Scanned by CamScanner

اردو کی ادبی تاریخیں

ڈاکٹر گیان چند

انجمن ترقی اردو، پاکستان
ڈی ۱۵۹، بلاک نمبر ۷ گلشن اقبال
کراچی۔ ۷۵۳۰۰

Scanned by CamScanner

انتساب

ادبی تاریخ کے سب سے اچھے اہلِ قلم
ڈاکٹر جمیل جالبی

اور

ادبی تاریخ کے سب سے اچھے اہلِ نظر
رشید حسن خاں
کے نام

Scanned by CamScanner

فہرست

Library Anjuman Taraqqi Urdu

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

حرفے چند

ڈاکٹر گیان چند ہمارے عہد کے ذمہ دار محقق اور باریک بیں نقاد ہیں۔ اگر اس عہد کے تین چار محققین کے نام لیے جائیں تو ان میں ڈاکٹر صاحب کا نام ضرور شامل ہوگا۔ وہ اُردو تحقیق کی ایک ناگزیر شخصیت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سیوہارہ ضلع بجنور میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم مراد آباد اور الہ آباد یونی ورسٹی میں ہوئی۔ درس و تدریس اور تحقیق و تصنیف مشغلۂ حیات رہا۔ حمیدیہ کالج بھوپال کے علاوہ آپ جموں و کشمیر یونی ورسٹی جموں، الہ آباد یونی ورسٹی اور سنٹرل یونی ورسٹی حیدر آباد دکن میں اُردو کے پروفیسر رہے۔ ان کے تحقیقی مقالے "اُردو کی نثری داستانیں" پر الہ آباد یونی ورسٹی نے انھیں ڈی۔ فل کی ڈگری عطا کی۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا پہلا تحقیقی کام تھا اور اس سے انھیں بڑی شہرت و توقیر حاصل ہوئی۔ انجمن کو خوشی ہے کہ ان کی اس پہلی تحقیقی کاوش کو انجمن ہی نے اہلِ نظر کے سامنے پیش کیا۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا زیرِ اشاعت ہے۔ اسے پہلی بار بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے خود شائع کیا تھا۔

"نثری داستانیں" کے بعد ڈاکٹر گیان چند نے تحقیق کے میدان میں نئی فتوحات کیں۔ وہ اب تک اُردو تحقیق و تنقید کے موضوعات پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں سے چند زیرِ اشاعت ہیں۔ رسائل میں شائع ہونے والے ان کے وقیع تحقیقی مقالے مستزاد ہیں۔ ان کی مشہور تحقیق "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" وہ کتاب ہے جس پر انھیں ڈی۔ لٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ اس کے علاوہ نظم و نثر کی تحقیق، لسانیات و عروض وغیرہ پر ان کی درج ذیل کتابیں ان کے تحقیقی ذوق، ان کی

Scanned by CamScanner

نظر کی گہرائی اور جستجو و تلاش سے ان کے شغف کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

عام لسانیات		۱۹۵۸ء
تحریریں	مجموعۂ مضامین	۱۹۶۵ء
تجزیے	مجموعۂ مضامین	۱۹۷۳ء
رموز غالب	(غالب پر مضامین کا مجموعہ)	۱۹۷۶ء
حقائق	(مجموعۂ مضامین)	۱۹۷۸ء
لسانی مطالعے	لسانیاتی مضامین	۱۹۷۹ء
ذکر و فکر	مجموعۂ مضامین	۱۹۸۱ء
تفسیر غالب	(غالب کے منسوخ کلام کی شرح)	۱۹۸۶ء
اُردو مثنوی شمالی ہند میں		۱۹۸۷ء
ابتدائی کلام اقبال		۱۹۸۸ء
اُردو کا اپنا عروض		۱۹۹۰ء
کھوج	تحقیقی مضامین	۱۹۹۰ء
پرکھ اور پہچان	تحقیقی و تنقیدی مضامین	۱۹۹۰ء
تحقیق کا فن		۱۹۹۰ء

ڈاکٹر صاحب کا جدید ترین تحقیقی کارنامہ "اُردو کی ادبی تاریخیں" ہے۔ یہ اُردو ادب کی ادبی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ہے۔ اس میں آبِ حیات سے اب تک کی کوئی ۱۴۰ ادبی تاریخوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان کے معائب و محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے تسامحات کی نشان دہی دوسرے محققین کے حوالے سے بھی کی گئی ہے اور خود اپنی تحقیق و جستجو کی روشنی میں بھی۔ اس طرح یہ کام اُردو تنقید، تاریخ اور تحقیق کے پورے منظر نامے سے واقفیت اور اس پر حکم لگانے کی بصیرت کا ایسا عمل ہو گیا ہے جسے کم سے کم الفاظ میں غیر معمولی کہا جاسکتا ہے۔

البتہ اس مطالعے میں ان ادبی تاریخوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو کسی علاقے، دور، تحریک یا صنف سے متعلق ہیں۔ گویا یہ صرف عمومی ادبی تاریخوں کا مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے ایک جگہ لکھا ہے "تحقیق کا سب سے مہتم بالشان کام کسی پورے ادب کی تاریخ لکھنا ہے" اور پورے ادب کی تقریباً تمام ہی تاریخوں اور ان پر

Scanned by CamScanner

ہونے والے تحقیقی کاموں کو پیش نظر رکھ کر ان پر حکم لگانا، اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ ڈاکٹر صاحب نے معلومہ محدودات کے باوجود بہت بڑی حد تک نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

ہاں، ادب کی تاریخ کیا ہوتی ہے، یہ اپنی جگہ ایک علاحدہ بحث ہے، سمتوں اور معانی میں بڑے تنوع اور وسعتوں والی۔ وقت کے ساتھ تاریخ کے مفہوم و تصور نے کئی سفر کیے ... بعض جاری ہیں... مگر ابھی ڈاکٹر صاحب سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ پہلے تاریخ یا ادب کے تصوراتی، تعریفی مباحث کو طے کرتے اور پھر لکھتے۔

ان کے کام کی تفصیل اگلے صفحات میں آپ کی نظروں سے گزرے گی، اس لیے اس پر مزید گفتگو ضروری نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر قابلِ ذکر تاریخ کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا ہے۔ اس کے تسامحات کی نشان دہی کی ہے، اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا اور یہ سارا کام خالص علمی انداز میں کیا ہے۔ وہ تعصبات سے مبرا ہو کر کاموں کا جائزہ لیتے ہیں البتہ جو کچھ انھیں کہنا ہوتا ہے وہ بے لاگ رہ کر اور عالمانہ صداقت کے ساتھ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی تحریر میں کوئی مصنوعی ادبیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے نہ اپنے بیان کو سجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کی تحریر میں ایک بھولپن اور ایسی فطری بے ساختگی ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے جو عام طور پر محققین کے حصے میں نہیں آتا۔ تحریر کا یہ انوکھا انداز بھی گیان چند صاحب کو اپنے ہم عصر محققین میں ایک امتیاز عطا کرتا ہے۔

انجمن ڈاکٹر صاحب کے اس وقیع اور ہمہ جہت تحقیقی کام کو علمی حلقوں میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔

Scanned by CamScanner

پیش لفظ

میں ۱۹۸۹ء کے وسط میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ اس کے بعد مجھے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن، حکومت ہند نے دو سال کے لیے فیلوایمیریٹس مقرر کیا۔ اس کے تحت مجھے "اردو تحقیق کی تاریخ" لکھنی تھی۔ میں نے کمیشن کو واضح کر دیا تھا کہ یہ کام دو سال میں پورا نہیں ہو سکتا، فیلوشپ ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اپریل ۱۹۹۰ء میں میں اپنی فیلوشپ کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ یہاں مجھے اندازہ ہوا کہ "تحقیق کی تاریخ" بہت بڑا کام ہے جو میری عمرِ مستعار میں پورا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسے سکوڑ کر اردو محققین کے جائزے تک محدود کرنا چاہا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ بھی زیادہ بڑا ہے۔ آخرکار ۱۹۹۰ء کے ربعِ آخر میں ایک مناسب موضوع سوجھا: "اردو کی ادبی تاریخوں کا جائزہ"، یہ "اردو تحقیق کی تاریخ" ہی کا ایک جزو ہے۔ میں سوا چار سال میں یہ کام پورا کر سکا ہوں۔

مجھے خوشی ہے کہ میں نے فیلوشپ کی رقم حلال کر کے ایک تحقیقی کتاب تیار کر دی۔ میری جملہ کتابوں میں یہ سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ میں یونی ورسٹی تعلیم کے لیے الہ آباد میں مقیم رہا، ملازمت کے سلسلے میں دوسرے چار مقامات پر۔ ہر جگہ میں نے کوئی نہ کوئی کتاب یا کتابیں تیار کیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے لکھنؤ کے قیام کا حقِ نمک بھی ادا کر دیا ہے۔

میں نے اس جائزے کو عمومی تاریخوں تک محدود رکھا ہے۔ محدود تاریخیں جو کسی علاقے، دور، تحریک یا صنف وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں، میرے جائزے سے باہر ہیں۔ ان کی تعداد لامتناہی ہے۔ ان پر کوئی ادارہ مجموعی تحقیق کرا سکتا ہے، ایک فردِ واحد کے بوتے کا نہیں۔ عمومی تاریخوں میں بھی اہم کارناموں کے علاوہ کئی مختصر درسی تاریخیں بھی نظر آتی ہیں۔ میں نے آخرالذکر کا محض تعارف کرایا ہے۔ ان کا مفصل جائزہ تضیعِ اوقات ہوتا۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ اگر تم نو کتابیں پڑھ لو تو دسویں کتاب تخلیق کر سکتے ہو۔ "درسی نصابی تاریخیں" اسی تکنیک کا کمال ہیں، کسی ذاتی تحقیق کا ثمرہ نہیں۔

Scanned by CamScanner

"ادبی تاریخوں" کے دو نمایاں پہلو ہیں: تحقیقی اور تنقیدی۔ میں نے بطورِ خاص تحقیقی پہلو سے سروکار رکھا ہے، گو تنقیدی رُخ سے بھی صَرفِ نظر نہیں کیا۔ تاریخِ ادب کا ہر قاری ان کے تنقیدی بیانات کے بارے میں بہ آسانی کوئی رائے قائم کر سکتا ہے لیکن ان کے تحقیقی تسامحات کی گرفت نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ عمر بھر پڑھنے پڑھانے کے بعد کہیں ۱۹۹۳ء میں جا کر اس لائق ہو سکا ہوں کہ پورے اردو ادب کے جملہ ادوار، جملہ گوشوں، جملہ مصنفوں اور جملہ اہم کتابوں کے بارے میں کچھ شُد بُد رکھتا ہوں۔

میں نے ادبی تاریخوں کے تحقیقی جائزے میں سنین اور بعض دوسرے واقعات کے تسامحات کی نشان دہی پر زور دیا ہے۔ اس کا مقصد ان تاریخوں کے فاضل مصنفین کی سبکی کر کے اپنی برتری ثابت کرنا نہیں ہے۔ ظاہر ہے مجھے جو تحقیقی مآخذ میسر ہیں، وہ ان مؤرخوں کو نہیں تھے۔ اپنے زمانے کے اعتبار سے انھوں نے جو کچھ پیش کر دیا، وہ اہم اور قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ انھیں کی اور ان جیسے دوسرے محققوں کی کاوشوں کی بدولت تو میں صحت کا عرفان کر سکا ہوں۔ میں ان اسلاف کا ممنون ہوں۔

لکھنؤ میں چند اچھی لائبریریاں ہیں، لیکن کوئی ایسی باضابطہ حوالے کی لائبریری نہیں جیسی یونی ورسٹیوں میں ہوتی ہے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی لائبریری میں جا کر محض نااُمیدی کا تحفہ ملتا ہے۔ "یوپی اردو اکادمی" کی لائبریری کا یہ انداز نہیں کہ اس میں خود الماریوں میں سے کتابیں نکال کر دیکھ سکیں۔ "ندوۃ العلما" کی لائبریری میں بھی کتابوں کی گروہ بندی خاطر خواہ نہیں۔ پھر، یہ کتب خانے میرے مستقر سے دور ہیں۔ میری عُمر میں وہاں روز روز جانا سہل نہیں۔ ایسے میں مَیں نے لکھنؤ اور باہر کے دوستوں کو زحمت دی اور ان سے کتابیں منگائیں۔ اگلے صفحات میں ہیں ان کی فہرست پیش کر رہا ہوں۔

میں انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کے اربابِ حلّ و عقد، بالخصوص اس کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی کا دل کی گہرائی سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی منظوری عطا کی۔

گیان چند

Scanned by CamScanner

اعتراف

۱۔ میں ذیل کے حضرات کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے کتابیں فراہم کیں یا اُن کی فراہمی میں مدد دی:

الف۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسلام آباد سے عبدالقیوم کی "تاریخِ ادبِ اردو" کا اپنا نسخہ مستعار بھیجا۔ انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان نے انجمن کے کتب خانے سے محمد یحییٰ تنہا کی ضخیم "مرآۃ الشعرا" کی دو جلدوں کا عکس فراہم کیا۔

ب۔ عزیزی ڈاکٹر انورالدین، حال صدرِ شعبۂ اردو، مرکزی یونی ورسٹی حیدرآباد نے یونی ورسٹی لائبریری اور عبدالصمد خاں کے اردو ریسرچ سنٹر سے کئی کتابیں لے کر بھیجیں اور بعض کے صفحات کے عکس فراہم کیے۔ عبدالصمد خاں کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے بے نظیر ذخیرے سے کتابیں مستعار دیں۔ ڈاکٹر مُغنی تبسم نے ڈاکٹر زور کی "دکنی ادب کی تاریخ" کا اپنا نسخہ مجھے مستقلاً بخش دیا۔

ج۔ الہ آباد سے ڈاکٹر عقیل رضوی نے رام بابو سکسینہ اور رالف رسل کی انگریزی تاریخیں دیں، ڈاکٹر جعفر رضا سے بھی بعض کتابیں ملیں۔

د۔ شمس الرحمان فاروقی سے ڈاکٹر شِمل، ڈاکٹر صادق اور میتھوز کی انگریزی تاریخیں ملیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے سلیم اختر کی "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" ملی۔

ہ۔ لکھنؤ میں ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی سے اسپرنگر کی انگریزی "فہرستِ کتب خانۂ اودھ" اور بعض دوسری کتابیں ملیں۔ ڈاکٹر ولی الحق انصاری، ڈاکٹر کاظم علی خاں اور ڈاکٹر محمود الحسن رضوی سے بھی کچھ کتابیں ملیں۔ رام لعل سے علی جواد زیدی کی انگریزی تاریخ ملی۔

و۔ مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشیں افتخار عارف نے ڈاکٹر انور سدید کی "اردو ادب کی مختصر تاریخ" عنایت کی۔

۲۔ ڈاکٹر شبیہ رضوی لیکچرر اردو، لکھنؤ یونی ورسٹی اور ان کی والدہ ڈاکٹر آصفہ زمانی، ریڈر فارسی، لکھنؤ یونی ورسٹی نے لکھنؤ یونی ورسٹی لائبریری اور یُوپی اردو اکادمی سے کئی

Scanned by CamScanner

کتابیں لا کر دیں۔ ڈاکٹر محمود الحسن رضوی نے بھی اس سلسلے میں مدد دی۔ میں جب بھی اردو اکادمی گیا، ڈاکٹر اظہر مسعود رضوی نے میرے ساتھ لائبریری میں جا کر کتابیں تلاش کیں اور انھیں دلانے میں مدد کی۔

۳۔ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کا بطورِ خاص ممنون ہوں کہ انھوں نے یونی ورسٹی لائبریری میں بہت سی کتابوں کو دیکھ کر میرے استفسارات کا جواب فراہم کیا اور چند صفحات کا عکس بھی کرا کر دیا۔ استفسارات کی حد تک میں نے الہ آباد کے ڈاکٹر سید محمد عقیل اور ڈاکٹر فضلِ امام، لکھنؤ کے ڈاکٹر نیر مسعود رضوی اور کاظم علی خاں، دہلی کے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور علی گڑھ کے ڈاکٹر مختار الدین احمد سے بھی استفادہ کیا۔ ان سب کا ممنون ہوں۔

ممکن ہے کسی اور سے بھی مجھے کوئی مدد ملی ہو لیکن ان کا نام اس وقت ذہن سے محو ہو گیا ہو۔ معذرت کے ساتھ ان کا بھی شکریہ درج کرتا ہوں۔

گیان چند

Scanned by CamScanner

پہلا باب

ادبی تاریخ نگاری

امریکا کی "موڈرن لینگویج ایسوسی ایشن" (M.L.A.) کی تحقیقی کارروائی کمیٹی نے ۱۹۵۲ء میں ایک رپورٹ پیش کی جس کا عنوان تھا: "جدید زبانوں اور ادبوں میں تحقیق کے مقاصد، طریقے اور مواد"۔ یہ ایسوسی ایشن کے رسالے P.M.L.A. شمارہ ۶۷، بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ص ۳ تا ۳۷ پر شائع ہوئی۔ اس میں چار موضوعات تھے۔ ۱۹۶۲ء میں ان موضوعات پر دوسرے لوگوں سے نئے مضامین لکھائے گئے جن میں پچھلے دس سال کے فکری و نظریاتی ارتقا سے فائدہ اٹھایا گیا۔ ان مضامین پر ۱۹۷۰ء میں نظر ثانی کرا کے "اسکالر شپ کے مقاصد اور طریقے" کے نام سے کتابچہ شائع کیا گیا(۱)۔ انگریزی میں اسکالر شپ کے معنی کم و بیش تحقیقی علمیت کے ہوتے ہیں۔ اس کتابچے میں چار ماہرین سے چار موضوعات پر مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ علمیت یا دانشوری کے یہی چار شعبے ہیں: ۔

۱۔ لسانیات
۲۔ متنی تنقید (تدوینِ متن)۔
۳۔ ادبی تاریخ
۴۔ ادبی تنقید

انگریزی میں تاریخ ادب کہنے کے بجائے ادبی تاریخ کی اصطلاح کا رواج ہے۔ کتابچے کے مدیر اور دوسرے مقالہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ چاروں شعبے الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک اسکالر کو ان سب پر تکیہ کرنا چاہیے۔ ان میں سے دوسرے اور تیسرے شعبے براہِ راست تحقیق کے تحت آتے ہیں۔ ادبی تحقیق کے دو شعبے ہیں۔

۱۔ سوانحی اور تاریخی تحقیق
۲۔ تدوینِ متن

ادبی تاریخ کے لیے سوانحی تحقیق اور ادبی تنقید مرکزی شعبے ہیں۔ تاریخ نگار لسانیات اور

Scanned by CamScanner

تدوینِ متن کے کاموں سے بھی استفادہ کرتا ہے۔

اردو میں ادبی تاریخ نویسی کے پیش رو شعرا کے تذکرے تھے۔ ادبی تاریخ شعرا کے تذکروں سے اگلا قدم ہے۔ انگریزی میں بھی سترھویں صدی کے رُبعِ سوم تک شعرا کی سوانح الفبائی ترتیب سے بیان کی جاتی تھیں۔ ٹامس وارٹن کی History of English Poetry (۱۷۷۴ء) انگریزی کی پہلی ادبی تاریخ ہے جس میں شعرا کا بیان تاریخی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ یہ یقینی ہے کہ اُردو میں ادبی تاریخ انگریزی کے زیرِ اثر آئی ہے۔ "آبِ حیات" کا پہلا جملہ:

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔

ہارنلے کی "گوڑمی زبانوں کی گرامر" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ "آبِ حیات" کے پہلے ہی صفحے پر آزاد "دانائے فرنگ" کی توصیف کرتے ہیں جنھوں نے زبانوں اور آثارِ قدیم کی تحقیق کی۔

اُردو کی مشہور تواریخِ ادب پر نظر ڈالیں کہ ان کے مقدموں میں فاضل مصنفین نے کن کن اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آزاد کی "آبِ حیات" میں اندرونی سرورق پر لکھا ہے:

آبِ حیات

یعنی

مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح عمری

زبانِ مذکور کی عہد بعہد ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان

دیباچے میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ شعرا کے حالات "اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں۔" اس کے بعد انھوں نے زبان کی تبدیلیوں کے اعتبار سے پانچ دور کیے اور ہر عہد کی زبان کی خصوصیات دکھائیں۔

"آبِ حیات" محض شاعروں کی تاریخ ہے۔ شاعروں اور نثر نگاروں کی مکمل اور جامع تاریخ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی ہے جو انگریزی میں لکھی گئی اور جس کا ترجمہ اضافے کے ساتھ محمد عسکری نے کیا۔ ڈاکٹر سکسینہ نے ایک طرف مختلف شعرا اور نثاروں کے حالاتِ زندگی لکھے، ان کی تصانیف پر تنقید کی، دوسری طرف ۱۹۲۷ء میں ذیل کے پہلو بھی ملحوظ رکھے:

مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی و زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اس دور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ

Scanned by CamScanner

کیے جائیں جس میں کہ وہ شعرا اور نثار گزرے۔ یہ کتاب محض کسی
زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ ان خیالات اور
خصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا
اثر اس زمانے پر تھا۔

گویا منفرد ادیبوں کی سوانح اور تنقید کے علاوہ تحریکات پر بھی بحث کی گئی ہے، افکار پر بھی اور تاریخی پس منظر پر بھی، مصنف کا یہ عندیہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اسے عملی جامہ پہنا سکا کہ نہیں؟

جناب علی جواد زیدی نے رسالہ "جامعہ"، دہلی بابت جون ۱۹۶۶ء میں ایک مضمون لکھا "اردو ادب کی تاریخ؟" بعد میں یہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اس کی ابتدا ہی یوں ہوتی ہے:

یہ بات بہت سنجیدگی سے اور سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ آج تک
اُردو ادب کی کوئی تاریخ اُردو میں نہیں لکھی گئی ہے۔

("جامعہ"، ص ۲۵۱)

ان کی رائے تھی کہ پہلے تاریخ ادب کے نظریے پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے پایا کہ کوئی تاریخ، ادبی تاریخ کے اصولوں کے مطابق نہیں لکھی گئی۔ انھوں نے اپنے مضمون میں یہ اصول پیش کیے ہیں، لیکن ان کا ذہن واضح نہیں معلوم ہوتا۔ ان کا مطالبہ ہے:

۱۔ اودھی اور برج بھاشا کے ادب کو اردو ادب کا جزو مان کر اسے بھی اُردو کی ادبی تاریخ میں شامل کیا جائے۔

۲۔ ادب میں اسکول قائم نہ کیے جائیں۔

۳۔ مختلف سماجی اداروں، سیاسی تحریکوں اور ثقافتی تنظیموں اور بدلتی ہوئی جمالیاتی اور ادبی و علمی قدروں کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۴۔ یہ بھی دکھایئے کہ اُردو ادب میں افراد نے ان تحریکوں کا اثر کیسے قبول کیا، کون لوگ روایت سے چمٹے رہے، کن لوگوں نے بغاوت کی۔ سماج کے ساتھ افراد کی نجی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ بھی لینے کی ضرورت ہے۔

پہلے مطالبے کو مان لیا جائے تو اردو زبان و ادب کی انفرادیت ہی ختم ہو جائے۔ اگر ہندی کے اودھی اور برج بھاشا کے ادب کو اردو ادب میں ضم کرلیا جائے تو اس سے بھی زیادہ جواز ہندی کے کھڑی بولی ادب کو اُردو میں ملا لینے کا ہے۔ اس طرح اُردو اور ہندی ایک ادب ہو جائیں گے یعنی اُردو ادب ہندی ادب کا ایک جزو ہو کر رہ جائے گا۔ زیدی صـ ـب کے

Scanned by CamScanner

اصولوں میں بعد کے دو اہم تر ہیں۔ وہ عبدالقادر سروری صاحب کی کتاب "اُردو کی ادبی تاریخ" (حیدر آباد، ۱۹۵۸ء) کے وجود سے واقف نہیں معلوم ہوتے کیونکہ انھوں نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک مختلف قسم کی تاریخ ہے جو سماجی پس منظر میں لکھی گئی ہے اور جس میں رجحانات اور تصورات کا ارتقا دکھایا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں سروری صاحب لکھتے ہیں:

> "آئندہ ادبی تاریخ لکھنے والوں کی یہ ذمےداری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سیاسی، معاشی، سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری سیاسی تاریخ تو مدوّن ہے لیکن معاشی، سماجی اور فنی تاریخ اتنی مرتّب نہیں ہے کہ اس کا مسالا ایک چھوٹی کتاب میں آسانی سے فراہم کیا جاسکے اور اس کے ساتھ ادبی مظاہر کی نشوونما کو جوڑ کر سب کے عمل اور ردِّعمل کو نمایاں کیا جاسکے... اس میں ادبی تاریخ کو خود مکتفی شعبۂ زندگی کی حیثیت سے، اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہٹا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ جہاں تک مواد دست یاری کر سکا، ہر عہد کے کارناموں کو ان کے سیاسی، سماجی اور فنی ماحول کے درمیان پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ مروجہ نوعیت کی تفصیلی تاریخ ادب نہیں ہے۔ اس میں رجحانات اور محرکات پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ یہی ادب کی (کذا) مزاج کو بناتے ہیں اور خود ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی ساخت کے بھی ذمے دار ہوتے ہیں۔

(ص ۶-۵)

پروفیسر آلِ احمد سرور نے "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو"، جلد اوّل کی تمہید میں تاریخِ ادب کے نظریے پر تفصیل سے غور کیا۔ انھوں نے مغربی نظریات کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا:

> کچھ لوگ اسے اجتماعی تاریخ سمجھتے ہیں یا افکار کی تاریخ جس میں فن پاروں پر محاکمہ بھی شامل ہوتا ہے۔ ٹامس وارٹن کے نزدیک ادبی تاریخ اپنے دور کی خصوصیات بے کم و کاست پیش کرتی ہے۔ ہنری مارلے اسے ایک طرح کی قومی سوانح عُمری کہتا ہے۔ سینٹس بری نے اسے ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھا ہے۔ جس میں ان کارناموں کی باز آفرینی ہو۔ کزامیاں کا خیال ہے کہ انگلستان کی ادبی

Scanned by CamScanner

تاریخ اس کی قومی روح کے اخلاقی آہنگ کا زیروبم ہے۔ کچھ اسے فن
کی تاریخ سمجھتے ہیں جس میں دلچسپی کے لیے مصنفین کی سوانح عمریاں
اور کچھ منفرد فن پاروں کی قدر شناسی(appreciation) شامل ہو۔
ٹی ایس ایلیٹ ادبی تاریخ کا کچھ ایسا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک
فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن سکے۔ جے اے سمنڈس
ادبی اصناف پر زور دیتا ہے اور یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ
ادبی اصناف کا ارتقا ادبی تاریخ کا سب سے اہم جزو ہے، کیونکہ
استدادِزمانہ کے ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھا جاتے اور بالآخر ختم
ہوجاتے ہیں۔ بعض جرمن اور امریکی فلسفیوں نے اس وجہ سے ادب
کے ارتقا کو حیاتیات کے ارتقا کی روشنی میں دیکھا ہے۔

سرور صاحب کا یہ بیان رَینے ویلک کے ایک مضمون پر مبنی ہے(۲)، لیکن حیرت
ہے کہ انھوں نے ایلیٹ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے منشا کے بالکل برعکس
ہے۔ ویلک کے متعلقہ الفاظ کا یہ ترجمہ ہوگا:

> ٹی ایس ایلیٹ آرٹ کے کسی کارنامے کے "ماضی پن" کا منکر
> ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ یورپ کا سارا ادب "ہومر سے لے اب تک"
> ایک ساتھ موجود ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے۔
>
> (ایضاً)

ایلیٹ کا یہ بیان اس کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" میں موجود
ہے(۳)۔

مغربیوں کے نظریات کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد انھوں نے تاریخِ ادب کے
بارے میں اپنی رائے پیش کی ہے:

> ادب کے اس مطالعے کے لیے زبان کی خصوصیات کے علم کے
> علاوہ تاریخ اور تہذیب کا گہرا شعور اور سماج کے پیچ در پیچ رشتے کا علم
> اور جمالیات، فلسفے اور معانی و بیان کے ساتھ ان زبانوں کے ادب کا
> علم بھی ضروری ہے جن سے یہ زبان خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔

اور وہ آگے جو لکھتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ادبی تاریخ میں:

ا۔ تحقیق سے خام مواد لے کر تاریخی پس منظر میں دیکھا جاتا ہے۔
ب۔ فن اور منفرد فن پاروں کی قدر شناسی ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

ج۔ منفرد فن پاروں کے جائزے کے باوجود اصناف کے ارتقا کا شعور ضروری ہوتا ہے۔

د۔ افکار کی تاریخ ہوتی ہے۔

ہ۔ تغیر پذیر ادب کو بدلتے ہوئے مگر مسلسل تہذیبی ارتقا کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔

ان سب باتوں کو سُلجھا کر کہیں تو سرور صاحب کے نزدیک ادبی تاریخ کو لسانیات، جمالیات، معانی و بیان سے استفادہ کرنا ہوتا ہے نیز اصناف، تخلیقات اور ادیبوں پر تاریخی و تہذیبی پس منظر میں تنقید کرنی ہوتی ہے۔

پنجاب یونی ورسٹی لاہور نے جو ضخیم "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" شائع کی اس کی جلد ۶ تا ۱۰ اُردو ادب سے متعلق ہیں اور ۷۲-۱۹۷۱ء میں شائع ہوئیں۔ یہ ایک مخصوص قسم کی تاریخ ہے جس میں ادب کو ملّتِ اسلام کے آئینے میں دیکھا گیا ہے۔ چھٹی جلد کے تعارف میں مدیرِ عموی گروپ کیپٹن سید فیاض محمود کہتے ہیں کہ اس تاریخِ ادب کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے تاکہ مسلمانانِ برِصغیر کی پوری زندگی اور تہذیب کا جامع عکس پیش ہو جائے۔ اس کے لیے انھوں نے تحریری ادب کے ساتھ لوک ادب کو بھی اہمیت دی۔ اس کے علاوہ دوسرے درجے کے، یعنی چھوٹے مصنفین پر بطورِ خاص توجہ کی کیونکہ ان کے ہاں عام زندگی کی عکاسی عظیم شعرا یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔

اس طرح اس تاریخِ ادب کو مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کے جزو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی "تاریخِ ادبِ اُردو"، جلد دوم، حصہ اوّل (دلّی ایڈیشن، ۱۹۸۴ء) کے پیش لفظ میں واضح کیا ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخِ ادب میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے:

> اگر ادب زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی "تاریخ" کو بھی ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں ساری زندگی کی روح کا عکس نظر آجائے... بنیادی طور پر میں نے "ادب" کو ادب کی حیثیت سے دیکھا ہے لیکن کلچر، فکر اور تاریخ کے تخلیقی امتزاج سے میں نے تاریخِ ادب کو ایک وحدت، اکائی بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ادبی تاریخ کی سطح پر تحقیق، تنقید اور کلچر مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ (ص ۱۱)

Scanned by CamScanner

> تاریخ ادب نہ صرف ادب کی، بلکہ سماجی تبدیلیوں کے زیرِ اثر زبان و بیان کی تبدیلیوں کی تاریخ بھی ہوتی ہے ... میں نے اردو کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل و تعمیر اور ردِ عمل و تبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے۔ (ص ۱۲)

نقاد کے سامنے ایک سوال یہ ابھرتا ہے کہ مختلف ادب پاروں کو ان کے عہدِ تصنیف کے معیار سے پرکھا جائے کہ اپنے دور کے معیار سے یہاں ڈاکٹر جالبی نے "یہ بھی اور وہ بھی" کا انداز اختیار کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> تاریخِ ادب میں جہاں کسی دور کے اپنے معیار اور نظامِ اقدار کی مدد سے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہاں ساتھ ساتھ دائمی ادبی معیاروں سے بھی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ (ص ۱۲)

اس کے علاوہ انھوں نے بتایا ہے کہ انھوں نے ادیبوں کے مستند حالاتِ زندگی، اہم واقعات کے مستند سنین اور مستند متون پر بطور خاص توجہ کی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ادبی تاریخ کے ابتدائی دور میں جہاں مختلف ادوار کی لسانی خصوصیات شمار کرانے کو کافی سمجھا جاتا تھا، بعد میں تحقیقی پہلو کے علاوہ، تخلیقات کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں بھی مطالعہ کیا گیا۔ اصناف ادب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ افکار کی تاریخ بھی بیان کی گئی اور سب سے زیادہ ادب اور کلچر کے باہمی ردِ عمل پر زور دیا گیا۔

"آبِ حیات" سے رام بابو سکسینہ کی تاریخ تک ارتقا کی ایک بڑی جست ہے اور رام بابو سکسینہ سے جمیل جالبی تک دوسری، جنھوں نے ادوار کے بجائے روایات کا دامن پکڑ کر تاریخ کا بیان کیا۔ یہ غنیمت ہے کہ اُردو کی "ادبی تاریخیں" تاریخ کی حدود سے نکل کر محض تنقید زدہ یا سماجی تاریخ گزیدہ ہو کر نہیں رہ جاتیں۔ رَینے ویلک نے اپنی ایک کتاب اور مضمون میں ادبی تاریخ نگار کے مسائل پر غور کیا ہے(۴)۔ ان سے استفادہ کرتے ہوئے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ادبی تاریخ ایک طرف تاریخ ہے، دوسری طرف ادب۔ یہ سوانح نگاری اور تنقید کے امتزاج سے بنی ہے لیکن اسے تحریک ملی سیاسی تاریخ سے، جس کی مماثلت پر اس نے سوانحات کو ترتیب دیا، بعد میں ادبی اصناف کی شعریات کا بھی اضافہ کیا۔ ادبی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں ایک بڑا فرق ہے۔ سیاسی تاریخ کے واقعات ماضی کے پردۂ عدم میں مکتوم ہیں جب کہ ادبی تاریخ کی ماضی کی تخلیقات ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی وجہ سے ٹی ایس ایلیٹ نے ادب میں ماضی و حال کی تقسیم سے انکار کیا تھا۔ ادبی تاریخ رقم کرنے سے پہلے اس کی نظریاتی

Scanned by CamScanner

بنیاد متعین کر لینی چاہیے۔

کیا ادب تاریخ کی طرح تبدیلیوں کا سلسلہ ہے؟ کیا ان تبدیلیوں میں تسلسل کا ایک سررشتہ تلاش کیا جاسکتا ہے؟ کچھ لوگ ادب کو حیاتیات کے ارتقا کے طور پر دیکھتے تھے جو ولادت سے شروع ہو کر موت پر ختم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک بعض ادبی اصناف، بعض رجحانات و روایات پیدا ہوئیں، نشوونما پایا اور آخرش مر گئیں۔ لیکن وہ یہ پہلو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ وہ مرنے کے باوجود ڈائناسور کی طرح ہماری نظروں سے او جھل نہیں ہوتیں، "ریختی" ہو کہ "ساقی نامہ"، "ایہام نگاری" ہو یا "عربی فارسی سے مرصع اسلوب"، ان سب کے نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

کارلائل کا تاریخ کا تصور تھا کہ وہ بڑے آدمیوں کی سوانحات کا مجموعہ ہے۔ ابتدائی ادبی مؤرخوں نے ادبی تاریخ کو بھی "مشاہیر ادب" کی سوانحات کا مجموعہ سمجھا۔ اگلا قدم تھا تنقید سے متاثر ہونے کا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی تاریخ مختلف ادیبوں پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ بن گئی۔

ادبی تاریخ کو نہ محض سوانحات کا مجموعہ ہونا چاہیے، نہ تنقیدی مضامین کا اور نہ اسے سماجی تاریخ ہی بن جانا چاہیے۔ اسے ادب کا مسلسل ارتقا پیش کرنا ہے۔ جس میں غیر ادبی عوامل کی حیثیت ثانوی رہنی چاہیے۔

۱۹۶۳ء میں ہارورڈ یونی ورسٹی میں ایک ادبی کانفرنس میں ایک مقالہ نگار بُش نے کہا کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی پہلی تہائی میں ادبی تاریخ تنقید کو چشمِ کم سے دیکھتی تھی اور محض خارجی ادبی واقعات کی تاریخ نگاری پر قانع تھی۔ اس کے بعد امریکا میں تاریخِ افکار یا تاریخِ تصورات کی لہر دوڑ آئی۔ اب بہت سے مصنف ادب کی جو تاریخیں لکھ رہے ہیں ان میں مذہبی، فلسفیانہ، سائنسی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور جمالیاتی تصورات کے پیچیدہ عوامل پر نظر رکھی جاتی ہے۔ تاریخِ تصورات کی وجہ سے ادبی تاریخ تنقید کے نزدیک آ گئی (۵)۔

اس باب کی ابتدا میں امریکا کی "موڈرن لینگویج ایسوسی ایشن" کے کتابچے "اسکالرشپ کے مقاصد اور طریقے" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں رابرٹ اسپلر کا مضمون "ادبی تاریخ" کے عنوان سے ہے۔ میں نے اس موضوع پر انگریزی میں جو مضامین اور کتابوں کے ابواب دیکھے ان سب میں ادبی تاریخ کے نظریات پر اس مضمون کو بہترین پایا۔ انگریزی کے پروفیسروں سے تحقیق کی تو انھوں نے بھی اس کی تائید کی۔ اس مضمون کے اہم نکات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

اسپلر ابتدا ہی میں واضح کرتا ہے کہ ادبی تاریخ (الف)۔ نہ زبان کی تاریخ ہے، (ب)۔

Scanned by CamScanner

نہ تجزیۂ متن (تدوینِ متن)، (ج)۔ نہ ادبی تنقید حالانکہ ادبی مورخ، (تاریخِ ادب کا لکھنے والا) ان سب سے استفادہ کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ان شعبوں میں سے کسی میں یا کئی میں ماہر ہو لیکن بحیثیت مورخ کے اس کا رول الگ ہے۔ اُسے ایسے سوالوں کا جواب دینا چاہیے کہ ادبی تخلیق کیسے، کب، کہاں اور کیوں وجود میں آئی اور اس کا دوسری تخلیقات، نیز انسان کی سماجی تاریخ سے کیا رشتہ ہے۔

اسپلر نے سب سے اہم بات یہ کہی ہے کہ ادبی مورخ کو نظریے اور تنقیدی تجزیے کا کام دوسروں پر چھوڑنا ہوگا۔ دوسرے موقعوں پر وہ تنقید نگار ہو سکتا ہے لیکن فی الحال اس کا دوسرا رول زیرِ بحث ہے(۶)۔

اُن اُردو والوں کو اس نکتے پر خاص توجہ کرنی چاہیے جو ادبی تاریخ کو ادبی تنقید کے مترادف بنا دیتے ہیں۔

اسپلر کہتا ہے کہ ادبی تاریخ کا موضوع ادب ہے اس لیے یہ ادبی انداز میں لکھی جانی چاہیے اور چونکہ یہ ادب کی ایک صنف ہے اس لیے یہ آرٹ ہے، تاریخ کی طرح سائنس نہیں۔ ادبی تخلیق کا، اپنے خالق کی ذات کے علاوہ، اس کی ثقافت، دوسری ثقافتوں اور قارئین سے بھی تعلق ہوتا ہے؛ ان کے علاوہ ایک تخلیق کا دوسری تخلیقات سے بھی رشتہ ہوتا ہے۔ ادبی تاریخ میں ان رشتوں کو کیوں کر اور کس حد تک واضح کیا جائے؟ اس کے جواب کے طور پر ادبی تاریخ کے بارے میں چار رویے یا نظریے سامنے آتے ہیں:

۱۔ قدیم ترین طریقہ یہ تھا کہ تخلیقات کو مصنف، عہد اور علاقے کے سیاق میں بیان کر دیا جائے، ان پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۲۔ ادبی مورخ کے لیے صرف ادبی اثرات اہم ہیں۔ اس کا کام ماضی کی ادبی تخلیقات کے ماخذ اور تحریکات کی تلاش کرنا ہے نیز ان تخلیقات کے بعد میں آنے والی تخلیقات پر جو اثر پڑے ان کی نشان دہی کرنا ہے۔ گویا ادبی تخلیقات صرف ادبی عوامل سے متاثر ہوتی ہیں، دوسرے عوامل غیر متعلق ہیں۔

۳۔ تیسرے نظریے کے مطابق ادبی عوامل کے ساتھ تخلیق کار اور اس کی کلچر، نیز قارئین اور ان کی کلچر کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اسپلر کے نزدیک یہی بہترین نظریہ ہے۔

۴۔ چوتھا نظریہ وقت کو سیدھی لکیر نہیں مانتا، بلکہ ایک نفسیاتی تصور، ایک دائرہ (سائکل) قرار دیتا ہے۔ اس میں ادب پر دیومالا، اساطیر، علامتوں اور اقدار وغیرہ کے اثر کو دیکھتا ہے۔ واضح ہو کہ دراصل یہ نقاد کا میدان ہے۔ دیومالا ادب نہیں بلکہ اس مواد کا حصہ ہے جس کے زیرِ اثر ادب وجود میں آتا ہے۔

Scanned by CamScanner

ادبی مؤرخ کو دوسرے علوم میں بھی کچھ نظر رکھنی چاہیے مثلاً فلسفہ، نفسیات، مذہبی یا سیاسی تاریخ، ڈراما، لسانیات، ذرائعِ ابلاغ وغیرہ۔ اُسے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن انھیں اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دینا چاہیے۔ وہ خیال رکھے کہ وہ پہلے ادبی مؤرخ ہے بعد کو کچھ اور۔ ادب کی تخلیق میں جو عوامل اثرانداز ہوتے ہیں، ادبی مؤرخ کو اپنی تاریخ میں ان پر توجہ کرنی چاہیے، وہ یہ ہیں:

۱۔ افکار و تصورات مثلاً مذہبی عقائدوافکار، سوشلزم، وجودیت، مارکسیت، فرائڈ کی جنسی نفسیات وغیرہ۔

۲۔ کلچر

۳۔ سیاسی اور سماجی ادارے مثلاً سیاسی پارٹی، کلیسا، کلب، اسکول، کالج اور یونی ورسٹی، سیمینار، مباحثے، سمپوزیم وغیرہ۔

۴۔ روایت اور اساطیر۔ یہ عناصر علمِ بشریات (Anthropology) کی دین ہیں۔

۵۔ سوانح عمری۔ یہ ادبی تاریخ کا اہم ترین ماخذ ہے۔

اسپلر کے مطابق ادبی مؤرخ کا کام تاریخی تنقید کرنا ہے جو ادبی تنقید سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ ان عوامل کی نشان دہی کرتا ہے جن کے زیرِاثر تخلیق وجود میں آئی۔ وہ کوئی نظریہ قائم کر کے اسے جانچتا ہے اور اس عمل میں وہ کسی حد تک نقاد بن جاتا ہے۔

اسپلر کے نظریات کا خلاصہ ختم ہوا۔

ابتدائی ادبی تاریخیں ادیبوں کی سوانح کا مجموعہ تھیں جنھیں تاریخی ادوار میں تقسیم کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ان کی تخلیقات پر بھی توجہ کی۔ بعد میں تاریخ میں قدرپیمائی اور تنقید کا عنصر بڑھتا گیا۔ تاریخ کو تنقید سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم جب یہ طے کرتے ہیں کہ اپنی ادبی تاریخ میں کن کن ادیبوں کا ذکر کریں گے تبھی ہم اپنے اندر ادبی نقاد سے مدد لیتے ہیں۔ انگریزی کے بڑے نقاد ایڈمنڈ ولسن نے ادبی تاریخ اور تنقید کو ایک قرار دیا تھا(۷)۔ ان دونوں کو ایک دوسرے پر منطبق کرنا تو مبالغہ ہے لیکن تنقید کے مختلف نظریات نے ادبی تاریخ نویسی کو ضرور متاثر کیا ہے۔ پہلے کی ادبی تاریخیں زیادہ تر ادبی پیمانوں سے کام لیتی تھیں۔ ساں بوے (Sainte Beauve) نے تنقید میں مصنف کی سوانح سے فائدہ اٹھایا۔ اس کا قول تھا کہ تخلیق اور تخلیق کار جدا نہیں۔ تاریخی تنقید کے ساتھ سماجی تنقید، نیز مارکسی تنقید نے ادبی تاریخ کو سماج کے آئینے میں دیکھنے پر زور دیا۔ ادبی تاریخ دراصل قوم کی ذہنی اور تہذیبی تاریخ کا اہم جزو ہے اس لیے ادبی تخلیقات اور ان کو جنم دینے والی ثقافت کے باہمی ردِعمل کو ٹٹولنا ضروری ہے۔

Scanned by CamScanner

ادبی تاریخ میں کلچر کے ذکر کے ساتھ ساتھ افکار کی تاریخ پر بھی دھیان دیا گیا۔ یہ افکار مذہبی، سیاسی، تاریخی، سماجی، فلسفیانہ اور شاذ ادبی بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ادبی تاریخ کو تحریکات و رحجانات پر توجہ کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ ان کے بیان میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ کلچر کے بیان میں یہ کافی نہیں کہ کلچر یا سیاست کی تاریخ الگ بیان کر دی جائے اور تخلیقات کا تجزیہ الگ۔ یہ دولخت بیان نامناسب ہے۔ کلچر کے صرف انھیں واقعات کا ذکر کرنا چاہیے جن سے ادبی تخلیق متاثر ہوتی ہے، یعنی کلچر (تہذیبی پس منظر) اور ادب کے بیان میں دوئی نہیں، وحدت ہونی چاہیے۔

دوسری احتیاط تحریکات کے بیان میں درکار ہے۔ انھیں تحریکات و رحجانات کا بیان کرنا چاہیے جو قابلِ قدر اور قابلِ ذکر ہیں یعنی جن میں کئی مشترک خصوصیات ہیں، جن سے کئی ایسے ادیب وابستہ رہے ہیں جن میں کئی مشترک رحجانات تھے، دلی اور لکھنؤ کے شعری دبستانوں کے سے ڈھیلے زمروں کو کم اہمیت دینی چاہیے کیونکہ ان میں دراصل کئی امتیازی اشتراکات نہیں جب کہ علی گڑھ تحریک، انجمنِ پنجاب، ادبِ لطیف، ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق، جدیدیت وغیرہ میں ایسے واضح ادبی اور فکری رحجانات مشترک ہیں کہ ان تحریکات و رحجانات کی اہمیت میں شبہ نہیں۔ محض کسی بھی ادبی مرکز کے گرد ایک دبستان بُن دینے کی خواہش بے معنی ہے مثلاً دکن اسکول، اکبر آباد اسکول، رام پور اسکول، عظیم آباد اسکول کی بات غیر مدلل ہے۔

ادبی تاریخ کے تعلق سے ایک سوال کا جواب دینا ہے۔

کیا ادبی تاریخ میں محض جمالیاتی تحریروں یعنی "لفظ بحیثیت آرٹ" کا احصا کیا جائے یا ہر قسم کی تحریروں کا؟ کھلے ڈُلے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کیا ادبی تاریخ میں محض ادبیات کو پیشِ نظر رکھا جائے یا مثلاً ذیل کے موضوعات کا بھی جائزہ لیا جائے؟

(الف) صحافت، (ب) مذہبی ادب، (ج) تاریخی ادب، (د) سائنسی ادب، (ہ) فلسفہ نفسیات اور جمالیات کا ادب، (و) تعلیمی ادب۔

کیمبرج تاریخ ادب انگریزی میں ان میں سے بعض موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ میرے سامنے علی گڑھ تاریخِ ادبِ اُردو کی پانچوں جلدوں کی اسکیم ہے۔ اس میں یہ ابواب بھی تھے:

جلد سوم: مذہبی تحریریں اور ترجمے، لغات اور گرامر، اُردو صحافت۔

جلد چہارم: صحافت، مذہبی تحریریں، تاریخی و علمی سرمائے کا جائزہ۔

جلد پنجم: اخبارات و رسائل، علمی سرمائے کا جائزہ۔

Scanned by CamScanner

پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی "تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" میں بھی دہلی کالج کی علمی خدمات، مناظراتی ادب، صحافت، دینی ادب وغیرہ پر ابواب ہیں۔ شکایت سننے میں آئی ہے کہ ادب کو محض شعر، فکشن اور انشائیے تک محدود نہ رکھنا چاہیے۔ ادب کے بارے میں بہت زیادہ تصنیف و شائع ہو رہا ہے۔ امریکا کی جدید زبانوں کی انجمن کے رسالے P.M.L.A میں لکھا تھا کہ ایک سال میں (ظاہراً ۱۹۶۲ء میں) انگریزی ادب کے بارے میں ۶۰۰۰ مضامین لکھے گئے (۸)۔ اُردو میں بھی ہند و پاک میں اردو ادب سے متعلق تحقیقی، تنقیدی مضامین کی تعداد ایک سال میں پانسات سَو کے لگ بھگ ہو ہی جاتی ہوگی۔ ادبی تاریخ غیر ادبی موضوعات سے پوری طرح صرف نظر نہیں کر سکتی۔

انگریزی کے ایک مضمون نگار چارلس کپلان نے کہا ہے کہ ہر نسل کو پچھلی نسل کی ادبی تاریخ لکھنی ہے (۹)۔ ضخیم انگریزی کتاب "تاریخِ امریکی ادب" کے مختصر مقدمے میں لکھا ہے کہ ہر نسل کو امریکی ادب کی ایک تاریخ لکھنی چاہیے۔ اسپلر نے اپنے عالمانہ مضمون کے آخر میں لکھا ہے:

> ان وجوہ سے کہا گیا ہے کہ ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی تاریخ (ادبی اور دوسری) خود لکھنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ ماضی بدل جاتا ہے، یہ نہیں بدلتا بلکہ انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنے علم، اپنی قوتِ تشریح اور ماضی کے متعلق اپنے فیصلے کو، اپنے حال کو بہتر طریقے پر سمجھنے اور مستقبل کو زیادہ عقل مندی سے تشکیل دینے کے کام میں لاتا ہے۔ ادبی تاریخ کے یہی فوائد ہیں۔ (ص ۶۸)

اسی بات کو جمیل جالبی نے اپنی "تاریخِ ادبِ اردو" جلد دوم کے مقدمے میں یوں کہا ہے:

> ادبی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آنی چاہیے کہ حال کا ماضی سے کیا رشتہ ہے اور یہ بات بھی کہ حال ماضی کو کیسے بدلتا رہتا ہے۔ (ص ۱۳)

انیسویں صدی عیسوی میں سمجھا جاتا تھا کہ سیاسی تاریخ کم از کم نظریاتی حد تک بالکل معروضی انداز میں لکھی جا سکتی ہے لیکن "کیمبرج موڈرن ہسٹری" کے عام تعارف میں سر جارج کلارک نے لکھا کہ ماضی کا علم ہم تک ایک یا کئی ذہنوں کے وسیلے سے چھن کر آیا ہے اس لیے کوئی "معروضی تاریخی صداقت" نہیں ہوتی۔

یہی کیفیت ادبی تاریخ کی ہے۔ وہاں بھی پیمانے اور مذاق بدلتے رہتے ہیں۔ ایک مضمون نگار ریمنڈ شوی نے سوال اٹھایا تھا:

Scanned by CamScanner

کسی تخلیق کے تاریخی سیاق میں تجزیے کے بعد غور کیجیے کہ وہ آج بھی
کیوں پڑھی جاتی ہے...اپنے زمانے کے بہت سے مقبول کارنامے
بعد میں کیوں فراموش ہوجاتے ہیں اور بہت سی ایسی تخلیقات، جن
پر اپنے زمانے میں کم توجہ کی گئی، دوام پا جاتی ہیں (۱۰)۔

اُردو میں شاہ نصیر، ناسخ اور داغ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھے، آج وہ ساقط المعیار ہوگئے ہیں۔ اپنے دور میں نظیر اکبر آبادی اور غالب کی زیادہ قدر نہیں کی گئی، اب انھیں بقاے دوام مل گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر نسل کو ماضی کی قدر بندی اپنے انداز سے کرنی ہوگی۔ اسی لیے ضروری ہے کہ ہر نسل میں پورے اُردو ادب کی ایک نئی تاریخ لکھی جائے۔

فی زمانہ ادبی تاریخ سے وہ سب مطالبے کیے جا رہے ہیں جو دراصل ادبی تنقید کی ذمے داری ہیں، لیکن یہ زیادتی ہے۔ ادبی تاریخ کو سب سے پہلے تاریخ ہونا چاہیے۔ اس میں صحیح سنین دینے پر خاص توجہ کرنی چاہیے۔ کسی مصنف کا سنہ ولادت، سنہ وفات اور زندگی کے دوسرے اہم واقعات مثلاً ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت کی تاریخیں دینی چاہییں۔ اس کے علاوہ اس کی مختلف تصانیف اور ان کے اہم ایڈیشنوں کے سال بھی زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ دیے جائیں۔ اگر تخلیق کہیں اور سے ماخوذ ہے تو اس کے ماخذ اور مختلف تراجم کی بھی نشان دہی کی جائے۔ قدیم ادب میں اس پہلو پر بطورِ خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سرور صاحب نے "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو" کے مقدمے میں لکھا ہے۔

پہلی جلد میں معلومات پر قدرتاً زیادہ زور ہے، اس لیے یہ تنقیدی کم
ہے تحقیقی زیادہ... تنقیدی پہلو بھی دوسری جلد سے زیادہ اہم ہوتا
گیا ہے۔

ابتدائی دور اور قدیم تصانیف میں لسانی پہلو پر بھی توجہ کرنی ہوگی۔ تنقیدی جائزے میں اس تشریح و بسط کی ضرورت نہیں جو تنقیدی کتب میں ہوتی ہے۔ ادبی تاریخ میں یہ طے کرنا ہوگا کہ کسی ادیب اور ادب پارے کا پورے اردو ادب میں کیا مقام ہے۔

ہندی کے ڈاکٹر دونے موہن شرما لکھتے ہیں:

ادبی تاریخ کے ادوار کی تقسیم ایسا مسئلہ ہے جو کبھی حل نہ ہو سکے گا۔
ادب کی تاریخ ملک کی تاریخ کے ساتھ چلنی چاہیے (۱۱)۔

یہ ایک حد تک درست ہے، پوری طرح درست نہیں۔ اردو ادب میں ۱۸۵۷ء، ۱۹۴۷ء تاریخی حدیں بھی ہیں، ادبی بھی لیکن دکنی اور شمالی ہند کے ادب کے بیچ ایسی کوئی حد

Scanned by CamScanner

نہیں۔ میر و مرزا کے دور کے بعد آتش و ناسخ اور ذوق و غالب کے عہد کے بیچ ادبی سرحد ہے، کوئی سیاسی حدِ فاصل نہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسندی کی ابتدا اور ۱۹۶۰ء میں جدیدیت کا آغاز ملک کی تاریخ کے کسی موڑ کے متوازی نہیں۔

رینے ویلک نے اپنے مذکورۂ سابق مضمون میں ادبی تاریخ، بالخصوص انگریزی ادبی تواریخ، کے ادوار پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اگر ادبی تاریخ کے ادوار کو سیاسی تاریخ کے ادوار یعنی بادشاہوں یا وزرائے اعظم کے عہدوں کے متوازی تقسیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ تسلیم کر لینا ہوگا کہ ادبی تصورات سیاسی تاریخ سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں اور اس کے بدلنے کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ لیکن انگریزی کی ادبی تاریخ کے ادوار طرح طرح کی بنیادوں پر ہیں۔ الزبیتھی دور اور Restoration کا دور سیاسی تاریخ سے ماخوذ ہیں، اصلاح کا دور مسیحی کلیسا سے متعلق ہے، رومانیت کا دور فلسفیانہ و ادبی تصور ہے۔

اردو کی ادبی تاریخ کے ادوار زمان و مکاں اور تحریکات و رجحانات کو ملا جلا کر قائم کیے جائیں گے۔ قدیم دور میں تو محض زمان و مکاں کو ملحوظ رکھنا کافی ہوگا۔ شمالی ہند کی تاریخ میں نظم و نثر کو علاحدہ جلدوں میں نہیں لیا جائے گا، بلکہ مختلف ابواب میں ملا جلا کر مثلاً فائز، حاتم، آبرو وغیرہ کو (جن میں کئی ایہام گو ہیں،) ایک باب دیں گے، میر و مرزا کو دوسرا۔ ان کے بعد فورٹ ولیم کالج کی نثر آئے گی، پھر مصحفی انشا و رنگین وغیرہ کو لیا جائے گا۔ غالب کے دور کو علاقائی بنیادوں پر دو ابواب میں بانٹ دیا جائے گا ایک میں دلی کے شعرا، دوسرے میں لکھنؤ کے آتش و ناسخ وغیرہ۔ ان کے بعد ایک صنف مرثیہ لی جاسکتی ہے۔ پھر نثر کی طرف رجوع کر کے مرزا رجب علی بیگ سرور اور ان کے زمرے کا بیان کیا جائے گا۔ اس کے آگے مغربی اثرات کی آئینہ داری کے طور پر علی گڑھ تحریک کو۔ اس تحریک کے مصنف اتنے قد آور ہیں کہ کئی ابواب کے متقاضی ہوں گے۔ اسی طرح ادبِ لطیف، ترقی پسند ادب، جدیدیت جیسے رجحانات و تحریکات پر الگ ابواب میں لکھنا ہوگا۔ یہ ادوار نہیں لیکن ان کا عروج تاریخی ترتیب سے یکے بعد دیگرے ہوتا ہے۔

گویا اُردو کی ادبی تاریخ تاریخی ادوار، علاقوں، نظم و نثر، ادبی تحریکات و رجحانات، ادبی اصناف مثلاً مرثیہ، شہر آشوب، ریختی، ناول، افسانہ وغیرہ جیسے گوناگوں ملحوظات کے تحت بیان کی جائے گی۔ اس کے علاوہ اس میں کئی غیر ادبی موضوعات کو بھی لینا ہوگا۔ وہ کون کون سے ہونے چاہییں۔ کم از کم ذیل کی تحریریں تو ادب کا جزو مان لی گئی ہیں:

۱۔ اردو ادب کے قدیم دور کی کتابیں خواہ وہ کسی موضوع پر ہوں ان میں سے بیش تر مذہب و معرفت پر ہیں۔ ظاہر ہے کہ آج ان موضوعات پر کوئی کتاب لکھی جائے تو اسے

ادب میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ مستند ادیبوں کی بعض غیر ادبی موضوعات پر تحریریں، کیونکہ ان کا اندازِ تحریر کسی نہ کسی حد تک اپنے خالق کی انشا کا آئینہ دار ہوگا، مثلاً:

مذہب: سرسید کی "تبیین الکلام"، نذیر احمد کی "الحقوق والفرائض"۔

کلام: شبلی کی "الکلام"، "علم الکلام"۔

فلسفہ: عبدالماجد دریابادی کی "فلسفۂ اجتماع"، "فلسفۂ جذبات"۔

تاریخ: شیر علی افسوس کی "آرائشِ محفل"، محمد حسین آزاد کی "دربارِ اکبری" اور "قصص ہند" حصۂ دوم۔

سماجیات: عابد حسین کی "قومی تہذیب کا مسئلہ"۔

تعمیر: سرسید کی "آثار الصنادید"۔

جغرافیہ: عبدالماجد دریابادی کا "جغرافیۂ قرآن"، سید سلیمان ندوی کی "ارض القرآن"۔

بڑی تاریخِ ادب میں ذیل کے موضوعات پر لکھنا ناگزیر ہے:

اردو کی شعری اصناف، اردو کی نثری اصناف، اردو قواعد، اردو لغات، اردو صحافت، اردو کے ادبی رسالے۔

کچھ اور موضوعات ہیں جن پر لکھنا ضروری نہیں لیکن اگر تاریخ کئی جلدوں میں ہو اور اس کا مصنف یا ادارۂ تحریر چاہے تو ذیل کے موضوعات میں سے کچھ کو علاحدہ باب دے سکتا ہے:

اردو کے اہم تصنیفی ادارے، اردو لوک گیت، اردو کی لوک کتھائیں، اردو کے لوک ناٹک، اردو میں تاریخی ادب، اردو کا مذہبی ادب وغیرہ۔

جہاں تک دوسرے سماجی علوم، سائنسی اور تکنیکی علوم کا تعلق ہے آزادی سے پہلے عثمانیہ یونی ورسٹی اور آزادی کے بعد ہندوستان کے ترقی اردو بیورو اور پاکستان کی مجلسِ ترقیِ ادب لاہور اور مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد وغیرہ نے کثرت سے کتابیں تصنیف یا ترجمہ کرائیں۔ چونکہ ان کا ادب سے کوئی رشتہ نہیں اس لیے میری رائے میں ادبی تاریخ میں ان پر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہر مصنف اور ہر ادارۂ تحریر اپنی صواب دید کے مطابق اپنی تحریر کے ابعاد طے کر سکتا ہے۔ "کیمبرج تاریخِ ادبِ انگریزی" ۱۵ جلدوں میں ہے، ہندی کی بڑی تاریخِ ادب ۱۶ جلدوں میں۔ اردو میں بھی اگر جملہ موضوعات کا احاطہ کیا جائے تو ۱۵ جلدیں کافی نہیں، مزید دو تین جلدیں درکار ہوں گی۔ یہ ایک خواب ہے جو قوت سے فعل میں آتا نہیں

Scanned by CamScanner

دکھائی دیتا۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ بعض تاریخیں صرف نظم کی ہیں، بعض محض نثر کی۔ بعض پورے اردو ادب کا احاطہ کرتی ہیں، بعض کسی ایک علاقے یا دور کا۔ بعض جامع ہیں تو بعض "راہِ دورِ عشق" کی پہلی منزل ہی میں دم توڑ دیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ "آبِ حیات"، "گلِ رعنا"، "شعر الہند" اور تنہا کی "مرآۃ الشعرا" صرف شاعری کی تاریخیں ہیں۔

۲۔ تنہا کی "سیر المصنفین"، احسن مارہروی کی "تاریخِ نثرِ اردو عرف نمونۂ منثورات" اور حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخ اردو" صرف نثر کی تاریخیں ہیں۔

۳۔ مختلف ادبی اصناف کی تاریخیں شمار سے کہیں افزوں ہیں۔

۴۔ "دکن میں اردو"، "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" اور اس قبیل کی متعدد تاریخیں کسی علاقے تک محدود ہیں۔

۵۔ ابواللیث صدیقی کی "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" اور نورالحسن ہاشمی کی "دلی کا دبستانِ شاعری"، دبستانوں کی مشہور ترین تاریخیں ہیں۔

۶۔ "اربابِ نثرِ اردو"، "مرحوم دلی کالج"، "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" از عبیدہ بیگم، "انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے" از سمیع اللہ اداروں کی تاریخیں ہیں۔

۷۔ شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" اور ڈاکٹر زور کی "اردو شہ پارے" کسی دور کی سب سے مشہور تاریخیں ہیں۔

۸۔ بعض تاریخیں مخصوص گروہوں کے متعلق ہیں مثلاً:

مولوی عبدالحق کی "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"، نصیر حسن خیال کی "مغل اور اردو"، "اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ" از گنپت سہائے شری واستو۔

۹۔ بعض تاریخیں تحریک اور رجحان سے متعلق ہیں، مثلاً:

"ترقی پسند ادب" از سردار جعفری، "علی گڑھ تحریک" مؤلفہ نسیم قریشی، "اردو نثر میں ادبِ لطیف" از ڈاکٹر عبدالودود، "اردو میں تمثیل نگاری" از منظر اعظمی، "اردو کی ادبی تحریکیں اور دبستان" از منظر اعظمی، "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" از ڈاکٹر پرکاش مونس۔

۱۰۔ بعض تاریخیں بنیادی حیثیت سے محض تنقیدی ہیں مثلاً "شعر الہند"، "اردو کی ادبی تاریخ" از سروری اور "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" از احتشام حسین۔

۱۱۔ بعض تاریخوں نے تھوڑے سے صفحات میں ٹھونس ٹھونس کر کثرت سے

Scanned by CamScanner

ادیبوں کے نام بھر دیے ہیں۔ یہ تاریخیں انگریزی میں ہیں یا انگریزی سے ماخوذ ہیں، مثلاً:
"تاریخِ ادبِ اردو" از گراہم بیلی، "تاریخِ ادبِ اردو" مرتبہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدر آباد
اور "کلاسیکی اردو ادب" از اینی میری شِمل۔

اس طرح اور گروہ بھی قائم کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے حتی الامکان علاقے، دور، گروہ وغیرہ کی محدود تاریخوں کو خارج رکھا ہے، عمومی تاریخوں ہی کا جائزہ لیا ہے، خواہ ان میں سے بعض محض نظم یا محض نثر ہی تک کیوں نہ محدود ہوں۔ ایک استثنا شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" ہے جو بنیادی حیثیت سے دکنی ادب کی تاریخ ہے گو اس کے آخری حصے میں برائے بیت شمالی ہند کے بھی چند ادیبوں کے نام آ گئے ہیں۔ چونکہ یہ اردو کی ایک بنیادی تاریخ ہے جس سے بعد کے مؤرخوں نے کافی استفادہ کیا اس لیے میں نے اسے بھی اپنے جائزے میں شامل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر زور کی "اردو شہ پارے" بھی اسی نوعیت کی ہے لیکن اس میں تاریخ کا کساو کم ہے، نمونے دینے پر زیادہ توجہ کی ہے۔ احسن مارہروی کی "تاریخِ نثر اردو" بھی اس لحاظ سے باقاعدہ تاریخ نہیں، نمونوں کا مخزن ہے لیکن اس کی جامعیت نیز ہر فصل کے بعد اس کے مفصل مجموعی جائزے کی وجہ سے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔

میرے جائزے کی بعض تاریخیں نامکمل رہ گئی ہیں لیکن ان کے مواد کی اہمیت کی بنا پر انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہیں عبدالقیوم کی مرتبہ "تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل، "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی "تاریخِ اقلیمِ ادب" دو حصے۔ جمیل جالبی کی تاریخ بھی ابھی محض اٹھارویں صدی کے آخر تک پہنچی ہے لیکن اس کی تصنیف کا عمل جاری ہے، آخرِ کار مکمل ہو کے رہے گی۔

درسی تاریخوں میں سب سے اہم اعجاز حسین کی مختصر "تاریخ ادب اردو" کا ترمیم شدہ ایڈیشن از ڈاکٹر عقیل رضوی ہے۔ اس کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ دوسری کئی تاریخیں ہیں جو بنیادی حیثیت سے درسی ہیں، تحقیقی نہیں۔ وقت اور اطناب کا خیال کر کے میں نے ان کا محض تعارف دیا ہے جو نام شماری سے قدرے ہی زیادہ ہے۔

میں نے اپنے جائزے میں انگریزی میں لکھی گئی تاریخوں کو بھی شامل کیا ہے مثلاً رام بابو سکسینہ، گراہم بیلی، اینی میری شِمل، ڈاکٹر صادق، رالف رسل اور علی جواد زیدی کی تاریخیں۔ رسل کی تاریخ بہ مشکل تاریخِ ادب کہی جا سکتی ہے۔ بقیہ تاریخوں کے مواد کی اہمیت کی بنا پر ان کا بھی جائزہ لیا۔ ڈاکٹر صادق اور علی جواد زیدی کی تاریخیں تو اردو میں لکھی تاریخوں کے مقابل رکھی جا سکتی ہیں۔

میں نے اپنے جائزے میں تحقیقی پہلو کو زیادہ اہمیت دی ہے، تنقیدی پہلو کو نسبتاً

Scanned by CamScanner

کم۔ تحقیقی اور تاریخی اعتبار سے ان کے تسامحات اور ان کی تصحیح پر توجہ مرکوز رکھی ہے تاکہ قارئین کا بھی فائدہ ہو اور ان مصنفوں کا بھی، اگر وہ دوسرا ایڈیشن شائع کریں۔ میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ وہ میری تصحیحات کو لازماً مانیں۔ صرف زیرِ غور لے آئیں، یہ کافی ہے۔

آئندہ اوراق میں اردو کی اہم عمومی تاریخوں کا جائزہ ملاحظہ کیجیے۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(1) James Thorpe (ed.): The Aims and Methods of Scholarship in Modern Languages and Literatures (American Studies Research Centre, Hydrabad.) 2nd edition, reprint Dec. 1979

(2) Rene Wellek and Austin Warren: "General,Comparative and National Literature in: Theory of Literature, London, 1963, P.254

(۳) جمیل جالبی (مرتب و مترجم): ایلیٹ کے مضامین، چوتھا ایڈیشن، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۸۵۔

(4) Rene Wellek: "The Rise of English Literary History," The University of North Carolina Press, 1941.

(5) Douglas Bush: "Literary History and Literary Criticism" in: Literary History and Literary Criticism, editor: Leon Edel, New york University Press, 1965, P.3

(6) Robert Espillar: "Literary History" in: The Aims and Methods of Scholarship, editor: James Thorpe, P.56

(7) Douglas Bush, in: Literary History and Literary Criticism, P.9

(8) Ibid., p.7

(9) Charles Kaplan: "Literary History as Literary Criticism", in: Literary History and Literary Criticism, editor: Leon Edel, P.54

(10) Raymond Tschumi: ' Past and Present in Literature" in: Literary History and Literary Criticism, P.346

(۱۱) وِنے موہن شرما: شودھ پرودھی، ص ۱۳۰

Scanned by CamScanner

دوسرا باب

محمد حسین آزاد: "آبِ حیات"

اردو تحقیق کی تاریخ میں مولانا محمد حسین آزاد کی شخصیت جتنی متنازع فیہ ہے اتنی کسی اور کی نہیں۔ ناواقفوں کے نزدیک "آبِ حیات" اردو کی ادبی تاریخ کی معلومات کا گنجینہ ہے۔ اہلِ نظر کی نظر میں یہ ادب کی تاریخ نہیں، تاریخی افسانوں کا مخزن ہے۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> اکثریت آزاد کی نثاری کی معترف ہے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ تحقیق کے مردِ میدان تھے(۱)۔

انگریزی میں اصول تحقیق پر بہترین کتاب رچرڈ ایلٹک کی ہے۔ وہ ماتم کرتا ہے کہ بعض سوانح نگار حقائق پر لفظی ترصیع کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک پرانا لطیفہ یا واقعہ امتدادِ زمانہ سے بالکل درست مانا جانے لگتا ہے۔ تحقیقی تاریخ ایسے افسانوں سے بھری پڑی ہے جنھیں نیم حقیقت یا غیر حقیقت کہا جانا چاہیے۔ ایک روایتی اور تخئیلی افسانہ تردید کے باوجود اس لیے زندہ رہتا ہے کہ یہ خشک حقیقت کے مقابلے میں بہت خوش رنگ ہوتا ہے(۲)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی "آبِ حیات" پر تبصرہ کر رہا ہو۔ آبِ حیات کے متعدد لطیفوں اور خودساختہ واقعات کی تردید کی جا چکی ہے لیکن وہ اب بھی زندہ و جنبندہ جاری و ساری ہیں۔ کوئی محقق یا نقاد کسی ادیب پر تحقیقی یا تنقیدی مقالہ لکھتا ہے تو عام طور پر اس سے ہم دردی، بلکہ جنبہ داری سے کام لیتا ہے لیکن آزاد کے محقق ڈاکٹر اسلم فرخی کو یہ لکھنے پر مجبور ہونا پڑا:

> آزاد دراصل واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کے لیے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ ضروری سمجھتے تھے۔ یہ بات انشاپردازی کے معیار سے تو درست ہو سکتی ہے لیکن ادبی تاریخ اس تقاضے کی متحمل نہیں ہو سکتی، خصوصاً جب کہ اضافے سے اصل واقعے کا رخ بدل جانے کا اندیشہ ہو۔ اس قسم کے اضافے آزاد نے جابجا کیے ہیں

Scanned by CamScanner

اور اگر پوری تفصیل کے ساتھ ایسے تمام اضافوں کی نشان دہی کی جائے تو "آبِ حیات" کی ضخامت کی کتاب تیار ہو سکتی ہے(۳)۔

فرخی نے سنبھلے ہوئے الفاظ میں جس روش کو اضافے کا نام دیا ہے وہ دراصل خیالی اختراعات ہیں۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

آزاد کی عام روش ہے کہ اشعار دیکھ کر حکایات وضع کر لیتے ہیں۔(ص۲۰۱)

آزاد کو کتاب کو دلچسپ بنانے کی چاٹ تھی۔ تاریخی ناول میں بنیادی کردار اور واقعات تاریخی ہوتے ہیں۔ ضمنی کرداروں، واقعات اور ان کی تفصیلات کو ناول نگار اختراع کرتا ہے۔ آزاد نے بھی شعرا کی سوانح کو تاریخی ناول کے انداز پر تخلیق کیا۔ لطیفوں کے ذریعے بات کو چٹ پٹی بنانا، نمک مرچ لگا کر معرکے اختراع کرنا ان کے مشرب میں جائز، بلکہ مستحسن تھا۔ یہ سب محض دلچسپی کی خاطر ہی نہ تھا۔ افسوس کہ وہ نہ تحقیقی صحت پر ایمان رکھتے تھے نہ غیر جانب داری پر۔ انھوں نے اپنے پسندیدہ شعرا کے لیے تحسینی واقعات وضع کیے۔ جنھیں ناپسند کرتے تھے ان کو نااہل ثابت کرنے کو، نیز ان کی کردار کشی کی خاطر تنقیص آمیز حکایات کے جھاڑ کھڑے کر دیے۔ ان کا محبوب مشغلہ حریفوں کے معرکے اختراع کرنا تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بیان کردہ معرکوں میں سے بڑی تعداد ان کے خلاق ذہن کی پیداوار ہے۔ ان معرکوں کی تصنیف کا مقصد ان شعرا کو ختم کرنا ہے جو مصنف کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔

آزاد کو تحقیق کے جو مواقع میسر تھے، انھوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا، تلاش و تدقیق نہ کی۔ جو کچھ مواد ملا اسے چھان پھٹک کے بغیر استعمال کر لیا۔ بارہا سنہ اور تاریخ لکھنے میں سہو کیا، اشعار کا غلط انتساب کیا۔ دوسرے تذکروں سے جو کچھ لیا، اس کا حوالہ نہ دیا۔ انھوں نے جن معرکوں کا بیان کیا ہے ان میں سے بعض کا ذکر ان کے پیش رو تذکروں میں ملتا ہے۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے واقعات کو تاریخی اعتبار سے کتنا مسخ کیا۔ انھوں نے اپنے ماخذ کی نشان دہی نہیں کی لیکن محققوں نے اکثر معرکوں کی اصل دریافت کر لی۔

جیسا کہ اسلم فرخی نے لکھا ہے، اغلاط "آبِ حیات" کی تفصیل دی جائے تو آبِ حیات کے برابر کی، بلکہ شاید اس سے بھی بڑی کتاب وجود میں آ جائے۔ میرے جائزے میں اتنی سمائی نہیں۔ "آبِ حیات" کی اغلاط کی نشان دہی پانچ حضرات نے خاص طور پر کی ہے:

۱۔ حکیم عبدالحی نے "گلِ رعنا" میں۔

۲۔ محمود شیرانی نے آزاد کے پوتے آغا محمد باقر کی تحریک پر، "تنقید بر آبِ حیات

" کا سلسلہ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور میں شروع کیا۔ تین قسطیں اگست ۱۹۴۱ء، نومبر ۱۹۴۱ء اور فروری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئیں۔ آغا صاحب نے سوچا ہوگا کہ شیرانی "آبِ حیات" کی مدح میں رطب اللسان ہوں گے لیکن انھوں نے ان کے علی الرغم غلطیوں کی فہرست مرتب کردی۔ اس پر آغا باقر کبیدہ خاطر ہوگئے جس کی وجہ سے شیرانی نے یہ سلسلہ بیچ ہی میں ختم کردیا جب کہ وہ محض میر ضاحک تک پہنچے تھے۔ افسوس! حکیم آزاد انصاری کا شعر کچھ اس طرح ہے:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی

خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

۳۔ قاضی عبدالودود نے اپنا مضمون "آزاد بحیثیت محقق" تین قسطوں میں لکھا جو "نوائے ادب" شمارہ ۲، ۳، ۴، ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں پٹنہ سے ۱۹۸۴ء میں چھاپ دیا؛ فی الحال یہی میرے سامنے ہے۔ اس میں مضامین کی عجب بے ترتیبی ہے۔ "آبِ حیات" پر سلسلے وار تنقید نہیں کی، جو کچھ مل گیا، کہیں بھی لکھ دیا۔

۴۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنی کتاب "محمد حسین آزاد"، کراچی ۱۹۶۵ء میں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ دوسری جلد میں "آبِ حیات" پر ۳۳۵ صفحات لکھے ہیں۔ ان میں سے بیش تر کا موضوع اغلاط کی نشان دہی ہے۔ فرخی نے شیرانی اور قاضی صاحب سے بھرپور استفادہ کیا ہے، لیکن حسبِ موقع حوالہ نہیں دیا۔

۵۔ ڈاکٹر عابد پیشاوری نے اپنی تین کتابوں "انشا کے حریف و حلیف" (الہ آباد، ۱۹۷۹ء)، "انشاءاللہ خاں انشا" (لکھنؤ، ۱۹۸۵ء) اور "ذوق اور محمد حسین آزاد" (دہلی، ۱۹۸۷ء) میں۔

"آبِ حیات" کے دفاع میں سب سے اہم کتاب سید مسعود حسن رضوی کی "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور اضافہ شدہ طبعِ دوم ۱۹۶۴ء میں۔ ڈاکٹر محمد صادق کا مضمون "آزاد کی حمایت میں" "صحیفہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا، میری نظر سے نہیں گزرا۔

ذیل کے جائزے میں سب سے زیادہ استفادہ قاضی عبدالودود کے کتابچے، اسلم فرخی کی کتاب نیز عابد پیشاوری کی "ذوق اور محمد حسین آزاد" سے اٹھایا گیا ہے۔

"آبِ حیات" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء کے آخر میں اور دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن مئی ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا (مکتوبات آزاد، ص۱۹، بحوالہ فرخی، جلد ۲، ص ۱۴)۔ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں نے از خود نئی معلومات فراہم کیں، کچھ دوسری اطلاعات آزاد نے

Scanned by CamScanner

کچھ لوگوں کو خط لکھ کر حاصل کیں۔ اس طرح طبعِ دوم کے کئی اضافوں کا ماخذ معلوم ہو گیا ہے لیکن بعض اضافے اتنے معدود نہیں۔ بعد کے تمام ایڈیشن طبعِ دوم کی نقل ہیں۔ دوسرے ایڈیشن کے اضافوں کی تفصیل اسلم فرخی نے اپنے مقالے کی جلد دوم میں ص ۱۴ تا ص ۲۸ پر دی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ میر ضاحک، میر حسن، خلیق، مومن، دبیر اور انیس کے حالات پہلی بار دوسرے ایڈیشن میں پیش کیے گئے۔ ناسخ اور ذوق کے حالات از سرِ نو لکھے۔ بعض اہم اضافے یہ ہیں:

جرأت کی نابینائی کے سلسلے میں طبعِ اوّل میں بعض روایات کو مشکوک قرار دیا تھا۔ طبعِ ثانی میں انھیں یقینی بنا دیا۔ انشا کی وفات پر بسنت سنگھ نشاط کا مشہور قطعۂ تاریخ دیا۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کے نمونے کا اضافہ کیا۔ انشا کے بارے میں شیفتہ کا مشہور فقرہ نقل کیا، "ہیچ صنف را بہ طریقِ راسخ شعرا نہ گفتہ۔" ناسخ کے سلسلے میں رعنی کی بیان کردہ حکایات کا اضافہ کیا۔ سب سے زیادہ اضافے ذوق کے حالات میں کیے یعنی غلام رسول شوق کے کلام کا نمونہ دیا، الٰہی بخش معروف کے مفصّل حالات لکھے، ذوق کے انتقال کے متعلق ذاتی واقعہ درج کیا، حکیم آغا جان عیش اور بدبد کے حالات حاشیے میں دیے، بادشاہ کی غزل کہنے کا طریقہ، ایک انگریز سے گفتگو یہ سب طبعِ ثانی کی اوّلیات میں ہیں۔ اسی ایڈیشن میں غالب کی پنشن کی تفصیلات دیں۔

میں نے اوپر اسلم فرخی کا قول نقل کیا ہے کہ "آبِ حیات" کے بعد کے تمام ایڈیشن طبعِ دوم کی نقل ہیں۔ یہ کہنا صحت سے زیادہ قریں ہوگا کہ آزاد نے طبعِ دوم کے بعد کوئی ترمیم نہیں کی لیکن دوسرے تو سہواً کر سکتے ہیں۔ "آبِ حیات" کے ایڈیشنوں میں آتش و ناسخ کی غزلیں "یار میں"، "بیمار میں" کی زمین میں دی ہوئی ہیں جن میں آزاد کو اعتراض ہے کہ ردیف "پر" ہونی چاہیے لیکن رشید حسن خاں نے ۱۸۹۹ء کے ایڈیشن میں اسے "کو" پایا جو آتش و ناسخ کے دواوین کے مطابق ہے۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

> جو اشاعتیں ۱۹۰۰ء سے پہلے کی ہیں، اُن میں اور بعد کی اشاعتوں میں زیادہ اختلافات ہیں۔
>
> ("ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، علی گڑھ ۱۹۷۸ء، ص ۱۲۱)۔

رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ آزاد کے ورثا صاحبِ قلم تھے، انھوں نے ترمیمیں کی ہوں گی۔ میرا قیاس ہے کہ مختلف ایڈیشنوں میں کچھ اختلافات ہیں تو ان کی نوعیت سہوِ کتابت سے زیادہ نہ ہوگی۔

آزاد نے تذکروں سے بہ کثرت استفادہ کیا لیکن کس کس تذکرے سے کس کس مقام

Scanned by CamScanner

پر، اس کا حسبِ موقع حوالہ نہیں دیا۔ انھوں نے "نکات الشعرا"، تذکرۂ سودا اور غالباً مصحفی کا "تذکرۂ ہندی گویاں" نہیں دیکھا لیکن ظاہر ایسے کرتے ہیں جیسے ان سب کو دیکھ چکے ہیں۔ سب سے زیادہ استفادہ قاسم کے "مجموعۂ نغز" سے کیا ہے جس کی تفصیل محمود شیرانی نے "مجموعۂ نغز" کے دیباچے میں دی ہے لیکن آزاد نے حسبِ دل خواہ قاسم کے بیانات میں ترمیم و تحریف کی ہے۔ قاضی عبدالودود نے دھیان دلایا کہ آزاد "گل زارِ ابراہیم" کو التزاماً "گل زارِ ابراہیمی" لکھتے ہیں، مثلاً ص ۲۰۳، ۲۵۷ پر [قاضی نمبر ۵۶]۔

آزاد نے اردو ادب کی تاریخ کے لیے محض نظم کی تاریخ کا انتخاب کیا۔ حسنِ اتفاق سے انگریزی ادب کی پہلی تاریخ ٹامس وارٹن کی "ہسٹری آف انگلش پوئٹری" بھی نظم تک محدود ہے۔ اردو میں تذکرے بھی محض شعرا سے متعلق ہوتے تھے، اس لیے آزاد نے محض شاعروں کو آبِ دوام کا اہل سمجھا۔

انھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کی تاریخ لکھی۔ آج کی تاریخی لسانیات کے لحاظ سے یہ تاریخ مبتدیانہ ہے، اس میں کچھ اغلاط بھی ہیں لیکن آزاد کے زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ بسا غنیمت ہے۔ انھوں نے اردو کو برج سے ماخوذ کیا۔ ان سے پہلے دو مستشرق ماہرینِ لسانیات بھی ایسا کر چکے تھے۔ میکس ملر اپنے خطبات "سائنس آف لینگویجز" میں اور ان کے معاصر ڈاکٹر ہارنلے "مشرقی زبانوں کی قواعد" میں۔ اسلم فرخی مطلع کرتے ہیں کہ عبدالحیٔ صفا بدایونی نے اپنے تذکرے "شمیمِ سخن" میں اردو زبان کی تاریخ کے بارے میں انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے اور اردو کو برج سے ماخوذ کیا ہے۔ "شمیمِ سخن" ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں مرتب ہوئی اور ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ آبِ حیات کی تاریخ ۱۸۸۰ء ہے۔ دونوں میں سے کسی نے دوسرے کے بیان سے استفادہ کیا ہے۔ اگر آزاد کو "شمیمِ سخن" اشاعت سے پہلے ہی دیکھنے کو مل گئی ہو تو آزاد نے نقل کی ہے، بصورتِ دیگر صفا نے "آبِ حیات" کی اشاعت کے بعد اپنی کتاب میں "اردو زبان کی تاریخ" کا باب لکھا ہوگا۔ اردو کو برج سے ماخوذ کرنا صحیح نہیں۔ اس کے باوجود اردو زبان کی تاریخ اور انشا پردازی پر مشاہداتِ آزاد کی اوّلیات میں ہیں۔

تاریخ کے سلسلے میں ایک اہم تسامح کا ذکر کرتا چلوں۔ "نوطرزِ مرصع" کی تکمیل ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ میں دکھائی ہے (طبعِ دوازدہم، لاہور، ص ۲۵)۔ قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی کہ آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ میں ہوا [قاضی نمبر ۲۰۶]۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے خیال میں یہ شجاع الدولہ کی وفات (۱۷۷۵ء) سے پہلے مکمل ہو چکی تھی (مقدمۂ نوطرزِ مرصع، الہ آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۳۰)۔ یہ شعر سودا سے منسوب کیا ہے:

Scanned by CamScanner

رستم رہا زمین پہ نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

(ص ۱۴۱)

کلیاتِ سودا، مرتبہٗ آسی میں یہ غزل موجود ہے لیکن قاضی عبدالودود کی رائے میں کلیات کے معتبر نسخے اس سے خالی ہیں جب کہ دیوانِ سوز کے دو نسخوں میں موجود ہے [قاضی نمبر ۲۰۷]۔

شعرا کے تذکرے اور تاریخِ ادب کا مابہ الامتیاز ادیبوں کو تاریخی ترتیب سے بیان کرنا ہے۔ اس کی سہولت کے لیے دور قائم کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر وِنے موہن شرما اپنی ہندی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ادبی تاریخ کے ادوار کی تقسیم ایسا مسئلہ ہے جو کبھی حل نہ ہو سکے گا۔
> ادب کی تاریخ ملک کی تاریخ کے ساتھ چلنی چاہیے۔
>
> (شودھ پرودھی، دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۰)

"آبِ حیات" سے پہلے بھی کئی اردو تذکروں میں ادوار یا طبقات کی تقسیم دکھائی دیتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر قائم، میر حسن اور کریم الدین کے تذکرے ہیں۔ کریم الدین نے پانچ طبقے قائم کیے ہیں۔ اسلم فرخی نے اطلاع دی ہے کہ قربان علی بیگ سالک نے بھی اسی طرح پانچ ادوار قائم کیے اور آزاد نے ان سے خصوصی استفادہ کیا۔ "آبِ حیات" میں پانچ ادوار کی یہ تقسیم قائل نہیں کرتی، مثلاً پہلے دور میں آبرو اور مضمون ہیں، دوسرے دور میں شاہ حاتم اور خان آرزو۔ ان دونوں ادوار کی تقسیم بالکل مصنوعی ہے۔ چوتھے دور میں جرأت، میر حسن، نسیم، انشا اور مصحفی ہیں جب کہ پانچویں دور میں خلیق، ضمیر، آتش، ناسخ، مومن، ذوق اور غالب ہیں۔ ان میں بھی کوئی واضح زمانی بُعد نہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ولی سے لے کر غالب و میر انیس تک تقریباً ڈیڑھ سو سال کا زمانہ ہر لحاظ سے محض ایک اور ایک ہی دور ہے۔ سیاسی، اقتصادی، سوشل، ادبی کسی لحاظ سے کوئی ایسی تبدیلی واقع نہیں ہوئی کہ کوئی پرانا دور ختم ہوتا ہوا اور نیا دور شروع ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہو۔ ادب کی روایات، ادراک، طرزِادا کی اقدار، مضامین کی نوعیت، اصنافِ ادب کسی میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ آزاد نے ڈیڑھ سو سال کو جو اپنے تمام صفات

Scanned by CamScanner

میں ایک تھے، دس دس بیس بیس برس کا وقفہ دے کر خواہ مخواہ
کاٹ کر پانچ ٹکڑے کر دیے۔

("اردو میں تنقید"، ص ۳۲-۳۱، بحوالۂ فرخی، جلد ۲، ص ۱۰۷)

بعض شعرا کی تاریخی ترتیب میں بھی قدرے گڑبڑ ہو گئی ہے مثلاً شاہ مبارک آبرو پہلے دور میں ہیں اور ان کے استاد خان آرزو دوسرے دور میں۔ یک رنگ پہلے دور میں اور جانِ جاناں مظہر تیسرے دور میں ہیں۔ یک رنگ نے بقولِ آزاد مرزا مظہر سے اور بہ قیاسِ قاضی عبدالودود آرزو سے مشورۂ سخن کیا۔ دراصل دوسرے دور کے شاہ حاتم و خانِ آرزو اور تیسرے دور کے مرزا مظہر کو پہلے دور ہی میں رکھنا چاہیے تھا۔ چوتھے اور پانچویں دور کا فرق بہت باریک، بلکہ غیر ضروری ہے۔ دیا شنکر نسیم کا ذکر چوتھے دور میں میر حسن کے سلسلے میں ہے۔ یہ پانچویں دور کے فرد ہیں۔ خلیق، ضمیر، فصیح اور شاہ نصیر کو پانچویں دور میں رکھا ہے جب کہ چوتھے دور میں رکھنا بہتر ہوتا لیکن ان سب میں بجز خلیق کے باقی کسی کو نیا باب اور نیا عنوان نہیں دیا بلکہ کسی دوسرے شاعر کے تحت ہی رکھا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ پہلے، دوسرے اور تیسرے دور یعنی اٹھارویں صدی کو ایک دور قرار دینا چاہیے تھا اور چوتھے اور پانچویں دور یعنی انیسویں صدی کو ایک دور۔ اس طرح کُل دو دور ہوتے۔

"آبِ حیات" میں شاعروں کا شمول اور حذف بھی پوری طرح اطمینان بخش نہیں۔ پہلے ایڈیشن میں میر ضاحک، میر حسن، خلیق، ضمیر، انیس، دبیر اور مومن کو شامل نہ کیا تھا۔ ان میں ضاحک کے علاوہ بقیہ کو بزم سے باہر رکھنا خوش مذاقی نہیں۔ مومن کے حذف پر سخت اعتراض کیے گئے۔ آزاد نے یہ عذر لنگ تراشا کہ انھیں مومن کے حالات دست یاب نہ ہو سکے تھے، حالانکہ مومن کے انتقال کے وقت یہ جوان تھے اور اسی شہر دہلی میں تھے۔ اب بھی افضل صاحبِ "بکٹ کہانی"، نظیر اکبر آبادی، واجد علی شاہ اختر، قلق اور نواب مرزا شوق کو جگہ نہیں دی۔

کتاب کے شروع میں جو فہرستِ مطالب ہے اس میں مندرج اسامی متن کی صحیح آئینہ داری نہیں کرتے۔ ایک شاعر کے بیان میں جن شعرا کا ضمنی طور پر ذکر آ گیا ہے، فہرست میں انھیں بھی علاحدہ عنوان کے طور پر ٹانک دیا ہے، مثلاً میر کلّن پاک باز، شاہ تسلیم، محمد امان نثار، میاں ہدایت، فدوی، قائم، بقا، فاخر مکین، مجذوب خلف سودا، میر مہدی حسن فراغ، میر اثر، میر خاں کمترین، جعفر علی حسرت، دیا شنکر نسیم، میر ماشاء اللہ خاں مصدر، شیخ ولی اللہ محب، عظیم وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے لیے صراحت کر دی ہے کہ وہ حاشیے پر ہیں، بعض کے لیے نہیں کی۔ معلوم نہیں یہ فہرست خود آزاد نے بنائی تھی یا کسی اور نے؟

Scanned by CamScanner

بہرحال ناقص ہے۔ متن میں میر ضاحک جیسے غیر اہم شاعر کو علاحدہ باب اور عنوان دینا عجب ہے جب کہ قائم کو حاشیے پر، میر اثر کو درد کے اندر اور دیا شنکر نسیم کو میر حسن کے بیچ ٹرخا دینا عدمِ توازن ہے۔ آزاد نے جن شعرا کو غیر اہم سمجھا ان کے حالات حاشیے (فٹ نوٹ) میں دیے جو بعض اوقات ایک سے زیادہ صفحوں میں چلے جاتے ہیں۔ حاشیے کا یہ غلط استعمال ہے۔ اس میں پُرمغز مواد نہیں آنا چاہیے۔ اسے متن میں یا پھر آخر میں ضمیمے میں جگہ دی جانی چاہیے۔

اب شعرا کے حالات پر صفحہ بہ صفحہ نظر ڈالتا ہوں لیکن اختصار کے ساتھ۔ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور اسلم فرخی اس کام کو تفصیل سے سرانجام دے چکے ہیں۔ میں اتنی شرح و بسط سے نہیں لکھ سکتا، صرف اہم تسامحات کا ذکر کروں گا۔ ع:

لود پھٹکری مُردہ سنگ

اس منظوم لٹکے کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے (ص ۷۱)، لیکن سید سلیمان ندوی نے "نقوشِ سلیمانی" میں "معدن المعانی" کے حوالے سے شرف الدین یحییٰ منیری کا قرار دیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

خسرو کی "خالقِ باری" اصلاً کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی (ص ۷۱)، قاضی عبدالودود نے لکھا کہ یہ بات کسی اور نے نہیں کہی اور اس میں بہت بڑا مبالغہ ہے (نمبر ۲۹۲)۔

امیر خسرو کے حالات ص ۷۱ تا ص ۸۷ پر ہیں۔ خسرو سے متعدد ہندی اردو تخلیقات منسوب کر کے "آبِ حیات" اردو کی تاریخ میں ایک غلط بیانی کو رائج کرنے کی ذمے دار ہے۔ ان تخلیقات کا لسانی جائزہ لیا جائے تو ان میں سے کوئی بھی عہدِ خسرو کی نہیں، ان کا ذکر انیسویں صدی یا زیادہ سے زیادہ اٹھارویں صدی کے اواخر سے پہلے نہیں ملتا۔ قاضی عبدالودود نے بجا طور پر انھیں بازاری گپیں کہا ہے [نمبر ۲۶۳]، چمو سے متعلق لطیفے پر وہ اعتراض کر چکے ہیں کہ خسرو کے زمانے تک تمبا کو مغرب سے نہیں آیا تھا، حقے کا کیا سوال ہے [قاضی نمبر ۲]۔ اس کے لیے جو دو ہندی اشعار کہے ہیں ان کی زبان اٹھارویں صدی سے قدیم تر نہیں۔ "زحالِ مسکیں" والے ریختے پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ شیرانی نے انکشاف کیا کہ یہ ایک قدیم بیاض میں جعفر کے نام سے درج ہے۔ خسرو کے سلسلے میں کسی حامد کی تصنیف "حامد باری" کا ذکر کیا ہے (ص ۸۷)۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے سراغ لگایا کہ اس شاعر کا نام حامد باری تھا، حامد نہیں (۴)۔

سودا نے ایک قصیدے میں ایہام گویوں کی شکایت کی، جس کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:

Scanned by CamScanner

سو نہ ہو پرورشِ شانہ تو پھر ہے موسَل
رام پور کی ہو کٹاری تو کہیں سیتا پھل

(ص ۸۱)

قاضی عبدالودود نے صراحت کی کہ یہ مخمس ہے، قصیدہ نہیں جو فاخر مکین کے بارے میں ہے۔

مندرجۂ بالا شعر کے دونوں مصرع دو مختلف بندوں کے پانچویں مصرع ہیں [نمبر ۱۱۱]، ص ۸۸ پر ولی کو نظمِ اردو کی نسل کا آدم یعنی پہلا شاعر کہا ہے۔ اگر قدیم تذکروں کو توجہ سے دیکھتے تو ان میں ولی سے پہلے کے کئی دکنی شعرا کا ذکر ہے مثلاً احمد گجراتی، غواصی وغیرہ۔ قائم نے عبداللہ قطب شاہ کا اور میر حسن نے غواصی کا زمانہ بھی درج کیا ہے۔ آزاد نے ولی کا نام شمس ولی اللہ لکھا۔ قاضی صاحب نے تصحیح کی کہ شمس ولی کے نام کا جزو نہیں [نمبر ۱۰۱] ۔ آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ولی "قواعدِ عروض کی طرح زبانِ عربی سے ناواقف تھے،" (ص ۸۹)۔ قاضی صاحب نے سوال کیا کہ ولی کا کوئی شعر غیر موزوں نہیں [نمبر ۱۰۳]، اور ان کے بقول یہ بھی غلط ہے کہ ولی عربی نہیں جانتے تھے [نمبر ۱۰۴]۔

لکھتے ہیں: "وہ مع اپنے دیوان کے سنہ ۳ محمد شاہی میں دلی پہنچے،" (ص ۹۲)۔ آزاد شاہ حاتم کے بیان میں اس واقعے کو مصحفی کے تذکرے کے حوالے سے لکھتے ہیں لیکن وہاں ولی کے آنے کا نہیں، بلکہ محض دیوان کے آنے کا ذکر کرتے ہیں (ص ۱۱۴)۔ شیرانی نے "تنقید بر آبِ حیات" میں دکھایا کہ "تذکرۂ ہندی" میں سنہ ۲ محمد شاہی میں ولی کے دیوان کے دلی میں آنے کا ذکر ہے، ولی کے آنے کا نہیں ("مقالاتِ شیرانی"، جلد سوم، ص ۶۸)۔ خود آزاد نے ستمبر ۱۸۶۷ء میں شاہ حاتم پر اپنے مضمون میں سنہ ۲ لکھا ہے۔ معلوم نہیں "آبِ حیات" میں یہ سنہ ۳ کیوں کر ہو گیا۔

ولی کے دیوان کے لیے لکھتے ہیں، "یہاں تک کہ پیرس اور لندن میں چھپ گیا ہے،" (ص ۹۳)۔ قاضی صاحب نے صراحت کی کہ دیوان صرف پیرس میں چھپا تھا، لندن میں نہیں چھپا [نمبر ۲۰۴]۔

آزاد نے یہ شعر ولی سے منسوب کر کے تحقیق ستم کیا:

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

قاضی عبدالودود نے انکشاف کیا کہ تذکرۂ گلشنِ گفتار میں یہ شعر مضمون کی غزل میں

Scanned by CamScanner

اس متن کے ساتھ دیا ہے:

اس گدا کا دل لیا ولی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اور "چمنستانِ شعرا" میں ص ۲۵۷ پر مضمون کے نام سے یوں ہے:

اس گدا کا دل لیا دلی میں چھین
کوئی کہے جا کر محمد شاہ سوں

[قاضی نمبر ۵]

ولی کی تصانیف میں ایک مثنوی مختصر "معرکۂ کربلا کے حال میں" کا بھی نام لیتے ہیں (ص ۹۳)۔ قاضی صاحب نے صراحت کی کہ ولی نے ایسی کوئی مثنوی نہیں لکھی [نمبر ۲۳۴] شاید آزاد نے ولی ویلوری کی مثنوی "روضۃ الشہدا" سے التباس کیا۔

آبرو کے احوال میں پیر مکھن پاک باز کا نام لیتے ہیں (ص ۹۷)۔ قاضی صاحب نے تصحیح کی کہ "پیر" کی جگہ "سیر" چاہیے [نمبر ۲۰۳]۔

مضمون کے وطن کا نام جاجمئو، علاقہ اکبر آباد لکھا ہے (ص ۱۰۱)۔ قاضی صاحب کے بقول صحیح نام جاجو ہے اور یہ ضلع کان پور میں ہے [قاضی نمبر ۱۰۵]۔ ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ استاد مرحوم (ذوق) نے فرمایا کہ مضمون کے زمانے میں کوئی امیر باہر سے محل میں آیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایک بڑھیا ماما حقہ بھر لائی۔ نواب صاحب نے مضمون کا شعر پڑھا:

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

ماما سن کر بولی: اس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت پڑ رہا ہے۔ بے چارے نوکروں پر کیا گزرے گی۔ چلو یہاں سے ... اسی مضمون کو مخلص کاشی نے بھی باندھا ہے (ص ۱۰۲)۔

عابد پیشاوری معترض ہیں کہ برسوں پہلے کا واقعہ ذوق سے اس طرح روایت کرایا ہے جیسے ان کا چشم دید رہا ہو۔ پھر مضمون کا گھر کیا سرائے تھا کہ کوئی بھی راہ گیر داخل ہو کر سیدھا پلنگ پر لیٹ جائے اور ماما حقہ بھر لائے۔ آزاد کا اصل مقصد یہ دکھانا تھا کہ مضمون نے یہ مضمون مخلص کاشی سے سرقہ کیا ہے ("ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص ۷-۶)۔

"احسن تخلص، محمد احسن نام (ص ۱۰۶)۔ قاضی عبدالودود نے تصحیح کی کہ صحیح نام احسن اللہ تھا جو خود "آبِ حیات" میں اسی صفحے پر مندرج ایک شعر میں موجود ہے [قاضی نمبر ۲۰۹]۔

Scanned by CamScanner

یک رنگ کے لیے لکھتے ہیں، "آخرِ عمر میں کلام اپنا مرزا جانِ جاناں مظہر کو بھی دکھاتے تھے۔" (ص۱۰۶)۔

قاضی صاحب کے مطابق تلمذِ مظہر کی کوئی قابلِ وثوق سند نہیں۔ بعض اسناد سے وہ آرزو کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں [نمبر۱۰۶]۔

شاہ حاتم کے لیے لکھتے ہیں، "ماہِ رمضان ۱۲۰۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے... مگر مصحفی نے تذکرۂ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے۔" (ص۱۱۹)۔ قاضی صاحب نے واضح کیا کہ "عقدِ ثریا" میں الفاظ میں لکھا ہے: یک ہزار و نود و ہفت۔ آزاد نے جو ۱۲۰۷ھ لکھی ہے اس کی کوئی سند نہیں [قاضی نمبر۱۵]۔ خان آرزو کے شاگردوں میں مرزا مظہر کا نام بھی شامل کر دیا ہے (ص۱۲۱)۔ بقولِ قاضی صاحب آرزو نے "مجمع النفائس" میں مظہر کے سلسلے میں یہ نہیں لکھا [نمبر۲۷۳]۔

خان آرزو کو اس شعر کا مصنف بنا دیا ہے:

اس زلفِ سیہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے

حاشیے میں لکھتے ہیں کہ انشا نے "دریائے لطافت" میں اس شعر کو قزلباش خاں امید کے نام پر لکھا ہے اور بعض تذکروں میں میر معز فطرت کے نام سے ہے (ص۱۲۲)۔ قاضی صاحب نے تصحیح کی کہ انشا نے اسے امید کے نام سے نہیں، فطرت کے نام سے لکھا ہے [نمبر۶]۔ مندرجۂ بالا شعر کی طرح حسبِ ذیل کو بھی آرزو سے منسوب کیا ہے:

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا

مےَ گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

(ص۱۲۲)

قاضی عبدالودود نے واضح کیا کہ کلیاتِ میر اور متعدد تذکروں کے مطابق یہ شعر میر کا ہے [قاضی ص۲]۔

اشرف علی خاں فغاں سے متعلق دونوں حکایتیں غیر معتبر ہیں۔ قاضی عبدالودود کے مطابق "جگنوسیاں... تالیاں،" والا شعر دیوانِ فغاں کے کسی نسخے میں نہیں ملتا [قاضی نمبر۱۲۹] فغاں راجا شتاب رائے ناظمِ عظیم آباد کے دربار میں چلے گئے تھے۔ وہاں بقولِ آزاد شتاب رائے نے فغاں سے پوچھا کہ احمد شاہ درانی ملکہ زمانی کو کیوں کر لے گیا۔ شیرانی اور قاضی عبدالودود دونوں کا خیال ہے کہ یہ مکالمہ محض افسانہ ہے۔ شیرانی نے یہ بھی واضح کیا کہ احمد شاہ ملکۂ زمانی کو نہیں لے گیا تھا، اس کی سوتیلی بیٹی کو عقد کر کے لے گیا تھا۔ ملکۂ زمانی اپنی

Scanned by CamScanner

مرضی سے بیٹی کے ساتھ چلی گئی۔ اس سے قطع نظر قاضی عبدالودود کی رائے میں راجا شتاب رائے ایک شائستہ آدمی تھا۔ وہ شاہی خاندان کی ایک خاتون کے بارے میں شاید ہی ایسا کہتا [نمبر ۱۲۵]۔

تیسرے دور کی تمہید میں قدیم زبان کے نمونوں کے طور پر بہت سے اشعار لکھے ہیں۔ ان میں بعض کا انتساب غلط ہے، مثلاً:

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(ص ۱۳۳)

اس شعر کو سودا کا کہا ہے لیکن قاضی صاحب کے مطابق تذکرۂ میر حسن، "گلزارِ ابراہیم" میں یہ شیدا شاگردِ سودا کے نام پر ہے اور یہ درست ہونا چاہیے [قاضی نمبر ۲۳]۔

خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑمت، مرنے کے بعد از بھی
دِلا، آیا جو تُو اِس میکدے میں، جام لیتا جا!

(ص ۱۳۴)

قاضی صاحب کے مطابق یہ شعر سودا کا نہیں، میر سوز کا ہے (ص ۲۱۱)۔ اس تمہیدی بیان کے آخر میں لکھتے ہیں، "منشی احمد حسن خاں، میر تقی مرحوم کے شاگردِ رشید تھے،" (ص ۱۳۶)۔ قاضی صاحب نے دعویٰ کیا کہ تذکروں میں کسی احمد حسن شاگردِ میر کا نام نہیں۔

مظہر جانِ جاناں کو "آبِ حیات" میں جگہ دیتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں لکھتے ہیں:

اگرچہ نظم کے جوش و خروش اور کثرتِ کلام کے لحاظ سے میر اور سودا کے ساتھ ان کا نام لیتے ہوئے تأمل ہوتا ہے۔ (ص ۱۳۷)

اس اعتذار کی ضرورت نہ تھی کیونکہ مظہر استاذالاساتذہ تھے۔ آزاد ان کے نسب کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

دادی اسد خاں وزیرِ عالم گیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پرداد سے اکبر بادشاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ (ص ۱۳۷)

نثار احمد فاروقی نے مرزا مظہر کے خلیفہ خاں شاہ غلام علی تشنہ کی کتاب "۔۔۔ تِ مظہری"، (ص ۱۴) کے اِس اقتباس کی طرف توجہ دلائی:

Scanned by CamScanner

معروف امیر عبدالسبحان کہ بہ دو واسطہ نواسۂ اکبر بادشاہ شوند جدِ آں حضرت اند ... جدۂ شریفہ آں حضرت دختر اسد خاں وزیر۔

(فاروقی، "دیدہ و دریافت"، دلی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۹۱)

یعنی مرزا مظہر کی دادی اسد خاں کی بہن نہیں، بیٹی تھیں۔ مرزا مظہر کے جد امیر عبدالسبحان دو واسطوں سے اکبر بادشاہ کے نواسے تھے، اس کے جو بھی معنی ہوں۔ آزاد کو مرزا مظہر سے شاید کوئی کد تھی کہ (ص ۱۴۳) کے فٹ نوٹ میں بغیر کسی سند کے لکھ دیا کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی۔ ان کے قاتل کے مذہب کے بارے میں آزاد نے جو توڑ مروڑ کی ہے، وہ افسوس ناک ہے۔ لکھتے ہیں کہ قاسم اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ قاتل سنّی تھا (ص ۱۴۳)۔ اس وقت تک "مجموعۂ نغز" شائع نہیں ہوا تھا۔ آزاد نے سوچا ہوگا کہ جو کچھ قاسم سے منسوب کر دیا جائے، کون گرفت کرے گا۔ محمود شیرانی نے "مجموعۂ نغز" کے دیباچے میں انکشاف کیا کہ قاسم کا منشا اس کے بالکل برعکس ہے۔ (دیباچہ، ص ھ)، [قاضی نمبر ۳]۔

اس سے پہلے آزاد نے ایک اور حرکت کی ہے جس کی طرف قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی۔

انشا نے مظہر جانِ جاناں سے ملاقات کی تفصیل میں لکھا ہے: "سرِ ایں بے لیاقت را در کنارِ خود گرفتہ بہ پہلوے خود جا دادند۔" اس پر آزاد فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

> افسوس ہے اہلِ وطن کے خیالات پر، جنھوں نے ایسی ایسی لطافتِ طبع کی باتیں دیکھ کر ازرُوے اعتقاد آخر میں ایک طرّہ اور بڑھایا یعنی: قاتل ہم جوانے صبیح و ملیح بود کہ بدستش جاں سپردند، یا شاید ایسا ہی ہو، عالم الغیب خدا ہے۔

(ص ۱۴۲، فٹ نوٹ)

قاضی عبدالودود کے مطابق یہ فارسی عبارت خود آزاد کی معلوم ہوتی ہے اور اس طرح وہ مظہر کے قتل کے اسباب میں ان کی حسن پرستی کو بھی داخل کرنا چاہتے ہیں اور "ازرُوے اعتقاد" کے معنی یہ کہ پڑھنے والے صاحبِ عبارت کو سنّی سمجھ لیں۔ پھر یہ کہ کوئی شخص بہ یک وقت صبیح و ملیح دونوں نہیں ہو سکتا [قاضی نمبر ۱۲]۔ مرزا مظہر کے قاتل کے بارے میں لکھتے ہیں:

> غرض ساتویں محرم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص مشائی کی ٹوکری ہاتھ میں لیے آیا۔ دروازہ بند تھا۔ آواز دی اور ظاہر کیا کہ مرید

Scanned by CamScanner

ہوں۔ (ص ۱۴۴)

نثار احمد فاروقی نے پھر "مقامات مظہری" ص ۶۱ کا اقتباس دیا، جس کے مطابق قتل کے لیے ایک شخص نہیں، تین اشخاص آئے تھے۔ مٹھائی کی ٹوکری لانے کا کوئی ذکر نہیں ("دید و دریافت"، ص ۱۹۲)۔

غالباً مرزا مظہر کے دفاع میں آزاد لکھتے ہیں کہ ان کے جدِ مرحوم اردو کا ایک شعر ان کے نام سے پڑھا کرتے تھے:

ہوں تو سنی پر علی کا صدقِ دل سے ہوں غلام
خواہ ایرانی کہو تم، خواہ تورانی مجھے

(ص ۱۲۵)

قاضی عبدالودود نے دریافت کیا کہ یہ شعر مظہر کا ہے ہی نہیں۔ یہ معروف کے دیوانِ دوم کے حسبِ ذیل شعر کی تبدیل شدہ صورت ہے:

ہوں تو سنی، ہے علی سے دوستی جانی مجھے
خواہ ایرانی کہو اور خواہ تورانی مجھے

[قاضی نمبر ۱۰]

قتلِ مظہر کے سلسلے میں ایک حاشیہ لگایا ہے:

استاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ دگاڑے کا نشان ہم نے بھی دیکھا ہے کیول رام کے کوٹھے پر ڈیوڑھی کی دیوار میں اب تک موجود تھا۔ (ص ۱۴۴، فٹ نوٹ)

عابد پیشاوری اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ ذوق، مرزا مظہر کی شہادت کے کئی سال بعد پیدا ہوئے، آزاد اور بھی بعد میں۔ آزاد متن میں قرابین (چھوٹی بندوق) کا ذکر کرتے ہیں۔ حاشیے میں دگاڑے (دو نالی کی بندوق) کا ("ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص ۸-۷)۔

کسی کے سینے میں گولی مارنے پر اس کا نشان دیوار میں کیوں کر پڑ سکتا ہے۔ اگر گولی سینے کے آر پار بھی ہو جائے تو اس میں اتنا زور نہیں رہے گا کہ دیوار پر گڑھا بنا دے۔

مظہر کے حال کے بیچ میں تاباں کا بھی ذکر ہے لیکن اسے جلی عنوان کے ساتھ لکھا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ مظہر کا حال ص ۱۳۸ پر ختم ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی صفحے کے وسط میں بغیر کسی فصل کے پھر سے مظہر کا حال درج کرنے لگتے ہیں۔ ص ۱۳۹ پر مظہر اور تاباں کے قرب کو مبالغے سے بیان کیا ہے۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ دیوانِ تاباں میں کسی جگہ

Scanned by CamScanner

مظہر سے عقیدت کا اظہار نہیں جب کہ محمد علی حشمت سے ہے۔ آزاد کو تاباں کی جزئیات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ [قاضی نمبر ۲۹۵]۔

سودا کے حالات میں کئی غلط بیانیاں واقع ہو گئی ہیں۔ سودا کے والد کے لیے لکھا ہے کہ "میرزایانِ کابل سے تھے۔" (ص ۱۴۸) یعنی کابل کے مغل تھے۔ قاضی عبدالودود نے دھیان دلایا کہ ہاتف کی ہجو میں سودا نے اس کے باپ کے لیے لکھا ہے:

وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی

("کلیاتِ سودا"، مرتبہ آسی، ص ۴۱۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے والد کابلی مغل نہیں ہو سکتے تھے۔ صاحبِ "باغِ معانی" کے سودا سے ذاتی تعلقات تھے اس میں ہے کہ سودا کے اجداد بخارا سے ہندوستان آئے [قاضی نمبر ۱۷۰]۔

"آبِ حیات" کی بدولت شاہ عالم کے سلسلے میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ شاہ عالم نے کہا، "بھئی ہم تو پاخانے میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔" اس پر سودا نے کہا، "حضور ویسی بُو بھی آتی ہے،" اور اس کے بعد شاہ عالم کا دربار چھوڑ دیا [ص ۱۴۹]۔ یہ لطیفہ کتنا غیر فطری ہے۔ نہ بادشاہ ایسی رکیک بات کہ سکتا تھا نہ سودا کو ایک بادشاہ پر ایسا طنز کرنے کی ہمت ہو سکتی تھی۔ اس جعل سازی کا بھانڈا شیرانی نے پھوڑا۔ انھوں نے دکھایا کہ شاہ عالم ۱۱۸۵ھ میں دلّی پہنچا ہے جب کہ سودا ۱۱۷۰ھ میں دہلی چھوڑ چکے تھے۔ سودا کی کبھی شاہ عالم سے ملاقات ہوئی ہی نہیں (مقالات، ص ۹۶)۔ اسلم فرخی کے مطابق سودا ۱۱۷۶ھ میں دلّی چھوڑ چکے تھے (جلد ۲، ص ۱۲۹)۔ بقول آزاد شاہ عالم کو چھوڑ کر سودا نے مخمس شہر آشوب لکھا:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواڈول

(ص ۱۵۰)

قاضی عبدالودود نے دریافت کیا کہ یہ نظم عالم گیرِ ثانی کے عہد میں لکھی گئی، اس کا شاہ عالم سے کوئی تعلق نہیں [نمبر ۲۷۶]۔

شاہ عالم سے مبینہ ترکِ موالات کے بعد جن امرا نے سودا کی سرپرستی کی ان میں مہربان خاں اور بسنت خاں ممتاز تھے (ص ۱۵۰)۔ قاضی صاحب کے مطابق بسنت خاں شاہ عالم سے قبل کے امرا میں ہے۔ مہربان خاں فرخ آباد میں ملازم تھے۔ سودا عمادالملک کی معیت میں فرخ آباد گئے۔ آزاد کو سودا کے اس مربّی کا علم ہی نہیں [نمبر ۲۷۷]۔ یہ کہنا درست نہیں کہ شجاع الدولہ نے سودا کو دلّی سے طلب کیا۔ شیخ چاند کی رائے میں دلّی سے

Scanned by CamScanner

نہیں، فرخ آباد سے طلب کیا کیونکہ کلیات سودا مکتوبہ ۱۱۷۴ھ میں سودا کی الکاری رباعی نہیں ملتی۔ "خوش معرکۂ زیبا" کے مطابق بھی سودا کو فرخ آباد سے بلایا تھا۔ خود شجاع الدولہ لکھنؤ میں نہیں، فیض آباد میں رہتے تھے۔

لکھتے ہیں: شجاع الدولہ نے سودا کو بلایا تو انھوں نے رباعی لکھ کر بھیج دی:

سودا پئے دُنیا تو بہر سُو کب تک

جب آخرکار شجاع الدولہ کی خدمت میں لکھنؤ پہنچے تو شجاع الدولہ نے وہ رباعی پڑھی۔ اس کے بعد سودا بہ پاسِ وضع داری پھر دربار نہ گئے (ص ۱۵۱-۱۵۰)۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

میری رائے میں اس رباعی کا شجاع الدولہ سے کوئی تعلق نہیں۔ سودا شجاع الدولہ کے درباری شاعر ہوئے اور کلیات میں متعدد مدحیہ نظمیں ہیں۔ [نمبر ۲۷۸]

آزاد کا بیان ہے کہ سودا نے دلی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں گزارے اور اس کے بعد ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے (ص ۱۵۰)۔ جمیل جالبی کے مطابق سودا ۱۱۷۳ھ/نومبر ۱۷۵۹ء میں دلی سے چلے گئے۔ ۱۱۷۶ھ میں ان کی فرخ آباد میں موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ کم از کم ۱۷ سال وہاں رہ کر ۸۵-۱۱۸۳ھ کے بیچ فیض آباد گئے۔ اس وقت لکھنؤ نہیں جا سکتے تھے کیونکہ لکھنؤ شجاع الدولہ کی وفات ۱۱۸۸ھ کے بعد دارالسلطنت ہوا (جمیل جالبی، "تاریخِ ادبِ اردو"، جلد ۲، ص ۶۵۷)۔

سودا کے حالات کے بعد ان کے کلام کا تعارف دیتے ہیں اور اس کے بعد پھر حالات، غرض کہ عجب بے ترتیبی ہے۔ ابتدائی حالات کے بعد لکھتے ہیں کہ سودا کا کلیات حکیم سید اصلح الدین خاں نے ترتیب دیا تھا اور اس پر دیباچہ بھی لکھا تھا (ص ۱۵۲)۔ قاضی عبدالودود تردید کرتے ہیں کہ اصلح الدین نے نہیں، غلام احمد نے مرتب کیا تھا [نمبر ۲۲۳]۔ ص ۱۵۵ کے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ فدوی نے احمد شاہ کی مدح میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے بہت سا انعام دیا۔ قاضی صاحب کی رائے میں فدوی کا دہلی جانا ہی ثابت نہیں، قصیدے کا کیا ذکر ہے [نمبر ۳۲]۔ اگلے صفحہ ۱۵۵ کے حاشیے میں شاہ ہدایت کا ذکر ہے۔ "شاہ" عموماً سادات کے لیے لکھا جاتا ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ہدایت افغان تھے۔ آزاد کے سوا انھیں کسی نے "شاہ" نہیں لکھا [نمبر ۵۰]۔

اب لیجیے سودا اور فاخر مکین کے معرکے کو۔ اس میں سودا کی زبانی فارسی کے جن علما کے نام گنائے ہیں ان میں ایک "حکیم بُوعلی خاں ہاتف بنگالہ میں" ہیں (ص ۱۶۶)۔ قاضی

Scanned by CamScanner

صاحب نے اصلاح کی کہ سودا نے بنگہ لکھا ہے جس سے مراد فیض آباد ہے [نمبر ۱۱۳]۔ "کلیاتِ سودا"، مرتبہ آسی کے آخر میں رسالہ "عبرت الغافلین" شامل ہے اس میں جلد دوم، ص ۷۷ ۳ پر "میرزا بُوعلی ہاتف در بنگہ" لکھا ہے۔ کیا آزاد کو معلوم نہ تھا کہ فیض آباد کا عُرف بنگہ تھا یا پھر سہو کتابت سے بنگہ بگڑ کر بنگالہ ہو گیا ہو۔

سودا اور فاخر مکیں کے مناقشے کے سلسلے میں سعادت علی خاں نے فرماں روا آصف الدولہ سے فریاد کی کہ جس کو باوا جان نے برادرِ من کہہ کر خط لکھا آج وہ یہاں اس حالت میں ہے (ص ۱۶۷)۔ یہ مکالمہ بے اصل ہے۔ اس معرکے کی تفصیلات حکیم اصلح الدین سے منسوب اس طویل قصیدے میں موجود ہیں جو کلیات سودا کے آخر میں ملتا ہے۔ آزاد نے ان کو خواہ مخواہ دوسرے ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ بقولِ آزاد اس معرکے سے قبل آصف الدولہ کو سودا کی اس شہر میں موجودگی کی اطلاع ہی نہ تھی۔ شیرانی نے دکھایا کہ کلیاتِ سودا میں شجاع الدولہ کی مدح میں چھ قصیدے ہیں۔ خود آزاد نے لکھا ہے کہ وہ ۱۱۸۵ھ میں شجاع الدولہ کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اگر ایسا تھا تو آصف الدولہ کیوں کر سودا کی موجودگی سے بے خبر ہو سکتے تھے۔

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ شجاع الدولہ نے سودا کو خط لکھا تھا۔ سعادت علی خاں اور آصف الدولہ کی گفتگو آزاد کے اختراعات میں سے ہے۔ نزاعِ سودا و فاخر مکیں سے قبل ہی سودا اودھ کے درباری شاعر تھے [قاضی نمبر ۲۴۷]۔ بقولِ آزاد سودا نے سرِ دربار فاخر مکیں کی ہجو میں فی البدیہہ رباعی پڑھی: تو فخر خراسانی و فا ساقط ازو۔۔الخ (ص ۱۶۸)۔ شیرانی لکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اس پر الجھتے تھے کہ فاخر کو خراسانی کیوں کہا۔ شیرانی کے پاس عہدِ شاہ جہاں کی ۱۰۶۲ھ کی ایک بیاض تھی جس میں انھیں یہ رباعی لکھی نظر آ گئی جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سیکڑوں سال پہلے کسی اور شاعر نے کہی تھی ("مقالاتِ شیرانی"، سوم، ص ۱۰۶)۔

قاضی عبدالودود نے کچھ اور تحقیق کی۔ لکھتے ہیں یہ مجہول الاسم رباعی "تذکرۂ تقی کاشی" میں ہے۔ یہ تذکرہ گیارھویں صدی ہجری کے نصف اول میں مکمل ہوا۔ وہاں متن یہ ہے:

تو فخرِ زمانۂ [زمانہ ای] و فے ساقط ازو
گوہر بدہاں داری و رے ساقط ازو

ہر روز و شبے من از خدای طلبم
مرکب دہدت ولے کہ بے ساقط ازو

[قاضی نمبر ۲۶]

گویا یہ رباعی سودا سے سَو ڈیڑھ سَو سال پہلے تصنیف ہو چکی تھی۔ آزاد کا اِسے سودا کی رباعی بنا دینا ادبی جعل سازی نہیں تو اور کیا ہے۔

آصف الدولہ نے شیر کا شکار کیا تو بقولِ آزاد سودا نے طنزیہ شعر کہا:

یارو یہ ابنِ ملجم پیدا ہوا دوبارہ

اس پر آصف الدولہ نے مرزا سے شکایت کی (ص ۱۶۹)، آزاد کو حفظِ مراتب کا کوئی شعور نہیں رہتا۔ وہ شاعروں سے والیانِ ملک اور زعیم امرا کی جناب میں ایسے گستاخانہ کلام کہلا دیتے ہیں، جن کا کوئی امکان نہیں۔ اس واقعے کی اصل جاننے سے پہلے وہ لطیفہ بھی نظر میں رکھیے کہ سودا نے ایک ولایتی کی ہجو کہی۔ ولایتی نے کمر سے پیش قبض کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دیا (ص ۱۷۱)۔

شیرانی نے صفدر مرزاپوری کی کتاب "بزمِ خیال" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک ولایتی عبدالرحمان نے آصف الدولہ کی معیت میں پیادہ تلوار سے شیر کو مارا، جس پر آصف الدولہ کو خفت ہوئی۔ سودا نے ان کی خفت دور کرنے کے لیے یہ شعر چست کیا۔ واضح ہو کہ ابنِ ملجم کا نام بھی عبدالرحمان تھا۔ اس پر ولایتی تلوار کھینچ کر آ گیا اور سودا سے کہا، "نظم ازما نمی آید، حالا ایں نثر را گوش کن۔" سودا نے یہ شعر آصف الدولہ کو خوش کرنے کے لیے لکھا تھا۔ آزاد نے اسے آصف الدولہ پر طنز بنا دیا۔

آزاد لکھتے ہیں کہ راسخ سودا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا کی فرمائش پر یہ شعر سنایا:

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب، دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

(ص ۱۷۱)

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ راسخ ۱۱۷۰ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ سودا ۱۱۹۵ھ میں مرے۔ راسخ کا بڑھاپے کا شعر سودا کی حیات میں کہاں؟ اس سے ہٹ کر راسخ نے یہ کہا ہے:

راسخ ہے اپنی طبع کو سودا سے احتراز
شاگردِ میر ہوں، مجھے سودا سے کیا غرض

حکایت اختراعی ہے [قاضی نمبر ۷۹]۔

قدسی سے یہ مطلع منسوب کیا ہے:

Scanned by CamScanner

آلودۂ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را
[۷۳-۱۷۲]

قاضی صاحب لکھتے ہیں قدسی کے کسی مطبوعہ یا قلمی دیوان میں نہیں۔ "مجالسِ رنگیں" میں سرقے کے سلسلے میں یہ اردو او فارسی اشعار دیے ہیں لیکن فارسی شعر کا مصنّف کون ہے، رنگین نے نہیں بتایا [نمبر ۱۱۳]۔

سودا کے لڑکپن اور جعفر زٹلی کے بڑھاپے کا جو لطیفہ:

لالہ در باغ داغ چوں دارد

پر گرہ لگانے کے سلسلے میں دیا ہے، بہت دلچسپ اور مکمل ہے لیکن ایک بار پھر آزاد کی ادبی اختراع (جعل؟) کا کرشمہ ہے۔ قاضی صاحب نے میر حسن کے تذکرے سے حقیقت دریافت کی۔ جعفر زٹلی بیدل کے یہاں گئے۔ وہ فکرِ شعر میں مبتلا تھے۔ جعفر نے پوچھا، کس مصرع پر فکر کر رہے ہیں؟ بیدل نے کہا:

لالہ در باغ داغ چوں دارد

اس پر جعفر نے کہا، یہ مصرع لگا دیجیے:

یک عصا سبز زیرِ کوں دارد

اس میں آزاد نے تحریف کر کے سودا اور جعفر کا معرکہ بنا دیا اور اسے دلچسپ کرنے کے لیے سودا کی زبانی تین اور مصرع کہلا دیے۔ ایسے تھے ہمارے آزاد! مورخ یا چٹکلے باز؟

اس دور کی تمہید میں فرسودہ زبان کی مثال میں سودا وغیرہ کئی شعرا کے اشعار دیے تھے۔ قاضی عبدالودود نے ان میں سے بعض کا سودا سے انتساب رد کیا۔ سودا کی فصل کے آخر میں جو نمونہ کلام ہے اس میں بھی کئی کا انتساب غلط ہے:

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچہ منھ اس کا لال کیا

(ص ۱۷۶)

قاضی عبدالودود کے مطابق تذکرۂ قدرت اللہ شوق میں یہ قطع چند ممنون کے نام سے اور بعض مجموعوں میں حیدری کے نام سے ہے [نمبر ۲۴]۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے مطابق یہ دیوانِ حیدری کی پہلی غزل کا مطلع ہے:(۵)

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ!
یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

(ص ۱۷۶)

Scanned by CamScanner

کلیاتِ سودا میں ہونے کے باوجود یہ سودا کا نہیں، قائم کا ہے۔ اس کے دیوان اور تذکرے میں ہے [قاضی نمبر ۲۸]۔

نہ بھول اے آرسی، گر یار کو تجھ سے محبت ہے!
نہیں ہے اعتبار اس کا، یہ منھ دیکھے کی الفت ہے

(ص ۱۷۶)

قاضی صاحب نے توجہ دلائی کہ یہ شعر ص ۱۷۶ پر میر کے نام سے اور ص ۴۹۴ پر سودا کے نام سے دیا ہے۔ درست سودا [نمبر ۲۰]۔ ساتھ ہی حسبِ ذیل شعر:

بگولے سے جسے آسیب اور صرصر سے زحمت ہے
ہماری خاک یوں برباد ہو، اے ابر، رحمت ہے!

ص ۱۷۶ پر سودا کا اور ص ۴۹۴ پر میر کا بتایا ہے۔ یہ دراصل ثابت، شاگردِ فدوی کا ہے۔ حوالہ: "گل زار ابراہیم"، "تذکرۂ عشقی" وغیرہ۔ دونوں میں دوسرے مصرع میں "برباد ہو"، کی جگہ "اڑتی پھرے" ہے [قاضی نمبر ۲۱]۔

سودا کے بعد میر ضاحک کے حالات ہیں۔ سودا، میر اور درد کی صف میں ضاحک کو لا کھڑا کرنے پر شیرانی بجا طور پر معترض ہیں (مقالات، سوم، ص ۱۰۹)۔ آزاد لکھتے ہیں کہ میر ضاحک کے انتقال پر سودا میر حسن کے یہاں گئے اور میر ضاحک کی ہجویں چاک کر دیں، دوسری طرف میر حسن نے ضاحک کے قلم سے سودا کی ہجویں چاک کر دیں۔ ضاحک کا کلام اسی مجلد کے اندر تھا، مفقود ہو گیا (ص ۸۳-۱۸۲)۔ شیرانی نے توجہ دلائی کہ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا اور ضاحک خود "آبِ حیات" کے مطابق ۱۱۹۶ھ میں زندہ تھے (ص ۱۸۴)۔ معلوم نہیں آزاد اس قسم کی حکایتیں کیوں گھڑ لیتے ہیں۔ اتفاق سے بتیاراج، بہار میں ضاحک کا دیوان دریافت ہو گیا، یعنی یہ مفقود نہیں ہوا۔

سودا، ضاحک و سکندر کا واقعہ سلیمان شکوہ کی موجودگی میں لکھنؤ میں دکھایا ہے (ص ۱۸۴)۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ سودا کا انتقال ۱۱۸۵ھ میں ہوا اور سلیمان شکوہ اس کے دس برس بعد لکھنؤ گئے [نمبر ۶۷]۔

میر درد کے احوال میں لکھتے ہیں کہ درد کی "علم الکتاب" میں ۱۱۱ رسالے ہیں: نالۂ درد، آہِ سرد وغیرہ (ص ۱۸۵)۔ قاضی صاحب نے بتایا کہ "علم الکتاب" میں اتنے رسالے نہیں، ابواب ہیں۔ نالۂ درد، دردِ دل وغیرہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں [نمبر ۲۱۹]۔ شاہ عبدالعزیز اور سودا کی طرف سے میر درد پر طنز کا ایک ایک لطیفہ درج کیا ہے (ص ۸۸-۱۸۷)۔

Scanned by CamScanner

اسلم فرخی کا خیال ہے کہ میر درد کی بزرگی اور خاندانی وجاہت کو دیکھتے ہوئے یہ دونوں مکالمے صحیح نہیں معلوم ہوتے (جلد دوم، ص ۱۴۸)۔

میر سوز کے حالات میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۱ھ میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشد آباد گئے۔ وہاں بھی نصیب نے یاوری نہ کی پھر لکھنؤ میں آئے۔ اب قسمت رجوع ہوئی اور نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے (ص ۱۹۴)۔ اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں۔ سوز سودا سے بھی بہت پہلے دلی چھوڑ کر فرخ آباد جا چکے تھے۔ جمیل جالبی کے مطابق یہ ۱۱۶۷ھ کے لگ بھگ کی بات ہونی چاہیے (جلد دوم، ص ۹۴۷)۔ شجاع الدولہ کے آخر عہد میں سوز لکھنؤ پہنچے۔ آصف الدولہ کی تخت نشینی کے بعد ان کے استاد ہوئے۔ آزاد آصف الدولہ کا سنہ وفات ۱۲۱۲ھ نہ جانتے تھے، جس کے سبب لکھتے ہیں کہ سوز ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد گئے اور وہاں سے واپس آکر آصف الدولہ کے استاد ہوئے۔ اگر سوز مرشد آباد گئے ہیں تو ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد چھوڑنے کے بعد اور ۱۱۸۸ھ میں آصف الدولہ کے جلوس کے درمیان گئے ہوں گے۔

میر سوز کے اس قطعے کو ڈرامائی انداز سے پڑھنے کا بیان ہے:

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے (ص ۱۹۹)۔

بقولِ قاضی صاحب یہ قطعہ دیوانِ سوز میں نہیں اور بہ تبدیلِ بعض الفاظ ظہور علی ظہور دہلوی شاگردِ ذوق و احسان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے اور انھیں کا ہے۔ آزاد نے سوز کی ایک مثنوی کے آغاز کا یہ شعر درج کیا ہے:

دعویٰ بڑا ہے سوز کو اپنے کلام کا

جو غور کیجیے تو ہے کورمی کے کام کا

قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ اس شعر کو مثنوی سے کوئی تعلق نہیں [نمبر ۱۲۳]۔

ہمارے ذہنوں میں میر کی جو تصویر بسی ہے، وہ وہی ہے جو آزاد نے "آبِ حیات" میں پیش کی ہے۔ ایک بد دماغ، مردم بیزار، متکبر، ناعاقبت اندیش قنوطی کی۔ اس میں یقیناً مبالغہ ہے۔ ان کے بعض بیانات کی محققین تردید کر چکے ہیں، ملاحظہ ہو:

ص ۲۰۳ پر آزاد نے میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ قاضی صاحب نے تصحیح کی کہ "ذکرِ میر" کے مطابق محمد علی صحیح نام ہے [نمبر ۱۱۶]۔ آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمد علی نے دو شادیاں کی تھیں، میر پہلی بیوی سے تھے، دوسری بیوی خان آرزو کی بہن تھی [ایضاً]۔ قاضی عبدالودود نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ خان آرزو کی ہمشیرہ پہلی بیوی

Scanned by CamScanner

تھی، میر کی ماں دوسری [قاضی نمبر ۱۱۷]۔ آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب محمد تقی نے میر تخلص رکھا تو ان کے والد نے منع کیا (ص ۱۱٦)۔ قاضی عبدالودود کہتے ہیں کہ والد کی وفات کے وقت میر دس گیارہ برس کے تھے۔ اس وقت تخلص رکھنا خارج از بحث تھا [نمبر ۱۱۹]۔ میر ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ بقولِ قاضی عبدالودود میر کے والد کا انتقال ۲۱ رجب ۱۱۴٦ھ کو ہوا (٦)۔

لکھتے ہیں کہ میر ۱۱۹۰ھ میں دلّی چھوڑ کر لکھنؤ گئے (ص ۲۰۵)۔ قاضی عبدالودود نے "ذکرِ میر" کے بیانات کی بِنا پر طے کیا کہ میر ۱۱۹٦ھ میں لکھنؤ گئے [بحوالۂ جالبی، تاریخ، جلد دوم، ص ۵۱۵]۔

آزاد لکھتے ہیں کہ میر جب دلّی سے لکھنؤ گئے تو ساری گاڑی کا کرایہ پاس نہ تھا، ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے (ص ۲۰۵)۔ قاضی عبدالودود نے اس کا "ذکرِ میر" کی روشنی میں تجزیہ کیا۔ اس کے مطابق آصف الدولہ نے اخراجات سفر بھیجے تھے۔ میر ہمیشہ کے لیے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا رہے تھے، اہلِ خانہ بھی ساتھ ہوں گے۔ ایسے میں یہ قرینِ قیاس نہیں کہ ساتھ میں کوئی غیر مسافر بھی ہو ("معاصر"، حصہ ۹، ص ۱۷۱، مشمولہ: "عیارستان"، پٹنہ، ۱۹۵۷ء]۔

لکھنؤ پہنچنے پر میر ایک مشاعرے میں شریک ہوئے جس میں اپنے تعارف کے لیے تین شعروں کا قطعہ: کیا بود و باش پوچھو ہو... اُجڑے پکار کے، شامل کر دیا (ص ۲۰٦)۔ قاضی کہتے ہیں کہ یہ قطعہ میر کے کسی مجموعے میں موجود نہیں [نمبر ۲۵۳]۔

نثار احمد فاروقی کو "انجمنِ محمدیہ"، آگرہ کے کتب خانے میں ایک قلمی بیاض (۸۸ نمبر ۳۲) ملی۔ اس کے ترقیمے میں اول رجب ۱۲۱٦ھ روزِ چہار شنبہ لکھا ہے۔ گویا یہ بیاض میر کی زندگی میں تیار ہوئی۔ اس میں یہ قطعہ میر کے نام سے موجود ہے۔ "آبِ حیات" میں دوسرے شعر کا پہلا مصرع ہے:

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

بیاض میں یوں ہے:

دلّی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم، آہ!

تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں "آبِ حیات" میں "ویران کر دیا" ہے۔ بیاض میں "برباد کر دیا" ہے (۷)۔ حیاتِ میر کی بیاض میں اس قطعے کا ہونا واثق ثبوت ہے کہ یہ میر ہی کی تخلیق ہے۔

Scanned by CamScanner

میر تنک مزاج اور بد دماغ تھے، لیکن "آبِ حیات" ص ۷-۲۰۶ پر میر کو جس طرح آصف الدولہ سے بد کلامی کرتے دکھایا ہے، وہ ممکن نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں آزاد کو فرقِ مناصب کا کوئی خیال نہیں رہتا۔

انتقال کے وقت میر کی عمر سو سال لکھی ہے (ص ۲۰۷)۔ اب جب کہ ولادت کا صحیح سنہ دریافت ہو گیا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ میر نے نوے سال کی عمر پائی۔ ان کی تصانیف کے سلسلے میں بعض اصنافِ سخن کو ان کی اوّلیات میں قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> فارسی کے عمدہ متفرق شعروں پر اردو مصرع لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے اور یہ ایجاد ان کا ہے (ص ۲۰۷) اہلی شیرازی کے شعر پر مصرع لگا کر مثلث کا ایجاد اپنی زبان میں دکھاتے ہیں۔ (ص ۲۳۰)
>
> اہلِ تحقیق نے فغانی یا وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انھیں واسوخت کا موجد تسلیم کیا۔ (ص ۲۰۹)

قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی کہ مثلث کلیاتِ ولی میں نیز میر حسن کے استاد میر ضیا دہلوی کے یہاں بھی ملتا ہے۔ ص ۲۳۰ کا ع: ناقہ را می راند لیلی سوے خلوت گاہ ناز والا شعر اہلی کا نہیں، آصفی (یا اصمعی) کا ہے۔ فارسی میں واسوخت کوئی مستقل صنفِ سخن نہیں۔ دیوانِ فغانی میں ایسی کوئی نظم نہیں جسے واسوخت کہا جا سکے۔ میر اردو میں واسوخت کے موجد نہیں کیونکہ ان سے پہلے آبرو اور ناجی کے واسوخت ملتے ہیں [قاضی نمبر ۴۳]، لیکن جمیل جالبی کے مطابق اردو کا پہلا واسوخت شاہ حاتم نے ۱۱۳۹ھ میں لکھا (تاریخ، جلد دوم، حصہ اوّل، ص ۴۴۱)۔

جہاں تک مربع کا سوال ہے، وہ بھی کلیاتِ ولی میں موجود ہے۔ آزاد نے ص ۲۳۰ پر "مربع فارسی پر" کے عنوان کے تحت جو مربع کا بند لکھا ہے، وہ مربع کدھر سے ہے۔ اس کے پہلے دو مصرع ایک قافیے میں ہیں، بعد کے دو مصرع علاحدہ قافیے میں، گویا مثنوی کی کیفیت ہے۔ انھوں نے اس صفحے پر مثلث کی جتنی مثالیں لکھی ہیں ان سب میں بند کا پہلا مصرع وسط میں ایک سطر میں اور دوسرے اور تیسرے مصرع نیچے دوسری سطر میں لکھے ہیں۔ مثلث کی معیاری صورت یہ ہے کہ پہلے دو مصرع بیت کی شکل میں ایک سطر میں لکھے جاتے ہیں اور تیسرا مصرع بعد کی سطر کے وسط میں۔ ان کا یہ کہنا کہ "مرثیہ بھی دیوان میں نہیں" نصف سچائی ہے کیونکہ مرثیہ دیوان میں بے شک نہیں لیکن مسیح الناس مراثیِ میر کا مجموعہ شائع کر چکے ہیں [قاضی نمبر ۱۲۲]۔

ص ۲۰۹ پر مشہور مثنوی کا نام "شعلۂ عشق" لکھا ہے۔ صحیح تر "شعلۂ شوق" ہے۔ میر

Scanned by CamScanner

کے دیوان کے قدیم ترین نسخے (نسخۂ حیدر آباد) میں "شعلۂ شوق" ہی ہے۔ قاضی عبدالودود کے مطابق کلیاتِ میر کی اولین اشاعت میں بھی یہی ہے(۸)۔ ص ۲۱۱ پر میر کی ایک مثنوی کا نام "اژدر نامہ" یا "اجگر نامہ" لکھتے ہیں۔ ص ۲۱۸ پر لکھتے ہیں کہ اس قصیدے کا نام "اجگر نامہ" قرار دیا۔ قاضی عبدالودود سوال کرتے ہیں کہ مثنوی کو قصیدہ کیوں کہا۔ یہ دعویٰ بھی محتاجِ ثبوت ہے کہ میر نے اس کا نام "اجگر نامہ" بھی رکھا تھا [نمبر ۲۶۲]۔ ص ۲۱۱ ہی پر ایک اور مثنوی کا نام "تنبیہ الخیال" لکھا ہے۔ صحیح "تنبیہ الجہال" ہے [قاضی نمبر ۱۴۱]۔ اس صفحے پر میر کے تذکرے "نکات الشعرا" کے بیان میں جو اغلاط در آئی ہیں، ان کی طرف بھی قاضی صاحب نے توجہ دلائی مثلاً یہ مبینہ دعویٰ کہ میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا۔ اس وقت تک اردو میں ہزار شاعر کہاں تھے [نمبر ۱۲۳]۔ اسی صفحے پر میر کے ایک معترض شاعر کا نام "میر خاں کمترین" لکھتے ہیں۔ قاضی صاحب کے مطابق صحیح "پیر خاں کمترین" ہے [نمبر ۱۲۴]۔

خواہی پیالہ خواہ سبو کر ہمیں، کلال!
ہم اپنی خاک پر تجھے مختار کر چلے

(ص ۲۱۳)

قاضی عبدالودود تبصرہ کرتے ہیں: "آبِ حیات" میں میر کے نام سے ہے لیکن کلیاتِ میر میں نہیں۔ تذکروں میں عظیم وغیرہ کے نام سے ہے [نمبر ۴۵]۔

میر کے غرور کے سلسلے میں لکھتے ہیں: افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے (ص ۲۱۶)۔ یہ مبالغہ ہے۔ "نکات الشعرا" میں کئی شعرا کی تعریف کی ہے۔ آزاد نے میر کی بد دماغی کے سلسلے میں کئی شعرا کے نام لکھے ہیں کہ انھیں شاگرد بنانے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک میر قمرالدین منت ہیں۔ جب ان کا وطن سونی پت معلوم ہوا تو میر نے انکار کر دیا کہ اردوے معلیٰ خاص دلی کی زبان ہے (ص ۲۱۷)۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں: قمرالدین منت کا مولد دہلی تھا لیکن خود میر اکبر آبادی تھے۔ ان کے متعدد تلامذہ دہلوی نہ تھے [نمبر ۱۲۰]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حکایت محض تخیلی ہے۔

میر کی بد دماغی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کے چند عمائد و اراکین نے میر کے یہاں جا کر کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر نے کہا کہ میرے کلام کے لیے محاورۂ اہلِ اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں۔ یہ کہہ کر شعر پڑھا:

Scanned by CamScanner

عشق برے ہی خیال پڑا ہے، چین گیا، آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا

آپ کہیں گے کہ خیال کی "ی" کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ "ی" تقطیع میں گرتی ہے مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے (ص ۲۱۹)۔

قاضی عبدالودود کا تبصرہ ہے کہ میر اتنے کج خلق اور مصلحت نااندیش نہ تھے جتنے اس حکایت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اُس عہد میں دلی اور لکھنؤ کی زبان میں بڑا فرق نہ تھا۔ میر کو یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کے کلام کو اہلِ لکھنؤ نہیں سمجھ سکتے۔ میر کے کلیات میں خیال بروزنِ بال صرف دو جگہ آیا ہے اور بروزنِ نہال کم از کم ۲۶ جگہ۔ کلیات میں شعر کسی قدر اختلاف کے ساتھ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آزاد کی بیان کردہ حکایت داستانِ محض ہے [نمبر ۴۸ و "معاصر"، حصہ ۹ ص: ۸۱-۱۷۸ مشمولہ "عیارستان"]۔

اس شعر میں ضروری نہیں کہ خیال کی "ی" گرائی جائے۔ گرائے بغیر مصرع کی تقطیع یوں ہو سکتی ہے: فعل فعول فعول فعولن _ فعل فعولن فعل فعَل۔ "خیال پڑنا" کوئی محاورہ نہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں لکھا ہے:

خیال پڑنا (فعلِ لازم) خیال ہونا، یاد آنا، شبہہ گزرنا۔

(جلد سوم، ص ۲۱۶)

مثلاً کسی جلسے میں کوئی شخص دکھائی دے جسے میں پوری طرح شناخت نہ کر سکوں اور اپنے ہم نشیں سے کہوں، مجھے خیال پڑتا ہے کہ میں نے اس کو پہلے کہیں دیکھا ہے، اس طرح "خیال پڑنا" محاورہ نہیں، لغوی معنی میں ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کے مطابق اس شعر کا صحیح متن یہ ہے:

عشق ہمارے خیال پڑا ہے، خواب گئی، آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے، صبح گیا یا شام گیا

("شعرِ شور انگیز"، جلد اول، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۸۱)

آزاد کے مطابق میر تقی انشا کی کوششوں سے سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچے، سعادت علی خاں ان کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے (ص ۲۲۰)۔ انشا کے محقق ڈاکٹر عابد پیشاوری لکھتے ہیں کہ میر کا سعادت علی خاں کے دربار میں جانا ثابت نہیں۔ پھر سعادت علی خاں حقے سے نفرت کرتے تھے، اپنا پیچوان میر کو پیش کرنا یعنی چہ؟ ("انشاء اللہ خاں انشا"، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۷)۔ سعادت علی خاں کے جلوس

Scanned by CamScanner

کا سنہ ۱۲۱۲ھ ہے، وفات ۱۲۲۹ھ۔ میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔ اس طرح وہ تقریباً ۱۳ سال سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ میں رہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ان کا میر جیسے شاعر سے کوئی ربط نہ رہا ہو لیکن اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

آزاد نے ذوق کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک بار میر اس مصرع میں کھوئے ہوئے تھے:

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

ایک شخص آیا، بیٹھا اور چلا گیا، میر کو خبر بھی نہ ہوئی (ص ۲۲۱)۔ عابد پیشاوری لکھتے ہیں کہ یہ مصرع ایک لفظ کے فرق سے سودا کا ہے۔ جب میر کا ہے ہی نہیں تو دوسرے مصرع کی فکر میں ہونے کے کیا معنی؟ پھر وہ بہار کی آمد کا زمانہ تھا۔ اس میں بہار کے گزرنے کا کیا محل؟ ("ذوق اور آزاد"، ص ۱۱-۱۰)۔

عابد نے سودا کا مصرع نہیں لکھا۔ میں نے بڑی تلاش کے بعد اسے کھوجا:

اب کی بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے
پھر پھر گل آ چکے پہ سجن تم بھلے گئے

(کلیات سودا، مرتبہ آسی، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء، ص ۱۹۰)

ص ۲۲۴ پر میر کے بیٹے کا نام میر عسکری لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: صحیح میر حسن عسکری ہے [نمبر ۴]۔ آزاد دوسرے بیٹے میر فیض علی فیض سے واقف نہیں جس کا ذکر "گلزار ابراہیم" اور "مجموعۂ نغز" میں ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے میر کی شخصیت میں انانیت، بددماغی، دنیا سے بددلی کو کچھ بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ میر نے گرمیوں کے زمانے میں بھی مکان کی وہ کھڑکیاں نہیں کھولیں جو باغ کی طرف کھلتی تھیں (ص ۲۲۰)۔ آزاد کا مقصد تو ایک فقرہ تراشنا تھا کہ میر نے اپنے کلام کو باغ پر ترجیح دی۔ بہر حال جہاں تک نقدِ میر کا سوال ہے اس میں آزاد نے عدمِ توازن نہیں دکھایا۔

جرأت۔ لکھتے ہیں: "باپ ان کے حافظ امان ... ان کے خاندان کا سلسلہ رائے امان محمد شاہی سے ملتا ہے۔" (ص ۲۳۶) قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ صحیح نام رائے مان ہے۔ آزاد نے ایسے لکھا ہے جیسے رائے امان، جرأت کے والد حافظ امان کے باپ دادا تھے جب کہ وہ حقیقی بھائی تھے [۲۱۲]۔ جرأت کے ورود لکھنؤ کی تاریخ ۱۲۱۵ھ لکھی ہے (ص ۲۳۷)۔ قاضی صاحب کے مطابق ۱۱۹۸ھ میں جب مصحفی لکھنؤ پہنچے، جرأت وہاں موجود تھے اور مصحفی کے

Scanned by CamScanner

"تذکرۂ ہندی" کی تکمیل سے پیش تر سلیمان شکوہ کے نوکر ہو چکے تھے [۲۸۸]۔

آزاد نے "آب حیات" کے پہلے ایڈیشن میں جرأت کے زوالِ بصارت کے سلسلے میں یہ روایت بیان کی تھی کہ وہ شوخیِ عمر سے اندھے بنے اور رفتہ رفتہ اندھے ہی ہو گئے، "لیکن میں مشکوک بات سے کتاب کا دامن کیوں آلودہ کروں۔" دوسرے ایڈیشن میں اسی مشکوک روایت کو یقینی مان کر شرح و بسط سے لکھا (ص ۳۹-۲۳۸) ایک شاعر کا اندھے پن کا مکر کرنا اور پھر واقعی اندھا ہو جانا درایت کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا۔ کسی عارضے کے سبب ان کی بینائی جاتی رہی ہو گی۔

ان کی شاعری کے لیے لکھا ہے: "قصیدہ وغیرہ اقسامِ شعر پر ہاتھ نہ ڈالا بلکہ زبانِ فارسی کی طرف خیال بھی نہیں کیا۔" (ص ۴۰-۲۳۹) قاضی عبدالودود نے دریافت کیا کہ کلیات جرأت کے ایک نسخے میں تین قصیدے ہیں اور ان کے فارسی اشعار فارسی گویوں کے تذکرے "انیس الاحبا" میں ملتے ہیں [نمبر ۱۳۳ و ۱۳۴]۔

لکھتے ہیں کہ کربلا جانڈ نے کہا، "حضور شعر بھی اندھا، شاعر بھی اندھا،" اور پھر اس شعر کو پڑھ کر اندھوں کی طرح ٹٹولتے پھرا:

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے
کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

(ص ۲۴۴)

عجیب بات یہ ہے کہ اسی صفحے کے طویل حاشیے کا آخری جملہ یہ ہے: "یہ شعر شاہ مبارک آبرو کا ہے۔" یہ جملہ کس نے بڑھایا ہے۔ اگر آزاد نے لکھا ہو تو پھر لطیفہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً کسی اور نے اضافہ کیا ہے۔ یہ شعر واقعی آبرو کا ہے۔ دیوانِ آبرو، مرتبۂ ڈاکٹر محمد حسن، (علی گڑھ، ص ۱۹۶)، "نکات الشعرا" مرتبۂ ڈاکٹر محمود الٰہی (لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۳۳) اور "مخزنِ نکات" میں یہ شعر آبرو کے نام سے اس طرح ہے:

تمھاری اتھارے لوگ کہتے ہیں، کمر ہے
کہاں ہے؟ کس طرح کی ہے؟ کدھر ہے؟

تذکرۂ میر حسن میں پہلا مصرع:

یہاں کے لوگ کہتے ہیں، کمر ہے

بظاہر یہ کہا جائے گا کہ شعر کو غلطی سے جرأت کا سمجھ کر آزاد نے یہ نقل اختراع کر لی لیکن اب دوسرا پہلو ملاحظہ ہو: مصحفی کے شاگرد میر بہادر علی واسق م ۱۲۰۷ھ نے ایک کتاب

"قصر اللطائف" لکھی۔ اس کے اقتباسات خیراتی لعل بے جگر کے تذکرے میں دیے ہیں۔ یہ تذکرہ ۳۶-۱۲۲۸ھ کے درمیان لکھا گیا گو اضافے ۱۲۴۳ھ تک ہوتے رہے۔ اس میں "قصر اللطائف" سے لے کر کچھ لطیفے بھی دیے ہیں، جن میں سے ایک یہی کریلا اور جرأت کا ہے۔ اس کے مطابق نواب آصف الدولہ کے حضور میں جرأت اور کریلا موجود تھے۔ وہاں کریلا نے بالکل یہی الفاظ کہے۔ "اے پیرومرشد شاعرانِ ایں زمانہ ہم کور آمد و شعرِ ایشاں ہم کور۔" اور اس کے بعد یہ شعر پڑھا:

جو سنتے ہیں میاں تیرے کمر ہے
کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ اور کدھر ہے؟

اور تمام فرش کو اپنے ہاتھ سے ٹٹولتے پھرا(۹)۔

اگر یہ حوالہ نہ ملتا تو اس لطیفے کو بھی آزاد کا جعل قرار دیا جاتا۔ انھوں نے واسق کی "قصر اللطائف" دیکھی ہوگی یا پھر کوئی اور کتاب۔ جس نے بھی سب سے پہلے اس نقل کو لکھا اس نے شعر کو جرأت سے منسوب کر کے اپنے تخیل کا زور دکھایا۔

اسی کٹ نوٹ میں آزاد لکھتے ہیں کہ نواب سراج الدولہ مرشد آباد کے صوبےدار ہو کر گئے تو دلّی سے کئی بھانڈ اور رنڈیاں بھی لے گئے (ص ۲۴۴)۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ سراج الدولہ کا ایک لمحے کے لیے دہلی جانا نہیں ہوا [نمبر ۵۹]۔

میر حسن کے لیے لکھا ہے کہ انھوں نے دلّی میں اپنے والد اور میر درد سے اصلاح لی (ص ۲۵۴)۔ اسلم فرخی لکھتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا (جلد ۲، ص ۱۷۰)۔ میر حسن کی صرف تین مثنویوں کا ذکر کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بقیہ مثنویوں سے واقف نہیں۔ ص ۲۵۷ پر لکھتے ہیں کہ دیوان اب نہیں ملتا۔ بقولِ قاضی عبدالودود اس کے مخطوطے بکثرت ملتے ہیں۔ [نمبر ۱۳۰]۔ حسن کے تذکرے کا بھی انھیں علم نہیں۔ حسن کے نمونۂ کلام میں آخری غزل خواجہ حسن دہلوی کی ہے جس کے مقطع میں اس کی محبوبہ بخشی کا لفظ بھی موجود ہے (فرخی، ص ۱۷۲)، [قاضی نمبر ۵۴]۔

انشا کے سلسلے کے بیانات کے اغلاط ڈاکٹر عابد پشاوری نے اپنے مقالے "انشاءاللہ خاں انشا" اور دوسری کتابوں میں تفصیل سے گنائے ہیں۔ میں ان پر اضافہ نہیں کر سکتا۔ ان میں سے خاص خاص کو مختصراً بیان کرتا ہوں۔ عابد کے مقالے "انشاءاللہ خاں انشا" کی طرف حوالہ قوسین میں مخفف "(انشا)" لکھ کر کیا ہے۔

"آبِ حیات" میں انشا و مصحفی کے بیانات میں خصوصاً اور دوسری جگہوں پر عموماً کچھ

Scanned by CamScanner

حالات جو حاشیے میں لکھے ہیں ان کی تقسیم کا جواز نہیں۔ ان میں سے بیشتر متن ہی میں آنے چاہییں۔ کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں ایک ہی واقعے کا ایک جزو متن میں اور دوسرا جزو حاشیے میں لکھا جائے، بہرحال۔

آزاد نے لکھا ہے: "سید انشا مرشد آباد سے دلی میں آئے۔" (ص ۲۶۰-۶۱)۔ اس کی تردید پہلے قاضی عبدالودود نے کی [نمبر ۲۵۴]۔ پھر ڈاکٹر عابد نے تفصیل سے کی کہ انشا مرشد آباد سے نہیں، فیض آباد سے دلی آئے تھے (انشا، ص ۳۸۶)۔ آزاد کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس وقت دلی میں میر نہ تھے۔ بقولِ عابد، انشا ۱۱۹۴ھ میں دلی آئے اور میر ۱۱۹۶ھ میں دلی سے گئے۔ عظیم وغیرہ سے معرکے میں بقولِ آزاد انشا نے فخریہ غزل ع:

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے

پڑھی۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون تاڑ گئیں کہ آزاد کو وا لفضیل ما لفضیل والی فخریہ غزل نہ ملی، اس کی جگہ ایک اور فخریہ غزل رکھ دی (۱۰)۔ عابد لکھتے ہیں کہ یہ غزل ع.... فلاطوں مرے آگے، لکھنؤ میں مصحفی سے معرکے کی ہے اور اس زمین میں مصحفی کا دو غزلہ بھی ہے (انشا، ص ۳۸۸)۔

آزاد لکھتے ہیں: انشا جب دلی پہنچے تو غلام قادر شاہ عالم کا نقدِ بصارت لے گیا تھا (ص ۲۶۶)۔ عابد نے شاہ عالم کے نابینا کیے جانے کی تاریخ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء/ ۷ ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ دی ہے۔ انشا اس وقت دلی سے جا چکے تھے۔ اس طرح آزاد نے انشا اور نابینا شاہ عالم کی جو حکایتیں لکھی ہیں وہ محض وضعی ہیں۔ انشا کا شاہ عالم کی جیبوں سے روپے نکلوانا بادشاہ کے منصب کو فراموش کر دینا ہے۔ اس زمانے کی قبا میں جیبیں نہیں ہوتی تھیں نہ بادشاہ اپنے جسم پر روپے اشرفیاں لیے پھرتے تھے۔ شاہ عالم کا انشا کے بال بچوں کا ذکر بھی بے محل ہے کیونکہ انشا مدتوں اولاد کے لیے ترسا کیے۔ ان کی پہلی اولاد ان کے قیامِ لکھنؤ میں ہوئی (انشا، ص ۱۲۸ و ۳۸۸-۸۹)۔

انشا کے ترکِ دلی کے سلسلے میں لکھتے ہیں: آخر دلی سے دل اچاٹ ہوا۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کی سخاوتوں نے حاتم کے نام کا خاتمہ کر دیا تھا (ص ۲۶۶)۔ انشا کا آصف الدولہ کی سخاوت کا شہرہ سن کر لکھنؤ جانا اس لیے غلط محض ہے کہ بقولِ عابد آصف الدولہ کی زندگی کے آخری نو برس انشا نے لکھنؤ میں گزارے لیکن ان سے تعلق پیدا نہیں کیا، بلکہ دربار سے باہر رہ کر نواب کے ایک وظیفہ خوار کی ملازمت میں گزار دیے۔ انشا دلی سے لکھنؤ نہیں، راجپوتانے کی طرف گئے تھے (انشا، ص ۱۲۸-۲۹)۔ پانچ چھ سال اِدھر اُدھر راجپوتانے اور فیض آباد میں گزار کر وہ ۱۲۰۳ھ تک دوبارہ لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں اس وقت سودا، ضاحک، سوز وغیرہ کا ورق زمانہ الٹ چکا تھا

Scanned by CamScanner

(ص ۲۶۷)۔ عابد کے مطابق یہ سوز کی حد تک درست نہیں کیونکہ ان کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا (انشا، ص ۳۹۰)۔ آزاد نے ایک بڑی ٹھوکر اس وقت کھائی جب یہ بیان دیا:

پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جب سیّد انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا۔ (ص ۲۶۷)

قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی کہ خود مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں ص ۱۲۱ پر لکھا ہے کہ انشا کے کہنے سے میرا گزر سلیمان شکوہ کے یہاں ہوا [نمبر ۶۸]۔ یہ اعتراف سلیمان شکوہ کے حالات میں ملتا ہے ("تذکرۂ ہندی" مرتبہٗ اکبر حیدری، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۸)۔ آزاد کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انشا تفضّل حسین خاں کے وسیلے سے سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچے۔ تفضّل حسین کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا اور انشا ۱۲۲۰ھ میں نواب کے ملازم ہوئے (اسلم فرخی، ص ۱۸۱، عابد، ص ۱۴۶ و ۳۹۱)۔ عابد نے تفضّل حسین کے انتقال کا سنہ ص ۱۴۶ پر ۱۲۱۳ھ اور ص ۳۹۱ پر ۱۲۱۵ھ لکھا ہے۔ اس طرح علامہ اور انشا کے بیچ وہ مکالمہ بھی بے اصل ہے جو ص ۲۶۸ پر درج ہے۔

انشا کے سنہ وفات کے لیے ان کے شاگرد بسنت سنگھ نشاط کا قطعۂ تاریخ دیا ہے جس سے تعمیہ کے ساتھ ۱۲۳۳ھ برآمد ہوتی ہے [۲۶۹]، لیکن وہ مصحفی کی رباعیِ تاریخ سے واقف نہیں، جس کا دوسرا شعر یہ ہے:

تاریخش گفت مصحفی بے کم و کاست
"اے وائے کہ مردہ قدردانِ شعرا"

اس سے ۱۲۳۲ھ حاصل ہوتے ہیں۔ قاضی عبدالودود اور مالک رام ۱۲۳۲ھ کو صحیح مانتے ہیں لیکن عابد کہتے ہیں کہ شعراء کے آخر میں ہمزہ ہے اور اس کا ایک عدد محسوب کیا ہے ("انشا"، ص ۲۸۰)، لیکن مالک رام کو ایک مجلّد میں انشا کے کسی قریبی شخص کی طرف سے انشا کی صحیح تاریخِ ولادت و وفات لکھی ملیں۔ اس نے تاریخ وفات ۳ جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ روزِ دوشنبہ لکھی ہے (۱۱)۔ اس لیے ۱۲۳۲ھ کو ۱۲۳۳ھ پر ترجیح دی جانی چاہیے۔

آزاد نے انشا کی تصانیف کی جو تفصیل دی ہے اس میں بعض کی تصحیح قاضی عبدالودود نے کی ہے۔ ص ۲۷۴ پر آزاد نے دیوانِ فارسی کے لیے لکھ دیا: "فقط مسخرا پن۔ مضمون کو دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔" قاضی صاحب نے دیوان کو بالاستیعاب پڑھ کر دعویٰ کیا: "اس میں ایک مصرع بھی ایسا نہیں جس میں مسخرا پن ہو۔ بعض اشعار مین مضمون بھی بلند ہے،" [نمبر ۲۶۷]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے فارسی دیوان کو پڑھے بغیر اندازے سے لکھ دیا کہ اس میں مسخرے پن کے مضامین ہیں۔ آزاد نے فارسی مثنوی "شیر

برنج" کو مثنویِ مولانا روم کی طرز میں بتایا ہے اور اسے بچپن کا کلام قیاس کیا ہے (ص ۲۷۶-۲۷۵)۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ اس کا صحیح نام "شیر و برنج" ہے۔ یہ خود انشا کے مطابق "نان و حلوائے بہائی" کا جواب ہے۔ اس کی تصنیف کے وقت انشا ۳۵ سال سے کم نہ تھے [نمبر ۶۴]۔ مثنوی "ماتہ عامل" کو بھی اوائلِ عمر کی قیاس کیا ہے (ص ۲۷۸)۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سعادت علی خاں کی تخت نشینی [۱۲۱۳ھ] کے بعد کی ہے۔ اس وقت انشا اپنی عمر کے پانچویں عشرے میں تھے [نمبر ۲۶۷]۔

آزاد نے اس مصرع کو مصحفی کے نام سے درج کیا ہے:

واللہ کہ شاعر نہیں تُو بھانڈ ہے بھڑوے (ص ۲۸۳)

عابد نے واضح کیا کہ یہ دراصل منتظر شاگردِ مصحفی کے ایک مخمس کا چوتھا مصرع ہے، جس میں آخری لفظ "بھڑوے" کی جگہ "بچود" ہے۔ ہاں اس پورے مخمس کے ٹیپ کے مصرع کی ردیف "بھڑوے" ہے ("انشا کے حریف و حلیف"، ص ۱۱۲)۔ ہجو کیا ہے، انشا کی بیوی، بیٹی، ہم شیرہ وغیرہ کو قحبہ بنا کر مغلظات سنائی ہیں۔ آزاد لکھتے ہیں کہ انشا اور مصحفی کے معرکوں کے وقت آصف الدولہ شکار میں تھے۔ انھوں نے اپنے لکھنؤ میں نہ ہونے پر ہزاروں افسوس کیے، ان ہجووں کو منگا کر سنا اور انعام بھیجے (حاشیہ ص ۲۸۵)۔ عابد لکھتے ہیں کہ مصحفی نے آصف الدولہ سے استغاثہ کیا اور "خازن الشعرا" کے مطابق آصف الدولہ نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دیا اور وہ عازمِ حیدر آباد ہوئے ("انشا کے حریف و حلیف"، ص ۱۴۰)۔ بہرحال انعام کا سوال ہی نہیں۔

آزاد لکھتے ہیں: سعادت علی خاں نے مصرع کہا تھا:

پگڑی تو نہیں، ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی

اس پر انشا نے پوری غزل کہہ دی (ص ۲۸۶)۔ سعادت علی خاں شاعر نہیں تھے۔ کلیاتِ انشا میں اسے گفتۂ حضور کہا ہے لیکن ترکی روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی خاں نے نثر میں فقرہ کہا تھا، "یہ پگڑی تو نہیں، فرانسیس کی ٹوپی ہے،" اسی کو انشا نے موزوں کر دیا اور بعد میں غزل کہی ("انشا"، ص ۶۴-۲۶۳)۔

لکھتے ہیں: سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے انشا کی گود میں سر دھرے، سرور کے عالم میں دریا کی سیر کر رہے تھے کہ لبِ دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا: "حویلی علی نقی خاں بہادر کی۔" انشا سے کہا، اسے رباعی کر دو۔ انشا نے اسی وقت عرض کی (ص ۲۸۶)۔ چونکہ مصرعِ تاریخ مکمل نہ تھا اس لیے انشا نے بھی اس پر تین غیر موزوں مصرع لگا دیے۔ انھیں رباعی سعادت علی خاں جیسا غیرِ شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔ عابد نے اس لطیفے کا ماخذ "طلسمِ ہند"

Scanned by CamScanner

شائع شدہ ۱۸۷۴ء میں تلاش کیا۔ اس کے مطابق سواریِ حضور منشی علی تقی خاں کے مکان کے قریب ہو کر نکلی۔ اس کا مصرعِ تاریخ دیکھ کر سعادت علی خاں نے مسکے کے ساتھ انشا کی طرف دیکھا۔ انشا نے فوراً نام نہاد مصرع لگا دیے ("طلسمِ ہند"، ص ۳۶۷، بحوالۂ "انشا"، ص ۲۰۰-۱۹۹ و ص ۹۹-۲۹۸)۔

آزاد نے اس واقعے میں یوں نمک مرچ لگایا کہ نواب کی سڑک کی سواری کی جگہ انھیں دریائی نواڑے میں لٹا دیا، حالانکہ علی تقی خاں کا مکان ریزیڈنسی کے پاس تھا، جہاں گومتی نہیں۔ سعادت علی خاں آخر عمر میں بیماری سے شفا پا کر منہیات سے تائب ہو گئے تھے؛ انھیں سرور کے عالم میں دکھا دیا۔ انشا کو غلماں بنا دیا اور نواب کا سر ان کی گود میں رکھ دیا (عابد، ایضاً)۔

اب لیجیے، انشا کا شاہ نصیر کو رح:

لگا چھپر کھٹ میں چار پیئے... الخ

کی شانِ نزول سنانا (ص ۲۸۷)۔ عابد کے بقول یہ شعر کلیاتِ انشا میں نہیں ملتا۔ لکھنؤ میں شاہ نصیر و انشا کی ملاقات کا کوئی ثبوت نہیں۔ آزاد نے شاہ نصیر کے احوال میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں کوئی اتنی بات کا بتانے والا نہ رہا کہ کس کس سنہ میں گئے تھے (ص ۴۰۴)۔ آزاد کے مطابق شاہ نصیر نے لکھنؤ کے دو سفر کیے۔ پہلے سفر میں انھوں نے جن غزلوں کا ذکر کیا ہے وہ ۱۲۱۰ھ کی ہیں۔ اس وقت انشا سلیمان شکوہ کے ملازم تھے، سعادت علی خاں کے نہیں۔ شاہ نصیر کا دوسرا سفر ۱۲۲۹ھ میں ہوا۔ یہ انشا کے جنون کا زمانہ ہے۔ اس طرح چھپر کھٹ والا پورا واقعہ اختراعی ہے، جو محض میاں بےتاب کا قول درج کرنے کے لیے تراشا گیا ہے ("انشا"، ص ۳۱۱)۔

ص ۲۸۷ پر انشا کے ننگے سر کھانا کھاتے وقت سعادت علی خاں کا دھول مارنا اور انشا کا ان کو شیطان کہنا بھی خلافِ قیاس ہے۔ عابد لکھتے ہیں کہ "ترکی روزنامچے میں کئی جگہ کھانے اور کھانے کے وقت کا ذکر آیا ہے،" کہیں یہ نہیں کہا کہ سعادت علی خاں انھیں ساتھ میں کھانا کھلاتے تھے۔ لطیفے میں پہلے دستار ہے جو بعد میں ٹوپی میں بدل جاتی ہے ("انشا"، ص ۶۷-۱۶۶)۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ والیِ ملک کے سامنے انشا ننگے سر بیٹھنے کا سوءِ ادب کریں اور مذاق میں بھی انھیں شیطان کہنے کی گستاخی تو کر ہی نہیں سکتے تھے۔

میر علی مرثیہ خواں سے متعلق لطیفے میں انشا نے زیوروں کے تکازے میں بات کی ہے (ص ۹۰-۲۸۹)۔ اس میں کئی غلطیاں ہیں: "کانوں میں جھمکے وہ کون دونوں صاحب زادے۔ گلے میں نولکھا ہار۔ وہ کون؟ خان علامہ۔" (ص ۲۹۰)۔ ڈاکٹر عابد نے واضح کیا کہ

Scanned by CamScanner

سعادت علی خاں کے دو نہیں، پانچ بیٹے تھے۔ خان علامہ تفضل حسین انشا کی باریابی سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ یہ کہانی آزاد نے ریختی کے شعر: "دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا،" کے پیشِ نظر گڑھی ("انشا"، ص ۳۹۵)۔

سعادت علی خاں اور جان بیلی میں ہِجر اور ہَجر کی بحث کا واقعہ آزاد کی افسوس ناک اختراع ہے (ص ۹۲-۲۹۰)۔ انشا کا جان بیلی کو دیکھ کر طرح طرح کے منہ بنانا خلافِ امکان ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون لکھتی ہیں کہ اُس زمانے میں کسی انگریز افسر کے سامنے تین تین دفعہ چہرہ بدلنے کی چھلیں جان کی بازی ہار کر ہی کی جا سکتی تھیں (۱۲)۔ پروفیسر آزاد گورنمنٹ کالج پنجاب کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر کے ہاتھوں جو پریشان ہوتے تھے اس کے نفسیاتی انتقام کے لیے انشا و ذوق کے بیانات میں انگریزوں کا مذاق اڑایا۔ سعادت علی خاں اور جان بیلی میں کبھی نہیں بنی، ہمیشہ تلخی رہی۔ وہ سعادت علی خاں کے یہاں دوستانہ صحبت کے لیے آ ہی نہ سکتے تھے۔ ہجر اور ہجر کی بحث کی تفصیل رقعاتِ قتیل سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ بحث مرزا جعفر اور قتیل کے بیچ پیش آئی تھی یا انشا اور قتیل کے بیچ۔ قتیل ہجر بہ کسرہ اول کو درست مانتے تھے انشا ہَجر بالفتح کو۔ انشا نے آیاتِ قرآنی سے اپنی بات ثابت کر دی۔ اس بحث میں جان بیلی اور سعادت علی خاں کہاں سے آ ٹپکے۔ جس شعر کو آزاد نے جامی کا کہا ہے وہ بقولِ انشا حافظ کا ہے ("حریف و حلیف"، ص ۶۱-۱۵۷، نیز "انشا"، ص ۶۷-۱۷۰)۔

آزاد نے ص ۲۹۴ کے فٹ نوٹ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تاریخی اغلاط قاضی صاحب ہی آشکارا کر سکتے تھے۔ آزاد نے گنا بیگم کو دخترِ قزلباش خاں امید لکھا ہے حالانکہ وہ علی قلی خاں شش انگشتی کی بیٹی تھیں۔ [نمبر ۲۵] اسی طرح دلہن بیگم کو آصف الدولہ کی والدہ کہا ہے حالانکہ ان کی بیوی تھیں (ص ۳۶)۔

انشا کے جنون کے اسباب میں ایک یہ لکھا ہے کہ انھیں دنوں تعالیٰ اللہ خاں جوان بیٹا مر گیا (ص ۲۹۵)۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ تعالیٰ اللہ خاں کا انتقال ۱۲۱۷ھ میں ہوا اور انشا کی خانہ قیدی بہت بعد کا واقعہ ہے۔ [قاضی ص ۲۶] رنگین کی زبانی انشا کی آخر عمر کے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ سر تا سر وضعی ہیں۔ یہ رنگین کی کسی تصنیف میں نہیں ملتے۔ لکھتے ہیں: خان موصوف کہا کرتے تھے ... (ص ۲۹۶)۔ کس سے؟ رنگین، انشا کی وفات کے دس برس بعد سیر و سیاحت سے واپس آئے انھیں تو انشا کی وفات کا علم بھی بہت بعد میں ہوا ہوگا۔ اس زمانے میں تربوز چار آنے کا نہیں، کوڑیوں کا ملتا ہوگا۔ فرحی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ خود آزاد کو تربوز بہت مرغوب تھا اس لیے اسے انشا پر بھی چسپاں کر دیا (۱۳)۔ آخری مشاعرے میں جو غزل انشا سے پڑھوائی ہے وہ ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہونے والے مصحفی

Scanned by CamScanner

کے "تذکرۂ ہندی گویاں" میں موجود ہے۔ [قاضی ص۲۶۵] غرض یہ ہے کہ ص۹۹-۲۹۶ پر بیان کردہ تمام ڈرامائی واقعات آزاد کے خلاق تخیل کی تخلیق ہیں۔

مصحفی ان کے حال کی ابتدا میں یہ شعر لکھتے ہیں:

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی

میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

(ص۳۰۹)

مجھے معلوم نہیں کہ یہ شعر واقعی کلامِ مصحفی میں ملتا ہے کہ نہیں لیکن آزاد نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ یہ شعر میر کے مشہور قطعے کے دو شعروں کے مصرعوں سے بنایا گیا ہے۔ نثار احمد فاروقی کو یہ قطعہ حیاتِ میر کی ایک بیاض میں ملا جس سے یقینی ہوجاتا ہے کہ یہ میر ہی کا ہے۔

آزاد مصحفی کے لیے لکھتے ہیں کہ آصف الدولہ کے عہد میں دلی سے لکھنؤ گئے (ص۳۱۰)۔ لیکن آزاد نے "تذکرۂ ہندی گویاں" میں نواب محمد یار خاں امیر کے احوال کو توجہ سے نہیں پڑھا جس کے مطابق مصحفی پہلی بار دلی سے ٹانڈے گئے اور وہاں سے شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ گئے اور ایک سال کے بعد واپس دہلی آگئے۔ بعد میں دوبارہ دلی سے لکھنؤ گئے۔ اسی ص۳۱۰ پر لکھا ہے کہ "علمیت کا حال معلوم نہیں۔" اسلم فرخی نے توجہ دلائی کہ مصحفی نے "ریاض الفصحا" میں اپنی تعلیم کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے (اسلم، ص۱۹۲)۔

آزاد لکھتے ہیں کہ "بڑھاپے میں پھر شادی کی تھی۔" (ص۳۱۱)۔ قاضی عبدالودود نے دعویٰ کیا کہ اس شادی کا کوئی ثبوت نہیں۔ [نمبر ۳، ۲۷] ڈاکٹر ابواللیث نے "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں "مجمع الفوائد" کے حوالے سے لکھا ہے کہ نکاح شرعی صرف ایک بار کیا تھا۔ (اسلم فرخی، ص۱۹۴)۔ انشا کی تصانیف کے سلسلے میں دیوانِ ہفتم کے بعد لکھتے ہیں:

ایک دیوان اور ہے، اس میں سید انشا کے جھگڑے بھی ہیں؛ یہ آٹھواں ہوگا کہ سب سے اخیر ہے۔

(ص۱۲-۳۱۱)

قاضی عبدالودود نے اصلاح کی کہ انشا سے معرکے عہدِ آصف الدولہ [متوفا ۱۲۱۲ھ] میں ہوئے۔ اس سے بعد والا دیوان تیسرا ہے، آٹھواں نہیں۔ آٹھویں دیوان کی تصنیف سے پہلے انشا مر چکے تھے۔ [قاضی ص۲۷۰] مصحفی کے تذکروں کی داد دیتے ہوئے آزاد نے لکھا ہے کہ ان میں اپنے کل شاگردوں کی فہرست بھی دی ہے (ص۳۱۳)۔ آزاد نے "تذکرۂ

Scanned by CamScanner

ہندی" غالباً دیکھا تھا "ریاض الفصحا" نہیں دیکھا۔ بہر حال کسی تذکرے میں تلامذہ کی فہرست نہیں (نمبر ۱۳۱)۔

آزاد نے مصحفی کی پُرگوئی (اور حاجت مندی) کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ شعر بیچتے تھے۔ پہلے تو ان کا سالا چن لیتا، بعد میں دوسرے گاہک، جو کچھ بچتا وہ خود لیتے (ص ۳۱۴)۔ اسلم فرخی پوچھتے ہیں کہ لکھنؤ میں سالا کہاں سے آگیا؟ دوسرے یہ کہ مصحفی اتنے کم عقل نہ تھے کہ بکسیے اشعار مشاعرے میں پڑھتے (اسلم، ص ۱۹۵)۔

ص ۳۱۷ پر آزاد نے جو کلمرز لکھا ہے کہ اول تو مرزا سلیمان شکوہ کی غزل کو مصحفی بنایا کرتے تھے۔ جب سید انشا پہنچے تو غزل ان کے پاس آنے لگی، اس کی تردید ص ۲۶۷ کے ضمن میں کی جا چکی ہے کہ سلیمان شکوہ کے حالات میں مصحفی نے اعتراف کیا ہے کہ وہ انشا کے وسیلے سے سلیمان شکوہ کے پاس پہنچے۔ آزاد نے چالیس کے لائق، دس بیس کے لائق کے شعروں سے مصحفی و انشا کی مسابقت کا استدلال کیا ہے (ص ۳۱۷)۔ لیکن قاضی عبدالودود نے واضح کیا کہ یہ اشعار بہت بعد کے ہیں اور مصحفی سلیمان شکوہ کے استاد بھی نہ تھے (نمبر ۱۳۲)۔ بقولِ عابد یہ غزل ساتویں دیوان میں ہے جو ۱۲۲۵ھ کے بعد شروع ہوا۔ گویا ان اشعار میں انشا کی طرف نہیں، کسی اور کی طرف اشارہ ہے۔ انشا اور مصحفی کے معرکوں کی تفصیل عابد کی کتابوں "انشا کے حریف و حلیف" اور "انشاءاللہ خان انشا" میں ملاحظہ ہو۔ ان میں بعض اوقات آزاد کے بیانات سے اختلاف ملتا ہے۔

آزاد نے مصحفی کے کئی اشعار کی زبان پر طبیعت کا امروہہ پن کہہ کر طنز کیا ہے (ص ۲۳۴ و ۳۱۳) چوتھے دور کی تمہید میں مصحفی کا شعر نقل کرتے ہیں ع:

اس گل کی باغ میں جو حنا نے چلائی بات

فٹ نوٹ میں طنز کرتے ہیں: "بات چلائی"، وہی امروہہ والی بات ہے (ص ۲۳۴)۔ قاضی عبدالودود نے میر کے یہاں سے تین مصرع تلاش کیے جن میں بات چلانے کا محاورہ ہے۔ [نمبر ۶۲] لیکن ان سے کہیں زیادہ تفصیل سے نثار احمد فاروقی نے جواب دیا ہے جنھوں نے آزاد کے جملہ اعتراضات کی تردید میں کن کن اساتذہ کی اسناد پیش کیں (۱۴)۔

آزاد نے انشا و مصحفی دونوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ قلمی مرقعے بھی کمال کے ہیں، لیکن ان میں صنعت کہاں تک ہے، وہ دوسری بات ہے۔ ان میں آزاد نے بالیقین انشا کی حمایت اور مصحفی کی سبکی میں جنبہ داری دکھائی ہے جو محققین کے طفیل پوشیدہ نہ رہ سکی۔

ناسخ۔ آزاد نے خود اعتراف کیا ہے کہ رغمی نے انھیں ناسخ کے حالات تفصیل سے

Scanned by CamScanner

لکھ کر بھیجے جن سے طبعِ ثانی میں اضافہ کیا گیا۔ آزاد رغمی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ناسخ کے والد لاہور سے گئے تھے، ناسخ ان کے ہمراہ تھے (حاشیہ، ص ۳۴۳)۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ رغمی امین اللہ طوفان کے بیٹے تھے۔ ان کے بھائی کے "تذکرۂ ابنِ امین اللہ طوفان" میں بہ صراحت مذکور ہے کہ ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔

بقولِ آزاد ناسخ کی شعر گوئی کے ابتدائی دور میں منجملہ دوسروں کے حاجی محمد صادق خاں اختر نے ان کی بڑی قدردانی کی (ص ۳۴۶)۔ قاضی عبدالودود تبصرہ کرتے ہیں کہ ناسخ کی ابتدائی غزل خوانی کا زمانہ ۱۲۱۷ھ کے قریب ہوگا۔ قاضی اختر ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعریف کا کوئی خاص وزن نہیں ہو سکتا تھا، نیز اختر کو کسی نے حاجی نہیں لکھا۔ [نمبر ۱۳۷] ناسخ کی سیاحی کے سلسلے میں "آبِ حیات" میں عظیم آباد پٹنہ کو بھی شامل کیا ہے (ص ۳۵۲)۔ قاضی عبدالودود کے مطابق ان کے عظیم آباد جانے کا کوئی ثبوت نہیں۔

آزاد نے ناسخ کے لکھنؤ سے نکلنے کا یہ سبب لکھا ہے کہ انھوں نے غازی الدین حیدر کی مدح میں قصیدہ لکھنے سے انکار کر دیا تھا (ص ۳۵۲)۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق ناسخ کی طبیعت سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ نصیر الدین حیدر (کذا، صحیح: غازی الدین حیدر) کے دربار میں قصیدہ خوانی کو اپنے مرتبہ سے گرا ہوا خیال کریں جب کہ وہ اس سے پہلے وزرا کے دامنِ دولت سے وابستہ رہنے پر فخر کرتے تھے (۱۵)۔ اسی سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں: "معتمد الدولہ ان کے بااخلاص شاگرد تھے،" (ص ۳۵۴)۔ قاضی عبدالودود نے چند الفاظ میں تردید کی۔ "وہ شاعر ہی نہ تھے۔" [نمبر ۲۱۸]

حکیم مہدی معزول ہو کر نکلے تو بقولِ آزاد تاریخ کہی:

کاشو برائے پختن شلغم گریختہ

(ص ۳۵۳)

قاضی صاحب نے تاریخ نکال کر دیکھی اور انکشاف کیا کہ پورے مصرع سے ۴۱۹۵ برآمد ہوتا ہے۔ مطلوبہ ۱۲۳۵ھ صرف "گریختہ" سے مستخرج ہوتا ہے۔ [نمبر ۷۳]۔ حکیم مہدی کے دوبارہ زوال کی تاریخ نئے انداز سے کہی:

از جائے حکیم بشت برگیر

سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

[۱۲۴۸ھ] (ص ۳۵۳)

قاضی عبدالودود نے معرکے کی دریافت کی کہ ناسخ کے ایک معاصر کی کتاب "تاریخِ

Scanned by CamScanner

مختتم" کے مطابق یہ صاحب راے کی طبع زاد ہے۔ اس سے پہلے کی بیت بھی دی ہے:

استاد حکیم از مراتب

تاریخ بطرزِ نو رقم کی

[قاضی نمبر ۷۴]

خود ناسخ کی تاریخ وفات کے سلسلے میں "آبِ حیات" کی طبعِ ثانی میں رغمی کا یہ قول ایزاد کیا کہ تقریباً سو برس کی عمر ہوگی (ص ۳۵۲)۔ قاضی صاحب کے مطابق ناسخ ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ پیدا ہوے اور تقریباً ۷۰ برس کی عمر پائی (ص ۲۱۳)۔ اسلم فرخی لکھتے ہیں کہ اگر ناسخ نے سو سال کی عمر پائی ہوتی تو وہ انشا اور رنگین سے بھی بڑے ہو جاتے (اسلم، ص ۲۲۰)۔

قاضی عبدالودود نے ناسخ کی تصانیف کے سلسلے کے بعض متضاد بیانات کی طرف دھیان دلایا۔ قصائد کا شوق نہ تھا (ص ۵۴-۳۵۳)۔ "اگر وہ قصیدہ کہتے تو خوب کہتے،" (ص ۳۵۴)۔ آغا میر نے سوالاکھ روپیہ قصیدے کا صلہ دیا تھا (ص ۳۶۸)، [حوالہ قاضی نمبر ۱۴۰] میں عرض کرتا ہوں کہ فارسی میں ناسخ کے کئی قصیدے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون، "ناسخ کے غیر مطبوعہ قصیدے" جو میرے مجموعے "حقائق" میں شامل ہے۔ تصانیف کے سلسلے میں آزاد نے ان کی مثنوی کا نام "نظم سراج" لکھ کر ایک غلط بیانی کو رواج دیا (ص ۳۵۴)۔ مثنوی کا صحیح نام "سراج نظم" ہے۔ [قاضی نمبر ۷۵]

اس کے آگے کئی صفحوں پر ناسخ کے کلام پر تنقید خوب کی ہے جس سے ان کی تمام خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں اعتراضات بھی شامل ہیں۔ ناسخ کے کئی شعروں کو مشاہیرِ فارسی کے اشعار سے ماخوذ دکھا کر آزاد نے تلاش و تدقیق کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں (ص ۳۶۰)۔ تنقیدِ کلام کے سلسلے میں ذیل کا شعر بھی ان سے منسوب کیا ہے:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دل گیر کو

کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

(ص ۳۶۱)

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ یہ شعر ص ۳۶۱ پر ناسخ سے اور "آبِ حیات" کی ابتدا میں ص ۳۸ پر وزیر سے منسوب کیا ہے اور یہ انتساب ہی صحیح ہے۔ [نمبر ۷۸] آزاد نے ناسخ سے مہدی حسن فراغ کو مخاطب کر کے کہلایا ہے، "میں فارسی کا شاعر نہیں،" (ص ۳۶۲)۔ شاید ایسا نہیں کہا ہوگا کیونکہ ان کی تخلیق سے فارسی کے کئی قصیدے اور دوسری مختصر

Scanned by CamScanner

نظمیں ملتی ہیں اس کے آگے ناسخ کے کئی لطیفے اور نقلیں لکھی ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے کتنے رغمی نے لکھ کر بھیجے تھے اور کتنے ان کے خانہ ساز ہیں۔

آزاد نے لکھا ہے کہ "۱۸۳۱ء میں معتمد الدولہ آغا میر نے جو سوالاکھ روپیہ قصیدے کا صلہ دیا تھا انھوں نے مرزائی صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔" (ص ۳۶۸)۔ ظاہراً اس واقعے کو لکھنؤ میں دکھایا ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں: آغا میر ۱۸۲۸ء میں یا اس کے کچھ بعد معزول ہو کر کان پور چلے گئے تھے۔ کیا انھوں نے یہ روپیہ کان پور میں دیا اور ناسخ نے مرزائی کو لکھنؤ بھیجا۔ اتنی بڑی رقم خلافِ قیاس ہے۔ [نمبر ۲۱۸] اسلم فرخی بھی یہ سب لکھ کر کہتے ہیں کہ ایک معزول وزیر کیوں کر اتنا صلہ دیتا (اسلم، ص ۱۸-۲۱۷)۔ میری رائے میں برسرِ عہدہ وزیر بھی اتنا صلہ نہ دیتا۔ واقعہ ۱۸۳۱ء ہی کا ہے، کیونکہ ناسخ نے اس کی جو عیسوی تاریخ کہی ہے اس سے صاف ۱۸۳۱ء برآمد ہوتا ہے اور اس وقت آغا میر معزول ہو چکے تھے۔ ممکن ہے اس تاریخ کا تعلق قصیدے کے مبیّنہ صلے کی رقم سے نہ ہو، بلکہ کسی اور چوری کے لیے کہی گئی ہو۔

اب کچھ اور تاریخیں

لکھتے ہیں: ۱۲۳۵ھ میں غسلِ صحت کیا تو کہا ع:

شود صحتِ ہمایوں مبارک

۱۲۳۵ھ (ص ۳۶۸)

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ اس سے محض ۱۱۸۹ھ نکلتا ہے۔ آزاد لفظ "الٰہی" کو محذوف کر گئے جس کے ۴۶ عدد ہیں۔ [نمبر ۳۰۰] چونکہ اس مصرع میں کہیں لفظ الٰہی کے اضافے کی گنجائش نہیں اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ لفظ پہلے مصرع کے آخر میں رہا ہوگا۔

... نے ناسخ کے چار خطوط چرا لیے۔ تاریخ کہی ع:

سیاہ ہمچو قلم باد روے حاسدِ من

(ص ۳۶۸)

قاضی صاحب نے توجہ دلائی کہ اس سے محض ۶۸۶ مستخرج ہوتا ہے۔ کلیات میں "حاسدِ من" کی جگہ "آں خاین" ہے اور اس سے ۱۲۳۵ھ نکلتا ہے۔ [نمبر ۱۳۸] آزاد آگے لکھتے ہیں: پھر چار خطوط جاتے رہے، تاریخ کہی ع:

صد حیف تلف چہار نامہ

(ص ۶۹-۳۶۸)

Scanned by CamScanner

قاضی صاحب لکھتے ہیں۔ آزاد نے مادۂ تاریخ غلط لکھا ہے۔ صحیح مصرع ہے:

صد حیف تلف چہار نامہ اے وائے

لیکن اس سے محض ۱۰۳۵ مستخرج ہوتا ہے۔ دو سو کی کمی کس طرح پوری ہو سکتی ہے، اس کا پتا نہیں چلتا۔ [نمبر ۱۳۹]

عرض کرتا ہوں کہ کسی قاصد نے ناسخ کے چار خطوط غائب کر دیے تھے۔ یہ ۱۲۴۵ھ کا واقعہ ہے اور اوپر کے دونوں مصرع اسی ایک واقعے سے متعلق ہیں۔ میں نے اس کی تفصیل اپنی کتاب "ذکر و فکر" میں ص ۵۴-۱۵۲ پر دی ہے۔ اس سانحے پر کُل نو تاریخیں کہیں۔ ایک سے عیسوی ۱۸۲۹ اور بقیہ سے ہجری ۱۲۴۵ھ نکلتا ہے۔ ایک قلمی دیوان میں مصرعِ تاریخ میں "انخاین" لکھا ہے جس کی قرأت "آں خاین" صحیح نہیں۔ یہ "ایں خائن" ہے اور اس طرح مصرع سے ۱۲۴۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔ دوسرا مصرع:

صد حیف تلف چہار نامہ اے وائے

قلمی دیوان میں:

شد حیف تلف چہار نامہ اے وائے

ہے اور اس سے بھی ۱۲۴۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

آزاد اس کے آگے ص ۳۶۹ پر آتش و ناسخ کے مطلع ع: چشم یار میں، مردمِ بیمار میں، نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ان میں ردیف "میں" کی جگہ "پر" ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر میں اس باب کی ابتدا میں "آبِ حیات" کے دوسرے ایڈیشن کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں؛ پھر اعادہ کرتا ہوں۔ رشید حسن خاں کے مطابق قاضی عبدالودود نے "تذکرۂ ابنِ امین اللہ طوفان" کے حواشی میں لکھا کہ آزاد نے جو ردیف "میں" پر اعتراض کیا ہے، آتش و ناسخ کے مطبوعہ کلیاتوں میں ان غزلوں میں ردیف "کو" ہی ہے۔ دیوان کی طرف رجوع کیے بغیر اعتراض جڑ دینا نہایت غیر ذمےدارانہ روش ہے۔

(حواشیِ تذکرۂ مذکور، ص ۲۹، بحوالۂ رشید حسن خاں: "ادبی تحقیق"، ص ۲۰-۱۱۹)

رشید حسن خاں نے "آبِ حیات" مطبوعہ ۱۸۹۹، ص ۳۴۴ میں پایا کہ وہاں ردیف "کو" ہی چھپی ہوئی ہے، اس لیے قاضی صاحب کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ رشید حسن خاں کے منقولہ اقتباس میں یہ جملے بھی نہیں: "آزاد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیمار میں گنڈا کیوں کر پہناتے ہیں۔ گنڈا بیمار کو پہنایا کرتے ہیں، یہ معترضانہ جملے طبعِ دوازدہم میں ص ۳۶۹ پر ہیں۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"جو اشاعتیں ۱۹۰۰ء سے پہلے کی ہیں، ان میں اور بعد کی اشاعتوں میں زیادہ اختلاف

Scanned by CamScanner

ہیں۔ آزاد کی دیوانگی کا زمانہ بھی معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے ورثہ بھی صاحبِ قلم تھے۔" (رشید حسن خاں، ص ۱۲۱-۱۲۰)۔ بقولِ آزاد، ناسخ کے ایک مطلع میں جنگ نوفل اور کیادہ کھینچنے کو لوگوں نے مہمل کہا لیکن ناسخ نے انھیں ان دونوں اصطلاحوں کے معنی بتائے (ص ۳۷۱)۔ قاضی لکھتے ہیں کہ یہ اصطلاحیں ہوس کی مثنوی، نظامی کی مثنوی اور "بہارِ عجم" میں مذکور ہیں۔ لکھنؤ میں ناسخ کے سوا کوئی ان اصطلاحوں سے واقف نہ تھا، یہ مضحکہ خیز ہے۔

[نمبر ۲۱۵] آزاد نے میرزائی صاحب کے لیے لکھا ہے: "ایک امیر شرفائے لکھنؤ میں سے تھے۔" [۳۷۱] یہ وہی میرزائی ہیں جن کے یہاں قصیدے کے صلے کی رقم رکھوا دی تھی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ امیر نہیں تھے، خوب صورت بت تھے۔ ناسخ ان پر فریفتہ تھے اور وہ لکھنؤ میں معشوقِ ناسخ مشہور ہو گئے۔

آزاد نے ص ۳۷۲-۳۷۱ پر دلّی اور لکھنؤ کی زبان کے کچھ اختلافات درج کیے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ لکھا کہ لکھنؤ میں اندھیاری بولتے ہیں، دلّی میں اندھیری۔ آتش و ناسخ کے بعض اشعار سے اندھیاری کے استعمال کی مثالیں دیں (ص ۳۷۱ و ص ۳۹۴)۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں آزاد کا یہ کہنا درست نہیں کہ دلّی والے اندھیری ہی بولتے ہیں۔ میر کا مصرع ہے:

چھد جاتے رہے کہ اندھیاری

نیز تاباں کے مصرع میں بھی اندھیاری آیا ہے۔ [نمبر ۲۵۵]

"جلوۂ خضر" اور "شعر الہند" میں اصطلاحاتِ ناسخ کی لمبی چوڑی فہرست ہے (رشید حسن خاں: مقدمۂ انتخابِ ناسخ، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۵۷)۔ لیکن آزاد نے صحیح صورتِ حال واضح کر دی۔

> ان لوگوں نے اور ان کے بعض ہم عصروں نے زبان کے باب میں اکثر قیدیں واجب سمجھیں۔ مگر اصل واضع ان قوانین کے میر علی اوسط اشک تھے۔
>
> (ص ۳۷۳-۳۷۴)

آزاد نے ناسخ کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں؛ ان میں سے بعض مصدقہ نہیں ہیں، بعض میں بےاحتیاطی کی وجہ سے اغلاط در آگئی ہیں، اس کے باوجود یہ حالات بساغنیمت ہیں۔ کلامِ ناسخ کی تنقید بالخصوص ان کی زبان کا جائزہ بےشبہہ قابلِ قدر ہے۔

خلیق۔ ان کا احوال طبعِ ثانی کا اضافہ ہے۔ اس میں خلیق و ضمیر کا ایک ہی مجلس میں مرثیہ پڑھنے کا واقعہ میر مہدی حسن فراغ کی زبانی سنایا ہے۔ بعد میں انیس کا دوسرا بیان میر علی حسن اشک سے روایت کیا ہے۔ اس سے آزاد کی تحقیق و تجسس کا پتا چلتا ہے۔

Scanned by CamScanner

مطلب یہ ہے کہ جہاں انھیں لطیفہ طرازی نہ کرنی ہو وہاں نئی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ اشک کا بیان اتنا معتبر نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس میں میر خلیق کو ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت میں آٹا گوندھتے دکھایا ہے۔

آزاد نے آخر میں لکھا ہے کہ ان کی کوئی پوری غزل ہاتھ نہ آئی۔ آزاد کے سامنے مصحفی کا "تذکرۂ ہندی گویاں" نہ تھا جس میں خلیق کی دو غزلیں درج ہیں (اسلم، ص ۳۲۹)۔

آتش۔ آزاد نے آتش کا جو نقشہ پیش کیا ہے۔ معلوم نہیں اس میں کتنی صحت ہے اور کتنی تخیل کی رنگ آمیزی۔ سر پر ایک زلف اور کبھی ایک حیدری چٹا اور طرہ سبزی کا، ساتھ ہی بانکی ٹوپی (ص ۳۸۸) طرہ ٹوپی کے ساتھ کیوں کر لگایا جا سکتا ہے؟ آزاد نے آتش کی موت کو دفعتاً بتایا ہے۔ "۱۲۶۳ ہجری میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک ایسا موت کا جھوکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گئے۔" (ص ۳۸۹)۔ لیکن خواجہ عبدالرؤف عشرت نے تذکرۂ "آبِ بقا" میں خواجہ محمد بشیر کے حوالے سے آتش کی بیماری کا ذکر کیا ہے جو تقریباً دو ہفتے چلی (اسلم، ص ۳۳۴)۔ آزاد نے صرف رعایت لفظی کی چاٹ میں موت کا جھوکا [کذا] شعلے کی طرح بجھ کر رہ جانا، بیماری کی موت کو مرگِ مفاجات میں بدل دیا۔

آتش و ناسخ کے معرکے کے سلسلے میں آزاد نے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب نے شیخ صاحب کی غزلوں پر متواتر غزلیں لکھیں تو ناسخ نے دیواں کا جواب، قرآں کا جواب والا شعر لکھا اور آتش نے اسی زمین میں جواب دیا (ص ۳۹۰)۔ قاضی عبدالودود نے ناصر کے تذکرے "خوش معرکۂ زیبا" کے حوالے سے انکشاف کیا کہ آتش نے نہیں، ان کے شاگرد سیوا رام شائق نے ناسخ کی ہر غزل کا جواب کہا جس پر ناسخ نے شعر کہا۔ اس کے جواب میں آتش نے مطلع کہہ کر اس شاگرد کو دے دیا، اپنے نام سے نہیں کہا۔ آزاد کے متن کے برعکس شائق کے مطلع کا متن یہ ہے:

چاہیے مومن کو دے اس نامسلماں کا جواب
جو کہے دیواں کو اپنے، یہ ہے قرآں کا جواب

[قاضی نمبر ۹۷]

چند صفحات پر آتش کی زبان کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے (ص ۹۵-۳۹۲)۔ باتیں ایسی پتے کی کہی ہیں کہ ہم آج تک انھیں دہراتے ہیں۔ کفن بگڑا، دہن بگڑا وغیرہ کے سلسلے میں آزاد نے لکھا ہے کہ آتش نے نشے کے سرور میں کہا کہ ان قافیوں میں کوئی شعر نکالے تو کلیجا نکل پڑتا ہے۔ جواباً مصحفی نے ایک شاگرد کی غزل میں یہ قافیے باندھ دیے

Scanned by CamScanner

(ص ۹۶-۳۹۵)۔ ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ یہ حکایت قابلِ قبول نہیں کہ آتش جیسا فقیر منش استاد کے سامنے تعلّی کرے اور مصحفی جیسا استاد شاگرد کو ذلیل کرنے کے لیے ایک نومشق کو جوابیہ شعر کہہ کر دے ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، طبع اوّل، ص ۳۴۳)۔ قاضی عبدالودود بھی اس معرکے کو نہیں مانتے کیونکہ اس زمین میں مصحفی کی غزل دیوانِ ہفتم میں ہے جس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۲۵ھ یا اس کے کچھ بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت آتش و مصحفی میں شاگردی و استادی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، لیکن استاد شاگرد کے بیچ کسی نزاع کا اشارہ "خوش معرکۂ زیبا" میں ضرور ملتا ہے۔ [قاضی نمبر ۰۷]

آزاد نے ایک جگہ کہا ہے کہ آتش کا ایک دیوان ان کی حیات میں رائج ہو گیا تھا، دوسرا تتمہ پیچھے مرتب ہوا (ص ۳۸۹)۔ لیکن بعد میں لکھتے ہیں کہ آتش کے انتقال کے بعد شاگردوں نے کلیات مرتب کیا (ص ۳۹۷)۔ اسلم فرخی اطلاع دیتے ہیں کہ کلیات آتش خود ان کی تصحیح سے ان کے انتقال سے دو سال پہلے ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوا۔ آزاد کو کلیات کی اشاعت کی تاریخ معلوم نہ تھی (اسلم، ۳۶-۲۳۵)۔

آزاد نے میر انیس سے یہ روایت کی ہے کہ آتش نے اپنے کسی شاگرد سے کہا کہ ہمیں نماز پڑھنا سکھا دو اور اس نے سنّیوں کے طریق سے نماز سکھا دی (ص ۳۹۸)۔ یہ روایت سرے سے ناقابلِ یقین ہے۔ جب آتش کا کوئی شاگرد تھا تو استاد کی عمر بھری جوانی کی تو ہوتی چاہیے۔ یہ کیوں کر تسلیم کرلیا جائے کہ ایک مسلمان کو اتنی عمر تک نماز پڑھنی نہ آتی تھی یا ایک پختہ عمر کے شیعہ کو شیعوں اور سنّیوں کے طریقِ نماز کا فرق معلوم نہ تھا۔

شاہ نصیر۔ یہ خیال رہے کہ آزاد کو ذوق کے دو استادوں غلام رسول شوق اور شاہ نصیر سے کد تھی، اس لیے انھوں نے شاہ نصیر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے بہت احتیاط سے قبول کرنا چاہیے۔ لکھتے ہیں: "یہ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے اور وہ قیام الدین قائم کے،" (ص ۴۰۳)۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں لیکن قائم نے اپنے تذکرے میں مائل کو قدرت کا شاگرد لکھا ہے۔ [نمبر ۱۲۵]

اسلم فرخی نے آزاد کے اسی صفحے کے دو متضاد بیانات کی طرف توجہ دلائی۔

"انھوں نے انگریزی عمل داری میں زندگی بسر کی۔" (ص ۴۰۳، سطر ۴)۔

"جب عمل داری انگریزی ہوئی تو انھیں دکن کا سفر کرنا پڑا۔" (ص ۴۰۳، سطر ۱۷)۔

اگر شاہ نصیر نے انگریزی عمل داری میں زندگی گزار دی تو یہ دکن ہجرت کرنے کی وجہ نہیں ہو سکتی (اسلم، ۲۴۳)۔

Scanned by CamScanner

آزاد شاہ نصیر کی استادی اور سنگلاخ زمینوں کو سر کرنے کا ذکر کرتے کرتے ان کی ایک لغزش کا ذکر کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے مشاعرے میں انھوں نے ایک شعر پڑھا جس میں تظلّم کو بجائے ظلم باندھ دیا تھا۔ اس پر انھوں نے سند میں محتشم کاشی کا شعر پڑھا (ص ۴۰۵)۔ تظلّم کے معنی ظلم کے خلاف فریاد کرنے کے ہیں۔ آزاد کے قول کے مطابق شاہ نصیر نے اس لفظ کو ظلم کے معنی میں باندھ دیا تھا۔ انھوں نے محتشم کا جو شعر دیا اس سے ان کی تائید نہیں، تردید ہوتی ہے۔ اسلم فرخی تبصرہ کرتے ہیں کہ آزاد نے لکھا نہیں کہ شاہ نصیر کا کون سا شعر تھا۔ قرین قیاس نہیں کہ نصیر جیسا استاد یہ غلطی کرے اور سند میں ایسا شعر پیش کرے جس میں تظلّم کے اصل معنی واضح ہوں (اسلم، ص ۲۴۳)۔

قدرت اللہ قاسم سے معرکے کا جو واقعہ آزاد نے لکھا ہے وہ اسلم کے نزدیک معقول نہیں معلوم ہوتا۔ شاہ نصیر نے فارسی شاعر قاسم انوار کا ذکر کیا تھا۔ اس میں زور لفظ "انوار" پر تھا کیونکہ رخِ انور اور بیاضِ گردن کا ذکر تھا (ص ۴۰۸)۔ قاسم کو برا ماننے کی کیا ضرورت تھی۔ قاسم نے اپنے تذکرے میں اس واقعے کا ذکر بھی نہیں کیا (اسلم، ص ۴۵-۲۴۴)۔ آگے چل کر آزاد نے "مجالسِ رنگیں" کے حوالے سے لکھا ہے کہ رنگین نے نصیر کے ایک شعر پر اصلاح دی جس سے نصیر ناراض ہوئے۔ "مجالسِ رنگیں" میں دوسری ہی بات ہے۔ کسی شخص کے اصرار پر رنگین نے نصیر کے شعر کی تعریف کر کے اس میں اصلاح کی۔ اسی شخص نے نصیر تک یہ خبر پہنچا دی۔ نصیر نے اس اصلاح سے اتفاق کیا اور اسے سو کر دیوان میں لکھ دیا (اسلم، ص ۲۴۸)۔ جب آزاد کا ماخذ "مجالسِ رنگیں" ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس میں تحریف کر کے خواہ مخواہ لطیفہ تراش لیا۔

"آبِ حیات" کی طبعِ اوّل میں مومن کا ذکر نہ تھا۔ اس پر اعتراضات ہوئے تو آزاد نے عذر کیا کہ حالات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مومن کو قلم انداز کر دیا تھا۔ عذر معقول نہیں ہے۔ مومن کے انتقال کے وقت آزاد کی عمر ۲۳ برس کی تھی۔ انھوں نے مومن کو مشاعروں میں پڑھتے سنا تھا۔ حالات لکھنا چاہتے تو بہم پہنچا سکتے تھے۔ شاید ایک وجہ یہ ہو کہ وہ ذوق کے ہم عصروں کو کم کرنا چاہتے تھے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں: مومن کے حال میں نہ ان کے دیوانِ فارسی کا ذکر ہے نہ مجموعۂ نثرِ فارسی کا حالانکہ یہ تصنیفِ "آبِ حیات" سے بہت پہلے معرضِ طبع میں آ چکے تھے۔ [نمبر ۸۱]

لکھتے ہیں: "مومن نے آزردہ کے مکان پر گلستان سعدی کی تنقیص کی۔ مولوی احمد دین شاگرد مولوی فضلِ حق نے اس کا جواب دیا۔" (ص ۴۲۶)۔ قاضی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ مومن نے گلستانِ سعدی پر اعتراض کیا تھا لیکن ظہور علی ظہور دہلوی شاگردِ مومن کے

Scanned by CamScanner

مطبوعہ دیوان سے پتا چلتا ہے کہ مومن نے تنقیص خود اپنے مکان پر کی تھی اور اس کا وہی جواب ظہور علی نے دیا تھا۔ [نمبر ۷،۲۹]

مومن پر پہلے ایڈیشن میں پہلے ہی نہ لکھا ہو لیکن دوسرے ایڈیشن میں جس شرح و بسط سے لکھا ہے اور ان کی شخصیت کی جتنی مکمل قلمی تصویر کھینچی ہے اس کے بعد شکایت کا کوئی موقع نہیں رہتا۔

ذوق۔ "آبِ حیات" میں ذوق کا بیان سب سے زیادہ مفصل ہے اور "آبِ حیات" پر اعتراضات کے باب میں بھی یہی بیان بیت الغزل ہے۔ آزاد نے ذوق کے حالات تین مرتبہ لکھے۔ "آبِ حیات" طبعِ اول میں اتنے مفصل نہ تھے، طبع دوم میں کئی نئی حکایتیں شامل کر دیں۔ تیسری بار انھیں حالات کو اپنے مرتبہ دیوانِ ذوق کے مقدمے میں دیا۔ میری تحریر کا تعلق صرف ادبی تاریخوں سے ہے جن میں دیوانِ ذوق نہیں آتا لیکن "آبِ حیات" میں ذوق کے حالات کے تقابلی مطالعے کے لیے مقدمۂ دیوان میں لکھے حالات کا حوالہ بھی ناگزیر ہے۔ محمود شیرانی نے "آبِ حیات" پر تبصرہ میر ضاحک پر ختم کر دیا ہے لیکن دیوانِ ذوق پر اپنے طویل مضمون میں مقدمۂ دیوانِ ذوق کا بھی جائزہ لیا ہے۔

شیرانی کے بعد اسلم فرخی نے اپنے تحقیقی مقالے میں شرح و بسط سے تبصرہ کیا لیکن حالاتِ ذوق پر سب سے زیادہ مفصل تبصرہ، بلکہ تجزیہ ڈاکٹر عابد پیشاوری کا ہے جنھوں نے "ذوق اور محمد حسین آزاد" نام کی تقریباً سوا تین سو صفحے کی کتاب تصنیف کر دی ہے۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق کے بیان کا بہت بڑا حصہ آزاد کے تخیل کی گل کاری ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے ہمت نہیں ہوتی کہ آزاد کے اس تاریخی ناولٹ کے جملہ بخیے ادھیڑوں۔ یہ کام عابد بخوبی انجام دے چکے ہیں۔ میں صرف اہم غلطیوں کی طرف اشارہ کروں گا جن کے لیے میرا ماخذ خاص طور سے عابد کی کتاب ہے۔ خود عابد نے شیرانی، اسلم فرخی اور ڈاکٹر صادق کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے گو بہت کچھ خود ان کے عمقِ نظر کا نتیجہ ہے۔

آزاد نے ذوق کا تعارف جن بلند آہنگ الفاظ میں دیا ہے وہ مضحکہ خیز ہے۔ شبلی نے پیغمبرِ اسلام کے مرقع کے لیے اس اسلوب کو اختیار کیا اور وہاں یہ زیب دیتا ہے، ذوق کے لیے نہیں (اسلم فرخی، ص ۵۹-۲۵۸)۔ آزاد نے ان کے والد کو سپاہی قرار دیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے مطابق شہر بھر انھیں نائی کہتا تھا (۱۶)۔ عابد کی رائے میں وہ دربان تھے (عابد، ص ۳۵)۔

عابد نے کئی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ آزاد، ذوق کے شاگرد نہ تھے۔ یہ شواہد جستہ

جستہ ان سے پہلے بھی بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ انھوں نے سب کو سمیٹ کر یک جا بیان کیا۔ تاریخی ترتیب سے وہ شہادتیں یہ ہیں:

۱۔ آزاد کی سب سے قدیم دست یاب نظم فارسی کا قطعہ تاریخِ وفاتِ ذوق ہے۔ یہ غالباً ۱۷ دسمبر ۱۸۵۴ء کو "دہلی اردو اخبار" میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان ہے: "کز نتائجِ طبعِ منشی محمد حسین پرنٹر اردو اخبار"۔ اس کا پہلا مصرع ہے:

چو رحلت کرد ابراہیم ذوق از عالمِ فانی

اس میں نہ خود کو تلمیذِ ذوق لکھا ہے نہ شعر میں ذوق کے نام سے پہلے "استاد" کا لفظ لائے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک اردو نثر ہے جس میں عربی اور فارسی میں کئی تاریخیں ہیں۔ اس میں بھی ذوق کو اپنا استاد نہیں کہا (عابد، "ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص ۱۲۰)۔

۲۔ آزاد نے انجمنِ پنجاب کے ۳۰ اگست ۱۸۷۴ء کے مشاعرے میں مثنوی "صبحِ امید" پڑھی۔ اخبار "پنجابی" لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۴ء میں اس کے خلاف ایک تبصرہ شائع ہوا۔ یہی تبصرہ ایک ادارتی نوٹ کے ساتھ اخبار "کوہِ نور" بابت ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۴ء میں ڈائجسٹ کیا گیا۔ مبصر نے اپنا نام پوشیدہ رکھا ہے۔ کہتا ہے:

"بندہ دلی کا رہنے والا اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کا ایک ادنیٰ شاگرد ہے۔ برسوں اپنا کلام استاد مرحوم کو دکھایا ہے اور بڑے بڑے معرکے کے مشاعروں میں ان کے ساتھ رہا ہے۔ استاد کا کوئی نامی گرامی شاگرد نہیں ہے، جس کو میں نہ جانتا ہوں۔ باوجود ان سب باتوں کے میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے مولوی محمد حسین آزاد کو نہ کبھی استاد کے سامنے غزل لاتے دیکھا نہ ان کے ساتھ کسی مشاعرے میں پڑھتے سنا۔ استاد کا بھتیجا ہونے سے لازم نہیں آتا کہ وہ ان کے شاگردِ رشید بھی بن جائیں۔ کاش مولوی صاحب کو شاعری سے کچھ مناسبت ہی ہوتی تو بھی استادی شاگردی کا دعویٰ ان کے چہرے پر کھل جاتا (فرخی، جلد ۱، ص ۶۷-۳۶۶ و عابد، ص ۱۲۳)۔

۳۔ صہبائی کے شاگرد منشی دھرم نرائن نے آزاد کو ایک خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۷۴ء میں لکھا:

جب میں دہلی میں تھا تو میں نے کبھی آپ کو فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا مگر استاد کا کلام آپ کی زبان پر رہتا تھا۔

(تنویر علوی، مقدمہ کلیاتِ ذوق، دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۵۵۔ عابد، ص ۱۲۳)۔

۴۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں الٰہی بخش معروف کو ذوق کا شاگرد قرار دے دیا۔ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد مرزا سعید الدین احمد خاں ابنِ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اس

Scanned by CamScanner

کی تردید کی اور دیوانِ معروف مطبوعہ بدایوں میں لکھا کہ "آبِ حیات" طبعِ اول کے بعد آزاد دلی گئے تو ضیاء الدین احمد خاں نے کہا:

آپ نے بالکل واقعہ نگاری کے خلاف کیا کہ ایسی بات بغیر تحقیق کے چھاپ دی۔ آپ کو چاہیے تھا کہ مجھ سے دریافت کرتے ورنہ حافظ غلام رسول صاحب ویران سے، جو ذوق مرحوم کے ارشد تلامذہ میں حاضر باش و نفسِ ناطقہ تھے، دریافت کر لیتے۔

(دیوانِ معروف، ص ۲۹-۲۲۵، بحوالہ فرخی، جلد-۲، ص ۷۷-۲ و عابد، ص ۱۳۲)۔

گویا ضیاء الدین احمد خاں نے آزاد کو ذوق کے شاگردوں میں شمار نہیں کیا۔

۵- ڈاکٹر محمد صادق کو انگریزی مقالے "محمد حسین آزاد حیات اور کارنامے" پر ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا(۱۷)۔ اس کے پہلے باب میں لکھتے ہیں:

It was, as his son told me, only after the death of Zauq (1854) that he began to recite his poems in Mushairas.

(عابد، ص ۱۱۶)

اگر وہ آزاد کے شاگرد ہوتے تو آزاد کے ساتھ مشاعروں میں اپنا کلام بھی سناتے۔

اسلم فرخی کے مطابق آزاد کی پہلی دستیاب اردو نظم "تاریخِ انقلابِ عبرت افزا" ہے جو ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے "دہلی اردو اخبار" میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی تراکیب سے فارسی رنگ میں شرابور ہے۔ پہلے دو شعر پوری طرح فارسی کے ہیں۔ ذوق کی شاگردی کا دعویٰ کیا۔ اس کے نیچے درج تھا:

"تصنیفِ مولوی محمد حسین المتخلص بہ آزاد تلمیذِ خاصِ حضرتِ خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق،"

اس سے پہلے وہ دو سال سے حکیم آغا جان عیش سے مشورہ کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں آزاد نے طے کیا کہ وہ دیوانِ ذوق تیار کریں گے اور اس کے لیے خود کو ذوق کا تلمیذِ خاص لکھا لیکن عیش کی شاگردی کو گول کر گئے (فرخی، جلد-۱، ص ۹۶ و عابد، ص ۲۲-۱۲۱)۔

اپنے اس اختراع کی توثیق کے لیے اپنے مرتبہ دیوانِ ذوق کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

مجھے بیس برس تک اس طرح حضوریِ خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھ کر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔

(دیوانِ ذوق، دہلی، ایڈیشن ۱۹۳۳ء/۱۳۵۱ھ ص ۲)۔

Scanned by CamScanner

حیرت ہے کہ محققین نے آزاد کے اس بیان کی لغویت پر دھیان نہیں دیا۔ سب سے پہلے عابد نے اس طرف توجہ منعطف کرائی کہ آزاد جون ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے، ذوق کا انتقال نومبر ۱۸۵۴ء کو ہوا۔ ۲۰ برس حضوری کے معنی ہیں کہ وہ ساڑھے چار سال کی عمر سے ان کے پاس حاضر ہونے لگے۔ ۲۰ برس کی حضوری کی بات انور دہلوی نے دیوانِ ذوق مرتبۂ ویران میں حافظ ویران کے لیے کہی تھی۔ آزاد نے اسی کو اپنے اوپر چسپاں کر لیا لیکن "آبِ حیات" میں نہیں، پہلی بار دیوانِ ذوق میں کیا (عابد، ص ۱۱۲)۔ جو شخص اتنا جھوٹ بول سکتا ہے اس کی کسی بھی تحریر کا کیا بھروسا، اگر اس کی توثیق کسی دوسرے ماخذ سے نہ ہوتی ہو۔

آزاد نے "آبِ حیات" میں ذوق کی تاریخِ پیدائش ۱۲۰۴ھ لکھی ہے۔ دیوانِ ذوق میں بغیر کسی حوالے کے ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کردی۔ عابد کہتے ہیں کہ آزاد اپنی پسند، اپنی نسبتیں دوسروں کو دے دیتے تھے۔ خود آزاد کی تاریخِ پیدائش ۱۸ ذی الحجہ ہے۔ اسی سے انھوں نے ۱۱ ذی الحجہ تخلیق کر لی لیکن انھیں استاد کا سنہ ولادت تک صحیح معلوم نہیں جو ۱۲۰۳ھ تھا اور یہ خود ان کے والد کے اخبار میں درج کیا گیا تھا (عابد، ص ۳۵)۔ "آبِ حیات" کے مطابق ان کی زبان سے پہلے دو شعر جو نکلے ان میں سے ایک حمد میں تھا، دوسرا نعت میں (ص ۴۳۸)۔ وہ اشعار کہاں گئے۔ آزاد نے درج کیوں نہیں کیے۔ کیا واقعی حمد و نعت میں تھے یا آزاد کے عقیدت کیش تخیل کی تخلیق ہیں۔ آزاد آگے لکھتے ہیں:

رشک، جو تلمیذ الرحمان کے آئنوں کا جوہر ہے، استاد شاگردوں کو چمکانے لگا (ص ۴۳۸)۔ ذوق کے دو دو استاد ہوئے ہیں لیکن آزاد انھیں تلمیذ الرحمان بنانے کے مشتاق ہیں اس لیے ان کے دونوں استادوں غلام رسول شوق اور شاہ نصیر دونوں کو مطعون کیا۔ آخر الذکر کی خاص طور پر کردار کشی کی۔ الزام لگاتے ہیں کہ شاہ نصیر ذوق کے جن اشعار کو کاٹ دیتے تھے، ان کے مضامین استاد زادے شاہ وجیہ الدین منیر کی غزلوں میں پائے گئے (ص ۴۳۹)۔ اسلم فرخی لکھتے ہیں:

> نصیر جیسے مشاق اور قادر الکلام شاعر کے خلاف اس قسم کا الزام آزاد کی بہت بڑی جسارت ہے۔ (ص ۲۶۲)

ذوق نے سودا کی زمین میں ایک غزل کہی:... ہوشِ نقشِ پا،... ہم آغوشِ نقشِ پا۔ اس پر شاہ نصیر نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے، اب گو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا ("آبِ حیات"، ص ۴۴۰-۴۳۹)۔ اس میں خفگی کی کوئی بات نہ تھی۔ اس قصے کی کئی کمزوریاں عابد نے آئینہ کی ہیں۔ تذکرۂ قاسم کے مطابق شاہ نصیر سودا و میر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس قصے کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ غزل ذوق کی ہے ہی

نہیں، کسی تذکرے، دیوانِ ذوق مرتبۂ ویران اور "نگارستانِ سخن" میں بھی نہیں ملتی، کیونکہ یہ خود آزاد کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق کو آزاد کے خط میں جو مسودے ملے، یہ غزل ان میں شامل ہے (عابد، ص ۴۱-۳۹)۔ "آبِ حیات" میں اس کا پہلا مصرع ہے:

رکھتا بھر قدم ہے وہ یہ ہوشِ نقشِ پا

دیوانِ ذوق میں اصلاح پا کر یوں ہو گیا:

ہر گام پر رکھے ہے وہ یہ ہوشِ نقشِ پا

یہ دلچسپ بات یاد رہے کہ خود سودا نے یہ غزل ایک استاد بیدل کی زمین میں کہی تھی۔ مقطع ہے:

سودا بقولِ حضرتِ بیدل بہ کوے دوست
خطِ جبینِ ماست ہم آغوشِ نقشِ پا

(کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی، ص ۲۴)۔

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی ("آبِ حیات"، ص ۴۴۱)۔ شیرانی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اکبر ثانی شاعر تھے۔ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں ان کا ذکر بہ حیثیت شاعر کے کیا ہے اور ان کا تخلص "شعاع" بتایا ہے ("مقالاتِ شیرانی"، سوم، ص ۱۲۵)۔

آزاد اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ مرزا عظیم بیگ اور میر قمر الدین منت اکبر شاہ کے عہد میں ولی عہد ظفر کے دربار میں جایا کرتے تھے (ص ۴۴۱)۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ اکبر شاہ کا عہد ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوتا ہے۔ منت اس صدی کے عشرۂ اول میں راہیِ ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ [قاضی نمبر ۱۵۲] مالک رام کے تذکرہ "ماہ و سال" کے مطابق منت کا انتقال ۱۲۰۸ھ میں اور عظیم کا ۱۲۲۱ھ میں ہوا۔ آزاد (ص ۴۴۲) پر لکھتے ہیں: "انھیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔" قاضی صاحب نے تصحیح کی کہ صحیح نام مونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن تھا۔ جان الفنسٹن اس کا باپ تھا۔ [قاضی، ص ۳۵]

آزاد لکھتے ہیں کہ میر کاظم حسین بے قرار کے جانے پر ولی عہد نے ذوق کو اپنا استاد مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے بے قرار کے سفرِ سندھ کو ۱۲۲۴ھ کا واقعہ قرار دیا ہے۔ اس وقت ذوق ۲۱ سال کے تھے اور بے قرار بھی ذوق کے ہم عُمر اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ یہ قرینِ قیاس نہیں کہ ولی عہد نے اس زمانے میں بے قرار اور ذوق جیسے نومشقوں کو اپنا استاد

Scanned by CamScanner

بنایا ہوگا (عابد، ص ۴۴۳)۔ آزاد لکھتے ہیں کہ ولی عہد نے ایک غزل جیب سے نکال کر دی ("آبِ حیات"، ص ۴۴۲) عابد لکھتے ہیں اس زمانے میں شاہوں کی قبا میں جیبوں کا وجود ہی مشکوک ہے (عابد، ص ۴۴۳)۔

ایک افسوس ناک بات ہے کہ آزاد نے معروف کو ذوق جیسے نوجوان کا شاگرد بنا دیا (ص ۴۸-۴۴۳-۴۴۴)۔ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں معروف کے ایک دیوان کا ذکر کیا ہے جو ۱۲۲۱ھ سے پہلے مرتب ہو چکا ہوگا۔ ظاہر ہے ایسا کہنہ مشق شاعر انیس بیس سال کے لڑکے کی شاگردی نہ کرے گا (فرخی، جلد-۲، ص ۲۷۶)۔ "آبِ حیات" کی پہلی اشاعت کے بعد سعیدالدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں نے اس کی تردید کی۔ آزاد نے طبعِ دوم میں اس کا ازالہ تو نہ کیا لیکن ۱۰ نئی حکایتوں کا اضافہ کر دیا (فرخی، ایضاً، ص ۷۸-۲۷۷)۔

شیرانی نے اپنے مضمون آزاد اور دیوانِ ذوق میں اس بیان کی کمزوریاں دکھائی ہیں اور اسے قبول نہیں کرتے (مقالات، سوم، ص ۲۹-۱۲۶)۔ آزاد نے معروف کے ذوق کی شاگردی کی ایک وجہ اول الذکر کے ضعفِ پیری کو بتایا، حالانکہ تذکرۂ قاسم کے مطابق وہ ۱۲۲۱ھ میں جوان تھے (مقالات، ص ۱۲۸)۔ عابد نے قدرے اور تفصیل سے تجزیہ کر کے اس بیان کے بخیے ادھیڑ دیے ہیں۔ آزاد نے معروف کے تسبیح زمرد کے ۱۰۰ مطلعوں کو بھی ذوق کی تصنیف بنا دیا ہے (ص ۴۴۷)۔ شیرانی نے اسے بالکل لچر اور بعید از قیاس کہا ہے (مقالات، ص ۱۳۰)۔ یہ معروف کے پہلے دیوان میں موجود ہے جو ۱۲۲۱ھ میں تیار ہو چکا تھا۔ اس طویل بحث کو عابد کی کتاب میں ملاحظہ کیا جائے۔ یہاں خوفِ اطناب سے قطع کیا جاتا ہے۔ آزاد نے معروف کو احمد بخش خاں کا بڑا بھائی سمجھ لیا ہے، (ص ۴۴۹)، حالانکہ وہ درحقیقت چھوٹے تھے۔ [قاضی نمبر ۲۷۵]

آزاد ذوق کے استادوں کے دشمن ہیں اس لیے شاہ نصیر کی بطورِ خاص کردار کشی کرتے ہیں۔ شیرانی نے اس معرکے کے متعلق صرف یہ کہا ہے کہ اس کا ذکر بہت مختصر ہے اور رائے قائم کرنے کے لیے ناکافی ہے (مقالات، ص ۱۳۷)۔ عابد نے اپنی کتاب کے ص ۴۵ تا ۵۳ پر اس کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سرتاپا آزاد کے تخیل کی پیداوار ہے۔ شاہ نصیر جب دکن سے آئے تو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں ایک نومشق شاگرد پر اعتراض کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ "آتش و آب و خاک و باد" کی ردیف میں ذوق کو ایک قصیدے کا مصنف کر دیا۔ ذوق اور بہادر شاہ اس کو جنچوانے کے لیے شاہ عبدالعزیز کی نظر سے گزارتے ہیں۔ شیرانی پوچھتے ہیں کہ شاعری کو ایک عالمِ دین کے پاس کیوں بھیجا گیا۔

عابد نے توجہ دلائی کہ پہلے تو آزاد ذوق کے ایک قصیدے کا ذکر کرتے ہیں،

Scanned by CamScanner

(ص ۴۵۴)۔ معرکے کے مکالمے میں ذوق سے کہلایا ہے کہ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے (ص ۴۵۵)۔ مشاعرے میں ایک طالب علم نے اسی وقت اعتراضات کیسے پیش کر دے۔ وہ اعتراضات اتنے بودے ہیں کہ شاہ نصیر کو زیب نہیں دیتے مثلاً پتھر میں آگ کے ہونے کا ثبوت دو۔ عابد سوچتے ہیں اگر کوئی ذوق سے آندھی میں آگ کی موجودگی کا ثبوت مانگ لیتا تو ان پر کیا گزرتی اور وہ کیا جواب دیتے (عابد، ص ۴۹)۔

وہ غزل اور تین قصیدے کہاں ہیں؟ کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں۔ اگر وہ اشعار اتنے معرکہ آرا تھے تو ضرور محفوظ ہوتے لیکن آزاد "آبِ حیات" میں محض ایک شعر دے سکے اور دیوانِ ذوق میں محض دو۔ نسخۂ ویران میں ان اشعار کو فرد کے طور پر درج کیا ہے۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں شعر کا مصرعِ اوّل یوں لکھا ہے:

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد

("آبِ حیات"، ص ۴۵۴) دیوانِ ذوق کے مقدمے میں جزو اوّل ہے ع:

مرمر و کوہ میں ہوں گر

(مقدمہ، ص ۱۳) اور دیوان کے متن میں ع:

کوہ اور آندھی میں ہیں گر ---

آزاد نے یہ دھیان نہیں دیا کہ ان دونوں اشعار کے بیچ قافیہ تو ہے ہی نہیں۔ پہلے شعر میں گر، پر قافیہ ہے۔ دوسرے شعر میں: "چھوڑ دیں شرک پوجنا آتش و آب و خاک و باد" میں قافیہ غائب ہے۔ عابد نے توجہ دلائی کہ کلیاتِ شاہ نصیر میں زمین مختلف ہے۔ اس میں قافیہ ہم، بہم، کم وغیرہ ہے۔ ذوق نے تو شاہ نصیر کی زمین میں غزل اور قصیدے لکھے تھے (عابد، ص ۵۴-۴۵)۔ سچ یہ ہے کہ یہ ذوق کے دو متفرق اشعار ہیں۔ ان کے گرد معرکہ تعمیر کرنا غیر ثقہ راوی آزاد کے تخیل کی کارفرمائی ہے۔

شاہ نصیر سے معرکے کے واقعات آزاد نے ایک جگہ بیان نہیں کیے۔ بڑے معرکے کا حال سوانح کے ضمن میں دیا تھا جو صحیح مقام تھا۔ بعد میں "عموماً اندازِ کلام" کے عنوان کے تحت کچھ اور واقعات لکھے ہیں جن کا اندازِ کلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ انھیں بھی پہلے معرکے کے سلسلے میں لکھنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں یک جا کیے دیتا ہوں۔

"آبِ حیات" (ص ۴۷۷-۴۷۸) میں ایک غزل کی نئی بحر کا ذکر ہے لیکن دیوانِ ذوق میں کہیں زیادہ تفصیل سے دو غزلوں کے دو اوزان کی بحث دی ہے (ص ۱۵۴-۱۵۷)۔ اس لیے اسی کو پیشِ نظر رکھ کر اظہارِ خیال کرتا ہوں۔ ذوق نے مبینہ طور پر دو نئی بحروں میں غزلیں کہیں۔ شا نزدہ رکنی ہیں اور ان میں سے کوئی نئی نہیں۔ شیرانی نے تفصیل سے ان کا

Scanned by CamScanner

جائزہ لیا ہے (مقالات، سوم، ص ۷۷-۱۶۴)۔

دیوانِ ذوق کے مطابق پہلی غزل اس مصرع سے شروع ہوتی ہے ع:

تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مزدِ قلق ہو

فعولن آٹھ بار۔ بحرِ متقارب مثمن سالم کو مضاعف کر دینا کوئی اجتہاد نہیں۔ شیرانی نے تذکروں سے ذوق سے قبل کے کئی اردو شعرا کے یہاں سے اس کی مثالیں نقل کیں مثلاً سراج اورنگ آبادی، عارف الدین خاں عاجز، عبدالولی عزلت شاہ محمد تقی ہمدم مشمولۂ تذکرہ "گلِ عجائب" شیرانی لکھتے ہیں:

> بارھویں صدی ہجری میں اس وزن کے اس قدر عام ہونے کے باوجود ذوق کا اپنے واسطے اس کی ایجاد کا دعویٰ اور آزاد کی تائید نہایت حیرت انگیز مگر افسوس ناک جسارت ہے۔
>
> (شیرانی، ص ۱۶۵)

کون جانے کہ ذوق نے اسے نیا وزن کہا تھا کہ آزاد نے اسے نیا سمجھ کر ذوق کے سر منڈھ دیا ہے۔ دوسری بحر سے شاہ نصیر کا براہِ راست تعلق ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> زمانے کے نام وروں کو پہلی تعریف اور شہرت بھی خوش نہ آتی تھی، دوسری غزل پر ناخوشی پھوٹ ہی اور کہا کہ اس بحر میں پہلے کسی نے غزل نہیں لکھی، یہ جائز نہیں۔
>
> (دیوانِ ذوق، ص ۱۵۴)

یہ غزل بحرِ متدارک شانزدہ رکنی میں ہے۔

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو

پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

ذوق نے مشاعرے میں جب یہ غزل پڑھی تو "آبِ حیات" کے مطابق سہواً پہلے مصرع کا پہلا لفظ "جس" کہنا بھول گئے تھے ("آبِ حیات"، ص ۷۷۴)۔ دیوانِ ذوق کے مطابق دوسرے مصرع کا "پھر" کہنا بھول گئے تھے۔ شاہ نصیر نے ٹوکا کہ مطلع پھر پڑھو۔ اس پر ذوق ٹھٹکے اور فوراً ہی لفظ سوجھ گیا اور اسے شامل کر کے پڑھا (دیوانِ ذوق، ص ۹۵-۱۹۴) "آبِ حیات" کے مطابق:

> پھر اعتراض ہوا کہ "یہ بحر ناجائز ہے۔ کسی استاد نے اس پر غزل نہیں کہی۔" شیخ مرحوم نے جواب دیا کہ "۱۹ بحریں آسمان سے

Scanned by CamScanner

نازل ہوئیں؟ طبائعِ موزوں نے وقت بوقت گل کھلائے ہیں۔" یہ
تقریر مقبول نہ ہوئی۔ (ص۷۸-۴۷۷)

آزاد نے یہ نہیں لکھا کہ "پھر اعتراض ہوا" کا فاعل کون ہے لیکن ظاہراً یہ شاہ نصیر ہی ہیں۔ آزاد نے ان کے کردار کی پستی دکھائی ہے کہ پہلے تو سابق شاگرد سے اپنے گھر پر غزل سن کر اس کی تعریف کی اور مشاعرے میں پڑھنے کو کہا اور پھر مشاعرے میں اعتراضات کیے۔ لیکن "آبِ حیات" اور دیوانِ ذوق میں لفظِ محذوف کے اختلاف سے اس واقعے کی صحت پر شبہہ ہوتا ہے۔ شیرانی لکھتے ہیں:

> یہ کیسے نام ور لوگ ہیں جنھیں صحیح اعتراض نہیں سوجھا کرتا ... میرے نزدیک استاد ذوق کا یہ دعویٰ کہ وہ اس وزن کے دریافت کرنے والے ہیں، اسی قدر غلط ہے جس قدر ان معترضین کا یہ اعتراض کہ اس بحر میں کسی نے غزل نہیں لکھی۔

(مقالات، ص۱۶۹)

شیرانی نے اطلاع دی کہ نظیر اکبر آبادی نے متعدد نظمیں اور غزلیں اس مضاعف وزن میں لکھی ہیں جن میں سب سے مشہور اس کا بنجارہ نامہ ہے ع:

ٹک حرص و ہوس کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا

نظیر کے علاوہ انھوں نے شاہ مراد، غلام قادر شاہ بٹالوی اور شاہ علی محمد گام دھنی کے یہاں سے بھی مثالیں دیں۔ شیرانی کی دوسرے شعرا کی مثالیں درست ہیں لیکن میری رائے میں گام دھنی کی مثال برمحل نہیں کہ وہ بحر متدارک میں نہیں بلکہ متقارب میں ہے۔ ملاحظہ ہو:

پگڑی	باندھ قبالٹ	کاؤں	پھروں	بانس زرینہ	سارا
فعلن	فعل فعولن	فعلن	فعلن	فعل فعولن	فعلن

سہرا	ہار جھیلاں	پھروں	دل بادل پے	ہوں اسوارا
فعلن	فعل فعولن	فعلن	فعلن فعلن	فعلن فعل

فعولن متدارک میں ممنوع ہے۔

آزاد نے دیوانِ ذوق میں اس غزل کا مقطع یوں لکھا ہے:

کیا رجز کو کر مقطوع و مرفل تم نے یہ غزل [کذا] لکھی ہے
ذوق اس کی بحر کو سن کر شاداں روحِ خلیل و اخفش ہو

شیرانی لکھتے ہیں کہ پہلے مصرع کو موزوں پڑھنے کے لیے "رجز" کی "ج" ساکن پڑھنی

Scanned by CamScanner

ہو گی اور دوسرے جزو میں یہ "یہ غزل" کے بجائے "غزل یہ" کہنا ہوگا۔ شیرانی یہ بھی کہتے ہیں کہ

> ترفیل اور قطع دونوں ایسے زحاف ہیں جو عروض و ضرب یعنی اواخرِ مصارع میں لائے جاتے ہیں، صدر و ابتدا اور حشو میں ان کا محل نہیں ہو سکتا۔ (مقالات، ص۲۷۶-۱۷۵)

مراد یہ ہے کہ اس وزن کو رجز مرفل مقطوع کہنا درست نہیں۔ دراصل یہ سب ترمیم، بلکہ تحریف، آزاد کی ہے۔ وہ اسے ایک نیا وزن سمجھے اور استاد کی زبانی مقطع میں اجتہاد کا دعویٰ کرا دیا۔ نسخہ دیوان میں یہ مطلع یوں ہے:

اِس بحر میں کیا برجستہ غزل اے ذوق یہ تم نے لکھی ہے
ہاں وزن کو جس کے سن کر شاداں روحِ خلیل و اخفش ہو

مقطع میں یہ تحریف بھی آزاد کی ہے اور انھوں نے ایک شعر مزید کہہ کر غزل میں شامل کر دیا:

بس چھوڑو دامن قاتل کا، لو ہاتھ بہاے خوں سے اٹھا
جب اپنا بہا خوں پاوں پہ اس کے، دل کیوں اس کا مُشوش ہو

(عابد، ص۲۷۶-۲۷۵)

واضح ہو کہ خلیل موجد عروض ہے اور ابوالحسن اخفش موجدِ بحر متدارک ہے۔ ذوق نے اس غزل کو بحر متدارک میں صحیح قرار دیا۔ آزاد اس وزن کو نہ سمجھ سکے اور اس کو بحر رجز میں لے گئے اور اسی کے مطابق ایک غیرِ موزوں مقطع کہہ دیا۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں، "حکایت کی دونوں شکلیں ("آبِ حیات" اور دیوانِ ذوق) مصنوعی ہیں۔" [قاضی، ۱۴۴]

"آبِ حیات" میں:

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر

والے شعر کو یوں دکھایا ہے کہ شاہ نصیر نے سرِ مشاعرہ ذوق کے مطلع میں اعتراض کے ساتھ اصلاح کی:

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کر
ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

ذوق نے استاد کی اصلاح میں خامی دکھا کر مزید اصلاح کی ع:

Scanned by CamScanner

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر

("آبِ حیات"، ص۴۷۸)

انجمنِ ترقیِ اردو ہند میں جو بیاض "کشکول ۱۲" ہے، اور جس میں خسرو سے منسوب ریختے کو جعفر کے نام سے لکھا ہے، وہ بقولِ تنویر علوی شاہ بہاءالدین کی مرتبہ ہے اور یہ شاہ بہاءالدین نبیرۂ شاہ نصیر ہو سکتے ہیں۔ اس میں اصلاً ذوق کا شعر یوں لکھا ہے:

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر

ہے یہ اشارہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

اور اس کے بعد اصلاحِ منیر کے عنوان کے تحت درج ہے:

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر

ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

(تنویر علوی: کلیاتِ ذوق، ص۶۱)

"اصلاحِ منیر" سے کیا مطلب ہے۔ یہ منیر فرزندِ شاہ نصیر کی اصلاح تو نہیں ہو سکتی۔ غالباً منیر لغوی معنی میں آیا ہے اور اسے شاہ نصیر کی اصلاح قرار دیا ہے۔ دیوانِ ذوق مرتبۂ ویران میں شعر اصلاحی شکل میں ہے (عابد، ص۹۰)۔

عابد نے کلیاتِ ذوق سے شعر کی شکلیں نہیں دی تھیں۔ یہ میں نے کلیات میں دیکھ کر درج کی ہیں۔ دیوانِ ذوق مرتبۂ آزاد میں لکھا ہے:

عالمِ شباب میں میں نے فقط مطلع کہا تھا:

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر

ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

یہ دفعتاً مشہور ہو گیا۔ تم دیکھتے ہو کہ میں ہمیشہ اپنے کلام کو زیرِ نظر رکھتا ہوں۔ میں نے خود اس میں اصلاح کی۔ کہنے والوں نے کہہ دیا کہ شاہ صاحب نے اصلاح کی۔ دل کو سخت رنج ہوا مگر ضبط کر گیا اور تدارک یہی سمجھ میں آیا کہ غزل پوری کی۔ اللہ نے یہ داد دی کہ وہ اس سے زیادہ مقبولِ خلائق ہوئی۔

(دیوانِ ذوق، ص۱۱۰-۱۱۱)

گویا مطلع کی اصلاح پہلے ہوئی، غزل کی تکمیل بعد میں۔ یعنی "آبِ حیات" کی حکایت

Scanned by CamScanner

کہ ذوق نے مشاعرے میں پوری غزل پڑھی اور شاہ نصیر نے سرِ مشاعرہ مطلع میں اصلاح کی، محض افسانہ ہے۔ اس الٹ پھیر کو دیکھ کر یہ قرینِ قیاس لگتا ہے کہ مطلع پر واقعی شاہ نصیر کی اصلاح ہے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ ذوق نے اکبر ثانی کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس میں ۱۸ زبانوں کا ایک ایک شعر تھا۔ اس قصیدے پر بادشاہ نے خاقانیِ ہند کا خطاب دیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی (ص ۴۵۶)۔ اس کم عمری میں خطاب ملنے کو شیرانی حیرت انگیز مانتے ہیں اور اس پر شبہہ کرتے ہیں۔

(مقالات، ص ۱۳۷)

اسلم فرخی لکھتے ہیں کہ ذوق بیس سال کی عمر میں ولی عہد کے استاد ہوئے۔ چند سال کے بعد انھوں نے یہ قصیدہ لکھا۔ اس کے معنی اس وقت ان کی عُمر ۲۵-۲۴ سال کی ہوگی۔ فرخی اس خطاب سے متعلق دونوں حکایتوں ("آبِ حیات"، ص ۵۷-۴۵۶) کی صحت کے قائل نہیں (جلد-۲، ص ۸۳-۲۸۲)۔ شیرانی اس کو مبالغہ مانتے ہیں کہ قصیدے میں ۱۸ زبانوں کے اشعار تھے (مقالات، ص ۱۳۷)۔ عابد لکھتے ہیں کہ انشا سے ۲۴ زبانوں کا قصیدہ منسوب کیا گیا ہے، آزاد نے ذوق سے ۱۸-۱۷ زبانوں کا قصیدہ کہلا دیا۔ اس کی زمین وہی ہے جو انشا کے قصیدے کی ہے۔ عابد یہ مانتے ہیں کہ ذوق کو کسی قصیدے پر خاقانیِ ہند کا خطاب ملا لیکن کس قصیدے پر اور کب، یہ معلوم نہیں۔ آزاد نے یہ تین شعر نسخۂ ویران سے لیے لیکن ان پر خطاب ملا ہوتا تو ویران ضرور ذکر کرتے (عابد، ص ۴۷-۴۶)۔ میری رائے میں قصیدے کی حکایت کذبِ محض ہے۔ ایسے معرکے کا قصیدہ محفوظ کیوں نہ رہا۔ آزاد کے دیوانِ ذوق میں اس کے محض تین شعر ہیں اور ان پر عنوان "قصیدۂ ہفدہ زبان" ہے، ۱۸ زبانوں کا نہیں۔

لکھتے ہیں کہ ذوق کی موت کی رات سے پہلی شام کو یہ ان کے پاس موجود تھے (ص ۴۵۹)۔ عابد اس دعوے کو اس لیے درست نہیں مانتے کہ "آبِ حیات" طبعِ اول میں اس کا کوئی ذکر نہیں، طبعِ دوم میں اضافہ ہے۔ نیز اس میں تاریخِ وفات میں بھی ایک دن کی غلطی ہے (عابد، ص ۶۲-۶۱)۔

"آبِ حیات" میں ذوق کی زبانی کہلوایا ہے کہ "میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور ان کا خلاصہ کیا (ص ۴۶۲)۔ دیوانِ ذوق میں یہ تعداد بڑھ کر ساڑھے سات سو ہو گئی (ص ۳۱)۔ یہ ساری تلخیصیں کہاں گئیں۔ شیرانی کا تبصرہ ہے کہ یہ بڑا مبالغہ ہے۔ دہلی میں ان ایام میں کوئی ایسا کتب خانہ نہ تھا جس میں اتنے یا اس کے نصف بھی دیوان موجود ہوں۔ یورپ کے کسی کتب خانے میں بھی نہیں (مقالات، ص ۱۳۸)۔

Scanned by CamScanner

آزاد کی اندھی عقیدت نے ذوق کو جملہ علوم و فنون مثلاً لغت کی تحقیقات، شعرائے عجم کے ہزاروں اشعار، تاریخ، تفسیر، تصوف کے مسائل، رمل، نجوم، موسیقی وغیرہ سب پر قادر دکھایا ہے (ص ۶۳-۴۶۲)۔ شاید آزاد قارئین کو بالکل سادہ لوح سمجھتے تھے۔ شیرانی، اسلم فرخی، عابد سب ان دعووں کو غلط مانتے ہیں۔ "آبِ حیات" میں ذوق کو نجوم کا ماہر دکھایا لیکن مقدمۂ دیوانِ ذوق میں ان کے نجوم کو بالکل علم الغیب بنادیا۔ دربار میں دخیل ایک شخص روشن بیگ کی ایک رنڈی تھی۔ ذوق اس کے معاملات شبی کو نجوم سے معلوم کر کے روزانہ چھیڑا کرتے تھے (دیوان، ص ۴۳)۔ عابد نے کہا ہے کہ یہ محض چھچھوراپن ہے۔ اس قسم کے احکام کا نجوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ تانترک اس قسم کے شعبدے کرتے ہیں (عابد، ص ۶۸)۔

"آبِ حیات" میں ذوق کے طولانی بیان کے تقریباً آخر میں ان کے عالم الغیب ہونے کے تین واقعات لکھے ہیں (ص ۹۴-۴۹۳)۔ یہ انھیں الفاظ میں دیوانِ ذوق میں بھی ہیں (ص ۴۱-۴۰)۔ پہلے واقعے [تلوار آج ماہ لقا چل کے تھم گئی] کے سلسلے میں ان کے بیٹے نے بتایا کہ کھاری باولی کے پاس دو تین آدمیوں نے تلوار چلائی۔ یہ شعر نہ نسخۂ ویران میں ہے، نہ تنویر علوی کی کلیاتِ ذوق میں جس کی وجہ سے عابد اسے آزاد کا ساختہ قرار دیتے ہیں۔ دوسرے واقعے میں بھوپال میں تلوار چلنے کا ذکر ہے اور پھر آزاد لکھتے ہیں:

> ایسے معاملے کتب تواریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں۔ طولِ کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں۔ (ص ۴۹۳)

عابد پوچھتے ہیں کہ کیا تواریخ اور تذکروں میں ذوق کے نام سے ان کی پیشین گوئیوں کے ساتھ درج ہیں۔ "آبِ حیات" میں دو واقعات کے بعد مزید کو قلم انداز کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے لیکن اس کے فوراً بعد خواب میں دیکھ کر کہیں آگ لگنے کی خبر دیتے ہیں۔ عابد کی رائے میں یہ سارے واقعات مولانا کے زرخیز ذہن کی پیداوار ہیں۔ ذوق سے انھیں کوئی تعلق نہیں (عابد، ص ۶۹)۔ مجھے عابد کے فیصلے سے اتفاق ہے۔

ذوق کی تصانیف کے سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں کہ ایک عاشقانہ مثنوی "نامۂ جاں سوز" لکھی۔ اس میں پانسو شعر سے زیادہ ہو گئے لیکن ناتمام رہ گئی (ص ۴۷۲)۔ عابد خبر دیتے ہیں کہ نسخۂ ویران میں ۳۰ شعر کی مثنوی ہے۔ آزاد نے اپنے مرتبہ دیوانِ ذوق میں کہیں کہیں لفظی ترمیم کی اور خود ۸ شعر شامل کر دیے۔ "دہلی اردو اخبار" میں خبر چھپی تھی کہ ذوق نے ایک ناتمام مثنوی کی تکمیل کا کام شروع کیا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ آزاد نے اسی خبر کی بنا پر ۵۰۰ شعر کی مثنوی کی بات گھڑ لی (عابد، ص ۸۷-۸۶)۔

Scanned by CamScanner

ظفر کے کلام میں ذوق کا حصہ... سب سے پہلے اشپرنگر نے اپنے تذکرے میں ظفر کے لیے لکھا، "میرزا ابو ظفر شاہِ دہلی ایک دیوان کے مصنف ہیں جو اصل میں ذوق کا لکھا ہوا ہے۔"

(یادگارِ شعرا، ص ۱۱۳)

لُطفِ ویران کے دیباچے میں امراو مرزا انور نے لکھا کہ بادشاہ کے چار مجلد دیوان تمام و کمال ذوق کے درست کردہ و چکیدۂ فکر ہیں (بحوالہ کلیاتِ ذوق، ص ۳۵)۔ آزاد دیوانِ ذوق کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرتِ مرحوم کے ہیں۔ (مقدمہ، ص ۴۳)

"آبِ حیات" میں لکھتے ہیں:

> صدہا تاریخیں تھیں۔ مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی۔

(ص ۴۷۲)

شیرانی کا تبصرہ ہے کہ ظفر کے چاروں دیوان موجود ہیں۔ ان میں سوائے اپنے دیوان کی تاریخوں کے، جن کا مصنف سے کوئی علاقہ نہیں، کوئی تاریخ موجود نہیں (مقالات، ۱۴۱)۔ آزاد مزید لکھتے ہیں، "ہزاروں گیت، ٹپے، ٹھمریاں، ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں۔" (ایضاً)۔ عابد اسے بھی محض مبالغہ مانتے ہیں (ص ۸۸)۔ آگے چل کر آزاد نے ظفر کو کلام کا ڈاکو بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں، جب بھی ان کی طبیعت کو متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا۔ ذوق اپنی غزل بادشاہ سے چھپاتے تھے۔

شیرانی آزاد کے بیان پر سخت معترض ہیں۔ لکھتے ہیں کہ قطعۂ تاریخ کے مطابق ظفر کا پہلا دیوان ۱۲۱۴ھ میں مکمل ہو گیا تھا، جب ذوق کی عمر دس سال تھی (مقالات، سوم، ص ۱۴۶)۔

شان الحق حقی نے "انتخابِ ظفر" میں لکھا ہے:

> ذوق کی وفات تک ظفر کا چوتھا دیوان تو یقیناً اور تیسرا دیوان بھی غالباً مکمل نہیں ہوا تھا۔ دیوانِ سوم میں بھی ذوق کو صیغۂ ماضی میں یاد کیا ہے۔

(انتخاب، ص ۶۸، بحوالہ مقالاتِ شیرانی، فٹ نوٹ، ص ۴۸-۱۴۷)۔

ظفر کا رنگ ذوق سے مختلف ہے۔ یہ کئی نقادوں نے بہ شمولِ شیرانی، عابد علی عابد، شان الحق حقی کہا ہے۔ ذوق نے ظفر کے دوسرے اور کسی حد تک تیسرے دیوان کی اصلاح

Scanned by CamScanner

کی لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ ظفر محض ایک آدھ مصرع کہتے تھے اور ذوق پوری غزل مکمل کرتے تھے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرے کی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ ذوق نے فی البدیہہ کہی: "دریاے اعظم" (ص ۴۸۰)۔ عابد انکشاف کرتے ہیں کہ "دریاے اعظم" سرور کے تذکرے کی تاریخ نہیں، ان کی مثنوی "سبعہ سیارہ" کی ہے۔

کہ ذوق ایں مثنوی در ہفت بحر است
بگو تاریخ ہم "دریاے اعظم"

لہٰذا تذکرے کی فی البدیہہ تاریخ کہنے کا افسانہ غلط ہے (عابد، ص ۹۰)۔ "دریاے اعظم" سے ۱۲۳۶ھ برآمد ہوتا ہے جو مثنوی کی تاریخ ہے، تذکرہ "عمدۂ منتخبہ" اس سے کافی پہلے کا ہے۔

بقولِ آزاد، شہیدی نے نواب عبداللہ خاں سے ایک جلسے میں کہا کہ آج ہندوستان میں تین شخص ہیں، لکھنؤ میں ناسخ، دلّی میں ذوق، دکن میں حفیظ ("آبِ حیات"، ص ۴۸۰)۔ بات جچتی نہیں، کیونکہ دلّی میں غالب و مومن کو کیوں کر نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ اس مقولے کی بہتر روایت دیوانِ آزاد میں ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ آج فنِ شعر میں تین شیخ ہیں، شیخ ناسخ لکھنؤ میں، شیخ حفیظ دکن میں، شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں (دیوان، ص ۹)۔ شیخ حفیظ بالکل گمنام شخص ہیں۔ سروری صاحب کے مطابق چندو لعل نے شیخ حفیظ دہلوی کو حیدرآباد بلوایا تھا اور ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے ("اردو کی ادبی تاریخ"، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء، ص ۲۰۹)۔ لیکن ان کا نہایت تفصیلی احوال ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے مقالے میں لکھا ہے۔ ان کے مطابق چندو لعل نے انھیں دعوت نہیں دی۔ یہ دہلی سے اورنگ آباد آئے اور وہاں سے ۱۲۱۹ھ میں حیدرآباد گئے اور پھر مہاراجا چندو لعل کے استاد مقرر ہوئے ("مہاراجہ چندو لعل شاداں"، حیدرآباد، ۱۹۷۹ء، ص ۹۳-۴۸۶)۔

مندرجۂ بالا واقعے کا تعلق شہیدی کی زبانی "چمن کی شاخ" والی غزل سے ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ شہیدی مرحوم دلّی سے لکھنؤ آئے۔ انھوں نے ناسخ کی غزل "چمن کی شاخ، یاسمن کی شاخ" کا ذکر کیا۔ نواب عبداللہ خاں کی فرمائش پر ذوق نے بھی غزل کہی۔ طے ہوا کہ برسرِ معرکہ مشاعرے میں پڑھی جائے لیکن شہیدی بےاطلاع چلے گئے۔ نواب نے پیچھے آدمی دوڑایا۔ اس نے بریلی میں جا پکڑا مگر وہ تشریف نہ لائے ("آبِ حیات"، ص ۴۸۰)۔ دیوان میں تفصیلات کچھ زیادہ ہیں۔ اس کے مطابق ذوق نے نہ صرف غزل، بلکہ

Scanned by CamScanner

قصیدہ بھی کہا۔ جب یہ طے ہوا کہ ذوق مشاعرے میں پڑھیں گے، اسے سن کر شیدی دہلی سے بھاگ کھڑے ہوئے (دیوان، ص ۹۹-۹۸)۔ عابد نے ان بیانوں کا بڑی تفصیل سے تجزیہ کیا ہے (ص ۹۰ تا ۱۰۵)۔ آگے بڑھنے سے پہلے نواب عبداللہ خاں کی شناخت کر لی جائے۔ آزاد نے انھیں صدرالصدور کہا ہے، پھر فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

نواب اصغر علی خاں اصغر، شاگردِ مومن جنھوں نے پھر نسیم تخلص کیا۔ یہ ان کے والد تھے۔ (ص ۴۸۰)

لیکن "سخنِ شعرا" میں نسیم دہلوی کے باپ کا نام نواب آغا علی خاں لکھا ہے (ص ۵۱۹) جب کہ حسرت موہانی کے تذکرے میں نواب آغا علی خاں دہلوی لکھا ہے۔ حسرت نے یہ بھی لکھا ہے کہ نسیم پہلے اصغر تخلص کرتے تھے (۱۸)۔ آزاد کو التباس ہوا۔ اصغر علی خاں اصغر ابنِ صاحب زادہ محمد عبداللہ خاں ظریف رام پوری دوسرے شخص ہیں۔ یہ اصغر بھی مومن کے شاگرد ہیں اور ان کا ذکر امیر بینائی کے تذکرے "انتخابِ یادگار" میں ص ۲۵ پر ہے اور ان کے والد عبداللہ خاں ظریف کا ص ۲۱۰-۲۱۱ پر۔ غالباً عابد کو بھی عبداللہ خاں کی تعیین میں التباس ہوا۔ انھوں نے "گلشنِ بےخار" میں ایک شاعر عبداللہ خاں مشتاق کو تلاش کیا ("گلشنِ بےخار"، ص ۱۷۷)۔ لیکن شیفتہ نے ان کے متعلق یہ نہیں لکھا کہ وہ اصغر علی خاں اصغر ثم نسیم کے والد تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی غیر متعلق شخص ہے۔ آزاد کو مومن کے دو شاگردوں اصغر علی خاں اصغر ثم نسیم دہلوی اور اصغر علی خاں اصغر رام پوری ابنِ عبداللہ خاں میں التباس ہوا ہے۔

عابد لکھتے ہیں کہ "آبِ حیات" میں محض ایک غزل تھی جس کا کوئی شعر آزاد نہ لکھ سکے۔ دیوان میں غزل مع قصیدہ ہو گئی اور اس کے ۶۸ شعر ذوق نے غزل کے تحت درج کر دیے۔

"آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ عبداللہ خاں نے کہا، "مشاعرے میں برسرِ معرکہ غزلیں پڑھی جائیں۔" عابد پوچھتے ہیں کہ معرکہ کس سے ہونا تھا؟ ناسخ تو دہلی میں تھے نہیں، شیدی نے ناسخ کی غزل سنائی تھی۔ وہ مشاعرے میں ذوق کی متوقع غزل خوانی سے کیوں گھبرا کر بھاگ گئے! اس غزل کے دس شعر نسخۂ ویران میں بھی ملتے ہیں بقیہ سب آزاد کی تخلیق ہونے چاہییں۔ شیدی کا واقعہ بھی اختراعی معلوم ہوتا ہے (عابد، ۱۰۵-۹۰)۔

ملازم کا شیدی کی تلاش میں بریلی تک پہنچ جانا بھی عجیب ہے۔

آزاد نے حکیم آغا جان عیش کے حالات ص ۴۸۲ کے حاشیے میں لکھے ہیں ان میں عیش کا جو حلیہ لکھا ہے اسے سن کر بقولِ مرزا فرحت اللہ بیگ، عیش کی پوتی نے کہا تھا کہ

Scanned by CamScanner

آزاد نے داداجان کو دیکھا تھا یا جو جی میں آیا، لکھ دیا۔ [قاضی نمبر ۸۵] آزاد نے عیش کے لیے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے چند روز بعد انتقال کیا۔ قاضی صاحب نے توجہ دلائی کہ "مضامینِ فرحت" میں فرحت نے عیش کی پوتی سے دریافت کر کے ۱۲۹۷ھ تاریخ وفات لکھی۔ [قاضی نمبر ۸۴] اسلم فرخی نے بھی فرحت کا حوالہ دیا کہ خاندانی روایات کے مطابق عیش کا سالِ وفات ۱۲۹۷ھ ہے۔ [اسلم، ص ۲۹۶] لیکن کالی داس گپتا رضا نے ان کی تاریخِ وفات ۲۶ جون ۱۸۷۴ء لکھی ہے۔ مالک رام نے اپنے "تذکرۂ ماہ و سال" میں ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۱ھ [۲۶ جون ۱۸۷۴ء] لکھی ہے اور اس کی تائید میں تاریخ کے دو مادّے دیے ہیں (۱۹)۔ ظاہر ہے کہ یہی صحیح تاریخ ہے۔

ذوق کے احوال کے آخر میں ایک دانائے فرنگ سے لال قلعے کے دیوانِ خاص میں ایک مکالمہ دیا ہے (ص ۴۹۴)۔ عابد اس کی صحت پر دو وجوہ سے کھٹکتے ہیں: "دیوانِ خاص چاندنی چوک کا بازار نہیں تھا کہ جس کا جب جی چاہے، منہ اٹھائے چلا آئے۔ پھر یہ بھی نظر میں رہے کہ یہ اتفاق طبعِ دوم میں پہلی بار آیا ہے۔ ہے یوں کہ آزاد کو ڈاکٹر لائٹنر سے بہت تکلیف پہنچی تھی، لہٰذا "آبِ حیات" میں انشا اور ذوق کی زبان سے انھیں کا منہ چڑایا ہے (عابد، ص ۳۳)۔

غالب... اسلم فرخی اطلاع دیتے ہیں کہ غالب کے حالات جاننے کے لیے آزاد نے علاءالدین احمد خاں کو ایک مستقل سوال نامہ بھیجا تھا، جس کا جواب انھوں نے ۲۸ جون ۱۸۷۶ء کو دیا۔ اس سے ایک بار پھر ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد نے "آبِ حیات" کی تیاری کے لیے متعدد حضرات سے معلومات اکٹھا کیں۔ علائی کا خط فرخی کی کتاب نیز کاظم علی خاں کے مجموعے "مقالات و نثریات" (لکھنؤ ۱۹۹۳ء، ص ۲۷۶-۲۷۳)۔ میں موجود ہے۔ افسوس کہ علائی نے کئی معلومات غلط فراہم کیں۔ آزاد نے انھیں نقل کردیا اور موردِ اعتراض بنے۔ کالی داس گپتا رضا نے اپنے کتابچے "آبِ حیات میں ترجمۂ غالب" (بمبئی، ۱۹۸۷ء)۔ میں آزاد کے بیانات پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ میں محض اہم نکات تک محدود رہوں گا۔

لکھتے ہیں، جھجّر کے کسی اسد کا شعر سنا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر، رحمت ہے خدا کی!

اس سے کبیدہ ہو کر ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا ("آبِ حیات"، ص ۵۰۰)۔ اس پر قاضی عبدالودود تبصرہ کرتے ہیں۔ جھجّر کے

Scanned by CamScanner

اسد کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ یہ شعر میر لائق اسد شاگردِ سودا کا ہے اور اس طرح ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر، شاباش رحمت خدا کی!

خود غالب نے "اردوے معلیٰ" ص ۲۷۵ میں یوں ہی لکھا ہے۔ میر لائق کی وفات ولادت غالب سے بہت پہلے ہوئی تھی۔ اس شعر کا سننا تبدیلِ تخلص کا باعث نہیں ہوا۔ [قاضی نمبر ۱۵۰] کالی داس گپتا لکھتے ہیں کہ یہ شعر آزاد کا من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔ تبدیلِ تخلص کا سنہ بھی درست نہیں۔ غالب نے ۱۲۳۱ھ [۱۶-۱۸۱۵ء] میں دو مہریں بنوائی تھیں۔ پہلی پر اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ کندہ کرایا، دوسری پر اسداللہ الغالب ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء میں غالب تخلص کا استعمال باقاعدگی سے کرنے لگے ("ترجمۂ غالب"، ص ۶)۔ آزاد کا قصور ہے کہ اس نے علائی کے بیان کو بغیرِ تحقیق قبول کر لیا۔ علائی نے بجز کے اسد کا شعر "آبِ حیات" میں مندرجہ متن کے ساتھ لکھا اور تبدیلِ تخلص کا سنہ ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء لکھا۔ آزاد نے ۱۸۲۸ء کے ساتھ ہجری سنہ ۱۲۴۵ھ صحیح نہیں لکھا۔ ۱۲۴۵ھ مطابق ہے ۳۰-۱۸۲۹ء کے۔

ص ۵۰۳ پر غالب کے ورودِ کلکتہ کی تاریخ ۱۸۳۰ء دی ہے۔ مالک رام ("ذکرِ غالب") اور کالی داس گپتا کے مطابق وہ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ آزاد نے غالب کے دہلی کالج کی ملازمت کی امیدواری کی تاریخ ۱۸۴۲ء لکھی ہے (ص ۵۰۷)۔ رضا کے مطابق یہ واقعہ ۱۸۴۰ء کا ہے (رضا، ص ۱۵)۔ "آبِ حیات" ص ۵۰۸ کے حاشیے کے مطابق مرزا تفتہ عمر میں مرزا غالب سے بھی بڑے معلوم ہوتے تھے۔ مالک رام کے مطابق تفتہ ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے ("تذکرۂ ماہ و سال")۔ اس طرح غالب سے دو سال چھوٹے تھے۔ "آبِ حیات" میں یہ بھی لکھا ہے کہ تفتہ نے دیوانِ قصائد اور دیوانِ غزلیات چھپوا دیا تھا۔ بقولِ رضا یہ شائع نہیں ہوا ("غالب درونِ خانہ"، بمبئی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۴)۔

غالب کے اردو دیوان کی ترتیب و طباعت کی تاریخ ۱۸۴۹ء لکھی ہے (ص ۵۱۴)۔ یہ پہلی بار ۱۸۴۱ء میں چھپا۔ غلط سنہ کا ماخذ ایک بار پھر علائی کا خط ہے۔ جنھوں نے ۱۸۴۹ء لکھ دی ہے۔ تصانیف کے سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

"ساطعِ بُرہان" کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں۔
وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔ (ص ۵۲۰)

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ "ساطعِ بُرہان" غالب کی مخالفت میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔

Scanned by CamScanner

اس میں مرزا کیوں کر لکھتے۔ نیز "قاطعِ برہان" کی مخالفت یا موافقت میں لکھی کسی کتاب میں سیّد عبداللہ کا نام تک نہیں آیا۔ [قاضی نمبر۸۶] اسی صفحے پر "نامۂ غالب" کو فارسی تصنیفات میں شامل کیا ہے۔ یہ اردو کتاب ہے۔ اگلے صفحے ۵۲۱ پر "سبدِ چین" کے مشمولات کو چند قصیدوں، قطعوں اور خطوط تک محدود کیا ہے لیکن اس میں خطوط نہیں ہیں اور منظومات میں رباعیاں اور غزلیں بھی ہیں۔ [قاضی نمبر۸۷] (رضا، ص ۳۰)۔

ص ۵۲۶ پر لکھتے ہیں مثنوی "بادِ مخالف" کے نام پر طنز کا لطیفہ درج کرتے ہیں۔ گوپتا رضا کے نزدیک یہ لطیفہ قطعی آزاد کی اختراع ہے۔ کیونکہ جب یہ مثنوی لکھی گئی تھی تب اس کا نام "بادِ مخالف" نہ تھا، بلکہ "آشتی نامہ" اور "ودادِ پیام" تھا جیسا کہ مثنوی کے آخری شعر سے ظاہر ہے۔ "بادِ مخالف" کا عنوان ترتیبِ دیوان کے وقت کا دیا معلوم ہوتا ہے (ص ۳۵)۔ قاضی صاحب کی رائے میں بھی یہ فرضی ہے۔ [نمبر۱۳۶] ص ۷-۵۲۶ پر لکھتے ہیں کہ مفتی آزردہ کی عدالت میں شعر پڑھا:

قرض کی پیتے تھے ہے ... الخ

آزاد نے یہ ظاہر کیا ہے جیسے شعر فی البدیہہ ہو گیا ہو لیکن رضا کی تحقیق کے مطابق یہ شعر ۱۸۲۱ء یا اس سے پہلے کا ہے اور مفتی صدرالدین آزردہ ۱۵ جون ۱۸۴۴ء کو صدرالصدور مقرر ہوئے تھے۔ محض شعر کو سامنے رکھ کر قصہ گھڑ لیا گیا ہے (رضا، ص ۳۷)۔

لکھتے ہیں کہ جب قید خانے سے رہا ہوئے تو وہاں کا کرتا وہیں پھاڑ کر پھینک دیا اور یہ شعر پڑھا:

بانٹے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

(ص ۵۲۷)

رضا کا تبصرہ ہے، "قید خانے کا کرتا پھاڑا نہیں جا سکتا۔ افسرانِ قید خانہ کو لوٹانا پڑتا ہے۔ نیز یہ شعر ۱۸۴۷ء سے کم از کم ۲۶ سال پہلے کہا گیا تھا، فی البدیہہ نہیں" (رضا، ص ۳۷)۔

ص ۵۲۸ پر مولوی فضلِ حق کی رنڈی کی آمد کا ایک لطیفہ لکھا ہے کہ وہ مصرع فرما دیجیے ع:

بنشیں مادر، بیٹھ ری مائی

عبدالودود نے اسے آزاد کی اختراع کہا ہے۔ [قاضی نمبر۱۴۷] مجھے یہ ماننے میں بھی تأمل قاضی

ہے کہ مولوی فضلِ حق رنڈی رکھتے تھے۔

"آبِ حیات" میں غالب کے حالات یادگارِ غالب سے بہت پہلے لکھے گئے، بلکہ سچ یہ

Scanned by CamScanner

ہے کہ مشاہیر میں آزاد ہی نے سب سے پہلے لکھے۔ انھوں نے غالب کی جو قلمی تصویر پیش کی ہے وہی اہلِ اردو کے دل میں نقش ہو گئی ہے، لیکن حسبِ معمول انھوں نے اسے دلچسپ بنانے کے لیے کئی لطیفے تراش دیے جن میں سے بعض اختراعی ہیں۔

دبیر۔ ان کا حال "آبِ حیات" طبعِ اوّل میں نہ تھا۔ طبعِ دوم میں جو کچھ لکھا اس پر سخت تنقید ہوئی۔ سید محمد رضا ظہیر نے ایک رسالہ "تنقیدِ آبِ حیات" کے نام سے لکھا جو قاضی عبدالودود کے مطابق ۱۳۰۳ھ میں یا اس کے کچھ بعد چھپا تھا۔ "آبِ حیات" میں دبیر کے متعلق جو حکایات ہیں، ظہیر کے مطابق "انصاف ان کے لفظ لفظ پر ہٰذا بہتانٌ عظیم کہہ اٹھتا ہے۔ کسی نے کبھی ان حکایاتِ موضوعہ کا ایک حرف بھی نہیں سنا۔ [قاضی نمبر ۹۰] ص ۷۳ کا حاشیہ ہے:

> تذکرۂ "سراپا سخن" میں لکھا ہے کہ ان کے والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے۔ پھر ایک جگہ اسی کتاب میں لکھتے ہیں: دبیر ولد غلام حسین، متعلقات مرزا آغا جان کاغذ فروش سے ہیں۔ مصنف موصوف کو شوق ہے کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہیں اس لیے خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک۔

قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی کہ "سراپا سخن" میں دونوں جگہ ان کے والد کا نام غلام حسین دیا ہے، نیز خاندان پر کوئی طنز نہیں۔ [نمبر ۹۰] قاضی صاحب ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں کہ خاندان کے بارے میں اگر یقین نہیں تو شک ہونا لازم ہے ("اصولِ تحقیق"، مشمولہ: "ادبی اور لسانی تحقیق"، مرتبہ: عبدالستار دلوی، بمبئی، ۸۴ء، ص ۸۷)۔

آزاد نے ناسخ اور دبیر کا ایک واقعہ لکھا ہے جس میں ناسخ نے دبیر سے کہا کہ تُو کتاب کو کیا جانے اور پھر لکڑی لے کر انھیں مارنے کو بھاگے (ص ۳۸-۵۴۷)۔ "آبِ حیات" طبعِ اوّل میں دبیر کا حال تو تھا نہیں۔ یہ واقعہ ناسخ کے ضمن میں دیا ہے۔ طبعِ دوم میں دبیر کے احوال میں ہے۔ مصنف "تنقیدِ آبِ حیات" اسے بہتانٌ عظیم سے بھی اعظم قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ دبیر نہ کبھی اس محلے میں گئے جہاں ناسخ رہتے تھے نہ کبھی ناسخ سے ملاقات و گفتگو کی۔ [قاضی نمبر ۹۳] ناسخ خلیق کے مداح تھے۔ ضمیر کے ایک شاگرد کا ناسخ کے پاس جانا قرینِ قیاس نہیں (اسلم فرخی، ص ۱۶-۳۱۵)۔

آزاد نے ص ۳۹-۵۳۸ پر ضمیر اور دبیر کے معرکے کا ذکر کیا ہے کہ ضمیر نے دبیر کا ایک مرثیہ اپنے نام سے پڑھنا چاہا لیکن دبیر نے ان سے پہلے اسی کو پڑھ دیا۔ مصنف "تنقیدِ آبِ حیات" نے اس کی تفصیلات دوسری طرح دی ہیں جن سے دبیر قصوروار نہیں

Scanned by CamScanner

ٹھہرتے۔ سعادت خاں ناصر نے کسی اور طرح لکھا ہے۔ بہر حال آزاد کی روایت میں قدرے مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب کے مطابق "تنقیدِ آبِ حیات کی روایت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ [نمبر۹۴]

ص۵۳۹: "ضمیر اپنے حریف میر خلیق کے سامنے گوشۂ عزلت کا مقابلہ کرنے لگے۔"

قاضی صاحب کہتے ہیں کہ خلیق ۱۲۶۰ھ میں اور ضمیر ۱۲۷۲ھ میں فوت ہوئے۔ یہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ اپنی زندگی میں ضمیر گوشہ نشیں ہو گئے تھے [نمبر۹۵]۔

"آبِ حیات" کے باعث یہ حکایت مشہور ہے کہ آتش نے دبیر کے ایک مرثیے کو لندھور بن سعدان کی داستان کہا تھا (ص۵۴۱)۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ "تنقیدِ آبِ حیات" کے مطابق یہ بالکل جھوٹی حکایت ہے۔ مصنف ظہیر کی موجودگی میں آتش نے دبیر کا بے نقط مرثیہ سن کر داد دی تھی۔ [نمبر۹۶]

اسی صفحے پر دبیر کا سنِ وفات ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ درج ہے۔ افضل علی ثابت مؤلفِ "حیاتِ دبیر" کے مطابق صحیح تاریخ ۳۰ محرم ہے (اسلم فرخی، ص۳۲۲)۔

لیکن "اودھ اخبار" کے مطابق ۲۹ محرم ہی کو انتقال ہوا۔ دوسری طرف مولوی عبدالعلی آسی مدراسی کی تاریخ میں صاف ۳۰ محرم ہے ع:

سلخِ محرم آمدہ روزِ وصالِ او

(محمد زماں آزردہ، "سلامت علی دبیر"، سری نگر، ۱۹۸۱ء، ص۱۵۱ و ۱۵۳)۔

ص۵۴۱ ہی پر دبیر کے بے نقط مرثیے ع:

ہم طالعِ ہما مرا وہم رسا ہوا

کا ذکر ہے۔ محمد رضا ظہیر مداحِ دبیر ہیں لیکن "تنقیدِ آبِ حیات" میں واضح کرتے ہیں کہ یہ مرثیہ دبیر کا نہیں، اختر کا ہے (اسلم فرخی، ص۳۴۲)۔

دبیر کا بے نقط مرثیہ ہے ع:

مہرِ علَمِ سرورِ اکرم ہوا طالع

("حیاتِ دبیر"، ص۴۴-۴۳، بحوالہ آزردہ، ص۱۰۹)۔

لکھتے ہیں، "تباہیِ لکھنؤ کے بعد اوّل ۱۸۵۸ء میں مرزا دبیر صاحب مرشد آباد بلائے گئے، وہ گئے۔" (ص۵۴۷)۔ میر محمد رضا کے مطابق دبیر نے مرشد آباد کبھی نہیں دیکھا لیکن عظیم آباد گئے تھے جس سے آزاد واقف نہیں۔ [قاضی نمبر۹۲]

Scanned by CamScanner

انیس ان کی پُرگوئی کے لیے لکھتے ہیں:

جن مرثیوں کے بند ۴۰، ۵۰ سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ ۱۵۰ سے گزر کر ۲۰۰ سے بھی نکل گئے۔ میر صاحب مرحوم نے کم سے کم ۱۰ ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔

(ص ۵۴۴)

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ انیس کے بندوں کا اوسط سو فی مرثیہ رکھا جائے تو ۱۰ ہزار مرثیوں کے بندوں کی تعداد دس لاکھ اور ابیات کا شمار ۳۰ لاکھ تک پہنچتا ہے۔ یہ مبالغے کی انتہا ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے مراثیِ انیس کے کئی مجموعوں کے اشعار گنے، کسی میں ۵۲ ہزار سے زیادہ نہ تھے۔ [نمبر ۱۰۰] قاضی صاحب نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ آزاد نے انیس کا سنہ وفات نہیں لکھا۔ [نمبر ۱۵۲]

مصنفِ "آبِ حیات" کس پائے کا راوی ہے اس کا صحیح ترین اندازہ لگانے کے لیے اس کی تدوینِ دیوانِ ذوق سے صَرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ شیرانی نے آزاد کے مسودات میں ۱۴ ایسی غزلیں تلاش کیں جو دیوانِ ذوق میں شامل ہیں اور خود آزاد کی مصنفہ ہیں۔ ملاحظہ ہو "مقالاتِ شیرانی"، جلد سوم، ص ۲۶۱، ڈاکٹر محمد صادق نے آزاد پر انگریزی میں مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ یہ مقالہ ۱۹۶۵ء میں انگریزی میں اور ۱۹۷۶ء میں اردو میں شائع ہوا۔ اس کے آخر میں آٹھواں ضمیمہ ہے: "مسودہ دیوانِ ذوق" اس میں انھوں نے تین قصیدوں اور ۷۲ غزلوں کے عکس دیے جو اگر یک سر جعلی نہیں تو مشکوک ضرور ہیں (عابد، ص ۱۴۶)۔

تدوینِ دیوانِ ذوق میں آزاد ایسے جعل ساز کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں جن کے جعل کے ناقابلِ تردید دستاویزی ثبوت ہیں۔ کیا ایسے راوی کی تاریخِ ادب کے کسی بیان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"آبِ حیات" میں بھی آزاد محقق کے طور پر سامنے نہیں آتے۔ شبلی نے آزاد کے بارے میں رائے دی تھی، "آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم اِدھر اُدھر سے گپیں ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔

("داستانِ تاریخِ اردو"، طبعِ دوم، آگرہ، ۱۹۵۷ء، ص ۳۹۹)۔

خود حامد حسن قادری کی آزاد کے بارے میں یہ رائے ہے:

علامہ مؤرخ بھی ہیں اور نقاد بھی اور مؤرخ و نقاد کا پہلا فرض صداقت، انصاف اور بے تعصبی ہے لیکن آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی

Scanned by CamScanner

راے کی تائید میں یا اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کے لیے یا اپنے
پسندیدہ و ناپسندیدہ شخص کی مدح و ذم کی خاطر کبھی واقعات فرض کر
لیتے ہیں، کبھی خلافِ واقع نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔

(ص ۳۹۹)

جو شخص ایک پرانی فارسی رباعی کو سودا سے منسوب کر کے فاخر مکین کی ہجو بنا دیتا ہے، جو بیدل اور جعفر زٹلی کے بیچ کے معاملے کو جعفر اور سودا کا معاملہ بنا دیتا ہے، جو قاسم کے منشا کے برعکس مرزا مظہر جانِ جاناں کے قاتل کو سنی قرار دیتا ہے، جو جھوٹ موٹ معرکے تصنیف کرتا ہے یا تذکروں سے بے ضرر مسابقتوں کو اٹھا کر معرکوں میں تبدیل کر دیتا ہے، جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ بیس سال تک دن رات ذوق کی حضوری میں رہا حالانکہ ذوق کے انتقال کے وقت اس کی عُمر تقریباً ساڑھے چوبیس سال تھی، جو خود غزلیں کہہ کر ذوق کے نام سے ان کے کلام میں شامل کر دیتا ہے وہ دور دور تک محقق نہیں، ادبی جعل ساز ہے۔ بحیثیت راوی اس کی حیثیت صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، نصیر حسین خیالؔ اور مفتی انتظام اللہ شہابی سے بہتر نہیں۔

"آبِ حیات" یا دیوانِ ذوق میں اس کے بیان کردہ کسی واقعے یا لطیفے پر کیوں کر بھروسا کیا جائے۔ کون جانے کہ اس میں اصل کتنی ہے اور افسانہ کتنا۔ اس نے میر، سودا، انشا، آتش، ناسخ، ذوق اور غالب وغیرہ کی بھرپور قلمی تصویریں کھینچی ہیں لیکن یہ جن واقعات اور لطائف کی بنا پر تعمیر کی گئی ہیں خود انھیں کی صحت مشکوک ہے۔ اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ وہ تصویریں صحیح ہیں کہ محض تخیلی ہیں۔ طرف داری انھیں چھو نہیں گئی۔ کسی ماخذ کے بیان کو وہ حسبِ ضرورت توڑنے مروڑنے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ آزاد کو تحقیق کے جو مواقع میسر تھے اس نے ان کا غلط استعمال کیا۔

تاریخی ناول کے بنیادی کردار اور مرکزی واقعات تاریخی ہوتے ہیں، ثانوی کردار اور واقعات مصنف کی تخلیق ہوتے ہیں۔ آزاد نے تحقیق میں ناول کے ہتھکنڈے کو استعمال کیا۔ مناسب ہوگا کہ "آبِ حیات" کو لائبریریوں میں ادبی تاریخ یا تذکروں کے خانے میں جگہ نہ دی جائے، بلکہ داستان و افسانہ کے خانے میں رکھا جائے۔ ادبی تاریخ اور ادبی شخصیات کے تصور کو اس کتاب نے جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا کسی اور کتاب نے نہیں۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱)۔ "آزاد بحیثیت محقق"، نوائے ادب، بمبئی، ۱۹۵۲ء، تین قسطیں۔ بعد میں یہ "محمد حسین آزاد بحیثیت محقق" نام کے کتابچے کے طور پر چھاپ دی گئیں، پٹنہ، ۱۹۸۴ء۔ فی الوقت یہی ایڈیشن پیش نظر ہے۔ مندرجہ بالا مقولہ اس کتابچے کا پہلا جملہ ہے۔ اس کے اندراجات کا حوالہ صفحے کے بجائے "قاضی" لکھ کر شق نمبر سے دیا جائے گا۔

(۲)۔ Richard Altick: The Act of Literary Research (NewYork, 1967) pp. 17-18

(۳)۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، "محمد حسین آزاد"، ۲ جلدیں، (کراچی-۱۹۶۵) جلد-۲، ص ۴۲-۱۴۱

(۴)۔ "دو قدیم ریختے"، رسالہ "تحریر"، دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۹۵-۹۳

(۵)۔ عبیدہ بیگم، "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۹

(۶)۔ دلی کالج میگزین، میر نمبر، ص ۳۰، بحوالہ: جمیل جالبی، "تاریخ ادب اردو"، جلد-۲، حصہ ایک، ص ۵۰۵

(۷)۔ فاروقی، "دید و دریافت"، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۰۲، حاشیہ

(۸)۔ "عبدالحق بحیثیت محقق"، رسالہ معاصر، ۱۵، بابت نومبر ۱۹۵۹ء، ص ۴

(۹)۔ نثار احمد فاروقی "میر بہادر علی وامق"، مشمولہ: "دراسات" دہلی، دسمبر ۱۹۷۸ء، ص ۶۱-۱۶۰

(۱۰)۔ آمنہ خاتون، "تحقیقی نوادر"، ص ۳۰-۲۹، بحوالہ: فرخی، ص ۱۷۷

(۱۱)۔ مالک رام، "انشا کی تاریخ ولادت و وفات"، مشمولہ: "تحقیقی مضامین"، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۹

(۱۲)۔ "لطائف السعادت"، ص ۲۵-۱۲۴، بحوالہ: "انشا کے حریف و حلیف"، ص ۱۹۹، نیز "انشا"، ص ۴۲۱

(۱۳)۔ "انشا کے حریف و حلیف"، ص ۱۸۲

(۱۴)۔ نثار احمد فاروقی، "مصحفی کی زبان"، مشمولہ: "دراسات"، دہلی، ۱۹۷۸ء

Scanned by CamScanner

(۱۵)۔ "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، طبع اول، علی گڑھ ۱۹۴۴ء، ص ۲۲۲
(۱۶)۔ "دہلی کی آخری شمع"، ص ۲۰، بحوالہ: شیرانی، "مقالاتِ حافظ محمود شیرانیؒ"، جلد سوم، ص ۱۲۲
(۱۷)۔ ڈاکٹر سید معین الرحمان، "یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق"، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۷-۲۸
(۱۸)۔ تذکرۂ شعرا از حسرت موہانی، مرتبہ: ڈاکٹر احمر لاری، گورکھ پور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۴۰، نیز ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی، "نسیم دہلوی حیات و شاعری"، لکھنؤ ۱۹۷۷ء، ص ۲۰-۱۷
(۱۹)۔ "غالب، درونِ خانہ"، بمبئی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۴ و ۲۹۴

Scanned by CamScanner

تیسرا باب

"گلِ رعنا" و "شعر الہند"

الف۔ حکیم عبدالحی: "گلِ رعنا"

"گلِ رعنا" کے دیباچے پر ۶ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ (دسمبر ۱۹۲۱ء) درج ہے۔ اس کے مصنف حکیم عبدالحی کا انتقال ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو ہوا۔ کتاب کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ طبعِ اول پر سنہ اشاعت ۱۳۴۳ھ درج ہے۔ مولانا عبدالحی کے لائق فرزند سید ابوالحسن علی ندوی کے مطابق مصنف نے کتاب کا مسودہ مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس بھیج دیا لیکن اس عرصے میں ان کی وفات ہو گئی اور وہ کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے۔ یہ غالباً جمادی الاول ۱۳۴۳ھ (دسمبر ۱۹۲۴ء) میں چھپ کر شائع ہوئی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے "معارف" بابت جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ (جنوری ۱۹۲۵ء) کے شذرات میں اس کا تعارف پیش کیا اور اس کی طباعت کا اعلان کیا(۱)۔ رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۷ء میں مولوی عبدالحق نے اس پر تبصرہ کیا۔

اردو میں شعرا کے حالات لکھنے کی روایت تین منزلوں میں استوار ہوئی ہے۔ پہلی منزل بیاض کی تھی جس میں صاحبِ بیاض اپنے پسندیدہ اشعار درج کر لیتا تھا۔ دوسری منزل تذکرے کی ہے جس میں اشعار کے ساتھ ان کے مصنفوں کے حالات بھی لکھ دیے جاتے تھے اور انھیں تخلصوں کی ہجائی ترتیب سے درج کیا جاتا تھا۔ تیسری منزل تاریخِ ادب کی ہے جس میں شعرا کو تاریخی ترتیب سے درج کیا گیا، ادوار قائم کیے گئے اور ہر دور کی خصوصیات دریافت کی گئیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ "گلِ رعنا" تینوں منزلوں سے گزری ہے۔ عبدالحی نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اپنے پسندیدہ اشعار کی ایک بیاض بنائی تھی۔ اس بیاض کو بھول گئے تھے۔ ایک عرصے کے بعد بیمار ہوئے تو ہلکی پھلکی کتابوں کے مطالعے تک محدود رہنا پڑا۔ کتابوں کے بیچ اوراقِ نسیاں میں سے وہ بیاض بھی نکل آئی۔ سوچا کہ کلام

Scanned by CamScanner

کو ترتیب دے کر شعرا کے مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں۔ اس طرح کتاب "گلِ رعنا" وجود میں آئی۔ یہ وہی طریقہ ہے جس سے تذکرے تالیف کیے جاتے تھے چنانچہ حکیم عبدالحی نے کتاب کے سرورق پر لکھا ہے، "تذکرۂ شعراے اردو موسوم بہ گلِ رعنا" لیکن تذکرے اور تاریخ کے بیچ مابہ الامتیاز یہ ہوتا ہے کہ تذکرے میں شعرا کو الف بائی ترتیب سے اور تاریخِ ادب میں تاریخی ترتیب سے درج کیا جاتا ہے۔ "گلِ رعنا" نے "آبِ حیات" کی تقلید میں شعرا کو تاریخی ترتیب سے دیا، ان کے ادوار قائم کیے اور ادوار کی خصوصیات درج کیں۔ سرورق پر اس کی صراحت یوں ہے:

> تذکرۂ شعراے اردو موسوم بہ گلِ رعنا یعنی اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد کے باکمال اردو شعرا کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار اور ان کے ہر قسم کے کلام کے نمونے۔

انھوں نے دیانت داری اور صحت سے اپنے موضوعِ تحریر کی صراحت کر دی ہے۔ یہ بازگشت ہے "آبِ حیات" کے سرورق کی جس پر لکھا ہے:

> آبِ حیات یعنی مشاہیر شعراے اردو کے سوانحِ عمری اور زبانِ مذکور کی عہد بعہد کی ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان۔

"گلِ رعنا" کا اہم ترین ماخذ "آبِ حیات" ہے لیکن انھوں نے ہر جگہ "آبِ حیات" کی غلطیوں پر اعتراض یا تصحیح کی طرف خصوصی توجہ دی ہے جس کی وجہ سے "گلِ رعنا"، "آبِ حیات" کی ایک کمزور حریف بن کر رہ گئی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے بھی ایک طویل مقدمے میں اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ دی ہے۔ سرورق کے اندراج کے مطابق یہ کتاب شعراے اردو تک محدود ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ چار صفحوں میں اردو نثر کی تاریخ بھی دی ہے (طبعِ چہارم، اعظم گڑھ، ۱۳۷۰ھ، ص ۳۸-۳۵)۔ شاعری کی تاریخ میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ آزاد نے اردو شاعری کے پانچ دور کیے تھے۔ "گلِ رعنا" میں پہلے تین طبقے قائم کیے گئے۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین۔ پھر ان تینوں طبقوں میں تین تین دور قائم کیے جن سے کل نو دور حاصل ہوئے۔

آزاد کے زمانے میں دکنی شعرا کے بارے میں میر کے "نکات الشعرا" سے زیادہ معلومات نہ تھیں اس لیے حکیم عبدالحی کا یہ اعتراض زیادتی ہے کہ آزاد نے ولی سے پہلے کے اردو شعرا کی کاوشوں اور کاہشوں پر خاک ڈالی ہے (ص ۴۴)۔ سچ تو یہ ہے کہ خود حکیم عبدالحی کے زمانے میں بھی شعراے دکن کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ آصفی ملکاپوری

Scanned by CamScanner

کا تذکرہ "محبوب الزمن" حکیم عبدالحی کے مآخذ میں سے ہے۔ انھوں نے مقدمے میں چند دکنی شعرا کا مختصراً ذکر کیا ہے، لیکن بعد میں صرف نصرتی کو عنوان بنا کر تفصیل سے لکھا۔
۱۹۲۱ء تک "آبِ حیات" کے علاوہ اور کوئی ادبی تاریخ وجود میں نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے صاحب "گلِ رعنا" کی معلومات سرسری اور بعض اوقات ناقص ہیں۔ شاید زمانی شعور کے کمزور ہونے کی وجہ سے بعض شعرا کو غلط دور میں رکھ دیا ہے مثلاً میر کے بہنوئی محمد حسین کلیم کو متقدمین میں جگہ دی جب کہ مظہر جانِ جاناں کو متوسطین کے دورِ اوّل میں۔ ظاہر ہے کہ مظہر کو حاتم و آبرو وفغاں وغیرہ کے ساتھ متقدمین میں رکھنا چاہیے تھا۔ میر اثر کو متوسطین کے دوسرے دور میں رکھا ہے حالانکہ ان کا صحیح مقام متوسطین کے دورِ اوّل میں سودا، میر، درد اور سوز وغیرہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ذوق، مومن اور غالب کو متوسطین کے تیسرے دور میں رکھا ہے، لیکن ناسخ اور آتش کو متاخرین کے دورِ اوّل میں جگہ دی، حالانکہ یہ سوفی صدی غالب و ذوق کے معاصرین ہیں۔ مرثیہ نگار دبیر و انیس کو کتاب کے آخر میں یعنی حالی، اسماعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی کے بھی بعد جگہ دی ہے۔ کیا حکیم صاحب اردو شاعری کو غزل ہی کے مترادف مانتے ہیں، مرثیے کو محض نواحی حیثیت دیتے ہیں۔
آزاد نے "آبِ حیات" میں شعرا کے حالات درج کرنے کا عجیب طریقہ نکالا کہ کچھ کو متن میں جگہ دی اور کچھ کو حاشیے (فٹ نوٹ) میں۔ اس میں کئی جگہ توازن ہاتھ سے جاتا رہا کہ متن میں بعض غیر اہم شعرا شامل ہو گئے جب کہ ان سے بہتر شعرا حاشیے ہی کے سزاوار قرار پائے۔ عبدالحی، آزاد کی اس درجہ بندی پر بجا اعتراض کرتے ہیں کہ "آبِ حیات" میں خان آرزو، میر ضاحک اور میر خلیق کو عنوان کے ساتھ ممتاز جگہ دی ہے، حالانکہ ان کے محض دو چار اردو شعر ملتے ہیں۔ جب کہ اثر، قائم، یقین، ہدایت، بیان جیسے مشاق شاعروں کو کہیں جگہ نہیں دی۔ قائم کے لیے آزاد خود لکھتے ہیں کہ ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے نیچے نہیں رکھ سکتے، پھر بھی اس غریب کو نظر انداز کیا (فٹ نوٹ ص ۳۲)۔
حاشیے کو شعرا کے حالات کے لیے استعمال کرنا غلط طریقہ ہے۔ حاشیے میں یا تو شاملِ متن اقتباسات کا حوالہ دینا چاہیے یا متن کے کسی اندراج پر ایسا تبصرہ جو متن میں درج کیا جائے تو دخل در معقولات معلوم ہو۔ پُرمغز معلومات کو حاشیے کے بجائے متن ہی میں جگہ دینی چاہیے۔ صاحبِ "گلِ رعنا" نے بھی "آبِ حیات" کی نقل کر کے متعدد شعرا کے حالات فٹ نوٹ میں لکھے ہیں اور بارہا یہ حالات ایک صفحے سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ انھوں نے بھی متعدد غیر اہم شعرا کو علاحدہ عنوان کے تحت لکھا ہے، حالانکہ ان سب کو ہر دور کے آخر میں سمیٹ لینا چاہیے تھا۔ ایسے کم اہم لیکن ممتاز مقام پانے والے شعرا یہ ہیں:

Scanned by CamScanner

فقیراللہ آزاد (جس کا محض ایک شعر ملتا ہے۔) محمد حسین کلیم، محمد باقر حزیں، میر محمد (کذا) بیدار، قدرت اللہ قدرت، میر ضیاءالدین ضیا، بقاءاللہ بقا، ثناءاللہ خاں فراق، میر حسین تسکین، کرامت علی شہیدی، قربان علی سالک۔

یہ صحیح ہے کہ مؤرخینِ ادب ان سب ناموں سے آشنا ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا قابلِ امتیاز مقام نہیں۔ ان کے مقابلے میں واجد علی شاہ جیسے پُرگو شاعر کو حاشیے میں جگہ دی ہے (ص ۸۵-۳۸۲)۔ ان صفحات پر متن میں محض دو تین سطریں ہیں۔ اتنے طویل احوال کا شاعر متن میں جگہ پانے کا مستحق تھا۔

اب میں اپنی اور قارئین کی سہولت کے لیے "گلِ رعنا" کے اندراجات پر صفحہ بہ صفحہ اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

میر حسن کے تذکرے سے لے کر لکھا ہے کہ غواصی کی مثنوی "طوطی نامہ"، "بکٹ کہانی" کے انداز پر کچھ ہندی کچھ فارسی ملی جُلی نظم تھی (ص ۱۰)۔ اب یہ مثنوی دریافت ہو کر شائع ہو گئی ہے۔ یہ "بکٹ کہانی" کی طرح دولسانی ریختہ نہیں، معمول کی دکنی میں ہے۔

میر حسن نے خاکی کا ایک شعر نقل کر کے اسے عہدِ جہاں گیر کا کہا ہے۔ حکیم عبدالحی کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ شعر کی زبان عہدِ جہاں گیر کی نہیں، عہدِ عالم گیر کی معلوم ہوتی ہے (ص ۱۱-۱۰)۔ ص ۱۱ کے حاشیے میں وہ یہ مفید اطلاع دیتے ہیں کہ حبیب الرحمان خاں شروانی کے کتب خانے میں سید محمد قادری خاکی معاصر ولی کا دیوان تھا جس میں دو ریختیاں بھی تھیں۔ بہت ممکن ہے میر حسن نے جس خاکی کا شعر نقل کیا ہے وہ یہی ہو (حاشیہ ص ۱۱)۔ یہ دیوان شائع ہونا چاہیے تھا۔ خاکی کی "ریختی" ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی نے اپنے مقالے "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" میں درج کی ہے (لکھنؤ، ۱۹۷۴ء، ص ۲۸۱)۔ خاکی کے بارے میں یہ معلومات سب سے پہلے مؤلفِ "گلِ رعنا" نے دی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے جو بات حاشیے میں دی ہے اسے متن میں کیوں نہیں دیا۔ ایک ہی موضوع کا آدھا جزو متن میں اور آدھا حاشیے میں!

ص ۱۴ تا ۱۸ پر درویشوں کے ملفوظات اور ان کی شانِ نزول درج ہے۔ یہ تلاش قابلِ قدر ہے۔ بعد کی کتابوں میں یہ ملفوظات عام ہو گئے ہیں لیکن "گلِ رعنا" میں شاید سب سے پہلے ملتے ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ کے لیے لکھتے ہیں:

> دھرپد میں ایک کتاب ملکی زبان میں لکھی تھی۔ اس کا نام "نورس نامہ۔" (ص ۲۳)

"نورس" نہ دھرپد کی کتاب ہے نہ موسیقی کی۔ یہ ابراہیم کے گیتوں کا مجموعہ ہے جن

Scanned by CamScanner

کی ابتدا میں اس راگ کی صراحت ہے جس میں یہ گائے جانے چاہییں۔

آزاد نے "آبِ حیات" میں ولی کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیا تھا۔ "گلِ رعنا" میں قلی قطب شاہ کو یہی اعزاز دیا ہے (ص ۲۴)۔ اب اس سے پہلے کے متعدد شعرا دریافت ہو گئے ہیں۔ قلی کا سنہ وفات ۱۰۲۲ھ لکھا ہے، صحیح ۱۰۲۰ھ ہے (۲)۔ ص ۲۶ نیز ص ۸۵-۸۴ پر ایک بیاض سے لے کر نصرتی کے ایک معراج نامے کا ذکر کرتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

مؤلف "گلِ رعنا" (حکیم عبدالحی صاحب) نے نصرتی کی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے۔

("دکن میں اردو"، ۸۵ء، ص ۲۱۵)

"گلِ رعنا" میں اس کے جو اشعار دیے ہیں ان سے یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ نصرتی کے قصیدۂ چرخیہ کے اشعار ہیں جنھیں ناواقفیت کی بنا پر "معراج نامہ" سمجھ لیا گیا۔ ص ۹۰ پر نصرتی کی مثنوی "شاہ نامہ" کا ذکر ہے۔ یہ غالباً "علی نامہ" کی تخریب ہے۔

"تذکرۂ محبوب الزمن" میں مشہور شاعر ہاشمی بیجاپوری کا نام شاہ ہاشم اور سنہ وفات ۱۱۹۰ھ بتایا گیا ہے۔ حکیم عبدالحی تصحیح کرتے ہیں کہ شاہ ہاشم ہاشمی کے پیر کا نام تھا نیز ۱۱۹۰ھ غالباً ۱۰۹۰ھ ہوگا (ص ۲۷)۔ یہ دونوں باتیں تقریباً صحیح ہیں۔ حفیظ قتیل نے "دیوانِ ہاشمی" میں ہاشمی کا سنہ وفات ۱۱۰۹ھ لکھا ہے (۳)۔ جمیل جالبی نے بھی ۱۱۰۹ھ لکھا ہے، گو اس کے آگے سوالیہ نشان بھی لگا دیا ہے (جلد اوّل، ص ۳۵۴)۔

ص ۲۸ پر آزاد کی تقلید میں ولی کا نام شمس ولی اللہ لکھا ہے لیکن ص ۸۷ پر اس کا نام شمس الدین اور لقب ولی اللہ بتاتے ہیں۔ ص ۸۸-۸۷ پر مختصراً ولی کے گجراتی یا اورنگ آبادی ہونے کی بحث درج کی ہے۔ آزاد نے ولی ویلوری کی مثنوی کو ولی دکنی کی سمجھ کر لکھا تھا، "ایک مثنویِ مختصر کربلا کے حال میں۔" یہی غلط فہمی حکیم عبدالحی کو ہے۔ وہ مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۳۱ھ بھی درج کرتے ہیں (ص ۳۵ اور ۸۹)۔ ص ۳۵ پر لکھتے ہیں کہ میر محمد حسین کلیم نے "فصوص الحکم" کا ترجمہ کیا۔ یہاں یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ کلیم نے یہ منظوم ترجمہ بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔ ص ۸۹ پر ولی کا سنہ وفات تقریباً ۱۱۵۵ھ درج کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ۱۱۱۹ھ طے کیا۔

حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی" کا ماخذ ابنِ نشاطی کے "طوطی نامہ" کو قرار دیتے ہیں (ص ۳۹)۔ لیکن ابنِ نشاطی نے کوئی "طوطی نامہ" لکھا ہی نہیں۔ حیدری کا ماخذ سید محمد قادری کا فارسی نثری "طوطی نامہ" ہے۔

Scanned by CamScanner

ص ۵۰ پر لکھتے ہیں کہ اردو میں پہلا واسوخت میر نے لکھا۔ ظاہر ہے یہ بات "آبِ حیات" ص ۲۰۹ سے لی ہے۔ میر سے پہلے حاتم، آبرو اور ناجی کے واسوخت ملتے ہیں۔ جمیل جالبی کے بقول اردو کا پہلا واسوخت شاہ حاتم نے ۱۱۴۹ھ میں لکھا (جلد دوم، حصہ اوّل، ص ۱۴۴۱)۔

ص ۵۲ پر لکھتے ہیں کہ تصوّف کو درد سے پہلے سراج کے سوا کسی نے چھوا ہی نہیں۔ یہ درست نہیں، ولی سراج سے مقدم ہے اور اس کی غزلوں میں معرفت کے اشعار کافی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ دکنی میں کئی عارفانہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔

"آبِ حیات" میں شرف الدین مضمون کے وطن کا نام جاج مئو علاقہ اکبر آباد لکھا ہے۔ "گلِ رعنا" میں اسی کی تقلید میں جاج مئو صوبہ اکبر آباد لکھا ہے (ص ۱۱۰)۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ صحیح نام "جاجو" ہے اور یہ ضلع کان پور میں ہے۔ ["آزاد بحیثیت محقق"، شق نمبر ۱۰۵]

اشرف علی خاں فغاں کے استاد کے سلسلے میں "تذکرۂ مصحفی" سے فغاں کا وہ شعر درج کرتے ہیں جس میں انھوں نے ندیم کو اپنا استاد کہا ہے۔ حکیم عبدالحی پھر "آبِ حیات" کی گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> آزاد نے "آبِ حیات" میں تذکرۂ مصحفی کے حوالے سے لکھا ہے کہ قزلباش خاں امید کے شاگرد تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نے مصحفی کا تذکرہ نہیں دیکھا۔ (ص ۱۲۱)

آزاد کو مرزا مظہر سے عناد ہے۔ حکیم صاحب نے اس کا تجزیہ کر کے اس پر اعتراضات کیے۔ آزاد نے جو لکھ دیا ہے کہ مظہر نے ایک نواب زادے کو آب خورہ ٹیڑھا رکھنے پر سخت سست کہا، اس واقعے کی صحیح شکل دریافت کر کے لکھی جس سے مظہر کا کردار مجروح نہیں ہوتا۔ ان کا اردو کلام بہت کم ہے۔ آزاد نے چند اشعار دیے تھے۔ "گلِ رعنا" میں تلاش کر کے "آبِ حیات" سے کہیں زیادہ شعر درج کیے ہیں (ص ۱۳۱-۱۲۸)۔

آزاد نے سودا کے دہلوی سرپرستوں میں مہربان خاں رند کا بھی نام لیا ہے۔ حکیم صاحب تصحیح کرتے ہیں کہ مہربان خاں رند فرخ آباد میں دیوان تھے، دہلی میں نہیں۔ آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودا ۱۱۸۵ھ میں شجاع الدولہ کی ملازمت میں لکھنؤ پہنچے۔ عبدالحی نے اعتراض کیا کہ شجاع الدولہ فیض آباد رہتے تھے، سودا لکھنؤ نہیں، فیض آباد گئے تھے (ص ۱۳۹)۔ عبدالحی کے وقت تک سنین کی تحقیق نہیں ہوئی تھی۔ خلیق انجم اپنی کتاب میں صراحت کرتے ہیں کہ سودا ۱۱۷۳ھ میں فرخ آباد گئے اور ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد

Scanned by CamScanner

("مرزا محمد رفیع سودا"، علی گڑھ ۱۹۶۶ء، ص۱۱۶ و۱۱۹)۔ جب سودا شجاع الدولہ کے پاس پہنچے تو بقولِ آزاد شجاع الدولہ نے سودا سے کہا کہ مرزا تمھاری رباعی میرے دل پر نقش ہے (اس رباعی میں سودا نے شجاع الدولہ کی دعوت کو ٹھکرا کر دلّی ہی میں رہنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا)۔ اس پر سودا بہ پاسِ وضع داری پھر کبھی دربار نہیں گئے تا آں کہ شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ حکیم عبدالحی نے درست تردید و تصحیح کی کہ سودا ہمیشہ شجاع الدولہ کی ملازمت میں رہے اور ثبوت میں مصحفی کا بیان نقل کیا۔

آزاد نے لکھا ہے کہ میر، خانِ آرزو سے بگڑ کر الگ ہو گئے تھے اور آزاد کا یہ بیان صحیح ہے۔ عبدالحی "نکات الشعرا" کو پڑھ کر اس پر شک کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میر نے خانِ آرزو کا ذکر بہت محبت و ادب سے کیا ہے (ص۱۵۵)۔ بگاڑ کا پتا "ذکرِ میر" سے چلتا ہے اور وہ "گلِ رعنا" کے چند سال بعد سامنے آئی۔ آزاد نے میر کی نازک دماغی کے بیان میں مبالغہ کیا ہے۔ عبدالحی نے ص۶۰-۱۵۸ پر اس کی تغلیط کی اور کہا کہ آزاد کا پیش کردہ انسان نازک مزاج نہیں، بلکہ خردماغ کہلائے گا۔ میر کی سعادت علی خاں سے مبینہ گستاخانہ گفتگو کو پاگلوں والا انداز کہا ہے۔ عبدالحی کی اس بات میں وزن ہے کہ آزاد کی یہ مرقع کشی حقیقت سے پرے ہے۔ آزاد نے جو یہ کہا تھا کہ میر کو اوروں کے کمال دکھائی نہ دیتے تھے، اس کی تردید میں عبدالحی نے "نکات الشعرا" سے میر سجاد کی قدرشناسی کے الفاظ نقل کیے (ص۱۶۰)۔

آزاد نے "نکات الشعرا" کے لیے لکھا تھا کہ اس میں میر نے ولی کو شیطان سے مشہور تر شاعر قرار دیا ہے۔ عبدالحی اعتراض کرتے ہیں کہ "نکات الشعرا" میں یہ الفاظ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے آزاد نے "نکات الشعرا" نہیں دیکھا تھا (ص۱۶۱)۔ اب محققوں کی رائے ہے کہ آزاد کے پیشِ نظر "نکات الشعرا" کا ایسا نقشِ اوّل رہا ہوگا جس میں یہ طنز تھا۔ "گلِ رعنا" میں بھی "آبِ حیات" کی طرح میر کی عمر سو برس لکھی ہے (ص۱۶۳)۔ اب تحقیق ہو گئی ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر ۹۰ ہجری برسوں کی تھی۔ میر درد کے فارسی رسالے نہ آزاد نے دیکھے تھے نہ حکیم عبدالحی نے۔ دونوں ان کے بارے میں غلط اطلاع دیتے رہے۔ آزاد نے لکھا:

> انتیس برس کی عمر میں "وارداتِ درد" نام ایک اور رسالہ لکھا اور اس کی شرح میں "علم الکتاب" ایک بڑا نسخہ تحریر کیا کہ اس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں، "نالۂ درد"، "آہِ سرد"، "دردِ دل"، "سوزِ دل"، "شمعِ محفل" وغیرہ۔ ("آبِ حیات"، ص۱۸۵)

Scanned by CamScanner

"گلِ رعنا" میں اسی بات کو قدرے اختلاف سے یوں لکھا ہے:

> "وارداتِ درد" نام کی ایک دوسری کتاب ہے جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں، "نالۂ درد"، "آہِ سرد"، "دردِ دل"، "سوزِ دل"، "شمعِ محفل" وغیرہ۔ اس کی شرح میں "علم الکتاب" جیسی کتاب تصنیف کی۔ (ص ۱۷۶)

صحیح صورتِ حال جمیل جالبی نے بیان کی۔ "واردات" میں ۱۱۱ واردات یعنی صوفیانہ تجربے بیان کیے گئے ہیں جن کے شروع اور آخر میں ایک ایک فارسی رباعی دی ہے۔ کتاب نسبتاً مختصر ہے۔ "علم الکتاب" ۶۴۸ جہازی صفحوں کی ضخیم کتاب ہے جس میں ہر صفحے پر باریک قلم سے ۲۷ سطریں لکھی ہیں۔ یہ کسی حد تک "واردات" کی شرح ہے لیکن ساتھ ہی میر درد کے والد کی کتاب "نالۂ عندلیب" پر بھی مبنی ہے۔ جنھیں آزاد نے علاحدہ رسالے کہا ہے وہ دراصل الگ الگ فصلیں ہیں (جالبی، جلد دوم، حصہ دوم، ص ۳۵-۷۳۱)۔ آزاد اور عبدالحی دونوں نے چند رسالوں کو "واردات" یا "علم الکتاب" کا جزو قرار دیا ہے، یہ صحیح نہیں۔ ان میں سے "نالۂ درد"، "آہِ سرد"، "شمعِ محفل" اور "دردِ دل" علاحدہ رسالے ہیں۔ "سوزِ دل" کے بارے میں جالبی کا خیال ہے کہ یہ "دردِ دل" ہی کا دوسرا نام ہے۔

آزاد نے "آبِ حیات" میں میر کی زبانی درد کو آدھا شاعر اور سوز کو پاو شاعر کہا ہے۔ آزاد کی بےاصل اختراعات کے پیشِ نظر ان کے بیانات کو صحیح نہیں مانا جا سکتا، تاوقتے کہ ان کی کہیں اور سے تصدیق نہ ہو جائے۔ حکیم عبدالحیٔ نے بھی میر درد اور میر سوز کے احوال میں اسے بجا طور پر آزاد کا "بہتان" اور "بذلہ سنجی" قرار دیا (ص ۱۷۷ و ۱۸۴)۔ عبدالحی نے قائم کا سنہِ وفات ۱۲۱۰ھ لکھا ہے (ص ۱۸۸)۔ جمیل جالبی نے مصحفی نیز رباعیِ جرأت کی سند پر ۱۲۰۸ھ قرار دیا (جلد ۲، حصہ اوّل، ص ۷۶۷)۔ بیان کا نام خواجہ احسن اللہ خاں لکھتے ہیں (ص ۱۹۶)۔ جالبی کے مطابق صحیح خواجہ احسن الدین خاں تھا جیسا کہ ان کے حیدر آبادی شاگرد گلاب چند ہمدم نے لکھا (جلد ۲، حصہ اوّل، ص ۷۰۴)۔

میر محمدی بیدار کا نام میر محمد علی لکھا ہے (ص ۲۰۴)۔ جمیل جالبی کے مطابق ان کا نام شیخ عمادالدین تھا لیکن گھر میں محمدی کے نام سے پکارے جاتے تھے (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۰۰)۔ "گلِ رعنا" میں ان کا سنہِ وفات ۱۲۰۹ھ لکھا ہے لیکن مزار پر کندہ قطعۂ تاریخ کے مطابق ۱۲۱۰ھ ہے۔ (جالبی، ایضاً، ص ۹۰۱)۔ میر اثر کے لیے لکھتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ سے پہلے انھوں نے رحلت کی ہے (ص ۲۱۳)۔ ان کی صحیح تاریخِ وفات ۱۲۰۹ھ

Scanned by CamScanner

ہے جو دہلی میں ان کے مزار پر کندہ ہے۔ عبدالحی جعفر علی حسرت کے استاد دیوانہ کا نام رائے سرب سنگھ لکھتے ہیں (ص ۲۱۹)۔ صحیح رائے سرب سکھ ہے۔ حسرت کی وفات کا سال "گلِ رعنا" طبعِ چہارم میں ۱۲۱۰ھ اور میرے پیشِ نظر جدید ترین ایڈیشن میں (سال طبع ندارد) ے۱۲۱ھ دی ہے (دونوں ایڈیشنوں میں، ص ۲۲۰)۔ جالبی نے رباعیِ جرأت اور تذکرۂ "مجمع الانتخاب" کی سند پر ۱۲۰۶ھ طے کی ہے (جا ۲، ص ۸۸۱)۔

مصحفی کا اہم شعر درج کرتے ہیں:

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی

میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

(ص ۲۲۳)

یہ "آبِ حیات" میں بھی درج ہے لیکن نہ آزاد نے، نہ عبدالحی نے اس طرف توجہ کی کہ آزاد کے بقول، میر جب لکھنؤ پہنچے اور انھوں نے غزل میں ایک قطعہ پڑھا تو اس کے دو مصرع مصحفی کے مندرجۂ بالا شعر سے مماثل ہیں:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

لگتا ہے مصحفی نے میر کے قطعے سے استفادہ کیا کیونکہ میر کا قطعہ ایک قدیم تر بیاض میں ملتا ہے۔

انشا کے لیے لکھتے ہیں، تفضل حسین خاں علامہ کی سفارش سے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی (ص ۲۶۰)۔ یہ صحیح نہیں۔ تفضل حسین کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا اور انشا ۱۲۲۰ھ میں نواب کے ملازم ہوئے (۴)۔

آزاد کی تقلید میں انشا کے لیے لکھا ہے کہ ۱۲۲۵ھ میں اقبال نے منہ موڑا (ص ۲۲۱)۔ عابد پیشاوری نے جملہ ماخذ دیکھ کر طے کیا کہ انشا اوائلِ ۱۲۲۹ھ میں معتوب ہوئے ("انشاء اللہ خاں انشا"، ص ۲۰۰)۔ آزاد نے انشا کے عالمِ جنون میں مشاعرے کی غزل کا یہ شعر درج کیا ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

حکیم عبدالحی کی معرکے کی دریافت ہے کہ یہ غزل تذکرۂ مصحفی میں موجود ہے جب

Scanned by CamScanner

کہ انشا لکھنؤ پہنچے بھی نہ تھے (ص ۲۶۲)۔ عابد کے مطابق یہ غزل انشا کے قیامِ دہلی کی تصنیف ہے (انشا، ص ۲۷۸)۔ حکیم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اوج نواسۂ انشا کے مطابق، "انشا نہ مجنوں ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی،" (ص ۲۶۳)۔ یہ درست نہیں۔ انشا کی مجنونیت کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔

آزاد کی تقلید میں ذوق کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ھ لکھا ہے (ص ۲۸۷)۔ عابد نے دریافت کیا کہ ۱۲۰۳ھ صحیح ہے ("ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص ۳۵)۔ آزاد نے معروف کو ذوق کا شاگرد بنا دیا ہے۔ عبدالحی نے اس بہتان کی شافی تردید کی (حاشیہ، ص ۲۸۸)۔ آزاد نے ظفر کا سارا کلام ذوق کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ عبدالحی نے دونوں کے رنگِ سخن کے اختلاف کی بنا پر صحیح نتیجہ نکالا کہ یہ درست نہیں (ص ۲۹۷-۹۸)۔

عجیب بات ہے کہ غالب کے احوال میں ان کی تاریخِ ولادت نہیں لکھی (ص ۳۱۲)۔

ناسخ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> کوئی کہتا ہے کہ مصحفی کے شاگردوں میں محمد عیسیٰ تنہا ایک شخص ہیں، ان سے تنہائی میں مشورہ کرتے تھے۔
>
> (ص ۳۴۴)

> حسرت موہانی نے "اردوے معلیٰ" میں مصحفی کے دیوانِ ششم کے دیباچے سے ایک فقرہ نقل کیا ہے جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ "حصۂ نعمتِ الوانِ ایں خوان بہ شیخ ناسخ، کہ یکے از دوستانِ محمد عیسیٰ تنہا است بہ فقیر ہم رسوخی زتہِ دل دارد، مقسوم گشت" (ص ۳۴۴، فٹ نوٹ)۔

اس جملے کے یہ معنی نہیں کہ ناسخ محمد عیسیٰ تنہا سے مشورہ کرتے تھے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ناسخ جو عیسیٰ تنہا کے دوست ہیں، انھوں نے بھی میرے خوانِ الوان سے حصہ بٹایا یعنی میرے شاگرد ہیں۔

آزاد کی تقلید میں لکھا ہے کہ آتش یکایک انتقال کر گئے (ص ۳۶۳)۔ اسلم فرخی نے دکھایا ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ آتش کافی عرصے تک بیمار رہ کر فوت ہوئے (جلد دوم، ص ۳۴۴)۔ حیرت ہے کہ حکیم صاحب آزاد کا سنہ وفات ۱۹۰۸ء لکھتے ہیں (ص ۴۰۷) صحیح ۱۹۱۰ء ہے۔

"گلِ رعنا" کے آخر میں دو ضمیمے ہیں۔ پہلے میں دبیر اور انیس کا بیان ہے۔ میں پہلے ہی اعتراض کر چکا ہوں کہ مرثیہ نگاروں کو ضمیمے میں کیوں جگہ دی۔ یہ "آبِ حیات" کی

Scanned by CamScanner

وفادارانہ تقلید ہے۔ دوسرا ضمیمہ ان کے والد سید فخرالدین کے بارے میں ہے جن کے لیے لکھتے ہیں:

وہ بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے مورخ تھے۔

(ص ۵۲۴)

کیفیت یہ ہے کہ ان کا بہت بڑا شاعر ہونا تو در کنار، انھیں کوئی چھوٹے شاعر کے طور پر بھی نہیں جانتا اور ملک کے مشہور مورخین ان کو مورخ کے طور پر بھی نہ جانتے ہوں گے۔ عقیدتِ فرزندی ایک بات ہے اور غیر جانب داری کے ساتھ ادبی تاریخ لکھنا دوسری بات۔ اردو ادب کی تاریخ میں اپنے والد کے ذکر کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

"گلِ رعنا" کے اس جائزے کے آخر میں مجھے اس طرف توجہ دلانی ہے کہ یہ کتاب ۲۱-۱۹۲۰ء میں تیار کی گئی۔ اس وقت تک "آبِ حیات" کے علاوہ کوئی تاریخِ ادب ظہور میں نہیں آئی تھی۔ تذکروں میں بھی علی ابراہیم کا "گلزارِ ابراہیم" ۱۹۰۶ء میں اور آسی لکھا پوری کا "محبوب الزمن" ۱۹۱۱ء میں اور چند تذکرے انیسویں صدی میں شائع ہوئے تھے۔ اس طرح عبدالحی کے سامنے وہ مواد نہ تھا جو ان کے اخلاف کے حصے میں آیا ہے۔ لامحالہ ان کا سب سے بڑا ماخذ "آبِ حیات" ہے لیکن انھوں نے کمیِ مواد کے باوصف جس طرح اس اوّلین تاریخ کے بعض تسامحات اور عدمِ توازن کی نشان دہی کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ تحقیقی اعتبار سے اس سے زیادہ کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔

ب: عبدالسلام ندوی: "شعرالہند"

عبدالسلام ندوی ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ہوا(۵)۔ شبلی نے "شعرالعجم" لکھی۔ خانوادۂ شبلی یعنی دارالمصنفین کے ایک ممتاز فرد مولانا عبدالسلام ندوی نے "شعرالہند" لکھی۔ یہ "آبِ حیات" اور "گلِ رعنا" کی طرح اردو شاعری کے جائزے تک محدود ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراض کیا:

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کتاب کا نام "شعرالہند" کیوں رکھا گیا ہے... موضوع کے لحاظ سے یہ نام موزوں نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اس میں اردو شاعری کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری زبان کی شاعری کا مطلق ذکر نہیں(۶)۔

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ میرے سامنے اس کے کئی ایڈیشن ہیں۔ طبعِ سوم اور اس کے بعد کے ایڈیشنوں کے سرورق پر سنہِ اشاعت دیا رہتا ہے لیکن ابتدائی ایڈیشنوں

میں نہیں۔ جلد اوّل کے دیباچے کے آخر میں کوئی تاریخ درج نہیں کی، کیونکہ سنین دینا مولانا عبدالسلام کی کمزوری نہیں۔ میرے استفسار پر دارالمصنفین سے مجھے اطلاع دی گئی کہ "شعرالہند" کا پہلا حصہ جون ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ فروری ۱۹۲۶ء میں نیاز نے "نگار" میں "شعرالہند" پر تبصرہ کیا(۷)۔

"آبِ حیات" اور "شعرالعجم" کے برخلاف "شعرالہند" پر ادبی تاریخ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کتاب میں تحقیق و تاریخ کا عنصر تقریباً مفقود ہے۔ یہ امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" اور حالی کے مقدمہ شعروشاعری کے قبیل کی کتاب ہے۔ اسے اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ کہنا چاہیے، جس میں شعرا کے حالات سے یک قلم صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں سنین شاذ ہی دیے ہوں گے۔ مولوی عبدالحق نے کتنا درست کہا ہے:

> مولف نے اپنی کتاب میں شعر سے بحث کی ہے اور شاعر اور اس کے عہد کو چھوڑ دیا ہے اس لیے یہ کتاب ہر جگہ تشنہ نظر آتی ہے۔
>
> ("تنقیداتِ عبدالحق"، ص ۹۸)

تنقید کا بھی مطالبہ ہے کہ شاعر کے کلام کا اس کے عہد، ادبی احول اور سوانح کے آئینے میں جائزہ لیا جائے، لیکن مولانا نے اس پہلو کو بالکل نظرانداز کیا ہے۔ وہ کتاب کا خاکہ بنانے میں بھی ماہر نہیں۔ انھیں باب کے تعین کا اچھا شعور نہیں۔ پہلے حصے (جلد) میں جو چار باب بنائے ہیں وہ دراصل کتاب کے بڑے حصے ہیں اور ان کے ذیلی عنوانات باب کی حیثیت رکھتے ہیں، بہرحال!

انھوں نے اردو شاعری کے چار دور کیے ہیں اور ان میں ہر ایک کو ایک ایک باب دیا ہے۔ پہلا باب متقدمین سے متعلق ہے جس کے تین دور کیے ہیں۔ دوسرا باب متوسطین کا ہے، اس کے دو دور کیے ہیں۔ تیسرا باب متاخرین کا ہے، اس کے بھی دو دور ہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ متاخرین کے دورِ دوم پر دور تمام ہو گئے۔ چوتھا باب دورِ جدید ہے جس میں صنف وار جائزہ لیا ہے۔ متاخرین کے بعد ایک اور دور کیا معنی۔ دورِ جدید کو متاخرین ہی کا تیسرا دور کہنا چاہیے تھا، یا پھر معاصرین کا عنوان لگا دیتے جو متاخرین کے بعد کا ہو سکتا تھا۔

کتاب کا حصہ دوم (جلد دوم) خالص تنقیدی ہے۔ مقدمہ حصہ اوّل میں اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے مقدمہ حالی، "موازنہ انیس و دبیر" اور "کاشف الحقائق" سے کافی فائدہ اٹھایا ہے (طبع ششم، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰)۔ ان کتابوں کی پرچھائیں جلد دوم میں بطورِ خاص دکھائی دیتی ہے۔ اس جلد کے مقدمے کا ذیلی عنوان، "اردو میں فنِ تنقید" ہے۔ پہلے باب میں اردو شاعری کی اصناف اور بعض موضوعات پر تاریخی حیثیت سے ریویو ہے۔ دوسرے باب میں

Scanned by CamScanner

انھیں پر ادبی حیثیت سے ریویو یعنی نظریاتی تنقید ہے۔ تیسرے باب میں تین متفرق موضوعات ہیں: "اردو کا ملکی سرمایہ" (مقامی رنگ)، "اردو شاعری سے ہندوؤں کا تعلق" اور "مربیانِ سخن"۔ آخر میں چار صفحات کا مختصر خاتمہ ہے۔

جلد اول کے ۱۱ صفحاتی دیباچے کا بڑا حصہ تذکروں کی فہرست پر مشتمل ہے جو، بقول ان کے، گارساں دتاسی نے اپنے تذکرے کے مقدمے میں دی ہے اور جس کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ محفوظ الحق نے رسالہ "معارف" ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع کیا ("شعرالہند"، حصۂ اوّل، ص ۸)۔ سچ یہ ہے کہ دتاسی نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔ اس نے ۱۸۵۴ء کے خطبے میں اردو تذکروں اور انتخابات کی تفصیل دی۔ بعد میں اسی کو "ہندوستانی زبان کے مصنفین کا تذکرہ" کے نام سے کتابی شکل میں چھاپا۔ مولوی ذکاءاللہ نے اس کا اردو ترجمہ کر کے ۱۸۵۶ء میں شائع کیا۔ محفوظ الحق کو اس ترجمے کا علم نہ ہوگا۔ انھوں نے اس کا علاحدہ سے ترجمہ کیا جس سے عبدالسلام نے استفادہ کیا۔ دتاسی کے رسالے میں جو تسامحات ہیں، وہ "شعرالہند" میں بھی در آگئے ہیں۔

عبدالسلام نے تذکروں کی فہرست نہ زمانی حیثیت سے دی ہے نہ تذکرے یا مصنفوں کے ناموں کی ہجائی ترتیب سے۔ ابتدا "عیارالشعرا" مصنفہ خوب چند ذکا سے کی ہے۔ فہرست میں ذیل کی کتابوں کو بھی تذکروں میں شامل کر لیا ہے۔

"گل زار مضامین" از مرزا جان طپش۔ "مجالسِ رنگیں"، "مختصر احوالِ مصنفین عرف رسالہ درباب تذکرہ جات" از ذکاءاللہ دہلوی۔ "روضۃ الشعرا" از محمد حسین کلیم دہلوی۔

"گل زار مضامین" طپش کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔ چونکہ شاعر نے اس کے نثری دیباچے میں اردو شاعری پر نظر ڈالی ہے اور شعرا کی زندگی کا مختصر خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ اسی لیے سہواً اسے تذکروں میں جگہ دے دی گئی۔ ذکاءاللہ کے رسالہ "درباب تذکرات" کے بارے میں عبدالسلام قیاس کرتے ہیں، "غالباً تذکروں پر کوئی بحث ہوگی"۔ انھیں یہ علم نہیں کہ وہ دتاسی کے جس نام نہاد تذکرے سے استفادہ کر رہے ہیں، ذکاءاللہ نے اسی کا ترجمہ کیا۔ یہ رسالہ تذکرہ نہیں، تذکروں کا تذکرہ ہے۔ محمد حسین کلیم کے "روضۃ الشعرا" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں اردو شعرا کا حال نظم میں لکھا گیا ہے، نیز میر نے "نکات الشعرا" میں کلیم کے احوال میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا ایک شعر بھی دیا ہے ("شعرالہند"، ص ۴)۔

ڈاکٹر محمود الٰہی کے مرتبہ "نکات الشعرا" میں کلیم کے حالات میں "روضۃ الشعرا" کا کوئی ذکر نہیں۔ عبدالسلام کے بیان سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی منظوم "تذکرہ شعرا" ہو۔ دراصل

Scanned by CamScanner

یہ ایک قصیدہ نما طویل نظم ہے جس میں شاعروں کا ذکر ہے۔ اسے تذکرہ نہیں کہہ سکتے۔
فہرست کے مندرجہ ذیل تذکرے موجود نہیں۔
"تذکرۂ عاشق" از مہدی علی عاشق دہلوی۔ لکھتے ہیں کہ "عیارالشعرا" اور "مجموعۂ نغز" کے مؤلفین نے اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ میرے سامنے "مجموعۂ نغز" ہے۔ اس کا مؤلف عاشق اور اس کی کتب سے بخوبی واقف ہے۔ اس نے عاشق کے کسی تذکرے کا ذکر نہیں کیا۔
"عیارالشعرا" میں لکھا ہے:

تذکرۂ شعرائے چند حصارِ مشاعرہ بعنوان نوشتہ (۸)۔

(مخطوطہ، مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن نقوی، ص ۳۰۳)

"مجموعۂ نغز" میں لکھا ہے کہ ۱۲ سال بلاناغہ جمعے کے روز اپنے مکان پر مجلسِ مشاعرہ منعقد کرتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مشاعرے کے شعرا میں سے چند منتخب حضرات کے احوال پر ایک تذکرہ تیار کیا۔ گارساں دتاسی نے بھی اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ تذکرۂ امام بخش کشمیری۔ اس کا ذکر مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" میں شاہ حسین حقیقت کے ضمن میں کیا ہے کہ امام بخش کشمیری نے "تذکرۂ مصحفی" اور جہاں دار شاہ کی جنگ سے سرقہ کرکے ایک جعلی تذکرہ تیار کرنا چاہا۔

۳۔ "تذکرۂ جہاں دار" از جواں بخت مرزا جہاں دار شاہ۔ یہ وہی جنگ (بزمی بیاض) ہو سکتی ہے جس کا ذکر مصحفی نے کیا ہے۔

۴۔ "تذکرۂ خاکسار"

۵۔ "تذکرۂ محمود" از حافظ محمود ہم عصرِ دتاسی۔ دتاسی نے لکھا ہے کہ اس تذکرے میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شعرا کے حالات ہیں۔ سرور نے اپنے تذکرے میں اس کا ذکر کیا ہے (ڈاکٹر ریاض الحسن، "اردو کے تذکرے"، رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۹۸)۔

۶۔ تذکرۂ امام الدین مضمون۔ عبدالسلام نے اس کے بارے میں کوئی ریمارک نہیں دیا۔ دتاسی نے لکھا ہے کہ عشقی نے مضمون کو مظلوم کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ عشقی اور میر حسن دونوں نے امام الدین مظلوم کو تذکرے کا مصنف بتایا ہے، اس کا تخلص مضمون نہیں لکھا۔ معلوم نہیں دتاسی نے کیوں کر مظلوم کو مضمون بنا دیا۔ "گلزارِ ابراہیم" و "گلشنِ ہند" میں ضرور اس کا تخلص مضمون دیا ہے لیکن اسے صاحبِ تذکرہ نہیں لکھا۔

۷۔ تذکرۂ سودا۔ قاسم نے "مجموعۂ نغز" میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے علاوہ کسی

Scanned by CamScanner

اور نے اسے نہیں دیکھا۔ قائم نے اپنے تذکرے "مخزنِ نکات" میں لکھا ہے کہ نواحِ اورنگ آباد کے مرزا ابوطالب، طالب بہادر شاہ اوّل کے لشکر کے ساتھ سودا کے چچا کی معیت میں دلّی آئے۔ انھوں نے ایک بیاض میں بہت سے شعرا کے احوال و اشعار لکھ رکھے تھے۔ وہ بیاض سودا کو ملی۔ سودا نے اس بیاض سے بعض اشعار قائم کو دیے، جنھیں اس نے اپنے تذکرے میں استعمال کیا ("مخزنِ نکات"، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء، ص ۱۰-۹)۔ "مخزنِ نکات" کی دوسری روایت کے مدوّن ڈاکٹر اقتدا حسن نے اپنے مقدمے میں قیاس کیا ہے کہ ممکن ہے، سودا نے خود بھی بیاضِ طالب میں کچھ اضافے کیے ہوں اور انھیں کو تذکرۂ سودا سمجھ لیا گیا ہو۔

۸۔ تذکرۂ شوق از حسن شوق۔ اس کا ذکر دتاسی کے یہاں نہیں۔ معلوم نہیں "گلِ رعنا" کا ماخذ کیا ہے۔

۹۔ تذکرۂ ترمذی از محمد علی ترمذی۔ جس کا حوالہ مبینہ طور پر تذکرۂ "گل زار ابراہیم" میں ہے۔ کریم الدین نے بھی میر محمد علی ترمذی کے لیے لکھا ہے۔ مصنف، ایک تذکرۂ اشعارِ ہندیہ کا، جس کا ذکر علی ابراہیم نے اپنے تذکرے میں کیا ہے ("طبقاتِ شعراے ہند"، ص ۹۴-۲۹۳)۔ میں نے "گل زارِ ابراہیم" میں بہت تلاش کیا، مجھے نہ ملا۔ معلوم نہیں کس شاعر کے احوال میں اس کا مذکور ہے۔

چند تذکروں کے بارے میں مجھے کچھ مشاہدات پیش کرنے ہیں۔

"گلستانِ سخن" از مبتلا کاظم۔ عبدالسلام نے کوئی تفصیل نہیں دی۔ دتاسی نے لکھا ہے کہ اس نام کے تین تذکرے ہیں، صابر، جوش اور مبتلا کے (رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۹۱)۔ دتاسی نے مبتلا کا نام کاظم نہیں دیا، یہ عبدالسلام کا اضافہ ہے۔ مرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا کے اس تذکرے کا صحیح نام "گلشنِ سخن" ہے۔ اسے مسعود حسن رضوی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ "گلستانِ سخن" قادر بخش صابر کے تذکرے کا نام ہے۔

"مجموعۂ انتخاب" کے مصنف کا نام فقیر شاہ محمد کامل لکھا ہے۔ کامل کے بجاے کمال ہونا چاہیے۔

تذکرۂ عشق از رحمت اللہ عشق عظیم آبادی۔ "یہ تذکرہ ۱۱۱۵ھ کے قریب مرتب ہوا اور اس میں ۲۳۹ شعراے ریختہ کا تذکرہ موجود ہے۔" ("شعر الہند"، ص ۵)۔

اس تذکرے کے مصنف کا تخلص عشق نہیں، عشقی ہے۔ دتاسی نے عشقی ہی لکھا ہے اور اس کا نام رحمت اللہ دیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے شورش اور عشقی کے تذکروں کو ایک ساتھ شائع کیا۔ انھوں نے تذکرۂ "نشترِ عشق" کے حوالے سے عشقی کا نام شیخ محمد وجیہ الدین

لکھا ہے (کلیم الدین، "دو تذکرے"، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، جلد اول، مقدمہ، ص ا-د)۔ "شعرالہند" میں تذکرے کی تاریخ ۱۱۱۵ھ کے قریب دی ہے، دتاسی نے کچھ نہیں دی۔ ۱۱۱۵ھ غالباً ۱۲۱۵ھ کی تخریب ہے۔ شعرا کی تعداد دتاسی نے ۳۳۹ دی ہے، عبدالسلام نے ۴۲۹۔ معلوم نہیں کہاں سہوِ طباعت ہے۔

عبدالسلام ص۸ کے حاشیے میں چند تذکروں کے ناموں کا اضافہ کرتے ہیں اور اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ڈی تاسی نے مرزا قطب علی نگار کے تذکرہ کا ذکر ہی نہیں کیا حالانکہ مولوی کریم الدین نے "تاریخِ شعرائے اردو" میں لکھا ہے کہ دلّی میں یہ تذکرہ تمام تذکروں سے پہلے لکھا گیا ہے اور شیفتہ بلکہ مصحفی وغیرہ نے اس سے مدد لی ہے۔ (حاشیہ، ص۸)

مولانا عبدالسلام کو کریم الدین کا بیان سمجھنے میں سخت غلط فہمی ہوئی۔ کریم الدین، نگار کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مرزا قطب علی بیگ ایک شخص دہلوی ہے۔ تذکرۂ اعظم الدولہ میں اس کا یہ شعر لکھا ہے۔ واضح ہو کہ یہ تذکرہ اول سب تذکروں کے درمیان دہلی کے لکھا گیا ہے۔ شیفتہ نے "گلشنِ بےخار" میں اس تذکرے سے بہت مدد لی ہے اور مصحفی وغیرہ اور شاعروں نے بھی اس تذکرے سے مدد لی ہے مگر تذکرۂ میر اس سے اول ہے۔
>
> (ص۳۹۴)

کریم الدین نے نگار کو تذکرہ نویس نہیں قرار دیا، بلکہ اعظم الدولہ سرور کے تذکرے "عمدۂ منتخبہ" کے بارے میں لکھا ہے جسے عبدالسلام، نگار کا تذکرہ سمجھ بیٹھے۔ کریم الدین کی یہ تضاد بیانی تو دیکھیے کہ اول تو "عمدۂ منتخبہ" کے لیے کہا کہ یہ دہلی میں سب تذکروں سے پہلے لکھا گیا، بعد میں اعتراف کرتے ہیں کہ میر کا تذکرہ اس سے اول ہے۔

عبدالسلام نے "شعرالہند" کے دیباچے کی فہرست میں کریم الدین کے تذکرے کا نام "طبقات الشعرا" لکھا ہے۔ صحیح "طبقاتِ شعرائے ہند" ہے لیکن ص۸ پر اس کا نام "تاریخِ شعرائے اردو" لکھا ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ اس تذکرے سے حوالے ہیں اور ہر جگہ اس کا نام "تاریخِ شعرائے اردو" لکھا ہے جو کسی طرح اس تذکرے کا نام نہیں۔ اس سے بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔ میں نے عبدالسلام کے مذکورہ کئی حوالوں کو کریم الدین کے تذکرے میں ڈھونڈا اور موجود پایا۔ اس سے یقین ہو گیا کہ "تاریخِ شعرائے اردو" سے عبدالسلام کی مراد "طبقاتِ

Scanned by CamScanner

شعراے ہند" ہی ہے۔
لکھتے ہیں کہ بعض تذکروں میں اردو شاعری سے متعلق کافی سرمایہ موجود ہے اور اس باب میں تذکرے "جلوۂ خضر" کی دونوں جلدیں دوسرے تذکروں پر تفوق رکھتی ہیں۔

پہلے باب کا پہلا عنوان ہے، "اردو شاعری کا آغاز۔" اس میں اردو زبان کو اختلاط کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے دکنی شعرا کے بارے میں بےاعتمادی کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں لکھا۔ اس میں واقفیت سے زیادہ ناواقفیت کی غمازی ہوتی ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں غواصی کے "طوطی نامہ" کے بارے میں لکھا۔

"بزبانِ قدیم نصفے فارسی، نصفے ہندی بطور بکٹ کہانی۔"

مولوی عبدالحق نے اس سے صرف یہ مطلب نکالا ہے کہ میر حسن نے فارسی اور ہندی آمیز زبان کا ذکر کیا ہے ("تنقیداتِ عبدالحق"، ص ۸۹)۔ میری راے میں "بکٹ کہانی" کی مثال دینے سے میر حسن کی مراد صرف یہی ہے کہ اس کے شعر یا مصرع ریختے کے طور پر نصف فارسی میں اور نصف ہندی میں ہیں۔ یہی بات عبدالسلام نے لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ میر حسن اور عبدالسلام نے غواصی کی مثنوی کو دیکھ کر یہ راے نہیں دی۔ یہ مثنوی عام دکنی میں ہے، فارسی اردو ریختے میں نہیں۔

دکنی شاعری کے بارے میں عبدالسلام کی معلومات صفیر بلگرامی کے "جلوۂ خضر" سے ماخوذ ہیں۔ کاش انھوں نے تذکرۂ "محبوب الزمن" (۱۹۱۱ء) یا "دکن میں اردو" (۱۹۲۳ء) دیکھی ہوتی۔ صفیر نے سعدی دکنی کو غزل کا بانی قرار دیا اور اس کے بعد پہلے دور میں اشرف، خوشنودی، احمدی، فضلی اور احسن کو شمار کیا۔ "خوشنودی" اور "احمدی" میں آخری "ی" زائد ہے۔ معلوم نہیں، فضلی اور احسن کون سے شاعر ہیں۔ دوسرے دور میں جعفر، سالک، لطیفی، محمود، باقی اور ہاشم وغیرہ کو داخل کیا ہے۔ ان میں سے بعض کے نام صحیح نہیں، بعض کی شخصیت واضح نہیں۔ یہ اپنے دور کے سب سے ممتاز شعرا نہیں ہیں۔ عبدالسلام نے صفیر کے قول کو بے چون و چرا کے تسلیم کر لیا ہے۔

دکنی شاعری کے بارے میں عبدالسلام کی معلومات کے دوسرے ماخذ میر اور میر حسن کے تذکرے ہیں، جن میں معلومات صحیح نہیں، مثلاً میر حسن نے دکن کے قدیم شاعر محمود استاد کو فری، شاگرد ولی کا ہم عصر لکھ دیا ہے۔ میر ہوں کہ میر حسن، انھیں دکنی شعرا کی اضافی اہمیت کا کوئی علم نہیں۔ یہی کیفیت عبدالسلام کی ہے۔ عبدالسلام میر حسن اور میر کی راے درج کرتے ہیں، جس میں دکن کے بیشتر شعرا کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا گیا۔ وہ صفیر بلگرامی کی یہ راے بھی درج کرتے ہیں کہ ولی کی شاعری دہلی میں آ کر سعد اللہ گلشن کے

Scanned by CamScanner

مشورے کے بعد چھپی۔

انھوں نے قدما کے پہلے دور کے بارے میں جو فصل لکھی ہے اسے دیکھ کر سخت نومیدی اور تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں، ولی کے اثر سے دہلی میں محمد شاہی عہد میں متعدد شعرا پیدا ہو گئے، جن کے کلام کی مشترک خصوصیت ایہام ہے۔۔۔ اور اس کے بعد آبرو، شاکر ناجی، مضمون، یکرنگ، احسن، ولی اور سراج کے ایک سے لے کر چار شعر تک درج کرتے ہیں۔ ان میں سراج اور احسن کا ایک ایک، ولی اور مضمون کے دو دو، شاکر کے تین اور یکرنگ اور آبرو کے چار چار شعر ہیں۔ نثر میں ان لوگوں کے بارے میں ایک جملہ نہیں لکھا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں نے "شعر الہند" کو تاریخِ ادب سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی۔ یہ محض تنقیدِ ادب ہے اور تنقید بھی عہد قدیم کی، حالانکہ ان سے پہلے "مقدمہ شعرو شاعری" اور "محاسنِ کلامِ غالب" جیسی کتابیں لکھی جا چکی تھیں جو "تفہیم ادب" کے باب میں "شعر الہند" سے منزلوں آگے ہیں۔

دوسری فصل "قدما کا دوسرا دور اور اردو شاعری کی تجدید و اصلاح" ہے، لیکن یہ پہلی فصل سے اچھی ہوئی ہے۔ اس میں پھر آبرو، شاکر اور یکرنگ کا ذکر ہے۔ مصلحینِ فن میں وہ سب سے پہلے مظہر جانِ جاناں کا نام لیتے ہیں، کیونکہ قدرت اللہ شوق اور مصحفی کے مطابق یہی ایہام کے ترک کرنے والوں میں پہلے تھے۔

زبان کی اصلاح وارتقا دکھانے کے لیے "شعر الہند" میں ڈھائی صفحوں پر ایک جدول دیا ہے، جس کے پہلے کالم میں "لفظِ وقتِ ولی" اور دوسرے کالم میں "تبدیلیِ میرو مرزا" دی ہے۔ یہ فہرست انھوں نے "جلوۂ خضر" سے نقل کی ہے۔ چونکہ "جلوۂ خضر" نہایت کم یاب ہے، اس لیے "شعر الہند" نے اس مفید فہرست کو ڈاٹ کر کے اچھا کیا۔ عبدالسلام نے یہ نتیجہ نکالا کہ اصلاحات مظہر و حاتم کے بعد اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی۔ اس کے آگے انھوں نے تحقیق کر کے میر، سودا، راسخ، قائم اور درد وغیرہ کے بہت سے اردو اشعار کو فارسی اشعار سے ماخوذ دکھایا، نیز اردو غزل کو فارسی غزل کی نقل قرار دیا۔ (ص ۴۶-۴۰)

اردو شعرا میں حریف جوڑوں کا تعین سب سے پہلے "آبِ حیات" میں کیا گیا، اس معرکہ آرائی کو آگے بڑھایا "شعر الہند" نے۔ عبدالسلام نے کسی مجہول الاسم نکتہ داں دوست کا قول نقل کیا ہے کہ "اردو شاعری کے ہر دور میں ایک غیر فطری شاعر ایک فطری شاعر کا مدمقابل رہا۔۔۔ لیکن عبدالسلام کی رائے میں میر کے حریف سودا کو بالکل غیرِ فطری شاعر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ (ص ۴۸)

Scanned by CamScanner

گو تنقیدی جائزہ میری کتاب کا موضوع نہیں، لیکن میں اس سے یک قلم صرفِ نظر بھی نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں عبدالسلام نے میر اور سودا کے موازنے میں خاصے توازن سے کام لیا ہے اور دونوں شعرا کی خوبیاں اور خامیاں پیش کی ہیں۔ ان کے بقول، میر کی نسبت بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ

پستش بغایت پست و بلندش بسیار بلند۔

(ص ۴۹)

عبدالسلام نے تذکروں یا تذکرے کا نام نہیں لکھا۔ شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں سودا کے احوال میں لکھا ہے کہ آزردہ نے اپنے تذکرے میں میر کی شرحِ کلام میں لکھا۔

پستش اگرچہ اندک پست است، اما بلندش بسیار بلند۔

("گلشنِ بے خار"، اردو اکادمی ایڈیشن، ص ۱۰۰)

مختارالدین احمد نے آزردہ کا تذکرہ چھاپا ہے، لیکن وہ ناقص الاخر ہے اور میر تک نہیں پہنچتا، قائم پر ختم ہو جاتا ہے۔ تذکرۂ شیفتہ کے فقرے میں "اندک پست" لکھا ہے، "بغایت پست" نہیں۔ "شعرالہند" جلد اوّل نے اسے "بغایت پست" بنا کر ایک غلط بیانی کو رائج کیا، گو "شعرالہند" جلد دوم میں صحیح صورتِ حال واضح کر دی گئی ہے کہ بعض تذکروں میں "بغایت پست" والا فقرہ ہے لیکن شیفتہ نے آزردہ کے قول میں "اندک پست" لکھا ہے ("شعرالہند"، جلد دوم، طبع چہارم، ۱۹۵۴ء، ص ۱۸-۱۷)۔ عبدالسلام یہ لکھنا بھول گئے کہ شیفتہ نے یہ اندراج میر کے احوال میں نہیں، سودا کے احوال میں کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ "بغایت پست" کن تذکروں میں درج ہے۔ عام قارئین "شعرالہند" جلد دوم کو نہیں دیکھتے۔ وہ جلد اوّل کے "بغایت پست" ہی کو صحیح متن مان لیتے ہیں۔

میر کے پہلے معاشقے سے متعلق تذکرۂ "بہارِ بے خزاں" کے مشہور اقتباس "بہ شہرِ خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود، در پردہ تعشقِ طبع و میلِ خاطر داشت،" کی نشان دہی سب سے پہلے "شعرالہند" نے کی (ص ۵۵)۔

"شعرالہند" کی تصنیف تک معدودے چند تذکرے ہی شائع ہوئے تھے۔ عبدالسلام نے قلمی تذکروں سے بھی استفادہ کیا، جن کا اچھا خاصا ذخیرہ ندوۃ العلما میں دستیاب تھا، مثلاً وہ تذکرۂ مصحفی سے شاہ ملول کے سلسلے میں یہ مقولہ بارہا لکھتے ہیں:

والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می رود۔

(ص ۵۷)

جلد دوم میں واضح کرتے ہیں کہ مصحفی کے مطبوعہ تذکرے میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

Scanned by CamScanner

انھوں نے ایک قلمی تذکرے سے یہ عبارت نقل کی ہے (ص ۲۳۶)۔

انھیں شاعری کے سماجی پس منظر کا اچھا شعور ہے۔ مشاعروں میں مناظرے اور مجادلے پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی رائے میں دلی میں ادبی اختلافات کے باوجود شعرا کے دل صاف رہتے تھے، لیکن درباداری کے اثر سے نفاق پیدا ہو گیا اور یہ درباری سرپرستی لکھنؤ میں زیادہ نمایاں تھی (ص ۷۷)۔ عبدالسلام نے مشرقی اتر پردیش میں بیٹھ کر شعرالہند لکھی لیکن دلی و لکھنؤ کی مسابقت میں وہ اردو شاعری کے غیر مطبوع تغیرات کے لیے لکھنؤ کی آب و ہوا اور درباری تعلقات کو ذمے دار قرار دینے کی طرف مائل ہیں (ص ۷۶)۔

میر و سودا کی طرح انشا و مصحفی کے موازنے میں بھی وہ خاصے متوازن ہیں، چنانچہ یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ ان دونوں میں سے کس کے حلیف ہیں۔ "آبِ حیات" سے بہک کر وہ انشا کی غزل ع: ... یار بیٹھے ہیں، کو آخر عمر کی سمجھتے ہیں (ص ۹۹)۔ حالانکہ یہ مصحفی کے "تذکرۂ ہندی گویاں" میں موجود ہے۔ "تلمذۂ شعرائے قدیم" اچھا تحقیقی باب ہے۔ اس میں خان آرزو، مرزا مظہر، سودا، میر اور درد کے تلامذہ کا بیان خصوصی طور پر معلومات افروز ہے، انھوں نے ایک اور انوٹھا باب "متبعینِ شعرائے قدیم" قائم کیا جس میں انھوں نے سودا اور میر کے مقلدوں کا بالخصوص ذکر کیا ہے۔ اکادکا مثالیں میر سوز اور میر درد کے متبعین کی بھی ہیں۔ میر کے سلسلے میں جلال اور امداد امام اثر تک چلے آتے ہیں۔

مندرجہ بالا اجزا کو "باب" سمجھ کر میں غلطی کا مرتکب ہوا ہوں۔ ہیں یہ باب جیسے، لیکن مصنف نے انھیں باب نہیں کہا، بلکہ ایک بڑے باب کے علاحدہ عنوانات والے اجزا۔ دوسرا باب متوسطین کے بارے میں ہے، اس کے پہلے دور میں ناسخ پر مرکوز ہو کر ان کی سینہ اصلاحاتِ زبان گنواتے ہیں۔ اس سلسلے میں "لفظِ وقتِ سودا و میر" اور "تبدیلی وقتِ ناسخ،" نیز "محاورۂ وقتِ انشا،" "مصحفی، میر حسن و شاہ نصیر اور "تبدیلیِ وقتِ ناسخ" کی فہرستیں دی ہیں (ص ۱۹۲ تا ۲۰۰)۔ یہ مفید فہرستیں تمام تر "جلوۂ خضر" جلد اوّل سے لی ہیں۔

اردو تحقیق کی تاریخ میں "شعرالہند" کی کوئی اہمیت نہیں، تنقید میں اسے یاد رکھا جائے گا۔ باب ۲ کے جزو "اردو شاعری کے دو مختلف اسکول، دلی اور لکھنؤ" کے ذریعے "شعرالہند" نے پہلی بار بڑے واضح اور پُرزور طریقے پر دلی اور لکھنؤ کے دو دبستانوں کا تصوّر پیش کیا (ص ۲۰۴)، جو علی جواد زیدی کی تردید کے باوجود اردو تنقید کی سوچ کا جزو لاینفک بن گیا۔ حیرت ہے کہ عبدالسلام علاقۂ لکھنؤ سے متعلق رہتے ہوئے بھی دلی اسکول میں ساری خوبیاں اور لکھنؤ اسکول میں ساری خرابیاں دیکھتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

"آبِ حیات" میں "... یار میں، ... بیمار میں" کی زمین میں آتش و ناسخ کی دو غزلوں کا ذکر ہے ("آبِ حیات"، ص۳۶۹)۔ رشید حسن خاں مطلع کرتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ایڈیشنوں میں ان غزلوں کی صحیح ردیف "کو" چھپی ہے ("ادبی تحقیق"، ص۲۱-۱۱۹)۔ غنیمت ہے کہ "شعرالہند" میں اس زمین میں ناسخ کے شعر میں ردیف "کو" ہی دی ہے (ص۲۲۹)۔

ناسخ کو بالعموم غیر فطری شاعر سمجھا جاتا ہے۔ عبدالسلام نے بھی ان کے کلام کے کئی عیوب شمار کرائے، لیکن اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے کلام کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے جس میں صفائی، سادگی اور کیف و اثر موجود ہے، اور اس کے بعد انھوں نے ناسخ کے عمدہ اشعار درج کیے (ص۲۳۰-۲۳۱)۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ "نگار" کے کسی قدیم شمارے میں نیاز نے عنوان لگایا تھا۔ "لکھنؤ کا وہ مشہور شاعر جس نے ساری عمر میں محض ۱۱شعر کہے تھے،" اور اس کے بعد ناسخ کے ۱۱شعر درج کیے تھے۔ عبدالسلام جو ناسخیت کے سب سے بڑے نقاد سمجھے جاتے ہیں، نو صفحوں میں ناسخ کے پسندیدہ اشعار تلاش کر کے درج کرتے ہیں۔

اساتذۂ دہلی کے باب میں بھی وہ ناسخ کو فراموش نہیں کر پاتے، انھیں ناسخ کے پیمانے سے جانچتے ہیں۔ شاہ نصیر کے لیے لکھتے ہیں: "شاہ نصیر تو گویا دلّی کے شیخ ناسخ ہیں،" (ص۲۴۱)۔ اور یہ شاید شاہ نصیر کے لیے سب سے بڑی گالی ہے۔ متوسطین کے دوسرے دور میں دو فصلیں ہیں: "تلامذۂ آتش و ناسخ" اور "تلامذۂ مومن و غالب،" لیکن یہ دونوں فصلیں محض تنقیدی ہیں جن میں نثر برائے نام ہے، شعروں کی بھرمار ہے۔ متأخرین کے دونوں ادوار والی فصلیں بھی تنقیدی ہیں۔ ان میں کی دوسری فصل "داغ اور امیر" ہے جس میں امیر مینائی کے بعض اشعار کی میر کے اشعار سے مماثلت کھوجنا قابلِ تحسین ہے۔

متأخرین کے دوسرے دور کی فصل کا عنوان "تلامذۂ داغ و امیر" ہے لیکن اس میں تلامذۂ جلال کا بھی ذکر ہے۔ یہ باب بھی تنقیدی ہے، تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ لکھتے ہیں، "تلامذۂ جلال میں حکیم سیّد مہدی کمال، احسان علی خاں شاہ جہاں پوری اور انور حسین آرزو امتیازی حیثیت رکھتے ہیں،" (ص۳۶۲)۔ آج کوئی کمال اور احسان علی خاں کا نام بھی نہیں جانتا۔ عجیب بات ہے کہ رام بابو سکسینہ نے بھی ان تینوں کو اسی طرح سراہا ہے۔ غالباً انھوں نے یہ خیال "شعرالہند" سے لیا ہوگا مگر اس کا اعتراف نہیں کیا۔

چوتھا باب دورِ جدید کا ہے جس میں شاعری کے موضوعات اور رجحانات کے تحت شعرا کو لیا ہے۔ عنوانات یہ ہیں:

غزل، وطنی شاعری، اخلاقی شاعری، سیاسی شاعری، نیچرل شاعری، مناظرِ قدرت،

Scanned by CamScanner

وصف نگاری، ظریفانہ شاعری، قومی شاعری، تاریخی شاعری، متفرق نظمیں، قدیم اصنافِ شاعری کا تنزل، جدید دور کی ادبی خدمات، اس میں جوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

اکبر اور ٹیگور کے خیالات سے خاص طور پر متاثر ہیں، اس لیے ان کے کلام میں تغزل کے بجاے زیادہ تر تصوف اور روحانیت کے اجزا شامل ہو گئے ہیں۔ (ص ۴۰۹)

جوش کی بعد کی شاعری کو دیکھ کر انھیں تصوف اور روحانیت کا گناہ گار قرار دینا کتنا ظریفانہ معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر لکھتے ہیں کہ جدید دور میں ولی اور سراج کا دیوان، دکن کے متعدد شعرا کی مثنویاں اور میر کا دیوان عمدہ صورت میں چھپ گئے ہیں (ص ۴۹۲)۔ یہ سب اشاعتیں "شعرالہند" کی طبعِ اول کے بعد کی ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جزو بعد کے ایڈیشنوں میں اضافہ کیا گیا ہے۔

دوسری جلد میں ایک پُرمغز مقدمہ اور تین ابواب ہیں۔ مقدمے کا ذیلی عنوان "اردو زبان میں فنِ تنقید" ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں قدیم انداز کی تنقید ہی ممکن تھی۔ اگلے دو ابواب میں اصناف و موضوعات شعر پر تنقید ہے۔ وہ اصناف کے بجاے "انواعِ شاعری" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تاکہ اس میں صنف و موضوع دونوں شامل ہو سکیں۔ تنقید کو "ریویو" کہتے ہیں۔ پہلے باب میں تاریخی حیثیت سے ریویو ہے، دوسرے میں ادبی حیثیت سے۔ پہلے باب کے عنوانات یہ ہیں:

غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما، مذہبی شاعری، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری، فلسفیانہ شاعری۔

ابتدائی شعرا میں امرد پرستی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "میر حسن افضل دکھنی کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں، کدام ہندو بچہ گوپال بود... الخ۔" (ص ۲۴)۔

میر حسن نے افضل مصنفِ "بکٹ کہانی" کو دکھنی نہیں لکھا۔ وہ دکھنی تھا بھی نہیں۔ یہ عبدالسلام کا اضافہ اور مغالطہ ہے۔

اصناف میں ریختی کی ایجاد و آغاز کے سلسلے میں کسی قدر تحقیقی مسالا فراہم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے "گلستانِ سخن"، تذکرۂ "مہرِ جہاں تاب"، تذکرۂ قدرت اور "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" سے اقتباسات دیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آخرالذکر دُرگا پرشاد نادر کی تصنیف ہے لیکن تذکرۂ "مہرجہاں تاب" کوئی غیر مشہور تذکرہ ہے۔ عبدالسلام نے تذکرۂ قدرت (دراصل "طبقات الشعرا" از قدرت اللہ شوق) سے انجام کے بارے میں یہ اقتباس دیا:

Scanned by CamScanner

مقابلِ ریختہ کہ لفظے ست مذکر "ریختی" تصنیف نمودہ(۹)۔

("شعر الہند"، دوم، ص ۱۰۳)

انجام کے بارے میں کسی اور نے ایسا نہیں لکھا۔ عبدالسلام نے "گلِ رعنا" کے حوالے سے ہاشمی اور سید محمد قادر خاکی کی ریختیوں کا ذکر کیا۔ اس کے بعد "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بعض کے نزدیک اس کا مخترع رحیم، معاصرِ رحمان وولی ہے (ایضاً)۔ "خزینۃ العلوم" دکنی شعرا کے بارے میں درگا پرشاد نادر کی تصنیف ہے۔ رحیم معاصر ولی کا ذکر بدیع حسینی نے اپنی کتاب "دکن میں ریختی کا ارتقا" میں کیا ہے (حیدر آباد، سنہ طبع ندارد، ص ۸۳-۲۸۲)۔ ان سے قدرے زیادہ تفصیل سے ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی نے اپنی کتاب "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" میں کیا ہے (لکھنو، ۱۹۷۴ء، ص ۶۷-۲۷۴)۔ رحمان ریختی گو کا ذکر اسی کتاب میں ص ۲۳۵ پر ہے۔ عبدالسلام کا فیصلہ ہے کہ رنگین سے پہلے کے جن شعرا (یعنی دکنی شعرا) کی ریختیوں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں، وہ ہندی شاعری کی روش پر لکھے گئے ہیں۔ ریختی کا موجد رنگین ہی کو ماننا ہوگا (ص ۱۰۴)۔ عبدالسلام کے سامنے دکنی ریختیوں کے بہت سے نمونے نہ تھے۔ ان میں بعض اشعار بالیقین ایسے نظر آتے ہیں جنھیں ریختی کہنے میں کوئی تکلف نہ ہوگا۔

واسوخت کی ایجاد کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ یہ متعین نہیں ہوتا کہ اردو میں سب سے پہلے کس نے اس صنف کی ابتدا کی۔ آزاد نے میر کو اس کا موجد لکھا ہے لیکن کسی مستند تذکرے سے اس کی توثیق نہیں ہوتی۔ تاہم واسوخت کے موجودہ طرز یعنی مسدس کے موجد میر ہی معلوم ہوتے ہیں (ص ۱۰۷)۔ قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی کہ میر سے پہلے آبرو اور ناجی کے یہاں واسوخت ملتا ہے اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے طے کیا کہ اردو کا پہلا واسوخت شاہ حاتم نے ۱۱۳۹ھ میں لکھا ("تاریخِ ادبِ اردو"، جلد دوم، حصہ اول، ص ۴۴۱)۔ ہاں، ان کے واسوخت مسدس کی طرز میں نہیں۔

اصنافِ سخن یا انواعِ شاعری کے تاریخی ریویو میں عہد بہ عہد متعلقہ صنف یا موضوع کے شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔ ذکر ایک دو سطروں میں ہے اور نمونہ کلام کئی صفحوں میں۔ مرثیے کے قدیم شعرا میں دکن اور شمال کے کئی شعرا کے نام لیے ہیں اور وہ سب درست ہیں۔ انھیں کے ساتھ ساتھ کریم الدین کے تذکرے کے حوالے سے فضل علی فضلی کے لیے لکھا کہ اس نے مرثیے اور مناقب میں کثرت سے اشعار لکھے (ص ۱۲۹)۔ سچ یہ ہے کہ فضلی "کربل کتھا" کا مصنف ہے۔ اس کے رثائی اشعار اسی نثری کتاب میں ملتے ہیں، اس کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ عبدالسلام نے منجملہ دوسرے مرثیہ گویوں کے قدرت اللہ شوق اور مصحفی کے

Scanned by CamScanner

تذکروں کے حوالے سے مرزا علی (قلی) ندیم کو بہت سراہا ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنی کتاب "اردو مرثیے کا ارتقا، ابتدا سے انیس تک" میں ندیم کا محض دو جگہ نام بھر لکھا ہے لیکن تذکرۂ مصحفی میں اس کے بارے میں کافی مواد ہے۔ اکبر حیدری اپنے مرتبہ ایڈیشن میں اطلاع دیتے ہیں کہ مسعود حسن رضوی صاحب کے پاس ندیم کے بہت سے قلمی مرثیے تھے جو اب علی گڑھ یونی ورسٹی میں پہنچ گئے ہیں (لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، حاشیہ، ص ۳۰۱)۔

مثنوی کے سلسلے میں دکن کے چند مثنوی نگاروں کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

> صاحبِ "تاریخ شعرائے اردو" افضل الدین خاں فضل (کذا) کے تذکرے میں لکھتے ہیں: "وہ دکن کے متقدین شعرا میں سے ہے۔ اس نے دکنی زبان میں ایک راجا کے بیان میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس کی عبارت مغلق ہے۔ میر اس کو اچھا شاعر نہیں مانتا ہے۔
>
> ("شعر الہند"، ص ۱۸۱)

جیسا کہ پیچھے لکھا گیا "تاریخِ شعرائے اردو" سے مراد کریم الدین کا تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" ہے جس کے ص ۶۶ پر سوا دو سطروں میں فضلی کا ذکر ہے۔ عبدالسلام نے اسے فضل لکھا ہے۔ میر نے "نکات الشعرا" میں اس کا نام نہیں لکھا۔ صرف اس کی مثنوی کو ایک نظر دیکھنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ نہیں لکھا کہ یہ مثنوی کس راجا کے بیان میں ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس کا نام شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی لکھا ہے۔ اس کی دو اردو مثنویاں "قصۂ پریم لوکا" اور "قصۂ برہ بیوگا" ہیں۔ اس کا انتقال ۱۱۸۴ھ میں ہوا ("دکن میں اردو"، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۲)۔ یہ یقینی ہے کہ نصیرالدین ہاشمی نے اُسی فضلی کا ذکر کیا ہے جس کا میر نے کیا ہے۔ میر نے اس کا جو شعر نمونتاً لکھا ہے، ہاشمی نے وہ اور بعض دوسرے اشعار دیے ہیں۔ عبدالسلام کے بیان اور مندرجۂ بالا حضرات کے بیانات میں کئی فرق دیکھنے کو آئے۔

۱۔ بقولِ کریم الدین اس کا نام افضل الدین خاں تھا، بقولِ ہاشمی شاہ فضل اللہ۔

۲۔ اس کی مثنوی کسی راجا کا قصہ نہیں۔ ظاہراً یہ دو صوفیانہ مثنویاں ہیں۔ میرا خیال ہے ان مثنویوں کے نام کے آخر میں الف زائد ہے، صحیح نام "قصۂ پریم لوک"، "قصۂ برہ بیوگ" ہونا چاہیے۔ شاید ہاشمی نے ان کے نام رومن رسم الخط کی کسی فہرستِ مخطوطات میں دیکھے ہوں گے۔

۳۔ وہ قدیم شاعر نہیں۔ اس کا انتقال ۱۱۸۴ھ/۷۱-۱۷۷۰ء میں ہوا۔

Scanned by CamScanner

مثنویوں کی فصل میں حیدر بخش حیدری کے لیے لکھتے ہیں:

اسی زمانے میں منشی حیدر بخش حیدری نے اردو زبان میں ایک مختصر سا "شاہنامہ" لکھا، دکنی زبان میں "قصۂ بہرام و گل اندام" کو نظم کیا اور نظامی کی "ہفت پیکر" کو اردو جامہ پہنایا۔

(ص ۱۸۱)[1]

یہ بیان ماخوذ ہے "طبقاتِ شعرائے ہند" سے۔ کریم الدین کو غلط فہمی ہوئی۔ حیدری نے کوئی "شاہنامہ" نہیں لکھا۔ جہاں تک دکنی میں "قصۂ بہرام و گل اندام" لکھنے کا تعلق ہے، عبدالسلام کو کریم الدین کا مطلب سمجھنے میں مغالطہ ہوا۔ کریم الدین نے لکھا ہے:

ایک مثنوی بنام "ہفت پیکر" اس کی تصنیف ہے۔ یہ ایک قصہ وہ ہے، جس میں مضمون وہ ہے جو نظامی کی کتاب "ہفت پیکر" میں ہے۔ ایک قصہ دکھنی زبان میں ہے بنام "قصۂ بہرام و گل اندام"۔ وہ بھی اسی طور کا ہے جو کہ بد نصیب سلطان ابوالحسن، آخر نواب گولکنڈہ کے، جس نے شکست کھا کر اورنگ زیب کی قید میں مقید ہوا تھا، درمیان ۱۶۸۷ کے۔ (ص ۱۷۲)

اپنی ٹوٹی پھوٹی نثر میں کریم الدین نے یہ کہا ہے کہ حیدری نے ایک مثنوی "ہفت پیکر" لکھی جس میں وہی قصہ ہے جو نظامی کی فارسی مثنوی "ہفت پیکر" میں ہے۔ اسی قصے کی ایک مثنوی دکنی میں "قصۂ بہرام و گل اندام" کے نام سے ملتی ہے جو گولکنڈہ کے آخری سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں لکھی گئی۔ تانا شاہ کو ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے شکست دے کر قید کیا۔

اس سے پہلے کریم الدین لکھ چکا ہے کہ حیدری ۱۸۱۴ء میں موجود تھا۔ وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اس نے دکھنی میں ۱۶۸۷ء کے آس پاس ایک مثنوی لکھی۔ وہ تو حیدری کی مثنوی سے مماثل اور مقدم ایک دکنی مثنوی کا ذکر کر رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ گولکنڈہ کے طبعی کی مثنوی "بہرام و گل اندام" کی طرف ہے۔ مولانا عبدالسلام عبارت پڑھنے میں توجہ سے کام نہیں لیتے۔ اس سے پہلے انھوں نے فگار کو ولی کا پہلا تذکرہ نگار سمجھ لیا تھا، یہاں ایک قدیم دکنی مثنوی کا مصنف بنا دیا۔ یہ بے توجہی کی عبرت ناک مثال ہے۔

ڈرامے کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ خود واجد علی شاہ کنھیا بن کے دھونی رما کے جوگی بنتے تھے (ص ۲۰۶)۔

مسعود حسن رضوی صاحب نے اس کی تردید کی ہے کہ واجد علی شاہ ڈراما رہس میں

اداکاری کرتے تھے۔ ہاں، ایک تو ہم کی وجہ سے وہ قیصر باغ میں جوگ میلا منعقد کرا کے جوگی ضرور بنتے تھے۔

ڈرامے کے باب میں عبدالسلام "اِندر سبھا" سے آگے نہیں بڑھے۔ حیرت ہے کہ پارسی تھیئٹر کے کسی ناٹک کار کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔

صوفیانہ شاعری کے سلسلے میں کریم الدین کے تذکرے سے میر فضل علی شاہ دانا اور میر حسن کے تذکرے سے میر ولایت اللہ خاں (ولایت) کا ذکر کرتے ہیں۔ واقعی ان تذکروں میں یہی لکھا ہے کہ ان شعرا نے خود کو تصوف تک محدود رکھا، لیکن کیا بحیثیت شاعر کے یہ قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے باب میں انواعِ شاعری پر ادبی حیثیت سے ریویو ہے، یعنی نظریاتی مباحث ہیں۔ اس میں چند اصناف... غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور سہرے کے ساتھ موضوعات۔ خمریات، فخریہ، ہجو، وصف اور تشبیہ و استعارہ بھی ملا دیے ہیں۔ اس کے بعد اجزاے شعر یعنی قافیہ، ردیف، وزن اور پھر محسناتِ شعر یعنی صنائع بدائع پر اظہار خیال کیا۔ تشبیہ واستعارہ کا بیان محسناتِ شعر کے ذیل میں آنا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بحثیں "مقدمۂ شعروشاعری" اور "موازنۂ انیس ودبیر" کی تقلید میں دی ہیں۔ اسی زمانے میں عبدالرحمان نے "مِرآۃ الشعر" میں انھیں موضوعات پر غور کیا۔

تیسرے باب میں دو موضوعات "ملکی سرمایہ" اور "ہندوؤں کا تعلق اردو شاعری سے" کسی حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ "مربیانِ سخن" بھی ایک اچھا موضوع ہے۔ اس میں یہ شعر ولی سے منسوب کیا ہے:

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ شعر شرف الدین مضمون کا ہے۔ تذکرۂ "گلشنِ گفتار" میں یہ غزل دی ہے۔ مندرجۂ بالا شعر کا پہلا مصرع یہ ہے:

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین

میں محسوس کرتا ہوں کہ "شعرالہند" کا خاکہ یعنی تقسیم ابواب باقاعدہ نہیں۔ حشو وزوائد کو نکال کر اسے بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ "شعرالہند" کی جلد دوم، جلد اول کے مقابلے میں کم زور ہے۔ مولانا عبدالسلام اردو ادب کا تاریخی ترتیب سے تنقیدی جائزہ لے سکتے تھے لیکن نظریاتی تنقید ان کا میدان نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جلد دوم میں نثر کے جملے برائے نام اور صفحوں کے

Scanned by CamScanner

صفحے شعری نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ شبلی کا "موازنۂ انیس و دبیر" بھی اسی طرح نمونوں سے زیر بار ہے۔

معلوم نہیں "شعرالہند" لکھنے سے مصنف کا کیا مقصد تھا۔ ظاہراً یہ نظم اردو کی تاریخ ہے لیکن تاریخ کے لحاظ سے بالکل ناکام ہے، محض "تنقیدِ ادب" ہے۔ نیاز فتح پوری نے "شعرالہند" کی دوسری جلد پر جو اعتراض کیے، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اصنافِ شاعری کے سلسلے میں جس اصول پر مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ اصول ناقابلِ فہم ہیں۔

۲۔ وہ اردو غزل سے بیزار نظر آتے ہیں، اسی وجہ سے انھوں نے سطحی اور سرسری بیان سے کام لے کر بات ختم کردی ہے۔

۳۔ غزل پر ادبی حیثیت سے جو تنقید کی گئی ہے وہ تشنہ اور نامکمل ہے۔

۴۔ اصنافِ سخن کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی زیادہ واضح، مکمل اور مدلل نہیں ہے۔

۵۔ "شعرالہند" تنقید کے اصولوں سے ہٹی ہوئی ہے جو اس کا بدترین عیب ہے(۱۰)۔

مولوی عبدالحق کا تبصرہ ہے:

> کتاب پڑھنے کے بعد صاف طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مؤلف کا موضوع کیا ہے اور اس کتاب کے لکھنے سے ان کا کیا منشا ہے۔

("شعرالہند"، مشمولہ: "تنقیداتِ عبدالحق"، ص ۸۷)

کلیم الدین احمد "اردو تنقید پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں:

> عبدالسلام صاحب جو کچھ دیکھتے ہیں دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی آواز اپنی نہیں، ایک صدائے بازگشت ہے۔

(ص ۶۷، بحوالہ: خورشید نعمانی، ص ۱۴۷)

لیکن ان کا یہ کہنا بہت زیادتی ہے:

> میں نے بہت غور کیا لیکن مجھے "شعرالہند" کی تالیف کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالسلام صاحب کو شعر و شاعری سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ان کی طبیعت خشک و بے رنگ ہے... سخن فہمی، حساس طبیعت، مذاقِ

Scanned by CamScanner

صحیح، تیز و تند ادراک ان اوصاف سے عبدالسلام صاحب مبرا ہیں۔

(ص ۱۷۱، بحوالہ گمانی، ص ۱۴۸-۱۴۷)

عبدالسلام نظریاتی تنقید میں نیازمند ہیں لیکن عملی تنقید میں نہیں۔ انھوں نے دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا جو تصور پیش کیا وہ اردو ادب سے محو ہونے والا نہیں، کسی نہ کسی شکل میں چپکا رہے گا۔ عام ذہنوں میں ان دبستانوں کے وہی خصائص بسے ہوئے ہیں جو انھوں نے گنوائے ہیں۔ انھوں نے میر و سودا، انشا و مصحفی اور آتش و ناسخ کے موازنے میں خاصے توازن کا ثبوت دیا ہے اور ان شعرا کی جو خصوصیات شناخت کی ہیں، انھیں عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہاں بحیثیت تاریخِ ادب کے "شعرالہند" کی کوئی اہمیت نہیں۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱)۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، "حیاتِ عبدالحی"، ندوۃ المصنفین، دہلی، رمضان ۱۳۹۰ھ/نومبر ۱۹۷۰ء، ص ۳۳۴

(۲)۔ سیدہ جعفر، "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ"، دہلی، ۱۹۸۵ء، مقدمہ، ص ۶۰

(۳)۔ بحوالۂ سید نصرت مہدی، "اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ"، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۶۵

(۴)۔ اسلم فرخی، "محمد حسین آزاد"، جلد دوم، ص ۱۸۱ ۔ عابد، "انشا اللہ خان انشا"، ص ۱۳۶ و ۳۹۱

(۵)۔ سعید انصاری کا مضمون، مشمولۂ "مولانا عبدالسلام کی یاد میں"، مرتبہ: کبیر احمد جائسی، اعظم گڑھ، ۱۹۵۸ء، ص ۵۵

(۶)۔ "تنقیدات عبدالحق"، طبع اول، حیدر آباد، ۱۹۳۴ء، ص ۸۶

(۷)۔ کبیر احمد جائسی، "مولانا عبدالسلام کی یاد میں" اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء، ص ۴۷

(۸)۔ مجھے اس مخطوطے کا اقتباس ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، مسلم یونی ورسٹی لائبریری نے بھیجا۔

(۹)۔ "طبقات الشعرا" از قدرت اللہ شوق، مرتبہ: نثار احمد فاروقی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۶۸

(۱۰)۔ "آثار" ۱۹۲۶ء، بحوالۂ خورشید نعمانی ردولوی، "دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات"، بمبئی، ۱۹۷۷ء، ص ۴۷-۱۳۶

Scanned by CamScanner

چوتھا باب

محمد یحییٰ تنہا: "سیر المصنفین"

مالک رام کے "تذکرۂ ماہ و سال" کے مطابق محمد یحییٰ تنہا شاگردِ حالی و سلیم پانی پتی، قصبہ شاہ پور، ضلع مظفر نگر میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ ماخذ "نگار پاکستان" اپریل ۱۹۶۷ء ہے، لیکن خود تنہا نے "مِراۃ الشعرا" جلد دوم میں اپنے حالات میں لکھا ہے:

غالباً ۱۸۹۰ء میں یہ خاکسار عالمِ وجود میں آیا۔

(ص ۳۸۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں، قیاساً ۱۸۹۰ء ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسے ۱۸۸۶ء پر ترجیح دی جائے گی۔ امیر اللہ خاں شاہین نے اپنی مرتبہ "سیر المصنفین" جلد اوّل (میرٹھ ۱۹۷۶ء) کے ماخذ سے یہ ، ان کے جو حالات لکھے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

تنہا نے بی اے، ایل ایل بی پاس کر کے، پہلے غازی آباد منصفی میں اور ۱۹۳۴ء سے میرٹھ کی ججی میں وکالت کی۔ تقسیمِ ملک کے بعد لاہور منتقل ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے مدرس کے طور پر مدعو کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ہیلی کالج آف کامرس میں پڑھانے لگے۔ ۱۹۵۳ء میں خرابیِ صحت کی وجہ سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کے دو لڑکے کراچی میں ملازم تھے۔ اُن کے اصرار پر ۱۹۶۲ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔ وہیں ۱۹ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

شاہین نے تنہا کے بیٹے حسن یحییٰ عندلیب، (کراچی) سے سوانحی حالات موصول کیے۔ انھیں سے تنہا کی تصانیف کی فہرست ملی ہو گی۔ میں اسے "مِراۃ الشعرا" کی مدد سے قدرے اضافے کے ساتھ درج کرتا ہوں:

۱۔ "شاعرانہ خیالات" ... اس میں شروع میں انگریزی شاعری کا مختصر حال لکھا۔ پھر بی۔اے کے نصاب میں شامل چند مشاہیر کی انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا۔ ترجمہ نثر میں ہے جیسا کہ "مِراۃ الشعرا" کے باب "اردو شاعری" کے آخر میں شامل بعض ترجموں سے معلوم ہوتا

Scanned by CamScanner

ہے۔ ترجمے کے بعد ان شعرا کے حالاتِ زندگی ہیں جن کی نظموں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو لکھا گیا اور یہ اسی سال شائع ہوئی۔

۲۔ "سیر المصنفین" ... ۲ جلد، ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۸ء۔ "مِرآۃ الشعرا" کے دیباچے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "مِرآۃ الشعرا" کے آٹھویں دور پر، جو ۱۹۴۱ء سے شروع ہوتا ہے، لکھنے کا ارادہ نہیں، "کیونکہ "سیر المصنفین" جلد سوم کو مکمل کرنا ہے،" جو تقاضائے وقت بھی ہے اور خود ہمارے دور سے متعلق ہے (جلد دوم ص ۸)۔

تنہا کے بیٹے عندلیب میرٹھی کے مطابق ان کے والد نے اس کا تیسرا حصہ بھی تحریر کر لیا تھا جو غیر مطبوعہ ہے۔

۳۔ "خیالاتِ ارونگ" ... امریکی مصنف واشنگٹن ارونگ کے چند مضامین کا ترجمہ، شائع ۱۹۲۸ء۔

۴۔ "تاریخِ مغربی یورپ" انگریزی سے ترجمہ، شائع ۱۹۲۸ء۔

۵۔ "تاریخِ امریکا" ... مختلف کتابوں سے ترجمہ کر کے ترتیب دی، شائع ۱۹۳۱ء۔

۶۔ "مِرآۃ الشعرا" ... جلد اوّل: تصنیف ۱۹۴۵ء، شائع لاہور، ۱۹۴۹ء، جلد دوم: شائع لاہور، ۱۹۵۰ء۔

۷۔ "تب و تاب" ... تنہا کا مجموعہ کلام۔

۸۔ "تاریخِ ادبِ اردو" ... یہ کتاب اطالوی سفارت خانے کی فرمائش پر لکھی گئی۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔

اگر تنہا کے صاحب زادے عندلیب کے پاس "سیر المصنفین" کی تیسری جلد اور تاریخِ ادبِ اردو کے مسودے تھے تو انھیں شائع کر دینا چاہیے تھا۔ اب تو عندلیب کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ ویسے "سیر المصنفین" کی دو جلدوں نیز "مِرآۃ الشعرا" کو دیکھتے ہوئے یہ امید نہیں کہ ان کتابوں میں کوئی اہم تحقیق ہو گی۔

"سیر المصنفین" جلد اوّل دارالاشاعت غازی آباد سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ فہرستِ مضامین کے بعد ۲۲۴ صفحے ہیں۔ تنہا نے اس میں ترمیم و اضافہ کر کے لاہور میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس پر تاریخِ اشاعت درج نہیں لیکن مقدمے پر ۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی تاریخ ہے۔ اس پر مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۵۰ء میں تبصرہ کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جلد ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ اگست ۱۹۷۶ء میں امیر اللہ خاں شاہین نے میرٹھ سے جلد اوّل کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس پر ۱۵ صفحے کا مقدمہ لکھا لیکن تحشیہ بالکل نہیں کی۔ وہ مقدمے میں یہ اطلاع تو دیتے ہیں کہ جلد اوّل کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا لیکن حیرت اور افسوس

Scanned by CamScanner

کی بات یہ ہے کہ انھوں نے پہلے ایڈیشن ہی کو چھاپ دیا ہے، اضافہ شدہ دوسرے ایڈیشن کو نہیں۔

پہلے ایڈیشن میں فہرست مضامین کے بعد ۲۲۴ صفحے ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں دیباچوں کے آٹھ صفحوں کو شامل کر کے ۳۲۴ صفحے ہیں، یعنی متن میں ۹۱ صفحوں کا اضافہ ہوا ہے۔ دوسری جلد ضخیم تر ہے۔ اس میں فہرستِ مطالب کے ۱۲ صفحوں کے بعد متن کے ۶۳۸ صفحے ہیں۔ میرے سامنے جو نسخہ ہے اس میں سرورق نہیں لیکن دیباچے پر غازی آباد ۲۹ نومبر ۱۹۲۷ء کی تاریخ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جلد ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی ہوگی۔ مجھے اس کے کسی دوسرے ایڈیشن کا علم نہیں۔ امیر اللہ شاہین اپنے ایڈیشن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> دونوں جلدیں دارالاشاعت غازی آباد سے ۱۹۲۴ء ہی میں شائع ہوئیں۔ (مقدمہ، صفحہ ط)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جلد، پہلی جلد کے مرتب امیر اللہ خاں، شاہین کی نظر سے نہیں گزری۔ شاہین کے مقدمے میں کچھ اور بھی سہو ہیں مثلاً "ص" کے "ط" حاشیے میں ڈاکٹر زور کی "ہندوستانی لسانیات" کی تاریخ ۱۹۲۸ء اور شیرانی کی "پنجاب میں اردو" کی ۱۹۳۲ء لکھتے ہیں۔ بے احتیاطی کے سبب دونوں کے سنین الٹ گئے ہیں۔ "پنجاب میں اردو" ۱۹۲۸ء میں اور "ہندوستانی لسانیات" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

جلد اول طبعِ اوّل کے سرورق پر مصنف کے نام کے ساتھ ایک ڈگری بی اے لکھی ہے۔ شاہین نے ان کی جو سوانح دی ہے، اس کے مطابق ۱۹۱۱ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا، (صفحہ ف)۔ جب تنہا نے نام کے ساتھ ڈگری لکھی ہی، تو بی اے، ایل ایل بی کیوں نہیں لکھا۔ ڈگری کے علاوہ ایک لقب اور دیا ہے، "مترجم شاعرانہ خیالات و تاریخ مغربی یورپ۔"

دیباچے میں "تاریخِ مغربی یورپ" کے بارے میں صراحت ہے کہ یہ ترجمہ ابھی تک شائع نہ ہوسکا۔ شاہین کے مطابق "شاعرانہ خیالات" ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی لیکن کیا یہ دونوں ترجمے اتنے اہم ہیں کہ انھیں نام کے ساتھ ڈگری یا خطاب کے طور پر فخریہ درج کیا جائے۔ شاید انھیں سے تحریک پا کر رام بابو سکسینہ نے بھی اپنی انگریزی "تاریخِ ادبِ اردو" کے سرورق پر نام کے ساتھ لکھا ہے: ""موڈرن اردو پوئٹس" اور "اوراقِ پریشاں" کا مترجم"۔ پہلی کتاب، تو آج تک شائع نہیں ہوئی، دوسری غالباً ان کا مجموعہ کلام ہے۔ "سیرالمصنفین" کے دوسرے ایڈیشن میں مصنف کے نام کے ساتھ مترجم کا القاب حذف کر دیا گیا۔

Scanned by CamScanner

کتاب کی وجہِ تالیف یہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں خیال آیا کہ "آبِ حیات" کے نمونے پر نثرِ اردو کی تاریخ لکھی جائے۔ جنگ کے زمانے میں لوگوں کو نیز مصنّف کو تصنیف و تالیف سے دلچسپی نہ رہی۔ بعد میں جون ۲۳ء سے پھر کام شروع کیا لیکن غازی آباد میں کتابوں کی قلت کے سبب خاطر خواہ نہ کر سکے۔ انھوں نے اکثر یہ کیا ہے کہ ہر نثر نگار کے حالات عموماً ایک، زیادہ سے زیادہ دو ماخذ سے لے کر ترتیب دیے ہیں۔ بہت سے مضامین (ابواب) کے شروع میں ماخذ کا اظہار کر دیا ہے، جو کمی تھی وہ دوسری جلد کے شروع میں پوری کر دی ہے۔ جہاں دونوں جلدوں کے مطالب کے مآخذ کی فہرست دی ہے۔ میں اردو کی کسی اور کتاب سے واقف نہیں جس میں ہر جزو کے مآخذ کا اس دیانت داری سے اعتراف کیا گیا ہو۔ پہلی جلد کے دوسرے اضافہ شدہ ایڈیشن میں انھوں نے اس وقت تک کی شائع شدہ دوسری تاریخوں سے فائدہ اٹھایا لیکن ان کا اس باقاعدگی سے اعتراف نہ کر سکے۔ دوسرے ایڈیشن میں پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں ذیل کے مصنفوں کا اضافہ کیا ہے۔

محمد عوض زرّیں، مرزا محمد فطرت، سید حمید الدین بہاری، محمد حسین کلیم، مولوی محمد عمران رام پوری، سید اعظم علی اکبر آبادی، سید صالح محمد دہلوی، محمد بخش مہجور، سدا سکھ لال، نیم چند کھتری، امانت لکھنوی، لالہ گوبند سنگھ، مولوی مسیح الزماں، منشی چرن جی لال، سید فدا حسین، مفتی صدر الدین آزردہ، مفتی سعد اللہ رام پوری، عباس بن ناصر علی المورخ، امام بخش صہبائی، سید باقر حسین، سید فضل علی، نواب محمد قطب الدین خاں، مولوی کریم الدین، جیمس کار کرن۔ پنڈت سروپ نرائن، شیو نرائن، سید ظہیر الدین حسین، امام الدین طالب، شیخ احمد علی، یوسف خاں، خواجہ امان، سید عنایت احمد، مولوی غلام امام خاں ترین، گارساں دتاسی، مولوی ضیاء الدین۔

اس حجم کی تاریخ میں مندرجہ بالا اہلِ قلم میں سے زرّیں، مہجور، نیم چند کھتری، امانت، یوسف خاں کمبل پوش اور خواجہ امان کو لینا مناسب تھا۔ آزردہ، صہبائی اور کریم الدین کو لینے کا جواز نہ تھا گو وہ مشہور ہیں۔ انھیں، تذکرہ نگاری کے باوصف، اہم نثار نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے اس کتاب کا منصوبہ اس اصول پر بنایا تھا۔

"نثرِ اردو کی تاریخ لکھی جائے۔" یا بالفاظِ دیگر نثارانِ باکمال کا تذکرہ تحریر کیا جائے (ص ۲)۔ گارساں دتاسی نے اردو نثر میں کچھ نہیں لکھا۔ گل کرسٹ تک کو نثاروں میں شمار نہیں کر سکتے۔ گل کرسٹ نے نئی نثر میں متعدد کتابیں لکھوائیں اور اردو کے بارے میں انگریزی میں لکھا۔ اس کا شمول تو ایک مرتبہ کو جائز ہو سکتا ہے، لیکن گارساں دتاسی کا نہیں۔ ہاں، اگر تنہا اردو تحقیق پر کوئی باب لکھتے تو اس میں دتاسی کو اہم مقام دیا جاتا۔ طبعِ ثانی کے

Scanned by CamScanner

بقیہ تمام اضافہ شدہ مصنفین ایسے ہیں کہ ان کے شمول پر طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ زیادہ تر کو احسن مارہروی کی "نمونۂ منثورات" سے اور کچھ کو حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخ اردو" سے لیا ہے۔ مولوی عبدالحق اضافہ شدہ ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس کتاب میں بہت سے ایسے صاحبوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جنھوں نے صرف ایک آدھ معمولی سا رسالہ مذہبی مسائل یا کسی دوسرے موضوع پر تحریر کیا ہے اور بعض تو ان میں ایسے خوش نصیب ہیں جنھوں نے عمر بھر میں صرف دو ایک خط اردو میں لکھے ہیں۔ یہ حضرات "سیر المصنفین" میں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اگر اردو نثر نگاروں کی ایک معمولی سی فہرست بنائی جائے تو اس میں بھی داخل کرنے کے قابل نہ ہوتے۔ دراصل اس بدعت کے بانی پروفیسر احسن مارہروی ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب "تاریخ نثرِ اردو" میں بہت سے ایسے لوگوں کو بھر دیا ہے۔
>
> ("اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۶۰)

تنہا نے ۱۹۴۸ء میں ان ناموں کا انتخاب کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تنقیدی شعور بالکل کمزور تھا۔ جلد اوّل کے پہلے ایڈیشن تک وہ دکنی نثر سے واقف نہ تھے، اس لیے محض شمالی ہند تک محدود رہے، لیکن دوسرے ایڈیشن میں بھی دکنی نثر نگاروں کا باقاعدہ اضافہ نہیں کیا۔ صرف نام اور مختصر نمونہ کتاب دیا ہے۔ اردو نثر کے چار دور رکھے ہیں جن کی حدود دونوں ایڈیشنوں میں بدل گئی ہیں۔

	پہلا ایڈیشن	دوسرا ایڈیشن
پہلا دور	۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۶ء تک	۱۷۷۵ء سے ۱۸۲۰ء تک
دوسرا دور	۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک	۱۸۲۱ء سے ۱۸۵۷ء تک
تیسرا دور	۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک	۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء تک
چوتھا دور	۱۹۱۴ء سے سنہ تالیف یعنی ۱۹۲۷ء تک	۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۰ء تک
پانچواں دور		۱۹۴۱ء سے آگے تک

پہلے ایڈیشن میں پہلا دور ۱۷۹۸ء سے اس لیے شروع کیا گیا تھا کہ "آبِ حیات" کی

تقلید میں "نوطرز مرصع" کا سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء سمجھ بیٹھے۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ ۱۷۷۵ء سے بھی کچھ قبل مکمل ہو گئی تھی۔ جب ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو کتاب کو ان کے نام پر معنون کر دیا گیا۔ اس طرح اب تنہا پہلے دور کو ۱۷۷۵ء سے شروع کرتے ہیں۔ اس دور کو اصلاً ۱۸۳۶ء پر ختم کیا تھا کہ یہ گویا کی "بستانِ حکمت" کی تالیف کا سال تھا لیکن نہ گویا اتنے بڑے نثر نگار ہیں، نہ ان کی "بستانِ حکمت" اتنی اہم کہ اسے دو ادوار کے بیچ کا سنگ میل قرار دیا جائے۔ اس طرح ان سے بدرجہا بڑے نثار رجب علی بیگ سرور کی "فسانۂ عجائب" پہلے دور میں اور بقیہ تصانیف دوسرے دور میں بٹ جاتی تھیں۔ دوسرے ایڈیشن میں تنہا نے پہلے دور کو ۱۸۲۰ء پر ختم کیا کیونکہ یہ فورٹ ولیم کالج کے کارناموں کی آخری حد تک تھی۔

جلد اوّل میں صرف پہلے دو ادوار کا بیان ہے۔ میں پہلے اسی کو لیتا ہوں جس کے لیے جلد اوّل کے دونوں ایڈیشنوں کو سامنے رکھوں گا۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا، کتاب میں ابواب کی تقسیم نہیں، موضوع یا عنوان ہی کو باب سمجھ سکتے ہیں۔ طبعِ اوّل میں پہلے تین عنوانات یہ ہیں، جو ۲۹ صفحات کو محیط ہیں:

۱۔ "اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے" ۲۔ "رسم الخط" ۳۔ "لٹریچر"

دوسرے ایڈیشن میں ان تینوں عنوانات کو حذف کر دیا گیا ہے اور اگلے عنوان "اردو کی پیدائش" سے ابتدا کی ہے۔ پہلے تین عنوانات کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کا تعلق زیادہ تر ہندوستان سے ہے۔ دوسرا ایڈیشن پاکستان میں شائع ہوا، اس لیے ان تینوں عنوانات کو حذف کرنا وقت کی آواز سمجھا ہوگا۔ بہرحال پہلے دو عنوانات کے بارے میں دو لفظ کہوں گا۔

طبعِ اوّل کا پہلا موضوع (جسے پہلا باب سمجھنا چاہیے) تمہید ہے، جس کا عنوان ہے، "اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے،" اعتراف کیا ہے کہ یہ مضمون "معارف" اعظم گڑھ ۱۹۲۱ء اور رسالہ "آئینہ" الہ آباد ۱۹۲۳ء سے ماخوذ ہے۔ تنہا اردو ہندی کی دوئی کے قائل نہیں، لکھتے ہیں:

> اصل میں اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ (ص ۹)
>
> اردو اور ہندی دراصل ایک ہی بولی کے دو نام ہیں۔ یہ دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں۔ (ص ۱۴)

دونوں کی قواعد اور لفظیات کا اشتراک دکھانے کے بعد کہتے ہیں:

Scanned by CamScanner

ہندی کے حمایتی کہتے ہیں کہ عربی فارسی ملی ہوئی ہندی، اردو ہے۔
اردو کے طرف داروں کا قول ہے کہ سنسکرت ملی ہوئی اردو کو ہندی
کہتے ہیں۔ ان دعووں سے بھی یہی ثابت ہے کہ حقیقت میں اردو اور
ہندی ایک ہی ہیں، صرف نام کا ایر پھیر (کذا) ہے۔

(ص ۱۵)

ص ۱۸-۱۷ پر اردو ہندی کے اختلافات گنواتے ہیں پھر انھیں دور کرنے کی تدبیریں پیش کرتے ہیں:

اگر ان پر عمل کیا جائے تو رفتہ رفتہ ایک مدت کے بعد وہ دن بھی آ
جائے گا کہ یہ دونوں زبانیں مل کر ایک ہو جائیں گی۔

(ص ۱۸)

صالح نقطۂ نظر ہے۔ لیکن انھوں نے ص ۲۴ پر اردو کے رسم الخط کو بہترین بتاتے ہوئے جو سفارش کی ہے کہ ملک کی مشترکہ زبان کے لیے اسی کو اختیار کر لیا جائے، آج اصلیت سے کس قدر دور دکھائی دیتا ہے۔ اگلا عنوان "اردو کی پیدائش" ہے۔ طبعِ اوّل میں یہ ۱۴ صفحوں کا ہے اور زیادہ تر "آبِ حیات" سے ماخوذ ہے۔ طبعِ دوم میں ۲۵ صفحے ہیں اور اس میں دونوں ایڈیشنوں کے درمیانی عرصے میں شائع ہونے والی کتب سے کسی قدر استفادہ کیا ہے۔ اس کو دیکھتے چلیں۔

مجھے سب سے پہلے دوسرے ایڈیشن کے کاتب کی اس جدت، بلکہ بدعت پر احتجاج کرنا ہے کہ وہ ہر باب کے لفظ کو توڑ کر اس کے پہلے حرف کو علاحدہ مربع میں لکھتا ہے اور بقیہ سر کٹے لفظ کو بعد میں مربع سے باہر مثلاً:

[ج] ب، دو صاحبِ زبان، قومیں ... (ص ۹)
[ش] یخ، معین الدین گنج العلم ... (ص ۳۴)

ایک لفظ کا سر اور دھڑ اس طرح بے معنی اجزا میں توڑ دینا بہت ستم ہے۔ پہلی نظر میں تو ان کی قرأت بھی گرفت میں نہیں آتی۔ پہلی مثال میں "صاحبِ زبان" کے بعد اور دوسری میں "شیخ" کے بعد کاما لگانا سہوِ کتابت ہے، جس کی کسی نے تصحیح نہیں کی۔

امیر خسرو سے نہ صرف ریختہ، غزل، پہیلیوں اور مکرنیوں کا انتساب تسلیم کرتے ہیں، بلکہ "آبِ حیات" کی تقلید میں ایک نسخہ "دوہروں کی بحر" میں بھی درج کرتے ہیں:

لود پھٹکری مُردہ سنگ
ہلدی زیرہ ایک ایک ڈھنگ وغیرہ

اسے "دوہے کی بحر" سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ سلیمان ندوی نے اس منظوم نسخے کو "معدن المعانی" کے حوالے سے شرف الدین یحییٰ منیری کی تخلیق بتایا ہے(۱)، اور اسے عام طور پر منیری ہی کا مانا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ "نقوشِ سلیمانی" کی اشاعت کے بعد بھی تنہا اسے خسرو کے نام پر درج کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے "سیر المصنفین" طبعِ دوم کے تبصرے میں لکھا ہے:

> قدیم اردو کے ضمن میں بعض ایسے ناموں اور ایسے کلام کا ذکر آتا ہے جن کی صداقت اب تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی، مثلاً امیر خسرو سے ایک غزل اور بعض چیستانیں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ منسوب کی گئی ہیں، لیکن یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ فی الحقیقت یہ انھیں کا کلام ہے۔ ان کی تصانیف میں یہ چیزیں کہیں نہیں پائی جاتیں۔
>
> (رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۶)

صاحب "سیر المصنفین" کا مسلک تقلید کرنا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں وہ "آبِ حیات" کے بجائے صاحبِ "پنجاب میں اردو" کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور اردو کے آغاز کے سلسلے میں ان کی ہر بات پر صاد کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کے وارد دہلی کے وقت دو آبے کی زبان کو برج بھاشا قرار دیتے ہیں (ص ۱۵)۔ شیرانی کی تقلید میں اردو کو ملتانی سے بہت قریب مانتے ہیں (ص ۱۷)۔

تنہا نے "معراج العاشقین" کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف قرار دیا۔ حفیظ قتیل کی تحقیق سے پہلے اس خیال میں کوئی مضائقہ نہیں حالانکہ مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں حفیظ قتیل اور حسینی شاہد سے پہلے یہ خیال ظاہر کیا کہ "معراج العاشقین" اور دوسرے رسالے خواجہ صاحب کی تصنیف نہیں۔ تنہا نے کئی اشعار بھی خواجہ بندہ نواز کی تخلیق بتائے ہیں:

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

اس کی زبان خواجہ صاحب کے عہد کی نہیں۔ یہ اور اس کے بعد کا شعر "دکن میں اردو" سے ماخوذ ہے۔

ص ۱۹ پر "شرحِ مرغوب القلوب" کا شاہ میراں جی شمس العشاق سے انتساب بھی

Scanned by CamScanner

درست نہیں کہ یہ میراں جی خدانما کی ہے۔ اسی صفحے پر تنہا کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ ابراہیم عادل شاہ نے شاہی دفتر فارسی سے دکنی زبان میں منتقل کر دیا۔ اس کی تردید شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" کے سلسلے میں کروں گا۔ یہ کتاب بہرحال "سیر المصنفین" جلد اوّل کی طبعِ دوم سے بہت پہلے کی ہے۔

تنہا وجدی کی مثنوی "تحفۂ عاشقاں" کو دسویں صدی ہجری کی قرار دے کر عطار کے "خسرو نامہ" کا ترجمہ ٹھہراتے ہیں (ص ۱۹)۔ مولوی صاحب رسالہ "اردو" اکتوبر ۱۹۴۹ء میں "مِرآۃ الشعرا" کے تبصرے میں اس کی تصحیح کر چکے ہیں اور اب اسی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ مثنوی ۱۱۵۳ھ کی تصنیف ہے اور اس کا موضوع عطار سے مختلف ہے۔

تنہا سنین کے معاملے میں محتاط نہیں۔ لکھتے ہیں شاہ میراں جی خدانما متوفی ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء نے "شرحِ تمہید ہمدانی" ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء کے قریب لکھی (ص ۲۲)۔ اس کے بارے میں مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۲۸ء میں ایک مفصل مضمون لکھا، جو ان کے مجموعے "قدیم اردو" میں شامل ہے۔ بعد میں جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں اور زیادہ صحت کے ساتھ حقائق پیش کیے۔ اصل کتاب عربی میں تھی۔ خواجہ بندہ نواز نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ جالبی کے مطابق خدانما نے فارسی سے اس کا ترجمہ ۱۰۶۶ھ میں کیا (تاریخ، جلد اوّل، ص ۹۹-۴۹۷)۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک خدانما کا انتقال ۱۰۷۴ھ میں ہوا ("قدیم اردو"، ص ۲۰۸)۔ ان کے پاس اردو کتاب کا ایک نسخہ ۱۰۱۲ھ کا مکتوبہ ہے لیکن مجھے یہ سنہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۰۷۴ھ میں مرنے والا ۱۰۱۲ھ میں تالیف کرے، یہ قرینِ قیاس نہیں۔ جالبی کا سنہ ۱۰۶۶ھ صحیح تر معلوم ہوتا ہے اس کے آگے تنہا نے ایک کتاب "مفتاح الخیرات" کا ذکر کیا ہے (ص ۲۳)۔ اس کا ذکر "دکن میں اردو" ص ۱۶۴ پر ملتا ہے۔

تنہا نے فارسی "شمائل الاتقیا" کو برہان الدین اولیا اورنگ آبادی کی تصنیف بتایا ہے (ص ۲۳)۔ جالبی نے واضح کیا کہ یہ برہان الدین غریب کے مرید رکن عمادالدین دبیرِ معنوی کی تصنیف تھی (جلد اوّل، ص ۵۰۱)۔ اس صفحے کے آخر میں تنہا لکھتے ہیں:

> ۱۰۹۴ھ میں ایک مثنوی موسوم بہ "روح افزا" لکھی گئی۔
>
> (ص ۲۳)

انھوں نے شاعر کا نام نہیں دیا اور مثنوی کا نام بھی نصف دیا ہے۔ ان کی مراد فائز کی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" سے ہے۔

Scanned by CamScanner

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں دو باتیں لکھتے ہیں:

۱۔ یہ مخلوط اور مشترک زبان تو عربوں کی فتوحاتِ سندھ ہی سے معرضِ وجود میں آگئی تھی (ص ۲۹)۔

۲۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اس زبان کا نام "ہندی" یا "دہلوی" کی بجائے "اردو" مشہور ہوا (ص ۳۰)۔

اپنے تبصرے میں مولوی صاحب نے پہلے دعوے کی تردید کی۔ سندھ میں سندھی میں عربی الفاظ داخل ہوئے، کوئی نئی زبان نہیں بنی۔ تنہا کے پاس اپنی فکر تو تھی نہیں۔ سلیمان ندوی نے کہا اور انھوں نے بغیر چھان بین کیے مان لیا۔ جہاں تک زبان کے نام کا تعلق ہے اس معنی میں محض "اردو" اٹھارویں صدی کے اواخر سے پہلے نہیں ملتا۔ بہرحال طبعِ اول کے مقابلے میں طبعِ دوم میں تنہا نے کافی نیا مواد پیش کیا ہے، لیکن کچھ حذف بھی کر دیا ہے مثلاً پہلے ایڈیشن میں شمالی ہند کے ابتدائی نثری نمونوں کے طور پر فضلی کی "دہ مجلس"، میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کی نثر از سودا کلیاتِ سودا کا اردو دیباچہ اور مرزا مظہر و انشا کے مکالے کا ذکر کیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں دوسرے ایڈیشن میں ان سب کو قطع کر دیا۔ طبعِ اول میں "دہ مجلس" کے سلسلے میں فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

> مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ ستمبر ۴۴ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک صاحب نثر اردو کی تاریخ لکھ رہے ہیں، ان کو عہدِ شاہ جہانی تک کی نثریں دستیاب ہو چکی ہیں۔
>
> (ص ۲۴)

عہدِ شاہ جہانی کی نثروں کو شمالی ہند کی سمجھ کر میں چونکا اور تلاش کی۔ یہ اشارہ ہے احسن مارہروی کی "تاریخِ نثرِ اردو عرف نمونۂ منثورات" [۱۹۳۰ء] کی طرف۔ خود احسن نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے:

> اس کتاب کی تالیف اب سے سات آٹھ برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ (مقتدرہ ایڈیشن، ص ۳۴)

اس کتاب میں عہدِ شاہ جہانی کی نثریں شمال کی نہیں، دکن کی ہیں، مثلاً وجہی کی "سب رس" کا ذکر ہے جو عہدِ شاہ جہاں کی تالیف ہے۔

دوسرا عنوان یا موضوع "قدیم اردو" ہے۔ چھ صفحوں کے اس باب میں دکنی نثر کا بیان ہے اور یہ پورا حصہ دوسرے ایڈیشن کا اضافہ ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں انتساب کی وہی اغلاط ہیں جن کی میں پیش تر تردید کر چکا ہوں اور آئندہ کروں گا، مثلاً شیخ عین الدین

Scanned by CamScanner

گنج العلم کے رسالے، خواجہ بندہ نواز کے تین نثری رسالے اور شمس العشاق کی شرح مرغوب القلوب"، "سبل ترنگ" اور "گل باس" ۔ "شرحِ مرغوب القلوب" میراں جی شمس العشاق کی نہیں، بلکہ میراں جی خدانما کی ہے۔ خواجہ بندہ نواز اور حضرت شمس العشاق نے اردو نثر میں کچھ لکھا ہی نہیں۔

اگلا باب "اردو کا عالمِ طفولیت" تمہید کے طور پر ہے، جس کی تفصیل اگلے دو ادوار میں دی ہے۔ لکھتے ہیں، ۱۸۳۶ء میں دلّی میں اردو اخبار جاری ہوا جو اس زبان میں پہلا اخبار تھا جو مولوی محمد باقر کے قلم سے نکلا (ص ۴۲)۔ یہ صحیح نہیں۔ "دلّی اردو اخبار" اردو کا پہلا اخبار نہ تھا۔ اس سے بہت پہلے "جامِ جہاں نما" نکل چکا تھا۔

پہلا دور ۱۷۷۵ء سے ۱۸۲۰ء تک ہے۔ یہ ہے تو خاص طور سے فورٹ ولیم کے مصنفین کے بارے میں، لیکن اِس میں اُس عہد کے چند دوسرے مشاہیر کا بھی تذکرہ ہے۔ اس بار "نوطرزِ مرصع" کی صحیح تاریخ ۱۷۷۵ء لکھتے ہیں (ص ۴۷)۔ ماَخذ کا ذکر نہیں کیا لیکن انھوں نے بلوم ہارٹ اور مولوی عبدالحق کے مقدمہ باغ و بہار سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے بعد شاہ رفیع الدین آتے ہیں۔ طبعِ اوّل میں ان کا ذکر بہت بعد میں یعنی شاہ عبدالقادر اور مولوی اسمٰعیل دہلوی سے پہلے تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں شاہ رفیع الدین کا ذکر ص ۴۸ پر اور شاہ عبدالقادر کا ص ۱۴۳ پر ہے۔ دونوں میں اتنا فصل کرنا تاریخیت کے خلاف ہے۔

اگلا بیان "محمد عوض زرّیں" دوسرے ایڈیشن کا اضافہ ہے۔ واضح ہو کہ زرّیں کا صحیح نام محمد غوث تھا اور ان کی کتاب کا "چار درویش" (دیکھیے میری کتاب، "اردو کی نثری داستانیں" لکھنؤ ایڈیشن، ص ۲۷۱)۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں طبعِ دوم میں مختلف مصنفین میں کافی اضافہ کیا ہے اور یہ ظاہرا سیّد محمد کی "اربابِ نثرِ اردو" کا فیض ہے۔ مصنفین میں حیدر بخش حیدری کی کتابوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مرزا علی لطف کے بیان میں کوئی خاص اضافہ نہیں۔ ان کے والد کا نام ناظم بیگ خاں لکھا ہے (طبعِ دوم، ص ۶۶)۔ صحیح کاظم بیگ ہے، لطف کے بیان میں ایک مذہبی چشمک ملتی ہے۔

تمنا سُنّی ہیں اور مرزا علی لطف شیعہ۔ لکھتے ہیں کہ لطف نے بعض اہلِ سنّت کا ذکر تعصب کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض باتیں بالکل لغو اور کذب سے پُر، بیان کر جاتے ہیں مثلاً شاہ ولی اللہ سے دو کتابیں، "قرۃ العین فی ابطالِ شہادت الحسنین" اور "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ" منسوب کی ہیں۔ تمنا نے واضح کیا کہ شاہ ولی اللہ نے ایسی کوئی کتابیں نہیں لکھیں (ص ۶۷)۔

Scanned by CamScanner

"گلشنِ ہند" کے مطبوعہ نسخے میں مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے:

> دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب تفضیلِ شیخین میں ہے۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدانخواستہ اس کو کوئی تعلق نہیں اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں۔
>
> (علی گڑھ، ۱۹۳۴، ص ۲۴)

مرتبِ تذکرہ اور تنہا نے اس اہم نکتے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی کہ ولی اللہ اشتیاق شاعر، شاہ ولی اللہ محدث سے مختلف شخص ہیں۔

لطف پر تنہا کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس کے مطابق اورنگ زیب نے مکہ مسجد کو کھدوا دیا۔ تنہا کے مطابق یہ بہتان ہے کیونکہ حیدر آباد میں مکہ مسجد آج بھی موجود ہے (ص ۶۷)۔ لطف نے "گلشنِ ہند" میں اس واقعے کا ذکر دو بار کیا۔ پہلی بار ابتدائے صفحہ میں، "مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اس کے نیچے گڑا سن کر نہایت آسان ہے۔" پھر وسطِ صفحہ میں، "مکہ مسجد کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا..." ("گلشنِ ہند"، ص ۸۱)۔ دراصل لطف نے پوری تحقیق سے کام نہیں لیا۔ ڈاکٹر زور نے اپنے کسی افسانے میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے گولکنڈے میں ایک مسجد کو کھدوایا تھا۔ یہ سمجھ کر کہ اس کے نیچے مال مدفون ہے۔ لطف نے سہواً اسے مکہ مسجد لکھ دیا۔ "گلشنِ ہند" سے دو شعرا حکیم آشفتہ اور میر حسن کے طویل حالات بطور نمونہ نقل کیے ہیں۔ ان دونوں کے نام اسی جلی قلم سے صفحے کے درمیان میں نمایاں طور پر دیے ہیں، جیسے یہ لطف کے بیان کا جزو نہیں، بلکہ علاحدہ سے کوئی مصنف ہیں۔ ستم یہ ہے کہ کتاب کی ابتدا میں فہرستِ مضامین میں بھی انھیں لطف کے بعد علاحدہ مصنف کے طور پر درج کیا ہے۔ کتاب بندی میں یہ عجب بے سلیقگی ہے۔

میر بہادر علی حسینی کے لیے تنہا نے لکھا ہے کہ میر بہادر علی نام اور حسینی تخلص تھا (ص ۶۷)۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ حسینی نام کا جزو ہے جو ان کے جدی نسب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنی کتاب "تاریخ آسام" میں انھوں نے اپنا نام "سید بہادر علی حسینی" لکھا ہے (ڈاکٹر عبیدہ بیگم، "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، ص ۵۴۶)۔ کریم الدین نے ان کے حالات حسینی تخلص کے تحت دیے ہیں، لیکن ان کا کوئی شعر نہیں دیا۔ حسینی کے شاعر ہونے کی بات مشکوک ہے۔ کریم الدین کے علاوہ کسی اور تذکرے میں ان کا نام بحیثیتِ شاعر نہیں دیا۔ ان کا کوئی شعر نہیں ملتا۔ خلیل الرحمان داؤدی مرتب "رسالۂ گل کرسٹ" نے حسینی کو شاعر نہیں مانا (۲)۔ حسینی کے بارے میں "سیر المصنفین" طبعِ اوّل میں محض

Scanned by CamScanner

آدھا صفحہ لکھا تھا۔ طبع دوم میں چھ صفحے ہیں جن میں کئی کتابوں کا تعارف ہے۔ ان میں "اخلاقِ ہندی" کی سنسکرت اصل کا نام پہلے ایڈیشن میں "ہتوپادیشا" اور دوسرے میں "ہوپادیشا" لکھا ہے۔ صحیح "ہتوپدیش" ہے۔ "تاریخِ آسام" کے لیے لکھتے ہیں کہ یہ ناپید ہے (ص ۸۰)۔ یہ صحیح نہیں، کلکتے میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

میر امن کے لیے لکھتے ہیں کہ اصلی نام میر امان اور تخلص امن، گو کہیں کہیں تخلص لطف بھی ظاہر کیا ہے (طبعِ دوم، ص ۸۱)۔ اس مغالطے کی ذمےداری ان کے مآخذ "خمخانۂ جاوید" نیز "تذکرۂ کریم الدین" کی ہے۔ میر امن کا نام امان نہیں تھا، امن تھا، تخلص محض لطف تھا۔ تنہا نے دیباچۂ باغ و بہار سے لے کر امیر خسرو کو اس کا مصنفِ اول قرار دیا اور نظام الدین اولیا کی بیماری اور دعا کا افسانہ بھی شامل کر دیا، لیکن اپنی طبع دوم میں رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۳۰ء سے لے کر مولوی عبدالحق کی اس تحقیق کا بھی ذکر کر دیا کہ یہ داستان خسرو کی تصنیف نہیں، بلکہ فارسی سے ترجمہ ہی نہیں، "نوطرزِ مرصع" کا نیا روپ ہے (ص ۸۵)۔

شیخ حفیظ الدین احمد کے لیے طبعِ دوم میں لکھتے ہیں کہ حفیظ الدین نام اور احمد تخلص تھا۔ سند دی ہے کریم الدین کے تذکرے کی۔ کریم الدین نے ان کا نام حفیظ الدین احمد اور تخلص احمد لکھا ہے لیکن ان کا کوئی شعر نہیں دیا۔ شیر علی افسوس کے بیان میں "باغِ اردو" (ترجمۂ "گلستاں") کا نمونہ چھ صفحوں کا دیا ہے۔ یہ کتاب اتنی اہم نہیں کہ اسے اتنے صفحے دیے جائیں۔ افسوس نے اس کے آغاز کا دو شعروں کا قطعۂ تاریخ درج کیا ہے۔ تنہا نے اسے نقل کیا لیکن اس کے مصرعِ ثانی کو غیر موزوں دیکھ کر ان کی قیاسی اصلاح کی، لیکن صحیح متن کچھ اور ہے جو ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اقتباس کا غلط متن (ص ۱۰۳)

کھول کھول دل جب بائینِ نیکو
ہے آغاز اُردی باغِ اردو

تنہا کی قیاسی اصلاح:

کھول دل کھول با آئینِ نیکو
کہ ہے آغازِ اُردی باغِ اردو

صحیح متن عبیدہ، ص ۴۸۹:

کھول دلچسپ با آئینِ نیکو
ہے از آغازِ اُردی باغِ اردو

۱۲۱۵ = ۱۲۱۴ + ۱

Scanned by CamScanner

افسوس کی "آرائش محفل" کو ۲۶ صفحے دیے ہیں، جس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ تنہا کو کتابوں کی اضافی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں۔ انھوں نے اردو "آرائش محفل" اور اس کی اصل فارسی "خلاصۃ التواریخ" پر تحقیق و تنقید کی ہے، افسوس کے اضافوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور فارسی کتاب کے مآخذ کی نشان دہی کی ہے جو قطعاً غیر ضروری تھا۔ اصل اور ترجمے کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد عنوان ہے:

وہ الفاظ و محاورات جو آج کل استعمال نہیں ہوتے۔

(ص ۱۱۷)

ان کی طویل فہرست ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اب بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بقولِ مولوی صاحب بعض الفاظ اور محاوروں کے معنی بھی صحیح نہیں دیے۔ پھر عنوان ہے:

وہ الفاظ و محاورات جو اختیار کرنے کے لائق ہیں۔

(ص ۱۲۰)

مولوی صاحب کی رائے میں یہ تقریباً سب لفظ پہلے سے مروج ہیں۔ اس کے آگے تنہا نے ترجمے کے مشمولات کا تجزیہ کیا ہے۔ اتنا لمبا چوڑا بیان اور تاریخ کی ایک ترجمہ شدہ کتاب کے لیے! شیر علی افسوس کو کُل ۳۰ صفحے دیے ہیں۔ جلد اول میں کسی دوسرے مصنف کو اس کا نصف بھی نصیب نہیں ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے بیچ میں آدھمکتے ہیں انشا۔ دوسرے ایڈیشن میں بھی لفظ بہ لفظ پہلے ایڈیشن کے بیان کو دہرا دیا ہے۔ صرف ایک حاشیے میں اہم تبدیلی کی ہے۔ ان کے حالات محض "آبِ حیات" سے لیے ہیں جس کی وجہ سے اس میں وہ سب اغلاط در آئی ہیں جو آزاد سے سرزد ہوئیں اور جن کی تصحیح عابد پیشاوری نے اپنے مقالے "انشاء اللہ خاں انشا" میں کی، مثلاً شاہ عالم کو انشا کی ایک دم کی جُدائی ناگوار، عالمِ جنوں میں انشا کا غزل "... یار بیٹھے ہیں، " پڑھنا۔ اس پر طبعِ اول میں حاشیہ لگا دیا ہے کہ یہ سید انشا کی آخری غزل ہے، لیکن طبعِ دوم میں اس کے بجائے یہ اہم حاشیہ درج کیا ہے:

یہ تمام حکایتیں آزاد کی "آبِ حیات" سے لی گئی ہیں ورنہ "مرآۃ الشعرا" میں ہم نے انشا کے حال میں تردید کر دی ہے کہ ہرگز انشا کی یہ غزل اس موقع کی تصنیف شدہ نہیں ہے۔ (ص ۱۴۲)

اغلاط اور تصحیحات کی تفصیل قطع کی جاتی ہے۔ تنہا نے "دریائے لطافت" دیکھی ہے اور اس سے طویل اقتباسات دیے ہیں، جن میں سب سے اہم وہ ہے جس میں انشا نے اردو

Scanned by CamScanner

میں دخیل الفاظ کے اردو روپ کو فصیح و صحیح اور اصل زبان کے مختلف روپ کو غلط قرار دیا۔ یہ بیان "آبِ حیات" میں نہیں۔

انشا کی طرح شاہ عبدالقادر اور شاہ اسماعیل شہید کے حالات میں بھی دوسرے ایڈیشن میں کوئی اضافہ نہیں۔ اسماعیل شہید کی "تقویت الایمان" کے اقتباس میں کئی جگہ اللہ صاحب کا فقرہ آیا ہے (طبعِ دوم، ص ۵۳-۱۵۲)۔ بعد میں احسن مارہروی نے "تاریخِ نثرِ اردو" میں مولانا اشرف علی تھانوی کی "بہشتی زیور" سے مثال دے کر لکھا ہے کہ دیوبندی اور تھانوی تحریروں میں خدا کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے (ص ۳۴-۳۳۳)۔

تنہا نے فورٹ ولیم کے مصنفوں کے ساتھ سید انشا، وہابی تحریک کے شاہ عبدالقادر اور شاہ اسماعیل شہید کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ فورٹ ولیم کے کچھ مصنف ان حضرات سے پہلے اور کچھ بعد میں بیان ہوئے ہیں۔ کاظم علی جوان اور للولال کے حالات میں طبعِ دوم میں خاصا اضافہ ہے۔ للولال اردو کے مصنف نہیں۔ ان کے حالات میں صرف انھی کتابوں کا ذکر آنا چاہیے جو اردو ادب کا بھی حصہ ہیں۔ تنہا نے ان کی "پریم ساگر"، "سبھا بلاس" اور "مہادیو بلاس" کا بھی ذکر کیا، اردو کو ان سے کیا لینا دینا۔ اکرام علی کے حالات میں نادم سیتاپوری کی مدد سے کافی اضافہ کیا۔ نادم کو وہ "ڈاکٹر نادم سیتاپوری" لکھتے ہیں، یہ ڈاکٹر نہ تھے۔ نادم نے اکرام علی کے حالات میں بہت سی غیر مصدقہ باتیں لکھ دی ہیں۔

مظہر علی ولا کے والد کا نام سلیمان علی خاں لکھا ہے (ص ۱۷۷)۔ صحیح سلمان قلی خاں ہے، جو خود ولا نے لکھا ہے۔ دیکھیے: "سودا" از ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۸۳۔ تنہا نے دوسرے ایڈیشن میں ان کے حالات میں بہت اضافہ کیا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ان کی صرف ایک کتاب "بیتال پچیسی" کا ذکر تھا۔ طبعِ دوم میں نثر و نظم کی مزید پانچ کتابوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "اتالیقِ ہندی" ۱۸۰۳ء لکھتے ہیں [ص ۱۸۰]۔ یہ غلط فہمی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی نام The Hindee Moral Preceptoc ہے۔ اس کے تین جزو ہیں: "پند نامۂ سعدی" کا گلیڈون کا انگریزی نثری ترجمہ، گِل کرسٹ کا اسی کا انگریزی منظوم ترجمہ، ولا کا اردو منظوم ترجمہ (ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۵۰۱-۵۰۰)۔ اسے عام طور سے گِل کرسٹ کی تالیفات میں شمار کیا جاتا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کی فہرستِ مطبوعات میں غلطی سے ولا کو اس کا مرتب لکھ دیا ہے (عتیق صدیقی، "گِل کرسٹ اور اس کا عہد"، ص ۹۲-۱۹۱)۔

ان کی "تاریخِ شیر شاہی" کے لیے لکھتے ہیں کہ خاتمۃ الکتاب میں ۵ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ مطابق ۲ اگست ۱۸۲۰ء درج ہے (ص ۱۸۳)۔ اس سے پہلے اس کا سنہ تکمیل

Scanned by CamScanner

۱۲۲۰ھ لکھتے ہیں، اور یہی صحیح ہے۔ عیسوی سنہ ۱۸۲۰ء اس لیے غلط ہے کہ یہ ۱۲۳۵-۳۶ھ کے متوازی ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے تاریخ کو دیکھا ہے۔ اس میں الفاظ میں ۵ جمادی الاول ۱۲۲۰ھ/۲۱ اگست ۱۸۰۵ء عیسوی تاریخ دی ہے ("فورٹ ولیم کالج"، ص ۵۳۰)۔ ولا کے ایک اور ترجمے کا نام "جہاں گیر نامہ" لکھتے ہیں (ص ۱۸۳)۔ ڈاکٹر عبیدہ نے اسے دیکھ کر اس کا نام "جہاں گیر شاہی" لکھا ہے (ص ۵۳۴)۔

طبعِ اوّل میں مولوی امانت اللہ، بینی نرائن جہاں، میرزا جان طپش (جنھیں طیش لکھا تھا،) اور اشک کے بارے میں چند سطور تھیں، یعنی چاروں کو کُل ملا کر سوا صفحہ۔ طبعِ دوم میں ان چار مصنفوں کو ۲۰ صفحے دیے ہیں اور ہر ایک پر بھرپور لکھا ہے۔ آخر میں محمد حسین کلیم کا اضافہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ انھوں نے "فصوص الحکم" کا اردو ترجمہ کیا، جس کا ایک جملہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے (ص ۲۰۵)۔ قائم، میر حسن اور مصحفی ("تذکرۂ ہندی") نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ ترجمہ منظوم تھا۔ قائم نے صریحاً لکھا ہے کہ فصوص کا ریختہ نظم میں ترجمہ کرنا شروع کیا تھا لیکن بعض بیماریوں کی وجہ سے باز رہا۔ معلوم ہوتا ہے تنہا نے میر حسن کے تذکرے میں کلیم کا حال بچشم خود نہیں دیکھا، کہیں اور سے نقل کر دیا ہے۔ میر حسن نے نہ صرف ترجمۂ فصوص کو نظم میں کہا ہے، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے علاوہ ایک کتاب نثر میں لکھی۔ تنہا نے جو نثری جملہ تذکرۂ حسن کے حوالے سے نقل کیا ہے، وہ اسی دوسری کتاب کا تھا۔ ان پر پہلے دور کا خاتمہ ہوتا ہے۔ تنہا نے اس کے جائزے کے طور پر ایک صفحہ لکھا ہے، جس میں اس دور کی اہم خدمات آ گئی ہیں۔

دوسرا دور ۱۸۲۱ء سے ۱۸۵۷ء تک ہے۔ اس میں ماتم کرتے ہیں کہ:

> جن بزرگوں کا حال اس دور میں بیان کیا ہے وہ مصنفین کے اس جمِ غفیر کے سامنے، جو اس دور میں ہو کر گزرے ہیں، معدودے چند معلوم ہوتے ہیں۔ (ص ۲۰۹)

سلیمان ندوی نے "معارف" بابت جون ۱۹۱۰ء میں انڈیا آفس لندن کی اردو مطبوعات کی منتخب علمی کتابوں کی فہرست چھاپی تھی۔ تنہا نے اسے کئی صفحوں میں نقل کیا ہے۔ مصنفین کی کمی کو انھوں نے مجہول الاسم، بے مرتبہ قلم کاروں کے ناموں سے پورا کیا ہے۔ ان میں سے اکثر ادبی دنیا میں صفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پیچھے ان کے نام دیے جا چکے ہیں۔ میں ان سب کو قلم انداز کر کے صرف عمائد کے بارے میں لکھوں گا۔

محمد بخش مہجور کا اضافہ کیا لیکن کیا کیا۔ دو سطروں میں ان کے حالات ہیں۔ ان کی محض ایک کتاب کا ذکر ہے، اس کا بھی نام ناقص "گلشنِ بہار" لکھا حالانکہ پورا نام "انشائے گلشنِ

نوبہار" ہے۔ ان کی مشہور کتاب "نورتن" کا نام ہی نہیں دیا۔ غرض مہجور کو صرف آدھا صفحہ دیا ہے (ص ۲۱۹)۔ فقیر محمد خاں گویا کے حال میں خفیف سا اضافہ ہے۔ نیم چند کھتری دوسرے ایڈیشن ہی میں سامنے آتے ہیں۔ ان کو پون صفحہ دیا ہے جس میں نمونہ کتاب سے پہلے محض پانچ سطروں میں مصنف اور کتاب کا تعارف ہے۔ امانت کا نثر نگار کے طور پر ذکر کرنا زائد معلوم ہوتا ہے۔ آزردہ اور صہبائی بھی نثر نگار کے طور پر اہم نہیں۔

متعدد غیر اہم ادیبوں کے بعد رجب علی بیگ سرور آتے ہیں۔ انھیں گویا اور نیم چند کھتری وغیرہ کے بعد کیوں جگہ دی۔ "فسانۂ عجائب" کی قدامت اور اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس دور میں سب سے پہلے انھیں کا احوال آنا چاہیے تھا۔ سرور کا بیان ان کے رتبے کے لحاظ سے کم ہے، یعنی محض سات صفحوں میں۔ افسوس کی "آرائش محفل" کو ۲۶ صفحے دیے ہیں اور سرور کی "فسانہ عجائب" کو محض ایک ڈیڑھ صفحہ۔ طبع دوم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ سرور کے بیان کے لیے انھوں نے تین کتابوں پر تکیہ کیا۔ "قند اردو"، "گل دستۂ اردو"، "اردو فائنل ریڈر"۔ پہلی دو مجہول الاسم کتابیں بھی درسی ریڈر معلوم ہوتی ہیں۔ تاریخ ادب کے لیے یہ مآخذ نہایت غیر معتبر ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "فسانۂ عجائب" ... ۱۸۴۵ء میں بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ لکھی گئی۔ (ص ۲۴۶)

۱۸۴۵ء سہو کتابت نہیں۔ طبع اول ۱۹۲۴ء، طبع دوم ۱۹۴۸ء، نیز طبع ۱۹۷۶ء، مرتبۂ شاہین تینوں میں ۱۸۴۵ء درج ہے۔ نصیر الدین حیدر کا عہد ۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء ہے، ۱۸۴۵ء نہیں۔ سچ یہ ہے کہ "فسانۂ عجائب" غازی الدین حیدر کے عہد میں ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں مکمل ہوئی۔ نصیر الدین حیدر کے اوائلِ حکومت میں سرور نے دیباچے میں ترمیم کر کے انھیں پیش کی۔ سرور کی "گل زارِ سرور" فارسی "حدائق العشاق" کا ترجمہ ہے۔ اب فارسی کتاب نایاب یا نادر ہے۔ تنہا نے اس کے مصنف کے بارے میں یہ بیش بہا معلومات بہم پہنچائی ہے کہ مصنف رضی ابن محمد شفیع نظام الدولہ نواب علی وردی خاں حاکم بنگالہ کا مصاحب تھا (ص ۲۵۰)۔ سرور کی کتاب "سرور سلطانی" کا نمونہ دینے کے لیے عنوان دیتے ہیں: "نمونہ از شمشیر خانی" (ص ۲۵۲) "شمشیر خانی" اس فارسی کتاب کا نام ہے جس کا اردو ترجمہ "سرور سلطانی" ہے۔ تنہا کو یہاں "نمونہ از سرور سلطانی" لکھنا چاہیے تھا۔ آگے لکھتے ہیں کہ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو مختلف لغات کی مدد سے تیار کی گئی ہے (ص ۲۵۳)۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے تصحیح کی کہ یہ فرہنگ اشخاص اور مقامات کے ناموں کا اشاریہ ہے جس میں ناموں کا تلفظ اور مختصر تعارف لغات کی مدد سے لکھا گیا

Scanned by CamScanner

ہے(۳)۔ تنہا نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب پہلی بار نول کشور پریس میں ۱۸۸۷ء میں چھپی۔ نیر مسعود نے اس کی تردید کی، لیکن پہلی طباعت کی تاریخ انھیں نہیں دی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کے مطابق مطبعِ خاقانی لکھنؤ میں ۷ رجب ۱۲۶۵ھ (اپریل ۱۸۴۹ء) کو چھپی ("اردو داستان"، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۲۲۰)۔ نول کشور پریس کا سینہ ۱۸۸۷ء کا ایڈیشن نیر مسعود کو نہیں ملا، نامی پریس کا اسی سال کا ملا۔ کہیں تنہا پریس کے نام میں التباس تو نہیں کر گئے۔

غالب کے حالات کا واحد ماخذ "یادگارِ غالب" ہے جس سے لے کر طبعِ اوّل میں ص ۱۵۵ سے ۱۸۸ تک کو سیاہ کیا۔ طبعِ دوم میں کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ تخفیف کی یعنی ان کے حالات ص ۲۶۰ کے آخر میں شروع کر کے ۲۷۲ کے وسط میں ختم کیے۔ اس ایڈیشن میں غالب کی سوانح اور شخصیت کے بیان نیز بہت سے لطیفوں کو بھی قطع کیا جس سے یہ بیان متوازن ہو گیا، لیکن طبعِ اوّل میں دو اہم عنوانات ہیں، مولانا نذیر احمد کی رائے مرزا کی شاعری پر، اور اس کا جواب ڈاکٹر عبدالرحمان کی طرف سے، یہ دونوں اہم اور دلچسپ ہیں۔ نذیر احمد نے کسی لیکچر میں غالب کی فارسی گوئی اور ریختہ اردو پر سخت اعتراض کیا ہے، مثلاً:

> ناچار مرزا صاحب نے بھی بادلِ ناخواستہ ریختہ کا منہ چڑانا شروع کیا۔
> (طبعِ اوّل، ص ۱۸۹)
>
> مرزا صاحب کی شاعری اس بات کا نمونہ ہے کہ زمانہ کیوں کر اپنی جنتری میں سے لوگوں کو نکالتا ہے۔ (ایضاً)
>
> مرزا صاحب زیادہ مدتوں تک اسی فارسی کو پکڑے رہے مگر زمانے کے ساتھ کسی کی کیا ضد چلے، خاص کر شاعری تو پیٹ بھرے کے مشغلے ہیں (کذا)۔ (ص ۸۹-۱۸۸)

اور ناول نگاری کیا خالی پیٹ کی جاتی ہے۔ نذیر احمد نے اپنی شاعری کے پیشِ نظر یہ رائے دی ہوگی۔ نذیر احمد نے "... خندہ ہے" کی زمین کی غزل کے تین اشعار طنزاً نقل کیے۔ تنہا نے اس کا جواب ڈاکٹر عبدالرحمان کی ستائشی رائے کے طور پر پیش کیا۔ جس میں انھوں نے اس غزل کو بطورِ خاص سراہا ہے۔ تنہا نے طبعِ دوم میں یہ دلچسپ تنقید شاید اس لیے حذف کر دی ہوگی کہ اس کا تعلق غالب کی شاعری سے تھا، جب کہ کتاب کا موضوع نثر ہے۔

خواجہ امان کا بیان دوسرے ایڈیشن کا اضافہ ہے اور قابلِ قدر ہے۔ تنہا اعتراف کرتے ہیں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون شائع شدہ رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء سے ضروری اور قابلِ ذکر باتیں لے لی ہیں۔ یہ دور ۱۸۵۷ء تک کا ہے لیکن امان کا ترجمہ "بوستانِ

Scanned by CamScanner

خیال" خود تنہا کے بقول ۱۸۶۶ء سے سامنے آتا ہے (ص ۲۷۴)۔ پھر امان کو اس دور میں کیوں جگہ دی۔ بہرحال تنہا نے یہ اچھا کیا کہ امان کے مقرر کردہ اصولِ افسانہ نگاری (دراصل داستان نگاری) درج کر دیے ہیں۔ امان کے علاوہ دوسرے دور (۱۸۳۶-۵۷ء) میں تین مصنفوں کا شمول حیرت انگیز ہے۔ غلام امام شہید، غلام غوث بے خبر اور امیر مینائی۔ شہید اور بے خبر کے حالات درسی کتاب "قند اردو" سے لیے ہیں۔

شہید کے لیے لکھتے ہیں، آپ کی تاریخِ ولادت و تاریخِ وفات معلوم نہیں ہوئی۔ لیکن یہ کئی جگہ ملتی ہیں گو باختلاف تاریخ۔ ادبیات مسلمانان، آٹھویں جلد میں خواجہ محمد زکریا نے ولادت ۱۸۰۴ء اور وفات ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۹ء لکھ کر ۱۸۷۶ء کو ترجیح دی ہے۔ مالک رام نے ولادت کی تاریخ نہیں دی، وفات کی تاریخ ۴ صفر ۱۲۹۶ھ/۲۸ جنوری ۱۸۷۹ء دی ہے۔ انھوں نے وفات کے تین شعری مادّے بھی دیے ہیں جن میں ایک سے ۱۲۹۳ھ اور دو سے ۱۲۹۶ھ نکلتا ہے۔ بنارس یونی ورسٹی کے ایک تحقیقی مقالے میں کفیل احمد نے سنہ ولادت ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹-۱۸۰۰ء) اور سنہ وفات ۱۴ شوال ۱۲۹۶ھ یکم اکتوبر ۱۸۷۹ء دیا ہے۔ میری رائے میں ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء صحیح سنہ وفات ہے۔ ان کی مشہور کتاب "انشائے بہارِ بے خزاں" ۱۸۶۶ء میں مرتب اور شائع ہوئی۔ اس طرح شہید کو ہر طرح سے بعدِ ۱۸۵۷ء کے دورِ سوم میں رکھنا چاہیے تھا، دوم میں نہیں۔

بے خبر کی دو تصانیف کا ذکر کیا ہے، "خوں نابۂ جگر" اور "فغانِ بے خبر" (ص ۲۰۵) ان کے سنین نہیں دیے، یہ بھی صراحت نہیں کی کہ ان میں پہلی کتاب فارسی کی اور دوسری اردو کی ہے۔ "فغانِ بے خبر" کی تاریخ ۱۸۹۱ء ہے اس لیے یہ بالیقین تیسرے دور میں رکھی جانی چاہیے۔ بے خبر کے بیان میں ان کی مصنفہ "انشائے بہارِ بے خزاں" از شہید کی تقریظ نقل کرتے ہیں اور پھر بڑی معرکے کی رائے دیتے ہیں:

> تقریظ کیا ہے، بالکل قصیدۂ مدحیہ ہے... افسوس یہ ہے کہ زمین و آسمان کے قلابے تو ملائے جاتے ہیں مگر اتنا بھی نہیں لکھا جاتا کہ اس کتاب میں کیا کیا مضامین درج ہیں اور مصنف نے کن مباحث پر قلم اٹھایا ہے... یہ تعریف "انشائے بہارِ بے خزاں" کے لیے مخصوص نہیں۔ اگر کتاب کا نام اور مصنف کا نام بدل دیا جائے تو ہر کتاب کے لیے، جو اچھی ہو، موزوں ہو سکتی ہے۔
>
> (طبع دوم، ص ۳۰۲)

آج کل کے شاعر اور افسانہ نگار تنقید نگاروں کو مجبور کر کے جو مقدمے، فلیپ یا

تبصرے لکھواتے ہیں وہ بھی ان تقریظوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔

تنہا نے امیر مینائی کو ان کے تذکرے "انتخابِ یادگار" کی وجہ سے نثر نگاروں میں جگہ دی ہے۔ یہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں شائع ہوئی۔ اسے دوسرے دور میں رکھنے کی دو وجوہ پیش کیں۔

۱۔ یہ بہ لحاظِ زبان "فسانۂ عجائب" سے ملتی ہے۔

۲۔ تیسرے دور کے مصنفین اس اعلیٰ پائے کے ہیں کہ ایک یا دو کتاب کے مؤلف کو ان صدر نشینانِ بزمِ اردو کے ہم پلہ جگہ نہیں دی گئی۔

(طبعِ دوم، ص ۳۱۵)

دونوں عذر لنگ ہیں۔ کتابوں اور مصنفوں کو ان کے سنین کی بنا پر کسی تاریخی دور میں رکھا جاتا ہے۔ کیا کوئی دور محض اعلیٰ پائے کے مصنفوں کا ہوتا ہے۔ ہر عہد میں بڑے اور چھوٹے دونوں طرح کے اہلِ قلم ہوتے ہیں۔ گارساں دتاسی کے مفصل حالات ڈاکٹر زور کی کتاب گارساں دتاسی سے اخذ کیے ہیں، اس لیے اطمینان بخش ہیں۔ امیر مینائی کے بعد ڈیڑھ صفحے کا خاتمہ ہے جو اس کتاب کے معیار کو دیکھتے ہوئے کافی ہے۔ کاش اس میں رجب علی بیگ سرور کے اثرات کا بھی ذکر کرتے۔

کتاب میں سنین کے بارے میں جس تحقیق کی ضرورت ہے، ظاہر ہے تنہا نے نہیں کی۔ میں "سیر المصنفین" جلد اوّل، طبعِ دوم کے ایسے سنین کو درج کرتا ہوں جو دوسرے محققین نے کچھ اور لکھے ہیں اور آخر الذکر کے صحیح تر ہونے کا امکان ہے۔ زیادہ غیر اہم سنین کو میں نظر انداز کرتا ہوں۔ دوسرے کالم میں مالک رام سے مراد ان کا "تذکرۂ ماہ و سال"، جالبی سے مراد ان کی "تاریخِ ادبِ اردو"، جلد اوّل اور عبیدہ بیگم سے مراد ان کی کتاب "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" ہے۔ ف سے مراد فوت اور پ سے مراد پیدائش۔

تنہا	دوسرے محققین
ص ۱۵ عبدالقدوس گنگوہی، ف ۹۴۵ھ۔	مالک رام ۲۳ جمادی الثانی ۹۴۴ھ۔
ص ۱۷ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، ف ۷۵۸ھ۔	مالک رام ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ۔
ص ۱۸ خواجہ بندہ نواز، ف ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء، (ظاہراً ۱۴۲۱ء) ص ۳۴ پر ۱۴۲۲ء۔	مالک رام ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ ایکم نومبر ۱۴۲۲ء (ص ۳۴۶)۔
ص ۱۹ و ۳۵ شمس العشاق، ف ۹۰۲ھ۔	جانم کے مرثیے کے مطابق شوال ۹۹۴ھ۔

ص ۲۰ برہان الدین جانم، ف ۹۹۰ھ۔

حسینی شاہد: ۱۰۰۷ھ (سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، ص ۱۱۴)۔

ص ۲۰ و ۳۵ شاہ امین الدین اعلیٰ، ف ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء۔

حسینی شاہد ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء، (ایضاً، ص ۱۴۹)۔

ص ۲۰ حضرت امین کا رسالہ "گنجِ مخفی"، تقریباً ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں۔

حسینی شاہد کے مطابق اس رسالے کا سنِ تصنیف معلوم نہیں۔ امین ۱۰۰۷ھ میں پیدا ہوئے تھے، تین سال کی عمر میں رسالہ نہیں لکھ سکتے۔

ص ۲۳ میراں یعقوب کی "شمائل الاتقیا"، ۱۰۷۸ھ، ص ۳۸ پر ۱۰۷۸ھ/۱۶۹۷ء، کے بعد۔

جالبی ۱۰۸۴ھ، (ص ۵۰۱)۔

ص ۲۴ ہاشمی، ف ۱۰۹۰ھ۔

شمس اللہ قادری ۱۱۰۹ھ، ("اردوے قدیم"، ص ۹۱)۔

ص ۳۰ وجہی کی "سب رس"، ۱۰۴۰ھ کے قریب، ص ۳۷ پر ۱۰۴۵ھ۔

خود وجہی کے مطابق ۱۰۴۵ھ۔

ص ۳۴ خواجہ بندہ نواز، پ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء۔

مالک رام: ۴ رجب ۷۲۱ھ/۳۰ جولائی ۱۳۲۱ء، (ص ۳۴۶)۔

ص ۳۵ ولی اللہ قادری کا ترجمہ "معرفت السلوک"، ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۴ء۔

نصیر الدین ہاشمی: ۱۱۲۵ھ ("دکن میں اردو"، ص ۳۵۶)۔

جالبی: ۱۱۵۷ھ، (ص ۳۰۶)۔ ظاہراً غلط۔

ص ۴۰ فورٹ ولیم کالج میں اردو کتابوں کی تصنیف و تالیف کا سررشتہ قائم، ۱۷۹۸ء/۱۲۱۳ھ۔

عتیق صدیقی: کالج ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو قائم، ("گل کرسٹ اور اس کا عہد"، ص ۱۳۷)۔

ص ۴۱ افسوس کی "باغِ اردو"، ۱۷۹۹ء/۱۲۱۴ھ۔

خود افسوس کے مطابق ۱۸۰۲ء/۱۲۱۶ھ (عبیدہ، ص ۴۹۰۔)۔

ص ۴۱ شاہ عبد القادر کا ترجمہ قرآن، ۱۸۰۷ء/۱۲۳۲ھ (کذا)۔

عبد الحق: ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء، ("قدیم اردو"، ص ۱۳۲)۔

ص ۴۸-۴۷ شوق اورنگ آبادی کی مثنوی "چہار درویش"، ۱۲۱۲ھ اور ۱۲۱۴ھ کے درمیان۔

۱۲۱۲ھ: تاریخ تصنیف "غریب"، ("فہرست اردو مخطوطات آصفیہ لائبریری"، جلد اول، ص ۱۲۴)۔

Scanned by CamScanner

ص ۵۴ گِل کرسٹ کی "انگریزی ہندوستانی لغت"، ۹۶-۱۷۸۷ء۔	عبیدہ بیگم: پہلی جلد ۱۷۸۶ء، دوسری ۱۷۹۰ء، (ص ۸۳)۔
ص ۵۴ گل کرسٹ کی "ہندوستانی علم اللسان"، ۱۸۱۰ء۔	عبیدہ و سمیع اللہ: ۱۸۰۰ء، یہ Anti-Jargonist کا اردو نام ہے، (عبیدہ، ص ۸۸-۸۷۔ سمیع اللہ، "انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے"، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۷)۔
ص ۵۵ گل کرسٹ کی "مشرقی زباندان" کا اضافہ شدہ ایڈیشن، ۱۸۰۰ء۔	سمیع اللہ: ۱۸۰۳ء، (ص ۱۰۷)۔
ص ۵۵ گِل کرسٹ کی رسالہ، ۱۸۰۲ء۔	سمیع اللہ: ۱۸۰۹ء، (ص ۱۰۹)۔
ص ۵۷ حیدری کا "قصہ لیلیٰ مجنوں"، ۱۲۱۴ھ۔	۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ (عبیدہ، ص ۲۸۳۔ سمیع اللہ، ص ۱۴۴)۔
ص ۸۰ "رسالہ گل کرسٹ" کی پہلی اشاعت، ۱۸۱۶ء۔	انصار اللہ نظر ۱۸۲۰ء، سرورق کا عکس، ("قاعدہ ہندی ریختہ عرف رسالہ گل کرسٹ"، ۱۹۷۳ء، ص ۱۵)۔
ص ۸۳ میر امن کی "گنج خوبی"، ۱۸۰۲ء۔	عبیدہ: شروع ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ، تکمیل ۱۸۰۴ء/۱۲۱۹ھ (ص ۳۵۰)۔
ص ۹۸ افسوس کی "باغِ اردو"، ۱۸۰۸ء، ص ۱۰۳ پر ۱۲۲۳ھ۔	خود افسوس ۱۸۰۲ء/۱۲۱۶ھ (عبیدہ، ص ۳۹۰)۔
ص ۱۵۷ جوان کی "شکنتلا"، تصنیف ۱۸۰۲ء، شائع ۱۸۰۳ء،	خود افسوس تصنیف ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء، اشاعت ۱۸۰۴ء، (عبیدہ، ص ۲۴۸ و ۲۵۰)۔
ص ۱۵۷ جوان، "تاریخِ فرشتہ" سے خاندانِ بہمنی کا ترجمہ، ۱۸۰۹ء۔	سمیع اللہ: ۱۸۰۷ء، (تصنیفی ادارے، ص ۱۲۸)۔
ص ۱۵۷ جوان، "سنگھاسن بتیسی"، ۱۸۰۵ء، لیکن ص ۱۵۹ پر ۱۸۰۱ء۔	خود جوان ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء، (عبیدہ، ص ۲۵۹)۔
ص ۱۸۱ ولا کی "بیتال پچیسی"، ۱۸۰۳ء/۱۲۱۵ھ (دونوں سنین میں مطابقت نہیں۔)	عبیدہ: ترجمہ ۱۸۰۱ء، شائع ۱۸۰۵ء، (ص ۷۷-۲۷۶)۔

Scanned by CamScanner

ص ۱۸۵ مولوی امانت اللہ کی "صرفِ اردو" منظوم، ۱۸۱۰ء۔	عبیدہ: ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں تصنیف، ۱۸۱۰ء میں شائع، (ص ۶۱۳)۔
ص ۱۹۱ بینی نرائن جہاں نے "چار گلشن" کا قصہ امام بخش کو ۱۸۱۱ء میں سنایا۔	خود جہاں کے مطابق ۱۲۲۵ھ جو برابر ہے ۱۸۱۰ء کے، (عبیدہ، ص ۳۳۴)۔
ص ۱۹۲ جہاں کا ترجمہ "تنبیہ الغافلین"، ۱۲۴۵ھ۔	حنیف نقوی: رمضان ۱۲۵۴ھ/نومبر ۱۸۳۸ء، ("نوائے ادب"، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۱۷)۔
ص ۱۹۴ مرزا جان طپش، پ ۱۱۹۸ھ۔	عبیدہ: اس سے بہت پہلے ۱۷۴۳ء کے قریب، (ص ۱۷۹)۔
ص ۱۹۵ طپش کی "بہارِ دانش"، ۱۸۰۱ء۔	تکمیل کی تاریخ "باغ و بہار" جس سے ۱۲۱۷ھ مطابق ۳-۱۸۰۲ء برآمد۔ یہ خود تپش نے درج کی ہے۔
ص ۲۲۶ امانت، ف ۱۸۵۸ء۔	مالک رام: ۲۸ جمادی الاوّل ۱۲۷۵ھ/۳ جنوری ۱۸۵۹ء۔
ص ۲۴۱ کریم الدین نے تذکرۂ "طبقاتِ شعرائے ہند"، ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں لکھا۔	خود کریم الدین کے مطابق: ۱۸۴۷ء، (تذکرہ، ص ۳، ص ۵۰۴)۔
ص ۲۴۶ "فسانۂ عجائب"، ۱۸۴۵ء۔	صحیح ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء۔ ("اردو کی نثری داستانیں"، ص ۵۰۹)۔
ص ۲۴۶ غالب کا قید خانے میں جانا، ۱۲۶۴ھ۔	کالی داس گپتا رضا: ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء/۱۲۶۳ھ ("دیوانِ غالب کامل"، بمبئی، ۱۹۸۸ء، ص ۸۹)۔ حالی نے "یادگارِ غالب" میں ۱۲۶۴ھ غلط لکھا ہے۔
ص ۲۷۴ امان کے ترجمۂ "بوستانِ خیال" کی پہلی جلد طبع ۱۲۷۵ھ/۱۸۶۶ء۔	گیان چند: ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء، (نثری داستانیں، ص ۸۲۶)۔
ص ۲۷۵ ترجمۂ "بوستانِ خیال" کی پانچ جلدیں ۱۸۷۶ء تک شائع۔	گیان چند: جلد پنجم، ترجمہ ۱۸۷۶ء، شائع ۱۸۷۹ء، (ایضاً)۔
ص ۲۹۸ بے خبر، ف ۱۹۰۵ء۔	مالک رام: ۱۸ شوال ۱۳۲۲ھ/۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء۔

Scanned by CamScanner

بیان	تصحیح
ص۳۰۵ عبدالکریم کا ترجمہ "الف لیلہ"، ۱۸۴۵ء۔	خود عبدالکریم ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ) میں کام کیا۔
ص۳۰۹ کریم الدین کا تذکرہ "طبقات الشعرا" (کذا)، ۱۸۵۲ء میں چھپا (بحوالہ: ڈاکٹر زور، "گارساں دتاسی")۔	صحیح تاریخِ اشاعت ۱۸۴۸ء۔
ص۳۱۶ امیر مینائی کی واجد علی شاہ کے دربار میں باریابی، ۱۲۶۹ھ۔	ابو محمد سحر: ۱۲۶۸ھ یا اس سے پہلے، ("مطالعۂ امیر"، لکھنؤ، ۱۹۶۵ء، ص۷۷)۔
ص۳۱۷ امیر کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق"، طبع ۱۸۹۱ء۔	ابو محمد سحر ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰-۰۱ء، (ایضاً، ص۱۲۲)۔
ص۳۲۳ دلی کالج سوسائٹی، ۱۸۴۲ء میں قائم۔	سمیع اللہ: ۱۸۴۳ء، (تصنیفی ادارے، ص۲۰۶)۔

"سیر المصنفین" کی جلد دوم ضخیم تر ہے۔ اس کے شروع میں ۱۲ صفحوں کی فہرستِ مطالب ہے جس کے بعد نئی نمبر شماری سے فہرستِ حوالہ جاتِ ہر دو جلد، دیباچہ اور متن ص۶۳۸ پر ختم ہوتے ہیں۔ دیباچے پر تاریخ ۲۹ نومبر ۱۹۲۷ء درج ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اصلاً یہ خیال تھا کہ کتاب ایک جلد میں تمام ہوجائے گی، اس لیے جلد اول کا دیباچہ پوری کتاب کے لیے تھا، لیکن اب تیسرے دور کو علاحدہ جلد میں لکھا جارہا ہے۔

لکھتے ہیں، پہلی جلد کی اشاعت کے بعد ان پر اردو کی پیدائش کے سلسلے میں اعتراض کیا گیا کہ اردو کی پیدائش مسلمانوں کے داخلۂ ہند کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ اب کی بار تنہا نے نصیر الدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" اور شمس اللہ قادری کی "تاریخِ زبان اردو" سے لے کر نیا مواد پیش کیا جس میں حضرت زین الدین خلد آبادی م ۷۷۱ھ کا ایک جملہ نیز عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز، میراں جی شمس العشاق کے رسالے نیز بعض دوسری دکنی کتابیں شامل ہیں۔ جلد اوّل کے سلسلے میں مَیں مولوی عبدالحق کے اور اپنے شبہات درج کر چکا ہوں۔ ظاہر ہے تنہا اپنے زمانے کی معلومات ہی پر تکیہ کر سکتے تھے۔ جن میں سے اب بہت کچھ غلط ثابت ہو چکی ہیں، مثلاً عین الدین گنج العلم کے رسالے محض افسانہ ہیں، جن کا کہیں وجود نہیں۔ تنہا نے خواجہ بندہ نواز سے دو رسالے منسوب کیے ہیں: "معراج العاشقین" اور "ترجمۂ

Scanned by CamScanner

نشاط العشق" (ص ۵) ثابت ہو چکا ہے کہ "معراج العاشقین" خواجہ صاحب سے ڈھائی صدی بعد کے ایک درویش کی تصنیف سے ماخوذ ہے اور "نشاط العشق" کا ترجمہ خواجہ کے مینہ نبیرہ عبداللہ حسینی نے کیا۔ میراں جی شمس العشاق کے دو رسالوں "جل ترنگ" اور "گل باس" کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کا بھی کہیں پتا نہیں چلتا۔ سچ تو یہ ہے کہ بندہ نواز اور میراں جی نے اردو میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ "سب رس" کے لیے لکھتے ہیں:

> ملاوجہی نے غالباً حضرت وجیہ الدین گجراتی کی تالیف سے کتاب "سب رس" ترجمہ کی ہے۔ یہ تصوف کی بہترین کتاب ہے۔
>
> (ص ۶)

"سب رس" تصوف کی کتاب نہیں، ایک تمثیلی داستان ہے۔ اسے وجیہ الدین گجراتی کی کسی تالیف سے کوئی تعلق نہیں۔ دراصل "تاج الحقائق" کو بعض حضرات نے وجیہ الدین گجراتی سے منسوب کیا۔ خود تنہا نے جلد اوّل طبع دوم میں ص ۳۸-۳۷ پر ان دونوں کتابوں کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کی ہیں۔ دکنی نثر کے بارے میں تنہا نے جو رائے دی ہے، وہ دلچسپ ہے، لیکن ایک مؤرخ ادب کے شایاں نہیں۔ لکھتے ہیں:

> ۱۱۴۵ھ سے قبل جب کہ میر فضلی نے اپنی کتاب "دہ مجلس" تصنیف کی۔ جملہ تصنیفات کی نثریں بہ مشکل اردو کہی جا سکتی ہیں۔ کم از کم مجھے تو ان مختصر نثروں کا نقل کرنا بھی اجیرن ہو گیا۔ طبیعت نہایت مکدّر اور منغّض ہوئی۔ جس طرح ابتدائی انگریزی زبان کو اینگلو سیکسن کہا جاتا ہے اسی طرح ان بزرگوں کی اردو کو اگر دکنی اردو کہیں تو بے جا نہیں ہے۔ جس جفا کشی اور محنت و تلاش سے ان بزرگوں کی کتابوں اور نثر کے نمونوں کو "دکن میں اردو" کے مؤلف نے بہم پہنچایا ہے۔ وہ ضرور قابلِ تعریف ہے لیکن ان کا یہ کارنامہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مصداق ہے۔
>
> (ص ۸)

ہم تنہا کی معصومیت پر درگزر کر سکتے ہیں کہ اس وقت تک دکنی ادب مکمل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ آگے چل کر پھر لکھتے ہیں کہ عین الدین گنج العلم سے تحسین تک کے مصنفین سے:

> نثرِ اردو کے ادوار قائم نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی دکنی اردو دراصل اردو ہی نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک تحسین سے پیش تر ایسی اردو کا

Scanned by CamScanner

سراغ نہیں ملتا جسے بہ آسانی اردو کہہ سکیں اور کھینچ تان کر کسی
کتاب کو اردو کی کتاب کہہ دینا اور بات ہے۔

(ص ۱۱)

گویا اب تحسین سے پہلے فضلی کی شمالی اردو کی کتاب "دہ مجلس" ("کربل کتھا") پر بھی زلزلہ گرتا ہے۔ یہ بات اس زمانے میں کہی جا سکتی تھی۔ آج دکنی ادب کو شمالی ادب سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے جدا کرنے والی بات کہی جائے گی۔ اہلِ دکن اسی ذہنیت سے چڑتے ہیں۔ باقر آگاہ نے ۱۲۱۱ھ میں مثنوی "گل زارِ عشق" کے دیباچے میں لکھا:

اکثر جاہلانِ بے معنی و ہرزہ دارانِ لایعنی زبانِ دکنی پر اعتراض اور "گلشنِ عشق" و "علی نامہ" پر اعتراض کرتے ہیں اور جہلِ مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطینِ دکن کی قائم تھی، زبان ان کی، درمیانے ان کے، خوب رائج اور طعن و شماتت سے سالم تھی۔

(بحوالہ جمیل جالبی، تاریخ جلد اوّل، ص ۵۲۳)

اس تحقیقی دیباچے کے آخر میں بتاتے ہیں کہ دوسری جلد کا مسودہ ۱۹۲۴ء ہی میں تیار ہو گیا تھا، چنانچہ اس کے بعض حصے رسالہ "اردو"، "الناظر" لکھنؤ اور "جامعہ" دہلی میں چھپ چکے ہیں، لیکن جلد کی اشاعت کے وقت مسودے میں مناسب ترمیم کر کے موجودہ معلومات شامل کر دی ہیں۔ رسالہ "اردو" کا اشاریہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ۱۹۲۸ء سے پہلے تنہا کا محض ایک مضمون مطبعِ منشی نول کشور رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا اور یہ "سیر المصنفین" کا جزو ہے۔ تنہا نے اس جلد کے بڑے مصنفین کے حالات میں بھی زیادہ تر ایک ماخذ پر تکیہ کیا ہے گو اس کی عبارتوں کو مختصر کر دیا ہے یا کہیں کہیں تبدیلی بھی کی ہے۔

آزاد نے "آبِ حیات" میں ایک جدت یا بدعت یہ کی کہ ان کے نزدیک جو مصنفین کم اہم تھے ان کا احوال فٹ نوٹ میں لکھا۔ تحقیق و تدوین کے نقطۂ نظر سے یہ فٹ نوٹ کا غلط استعمال ہے۔ فٹ نوٹ کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس میں ماخذ کا حوالہ دیا جائے یا متن کی عبارت پر بعض ایسے تبصرے درج کیے جائیں جو متن میں شامل کیے جاتے تو بیان کے تسلسل میں دخل در معقولات معلوم ہوتے۔ فٹ نوٹ کا مقصد پُر مغز معلومات دینا نہیں۔ ہمارے دور میں ڈاکٹر عابد پیشاوری حاشیے کا اسی طرح نامناسب استعمال کر کے اس میں پورا مقالہ لکھ ڈالتے ہیں۔

تنہا نے بھی آزاد کی تقلید میں ۱۵ اہلِ قلم کا ذکر فٹ نوٹ میں کیا ہے جو بعض اوقات

Scanned by CamScanner

کئی صفحوں پر پھیلا ہوتا ہے۔ ان میں محسن الملک، سید احمد دہلوی، ظفر علی خاں، منشی سجاد حسین، امداد امام اثر، سلیمان ندوی اور وحیدالدین سلیم جیسے اہم ادیب بھی ہیں اور مولوی سید کرامت حسین مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، رائے بہادر لالہ بیج ناتھ اور نواب محمد اسماعیل خاں مرحوم جیسے نام بھی ہیں، جن کا اردو ادب میں کوئی مقام نہیں۔ انھیں اس تاریخ میں شمول کا شرف نہ دیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔

اس دور کی ابتدا میں پھر انڈیا آفس لائبریری میں موجود بعض علمی کتابوں کی فہرست دی ہے اور اس کے بعد خالص ادیبوں پر آ جاتے ہیں جس کی ابتدا سر سید احمد خاں سے ہوتی ہے۔ ان کے حالات حالی کی "حیاتِ جاوید" سے منقول ہیں اور یہ ص۲۴ سے ص۹۸ تک کو محیط ہیں۔ دوسروں کی کتابوں سے باب کے باب تیار کرنا تصنیف کو تالیف سے بھی گرا کر ڈائجسٹ بنا دینا ہے۔ ہمارے دور میں ڈاکٹر عبدالرحیم جاگیردار نے اسی فن سے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو نثر کا دہلوی دبستان" تیار کر دیا۔

"سیر المصنفین" میں سر سید کے بعد چراغ علی کا ذکر متن میں اور محسن الملک کا حاشیے میں ہے، جو ص۱۰۱ سے ۱۰۵ تک ہے اور تقریباً پورے صفحے کو گھیرے ہوئے ہے۔ چراغ علی کا بیان ص۹۸ سے ۱۵۷ تک ہے۔ انھیں ۶۰ صفحے دینا عدمِ توازن کی حد ہے۔ تنہا مصنفین کی صحیح قدر بندی نہ کر سکے۔ چراغ علی کے حالات محض ایک ماخذ مولوی عبدالحق کے مقدمۂ "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" سے اخذ کیے ہیں اور اس کے بعد بیسیوں صفحوں میں چراغ علی کی تحریروں کے نمونے دیے ہیں۔

چراغ علی کے حالات ۶۰ صفحوں پر ہیں لیکن محمد حسین آزاد کے اُن سے کم یعنی ۴۶ صفحات ہی پر ہیں۔ ان میں ۲۲ صفحات پر سوانح اور ۲۴ صفحات پر تحریروں کے نمونے ہیں۔ یہ حالات "خمخانۂ جاوید" و رسالہ "ادیب" الہ آباد سے ماخوذ ہیں۔ حاشیے پر رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کے حالات ہیں۔ لکھا ہے کہ ان کی صحیح تاریخِ وفات معلوم نہیں ہوئی۔ مالک رام کے "تذکرہ ماہ و سال" کے مطابق آشوب نے ۲۸ مئی ۱۹۱۴ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ آشوب اور ڈائرکٹر میجر فلر کے بیچ لفظ ایجاد کی جنس پر بحث ہوئی۔ آشوب نے حکم کے طور پر آزاد کو بلایا۔ آزاد نے سودا کے حسب ذیل شعر سے ایجاد کی تذکیر ثابت کی:

بانے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے (کذا)
نُسخے میں معجونِ زر انباد ہے

(ص ۱۶۳)

Scanned by CamScanner

اس پر تنہا نے حاشیہ لکھا ہے کہ اس شعر سے ایجاد کا مذکر ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ "کا" کی جگہ "کی" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ تنہا نے یہ دھیان نہیں دیا کہ شعر کا متن غلط ہے۔ مندرجۂ بالا متن سے شعر کا وزن، فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہو جاتا ہے جب کہ مثنوی در ہجو حکیم طوث کا وزن مفتعلن مفتعلن فاعلن ہے۔ مندرجۂ بالا شعر کا دوسرا مصرع دونوں اوزان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ پہلے مصرع کا صحیح متن یہ ہے:

بانئ یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے

"دربارِ اکبری" کے ایک اقتباس کے سلسلے میں تنہا حاشیہ لکھتے ہیں:

> تقلیداً ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی ظل اللہ کا لقب گھڑ لیا کہ ایرانیوں نے، کہ وہ بھی آریائی قوم سے ہیں، طبعاً بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے یہ لفظ ایجاد کیا۔ (ص ۱۹۷)

مجھے راجا کے لیے سنسکرت کا ایسا لقب معلوم نہیں جس کے معنی ظل اللہ ہوں۔ اگر ایرانیوں نے یہ لقب ایجاد کیا تو وہ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی کیوں کر ہوا۔ ایران میں تو ہندو نہ تھے۔

اس جلد کے دوسرے اہم اہلِ قلم مولوی ذکاء اللہ، ڈاکٹر سید علی بلگرامی، نذیر احمد، حالی، شبلی، سرشار اور شرر ہیں۔ حاشیہ نشینوں کے نام پہلے ہی لکھے جا چکے ہیں۔ چونکہ تنہا نے مصنفین کے حالات مرتب کرنے میں ذاتی تحقیق نہیں کی، بلکہ ایک آدھ ماخذ سے ڈائجسٹ کیا ہے اس لیے تفصیلی جائزہ قطع کیا جاتا ہے۔

نذیر احمد کے حالات "حیات النذیر" سے لیے ہیں لیکن کہیں کہیں ذاتی تنقید سے بھی کام لیا ہے، مثلاً "امہات الامہ" کے لہجے پر سخت اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بعض مقامات پر تو بقولِ جامعِ "حیات النذیر"، جو مولانا کی مدح سرائی میں نثر کی قصیدہ نگاری کی خدمت کو اپنے اوپر لازم کیے ہوئے ہے، مصنف کا قلم سرپٹ سرپٹ جاتے جاتے پھسل گیا ہے ... راقم نے خود ایک مرتبہ مؤلف سے دریافت کیا کہ یہ فقرے اور آپ کے قلم سے! کہنے لگے کہ بے شک شوخی ہو گئی ہے۔ خیر، یہ ان کا خیال ہے مگر ہم تو اس کو گستاخی کہیں گے۔
>
> (ص ۳۱۱)

مندرجۂ بالا اقتباس میں "حیات النذیر" کی نوعیت پر بڑا دلچسپ انکشاف فقرہ لکھا ہے۔

Scanned by CamScanner

نذیر احمد "امہات الامہ" میں لکھتے ہیں کہ رسول ﷺ مرتے دم تک اشاعتِ اسلام کی فکر میں منہمک رہے:

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
غم کے جانے کا بہت ماتم رہا

اس پر تنہا حاشیہ لکھتے ہیں:

کاش مولانا مصرعِ ثانی کو بدل کر میر صاحب کے شعر کو بدمزہ نہ فرماتے اور صرف مصرعِ اُولے ہی پر اکتفا کرتے ... میر تقی میر کا اصل شعر یہ ہے:

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

(ص ۳۱۴)

اصل شعر یوں بھی نہیں ہے۔ دوسرے مصرع میں "دل" کے بجائے "دم" ہے۔
(ڈاکٹر محمد حسن، انتخاب میر، ۱۹۷۰ء، ص ۵۲)

شبلی کی سوانح میں سر سید سے ان کے اختلافات اور عطیہ فیضی کی طرف کشش کا کوئی ذکر نہیں۔ حالی ہوں یا شبلی یا کوئی دوسرا بڑا مصنف ــــ نمونے اتنے زیادہ ہیں کہ تاریخِ ادب سے کسی طرح میل نہیں کھاتے۔ ایک عنوان مطبعِ منشی نول کشور ہے جس میں "داستانِ امیر حمزہ" کے لیے لکھ دیا ہے کہ یہ فیضی کی تصنیف ہے (ص ۴۹۱)۔ حالانکہ اردو کے بیشتر دفتر اردو کے منشیوں کی تصنیف ہیں، لیکن تنہا انھیں بھی فیضی کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

بالفاظِ دیگر یہ کُل داستان بڑی تقطیع کے سترہ ہزار صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ واقعی علامہ فیضی نے اپنے دماغِ خلاقِ قصص سے کام لے کر یہ داستانِ بے مثل و بے نظیر بڑی عرق ریزی اور جاں کاہی سے تصنیف فرمائی ہے۔

(ص ۴۹۲)

"داستانِ امیر حمزہ" کے دفاتر کے لیے ان کی رائے ہے:

تمام کتاب فضول حکایتوں اور قصوں سے پُر ہے۔

(ص ۴۹۴)

Scanned by CamScanner

اور پھر یہ غیر معمولی تمنا کرتے ہیں:

> علامہ فیضی اگر اپنی طبیعتِ خلاقِ قصص کو ایک انسائیکلوپیڈیا کی
> ترتیب و تدوین میں لگاتے اور اس کا ترجمہ منشی نول کشور صاحب
> چھپواتے تو ملک و زبان کے لیے کار آمد اور مفید مسالا بہم پہنچتا
> (ایضاً)

فیضی سے انسائیکلوپیڈیا تیار کرانے کی خواہش ایسی ہی ہے جیسی لیلیٰ کی ماں کی مجنوں سے ایم اے پاس کرنے کی۔

ص ۵۰۴ پر غالب کے ایک خط سے "بوستانِ خیال" کے ترجمے "حدائق الانظار" کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے مترجم کے بارے میں تذبذب کا شکار ہیں کہ اگر یہ ترجمہ خواجہ امان کا نہیں تو "بوستانِ خیال" کے تین اردو ترجمے سمجھنے چاہییں لیکن مولوی عبدالحق بہ وثوق کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ خواجہ امان صاحب دہلوی کا ہے (ص ۵۰۴)۔

اگر تنہا غالب کے دوسرے خطوط کو دیکھتے تو معلوم ہو جاتا کہ غالب امان ہی کے ترجمے کا ذکر کر رہے ہیں۔ کم از کم "حدائقِ انظار" مطبوعہ ہی کو دیکھ لیتے تو مترجم کی بات صاف ہو جاتی۔

سرشار اور شرر کے بیانات میں تنقید کا پلہ بھاری ہے۔ مصنف نے بہت تفصیل اور غیر جانب داری سے دونوں کا موازنہ کیا ہے۔ ان کا رجحان سرشار کو ترجیح دینے کا ہے لیکن دونوں میں سے کسی کے اسقام کو پوشیدہ نہیں کرنا چاہتے۔ لکھتے ہیں آزاد اور خوجی جیسے آدمی دنیا میں تلاش کیے سے بھی بہ مشکل ملیں گے، لیکن سرشار کا ہر کیریکٹر اپنی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے علاحدہ نمایاں معلوم ہوتا ہے جب کہ شرر کے سب ہیرو ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں، مثلاً منصور کے جسم پر افغانی لباس ہے، عزیز کے جسم پر ترکی، زیاد کے جسم پر عربی، لیکن ان کی باہمی مشابہت اس قدر زیادہ ہے کہ سب سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں (ص ۵۲۲)۔

ص ۲۳-۵۲۲ پر شرر کی خرابیاں گناتے ہیں، ص ۴۶-۵۴۳ پر "فسانۂ آزاد" کے عیوب مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اگر "فسانۂ آزاد" جیسی معجونِ مرکب ہی (کا) نام افسانہ یا ناول ہے تو
> شاید دنیا میں سرشار سے پہلے ان الفاظ کا مفہوم کسی بشر کی سمجھ میں
> نہیں آیا تھا۔ (ص ۵۴۴)

میں نے اپنی زیرِ نظر کتاب میں ادبی تاریخوں کے تحقیقی پہلو کو مدِ نظر رکھا ہے، تنقید نگاری کو نہیں، اس لیے سیر کے اس پہلو پر زیادہ نہ لکھوں گا۔ ہاں تنہا نے تاریخی ناولوں

Scanned by CamScanner

پر جو اعتراض کیا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے۔ لکھتے ہیں:

تاریخی ناولوں پر اصولاً ہمیں ایک اعتراض ہے۔ وہ یہ کہ ان کے ذریعے سے غلط خیالات عوام میں رائج ہو جاتے ہیں اور لوگ خلافِ واقعہ امور کو تاریخی واقعات تصور کرنے لگتے ہیں۔ عوام کو گمراہ کرنے کا الزام اس قدر زبردست ہے کہ ضرورت و دلچسپی کا عذر ہماری نظر میں ہرگز اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔

(ص ۵۲۳)

آگے پھر لکھتے ہیں:

آپ اکثر تاریخی ناول لکھتے ہیں لیکن ان میں بہت سی باتیں ایسی بیان کر جاتے ہیں جن کا تعلق تاریخ سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ عوام الناس ان کو بھی تاریخ سمجھتے ہیں اور اس طرح تاریخ کا غلط علم عوام تک پہنچتا ہے۔ (ص ۵۹۹)

تیسرے دور کا دو ڈھائی صفحوں کا خاتمہ بالکل "آبِ حیات" کے انداز کا خطیبانہ ہے، مثلاً یہ جملے دیکھیے:

لیجیے تیسرے دور کا بھی خاتمہ ہو گیا اور وہ بزرگ صورتیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی تھیں، خاک میں پنہاں ہو گئیں۔

(ص ۶۲۸)

دیکھو ہمارے چوتھے دور کے مصنفین انھی بزرگوں کی بدولت ہماری زبان میں کیا گل کاریاں اور سرطرازیاں کرنے لگے ہیں...

(ص ۶۲۹)

یہ انداز محض تیسرے دور کے خاتمے میں ہے۔ شاید کتاب کی تکمیل کی سرخوشی کا اثر ہے۔ چوتھے دور کے بارے میں سات صفحے لکھے ہیں لیکن چونکہ وہ ۱۹۱۴ء کے بعد ہے، اس لیے محض چند سرسری جملے ہیں۔ ان میں عبدالرحمان بجنوری کے مقدمۂ دیوانِ غالب کو خاص طور سے سراہا ہے۔

میں نے زمانۂ طالب علمی میں "سیر المصنفین" کی دوسری جلد کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے متاثر ہوا تھا۔ اب بہ نظرِ تحقیق جو ان جلدوں کا جائزہ لیا تو ان میں تالیف کی شان پائی، ذاتی تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی پہلی جلد خاص طور سے فورٹ ولیم کالج کے

Scanned by CamScanner

مصنفوں کے بارے میں ہے، لیکن طبعِ اول میں بالکل سرسری ہے، طبعِ دوم میں "اربابِ نثر اردو" کی مدد سے مناسب اضافے کیے ہیں لیکن اس میں جو غیر اہم "بطابہ مصنفین" کو بھر دیا ہے، ان سے کتاب کا پایۂ اعتبار کمزور ہو گیا ہے۔ یعنی تاریخِ تکمیل ۱۹۴۸ء کے لحاظ سے یہ بھی ہلکا ہے۔

رام بابو سکسینہ کی تاریخ کا حصۂ نثر، سید محمد کی "اربابِ نثرِ اردو" اور حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخ اردو" اس سے کئی منزل آگے ہیں۔

دوسری جلد خاص طور سے سرسید اور ان کے رفقا کے بارے میں ہے۔ ان کے حالات بھی مفصل ہیں اور ان کی تحریروں کے نمونے بھی وافر ہیں۔ حالات میں ذاتی تحقیق نہیں۔ نمونوں کو اگر قطع کر کے تین چار صفحوں تک محدود کر دیا جاتا تو کتاب کا حجم بھی کم ہو جاتا اور تناسب و توازن کا حق بھی ادا ہو جاتا۔ اس کتاب کی سب سے بڑی کمزوریاں دو ہیں: ۱۔ محض ایک یا دو ماخذوں کو لے کر کسی مصنف کے حالات لکھ دینا۔ ۲۔ نمونوں کے صفحوں کے صفحے نقل کر دینا۔ تنہا کو اہم اور غیر اہم میں کوئی تمیز نہیں۔ اس کی جلد دوم سے ایک سال قبل رام بابو سکسینہ کی انگریزی تاریخ اور ایک سال بعد اس کا اضافہ شدہ اردو ترجمہ منصۂ شہود پر آتا ہے اور اس کا حصۂ نثر "سیر المصنفین" سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ "سیر المصنفین" "آبِ حیات" اور "یادگارِ غالب" وغیرہ کی گرفت میں ہے جب کہ سکسینہ کی کتاب جدید انداز کی تاریخِ ادب ہے۔

"سیر المصنفین" کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہ اردو نثر کی پہلی تاریخ ہے۔ تنہا نے بغیر کسی نمونے کے یہ منصوبہ اپنے ذمے لیا اور اپنے دور کے لحاظ سے کافی معلومات پیش کر دیں۔ دوسری جلد کے آخری حصے میں تنقیدی فیصلے ان کے اپنے ہیں اور قابلِ توجہ ہیں۔

حواشی

(۱)۔ "نقوشِ سلیمانی"، ص۴۸، بحوالۂ رفیعہ سلطانہ، "اردو نثر کا آغاز اور ارتقا"، ص۳۴۔

(۲)۔ داؤدی، مقدمۂ "رسالۂ گل کرسٹ"، ص۴۴، بحوالۂ ڈاکٹر انصار اللہ، "قاعدۂ ہندی ریختہ عرف رسالۂ گل کرسٹ"، ۱۹۷۳ء، مقدمہ ص۲۰۔

(۳)۔ "رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے"، الہ آباد، ۱۹۶۷ء، ص۲۶۵۔

Scanned by CamScanner

پانچواں باب

شمس اللہ قادری: "اردوے قدیم"

شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" میں ۱۵۵ صفحے متن کے اور ۶۰ صفحے ملحقات کے ہیں۔ ان ۲۱۵ صفحوں میں شمالی ہند کو صرف ذیل کے صفحات دیے گئے ہیں:

"دہلی میں زبان اردو"، ۴ صفحے۔ "شمالی ہند میں نثرِ اردو کی ابتدا"، ایک صفحہ۔ کل پانچ صفحے۔

گویا "اردوے قدیم" بنیادی طور سے دکنی ادب کی تاریخ ہے۔ میں نے اپنی کتاب کے حصار کو اردو ادب کی صرف عمومی تاریخوں تک محدود رکھا ہے۔ ایسی تاریخوں کو اپنے جائزے سے باہر رکھا جو کسی علاقے یا دبستان یا ادارے یا تحریک ہی کے بارے میں ہوں۔ اس پابندی کی وجہ سے میں نے ایسی بنیادی کتابوں کو نہیں لیا۔

نصیرالدین ہاشمی: "دکن میں اردو،" محمود شیرانی: "پنجاب میں اردو،" سید محمد: "اربابِ نثرِ اردو،" ڈاکٹر زور: "اردو شہ پارے،" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری،" ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی: "دلّی کا دبستانِ شاعری"۔

مجھے ان تاریخ ساز تاریخوں سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے ایک کوتاہی کا احساس ہوتا ہے لیکن اگر محدود تاریخوں کو بھی اپنی تنگ بزم میں بار دیتا تو اپنی محدود زندگی میں اس کارِ وسیع کو تمام نہ کر سکتا تھا۔ اسی لیے اصلاً میں نے شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" کو بھی اپنے جائزے میں شامل نہیں کیا تھا، لیکن پھر خیال آیا کہ اگر عبدالقیوم کی "تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل اور "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل کو شامل کرتے ہوئے مجھے کوئی تکلف نہیں ہوا تو "اردوے قدیم" کا دائرہ بھی کم و بیش وہی ہے۔ براے بیت ہی سہی، لیکن اس میں شمالی ہند کا کچھ نہ کچھ ذکر تو ہے ہی۔ پھر یہ اردو ادب کی تاریخوں میں حوالے کی بنیادی کتاب ہے، جگہ جگہ اس کے بیانوں کی تردید یا تائید کرنی پڑتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کا جائزہ بھی لے لیا جائے تو میری کتاب کی جامعیت میں اضافہ ہوگا۔

شمس اللہ قادری ۱۸۷۷ء میں پیدا اور ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے ("تاریخِ ادبیات

Scanned by CamScanner

مسلمانانِ پاکستان و ہند"، لاہور، جلد ۱۰، ص ۱۹۲)۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اردو ہندی کی بحث چھڑی تو قادری نے حامیانِ اردو کے مضامین میں دورِ قدیم کو بالکل مفقود پایا۔ اس پر انھوں نے ایک مضمون "قدیم شعرائے اردو" لکھ کر ۱۹۱۰ء میں "لسان العصر" لکھنؤ کے چار شماروں میں شائع کیا۔ اس میں ۱۰ دکنی شعرا کا تذکرہ تھا۔ اس کے بعد انھیں مزید مواد ملتا رہا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں مدیر "تاج" حیدر آباد نے مضمون کو مکمل کرنے کی فرمائش کی۔ دو مہینے میں مستقل کتاب تیار ہو گئی جسے ۱۹۲۵ء میں "تاج" کے خاص نمبر کی شکل میں چھاپ دیا (مقدمہ ص ۲)۔ قادری، عبدالحی کے "گلِ رعنا" کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ نصیر الدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" کا نہیں جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۲۷ء میں شمس اللہ قادری نے چار مہینے مدراس میں قیام کیا، جہاں مختلف مقامات پر انھیں دکنی مخطوطات ملے۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں انھوں نے اردو سوسائٹی مدراس کے تحت اردو کی ابتدائی تاریخ پر دو لیکچر دیے۔ مزید مواد کے ساتھ انھوں نے کتاب میں نظرِ ثانی کے بعد ۱۹۲۹ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے مقدمے پر ۲ جون ۱۹۲۹ء کی تاریخ پڑی ہے۔ میرے سامنے تیج کمار بھار گو بک ڈپو، وارث نول کشور پریس لکھنؤ کا ۱۹۶۷ء کا ایڈیشن ہے۔

کتاب میں ابواب کی تقسیم نہیں، ذیل کے بڑے اجزا ہیں:

۱۔ تاریخِ زبان اردو ۲۔ سلطنتِ بہمنیہ ۳۔ سلطنتِ گجرات ۴۔ سلطنتِ قطب شاہیہ ۵۔ سلطنتِ عادل شاہیہ ۶۔ شعرائے دکن مغلوں کے عہدِ حکومت میں ۷۔ شعرائے اورنگ آباد ۸۔ دہلی میں زبانِ اردو ۹۔ نثرِ اردو۔

ان کے بعد تین ضمیمے ہیں، پہلا "شیخ سعدی" متعلقہ ص ۱۱۱، دوسرا "طوطی نامہ" متعلقہ ص ۶۵ جس میں طوطی نامے کے مختلف نسخوں کی تفصیل ہے، تیسرا "حسن و دل" متعلقہ صفحہ...، یہاں صفحے کا نمبر درج ہونے سے رہ گیا ہے، ص ۱۱۶ ہونا چاہیے۔ ضمیموں کے بعد کتابیات ہے جس میں کتاب کی اشاعت کا مقام و سنہ بھی دیا ہے۔ کتابیات کی مختلف عنوانات کے تحت گروہ بندی کی ہے۔ اس کے آگے قدیم لفظیات کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیل ہے جو مصنف نے دیکھے۔ ہر مخطوطے کے ساتھ اطلاع ہے کہ وہ کس ذخیرے میں ہے اور کس کی ملکیت ہے۔ اس کے بعد انڈکس ہے جو ۲۸ صفحوں پر محیط ہے۔ آگے قدیم مصنفین کے نمونوں کے ملحقات ہیں۔ یہاں سے نیا نمبر شمار ص ۱ شروع ہوتا ہے۔ نئی نمبر شماری کا جواز نہیں۔ یہاں شروع میں آٹھ صفحوں پر دکنی زبان کی خصوصیات ہیں۔ پھر نمونہ کلام کی زمانی اور اس کے آگے علاقائی تقسیم درج کی ہے۔ آخر میں نظم و نثر کے اقتباسات دیے ہیں، جو ص ۱۳ سے ۶۰ تک ہیں۔

Scanned by CamScanner

بہتر یہ ہوتا کہ تین موضوعات سے متعلق ضمیموں کا مضمون متنِ کتاب میں ان موضوعات کے ساتھ اس میں سمو دیا گیا ہوتا: دکنی زبان کی خصوصیات تمہیدِ کتاب میں دی گئی ہوتیں اور اقتباسات متن میں متعلقہ مصنف کے تذکرے کے بعد ہی ہوتے۔ انھیں علاحدہ کر کے درج کرنا بے اصولی ہے۔ آخر میں صرف کتابیات اور اشاریہ ہوتا۔

ابتدائے کتاب میں ص ۸ کے بعد ایک اندرونی سرورق دیا ہے جسے اندرونی ٹائٹل پیج کہہ سکتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے:

تاریخِ زبانِ اردو
یعنی
اردوے قدیم
جس میں
زبانِ اردو اور اس کی نظم و نثر کی مفصل تاریخ، عہد بہ عہد ترقیوں کا تذکرہ، ابتدائی زمانہ سے بارھویں صدی ہجری کے نصف اول تک مذکور ہے اور اس کے ضمن میں قدیم شعرا اور مصنفین کے صحیح و معتبر حالات ہیں۔

گویا اس کتاب میں اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) تک کا بیان ہے۔ ٹائٹل پیج پر مشمولات کی تفصیل اسی انداز کی ہے جیسے "آبِ حیات" اور "گلِ رعنا" میں ملتی ہے۔ فہرست میں جزوِ اول پر کوئی عنوان نہیں۔ متن میں ص ۵ پر یہ جزو شروع ہوتا ہے وہاں خفی خط میں "تاریخِ زبانِ اردو" لکھا ہے۔ معلوم نہیں مصنف کے عندیے میں یہ اس جزو کا عنوان ہے کہ پوری کتاب کا۔ اس جزو میں ہندوستان میں اردو سے پہلے کی لسانی صورت حال کا ذکر ہے، تاریخی اور سیاسی پس منظر ہے، اردو کے آغاز کے نظریے ہیں اور ان سے متعلق قدیم مصنفین کے بیانات ہیں۔ دراصل اس جزو کو دو ابواب، "لسانی پس منظر" اور "تاریخی پس منظر" میں بانٹ دینا چاہیے تھا۔ اس جزو میں ابتدا میں وبیر کی تحقیقات دی ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں ۲۰ سے زیادہ پراکرتیں بولی جاتی تھیں جن میں ذیل کی پانچ زیادہ مشہور اور ممتاز تھیں:

۱۔ پالی، ۲۔ جَینا پراکرت، جس میں جینا مرہٹی بھی شامل ہے، ۳۔ مہاراشٹری، ۴۔ سوراسینی، ۵۔ مگدھی (ص ۶-۵)۔

اب وبیر کہیں کہ کوئی اور، چھٹی صدی عیسوی میں پالی نہیں بولی جاتی تھی۔ جَینا پراکرت سے ان کی مراد آردھ ماگدھی ہو سکتی ہے کہ اس میں جینیوں کی مذہبی کتابیں ہیں،

Scanned by CamScanner

لیکن اس میں جھنا مرہٹی کہاں سے آ گئی۔ قادری کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ چار دراوڑ زبانوں کا تورانی السنہ سے تعلق تھا (ص۶)۔ اردو کے آغاز کے لیے انھوں نے محمد حسین آزاد کی تقلید کی ہے، چنانچہ عنوان دیتے ہیں، "اردو کا منبع و مخرج برج بھاشا ہے،" (ص۶)۔ لکھتے ہیں کہ مسلمان فاتحوں کی زبان اور برج بھاشا کے میل سے ایک جدید زبان بنی، جو مغلیہ عہد میں زبانِ اردو کہلائی۔ یہی بات پھر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے، جس نے اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔ بعد کی لسانی تحقیقات نے یہ خیال باطل ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا مخرج برج بھاشا ہے۔ محمود شیرانی، مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری نے اردو اور برج کے بنیادی اختلافات آشکارا کیے۔ شیرانی کی "پنجاب میں اردو" ۱۹۲۵ء میں شائع ہو گئی تھی۔ شمس اللہ قادری نے "اردوے قدیم" کے ۱۹۲۹ء کے ایڈیشن میں بھی شیرانی کی راے سے استفادہ نہیں کیا۔

اس کے آگے وہ اردو کی ابتدا کے بارے میں قدیم مصنفین کے بیانات کا خلاصہ دیتے ہیں۔ ان میں سرسید، میرامن، نساخ نیز مستشرقین بیمس، گل کرسٹ، کوبروک اور ڈاکٹر وِنٹرز کی رائیں درج کرتے ہیں۔ ص۲۱ پر یہ جو لکھتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان اور ان کے معاصر ابو عبداللہ الکتی نے ہندی دیوان مرتب کیے، یہ غیر مصدقہ ہے۔ ہندی سے مراد کوئی دوسری ہندوستانی زبان مثلاً پنجابی رہی ہوگی۔ مورخینِ اردو کی یہ کمزوری ہے کہ کسی قدیم مصنف کی ہندی یا ہندوی تصنیف کا ذکر ملتا ہے تو جھٹ اسے اردو سمجھ لیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ چونکہ متعلقہ اہلِ قلم مسلمان تھا اس لیے اس کے اظہار کی ہندی یا ہندوی، دراصل اردو، رہی ہوگی۔ یہ محض مغالطہ ہے۔

قدما کے سنین میں مختلف کتبِ تواریخ میں کافی فرق ملتا ہے۔ یہاں ایسے چند اختلافات کی طرف توجہ دلائی ہے، معلوم نہیں قادری درست ہیں کہ دوسرے مصنفین؟ قادری نے "آئینِ اکبری" کے حوالے سے شیخ فرید گنج شکر کا سنہ وفات ۶۶۸ھ درج کیا ہے (ص۲۲)، لیکن مولوی عبدالحق نے ۶۶۴ھ لکھا ہے ("اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"، ص۱۳)۔ یہی مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں لکھا ہے اور اپنی تائید میں نساخ کا کہا ہوا مادۂ تاریخ "جامع الحسنات" بھی درج کیا ہے۔ ان شواہد سے ۶۶۴ھ صحیح تر معلوم ہوتا ہے۔ قادری نے شاہ قطب عالم کا سنہ وفات ۸۵۷ھ لکھا ہے (ص۲۳)، جب کہ مولوی عبدالحق نے ۸۵۰ھ (ابتدائی نشوونما، ص۲۲)۔ قادری نے ص۲۴ پر شیخ وجیہ الدین گجراتی کا سنہ ولادت ۹۱۱ھ دیا ہے، لیکن مولوی عبدالحق نے ص۳۰ پر اور جمیل جالبی نے ۹۱۰ھ درج کیا ہے (تاریخ، جلد اول، ص۱۰۰)۔ قادری نے سید شاہ ہاشم علوی گجراتی کے اقوال و اشعار

Scanned by CamScanner

کے مجموعے کا نام "مقصود العاشقین" لکھا ہے، (ص ۲۵)، جب کہ مولوی عبدالحق نے "مقصود المراد" (ابتدائی نشوونما، ص ۳۲)۔ "اردوے قدیم" ص ۲۷-۲٦ پر کبیر کے بہت سے دوہے دیے ہیں۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ کبیر کے کلام میں الحاق کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا۔

ص ۳۰ پر امیر خسرو کا سنہ ولادت ٦۵۳ھ اور تاریخ وفات ۱۹ ذی قعدہ ۷۲۵ھ دی ہے جب کہ ظ۔ انصاری نے "خسرو شناسی" میں سنہ ولادت ٦۵۱ھ اور تاریخ وفات ۱۸ شوال ۷۲۵ھ درج کی ہے (ص ۱۲، ص ۳۰)۔ جہاں تک سنہ ولادت کا تعلق ہے نورالحسن ہاشمی نے علی گڑھ تاریخ ادب (ص ۱۷۴) میں اور جمیل جالبی نے اپنی تاریخ حصہ اوّل (ص ۲۷) میں ۱۲۵۳ء لکھا ہے جو ٦۵۱ھ کے مطابق ہے، ٦۵۳ھ کے نہیں۔ تقی اوحدی نے اپنے تذکرے میں لکھا تھا کہ خسرو کا ہندی کلام فارسی کلام سے زیادہ ہے۔ قادری نے بجا تبصرہ کیا کہ یہ بیان ایک افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا (ص ۳۰)، لیکن خود انھوں نے خسرو کے ہندی کلام کو نقل کرتے وقت اس کی صفائیِ زبان پر توجہ نہ کر کے اس کی اصلیت پر شبہہ نہیں کیا، حالانکہ اب صورت یہ ہے کہ خسرو سے منسوب ہر ہندی شعر مشکوک ہے۔ قادری اس ریختے تک کو بے دھڑک خسرو سے منسوب کر دیتے ہیں ع:

در غم ہجر تو کمر ٹوٹا ہے

(ص ۳۱)

لیکن قادری نے معرکے کا انکشاف کیا اور اسپر نگر کے ایک مضمون مؤرخہ ۱۸۵۴ء کی خبر دی۔ اس میں سے کئی چیستان نقل کیے (ص ۳۲-۳۰)۔ اس مضمون کا اب کہیں سراغ نہیں ملتا، "اردوے قدیم" کا بیان ہی اس کے وجود کا واحد ماخذ ہے، لیکن قادری کو اسپر نگر کے منقولہ کلام کی صفائیِ زبان کو دیکھ کر ٹھٹکنا چاہیے تھا۔

لسانیات، تاریخی پس منظر اور ابتدائی اردو نمونوں کے ملے جلے جزو کے بعد قادری ص ۳۴ سے باقاعدہ تاریخ ادب شروع کرتے ہیں۔ عنوان ہے، "سلطنت بہمنیہ۔" اس میں پھر ص ٦ والی بات دہراتے ہیں کہ مرہٹی خالص آریائی زبان نہیں، بلکہ آرین اور پارتھین زبانوں کی آمیزش سے بنی (ص ۳۹)۔ ظاہر ہے، مرہٹی کو غیر آریائی کہنا کسی طرح درست نہیں، لیکن وہ یہ درست لکھتے ہیں کہ علاءالدین خلجی کے وقت میں دکنی، اردو سے جداگانہ زبان نہیں تھی، لیکن سو سال میں فرق ہو جانے سے دونوں زبانیں ایک دوسرے سے ممیز ہو گئیں، ہندوستان کی زبان اردو اور دکن کی زبان دکھنی کہلائی (ص ۳۹)۔ یہ مسلّم کہ شمال کی زبان دکنی سے مختلف ہو گئی لیکن وہ خلجی کے سو سال بعد اردو نہیں کہلائی، یہ نام تو انیسویں

صدی میں جا کر ملا ہے۔

اس کے بعد وہ مختلف علاقائی مرکزوں کے تحت شعرا کا بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ خوب کیا کہ ہر علاقے کے بیان سے پہلے وہاں کے تمام فرماں رواؤں کے جلوس اور وفات کے سنین دے دیے۔ ان میں بہمنی، گجراتی، قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان شامل ہیں۔ اسی طرح ان کا یہ طریقہ بھی قابلِ داد ہے کہ ہر شاعر کے بیان کے بعد اپنے جملہ مآخذ کی تفصیل دے دیتے ہیں۔

اردو نثر کے پہلے مصنف کے طور پر شیخ عین الدین گنج العلم کو شمس اللہ قادری ہی نے اردو ادب کی تاریخ میں متعارف کیا۔ لکھتے ہیں کہ قلعہ سینٹ جارج مدراس میں ان کے دکھنی کے کئی رسالے تھے، جن میں سے تین رسالوں میں فرائض و سنن کے احکامات تھے (ص ۴۱-۴۰)۔ انھوں نے ان رسالوں کا کوئی اقتباس نہیں دیا، چونکہ انھیں کسی اور نے نہیں دیکھا اور اب ان کا کہیں پتا نہیں، اس لیے ان کے وجود پر بھی شبہہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح قادری نے خواجہ بندہ نواز کے لیے لکھا ہے کہ انھوں نے دکنی کے متعدد رسالے تصنیف کیے تھے، جن میں "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ" زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے دکنی کے سات مقولوں کی شرح کسی مرید نے "ہفت اسرار" کے نام سے لکھی (ص ۴۱)۔

واضح ہو کہ بعد کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ خواجہ صاحب نے اردو نثر میں کچھ نہیں لکھا۔ مولوی عبدالحق نے "سیرالمصنفین" کے دوسرے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> "معراج العاشقین" میں نے ہی مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کے دیباچے میں میں نے اپنا شبہہ ظاہر کیا تھا۔ بعد کی تحقیق سے مجھے قریب قریب یقین ہو گیا کہ یہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے رسالے "شکار نامہ" "معراج نامہ" وغیرہ جو اُن سے منسوب کیے جاتے ہیں، در حقیقت ان کی تصنیف نہیں، ان کے بعض مریدوں یا عقیدت مندوں نے ان کے بعض فارسی رسالوں کا ترجمہ اردو میں کر دیا اور وہ ان کے نام سے منسوب ہو گئے۔ فارسی میں ان کی بے شمار تصانیف ہیں۔ بہت تلاش اور کوشش کی کہ ان میں سے اردو کے کچھ جملے مل جائیں کہ اتنا تو معلوم ہو جائے کہ وہ کبھی کبھی اردو میں بھی کچھ فرماتے تھے، لیکن کچھ نہ ملا۔
>
> (رسالہ "اردو،" جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۷)

Scanned by CamScanner

دکنیات کے زبردست محقق ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے مضمون "کلمۃ الحقائق۔ اردو نثر کا پہلا مستند نقش" ("نوائے ادب،" جولائی ۱۹۷۰ء) میں دعویٰ کیا کہ جانم کے پیش پیش روؤں سے جو نثری رسائل منسوب کیے جاتے ہیں، ان کا انتساب شبہہ سے خالی نہیں۔ خواجہ صاحب کے مرید و خادم سید محمد علی سامانی نے ان کے انتقال کے چھ سال بعد ۸۳۱ھ میں "سیرِ محمدی" لکھی جو اُن پر سب سے مستند کتاب ہونی چاہیے۔ جمیل جالبی توجہ دلاتے ہیں کہ اس میں خواجہ صاحب کی اہم و غیر اہم جملہ تصانیف کی فہرست ہے جو ۳۶ ہیں۔ یہ سب عربی فارسی میں ہیں۔ اردو میں ایک بھی نہیں (مقدمہ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" دہلی ایڈیشن، ۱۹۷۹ء، ص ۴۴)۔

میں نے بھی "سیرِ محمدی" دیکھی۔ ان ۳۶ کتابوں میں پانچ عربی خلافت نامے ہیں، جنھیں تصانیف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کتابوں کی تعداد ۳۱ رہ جاتی ہے۔ بنگلور کے ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے اپنے تحقیقی مقالے "خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل" (نومبر ۱۹۸۲ء) میں ایک ایک رسالے پر بحث کر کے اسے رد کیا۔ میں نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت میں جو "اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک" لکھی ہے اور جو ہنوز شائع نہیں ہوئی اس میں ان سب رسالوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

"معراج العاشقین" کے بارے میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" (حیدر آباد، ۱۹۶۸ء) میں ثابت کر دیا کہ یہ خواجہ بندہ نواز سے بہت بعد کے ایک صوفی مخدوم حسینی کی تصنیف ہے۔ "ہدایت نامہ" اُردو نہ کسی نے دیکھا ہے نہ اب کہیں ملتا ہے۔ جہاں تک رسالہ "ہفت اسرار" کا تعلق ہے اس میں خواجہ صاحب کے محض سات ارشادات ہیں جن کی شرح کسی مرید نے لکھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں ص ۲۰ پر اسے خواجہ صاحب کی نہیں، ان کے کسی مرید کی تصنیف قرار دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب یہ رسالہ ناپید ہے۔ قادری نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں "ہفت اسرار" کے بارے میں کہاں سے معلوم ہوا۔

قادری ص ۴۲ پر عبداللہ حسینی کو خواجہ بندہ نواز کا نبیرہ لکھتے ہیں۔ نبیرہ عام طور سے پوتے کو اور شاذ نواسے کو بھی کہتے ہیں۔ سخاوت مرزا کی تحقیق ہے کہ سید عبداللہ حسینی خواجہ بندہ نواز کے برادرِ نسبتی مولانا ابوالمعالی کے بیٹے تھے، نبیرہ نہ تھے ("تاریخ ادب اردو،" مرتبہ عبدالقیوم، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۷۵۳)۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ مطلع کرتی ہیں کہ "سیرِ محمدی" میں حضرت گیسو دراز کا جو شجرہ دیا گیا ہے، اس میں عبداللہ حسینی کا نام خواجہ صاحب کی نواسی کے شوہر کی حیثیت سے بتایا گیا ہے اور عبداللہ حسینی سید ابوالمعالی کے فرزند بتائے گئے

Scanned by CamScanner

ہیں، "("اردو نثر کا آغاز اور ارتقا،" ص ۱۱۵)۔

قادری کے مطابق عبداللہ حسینی نے رسالہ "نشاط العشق" کا دکنی میں ترجمہ کیا اور اس کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کی لائبریری میں تھا (ص ۴۲)۔ اسٹوارٹ نے "فہرستِ کتب خانۂ ٹیپو سلطان" میں ایک کتاب "نشاط العشق، شرحِ غوثیہ" کی موجودگی کی خبر دی ہے لیکن اس کے مصنف یا مترجم کا نام نہیں ظاہر کیا۔ بعد کا ہر مصنف اس کتاب کا ذکر فہرستِ اسٹوارٹ ہی کے حوالے سے کرتا ہے۔ انھیں کیوں کر معلوم ہوا کہ اس کے مترجم عبداللہ حسینی ہیں۔ بہر حال اب یہ ترجمہ کہیں موجود نہیں، اسے کسی اردو والے نے نہیں دیکھا، اس کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔

قادری نے محمد تقی نظیری فارسی شاعر کا ذکر کیا ہے، جو نویں صدی ہجری کے نصفِ دوم میں بیدر میں تھا۔ یہ مشہور فارسی شاعر نظیری نیشاپوری سے مختلف ہے۔ قادری نے ایک معاصر کتاب سے محمد تقی نظیری کا ایک اردو شعر نقل کیا ہے (ص ۴۲)۔

اگلی فصل شعرائے گجرات کی ہے۔ دوسرے مورخ جہاں مشاہیر شعرا کا محض سنہ وفات لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں قادری ان کا ماہ و یوم بھی دیتے ہیں، مثلاً شاہ بہاء الدین باجن ف ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ، سید شاہ علی الحسینی گاؤں دھنی (علی جیو گام دھنی) ۱۴ جمادی الاخریٰ ۹۷۳ھ، خوب محمد چشتی ۲۴ شوال ۱۰۲۳ھ۔

قادری نے یہ مزید اطلاع دی ہے کہ گام دھنی کا مجموعہ "جواہرِ اسرارِ اللہ" (کذا) ۱۲۴۸ھ میں بمبئی میں طبع ہوا جوان کی نظر سے گزرا ہے (ص ۴۷)۔

امین کی مثنوی "بہرام و حسن بانو" کا دولت نے تکملہ کیا۔ قادری نے اس کی تاریخ کا شعر یوں لکھا ہے:

سنہ یک ہزار اور پنجاہ میں
جمعہ روز شعبان اول ماہ میں

(ص ۴۹)

شعر کا یہ متن بہت صاف اور چست ہے۔ جمیل جالبی نے دوسرا مصرع یوں لکھا ہے:

جمعہ روز ... ربیع ماہ میں

(جلد اول، ص ۲۶۲)

یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگلی فصل سلاطینِ گولکنڈہ کی ہے۔ اس میں مرزا لطف اور میر حسن کے تذکروں کے حوالے سے ابوالحسن تاناشاہ کا یہ وحید اردو شعر نقل کیا ہے:

Scanned by CamScanner

کس در کھول، جاؤں کہاں، مجھ دِل پہ پَل بھراٹ ہے
ایک بات کے ہوں گے سبھی، یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

(ص ۶۲)

تذکرۂ میر حسن میں اس شعر کا متن قدرے اختلاف سے ہے۔ مولوی عبدالحق نے تنہا کی "مرآۃ الشعرا" پر تبصرے میں انکشاف کیا کہ یہ شعر تاناشاہ کا نہیں، بحری کا ہے (رسالہ "اردو"، اکتوبر ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۹)۔ قادری نے وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" پر بہت اختصار کے ساتھ اور سرسری لکھا ہے۔ ص ۶۶ پر سید میراں حسینی کی دکنی نظم "تحفۃ العاشقین" کا ذکر کرتے ہیں جو کوک شاستر منظوم ہے۔ قادری نے انھیں گولکنڈہ کے مشائخ میں سے سمجھ لیا لیکن سخاوت مرزا نے واضح کیا ہے کہ یہ میراں حسینی، سید میراں حسینی درویش سے مختلف ہیں ("تاریخ ادبِ اردو"، مرتبہ: عبدالقیوم، ص ۹-۵۰۸)۔ میراں حسینی کا ماخذ شاہ محمد جامی کی فارسی نظم کوک شاستر ہے (ص ۶۶)۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر مطلع کرتے ہیں کہ "فہرستِ مخطوطاتِ فارسی سالار جنگ لائبریری"، ص ۱۲۲ کے مطابق اس فارسی نظم کا نام "لذت النسا" ہے (۱)۔

میراں حسینی کے بعد ملا قطبی مؤلف "تحفۃ النصائح" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصل فارسی کتاب شیخ یوسف دہلوی نے اپنے فرزند صدرالدین ابوالفتح کی تعلیم کے لیے ۷۹۵ھ میں تصنیف کی (ص ۶۷)۔ معلوم نہیں شمس اللہ قادری کو یہ اندازہ ہے کہ نہیں کہ یوسف دہلوی سے مراد شاہ راجو قتال اور صدرالدین سے مراد خواجہ بندہ نواز ہیں۔ قادری یہ بھی لکھتے ہیں کہ اردو شاعر نے دو تخلص استعمال کیے ہیں، کہیں قطبی، کہیں رازی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق ہے کہ "تحفۃ النصائح" کے مؤلف کا نام قطب اور تخلص زاری (رازی نہیں) ہے۔ جب کہ قطبی ایک اور شاعر ہے جس نے دو نظمیں "مینانامہ" اور "چڑیانامہ" لکھیں (تاریخ، جلد اوّل، ص ۳۸۶)۔ اب صورت یہ ہے کہ انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کے نسخے میں زاری لکھا ہے، جب کہ بقیہ سب جگہ رازی آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں سات نسخے ہیں۔ جن میں سے ایک میں تخلص بہ تحریف "راضی" لکھا ہے (فہرستِ آصفیہ، جلد دوم، ص ۶۴)۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اصلاً تخلص رازی ہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ قطبی اور رازی دونوں تخلص کرتا تھا کیونکہ نظم میں دو مصرع ہیں:

قطبی دھریا امید یو، لایا ہوں سب صاحب نظر
بندیاں میں سب کم تر بندہ، رازی تخلص قطب کا

("اردوے قدیم"، ص ۶۸)

Scanned by CamScanner

دوسرے مصرع کے دوسرے جزو سے صاف ہو جاتا ہے کہ شاعر کا نام قطب(الدین) تھا اور قلص رازی۔ وہ حسبِ ضرورت نام کو بھی قطبی کی شکل میں تخلص کر لیتا تھا۔

ص ۶۹ پر "پھول بن" کی تاریخ ۱۰۶۶ھ اور ۱۰۷۶ھ کے بیچ۔ ۱۰۷۶ھ کو ترجیح دیتے ہیں۔ وجہ یہ مصرع ہے:

اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پر چار

لیکن انھیں جاننا چاہیے کہ بعض نسخوں میں "بیس" کے بجائے تیس لکھا ہے۔ کون جانے کہ کیا درست ہے۔ اس سلسلے میں قادری محمد ابراہیم بیجاپوری کے "انوار سہیلی" کے دکنی نثر کے ترجمے کی تاریخ ۱۱۷۹ھ لکھتے ہیں، (ص ۶۹) حیرت ہے۔ ابراہیم نے یہ ترجمہ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس میں جمادی الاول ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء میں کیا، اور یہ ۱۸۲۴ء میں شائع ہوا۔ قادری نے ابن نشاطی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" کا بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ محض غلط فہمی ہے۔ ابن نشاطی نے کوئی "طوطی نامہ" نہیں لکھا۔ قادری اسٹوارٹ کا حوالہ دیتے ہیں (قادری، ص ۶۹)، لیکن اسٹوارٹ نے "پھول بن" اور "طوطی نامہ" دونوں کے مصنف کا نام Avary لکھا ہے، جو بے بنیاد ہے۔

قادری نے شاہ راجو حسینی ثانی کا سنہ وفات ۱۰۶۳ھ لکھا ہے (ص ۷۰)۔ جالبی نے اپنی تاریخ میں اس سنہ پر مفصل بحث کی ہے۔ وہ توجہ دلاتے ہیں کہ طبعی نے "بہرام و گل اندام" (۱۰۸۱ھ) میں شاہ راجو کو ذی حیات دکھایا ہے، جالبی کی رائے میں بیشتر بیانات کی بنا پر شاہ راجو کا سنہ وفات ۱۰۹۳ھ ہے (جالبی، جلد اوّل، حاشیہ ص ۵۰۷)۔ نوری کے سلسلے میں قادری وضاحت کرتے ہیں کہ دو نوری ہوئے ہیں، ایک نوری اعظم پوری جو اکبر کے زمانے میں تھے اور فیضی کے دوست تھے۔ ان کے ریختے کا مصرعِ ثانی ہے:

بیچارہ نوری نہ کرے ہے، نہ ڈرے ہے

دوسرے شجاع الدین نوری حیدر آبادی ابوالحسن تاناشاہ کے دور میں تھے۔ دتاسی نے ان دونوں کو خلط کر دیا ہے جس کی قادری نے گرفت کی (ص ۷۲-۷۱)۔ قادری محققانہ نظر سے مستشرقین مثلاً اسٹوارٹ، اشپرنگر اور دتاسی کی اغلاط کی جگہ جگہ تصحیح کرتے ہیں، مثلاً اشارہ کرتے ہیں کہ اشپرنگر نے "قصۂ رضوان شاہ و روح افزا" کے مصنف کا نام فائز کے بجائے فائض لکھا ہے (ص ۷۳)۔

اس کے آگے سلطنت عادل شاہیہ کا بیان ہے۔ اس میں عنوان ہے، "سلاطینِ عادل شاہیہ اور زبانِ اردو۔" اس میں لکھتے ہیں کہ سلاطینِ بہمنیہ کے دور میں شاہی دفتروں کی زبان

اردو تھی، یوسف عادل شاہ اور اس کے فرزند اسماعیل عادل شاہ نے فارسی کر دی۔ بعد میں ابراہیم عادل شاہ اوّل نے فارسی کے عوض اردو رائج کر دی۔ اس کی تائید میں قادری خافی خاں اور فرشتہ کے بیانات دیتے ہیں۔ علی عادل شاہ اوّل نے پھر فارسی زبان رائج کر دی، لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں ہوا تو پھر شاہی دفاتر کی زبان اردو ہو گئی (ص ۸۷)۔

بعض اہلِ قلم نے ابراہیم عادل شاہ اوّل کو اور بعض نے ثانی کو یہ اعزاز دیا ہے کہ اس نے دفتروں میں اردو کو رائج کر دیا۔ حیدر آباد کے ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے اپنے تحقیقی مقالے "حیدر آباد میں اردو کی ترقی، تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے،" (حیدر آباد، ۱۹۹۰ء) میں واضح کیا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کے دور میں دفتروں کی زبان اردو نہ تھی۔ فرشتہ نے اس کے لیے لکھا ہے:

دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندی کرد۔

اور خافی خاں نے لکھا ہے:

ابراہیم عادل شاہ دفترِ فارسی کہ بجاے دفترِ ہندوی جدّ و پدرِ او قرار دادہ بودند برطرف نمودہ بہ دستورِ سابق ہندوی مقرّر نمود۔

یہاں ہندی یا ہندوی کو شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر زور نے اردو سمجھ لیا ہے، لیکن مصطفےٰ کمال نے فرشتہ اور دوسروں کے بیانات کی روشنی میں طے کیا کہ فرشتہ نے ہندی یا ہندوی کا لفظ کسی بھی ہندوستانی زبان مثلاً سنسکرت تک کے لیے استعمال کیا ہے۔ ابراہیم کے دفاتر میں فارسی کے علاوہ مراٹھی اور بعض اوقات تیلگو کا بھی استعمال کیا گیا، اردو کا کبھی نہیں۔

(مصطفےٰ کمال، ص ۳۶-۳۰)

قادری لکھتے ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ نے علم موسیقی میں ایک کتاب "نورس نامہ" لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد و ضوابط قلم بند کیے تھے (ص ۸۷)۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنے تحقیقی مقالے میں واضح کیا ہے کہ اس کتاب کو قوانینِ موسیقی یا علم موسیقی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس میں گیت درج ہیں۔ ہر گیت کے شروع میں اس راگ راگنی کا نام ہے جس میں وہ گایا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی ہر راگ کی مفروضہ دیوی یا دیوتا کی قلمی تصویر پیش کر دی ہے اور بس ("اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، الہ آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۲۴۲)۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کی تاریخِ وفات ۲۵ شوال ۹۰۲ھ لکھی ہے (ص ۸۱)۔ دراصل یہ ان کی تاریخِ ولادت ہو سکتی ہے۔ مولوی عبدالحق کو میراں جی کے بیٹے شاہ برہان نے

الدین جانم کا لکھا ہوا میراں جی کا مرثیہ ملا۔ اس میں ۹۰۲ھ، ۹۴ویں سال اور ۲۵ شوال کا ذکر ہے۔ اس سے مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۷ء کے مضمون میں نتیجہ نکالا کہ میراں جی کا انتقال ۲۵ شوال ۹۰۲ھ کو ہوا۔ "شمس العشاق" کے مادۂ تاریخ سے بھی ۹۰۲ بر آمد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "ارشاد نامۂ جانم" کا متن چھپوایا تھا، اس پر مقدمہ لکھا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا۔ اس میں ڈاکٹر زور نے اس کے خلاف کئی دلائل دیے، مثلاً تذکرے متفق ہیں کہ میراں جی علی عادل شاہ کے عہد (۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ) میں بیجاپور تشریف لائے۔ عبدالجبار ملکاپوری نے "تذکرۂ اولیاے دکن" میں ص ۸۳۶ پر میراں جی کا سنہ وفات ۸۷۰ھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ سخاوت مرزا کے پاس "بساتین السلاطین" کا ایک ایسا قلمی نسخہ ہے جس میں علی عادل شاہ اوّل کے عہد کے اہم واقعات کے سلسلے میں لکھا ہے:

ورود میراں جی صاحب در سنہ نہ صد و شصت و شش

ڈاکٹر زور کے دلائل اور "بساتین السلاطین" کے مخطوطے کے پیشِ نظر مولوی عبدالحق بالآخر یہ ماننے پر مجبور ہوئے کہ میراں جی ۹۶۲ھ میں بیجاپور آئے اور ۹۷۰ھ میں انتقال کیا(۲)۔ میراں جی اپنی مثنوی "خوش نامہ" میں لکھتے ہیں:

تھاں کیا شاہ پور ماہیں وہ تو پیارا

جانم کے لکھے مرثیے میں بھی منوّر پور اور شاہ پور کا ذکر آتا ہے۔ دیوی سنگھ چوہان نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ "تاریخِ فرشتہ" کے مطابق علی عادل شاہ اوّل نے اپنی تخت نشینی کی یاد میں قصبۂ شاہ پور کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ پور کا وجود ۹۶۸ھ سے قبل ممکن ہی نہیں تھا۔ جب خود میراں جی نے شاہ پور کا ذکر کیا ہے، تو یہ ان کے سنہ ۹۶۸ھ کے لگ بھگ زندہ ہونے کی دلیل ہے ("کلمۃ الحقائق کا لسانیاتی مطالعہ"، "نوائے ادب"، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۲۹-۲۸)۔

مندرجۂ بالا مرثیے میں ایک شعر ہے:

اربع تسعوا . یو سال ہے، ماہے کوں شوّال ہے
رحلت کیے اس حال ہے، جے کچھ حکم الٰہی کا

تاریخ بست و پنج بود، بسیار گریاں رنج شد
در حال واصل گنج خود، جے کچھ حکم الٰہی کا

"اربع تسعوں" کے معنی ہیں ۹۴۔ اس سے اکثر محققین نے نتیجہ نکالا کہ میراں جی کا وصال ۹۴ سال کی عُمر میں ہوا۔ میرا کہنا ہے کہ یہ سنہ ۹۴ھ یعنی سنہ ۸۹۴ھ کی طرف اشارہ

Scanned by CamScanner

ہے جس کی ۲۵ شوال کو انھوں نے انتقال کیا۔ سال کا ذکر کرتے ہوئے معاصرین صدی کے اعداد حذف کر دیتے ہیں۔ "شمس العشاق" ان کی ولادت کا تاریخی نام ہوگا، جس سے ۹۰۲ھ حاصل ہوتا ہے۔ عموماً تاریخی نام ولادت کا ہوتا ہے، وفات کا نہیں۔

قادری نے میراں جی کی صرف دو نظموں کے نام لکھے ہیں، "گنجِ عرفاں" اور "شہادت التحقیق،" (ص ۸۱)۔ "گنج عرفاں" میراں جی کی کوئی نظم نہیں۔ اس کا کسی اور نے ذکر نہیں کیا۔ جہاں تک دوسری نظم کا تعلق ہے، اسے کوئی "شہادت التحقیق" لکھتا ہے، کوئی "شہادت الحقیقت۔" صحیح نام وہی مانا جائے گا جو خود شاعر نے نظم کیا ہے خواہ وہ قواعدی اعتبار سے چست نہ ہو:

اس نام ہے تحقیق   کن شہادۃ التحقیق

اس لیے اس کا صحیح نام "شہادت التحقیق" ہے اور کچھ نہیں۔ قادری صاحب نے حسبِ رواج ملک خوشنود کی مثنوی کا نام "ہشت بہشت" لکھا ہے (ص ۸۳)۔ سخاوت مرزا نے واضح کیا کہ اس مثنوی کا صحیح نام "جنت سنگار" ہے (تاریخ ادب، مرتبہ عبدالقیوم، ص ۳۸۶)۔ یہی بات جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں لکھی ہے (جلد اول، ص ۲۵۲)۔ قادری نے "خاور نامہ" فارسی کی تاریخ ۸۳۸ھ اور رستمی کی اردو "خاور نامہ" کی ۱۰۵۹ھ لکھی ہے (ص ۵۳)۔ جمیل جالبی نے شیخ چاند کی مرتبہ "خاور نامہ" کو دیکھ کر فارسی کا سنہ ۸۳۰ھ اور اردو کا ۱۰۵۰ھ لکھا ہے جو صحیح ہونا چاہیے۔

قادری نصرتی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس کی تصنیفات میں تین مثنویاں، ایک قصائد کا مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ مثنویوں کے نام ہیں: "علی نامہ،" "گلشنِ عشق" اور "گل دستۂ عشق۔" یہ تینوں کتابیں ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھیں (ص ۸۵)۔ حقیقت یہ ہے کہ اسٹیوارٹ کی "فہرست کتب خانۂ ٹیپو سلطان" کے مطابق وہاں صرف دو مثنویاں "علی نامہ" اور "گلشنِ عشق" تھیں۔ آخرالذکر کے ساتھ عشقیہ نظموں کی ایک اور کتاب "گل دستۂ عشق" مجلد تھی۔ اسٹیوارٹ نے یہ نہیں لکھا کہ یہ بھی نصرتی کی تصنیف تھی۔ دوسروں نے "گل دستۂ عشق" کو اس کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ قرار دیا ہے، لیکن یہ درست نہیں۔ اس نام کی نصرتی کی کوئی کتاب نہیں۔ قادری کو "علی نامہ" کا جو نسخہ ملا اس میں سنہ مذکور نہ تھا۔ انھوں نے قیاس کیا کہ یہ ۱۰۷۱ھ کے بعد کی تصنیف ہے (ص ۸۵)۔ جالبی نے صحیح سنہ ۱۰۷۶ھ لکھا ہے (جلد ۱، ص ۳۳۱)۔ قادری لکھتے ہیں کہ "گلشنِ عشق" (۱۰۶۸ھ) کے قصے کو فارسی میں عاقل خاں رازی نے مثنوی "مہروماہ" (۱۰۶۸ھ) میں لکھا ہے، لیکن نصرتی نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا، نہ اپنا ماخذ ظاہر کیا

Scanned by CamScanner

(ص ۸۷)۔ اسی صفحے پر قادری نصرتی کا سنہ وفات ۱۰۹۵ھ لکھتے ہیں، لیکن نصیرالدین ہاشمی نے "گلشنِ عشق" کے ایک مخطوطے سے نصرتی کا جو قطعۂ تاریخِ وفات نقل کیا ہے اس سے ۱۰۸۵ھ بر آمد ہوتا ہے (فہرستِ سالار جنگ، ص ۲۰۱)۔

شاہ ملک کی مثنوی کا نام بلوم ہارٹ نے "شریعت نامہ" لکھا ہے۔ قادری نے مناسب تصحیح کی کہ دراصل اس کا نام "احکام الصلوٰۃ" ہے (ص ۸۸)۔ شیخ امین الدین اعلیٰ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ان کے بعض منظوم ارشادات کو مریدوں نے "جواہر الاسرار" کے نام سے جمع کر دیا (ص ۸۹)۔ شاہ امین کے محقق ڈاکٹر حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ انھوں نے بہت تلاش کی لیکن کہیں اس مجموعے کا پتا نہ چلا ("امین الدین اعلیٰ"، ص ۲۲۶)۔ قادری نے شاہ امین کی ایک مثنوی کا نام "مفتاح التوحید" بھی لکھا ہے۔ اس کا کسی نے بھی ذکر نہیں کیا، حسینی شاہد تک نے نہیں۔

قادری نے ص ۸۹ پر مثنوی "روضۃ الشہدا" کے مصنف سیوا کا ذکر کیا ہے۔ اس کا ذکر بہتوں نے کیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا کہ اُس کا نام رام راو تھا۔ یہ نام نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکھنی ہندو اور اردو" (حیدر آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۱۸) میں اور کالی داس گپتا رضا نے اپنے مجموعے "سہو سراغ" (بمبئی، ۱۹۸۰ء، ص ۶۳) میں لکھا ہے۔ عبدالمومن کی مثنوی "عشق نامہ عرف اسرارِ عشق" کا سنہِ تصنیف ۱۰۹۳ھ خود مصنف کے شعر سے اخذ کرتے ہیں (ص ۹۰)۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود مولوی عبدالحق (ابتدائی نشو و نما، ص ۲۶) اور جمیل جالبی (جلد ۱، ص ۳۶۸) نے اس کی تاریخ ۱۰۹۱ھ لکھ دی ہے۔ ہاشمی بیجاپوری کا سنہ وفات مختلف علما نے مختلف لکھا ہے، لیکن قادری سب کا ذکر کر کے صحیح ۱۱۰۹ھ طے کرتے ہیں، جو صحیح ترین معلوم ہوتی ہے (ص ۹۲-۹۱)۔

اگلا عنوان ہے، "شعرائے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں۔" اس میں مقیمی مصنف "چندر بدن و مہیار" کی ایک اور مثنوی "قصۂ سومہار" کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے ابتدائی اشعار بھی دیے ہیں۔ اس کا ذکر اسپرنگر نے اپنی فہرست میں Tale of Somhar کے نام سے کیا ہے۔ دکنیات کی کتابوں میں عموماً اس مثنوی کا ذکر نہیں ملتا۔ قادری نے اس پر لکھا، یہ قابلِ قدر ہے۔ بلوم ہارٹ نے مثنوی "چندر بدن و مہیار" کو عزیز کی تصنیف بتایا ہے اور عزیز کو غواصی کا دوست۔ قادری کی ژرف بیں نگاہ نے اس غلط فہمی کے ماخذ اشعار ڈھونڈ نکالے (ص ۹۵)۔ انھوں نے اسی صفحے پر سید محمد عاجز کی مثنوی "قصۂ ملکۂ مصر" کا ذکر کیا۔ بیلی کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے تصحیح کی کہ اس شاعر کا نام محمد علی نہیں۔ اس نے خود اپنی تصنیف میں نام اور تخلص محمود لکھا ہے ("تنقیداتِ عبدالحق"،

Scanned by CamScanner

ص ۱۵۶)۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے اس کی تائید کرتے ہوئے واضح کیا کہ شاعر نے مثنوی کی ابتدا میں ایک جگہ اپنے لیے عاجز لغوی معنی میں استعمال کیا۔

شیخ داؤد ضعیفی کی مثنوی کا نام "ہدایتِ ہندی" لکھتے ہیں جو اس شعر میں آتا ہے:

جو تاریخ ہجرت ہزار یک سو بیچ

ہدایت ہندی ہوا یو تویج

(ص ۹۶)

جالبی نے اس کا نام "ہدایت الہندی" لکھا ہے (جلد ۱، ص ۶۱۲)۔ قادری کا منقولہ مصرع موزوں نہیں۔ اگر یہاں "ہدایت الہندی" پڑھا جائے تو ہائے مخلوط کے تلفظ کے ساتھ موزوں ہو جاتا ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کے ایک نسخے میں اس کا نام "ہدایت الہندی" ہی دیا ہے (فہرست، جلد دوم، ص ۸۷۷)۔ دوسرے بہت سے شعرا کے احوال کے بعد وجدی کی اہم مثنویوں کو گنواتے ہیں۔ ان میں پہلی کا نام "مخزنِ عشق" لکھا ہے (ص ۱۰۳)۔ چاہیے تھا کہ اسے اس کے زیادہ مشہور تاریخی نام "باغِ جاں فزا" کے تحت درج کرتے۔ وجدی کی دوسری مثنوی "پنچھی باچھا" کی تاریخ کی اچھی بحث کر کے ۱۱۴۶ھ طے کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "ببلیو تھک ڈر مار گن لیاندش کیشل شافٹ" میں اس کا جو نسخہ ہے اس سے ۱۱۱۵ھ میں تصنیف ہونا ظاہر ہوتا ہے، لیکن دوسرے نسخوں سے ۱۱۴۶ھ ہی کا پتا چلتا ہے۔ تاریخ کا شعر ہے:

جب کیا تاریخ کا دل میں حساب

تب ہوا میزان کیا خاصا کتاب

۱۱۴۶ھ

(ص ۱۰۴-۱۰۳)

دراصل "کیا خاصا کتاب" سے ۱۱۴۶ھ اور محض "خاصا کتاب" سے ۱۱۱۵ھ حاصل ہوتے ہیں۔ مصرع کو دیکھا جائے تو "کیا" کو مادۂ تاریخ میں شامل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مغلیہ عہد کے شعرا میں ولی بیجاپوری مصنف "تنبیہ نامہ" کا ذکر کرتے ہیں (ص ۱۰۵)۔ اسی طرح کوئی شاعر صنعتی ہے جس نے ایک ضخیم مثنوی "گل دستۂ عشق" ۱۱۵۹ھ میں لکھی۔ یہ نئے نام ہیں، ان کا ذکر قابلِ قدر ہے۔ شعرائے اورنگ آباد کے عنوان کے تحت ولی کے نام، وطن اور تاریخِ وفات سے متعلق اس وقت تک کے جملہ علما کے بیانات کا خلاصہ دے کر بات ختم کر دی ہے۔ رسالہ "نور المعرفت" کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ ناپید ہو گیا ہے

Scanned by CamScanner

(ص ۱۰۹)۔ واضح ہو کہ بعد میں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اسے دریافت کر کے شائع کر دیا۔
تصحیح کرتے ہیں کہ "تذکرۂ شعرائے دکن" اور "گلِ رعنا" کے مصنفین نے "روضۃ الشہدا" کو
ولی اورنگ آبادی کی تصنیفات میں شمار کیا ہے، لیکن در حقیقت وہ ولی دکھنی (ویلوری) کی
تصنیف ہے (ص ۱۰۹)۔

اب دکن سے نکل کر "دہلی میں زبانِ اردو" پر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ
جس زمانے میں شجاع اور اورنگ زیب لڑ رہے تھے، شاہ جہاں نے ایک خط شجاع کو لکھا۔ یہ
خط کسی طرح اورنگ زیب کے ہاتھ پڑ گیا جس کی بنا پر اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو لکھا کہ
"آپ نے اپنے دستخط سے جو فرمان زبانِ ہندی میں لکھا تھا وہ اس امر پر شاہد ہے..." اس
جملے سے قادری نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاہ جہاں اردو میں مراسلت کرتا تھا (ص ۱۲-۱۱۱)۔
رشید حسن خاں نے اس پورے معاملے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ انھوں نے "منتخب اللباب" سے
صحیح عبارت نقل کی جس میں "خطِ ہندی" کے بجائے "خطِ ہندوی" ہے نیز دستخط خاص
کا فقرہ ہے ہی نہیں۔ رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ سیاسی وجوہ سے شاہ جہاں نے فارسی رسم
خط کے بجائے ہندوی رسم خط میں اگر ایک خط لکھوایا تو اس سے یہ مطلب کیسے نکالا جائے کہ
وہ خط اردو زبان میں تھا ("ادبی تحقیق"، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۵-۳۱۲)۔

اب کچھ ایسے سنین درج کیے جاتے ہیں جو شمس اللہ قادری نے کچھ اور لکھے ہیں،
جمیل جالبی نے کچھ اور چونکہ جالبی کے سامنے بہت سے ماخذ اور جدید ترین مواد تھا، اس لیے
ان کے سنین کو ترجیح دی جائے گی۔

قادری: اردوئے قدیم	جالبی: "تاریخِ ادبِ اردو"
ص ۱۱۴، شاکر ناجی، ولادت ۱۱۶۸ھ	جلد دوم، حصۂ اول، ص ۴۴۵، قریب ۱۱۶۰ھ
شاہ حاتم، وفات ۱۱۹۶ھ	جلد دوم، حصۂ اول ص ۴۳۱، ۱۱۹۷ھ
ص ۱۱۵، قائم، فوت ۱۲۲۰ھ	جلد دوم، حصۂ دوم، ص ۷۶۷، ۱۲۰۸ھ
ص ۱۱۷، میراں جی حسینی (خدانما)، فوت ۱۰۷۰ھ	جلد اول، ص ۳۹۷، ۱۰۷۴ھ
ص ۱۸-۱۱۷، "شرحِ تمہیدات" کا ترجمہ ۱۰۶۹ھ کے حدود میں	جلد اول، ص ۳۹۹، ۱۰۶۶ھ

Scanned by CamScanner

ص ۱۱۸، "شمائل الاتقیا" کا ترجمہ از میراں یعقوب ۱۰۷۸ھ کے بعد، ۱۰۹۸ھ سے دس پندرہ سال پہلے	جلد اول، ص ۵۰۱، ۱۰۸۳ھ

ص ۱۱۴ پر یکرنگ کا نام مصطفےٰ قلی خاں یکرنگ لکھتے ہیں۔ جالبی صراحت کرتے ہیں کہ حاتم نے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں ان کا نام غلام مصطفےٰ لکھا ہے جب کہ دوسرے تمام تذکرہ نگاروں اور خود یکرنگ نے مصطفےٰ خاں ہی لکھا ہے:

مصطفےٰ خاں آشنا یکرنگ ہے

اس طرح یہی صحیح مانا جائے گا (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۶۲-۲۶۱)۔

ص ۱۱۵ پر "نثر اردو" کا عنوان ہے۔ یہاں عین الدین گنج العلم کے رسالوں، خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین"، نیز "نشاط العشق" کا ذکر ہے۔ ان میں پہلے دو مصنفین کے انتساب کی پہلے ہی تردید کر چکا ہوں۔ بقولِ اسٹوارٹ ترجمۂ "نشاط العشق" ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھا، اب اس کا کوئی پتا نہیں۔ واضح ہو کہ اسٹوارٹ نے مترجم کا نام نہیں لکھا۔ قادری نے میراں جی کے دو رسالوں "جل ترنگ" اور "گل باس" کا بھی ذکر کیا ہے (ص ۱۱۶)۔ ان کا نہ نمونہ دیا ہے نہ اور کوئی تفصیل۔ یہ کہیں موجود نہیں، انھیں کسی اور نے نہیں دیکھا۔ ان کے وجود پر ایمان بالغیب لانا ممکن نہیں۔ اسی صفحے پر قادری نے وجہی کی "سب رس" کا سنہِ تصنیف ۱۰۴۴ھ لکھا ہے۔ اس وقت تک یہ کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، اب سامنے آچکی ہے۔ اس کے آخر میں خود مصنف نے لفظو ۔ بس اس کا سنہ ۱۰۴۵ھ قلم بند کیا ہے۔

آگے قادری لکھتے ہیں کہ سید میراں جی حسینی نے عین القضاۃ ہمدانی کی عربی کتاب "تمہیدات" کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا (ص ۱۱۷)۔ اردو مترجم کا مشہور نام میراں جی خدانما ہے۔ دکن میں بہت سے میراں جی ہوئے ہیں، اس لیے لقب خدانما لکھنا ضروری تھا۔ یہ بھی واضح ہو کہ خدانما نے براہِ راست عربی سے ترجمہ نہیں کیا۔ خواجہ بندہ نواز نے عربی کتاب کی فارسی میں شرح لکھی اور خدانما نے فارسی شرح کا ترجمہ کیا (جالبی، جلد ۱، ص ۹۹-۴۹۸)۔ خدانما کی کتاب کو "ترجمۂ شرحِ تمہیداتِ ہمدانی" کہا جائے گا۔ قادری نے انھیں میراں حسینی کے ایک رسالے کا نام "وجودیہ" لکھا ہے (ص ۱۱۷)۔ جالبی نے اس کا صحیح نام "چہار وجود" درج کیا ہے (جلد ۱، ص ۴۹۷)۔

Scanned by CamScanner

"شمالی ہند میں نثرِ اردو کی ابتدا" کے عنوان سے صرف آٹھ سطریں لکھی ہیں (ص ۱۲۱-۱۲۰)۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

محمد حسین کلیم نے ابنِ عربی کی فصوص الحکم کا ترجمہ کیا۔

حوالہ ہے تذکرۂ "گلشنِ ہند" کا (قادری، ص ۱۲۰)، لیکن "گلشنِ ہند" میں صرف یہ لکھا ہے کہ "فصوص الحکم کا ترجمہ بھی زبانِ ہندی میں کیا ہے،" اس کے بعد ایک نثر کا ذکر ہے، ترجمۂ فصوص الحکم کے لیے یہ نہیں کہا کہ یہ نثر میں ہے۔ قائم نے "مخزنِ نکات" میں لکھا ہے کہ فصوص کا ریختہ نظم میں ترجمہ کرتا تھا لیکن بعض بیماریوں کی وجہ سے باز رہا۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں نیز مصحفی نے "تذکرۂ ہندی گویاں" میں "فصوص الحکم" کے ترجمے کو منظوم ہی کہا ہے۔ نثر کی کتاب اس کے علاوہ تھی اور وہ اب موجود نہیں ہے۔ فورٹ ولیم کالج کا محض نام لے کر شمس اللہ قادری نے کتاب ختم کر دی ہے۔

اس کے بعد تین ضمیمے ہیں۔ پہلے ضمیمے میں فیصلہ کیا ہے کہ ریختہ گو سعدی نہ شیرازی ہے نہ دکنی، بلکہ عہدِ اکبر کا شمالی ہند کا باشندہ ہے۔ واضح ہو کہ علی گڑھ تاریخِ اردو میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اس ریختے کو پنجاب کے ملا شیری سے منسوب کیا (تاریخ، ص ۴۸۸)۔

دوسرا ضمیمہ مختلف زبانوں میں "طوطی نامہ" کے ترجموں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اردو میں یہ پہلی بار کیا گیا ہے۔ میں نے بھی اپنی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" میں ترجموں کی تفصیل دی ہے۔ تیسرا ضمیمہ "قصۂ حسن و دل" کے چار ترجموں کا ذکر کرتا ہے۔ ان کی جامع فہرست ڈاکٹر نورالسعید اختر کے مضمون "قصۂ حسن و دل، مختلف زبانوں میں" مشمولہ "نقوشِ دکن" (بمبئی، ۱۹۷۷ء)، نیز ڈاکٹر منظر اعظمی کی کتاب "اردو میں تمثیل نگاری" (دلی، ۱۹۷۷ء) میں ملاحظہ ہو۔

ضمیموں کے بعد کتابیات بڑے سلیقے سے درج کی ہے جس میں مقامِ اشاعت اور ایڈیشن کا سنہ اشاعت بھی (جو مؤلف نے دیکھا ہے،) ظاہر کیا ہے۔ کتابوں کو تاریخ، تراجمِ صوفیہ، تراجمِ شعرا، تراجمِ عام اور متفرق میں تقسیم کیا ہے۔ تراجم سے مراد تذکرے ہیں۔ سوءِ اتفاق سے "سخنِ شعرا" کو تراجمِ شعرا میں جگہ نہ دے کر تراجمِ عام میں درج کیا ہے۔ پھر انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی کتابوں کی فہرست ہے۔ اُردو میں اس سے پہلے کسی نے اتنی مغربی کتابوں سے استفادہ نہ کیا ہوگا۔ اس میں سہواً اسٹوارٹ کی "فہرست کتب خانۂ ٹیپو سلطان" کا سنہ ۱۸۴۲ء درج کیا ہے۔ میں نے اس فہرست کا ۱۸۰۹ء کا ایڈیشن دیکھا ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ فہرست دوبارہ طبع نہیں ہوئی۔

پھر "قدیم تصنیفات" کے عنوان سے قدیم کتابوں کے مخطوطات اور چند پرانے

Scanned by CamScanner

ایڈیشنوں کی تفصیل دی ہے۔ اس سے کئی دکنی کتابوں کے ان قدیم ایڈیشنوں کا پتا چلتا ہے جو عام طور سے معروف نہیں، مثلاً "پنچھی باچھا"، "جواہر الاسرار آکہ" (کذا) از شاہ علی جیو گام دھنی، دیوانِ ولی، "روضۃ الشہدا"، "قصۂ بہرام و حسن بانو" از امین و دولت، "قصۂ چندربدن و ... "قصۂ سیف الملوک" از غواصی، "قصۂ ملکۂ مصر" از عاجز، "گل دستۂ عشق" از صنعتی، "گنجِ عرفاں" از شمس العشاق، "من لگن" از بحری، "ہدایتِ ہندی" از ضعیفی، "یوسف زلیخا" از امین گجراتی۔ ان میں سے صنعتی کی کتاب بیسویں صدی میں چھپی، بقیہ سب کے ایڈیشن انیسویں صدی کے ہیں۔ کون جانتا ہے ان ایڈیشنوں کو!

بہت مفصل انڈکس کے بعد ملحقات ہیں، جن میں دورِ قدیم کے مشاہیر شعرا اور نثاروں کی تخلیقات کے نمونے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ قابلِ قدر توصفوں کے ابتدائی تعارف میں دکنی زبان کی خصوصیات ہیں۔ پھر دَور اور علاقوں کے اعتبار سے نمونۂ کلام کی الگ الگ گروہ بندی کی ہے۔ آخر میں نمونۂ کلام ہے جو دکنی کتابوں تک محدود ہے۔

اس کتاب کا جائزہ لینے سے یہ بات اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۹ء کے اعتبار سے شمس اللہ قادری نے جس جدید تحقیقی نظر سے کام کیا ہے وہ اس دور میں عام نہیں۔ اس کے مقابلے میں اسی دور کی "گلِ رعنا"، "دکن میں اردو" اور "پنجاب میں اردو" کو دیکھیے۔ ان میں جدید تحقیقی انداز نہیں۔ ہاں، رام بابو سکسینہ کی تاریخ ضرور مغربی تاریخوں کے انداز پر ہے۔ قادری صاحب نے جس التزام کے ساتھ ہر جگہ اپنے ماخذ کا اظہار کیا ہے، جس طرح سنین پر خصوصی توجہ کی ہے، جس طرح اس وقت تک کے دوسرے اہلِ قلم کے تسامحات کی تصحیح کی ہے، انہیں دیکھتے ہوئے ان کے کارنامے کی داد دینی ہوگی۔ ظاہر ہے، ان کے زمانے میں تاریخِ ادب اور تذکروں کا جو مواد سامنے آیا تھا، قادری اسی سے استفادہ کر سکتے تھے۔ انہیں بعد کی تحقیق کے مقابلے میں کم ارز نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی ان کے یہاں فاش غلطیاں کم سے کم ہیں۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱)۔ "بھوگ بل" از قریشی بیدری۔ مشمولۂ "نقوشِ دکن"، بمبئی، تاریخ ندارد ... ظاہراً ۱۹۷۷ء، ص ۳۶

(۲)۔ مکتوب بہ نام سخاوت مرزا، "مکتوباتِ عبدالحق"، مرتبہ جلیل قدوائی، ص ۴۶۷

(۳)۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں (مرتب)، "لیلیٰ مجنوں" از عاجز، "قدیم اردو عثمانیہ یونی ورسٹی"، حیدر آباد، ۱۹۶۷ء، مقدمہ ص ۶

Scanned by CamScanner

چھٹا باب

رام بابو سکسینہ کی "اردو ادب کی تاریخ" (انگریزی) اور اس کا اردو ترجمہ

مالک رام کے تذکرۂ ماہ و سال کے مطابق رام بابو سکسینہ پیر، ضلع فرخ آباد میں ۲۷ ستمبر ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے اور میرٹھ ریلوے اسٹیشن پر ۳۰ دسمبر ۱۹۵۷ء کو فوت ہوئے(۱)۔ انگریزی میں لکھی ہوئی ان کی "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر"، رام نراین لال، الہ آباد نے ۱۹۲۷ء میں شائع کی۔ اس میں ۳۸۵ صفحے ہیں۔ ابتدا میں رام بابو سکسینہ اور تیج بہادر سپرو کے پیش لفظ ہیں اور آخر میں اشاریہ۔ کتاب کا انتساب سر ولیم سنکلیر میرس، گورنر یوپی کے نام ہے اس کے سرورق پر مصنف کے نام کے ساتھ لکھا ہے:

مصنف موڈرن اردو پوئٹس و اوراقِ پریشاں

اردو ترجمے کے سرورق پر پہلی کتاب کا نام "اردو شعراء زمانۂ حال" لکھا ہے۔ مقدمے میں اطلاع ہے کہ یہ کتاب اشاعت کے لیے تیار ہے۔ میں ان کی ذیل کی مطبوعہ کتابوں سے واقف ہوں جن میں سے پہلی دو انگریزی میں ہیں۔

۱۔ "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر"، ۲۔ "یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین"، ۳۔ "مرقعِ شعرا"، دہلی، ۱۹۵۶ء، ۴۔ "مثنویاتِ میر بخطِ میر"۔

گورنمنٹ ڈگری کالج بیکانیر کے اردو لکچرر محمد معین الدین شاہین راجستھان یونی ورسٹی جے پور سے رام بابو سکسینہ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے ۵ ستمبر ۱۹۹۳ء کے خط میں لکھا: "مجھے رام بابو سکسینہ کی پانچ مطبوعہ کتابیں موصول ہو گئی ہیں، جن میں ان کا مجموعۂ کلام بھی شامل ہے۔"

ظاہراً "اوراقِ پریشاں" ان کے مجموعہ کلام کا نام ہوگا۔ "مرقعِ شعرا" کے فلیپ پر درج ہے کہ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں آنے والی ہیں۔

1- Symbolism and Literatrue with special reference to Languages of India (800 pages)
2- Hindi poetry of Urdu and Persian poets (800 pages)

Scanned by CamScanner

3- Modern Urdu literature (3 volumes.)

میرا خیال ہے ان میں سے کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں ان کے مسودے کہاں ہیں۔ تاریخ کے اردو روپ کو اس کا اردو ترجمہ سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا کہنے سے مترجم مرزا محمد عسکری کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا کیونکہ انھوں نے کتاب میں نہ صرف ترمیم کی ہے بلکہ زبردست اضافے بھی کیے ہیں۔ لکھنا چاہیے تھا:

مصنف رام بابو سکسینہ، ترجمہ مع اضافہ و ترمیم از مرزا محمد عسکری۔

مندرجۂ صدر معین الدین شاہین صاحب نے اپنے مکتوب مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء میں مجھے اطلاع دی کہ رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے اردو اور ہندی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، روسی اور فارسی میں بھی ترجمے ہو رہے تھے لیکن یہ مصدقہ نہیں۔ ہندی ترجمہ شائیگ رام شری واستو نے انگریزی سے دو جلدوں میں کیا جو ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔

چونکہ سکسینہ کی تاریخ کا اردو ترجمہ مشرقی امتحانوں کے نصاب میں شامل تھا اس لیے شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے آغا محمد باقر سے کہا کہ وہ سکسینہ کی تاریخ کی تلخیص کر دیں۔ یہ تلخیص "تاریخ نظم و نثرِ اردو" کے نام سے لاہور سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ محض تلخیص نہیں ہے۔ اردو مترجم نے "آبِ حیات" کے بعض بیانات پر جو اعتراض کیا تھا، محمد باقر نے اس کا جواب بھی دیا ہے۔

انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ اس کی ابتدا میں سکسینہ اور سپرو کے انگریزی پیش لفظوں کے ترجمے نیز مرزا محمد عسکری کا طویل "التماسِ مترجم" ہے۔ انھوں نے نظم و نثر کے کے حصوں کو الگ کر دیا ہے۔ یعنی اول نظم کی فہرستِ مضامین اور آخر میں اشاریہ ہے، اس کے بعد حصۂ نثر نئے صفحہ ایک سے، جس کی ابتدا میں فہرست اور آخر میں اشاریہ ہے۔ انگریزی میں پوری کتاب ایک سلسلے میں ہے۔ ابتدا میں جملہ ابواب کی فہرست اور آخر میں پوری کتاب کا اشاریہ ہے۔ انگریزی کتاب میں سکسینہ نے اپنے پیش لفظ میں چار کمیوں کا اعتراف کیا ہے۔

۱۔ فٹ نوٹ نیز اصل مآخذ کے حوالے نہیں دیے۔ کتاب بڑھتی گئی اور حوالے دینا عملاً ممکن نہ رہا۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی دور کر دی جائے گی۔

۲۔ کلام کے نمونے نہیں دیے۔ یہ قصداً ہے جیسا کہ پروفیسر سینٹ بری نے "انگریزی ادب کی مختصر تاریخ" میں کیا ہے۔ نمونوں سے ضخامت بہت بڑھ جاتی۔ ارادہ ہے کہ علاحدہ سے ایک جلد نمونوں اور ان کے انگریزی ترجموں کی شائع کر دی جائے۔

۳۔ آخر میں کتابیات نہیں دی۔ ارادہ ہے کہ علاحدہ سے کتابیات مع تنقیدی نمونوں

Scanned by CamScanner

کے "اردو ادب کے ماخذ" کے عنوان سے چھاپ دی جائے۔
۴۔جدید شعرا کے حالات کی کمی ارادی ہے۔ ان کے لیے علاحدہ سے کتاب تیار کرلی ہے۔

ان دعووں کی کیفیت یہ ہے کہ اردو ترجمے کے آنے کے بعد انگریزی اصل کا کوئی مزید ایڈیشن نہیں نکلا اس لیے حوالے دینے کی بات رہ گئی۔ نمبر ۲ اور نمبر ۳ میں جن کتابوں کا وعدہ کیا ہے وہ کبھی سامنے نہ آسکے۔ نمبر ۴ کی موعودہ انگریزی کتاب "موڈرن اردو پوئٹس" کو ۱۹۲۷ء میں زیر اشاعت دکھایا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں "مرقعِ شعرا" کے فلیپ پر اس کا نام بدل کر "موڈرن اردو لٹریچر" ہوجاتا ہے اور یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۹۵۷ء میں سکسینہ کا انتقال ہوگیا اور یہ کتاب منصۂ شہود پر نہ آسکی۔ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ شاعری اور نثر کے جدید مصنفین کا ذکر بعد کی جلدوں میں کیا جائے گا ("اے ہسٹری آف اردو لٹریچر"، ص ۳۱۲)۔ ظاہر ہے کہ بعد کی جلدیں نہیں آئیں۔ اس طرح ان کی تاریخ ادب میں حوالوں، نمونہ کلام، کتابیات اور جدید شعرا کی کمی رہی۔ اردو ترجمے میں نمونہ کلام دے دیا گیا ہے۔
اردو کے مترجم مرزا محمد عسکری نے انگریزی کتاب کو بہت سراہا ہے کہ مصنف نے انگریزی کے مشہور مورخینِ ادب سینٹس بری اور گاس کی روش پر لکھا ہے۔ مترجم نے یہ واضح نہیں کیا کہ انھوں نے مصنف کے ایما پر ترجمہ کیا کہ ازخود کیا ہے۔ ان کے بجاے وہ راے بہادر کنور بم بہادر شاہ کے ممنون ہیں کہ ان کے اصرار پر اردو کتاب پیش کرسکے۔
انگریزی کتاب کا انتساب گورنر یوپی کے نام ہے۔ عجیب بات ہے کہ اردو ترجمہ نواب حامد علی خاں فرماں رواے رام پور کے نام معنون ہے اور یہ رام بابو سکسینہ ہی نے کیا ہوگا۔ مترجم کو ترجمے میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض امور تذکرہ نویسوں نے فارسی میں بیان کیے تھے، انھیں اردو میں بیان کیا گیا (مثلاً "آبِ حیات" میں)۔ سکسینہ نے انھیں انگریزی میں لکھا۔ مترجم انھیں پھر سے اردو میں لکھتا ہے سو کچھ نہ کچھ تبدیلی ہو ہی جائے گی۔ دوسری دشواری یہ آئی کہ مصنف نے بعض اصل ماخذ سے نقل کرنے میں حذف و اضافہ سے کام لیا ہے۔ مترجم نے انھیں اصل کتاب کے مطابق لکھا ہے مثلاً سکسینہ نے زیادہ تر عیسوی سنین دیے ہیں جب کہ قدما کی تاریخیں ہجری سنین میں ملتی ہیں۔ ہجری سنہ کے مطابق بالعموم دو انگریزی سنین ہوتے ہیں۔ عسکری نے متعدد موقعوں پر عیسوی سنہ کے بجاے ہجری سنہ لکھا ہے جو صحیح تر ہے۔ بقولِ مترجم انگریزی اصل اور اردو ترجمے میں ذیل کے فرق ہیں۔
۱۔اردو میں نمونہ کلام دیا ہے۔
۲۔مصنف نے کسی اصل ماخذ سے نقل کرنے میں کچھ ترمیم کی تھی تو اسے درست

Scanned by CamScanner

کردیا ہے۔

۳۔مترجم کو کہیں مصنف کی رائے سے اختلاف ہے تو فٹ نوٹ میں ظاہر کردیا ہے۔

۴۔ادیبوں کی تصویریں تلاش کرکے شامل کی ہیں جو خاص طور سے دیا نراین نگم، عبدالباری آسی اور کچھ رام بابو سکسینہ نے فراہم کیں۔

محض اسی قدر اعتراف کرنا مترجم کا انکسار ہے ورنہ اس نے کثرت سے مواد کا اضافہ اور کئی جگہ تصحیح بھی کی ہے، بعض مصنفوں کے احوال کی ترتیب بدل دی ہے، تفصیل بعد میں دی جائے گی۔

میں نے اپنی کتاب "تحقیق کا فن"، (لکھنؤ، ۱۹۹۰ء) میں ادبی تاریخ کے باب میں لکھا تھا:

> "آبِ حیات" سے رام بابو سکسینہ کی تاریخ تک ارتقا کی ایک بڑی جست ہے اور رام بابو سکسینہ سے جمیل جالبی تک دوسری۔
>
> (ص ۳۸۷)

میری رائے میں اردو کی ادبی تاریخ کے یہی تین اہم سنگ میل ہیں۔ سکسینہ کی تاریخ، اردو ادب کی پہلی مکمل تاریخ ہے۔ اس سے پہلے کی تاریخیں نظم یا نثر میں کسی ایک تک محدود تھیں۔ تذکروں پر "آبِ حیات" جتنی بڑی ترقی ہے، "آبِ حیات" پر سکسینہ کی تاریخ بھی اتنا ہی بڑا اضافہ ہے۔ یہ توقع رکھتے ہوئے کہ جمیل جالبی اپنی تاریخ مکمل کرلیں گے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ پورے اردو ادب کی تین تاریخیں ہی جامع ہیں: سکسینہ کی تاریخ، "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" میں بہرہ اردو اور جمیل جالبی کی تاریخ۔

۱۹۲۷ء کے زمانے کو دیکھتے ہوئے سکسینہ کی تاریخ کا خاکہ قابلِ تحسین و ستائش ہے، حالانکہ اردو میں ابواب وہی ہیں لیکن ان کے عنوانات میں ترمیم کرکے عسکری نے باہمی کساؤ اور بندھاؤ کو ضرر پہنچایا ہے۔ سکسینہ کا پہلا باب اردو زبان کے آغاز سے متعلق ہے۔ دوسرے کا عنوان ہے، "اردو ادب کا عمومی جائزہ" عسکری نے اس کو "ادبِ اردو کی ترقی کے ابتدائی دور" کہا جو غلط ہے کیونکہ اس جائزے میں اسیر و داغ اور آزاد و حالی، ناول نویسی و ڈراما تک شامل ہیں۔ اس کے بعد سکسینہ نے شاعری کے دبستانوں کو لیا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان ہے، "ابتدائی اردو شاعری کا دکنی اسکول۔" عسکری نے اسے "قدیم شعرائے دکن" عنوان دیا ہے۔ سکسینہ نے اس کے بعد دلی اسکول کو پکڑ کر اسے چار حصوں اور ابواب میں

Scanned by CamScanner

تقسیم کیا۔ عسکری نے دبستان کا لفظ اڑا کر منشاے مصنف کی خلاف ورزی کی ہے۔ سکسینہ اور عسکری کے باب ۵، ۶، ۷ اور ۱۲ کے عنوانات سے یہ فرق واضح ہو جائے گا۔

سکسینہ	عسکری
۵۔ اردو شعرا کا دلی اسکول، حصہ ۱، آرزو اور حاتم کا عہد	۵۔ اساتذۂ دہلی، حصہ اوّل، طبقۂ متقدمین، حاتم اور آبرو کا زمانہ
۶۔ اردو شعرا کا دلی اسکول، حصہ ۲، میر اور سودا کا عہد	۶۔ اساتذۂ دہلی، حصہ دوم، طبقۂ متوسطین، میر اور سودا کا زمانہ
۷۔ اردو شعرا کا دلی اسکول، حصہ ۳، انشا اور مصحفی کا عہد	۷۔ اساتذۂ دہلی، طبقۂ متاخرین، انشا اور مصحفی کا زمانہ
۱۲۔ دلی کا دربار اور اس کے شعرا، حصہ ۴، غالب اور ذوق کا زمانہ	۱۲۔ طبقۂ متوسطین، شعراے دہلی، ذوق اور غالب کا زمانہ

ظاہر ہے کہ باب ۱۲ میں دلی دربار اور اس کے شعرا سے سکسینہ کی مراد دبستان دہلی ہے۔ عسکری کو دبستان سے عار ہے۔ انھوں نے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی تقسیم کی۔ انشا اور مصحفی کو متاخرین کہنا کہاں تک مناسب ہے۔ غضب یہ ہے کہ ان کے بعد ذوق اور غالب کو پھر سے متوسطین میں جگہ دی۔ سکسینہ کے گیارھویں باب کا عنوان ہے۔

The stragglers- Nazir Akbarabadi and Nasir Dehlvi

اردو کا عنوان محض "نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی" ہے۔ سکسینہ نے پہلی بار نظیر اکبر آبادی کی عظمت اور اہمیت پر توجہ دلائی لیکن ان کے ساتھ ایک روایت زدہ کلاسیکی شاعر شاہ نصیر کو نتھی کرنے کی کیا تک تھی۔ شاہ نصیر کوئی اہم یا تاریخ ساز شاعر نہیں۔ اسے بارھویں باب میں غالب اور ذوق کے ساتھ رکھا جا سکتا تھا۔ ہاں نظیر اکبر آبادی اپنے آپ میں ایک ادارہ ہے۔ انگریزی لفظ Straggler کے معنی ہیں ہم راہیوں سے پیچھے رہ جانے والا، بھٹکنے والا۔ نظیر تو اپنے زمانہ سے الگ تھا لیکن شاہ نصیر پر اس اصطلاح کا اطلاق کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ اس خصوص میں انشا نظیر کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ سکسینہ نے اردو نثر کے بھی تین حصے کر کے تین ابواب میں بیان کیا جس سے خاکے میں باقاعدگی آ گئی۔ انگریزی اور اردو کے عنوانات یوں ہیں:

Scanned by CamScanner

عسکری	سکینہ
۱۵- نثرِ اردو کی ابتدا اور ترقی	باب ۱۵- اردو نثر، اس کی ابتدا اور ترقی، حصہ ۱، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ
۱۶- نثرِ اردو کا دورِ متوسط اور دورِ جدید	۱۶- اردو نثر، حصہ ۲، غالب اور سرسید کا عہد
۱۷- اردو ناول کی ابتدا، شرر اور سرشار کا زمانہ	۱۷- اردو نثر، حصہ ۳، اردو ناول کی ابتدا، سرشار اور شرر کا عہد
۱۹- زبانِ اردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق بعض اہل الرائے کی قیمتی رائیں	۱۹- اردو ادب کی ترقی اور اکتسابات

اٹھارواں باب ڈرامے سے متعلق تھا۔ اختتامی جائزے کے طور پر باب ۱۹ کا سکینہ کا عنوان بہتر ہے۔ یوں بھی یہ باب زبان سے زیادہ ادب کے بارے میں ہے۔ مرزا عسکری نے اردو میں ایک طویل ضمیمے کا اضافہ کیا ہے جس میں نوبت رائے نظر، چکبست اور اقبال کے حالات ہیں۔

میری رائے میں تحقیقی مقالے کے خاکے کے طور پر سکینہ کی فہرست ابواب زیادہ کسی اور گٹھی ہوئی ہے لیکن میں یہ پسند کرتا کہ نظم اور نثر کو بالکل دولخت کرنے کے بجائے ہر دور کی نظم کے بعد نثر کا باب آجاتا تاکہ تاریخی ارتقا کا حق ادا ہوجاتا۔ "علی گڑھ تاریخ ادب اردو"، "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند"، جمیل جالبی کی تاریخ اور سیدہ جعفر اور میری مشترک زیرِ طبع تاریخ میں اسی طرح دور بہ دور نظم اور نثر کا بیان پیاپے ہے۔

میرے مشاہدات سے قارئین کو یہ تاثر نہ ہو کہ عسکری سکینہ کی تحریر میں زوال کا باعث ہوئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ عسکری نے بڑی تعداد میں اضافے اور گاہے تصحیحات بھی کی ہیں۔ ذیل میں انگریزی اور اردو نسخوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس میں زیادہ تر عسکری کے اضافوں کی تفصیل ہے۔ شاذ عسکری نے انگریزی کے بعض اندراجات کو حذف بھی کردیا ہے اور کہیں کہیں ترمیم کی ہے۔ ذیل کے بیانات میں انگریزی کتاب کے صفحوں کا نمبر انگریزی اعداد میں اور اردو ترجمے کا اردو اعداد میں دوں گا۔ اس سے امتیاز میں سہولت رہے گی۔

انگریزی ص 5 پر پرتگالی الفاظ کی فہرست دی ہے۔ ان میں ایک لفظ پریگ کی قوسین میں تصریح کی ہے: "چھوٹی کیل" اردو میں ص ۸ پر یہ صراحت حذف ہے۔ "کوچ" کے آگے

Scanned by CamScanner

قوسین میں "صوفہ" چاہیے تھا۔ اسی صفحے پر "کاربین" کو اردو میں "قرابین" لکھنا چاہیے تھا۔ ص 5 کے لفظ Pagar (تنخواہ) کو اردو میں ص۸ پر "پاگر" لکھا ہے، "پگار" چاہیے تھا۔ سکسینہ کے لفظ "چھاپ" کو اردو میں "چھاپہ" لکھا ہے۔ دونوں میں تھوڑے فرق ہے۔

انگریزی ص 7 پر لفظ "ہندوستانی" کو ۱۶۱۶ء میں استعمال کرنے والے شخص Yule کو اردو ص ۱۱ پر سہواً مسٹر یول لکھا ہے۔ انگریزی ص 7 پر عنوان Urdu prosody ہے جس کو عسکری نے ص ۱۲ پر "نظم اردو" کا عنوان دیا۔ صحیح ترجمہ "اردو عروض" ہے۔

انگریزی ص 15 پر دکن کے ریختی گو محمد قادری خاکی کو اردو ص ۲۵ پر محض سید محمد قادری معاصر ولی لکھا ہے، تخلص کے بغیر اس کی شناخت مشکل ہے۔

انگریزی ص 21: سب سے پہلے اردو میں قرآن کا ترجمہ ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ ہوا۔

اردو ص ۳۴: قرآنِ مجید کا سب سے پہلا ترجمہ زبانِ اردو میں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔

انگریزی میں "۱۸۰۳ء کے لگ بھگ" کہا تھا، اردو میں اسے قطعیت سے ۱۸۰۳ء لکھ دیا۔ اردو مترجم نے بارہا ایسا کیا ہے کہ سکسینہ کے "تقریباً" کو حذف کر دیا ہے۔ انگریزی میں "ترجمے" کی تاریخ دی تھی، اردو میں اسے "اشاعت" کی تاریخ قرار دے دیا۔ دونوں لحاظ سے یہ تاریخ غلط ہے۔ شاہ رفیع کے ترجمے کی تاریخ معلوم نہیں۔ شاہ عبدالقادر کی "موضح قرآن" ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء میں مکمل ہوئی۔ دونوں کے ترجمے بہت بعد میں شائع ہوئے۔

عسکری نے ص ۶۱ پر میر حسن کے تذکرے سے لے کر غواصی کے بارے میں ایک اقتباس کا اضافہ کیا۔ سکسینہ نے ص 38 پر "سب رس" کی تاریخ ۱۰۴۰ھ یا ۱۰۴۵ھ کے قریب لکھی ہے۔ اردو ص ۶۱ پر قریب کا لفظ اڑا کر محض ۱۰۴۰ھ یا ۱۰۴۵ھ لکھ دیا ہے۔ اردو ص ۶۳-۶۲ پر "قطبی، جنیدی، نوری، شاہی اور مرزا" کے حالات عسکری کا اضافہ ہیں۔ سکسینہ نے ص 39 پر ایک دکنی مثنوی نگار کا نام Tabai ("طبائی") اور اس کی مثنوی کا نام "قصہ بہرام و گل بدن" لکھا ہے۔ عسکری نے تصحیح کر کے شاعر کا نام "طبعی" اور مثنوی کا "بہرام و گل اندام" لکھا (ص ۶۲)۔

عادل شاہیوں کے بارے میں ص ۶۴ کا پہلا پیرا عسکری کا اضافہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ پورا پیرا لفظ بہ لفظ شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" کے پہلے ایڈیشن سے نقل کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا(۲)۔ اس اقتباس میں دعوا کیا گیا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ نے شاہی دفتروں میں فارسی کے بجاے اردو کو رواج دیا۔ قادری کے اس بیان کا آخری ماخذ "تاریخ فرشتہ" ہے جس کے مطابق فارسی کی جگہ "ہندوی" کو دفتروں میں داخل کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال نے مدلل بحث کے بعد ثابت کیا کہ یہاں ہندوی سے مراد مرہٹی ہے، اردو نہیں

Scanned by CamScanner

(ص ۳۴۔۳۰۔۳۱)۔ ص ۶۵ پر عادل شاہ کے بارے میں خافی خاں کا اقتباس بھی اردو کا اضافہ ہے۔ اس عہد کے شعرا رسی (کذا)، شاہ ملک، امین، سیوا، مومن، ہاشم اور مرزا کے نام بھی انگریزی کتاب میں نہیں۔ "رسی" دراصل "رستمی" ہونا چاہیے۔ اس کے حالات بھی اردو میں اضافہ ہیں (ص ۶۵)۔

اردو میں نصرتی کے حالات میں شمس اللہ قادری اور عبدالجبار خاں ملکاپوری سے لے کر اضافہ کیا ہے۔ سکسینہ نے ص ۴۰ پر نصرتی کا سنہ وفات ۱۰۷۵ھ/۱۶۸۵ء لکھا ہے۔ اردو ص ۶۶ پر ۱۰۹۵ھ درج ہے، صحیح ۱۰۸۵ھ ہے جو ایک قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوا۔ سکسینہ نے ص 40 پر نصرتی کی سینہ کتاب "گل دستۂ عشق" کو غزلوں اور نظموں کا دیوان لکھا ہے۔ عسکری نے بقولِ شمس اللہ قادری اسے مثنوی اور بقولِ دی تاسی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ قرار دیا (ص ۶۷)۔ اسی طرح انھوں نے "گلِ رعنا" کی سند پر نصرتی کے "معراج نامہ" کا اضافہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نصرتی کی کوئی کتاب "گل دستۂ عشق" نہیں ملتی اور نام نہاد "معراج نامہ" دراصل اس کا "قصیدۂ چرخیہ" ہے۔ اسی صفحے پر ہاشمی کی مثنوی "یوسف زلیخا" کا سنہ ۱۰۹۹ھ اردو کا اضافہ ہے۔ سکسینہ نے ص 40 پر ہاشمی کی تاریخِ وفات ۱۱۹۰ھ م ۱۶۷۹ء لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۱۹۰ھ سہوِ طباعت ہے۔ سکسینہ کی مراد ۱۰۹۰ھ ہوگی جو ۱۶۷۹ء کے مطابق ہے۔ عسکری نے ص ۶۸ پر شمس اللہ قادری کی سند پر سنہ ۱۱۰۹ھ لکھا ہے۔

ص ۶۸ تا ۷۱ پر شاہ ملک، شاہ امین، عاجز، بحری، امین، ولی دکھنی (ویلوری)، وجدی اور فقیر اللہ آزاد کے حالات، نیز ص ۷۱ پر "شعرائے اورنگ آباد" کے عنوان کا پورا پیرا اردو کے اضافے ہیں۔ انگریزی ص 48 اور اردو ص ۷۳ پر ولی سے جو "مثنوی دہ مجلس" (دراصل "روضۃ الشہداء") منسوب کی ہے وہ دراصل ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ ص ۷۴ پر اس مثنوی کے دو اشعار اور رسالہ "نور المعرفت" کا ذکر اردو کا اضافہ ہیں۔ ص ۷۴ تا ۷۶ پر ولی کی غزلیات کے اشعار بھی اردو کی دین ہیں۔ ولی کے بعد سے آخرِ باب تک بہ شمولِ حالاتِ داؤد، سراج، باقر آگاہ وغیرہ اردو کا اضافہ ہیں (ص ۷۶ تا ۷۹)۔

باب ۵ میں اردو ص ۸۳۔۸۲ پر عنوان ہے "صنعتِ ایہام"۔ انگریزی میں ص 45 پر کئی جگہ اس لفظ کو Ahyam ("اہیام") لکھا ہے معلوم نہیں یہ سہوِ طباعت ہے یا سہوِ مصنف؟ اس باب کے تمہیدی بیانات میں اردو میں کئی جگہ چھوٹے چھوٹے اضافے ہیں مثلاً ص ۸۱ پر "اردو لغات کی ترتیب"، ص ۸۲ پر "دلّی کے پرانے شاعر"، ص ۸۴ پر "عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ" اور "سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج" کے عنوانات کے بعض اجزا۔ انگریزی ص 49 پر مضمون کے استعمال کا زمانہ ۱۱۵۸ھ کے قریب لکھا ہے۔

Scanned by CamScanner

اردو میں قریب غائب کر کے قطعیت سے ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء لکھ دیا ہے (ص ۹۰)۔
جمیل جالبی نے ۱۱۴۷ھ طے کیا ہے (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۵۸)۔

اردو ترجمے میں بعض تصحیحات بھی ہیں مثلاً سکینہ نے ص 51 پر مرزا مظہر کے شاگردوں میں دو نام امام اللہ خاں اور فقیر شاہ دردامن (Fakir Shah Dardaman) لکھے ہیں۔ اردو ص ۹۳ پر انہیں درست کر کے خواجہ احسان اللہ خاں بیاں اور محمد فقیہ دردمند لکھا ہے۔ اول الذکر کو عام طور سے "احسن اللہ خاں" کہا جاتا ہے لیکن جمیل جالبی نے کئی ماخذ سے ثابت کیا کہ اس کا صحیح نام "خواجہ احسن الدین خاں" ہے (جلد دوم، حصہ اول، ص ۷۰۴، حاشیہ)

انگریزی ص 55 پر میر درد کی عرفیت "میاں صاحب" لکھی ہے۔ اردو میں شاید اسے اس لیے حذف کر دیا ہے کہ یہ درست نہیں۔ انگریزی ص 63-62 پر سودا کی ۱۲ تصانیف گنائی ہیں۔ ان میں آخری دو کو چھوڑ کر بقیہ سب "کلیاتِ سودا" کے مشمولات ہیں، علاحدہ سے کتابیں نہیں۔ نمبر ۱۰ مثنوی "شعلۂ عشق" کی نثر اور نمبر ۱۱ تذکرہ ہے۔ اردو میں ان ۱۱ کو "تصانیف جمیعِ اقسامِ سخن میں" کہا ہے (ص ۱۱۱)۔ اس سے بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ آزاد تصانیف ہیں۔ بہر حال نثرِ "شعلۂ عشق" کے لیے صراحت کی ہے کہ یہ ان کے کلیات میں نہیں اور اردو تذکرے کو ناپید کہا ہے (ص ۱۱۲)۔ بعد کے محققین کی رائے میں سودا نے کوئی تذکرہ لکھا ہی نہیں۔

انگریزی ص 67 پر میر حسن اور ان کے والد میر ضاحک دونوں کا نام میر غلام حسن لکھا ہے۔ یہ بیٹے کا نام تھا، والد کا نہیں۔ اردو ص ۱۲۲ پر ضاحک کا صحیح نام میر غلام حسین دیا ہے۔ اسی صفحے پر سکینہ نے میر حسن کے بارے میں لکھا ہے کہ عربی بالکل نہ جانتے تھے لیکن فارسی پر عبور حاصل تھا۔ اس بیان کا ماخذ مثنوی میر حسن پر میر شیر علی افسوس کے دیباچے کا یہ جملہ ہے:

"اگرچہ علمِ عربی مطلق اسے نہ تھا ہاں فارسیت تھی۔"

(بحوالہ وحید قریشی، "میر حسن اور ان کا زمانہ"، لاہور، ۵۶ء، ص ۲۰۶)

مرزا عسکری نے سکینہ کے بیان کا ترجمہ یوں کیا: "میر حسن عربی کم جانتے تھے مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔" (ص ۱۲۳)۔ ظاہر ہے کہ عربی بالکل نہ جاننے کو عربی کم جاننا نہیں کہہ سکتے۔ عسکری نے "سحر البیان" کا ۱۶ صفحوں کا انتخاب اضافہ کیا ہے، جس کا جواز نہیں۔

میر کے بارے میں سکینہ نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ ص 72 پر لکھتے ہیں کہ

Scanned by CamScanner

"ذکرِ میر" غالباً ناپید ہو گئی ہے لیکن عسکری نے "ذکرِ میر" کی مدد سے کافی اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے "نازک دماغی" (ص ۱۵۷) اور "میر کے کلام میں مایوسی و درد" (ص ۱۶۰) کے عنوانات کے تحت کافی اضافے کیے ہیں۔

انشا کے سلسلے میں سکسینہ نے ص 83 پر فرماں روائے لکھنؤ کا نام سعادت یار خاں لکھا ہے، اردو میں درست نام سعادت علی خاں درج ہے۔ مرزا عسکری نے ایک حاشیہ لکھا ہے کہ یہ درست نہیں کہ انشا مجنوں ہوئے تھے یا ان کی تنخواہ بند ہوئی تھی (فٹ نوٹ ص ۸۴-۱۸۱)۔ عسکری کے مآخذ کمزور ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انشا مجنوں بھی ہوئے تھے، معزول بھی۔ دیکھیے ڈاکٹر عابد پیشاوری کا مقالہ "انشاء اللہ خاں انشا"۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کا خلاصہ اردو میں اضافہ ہے۔ انگریزی میں ص 87 پر "دریائے لطافت" کا سنہ ۱۲۲۲ھ یا ۱۸۰۲ء لکھا ہے۔ اردو میں بھی ص ۱۹۰ پر یہی سنین ٹانک دیے ہیں۔ ہجری سنہ درست ہے لیکن اس کا متوازی عیسوی سنہ ۸-۱۸۰۷ء ہونا چاہیے۔

عسکری نے انشا کی دو نئی قلمی کتابوں "لطائف السعادت" اور "بحرالسعادت" کی دریافت کی اطلاع دی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے "بحرالسعادت"، "دریائے لطافت" کا نقشِ اوّل ہو (فٹ نوٹ ص ۱۸۷)۔ ڈاکٹر عابد پیشاوری کے مقالے "انشاء اللہ خاں انشا" سے معلوم ہوا کہ بقولِ انشا "دریائے لطافت" کے چار نام زیرِ غور تھے جن میں سے ایک "بحرالسعادت" تھا۔ ان چاروں میں "دریائے لطافت" کو چُنا گیا۔ فائق سے متعلق قطعہ جس میں قوافی کے الفاظ کو غیر ضروری طور پر مشدد کیا ہے، اردو کا اضافہ ہے (ص ۱۹۱)۔

سکسینہ نے ص 96-95 پر جان صاحب کا انتقال ۱۸۹۷ء کے آس پاس دکھایا ہے۔ اردو میں "آس پاس" کو ہٹا کر قطعیت سے ۱۸۹۷ء لکھ دیا گیا (ص ۲۰۶)۔ کتب میں عام طور سے ۱۲۹۷ھ ملتا ہے جسے سکسینہ نے ۱۸۹۷ء بنادیا۔ "ریختی" کے محقق ڈاکٹر خلیل احمد کے مطابق صحیح سنہ وفات ۱۸۸۶ء ہے (۳)۔ سکسینہ لکھتے ہیں کہ شاہ عالم نے ایک مثنوی "مضمونِ اقدس" لکھی، یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۰۱ھ نکلتا ہے (ص 96)۔ ان کا مآخذ اسپرنگر ہے۔ عسکری نے صراحت کی کہ اس نام سے محض ۱۱۰۱ھ نکلتا ہے (حاشیہ، ص ۲۰۱)۔ انگریزی میں ص 96 پر مرزا سلیمان شکوہ کی وفات ۱۸۳۸ء میں لیکن اردو میں ۱۸۳۷ء میں لکھی ہے۔ "سوانحاتِ سلاطینِ اودھ" کے مطابق ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۷ء صحیح ہے (بحوالہ عابد پیشاوری: انشاء اللہ خاں انشا، ص ۱۳۷)۔ اردو میں اس باب کے آخر میں قمرالدین منت، ممنون، جعفر علی حسرت، قدرت، بیدار، ہدایت، ثناء اللہ فراق، ضیا، بقا، باقر حزیں، احسن اللہ بیان اور راسخ عظیم آبادی کے حالات اضافہ ہیں (ص ۱۹-۲۱۰)۔

Scanned by CamScanner

انگریزی ص 102 پر ناسخ کا سنہ وفات ۱۵۲۴ھ م ۱۸۳۸ء لکھا ہے، عیسوی سنہ صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۵۲۴ھ تخریبِ طباعت ہے ۱۲۵۴ھ کی۔ عسکری نے "کلیاتِ ناسخ" مطبوعہ ۱۲۶۲ھ کا ترقیمہ نقل کیا ہے جس سے دیوانِ سوم کے دیوانِ دوم میں ضم ہونے پر روشنی پڑتی ہے (فٹ نوٹ، ص۲۲۸)۔ انگریزی میں ص 107 پر امداد علی بحر کا سنہِ ولادت ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء اور اشک کا سنہِ ولادت ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء دیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں یہ اردو میں حذف کردیے گئے ہیں۔ ممکن ہے عسکری کو ان کی صحت پر شبہ ہو۔ سکسینہ نے ص۱۱۱ پر لکھا ہے کہ آتش نے عربی میں علمِ قافیہ پر ایک رسالہ پڑھا۔ اردو میں ص۲۴۲ پر اسے "فنِ عروض" کا رسالہ لکھا ہے۔ سکسینہ کا ماخذ "آبِ حیات" ہونا چاہیے جہاں اس جگہ عربی کے رسالے "کافیہ" کا ذکر ہے جسے سکسینہ نے "قافیہ" سمجھ لیا۔ "کافیہ" کا موضوع عربی نحو ہے۔ رشک کی لغت کا نام "نفس اللغۃ" لکھا ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے میتنہ طور پر سنہِ تالیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے (ص۲۳۷)۔ دراصل لغت کا صحیح نام "نفس اللغۃ" ہے جس سے ۱۲۵۶ھ برآمد ہوتا ہے۔

واجد علی شاہ کے چھ دواوین کے نام سکسینہ اور عسکری نے قدرے مختلف لکھے ہیں۔ میں نے مسعود حسن رضوی کی کتاب "سلطان واجد علی شاہ" (لکھنؤ، ۱۹۷۷ء) سے صحیح صورتِ حال معلوم کی۔ تینوں کے بیانات یوں ہیں۔

سکسینہ ص118	عسکری ص۲۵۸	مسعود حسن رضوی ص۷۷-۱۶۸
۱۔ شارعِ فیض	۱۔ شیوعِ فیض	۱۔ گل دستۂ عاشقاں
۲۔ قرِ مضمون	۲۔ قرِ مضمون	۲۔ بے نام۔ سخنِ اشرف ہوسکتا ہے
۳۔ سخنِ اشرف	۳۔ سخنِ اشرف	۳۔ دیوانِ ثالث بے نام
۴۔ گل دستۂ عاشقانہ	۴۔ گل دستۂ عاشقاں	۴۔ نظمِ نام ور
۵۔ اخترِ ملک	۵۔ ماہِ ملک	۵۔ دیوانِ بے نام (سخنِ اشرف)
۶۔ نظمِ نام ور	۶۔ نظمِ نام ور	۶۔ قرِ مضمون
		۷۔ ملکِ اختر

پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مطابق دوسرا مجموعہ بھی "سخنِ اشرف" ہوسکتا ہے اور پانچواں بھی۔ ملکِ اختر کے لیے لکھا ہے کہ بادشاہ کی کتاب "بنی" اور امیر علی خاں کی کتاب "وزیر نامہ" میں اس کا نام اخترِ ملک لکھا ہے جو سکسینہ نے بھی لکھا۔ مسعود صاحب کے مطابق ایک ضخیم مجموعہ "دیوانِ مبارک" بہ ظاہر چار دیوانوں کا مجموعہ ہے ("سلطانِ عالم واجد علی شاہ"، ص۱۷۷)۔ ایک اور کتاب "مجموعۂ مبارک مسمیٰ بہ شیوعِ فیض" اردو فارسی کا مجموعہ

ہے۔

سکینہ نے ص 139 پر سید ذوالفقار علی مرزا، ان کے بیٹے سید علی مرزا اور پوتے سید مرزا انس مرثیہ گو کے خاندان کا شجرہ دیا ہے جس میں کشتق، عشق، پیارے صاحب رشید وغیرہ شامل ہیں۔ معلوم نہیں کیوں، عسکری نے یہ شجرہ حذف کردیا۔ محذوفات اور بھی کئی ہیں۔ انگریزی ص 120 پر اسیر کی ولادت کا سنہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء درج ہے جو اردو ص ۲۶۰ پر محذوف ٹھہرا۔ امانت کی زندگی کے سنین ۱۲۷۵-۱۲۳۱ھ/۱۸۵۸-۱۸۱۵ء بھی اردو ص ۲۶۱ پر نہیں دیے۔ ممکن ہے ان کی صحت میں شبہ ہو۔

انگریزی ص 182 پر امیر مینائی کے ایک دیوان کا نام "محمد خاتم النبیین ﷺ" لکھا ہے۔ عسکری نے ص ۳۶۱ پر صحیح نام "محامد خاتم النبیین ﷺ" درج کیا ہے۔ انگریزی ص 193 پر جلال کے چار دیوانوں کے نام دیے ہیں۔ اردو میں ص ۳۷۹ پر ان کی تعداد چار درج کر کے ناموں کو حذف کردیا ہے۔ انگریزی ص 193 پر جلال کی "عروض" کی کتاب کا نام "مفید الصفحا" درج ہے جب کہ اردو ص ۳۷۹ پر صحیح صورتِ حال "دستور الفصحا فی عروض پر رسالہ" اور "مفید الشعرا در بابِ تحقیق تذکیر و تانیث" پیش کی ہے۔ یہی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، طبعِ اوّل، علی گڑھ، ۱۹۴۴ء، ص ۳۸۲)۔

سکینہ نے ص 210 پر نئی طرز کے اعتدال پسند شعرا میں جعفر علی خاں اثر اور حامد اللہ افسر کو بھی شامل کیا ہے۔ عسکری نے ص ۴۰۴ پر ان دونوں کو حذف کر کے مولوی محمد اسماعیل کو شامل کیا ہے۔ انگریزی کے ص 215 پر "مسدسِ حالی" کی تاریخ ۱۸۷۹ء اور ص 217 پر "دیوانِ حالی" کی تاریخ ۱۸۹۲ء دی ہے لیکن اردو میں ص ۴۱۰ اور ص ۴۱۴ پر یہ دونوں سنین حذف کردیے جس کا جواز نہیں۔ انگریزی میں سہواً نادر کاکوروی کا بیان دو بار درج ہوگیا ہے: اکبر الہ آبادی سے پہلے ص 227 پر اور پھر بعد میں ص 238 پر۔

اب لیجیے حصۂ نثر کو۔ سکینہ نے ص 240 پر بندہ نواز سے منسوب "معراج العاشقین" کو "ترجمہ" "نشاط العشق" لکھا ہے جو درست نہیں۔ اردو میں ص ۲ پر عسکری نے اس کی یوں تصحیح کی ہے کہ بندہ نواز کے نواسے محمد عبداللہ الحسینی نے "نشاط العشق" کا دکنی میں ترجمہ کیا۔ اردو میں ص ۲ پر "شرحِ مرغوب القلوب" کو شاہ میراں جی شمس العشاق سے منسوب کیا ہے لیکن انگریزی میں نہیں۔ یہ دراصل میراں جی خدانما کی تصنیف ہے۔ سکینہ نے ص 240 پر "جل ترنگ" اور "گل باس" نام کے دو رسالوں کو میراں جی سے منسوب کیا۔ حیرت ہے کہ اردو ص ۲ پر انھیں میراں جی کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی کتابیں قرار دیا ہے جو اور کسی نے نہیں کہا۔ ان رسالوں کے دیکھنے کے مدعی صرف شمس اللہ قادری ہیں اور

Scanned by CamScanner

انھوں نے انھیں میراں جی کی تصنیف بتایا تھا، جانم کی نہیں لیکن چونکہ اب ان رسالوں کا کہیں وجود ہی نہیں اس لیے انھیں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ انگریزی ص240 اور اردو ص ۲ پر نور دریا خاندان کے شاہ محمد قادری کا ذکر ہے۔ انگریزی میں ان کے نام کے آگے سید شاہ میر درست لکھا ہے جب کہ اردو میں سید میر شاہ غلط ہے۔

شیر علی افسوس کی "آرائشِ محفل" فارسی "خلاصۃ التواریخ" کا ترجمہ ہے۔ سکینہ نے آخرالذکر کے مصنف کا نام Sujan Rai لکھا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو ص۹ پر اس نام کی قرأت "منشی سوجن رائے" کی ہے، "سجان رائے" ہونا چاہیے۔ انگریزی ص247 کے مطابق ضیا نخشبی نے ۱۳۳۰ء میں "طوطی نامہ" لکھی، محمد قادری نے اس کا خلاصہ ۹۴-۱۷۹۳ء میں کیا۔ اردو ص۱۰ پر نخشبی کی کتاب کی تاریخ ۱۳۳۰ھ اور قادری کی انگریزی کے مطابق دی ہے۔ دراصل نخشبی کی تاریخ ۷۳۰ھ/۳۰-۱۳۲۹ء ہے۔ قادری کی تاریخ قطعیت سے معلوم نہیں، یہ ۱۰۹۳ھ/۸۲-۱۶۸۱ء ہو سکتی ہے۔

سکینہ نے ص249 پر فارسی "گلِ بکاولی" کے مصنف کا نام عظمت اللہ بنگالی اور تاریخ ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء دی ہے۔ عسکری نے ص ۱۲ پر تصحیح کر کے مصنف کا نام عزت اللہ بنگالی اور سنہ ۱۱۲۴ھ لکھا۔ میری رائے میں صحیح سنہ ۱۱۳۴ھ ہے۔ انگریزی میں ریحان کی مثنوی "گل بکاولی" کے ابواب کو سہوطباعت سے Gul gashni لکھا۔ اردو میں اسے درست کر کے "گلگشت" لکھا ہے۔ اس سے قبل کی ایک مثنوی بکاولی کا تاریخی نام سکینہ نے "تحفۂ مجلس" لکھ کر ۱۱۵۱ھ برآمد کیا (ص249)، لیکن اس سے محض ۹۲۶ھ نکلتا ہے۔ اردو ص۱۲ پر اس کا "تحفۃ المجالس" لکھ کر ۱۰۵۳ھ برآمد کیا۔ واقعی اس نام سے یہی سنہ نکلتا ہے لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ عسکری کے منقولہ اس نام کا ماخذ کیا ہے۔ ان سب کا ماخذ اسپرنگر کی "فہرست کتب خانۂ شاہ اودھ" ہے جس میں اس کا نام "تحفۂ مجلسِ سلاطین" لکھا ہے اور جس سے اسپرنگر کے بقول ۱۱۵۱ھ برآمد ہوتا ہے حالانکہ دراصل محض ۷۸۶ھ نکلتا ہے۔ اسپرنگر کے دیے ہوئے نام اور سنہ میں سکینہ اور عسکری کو ترمیم کا کوئی حق نہیں۔

انگریزی میں نہال چند لاہوری کی ایک مثنوی "عدانِ منظوم" (Idan-i-Manzum) کا بھی ذکر ہے، اردو میں نہیں۔ اس مثنوی کا صحیح نام معلوم نہ ہوسکا۔ ص۲۵۵ پر نہال چند لاہوری کی صرف اردو کو Hindu verse میں بتایا ہے جب کہ ص۲۵۳ پر اسے اردو نظم لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ص۲۵۵ پر ہندو نظم تخریب ہے ہندی نظم کی جس سے مراد ہے اردو نظم۔ ص۲۵۶ پر محمد ابراہیم مقبہ (Maqbah) کی قواعد "تحفۃ الفقنشٹن" کا ذکر ہے۔ اردو ص۱۹ پر مصنف کے نام کا اہم جزو مقبہ محذوف ہے۔ اس کتاب

Library
Anjuman Taraqqi ...

Scanned by CamScanner

کی تفصیل ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے "کتابیاتِ قواعدِ اردو"، (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۹ پر دی ہیں۔

عسکری نے رجب علی بیگ سرور کا سنہ وفات ۱۸۶۷ء م ۱۲۸۴ھ لکھا ہے (ص ۲۴-۲۳)۔ ڈاکٹر نیر مسعود کے مطابق صحیح تاریخ محرم ۱۲۸۶ھ/اپریل-مئی ۱۸۶۹ء ہے (رجب علی بیگ سرور، الہ آباد ۱۹۶۷ء، ص ۳۰۰)۔

انگریزی ص266 پر سید احمد شہید کا سنہ ولادت ۱۷۸۲ء اور اردو ص ۳۴ پر ۱۷۷۲ء درج ہے لیکن ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند"، آٹھویں جلد، ص ۲۳ پر ۱۷۸۶ء/۱۲۰۱ھ لکھا ہے۔ ۱۳۰۱ھ سہوِ طباعت ہے۔ ۱۲۰۱ھ ہونا چاہیے۔ ان کا ماخذ غلام رسول مہر کی کتاب "سید احمد شہید" ہے اس لیے یہ سنین ٹھیک ہونے چاہییں۔ اردو میں ص ۴۴ پر وقار الملک کو علاقت علی گڑھ کا خلیفۂ ثانی لکھا ہے۔ حامد حسن قادری نے اس مذہبی طنز پر سخت اعتراض کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وقار الملک علی گڑھ کے چوتھے سیکریٹری تھے، دوسرے نہیں ("داستانِ تاریخِ اردو"، دوسرا ایڈیشن، آگرہ، ۱۹۵۷ء، ص ۳۶۴)۔

انگریزی ص283-284 پر نذیر احمد کی تیس کتابوں کی فہرست ہے۔ اردو میں ص ۷۵ پر جو نام گنائے ہیں ان میں اور انگریزی میں اختلاف ہے۔ انگریزی میں کتاب نمبر ۱۹ کا نام محض "حکایات" لکھا ہے جب کہ اردو میں پورا نام "منتخب الحکایات" درج ہے۔ مولوی ذکاء اللہ پر انگریزی میں شبلی وغیرہ کے بعد اور اردو میں پہلے لکھا ہے۔ جدید دور میں انگریزی اور اردو میں بہت سے مصنفین کی ترتیب میں فرق ہے۔ انگریزی ص312 پر "مہتاب داغ" اور "ضمیمۂ یادگار داغ" کا سنہ ۱۹۰۹ء درج ہے، اردو ص ۹۱ پر ۱۹۰۲ء۔ محمد علی زیدی کی "مطالعۂ داغ" میں ان مجموعوں کا سنہ نہیں دیا لیکن یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۶ء میں شائع نہیں ہوا۔

سکسینہ نے لکھا ہے: "پروفیسر نامی، پروفیسر ضامن علی اور لکچرر اردو الہ آباد یونی ورسٹی اردو کا بہت مطالعہ رکھتے ہیں (highly read in urdu)، (ص313)۔ اردو میں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: "اسی طرح پروفیسر نامی، پروفیسر ضامن علی الہ آباد یونی ورسٹی کے لکچرر بھی ادبِ اردو میں بڑی بصیرت رکھتے ہیں،" (ص ۹۲)۔

سکسینہ نے ضامن علی کے علاوہ ایک اور لکچرر اردو کا ذکر کیا تھا جو ڈاکٹر حفیظ سید ہو سکتے ہیں۔ عسکری نے ضامن علی ہی کو لکچرر اردو بنادیا۔ استاذی ضامن علی نے اردو ادب کا بہت مطالعہ نہیں کیا تھا۔ نامی فارسی کے استاد تھے۔

Scanned by CamScanner

انگریزی ص313 پر محمد الدین فوق (صحیح نام محمد دین فوق) کی ایک کتاب کا نام "اخبار نویسوں کی حالت" لکھا ہے۔ اردو ص ۵۷ پر صحیح نام "اخبار نویسوں کے حالات" درج ہے۔ یہی رسالہ "نقوش" (لاہور نمبر) بابت فروری ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۰۰ پر ہے۔ اردو ص ۹۵ پر منشی ہر سکھ رائے کو "بھٹ نگری کایستھ" لکھا ہے جب کہ انگریزی ص315 پر صاف صاف "بھٹناگر کایستھ" لکھا ہے۔ کیا عسکری کے لیے Bhatnagar اجنبی لفظ تھا۔

سکسینہ نے ص321 پر "اودھ پنچ" کے ایڈیٹر کا نام سجاد حیدر لکھا ہے لیکن ص322 پر ان کے تفصیلی حالات میں صحیح نام سجاد حسین لکھ دیا ہے۔ انگریزی ص327 پر سرشار کی ایک کتاب کا نام لارڈ ڈفرن کی Letters from Higher Altitudes کا ترجمہ لکھا ہے۔ عسکری نے ص۱۱۰ پر انگریزی کے آخری دو الفاظ کو اردو میں "ہائی لیٹی ٹوڈس" لکھا ہے جو مہمل ہے۔ "لیٹی ٹوڈس" کرۂ ارض کے افقی خطوط کو کہتے ہیں جب کہ ڈفرن نے پہاڑوں کی بلندی کا ذکر کیا ہے۔ سکسینہ نے سرشار کے اس ترجمے کے علاوہ ویلیس کی کتاب "Russia" کے ترجمے کا بھی نام لکھا ہے۔ سرشار کے محقق ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کے مطابق اگر یہ ترجمے کیے گئے ہوں گے تو شائع نہیں ہوئے اور اب ناپید ہیں ("سرشار کی ناول نگاری"، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۸۲)۔

شرر کے حالات اردو میں انگریزی سے مختلف ہیں۔ شرر نے عسکری کو خود نوشت حالات لکھ کر بھیجے۔ اردو میں ص ۱۲۵ تا ۱۳۳ پر یہی درج ہیں، انگریزی سے نہیں لیے۔ سکسینہ نے ص39-338 پر شرر کی ۳۶ کتابوں کے نام دیے ہیں، اردو میں یہ سب نام نہیں۔ انگریزی میں شرر کی تنقید جتنی بھرپور ہے، اردو میں نہیں۔ انگریزی ص343 پر خواجہ حسن نظامی کی کتابوں کے جتنے نام ہیں اردو میں اتنے نہیں۔ شاید آخری حصے میں اردو مترجم کو ضخامت کم کرنے کی فکر ہو گئی تھی اس لیے انھوں نے ڈراما نگاروں کے بھی اتنے ڈراموں کے نام نہیں دیے جتنے انگریزی میں مثلاً بعض کی تعداد

انگریزی	اردو
ص354 حسینی میاں ظریف کے ۳۰ ڈراموں کے نام	ص ۱۴۹ صرف ۴ نام
ص357 آغا حشر کے ۱۸ ڈرامے	ص ۱۵۴ صرف ۹
ص358 حافظ محمد عبداللہ کے ۱۳ ڈرامے	ص ۱۵۳ صرف ۳
ص358 مرزا ظہیر بیگ کے سات ڈرامے	ص ۱۵۳ صرف ۴

Scanned by CamScanner

انگریزی میں زیادہ ڈراما نگاروں کے نام دیے ہیں، اردو میں ان میں سے بعض حذف کر دیے گئے ہیں۔ آخر کتاب میں اردو میں ایک ضمیمے میں نوبت رائے نظر، چکبست اور اقبال کے مفصل حالات ہیں۔ معلوم نہیں نظر کو یہ اہمیت کیوں دی گئی۔ ۲۴ صفحوں کا یہ ضمیمہ عسکری کا اضافہ ہے۔

انگریزی اور اردو نسخوں کے مندرجۂ بالا تقابلی مطالعے سے رام بابو سکسینہ کی اصل کتاب کی بعض اغلاط اور خوبیوں کی نشان دہی کی گئی۔ ذیل میں ایسی فرو گزاشتوں اور خوبیوں کو پیش کیا جاتا ہے جو انگریزی اور اردو دونوں نسخوں میں یک ساں موجود ہیں۔

پہلے فرو گزاشتیں

انگریزی ص 5 پر اردو زبان میں رائج پرتگالی الفاظ کی فہرست دی ہے۔ ان میں سے کم از کم پانچ ایسے ہیں جو اردو میں مستعمل نہیں، ملاحظہ ہو:

۱۔ Afus۔ اردو ص ۸ پر اسے "افسوس (قسم انبہ)" لکھا ہے۔ شاید "الفانسو" مراد ہے۔ ۲۔ Pamfrit (ایک قسم کی مچھلی جو بمبئی میں ملتی ہے)۔ اردو میں اسے "پمپفیرے" لکھا ہے۔ ۳۔ Praig (چھوٹی کیل)۔ ۴۔ Kurs (Cruz) اردو میں اسے "کراس" لکھا ہے۔ ممکن ہے یہ "کراس" بہ معنی صلیب ہو۔ ۵۔ Spats یا Spat۔ اردو میں اسے "اسپیٹ" لکھ کر لباس کے تحت رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ مندرجۂ بالا الفاظ میں سے کوئی اردو میں مستعمل نہیں۔ "چا" کو پرتگالی کہنا غلط ہے۔ یہ بالیقین چینی لفظ ہے۔

انگریزی ص 12 پر ولی کی زندگی کی حدود ۱۷۴۴ء۔۱۶۶۸ء لکھی ہیں دونوں مشکوک ہیں، بالخصوص سنہ وفات۔ ص 84 پر انشا کو بہت سی زبانوں میں ماہر دکھایا ہے جن میں پشتو، مراٹھی، کشمیری بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر عابد پشاوری کا فیصلہ ہے کہ وہ ان زبانوں کے محض دو چار الفاظ یا لہجہ جانتے تھے وہ بھی غلط سلط (انشاء اللہ خاں انشا، ص۱۰۱)۔ انگریزی ص 89 پر جرأت کی مثنوی "ہجو برسات" کو ۶۲ صفحوں کی لکھا ہے۔ ان کے بیان کا مآخذ اسپرنگر کی فہرست ہے۔ دراصل یہ ایک مختصر مثنوی ہے۔ انگریزی ص 91 پر رنگین کی "ایجادِ رنگین" کی بعض حکایتوں کو مبتذل یا فحش کہا ہے۔ میری رائے میں یہ درست نہیں۔

انگریزی ص 92 اور اردو ص ۱۹۹ پر "آبِ حیات" کی تقلید میں لکھا ہے: سلیمان شکوہ پہلے مصحفی سے اصلاح لیتے تھے، بعد میں انشا کو استاد بنایا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی کہ خود مصحفی نے "تذکرۂ ہندی" ص ۱۲۱ پر لکھا ہے کہ انشا کے

کھنے سے ان کا گزر سلیمان شکوہ کے یہاں ہوا ("آزاد بحیثیت محقق"، ص ۶۸)۔ ص 105 پر لکھتے ہیں: "ناسخ نے قصیدے نہیں لکھے۔" اردو کی حد تک صحیح ہے لیکن فارسی کے چار قصیدے ملتے ہیں۔ میں نے انھیں اپنے مجموعے "حقائق" میں شائع کیا ہے۔

ص150 پر مومن کی مثنویوں کو قلق کی مثنوی "طلسمِ الفت"، شوق کی "زہرِ عشق" اور دوسری مثنویوں سے مشابہ قرار دیا۔ تقابل مناسب نہیں۔ "طلسمِ الفت" اور "زہرِ عشق" جنسیت کے لیے بدنام نہیں، ہاں شوق کی دوسری مثنویاں ضرور جنس زدہ ہیں۔ سکسینہ نے "زہرِ عشق" کی تاریخ ۱۲۷۰ھ لکھی ہے۔ صحیح ۱۲۷۷ھ ہے جو ایک قطعۂ تاریخ میں "غمِ دل رُبا" کے مادّے سے ملتی ہے۔ اس کا انکشاف راس مسعود نے "انتخابِ زرّیں" میں کیا۔

ذوق کے بیان میں زیادہ تر "آبِ حیات" سے استفادہ کیا ہے اس لیے اس کی جملہ اغلاط در آگئی ہیں۔ عابد پیشاوری نے اپنی کتاب "ذوق اور محمد حسین آزاد" میں ان کی نشان دہی کی ہے مثلاً معروف کا ذوق کا شاگرد ہونا، شاہ نصیر سے معرکے، پانسو اشعار کی مثنوی "نامۂ جاں سوز" کی تصنیف وغیرہ جو سب آزاد کے تخیّل کی پیداوار ہیں۔

ص 195 پر سکسینہ نے جلال کے مشہور شاگردوں میں ذیل کے نام لیے ہیں: خود ان کے بیٹے کمال، (مرزا ذاکر حسین) یاس، ان کے بیٹے آرزو لکھنوی، احسان شاہ جہاں پوری اور سردار اودھم سنگھ (اردو، ص۳۸۱)۔ انگریزی میں اس کے بعد کے جملے میں کمال ابنِ جلال، آرزو اور احسان کو سب سے ممتاز بتایا ہے۔ یہ اس زمانے کا معیار ہوسکتا ہے۔ آج کمال اور احسان کو کوئی جانتا ہی نہیں۔ مجہول الاحوال سردار اودھم سنگھ تو اردو کی بزم میں بدرنگ معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اپنی کتاب "لکھنؤ کے چند نامور شعرا" (لکھنؤ، ۱۹۷۳ء) میں جلال کے شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام منشی اُدھم سنگھ سردار امرت سری دیا ہے (ص۲۵۸)۔ "خمخانۂ جاوید"، جلد چہارم، ص۱۵۴-۵۵ پر ان کا تفصیلی حال "سردار" تخلص کے تحت دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ "شعر الہند" میں بھی جلال کے تلامذہ میں کمال، احسان اور آرزو کو امتیازی حیثیت دی ہے (ص۳۶۲)۔ کیا سکسینہ نے "شعر الہند" سے استفادہ کیا تھا؟

اب بابِ نثر کو لیجیے۔ ص240 پر ابتدائی دکنی نثر کے بارے میں جو کچھ معلومات بہم پہنچائی ہیں، اس زمانے میں ان سب کو درست لیکن آج ان میں سے بعض کو غلط سمجھا جاتا ہے مثلاً عین الدین گنج العلم کے رسالے کا ذکر یا بندہ نواز اور میراں جی شمس العشاق کے رسالوں کا وجود۔ "آبِ حیات" سے گمراہ ہو کر ص 241 پر "نوطرزِ مرصع" کی تاریخ ۱۷۹۸ء دی ہے۔ صحیح ۱۷۷۵ء ہے۔ اس صفحے، نیز ص244 پر "قصۂ چار درویش" کو میر امن کی

تقلید میں امیر خسرو کی تصنیف لکھا ہے۔ محمود شیرانی نے ثابت کردیا کہ اس کا خسرو سے کوئی تعلق نہیں۔ ص248 پر مذکورہ جوان کے ترجمے "شکنتلا ناٹک" کے ضمن میں یہ وضاحت ضروری تھی کہ جوان کا ترجمہ ڈرامے کے روپ میں نہیں، مسلسل قصے کے طور پر ہے۔

انگریزی ص255 اور ص۱۹ پر "دریائے لطافت" کا سنہ ۱۸۰۲ء دیا ہے۔ صحیح سنہ ۱۲۲۲ھ م ۸-۱۸۰۷ء ہے۔ ص257 پر فقیر محمد گویا کا سنہ وفات ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء دیا ہے، صحیح ۱۲۶۸ھ ہے جو جعفر علی خاں آبادی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے ("گویا، صاحبِ سیف و قلم"، لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ص۱۳۱)۔ ص258 پر رجب علی بیگ سرور کا سنہ ولادت ۲-۱۲۰۱ھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اپنے مقالے میں ۱۲۰۰ھ قیاس کیا کیونکہ سرور نے "فسانۂ عجائب" (۱۲۴۰ھ) کے ابتدائیے میں لکھا ہے: "۴۰ سال جہاں کی سیر کی" سرور کے لیے لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۶ء میں واجد علی شاہ کے درباری شعرا میں بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہ وار داخل ہوگئے (اردو، ص ۲۳)۔ یہ درست نہیں۔ نیر مسعود نے واضح کیا کہ یہ مشاہرہ بلاشرط خدمت تھا۔ کبھی کبھار بادشاہ کے حسب الطلب چوکی خانے میں حاضر ہوجانے کے سوا ان کے ذمے کوئی کام نہ تھا ("رجب علی بیگ سرور"، الہ آباد، ۱۹۶۷ء، ص۹۹)۔

ص268 پر لکھا ہے کہ ۱۸۳۲ء میں فارسی کے بجائے دیسی زبانوں کو عدالتوں کی زبان قرار دے دیا گیا، جس سے اردو کو ایک مرتبہ ملا۔ تاریخ صحیح نہیں۔ حکم چند نیر کے مطابق اس غرض سے ۲۰ نومبر ۱۸۳۷ء کو ایکٹ نافذ ہوا ("اردو کے مسائل"، بنارس، ۱۹۷۷ء، ص۴۲)۔ انگریزی ص279 اور اردو ص ۵۳ پر حالی کی کتاب کا نام "مجلس النسا" لکھا ہے، صحیح "مجالس النسا" ہے۔

معلوم نہیں کیوں "خمخانۂ جاوید" کی ابتدائی تین جلدوں کے سنہ اشاعت میں غلطی کی ہے حالانکہ جلدوں کے سرورق اور آخر کے قطعاتِ تاریخ میں سنہ واضح طور پر لکھا ہے۔ سکسینہ نے جلد اول کا سنہ ۱۹۰۶ء لکھا حالانکہ تاریخی نام سے ۱۳۲۵ھ (۸-۱۹۰۷ء) نکلتا ہے۔ قطعاتِ تاریخ میں صاف ۱۹۰۸ء دیا ہے۔ دوم اور سوم کے سنہ سکسینہ نے ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۵ء لکھے ہیں حالانکہ ان کے باہری سرورق ہی پر ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۷ء نمایاں طور پر لکھا ہے (انگریزی ص311 ، اور اردو ص ۹۰)۔

سکسینہ کے بعض تنقیدی فیصلے مشکوک ہیں۔ وہ بعض غیر اہم ادیبوں کو بڑا قرار دیتے ہیں، مثلاً ص313 پر پروفیسر ضامن علی کو اردو ادب میں بہت پڑھا لکھا قرار دیتے ہیں۔ کسی خان بہادر سلطان احمد کو بہت عظیم ناموں (most eminent names) میں شمار کرتے

Scanned by CamScanner

ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کے لیے لکھتے ہیں: "عظیم ترین لکھنے والوں میں سے ایک، نیز اردو کا محسن"۔ ہاشمی فرید آبادی: "دکن کے ادبی گروہ کا ایک اور عظیم نام جس کے اکتسابات کا معتبر رکارڈ ہے۔" چھپے ص195 پر جلال کے بیٹے کمال اور جلال کے شاگرد احسان شاہ جہاں پوری کو ممتاز قرار دے چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بڑا ادیب نہیں، ظفر علی خاں صحافت میں اہمیت رکھتے ہیں، ادب میں نہیں۔

اسی طرح ص317 پر اس دور کے رسالوں میں "شبابِ اردو" لاہور، رسالہ "اکبر" الہ آباد اور "رسالہ حسن" اور "العصر" حیدر آباد کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ سب غیر اہم پرچے ہیں۔

باب ۱۷ "اردو ناول کی ابتدا" سے متعلق ہے لیکن اس کے کئی صفحوں میں داستانوں، مثلاً "داستانِ امیر حمزہ" اور "بوستانِ خیال" کی تفصیل ہے جو غیر متعلق ہے۔ داستانوں کو ایک علاحدہ باب یا جزو باب دینا چاہیے تھا۔ ان کا یہ بیان بھی محلِ نظر ہے:

> رجب علی بیگ سرور نے اس کا ذوق پیدا کر کے ناول کی ترقی میں کچھ نہ کچھ حصہ ادا کیا۔ اس نے "فسانۂ عجائب" اور بہت سی دوسری داستانیں اور مختصر قصے لکھے۔
>
> (ص320)

اگر "فسانۂ عجائب" نے ناول نگاری کا ذوق پیدا کیا تو "باغ و بہار" نے کیوں نہیں؟ "فسانۂ عجائب" کے بعد تقریباً نصف صدی تک ناول کا فروغ کیوں نہیں ہوا؟ دراصل اس فوق الفطری داستان کو ناول سے کچھ لینا دینا نہیں۔

منشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" کے ناولوں کی فہرست میں تین نام "طرح دار لونڈی"، "پیاری دنیا" اور "حیات شیخ چلی" بھی دیے ہیں (ص۱۰۴)۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے ان کے بارے میں تحقیق کر کے انکشاف کیا کہ "طرح دار لونڈی" ڈراما ہے، ناول نہیں۔ اس کے مصنف مرزا احمد بیگ طرح دار لکھنوی ہیں۔ اس ڈرامے کے دوسرے دو نام "گرمھاؤں، گلگلوں سے پرہیز" اور "آستین کا سانپ" ہیں۔ ناول "پیاری دنیا" ۱۹۰۷-۸ء میں "اودھ پنچ" میں شائع ہوتا رہا۔ اس کی آخری قسط کے آخر میں لکھا ہے:

> اس کا مصنف ایک دنیا دار ہے۔

اس سے یوسف سرمست نے بجا نتیجہ نکالا کہ یہ منشی سجاد حسین کی تصنیف نہیں۔ "حیات شیخ چلی" بھی ناول نہیں نیز اس کے مصنف سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" نہیں بلکہ سجاد حسین انجم کسمنڈوی مولف "نشتر" ہیں(۴)۔ ص۱۰۵ پر نواب سید محمد آزاد کی تصنیف "نوابی دربار" کو ناول ظاہر کیا ہے۔ یوسف سرمست نے تصحیح کی کہ یہ ناول نہیں، ڈراما

Scanned by CamScanner

ہے(۵)۔

اردو ترجمے میں سکینہ طور پر شرر کے بیان کردہ خود نوشت حالات کے طور پر ان کی تاریخ ولادت ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ لکھی ہے (ص۱۲۵)، لیکن علی احمد فاطمی نے اپنے مقالے "عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار" (لکھنؤ، ۱۹۸۶ء) میں خود شرر کے الفاظ نقل کیے ہیں:

> بروز پنج شنبہ ۱۷ جمادی آخر ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو میں پیدا ہوا۔ (فاطمی، ص۱۳۳)

گویا عسکری صاحب نے تین دن کا فرق کر دیا۔

یہ خیال رہے کہ رام بابو سکسینہ کی کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی تسوید اس سے پہلے کے دو تین برسوں میں ہوئی ہوگی۔ اس وقت تک جدید تحقیق اور تنقید دونوں کا آغاز ہی ہوا تھا۔ ان کو جو تحقیقی وراثت ملی تھی اسے نظر میں رکھا جائے تو ان کے تسامحات قابلِ در گزر ہیں۔ انھوں نے کتاب کے آخر میں اپنے مآخذ کی فہرست یعنی کتابیات نہیں دی لیکن اشاریے سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کے عہد تک معدودے چند تذکرے ہی شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے ذیل کے مطبوعہ تذکروں سے استفادہ کیا ہے:

شیفتہ کا "گلشنِ بے خار" جس کا نول کشوری ایڈیشن ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا، علی لطف کا "گلشنِ ہند" ۱۹۰۶ء، "خمخانہ جاوید" کی پہلی تین جلدیں ۱۹۰۸ء، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۷ء، عبدالجبار ملکاپوری کا تذکرہ "محبوب الزمن" ۱۹۱۱ء، میر کا "نکات الشعرا" ۱۹۲۲ء، نیز "تذکرۂ میر حسن" ۱۹۲۲ء۔ مصحفی کا "تذکرۂ ہندی گویاں" اس وقت تک شائع نہیں ہوا تھا لیکن سکسینہ نے اسے دیکھا ہے اور انگریزی ص91 پر تفصیل دی ہے۔ اردو مترجم نے "ذکرِ میر" سے بھی استفادہ کیا۔ اس وقت تک کریم الدین و فیلن کا "طبقات شعرائے ہند"، نساخ کا "تذکرۂ سخنِ شعرا"، عبداللہ خاں ضیغم کا "یادگارِ ضیغم"، امیر مینائی کا "انتخابِ یادگار" اور متعدد کم اہم تذکرے شائع ہو چکے تھے لیکن وہ سکسینہ کی نظر سے نہیں گزرے۔ ان کے سب سے اہم مآخذ تین ہیں: اسپرنگر کی "فہرستِ کتب خانۂ شاہِ اودھ"، "آبِ حیات" اور شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم"۔

تذکرہ و تاریخ کی اس قلیل متاع کے سہارے انھوں نے جو کچھ لکھ دیا وہ بسا غنیمت ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا "آبِ حیات" کے بعد رام بابو سکسینہ کی تاریخ بہت بڑی جست ہے۔ "آبِ حیات" رومانی یا ثانوی رنگ کی کتاب ہے۔ سکسینہ کی تاریخ صحیح معنی میں جدید تاریخِ ادب ہے۔ اس کی ابتدا میں اردو کے آغاز کی لسانی بحث دیکھیے۔

Scanned by CamScanner

۱۹۲۵ء میں شیرانی کی "پنجاب میں اردو" شائع ہوئی۔ اس میں اردو سے پہلے کے لسانی پس منظر کا بیان کتنا اکھڑا اکھڑا مغالطوں سے بھرا ہے۔ شیرانی لکھتے ہیں۔

> مغربی ہندی ... جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں، قدیم پراکرت سوراسینی کی یادگار ہے۔
>
> (لکھنؤ ۱۹۸۱ء، ص ۱۸)

پوچھیے کہ راجستانی اور پنجابی کہاں سے مغربی ہندی کی شاخیں ہو گئیں۔ اس کے مقابلے میں دیکھیے سکسینہ نے کتنا صحیح لکھا کہ اردو مغربی ہندی کی اس بولی پر مبنی ہے جو دلّی اور میرٹھ کے علاقے میں رائج تھی۔ مغربی ہندی کی دوسری بولیاں بانگرو (ہریانی)، برج بھاشا اور قنوجی ہیں (انگریزی ص 2,1)۔ شیرانی اور سکسینہ دونوں نے بندیلی کو حذف کردیا۔ سکسینہ نے آزاد کے اس بیان کی بھی تردید کی کہ اردو برج بھاشا پر مبنی ہے۔

سکسینہ کی چند تحقیقی بحثیں قابلِ قدر ہیں مثلاً ص 41 ولی کے وطن کی بحث، ص 59 (اردو ص ۱۰۵) میر درد کی عُمر کی تحقیق، ص 73 میر کے بارے میں محمد حسین آزاد کے بعض بیانات کی تغلیط، باب ۱۳، ص 77-172 غدر کے بعد دلّی اور لکھنؤ سے اردو شعرا کی ہجرت، اس میں سب سے پہلے مٹیا بُرج کلکتے کو اخراج، پھر دلّی سے پہلی ہجرت لکھنؤ عظیم آباد، مرشد آباد اور حیدر آباد کو، اس کے بعد دلّی و لکھنؤ سے دوسری ہجرت رام پور، حیدر آباد اور دوسری ریاستوں مثلاً ٹونک، منگرول، بھوپال، رام پور کو شامل ہیں۔

باب ۱۵ سے ۱۸ تک اردو نثر اور ڈرامے کی تاریخ سکسینہ کی اوّلیات میں ہے کیونکہ ان سے پہلے کے مؤرخ محض شاعری پر توجہ کرتے تھے۔ تنہا کی "سیرالمصنفین" سکسینہ کی معاصر ہے۔ ص 246 پر حیدر بخش حیدری کا بیان کافی مفصّل اور جامع ہے کہ آج تک اردو تاریخوں میں اس سے زیادہ مواد نہیں ملتا۔ اسی پر ایزاد ہے ہندوستانی قواعد ولغت نویسوں کی تفصیل۔ ص 262 پر "الف لیلہ" کے ترجموں کا بیان بھی سکسینہ کی اوّلیات میں ہے۔ بیت الغزل ہے اردو ڈراما نگاروں کا بیان۔ اردو ادب کی کسی عام تاریخ میں یہ اتنی تفصیل سے نہیں ملتا، صنفِ ڈراما پر کتابوں کی بات دوسری ہے۔ پوری کتاب میں سب سے زیادہ محققانہ اور طمانیت بخش بیانات دو ہیں: قواعد ولغت کے باب میں مستشرقین کے کارنامے اور اردو کے ڈراما نگار۔

تنقید میں سکسینہ کی اس دُور بینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں سے بھی پہلے نظیر اکبر آبادی کی اہمیت کی گرفت کی۔ کتاب کی کمزوری جدید دور کے شعرا پر سے سرسری گزر جانا ہے۔ دوسری بڑی کمزوری شعری اور نثری نمونوں کے نہ ہونے کی ہے۔

Scanned by CamScanner

انگریزی عبارت کے بیچ اردو اقتباسات اردو ٹائپ میں چھاپے جاسکتے تھے۔ عسکری نے اس کمی کو پورا کیا۔

سکسینہ کی انگریزی کتاب کبریتِ احمر کی طرح نایاب ہے(۶)۔ سکسینہ کی شہرت عسکری کے اردو ترجمے کی بدولت ہے۔ اردو کے پورے نسخے کو سکسینہ کا کارنامہ سمجھ لیا جاتا ہے گو نمونوں کے علاوہ دوسرے اضافوں اور تصحیحوں کی بدولت مرزا عسکری بھی کم از کم ۲۵ فی صد شریکِ مصنف کہے جا سکتے ہیں۔ ایک طرح سے انھوں نے کتاب کی تکمیل کی۔ ان کے اضافہ شدہ ترجمے کے روپ میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ آج بھی چھپتی ہے۔ طلبہ کے لیے تو یہ نہایت کار آمد ہے ہی، محققین بھی اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ یہ اردو کی پہلی مکمل ادبی تاریخ ہے۔

پس نوشت

"اردو کی ادبی تاریخیں" کا مسودہ ناشر کے حوالے کرنے کے بعد مرزا سلیم بیگ کا طویل مضمون "سکسینہ کی تاریخِ ادب اردو" ڈاکٹر مختارالدین احمد کی عنایت سے دیکھنے کو ملا۔ یہ مضمون رسالہ تحقیق:۲، ۱۹۸۸ء، شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی جام شورو، سندھ میں شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سکسینہ کی تاریخ کے اردو ترجمے کو پاکستان کے چار اصحاب نے مرتّب کیا ہے:

۱۔ مقدمہ از غلام حسین ذوالفقار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سنہ ندارد

۲۔ مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ ولی سنز، لاہور، سنہ ندارد

۳۔ مرتبہ تبسم کاشمیری، علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۸۲ء

۴۔ مرتبہ قیوم نظامی، گلوب پبلی کیشنز، لاہور، طبعِ اول: ۱۹۸۶ء

ان سے بہت پہلے مختارالدین احمد آرزو نے ایک مضمون "تاریخِ ادبِ اردو از رام بابو سکسینہ"، "ادبی دنیا"، لاہور، بابت دسمبر ۱۹۴۰ء میں شائع کیا جس میں سکسینہ کے تقریباً ۱۱۰ تسامحات کی نشان دہی کی۔ سلیم بیگ نے ان کا خلاصہ دیا ہے نیز دوسرے مرتبین کے بعض اعتراضات بھی قلم بند کیے ہیں۔ میرے لیے ان سب اغلاط کو درج کرنا اور ان پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں، ایک تاریخ کو اتنے صفحات نہیں دے سکتا۔ صرف چند اہم تسامحات درج کروں گا۔ ان میں سے بیشتر مختارالدین احمد کی تحقیق ہیں جب وہ مشرقی علوم کی ڈگریاں حاصل کر رہے تھے، انگریزی میں ہائی اسکول بھی نہیں کیا تھا۔ مختارالدین کی تصحیحات میں سے میں ان کو نہیں لوں گا جو میری رائے میں درست نہیں، درست تصحیحات میں سے انھیں بھی حذف

Scanned by CamScanner

کروں گا جنھیں دوسرے بھی لکھ چکے ہیں، صرف ان اہم تر تصیحات کو قلم بند کروں گا جن سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۔ قلی قطب شاہ فارسی میں قطب شاہ اور اردو میں معانی تخلص کرتے تھے۔ بقولِ آرزو اردو کلام میں بھی قطب شاہ تخلص ملتا ہے۔

۲۔ نثری رسالوں "جل ترنگ" اور "گل باس" کے مصنف کا نام شاہ برہان الدین جانم لکھا ہے۔ بقولِ آرزو صحیح نام شاہ برہان الدین عالم ہے۔ میری رائے میں آرزو کو بھی سہو ہوا۔ ان رسائل کا ذکر صرف شمس اللہ قادری نے کیا ہے اور انھیں میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتایا ہے، لیکن یہ موجود ہی نہیں۔

۳۔ شاہ میراں جی خدا نما کے رسالے کا نام "شرحِ مقلوب القلوب" بتایا ہے جب کہ صحیح نام "شرحِ تمہیدِ ہمدانی" ہے۔ میں توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ خدا نما سے اس رسالے کا انتساب اردو مترجم کا اضافہ ہے۔ سکسینہ نے نہیں لکھا۔

۴۔ "تاریخِ ادب" کے مطابق راجا شتاب رائے خود بڑا شاعر تھا۔ آرزو کے مطابق یہ غلط ہے۔

۵۔ تاریخ میں عاقل خاں رازی کی مثنوی کا نام "شمع و پروانہ" لکھا ہے جب کہ صحیح "مہر وماہ" ہے۔

۶۔ تاریخ میں دیوانِ ہاشمی کو اس وقت نایاب قرار دیا ہے جو صحیح نہیں۔

۷۔ مختار الدین احمد نے وجدی اور ولی سے متعلق تاریخ کے بعض بیانات پر اعتراض کیے ہیں۔ ان میں سے بیش تر اردو مترجم کا اضافہ ہیں۔ ولی کے بارے میں سکسینہ اپنے زمانے تک کی تحقیق ہی پیش کر سکتے تھے۔

۸۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ شاہ آبرو کا دیوان غدر میں تلف ہو گیا حالانکہ یہ اب بھی ملتا ہے۔ لکھتے ہیں آبرو نے ۱۱۶۱ھ/۱۷۵۰ء میں وفات پائی۔ آرزو نے نشان دہی کی کہ دونوں سنین میں مطابقت نہیں، نیز آبرو کا صحیح سنِ وفات ۱۱۴۶ھ ہے۔

۹۔ خان آرزو کا سالِ ولادت ۱۶۸۹ء لکھا ہے جس کی مطابقت ۱۱۰۲ھ سے ہے (دراصل ۱۱۰۱-۱۱۰۰ سے ہے۔) صحیح سالِ ولادت ۱۰۹۹ھ ہے۔

۱۰۔ شاہ حاتم کے سالِ وفات کے سلسلے میں چار اقوال نقل کیے ہیں، خود کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ آرزو نے صحیح سنہ ۱۱۹۷ھ لکھا ہے۔

۱۱۔ تاریخ کے مطابق "گلشنِ ہند" میں ۱۲۰۱ھ میں اور فیلن نے ۱۲۱۱ھ میں عبدالحی تاباں کو زندہ دکھایا ہے حالانکہ وہ "نکات الشعرا" (۱۱۶۵ھ) سے قبل ہی مر چکے تھے۔

Scanned by CamScanner

۱۲- تاریخ کے مطابق شاہ عالم آفتاب نے سودا کی شاگردی اختیار کی۔ بقولِ آرزو یہ بات افسانے سے زائد وقعت نہیں رکھتی۔

۱۳- آرزو نے سودا کے قیام فرخ آباد کے سنین کی تصحیح کی۔

۱۴- تاریخ میں لکھا ہے کہ میر حسن میر درد کے شاگرد ہوئے۔ آرزو اسے صحیح نہیں مانتے۔

۱۵- تاریخ میں میر حسن کی وفات کا مادۂ تاریخ "شاعر شیریں بیاں" لکھ کر ۱۲۰۱ھ اخذ کیا۔ بقولِ آرزو اس مادے سے ۱۲۰۴ھ نکلتا ہے جب کہ مصحفی نے "شاعرِ شیریں زباں" لکھا ہے جس کے اعداد واقعی ۱۲۰۱ھ ہیں۔

۱۶- تاریخ کے مطابق انشا مرشد آباد سے دلی آئے۔ آرزو نے تصحیح کی کہ مرشد آباد سے فیض آباد گئے اور کئی سال کے قیام کے بعد دلی آئے۔

۱۷- "دریائے لطافت" کا سنِ تصنیف ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۲ء لکھا ہے۔ آرزو کے مطابق یہ سنِ تکمیل ہے سنِ تصنیف نہیں، دوسرے یہ کہ ہجری سن کے مطابق ۸-۱۸۰۷ء آتا ہے۔

۱۸- تاریخ میں لکھا ہے کہ مصحفی ۱۱۹۰ھ میں امروہے سے دلی آئے اور وہاں ۱۲ برس رہ کر لکھنؤ گئے۔ بقولِ آرزو مصحفی ۱۱۸۶ھ میں دلی آئے اور ۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ پہنچے۔

۱۹- قائم کا سنِ وفات ۱۲۱۰ھ لکھا ہے۔ بقولِ آرزو صحیح ۱۲۰۸ھ ہے۔

مختار الدین احمد آرزو کی تصحیحات بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ ۱۹۴۰ء کو دیکھتے ہوئے یہ بہت قابل قدر ہیں۔ ان میں بعض تصحیحات درست نہیں۔ سلیم بیگ کے مضمون میں اس کے آگے اردو تاریخ کے دوسرے مرتبین کے مشاہدات بھی دیے ہیں جو معدودے چند ہیں۔ غلام حسین ذوالفقار کی یہ تصحیحیں قابلِ ذکر ہیں۔

۱- نثری حصے میں گل کرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا منتظم اعلیٰ اور افسرِ اعلیٰ لکھا ہے حالانکہ وہ شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر تھے۔

۲- غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا قیاساً ۱۸۵۰ء سے کی ہے۔ بقولِ ذوالفقار پہلا اردو خط مارچ ۱۸۴۸ء کا ملتا ہے۔

۳- نثر کے سترھویں باب میں نواب سید محمد آزاد کے لیے لکھا ہے کہ وہ انگلستان بھی گئے تھے۔ ذوالفقار کے مطابق آزاد ولایت نہیں گئے۔

۴- خود مضمون نگار سلیم بیگ نے بھی چند تصحیحات کی ہیں جن میں سے دو کا ذکر کرتا ہوں۔

۱- پندرھویں باب میں سید محمد قادری کے فارسی "طوطی نامہ" کی تاریخ ۹۳-۱۷۹۲ء

Scanned by CamScanner

لکھی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے اس کی تاریخ ۱۰۹۳ھ (۸۲-۱۶۸۱ء) لکھی ہے۔

۲۔ نذیر احمد کی ایک کتاب کا نام "افسانۂ غدر" لکھا ہے۔ افتخار احمد صدیقی کے مطابق اس کا نام "مصائبِ غدر" ہے۔

تبسم کاشمیری کی تصحیحات زیادہ تر سنین سے متعلق ہیں۔ ان میں کوئی زیادہ اہم نہیں۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱)۔ آخری زمانے میں ان کی مجھ سے خط و کتابت تھی۔ وہ ہمیشہ انگریزی میں لکھتے تھے۔ ان کا آخری پوسٹ کارڈ ان کے انتقال کے بعد موصول ہوا۔ اس پر ان کے عزیز نے لکھا تھا کہ سکینہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یہ جملہ ایزاد کرکے کارڈ کو سپردِ ڈاک کردیا۔ معلوم نہیں یہ بیش بہا کارڈ کہاں چلا گیا۔

(۲)۔ "اردوئے قدیم"، تاج پریس، حیدرآباد، ص ۷۰-۶۹ (بحوالہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال: "حیدرآباد میں اردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے"، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء، ص ۳۱-۳۰)

(۳)۔ خلیل احمد صدیقی: "ریختی کا تنقیدی مطالعہ"، لکھنؤ ۱۹۷۴ء، ص ۳۹۷۔

(۴)۔ یوسف سرمست: "بیسویں صدی میں اردو ناول"، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء، ص ۵۱-۵۰، نیز ص ۳۶۔

(۵)۔ یوسف سرمست: "تنقید۔ تحقیق = گم راہی"، رسالہ "ایوانِ اردو"۔

(۶)۔ میں ممنون ہوں ڈاکٹر سید عقیل رضوی کا کہ انھوں نے اپنا نسخہ مجھے مستعار دیا۔ عقیل صاحب کو یہ جلد امرناتھ بجل نے تحفتاً دی تھی۔

Scanned by CamScanner

ساتواں باب

احسن مارہروی: "تاریخِ نثرِ اردو" موسوم بہ نمونۂ منثورات

سیّد علی احسن مارہروی یکم نومبر ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے۔ شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے انٹر سیکشن میں اردو کے لیکچرر رہے۔ ۱۹۳۴ء میں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے ریڈر اور لیکچرر دونوں کی سلیکشن کمیٹی ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال ماہر تھے، جنھیں امیدواروں کی تفصیل بھیج کر ان کی رائے مانگی گئی۔ ان کی سفارش کے مطابق رشید احمد صدیقی ریڈر اور احسن مارہروی لیکچرر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں یہ ریٹائر ہوگئے (۱) ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو انتقال کر گئے۔

ان کی مرتبہ "کلیاتِ ولی" بہت مشہور ہے۔ دوسرا کارنامہ "تاریخ نثر اردو" بنام تاریخی "نمونۂ منثورات" ہے۔ یہ کتاب ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے اس کا عکسی فوٹو ایڈیشن جون ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ اس ایڈیشن کی ابتدا میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا مختصر مقدمہ ہے۔ یہی ایڈیشن میرے پیشِ نظر ہے۔

یہ ایک عجیب و غریب کتاب ہے جو باقاعدہ مسلسل تاریخ نہیں۔ اس کی ابتدا میں ۳۶ صفحوں کا مقدمہ ہے جس کے بعد چند گروہوں کے تحت عہد بہ عہد اردو ادب کے نمونے دیے ہیں۔ نمونے سے پہلے ایک چارٹ ہوتا ہے جس میں مختلف کالموں اور خانوں میں کتاب کا نام، مصنف کا نام اور سنہ تصنیف ہوتا ہے۔ اس کے بعد نمونۂ عبارت ہوتا ہے جو چارٹ کے آخری کالم سے شروع ہو کر نیچے تک لکھا گیا ہے۔ چند نمونوں کے بعد تبصرہ و کیفیت درج کرتے ہیں۔ ہر موضوع کے آخر میں جو نسبتاً طویل تبصرہ و کیفیت دیتے ہیں اس میں تحقیق و تنقید کے کئی اہم نکات سموئے رہتے ہیں۔ اس طرح نمونوں اور تبصروں کے ذریعے اردو نثر کی تاریخ پیش کی ہے۔ ڈاکٹر زور نے بھی اسی دور میں "اردو شہ پارے" میں قدیم ادب کی تاریخ نمونوں کے ذریعے پیش کی تھی۔

Scanned by CamScanner

محض تحقیق کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو احسن کی تالیف میں ایک طرف بعض تحقیقی معلومات ملتی ہیں تو دوسری طرف تحقیقی تسامحات بھی ہیں۔ آخرالذکر کی وجہ ہے اُس دور تک قدیم اردو کے بنیادی مواد کا منظرِ عام پر نہ آنا۔ اسی لیے اُس زمانے میں قابلِ اعتماد تاریخی معلومات فراہم کرنا بہت مشکل تھا۔ ذیل میں ان کے مقدمے اور چھے موضوعات پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

۳۶ صفحوں کے مقدمے کا انداز وہی ہے جو "آبِ حیات" کے تمہیدی حصّے کا ہے، یعنی اس کے موضوعات کچھ اس قسم کے ہیں۔

اردو زبان کا آغاز۔ لفظِ اردو کی تحقیق۔ نئی زبان کس طرح بنتی ہے۔ اردو نظم کے پہلے نمونے۔ شمالی ہند میں اردو زبان کیوں دیر میں مروّج ہوئی۔ اردو کے متعدد نام۔ نثرِ اردو کی تصنیف کا آغاز۔ موجودہ اردو کی ابتدا۔ نتیجہ کلام وغیرہ۔

یہ حصہ لسانی، تاریخی، تنقیدی سب ہی کچھ ہے۔ اس میں تغیرِ زبان کے سلسلے میں بڑی بلیغ بات کہی ہے:

> جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ پچاس سَو کوس کے دورِ مکانی سے تکلم کا لب و لہجہ متغیر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ دیکھا جاتا ہے کہ پچاس سو برس کے تفاوتِ زمانی سے زبان و بیان میں بھی اختیار و ترک اور اضافہ و ترمیم کے ذریعے سے تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔
>
> (ص ۳۲)

لکھتے ہیں کہ اس وقت تک اردو زبان کے بارے میں جتنی تالیفات شائع ہوئی ہیں، کسی میں ان تبدیلیوں کا مفصّل بیان نہیں۔ اس لیے انھوں نے اس کتاب میں اردو کے ہر اندازِ بیان کے نمونے اصل کتابوں سے لے کر دیے ہیں۔ انھوں نے اپنے دائرے کو چھے زمروں میں تقسیم کیا ہے، جنھیں وہ نمونہ کہتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ عام تصنیف و تالیف، ۲۔ دفاترِ سلطنت، ۳۔ اخبار، ۴۔ قانونی تراجم، ۵۔ تقریظ و تنقید، ۶۔ خطوط۔

ہر نمونے یعنی موضوع کو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم موضوع عام تصنیف و تالیف ہے جس کی ابتدا "معراج العاشقین" سے کی ہے۔ اس کتاب کی تاریخ ۸۰۱ھ مقرر کی ہے۔ اس کے بعد ہجری صدیوں کی ترتیب سے چھے دور کیے ہیں جو بالترتیب نویں، دسویں، گیارھویں، بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کو محیط ہیں۔ چودھویں صدی سے اس کا نصفِ اوّل یعنی ۱۳۰۱ھ سے سنہ تالیفِ کتاب ۱۳۴۸ھ تک مراد

Scanned by CamScanner

ہے۔

دوسرا نمونہ دفاتر سلطنت کا ہے۔ اس کے دو دور ہیں: پہلا دور ۱۸۴۱ء تا ۱۸۵۹ء اور دوسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۹۳۰ء۔ معلوم نہیں کیوں ۱۸۶۰ء تا ۱۸۶۵ء کے چھے سال محذوف رکھے۔ شاید انھیں اس دور کی کوئی تحریر نہ ملی ہوگی لیکن زمانی دور میں تو احصا کرنا چاہیے تھا۔ اس موضوع کے تقریباً سب نمونے عدالتوں سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی فیصلے، سمن، عرضی وغیرہ۔

تیسرا موضوع یا نمونہ اخبار یعنی اردو صحافت کا ہے۔ اس کے حسبِ ذیل چار دور ہیں:
(۱) ۵۶-۱۸۴۷ء، (۲) ۸۲-۱۸۵۷ء، (۳) ۱۸۸۴-۱۹۰۰ء، (۴) ۳۰-۱۹۰۱ء۔

چوتھا نمونہ قانونی تراجم کا ہے۔ اس کے محض دو دور ہیں: ۱۸۵۱-۱۹۰۰ء، اور ۱۹۰۰-۳۰ء۔

پانچواں نمونہ تقریظ و تنقید کا ہے۔ اس کے بھی دو دور ہیں: ۱۸۵۱-۱۹۰۰ء، اور ۱۹۰۰-۳۰ء۔

چھٹا نمونہ خطوط کا ہے۔ اس کے بھی دو دور ہیں: ۱۸۵۷-۱۹۰۰ء، اور ۳۰-۱۹۰۱ء۔

مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب اب سے سات آٹھ برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس اثنا میں "سیر المصنفین" ۲ حصے، "اردوے قدیم" (شمس اللہ قادری)، "دکن میں اردو" اور "پنجاب میں اردو" شائع ہو گئیں لیکن چونکہ کسی میں اردو کے ارتقائی مدارج کو ترتیب وار ظاہر نہیں کیا، اس لیے انھوں نے اپنی کتاب کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی (ص ۳۵) واضح ہو کہ ان کی کتاب نثر تک محدود ہے اس لیے انھوں نے اپنے مقدمے میں "گلِ رعنا" اور "شعر الہند" کا ذکر نہیں کیا لیکن متنِ کتاب میں ان دونوں کے نمونے دیے ہیں۔ انھوں نے اس عہد کی سب سے اہم تاریخ، رام بابو سکسینہ کی تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ احسن مارہروی انگریزی نہیں جانتے تھے، اس لیے اس سے بے خبر رہے ہوں گے۔ اردو ترجمہ ۱۹۲۹ء میں آیا اس وقت تک احسن اپنی تاریخ پریس کو دے چکے ہوں گے۔

مقدمے میں اردو کے ارتقا اور تاریخ کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے دو ایک جگہ محققانہ استفہام کا ثبوت دیا ہے، مثلاً:

۱۔ لکھتے ہیں کہ بعض بے پروا تذکرہ نویسوں نے اکبر اور جہاں گیر یا نورجہاں اور زیب النسا کی زبان سے جدید اردو اشعار کہلا دیے ہیں، لکھ دیا ہے کہ یہ رباعی اکبر نے کہی ہے۔ اہلِ تحقیق کی نگاہوں میں یہ غلط بیانی کوئی وقعت نہیں رکھتی (ص ۱۶)

Scanned by CamScanner

یہ طنز ہے۔ صفیر بلگرامی کے تذکرے "جلوۂ خضر" پر، جس میں اکبر، نورجہاں اور زیب النسا سے منسوب کر کے آج کی اردو میں اشعار کہلا دیے ہیں۔ ذیل کی رباعی شہنشاہ اکبر کے نام سے دی ہے:

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہِ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں خوش، ہر ساعت،

("جلوۂ خضر"، ص ۷۴، بحوالۂ "مغل اور اردو" از نصیر حسین خیال ص ۸)

یہی رباعی "کاشف الحقائق" میں بھی کسی شک و شبہہ کے بغیر نقل کی گئی ہے۔ اس کی حقیقت ملاحظہ ہو عبدالقیوم کی مرتبہ تاریخ کے ص ۱۵- ۲۱۴ کے سلسلے میں۔ اس کی اصل فارسی رباعی جعفر بیگ خاں آصف کی ہے۔ اردو رباعی "تزکِ جہاں گیری" کے اردو مترجم سید احمد علی رام پوری کی ہو سکتی ہے، جہاں یہ پہلی بار نظر آتی ہے۔

۲۔ شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں لکھا کہ مسعود سعد سلمان نے ہندی (اردو) کا دیوان مرتب کیا۔ اس پر احسن بڑا معقول سوال اٹھاتے ہیں کہ جب ان کا کوئی مصرع یا فقرہ موجود نہیں تو اس زمانے میں، جب کہ سنسکرت اور پراکرتوں کے سوا کوئی مخلوط زبان نہ تھی، انھیں اردو کا موجد کیوں کر مان لیا جائے؟ اگر یہ دلیل دی جائے کہ مسلمانوں نے دہلی سے پہلے لاہور کو دارالسلطنت بنایا تو پہلی صدی ہجری میں محمد قاسم کو کیوں بانیِ اردو نہ سمجھا جائے (ص ۳۶)

اعتراض مناسب ہے۔ سلیمان ندوی نے اسی منطق سے سندھ کو اردو کا مولد قرار دیا لیکن احسن نے ایسا نہیں کیا۔

وہ نثرِ اردو کو سلطان فیروز شاہ (دکنی) معاصر امیر تیمور (۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء) کے زمانے کی یادگار بتاتے ہیں (ص ۲۳) لیکن ہم اس عہد کے کسی سلطان فیروز شاہ دکنی سے واقف نہیں۔

حیرت ہے کہ وہ "کربل کتھا" کے مصنف فضلی کو دکنی کہتے ہیں (ص ۲۳) آزاد نے فضلی کی "دہ مجلس" سے محض ایک پیراگراف دیا تھا۔ احسن نے کریم الدین کے تذکرے سے لے کر دیباچے کے کئی صفحے نقل کیے، نیز کتاب کا صحیح نام "کربل کتھا" لکھا (ص ۶۴) تذکرہ ۱۸۴۸ء میں چھپ چکا تھا۔ معلوم نہیں آزاد نے "آبِ حیات" میں اس سے استفادہ

Scanned by CamScanner

کیوں نہیں کیا۔ احسن ص ۶۴ پر جب "کربل کتھا" کا نمونہ درج کرتے ہیں تو مصنّف کا نام شاہ فضل اللہ المتخلص بہ فضلی اورنگ آبادی لکھتے ہیں، لیکن بعد میں ص ۶۸-۷۱ پر جب اس پر تبصرہ کرتے ہیں تو ٹھٹکتے ہیں۔ انھوں نے "تذکرۂ شعرائے دکن" موسوم بہ "محبوب الزمن" میں شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی کا حال دیکھا، لیکن اس تذکرے میں یا کسی اور تذکرے میں اس فضلی کے لیے یہ نہیں لکھا کہ وہ "کربل کتھا" کا مصنّف ہے، اس لیے احسن اس شاعر فضلی سے نثری کتاب کے انتساب پر شک کرتے ہیں اور یہ بھی دھیان دیتے ہیں کہ اس کے دیباچے میں جنوبی ہند کی زبان کا اثر نہیں۔ دوسرے کئی دلائل کی بنا پر وہ اس کتاب کو شمالی ہند کی اردو کا پہلا نمونہ قرار دیتے ہیں (ص ۷۱)

لیکن ان کے مقدمے میں کچھ ایسے بیانات بھی ہیں جو اُن کے زمانے میں صحیح سمجھے جاتے ہوں گے، لیکن بعد کی تحقیق نے ان کی صحت پر سوالیہ نشان لگا دیا، مثلاً "خالق باری" کو اردو نظم کے قدیم ترین نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد خسرو سے منسوب ایک قطعہ اور پہیلیاں وغیرہ درج کرتے ہیں۔ آج اہلِ تحقیق کو ان کے استناد میں شک ہے۔ آزاد نے خسرو کی جس نظم کو مکرنی کہا تھا، احسن نے اسے کہہ مکرنی کہا، اس کی صحیح تعریف دی کہ "کسی چیز کا نام اس طرح لیا جائے کہ کہہ کر مکر جانا پایا جائے۔"

لیکن مثال غلط دی:

بیسوں کا سر کاٹ لیا
نا مارا، نا خون کیا

اصل میں کہہ مکرنی وہ ہوتی ہے جس کے آخری مصرع کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں:

اے سکھی ساجن، نا سکھی دیا

احسن نے "آبِ حیات" سے عہدِ ہمایوں کے طوطے کا مقولہ درج کیا ہے، "پھٹ پاپی، رومی خاں نمک حرام!" آزاد کی طرح لکھا ہے کہ "وہ طوطا آدمی کی طرح باتیں کرتا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا۔" (ص ۱۵) مجھے اس میں شبہ ہے۔ طوطے کو جو کچھ رٹا دیا جاتا ہے صرف وہی دہرا سکتا ہے۔ فہم سے کام لینا داستانوں کی دنیا تک محدود ہے، اصلی دنیا میں نہیں ہوتا۔ طوطا رومی خاں کو پہچان کر یہ فقرہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے کسی نے رٹا رکھا ہو اور اس نے اتفاقیہ برمحل دہرا دیا ہو تو دوسری بات ہے۔

ص ۳۹ پر سرسیّد کی ابتدائی اردو کتابوں میں ترجمۂ "آئینِ اکبری" کا ذکر کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ سرسیّد نے فارسی "آئینِ اکبری" کی تدوین کی، اسے اردو میں ترجمہ نہیں

Scanned by CamScanner

کیا۔

مقدمے کے آخری حصے "نتیجہ کلام" میں اپنے زمانے کی اردو کے تین "اسالیب" کا ذکر کرتے ہیں: اوّل مسلمانوں کا غیر مروج ترکیبوں اور نامانوس عربی و فارسی الفاظ کا استعمال، دوسرے ہندوؤں کا سنسکرت کے بھاری بھرکم شبدوں کا استعمال، تیسری روشِ تریان انگریزی خواں اردو دانوں کی ہے جن کو یہ مرض لاحق ہو گیا ہے کہ اردو کے ایک لفظ کے بعد جب تک چار لفظ انگریزی کے نہ بولیں صحت زبان پر یقین نہیں کر سکتے" (ص ۳۰)

یہ آخری روش تحریر کی نہیں، تقریر کی ہوگی۔ حیرت ہے کہ احسن کے دور میں بھی گفتگو میں انگریزی الفاظ کے بہ کثرت استعمال کا رواج تھا۔ ہم سمجھتے تھے، یہ بدعت آزادی کے بعد کی ہے۔

مقدمے کے بعد کتاب کا سب سے اہم جزو (نمونہ) عام تصنیف و تالیف ہے، جو ص ۳۹ سے ۳۶۰ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس جزو کو عام طور پر ادبی کتابوں تک محدود رہنا چاہیے تھا، لیکن اس میں بدرنگ کے طور پر کئی غیر ادبی کتابوں کے اقتباس بھی دیے ہیں، مثلاً "مجموعۂ قوانین" کی جلدیں ص ۸۳ و ص ۱۰۵۔ "ہدایت نامۂ مال گزاری" ص ۲۹۶، جب کہ یہ کتابیں نمونہ نمبر ۲ "دفاترِ سلطنت" میں جانی چاہییں۔ اس جزو میں ڈاکٹری کی کتاب "مجموعۂ علم تشریح" بھی ہے، رسالہ "سینے کا علاج" بھی۔ غرض یہ ہے کہ اس جزو میں ادبی کتابوں کے ساتھ دوسرے موضوعات کی کئی کتابوں کو بھی سمو دیا ہے، جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس جزو کے بارے میں جستہ جستہ مشاہدات درج کیے جاتے ہیں۔

قدیم ترین نمونہ حضرت گیسو دراز کی "معراج العاشقین" (۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء) کا ہے (ص ۴۰-۳۹) ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق کے بعد یہ طے ہو گیا ہے کہ یہ کتاب خواجہ گیسو دراز کی نہیں، بلکہ ان سے بہت بعد کے ایک دوسرے بزرگ کی ہے۔ ص ۴۲ پر "شرحِ مرغوب القلوب" از شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ کا نمونہ ہے۔ یہ کتاب دراصل میراں جی خدانما کی ہے۔ شمس العشاق کا کوئی اردو نثری رسالہ مصدقہ نہیں۔ ان کی تاریخِ وفات ۹۰۲ھ بھی صحیح نہیں۔ میری رائے میں یہ ان کی تاریخِ ولادت ہے۔ آگے شاہ برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین علی اعلیٰ کی وفات کی جو تاریخیں دی ہیں وہ بھی حالیہ تحقیق کی روشنی میں درست نہیں۔ "کلمۃ الحقائق" کا سنہ تصنیف ۹۹۰ھ لکھا ہے (ص ۴۳) حسینی شاہد کے مطابق یہ ۹۹۰ھ سے بعد کی ہے۔

ص ۴۶ پر "شرح تمہید ہمدانی" یا "شرحِ شرح تمہید" حضرت میراں صاحب یا شاہ میراں جی حسن خدانما کی تصنیف لکھا ہے۔ یہ خدانما کی تصنیف ہے، میراں جی شمس

Scanned by CamScanner

العشاق کی نہیں۔ ص ۶۲ پر ایک دکنی ترجمہ "طوطی نامہ" کو محمد قادری کی تصنیف کہا ہے، جو صحیح نہیں۔ محمد قادری فارسی اصل کا مؤلف تھا، نہ کہ دکنی ترجمے کا مترجم۔ خود احسن ص ۶۳ پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ترجمہ محمد قادری کا نہیں۔ اگلے ص ۶۴ پر فضلی کی "کربل کتھا" کا نمونہ ہے جس پر میں پہلے ہی اظہار خیال کر چکا ہوں۔

ص ۲۷ پر سودا کے نثری دیباچۂ دیوان کی تاریخ ۱۱۸۰ھ م ۱۷۶۶ء درج کی ہے۔ احسن نے سودا کی ۴۰ سالہ "مشقِ سخن" کی بنا پر یہ سنہ اخذ کیا، لیکن قیاس کو اس قطعیت کے ساتھ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ خلیق انجم کی رائے میں "کلیاتِ سودا" کی ترتیب ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان ہوئی ("مرزا محمد رفیع سودا"، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۴۵)

ص ۷۷ پر شاہ رفیع الدین کے "ترجمۂ قرآن" کا سنہ ۱۲۰۳ھ درج کیا ہے، لیکن ص ۸۰ پر لکھتے ہیں کہ اس ترجمے کا سنہ تحریر معلوم نہ ہوسکا، اور یہ بات درست ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کے ترجمے کا سنہ ۱۲۰۵ھ معلوم ہے، اس لیے اندازے سے بڑے بھائی کے ترجمے کا سنہ ۱۲۰۳ھ لکھ دیا۔ قیاس کو اس قطعیت میں بدل دینا عجب منطق ہے۔ مولوی عبدالحق کی رائے میں شاہ رفیع الدین کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے بعد کا ہے (۲) جب کہ جمیل جالبی کی رائے میں پہلے کا ہے (تاریخ، جلد دوم، حصۂ دوم، ص ۱۰۵۳)

احسن نے اٹھارویں صدی عیسوی کی نثر کے نمونے کے طور پر ایک غیر مطبوعہ کتاب "تفسیرِ قرآنی موسومہ بہ حقانی" از سید شاہ حقانی ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء کا تعارف دیا، جو مفید ہے (ص ۸۱)

کتاب کا پہلا حصہ یا نمونہ بالعموم ادبی کتابوں کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ دوسرا نمونہ دفاتر سلطنت کا اور چوتھا نمونہ قانونی تراجم کا ہے لیکن مؤلف نے تقسیم کی خلاف ورزی کر کے نمونۂ اوّل میں بھی بعض دفتری اور قانونی کتابوں کو شامل کر لیا ہے۔ ص ۸۳ پر کمپنی کی کتاب "مجمع القوانین" کا سنۂ تصنیف ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء لکھا ہے لیکن اگلے ہی صفحے پر اس کے دیباچے کا جو اقتباس دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مجموعۂ قوانین" کی جلد اوّل میں ۱۷۹۳ء سے ۱۸۴۳ء تک کے احکامات شامل ہیں۔ ص ۱۰۵ پر اس کے بعد کی جلد کا دیباچہ نقل کیا ہے۔ اس کا سنۂ تصنیف ۱۸۳۴ء اور سنۂ طباعت ۱۸۶۶ء ہے۔ اس کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ "مجموعۂ قوانین" کی جلد اوّل ۱۷۹۳ء تا ۱۸۳۴ء تک کے قوانین پر اور جلد دوم ۱۸۳۴ء سے ۱۸۵۷ء تک کے قوانین پر مشتمل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ص ۸۴ پر جلد اوّل کے مشمولات کی آخری حد ۱۸۴۳ء سہو کتابت ہے ۱۸۳۴ء کی۔ اس طرح معلوم ہوا کہ احسن نے "مجموعۂ قوانین" کی جلدوں کے مشمولات کی ابتدا کی تاریخ کو

Scanned by CamScanner

سنہِ تصنیف لکھ دیا ہے، جو بالکل غلط ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ کتاب کے سنہِ تکمیل کو سنہِ تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔

ص۸۸ پر لطف کے تذکرے "گلشنِ ہند" پر یہ اچھی گرفت کی ہے کہ شاہ ولی اللہ کو اردو شاعر بہ تخلص اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق دوسرے شخص ہیں۔ ص۹۷ پر "رانی کیتکی کی کہانی" کی تاریخ ۱۸۰۳ء لکھی ہے، ماخذ نہیں دیا۔ یہی تاریخ رام بابو سکسینہ نے لکھی ہے۔ انشا کے محقق ڈاکٹر عابد پیشاوری نے اپنے مقالے میں اس کہانی کی تاریخِ تصنیف کافی پہلے کی قیاس کی ہے۔

ص۱۱۴ پر "رسالہ گِل کرسٹ (قواعدِ اردو)" از گِل کرسٹ، مطبوعہ ۱۸۴۶ء کا اقتباس دیا ہے۔ تبصرے میں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۸۰۹ء اور ۱۸۲۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنے مقالے "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" میں واضح کیا ہے کہ اس رسالے کے مؤلف میر بہادر علی حسینی ہیں جنھوں نے "گِل کرسٹ" کی قواعد مطبوعہ ۱۷۹۶ء کی تلخیص کی یا اس کی بنا پر یہ رسالہ تیار کیا، جو پہلی بار ۱۸۲۰ء میں چھپا، ۱۸۰۹ء میں نہیں (عبیدہ، ص۶۱۱)

ص۱۲۹ پر ایک بہت مفید کتاب "مطلع القمرین فی احکام العیدین" (تصنیف ۱۲۶۴ھ، طباعت ۱۲۶۵ھ) کا اقتباس دیا ہے۔ اس کا مصنف سید احمد ابنِ سید درویش کرناٹک کا رہنے والا ہے۔ مشہور تھا کہ کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب نے اردو املا کی معیار بندی کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کام ڈاکٹر گِل کرسٹ کر چکے تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو آج کے املا میں ہیں، مثلاً:

۱۔ ہائے مخلوط کو ہمیشہ دو چشمی "ھ" سے لکھا ہے۔

۲۔ یائے معروف و مجہول کو تلفظ کے مطابق "ی" اور "ے" سے لکھا ہے۔

۳۔ یائے لین، یعنی یائے ماقبل مفتوح کو نصف "ی" کی شکل میں "ی" لکھا ہے۔ لفظ کے درمیان اس کی صراحت کے لیے لفظ کو توڑ کر لکھا ہے، مثلاً بینٹھ کو بیں ٹھ۔

۴۔ ہائے مختفی کو بہ صورتِ امالہ یائے مجہول سے لکھا ہے اور بغیرِ امالہ الف سے لکھا ہے، مثلاً چھاپہ خانہ کو چھاپے خانہ اور بارہ کو بارا (ص۱۳۱۔۱۳۰) معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد نے گِل کرسٹ کے طرزِ املا سے استفادہ کیا ہے۔

ص۱۴۷ پر خواجہ امان کی "ریاض الابصار" کی تاریخ ۱۲۷۳ھ دی ہے۔ صحیح تاریخِ تصنیف ۱۲۸۲ھ اور تاریخِ اشاعت ۱۲۸۴ھ ہے۔ ص۱۷۷ پر "آبِ حیات" کا سنہِ تصنیف ۱۸۷۹ء دیا ہے جو ۱۸۸۰ء ہونا چاہیے۔ جلال کی "سرمایۂ زبانِ اردو" پر بے لاگ تبصرہ کرتے

Scanned by CamScanner

ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی نثر میں روانی اور شستہ بیانی مفقود ہے۔ بعض وہ حضرات جن کو فارسی و عربی کی مزاولت زیادہ رہتی تھی۔ چودھویں صدی کے ابتدائی دور میں بھی تیرھویں صدی کی زبان لکھا کرتے تھے (ص۱۸۸)

ص۲۰۶-۲۰۷ پر خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان" کا ایک دلچسپ اقتباس دیا ہے کہ سکندر لودھی کو فارسی خواں ہندوؤں کی ضرورت ہوئی۔ چونکہ کوئی موجود نہ تھا اس لیے طے کیا گیا کہ کچھ ہندوؤں کو فارسی پڑھائی جائے۔ اس نے سلسلے وار برہمنوں، چھتریوں اور ویشوں سے پوچھا لیکن ان میں سے کوئی فارسی پڑھنے کو تیار نہ ہوا۔ "پھر شودروں میں سے کایستوں سے، جو پہلے سے سنسکرت کی لکھائی کی اُجرت سے اوقات بسر کرتے تھے، یہ کہا تو انھوں نے بسرو چشم قبول کیا۔" (ص۲۰۷)

کایستھوں کو خواہ مخواہ شودر کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ پڑھائی لکھائی کا پیشہ رکھنے والا شودر نہیں ہو سکتا۔

احسن نے ہر اقتباس کے ساتھ سنہ تصنیف لکھنے کا التزام کیا ہے، پھر معلوم نہیں کیوں نمونے ہر جگہ تاریخی ترتیب سے نہیں دیے، مثلاً ص۲۳۹ پر مرزا سلطان احمد کی "فنِ شاعری" (۱۹۰۷ء) ہے۔ اس کے بعد ص۲۴۰ پر "شعر العجم" حصہ اول ۱۹۰۰ء اور پھر ص۲۴۲ پر "امیر اللغات" حصہ اول ۱۸۹۱ء کا نمونہ ہے۔ اسی طرح ص۲۴۹ پر مولوی زین العابدین کی "آئینِ اردو" ۱۹۲۶ء کا اقتباس ہے اور ص۲۵۰ پر اسماعیل میرٹھی کی "قواعد اردو" ۱۹۰۴ء۔ یا ص۲۵۱ پر "سیرۃ النبی" حصہ اول ۱۹۱۲ء کا نمونہ ہے، اس کے آگے ص۲۵۳ پر ذکاء اللہ کی "فلسفۂ امثال" ۱۸۹۰ء کا اور اس کے فوراً بعد ص۲۵۴ پر دیبی پرشاد بشاش کے "تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود" (۱۸۸۵ء کا)۔ جب نمونے دیے ہی تھے تو انھیں تاریخی یا موضوعاتی اعتبار سے ترتیب دینا چاہیے تھا۔

مؤلفِ "خمخانۂ جاوید" کی محنت کو سراہتے ہوئے اس بات کے شاکی ہیں کہ اس میں کامل، ناقص، شاعر و متشاعر ہر قسم کے شاعروں کو شامل کر لیا گیا ہے اور بعض معروف شعرا کے حالات کی صحت میں تامل ہے، مثلاً شاہ ولی اللہ کو شاعر قرار دینا یا سراج اورنگ آبادی کے حالات کا بغیر تحقیق کے اندراج کرنا (ص۲-۲۶۱) دراصل "خمخانۂ جاوید" جلد چہارم میں سراج کے حالات میں چند سطریں ہی ہیں جن میں سوانح کے نام پر ایک لفظ نہیں۔ سراج کا نام سراج الدین علی خاں لکھا ہے جو درست نہیں۔

"خمخانۂ جاوید" میں ناقص شاعروں کے شمول پر جو اعتراض کیا ہے وہی احسن کی تاریخ پر وارد ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی کثرت سے مجہول الاحوال مصنفین کے نمونے دیے

Scanned by CamScanner

ہیں۔ احسن کو "شعرالہند" کے اس پہلو پر اعتراض ہے کہ بعض حالات تاریخی حیثیت سے قابلِ گرفت ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ انشا، جرأت اور ناسخ نے مثنوی کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ احسن نے ان تینوں کی کئی مثنویوں کا ذکر کیا (ص ۲۷۳)

مولوی اشرف علی تھانوی کی "بہشتی زیور" سے ایک اقتباس دیا ہے، جس کا آخری جملہ ہے: "اللہ تعالی سب سے بچاویں" اور اس کے بعد یہ معلومات افزا مشاہدہ درج کرتے ہیں کہ دیوبندی اور تھانوی تحریروں میں خدا کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں حالانکہ عربی فارسی اور اردو میں خدا کے لیے ضمیر واحد ہی فصیح سمجھی جاتی ہے (ص ۴-۳۳۳) انھیں یہ معلوم نہیں کہ اسماعیل شہید نے "تقویت الایمان" میں بھی جگہ جگہ اللہ صاحب لکھ کر جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

"گلِ رعنا" کا سنہ تصنیف ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۴ء دیا ہے (ص ۳۴۰) حالانکہ اس کے دیباچے پر ۶ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ م دسمبر ۱۹۲۱ء درج ہے۔ اس کی تاریخِ اشاعت جمادی الاول ۱۳۴۳ھ لو سمبر ۱۹۲۴ء ہے۔ اس کے ساتھ نمونہ (۱) کے چھے دور ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ۲۰ صفحوں میں جو "تبصرہ و کیفیت" ہے وہ اچھی خاصی مختصر سی تاریخ ادب ہے۔ اس میں انکشاف کرتے ہیں کہ "آثار الصنادید" کا دیباچہ پڑھ کر یقین کیا جا سکتا ہے کہ مولوی غلام امام کی "تعریفِ روضۂ تاج گنج" کو سامنے رکھ کر اس کا چربہ اتارا گیا ہے۔" (ص ۳۴۸)

تبصرے کے آخر میں جدید زبان کی خصوصیات دی ہیں۔ ایک عنوان "اردو تراجم میں انگریزی ساخت کے اسالیب بیان" مختصر لیکن مفید ہے۔ اس کے آگے "عربی و فارسی الفاظ کا غلط تلفظ"، "دلی اور لکھنؤ میں بعض الفاظ کا خصوصی استعمال" کے عنوانات ہیں۔ (ص ۸-۳۵۴) اس کتاب میں مختلف فصلوں میں متروک الفاظ کی فہرستوں اور جا بجا بکھرے ہوئے لسانی مشاہدات کو یک جا کر دیا جائے تو اردو زبان کے ارتقا کے بارے میں ایک کار آمد مقالہ سامنے آجاتا ہے۔

نمونہ نمبر ۲ دفاترِ سلطنت سے متعلق ہے لیکن دراصل زیادہ تر عدالتی کاغذات ہی تک محدود رہتا ہے۔ نمونہ نمبر ۳ صحافت سے متعلق ہے۔ یہ جزو بہت پُر از معلومات ہے۔ اس میں ص ۴۷-۴۰۷ پر ۱۵۴ اخباروں کی فہرست ہے جس میں مقامِ اشاعت اور زمانۂ اشاعت بھی دیا ہے۔ اس کے بعد قانونی تراجم اور پھر تقریظ و تنقید کے نمونے ہیں۔ آخرالذکر میں زکی دہلوی کے دیوان پر غالب کا سرٹیفکیٹ ہے، جس کا پہلا جملہ یہ ہے:

سبحان اللہ! سارٹی فکٹ کے لکھنے کا کس وقت میں اتفاق ہوا ہے کہ
میں نیم جان چند روز کا مہمان ہوں۔ (ص ۵۰۳)

Scanned by CamScanner

مجھے علم نہ تھا کہ غالب نے "سارٹی فکٹ" کے باضابطہ لفظ کے ساتھ کسی شخص کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ دوسری کتابوں پر تو مصنف کے علاوہ کسی اور کی تقریظ ہے لیکن "نیرنگ خیال" پر خود آزاد کے لکھے دیباچے کو تقریظ کے طور پر پیش کیا ہے جو کسی طرح تقریظ کے ذیل میں نہیں آتا۔

آخر میں دو کتابوں کے جعل کا انکشاف کیا ہے۔ ص ۵۱۶-۵۱۷ پر کسی شمس الدین کے ناول "مزدور کی بیٹی" پر رسالہ "زمانہ" جون ۱۹۲۳ء کا تبصرہ درج کیا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ رینالڈ کے ناول "روزالیسبرٹ" کا اثر لکھنوی نے ترجمہ کیا۔ شمس الدین نے اسی کی نقل کردی ہے، نام البتہ بدل دیے ہیں (ص ۵۱۷) اور اس کے دو صفحے بعد نیاز فتح پوری کی کتاب "تاریخ الدولتین" پر نجیب اشرف ندوی کا تبصرہ ہے جو "معارف" اگست ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ ندوی لکھتے ہیں کہ کتاب کے سرورق پر نیز دوسرے صفحے پر کتاب کا نام "تاریخ الدولتین" مؤلفہ مولانا نیاز فتح پوری دیا ہے جب کہ دوسرے صفحے کے نیچے یہ عبارت بھی ہے "مقتبس از تاریخ الدولتین الاسلامی، جزء ۴ مؤلفہ جرجی زیدان۔" ندوی اطلاع دیتے ہیں کہ اردو کتاب سراسر ترجمہ ہے جس کی وجہ سے نیاز فتح پوری اس کے مؤلف نہیں ٹھہرتے۔

آخری نمونہ خطوط کا ہے جو ص ۵۲۷ سے ۶۱۰ تک کو محیط ہے۔ یہ ایک طرح کا "انتخابِ خطوطِ مشاہیر" ہے لیکن تاریخی ارتقا کے ساتھ۔

یہ کتاب بنیادی طور پر اقتباسات کا مجموعہ ہے لیکن یہ پہلو چنداں مفید نہیں۔ اقتباسات سے پہلے کے چارٹوں سے کتابوں کے زمانۂ تصنیف کا پتا چلتا ہے لیکن وہ ہر جگہ معتبر نہیں۔ پھر غیراہم اور مجہول الاسم تحریروں کے سنین جاننا بھی غیرضروری ہے۔ مفید ہیں مولانا کی "تبصرہ و کیفیت" کے عنوان کی تحریریں۔ ان سب کو جمع کر دیا جائے تو اپنے دور کے لحاظ سے ایک مفید، گو بکھرا ہوا، رسالہ مرتب ہو جائے گا۔ مولانا احسن کو "گلِ رعنا" اور "شعرالہند" دیکھ کر خیال آیا ہوگا کہ وہ نثر کے بارے میں لکھیں۔ "سیرالمصنفین" کا اشتہار دیکھ کر وہ گھبرائے کہ کہیں ان کی محنت برباد تو نہیں گئی لیکن کتاب کو دیکھ کر انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کے لیے ادبی نمونے پیش کرنے کی گنجائش ہے، حالانکہ یہ یقینی ہے کہ نمونوں کے بجائے مستقل تاریخِ ادب کہیں زیادہ مفید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "نمونۂ منثورات" کے مقابلے میں "سیرالمصنفین" کہیں زیادہ مفید اور اہم کتاب ہے۔ "نمونۂ منثورات" کو صحیح معنی میں اردو نثر کی تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱) م قدیر علیگ، "علامہ اقبال اور رشید احمد صدیقی"، "نقوش"، شمارہ ۱۳۹ ص۵۸-۶۵۵

(۲) "پرانی اردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں"، رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۳۷ء، بازطباعت: "قدیم اردو"، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص۱۳۳

Scanned by CamScanner

آٹھواں باب

گراہم بیلی و ادارۂ ادبیاتِ اردو کی تاریخیں

الف: گراہم بیلی: "اردو ادب کی تاریخ" (انگریزی)

ڈاکٹر گراہم بیلی (T. Grahame Bailey) لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف افریقن اینڈ ایشین اسٹڈیز کے شعبۂ اردو و ہندی میں ریڈر تھے۔ وہ عرصے تک پنجاب میں قیام کر چکے تھے، جس کی وجہ سے نہ صرف اردو اور ہندی، بلکہ پنجابی بھی بخوبی جانتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر زور اور الہ آباد یونی ورسٹی کے ڈاکٹر حفیظ سید ممتاز ہیں۔ انگریزی میں ان کی کتاب "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" ہندوستان کی "وراثت کا سلسلہ" میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مقاماتِ اشاعت کلکتہ، بمبئی، مدراس، لندن، نیویارک، ٹورنٹو اور ملبورن ہیں۔ ان کے وسائل کی داد دینی پڑتی ہے کہ ایک کتاب بیک وقت پانچ ملکوں کے سات شہروں سے شائع ہوئی۔ حیرت ہے کہ ان میں ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی شامل نہیں۔ ہندوستان کی "وراثت کا سلسلہ" مسیحی پادریوں کا ہے۔

کتاب کے شروع میں تین صفحوں کا دیباچہ، پھر صحت نامہ، فہرست اور اس کے بعد باقاعدہ تمہید ہے۔ دیباچے میں اعتراف کرتے ہیں کہ کتاب کے پروف ایک قدیم شاگرد، عثمانیہ یونی ورسٹی کے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے دیکھے، نیز بیش بہا تجویزیں پیش کیں۔ دیباچے کے بعد ۱۰۴ صفحات کو محیط متن کے آٹھ باب ہیں۔ ان کے بعد کتابیات اور اشاریہ وغیرہ ہیں۔ دیباچے میں مطلع کرتے ہیں کہ یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں مکمل ہو گئی تھی اور اس میں ۱۹۲۸ء کے آخر تک کے اردو ادب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اُس وقت جو لکھنے والے زندہ تھے ان سب کو باستثنائے اقبال خارج کر دیا گیا ہے۔ اس اصول کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی وجہ سے پریم چند، یلدرم، عبدالحق، نیاز، مجنوں، حسرت اور جوش وغیرہ بزم سے باہر رہتے ہیں۔

ترقیِ اردو بیورو دہلی کے سید محمد عصیم نے دہلی یونی ورسٹی کے ترجمے کے ڈپلوما کے

Scanned by CamScanner

لیے اس کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالا اور ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ اس میں کچھ حواشی و تعلیقات بھی ہیں لیکن وہ تشنہ اور ناکافی ہیں اُن سے بہت پہلے مولوی عبدالحق نے اس کتاب پر تبصرہ کیا جو ان کے مجموعے "تنقیداتِ عبدالحق" (حیدر آباد، طبعِ اوّل، ۱۹۳۴ء) میں شامل ہے۔ اس میں مولوی صاحب بیلی اور ان کے شاگرد ڈاکٹر زور سے بہت خفا ہیں، جھلائے ہوئے لہجے میں کتاب کی اغلاط شماری تک محدود رہے ہیں۔ رسالہ "اردو" (بابائے اردو نمبر، ۱۹۶۲ء) میں خواجہ تنویر حسین اپنے مضمون "تصانیفِ عبدالحق ... ایک جائزہ" میں اس تبصرے کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

> مولوی صاحب جب اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ "ڈاکٹر بیلی کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشہور ہے کہ "نقل میں عقل کو بہت کم دخل ہوتا ہے تو ان کا یہ ریمارک شخصی ہو جاتا ہے۔ ان کے لہجے کی درشتگی اس میں مزید تیزابیت پیدا کر دیتی ہے۔ غلطی کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے، اس میں نقل اور عقل کا سوال نہیں۔
>
> (رسالہ "اردو"، ص ۲۵۷)

اس کے آگے مضمون نگار نے مولوی صاحب کے ہاں سے ایک مثال نقل کی ہے جس میں انھوں نے "حیاتِ جاوید" سے سرسید کے ایک لیکچر کی غلط تاریخ نقل کر دی۔ مولوی صاحب کو غصہ اس بات پر ہے کہ بیلی نے ان کے مضامین سے استفادہ کیا ہے، لیکن ان کا حوالہ نہیں دیا۔ دراصل اس مختصر کتاب میں لاتناہی اندراجات کے مآخذ قلم بند کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

بیلی کتاب کے مختصر دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی تین امتیازی خصوصیات ہیں:

۱۔ اردو کے آغاز کا نظریہ ماسبق کے نظریوں سے مختلف ہے بالخصوص پنجابی کو اہمیت دینے کے معاملے میں۔ لفظ اردو اور کھڑی بولی کی تشریح پر میرے مشاہدات نئے ہیں۔

۲۔ اردو ادب میں دکن کے مقام کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا۔ میں نے دکھنی کے حصے کو حتی الامکان جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ تحسین کی "نوطرزِ مرصع"، امن کی "باغ و بہار" اور خسرو کے مفروضہ کارنامے "چہار درویش" پر نئی معلومات دی ہیں۔

Scanned by CamScanner

مولوی صاحب اپنے تبصرے میں ان تینوں دعووں پر بہت خفا ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ یہ سب بغیر اعتراف کے دوسروں کی تحریر سے ماخوذ ہے۔ پہلی جدت کلیتاً "پنجاب میں اردو" سے لی گئی ہے۔ دوسری رسالہ "اردو" کے مختلف مضامین، شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" یا ان دونوں کے خوشہ چینیوں سے ماخوذ ہے، تیسری مولوی صاحب کے "مقدمۂ باغ و بہار" کی رہینِ منت ہے۔

("تنقیداتِ عبدالحق"، ص ۱۵۴)

ہر مصنف اپنے پیش رووں کی تحریروں سے استفادہ کرتا ہے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ بیلی نے محدود حجم کی کتاب میں متن میں مآخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ اتنے زیادہ شعرا کے حالات میں اگر وہ فرداً فرداً مآخذ کا حوالہ دیتے تو حوالے متن کے برابر ہو جاتے۔ انھوں نے کتاب کے آخر میں منتخب کتابیات دے دی ہے جسے مآخذ کا اعتراف مان لینا چاہیے۔ اب تینوں شقوں کو دیکھیے:

۱۔ بیلی نے کتابیات میں "پنجاب میں اردو" کو شامل کیا ہے۔ بیلی پنجاب میں قیام کر چکے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہاں انھوں نے محمود شیرانی سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا ہو، لیکن بیلی کا نظریہ سو فی صدی شیرانی کے مطابق نہیں۔ اس کی مماثلت ڈاکٹر زور کی "ہندوستانی فونیٹکس" (۱۹۳۰ء) سے زیادہ ہے۔ بیلی نے اپنے خیالات کو جس وضاحت سے پیش کیا، ویسے شیرانی نہ کر سکے۔

۲۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ دکن کے شاعروں کا بیان رسالہ "اردو" کے مضامین (ظاہراً خود مولوی صاحب کے) شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" اور ان دونوں کے خوشہ چینیوں سے ماخوذ ہے۔ مولوی صاحب نے ادھر توجہ نہیں کی کہ بیلی نے کتابیات میں "اردوے قدیم"، "دکن میں اردو"، عبدالجبار آصفی کے تذکرے "محبوب الزمن"، ڈاکٹر زور کی "اردو شہ پارے" اور رام بابو سکسینہ کی انگریزی "تاریخِ ادبِ اردو"، سب کو شامل کیا ہے۔ اپنے ماسبق مصنفوں کی تحریروں سے سبھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بیلی نے اسے پوشیدہ نہیں رکھا، ہاں ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ دکنیات کا بیان ان کی اولیات میں ہے۔ رام بابو سکسینہ نے ان سے پہلے دکنی کو اسی طرح نمایاں کیا ہے۔

۳۔ "چہار درویش" سے متعلق تحقیق پر بیلی کو فخر ہے۔ عبدالحق کہتے ہیں کہ یہ ان کے "مقدمۂ باغ و بہار" سے ماخوذ ہے۔ مولوی صاحب کی مرتبہ "باغ و بہار" ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی لیکن ان کا مضمون "باغ و بہار (قصۂ چہار درویش از میر امن)" رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ بیلی نے اپنی تاریخ ۱۹۲۹ء میں مکمل کر دی تھی۔ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے اس

Scanned by CamScanner

مضمون سے استفادہ کیا کہ نہیں۔ شیرانی کے مضمون (رسالہ "کارواں"، ۱۹۳۳ء) سے بھی پہلے انھوں نے زور دے کر لکھا۔

> یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ خسرو نے کبھی اس نام کی کتاب نہیں لکھی۔
> (اردو ترجمہ، ص۱۴۶)

مولوی صاحب کو اس تحقیق کی داد دینی چاہیے تھی۔

کتاب ظاہراً مختصر ہے لیکن اس میں حشویات کو دور رکھتے ہوئے اتنا مواد پیش کر دیا گیا ہے جو زیادہ ضخیم تاریخوں ہی میں مل سکتا ہے۔ مصنفوں کو نمبر شمار کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ کُل ۲۴۱ نمبر ہیں، لیکن حسبِ ذیل نو ادیب شاعری اور نثر دونوں کے تحت آ گئے ہیں جہاں انھیں مکرر نمبر دیا گیا ہے۔

جعفر زٹلی، سودا، انشا، رنگین، غالب، امیر مینائی، محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی۔ ان میں جعفر زٹلی، رنگین اور امیر مینائی کو نثر نگاروں میں جگہ دینا محض تکلف ہے۔ مکررات کو نفی کر کے کتاب میں کُل ۲۳۲ قلم کاروں کا تذکرہ ہے۔ نمبر شماری کی وجہ سے تذکراتی انداز آ گیا ہے، لیکن باب کے شروع یا آخر میں مختصر مجموعی جائزے سے یہ رنگ دھیما ہو جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق اس تاریخ میں ادیبوں کی ریل پیل پر یوں طنز کرتے ہیں:

> بعض ایسے مصنفوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو غالباً کسی بڑی تاریخ میں بھی قابلِ ذکر نہ سمجھے جاتے۔
> (تنقیدات، ص۱۵۲)
>
> اس چھوٹی سی کتاب کو، جس کا حجم سو صفحے سے زیادہ نہیں، ایسے شاعروں کے ذکر سے جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے ایسے اشخاص کے تذکرے سے جنھیں شاعر کہنا بدمذاقی کی دلیل ہے، زیر بار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعض ایسی بے حقیقت کتابوں کا ذکر کر دیا ہے جن کے مصنف گم نام و بے نشان ہیں اور بعض ایسے غیر معروف اور ناقابلِ لحاظ شاعروں کے نام آ گئے ہیں جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی۔ اس قسم کی مختصر کتابیں جزوی تذکروں اور لاحاصل اسم شماری کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ایک ادبی فہرست بن گئی ہے۔
>
> (تنقیدات، ص۵۴-۱۵۳)

مولوی صاحب کا یہ اعتراض برحق ہے۔ انھیں سودا کے دور کے دو مشہور شاعروں

عبدالولی عزلت مصنفِ "راگ مالا" اور خفیہ دردمند صاحبِ "ساقی نامہ" کے حذف پر حیرت ہے۔

بیلی نے سنین درج کرنے پر خصوصی توجہ کی ہے لیکن یہ سب سنین عیسوی ہیں۔ قدیم ادبیات میں تاریخیں ہجری سنہ میں ملتی ہیں جن کے متوازی دو سنینِ عیسوی پڑتے ہیں۔ جب تک ماہ و یوم مذکور نہ ہو، محض ایک سنہ عیسوی سے ایک سال کے سہو کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ قدما کا سنہ ولادت دینا بہت مخدوش ہے۔ اس کے لیے طویل بحث کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیلی جس دھڑلے سے قطعی سنہ ولادت درج کر دیتے ہیں، وہ خلافِ احتیاط ہے۔ سنہ وفات میں بھی متعدد صورتوں میں اختلاف برقرار رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیلی کے دیے ہوئے سنین میں بہ کثرت تسامح پایا جاتا ہے۔ مغربی محقق سے بہتر احتیاط کی توقع تھی۔

تمہید میں لکھتے ہیں کہ اردو میں ذیل کے تین اوزان سب سے زیادہ مقبول ہیں: (انھوں نے انگریزی نشانات میں لکھا ہے جسے میں عروضی ارکان میں پیش کر رہا ہوں۔)

۱۔ مفاعیلن مفاعیلن فعولن،

۲۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن،

۳۔ فعولن فعولن فعولن فعَل۔

پہلا وزن بہ صورتِ موجودہ مقبول ہونا تو درکنار، مستعمل ہی نہیں ہے۔ اس کا آخری رکن بھی فعولن کے بجائے مفاعیلن ہونا چاہیے تھا، بہ صورتِ دیگر ایک مفاعیلن کم کر کے مفاعیلن مفاعیلن فعولن لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن اردو کے مقبول ترین اوزان یہی تین نہیں، متعدد کئی دوسرے بھی ہیں، مثلاً:

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات یا فاعلن،

فاعلاتن مفاعلن فعلن،

مفعول مفاعلن فعولن،

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن، وغیرہ۔

بیلی تمہید میں اردو شاعری کی حسبِ ذیل خاص اصناف گناتے ہیں:

غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، تذکرہ، دیوان، کلیات، تخلص (ص ۳-۴)

تذکرہ صنفِ نثر ہے۔ دیوان، کلیات اور تخلص کو اصناف کے ذیل میں درج کرنا ستم ہے۔ اس سلسلے کے آخر میں عنوان ہے: "اردو کے اہم ترین شعرا" اس کے تحت جو درجہ بندی کی ہے، وہ بیلی کی وسعتِ مطالعہ اور ژرف بینی پر دال ہے۔ اس کا خلاصہ حامد حسن قادری نے بھی دیا ہے۔ (طبعِ دوم، ص ۸۰) میں ذیل میں درج کرتا ہوں:

Scanned by CamScanner

۱۔ سب سے اہم شعرا: ذیل کے زمرے مرتبے کے لحاظ سے ہیں، اور زمرے کے اندر نام تاریخی ترتیب سے ہیں:

الف۔ میر، غالب، انیس۔

ب۔ ولی، سودا، نظیر اکبر آبادی، اقبال۔

ج۔ درد، میر حسن، داغ، حالی، اکبر۔

۲۔ بہترین غزل گو بہ اعتبارِ درجہ: میر، ولی، درد، غالب، مصحفی، آتش، داغ، امیر۔

۳۔ بہترین قصیدہ گو: سودا، ذوق، نصرتی۔

۴۔ بہترین مرثیہ گو بہ اعتبارِ درجہ: انیس، دبیر، مونس، خلیق، ضمیر اور دکھنی شعرا ہاشم علی، مرزا۔

۵۔ بہترین مثنوی گو بہ اعتبارِ درجہ: میر حسن، اثر، میر، نسیم، مومن اور دکھنی شعرا غواصی، نصرتی، طبعی، وجہی۔

۶۔ شعرا جو عام شاعری (نظم) میں ممتاز ہیں، تاریخی ترتیب سے: محمد قلی قطب شاہ، نظیر، حالی، اکبر، کیفی دکنی، اقبال۔ گزشتہ پچاس سال میں مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ شاید یہ بہترین تھے: آزاد، جلال، تسلیم، اسماعیل، شاد۔

پچھلے سَو سال کی عظیم ترین نظم مسدسِ حالی ہے، بشرطے کہ ہم انیس کے مرثیوں کو ایک نظم نہ سمجھیں۔ (ص ۴)

اس درجہ بندی سے کئی جگہ اختلاف کیا جاسکتا ہے، مثلاً پہلے گروہ میں اقبال کو صفِ دوم کا شاعر قرار دے کر دوسرے زمرے میں رکھا۔ وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ۱۹۲۸ء تک "بانگِ درا" کے علاوہ ان کے دوسرے مجموعے سامنے نہیں آئے تھے۔ بہترین غزل گویوں میں غالب کو چوتھے نمبر پر رکھنا صحیح تنقیدی فیصلہ نہیں۔ بہترین مثنوی گویوں میں نسیم کے بعد قلق، نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی کا نام آنا چاہیے تھا، میر اثر کا ان کے بعد۔ بہرحال اس اختلافِ رائے کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ مستشرق بیلی کو اردو شعرا کی اضافی قدر کی اچھی گرفت تھی۔

پہلا باقاعدہ باب "اردو کی تاریخ" ہے۔ چونکہ مستشرقین کی لسانیات پر اچھی نظر ہوتی ہے اس لیے وہ اردو کے قدیم مصنفوں کی سی غلطیاں نہیں کرتے۔ نو صفحوں کے اس باب میں اتنا مواد سمایا ہوا ہے کہ یہ ایک لمبے مقالے میں ہونا چاہیے تھا۔ ان کا اردو کے آغاز کا وہی نظریہ ہے جو ان کے شاگرد ڈاکٹر زور نے پیش کیا اور یہ بالیقین بیلی کے زیرِ اثر ہوگا۔ بیلی لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

عام عقیدہ یہ ہے کہ دہلی کا مسلم لشکر فارسی بولتا تھا اور دہلی کے باشندے برج، لیکن یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ برج کبھی دہلی کی زبان تھی۔ دہلی کی زبان کھڑی بولی کی ابتدائی شکل تھی۔ محمود غزنوی نے ۱۰۲۷ء میں پنجاب فتح کیا۔ محمد غوری نے ۱۱۸۷ء میں غزنویوں سے پنجاب کو لیا، ۱۱۹۳ء میں دہلی فتح کی۔ اہم بات یہ ہے کہ اردو دہلی میں نہیں، لاہور میں شروع ہوئی۔ اس کی تہ نشین بولی کھڑی نہیں تھی، (برج کا تو سوال ہی نہیں،) بلکہ قدیم پنجابی تھی۔ اس وقت تک کی پنجابی اور کھڑی میں اتنا فرق نہ ہوگا جتنا اب ہے۔ جیسے ہی غزنوی افواج لاہور میں داخل ہوئیں اردو کا آغاز ہو گیا۔ اردو کے ارتقا کی دو منزلیں ہیں:

۱۔ ۱۰۲۷ء کے آس پاس لاہوری اردو جو قدیم پنجابی پر فارسی کی تہ چڑھنے سے بنی تھی۔

۲۔ ۱۱۹۳ء میں لاہوری اردو پر پرانی کھڑی کی تہ چڑھنے سے دہلوی اردو بنی۔ (ص ۷)

بیلی نے پنجابی اور اردو کے مزاج کے بنیادی اختلافات کی طرف توجہ نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے بیلی محمود شیرانی سے متاثر ہوئے اور بیلی کے درس سے ڈاکٹر زور۔ بعد میں بیلی دکن میں اردو کے پہنچنے، یعنی دکنی کے آغاز پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ تلاش کرتے ہیں کہ اصطلاح "کھڑی" اور "اردو" سب سے پہلے کب استعمال کی گئیں۔ انھوں نے واضح کیا کہ "کھڑی" کا "کھری" سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی کہا کہ "کھڑی" اور "اردو" میں امتیاز کرنا مشکل ہے بجز اس کے کہ کھڑی میں فارسی کے الفاظ بہت کم اور اردو میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق "کھڑی بولی" کو بہت تحقیر سے دیکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر بیلی نے "کھڑی" اور "کھری" کے معنی تقریباً وہی رکھے جو "کھری" کے ہیں۔ دوسرا غضب یہ کیا ہے کہ کھڑی بولی کو ایک خاص زبان قرار دیا اور اس کی دو شاخیں بتائی ہیں، ایک ہندی اور دوسری اردو۔ ان کا یہ خیال صحت سے اسی قدر بعید ہے جس قدر ان کے پیش رو یورپی مصنفین کا۔

(تنقیدات، ص ۱۶۲)

دیکھیں، بیلی نے اس موضوع پر کیا لکھا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی زبانوں کی گروہ بندی بھی کی اور گریرسن کی طرح پنجابی اور لہندا کو الگ الگ رکھا۔ حالانکہ یہ اس قدر مختلف

Scanned by CamScanner

نہیں۔ ہندی، کھڑی اور اردو کی مختلف شکلوں کا بھی ذکر کیا جس سے عام طور پر اتفاق کیا جائے گا، یعنی:

۱۔ لفظ "ہندی" دو معنی میں استعمال کیا جاتا ہے؛ وسیع معنی میں بہار، یوپی، صوبہ متوسط، راجپوتانہ اور جنوب مشرقی پنجاب (موجودہ ہریانہ) کی زبان۔ تنگ معنی میں کھڑی بولی اور برج کے معنی میں۔ (ص ۸)

۲۔ کھڑی کے تین روپ ہیں: اردو، ادبی ہندی، ہندوستانی، جو آسان اردو سے مختلف نہیں۔ (ص ۱۳)

۳۔ بول چال کی اردو کی دو شکلیں ہیں: ۱۔ دکنی یا دکھنی ۲۔ شمالی اردو (ایضاً)

بیلی کے نظریۂ پنجابی سے اختلاف کے باوجود ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو، ہندی، کھڑی بولی کے معاملے میں ان کی اصابت رائے اور سلیم الطبعی کی داد دینی ہو گی۔

دوسرا باب دکنی اردو سے متعلق ہے، جیسا کہ انھوں نے دیباچے میں کہا ہے انھوں نے اسے حتی الامکان مفصل بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ص ۱۴ سے ۳۷ تک یعنی ۲۴ صفحوں کو محیط ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ متنِ کتاب کا ایک چوتھائی حصہ اسے دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کی اردو کی عمومی تاریخوں، مثلاً "گلِ رعنا"، "شعرالہند" اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ، میں دکنیات اتنی تفصیل سے نہیں ملتی۔ اس باب میں انھوں نے ۹۲ اہل قلم کا ذکر کیا ہے جن میں نو کے علاوہ بقیہ سب دکن کے ہیں۔ ان نو میں سے کچھ پنجاب کے اور کچھ گجرات کے ہیں۔ ہم اہلِ گجرات کو بھی دکن میں شامل کر سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ یہ باب ۳۸۰ سال کو محیط ہے۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ مذہبی دور ۱۳۵۰ء تا ۱۵۹۰ء۔

۲۔ ادبی دور ۱۵۹۰ء تا ۱۷۳۰ء۔

بیلی کو نصیر الدین ہاشمی کی دکن میں اردو اور شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" میسر تھیں جس کی وجہ سے وہ دکنیات پر تفصیل سے لکھ سکے لیکن ان کتب میں، نیز اس دور تک تحقیق بہت تشنہ تھی، لہٰذا ان کے کئی بیانات اب درست نہیں مانے جاتے۔ بیلی نے ابتدا میں شیخ عین الدین گنج العلم اور خواجہ بندہ نواز کے رسائل کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۱۶) اب ثابت ہو چکا ہے کہ ان بزرگوں نے اردو نثر میں کچھ نہیں لکھا۔ نمبر ۳ پر بندہ نواز کے کسی مُرید کی "ہفت اسرار" کا ذکر ہے۔ اس رسالے کا نام شمس اللہ قادری نے لیا ہے، لیکن یہ بھی معدوم ہے۔ نمبر ۴ پر بندہ نواز کے نبیرہ عبداللہ حسینی کے ترجمۂ "نشاط العشق" کا اندراج ہے۔ اس کا ذکر اسٹیوارٹ نے اپنی "فہرستِ کتب خانۂ شاہانِ میسور" میں کیا تھا۔ یہ بھی بالکل ناپید

Scanned by CamScanner

ہے۔

نمبر ۵ پر شاہ میراں جی شمس العشاق سے چند مثنویاں اور تین نثری رسالے منسوب کیے گئے ہیں۔ مثنویوں کا انتساب درست ہے، نثری رسالوں میں سے "شرحِ مرغوب القلوب" ان کی نہیں، میراں جی خدانما کی تالیف ہے۔ "جل ترنگ" اور "گل باس" کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس طرح نمبر ۶ شاہ برہان الدین جانم سے پہلے اردو کی کسی نثری کتاب کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ بیلی نے میراں جی اور شاہ جانم کی بعض مثنویوں کی سطور کی تعداد درج کی ہے۔ سطر سے ان کی مراد مصرع ہے۔ تعداد کو نصف کرنے سے اشعار کی تعداد بر آمد ہوگی۔

بیلی نے دیباچے کے صفحت نامے میں لکھا ہے کہ میراں جی، شاہ برہان اور امین الدین اعلیٰ کے بیچ باپ، بیٹے اور پوتے کا رشتہ مانا جاتا ہے، لیکن درمیان میں ایک دو پشتیں غائب معلوم ہوتی ہیں۔ بیلی کو یہ شبہہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے ان حضرات کی جو تاریخیں دی ہیں ان کے بیچ کافی تفاوت ہے۔ نئی تحقیق نے ان میں تصحیح کر دی ہے، مثلاً انھوں نے میراں جی کا سنہ وفات ۱۴۹۶ء دیا ہے جو برابر ہے، ۹۰۲ھ کے۔ میری رائے میں صحیح ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء ہے۔ جانم کی وفات ۱۵۸۷ء میں دکھائی ہے، حسینی شاہد کے مطابق ۱۰۰۷ھ/۹۹-۱۵۹۸ء درست ہے۔ میراں جی خدانما کا سنہ وفات ۱۶۹۵ء اور ان کی شرح شرحِ تمہید کا سنہ ۱۶۰۰ء دیا ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق خدانما ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء میں فوت ہوئے اور ان کی تالیف کا سنہ ۱۰۶۶ھ (۵۶-۱۶۵۵ء) ہے۔ (جلد ۱، ص ۴۹۶، ۴۹۸) بیلی نے صین الدین اعلیٰ کا عرصۂ حیات ۱۵۸۲ء تا ۱۶۷۵ء لکھا ہے، حسینی شاہد کے مطابق ۱۵۹۹ء تا ۱۶۷۴ء ہے۔

ص ۱۷ پر ایک مجہول الاسم کتاب "مفتاح الخیرات" کا ذکر ہے جو غالباً ۱۶۳۰ء کے قریب لکھی گئی۔ اس کا ذکر "دکن میں اردو" ص ۱۶۴ (بیورو ایڈیشن) میں ملتا ہے لیکن وہاں کوئی سنہ مذکور نہیں۔ اسی صفحے کے نمبر ۱۰ پر عبداللہ کی "احکام الصلوٰۃ" کا سنہ ۱۶۶۲ء لکھا ہے۔ "دکن میں اردو" کے مطابق ۱۰۳۲ھ/۲۳-۱۶۲۲ء ہے۔ (دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۶۴) اس کے بعد بیلی نے دکن سے ہٹ کر گجرات اور پنجاب کے نو مصنفوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چار گجرات کے اور پانچ پنجاب کے ہیں۔ پنجاب کے بعض مصنفین کا سنہ وفات تحقیق طلب ہے۔

دکن کے ادبی دور (۱۵۹۰ء تا ۱۷۳۰ء) کو انھوں نے چار عنوانات کے تحت دیا ہے:
۱۔ قطب شاہی شعرا، ۲۔ عادل شاہی شعرا، ۳۔ دکن میں اردو ادب مغلوں کے عہد میں (۱۶۸۷ء تا ۱۷۳۰ء)، ۴۔ دکن میں ولی کے خورد معاصرین۔

Scanned by CamScanner

قلی قطب شاہ پر تفصیل سے لکھ کر اس کی تین نظموں کے منظوم انگریزی ترجمے دیے ہیں۔ اسی طرح وجہی کی دو نظموں کا بھی منظوم ترجمہ دیا ہے۔ واضح ہو کہ بیلی کی تاریخِ ادب میں نثر و نظم کا کوئی نمونہ اردو زبان میں نہیں دیا۔ صرف دو چار شعرا کے کلام کا انگریزی ترجمہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ کلیات قلی قطب شاہ میں تقریباً ایک لاکھ سطریں ہیں۔ (ص ۲۰) ظاہر ہے کہ سطر سے ان کی مراد مصرع ہے۔ کلیات کے مدونِ اول محمد قطب شاہ کے مطابق اس میں ۵۰ ہزار شعر تھے، لیکن موجودہ نسخوں میں بہت کم ہیں۔ ان جزئیات پر مولوی عبدالحق کا تبصرہ حسب ذیل ہے:

> محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر تفصیلی رائے، اس کے اشعار اور صفحات کی تعداد نہایت وثوق کے ساتھ لکھی، حالانکہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے شریکِ جُرم نے کلیاتِ قلی قطب شاہ کی صورت تک نہیں دیکھی اور یہ سب تفصیلات لفظ بلفظ ان دونوں صاحبوں نے رسالہ "اردو" کے مضمون سے نقل کی ہیں، لیکن حوالہ دینا ان کے مذہب میں روا نہیں۔ یہی حال ہم شمس العشاق، برہان الدین جانم، ذوقی وغیرہ کے حالات میں دیکھتے ہیں۔
>
> (تنقیدات، ص ۱۵۷)

شریکِ جُرم سے مراد ڈاکٹر زور ہیں۔ رسالہ "اردو" کے مضامین سے مراد مولوی صاحب کے حسبِ ذیل مقالے ہیں:

۱۔ کلیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ۔ "اردو"، جنوری ۱۹۲۲ء، ۲۔ بیجاپور کے اولیاءاللہ کا ایک شاعر خاندان۔ "اردو"، جولائی ۱۹۲۷ء، ۳۔ "سب رس" منظوم، "اردو" جولائی ۱۹۲۵ء۔

غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال میں ۱۴ ہزار سطور (۷ ہزار شعر) لکھی ہیں۔ (ص ۲۴) لیکن موجودہ نسخوں میں دو ہزار سے کم ہی ہیں۔ شاعر نمبر ۷۳ محمد امین کو "قصۂ ابو شحمہ" کا مصنف لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں تصحیح کی کہ اس مثنوی کا مصنف "اولیا" ہے، امین نہیں۔ (تنقیدات، ص ۱۵۵)

مرزا مرثیہ گو کی ایک مثنوی "جنگ نامہ" کا ذکر کر کے قوسین میں مشکوک لکھتے ہیں: (ص ۲۷)

دراصل "جنگ نامۂ محمد حنیف" کا مصنف سیوک مرثیہ گو ہے۔ (جمیل جالبی، تاریخ جلد اول، ص ۵۱۳) شاہ قلی خاں شاہی مرثیہ گو کا وطن بھلو نگر لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق کے

Scanned by CamScanner

MANISHA JAWAID

مطابق یہ بھاگ نگر حیدر آباد کا تھا۔ فائز کی "رضوان شاہ و روح افزا" کے اشعار کی تعداد ۸۵۰ لکھی ہے۔ جالبی کے مطابق ۲۵۰۰ ہے۔ (جلد اوّل، ص ۵۱۴)

اس کے آگے عادل شاہی شعرا کا ذکر ہے، جن میں سرِ فہرست ابراہیم عادل شاہ ثانی ہیں۔ ان کی "نورس نامہ" کو موسیقی کی کتاب لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ابراہیم کے گیتوں کا مجموعہ ہے جس میں ہر گیت کے ساتھ اس راگ کی صراحت کر دی ہے، جس میں یہ گایا جانا چاہیے۔ بیلی نے نورس کی زبان کے لیے لکھا ہے۔ "یہ نظم دکھنی زبان میں ہے۔" مولوی صاحب بجا تردید کرتے ہیں کہ نورس کی زبان دکھنی نہیں، ہندی ہے۔ (تنقیدات، ص ۱۵۸) بیلی نے امین کی مثنوی "بہرام و بانو حسن" کی تاریخ تقریباً ۱۶۲۰ء لکھی ہے۔ (ص ۲۸) معلوم نہیں اس کا ماخذ کیا ہے، کیونکہ عام طور سے اس نامکمل نسخے کی تاریخ نہیں ملتی۔

ملک خوشنود کی مثنوی کا نام "بہرام" لکھا ہے۔ (ص ۲۸) عام طور سے اسے "ہشت بہشت" سمجھا جاتا ہے، لیکن سخاوت مرزا نے تصحیح کی کہ اس کا نام "جنت سنگار" ہے۔ (سخاوت مرزا، "تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل، مرتبہٗ عبدالقیوم، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۸۶) بیلی نے اس کی دوسری مثنوی "یوسف زلیخا" کا ذکر کر کے اسے خسرو کی شاعری سے مماثل قرار دیا، لیکن یہ اہم معلومات نہیں دی کہ خوشنود کی یوسف زلیخا ناپید ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق خوشنود اور خسرو میں سے کسی نے "یوسف زلیخا" نہیں لکھی۔ ص ۳۰ پر سیوا کی کتاب "قانونِ اسلام" کا ذکر ہے۔ مجھے اس کا نام بھی کہیں اور نہ مل سکا۔ معلوم نہیں یہ کسی غلط فہمی پر تو مبنی نہیں۔

ہاشمی کی یوسف زلیخا کو ۱۲۰۰۰ سطروں (یعنی ۶۰۰۰ شعروں) کی نظم قرار دیا ہے لیکن میرے ایک شاگرد سید نصرت مہدی کے مطابق یہ مثنوی تقریباً ۵۱۰۰ شعروں پر مشتمل ہے۔ (۱) بیلی نے اس بات کی تردید کی ہے کہ اس مثنوی میں زلیخا کے مکالموں کی بنا پر اسے ریختی کا پہلا شاعر کہا جائے گا۔ (ص ۳۰) اس تردید کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے خود بیلی کے ذہن میں ریختی کا تصور واضح نہیں ہے۔ بیلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہاشمی نے ایک اور مثنوی "احسن القصص" چھوڑی۔ مولوی عبدالحق اس پر لکھتے ہیں:

> یہ غلطی بچوں کی سی ہے۔ یہ عبارت لفظ بہ لفظ "اردو شہ پارے" سے نقل کی ہے۔ تعجب ہے کہ اَن پڑھ مسلمان بھی یہ جانتے ہیں کہ قرآن میں یوسف زلیخا کے قصے کو "احسن القصص" کے نام سے یاد کیا ہے۔ (ص ۱۵۶)

Scanned by CamScanner

قطب شاہی اور عادل شاہی شعرا کے بعد عہدِ مغلیہ کے دکنی شعرا کو لیا ہے۔ ان کے ذیل میں عاجز تخلص کے دو شاعروں کا ذکر کیا: محمد علی عاجز مصنف "قصہ ملکہ مصر" اور عارف الدین عاجز مصنف "قصہ لیلیٰ مجنوں۔" (ص ۳۰) پہلے عاجز کے بارے میں مولوی عبد الحق نے وضاحت کی کہ نہ اس کا نام محمد علی ہے نہ تخلص عاجز۔ اس نے خود اپنی تصنیف میں اپنا نام اور تخلص محمود لکھا ہے۔ (تنقیدات، ص ۱۵۶) ابتدائی اشعار میں اس نے اپنے لیے لغوی معنی میں عاجز کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ ولی اللہ قادری نے فارسی "معرفت السلوک" کا ترجمہ ۱۶۸۸ء میں کیا۔ سنہ درست نہیں ہے۔ جالبی کے مطابق صحیح سنہ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء ہے۔ (جلد اول، ص ۳۰۶) قادری کے فوراً بعد شیخ داؤد ضعیفی کی ایک بے نام مثنوی کا ذکر کرتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کا نام "عشقِ صادق" لکھا ہے۔ ("دکن میں اردو"، ص ۳۱۰)

امین مصنف "یوسف زلیخا" کی مثنوی کا صحیح سنہ درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ امین نمبر ۳ (مصنف "قصہ ابو شحمہ") اور امین نمبر ۴۵ (مصنف "بہرام و بانو حسن") سے مختلف ہے۔ سچ یہ ہے کہ قطب شاہی امین نمبر ۳ مصنف "قصہ ابو شحمہ" کا وجود ہی نہیں۔ یہ مثنوی اولیا نے لکھی ہے۔ ص ۳۲ نمبر ۶۶ پر عہدِ اورنگ زیب کے احمد گجراتی مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے لیکن مزید تفصیل نہیں دی۔ قلی قطب شاہ کے عہد میں ایک مشہور شاعر احمد گجراتی مصنف "لیلیٰ مجنوں" ہوا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس سے ایک مثنوی "مصیبت اہلِ بیت" بھی منسوب کی ہے۔ ("دکن میں اردو"، ص ۱۱۷) لیکن اس کی زبان کی بنا پر ڈاکٹر زور اور سیدہ جعفر نے اسے بعد کی تصنیف قرار دیا ہے۔ (۲) دوسری طرف سخاوت مرزا اور مشفق خواجہ نے احمد گجراتی کی مثنوی "وفات نامہ حضرت فاطمہ" ۱۱۴۳ھ/۱۷۴۲ء کا تعارف کرایا ہے۔ (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، چھٹی جلد، ص ۵۱۳) یہ عہدِ اورنگ زیب سے بعد کی ہوئی۔ ممکن ہے آخر الذکر دونوں احمد ایک ہوں اور بیلی نے اسی کا ذکر کیا ہو۔

اسی ص ۳۲ پر ابوطالب کو حیدر آباد کا شاعر کہا ہے۔ مولوی عبد الحق کے مطابق وہ قصبہ بلنڈہ، مضافات اورنگ آباد کا رہنے والا تھا۔ (تنقیدات، ص ۱۵۷) اسی صفحے پر شاہ بیر اللہ مجری کی مثنوی "گلشنِ حسنِ دل" ("سب رس" منظوم) کا ذکر ہے۔ مولوی صاحب چٹکی لیتے ہیں:

> اس کا اصل نام "گلشنِ جشنِ دل" ہے۔ راقم نے اس کتاب کا ذکر اپنے ایک مضمون رسالہ "اردو" میں کیا ہے۔ کاتب نے غلطی سے جشن کی بجائے حسن لکھ دیا۔ مؤلفِ شہ پارے نے اپنی کتاب میں

Scanned by CamScanner

(بغیرِ حوالہ) نقل کردیا اور ڈاکٹر بیلی نے نقل در نقل۔ کتاب استاد شاگرد دونوں نے نہیں دیکھی۔

(تنقیدات، ص ۵۷-۱۵۶)

عجیب بات ہے کہ اس مثنوی کا نام ہر جگہ "گلشنِ حسن ودل" یا "گلشنِ حسنِ دل" ہی ملتا ہے۔ "سب رس" کے محققین ڈاکٹر نورالسعید اختر (۳) اور ڈاکٹر منظر اعظمی (۴) دونوں نے "گلشنِ حسن ودل" لکھا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کا رسالہ "اردو" کا مضمون جب ان کے مجموعے "قدیم اردو" میں چھپا تو وہاں بھی اس کا نام "گلشنِ حسنِ دل" دیا ہے۔ ("قدیم اردو"، ص ۲۵۴) لیکن ان کے ایک اور مضمون "سب رس از ملا وجہی" میں اس کا نام "گلشنِ جشنِ دل" لکھا ہے۔ ("قدیم اردو"، ص ۲۴۷) نورالسعید اختر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ اکبرالدین صدیقی کے مطابق مجری کا نام ببرالله ہے نہ کہ بیرالله۔ ("نقوشِ دکن"، ص ۲۶)

اس دور میں بیلی نے متعدد غیر اہم، غیر معروف شعرا کا ذکر کیا ہے، مثلاً محمود بیگ بیجاپوری، فخری، ابوطالب طالب، صباحی احمد آبادی، عراقی وغیرہ۔ ان کی کوئی خاص تفصیلات نہیں دیں۔ اس طرح ناموں کی بھرمار سے تذکرہ نگاری کا رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ محبوب عالم شیخ جیون کے "دردنامہ" کا ذکر کر کے ان سے مزید تین مشکوک تصانیف منسوب کیں: "محشر نامہ"، "خواب نامہ" اور "دبیز نامہ"۔ ساتھ ہی یہ لکھا کہ یہ غالباً دکھنی مصنف تھے۔ (ص ۳۳-۳۲)

اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں۔ شیرانی نے اپنے مضمون "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" ("اورینٹل کالج میگزین"، لاہور، نومبر ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۲ء) میں واضح کیا کہ شیخ جیون محبوب عالم سے علاحدہ ایک شخص ہے۔ اس غلط فہمی کو رائج کرنے کی ذمےداری اسپرنگر کی ہے۔ "محشر نامہ" بالیقین محبوب عالم کی تصنیف ہے، جب کہ "خواب نامہ" اور "دبیز نامہ" دراصل شاہ عبدالحکیم مہی کی ہیں۔ محبوب عالم کو دکھنی مصنف سمجھنے کا کوئی جواز نہیں۔

وجدی کی مثنوی کا نام "تحفۂ عاشقین" لکھ کر اسے فریدالدین عطار کی فارسی "خسرونامہ" سے ماخوذ کیا۔ (ص ۳۲) مولوی عبدالحق نے تصحیح کی کہ اس کا صحیح نام "تحفۂ عاشقاں" ہے۔ تعجب ہے کہ وجدی کی سب سے مشہور مثنوی "پنچھی باچھا" کا ذکر نہیں کیا۔ (تنقیدات، ص ۱۵۸) نصیرالدین ہاشمی کے مطابق "تحفۂ عاشقاں" عطار کی "گل و ہرمز" کا ترجمہ ہے۔

Scanned by CamScanner

ولی پر تفصیل سے لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ اس زمانے کی معلومات ہی پر تکیہ کر سکتے تھے۔ بعد کی تحقیق نے ان کے کئی بیانات میں ترمیم کر دی ہے، مثلاً اس کا نام شمس الدین ولی اللہ، وطن اورنگ آباد اور سنہ وفات ۱۷۴۱ء لکھا ہے۔ ویسے یہ بھی اضافہ کر دیا ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں وہ گجراتی الاصل تھے۔ (ص ۳۴-۳۳)

ظہیر الدین مدنی نے ولی کا مولد اور وطن احمد آباد ٹھہرایا۔ جمیل جالبی نے قریب ترین روایتوں کے مطابق ان کا نام ولی محمد طے کیا اور مولوی عبدالحق نے ولی کا سنہ وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء طے کیا۔ بیلی نے صراحت کر دی ہے کہ مثنوی "روضۃ الشہدا" اس ولی کی نہیں، بلکہ ولی ویلوری کی ہے۔

آخری جزو دکن میں ولی کے خورد معاصرین کا ہے، جس میں ایڈنبرا کی بیاضِ مراثی کا تعارف کرایا ہے۔ اس سے لے کر کئی غیر مشہور مرثیہ گویوں کے نام درج کیے ہیں۔ اہم اور غیر اہم کی تمیز نہ کرنے پر مولوی عبدالحق کی جھلاہٹ برحق ہو جاتی ہے۔ سید محمد، صابر، عارم، قیاسی وغیرہ کو کون جانتا ہے؟ نمبر ۸۲ کے شاعر کا نام یتیم احمد لکھا ہے۔ محمد عظیم، تاریخِ بیلی کے مترجم کے مطابق صحیح تبسم احمد ہے۔ (ترجمہ اردو، ص ۷۰، حاشیہ)۔ نمبر ۸۸ پر سید محمد کی مثنوی "فیضِ عام" ۱۷۲۷ء کا ذکر ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے تصحیح کی کہ اس کا نام سید محمد نہیں، عبدالمحمد ہے جیسا کہ اس نے خود مثنوی میں کہا ہے۔ نصرت مہدی کے مطابق مثنوی "فیضِ عام" کی صحیح تاریخ ۱۱۴۱ھ/۲۹-۱۷۲۸ء ہے ("اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ"، ص ۱۱۰) نمبر ۹۱ کے عبدالحئی خاں صارم کو لکھا ہے کہ وہ نظام حیدر آباد آصف جاہ کا پہلا وزیر تھا۔ مولوی عبدالحق کے مطابق وہ پہلا وزیر نہیں، اس کا باپ عبدالرزاق صمصام الدولہ شاہ نواز خاں مؤلف "مآثر الامرا" و "بہارستانِ سخن" پہلا وزیر تھا۔ اس باب میں بیلی نے آخری نام سید عبداللہ قیاسی کا لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق اس کا نام سید عبداللہ نہیں سیدی عبداللہ ہے۔ (تنقیدات، ص ۱۵۸)

تیسرا باب "دلی میں اردو شاعری کی پہلی صدی (۱۸۳۰-۱۷۳۰ء)" ہے۔ تمہید میں ان فارسی شعرا کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے اردو میں بھی کچھ لکھا، مثلاً مرزا معز، قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں وداد، سعد اللہ گلشن اور آرزو وغیرہ۔ آرزو کے لیے لکھتے ہیں کہ انھوں نے دو اردو لغات "نوادر القرض" اور "غرائب اللغات" لکھیں۔ (ص ۳۹) مولوی عبدالحق نے تصحیح کی کہ آرزو کی تصنیف کا صحیح نام "نوادر الالفاظ" ہے جب کہ "غرائب اللغات" عبدالواسع ہانسوی کی تصنیف ہے۔ (تنقیدات، ص ۱۵۸) دراصل "نوادر الالفاظ" "غرائب اللغات" ہی پر مبنی ہے۔ آرزو کو آخر الذکر میں سے جن الفاظ کے معنی غلط معلوم ہوتے ان

Scanned by CamScanner

کی تصحیح کی اور بہت سے نئے الفاظ شامل کر کے "نوادر الالفاظ" تیار کی۔

اس عہد میں اردو پر جس شدت سے فارسی اثرات حاوی ہونے لگے ان کا ذکر کرتے ہوئے بڑی اصابت رائے سے لکھتے ہیں کہ جسے زبان کی صفائی کہا گیا وہ دراصل اس کو فارسیانا (فارسی رنگ دینا) تھا۔ شاعری زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور غیر ہندوستانی ہو گئی۔ اب اردو میں ہر چیز بدیسی، مصنوعی اور خارجی ہو گئی۔

(ص ۴۰)

اس باب کے تین حصے کیے ہیں: ۱۔حاتم کا دور، ۲۔ مظہر، سودا، میر اور درد کا دور، ۳۔انشا، مصحفی اور نظیر کا دور۔

ایک بار پھر عمائد کی تعیین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس باب کے سب سے عظیم شاعر شاید سب سے پہلے میر اور پھر سودا اور نظیر اور آخر میں میر حسن اور درد ہیں۔ سب سے عظیم نظم میر حسن کی "سحرالبیان" اور "گل زار ارم" اور "خواب و خیال" ہیں۔ (ص ۴۲) شعرا کے بارے میں ان کی درجہ بندی پر اعتراض نہیں لیکن "گل زار ارم" اور "خواب و خیال" کو عظیم نظم کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اس باب کا پہلا شاعر محمد افضل ہے۔ لکھتے ہیں کہ وہ ۱۶۲۵ء میں مرا اور دکن یا جھنجھانہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا "بارہ ماسہ" ہندی اوزان میں ہے۔ ایک دکنی شاعر افضل شاید یہی ہے اور اس نے پیر حضرت عبدالقادر جیلانی کی سوانح لکھی۔ (ص ۴۲)

بیلی نے افضل کے بارہ ماسے کے موضوع پر جو کچھ لکھا مجھے اس سے اتفاق ہے، لیکن مندرجہ بالا جزئیات سے نہیں، مثلاً اس کا نام محمد افضل محلِ نظر ہے۔ خود اس کی "بکٹ کہانی" کے ایک نسخے میں اور قریب ترین روایت "تیرہ ماسہ" از اکرم قطبی رہتکی میں اس کا نام گوپال درج ہے۔ اس کا سنہ وفات معلوم نہیں۔ ۱۶۲۵ء تذکرہ قائم کے ایک بیان کو غلط سمجھنے کے باعث لکھا گیا۔ اسے دکنی شاعر کہنا بالکل غلط ہے۔ دکن کا محمد افضل عبداللہ قطب شاہ کے دور کا، مصنف محی الدین نامہ، ایک اور شاعر ہے۔ افضل کی مثنوی ہندی اوزان میں نہیں، اردو کی بحر ہزج میں ہے۔

جعفر زٹلی کے لیے ایک عجیب بات لکھی ہے کہ اسے یہ لقب ایک شہزادی نے دیا تھا (ص ۴۲) میں نے یہ بات کہیں نہیں پڑھی۔ جعفر کی دو سو سطور (۱۰۰ شعروں) کی سوانحی نظم "سلوک" کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس عنوان کی اور اتنی طویل کوئی سوانحی نظم نہیں ملتی۔ جعفر کی دو نظموں کے انگریزی منظوم ترجمے دیے ہیں۔ آبرو کا زمانہ تقریباً ۱۶۹۲ء تا ۱۷۴۷ء ٹھہراتے ہیں۔ جمیل جالبی کے مطابق آبرو تقریباً ۱۶۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۳۳ء میں

Scanned by CamScanner

انتقال کیا (جلد ۲، حصہ اول، ص ۲۱۲)

بیلی کا یہ کہنا غلط ہے کہ آبرو دراصل لکھنؤ کے تھے اور لڑکپن میں دہلی منتقل ہو گئے (ص ۴۴) آبرو کا وطن مالوف گوالیر تھا۔

سودا کے لیے لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ دہلی ہی میں ۱۱۶۵ھ سے قبل دربار دہلی سے یہ خطاب مل چکا تھا۔ سودا کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ وہ جہاں جاتے ان کا نوکر قلم دان لیے ان کے ساتھ رہتا۔ جس پر ناراض ہوتے، وہیں اس کی ہجو لکھ دیتے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ سودا کے غلام غنچہ کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں آیا۔ صرف آزاد نے "آب حیات" میں لکھا ہے (تنقیدات، ص ۱۵۹) "آب حیات" کی تقلید میں بیلی نے میر کی ایک مثنوی کا نام "تنبیہ الخیال" دیا ہے (ص ۴۹) صحیح "تنبیہ الجہال" ہے۔

لکھتے ہیں کہ ایک مصنف نے خوب کہا ہے کہ اردو کے ہر دور میں شعرا کے جوڑے ہوئے ہیں جن میں سے ایک فطری شاعر تھا، دوسرا تصنع آمیز جو زیادہ تر ہوا باندھنے کے لیے لکھتا تھا۔ ایسے جوڑے حسب ذیل ہیں جن میں کا پہلا شاعر فطری ہے:

میر و سودا، مصحفی و انشا، آتش و ناسخ، غالب و ذوق، داغ و امیر (ص ۵۰)

بیلی نے راوی کا نام نہیں دیا، لیکن ان کا ماخذ "شعر الہند" ہے جہاں عبدالسلام ندوی نے اپنے کسی مجہول الاسم دوست کا قول نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے سودا، انشا اور امیر کو بے تامل غیر فطری شاعر نہیں کہہ سکتے۔ بیلی نے قائم کے لیے لکھا ہے کہ انھیں سب سے زیادہ کام یابی رباعی گوئی میں ہوئی۔ ان کا کلام سنہ ۱۷۵۴ء میں طبع ہوا۔ مولوی عبدالحق نے ان دونوں بیانات کو غلط قرار دیا ہے۔ اتفاق سے تنقیدات میں قائم کا سنہ اشاعت ۱۹۲۷ء درج ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ تسامح مولوی صاحب کا ہے کہ کاتب کا؟ بیلی نے میر سوز کے لیے لکھا ہے کہ وہ دہلی سے ۱۷۷۷ء میں گئے۔ مولوی صاحب نے اس سنہ کی تغلیط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سوز ۱۷۵۷ء کے لگ بھگ دہلی سے فرخ آباد گئے۔ بیلی نے یہ بھی لکھا تھا کہ سوز کا کلام زیادہ نہیں ہے، تقریباً ۶۳۰۰ اشعار ہیں (ص ۵۱)

مولوی صاحب کے مطابق سوز کا کلام ضخیم ہے۔

ص ۵۳ پر مصحفی کے صرف ایک تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ مولوی صاحب نے تصحیح کی کہ مصحفی نے ایک نہیں، تین تذکرے لکھے ہیں۔ بیلی نے انشا کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ آزاد نے انشا کے آخری دور کے بارے میں مبالغے سے کام لیا ہے، لیکن ان کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ انشا کو جنون نہیں ہوا تھا۔ عابد پیشاوری نے

Scanned by CamScanner

اپنے مقالے "انشاء اللہ خان انشا" (لکھنؤ ۱۹۸۵ء) میں انشا کی دیوانگی کی تفصیل دی ہے۔
بیلی نے انشا کی جس نثر کا نام کہانی ٹھیٹھ ہندی میں" لکھا ہے وہ "رانی کیتکی کی کہانی" ہے۔

رام بابو سکسینہ کی طرح بیلی نے بھی نظیر کی عظمت کی داد دی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اپنے زمانے میں اس کی کوئی قدر نہیں ہوئی، لیکن اب اسے اردو کے چوٹی کے چھ یا سات شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے اور سودا کی بغل میں جگہ دی جاتی ہے (ص ۵۸)

میں نے اس باب میں وقتاً فوقتاً بیلی کے مذکورہ بعض سنین سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے جو سنینِ ولادت و وفات لکھے ہیں ان میں سے کئی محلِ نظر ہیں کیونکہ بعد کے محققوں نے کچھ اور طے کیے ہیں اور وہ صحیح ہونے چاہییں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

بیلی کا مذکورہ سنہ	بعد کے محققوں کا فیصلہ
ص ۴۵ مضمون ف ۱۷۴۵ء کے قریب	جمیل جالبی: ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء (جلد ۲، ص ۲۵۷)
ص ۴۵ حاتم فوت ۱۷۸۱ء یا ۱۷۹۲ء	صحیح ۱۷۸۳ء
میر کی ولادت ۱۷۲۴ء	صحیح ۱۷۲۳ء (اواخرِ ۱۱۳۵ھ)
ص ۵۰ قائم ف ۱۷۸۷ اور ۱۷۹۵ء کے بیچ	صحیح ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء (جالبی جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۶۴)
ص ۵۰ میر درد پ ۱۷۱۹ء	جالبی: ۲۱-۱۷۲۰ء (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۲۳)
ص ۵۲ بیدار ف ۹۷-۱۷۹۳ء کے بیچ	جالبی: ۱۷۹۶ء (ایضاً ص ۹۰۱)
ص ۵۵ جعفر علی حسرت ف ۱۷۹۱ء اور ۱۸۰۲ء کے بیچ	مالک رام: ۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء ("تذکرۂ ماہ و سال")
ص ۵۶ رنگین ف ۱۸۳۴ء	صحیح: ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء
ص ۵۷ یقین ف تقریباً ۱۸۵۰ء میں احمد شاہ کے عہد میں (۵۴-۱۷۴۸ء)۔ ۱۸۵۰ء تخریب ہے ۱۷۵۰ء کی	جالبی: ۱۱۶۹ھ/۵۵-۱۷۵۴ء (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۳۷۷)
ص ۵۷ ہدایت ف ۱۸۰۰ء	جالبی: ۱۲۱۹ھ/۰۵-۱۸۰۴ء (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۱۷)

Scanned by CamScanner

ص۵۸ راسخ ف ۱۸۲۲ء	مالک رام: ۱۸۲۳ء
ص۵۸ نظیر پ ۱۷۴۰ء	علی احمد فاطمی: ۱۷۳۵ء ("نظیر اکبر آبادی"، الہ آباد، ۱۹۸۴ء، ص۳۶)

چوتھا باب ہے "لکھنؤ میں اردو شاعری انیسویں صدی میں۔" اس باب میں خاص طور سے چند جوڑوں: خلیق و ضمیر، آتش و ناسخ اور انیس و دبیر پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ اس میں ص۶۱ پر خلیق کا زمانہ ۱۷۷۴ء تا ۱۸۰۴ء درج ہے جو ظاہراً غلط ہے۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے "اسلافِ میرانیس" میں خلیق کا سنہ ولادت نہیں لکھا، سنہ وفات ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء دیا ہے۔ مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں اسی سنہ وفات سے پہلے سنہ ولادت ۱۷۶۸ء درج کیا ہے۔ بیلی نے نسیم کا ذکر ان کے استاد آتش سے پہلے کیا ہے، جو تاریخی اعتبار سے مناسب نہ تھا۔ شاید تاریخی ترتیب میں انھوں نے سنہ وفات کو ترجیح دی ہے۔ ان کی مثنوی "گل زارِ نسیم" کے لیے کہتے ہیں کہ یہ "سحرالبیان" سے بہت مشابہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے تنقیدات میں اس فیصلے پر گرفت کی لیکن بیلی کے اس بیان پر انگشت نمائی نہیں کی کہ نسیم نے "الف لیلہ" کا بھی ترجمہ کیا (ص۶۲) "الف لیلہ" کو نظم کرنے والے دیاشنکر نسیم نہیں، بلکہ نسیم دہلوی ہیں۔ خود بیلی نے اگلے باب میں نسیم دہلوی کے منظوم ترجمۂ "الف لیلہ" کو فارسی شاعر ظہوری کی نظم سے بہتر قرار دیا ہے۔ مجھے بیلی کے اس تنقیدی فیصلے سے اتفاق ہے کہ "گل زارِ نسیم" کو "سحرالبیان" کے بعد اردو مثنویوں میں دوسرا مقام حاصل ہے۔

ص۶۵ پر لکھتے ہیں کہ رشک کا تیسرا دیوان ناپید ہے۔ ابواللیث صدیقی نے "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں اطلاع دی ہے کہ انھیں یہ تیسرا گم شدہ دیوان مل گیا (دبستان، طبعِ اوّل، ۱۹۴۴ء، ص۲۶۰) بیلی نے ص۶۶ پر قلق کا نام ارشد علی خاں لکھا ہے۔ ابواللیث کے مطابق صحیح اسد علی خاں ہے (ایضاً، ص۲۸۵) ص۶۷ پر لکھنؤ کے کسی شاعر علی خاں درخشاں کا ذکر کیا ہے جو برق کے ہم راہ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتے گیا۔ میں نے اس مجہول الاسم شاعر کا نام کہیں نہیں پڑھا۔ انیس کے سلسلے میں اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے مرثیوں سے ایک مسلسل نظم "واقعاتِ کربلا" بنائی گئی جس میں ڈھائی اور تین ہزار شعر کے بیچ ہیں (ص۶۸-۶۷) بیلی نے مرتّب کا نام نہیں لکھا۔ مجھے ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے بتایا کہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں محمد صادق نے ایسی نظم ترتیب دی۔ بہت بعد میں مسعود حسن رضوی صاحب نے ایسی نظم "بزم نامۂ انیس" تیار کی۔

Scanned by CamScanner

نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں "لذتِ عشق" کو بھی شامل کر لیا ہے، جو ان کی تصنیف نہیں۔ بیلی کا یہ لکھنا بجا ہے کہ "بہارِ عشق" پر میر اثر کی "خواب و خیال" کا شدید اثر ہے۔ اس باب کے آخر میں تعشق اور دوسرے مرثیہ گویوں کا تذکرہ ہے۔

پانچویں باب کا عنوان "دہلی کا دوسرا دور اور رام پور کے چار شعرا" ہے۔ اس میں ذوق، غالب، مومن اور ان کے شاگردوں کا ذکر ہے۔ تنقید متوازن ہے۔ رام پور کے چار شعرا امیر، داغ، تسلیم اور جلال ہیں۔ داغ کے لیے لکھتے ہیں کہ انھیں ان کے اہلِ ملک پہلے ۱۲ بہترین شعرا میں رکھیں گے (ص ۷۶) باب کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تسلیم و جلال جیسے شعرا کی شہرت کا دارومدار کیا ہے۔ ان کے قصیدے اور غزلیں روایتی ہیں۔ اردو شاعری کا نیا دور ان کے لیے گویا آیا ہی نہیں۔

چھٹے باب کا عنوان "اردو نثر" ہے۔ اس کے تین ذیلی اجزا ہیں: الف۔ ابتدائی نثر نگار، ب۔ فورٹ ولیم کالج کے مترجمین، ج۔ انیسویں صدی کے اردو نثر نگار، چونکہ فورٹ ولیم کالج کے کارنامے بھی انیسویں صدی کے ہیں اس لیے جزو ب اور جزو ج میں بنائے تقسیم غتر بود ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جزو ج میں بھی فورٹ ولیم کے دو مولفین خلیل علی خاں اشک اور مرزا جان طپش داخل ہو گئے ہیں، حالانکہ ان کا صحیح مقام جزو ب میں تھا۔

باب کا جزو الف ابتدائی نثر نگار ہے۔ اس میں ایک بار پھر دکن کی نثری کتابوں کے نام دہرائے ہیں۔ لکھتے ہیں ۱۶۳۰ء کے قریب ایک کتاب "مفتاح الخیرات" لکھی گئی (ص ۷۸) یہ جیسا کہ پیچھے لکھا گیا اس کا ذکر "دکن میں اردو" میں ملتا ہے (ص ۱۶۴) اسی صفحے پر انھوں نے جعفر زٹلی کو اس کے چند جملوں کے سبب اردو کے نثر نگاروں میں جگہ دی ہے۔ وہ اس کا مستحق نہ تھا۔ دیباچے میں چار درویش کے سلسلے میں اپنی تحقیق پر توجہ دلائی تھی۔ میر امن نے "باغ و بہار" میں قصۂ چار درویش کو امیر خسرو کی تصنیف قرار دیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۰ء میں "باغ و بہار" پر مضمون لکھا جس میں یہ شبہ ظاہر کیا کہ یہ قصہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے، لیکن سب سے پہلے محمود شیرانی نے قطعی طور پر طے کیا کہ چار درویش خسرو کی تصنیف نہیں (رسالہ "کارواں"، لاہور، ۱۹۳۳ء) لیکن انگریزی میں بیلی ان سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ خسرو کی تصانیف میں چار درویش کا نام نہیں ملتا (ص ۷۹) بالیقین خسرو نے یہ کتاب نہیں لکھی (ص ۸۱)

محمد حسین آزاد نے تحسین کی "نوطرزِ مرصع" کی تاریخ ۱۷۹۸ء لکھی تھی۔ نورالحسن ہاشمی نے اپنی مرتبہ "نوطرزِ مرصع" کے دیباچے میں اس کا زمانہ ۱۷۷۵ء کے قریب رکھا ہے۔ ان سے پہلے محمد یحییٰ تنہا "سیر المصنفین"، جلد اول، دوسرے ایڈیشن (۱۹۴۹ء) میں

Scanned by CamScanner

یہی زمانہ طے کیا، لیکن ان دونوں سے بہت پہلے بیلی لکھتا ہے کہ نئی تحقیقات کے مطابق یہ کتاب ۱۷۷۰ء کے قریب لکھی گئی، مشہور تاریخ سے تقریباً ۳۰ سال پہلے (ص ۷۹) ڈاکٹر سید سجاد نے "نوطرزِ مرصع" پر لندن یونی ورسٹی سے ۱۹۳۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ بیلی کو انھیں کی تحقیق سے یہ انکشاف ہوا ہوگا۔

مولوی عبدالحق نے "باغ و بہار" پر ۱۹۳۰ء میں مضمون لکھا اور ۱۹۳۱ء میں ترتیب دے کر شائع کیا۔ انھوں نے مقدمے میں سارا زور یہ ثابت کرنے پر لگا دیا کہ امن کا ماخذ "نوطرزِ مرصع" ہے نہ کہ فارسی نسخہ۔ چونکہ بیلی نے ۱۹۲۹ء میں اپنی کتاب مکمل کر لی تھی، اس لیے کم امکان ہے کہ وہ مولوی صاحب کے مضمون سے واقف ہو۔ بیلی نے ان سے پہلے لکھ دیا ہے کہ شاید میر امن کی "باغ و بہار" "نوطرزِ مرصع" کو دوسرے الفاظ میں دہرا دینا ہے (ص ۸۱) اس طرح بیلی نے اس قصے کی تحقیق کے سلسلے میں جس تفاخر کا دعویٰ کیا ہے، اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میر امن نے "باغ و بہار" کے دیباچے میں اردو کے آغاز کے بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے عرصے تک غلط فہمی کا باب کھل گیا اور وہ غلط نظریہ ابھی تک پوری طرح ترک نہیں کیا گیا (ص ۸۱) وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ غالباً امن کا اسلوب گِل کرسٹ کے دوسرے تمام رفیقوں سے بہتر ہے۔ امن کا اردو نثر میں وہی مرتبہ ہے جو میر کا شعر میں (ص ۸۱)

جزو ب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے بارے میں تھا۔ جزو ج انیسویں صدی کے نثر نگاروں کے بارے میں ہے۔ اس میں بھی فورٹ ولیم کے دو مصنفین در آگئے ہیں، لیکن "سیر المصنفین" کی تقلید میں ان کے نام غلط لکھے ہیں۔ نمبر ۲۰۲ خلیل اللہ خاں اشک نمبر ۲۰۳ مرزا جان طپش۔ اشک کا نام خلیل علی خاں تھا اور مرزا جان کا تخلص طپش... طیش نہیں۔ نمبر ۲۰۶ گویا کا نام فقیر اللہ لکھا ہے، صحیح فقیر محمد خاں ہے۔ چونکہ انیسویں صدی کے نثر نگاروں میں دلی کالج کے مترجمین کا ذکر نہیں اس پر مولوی عبدالحق اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> فورٹ ولیم کالج کے مترجمین کا تفصیل سے ذکر کیا لیکن دہلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور اس کے مترجمین کا مطلق ذکر نہیں، حالانکہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ دہلی کالج کے مترجمین نے حقیقی علمی کام کیا۔
>
> (تنقیدات، ص ۱۶۱)

محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" کی بہت صحیح قدر بندی کر کے لکھتے ہیں کہ اس کا

Scanned by CamScanner

اسلوب سائنٹفک نہیں، لوگوں کی سوانح اور کتابوں کے بارے میں اس کے متعدد بیانات نادرست ہیں (ص ۸۷) ص ۸۹ پر شبلی کی ایک کتاب کا نام "بیانِ خسرو" لکھا ہے۔ شبلی نے "شعرالعجم" میں امیر خسرو پر جو کچھ لکھا تھا اسے بعد میں کتابی صورت میں "حیاتِ خسرو"، نہ کہ "بیانِ خسرو"، کے نام سے چھاپ دیا گیا۔

صفیر بلگرامی کے لیے لکھا ہے کہ اس نے ایک تذکرہ "صلوٰۃ خضر" شائع کیا۔۔۔ اس نے ایک ناول "روح افزا" لکھا جو شائع نہیں ہوا۔۔۔ اس نے ایک تاریخ "جلوۂ خضر" لکھی جس میں "آبِ حیات" کی اغلاط کی تصحیح کی (ص ۹۲) صفیر کا کوئی تذکرہ "صلوٰۃ خضر" نہیں، صرف "جلوۂ خضر" ہے۔ اس کے مبینہ ناول "روح افزا" کا ذکر ظفر اوگانوی کی کتاب "صفیر بلگرامی" میں بھی نہیں۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بیلی کی انیسویں صدی کے نثر نگاروں کی قدر بندی متوازن ہے۔ ساتویں باب "نیا عہد" میں حالی پر زیادہ، اور آزاد پر اس سے کم، زور دیا ہے۔ مسدسِ حالی کے کئی بندوں کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ اس باب میں محسن کاکوروی کو بھی نئے شعرا میں شامل کر لیا ہے، لیکن حیرت ہے کہ چکبست کا نام کہیں نہیں لیا۔ آٹھواں باب خاتمہ ہے، جس میں لکھتے ہیں کہ اگر آج کے اردو شعرا شیکسپیئر، ملٹن، ٹینی سن اور براؤننگ کا مطالعہ کریں تو قارئین کے لیے ایک پورا نیا جہاں پیدا کر سکتے ہیں (ص ۱۰۲) لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں ۲۵۰ اہلِ قلم کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں محض آٹھ ہندو ہیں، بقیہ سب مسلمان۔ ہندو مصنفین عموماً ہندی میں لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں (ص ۱۰۲) یہ پوری صداقت نہیں۔

اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء لکھا ہے (ص ۱۰۳) صحیح ۱۸۷۳ء ہے۔

آخر میں توضیحی کتابیات ہے، جس میں اردو کی ۱۷، فرنچ کی ایک اور انگریزی کی تین کتابوں اور ایک مضمون کی تفصیل ہے۔ "گلِ رعنا" کا سنہ ۱۹۲۵ء لکھا ہے (ص ۱۰۵) کتاب میں تو سنہ دیا نہیں، اس کے مقدمے پر ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ (دسمبر ۱۹۲۱ء) کی تاریخ ہے۔ یہ دسمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ "شعرالہند" کو ۱۹۲۶ء کے پاس لکھا ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۲۵ء میں اور دوسری ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ نمبر ۵ پر "آبِ بقا" از جعفر علی نشتر ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ دراصل اس تذکرے کے مؤلف عبدالرؤف عشرت ہیں، نشتر محض مرتب ہیں۔ عبدالجبار آصفی کے تذکرہ "محبوب الزمن" کی دو جلدوں کا سنہ ۱۸۷۰ء کے آس پاس لکھا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔ شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" کی تاریخ ۱۹۲۷ء لکھی ہے۔ یہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ "دکن میں اردو" کا

Scanned by CamScanner

سنہ، ۱۹۲۶ء لکھا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں نکلا۔

بیلی نے رومن میں اردو نام صحیح طریقے سے لکھنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ آخر میں اردو کے جملہ حروف کو نشانات کے اضافے سے رومن میں ادا کرنے کا چارٹ دیا ہے۔ اس کے آگے اشاریۂ اشخاص، اشاریۂ کتب اور اشاریۂ موضوعات ہیں۔ غرضیکہ کتاب بڑے سلیقے سے پیش کی گئی ہے۔

اپنے اختصار کے سبب بیلی کی تاریخ کو چشمِ کم سے دیکھا گیا ہے، لیکن اس کی کثرتِ مواد کو دیکھا جائے تو یہ دو تین سو صفحوں کی کتاب سے کم نہیں۔ مولوی عبدالحق کے جارحانہ تخریبی تبصرے کے باوصف بیلی کی تحقیقی و تنقیدی نظر کا اعتراف کرنا ہوگا۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ کے بارے میں کوئی بڑی غلطی نہیں کی۔ اس وقت تک تحقیق نے جو کچھ مواد پیش کیا تھا۔ انھوں نے اس سب سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اہلِ قلم کے بارے میں ان کے تنقیدی فیصلوں اور ادبی رجحانات کے تجزیے میں بھی ان سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں دکھائی دیتی۔ کتاب کی بڑی کمی اس میں نمونوں کا نہ ہونا ہے۔ تذکروں کی طرح انھوں نے بعض اوقات نہایت غیر اہم مصنفین کو بھی شامل کر لیا ہے۔ انھیں خارج کر دیا جائے تو کتاب کی وقعت میں اضافہ ہو جائے۔

گراہم بیلی میرے استاد ڈاکٹر حفیظ سید کے استاد تھے۔

ب: "تاریخِ ادبِ اردو" مرتبۂ ادارۂ ادبیات اردو

اردو میں صرف دو ادبی تاریخ ایسی ہیں جن کا کوئی ایک فرد مرتب یا مدیر نہیں، بلکہ وہ کسی ادارے کی مرتبہ ہیں۔ یہ ہیں: ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد کی "تاریخ ادبِ اردو" اور پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی "تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔" اول الذکر تاریخ پہلی بار ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۸۲ء میں اس کا آٹھواں ایڈیشن آیا، جو میرے سامنے ہے۔ اس کی ابتدا میں ڈاکٹر زور کا دیباچۂ عمومی ہے، جس پر ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخ پڑی ہے۔ لکھتے ہیں کہ چند سال پہلے ادارے نے دنیا کی چند اہم زبانوں کی ادبی تاریخوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ اردو ادب کی تاریخ کا کام ڈاکٹر زور نے اپنے ذمے لیا۔ انھوں نے اپنا کام ختم کر لیا لیکن کتاب زیادہ بڑی ہو گئی۔ اس اثنا میں ادارے کے امتحانات کے لیے ایک چھوٹی تاریخ کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ اسی مقصد سے ادارے نے یہ چھوٹی سی کتاب مرتب کی۔

لکھتے ہیں کہ پہلے خیال تھا ڈاکٹر بیلی کی انگریزی کتاب کو اردو میں ترجمہ کر دیا جائے، لیکن پھر خیال ہوا کہ اس میں بعض تحریکوں کا ذکر نہیں۔ زیرِ نظر کتاب کو تیار کرنے میں

Scanned by CamScanner

ادارے کے مختلف کارکنوں، خاص کر سید محمد صاحب نے بہت ہاتھ بٹایا۔ ڈاکٹر زور کا دعویٰ یا اعتراف ہے:

> اس کی ترتیب میں یوں تو بہت کچھ ڈاکٹر بیلی کی "تاریخ ادب اردو" سے فائدہ اٹھایا گیا لیکن دوسری مطبوعہ تاریخوں اور تذکروں اور خود میرے مسودۂ تاریخِ ادب کے مطالعے کے نتیجے بھی اس میں جگہ جگہ شامل ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب بالکل تحقیقی اور سائنٹفک بنیاد پر کی گئی ہے۔ اس معاملے میں ڈاکٹر بیلی کی تاریخ بہت پیچھے ہے۔ (دیباچہ ص ۸-۷)

مجھے اس اقتباس کے ہر دعوے سے اختلاف ہے۔ یہ تاریخ کم از کم ۹۰٪ بیلی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ شعرا کے حالات بیلی کے الفاظ میں اسی کی ترتیب سے درج کیے ہیں۔ اس میں بہت کم بیانات ایسے ہیں جو ۱۹۳۲ء یا ۱۹۴۰ء کے بعد کے اضافے ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ "سائنٹفک تاریخ" کس کو کہتے ہیں۔ سائنس سے مرعوبیت کے دور میں کسی کارنامے کو سائنٹفک کہہ دینا اسمِ اعظم کی طرح کارگر سمجھا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کہیں سے بھی سائنٹفک نہیں۔ اس میں اغلاط کثرت سے ہیں اور یہ بیلی کی تاریخ سے ذرا بھی آگے نہیں بڑھتی۔ معلوم نہیں ڈاکٹر زور کے مسودۂ تاریخِ ادب سے کیا مراد ہے۔ کیا ہوا وہ مسودہ؟ ۱۹۴۰ء کے بعد انھوں نے دو ادبی تاریخیں شائع کیں: "داستانِ ادبِ حیدر آباد" ۱۹۵۱ء، "دکنی ادب کی تاریخ" ۱۹۵۸ء۔ ان میں سے کوئی بھی پورے اردو ادب کی تاریخ نہیں۔

بیلی نے اپنی تاریخ کے حصار کے لیے اصول بنایا تھا کہ جو مصنفین ان کے زمانے میں زندہ تھے ان کو اپنی تاریخ میں نہ لیا جائے، بجز ایک استثنا ڈاکٹر اقبال کے۔ زیرِ نظر تاریخ میں بھی وہ سب غائب ہیں۔ دیباچے کے آخر میں ڈاکٹر زور نے وضاحت کی ہے کہ موجودہ مصنفین اور شعرا و خدمت گزارانِ اردو کے حالات اس میں درج نہیں کیے گئے ہیں (ص ۸) کیوں؟ ۱۹۴۰ء میں لکھی جانے والی جو تاریخ پریم چند، نیاز، جوش، فراق، حسرت موہانی وغیرہ کے کارناموں کا ذکر نہ کرے، وہ ناقص ہے۔ ادارے کی تاریخ میں جدید دور میں ذیل کے ایسے نام شامل کیے گئے ہیں جو بیلی کے یہاں نہیں ملتے:

جلال الدین توفیق، شمس الدین محمد حمزہ، چکبست، کیفی حیدر آبادی، بشیر الدین احمد، طیبہ بیگم، عظمت اللہ۔ ان میں چکبست کے علاوہ بقیہ سب کا تعلق دکن سے ہے۔

ڈاکٹر زور نے دیباچے میں لکھا تھا کہ بیلی کی تاریخ کا اس لیے ترجمہ نہیں کیا کہ اس میں بعض ایسی تحریکیں شامل نہیں جن کے بغیر تاریخِ ادبِ اردو لکھنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا،

Scanned by CamScanner

(ص ۷) لیکن خود اس تاریخ میں ان تحریکوں کا پتا نہیں۔ علی گڑھ تحریک، ادب لطیف کی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ مولوی عبدالحق نے بیلی کی تاریخ پر جو اعتراضات کیے تھے وہ سب ادارے کی تاریخ پر بھی صادق آتے ہیں۔ یہ تاریخ تذکروں کی طرح نام شماری پر قانع ہے اور ان میں متعدد غیر معتبر نام آ گئے ہیں۔
مولوی صاحب نے بیلی کی تاریخ کے لیے لکھا تھا:

> اس چھوٹی سی کتاب کو... ایسے شاعروں کے ذکر سے، جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے ایسے اشخاص کے تذکرے سے جنھیں شاعر کہنا بدمذاقی کی دلیل ہے، زیر بار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا... بعض ایسے غیر معروف اور ناقابلِ لحاظ شاعروں کے نام آ گئے ہیں جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی... اس قسم کی مختصر کتابیں جزوی تذکروں اور لاحاصل اسم شماری کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ایک ادبی فہرست بن گئی ہے۔
>
> ("تنقیداتِ عبدالحق"، طبع اوّل، ص ۵۴-۱۵۳)

یہی کیفیت ادارے کی تاریخ کی ہے۔ اردو ترجمے میں بیلی کی تاریخ کا متن ڈیمائی سائز کے ۱۶۶ صفحات پر ہے جب کہ ادارے کی تاریخ کا متن چھوٹے سائز کے ۱۳۶ صفحوں کا ہے۔
اس تنگ دامنی کے باوصف اس میں شامل چند نام یہ ہیں:

آتشی، محمود بیگ بیجاپوری، فخری، ابوطالب، صبائی، عراقی، سید گجراتی مرثیہ گو، قادر مرثیہ گو، معتبر خاں عمر، صابر، صارم، قیاسی، نوازش علی خاں شیدا، جلال الدین توفیق، شمس الدین محمد امیر حمزہ۔

ادب کے کل ہند نقشے میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ ان میں سے بیشتر دکن کے ہیں لیکن دکنی ادب میں بھی یہ معروف نام نہیں۔ کتاب کے حصے، ابواب، ان کے عنوانات سب بیلی کا چربہ ہیں۔ صرف ذیل کی مختصر فصلیں اضافہ ہیں:

دکن میں اردو ادب کا احیا، جدید علوم و فنون (ص ۹۷ تا ۱۰۲)۔ چوتھا حصہ اجتماعی خدمات، اردو صحافت (ص ۱۴۳ تا ۱۵۱)

کتاب کا پہلا حصہ اردو زبان کی تاریخ نیز دکنی ادب کے متعلق ہے۔ متن کی ابتدا ص ۱۱ سے ہوتی ہے۔ اس کے حاشیے میں کھڑی بولی کے لیے لکھتے ہیں:

> اس لفظ کو پہلے پہل ۱۸۰۳ء میں سال مسر نے اپنی کتاب لسی کوشو

پاکیان میں اور للولال نے پریم ساگر میں استعمال کیا ہے (کذا)۔

یہ جملہ یوں لکھا جانا چاہیے:

اس لفظ کو پہلے پہل ۱۸۰۳ء میں سدل مسر نے اپنی کتاب ناسکیتو پاکھیان میں اور۔۔

اس باب میں اردو کے آغاز کا وہی نظریہ پیش کیا ہے جو ڈاکٹر زور اور بیلی کا مشترکہ نظریہ ہے، لیکن اس کی جزئیات بیلی کی تاریخ کے الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔ بیلی نے جو بات کہی تھی، اور ڈاکٹر زور نے نہیں کہی تھی، وہ یہ ہے کہ اردو کی دو منزلیں قرار دی جا سکتی ہیں:

۱۔ ۱۰۲۷ء سے ۱۱۹۳ء تک لاہوری اردو جو پرانی پنجابی اور فارسی کے میل سے بنی۔

۲۔ ۱۱۹۳ء کے بعد لاہوری اردو اور پرانی کھڑی بولی کا میل۔

اس کتاب میں بھی بیلی کی تقلید میں، اسی کے الفاظ میں "قدیم دکنی ادب کے دو دور" کیے گئے ہیں، پہلا مذہبی دور ۱۳۵۰ء سے ۱۵۹۰ء تک، دوسرا ادبی دور ۱۵۹۰ء سے ۱۷۳۰ء تک۔ سنین کی یہ قطعیت محلِ نظر ہے کیونکہ میمنہ دوسرے دور میں بھی کئی مذہبی مثنویاں لکھی گئیں، نیز مذہبی نثری ترجمے کیے گئے، مثلاً:

قطبی کی "تحفۃ النصائح"، میراں یعقوب کا نثری ترجمہ "شمائل الاتقیا"، شاہ ملک کی مثنوی "احکام الصلوٰۃ"، سیوا کی "روضۃ الشہدا"، شاہ محمد قادری گوردریا کے رسالے۔

شاہ امین الدین علی اعلیٰ، میراں جی خدا نما، میراں یعقوب وغیرہ ادبی دور کے مصنفین ہیں، حالانکہ انھوں نے صرف مذہبی کتابیں لکھیں۔

اب مختلف ابواب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پہلے حصے "اردو کا ابتدائی ادب" کا جزو الف مذہبی دور ہے۔ اس کے بیانات اسی سطح کے ہیں جو ۱۹۴۰ء، بلکہ ۱۹۳۲ء میں دیے جا سکتے تھے۔ بعد کی تحقیق نے ان میں سے بہتوں کی تصحیح کر دی ہے۔ میں بیلی کی تاریخ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں۔ چند تصحیحات کا اعادہ کرتا ہوں۔

خواجہ بندہ نواز سے دو رسالے منسوب کیے ہیں: "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ"۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ثابت کر دیا کہ "معراج العاشقین" بہت بعد کے ایک درویش کی تالیف ہے۔ ہدایت نامے کا صرف نام سننے میں آیا ہے، دنیا میں کسی نے اسے نہیں دیکھا، جس سے اس کا وجود ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت ان کے کسی مجہول الاسم خلیفہ کے رسالے "ہفت اسرار" کی ہے، جس کا صرف نام ہی نام ہے، وجود نہیں۔ خواجہ بندہ نواز کے بعد میراں جی شمس العشاق کا ذکر ہے۔ یہاں ایک صراحت کرنی ضروری ہے۔ بیلی

Scanned by CamScanner

نے اپنی تاریخ میں مختلف طویل نظموں کی سطروں کی تعداد لکھی ہے۔ سطر سے اس کی مراد مصرع ہے۔ زیرِ نظر تاریخ کے مرتبین نے بیلی کی سطر کو شعر کے معنی میں سمجھ کر ابیات کی جو تعداد لکھی ہے وہ تقریباً تمام صورتوں میں دوگنی ہوئی ہے، مثلاً ص ۲۵ پر "خوش نامہ" میں ۳۵۰ ابیات لکھی ہیں جب کہ خود نظم میں ۱۷۰ ابیات ظاہر کی گئی ہیں۔ "خوش نغز" میں ۱۴۶ ابیات ظاہر کی ہیں، مولوی عبدالحق کے مطابق ۷۲، ۷۳ ہیں ("قدیم اردو"، ص ۱۷) "شہادت الحقیقت" میں ۱۱۲۶ اشعار لکھے ہیں، مولوی صاحب کے مطابق اس کے نصف ۵۶۳ ہیں ("قدیم اردو"، ص ۱۸) شاہ صاحب سے نثری کتاب "شرحِ مرغوب القلوب" بھی منسوب کی ہے۔ بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ میراں جی خدانُما کی ہے۔

شاہ بُرہان الدین جانم کے سلسلے میں گجری کی ایک عجیب تعریف کی ہے:

گجری سے مراد وہ دکنی ہے جس میں بازار کے الفاظ اور محاورے داخل ہیں۔ (ص ۲۶)

مرتبین کو یہ کہاں سے معلوم ہوا۔ بیلی نے تو یہ لکھا نہیں۔ کہیں وہ گجری کو "گزری" بمعنی "شام کو لگنے والا بازار" تو نہیں سمجھ بیٹھے۔ بیلی کی طرح انھوں نے بھی نثری کتاب "مفتاح الخیرات" (تصنیف غالباً ۱۶۳۰ء) کا ذکر کیا ہے (ص ۲۸) اس کتاب کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں ص ۱۶۴ پر کیا ہے، لیکن اس کا سنہ تالیف نہیں دیا۔ اسے عبداللہ کی "احکام الصلوٰۃ" کے دور کی کہا ہے۔ بیلی یا ادارے کو اس کا تخمینی سنہ ۱۶۳۰ء نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ ص ۲۸ پر مولانا عبداللہ کی "احکام الصلوٰۃ" کے لیے یہ کہنا کہ یہ شاہ ملک کے "شریعت نامہ" کے جزو کی حیثیت سے طبع ہوئی ہے، درست نہیں۔ شمس اللہ قادری نے شاہ ملک کے "شریعت نامہ" کے سلسلے میں اس کا ذکر کیا ("اردوے قدیم"، ص ۸۸) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انڈیا آفس میں ایک جلد میں شروع میں شاہ ملک کی مثنوی "شریعت نامہ" اور اس کے بعد عبداللہ کی نثر "احکام الصلوٰۃ" ہے۔ یہ بہرحال طبع نہیں ہوئی۔

لکھتے ہیں: عبدی (۱۶۶۳ء) "فقہ ہندی" کا مؤلف ہے (ص ۲۹) یہ جملہ بیلی کی تاریخ سے لیا ہے۔ ظاہراً اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۶۳ء عبدی کا سنہِ وفات ہے لیکن دراصل یہ "فقہِ ہندی" کا سنہ ہے۔

مذہبی دور کے بعد ادبی دور آتا ہے جس کے تین حصے ہیں: پہلا گولکنڈہ کے شعرا، دوسرا بیجاپور کے شعرا، تیسرا مغلوں کے دور کے شعرا۔ پہلے قطب شاہی دور کو لیجیے۔ قلی قطب شاہ کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ لکھی ہے (ص ۳۲) یہ بیلی کی مذکورہ ایک

Scanned by CamScanner

لاکھ سطروں سے پیدا شدہ مغالطہ ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر زور نے اسے مرتب کر کے چھپوا دیا ہے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عبارت کا لکھنے والا کوئی اور ہے۔ قلی قطب شاہ کے بارے میں تین صفحوں میں تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کی نظموں کے موضوع کے اعتبار سے اسے سودا اور نظیر اکبر آبادی سے مماثل گردانا ہے۔

قلی قطب شاہ کے علاوہ قدیم شعرا فیروز، ملا خیالی، محمود اور احمد (گجراتی) کا بھی ذکر کیا ہے۔ غواصی کی ایک مثنوی کا نام "چندا اور لورک" لکھتے ہیں (ص ۳۶) یہ ہندی ماخذ کا نام ہے۔ غواصی کی مثنوی کا نام مینا ستونتی ہے۔ بیلی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اہل ادارہ کا اضافہ ہے۔ قطبی کی مثنوی "تحفۃ النصائح" کے اشعار کی تعداد ۱۵۰۰ لکھی ہے (ص ۳۷) بیلی نے ۱۵۰۰ سطریں اور جمیل جالبی نے مخطوطے میں دیکھ کر ۷۸۶ اشعار بتائے ہیں (تاریخ، جلد اول، ص ۳۸۶) اہلِ ادارہ لکھتے ہیں کہ یہ شیخ یوسف کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ بہتر یہ ہوتا کہ شیخ یوسف کی شناخت ان کے معروف لقب شاہ راجو قتال والدِ خواجہ بندہ نواز سے کی ہوتی۔ شمس اللہ قادری نے انھیں محض شیخ یوسف دہلوی لکھا ہے، جہاں سے بیلی نے اور وہاں سے ادارے نے نقل کیا۔

طبعی کی مثنوی "بہرام و گل اندام" کے بارے میں لکھا ہے: "اس میں شاہ راجو کی مدح ہے۔" (ص ۳۹) اس سے غلط فہمی ہوتی ہے کہ مثنوی کا مرکزی موضوع یہی ہے، حالانکہ یہ ضمنی بات ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد ۱۳۰۰ لکھی ہے (ص ۴۰) یہ تعداد تقریباً صحیح ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق ۱۳۴۰ اشعار ہیں۔ اسی صفحے پر محمد امین کو تین نظموں کا مؤلف یا مصنف قرار دیا ہے۔ ۱۔ بارہ سو ابیات کی مثنوی "قصۂ ابو شحمہ"، ۲۔ ایک مختصر مثنوی "جنگ نامہ" جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے، ۳۔ ایک مرثیہ۔ صرف پہلے انتساب کا ماخذ بیلی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بیلی کی تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے صراحت کی کہ "قصۂ ابو شحمہ" کا مصنف اولیا ہے نہ کہ امین ("تنقیدات عبدالحق") کیا یہ افسوس ناک نہیں کہ ادارۂ ادبیات کی تاریخ میں ایک دکنی مثنوی کے مصنف کی صحیح شناخت کرنے کے بجائے بیلی کی تحریر پر آنکھ موند کر بھروسا کر لیا جائے۔ بیلی نے مثنوی میں ۱۲۰۰ سطریں (مصرع) لکھی ہیں، جنھیں ادارے نے اشعار بنا دیا۔ امین کے متعلق مندرجۂ بالا دوسری اور تیسری تصنیف کا ذکر بیلی نے نہیں کیا۔ ادارے کو یہ کہاں سے ملا؟

بیلی نے امین کے بعد ابوالقاسم مرزا کا ذکر کیا ہے جس سے فارسی سے ترجمہ شدہ مثنوی "جنگ نامہ" اور ایک مرثیہ منسوب کیا ہے۔ اہلِ ادارہ نے خلط مبحث کر کے ان دونوں کو بھی امین کی جھولی میں ڈال دیا، بے احتیاطی کی حد ہے۔ واضح ہو کہ مثنوی "جنگ نامہ" نہ

Scanned by CamScanner

امین کی تصنیف ہے، نہ ابوالقاسم مرزا کی، بلکہ سیوا کی ہے (الف د نسیم، ادبیات مسلماناں، جلد ۶، ص ۲۳۹) ادارے نے فائز کی "رضوان شاہ و روح افزا" میں ۱۷۰۰ ابیات ظاہر کی ہیں (ص ۴۰) جب کہ جالبی کے مطابق یہ تعداد ڈھائی ہزار ہے (جلد ۱، ص ۵۱۴)

ملک خوشنود کی تین مثنویوں کا ذکر کیا ہے: ۱۔ "ہشت بہشت"، ۲۔ "یوسف زلیخا"، ۳۔ "جنت سنگھار"، معروف بہ "بہرام و دل آرام (ص ۴۳) "تاریخ ادب اردو" مرتبہ عبدالقیوم (کراچی، ۱۹۶۱ء) میں سخاوت مرزا نے واضح کیا ہے کہ "ہشت بہشت" ہی کا صحیح نام "جنت سنگھار" ہے۔ ادارے نے اس کے اشعار کی تعداد حسب معمول دو گنی کر کے ۶۵۰۰ بتائی ہے جب کہ خود شاعر کے مطابق ۳۲۲۵ ہے (جالبی، جلد ۱، ص ۲۵۳) دوسری مثنوی "یوسف زلیخا" کے لیے مولوی عبدالحق نے واضح کیا کہ نہ خوشنود نے، نہ خسرو نے کوئی "یوسف زلیخا" لکھی۔ اس طرح ملک خوشنود نے تین مثنویاں نہیں، محض ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس تاریخ کے مرتبین رستمی کے "خاور نامہ" کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ اسے ترقی اردو بورڈ کراچی نے شائع کر دیا ہے (ص ۴۴) چونکہ یہ اشاعت ۱۹۶۸ء میں ہوئی: اس سے پتا چلتا ہے کہ تاریخ میں کم از کم یہ جملہ اس سنہ کے بعد کے ایڈیشن میں اضافہ کیا گیا ہوگا۔

نصرتی کی "گلشن عشق" میں ۸۰۰۰ ابیات ظاہر کی ہیں جو مصرعوں کی تعداد ہے۔ ص ۴۵ پر اس کی ایک نظم "معراج نامہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات مرتبین نے بیلی سے اور اس نے "گل رعنا" سے لی ہے۔ نصرتی نے کوئی "معراج نامہ" نہیں لکھا، اس کے قصیدۂ چرخیہ کو "معراج نامہ" سمجھ لیا گیا۔ ص ۴۵ پر شاہ ملک کی "شریعت نامہ" کے اشعار کی تعداد بھی دو نی لکھی ہے۔ ص ۴۶ پر سیوا کی "روضۃ الشہادت" کو مرثیوں کا مجموعہ لکھتے ہیں۔ یہ حسین واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہدا" کا منظوم ترجمہ ہے، مرثیوں کا مجموعہ نہیں۔ اردو کتاب کا نام بھی "روضۃ الشہدا" ہے۔ ہاشمی کی "یوسف زلیخا" کے اشعار کی تعداد ۲۰۰۰ لکھی ہے۔ نصرت مہدی کے مطابق تقریباً ۵۱۰۰ ہے ("اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ"، ص ۸۱)

کتاب کے اختصار کو دیکھتے ہوئے قطب شاہی اور عادل شاہی ادب کا تعارف بسا غنیمت ہے۔

پہلے حصے کا تیسرا جزو مغلوں کے عہد (۱۶۸۷ء تا ۱۷۲۰ء) کا ادب ہے۔ اس کی ابتدا میں محمد علی عاجز کی مثنوی "قصہ فیروز شاہ و ملکہ مصر" کا ذکر ہے (ص ۴۷) مولوی عبدالحق نے بیلی پر تنقید میں واضح کیا کہ نہ اس کا نام محمد علی ہے نہ تخلص عاجز، بلکہ نام اور تخلص دونوں محمود ہیں جیسا کہ شاعر نے خود مثنوی میں درج کیا ہے۔ ابتدائی اشعار میں اس نے اپنے لیے خاک ساری سے لفظ "عاجز" استعمال کیا ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد مرتبین نے ۸۰۰ لکھی

Scanned by CamScanner

ہے جب کہ بیلی نے ۸۰۰ مصرع لکھے ہیں۔ اگلے ادیب ولی اللہ قادری کے ترجمۂ "معرفت السلوک" کی تاریخ ۱۶۸۸ء لکھی ہے (ص۴۷) یہ حبیب اللہ قادری کے بیٹے تھے۔ باپ بیٹے کے سنینِ وفات اور ترجمے کی تاریخ کے بارے میں مختلف محققین کے بیانات میں کتنا اختلاف ہے، وہ ذیل کی جدول سے واضح ہوگا:

محقق اور کتاب	وفاتِ حبیب اللہ	وفاتِ ولی اللہ	سنہ ترجمہ
شمس اللہ قادری: "اردوے قدیم"، ص ۲۰-۱۱۹	——	۲۹ محرم ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء)	۱۱۰۹ھ (۹۸-۱۶۹۷ء)
بیلی اور ادارۂ ادبیات کی تاریخیں	——	——	۱۶۸۸ء (۱۱۰۰-۱۰۹۹ھ)
نصیر الدین ہاشمی: "دکن میں اردو"، ص ۳۵۶	——	۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء)	۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء)
ہاشمی: "فہرستِ آصفیہ"، جلد ۲، ص ۳۲۹	۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء)	۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء)	قبل ۱۱۲۵ھ (قبلِ ۱۷۱۳ء)
رفیعہ سلطانہ: "اردو نثر کا ارتقا"، ص ۲۳۲	۱۱۴۴ھ (۳۲-۱۷۳۱ء)	——	——
جمیل جالبی، جلد ۱، ص ۳۰۶	——	——	۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء)

اب کیا کہا جائے کہ کس کی کیا تاریخِ وفات ہے، کیا سنہ تالیف۔ شمس اللہ قادری جس سنہ کو بیٹے کی وفات کا لکھتے ہیں، رفیعہ سلطانہ اسے باپ کا سنہ انتقال قرار دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ترجمہ ۱۱۰۹ھ اور ۱۱۲۵ھ کے بیچ کی کوئی تاریخ ہے۔ اگلے شاعر کا نام شیخ داؤد لکھا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس کا معروف تخلص ضعیفی بھی لکھا ہوتا۔ اس کی پہلی مثنوی کے اشعار کی تعداد ۲۰۷ لکھی ہے، اصلاً اس سے نصف ہے۔ دوسری مثنوی "ہدایتِ ہندی" کا صحیح تر نام "ہدایت الہندی" ہے۔ شاہ حسین ذوقی کی سب رس منظوم کا نام "کتاب العاشقین" لکھا ہے (ص ۴۸) صحیح "وصال العاشقین" ہے (عبدالحق: "قدیم اردو"، ص ۲۵۱) اسی صفحے پر "یوسف زلیخا" کے مصنف امین کا ذکر ہے۔ چونکہ امین کئی شاعروں کا تخلص ہوا ہے، اس لیے اس امین کی تعیین امین گجراتی، یا "گودھرا کے امین" سے کرنی چاہیے۔

محمود بحری کے لیے لکھا ہے: "جو ۱۶۸۰ء تا ۱۷۰۰ء میں گزرے ہیں۔" (ص ۴۸)

Scanned by CamScanner

اس جملے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عرصۂ حیات انھیں حدود میں تھا۔ یہ بیلی کے بیان کے غلط ترجمے کا نتیجہ ہے۔ صحیح ترجمہ محمد عصیم نے یوں کیا ہے:

جنھیں ۱۷۰۰ء۔۱۶۸۰ء میں فروغ حاصل ہوا۔

(اردو ترجمۂ بیلی، ص ۶۴)

بیلی کو غلط سمجھنے کی دوسری مثال اگلے اندراج ولی ویلوری میں ہے، جن کے لیے لکھا ہے: "ان کا زمانہ ۱۶۹۰ء اور ۱۷۰۷ء کے درمیان ہے۔" (ص ۴۹) اس جملے کے معنی ہوئے کہ ولی ۱۶۹۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷ سال کی عمر میں ۱۷۰۷ء میں چل بسے۔ بیلی کی تحریر کا اردو مفہوم عصیم نے یوں دیا ہے: "ان کی ادبی سرگرمیاں ۱۶۹۰ء سے ۱۷۰۷ء تک جاری رہیں۔" (اردو ترجمہ، ص ۶۴) افسوس ادارے کے مرتبین نے آنکھ موند کر بیلی پر تکیہ کیا، وہ بھی غلط سلط۔ اپنی طرف سے کسی تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی۔ بیلی اور ادارے کے مولفین کا مندرجۂ بالا بیان صحیح نہیں۔ "دکن میں اردو" میں ہاشمی نے ولی ویلوری کی تین مثنویوں کی تاریخ ۱۱۳۷ھ، ۱۱۵۹ھ اور ۱۱۶۲ھ دی ہے (ص ۳۳۴) یہ زمانہ ۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۹ء کا ہوا۔ ادارے نے ولی کی "رتنا پدم" کے اشعار کی تعداد ۸ ہزار اور "روضۃ الشہدا" کی دس ہزار لکھی ہے۔ بیلی کے مطابق یہ تعداد سطور یعنی مصرعوں کی ہے۔

ولی کے بعد کے شعرا محمد بیگ بیجاپوری، فری، ابوطالب، صبائی اور عراقی کسی طرح اس مختصر تاریخ میں جگہ پانے کے مستحق نہ تھے۔ صبائی کا بیان سنہ کے علاوہ لفظ بہ لفظ بیلی سے لیا ہے۔ بیلی نے نام کے بعد "۱۶۹۵ء" لکھا تھا۔ معلوم نہیں اس سے کیا مراد ہے (اردو ترجمہ، ص ۶۵) ادارے کے مرتبین لکھتے ہیں: "جو ۱۷۱۵ء میں گزرے ہیں۔" (ص ۵۰) معلوم نہیں، یہ مختلف سنہ کہاں سے حاصل ہوا۔ ص ۵۰ پر شاہ پیر اللہ مجری کی "گلشنِ حسن و دل" کا ذکر ہے۔ مولوی عبدالحق بیلی کے تبصرے میں واضح کر چکے ہیں کہ مثنوی کا صحیح نام "گلشنِ حُسنِ دل" ہے۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر کے مطابق شاعر کا نام ببراللہ ہے۔

محبوب عالم کا دوسرا نام شیخ جیون لکھا ہے اور اس کی تین مثنویوں "محشر نامہ"، "خواب نامہ" اور "جہیز نامہ" کا ذکر کیا ہے (ص ۵۰) ان غلط فہمیوں کا بانی اسپرنگر ہے۔ محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون میں واضح کیا کہ شیخ جیون، محبوب عالم سے الگ شخصیت، یعنی اس کا دوست ہے۔ "محشر نامہ" محبوب عالم کی مثنوی ہے، جب کہ "خواب نامہ" اور "جہیز نامہ" عبدالحکیم مہی کی ہیں ("اورینٹل کالج میگزین"، نومبر ۱۹۳۱ء، فروری ۱۹۳۲ء) مرتبین نے ولی پر مفصل لکھا ہے، لیکن شروع میں جو یہ لکھ دیا ہے کہ وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، بعد کی تحقیق نے اسے غلط پایا۔ ظہیرالدین مدنی کے مطابق وہ گجراتی تھے۔ قلی قطب شاہ کی طرح ولی کی تنقید بھی قابلِ قدر ہے۔

Scanned by CamScanner

ولی کے نوعمر معاصرینِ دکن کا باب پوری طرح بیلی سے ماخوذ ہے۔ اس میں متعدد ایسے مرثیہ گویوں کا ذکر ہے جو دنیاے ادب میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ان میں ایک شاعر کا نام یتیم احمد برہان پوری لکھا ہے (ص۵۶) تاریخِ بیلی کے مترجم سید محمد عصیم کے مطابق ان کا صحیح نام تبسم احمد ہے ("اردو ادب کی تاریخ"، حاشیہ، ص ۷۰) "یتیم احمد کے بعد اشرف کی مثنوی کا نام "جنگ نامۂ حیدری" لکھا ہے۔ صحیح "جنگ نامۂ حیدر" ہے۔ اشعار کی تعداد دو نی لکھی ہے۔ غلام قادر سامی کی مثنوی "سرو و شمشاد" میں دس ہزار ابیات لکھی ہیں (ص۵۸) بیلی کے مطابق اس سے نصف ہیں۔ مثنوی "فیض عام" کے مصنف کا نام سید محمد لکھا ہے (ص۵۸) مولوی عبدالحق نے تصحیح کی تھی کہ عبدالحمد ہے۔ حیرت ہے کہ حیدر آباد کے مرتبین نے بھی عبدالحی صارم کو آصف جاہ نظام الملک کا پہلا وزیر لکھ دیا (ص۵۹) مولوی عبدالحق نے تنقیدات میں لکھا ہے کہ یہ پہلا وزیر نہیں تھا، پہلا وزیر اس کا والد صمصام الدولہ شاہ نواز خاں مؤلفِ "مآثرالامرا" تھا۔ اس باب کے آخری شاعر قیاسی کا نام سید عبداللہ لکھا ہے۔ مولوی صاحب کے مطابق سیدی عبداللہ ہونا چاہیے۔ ایک لغت کے مطابق سیدی کے معنی سوڈان کا حبشی باشندہ ہے۔

تاریخ کے دوسرے حصے کے دو موضوعات ہیں: پہلا عنوان "دہلی میں اردو ادب کا آغاز اور ارتقا" ہے۔ اس کی ابتدا میں تاریخی پس منظر ہے، جس میں لکھتے ہیں کہ ۱۷۴۸ء اور ۱۷۶۱ء کے درمیان احمد شاہ درانی نے دوبارہ ہندوستان پر چڑھائی کی (ص ۶۳) بیلی نے اس جملے میں لکھا تھا کہ مسلسل حملے کرتا رہا، وہی صحیح تھا۔ سچ یہ ہے کہ درانی نے اس عرصے میں کم از کم چار مرتبہ ہندوستان پر حملے کیے۔ بیلی کی طرح مدیرانِ ادارہ نے بھی شمالی ہند کی اصلاحِ شعرو زبان پر دل سوزی کے ساتھ لکھا ہے:

> یہاں سے اردو شاعری کو فارسی کے رنگ میں رنگنے کی تحریک روز بروز تقویت حاصل کرتی گئی ... دہلی میں زبان کی اصلاح و درستی سے مراد دراصل اسے فارسی آمیز بنانا تھا، جس کی وجہ (سے) اردو شاعری روز بروز مصنوعی اور غیر ہندوستانی ہوتی گئی۔ ایران کے باغات جس (کذا) میں ایران کے درخت، میوے اور پھول کھلے ہوئے تھے، ہندوستان میں منتقل کیے گئے۔ نہ صرف یہی، بلکہ ایران کے مناظر، وہاں کے رسم و رواج حتیٰ کہ ایران کے عاشق و معشوق کے قصے اردو شاعری میں دہرائے جانے لگے۔
>
> (ص۶۶)

Scanned by CamScanner

شمالی ہند کا پہلا شاعر محمد افضل، متوفی ۱۶۲۵ء، کو قرار دیا ہے۔ اس کا بارہ ماسہ، ۱۶۰۰ اشعار کا، ہندی بحر میں ہے (ص ۷۰) مجھے اس بیان کے کسی حصے سے اتفاق نہیں۔ "بکٹ کہانی" کی قریب ترین روایت میں اکرم قطبی رہتکی نے اس کا نام گوپال لکھا ہے۔ محمد افضل متوفی ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء ایک دوسرا فارسی شاعر ہے جس کا ذکر والہ داغستانی نے تذکرے "ریاض الشعرا" میں کیا لیکن ان کے لیے یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس نے "بکٹ کہانی" بھی لکھی۔ یہ نظم ۱۶۰۰ اشعار کی نہیں، سوا تین سو سے کچھ کم کی ہے، نیز یہ ہندی بحر میں نہیں، اردو کی بحر ہزج میں لکھی گئی ہے۔ جعفر زٹلی کے بیان میں اس کی ایک سوانحی نظم بہ عنوانِ "سلوک" کا ذکر کرتے ہیں جس میں دو سو ابیات ہیں (ص ۷۰) یہ بات بیلی کے یہاں سے لی ہے، جنھوں نے اسے ۲۰۰ سطروں یعنی ۱۰۰ اشعار کی بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کلیات جعفر میں کوئی طویل سوانحی مثنوی نہیں، نہ کسی نظم کا عنوان "سلوک" ہے۔ بیلی کو کوئی غلط فہمی ہوئی۔

شاہ مبارک آبرو کے لیے لکھا ہے کہ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گیا (ص ۷۱) "غدر" ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو کہتے ہیں۔ آبرو اٹھارویں صدی کا شاعر ہے۔ ادارے کا ماخذ بیلی ہے، اس نے بھی زمانۂ غدر میں تلف ہونے کی بات کہی ہے۔ گویا آبرو کا کوئی بڑا دیوان ۱۸۵۷ء میں تلف ہو گیا۔ ان کے پہلے دیوان کے ضائع ہونے کی بات کسی نے نہیں لکھی، نہ "آبِ حیات" میں آزاد نے، نہ قاضی عبدالودود نے "عیارستان" میں، نہ ڈاکٹر محمد حسن نے مقدمۂ دیوانِ آبرو میں اور نہ ان پر مستند محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں۔

ص ۷۴ پر سودا کے لیے لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ مولوی عبدالحق کے مطابق میر کو دہلی ہی میں ۱۱۶۵ھ سے قبل یہ خطاب مل چکا تھا۔ ص ۷۷ پر میر کے بارے میں ایک نقاد کا قول لکھا ہے:

پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند۔

یہ رائے آرزدہ کی ہے لیکن یہ تحریف کے ساتھ مشہور ہو گئی ہے۔ "گلشنِ بےخار" کے مطابق تذکرہ آزردہ میں لکھا ہے:

پستش اگرچہ اندک پست است امّا بلندش بسیار بلند۔

("گلشنِ بےخار"، ص ۱۰۰)

مختارالدین احمد کو آزردہ کا ناقص الآخر تذکرہ ملا، جو میر تک نہیں پہنچا، قائم پر ختم ہو گیا ہے۔ ادارے نے بیلی کی طرح میر سوز کے لیے لکھا ہے کہ کلام زیادہ نہیں (ص ۸۰)

Scanned by CamScanner

مولوی عبدالحق نے اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ سوز کا کلیات ضخیم ہے۔ اہلِ ادارہ نے میر حسن کی مثنوی "سحرالبیان" کے اشعار کی تعداد ۳۴۴۲ لکھی ہے (ص۸۱) بیلی نے اتنے مصرع قرار دیے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے مطابق "سحرالبیان" کے ایک نسخے میں دوسرے مخطوطوں سے زیادہ اشعار ہیں، یعنی کُل ۲۰۶۷ (مقدمہ مثنویِ "سحرالبیان"، لکھنؤ ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۰)

بیلی نے مصحفی کے لیے لکھا تھا کہ ۱۷۹۴ء میں اس نے ایک فارسی تذکرہ مکمل کیا جس میں ۳۵۰ شاعروں کا ذکر ہے، اس پر مولوی عبدالحق نے اعتراض کیا کہ مصحفی نے ایک نہیں، تین تذکرے لکھے ہیں۔ اہلِ ادارہ نے اپنی تاریخ میں اس تذکرے کا ذکر کر کے اضافہ کیا:

اس کے علاوہ انھوں نے اور تین تذکرے لکھے۔

(ص ۸۳)

گویا کُل چار تذکرے لکھے، حالانکہ واقعتاً تین ہی لکھے ہیں۔ ۱۷۹۴ء میں اردو کا پہلا تذکرہ "تذکرہَ ہندی" مکمل کیا جس میں ۳۵۰ نہیں، ۱۹۳ شاعروں کا ذکر ہے۔ دوسرے تذکرے "ریاض الفصحا" میں ۳۲۲ شاعر ہیں۔ ان سب سے پہلے کا "عقدِ ثریا" مختصر تذکرہ ہے۔

انشا کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۷۸۶ء میں دہلی گئے تو نابینا بادشاہ شاہ عالم کا دور دورہ تھا (ص ۸۳) شاہ عالم کے اندھا کیے جانے کی تاریخ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء ہے۔ انشا اس سے پہلے ہی دہلی چھوڑ چکے تھے۔ اسی صفحے پر انشا کے بارے میں ایک عجیب بات لکھ دی ہے کہ ۱۸۱۰ء میں انھیں لکھنؤ سے نکل جانا پڑا، اگرچہ بعد کو انھیں لکھنؤ آنے کی اجازت مل گئی تھی (ص ۸۳) یہ بے بنیاد بات بیلی کے ہاں سے لی ہے۔ زندگی کے آخری برسوں میں انشا لکھنؤ سے باہر نہیں گئے۔

رنگین کی ۳۶ مثنویوں کے اشعار کی تعداد ۴۰۰۰۰۰ لکھی ہے (۱۹۸۲ء ایڈیشن، ص۸۶) پانچ صفروں کے ساتھ یہ ہندسہ "چار لاکھ" پڑھا جائے گا۔ بیلی نے ۴۰ ہزار سطریں (یعنی ۲۰ ہزار اشعار) قرار دی تھیں۔ ادارے کی تاریخ میں ایک صفر زیادہ لگ کر ۲۰ ہزار شعروں کی جگہ ۴ لاکھ شعر ہو گئے۔ نظیر اکبر آبادی کے لیے لکھتے ہیں: "نظیر کا بہت سا کلام ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے۔" (ص ۸۹) یہ بات کم از کم ۱۹۸۲ء کے ایڈیشن میں نہیں لکھی جانی چاہیے تھی۔ نظیر کا مجموعہ "روحِ نظیر" ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ فرحت اللہ بیگ نے نظیر کے دو دیوان ۱۹۴۲ء میں شائع کیے اور عبدالباری آسی نے نول کشور پریس سے کلیات نظیر ۱۹۵۸ء میں چھاپی (علی احمد فاطمی: "نظیر اکبر آبادی"، ص۵-۱۰۴) اس باب کے تقریباً آخر

Scanned by CamScanner

میں لکھتے ہیں کہ شاہ عالم کو ۱۷۷۱ء میں اندھا کر دیا گیا (ص ۹۱) جیسا کہ پیچھے لکھا گیا، صحیح تاریخ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء ہے۔ بیلی نے بھی ۱۷۸۸ء لکھی ہے۔ معلوم نہیں، اہلِ ادارہ نے اسے ۱۷۷۱ء کیوں کر بنا دیا۔

دوسرا جزو "اردو نثر کی ترقی" ہے۔ یہ زیادہ تر فورٹ ولیم کالج سے متعلق ہے۔ اس میں مرزا علی لطف کے "گلشنِ ہند" کے لیے لکھتے ہیں: "دوسرا حصہ جس میں تمام شاعروں کا ذکر تھا، مفقود ہے۔" (ص ۹۳) اس سے ایسا لگتا ہے کہ لطف نے دوسرا حصہ لکھا، لیکن اب ناپید ہو گیا ہے، حالانکہ لطف نے اپنے دیباچے میں صرف یہ کہا ہے کہ "کتاب کی دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا۔" مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں (تذکرہ "گل زار ابراہیم مع تذکرہ گلشنِ ہند" علی گڑھ ۱۹۳۴ء، مقدمہ ص ۳۹) یہ مان لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ یہ جلد نہیں لکھی گئی۔

حیدر بخش حیدری کی ایک تالیف کا نام "تاریخِ قادری" لکھا ہے (ص ۹۴) یہ سہوِ کتابت ہے، صحیح نام "تاریخِ نادری" ہے۔ بہادر علی حسینی کے "رسالۂ صرف و نحو" کے لیے بیلی کی تقلید میں لکھتے ہیں کہ یہ گِل کرسٹ کے رسالے سے ماخوذ ہے (ص ۹۴) دراصل حسینی کا رسالہ گِل کرسٹ کی انگریزی "کتابِ قواعد" سے ماخوذ ہے اور عرفِ عام میں "رسالۂ گِل کرسٹ" ہی کے نام سے مشہور ہے۔ ادارے نے اشک کا نام خلیل اللہ خاں غلط لکھا ہے، صحیح خلیل علی خاں ہے۔ ان کی تین کتابوں کے نام "انتخاباتِ سلطانیہ"، "واقعاتِ اکبری" اور "رسالہ کائنات" لکھے ہیں (ص ۹۶) ان کے صحیح نام "انتخابِ سلطانیہ"، "کتابِ واقعاتِ اکبر" اور "کائنات جو" ہیں (ڈاکٹر عبیدہ بیگم: "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، ص ۱۶۵)

اس کے آگے دو مختصر اجزا "دکن میں اردو ادب کا احیا" اور "جدید علوم و فنون" بیلی کی تاریخ میں نہیں، اس کتاب میں اضافہ ہیں۔ پہلے جزو میں شمالی ہند سے دکن جانے والے کچھ ادیبوں کے نام گنائے ہیں جو بقول مؤلفین کے بہت مشہور ہیں (ص ۹۸) میرے نزدیک اس فہرست کے تاج الدین مشتاق، شیخ حفیظ اور فرید الدین آفاق کو مشاہیر میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ "جدید علوم و فنون" کے تحت شمس الامرا امیر کبیر ثانی کی علمی کوششوں کا ذکر ہے۔ صرف ۶ صفحوں کے یہ اجزا مفید معلومات رکھتے ہیں۔

تیسرا حصہ "لکھنؤ اور دہلی کے دبستانِ سخن" ہے۔ اس میں پہلے دبستانِ لکھنؤ کو لیا ہے۔ اس میں بیلی کی غلطی دہرا دی کہ دیا شنکر نسیم نے الف لیلہ کا اردو میں ترجمہ کیا (ص ۱۰۷) آتش کے لیے لکھتے ہیں کہ پہلا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہوا، کوئی تیس ہزار

Scanned by CamScanner

اشعار پر مشتمل ہے، دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد مرتب ہوا (ص۸-۱۰۷) بیلی نے پہلے دیوان (دراصل کلیات) میں ۳۰ ہزار سطور یعنی ۱۵ ہزار شعر لکھے ہیں۔ صحیح صورت حال اس سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر شاہ عبد السلام کے مطابق دونوں دیوانوں میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار ہیں ("دبستانِ آتش" دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۵۳) ناسخ کے اشعار کی تعداد بھی بیلی کے مقابلے میں دوگنی لکھی ہے۔ اس طرح اشعار کی تعداد کے باب میں ادارے کی تاریخ بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ معلوم نہیں کیوں اس باب میں کئی بار مؤلفین نے شعرا کا ذکر جوڑوں میں کیا ہے، مثلاً یہ عنوان دیکھیے:

آتش اور ناسخ، انیس اور دبیر، گویا اور سرور، صبا اور وزیر۔

جب اس باب میں ان سے بہت چھوٹے شعرا کو آزاد و مکمل عنوان کے تحت بلاشرکتِ غیرے بیان کیا گیا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آتش و ناسخ اور انیس و دبیر کا کیوں ملغوبہ بنایا گیا۔

چونکہ بیلی نے نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں "لذتِ عشق" کو بھی شامل کیا ہے، اس لیے اہلِ ادارہ نے بھی آنکھ موند کر ڈاکٹر زور کے استاد کی بات پر "آمنّا و صدقنا" کہہ دیا (ص۱۰۹) حالانکہ "لذتِ عشق" شوق کے بھانجے آغا حسن نظم کی تخلیق ہے۔ علی اوسط رشک کی لغت کا نام "نفیس اللغات" لکھا ہے۔ صحیح "نفس اللغہ" ("...اللغتہ" نہیں،) ہے۔ یہ تاریخی نام ہے، جس سے ۱۲۵۶ھ حاصل ہوتا ہے۔ منیر شکوہ آبادی کی تین کتابوں کے نام یہ لکھے ہیں:

مثنوی "معارج المصامین"، "منتخباتِ عالم"، "تنویر الاشیا۔" (ص۱۱۲)

پہلے دو نام بیلی کی نقل ہیں، تیسرے میں سہو کتابت ہے۔ ان تینوں کے صحیح نام یہ ہیں: مثنوی "معراج المضامین"، "منتخب العالم" (تاریخی نام: ۱۲۶۴ھ)، "تنویر الاشعار۔" قلق کا نام ارشد علی خاں لکھا ہے۔ ان کا نام اسد علی خاں تھا، ارشد علی خاں عرف تھا۔ امانت کے لیے لکھا ہے:

مرثیہ نگار تھے لیکن اصل میں اپنے ڈرامے "اندر سبھا" کی وجہ سے
بہت مشہور ہیں۔ (ص۱۱۳)

امانت کا پہلا اختصاص مرثیہ نگاری قرار دینا عجب ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث کے مطابق امانت نے ابتدا میں چند سلام کہے، بعد میں غزل گوئی پر آرہے ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، ص ۲۹۳) ان کی مرثیہ گوئی کا تذکرہ نہیں کیا۔ واجد علی شاہ اختر کے حالات نہایت تشنہ ہیں، ان کی تصانیف کے نام بھی نہیں دیے۔

Scanned by CamScanner

نسیم دہلوی کے لیے لکھتے ہیں: "الف لیلہ کے قصّوں پر انھوں نے مقدمے لکھے۔" (ص۱۱۷) صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ نول کشور پریس نے "الف لیلہ" کو منظوم کرایا۔ اس کے چار حصّے ہیں، جن میں سے پہلا حصہ اصغر علی خاں نسیم نے نظم کیا ہے، کوئی مقدمہ نہیں لکھا۔ ظہیر دہلوی کے لیے لکھتے ہیں کہ ان کا ایک مجموعہ کلام "گلستانِ سخن" شائع ہو چکا ہے (ص۱۱۹) یہ صحیح نہیں۔ ان کے مزید دو دیوان "سُنبلستانِ عبرت" اور "دفترِ خیال" شائع ہو چکے ہیں۔ ادارے نے ان کی ایک تصنیف کا نام غدر کا روزنامچہ "ایامِ غدر" لکھا ہے، سچ یہ ہے کہ ان کی سوانح کا نام "داستانِ غدر" ہے۔ "ایامِ غدر" منشی عنایت حسین کی تصنیف کا نام ہے (ڈاکٹر مختار تسمیم: "ظہیر دہلوی"، ص۳۲۱و۳۲۶)

"نثر کی کوششیں" کے عنوان کے تحت دلی کالج کی علمی خدمات کا ذکر قابلِ قدر ہے۔ کتاب کا چوتھا حصہ "اردو ادب کا دورِ جدید" ہے، جس میں سرسید اور ان کے رفقا کو بجا اہمیت دی گئی ہے۔ مولوی ذکاءاللہ کے لیے لکھا ہے کہ: "تاریخِ ہند"، "آئینۂ قیصری" اور "حیاتِ لارڈ کرزن" وغیرہ کو اردو میں منتقل کیا (ص۱۳۰) دراصل یہ ذکاءاللہ کی اپنی تالیفات ہیں، کسی انگریزی کتاب کے ترجمے نہیں۔ دوسری اور تیسری کتاب کا صحیح نام "آئینِ قیصری" اور "کرزن نامہ" ہے۔ "آئینِ قیصری" انگریزوں کے زمانے کی "تاریخِ ہند" کی جلد پنجم ہے (ڈاکٹر رفعت جمال: "ذکاءاللہ"، ۱۹۹۰، ص۲۲۱) امیر اللہ تسلیم کی مثنوی کا نام "صبحِ خندہ" لکھا ہے (ص۱۳۱) "صبحِ خنداں" چاہیے۔ اگلے صفحے پر جلال کی جس کتاب کا نام "تنقیدالشعرا" لکھا ہے وہ دراصل "مفیدالشعرا" ہے۔ اسی طرح ان کی "فوائدالمنتخب" کا صحیح نام "منتخب القواعد" ہے۔

صفیر بلگرامی کی تصانیف میں بیلی کی غلط بیانی کو نقل کر دیا ہے، یعنی ایک تذکرہ "صلوات صفیر" اور ایک ناول "روح افزا" کو ان کی تصنیف بتایا ہے (ص۱۳۵) حالانکہ صفیر نے ان ناموں کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اس باب میں جلال الدین توفیق اور شمس الدین محمد امیر حمزہ دو نہایت غیر معروف ادیبوں کو لے آئے ہیں، جو اس مختصر کتاب میں ضروری نہیں تھے۔

کتاب کے آخر میں اجتماعی خدمات کے باب میں اردو کے اداروں کا بیان قابلِ قدر ہے لیکن جامعہ ملّیہ کی جس اردو اکیڈمی کا ذکر کیا ہے اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔ آخری جزو "اردو صحافت" کے عنوان سے ہے جس میں نہایت مختصراً کچھ اخباروں اور رسالوں کے نام درج کیے ہیں۔ اس مختصر کتاب، بلکہ کتابچے میں اس سے زیادہ کی توقع کر بھی نہیں سکتے تھے۔

کتاب میں بکثرت ادیبوں کا تذکرہ ہونے کی وجہ سے سنین بھی بہت بڑی تعداد میں

Scanned by CamScanner

دیے گئے ہیں۔ ان سب کو پرکھنا ممکن نہیں لیکن جن میں شبہہ ہوا، ان کی تنقیح کی گئی۔ اگر دوسرے لکھنے والوں نے کوئی اور سنہ دیا ہے تو ذیل میں اس اختلاف کو پیش کیا جاتا ہے۔ زیادہ امکان ہے کہ دوسروں کا دیا ہوا سنہ صحیح تر ہو گو ہمیشہ یہ ضروری نہیں۔ اس تاریخِ ادب کے بعض سنین میں صاف صاف سہوِ کتابت ہے۔ کتاب میں بالعموم عیسوی سنہ دیا ہے۔ قدیم اردو ادب کی تاریخوں میں زیادہ تر ہجری سنین ہوتے ہیں۔ جب تک ماہ و یوم معلوم نہ ہو ایک ہجری سنہ کے برابر دو عیسوی سنین لکھنے چاہییں۔ ہمیں بعض موقعوں پر صحیح تاریخِ ہجری معلوم ہے جس کے پیشِ نظر بعض اوقات مندرجہ ایک عیسوی سنہ میں ایک سال کا فرق واقع ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ اہلِ ادارہ بیلی کی تقلید میں متعدد ادیبوں کے نام کے بعد قوسین میں ایک سنہ دے دیتے ہیں، مثلاً ص ۴۵ مرزا، ص ۵۰ وجدی، ص ۵۱ ولی، ص ۵۶ اشرف اور معتبر خاں عُمر، ص ۸۷ محمد حسین کلیم، ص ۹۳ حیدری۔ کوئی صراحت نہیں کہ یہ کاہے کی تاریخ ہے، وفات کی یا اس سنہ میں محض موجود ہونے کی؟ غالباً وفات کی ہے۔ ذیل میں تمام مشکوک سنین کو پرکھا جاتا ہے:

ادارے کی مندرجہ تاریخ	دوسرے لکھنے والے
ص ۱۶ امیر خسرو پ ۱۲۵۵ء	ظ۔ انصاری ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) "خسرو شناسی"، ص ۱۳
ص ۲۵ میراں جی شمس العشاق پ ۱۴۰۷ء	میری رائے میں ۹۰۲ھ/۹۷-۱۴۹۶ء۔ شمس العشاق تاریخی نامِ ولادت
ص ۲۵ میراں جی فوت ۹۰۴ھ	جانم کے مرثیے کے مطابق ۲۵ شوال ۹۹۴ھ/۲۹ ستمبر ۱۹۸۶ء
ص ۲۶ شاہ برہان الدین جانم ف ۱۵۹۱ء	حسینی شاہد: ۱۵ ربیع الثانی ۱۰۰۷ھ/۱ نومبر ۱۵۹۸ء (شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۱۱۴)
ص ۲۷ امین الدین اعلیٰ ۱۵۹۱ء تا ۱۶۷۵ء	حسینی شاہد: پ ۲۳ رمضان ۱۰۰۷ھ/۱۱ اپریل ۱۵۹۹ء۔ ف ۲۳ جمادی الاوّل ۱۰۸۵ھ/۱ اگست ۱۶۷۴ء (ایضاً ص ۱۱۹ و ص ۱۵۰)

Scanned by CamScanner

ص ٢٧ میراں جی خدا نما ف ١٦٥٩ء	حفیظ قتیل: ١٠٧٤ھ (٦٤-١٦٦٣ء) کتاب "میراں جی خدا نما" حیدر آباد اردو اکیڈمی ١٩٦١ء
ص ٢٨ خدا نما: شرحِ شرحِ تمہید ١٦٠٠ء	جالبی ١٠٦٦ھ/٥٦-١٦٥٥ء، حوالہ قدیم اردو جلد دوم ص ١٥٥ حاشیہ (جلد اوّل ص ٣٩٩)
ص ٢٨ عبداللہ کی احکام الصلوۃ ١٦٦٢ء	نصیر الدین ہاشمی: ١٠٣٢ھ (٢٣-١٦٢٢ء) (دکن میں اردو ص ١٦٤)
ص ٢٨ بہاء الدین باجن ف ١٥٠٦ء	شمس اللہ قادری: ١٤ ذیقعدہ ٩١٢ھ/مارچ ١٥٠٧ء (اردوئے قدیم ص ٤٦)
ص ٢٩ شیخ عثمان ف ١٢٣٥ء - ظاہرا سہوِ کتابت ١٦٢٥ء کے لیے	شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں ان کا ذکر کیا ہے لیکن سنہ وفات نہیں دیا۔ جالبی کے مطابق یہ مجددِ الف ثانی کے پیر بھائی تھے۔ اس طرح ١٦٢٥ء عثمان کا نہیں، مجدد صاحب کا سنہ وفات ہے (جلد اوّل ص ٦٢٦)
ص ٣١ ابراہیم قطب شاہ جلوس ٩٥٥ء۔ عیسوی کا سہوِ کتابت ہے ہجری کے بجائے	شمس اللہ قادری: ٩٥٧ھ (اردوئے قدیم)
ص ٣٢ قلی قطب شاہ کی حکومت اور زندگی ١٦١١ء/١٠٢٠ھ تک	ڈاکٹر زور: گیارہ جنوری ١٦١٢ء/١٠٢٠ھ (معانیِ سخن ١٩)
ص ٣٥ سب رس ١٦٣٦ء/١٠٤٥ھ	ہجری سنہ صحیح ہے لیکن اس کا زیادہ حصہ ١٦٣٥ء میں پڑتا ہے۔
ص ٣٦ غواصی کی طوطی نامہ ١٦٣٩ء	جالبی: ١٠٤٩ھ/١٦٣٩ء بقول مرتب میر سعادت علی رضوی (جالبی جلد ١، ص ٣٨١)
ص ٣٧ محمد قطب شاہ کا جلوس ١٦١١ء	صحیح ١٦١٢ء، قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد
ص ٣٨ ابنِ نشاطی کی پھول بن ١٦٧٥ء	مرتبین عبدالقادر سروری اور شیخ چاند ابنِ حسین کراچی کے مطابق ١٠٧٦ھ/٦٦-١٦٦٥ء ۔ جمیل جالبی کے بقول ١٠٦٦ھ/١٦٥٥ء (جلد ١، ص ٣٨٧)

Scanned by CamScanner

ص۳۹ میراں یعقوب کی شمائل الاتقیا ۱۶۶۸ء۔

جالبی: خود مولف کے مطابق ۱۰۸۴ھ/۷۴-۱۶۷۳ء (ایضاً ص ۵۰۱)

ص۳۹ طبعی کی پھول بن ۱۶۶۰ء۔

خود شاعر کے مطابق ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۳ء) (اردوئے قدیم ص ۷۱)

ص۴۰ فائز کی رضوان شاہ و روح افزا ۱۶۵۳ء۔

خود شاعر کے مطابق ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۳ء) (اردوئے قدیم ص ۷۲)

ص۴۳ امین کی نامکمل مثنوی بہرام و بانو حسن تقریباً ۱۶۴۰ء۔

امین نے مقیمی کی چندر بدن و مہیار کی تقلید کی اور مقیمی نے غواصی کی سیف الملوک، ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء کی۔ اس لیے امین کی مثنوی ۱۶۲۵ء کے بعد کی ہونی چاہیے۔

ص۴۳ دولت نے مندرجہ بالا مثنوی کی تکمیل ۱۶۳۹ء میں کی

خود دولت کے مطابق یکم شعبان ۱۰۵۰ھ/ نومبر ۱۶۴۰ء (اردوئے قدیم ص ۴۸)

ص ۴۴ خاور نامہ ۱۶۳۹ء

جالبی: ۱۰۵۰ھ (۴۱-۱۶۴۰ء) جلد ۱، ص ۲۶۵

ص ۴۴، ۴۵ علی عادل شاہ ف ۱۶۷۳ء

مبارز الدین رفعت: ۱۳ شعبان ۱۰۸۳ھ (۲۴ نومبر ۱۹۷۲ء، کلیاتِ شاہی، علی گڑھ ۱۹۶۲ء)

ص ۴۵ نصرتی ف ۱۶۶۴ء

نصیر الدین ہاشمی: ۱۰۸۵ھ (۷۵-۱۶۷۴ء) قطعۂ تاریخ کے مطابق (فہرستِ مخطوطاتِ سالار جنگ ص ۶۰۱)

ص ۴۵ مرزا بیجاپوری مرثیہ گو (۱۶۶۰ء) ظاہراً سنہ وفات

اس سنہ کا کوئی ثبوت نہیں۔ دیکھیے ڈاکٹر چراغ علی: اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور اور گولکنڈہ میں (حیدر آباد ۱۹۷۳ء) ص ۸۱-۷۸

ص ۴۶ سیوا کی روضۃ الشہادت (کذا، اصل نام روضۃ الشہدا) ۱۶۷۰ء

شمس اللہ قادری: ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء (اردوئے قدیم ص ۸۹)

ص ۴۶ مومن مہدوی کی اسرارِ عشق ۱۶۸۱ء

مثنوی کے آخر میں لفظی مصرعِ تاریخ ہے جو بقول شمس اللہ قادری ۱۰۹۳ھ (۸۲-۱۶۸۱ء) اور بقول جالبی ۱۰۹۱ھ (۱۶۸۰ء) ظاہر کرتا ہے۔ (جالبی: تاریخ ۱، ص ۳۶۸)

Scanned by CamScanner

ص۳۶ ہاشمی کی یوسف زلیخا ۱۶۶۷ء	خود مثنوی میں ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷-۸۸ء) (اردوئے قدیم ص ۹۱)
ص۳۹ ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا ۱۷۰۰ء	ڈاکٹر زور: ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴-۲۵ء) تذکرۂ مخطوطات نمبر ۳۱- بحوالۂ دکنی میں اردو ص ۳۳۴
ص۵۰ وجدی (تقریباً ۱۷۱۰ء) ظاہرا سنہ وفات	۱۷۱۰ء برابر ہے ۱۱۲۲ھ کے لیکن وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقاں ۱۱۵۳ھ کی ہے۔
ص۵۵ ہاشم علی ۱۷۲۱ء سے ۱۷۶۰ء تک برہان پور میں قیام پذیر تھے	بیلی: ۱۷۲۱ء سے ۱۷۳۶ء کے درمیان برہان پور میں زندگی گزاری (اردو ترجمہ ص ۷۰)
ص ۵۷ سراج ۱۷۱۴ء تا ۱۷۶۲ء	سروری: ولادت ۱۳ صفر ۱۱۲۴ھ (مارچ ۱۷۱۲ء) وفات ۴ شوال ۱۱۷۷ھ (اپریل ۱۷۶۴ء) (مقدمۂ بوستانِ خیال حیدر آباد ۱۹۶۹ء ص ۷،۹) یہی تاریخیں مالک رام کے تذکرے میں
ص۵۸ سید محمد (کذا) کی مثنوی فیضِ عام ۱۷۲۷ء	نصرت مہدی: ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸-۲۹ء) (اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ ص ۱۱۰)
ص۵۸ داؤد فوت ۱۷۵۴ء	لچھمی نراین شفیق- ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴-۴۵ء) داؤد کے بیٹے کے حوالے سے (چمنستانِ شعرا)
ص ۶۲ نادر شاہ کا حملہ ۱۷۳۹ء- سہو طباعت	بیلی: ۱۷۳۹ء
ص ۶۳ آصف جاہِ اول کا خود مختاری کا اعلان ۱۷۴۴ء- سہوِ طباعت	بیلی: ۱۷۲۴ء، ہاشمی ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۳-۲۴ء) دکن میں اردو ص ۳۶۰
ص ۶۳ احمد شاہ ۱۷۴۰ء سے تختِ دہلی پر	بیلی: ۱۷۴۸ء
ص ۶۳ شاہ عالم ثانی ۱۸۰۴ء تک بادشاہ	مالک رام: شاہ عالم ف نومبر ۱۸۰۶ء
ص ۷۱ آبرو ۱۶۹۲ء تا ۱۷۴۳ء	جالبی و مالک رام، ولادت ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۳ء وفات ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ/ دسمبر ۱۷۳۳ء (جالبی جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۱۱-۱۲)
ص ۷۱ ناجی ف ۱۷۵۴ء	جالبی: ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء اور ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء کے بیچ۔ زیادہ امکان ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء (ایضاً ص ۲۴۵)

Scanned by CamScanner

ص ۷۱ مضمون ف تقریباً ۱۷۴۵ء	جالبی: ۱۱۴۷ھ/۳۵-۱۷۳۴ء (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۵۸)
ص ۷۲ حاتم ف ۱۷۸۱ء یا ۱۷۹۲ء	مالک رام: رمضان ۱۱۹۷ھ/اگست ۱۷۸۳ء
ص ۷۳ مظہر جانِ جاناں ف ۱۷۸۰ء	جالبی ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ/۷ جنوری ۱۷۸۱ء
ص ۷۳ سودا پ ۱۷۱۳ء	جالبی اور قاضی عبدالودود: ۱۱۱۸ھ/ ۰۷-۱۷۰۶ء (جلد دوم، حصہ دوم، ص ۶۵۴)
ص ۷۴ سودا ۱۷۶۵ء (کذا) میں دہلی سے فرخ آباد گئے	جالبی: ربیع الآخر ۱۱۷۳ھ/نومبر ۱۷۵۹ء میں گئے (ایضاً ص ۶۵۶)
ص ۷۵ میر پ ۱۷۲۴ء	جالبی: آخر ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۳ء) ماخذ نوادر الکملا (جلد دوم، حصہ ۱، ص ۵۰۴)
ص ۷۸ قائم ف ۱۷۸۷ء اور ۱۷۹۵ء کے بیچ	مالک رام: ۱۲۰۸ھ/ ۹۴-۱۷۹۳ء بحوالہ تاریخ جرأت
ص ۷۹ دیوانِ قائم ۱۹۲۰ء میں شائع	عبدالحق: یہ درست نہیں (تنقیدات عبدالحق)
ص ۷۹ میر درد ۱۷۱۹ء تا ۱۷۵۸ء۔ آخرالذکر سنہ سہوِ کتابت ہے ۱۷۸۵ء کا	جالبی: سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ (۲۱-۱۷۲۰ء) حوالہ سنا تھ سنگھ بیدار کا قطعہ (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۳۵)
ص ۷۹ میر سوز ۱۷۷۷ء میں دہلی سے نکلے	عبدالحق: ۱۷۵۷ء کے لگ بھگ (تنقیدات)
ص ۸۰ سوز ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ میں بس گئے	جالبی: شجاع الدولہ کے عہد کے آخر میں فیض آباد پہنچے۔ آصف الدولہ کے جلوس ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء کے بعد ان کے استاد ہوئے۔ انھیں کے ساتھ لکھنؤ آئے (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۹۵)
ص ۸۰ بیان۔ ف ۱۸۹۸ء (کذا)	جالبی: ۱۲۱۳ھ (۹۹-۱۷۹۸ء) (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۳۱۰)
ص ۸۰ میر محمدی بیدار ف قبل ۱۷۹۷ء	جالبی: ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۱۰ھ/۱۴ جولائی ۱۷۹۶ء (جلد ۲، حصہ ۲ ص ۹۰۱)
ص ۸۲ مصحفی پ ۱۷۵۰ء	ابواللیث: ۳۳-۱۱۳۱ھ/۲۹-۱۷۲۸ء (ادبیاتِ مسلمانان جلد ۷، ص ۳۶۵)

Scanned by CamScanner

	حنیف احمد نقوی: جمادی الاخریٰ ۱۱۷۰ھ کا دوسرا ہفتہ (مارچ ۱۷۵۷ء)
ص ۸۳ انشا ۱۷۸۶ء میں دہلی گئے	عابد پیشاوری: ۱۷۷۹ء یا ۱۷۸۰ء میں (انشاءاللہ خان انشا ص ۱۱۶)
ص ۸۵ جعفر علی حسرت ف ۱۷۹۱ء اور ۱۸۰۲ء کے بیچ	جالبی اور مشفق خواجہ ۱۲۰۶ھ/۹۲-۱۷۹۱ء (جالبی جلد ۲، حصہ ۲، حاشیہ ص ۸۸۱)
ص ۸۶ رنگین ۱۷۵۶ء تا ۱۸۳۴ء	ڈاکٹر حسن آرزو: ولادت ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء (سعادت یار خاں رنگین، مؤناتھ بھنجن ۱۹۸۴ء، ص ۶۱)
ص ۸۸ ہدایت پ ۱۷۳۰ء ف ۱۸۰۰ء	مالک رام: پ ۱۱۴۰ھ (۲۸-۱۷۲۷ء) جالبی: فوت ۱۲۱۹ھ/۰۵-۱۸۰۴ء (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۱۸)
ص ۸۸ راسخ ۱۷۴۸ء تا ۱۸۲۲ء	قاضی عبدالودود: پ ۱۱۷۱ھ/۵۸-۱۷۵۷ء جالبی ف ۲۰ جمادی الاوّل ۱۲۳۸ھ/فروری ۱۸۲۳ء (جلد ۲/۲، ص ۹۴۵)
ص ۸۹ نظیر اکبر آبادی پ ۱۷۴۰ء	علی احمد فاطمی: تقریباً ۱۷۳۵ء (نظیر اکبر آبادی الہ آباد ۱۹۸۳ء، ص ۳۶)
ص ۹۱ شاہ عالم ثانی ف ۱۸۰۴ء	صحیح: ۱۸۰۶ء
ص ۹۱ شاہ عالم کو اندھا کرنا ۱۷۷۱ء	صحیح تاریخ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء
ص ۹۳ حیدر بخش حیدری ف ۱۸۲۸ء	غلام حیدر: ۱۸۲۳ء/۱۲۳۹ھ (عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۳۸)
ص ۹۴ بہادر علی حسینی: اخلاقِ ہندی ۱۸۰۲ء	عبیدہ بیگم: خود حسینی کے مطابق ۱۸۰۱ء (ایضاً ص ۴۷۹)
ص ۹۵ کاظم علی جوان: شکنتلا ۱۸۰۲ء	خود مصنف کے مطابق ۱۸۰۱ء (ایضاً ص ۲۴۸)
ص ۹۶ اشک: منتخب الفوائد ۱۷۹۹ء	ڈاکٹر سمیع اللہ: تاریخی نام جس سے ۱۸۱۱ء برآمد (انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۷)

Scanned by CamScanner

ص۹۶ اشک: اسیر حمزہ ۱۸۰۰ء	خود مصنف کے مطابق ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء
ص۹۸ نوازش علی شیدا کی روضۃ الاطہار ۱۷۹۵ء	ہاشمی: ۱۱۷۳ھ (دکن میں اردو ص۳۹۱، فہرست مخطوطاتِ آصفیہ جلد اوّل ص۱۶۱)
ص۹۹ تنا کا گلِ عجائب ۱۷۷۳ء (یا ۱۷۸۸ء) قرات واضح نہیں	خود تذکرے میں تاریخِ تکمیل ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء
ص۹۹ لچھمی نراین شفیق پ ۱۷۴۴ء	مالک رام: ۲۳ فروری ۱۷۴۵ء
ص۹۹ شیر محمد خاں ایمان ف ۱۸۰۵ء	جالبی: ۱۲۲۱ھ/۰۷-۱۸۰۶ء، حوالہ گلزار آصفیہ۔ (تاریخ جلد ۲، حصہ ۲، ص۹۶۹)
ص۱۰۰ ماہ لقا بائی چندا ۱۷۶۷ء تا ۱۸۲۴ء	رفیعہ سلطانہ و نصیر الدین ہاشمی: پ ۱۱۷۸ھ/۶۵-۱۷۶۴ء۔ ف ۱۲۳۶ھ/۲۱-۱۸۲۰ء (رفیعہ: اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ۔ ہاشمی: دکن میں اردو)
ص۱۰۰ میر شمس الدین فیض پ ۱۷۸۱ء	وجودِ مظہرِ گل سے ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) (الحسن صلاح: میر شمس الدین فیض ۱۹۸۰ء، ص۵۲، ۸۳)
ص۱۰۶ میر خلیق ۱۷۷۴ء تا ۱۸۱۴ء	مسیح الناس ۱۷۶۶ء/۱۱۸۰ھ تا ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ (اردو مرثیے کی روایت ص۲۰۵) مالک رام: پ ۱۱۸۲ھ/۶۸-۱۷۶۷ء۔ ف ۱۸۴۴ء
ص۱۰۷ دیا شنکر نسیم ف ۱۸۴۳ء	مالک رام: مصرعِ تاریخ سے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء
ص۱۰۷ آتش ف ۱۸۴۶ء	شاہ عبدالسلام: ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ/جنوری ۱۸۴۷ء (دبستانِ آتش۔ دہلی ۱۹۷۷ء۔ ص۵۱)
ص۱۰۷ ناسخ ف ۱۸۲۸ء	بیلی و مالک رام: ۱۸۳۸ء
ص۱۰۸ انیس پ ۱۸۰۲ء	اکبر حیدری و مالک رام: ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء (حیدری اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص۵۶۹)
ص۱۰۹ فقیر محمد خاں گویا ف ۱۸۴۵ء	جعفر ملیح آبادی: ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء۔ بھانجے اور داماد کے مطابق (گویا صاحبِ سیف و قلم۔ لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ص۱۳۱)

ص۱۰۹ رجب علی بیگ سرور ف ۱۸۴۵ء	نیر مسعود: اپریل مئی ۱۸۶۹ء (رجب علی بیگ سرور ص ۴۰۰)
ص۱۱۰ صبا ۱۷۹۵ء تا ۱۸۵۴ء	تکمیل احمد: پ ۱۲۰۷ھ/۹۳-۱۷۹۲ء (اردو کے مشاہیر ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء غیر مطبوعہ مقالہ) مالک رام: ف ۱۳ جون ۱۸۵۵ء
ص۱۱۰ علی اوسط اشک پ ۱۷۹۹ء	سلیمان حسین ۱۲۱۲ھ/۹۸-۱۷۹۷ء کے لگ بھگ (لکھنؤ کے چند نامور شعرا، ۱۹۷۴ء ص ۱۱۸)
ص۱۱۱ اشک کا دوسرا دیوان نظمِ گرامی ۱۸۴۶ء	ابواللیث۔ تاریخی نام ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۲۵۹)
ص۱۱۱ امداد علی برق ف ۱۸۹۴ء	ابواللیث۔ تذکرہ گلستانِ سخن مطبوعہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء کے حاشیے پر لکھا ہے کہ تھوڑا زمانہ ہوا انتقال کیا (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۲۷۶)
ص۱۱۱ منیر ۱۸۱۹ء تا ۱۸۸۱ء	مالک رام: پ ۱۸۱۴ء ف ۱۰ اگست ۱۸۸۰ء
ص۱۱۲ اسیر ۱۸۰۰ء تا ۱۸۸۱ء	سلیمان حسین: پ ۱۲۲۰ھ (۶-۱۸۰۵ء) تاریخی نام مظفر۔ ف ۷ فروری ۱۸۸۲ء (لکھنؤ کے چند نامور شعرا ص ۱۷۵ و ۱۹۴)
ص۱۱۲ قلق ۱۸۵۰ء ظاہراً تاریخِ وفات	مالک رام بحوالۂ معاصر ۱۳ نومبر ۱۸۷۹ء
ص۱۱۲ مہدی علی خاں زکی ف ۱۸۷۶ء	بیلی: غالباً ۱۸۶۶ء۔ مالک رام مارچ ۱۸۶۷ء
ص۱۱۲ امانت ف ۱۸۵۸ء	مالک رام: ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ/۳ جنوری ۱۸۵۹ء
ص۱۱۳ تعشق لکھنوی ف ۱۸۵۱ء سہوِ کتابت۔ بیلی ۱۸۹۱ء	مالک رام: ۱۲ اپریل ۱۸۹۲ء
ص۱۱۳ حسین مرزا عشق ف قبل ۱۸۱۰ء سہوِ کتابت۔ بیلی قبلِ ۱۸۹۰ء	مالک رام: ۳۰ مئی ۱۸۸۶ء

Scanned by CamScanner

ص ۱۱۳ میر خورشید علی نفیس پ ۱۸۱۷ء	مالک رام: ۱۸۱۹ء/۱۲۳۴ھ
ص ۱۱۳ پیارے صاحب رشید ۱۸۴۵ء تا ۱۹۱۷ء	مالک رام: ۱۶ فروری ۱۸۴۷ء تا ۲ ستمبر ۱۹۱۸ء
ص ۱۱۳ علی محمد عارف پ ۱۸۶۱ء	مالک رام: ۲۸ دسمبر ۱۸۵۹ء
ص ۱۱۵ ذوق پ ۱۷۹۱ء سہوِ کتابت بلکہ ۱۷۸۹ء	تنویر علوی: ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء (کلیاتِ ذوق ص ۳۰)
ص ۱۱۷ مومن ف ۱۸۵۱ء	مالک رام: ۲۴ مئی ۱۸۵۲ء
ص ۱۱۷ نسیم دہلوی ۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۴ء	مالک رام: پ ۱۲۱۴ھ/(۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) ف ۳۱ جنوری ۱۸۶۶ء
ص ۱۱۸ قربان علی بیگ سالک ف ۱۸۷۵ء	مالک رام: ۱۲۹۷ھ/۸۰-۱۸۷۹ء (تلامذۂ غالب طبعِ دوم ص ۲۴۲)
ص ۱۱۸ نیر رخشاں ف ۱۸۸۳ء	مالک رام: ۲۷ جون ۱۸۸۵ء
ص ۱۱۹ میر مہدی مجروح ف ۱۹۰۲ء	مالک رام: ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء
ص ۱۲۴ سرسید کا تہذیب الاخلاق ۱۸۷۲ء میں جاری	نورالحسن نقوی: یکم شوال ۱۲۸۷ھ/۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو (سرسید اور ہندوستانی مسلمان ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۶)
ص ۱۲۶ حالی کی تریاقِ مسموم ۱۸۶۸ء	صحیح ۱۲۸۴ھ/۶۸-۱۸۶۷ء
ص ۱۲۶ حالی کی مجالس النسا ۱۸۸۲ء	۲ حصے پہلا حصہ، لاہور ۱۸۷۴ء میں شائع (ادبیاتِ تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و ہند جلد ۹، ص ۱۱۹)
ص ۱۲۹ غلام غوث بے خبر ف ۱۹۰۵ء	مالک رام: ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء کتبۂ قبر کے مطابق (تلامذۂ غالب ص ۶-۳۰۵)
ص ۱۳۰ امیر مینائی پ ۱۸۲۸ء	ابو محمد سحر: فروری ۱۸۲۹ء (مطالعۂ امیر ۶۵ء ص ۶۷)
ص ۱۳۱ امیر اللہ تسلیم پ ۱۸۲۰ء	ڈاکٹر فضلِ امام: ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء (امیر اللہ تسلیم ص ۱۸)
ص ۱۳۲ محسن کاکوروی پ ۱۸۲۵ء	مالک رام: ۲۶ ستمبر ۱۸۲۶ء
ص ۱۳۳ سرشار ف ۱۹۰۲ء	لطیف حسین ادیب: ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء (سرشار کی ناول نگاری، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۴۲)

Scanned by CamScanner

ص ۱۳۴ شرر پ ۱۸۸۶ء	بیلی وفاطمی ۱۸۶۰ء۔ خود شرر کے مطابق
ص ۱۳۵ سید احمد دہلوی ف ۱۹۳۰ء	حامد حسن قادری: ۱۹۱۹ء (داستانِ تاریخ اردو ص ۷۵۷)
ص ۱۳۵ صفیر بلگرامی پ ۱۸۳۳ء	ظفر اوگانوی: ۷ اپریل ۱۸۳۴ء (صفیر بلگرامی ص ۴۷)
ص ۱۳۷ شاد عظیم آبادی ف ۱۹۱۷ء	شاد کی کہانی شاد کی زبانی: ۸ جنوری ۱۹۲۷ء (ص ۲۷۵) بیلی بھی ۱۹۲۷ء
ص ۱۳۸ چکبست ف ۱۹۲۹ء	مالک رام: ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء
ص ۱۳۹ کیفی حیدر آبادی ف ۱۹۳۰ء	نصیرالدین ہاشمی و مالک رام: رجب ۱۳۳۸ھ/مارچ ۱۹۲۰ء
ص ۱۴۰ راشد الخیری ف ۱۹۳۲ء	مالک رام: ۳ فروری ۱۹۳۶ء
ص ۱۴۱ اقبال پ ۱۸۷۵ء	مالک رام ۱۸۷۳ء
ص ۱۵۰ اودھ اخبار ۱۸۹۹ء میں ہفتہ وار جاری کیا گیا	سکین علی حجازی: ۱۸۵۸ء میں ہفت روزہ، ۱۸۷۱ء میں ہفتے میں دو بار اور ۱۸۷۴ء میں روزنامہ (اردو صحافت۔ ادبیاتِ مسلمانان جلد ۹، ص ۵۲۸)
ص ۱۵۰ سرسید کا انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۴ء میں	اصغر عباس: ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو پہلی بار شائع (سرسید کی صحافت، دہلی ۱۹۷۵ء، ص ۴۳)

مندرجۂ بالا تسامحات کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ اس تاریخ میں تحقیق اور احتیاط سے ذرا بھی کام نہیں لیا گیا۔ تن آسانی کی خاطر محض بیلی کی تاریخ پر تکیہ کیا گیا جو اس وقت تک اردو کی بہترین تاریخ نہ تھی۔ نصابی ضروریات کے لحاظ سے اعجاز حسین کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" کہیں بہتر تھی۔ نئی تاریخ ہی لکھنی تھی تو رام بابو سکسینہ کی تاریخ کو اپنا خاص ماخذ بنانا چاہیے تھا۔ بیلی کی تاریخ سنین کے لحاظ سے پوری طرح معتبر نہیں۔ ادارے کی تاریخ میں بے احتیاطی اور لاپروائی کی وجہ سے اس کے سنین کو بھی جی بھر کے غلط نقل کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس تاریخ میں ناموں کی کثرت کے علاوہ نہ کوئی تحقیقی پہلو ہے نہ تنقیدی اہمیت۔ حیدر آباد کے باہر کوئی بمشکل اس تاریخ سے واقف ہوگا۔

میں نے جو ایسی غیر معیاری تاریخ کا مفصل تجزیہ کرنے میں اتنی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، وہ غیر ضروری تھا۔ میں یہ سمجھا کہ یہ ڈاکٹر زور جیسے محقق کا کارنامہ ہے اس لیے اس کا

Scanned by CamScanner

بالاستیعاب جائزہ لیا جائے۔ اب خیال ہوتا ہے کہ یہ شاید ان کا کام نہیں، ان کے رفقا کا ہے۔ مجھے اس شرح و بسط سے اس میں نہیں ڈوبنا چاہیے تھا۔

حواشی

(۱) "اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ"، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۸۱۔
(۲) زور: علی گڑھ تاریخ، حاشیہ ص ۳۸۲۔ سیدہ جعفر: مقدمہ "یوسف زلیخا"، حیدر آباد، ۱۹۸۳ء، ص ۴۵-۴۴)
(۳) نورالسعید اختر: "قصہ حسن و دل مختلف زبانوں میں"، مشمولہ "نقوشِ دکن"، بمبئی، سنہ ندارد، ص ۲۵۔
(۴) منظر اعظمی: "اردو میں تمثیل نگاری"، دہلی، طبع اول، ص ۱۷۳۔

Scanned by CamScanner

نواں باب

حامد حسن قادری: "داستانِ تاریخِ اردو"

مالک رام کے "تذکرۂ ماہ و سال" کے مطابق حامد حسن قادری کی ولادت ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔ وہ سینٹ جونس کالج آگرہ میں اردو کے استاد ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے، جہاں ۱۹۶۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ تاریخِ جمل کے ماہر تھے۔ نثرِ اردو کی تاریخ لکھی تو سنہِ آغاز کو یوں لفظوں میں اسیر کیا "داستانِ تاریخِ اردو۔" اس سے ۱۹۳۸ء نکلتی ہے۔ دوسری تاریخ ہے ع: "بذکرِ خدائے زباں آفریں" (۱۹۳۸ء)۔ کتاب کی تکمیل ۱۹۴۱ء میں ہوئی اور اشاعت نومبر ۱۹۴۱ء میں۔ اس کی تاریخ ع: "بذکرِ خدائے بیاں آفریں" کہی (۱۹۴۱ء)۔

کتاب لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ شعرا کے تذکرے اور "آبِ حیات" محض شاعروں تک محدود تھے۔ کسی نے مصنفینِ نثر کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ "سیر المصنفین" کے تقدم کا اقرار کرنے کے بعد اس سے ناآسودگی کی یہ وجہ بتاتے ہیں کہ جلد اول میں اردوے قدیم کو رواروی میں لکھا اور جلد دوم محض سرشار و شرر پر ختم کر دی۔ گراہم بیلی، رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین کی نثر و نظم کی تاریخ میں تحریروں کے نمونے نہیں۔ احسن مارہروی کی "نمونۂ منثورات" میں محض نمونے ہیں۔ انھوں نے چاہا کہ ایسی تاریخ لکھیں جس میں ارتقائے اردو، مصنفوں کے حالات، ان کی تحریروں کے نمونے اور تبصرے تفصیل سے ہوں۔ کہتے ہیں کہ پوری تاریخ نثر کے لیے ۱۵۰۰ صفحے تجویز ہوتے تو بہتر تھا۔ ص ۵۱۴ کے حاشیے میں اطلاع دیتے ہیں کہ کتاب کی تصنیف اور طباعت کا کام ساتھ ساتھ چلا کیا۔ بعض اوقات آگے کا مسودہ تیار نہ ہونے کی وجہ سے طباعت رک جاتی تھی۔

پاکستان میں ترمیم و اضافے کے بعد دوسرا ایڈیشن تیار کیا جسے آگرہ میں ۱۹۵۷ء میں چھپوایا۔ میرے سامنے یہی ایڈیشن ہے۔ کیا لطف ہے کہ پہلے اور دوسرے ایڈیشن دونوں کے دیباچے یکم رمضان کو (مختلف سنین کے) لکھے گئے۔ قادری نے "آبِ حیات"، "گلِ رعنا"، "سیر المصنفین" اور "نمونۂ منثورات" کی روایت برقرار رکھتے ہوئے کتاب کو ابواب

میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ ادوار اور ان کے تحت ذیلی عنوانات میں بیان کیا ہے۔ ادوار کی تقسیم بھی معقول نہیں۔

پہلی بڑی فصل یا جزو کتاب کا کیا نام ہے، واضح نہیں۔ اس کی ابتدا میں عنوان ہے: "آغازِ اردو سے پہلے۔" چوتھے صفحے پر دوسرا عنوان "اردو زبان"، آٹھویں صفحے پر عنوان "آغازِ اردو"، جس کے تحت گجرات، دکن اور شمالی ہند کے قدیم ادیبوں کا ذکر ہے۔ کتاب کا تعلق نثر سے ہے، لیکن شمالی ہند سے متعلق عنوان ہے: "شمالی ہند میں اردو شاعری کا دورِ قدیم" ان ۲۹ صفحوں کے بعد پہلی اہم فصل "نثرِ اردو کا دورِ اول" شروع ہوتی ہے۔ کتاب میں کسی دور یا عنوان کو نئے صفحے سے شروع نہیں کیا، بلکہ ماقبل بیان کے اختتام کے بعد اسی صفحے پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ نثرِ اردو کا دورِ اول "دکن میں اردو" کا ہے۔ چونکہ اس میں دکن کی انیسویں صدی تک کی نثر کا بیان ہے، اس لیے اس کا عنوان زمانے کے بجائے علاقے سے متعلق ہونا چاہیے تھا، یعنی "نثرِ اردو کا دورِ اول" کے بجائے "دکن میں اردو نثر" موزوں تر ہوتا۔

"نثرِ اردو کا دوسرا دور" شمالی ہند میں ۱۷۳۲ء تا ۱۷۹۹ء (یعنی اٹھارویں صدی) اور یورپین مصنفینِ اردو کے بارے میں ہے۔ دوسرے حصے میں یہ خلفشار ہے کہ اس میں اٹھارویں صدی کے مستشرقین کے ساتھ انیسویں صدی اور حد ہے کہ بیسویں صدی کے گراہم بیلی تک کا بیان آ گیا ہے۔ نثر کا تیسرا دور مصنفین فورٹ ولیم کالج سے لے کر رجب علی بیگ سرور تک ہے، جن کی غدر کے بعد کی تصانیف کو بھی شامل کیا ہے۔ چوتھے دور کی تاریخی حدود مجھے واضح نہیں۔ اس میں ایک طرف فقیر محمد گویا اور نیم چند کھتری کو لیا ہے، جو سرور کے ہم عصر تھے تو دوسری طرف غلام غوث بے خبر متوفی ۱۹۰۵ء تک کو۔ اس سے تیسرے اور چوتھے دور جزوی طور سے ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں۔ ان کے آگے انیسویں صدی کے مصنفینِ دکن کا بیان ہے۔

بظاہر یہ چوتھا دور ۱۸۳۴ء سے انیسویں صدی کے آخر تک کو محیط ہے لیکن اس کے آگے نثر کا پانچواں دور ۱۸۷۱ء سے ۱۹۰۰ء تک ہے جس میں سرسید، امیر مینائی، محسن الملک، وقار الملک متوفی ۱۹۱۷ء اور چراغ علی متوفی ۱۹۱۲ء تک شامل ہیں۔ اس دور میں ایک عنوان ہے: "اس دور کے غیر مشہور مصنفین (۱۸۳۹ء تا ۱۸۸۹ء)"، گویا ان میں کے ابتدائی مصنفین نہ صرف یہ کہ چوتھے دور، بلکہ تیسرے دور (سرور کا عہد) تک کے تحت آ سکتے تھے۔ بہر حال پانچواں دور زمانی حیثیت سے چوتھے دور کے متوازی ہے کہ دونوں انیسویں صدی پر ختم ہوتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

اور پھر "نثر کا چھٹا دور (غدر کے بعد)" آتا ہے۔ اس میں آزاد، ذکاءاللہ، نذیر احمد، حالی، سیّد علی بلگرامی، شبلی وغیرہ کا بیان ہے۔ ان سب کو سرسیّد کے دور سے کیوں کر علاحدہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف چوتھا اور پانچواں، بلکہ یہ مبینہ چھٹا دور بھی پوری طرح ایک دوسرے کے معاصر ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ "داستانِ تاریخِ اردو" کے مصنّف کو تاریخی ادوار کا کوئی واضح شعور نہ تھا۔ وہ ایک تحقیقی کتاب کا باقاعدہ خاکہ نہیں بنا سکتے تھے۔

کتاب میں فٹ نوٹ کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں: ۱۔ مآخذ کا حوالہ دینا ۲۔ متن کے کسی بیان پر تبصرہ کرنا۔ اوّل الذکر کو حوالے اور آخرالذکر کو حواشی کہہ سکتے ہیں۔ حواشی متن کے حریف نہیں ہونے چاہییں۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے کتابچے میں لکھا ہے کہ تشریحی نوٹ کم سے کم ہوں اور زیادہ سے زیادہ مختصر ہوں۔ جو بات متن میں جگہ پانے کی مستحق نہیں، اسے حاشیے میں دینے کی ضرورت بھی نہیں (۱)۔ مغرب میں بعض درس گاہوں کے شعبے کہتے ہیں کہ فٹ نوٹ محض حوالوں کے لیے استعمال کیجیے۔ تبصراتی حواشی متن میں شامل کیجیے یا ضمیمے کے طور پر دیجیے (گیان چند: "تحقیق کا فن"، ص ۳۲۲-۳۲۳)۔

محمد حسین آزاد نے یہ بدعت شروع کی کہ ان کی رائے میں جو شاعر ثانوی حیثیت کے تھے، ان کے پورے حالات فٹ نوٹ میں لکھے۔ آزاد کی تقلید "گلِ رعنا" اور "سیر المصنفین" میں بھی کی گئی۔ حامد حسن قادری ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ انھوں نے ٹھوس پُرمغز موضوعات کو کئی کئی صفحوں کے حواشی میں سمایا ہے، مثلاً ہندی زبان کی تاریخ ص ۴۰-۱۳۱، ریختی ص ۱۵۱، مختصر تاریخِ وزارتِ شاہِ اودھ ص ۶۶-۱۵۹، اردو لغات ص ۴۳-۳۴۱، جدید اردو شاعری ص ۸۹-۳۸۶ وغیرہ۔ ان موضوعات کو فٹ نوٹ میں لکھنا اس کا غلط استعمال ہے۔ ہمارے دور میں قاضی عبدالودود اور عابد پیشاوری نے اس غلط طریقے کو بکثرت استعمال کیا ہے۔

حامد حسن قادری نے "سیر المصنفین" پر اعتراض کیا تھا کہ "دوسری جلد کے لیے صرف چوٹی کے سات آٹھ مشہور مصنّفوں کو چُن لیا اور سرشار و شرر پر کتاب کو ختم کر دیا (پہلا دیباچہ، صفحہ ب)۔ خود قادری نے کیا کیا ہے۔ انھوں نے نثر کے چھٹے دور میں، جو چار سو سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، محمد حسین آزاد، ذکاءاللہ، نذیر احمد، حالی، سیّد علی بلگرامی، شبلی، سیّد احمد دہلوی، میر ناصر علی خاں دہلوی اور ناصر نذیر فراق پر لکھا اور ان پر کتاب کو ختم کر دیا۔ ان میں سے کچھ ثانوی حیثیت کے اہلِ قلم ہیں۔ قادری نے سرشار، شرر، رسوا اور منشی سجاد حسین پر نہ لکھنے کا عذرِ لنگ پیش کیا۔ لکھتے ہیں کہ ان کی پہلی اور بڑی حیثیت ناول نگار کی ہے، سرشار اور سجاد حسین ظرافت کے پیش رو ہیں۔ اس کے لیے ایک علاحدہ کتاب

Scanned by CamScanner

کی ضرورت ہے (ص ۷۸۷)۔ یہ کس نے قاعدہ بنایا کہ نثر کی تاریخ میں ناول نگاروں یا اہم ظرافت نگاروں پر نہ لکھا جائے۔ ان کے اعتذار کے باوجود کتاب میں سرشار، شرر اور رسوا کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے، جب کہ ان سے فروتر مصنفین کو جگہ دی گئی ہے اور ۱۹۴۱ء میں پہلے ایڈیشن والی تاریخ نثر میں پریم چند اور نیاز فتح پوری وغیرہ کو نظرانداز کرنے کا کیا جواز ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ تاریخ محض انیسویں صدی کے آخر تک کے نثری ادب کا احصاء کرتی ہے اور اس میں بھی سرشار، شرر اور رسوا جیسے عمائد کو چھوڑ کر۔

تذکروں میں جتنا بڑا شاعر ہوتا تھا، اس کا نمونہ کلام اتنا ہی زیادہ درج کیا جاتا تھا، جو بعض اوقات بیسیوں صفحوں پر پھیل جاتا تھا۔ "سیرالمصنفین" میں بڑے نثر نگاروں کی تخلیقات کے طولانی نمونے نقل کیے گئے۔ قادری ان کو بھی مات دے گئے ہیں۔ تنقید کے بغیر کتابوں کے اجزا نقل کر دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ بعض بڑے مصنفین کی تصانیف کو جتنے صفحے دیے گئے ہیں، ذیل میں ان کی تعداد دیکھیے:

سرسید ۴۴ صفحے، آزاد ۴۰ صفحے، نذیر احمد ۴۳ صفحے، حالی ۳۹ صفحے، شبلی ۱۱۰ صفحے۔

شبلی نے تو ریکارڈ ہی توڑ دیا۔ ان صفحات میں ان تصانیف کا تعارف یا تبصرہ بھی شامل ہے، لیکن وہ محض چند صفحات میں ہوتا ہے، کم از کم ۸۰ فی صد صفحے نمونوں کی نذر کر دیے گئے ہیں۔ یہ عدم توازن ہے۔

مندرجۂ بالا مشاہدات سے قطعِ نظر، کتاب میں تحقیق اور تنقید کے اچھے نمونے بکثرت ہیں۔ ذیل میں سلسلےوار کتاب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کی شرح کر دی جائے گی۔

ابتدائی چند صفحات لسانیاتی ہیں، یعنی اردو زبان کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ "داستانِ تاریخِ اردو" کی طبعِ دوم ہی نہیں، طبعِ اوّل تک "آبِ حیات"، "دکن میں اردو"، شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم"، "پنجاب میں اردو"، مولوی عبدالحق کی "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"، تاریخِ ادب کی کئی کتابیں، "نقوشِ سلیمانی" اور محمود شیرانی کے مضامین شائع ہو چکے تھے، اس لیے قادری کو اردو کے آغاز اور ابتدائی اردو پر لکھنے میں کوئی دقت نہ ہو سکتی تھی۔ اتفاق سے انھوں نے کتاب کے آخر میں کتابیات نہیں دی۔ اس وقت تک اس کا رواج ہی نہیں ہوا تھا۔

میں لسانی بیان کے کچھ تسامحات کی نشان دہی کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ اس کتاب کی ابتدا میں صفحوں کے شمار میں عجب بے ضابطگی ہے۔ شروع میں دوسرا دیباچہ ہے جس پر صفحوں کے نمبر ۱ تا ۴ پڑے ہیں۔ اس کے بعد پہلا دیباچہ ہے جس پر صفحوں کے ابجدی نمبر الف تا

Scanned by CamScanner

واوٗ ہیں۔ اس کے بعد فہرست میں عددی نمبر ا تا ۲۴ ہیں۔ فہرستِ مضامین کو ۲۴ صفحے دینا عدمِ توازن کی ایک اور نشانی ہے۔ اس کے بعد متن میں پھر سے عددی نمبر "ا" سے شروع ہوتے ہیں۔ فہرست کے عددی ۲۴ کے بعد ص ا آنا بالکل غلط ہے۔ اس طرح کتاب میں ص ا تا ۴ تین جگہ اور ص ۵ تا ۲۴ دو جگہ ہیں۔ میں ذیل میں متن کے صفحوں کا حوالہ دے رہا ہوں۔

سنسکرت کے مشہور شاعر کالی داس کا زمانہ طے نہیں، لیکن قادری نے ص ۲ پر اسے قطعی طور پر نصف صدی قبلِ مسیح میں رکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں اسی عہد کے پنڈت ورا روچی نے پراکرت پرکاش کے نام سے برج بھاشا کے قواعد لکھے۔ آگے لکھتے ہیں کہ سکندر کے حملے کے وقت ہندوستان میں برج بھاشا رائج تھی اور اشوک کے کتبوں پر یہی زبان کندہ ہے (ص ۲)۔ اب کیفیت یہ ہے کہ برج بھاشا بارھویں تیرھویں صدی عیسوی میں وجود میں آئی۔ اشوک کی لاٹوں اور شلا لیکھوں میں اس کے ہونے کا سوال ہی نہیں۔ ان کی زبان کو اشوکی پراکرت کہتے ہیں۔ وررُوچی پانچویں صدی عیسوی کا مصنف ہے اور اس کی کتاب میں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، پراکرت کا بیان ہے (بھولاناتھ تواری: "بھاشا وگیان ہندی"، الہ آباد، شک سمبت ۱۸۸۴ء، ص ۵۴۵)۔

شاہ جہاں نے کوئی تحریر اپنے زمانے کی اردو زبان میں اپنے قلم سے لکھی ہے۔ اس کے متعلق عالم گیر شاہ جہاں کو لکھتے ہیں:

> آں فرمان کہ در زبانِ ہندی از دستخطِ خاص رقمی فرمودہ شاہدِ ایں معانی است۔ (ص ۷)

حامد حسن قادری نے یہ بیان شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" سے لیا ہے۔ رشید حسن خاں نے اس پر خاصی تحقیق کی۔ ان کے بقول "منتخب اللباب" جلد دوم، ص ۳-۱۰۲ میں رقعے کا متعلقہ جملہ یوں ہے:

> از نوشتہ کہ بخطِ ہندوی بہ شجاع قلمی گردیدہ بود...
>
> ("ادبی تحقیق"، ص ۳۱۳)

ڈاکٹر مصطفےٰ کمال، ڈاکٹر مسعود حسین خاں وغیرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اکبر تا شاہ جہاں کے دور میں ہندی سے مراد برج بھاشا ہوتی تھی نہ کہ اردو۔ "تاریخ شاہ جہاں" کے مصنف ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں کو اردو کی ترقی سے وابستہ کرنا غلط ہے (ڈاکٹر مصطفےٰ کمال: "حیدر آباد میں اردو کی ترقی، تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے"، ص ۲۰)۔

Scanned by CamScanner

شیرانی کی "پنجاب میں اردو"، مولوی عبدالحق کی "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" اور سلیمان ندوی کی "نقوشِ سلیمانی" میں اردو کے ابتدائی نمونوں کے طور پر بہت سی ضعیف روایتوں پر مبنی غیر مصدقہ تخلیقات دی ہیں، جنھیں قادری نے بھی لے لیا ہے۔ ان میں بابا فرید کی نظم و غزل (ص ۱۲)، خسرو سے منسوب غزلیں، ریختے اور پہیلیاں (ص ۱۵)، مخدوم صابر پیرانِ کلیری سے منسوب آج کی زبان میں ایک شعر (ص ۱۶) وغیرہ ایسی ہی چیزیں ہیں جن کا انتساب تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ریختہ ع:

در غم ہجر تو کمر توتہ ہے

کو خسرو سے منسوب کرنا بطور خاص مضحکہ خیز ہے۔ شیرانی نے اسے شیخ جمالی سے منسوب کیا، لیکن شمس اللہ قادری نے خسرو سے۔ اس کے بارے میں مزید معلومات میرے مضمون "دو لسانی ریختے" میں ملاحظہ ہوں (مشمولہ "کھوج"، دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۶۲)۔

حامد حسن قادری ایک غیر مصدقہ مصنف اور اس کے معدوم رسالے کی تشہیر کے بھی ذمےدار ہیں۔ ص ۱۷ پر "اردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر ۱۳۰۸ء" (۷۰۸ھ) کے پُرشکوہ عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ رسالہ "نگار" لکھنؤ (بابت دسمبر ۱۹۲۵ء) میں سید نذر علی درد کاکوروی نے اطلاع دی (۲) کہ سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو ایک رسالے کی شکل میں ۱۳۰۸ء (۷۰۸ھ) میں جمع کیا۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحات کی ہے۔ اس کے بعد قادری رسالے کے ص ۱۱۸ سے دو سطروں کا نمونہ درج کرتے ہیں۔ ان جملوں کی زبان کسی طرح آٹھویں صدی ہجری کی نہیں، بہت بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس رسالے کی جم کر تحقیق کی۔ انھوں نے حامد حسن قادری اور درد کاکوروی دونوں سے رابطہ قائم کیا۔ درد نے بتایا کہ انھوں نے یہ رسالہ اورنگ آباد میں حضرت شاہ قادر اولیا کی درگاہ میں محبوب علی شاہ نامی ایک خادم کے پاس دیکھا تھا، عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو گیا۔ درد نے رسالہ "یادگار" لاہور میں "اردو اور شمالی ہند" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا (ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: "اردو نثر کا آغاز اور ارتقا"، ص ۵۷-۵۶)۔

یہ عجیب بات ہے کہ حامد حسن قادری لکھتے ہیں کہ انھوں نے "نگار" دسمبر ۱۹۲۵ء میں درد کا مضمون دیکھا۔ درد نے ڈاکٹر رفیعہ کو لکھا کہ انھوں نے کسی مجہول الاسم و مجہول التاریخ رسالے "یادگار" لاہور میں لکھا تھا۔ انھوں نے اورنگ آباد میں اگر ایسی بیش بہا کتاب دیکھی تھی تو اس کے بارے میں مزید تفصیل کیوں نہ دی، اسے محفوظ کرانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ مشکوک راویوں کے مشکوک بیان، غیر موجود رسالہ، ہم کیوں کر اسے تسلیم کریں۔

Scanned by CamScanner

حامد حسن قادری کریں تو کریں۔ وہ بشاش ہو کر لکھتے ہیں:

اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی (بارھویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیفِ نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہاں گیر کے رسالۂ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہاں گیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔ (ص ۱۸)

گویا دکن اور شمال میں کوئی دوڑ کا مقابلہ ہو رہا ہے۔

کبیر سے منسوب ایک غزل کے دو شعر نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ان کی تاریخی سند مشتبہ ہے (ص ۲۱)۔ مشتبہ کیا، ان کی صاف زبان کے پیشِ نظر یہ کبیر کے ہو ہی نہیں سکتے۔ ص ۲۳ پر راجا بھگوان داس کی لڑکی سے جہاں گیر کی شادی کے موقع پر راجا اور اکبر کی زبانی جو دو دیسی اشعار کہلائے ہیں ان کا ماخذ کوئی مجہول الاسم "تاریخِ ہمایونی" ہے۔ معلوم نہیں اس پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس تاریخ کے مطابق خود شہنشاہ اکبر اور نوشہ جہاں گیر دلہن کی پالکی کندھے پر لے کر چلے۔ یہ کسی طرح قرینِ قیاس نہیں۔ خسر اور نوشہ اور وہ بھی شہنشاہ اور ولی عہد، کس قوم میں دلہن کی پالکی اٹھاتے ہیں۔

سعدی کاکوروی سے منسوب غزلِ ریختہ کا ایک شعر دیا ہے: "... پیت ہے۔" (ص ۲۴)۔ اس ریختے کے مصنف کا معاملہ اختلافی ہے۔ کاکوری میں ایک سعدی ضرور ہوئے ہیں، لیکن قاضی عبدالودود کا کہنا ہے کہ یہ ان کا نام تھا، تخلص نہ تھا اور ان کا شاعر ہونا مطلقاً ثابت نہیں ("معاصر"، حصہ ۹، ص ۱۸۷، مشمولہ "عیارستان")۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اسے سعدی دکنی لکھا ہے۔ لچھمی نرائن شفیق نے اسے برہان پوری قرار دیا ہے۔ محمود شیرانی بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں (۳)۔ نورالحسن ہاشمی نے اس ریختے کی قدیم ترین روایت دریافت کی، جس میں اسے پنجاب کے ملا شیری سے منسوب کیا ہے (علی گڑھ تاریخ، ص ۴۸۸)۔

لکھتے ہیں کہ محمد افضل ساکنِ جھنجھانہ نے اپنی داستانِ محبت نہایت دردانگیز طور پر مثنوی میں بیان کی ہے۔ ایک نظم بارہ ماسہ بھی ہے۔ ۱۶۲۵ء میں انتقال کیا (ص ۲۵)۔

انھوں نے یہ غیر معمولی بیان دیا کہ افضل نے ایک مثنوی اور ایک بارہ ماسہ دو نظمیں

Scanned by CamScanner

لکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ افضل کا قدیم ترین حوالہ سید قطبی کے تیرہ ماسے میں ملتا ہے، جہاں اس کا نام گوپال بتایا ہے۔ "بکٹ کہانی" ناکام عاشق کی داستانِ محبت نہیں، سیدھا سادہ بارہ ماسہ ہے جس میں ایک عورت اپنے شوہر سے بچھڑنے پر فغاں کرتی ہے۔ محمد افضل ایک دوسرا فارسی شاعر ہے جس کا ذکر والہ داغستانی نے اپنے تذکرے "ریاض الشعرا" میں کیا ہے۔ اس کا سنہ وفات ۱۰۳۵ھ لکھا ہے جو ۲۶-۱۶۲۵ء کے برابر ہے لیکن والہ نے اس کے لیے یہ نہیں لکھا کہ وہ "بکٹ کہانی" کا مصنف ہے۔ قائم نے "بکٹ کہانی" کے مصنف افضل کو عبداللہ قطب شاہ سے پیشتر کا شاعر مانا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کا سنہ جلوس ۱۰۳۵ھ ہے۔ اسی کو بعض حضرات نے افضل کا سنہ وفات سمجھ لیا۔

اسی صفحے پر برہمن سے منسوب غزل کا مطلع دیا ہے۔ نورالحسن ہاشمی اور رشید حسن خاں تسلیم نہیں کرتے کہ برہمن نے اردو میں کچھ کہا تھا ("دلی کا دبستانِ شاعری"، لکھنؤ ۱۹۶۷ء، ص ۵۶-۵۵ فٹ نوٹ۔ "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ص ۱۱-۳۰۹)۔

"نثر اردو کا دورِ اول" کا صحیح عنوان "دکن میں اردو" ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس باب میں انیسویں صدی تک کی دکنی نثر کا ذکر آ گیا ہے جو کسی طرح دورِ اول سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس میں سب سے پہلے شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کا ذکر ہے لیکن یہ رسالے ناپید ہیں۔ کسی نے ان کا نمونہ نہیں دیا اس لیے ان کے وجود کا کیا بھروسا۔ خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" کے ذکر کے لیے قادری کو معذور رکھنا چاہیے، کیونکہ اس وقت تک حسینی شاہد اور حفیظ قتیل کی یہ تحقیق سامنے نہیں آئی تھی کہ "معراج العاشقین" خواجہ کی تصنیف نہیں۔ اسی طرح دوسرے رسالوں مثلاً "معراج نامہ" اور "سہ بارہ" کا بھی خواجہ سے انتساب درست نہیں۔ قادری نے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" سے لے کر "...ہشیار توں، ...دیدار توں" والی غزل خواجہ بندہ نواز کی قرار دی۔ جالبی کی تحقیق ہے کہ یہ بہت بعد کے ایک بزرگ شہباز حسینی قادری بیجاپوری کی ہے (جالبی: تاریخ، جلد اول، ص ۲۲۷)۔ ص ۳۴ پر شاہ میراں جی شمس العشاق کے کئی نثری رسالوں کا نام لیا ہے۔ میراں جی سے بھی کسی اردو نثری رسالے کا انتساب غلط ہے۔

احسن مارہروی نے تذکرہ "محبوب الزمن" میں ایک شاہ فضل اللہ فضلی اورنگ آبادی کا ذکر دیکھ کر اسے فضلی مصنف "کربل کتھا" سمجھ لیا، لیکن اتنا ضرور کھٹکے کہ اس کی زبان میں دکنیت نہیں (ص ۱۷-۶۹)۔ حامد حسن قادری احسن مارہروی کی مزید گرفت کرتے ہیں کہ فضلی شیعہ ہے، اسے حنفی و نقش بندی کیوں تسلیم کیا۔ ص ۵۴ پر شاہ رفیع الدین کے "ترجمۂ قرآن" کا سنہ ۱۲۰۰ھ محض قیاسی ہے۔ چونکہ چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کے ترجمے کا سنہ

Scanned by CamScanner

۱۲۰۵ھ ہے، اس لیے بعضوں نے قیاساً بڑے بھائی کے ترجمے کو اس سے پہلے رکھ دیا۔ مولوی عبدالحق کی رائے میں شاہ رفیع الدین کا ترجمہ شاہ عبدالقادر سے بعد کا ہے(۴)۔ لیکن جمیل جالبی کی رائے میں پہلے کا ہے (جلد دوم، حصۂ دوم، ص ۱۰۵۳)۔

آزاد نے "آبِ حیات" میں "نوطرزِ مرصع" کے بارے میں لکھا تھا کہ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی اور ۱۷۹۸ء میں آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی ("آبِ حیات"، ص ۲۵)۔ آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء میں ہوا تھا، ۱۷۹۸ء میں نہیں۔ مولانا قادری نے "آبِ حیات" کے بیان کو یوں مسخ کیا: "شجاع الدولہ کے دربار میں آکر ۱۷۹۸ء، ۱۲۱۳ھ میں ختم کی۔" (ص ۵۷)۔ لیکن شجاع الدولہ کا انتقال ۱۷۷۵ء میں ہو گیا تھا۔ خود تحسین کے بیان سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے یہ داستان شجاع الدولہ کی زندگی میں مکمل کرلی تھی۔

"یوروپین مصنّفینِ اردو" کی فصل میں اوّل انھوں نے کئی صفحوں میں ہندوستان میں یورپی قوموں کا ورود اور تجارتی جنگ، اس کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے اشاعت تعلیم اور اس کے بعد مستشرق مصنّفین کا ذکر ہے۔ یہ پوری فصل تحقیقی اعتبار سے کافی مفصّل ہے۔ دکن کے باب کی طرح یہاں بھی زمانے کا خیال نہیں رکھا اور ۱۹۳۲ء کی گراہم بیلی کی "تاریخِ اردو ادب" تک کا تعارف کرادیا ہے۔ اس فصل میں ص ۷۲ پر گِل کرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل لکھا ہے۔ یہ غلطی عام تھی جس کا ازالہ عتیق صدیقی نے "گِل کرسٹ اور اس کا عہد" (۱۹۶۰ء)۔ میں کیا۔ ص ۷۶-۷۵ پر گارساں دتاسی کی ۱۷ کتابوں کی فہرست ہے۔ اس میں بعض مضامین کو کتاب سمجھ کر شامل کردیا ہے۔ دقت یہ ہے کہ قادری بیشتر صورتوں میں اپنے ماخذ کا اظہار نہیں کرتے۔

ص ۸۳-۸۲ پر فٹ نوٹ میں چھاپا خانوں - کے بارے میں لکھتے ہیں۔ یہ بیان متن میں آتا تو کیا مضائقہ تھا۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ پہلا اردو اخبار اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا (ص ۸۲، فٹ نوٹ)۔ قادری نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا، لیکن انھوں نے یہ معلومات نادم سیتاپوری کے کسی مضمون سے لی ہوگی۔ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ اردو کا پہلا اخبار منشی سدا سکھ کا "جامِ جہاں نُما" ہے جو ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے جاری ہوا(۵)۔

لکھتے ہیں کہ میرامّن کا نام میر امان تھا اور تخلص امّن (ص ۸۴)۔ رشید حسن خاں نے اس بدعت کی تاریخ بیان کی ہے کہ ایسا اوّل کریم الدین اپنے تذکرے میں لکھا۔ بعد میں "سیرالمصنّفین" اور "اربابِ نثرِ اردو" میں اس کا اعادہ کیا گیا۔ یہی بات قادری نے دہرادی ہے۔ صحیح صورت یہ ہے کہ میرامّن نام اور لطف تخلص ہے (رشید حسن خاں: مقدمہ

Scanned by CamScanner

"باغ و بہار"، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۹-۲۸)۔ قادری محمد عوض زریں کی "نوطرزِ مرصع" کے نام پر ٹھٹکتے ہیں کہ اس نے تحسین والا نام کیوں کر رکھ لیا (ص ۸۷)۔ نثار احمد فاروقی نے میرے نام ایک مکتوب میں واضح کیا کہ مترجم کا نام محمد عوض نہیں محمد غوث اور اس کے ترجمے کا نام "چاردرویش" تھا۔ بازاری ناشرین نے غلط فہمی سے اس کا بھی نام "نوطرزِ مرصع" رکھ دیا۔

لکھتے ہیں: میرامن کی "گنجِ خوبی" ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۷ھ میں لکھی گئی اور ۱۸۷۵ء/ ۱۲۹۲ھ میں پہلی بار شائع ہوئی (ص ۸۴)۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے مطابق ۱۲۱۷ھ اس کی تاریخ آغاز ہے جو کتاب میں درج ہے۔ تکمیل کا قطعۂ تاریخ آخر میں دیا ہے، جس سے ۱۲۱۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰۵ء میں ہندی میں اور ۱۸۴۶ء میں اردو میں کلکتے سے شائع ہوئی ("فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۴۵۱)۔ قادری نے حیدر بخش حیدری کے تذکرہ "گلشنِ ہند" کی تاریخ ۱۲۱۴ھ نکالی ہے (ص ۹۲)۔ شاید ان سے حساب میں سہو ہوا۔ قطعۂ تاریخ کے دونوں شعروں کے دوسرے مصرع یہ ہیں:

رزؤے حق یہ بولے شیخ اور رند

۸

اسے کہتا ہے ہر ایک "گلشنِ ہند"

۱۲۱۴ = ۸ + ۱۲۰۶

دوسرے مصرع سے بے کم و کاست صاف صاف ۱۲۰۷ برآمد ہوتا ہے، جس سے تذکرے کی تاریخ ۱۲۱۵ھ قرار پاتی ہے۔

یہ اطمینان کی بات ہے کہ قادری کو سنین کا شعور ہے۔ ص ۱۰۰ کے فٹ نوٹ میں ہجری و عیسوی سنین کا تطابق کر کے بعض مآخذ کے اندراجات میں ایک سال کے فرق پر حیران ہوتے ہیں۔ افسوس نے "باغِ اردو" کی تاریخ الفاظ میں "بارہ سے سولہ ہجری اور عیسوی اٹھارہ سے دو" لکھی ہے۔ اس کے بعد عیسوی قطعۂ تاریخ دیا ہے۔ قادری پریشان ہیں کہ عیسوی مصرعِ تاریخ میں ایک سال کا فرق رہتا ہے۔

ابتدائے بہار سے یہ کہا

"باغِ اردو ہوئی گلستاں اب

۱۸۰۱ = ۲ + ۱۷۹۹

لیکن "ہوئی" میں ہمزہ کا ایک عدد شمار کیا جائے تو مصرع سے ۱۸۰۰ء برآمد ہوگا جس

Scanned by CamScanner

پر دو کا اضافہ کیا جائے گا۔ ڈاکٹر عابد پیشاوری نے اپنے مقالے "انشاءاللہ خاں انشا" میں (ص۲۸۰) "بحرالفصاحت" کے اس بیان کی طرف توجہ دلائی کہ بعض لوگ ہمزہ کا ایک عدد شمار کرتے ہیں، بعض جُمَلِ "یا" لکھ کر دس عدد لیتے ہیں، بعض کوئی عدد نہیں لیتے ("بحرالفصاحت"، لکھنؤ ۱۹۵۷ء، ص۹۹۶)۔

قادری نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے حالات بھی خوب لکھے ہیں اور تنقید بھی خوب کی ہے، مثلاً لطف کے "گلشنِ ہند" کی قافیہ پیمائی اور تعقیدِ لفظی کی نمونوں کے ساتھ گرفت کی ہے (ص۱۰۵-۱۰۶)۔ انھوں نے حسینی کی "تاریخِ آسام" کو ناپید کہا ہے (ص۱۱۰)۔ ڈاکٹر عبیدہ کے مطابق "تاریخ آشام" کا نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود ہے اور عبیدہ نے اس کا مفصّل تعارف کرایا ہے (عبیدہ، ص۵۰-۵۴۶)۔ معلوم ہوتا ہے حسینی نے اس کا نام "تاریخِ اشام" رکھا تھا جسے "تاریخ آشام" اور "تاریخِ آسام" پڑھ لیا گیا ہے۔

ص۱۱۱ پر وِلا کی تالیفات میں "اتالیقِ ہندی" کو بھی شمار کیا ہے اور اسے فارسی کی کتاب کہا ہے۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ڈاکٹر عبیدہ کے مطابق یہ گل کرسٹ کی تالیف The Hindi Moral Preceptor ہے۔ اس کے تین اجزا ہیں۔ پہلے جزو میں گلیڈون کا کیا ہوا "پند نامۂ سعدی" کا انگریزی نثر میں ترجمہ ہے۔ دوسرے میں اس کے خلاصے کا انگریزی نظم میں ترجمہ ہے۔ تیسرے جزو میں "پند نامۂ سعدی" کے فارسی اشعار اور ان کا وِلا کا منظوم ترجمہ ہے (عبیدہ، ص۵۰۱-۴۹۹)۔

وِلا نے "قصۂ مادھونل اور کام کندلا" کی ہندی اصل کو موتی رام کبیشر کی تصنیف قرار دیا تھا۔ یہی قادری نے لکھا ہے (ص۱۱۱)۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس نے دریافت کیا کہ وِلا کا ماخذ برج کی نہیں، اودھی کی نظم ہے۔ مصنف موتی رام نہیں، عالم کوی ہے ("اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، ص۹۳-۳۸۶)۔ قادری پھر اس کتاب کے ہجری و عیسوی سنین کے تطابق پر الجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ آخر میں دو قطعات تاریخ ہیں جن میں ہجری ۱۲۱۵ اور عیسوی ۱۸۰۲ نکلتا ہے اور یہ آپس میں مطابقت نہیں رکھتے (ص۱۱۱)۔ اب میں یہ کہوں کہ قادری جیسا ماہرِ تاریخ مصرعوں سے تاریخ نکالنے میں سہو کر جاتا ہے تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن ہے کچھ ایسا ہی۔ ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنی کتاب میں شعرِ تاریخ دیا ہے:

سرِ جہل کر دور اور دیکھ لے
فسانہ ہے یک سر عجیب و غریب
۳ - ۱۸۰۴ = ۱۸۰۱ء

(مونس، ص۳۸۱)

سمجھ میں نہیں آتا کہ قادری نے اس شعر سے ۱۸۰۲ء کیوں کر برآمد کیا۔ ص ۱۱۴ پر ولا کے "جہاں گیر نامہ" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں۔ ڈاکٹر عبیدہ کے مطابق اس کا صحیح نام "جہاں گیر شاہی" ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۹ء میں مکمل ہوا۔ اس کا مخطوطہ موجود ہے جس کا مفصل تعارف عبیدہ نے کرایا ہے (ص ۵۴۴)۔ قادری نے ص ۱۱۶ پر جوان کے ترجمہ "شکنتلا ناٹک" کو اردو کا پہلا ناٹک یا ڈراما لکھا ہے۔ دراصل یہ مسلسل نثری قصہ ہے، ڈراما نہیں۔

ص ۱۳۱ سے ۱۴۰ تک فٹ نوٹ میں ہندی زبان کی تاریخ لکھتے ہیں۔ بسااوقات حاشیے متن سے زیادہ سطریں دی ہیں۔ اس مضمون کو ہٹ کر کے متن میں دینا چاہیے تھا یا ہٹ بار کر کتاب کے آخر میں ضمیمے کی شکل میں۔ اس میں ہند آریائی لسانیات کا بھی اکھڑا اکھڑا بیان ہے۔ وہ جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کو پراکرت سمجھتے ہیں حالانکہ پراکرتوں کا دور چھٹی صدی عیسوی میں ختم ہو گیا۔ ہند آریائی کی ایک شاخ کے لیے لکھتے ہیں:

(۴) پچھمی بھاشا: اس میں پنجابی، برج بھاشا، قنوجی، بندیلی زبانیں شامل ہیں (ص ۱۳۱)۔ یہاں پنجابی کی جگہ ہریانی لکھنا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی اہم ترین بولی "کھڑی بولی" کو شامل کرنا تھا۔ آگے چل کر بہاری کے لیے لکھتے ہیں: "جو بنگالی کی ایک صورت خاص ہے" یہ درست نہیں۔ بہاری بنگالی سے جدا ہے۔ اب ہم لسانیات کو چھوڑ کر فورٹ ولیم کی ادبیات پر واپس آتے ہیں۔

ص ۱۳۵ پر حمیدالدین بہاری کی کتاب کا نام "خوانِ الوان" دیا ہے۔ یہی عتیق صدیقی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ نے کتاب کا دیباچہ نقل کیا جس سے معلوم ہوا کہ مؤلف نے "خوانِ الوان" نام کی کتاب کا اردو ترجمہ کر کے "خوانِ نعمت" نام رکھا (عبیدہ، ص ۵۰۹)۔ قادری مرزا جان طپش کے لیے لکھتے ہیں: "عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔" (ص ۱۳۵)۔ سنسکرت کا عالم کہنا مبالغہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ نے لکھا ہے: "انھوں نے سنسکرت زبان کا علم بھی حاصل کیا تھا۔" (ص ۱۷۹) اور یہی صحیح صورتِ حال ہونی چاہیے۔ ص ۱۵۴ پر مرزا قتیل کے خطوں کے مجموعے "معدن الفوائد" ۱۸۱۷ء/۱۲۳۲ھ کے سلسلے میں یہ مفید معلومات بہم پہنچائی ہے کہ اس میں حمد و نعت عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں ہے۔ انھوں نے اردو کا نمونہ دیا ہے۔ ابھی تک "دریائے لطافت" کی اردو عبارتوں کے علاوہ قتیل کی کسی اردو نثر کا کم از کم مجھے علم نہ تھا۔

لکھتے ہیں، ۱۸۴۶ء میں واجد علی شاہ نے سرور کو درباری شاعر مقرر کیا اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ دی (ص ۱۵۹)۔ ظاہر ہے انھوں نے یہ بیان سکسینہ کی تاریخ ادب سے لیا ہے

Scanned by CamScanner

اور میں اس کے سلسلے میں اس بیان کا جائزہ لے چکا ہوں۔ ڈاکٹر نیر مسعود کے مطابق سرور کا مشاہرہ بلا شرطِ خدمت تھا۔ ص ۱۶۱ پر سرور کی "گلِ زارِ سرور" کے لیے لکھتے ہیں: "یہ مذہبی کتاب ہے، جس میں روح و عشق کا مناظرہ دکھایا ہے۔" یہ درست نہیں۔ "گلِ زارِ سرور" "سب رس" کے انداز کی ایک تمثیلی داستان ہے جس کے اصلی کردار دل اور حسن ہیں۔ قادری نے سرور پر تفصیل سے لکھا ہے اور "فسانۂ عجائب" کی مفصل تنقید کی ہے۔ "فسانۂ عجائب" کا سنہ تکمیل ۱۲۴۰ھ ہے۔ اس کے باوجود اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی جب کہ نصیر الدین حیدر کا سنہ جلوس ۱۲۴۳ھ ہے۔ اس تضاد کو قادری غیر ذمے دارانہ قرار دیتے ہیں (ص ۱۷۲)۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ فسانہ واقعی ۱۲۴۰ھ میں مکمل ہو گیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے جلوس کے بعد دیباچے میں کچھ اضافہ کر کے یہی قصہ نصیر الدین حیدر کو پیش کر دیا گیا۔

چوتھا دور ۱۸۳۱ء تا ۱۸۷۰ء ہے۔ قادری دیباچۂ طبعِ دوم میں لکھتے ہیں کہ کسی قاری نے کتاب میں غیر مشہور مصنفوں کو شامل کرنے پر اعتراض کیا تھا (دیباچہ، ص ۲)۔ اکثر غیر مشہور مصنف ادبی اعتبار سے کم مایہ ہوتے ہیں۔ مجھے بھی ان کے شمول پر اعتراض ہے۔ قادری نے مختلف ادوار میں ایسے نثر نگار شامل کر لیے ہیں، جنھیں اس منتخب بزم میں بار نہیں ملنا چاہیے تھا، مثلاً چوتھے دور کے سدا سکھ لال، قطب الدین دہلوی، منشی چرنجی لال، مولوی ضیاء الدین، محمد عثمان مبین، علام امام ترین حیدر آبادی، شاہ علی اور پانچویں دور میں منشی اکرام اللہ صدیقی، نیاز علی پریشاں، پنڈت گرراج کشور دت وغیرہ۔ ان میں سے کسی نے غیر ادبی، علمی موضوعات پر کتابیں لکھیں یا ترجمہ کیں۔ قادری نے احسن کی "نمونۂ منثورات" کی تقلید میں اس قسم کے بعض مصنفین کا ذکر کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ "علمی نثر" کے عنوان سے ایک الگ باب قائم کر کے اس میں ان سب کا ذکر کر دیا جاتا۔

اس زمانے کی معلومات کے مطابق لکھتے ہیں کہ آزردہ کا تذکرہ نایاب ہے (ص ۱۸۴)۔ اب مختار الدین احمد نے اسے شائع کر دیا ہے۔

جس طرح "سیر المصنفین" جلد دوم سرسید کے دور کے ادیبوں کے مفصل حالات اور نمونۂ تصانیف کے لیے مشہور ہے، اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر "داستانِ تاریخِ اردو" ہے، مثلاً غالب پر ۳۳ صفحات لکھے ہیں جن میں حالات بھی مفصل ہیں، کردار اور نثر نگاری پر تنقید بھی ہے۔ عرشی صاحب کے "مکاتیبِ غالب" کی روشنی میں غالب کے کردار کا سختی سے جائزہ لیا ہے۔ غالب کی اس بات کے لیے گرفت کی ہے کہ ہندوستانیوں، بالخصوص اپنے معاصرین کی فارسی دانی کو بالکل ہیچ و پوچ سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

ان میں بھی ہندو اہلِ قلم سے نہایت بیزار تھے۔ خاص کر خود ان
کے مقابلے میں کسی ہندی یا ہندو کا نام کوئی شخص لیتا تھا تو جل
جاتے تھے۔ (ص ۲۰۷)

غالب کے خطوط پر تو وہ سرور نے بھی لکھا ہے، لیکن غالب کی شخصیت اور مذہب پر جس جگرداری سے انھوں نے لکھا ہے، وہ قابل داد ہے۔ امیر مینائی کی لغت کے سلسلے میں قادری نے "اردو لغات" کے عنوان سے جو حاشیہ لکھا ہے وہ مفید معلومات کا امین ہے (ص ۴۳-۳۴۱)۔ اسے بلاتأمل متن میں لے لینا چاہیے تھا۔ محسن الملک کے ضمن میں یہ مفید اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ بنگالیوں کی "انڈین نیشنل کانگریس" کے جواب میں "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانگریس" قائم کی گئی جس کے نام میں بار بار تبدیلی ہو کر آخر نام "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" طے پایا (حاشیہ، ص ۳۶۱)۔

ص ۳۶۴ پر وقار الملک کی تاریخِ ولادت ۱۸۳۹ء/۱۲۵۵ھ لکھی ہے۔ ہجری سنہ درست ہے۔ مالک رام نے صحیح تاریخ ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ/۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء لکھی ہے، گویا قادری نے عیسوی سنہ میں دو سال کی کمی کی۔ مرزا محمد عسکری نے رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے اردو ترجمے میں وقار الملک کو خلافت علی گڑھ کا خلیفۂ ثانی لکھا ہے۔ اس پر قادری نے بجا اعتراض کیا ہے کہ ایک ادبی کتاب میں ایسی مناظراتی تشبیہ کا کوئی محل نہ تھا، خاص کر جب کہ ترتیب کی بنا پر بھی یہ غلط ہے، کیونکہ کالج کے سیکرٹریوں میں وقار الملک کا نمبر چوتھا تھا (ص ۳۶۴، حاشیہ)۔ محسن الملک اور وقار الملک کے بیانات خاص طور سے قابلِ قدر ہیں۔ قادری نے ان بیانات کے ماخذ کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ دراصل انیسویں صدی کے نصفِ دوم کے بڑے نثر نگاروں کے لیے قادری کی کتاب کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں ان دیوقد نثاروں کے حالات بھی مفصل ہیں، تصانیف کی تفصیل اور ان پر تنقید بھی قابلِ اطمینان ہے۔ ہاں، نمونے جو لامتناہی طول کے ہیں، بہت مختصر ہوتے تو بہتر ہوتا۔

محمد حسین آزاد کے لیے لکھتے ہیں: غالباً ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے (ص ۳۸۳)۔ عابد پشاوری کے مطابق آزاد ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء) کو پیدا ہوئے ("ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص ۱۸، ۳۵)۔ قادری نے غالب کی طرح آزاد کے کردار کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "آزاد کی طبیعت کا عجیب خاصہ" (ص ۴۰۳-۳۸۸) آزاد نے "آبِ حیات" میں جنبہ داری، ہجو ملیح، میٹھے الفاظ میں طعن و تشنیع سے جو کام لیا ہے اس کی نشان دہی کی ہے۔ "آبِ حیات" کے بعد تدوینِ دیوانِ ذوق میں آزاد نے متنِ اشعار میں جو تحریف کی

Scanned by CamScanner

ہے اس کو شعر کی تخریب قرار دیتے ہیں۔ ص ۱۵-۳۱۲ پر "آبِ حیات" پر تنقید کی ہے، بالخصوص اس بات پر کہ ظفر اور الٰہی بخش معروف کے کلام کو ذوق کا کہا ہوا بتایا ہے۔ اس سے قطع نظر "اولیاتِ آزاد" کے عنوان سے آزاد کا اعتراف بھی کرتے ہیں (ص ۶-۳۰۴)۔ غرضیکہ آزاد کا بیان بہت سیر حاصل ہے۔

یہی کیفیت نثر کے دوسرے عناصرِ خمسہ کی ہے۔ ص ۳۶۳ کے حاشیے میں نذیر احمد کے سنہ ولادت اور ان کے کالج میں داخل ہونے کے سنین کا جو تجزیہ کیا ہے، اس سے مولانا کے تحقیقی رجحان کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ص ۳۷۴ پر "توبۃ النصوح" کی اشاعت اول کا سنہ ۱۸۷۷ء جو لکھا ہے، وہ درست نہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی (۶) اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (۷) کے مطابق صحیح سنہ ۱۸۷۴ء ہے۔ ص ۳۷۴ پر ان کی ایک کتاب کا نام "فسانۂ غدر" دیا ہے۔ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان کے مطابق صحیح "مصائبِ غدر" ہے (نویں جلد، ص ۳۵۳)۔ یہی نام ان کی کتابیات مرتبہ افتخار احمد صدیقی میں دیا ہے۔

ص ۵۳۶ پر حالی کی "حیاتِ سعدی" کی تاریخ ۱۸۸۲ء دی ہے۔ صحیح ۱۸۸۶ء ہے (تاریخِ ادبیات مسلمانان، نویں جلد، ص ۱۲۱، حاشیہ)۔ حالی کے مضمون "کلیاتِ دلگیر پر ریویو" کی جو تفصیلات دی ہیں، ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے (ص ۹۱-۵۸۵)۔ منور خاں دلگیر ساکنِ میرٹھ کا کلام ایک قسم کی دیہاتی اردو یا دیہاتی ہندی میں ہے۔ ۱۸۵۰ء کی اس عوامی زبان کا مطالعہ کارآمد ہے۔ یہ مضمون اصلاً "معارف" (۱۹۰۱ء) میں چھپا۔

شبلی پر سب سے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، یعنی تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر۔ اس میں سب سے زیادہ کام کا جزو "علامہ شبلی پر اعتراضات" کے عنوان سے ہے۔ اس میں "سیرۃ النعمان"، "الفاروق"، "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" سب کو لیا ہے۔ شبلی نے خلافت فاروقی میں دورِ حاضر کی کیفیت دکھا دی، موازنہ میں جنبہ داری سے کام لیا، "شعر العجم" کی تحقیق بھی کمزور ہے (ص ۳۶-۶۳۶)۔ ص ۶۵۳ پر لکھتے ہیں کہ "سیرۃ النعمان" ۱۵ دسمبر ۱۸۹۳ء کو مکمل کی۔ ظفر احمد صدیقی کی تحقیق ہے کہ پہلا حصہ ۱۸۸۹ء میں اور دوسرا ۱۸۹۰ء میں لکھا، اشاعت ۱۸۹۱ء میں ہوئی (شبلی، ص ۵۱)۔ قادری نے شبلی کی کتابوں کے نمونوں سے قبل ان کے بارے میں مفید اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ ص ۵۶-۷۴۹ پر عطیہ کے نام کے مکاتیب کے نمونے درج کرتے ہیں، لیکن وہ نتیجہ نکالتے ہوئے ڈرتے ہیں جسے بعد کے مصنفین نے مولانا کی عطیہ پسندی قرار دیا تھا۔

سید احمد دہلوی کے سلسلے میں "فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات کا مقابلہ" کا عنوان جاذبِ توجہ ہے۔ مجھے اس سے پہلی بار معلوم ہوا کہ سید احمد نے "فرہنگِ آصفیہ"

Scanned by CamScanner

کے دیباچے میں "امیر اللغات" اور "نور اللغات" کے مولفین پر سرقے کا الزام لگایا تھا۔ سید احمد نے ۱۸۷۸ء میں "ارمغانِ دہلی" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ "فرہنگِ آصفیہ" کے دیباچے میں اعتراض کرتے ہیں کہ جامعِ "امیر اللغات" نے "ارمغانِ دہلی" سے لفظ "آنکھ"، اس کے مشتقات اور معانی کی ہو بہو نقل بطورِ نمونہ چھاپی۔ اسی طرح مولفِ "نور اللغات" نے "فرہنگِ آصفیہ" سے لفظ "بات" اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطورِ نمونہ شائع فرمائی ہے (قادری، ص ۷۵۹)

میں نے "فرہنگِ آصفیہ" جلد اوّل نکال کر دیباچہ دیکھا، اس کے پہلے صفحے ہی پر ان دونوں لغات نگاروں کو تصنیف کے ڈاکو قرار دیا ہے۔ قادری نے اپنے موازنے میں طے کیا ہے کہ ہو بہو نقل کا الزام غلط ہے (ص ۷۶۳)۔ ان لوگوں نے فرہنگ سے استفادہ کیا ہوگا، نقل نہیں کی۔ قادری نے سید احمد کے رسالے "محاکمہ مرکزِ اردو" کا بھی تعارف کرایا جس میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا معرکہ ہے۔

آخر میں قادری نے چار ممتاز مصنفوں پر نہ لکھنے پر معذرت کی ہے۔ وہ ہیں سرشار، شرر، رسوا اور سجاد حسین۔ ان کے بارے میں جو عذر پیش کیا ہے وہ عذرِ لنگ ہے۔ ان سے تو رام بابو سکسینہ بھی آگے نکل گئے تھے کہ اپنے معاصر نثر نگاروں تک کا تذکرہ کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے سر سید اور ان کے معاصرین پر طول طویل بیانات کے بعد قادری کا قلم تھک گیا، ہمت جواب دے گئی۔ اگر وہ تصانیف کے نمونے نہایت مختصر دیتے تو کتاب اس طرح بے قابو نہ ہوتی۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں آیا۔ اس وقت تک اردو ادب کی تاریخ اور تحقیق کا کارواں کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ معلوم نہیں، حامد حسن قادری نے تازہ ترین کتابوں سے استفادہ کیا کہ نہیں۔ اگر وہ آخر میں کتابیات دیتے تو اندازہ ہوتا۔ متنِ کتاب میں کہیں طبعِ اول ۱۹۴۱ء کے بعد کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دکھائی دیا۔ دوسرے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ادھر آگرہ کے پبلشر کا اصرار، اُدھر یہ مانگ، میرے ارادے، کتاب کو از سرِ نو لکھنے کے متعلق، سب رہ گئے اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب جیسی کچھ ہے، دوبارہ چھپوا دی جائے۔ چنانچہ نظرِ ثانی میں درستی و ترمیم اور حذف و اضافہ کرتا گیا۔
>
> (دیباچہ، ص ۳)

غالباً یہ حذف و اضافہ بہت کم ہوا ہوگا۔ بہر حال نمونوں کی غیر معمولی طوالت سے قطعِ نظر کتاب میں جس کثرت سے مواد ہے، بالخصوص غدر کے بعد کے ادیبوں کے بارے میں،

Scanned by CamScanner

وہ قابلِ داد ہے۔ ہاں اردو کے آغاز، دکنی ادب، شمالی ہند کے قدیم ادب کے بارے میں کچھ بھی نیا نہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے بارے میں بھی دوسری کتابوں مثلاً "اربابِ نثر اردو" سے زیادہ آگے نہیں بڑھ پاتے، لیکن سرسید، محسن الملک، وقار الملک، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، نذیر احمد، حالی، شبلی اور سید احمد دہلوی کے بارے میں بہت بھرپور اور سیر حاصل طریقے پر لکھا ہے۔ تمام تحقیقی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ مصنفوں کے حسن و قبح دونوں پر نظر ڈالی ہے۔ ان کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے، ان کی تصانیف پر غیر جانب داری سے تنقید کی ہے۔

کتاب کا خاکہ اور بہتر ہو سکتا تھا اگر اس میں سے بعض غیر اہم اہلِ قلم حذف کر دیے جاتے اور شبلی کے بعد کے بیسویں صدی کے نصف اول کے نثاروں کو شامل کر لیا جاتا۔ کتاب کے آخری حصے میں مصنفین کے احوال کے مآخذ کا اظہار کر دیا ہے۔ ابتدائی حصے میں اس کی اور زیادہ ضرورت تھی۔ بہر حال بحیثیت مجموعی انیسویں صدی کے نثر نگاروں سے متعلق یہ داستان اہم اور مفصل ہے۔ اُس وقت تک کی دوسری ادبی تاریخ میں ان نثاروں پر اس شرح و بسط سے نہیں لکھا گیا۔

پس نوشت:

"اردو کی ادبی تاریخیں" کا مسودہ ناشر کو بھیجنے کے بعد مجھے سندھ یونی ورسٹی کے مرزا سلیم بیگ کا ایک عالمانہ مضمون ڈاکٹر مختار الدین احمد کی عنایات سے استفادے کو ملا۔ اسے پس نوشت کے طور پر شامل کر رہا ہوں۔ مضمون "داستانِ تاریخ اردو: ایک مطالعہ" سندھ یونی ورسٹی جام شورو، سندھ کے رسالہ "تحقیق" ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے (ص ۱۶۸ تا ۲۶۱)۔ مرزا سلیم بیگ وہاں کے شعبۂ اردو میں ہیں۔ میری کتاب میں سمائی نہیں کہ میں ایک تاریخِ ادب کا اس شرح و بسط سے جائزہ لوں۔ چند اہم نکات کو پیش کر رہا ہوں۔

مضمون سے معلوم ہوا کہ حامد حسن قادری ۱۹۵۵ء میں پاکستان منتقل ہوئے۔ سلیم بیگ نے ان سے متعلق ایک تحقیقی مقالے سے بہت مدد لی۔ ڈاکٹر نور محمد سرور اکبر آبادی نے سندھ یونی ورسٹی سے ۱۹۷۸ء میں "حامد حسن قادری: احوال و آثار" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی (۸)۔ حامد حسن قادری نے ترمیم و اضافے کے بعد اپنی تاریخ کا تیسرا ایڈیشن اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ قادری نے اس کی تاریخ "دیباچۂ داستانِ تاریخ اردو" سے نکالی ہے۔ چوتھا ایڈیشن مصنف کے انتقال کے بعد ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ میری نظر سے تیسرا اور چوتھا ایڈیشن نہیں گزرا۔

Scanned by CamScanner

ذیل میں سلیم بیگ کی نشان زدہ چند تصحیحات درج کرتا ہوں۔ انھوں نے طبع سوم کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔ میں اسے بدل کر طبع دوم کے متعلقہ صفحے کا نمبر دوں گا کہ یہی ہندوستان میں ملتی ہے (ص ۱۴۳)۔ قادری نے کلیم کے ترجمۂ "فصوص الحکم" کو نثری سمجھا ہے، حالانکہ وہ نظم میں تھا۔

ص ۴۳-۲۴۱: علام امام خاں ترین حیدرآبادی کی تاریخِ رشیدالدین خانی (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء) کا دیباچہ دقیق، ژولیدہ اسلوب میں ہے اور متن صاف زبان میں۔ اس سے قادری الجھتے ہیں۔ سلیم بیگ نے نصیرالدین ہاشمی کے ایک بیان کی طرف توجہ دلائی کہ یہ دیباچہ شمالی ہند کے سید محمد حسین اغلب موہانی نے لکھا تھا ("فہرست مخطوطات آصفیہ"، جلد اوّل، ص ۲۴۱)۔ حامد حسن قادری نے اس ضمن میں نصیرالدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" سے استفادہ کیا ہے، لیکن فہرستِ آصفیہ نہیں دیکھی۔ یہاں سلیم بیگ لکھتے ہیں، معلوم ہوتا ہے مولف نے یہ کتاب گھر میں بیٹھ کر اس مواد کی روشنی میں ترتیب دی جو انھیں میسر آیا۔ مثلاً انھوں نے مفتی انتظام اللہ شہابی کی کتاب "یوپی میں اردو" سے بھرپور استفادہ کیا حالانکہ یہ باقاعدہ کتاب نہیں۔ شہابی نے جو مضامین رسالہ "کنول" آگرہ میں بالاقساط چھپوائے تھے، انھیں رسالے کے شماروں سے الگ کر کے یک جا سی لیا تھا (قادری نے ص ۱۴۲ کے فٹ نوٹ میں اسی نام نہاد کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ گیان چند)

ص ۱۴-۱۳: قادری نے لکھا ہے کہ بابا فرید شکر گنج نے خسرو کو اپنا کلام سنا کر کہا، "ترکا کچھ سمجھ دار ہے۔" اس موقع پر مولوی عبدالحق اور جمیل جالبی نے "سمجھ دا" لکھا ہے جو پنجابی کا برجستہ فعل ہے۔ قادری اسے "سمجھ دار" سمجھ بیٹھے۔ یہ سہوِ کاتب نہیں، کیونکہ داستان کی پہلی تینوں اشاعتوں میں "سمجھ دار" ہی چھپا ہے۔ قادری نے خسرو کا سنہ ولادت ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء لکھا ہے جب کہ وحید مرزا نے ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء مقرر کیا ہے۔ قادری کے مطابق خسرو نے سات بادشاہوں کی ملازمت کی۔ سلیم بیگ نے محمد محی الدین بدایونی کے حوالے سے لکھا ہے کہ خسرو پانچ بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ بقول قادری خسرو نے فارسی میں تین دیوان اور آٹھ مثنویاں تخلیق کیں۔ سلیم بیگ نے محی الدین کے حوالے سے خسرو کے پانچ دواوین اور ۱۰ مثنویوں کی فہرست دی۔

قادری نے مختصراً دکنی نثر پر بھی لکھا ہے۔ سلیم بیگ نے اس کی بعض جزئیات کی تصحیح کی ہے۔ چونکہ دکنیات قادری کا میدان نہیں اس لیے میں اس جزو کو نظر انداز کرتا ہوں۔

ص ۴۷: فضلی کی کتاب کا نام "دہ مجلس" لکھا ہے اور اسے کاشفی کی "روضۃ الشہدا" کا

Scanned by CamScanner

ترجمہ قرار دیا ہے۔ سلیم بیگ کے مطابق اس کا نام "دہ مجلس" نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں ۱۲ مجلسیں ہیں۔ یہ "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ نہیں، اس کے کسی خلاصے کا ترجمہ ہے۔

ص ۵۴: قادری نے شمالی ہند کی سب سے پہلی اردو نثری کتاب مولانا شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کو قرار دیا ہے۔ سلیم بیگ کی رائے میں شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی "تفسیر مرادیہ ۱۱۸۵ھ اس سے قدیم تر ہے۔

ص ۷۰: قادری نے ولیم ٹیٹ کی "مقدمۂ زبانِ ہندوستانی" کا سنہ طباعت داستان کی طبعِ دوم میں ۱۸۲۷ء اور طبعِ سوم میں ۱۹۲۷ء (سہو کتابت) قرار دیا ہے جب کہ اس کی طبعِ اول ۱۸۲۴ء میں ہوئی تھی، ۱۸۲۷ء طبعِ دوم کا سال ہے۔

ص ۸۹: قادری کے مطابق گل کرسٹ نے میر امن کی "گنجِ خوبی" کو نہیں چھپوایا، لیکن سلیم بیگ کے مطابق یہ فورٹ ولیم کالج ہی میں چھپ چکی تھی۔

ص ۱۰۶: قادری نے مرزا علی لطف کا سنہ وفات ۱۲۳۸ھ لکھا ہے۔ سلیم بیگ فرمان فتح پوری کے حوالے سے ۱۲۲۸ھ لکھتے ہیں، لیکن ثمینہ شوکت نے ایک قطعۂ تاریخ وفات درج کر کے ۱۲۳۳ھ اخذ کیا ہے، جو صحیح ہونا چاہیے ("مثنوی لطف"، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء، ص ۴۲-۴۱) داستان، ص ۱۲۶ پر نہال چند لاہوری کے لیے لکھا ہے کہ وہ دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے نکل کر لاہور کو اپنا وطن بنا لیا۔ سلیم بیگ کے مطابق صحیح یہ ہے کہ ان کے بزرگ لاہور سے آ کر دہلی میں بس گئے تھے یہاں نہال چند پیدا ہوئے۔ داستان کے ص ۱۲۸ پر بینی نرائن کے والد کا نام مہاراجا لکشمی نرائن لکھا ہے۔ بقولِ سلیم بیگ یہ بینی نرائن کے نانا تھے، والد کا نام شیودشٹ نرائن تھا۔ یہی ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے لکھا ہے۔

ص ۱۷۳ پر جرأت کا سنہ وفات ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء لکھا ہے۔ سلیم بیگ نے تصحیح کی کہ سنہ وفات ۱۲۲۴ھ ثابت ہوتا ہے۔

ص ۱۹۶ پر لکھتے ہیں کہ غالب نے نظیر اکبر آبادی سے کچھ پڑھا۔ سلیم بیگ نے غلام رسول مہر کا قول نقل کیا کہ یہ درست نہیں۔ ص ۱۹۹ پر لکھتے ہیں کہ غالب ۱۸۳۰ء میں کلکتے پہنچے۔ غلام رسول مہر کے مطابق ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء صحیح تاریخ ہے۔ ص ۱۹۹ ہی پر غالب کی گرفتاری کا سنہ ۱۸۲۸ء لکھا ہے۔ سلیم بیگ نے نثار احمد فاروقی کی سند پر لکھا کہ غالب ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو گرفتار ہوئے تھے۔ ص ۲۱۷ پر لکھتے ہیں کہ غالب ۱۸۵۰ء تک فارسی میں خطوط لکھتے تھے۔ سلیم بیگ نے غلام حسین ذوالفقار کے حوالے سے لکھا کہ غالب مارچ ۱۸۴۸ء سے اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔

حامد حسن قادری نے ہجری سنہ کے متوازی عیسوی سنہ لکھنے میں کئی بار سنہ کی سا

فرق کیا ہے، جس کی نشان دہی سلیم بیگ نے کی ہے۔

ص ۳۸۳ پر محمد حسین آزاد کا سنِ ولادت ۱۸۳۲ء قیاس کیا ہے جب کہ ڈاکٹر صادق کے بموجب وہ ۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ ص ۳۸۴ پر ذوق کے لاہور پہنچنے کا سنہ ۱۸۶۴ء قیاس کیا ہے۔ سلیم بیگ نے کئی اسناد کی بنا پر ۱۸۶۰ء کا آخر یا ۱۸۶۱ء کا اوائل طے کیا ہے۔ ص ۳۸۵ کے مطابق آزاد ۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۳ء میں ایران گئے۔ سلیم بیگ ڈاکٹر صادق کی سند پر لکھتے ہیں کہ صرف ایک بار ۱۸۸۵ء میں گئے۔

محمد حسین آزاد کی طرح نذیر احمد کے بیان میں بھی سنین کی بہت سی غلطیاں ہیں، جنھیں سلیم بیگ نے درست کیا۔ مثلاً قادری نے ص ۳۶۱ پر نذیر احمد کی تاریخِ ولادت ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء لکھی ہے۔ سلیم بیگ نے افتخار احمد صدیقی کی سند پر ۱۸۳۰ء کو صحیح مانا ہے۔ ان کی بعض کتابوں کے سنین بھی درست کیے ہیں۔ حالی کی کئی کتابوں کے سنینِ تصنیف و اشاعت بھی حوالوں کے ساتھ درست کیے ہیں۔ گو یہ تاریخ نثر سے متعلق ہے لیکن اس میں حالی کی بعض نظموں کے سنین بھی دیے ہیں۔ ان پر بھی بحث کی ہے۔ اطناب کے خوف سے میں سلیم بیگ کی ان تمام تصحیحات کو قلم زد کرتا ہوں۔

رسالہ "زمانہ" کان پور بابت مارچ ۱۹۴۲ء میں اور "اردو" جنوری ۱۹۴۲ء میں اس کتاب کی طبعِ اول پر تبصرہ شائع ہوا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ مؤلف نے مصنفین کی فہرست بہت بڑھا دی ہے۔ بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو اردو مصنفین میں کوئی جگہ نہیں رکھتے۔ مثلاً وقارالملک، مفتی آرزدہ، مفتی سعد اللہ رام پوری، میر عباس، مولوی مسیح الزماں وغیرہ۔ ابتدائی ابواب میں دوسروں کی تحقیقات پر تکیہ کرنے کی وجہ سے غلط باتیں لکھ گئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱) بحوالہ عبدالرزاق قریشی: "مبادیاتِ تحقیق"، بمبئی، ۱۹۶۸ء، ص ۶۴-۶۳
(۲) مضمون "امیر خسرو، ایک اردو شاعر کی حیثیت سے"، "نگار" دسمبر ۱۹۲۵ء، ص ۵۱- یہ پرچہ میری نظر سے گزرا- حامد حسن قادری کا واحد ماخذ "نگار" کا مضمون ہے، لاہور کے رسالے کا نہیں-
(۳) "شمالی ہند میں اردو، دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں"، "مقالاتِ شیرانی"، جلد دوم، ص ۶۰
(۴) "قدیم اردو"، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۳۲
(۵) عتیق صدیقی: "ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں"، علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۴۴۹
(۶) "نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے"، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۸۴
(۷) "ڈپٹی نذیر احمد (کتابیات)"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲
(۸) ڈاکٹر معین الرحمان: "اردو تحقیق یونی ورسٹیوں میں"، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۱

Scanned by CamScanner

دسواں باب

مخمور اکبر آبادی: صحیفۂ تاریخِ اردو

مالک رام کے "تذکرۂ معاصرین۔۴" کے مطابق سید محمد رضوی مخمور اکبر آبادی ۴فروری ۱۸۹۴ء کو آگرے میں پیدا ہوئے اور ۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء کو خیرپور میر (سندھ، پاکستان) میں انتقال کیا(۱)۔

مالک رام نے ان کی ۱۴ کتابوں کی فہرست دی ہے، لیکن ذیل کی تین زیادہ مشہور ہیں:

۱۔ "روحِ نظیر"، طبعِ اول: ۱۹۲۲ء، طبعِ دوم: ۱۹۴۶ء، طبعِ سوم: ۱۹۷۸ء (علی احمد فاطمی: "نظیر اکبر آبادی" ص ۱۰۴)۔

۲۔ "فسانۂ عجائب کی تدوین"، ناشر: لالہ رام نرائن لال بک سیلر، الہ آباد، ۱۹۲۸ء۔

۳۔ "صحیفۂ تاریخِ اردو"، ناشر: گیا پرشاد اینڈ سنس، آگرہ، ۱۹۳۶ء۔

آخرالذکر کتاب میں سب سے پہلے مصنف کا مختصر دیباچہ ہے، پھر فہرست اور پھر مصنف ہی کا طولانی مقدمہ۔ فہرست کے مطابق کتاب میں تین باب ہیں:- پہلا باب: (اردو زبان کی) خلقت و ارتقا، دوسرا باب: نظم کا نشو ونما، تیسرا باب: نثر کا نشو ونما۔ ۴: ضمیمہ جو تذکروں کے بارے میں ہے۔ ۵: اشاریہ۔

دیباچے میں اطلاع دیتے ہیں کہ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں چھپنی شروع ہوئی تھی لیکن نوع بہ نوع دشواریوں کی وجہ سے اس کی طباعت مکمل نہ ہو سکی۔ دوسرے باب کی آخری فصل، بیسویں صدی بھی پوری نہیں چھپ سکی۔ ضمیمہ اور اشاریہ بھی طباعت سے محروم رہے۔ اگر پوری کتاب کی طباعت کا انتظار کیا جاتا تو مزید پانچ سال اور ٹھہرنا پڑتا چنانچہ مجبور ہو کر اسی حالت میں شائع کی جا رہی ہے۔ افسوس کہ بقیہ حصے جو مرتب و مکمل ہو چکے ہیں اس اشاعت میں شامل نہ ہو سکے (صفحہ د)۔

معلوم نہیں پاکستان جانے کے بعد مخمور نے پوری کتاب کو شائع کیا کہ نہیں۔ فی الوقت "بیسویں صدی" کی فصل میں اسماعیل میرٹھی کا حال ص ۳۸۸ کے آخر میں ختم ہو

---

(۱) تذکرۂ معاصرین ۴، مکتبۂ جامعہ نئی دہلی ص ۶۳۔۶۴

Scanned by CamScanner

گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ مکمل ہے کہ نہیں؟ اس کے بعد اقبال اور دوسرے شعرا رہے ہوں گے۔ تیسرا طویل باب جو حصۂ نثر پر مشتمل تھا، غائب ہے۔ اس طرح یہ کتاب محض نظم کی تاریخ بن کر رہ گئی ہے۔ ضمیمے کے اجزا یہ ہیں:

۱۔ اردو زبان کے شعرا کے تذکرے: اٹھارویں صدی، انیسویں صدی، بیسویں صدی۔ ۲۔ مقامی شعرا کے تذکرے۔ ۳۔ مخصوص تذکرے۔ ۴۔ ذاتی تذکرے۔ ۵۔ فارسی زبان کے شعرا کے تذکرے۔

ظاہر ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں فارسی شعرا کے تذکروں کا بیان حشو ہے۔

پہلے میں نے مخمور کی تاریخ کو اپنے آخری سے پہلے باب میں رکھا تھا جو عام طور سے نصابی تاریخوں پر مشتمل ہے، لیکن جب اس کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نصابی تاریخ نہیں، اس کے مصنف کے پاس آزادیِ فکر و اظہار ہے۔ اس کتاب میں کچھ نہ کچھ اپج ضرور ہے۔ مخمور نصابی تاریخوں کے لیے بجا طور پر لکھتے ہیں:

> عہدِ حاضر کی بہت تصنیفیں اور تالیفیں، خصوصیت سے وہ جو نصابِ تعلیم میں داخل کرنے یا دوسرے لفظوں میں روپیہ کمانے کے مقصد سے مرتب کی جاتی ہے (کذا)، عموماً قینچی اور لئی کا متحدہ کارنامہ ہوتی ہے (کذا) قطع، برید، ردّ و بدل، پیوند کاری، ملمع سازی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔

اپنی کتاب کے لیے لکھتے ہیں کہ اہلِ نظر خواہ اس کے نظامِ ترتیب سے اتفاق نہ کریں لیکن "مصنف کی جاں فشانی اور مغز کاری کا غالباً اعتراف کریں گے اور جلد بازی، حرام خوری یا خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی کوشش کا الزام نہ دیں گے۔"

فہرست کے بعد ۸۶ صفحوں کا طویل مقدمہ ہے جس میں اپنی تاریخ اور چند دوسری تاریخوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ سب سے پہلے کتاب کے خاکے کی شرح کی ہے کہ پہلے باب میں محرکات اور اداروں کی تاریخ نیز اردو زبان کی پیدائش پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے طویل باب میں نظم کا نشو و نما ہے، تیسرے میں نثر کی تاریخ، جس کے بعد تذکروں کا ضمیمہ اور آخر میں انڈکس ہے (ص ۲)۔ جیسا کہ پیچھے لکھا گیا، سوءِ اتفاق سے دوسرے باب کے بعد کے مشمولات سامنے ہی نہیں آئے۔ اردو کے پورے شعری ادب کو ایک باب میں سما دینا اور اسی طرح نثری باب کو بھی ایک باب میں نمٹا دینا ناقص خاکہ سازی ہے۔

اس کے آگے وہ ادبی تاریخ میں ادوار کی تقسیم پر بحث کرتے ہیں۔ "آبِ حیات" کے ادوار سے اس لیے اتفاق نہیں کرتے کہ ان کی زمانی حدیں نہیں دی ہیں۔ اپنے ضمیمے میں

Scanned by CamScanner

انھوں نے صدی وار تقسیم کی اور اس تقسیم میں شاعروں کی تقدیم و تاخیر، ان کی تاریخِ ولادت سے نہیں، تاریخِ وفات سے طے کی۔ اس کا جواز پیش کرتے ہیں لیکن خود ہی اس طریق کی خرابی کی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ کئی شاگرد استاد سے پہلے فوت ہوئے، مثلاً سودا، میر خلیق اور دیاشنکر نسیم بالترتیب اپنے اساتذہ شاہ حاتم، مصحفی اور آتش سے پہلے فوت ہوئے، چنانچہ مصنف نے انھیں اسی ترتیب سے بیان کیا ہے (ص ۴-۳)۔ مجھے سنہ وفات کا اصول درست نہیں معلوم ہوتا۔ اگر پوتا دادا کی زندگی میں فوت ہو جائے تو اسے دادا پر کیوں کر سبقت دی جا سکتی ہے۔ محمود نے نسیم کو پہلے اور اس کے فوراً بعد آتش کو درج کیا ہے جو کتنا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

محمود نے اپنے دو اہم ماخذ نصیر حسین خیال کی "داستانِ اردو" اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا تیسرا بڑا ماخذ "آبِ حیات" ہے۔ خیال کی "داستانِ اردو" تو شائع ہوئی نہیں، اس کا ایک طویل حصہ "مغل اور اردو" کے نام سے چھپا ہے اور محمود نے اسی کو دیکھا ہوگا۔ اسے وہ صحیح معنی میں علمی کاوش کا لقب دیتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غیر معتبر کتاب ہے۔ اس کی دلدادگی سے محمود نے یہ ظاہر کر دیا کہ تحقیق میں ان کی نظر کتنی کمزور ہے۔ سنین کے معاملے میں انھوں نے سکسینہ کی تصنیف کو معیار قرار دیا۔ سکسینہ نے عموماً عیسوی سنین دیے ہیں اور یہی محمود نے کیا ہے، لیکن انھیں اس بات کا احساس ہے کہ عیسوی اور ہجری سنین کی رفتار یک ساں نہیں ہوتی اس لیے قارئین کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ عیسوی سنہ کی مطابقت کو بہ طورِ خود بھی جانچ لیں (ص ۵-۴)۔ یہ اعتراف اور تنبیہ بے نظیر ہے۔

انھوں نے قسم کھا کر ہر شخص کے لیے ضمیر اور فعل میں صیغۂ واحد استعمال کیا ہے۔ ایسا پیرو پرستی اور مُردہ پرستی پر ضرب لگانے کے لیے کیا۔ وہ خواجہ، حضرت، علیہ الرحمۃ جیسے القاب کے بھی خلاف ہیں۔ کہتے ہیں کہ اردو زبان کی اہم سے اہم شخصیت کو ہر خارجی عظمت کے بغیر پیش کر رہے ہیں تاکہ پڑھنے والا خود اپنی رائے قائم کر سکے (ص ۷)۔

محمود کا یہ طریقہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔ انگریزی میں طریقِ تحقیق کے مستند کتابچے "ایم ایل اے ہینڈ بک" ص ۷۴ میں ہدایت ہے کہ ناموں کے ساتھ کوئی سابقہ نہ لگایا جائے، خواہ شخص زندہ ہو کہ مُردہ۔ "عمادالتحقیق" کے مصنف مولانا کلبِ عابد بھی یہی کہتے ہیں (ص ۹۷)۔ تفصیل دیکھیے، میری کتاب "تحقیق کا فن" میں؛ ص ۳۱۴-۳۱۶ پر۔ لیکن محترم ہستیوں کے لیے ضمیر اور فعل میں صیغۂ واحد کا استعمال دوسری بات ہے۔ اردو کے آداب کو دیکھتے ہوئے شاہ مظہر جانِ جاناں، میر درد اور سر سید کے لیے یہ طریقہ اچھا نہیں معلوم

Scanned by CamScanner

ہوتا۔

اپنی کتاب کی ۱۳ خصوصیات درج کرتے ہیں جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں:

۱۔ پورے تاریخی عہد کو صدیوں میں تقسیم کیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دو دو اور بیسویں صدی کے چار حصے کیے۔

۲۔ تحریکوں کا ایک نظام بنا کر پیش کیا۔

۳۔ اردو شاعری کے ۱۲ امام متعین کیے۔

۴۔ شعرا کے پانچ مدارج طے کیے: خوش گو، ممتاز، مشہور، بڑا، بہت بڑا۔

۵۔ زبان کے دبستان قائم کیے۔

۶۔ اصطلاحی مفاہیم کی حد بندی کی۔

۷۔ بعض الفاظ اور ان کے مشتقات پہلی مرتبہ اصطلاح کے طور پر استعمال کیے۔ مثلاً مُتشاعر، تنزل، مُتنزل، بتدیت۔ انگریزی لفظ فارم کے لیے ہیکَل مونوٹنی کے لیے یک لختی، Decadent کے لیے مُتنزل وغیرہ۔

۸۔ اوقاف اور املے پر خصوصی توجہ کی (ص ۹۔۷)۔

کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف انگریزی زبان و ادب سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔

اس کے آگے انھوں نے اردو ادب کی چند تاریخوں کا جائزہ لیا، بلکہ یوں کہیے کہ خامیاں افشا کیں۔ پہلے "گلِ رعنا" اور "شعر الہند" کو ایک ساتھ لیا، لیکن بعد میں محض "گلِ رعنا" پر آ گئے۔ ان کا جائزہ زیادہ تر زبان و بیان کی خامیوں تک محدود ہے۔ وہ جملوں اور عبارتوں کو اصلاح دے کر جس طرح سلیس اور چست بنا دیتے ہیں، اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاعری کی طرح نثر نگاری میں بھی استادی شاگردی کی روایت کی ضرورت ہے اور اس باب میں ممور سے بہتر استاد نہیں ہو سکتا۔ وہ "گلِ رعنا" کی بعض ترکیبوں "بختگیِ کلام"، "رنگینیِ الفاظ" وغیرہ پر اعتراض کرتے ہوئے اصول پیش کرتے ہیں:

> ثقات و سلاست پسند یائے معروف کو اضافت کے ساتھ لکھنا پسند نہیں کرتے۔ (ص ۱۱)

مجھے اس اصول پر حیرت ہے۔ میں نے "دیوانِ غالب" اٹھا کر دیکھا، اس میں یائے معروف کے بعد فارسی اضافت کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ مثلاً:

ع: زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب

ع: پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار

Scanned by CamScanner

ع: جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

ع: وہ جو اِک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

پھر دو مستند زبان والے شعرا جوش اور مرزا جعفر علی خاں اثر کے انتخاباتِ کلام دیکھیے، وہاں بھی بادی النظر ہی میں ایسے مصرع مل گئے:

ع: کشتیِ ہستی کو جُھوٹے سیم میں کھوتا ہوا

ع: اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار

("انتخابِ جوش"، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۵۹-۵۸)

ع: پامالیِ امید کی حد ہو گئی آخر

("انتخابِ نثر"، لکھنؤ ۱۹۸۸ء، ص ۴۷)

صاحبِ "گلِ رعنا" نے مرثیے کے بیانات پر جو تبصرہ کیا ہے محمود اس کی داد دیتے ہیں، مثلاً مرثیہ نگاروں نے اہلِ بیت کو جس طرح نوحہ و بکا میں مشغول کرایا ہے، وہ ان کی شان سے بعید ہے۔ اس کے جواز میں جو دلیلیں دی جاتی ہیں، محمود انھیں رد کرتے ہیں (ص ۲۵-۲۴)

"گلِ رعنا" کے بعد آغا محمد باقر کی "تاریخِ نظم و نثرِ اردو" کو لیتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ کتاب کے سرورق یا دیباچے میں کھل کر اعتراف نہیں کیا گیا کہ یہ کتاب سکسینہ کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ کتاب سکسینہ کا خلاصہ کہہ کر پیش کی گئی ہے، لیکن ترجمہ معلوم ہوتی ہے (ص ۲۷-۲۶)۔ دونوں اعتراضات غلط ہیں۔ باقر نے مقدمے میں سب سے پہلے یہی لکھا ہے کہ شیخ مبارک علی نے ان سے کہا کہ رام بابو کی تاریخ مشرقی امتحانوں کے نصاب میں شامل ہے، اس کی تلخیص کر دو، چنانچہ انھوں نے یہ بات مان لی۔ کتاب تلخیص ہے، یہ سکسینہ کی کتاب یا اس کے اردو ترجمے اور باقر کی کتاب کے حجم کے فرق ہی سے واضح ہو جاتی ہے۔

اس کے آگے مصنف نے آغا صاحب کی نثر کی خامیاں دکھا کر ان کی اصلاح کی ہے۔

پھر ڈاکٹر اعجاز حسین کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" (۱۹۴۰ء ایڈیشن) کی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ محمود نے پہلی بات یہ کہی ہے کہ اعجاز صاحب رام بابو سکسینہ کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ دونوں تاریخوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ثابت کرتے ہیں کہ اعجاز صاحب نے ہر جگہ سکسینہ کی تقلید کی ہے۔ جن قابلِ ذکر مصنفوں کو سکسینہ نے چھوڑ دیا، اعجاز حسین نے بھی ان پر نہیں لکھا۔ اس کے بعد کتاب کی لسانی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً:

Scanned by CamScanner

بیان کا لب و لہجہ عامیانہ اور عبارت کا انداز غیر ادبی اور نہایت
غیر دلکش ہے۔ الفاظ کی نشست میں مشرقی دیہات کی بولی،
محاورے اور روزمرہ کا دخل ہے، کتاب میں علمیت کا عنصر کم ہے
اور سطحیت اور نقالی زیادہ ہے۔ ابتدائی شعرا پر تنقیدیں عموماً فکر و نظر
سے معرّا اور بے مغز ہیں۔ (ص ۵۷-۵۶)

اس کے آگے کتاب کی زبان و بیان کی خامیوں کے نمونے دکھا کر ان کی اصلاح کی ہے۔ مجھے مخمور کے ایک اعتراض کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ وہ آغا باقر کی تاریخ میں "اساتذۂ دہلی"، "طبقۂ متقدمین" اور اعجاز صاحب کی تاریخ میں "اساتذۂ اردو" کی ترکیبوں کو غلط قرار دے کر اصول پیش کرتے ہیں کہ جو لفظ ہائے ہوز پر ختم ہو اور ترکیب اضافی میں لایا جائے تو اضافت ہمزہ سے ظاہر نہ کی جائے، بلکہ "ہائے ہوز" "اے" سے بدل جائے گی یعنی ان تراکیب کی صحیح صورت "اساتذاے دہلی"، "طبقاے متقدمین"، "اساتذاے اردو" ہے۔ (ص ۴۷-۴۶ اور ص ۴۳)۔

میں مخمور کے اس اصول کو غلط سمجھتا ہوں، اس پر حیران ہوں۔ اس کے برعکس چند مثالیں دیتا ہوں:

بندۂ عشق شدی، ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

ع: بوے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
ع: بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
ع: ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
(غالب)

ع: شعلۂ جوالہ، قرطاسِ کتابِ تیرگی
("انتخابِ جوش"، ص ۶۷)

ع: آج پھر قید میں اندازۂ وحشت کے لیے
ع: آپ کے وعدۂ رنگیں پہ جہاں غور کیا
("انتخابِ اثر"، ص ۴۷-۴۶)

Scanned by CamScanner

اس اصول سے اختلاف سے قطعِ نظر میں مانتا ہوں کہ محمود نے تینوں کتابوں کی زبان و بیان کی جن کمزوریوں کو پیش کیا، انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ مصنفین چست اردو نثر لکھنے پر کس حد تک قادر نہ تھے۔ ویسے محمود نے کتاب کے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ مقدمے میں ان کتابوں پر تنقید کرنے کا مقصد حرف گیری کرنا یا ان فاضل مصنفوں کو سبک کرنا نہیں، بلکہ نوآموزوں کو ان خامیوں کی اہمیت محسوس کرانا ہے۔

مقدمے کے بعد متن نئے نمبر شمار صفحہ ۱ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کتاب میں ص ۱ تا ۸۶ دو بار آئے ہیں۔ یہ روش غلط ہے۔ اب کہیں حوالہ دیا جائے تو "مقدمہ ص ۴۰" یا "متن ص ۴۰" وغیرہ لکھنا پڑے گا۔ متن کا پہلا باب "خلقت و ارتقا" ہے۔ قوسین میں اس کی صراحت ہے: (اردو زبان کی پیدائش کے اسباب، محرکات اور اداروں پر تبصرہ)۔ مصنف کے لسانیاتی بیانات معتبر نہیں۔ گوتم بدھ کے وطن کی زبان پالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ زبان پالی کہلائی۔ گوتم بدھ کے ان فقروں سے، "دھرم کرو، دھرم کرو، دھرم کا سنکھ پھونکو، دھرم کی ڈُنڈ بجاؤ" اردو کی قدامت صاف ظاہر ہے۔ (ص ۵)

گویا گوتم بودھ نے یہ تلقین کھڑی بولی کے انھیں الفاظ میں کی تھی، جن کی بدولت محمود نے چھٹی صدی قبل مسیح میں اردو کو جاری و ساری دکھا دیا۔ جس شخص کا لسانیاتی شعور اتنا پس ماندہ ہو، اس کے لسانیاتی مشاہدے کیا قیمت رکھتے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> چونکہ پالی زبان کو کوئی نمایاں خصوصیت یا مذہبی امتیاز حاصل نہ ہوا تھا، اس لیے بدھ مذہب کا ہندوستان سے اخراج ہوتے ہی یہ زبان بھی پسِ پشت جا پڑی۔
>
> (مقدمہ ص ۶)

محمود پالی کے مذہبی امتیاز سے واقف نہیں۔ پالی زبان کا سو فی صد سرمایہ بودھوں کے مذہبی ادب پر مشتمل ہے۔ بدھ مذہب کے اخراج کی وجہ سے ان کی مذہبی زبان بھی ختم ہو گئی۔ محمود سنسکرت دور کی پانچ ممتاز پراکرتوں کے یہ نام لکھتے ہیں:

> مہاراشٹری، سورسینی، ماگدی، پیساچی اور اُبھ لسار۔
>
> (ص ۷)

پانچوں نام غلط ہیں۔ پہلے چار نام "مہاراشٹری، شورسینی، ماگدھی، پیشاچی" ہونے چاہییں۔ "اُبھ لسار" واللہ اعلم کس لفظ کی تخریب ہے کیونکہ پانچویں مشہور پراکرت "اردھ

Scanned by CamScanner

ماگدھی" ہے۔ قمور آگے چل کر لکھتے ہیں:

مہاراشٹری جو دکن میں رائج تھی بگڑ کر مرہٹی بنی اور دکنی اس کا نام پڑا۔ (ص ۲۵)

دکنی کو مرہٹی کا ارتقائی روپ قرار دینا قمور کے لسانیاتی علم کو اور رسوا کرتا ہے۔ میں اس موضوع کو قطع کرتا ہوں۔ میں نے اس تاریخ کے سنین کا جائزہ لینے سے بھی پرہیز کیا ہے کیونکہ ان میں بکثرت اغلاط ہیں اور میں ان کی نشان دہی میں صفحے کے صفحے بھر دینا غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تاریخ تحقیقی نہیں۔ صرف دو چار جگہ ان کا ذکر کروں گا۔

راجا بھوج (۱۰۵۸-۱۰۱۸) اور بکرماجیت (۱۱۲۵-۱۰۷۶)۔ (ص ۶)

گویا بکرماجیت بھوج کے بعد ہوا ہے، حالانکہ "سنگھاسن بتیسی" میں بھی قصہ ہے کہ بھوج نے بکرماجیت کے تخت کو ایک ٹیلے کی کھدائی کر کے برآمد کیا۔ بکرمی سمبت ۵۷ قبلِ مسیح سے شروع ہوتا ہے۔

مصنف نے ہندو مسلم اتحاد کے نمونے کے طور پر ایسی کئی مثالیں پیش کی ہیں کہ مسلمان فرماں رواؤں نے اپنی یا اپنے بیٹے کی شادی ہندو راج کماریوں سے کی، مثلاً:

علاء الدین خلجی کی، مہارانی کملا دیوی سے مناکحت اور خضر خاں کی دیول دیوی سے محبت۔ (ص ۱۲)

مسلم بادشاہ اور شہزادے ہندو راج کماریوں سے شادی کر لیتے تھے اور یہی حال ہندو امرا کا تھا۔ (ص ۱۶)

مصنف نے ہندو امرا کی کسی مسلم شہزادی سے شادی کی کوئی مثال درج کی ہوتی۔ میرے علم میں ایسی ایک بھی مثال نہیں۔

شہزادہ سلیم کی شادی راج پوتوں میں کی۔ (ص ۲۲)

بادشاہ (فرخ سیَر) کی شادی راجا اجیت سنگھ کی دخترِ نیک اختر سے ہوئی تھی۔ اس واقعے نے ہندو مسلم ازدواج کے رابطۂ اتحاد میں ازسرِ نو جان ڈال دی۔ (ص ۲۸)

مسلمان اہلِ اقتدار کی ہندو خواتین سے شادی ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ نہیں تھی۔ اسے جنسی جارحیت کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اکبر نے جودھا بائی سے شادی کی تو راج پوتوں میں کیسا شدید ردِ عمل ہوا، مہارانا پرتاپ کی سوانح میں دیکھیے۔ اگر یہ بین المذاہب شادیاں ہندو

Scanned by CamScanner

مسلم اتحاد کے جذبے کے زیر اثر ہوئی تھیں تو کوئی ایک مثال تو ایسی ہوتی کہ کسی مسلم حکمراں نے اپنی دختر نیک اختر کو ہندو راج کمار کو دیا ہوتا۔

اردو کے تاریخی پس منظر کے سلسلے میں ملکہ نور جہاں کے دو شعر لکھے ہیں، جن میں پہلا مطلع ہے:

دیں جگہ زخم جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بتِ بے باک میں ہم

(ص ۲۲)

ماخذ درج نہیں کیا، لیکن انھوں نے خیال کی "نقل اور اردو" سے لیا ہے جنھوں نے صفیر کے "جلوۂ خضر" سے نقل کیا۔ ان اشعار کی صاف زبان کو دیکھ کر محمود ذرا بھی نہیں ٹھٹکے۔ رشید حسن خاں نے انکشاف کیا کہ تذکرۂ میر حسن کے مطابق یہ دونوں اشعار محمد معین الدین معین بدایونی کے ہیں۔ تذکرے میں اس زمین میں مزید تین شعر دیے ہیں ("ادبی تحقیق"، ص ۲۲، حاشیہ)۔ تذکرے کے مطابق معین میر سوز اور سودا کا شاگرد ہے۔

مصنف نے مقدمے میں اپنی تاریخ کی خصوصیات میں لکھا ہے:

(۱) زبان کے دبستان الگ الگ قائم کیے۔

(ص ۸)

(۲) گوالیار کے شعرا کو دبستان کی حیثیت سے پہلی بار منصۂ شہود پر لایا گیا ہے۔

(ص ۱۱)

دبستان عموماً شاعری کا ہوتا ہے، نثر کا بھی ہو سکتا ہے، لیکن زبان کا دبستان کہنا بہت بڑا دعویٰ ہے۔ مجھے اس میں شک ہے کہ گجری یا دکنی کے جملہ شعرا کو ملا کر ان بولیوں کا کوئی دبستان قرار دیا جا سکتا ہے۔ شعر کے دبستان محمود کی اختراع نہیں، ان سے بہت پہلے "شعر الہند" میں دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا مذکور ہو چکا تھا۔ مجھے ان کی تاریخ میں گوالیار کا دبستان کہیں نظر نہیں آیا، ص ۲۸ پر "دبستانِ اکبر آباد" کا عنوان ضرور ہے۔ ان کا دبستان کا تصور درست نہیں معلوم ہوتا۔ ایک شہر یا علاقے کے جملہ شعرا کو لے کر وہ ایک دبستان میں محصور کر دیتے ہیں، اس کے لیے شعری روایات و اظہارات وغیرہ کی یک سانی ضروری نہیں سمجھتے۔ اکبر آباد کے دبستان کا بانی خان آرزو کو قرار دیتے ہیں اور اس کے ارکان میں مضمون، آبرو، مظہر جانِ جاناں اور میر کو شمار کرتے ہیں۔ ان شعرا میں کون سی ایسی مشترک شعری خصوصیات ہیں جو دوسری جگہ کے شعرا میں نہیں

عمدۃالملک محمد امیر خاں انجام کے لیے لکھتے ہیں کہ یہ عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت اور بھاشا کا بھی بڑا عالم تھا (ص ۳۱)۔ مصنف نے انجام کے سنسکرت کا عالم ہونے کا کوئی ثبوت نہیں دیا، اسے ایک لسانی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا بانی جو دکھانا تھا۔ لکھتے ہیں:

> عمدۃالملک نے اب اردو کو پختہ، باقاعدہ اور مستند بنانے کی فکر کی۔ چنانچہ امرا اور فضلا کے مشورے سے ایک انجمن قائم کی، جس کا نام "عمدۃالملکی انجمن" رکھا گیا۔ اس انجمن کے جلسوں میں زبان کے مسئلے پر بحث کی جاتی تھی، چیزوں کے اردو نام رکھے جاتے تھے، لفظوں اور محاوروں کی سند پر ردوقدح ہوتی تھی اور بڑی چھان بین کے بعد تحقیق شدہ الفاظ اور محاورے انجمن کے دفتر میں قلم بند کر لیے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کی نقلیں جابجا ہند کے امرا اور رؤسا کے پاس بھیج دی جاتی تھیں جو اُن کی تقلید فخر اور نشرواشاعت فرض سمجھتے تھے۔ اردو پر عمدۃالملک کا یہ احسان ہمیشہ زندہ رہنے والا کارنامہ ہے۔ (ص ۳۲-۳۳)

آگے لکھتے ہیں کہ عمدۃالملک کے قتل کے بعد صفدر جنگ نے یہ دفتر سمیٹا اور اپنے ساتھ فیض آباد لے گیا۔ کچھ مدت کے بعد مرحوم عمدۃالملکی انجمن کی بنیاد پر بہو بیگم کا ادارہ فیض آباد میں قائم ہوا اور میر ضاحک اس کا سرِ دفتر مقرر ہوا (ص ۳۳)۔

چند صفحات بعد بہو بیگم کے ادارے کو باضابطہ شکل دے دیتے ہیں کہ فیض آباد میں ایک مستقل دفتر قائم کیا گیا جس میں محاوروں کے باقاعدہ اندراج کے لیے رجسٹر مرتب کیے گئے۔ وہ سارے محاورات اور ضرب الامثال جو یہاں بولے جاتے تھے، ادارے کے رجسٹروں میں درج کیے جاتے تھے۔ انھیں مستند قرار دے کر شائع کر دیا جاتا تھا۔ یہ ادارہ میر حسن اور ان کے بیٹے میر خلیق کی نگرانی میں کام کرتا تھا (ص ۳۸)۔

یہ جو بیسویں صدی کے رُبعِ چہارم میں پاکستان میں "ترقیِ اردو بورڈ" اور "مرکزی لغت بورڈ" (اب "اردو ڈکشنری بورڈ") نیز ہندوستان میں "ترقیِ اردو بورڈ" (بعد میں "ترقیِ اردو بیورو") بنے، انجام اور بہو بیگم دو ڈھائی صدی قبل دہلی اور لکھنؤ میں قائم کر چکے تھے، میر ضاحک اس لغات بورڈ کے صدر نشین تھے۔ سبحان اللہ! قصہ طوطا مینا کا مزہ آگیا۔ خمور قسم کھا کر کہیں اپنے بیان کا ماخذ درج کرنے کے تو قائل نہیں۔ گو مجھے اس کا ماخذ معلوم ہے۔ انھوں نے یہ گپ "سقل اور اردو" ص ۶۰ تا ۶۳ سے لی ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ انجام کی "اردو انجمن" کا ذکر "سیَرالمتاخرین" میں ہے۔ مجھے اس کتاب میں نہ مل سکا۔ میر درد کے یہاں بھی

کچھ ایسا ہی ادارہ دریافت کر لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

خواجہ میر درد کی علمی صحبت اور اس کا حلقۂ اثر اٹھارویں صدی کا ایک مستقل اور اہم ادارہ ہے، جس نے اردو زبان کی ترویج اور ترقی اور محاورے کی صحت اور صفائی میں نمایاں حصہ لیا۔

(ص ۴۴)

اکبر آباد کے دبستانِ زبان (دبستانِ شعر نہیں،) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سے خود دلی اور دلی والوں نے زبان سیکھی (ص ۴۰)۔ رجب علی بیگ سرور کے لیے لکھتے ہیں:

سرور اکبر آباد کی سرزمین کا ایک سپوت ہے اور اکبر آبادی ماں سے زبان سیکھ کر لکھنؤ گیا تھا۔ (ص ۴۴)

حسبِ معمول مخمور نے اپنا ماخذ درج نہیں کیا، حالانکہ مقدمے میں ایک پیراگراف میں ماخذ کے اعتراف پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہمارے انشاپرداز، استفادے کے اعتراف کے رواجاً اور طبعاً خوگر نہیں ... استفادے کا اعتراف کسی نوع کی ہمہ دانی کی اہانت یا علمی عظمت و وقار کی توہین نہیں کرتا۔ ہاں، اس کا پوشیدہ رکھنا، فرومائگی کے شدید احساس کی کھلی نمائش اور پست ذہنیت کی بیّن دلیل ہے۔ (مقدمہ ص ۱۱-۱۰)

ڈاکٹر نیر مسعود کے مطابق مخمور کے ان بیانات کا ماخذ شرر کا ایک مضمون ہو سکتا ہے ("رجب علی بیگ سرور"، ص ۷۷)، لیکن وہ بھی بے دلیل ہے۔ مخمور وطن کی محبت میں تاریخی معروضیت کو تجنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ ص ۴۱ پر اکبر آباد کے نہ جانے کن کن غیر معروف شعرا کے نام درج کرتے ہیں۔ یہ ظاہر کرتا چلوں کہ تحقیق و تاریخ کے باب میں یہ صحیفہ کتنا ہی غیر معتبر سہی، عملی تنقید کے معاملے میں خاصا استوار ہے۔ ان کی تنقیدی رائیں جاذبِ توجہ ہوتی ہیں۔

اس الزام کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ ظفر دوسروں سے کہواتا اور اپنے نام سے پڑھتا تھا۔ ان کے بقول یہ کیوں کر ممکن ہے کہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن اپنی شاعری اپنے رنگ میں کریں اور ظفر کے لیے کہیں تو ایک رنگ میں کہیں (ص ۵۰)۔ واضح ہو کہ مومن کو کسی نے ظفر کا استاد نہیں لکھا۔ ظفر کے بعد "دلی لٹریری سوسائٹی"، سرسید کی "سائنٹفک سوسائٹی" ۱۸۶۳ء، "ندوۃ العلما" ۱۸۹۴ء اور صحافت وغیرہ کا ذکر کر کے بیسویں

Scanned by CamScanner

صدی کے اداروں "دارالمصنفین"، "انجمن ترقیِ اردو"، عثمانیہ یونی ورسٹی وغیرہ پر آجاتے ہیں۔ غرض یہ عجیب باب ہے جس میں کہیں زبان کے آغاز کا ذکر ہے، کہیں سیاسی اور سماجی پس منظر کا۔ کہیں شعرا کا ذکر ہے اور کہیں اداروں کا۔ عمرو عیار کی زنبیل کا عالم ہے۔

دوسرا باب نظم کا نشوونما ہے جو بہ صورتِ موجودہ اس کتاب کا آخری باب ہے۔ اپنی اثنا عشریت کے زیرِ اثر اردو کے سب سے بڑے ۱۲ شاعر تلاش کرتے ہیں، جنھیں اردو شعرا کے بارہ امام کہتے ہیں۔ یہ عمائد ہیں:

ولی، سودا، میر حسن، میر، نظیر، مومن، غالب، انیس، حالی، اکبر، اقبال، جوش۔

(ص۶۵)

ان میں اور شعرا کا بھی اضافہ ہو سکتا ہے، مثلاً نصرتی، میر درد، دبیر وغیرہ لیکن اس طرح ۱۲ کی مبارک تعداد ہاتھ سے نکل جاتی۔ شاعروں کے مرتبے کے لحاظ سے پانچ درجے کیے ہیں:

خوش گو، ممتاز، مشہور، بڑے، بہت بڑے (ص۶۵)۔

ممتاز کو مشہور سے نیچے رکھنا معنوی اعتبار سے درست نہیں۔ شہرت کو اتنی اہمیت دینا محلِ نظر ہے۔ جعفر زٹلی، جان صاحب اور چرکیں بہت مشہور شاعر ہیں لیکن اتنے بلند و بالا نہیں۔ شعرا کی درجہ بندی کے بعد ممور ۲۳ تحریکیں گنواتے ہیں۔ ان کے اور ان کے قائدین کے نام سنتے چلیے:

۱۔ طنز: جعفر، سودا ۲۔ تصوف: ولی، ۳۔ ہجو: سودا، ۴۔ مدح: سودا، ۵۔ قنوطیت: میر، ۶۔ جمالیات: میر حسن، ۷۔ ریختی: میر سوز، ۸۔ مرثیہ: ضمیر، خلیق، دلگیر، فصیح، ۹۔ معاملہ بندی: انشا، جرأت، ۱۰۔ رجائیت: نظیر اکبر آبادی، ۱۱۔ تصنع: ناسخ، ۱۲۔ جذبات نگاری: مومن، ۱۳۔ ڈراما: امانت، ۱۴۔ گیت: ظفر، ۱۵۔ فلسفیت: غالب، ۱۶۔ بلاغت: امیر، ۱۷۔ روزمرہ: داغ، ۱۸۔ نورجائیت: سرور جہاں آبادی، حالی، اسماعیل، اکبر، شوق قدوائی، ۱۹۔ وطنیت: حالی، ۲۰۔ ظریفانہ شاعری: اکبر، ۲۱۔ اسلامیت: اقبال، ۲۲۔ ترقی پسند تحریک: جوش، ۲۳۔ اشتراکی تحریک: چند پختہ کار اور بے شمار ناتجربہ کار شاعر۔

مدح کی تحریک، تصنع کی تحریک، ڈرامے کی تحریک، گیت کی تحریک، روزمرہ کی تحریک ان عنوانوں سے اندازہ ہو گیا کہ ممور تحریک کے معنی نہیں سمجھتے۔ اردو کی سب سے مشہور تحریک علی گڑھ تحریک کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ کچھ اصناف، مثلاً ریختی، مرثیہ، ڈراما، گیت کو تحریک کا درجہ دیا ہے، دوسری مماثل اصناف کو کیوں نہیں دیا۔ میں نورجائیت کی تحریک کے معنی نہیں سمجھتا، ترقی پسند اور اشتراکی تحریک کا فرق نہیں جانتا۔ پھر کئی تحریکوں کے قائدین کے تعین میں بھی شبہہ رکھتا ہوں۔ تصوف کا قائد امرد پرست ولی کو قرار

دیا۔ معلوم نہیں میر حسن کو جمالیات کا، نظیر اکبر آبادی کو رجائیت کا اور سرور جہاں آبادی کو نورجائیت کا بانی کیوں کہا؟ وطنیت کی تحریک کا سرچشمہ مسدس "مدو جزر اسلام" اور ترکیب بند "شکوہ ہند" کے شاعر حالی کو قرار دیا، چکبست کو نہیں۔ ریختی کا بانی میر سوز کو کہنا انھیں کا اجتہاد ہے۔ مرثیے کی تحریک میں ضمیر، خلیق، دلگیر، فصیح، خلیق اور انیس کے نام ہیں، نہیں ہے تو دبیر کا نام۔ کیا دلگیر و فصیح ان سے اہم تر مرثیہ گو تھے۔ کئی شاعروں کو ایک سے زیادہ تحریکوں سے وابستہ کیا ہے، مثلاً سودا کو طنز، ہجو اور مدح سے، حالی کو نورجائیت اور وطنیت سے، اکبر کو نورجائیت اور ظریفانہ شاعری سے۔ اشتراکی تحریک میں ایک بھی نام نہیں دیا۔ تحریکوں کے بیان کو دیکھ کر مجھے ثمور کی نظریاتی تنقید میں شبہہ ہونے لگا ہے۔

لسانی نقطۂ نظر کے عنوان کے تحت میر، انشا، نظیر، داغ اور جلال کا لسانی نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں۔ ناسخ کو فراموش کر گئے۔ ان شعرا کا لسانی نقطۂ نظر یہاں بیان کرنے کے بجائے نظم کے باب میں ان کے ذیل میں لکھنا زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کے بعد ایک عجیب عنوان "صوری و معنوی پیکر" آتا ہے جس کے بعد آخرِ کار ص ۹۱ سے نظم کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ شعرا کے بیان میں ثمور کا ایک عجیب وتیرہ یہ ہے کہ پہلے ایک آدھ صفحے میں اس کی شاعری کا تعارف یا مجموعی تبصرہ دیتے ہیں، پھر اس کا نام، پیدائش اور حالات اور پھر اس کے بعد مفصل تنقید۔ حالات سے پہلے شاعری کے بارے میں حرف زنی کی ضرورت نہیں۔

خسرو کا سنہ ولادت ۱۲۰۸ء قرار دے کر اس کی عمر ۱۱۷ سال لکھتے ہیں، حالانکہ خسرو ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوا۔ خسرو کے بعد کبیر اور ملک محمد جائسی پر لکھا ہے۔ انھیں اردو کا شاعر تو نہیں کہا، پھر اردو نظم کی تاریخ میں ان پر لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ص ۹۸ پر کبیر کی زبان ہندی یا برج بھاشا قرار دیتے ہیں، حالانکہ اس نے خود اپنی زبان کو پوربی کہا ہے۔ کبیر کے حالات اور اس کے پیغام پر دلآویز طریقے سے لکھا ہے۔ دکنی شعرا پر لکھتے ہوئے ہاشمی کو مادرزاد اندھا کہا ہے (ص ۱۰۶)۔ جمیل جالبی کے مطابق یہ صحیح نہیں۔ اس کی شاعری میں رنگوں کا جو احساس ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں اندھا ہوا۔ اسی صفحے پر مثنوی "رضوان شاہ اور روح افزا" کے مصنف کا نام "فیض" لکھا ہے، صحیح فائز ہے۔

"سترھویں صدی اور شمال" کے عنوان کے تحت اپنے پیرِ طریقت صاحب "جلوۂ خضر" سے لے کر زیب النسا کے تین شعر درج کیے ہیں، جو بیسویں صدی کی زبان میں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے
خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے

(ص ۱۰۷)

رشید حسن خاں نے نشان دہی کی کہ تذکرۂ میر حسن میں یہ شعر محمد عظیم عظیم تلمیذ سودا کے نام سے ملتے ہیں۔ وہاں اس غزل کے دو شعر اور ہیں ("ادبی تحقیق"، ص ۳۲)۔ آگے چل کر بیدل کی اردو غزل کے وہ دونوں اشعار درج کیے ہیں، جن کا انتساب مشکوک ہے۔ "آبِ حیات" کی تقلید میں ولی کا وطن اورنگ آباد لکھتے ہیں، نیز یہ کہ وہ ۱۷۲۲ء میں دوبارہ آنے پر اپنا دیوان بھی ساتھ لایا (ص ۱۱۰)۔ اس زمانے کی تحقیق کے مطابق یہی کہہ سکتے تھے۔ ص ۱۲۲ پر پھر میر سوز کو ریختی کی تحریک کا بانی کہا ہے۔ کاش اس کے ثبوت میں ایک شعر تو دے دیتے۔

مرثیوں کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:

ولی کے کلام میں بھی مرثیت کا عنصر موجود ہے۔

(ص ۱۲۴)

ظاہر ہے کہ وہ مثنوی "روضۃ الشہدا" کے ولی ویلوری سے التباس کر رہے ہیں۔ مرزا فصیح اور میر دلگیر کے لیے لکھتے ہیں کہ یہ دونوں حج کے لیے گئے اور مکے میں آباد ہو گئے (ص ۱۲۶)۔ دلگیر میر کہاں سے ہو گئے۔ ان کا مسلمان ہونا ہی مشکوک ہے، وہ مکہ کیوں کر جا سکتے تھے۔ اکبر حیدری کے مطابق ان کا انتقال لکھنؤ میں ہوا ("اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا"، ص ۴۷۴)۔

چونکہ محمود نے "آبِ حیات" سے بہت استفادہ کیا ہے اس لیے اس کی اغلاط بھی در آئی ہیں مثلاً یہ کہنا کہ سلیمان شکوہ پہلے مصحفی سے مشورہ کرتے تھے، بعد میں مصحفی کی جگہ انشا کو استاد بنا لیا (ص ۱۴۶)، حالانکہ خود مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ وہ انشا کی وساطت سے سلیمان شکوہ کے ہاں پہنچے۔ ص ۱۴۷ پر انشا کی ایک رباعی لکھی ہے جو فارسی اور اردو دونوں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ پہلا شعر ہے:

بہارِ زندگی برباد کردی
قیامت اے دلِ ناشاد کردی

یہ رباعی نہیں، قطعہ ہے۔ مصحفی کے کلام پر بڑی سخت تنقید کرتے ہیں کہ وہ فطری شاعر نہیں، اس کی غزلیں روکھی، پھیکی اور بدمزہ ہیں۔ اس کی بے رنگی، بے نمکی اور

Scanned by CamScanner

بے اثری دل کو بیزار کرنے اور دماغ کو تھکا دینے والی چیزیں ہیں (ص ۱۵۰)۔ ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ اپنے ہم وطن نظیر پر بہت مفصل، یعنی ص ۱۵۴ سے ۱۶۳ تک لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، لیکن نمونے کا ایک شعر بھی نہیں دیا۔ محمود عام طور سے کسی کا نمونۂ کلام نہیں دیتے۔ رنگین کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس نے جو ریختی کے موجد ہونے کا دعویٰ کیا ہے، وہ بے بنیاد ہے۔ اس کی ابتدا ہاشمی اور خاکی نے کی لیکن میر سوز نے تحریک کی حیثیت سے اس صنف کی بنیاد ڈالی (ص ۱۶۶)۔ معلوم نہیں سوز بے چارے کو کس بِنا پر ریختی گو قرار دے دیا۔

دیا شنکر نسیم اور اس کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> اردو ادب، اس مثنوی پر ہمیشہ بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔
>
> (ص ۱۷۹)

مومن کے لیے لکھتے ہیں:

> اس نے اردو شعر کی ضخیم کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس کا نام اشارتی شاعری ہے ... اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ اشاروں اور کنایوں کی مدد سے ذہن کو اصل مقصود کی طرف منتقل کیا جائے۔
>
> (ص ۸۷-۱۸۶)

آزاد نے ذوق کی جو غلو کے ساتھ مدح سرائی کی ہے اسے نقادی نہیں، استاد کی کھلی ہوئی تعریف کہتے ہیں اور اس کے بعد یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں:

> بعض نقادوں کا خیال ہے کہ وہ فطری شاعر نہ تھا۔ مشق اور ممارست نے اسے پُرگو بنا دیا ... اس کے خیالات و مضامین میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ پستی اور تنزل کے آثار، اس کے قصیدے اور غزل دونوں میں نمایاں ہیں ... ترکیبیں بھونڈی، ڈھیلی اور سست ہیں۔
>
> (ص ۱۹۳)

مصحفی کی طرح ذوق کی یہ تنقید، بلکہ تنقیص متوازن نہیں لیکن ان کا یہ نقطۂ نظر صحیح ہے کہ مومن، غالب اور ذوق کا محض ہم عصری کی بِنا پر مقابلہ کرنا ایک بے حاصل سی بات ہے۔ یک ساں چیزوں کا مقابلہ کامیاب ہوتا ہے، لیکن ان تینوں میں وجہِ اشتراک کم اور اختلاف بہت زیادہ ہے (ص ۱۹۵)۔ ایک دفعہ پھر "ذوق اور غالب کا تقابل" عنوان دے کر لکھتے ہیں کہ:

Scanned by CamScanner

اردو شعر کی تاریخ میں بے سود و مضرت رساں تقابل کی چار مثالیں موجود ہیں۔ سودا اور میر، ناسخ اور آتش، ذوق اور غالب، انیس اور دبیر -- ان چار جوڑوں میں باہم کوئی اپنے معاصر سے چھوٹا یا بڑا نہیں، اپنی جداگانہ حیثیت کا مالک اور ہم عصر سے مختلف ہے۔

(ص ۲۰۹)

معلوم نہیں ان چار جوڑوں کے ساتھ انشا و مصحفی اور امیر و داغ کو کیوں شامل نہیں کیا۔ انھیں بھی ایک دوسرے کا حریف کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ فیصلہ صائب ہے کہ دو شعرا کا تقابل (موازنہ) بے سود رہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کئی ہم عصروں کا موازنہ کرتے ہیں، مثلاً بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ اختر (ص ۴۹-۲۴۷) امیر و داغ (ص ۲۷۷)، غلام امام شہید، امیر مینائی اور محسن، نعت نگاری کی حد تک (ص ۲۸۴)۔

ص ۲۰۴ پر غالب کو انتہا درجے کا خوددار لکھتے ہیں۔ غالباً انھوں نے "مکاتیبِ غالب" مرتبہ عرشی (۱۹۳۷ء) نہیں پڑھے، جن میں غالب گڑگڑا کر گدایانہ طریقے سے بھیک مانگتا ہے۔ ص ۲۱۲ پر رشک کی لغت کا نام "لفائس اللغات" لکھا ہے۔ یہ اوحد الدین بلگرامی کی لغت کا نام ہے۔ رشک کی لغت کا نام "نفس اللغہ" ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۵۶ھ حاصل ہوتا ہے۔ ایک شاعر نواب سید اسد علی ستین کے لیے لکھتے ہیں کہ اردو زبان کا مشہور شاعر ہے۔ اس نے اس زبان میں نوحے کے آرٹ کی بنیاد ڈالی (ص ۲۲۱)۔ ستین کو مشہور کہنا مبالغہ ہے۔ میں نے اسی تاریخ سے اس شاعر کا نام جانا۔ مصنف اس کے لیے لکھتے ہیں کہ اپنے عہد کے اعتبار سے ستین انیس و دبیر کا ہم عصر ہے (ص ۲۲۲)۔ لیکن مالک رام کے "تذکرۂ ماہ و سال" میں دبستانِ دبیر وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ دبیر کا شاگرد تھا۔ محمود نے اس کے قتل کے واقعے میں ناموں میں کچھ خلفشار کیا ہے۔

رام پور اور ناسخیت کے سلسلے میں بلاغت نظر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں لکھنؤ کے شاعرانہ سماج پر ناسخ کا رنگ چڑھا ہوا تھا، تیسرے رُبع میں یہ رنگ پھیکا پڑا اور چوتھے رُبع میں اترنا شروع ہو گیا۔ رام پور کی فضا میں یہ رنگ یک قلم نامقبول و متروک ہو گیا (ص ۲۶۲)۔ امیر، داغ، جلال اور تسلیم کو دربارِ رام پور کے چار رکن قرار دیتے ہیں (ص ۲۶۳)۔ امیر کے لیے لکھتے ہیں:

یہ بلاغت کی تحریک کا بانی ہے مگر یہ تحریک ناکام رہی اور اس کی ذات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ حد یہ ہے کہ خود اس کے شاگردوں نے اس کا اتباع نہ کیا۔ (ص ۲۶۴)

Scanned by CamScanner

اگر یہ ایک فردِ واحد تک محدود تھی تو اسے تحریک کیوں کر کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ تحریک ہے کیا؟ مصنف نے یہاں تو نہیں، لیکن پیچھے اس کی صراحت کی ہے۔ امیر نے صنائع بدائع، تشبیہ اور استعارے کے کثیر استعمال سے اس تحریک کی بنا ڈالی (ص ۲۷۷)۔ ایک زمانہ ہوا میں نے قاضی عبدالودود سے پوچھا تھا کہ بلاغت کے کیا معنی ہیں، صنائع بدائع، ترصیع اور فارسیت کی شدّت یا کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا؟ انھوں نے آخرالذکر کو صحیح ٹھہرایا۔ بعد میں میں نے "بحرالفصاحت" میں دیکھا تو اس سے بھی یہی بات ثابت ہوئی۔ لیکن اگلے وقتوں کے لوگ بلاغت کو ترصیع و صناعت سے وابستہ کرتے تھے۔ اسی لیے تو مشہور تھا کہ انیس کا کلام فصیح اور دبیر کا کلام بلیغ ہے۔ محمود بھی تفہیم کی اسی غلط فہمی کا شکار ہیں، لیکن صنائع بدائع کے لیے امیر کہاں ممتاز ہیں، اس مفہوم میں تو دبیر یا دیا شنکر نسیم کو ترجیح دینی چاہیے تھی۔

وہ امیر کو دوسرے درجے کا شاعر سمجھتے ہیں۔ اس کی تنقیص میں لکھتے ہیں:

> اس نے کسی نوع کی جدّت یا ندرت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کو کسی طرح آرٹسٹ یا صناع کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ شعر سے اس کا معنوی واسطہ بہت زیادہ نہیں ... تصورات کی عظمت اور گہرائی بھی مفقود ہے۔۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ وہ محض ایک نعت گو شاعر تھا جسے رام پور کے قیام اور داغ کی ہم نشینی واثر نے شاعر بنا دیا۔
>
> (ص ۶۵-۲۶۴)

محمود ص ۲۷۷ تا ۲۸۰ پر امیر اور داغ کا تقابل کرتے ہیں اور آخر میں یہ فیصلہ دیتے ہیں:

> قولِ فیصل یہ ہے کہ صناعت کے معیاری نقطۂ نظر سے امیر اور داغ کے دونوں کا کلام ایسا نہیں جس کو بلند پایہ یا کائناتی شعر کا مرتبہ دیا جا سکے۔ تصورات کی گہرائی اور فکر کی بلندی دونوں کے یہاں مفقود ہے۔ دونوں کا عاشق روایتی اور ادنیٰ درجے کا ہے۔
>
> (ص ۲۸۰)

میں پھر یہ کہوں گا کہ محمود صناع اور صناعت کے صحیح معنی نہیں سمجھے۔ صناعت کے معنی کاری گری اور دست کاری کے ہیں اور صناع دست کار ہوتا ہے۔ انھوں نے "آرٹسٹ یا صناع" کہہ کر ظاہر کر دیا کہ وہ صناع کو فن کار کے معنی میں اور صناعت کو آرٹ یا فن کاری کے معنی میں لے رہے ہیں۔ آتش کا شعر ہے:

Scanned by CamScanner

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے، آتش، مرصّع ساز کا

یہ صناعت ہے۔ کائناتی شعر فکری خوبیوں سے ظہور میں آسکتا ہے، صناعت سے نہیں، جس کا تصنع سے نزدیکی رشتہ ہے۔

جلال کی تنقیص امیر سے بھی زیادہ گاڑھی ہے۔ اسے یہ اوصاف عطا ہوتے ہیں:

> اس کی غزل بے نمک اور بدمزہ اور اس کا قصیدہ روکھی پھیکی قافیہ پیمائی ہے۔ مستثنیات سے قطعِ نظر، اس کا غزلیہ کلام سطحی موزوں گوئی اور بے مغز لفاظی ہے۔ وہ متوسط دل ودماغ کا انسان تھا۔
>
> (ص ۲۸۷)

مرثیہ گو رشید کا نام پیارے صاحب بتاتے ہیں (ص ۲۹۵)۔ دراصل یہ ان کی عرفیت تھی۔ نام محمد مصطفیٰ تھا۔

محمد حسین آزاد کی نظم نگاری کے بارے میں محمود کے اس فیصلے سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا:

> آزاد، حقیقت میں، صرف ایک موزوں گو ہے۔ اس لیے، اس کا کلام، اس آب و رنگ یا اس نوک پلک سے محروم ہے جو شعر کو صنعت پارے اور نظم کو نقش کا درجہ بخش دیتی ہے۔
>
> (ص ۳۲۶)

درگا سہائے سرور کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اس کے کلام کی مفصل تنقید قابلِ داد ہے۔ سرور اور نادر کاکوروی کو نورجائیت کی تحریک کا علم بردار کہتے ہیں۔ پچھے اس کی یوں شرح کی ہے:

> یہ تحریک بیسویں صدی میں، نظیر اکبر آبادی کی رجائیت و واقعیت کے بطون سے پیدا ہوئی۔ مغربی ادب کے صحت ور عناصر اور نظیر کے کلام کے کائناتی و معیاری اجزا کے امتزاج سے شعر کا ایک نیا نقطۂ نظر خلق ہوا جو زندگی کا ترجمان اور ترقی کا معاون سمجھا گیا۔
>
> (ص ۳۷)

میں اپنی کوڑھ مغزی کے سبب اب بھی اس تحریک کے ابعاد کی گرفت نہ کرسکا۔

حالی کی تنقید بہت مفصل ہے، ص ۳۴۲ سے ۳۵۱ تک اور اس میں شک نہیں کہ

Scanned by CamScanner

یہ ہر اعتبار سے خوب سے خوب تر ہے۔ مصنف حالی کو بہت پسند کرتا ہے اور یہ برحق ہے۔ ان کے بعد اسماعیل میرٹھی کا ذکر آتا ہے جو شاید نامکمل رہ گیا ہے یہ افسوس کی بات ہے کہ تصنیف کر لینے کے باوجود محمود اقبال وغیرہ کا جائزہ شائع نہ کر سکے، نیز نثر کے طویل باب اور تذکروں کے متعلق ضمیمے کو نظروں کے سامنے نہ لا سکے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ اجزا پاکستان میں بھی شائع نہ ہو سکے۔ نثری باب خصوصاً مفید ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے، دو تہائی تاریخ شائع ہوئی ہے، ایک تہائی پردۂ خفا میں رہ گئی۔

"صحیفۂ تاریخِ اردو" کا جائزہ لینے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ یہ ایک اوریجنل اور اپنے مخصوص رنگ کی تاریخ ہے، محض تقلیدی نہیں۔ مصنف اپنے طور سے سوچ سکتا ہے۔ تحقیقی اعتبار سے یہ بے مغز ہے، لیکن مصنف کے تنقیدی فیصلے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ وہ بعض شعرا کی تنقیص میں زیادہ انتہا پسند ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ ان کے جدید نقطۂ نظر کے سبب ہوگا کہ وہ روایتی شاعری کو برداشت نہ کر سکتے ہوں گے۔

Scanned by CamScanner

گیارھواں باب

محمد یحییٰ تنہا: "مِراۃ الشعرا"

تنہا کی "سیر المصنفین" کا تذکرہ پیچھے کیا جا چکا ہے۔ یہ نثر نگاروں کی تاریخ تھی۔ تنہا نے سوچا کہ شاعروں کی تاریخ بھی لکھ دی جائے تو کام جامع ہو جائے۔ اس طرح انھوں نے دو جلدوں میں "مِراۃ الشعرا" لکھی جسے وہ ہر جگہ تذکرہ کہتے ہیں۔ شاید ان کے ذہن میں تاریخِ ادب اور تذکرہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ اپنے دیباچے میں وہ ۲۷ تذکروں کی فہرست دیتے ہیں جس میں معروف تذکروں کے ساتھ "آبِ حیات"، "گلِ رعنا"، "شعر الہند"، رام بابو سکسینہ کی "تاریخِ ادبِ اردو" اور اعجاز حسین کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" کو بھی شامل کرتے ہیں۔ وہ تذکرے اور تاریخ کے اس اہم فرق سے واقف نہیں کہ تذکرے میں شعرا کے حالات الفبائی ترتیب سے ہوتے ہیں، تاریخ میں تاریخی ترتیب سے ادوار کے تحت۔ انھوں نے اپنی تاریخ کا نام "مِراۃ الشعرا" رکھا حالانکہ ان سے تقریباً رُبع صدی پہلے عبدالرحمان اپنی تنقیدی کتاب "مِراۃ الشعر" شائع کر چکے تھے۔ دونوں نام کافی ملتے جُلتے ہیں۔

اس کتاب کی کسی جلد کے اوپر تاریخِ طباعت درج نہیں۔ جلد اوّل پر تو ناشر کا نام بھی نہیں، صرف مطبع کا نام "عالم گیر الیکٹرک پریس، لاہور" چھپا ہے لیکن کتاب کے آخر میں ملنے کا پتا "شیخ مبارک علی تاجرِ کتب، لاہور" درج ہے۔ جلد دوم کے سرورق پر مبارک علی کا نام دیا ہے۔ میرے سامنے مولوی عبدالحق کے کتب خانے کے نسخے کا فوٹو عکس ہے جو مجھے انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان نے عطا کیا۔ جلد اوّل کے دیباچے پر مقام اور تاریخ "بیگم باغ، میرٹھ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۵ء" درج ہے۔ اس میں بیان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> اصل میں تاباں سے لے کر بیدار تک جو مسودہ تیار ہوا تھا، وہ میرٹھ کے کاتب کو دے دیا گیا تھا۔ جب ہندوستان میں بدامنی پھیلی اور کشت و خون کا بازار گرم ہوا راقم آثم بھی میرٹھ سے نکل کر براہ کراچی لاہور پہنچا۔ مسودہ کاتب کے پاس رہ گیا اور ہر چند اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن پھر وہ دستیاب نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں

میری تمام کتابیں میرٹھ میں رہ گئیں۔ جو کچھ سامان یہاں میسر آیا،
اسی سے دوبارہ ان شعرا کا حال لکھا گیا۔

(جلد اوّل، ص ۱۴۶)

فی الوقت جلد میں تاباں سے بیدار تک کا حصہ ص ۱۳۴ تا ۲۶۹ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں میر، سودا اور درد جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ تنہا کو مندرجہ بالا بیان دیباچے میں دینا چاہیے تھا لیکن دیباچے پر تو میرٹھ کی تاریخ پڑی ہے۔ انھوں نے اسے نہیں بدلا۔ ظاہر ہے کہ جلد اوّل وہاں نہ چھپ کر تقسیم ملک کے بعد لاہور میں چھپی۔ کب؟ کتاب پر تاریخِ طبع درج نہیں۔ تنہا نے مولوی عبدالحق کو جلد اوّل پیش کرتے ہوئے لکھا:

جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں۔ محمد یحییٰ تنہا۔
۲۵ جولائی ۴۹ء۔

اندر کے سرورق پر لکھا: "بغرضِ ریویو"۔ اگر انھیں اشاعت کے فوراً بعد بھیجی ہوگی تو یہ جلد جولائی ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ مولوی صاحب نے رسالہ "اردو" بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء میں اس پر مختصر تبصرہ کیا۔ دوسری جلد کے دیباچے پر "لاہور، ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء" کی تاریخ درج ہے۔ سرورق پر مصنف نے مولوی صاحب کو پیش کرتے ہوئے لکھا:

بغرضِ ریویو جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں۔
تنہا۔ ۲۹ اگست ۵۰ء۔

کتاب شائع ہوتے ہی سب سے پہلے مولوی صاحب کو بھیجی ہوگی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جلد اگست ۱۹۵۰ء میں بازار میں آئی، گویا جلد اوّل کی تاریخ ۱۹۴۹ء اور جلد دوم کی تاریخ ۱۹۵۰ء ہے۔ کتاب خاصی ضخیم ہے۔ پہلی جلد میں ۵۸۴ صفحے ہیں، دوسری میں ۳۹۶ یعنی کُل ۹۸۰ صفحے۔ حیرت ہے کہ اس تن و توش کے باوجود یہ کتاب اتنی گم نام رہی کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی اس کے وجود سے واقف ہو۔

کتاب پر دو تبصرے چھپے، پہلا مولوی عبدالحق کے رسالے "اردو" کراچی میں ۱۰ صفحوں پر۔ اس میں مولوی صاحب نے زیادہ تر ان بیانات کو لیا ہے جن کا تعلق خود ان کی ذات سے ہے۔ نفسِ کتاب کا جائزہ نہیں لیا۔ دوسرا تبصرہ نثار احمد فاروقی نے "تنقیدِ مراۃ الشعرا" کے نام سے لکھا۔ یہ ان کے مجموعے "دید و دریافت" (۱۹۶۴ء) میں شامل ہے۔ مضمون کے نیچے تاریخ ۱۹۵۶ء درج ہے۔ یہ صراحت نہیں کہ یہ اصلاً کہاں اور کب چھپا۔ نثار صاحب سے متعلق "کتاب نما" کے خصوصی شمارے دسمبر ۱۹۹۳ء میں بھی ان کے مضامین کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں۔ یہ تبصرہ "دید و دریافت" کے ۳۲ صفحوں پر محیط ہے، پھر

Scanned by CamScanner

بھی میں یہ محسوس ہوگا کہ یہ صرف ابتدائے کتاب سے متعلق ہے، اس کے آگے کے مطالب سے نہیں۔ میں دونوں جلدوں کا مفصل جائزہ لیتا ہوں۔

جلد اول: اس میں اندر کے سرورق پر اپنے نام کے بعد قوسین میں خود کو چند کتابوں کا مصنف، مؤلف اور مترجم لکھا ہے۔ یہ رام بابو سکسینہ کی نقل ہے۔ فہرست مطالب کے بعد دیباچہ ہے۔ "سیر المصنفین" جلد اول طبع دوم کی طرح یہاں بھی ہر باب کے پہلے لفظ کا پہلا حرف علاحدہ سے ایک مربع میں جلی کتابت میں لکھا ہے مثلاً:

ی ہ (ص ۱۱)۔ ح کیم (ص ۲۴۹)۔ ش یخ (ص ۲۶۴)۔

لفظوں کو قطع کرنے کی یہ روش ناشر شیخ مبارک علی کی ہوگی۔ وہ اسے حُسن سمجھتے ہوں گے، حالانکہ یہ بالکل لغو ہے۔

جلد اول کے دیباچے اور جلد دوم کے خاتمے میں خود ان کے حالات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حالی کے مقدمے اور انگریزی شاعری سے بہت متاثر ہیں۔ اپنے احوال میں لکھتے ہیں۔

> ابتدا میں چند غزلیں کہیں اور نویں کلاس میں "مقدمۂ دیوانِ حالی" پڑھ کر تغزل کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا اور انگریزی زبان کی تقلید میں نظمیں کہنے لگا۔
>
> (جلد ۲، ص ۳۸۶)

جلد اول کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی شاعری سے متاثر ہی نہیں، مرعوب ہو گئے۔ انگریزی نظموں کا ترجمہ "شاعرانہ خیالات" کے نام سے، اروِنگ کے مضامین کا "خیالات اروِنگ" کے نام سے کیا۔ حیرت ہے کہ وہ غزل گوئی اور تغزل کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں:

> آزاد اور حالی نے بھی، جنھوں نے تغزل ہی میں پرورش پائی تھی۔
>
> (جلد ۱، ص ۵۱)
>
> ہماری شاعری میں تغزل کے سوا اور کوئی صنف اس قدر مقبول نہیں ہوئی۔
>
> (جلد ۱، ص ۵۷)

نسیم دہلوی کے لیے:

> معلوم نہیں، تغزل کے سوا کچھ اور بھی لکھا ہے یا نہیں۔
>
> (جلد ۱، ص ۵۵۸)

Scanned by CamScanner

صنفِ تغزل میں خوبیاں کم اور برائیاں بہت زیادہ ہیں۔

(جلد دوم، ص ۴)

تغزل ایک داخلی وارداتی کیفیت ہے۔ اصلاحی دور کی حالی کی بہت سی غزلیں تغزل سے عاری ہیں۔ دوسری طرف اقبال، جوش، اختر شیرانی، مخدوم اور فیض کی بہت سی نظموں میں بھی تغزل ملتا ہے۔

اپنی کتاب کی شانِ نزول یوں بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۲۸ء میں انھیں یہ خیال ہوا، شعرائے اردو کے بہت سے تذکرے لکھے گئے لیکن کسی تذکرے میں شاعروں کے کلام پر سیر حاصل تبصرے نہیں۔ تنہا "آبِ حیات" اور "گلِ رعنا" کو بطورِ خاص تنقید سے نیازمند قرار دیتے ہیں۔ وہ ایسے ۲۷ تذکروں کی فہرست دیتے ہیں جن میں چار تواریخ ادب بھی شامل ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے اپنے تبصرے میں ان کی فہرست کے اغلاط کی مفصل نشان دہی کی۔ پہلا انکشاف یہ کیا کہ تنہا نے یہ فہرست فرحت اللہ بیگ کے دیباچۂ دیوانِ یقین سے نقل کی ہے اور فرحت اللہ کا حوالہ بھی نہیں دیا، اس لیے اس کی تمام غلطیوں کی ذمے داری بھی تنہا کے سر آتی ہے۔ فہرست میں کئی تذکروں کے نام غلط ہیں، بعض کے مصنفوں کے نام صحیح نہیں، کئی کا سنہ غلط لکھا ہے۔ پھر اردو میں محض یہ ۲۷ تذکرے ہی نہیں، اور کئی ہیں۔ میں اغلاط کو مختصراً درج کرتا ہوں:

ذیل کے تذکروں کے نام غلط لکھے ہیں، صحیح یہ ہیں:

غلط	صحیح
۱۔ تذکرۂ شعرائے ہند	مشہور نام تذکرۂ ریختہ گویاں۔ صحیح تر نام گلشنِ راز (گیان چند)
۲۔ تذکرہ بزمِ گلشنِ گفتار	گلشنِ گفتار
۱۰۔ تاریخ ادبِ ہندوستان (گارساں دتاسی)	تاریخ ادبیاتِ ہندوی (ہندوستانی۔ فرانسیسی میں لکھی یہ تاریخ محض شعرائے اردو کا تذکرہ نہیں۔
۱۲۔ مجموعۃ الانتخاب	مجمع الانتخاب (مخطوطۂ سالار جنگ کے مطابق)
۱۶۔ طبقات الشعرا یا تذکرۂ شعرائے اردو	طبقاتِ شعرائے ہند

ذیل کے مصنفوں کے نام صحیح نہیں دیے

Scanned by CamScanner

غلط	صحیح
۱- فتح علی حسین گردیزی	سید فتح علی حسینی گردیزی
۲- خواجہ حمید خاں اورنگ آبادی	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی
۱۲- فقیر شاہ کمال الدین کمال	شاہ محمد کمال
۲۳- مرزا جعفر علی نشتر	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی۔ جعفری علی نشتر "آبِ بقا" کے مرتب ہیں، مصنف نہیں

سنین کی غلطیوں کی تفصیل نثار صاحب کے مضمون میں دیکھیے۔ میں چند زیادہ نمایاں اغلاط درج کرتا ہوں:

غلط	صحیح
۱- تذکرہ گردیزی ۱۱۶۵ھ	خاتمے کے مطابق محرم ۱۱۶۶ھ
۳- نکات الشعرا ۱۱۴۷ھ	۱۱۶۵ھ
۵- مخزنِ نکات ۱۱۷۸ھ	۱۱۶۸ھ
۱۲- [مجمع الانتخاب] ۱۲۱۹ھ	۱۲۱۸ھ
۱۵- گلستانِ سخن اندازاً ۱۲۵۰ھ	۱۲۷۱ھ جو تاریخی نام گلستانِ سخن سے برآمد ہوتا ہے
۱۶- کریم الدین کا تذکرہ ۱۲۶۲ھ	خود مولف نے ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) لکھی ہے
۱۹- باطن کا گلستانِ بے خزاں ۱۲۹۱ھ	خاتمے میں تاریخوں کے مطابق ۱۲۶۵ھ
۲۱- "آبِ حیات" ۱۸۸۴ء	۱۸۸۰ء
۲۲- خمخانۂ جاوید ۱۳۲۵ھ (۸-۱۹۰۷ء)	یہ محض جلد اول کی تاریخ ہے۔ جملہ جلدوں کی تاریخیں یہ ہیں اول ۱۹۰۸ء ۔ دوم ۱۹۱۱ء ۔ سوم ۱۹۱۷ء، چہارم ۱۹۲۶ء ۔ پنجم ۱۹۴۰ء (گیان چند)
۲۷- مختصر تاریخ ادبِ اردو از اعجاز حسین ۱۹۴۰ء	۱۹۳۴ء (گیان چند)

اس فہرست میں نثار احمد فاروقی نے یادداشت سے مزید ۳۶ تذکروں کے ناموں کا اضافہ کیا جن میں عیار الشعرا، ریاض الفصحا، جلوۂ خضر اور انتخابِ یادگار بھی شامل ہیں۔

(دید و دریافت ص ۸۲-۱۸۱)

تنہا نے رتبے کے لحاظ سے شاعروں کے چھ درجے قرار دیے، ان میں سے صرف پہلے اور دوسرے درجے کے شعرا پر لکھا ہے۔ متن میں انھیں طبقۂ اوّل اور طبقۂ دوم کہا ہے۔ تنہا نے ایک اور لایعنی تقید کیا ہے کہ ہر شاعر کے ۲۷ شعر نمونے میں دیے ہیں۔ جن کے ۲۷ شعر نہ مل سکے، ان کے کم ہیں۔ تنقیدِ کلام میں جو بکثرت اشعار درج کیے ہیں، وہ مزید ہیں۔ وہ تنقید میں بعض اوقات پوری غزلیں درج کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہر شاعر کے ذیل میں اشعار کی بھرمار ہے۔ انھیں کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ مادّی اور ذہنی وسائل کا صرفِ بےجا ہے۔

لکھتے ہیں کہ تنقید میں رُو رعایت کا بالکل لحاظ نہیں کیا اور یہ سچ ہے۔ انھوں نے شاعروں کے جو حالات لکھے ہیں، ان کے تین حصے ہیں:

(الف) حالات: ان میں کہیں ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا۔ کتب خانوں میں جا کر مخطوطات یا اصل ماخذ کو نہیں دیکھا، بلکہ دوسروں کی ادبی تاریخوں سے حالات لکھ لیے ہیں۔ ان میں سنین بعض اوقات غلط ہوتے ہیں۔ اس تبصرے کے آخر میں ولادت و وفات کے سنین کا تجزیہ کروں گا۔ حالات کی تحقیق کی حد تک یہ تاریخ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

(ب) تنقید: اس میں انھوں نے ہر شاعر کے تحت متروکات کی فہرست گنانے پر خاص توجہ کی ہے۔

مولوی عبدالحق اور نثار احمد فاروقی دونوں نے اس بات پر اعتراض کیا ہے۔ جس زمانے میں شاعر نے تخلیقات کیں، اس وقت یہ الفاظ متروک نہیں تھے۔ بار بار انھیں متروکات کو گنانا بےلطفی کا باعث ہے۔ پورے دور کے بارے میں یک جا لکھ دیا جاتا تو دوسری بات تھی۔ وہ ہر شاعر کے حال میں اس کے رکیک اشعار اَدبدا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے آگے وہ بڑی جگرداری اور جسارت سے تنقید کرتے ہیں، کسی سے مرعوب ہوئے بغیر اس کے نقائص گنا دیتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر عام طور پر حالی اور کلیم الدین احمد کے انداز کا ہے کہ اردو کی روایتی شاعری اور غزل کے سکّہ بند موضوعات کو ناپسند کرتے ہیں، اخلاقیات اور افادیت کے پیمانے سے شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی تنقیدوں کے دلچسپ ہونے میں کلام نہیں، گو ہر جگہ ان سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ مولوی عبدالحق جو اپنے

Scanned by CamScanner

تبصرے میں ان سے نہایت ناراض ہیں، وہ بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے:

قابل مؤلف نے شعرا کے کلام پر نہایت صفائی اور بے باکی سے اپنی راے کا اظہار کیا ہے اور اکثر تذکرہ نویسوں کی راے سے اختلاف کرنے میں مطلق تأمل نہیں کیا۔ اس معاملے میں انھوں نے تنقید کا حق ادا کیا ہے۔

("اردو"، اکتوبر ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۶)

(ج) انتخابِ کلام: جو عموماً ۴، ۷ شعروں کا ہے۔ نثار احمد فاروقی کا تبصرہ ہے:

۴، ۷ کی پابندی ایسی کی گئی ہے گویا فرائضِ تذکرہ نویسی میں داخل ہے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ۴، ۷ نشتر ہی ہوں۔ عموماً ان کا انتخاب نہایت پھسپھسا اور بے کیف ہے۔ بہت سے شاعروں کا انتخاب اس سے ہزار جگہ اچھا کیا جا سکتا تھا۔

("دید و دریافت"، ص ۱۷۵)

ظاہراً انتخابِ اشعار میں کسی معیّن اصول کے پابند نظر نہیں آتے اور ۴، ۷ شعروں کی تلاش میں انھوں نے جو سعی کی ہے، وہ رائیگاں ہی رہی۔ (ایضاً، ص ۱۷۶)

تنہا کی کتاب کے اس حد تک گم نام رہنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے ۵۰-۱۹۴۹ء میں ۱۹۱۵ء کے انداز کی کتاب پیش کی۔ اس وقت تک تحقیق اور تنقید دونوں بہت آگے نکل چکی تھیں۔ میں ان کی تنقید کو قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔ کاش ان کی کتاب کا ایک خلاصہ تیار کیا جائے جس میں شاعروں کے حالات اور انتخابِ کلام کو پوری طرح قطع کر کے صرف تنقید کو برقرار رکھا جائے۔ اس میں بھی جہاں اشعار زیادہ ہوں انھیں کم کر دیا جائے۔ اس طرح کی کتاب زیادہ سے زیادہ تین سو صفحوں میں آ جائے گی اور اس کا نوٹس ضرور لیا جائے گا۔

دیباچے کے آخری صفحے پر لکھتے ہیں کہ اس کتاب کو تین جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، پہلی جلد شائع کی جاتی ہے، بعد ازاں بقیہ جلدیں بھی شائع کی جائیں گی۔

اب میرا ارادہ ہے کہ "سیر المصنفین" جلد سوم کی تیاری میں مصروف ہو جاؤں۔ (ص ۱۰، سیر ۳، ۱۹۴۵ء)

اس سے ایسا لگتا ہے جیسے "مرآۃ الشعرا" کی تین جلدیں تیار کر چکے ہیں اور ان سے فارغ ہو کر "سیر المصنفین" جلد سوم کی تالیف میں لگ جانا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے "مرآۃ الشعرا" اور

Scanned by CamScanner

سیرالمصنفین۔ کسی کی بھی تیسری جلد سامنے نہیں آئی۔ مندرجۂ بالا بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۵ء تک "مرآۃ الشعرا" کی دوسری جلد تیار ہو گئی تھی۔ دیباچے کے آخر میں جلد اوّل کے بعض مضامین کے رسالوں میں اشاعت کی فہرست دیتے ہیں۔ یہ مضامین ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۷ء کے بیچ میں شائع ہوئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے واقعی ۱۹۲۹ء میں شاعروں پر لکھنا شروع کر دیا تھا یعنی کتاب کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔

متن کا پہلا باب "اردو زبان کی تاریخ" ہے۔ یہ واضح کر دوں کہ انھوں نے فہرست یا متن میں کہیں باب کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ یہ باب زیادہ تر "پنجاب میں اردو" کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "دکن میں اردو"، "تاریخِ نثرِ اردو" (یعنی احسن کی "نمونۂ منثورات")، "تاریخ و تنقید" (حامد حسن قادری) اور "گلِ رعنا" وغیرہ سے استفادہ کیا گیا۔ اردو کے آغاز کے بارے میں شیرانی کے نظریے سے متفق ہیں۔ میں اُن کے لسانی پہلو سے پوری طرح صرفِ نظر کرتے ہوئے اس باب کے بعض تاریخی و تحقیقی بیانات پر اپنا مشاہدہ پیش کرتا ہوں۔

البیرونی نے جن کتابوں کو عربی میں منتقل کیا ان کے نام شنکیا اور پتنجلی لکھے ہیں (ص ۱۲)۔

یہ کتابوں کے نام نہیں۔ قبلِ مسیح دور میں سنکھیہ فلسفے کا ایک دبستان تھا اور رشی پتنجلی کی "پتنجلی یوگ سوتر" مشہور ہے۔ ص ۱۵ پر "لود پھنگری مردہ سنگ" والے تین اشعار کو دوہروں کی بحر میں قرار دے کر خسرو سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ اشعار دُور دُور تک دوہے کے وزن میں نہیں۔ جیسا کہ میں "سیرالمصنفین" کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں، ناحتاط مورّخ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں انھیں خسرو ہی سے منسوب کر دیا ہے ("آبِ حیات" ص ۱۷)، لیکن سلیمان ندوی نے "نقوشِ سلیمانی" میں "معدن المعانی" کے حوالے سے انھیں شرف الدین یحییٰ منیری کا قرار دیا ہے۔ تنہا نے بابا فرید شکر گنج کا یہ ملفوظہ درج کیا ہے:

رحم کرے تو چھوٹیاں، عدل کرے تو لوٹیاں۔ (ص ۱۵)

یہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ مصنف نے اس کا ماخذ بھی نہیں دیا۔ چند صفحات کے بعد خواجہ گیسودراز سے اتنی صاف زبان کے اردو عروض کے شعر منسوب کیے ہیں:

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اُسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

وغیرہ۔ (ص ۱۹)

Scanned by CamScanner

ان اشعار کا ماخذ درج نہیں کیا، لیکن یہ "دکن میں اردو" سے ماخوذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ زبان خواجہ بندہ نواز کی نہیں۔ "معراج العاشقین" کو خواجہ بندہ نواز سے اور "شرحِ مرغوب القلوب" کو میراں جی شمس العشاق سے منسوب کیا ہے۔ اب یہ دونوں انتساب غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی صفحے پر وجدی کی مثنوی "تحفۂ عاشقاں" کو فریدالدین عطار کے "خسرو نامہ" کا ترجمہ قرار دیا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کے مطابق یہ خسرو کی "گل و ہرمز" کا اضافہ شدہ ترجمہ ہے ("دکن میں اردو"، ص۳۲۵)۔ ص۲۰ پر مشہور ریختے "ریت ہے، گیت ہے" کے شاعر کا نام سعدی دکنی لکھتے ہیں، گو انھیں عام طور سے سعدی کاکوروی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے علی گڑھ تاریخ میں انکشاف کیا کہ ایک قدیم کشکول کے مطابق یہ پنجاب کے ملا شیری کی تخلیق ہے۔

تنہا لکھتے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنا کلیات ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا (ص۲۰)، لیکن قلی قطب شاہ تو ۱۰۲۰ھ میں انتقال کر گیا تھا۔ دراصل کلیات اس نے نہیں، اس کے بھتیجے محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا۔ ص۲۱ پر تاناشاہ کا یہ شعر، "... بھرات ہے، ... بارہ باٹ ہے،" نقل کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے تصحیح کی کہ اس بارے میں تمام تذکرہ نویسوں نے غلطی کی ہے۔ یہ شعر بحری کا ہے اور اس کے دیوان میں موجود ہے (رسالہ "اردو"، اکتوبر ۱۹۴۹ء، ص۱۳۹) قطب شاہیوں کے زمانہ میں جن شعرا کے نام گنائے ہیں ان میں یہ بھی شامل ہیں:

نشاطی، شعور، بےچارہ، بحری، طالب، مومن۔

ان میں نشاطی کو ابنِ نشاطی لکھنا چاہیے۔ شعور کے بارے میں کچھ پتا نہ مل سکا، لیکن ص۲۲ پر اس کا نمونے کا جو شعر درج کیا ہے وہ انیسویں صدی کی شمالی اردو کا معلوم ہوتا ہے۔ بےچارہ، بحری اور طالب مغلیہ دور کے ہیں۔ مومن کا تعلق عادل شاہیوں سے ہے، گو ہے یہ قطب شاہیوں کا ہم عصر۔ غوّاصی کے لیے لکھتے ہیں کہ یہ جہاں گیر کے عہد میں دلی میں آیا تھا (ص۲۱)۔ یہ درست نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ہاشمی کو مادرزاد اندھا لکھا ہے (ص۲۴)۔ یہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ بقولِ جالبی رنگوں کا جو احساس ہاشمی کی شاعری میں ملتا ہے وہ کسی مادرزاد اندھے کے یہاں ممکن نہیں۔ (جلد اوّل، ص۳۵۴)

لکھتے ہیں، تلسی داس نے "راماین" کو برج بھاشا میں ترجمہ کیا (ص۲۷)۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں تصحیح کی کہ اوّل تو یہ ترجمہ نہیں، طبع زاد کتاب ہے، دوسرے اس کی زبان برج نہیں، بیسواڑی یعنی اودھی ہے۔ تنہا ص۲۹ پر یہ جو لکھتے ہیں کہ اب تک اہلِ گجرات نے کوئی ایسا نمونہ پیش نہیں کیا جس سے ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکیں

Scanned by CamScanner

کہ گجرات میں بھی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا، مولوی عبدالحق اس کی سختی سے تردید کر کے گجری کے متعدد قدیم شعرا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے آگے تنہا نے لکھا ہے:

> شاہ جہاں کے زمانے میں اس زبان کا نام ہندی یا دہلوی زبان کی بجائے اردو مشہور ہوا۔ (ص ۲۹)

مولوی صاحب اس کی تصحیح کرتے ہیں کہ زبان کے بارے میں اس کا یہ نام پہلی بار مصحفی اور انشا نے استعمال کیا ہے (رسالہ "اردو"، ص ۱۴۱)۔ مولوی صاحب کا بیان بھی پوری طرح درست نہیں۔ سب سے پہلے مائل دہلوی نے تنہا لفظ "اردو" کو زبان کے معنی میں استعمال کیا۔

اگلی فصل کا عنوان "اردو شاعری" ہے۔ اس میں حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری"، شبلی کی "شعر العجم" جلد چہارم اور عبدالرحمان کی "مرآۃ الشعر" سے اخذ کر کے نظریاتی بحثیں کی ہیں، مثلاً کیا سماج کو شاعری کی ضرورت ہے؟ کیا شاعری زمانۂ جاہلیت میں فروغ پاتی ہے؟ شعر کی تاثیر، شعر میں مبالغہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوعات ادبی تاریخ کے حصار میں نہیں آتے۔ تنہا کو اندازہ نہیں کہ تذکرہ یا تاریخِ ادب کس کو کہتے ہیں۔ میں ان نظریاتی بحثوں سے بڑی حد تک صرفِ نظر کر کے بعض تحقیقی بیانات کو دیکھتا ہوں۔

ص ۴۰ پر میر کے مشہور قطعے کا دوسرا مصرع یوں لکھا ہے:

> یکسر وہ استوانِ شکستہ سے چور تھا

نثار احمد فاروقی نے تصحیح کی کہ دوسرا مصرع یوں ہے:

> یک سر وہ استخوان، شکستوں سے چور تھا
>
> ("دید و دریافت"، ص ۲۰۱)

مکتبۂ جامعہ کے "انتخابِ میر" مرتبۂ ڈاکٹر محمد حسن میں بھی آخرالذکر متن ہے (ص ۹)۔ تنہا نے لکھنؤ کے مشاعرے والا میر کا مشہور قطعہ لکھا ہے:

> کیا بود و باش ... الخ (ص ۴۰)۔

فاروقی نے اپنے تبصرے میں اعتراض کیا کہ یہ میر کا نہیں، کیونکہ یہ کلیات میں موجود نہیں۔ لیکن نثار بعد میں حاشیے میں اضافہ کرتے ہیں کہ تبصرہ لکھنے کے سات سال بعد انجمنِ محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں ایک قلمی بیاض مورخہ اول رجب ۱۲۱۶ھ کی، یعنی حیاتِ میر کی ہے۔ اس میں یہ قطعہ قدرے اختلاف کے ساتھ میر کے نام سے موجود ہے،

Scanned by CamScanner

یعنی دوسرے شعر کا پہلا مصرع:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب،

یوں ہے:

دلی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم آہ!

اور تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں "لوٹ کے ویران کر دیا" کی جگہ "لوٹ کے برباد کر دیا" ہے۔ ("دیدودریافت"، ص ۲۰۲)

فاروقی صاحب کی یہ دریافت بہت اہم ہے۔

لکھتے ہیں:

> ہماری شاعری کی ابتدا "دکن میں اردو" کے مؤلف نے وجیہ الدین وجدی سے بتائی ہے... جس نے ایک مثنوی "تحفۂ عاشقاں" ۱۰۱۵ھ میں تصنیف کی تھی۔ وجدی کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ اور سعدی دکنی کا نمبر ہے۔ (ص ۴۲)

مولوی عبدالحق تصحیح کرتے ہیں کہ خود مثنوی کے آخر میں اس کی تاریخِ تصنیف ۱۱۵۳ھ درج ہے (رسالہ "اردو"، ص ۱۳۹)۔ قلی قطب شاہ کو وجدی کے بعد کا شاعر کہنا درست نہیں۔ وجدی مغلیہ عہد کا شاعر ہے۔ اردو کا پہلا مستند شاعر نظامی دکنی ہے۔ "دکن میں اردو" کے ابتدائی ایڈیشنوں میں مندرجۂ بالا بیان رہا ہوگا، اس کے آخری یعنی ترقیِ اردو بیورو دہلی والے ایڈیشن میں سے یہ سب خارج کر دیا گیا ہے۔ اس میں ص ۳۲۵ پر وجدی کی مثنوی کی تاریخ ۱۱۵۳ھ ہی درج ہے۔ ولی کے لیے تنہا لکھتے ہیں:

> یہ شاعر ۱۰۸۰ھ میں پیدا ہوا اور ۱۱۵۵ھ میں فوت ہو گیا۔
>
> (ص ۴۳)

ولی کے سنین کی بحث ابھی کچھ رک کر معرکۂ تنہا و عبدالحق کے ضمن میں کی جائے گی۔

تنہا "اردو شاعری" پر بحث کرتے ہوئے ایک عنوان دیتے ہیں: "اخوتِ اسلامی کا خیال ولی کے دل میں نہ تھا" اور اس عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ولی کے دل میں مطلق یہ خیال نہ پیدا ہوا کہ کوئی نظم ایسی لکھے جس سے لوگوں کے خیالات عیاشی کے خلاف ہو جائیں۔
>
> (ص ۴۳)
>
> ولی سے یہ مطالبہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا لیلیٰ کی ماں نے مجنوں

Scanned by CamScanner

سے ایم اے پاس کرنے کا کہا تھا۔ تنہا کو اعتراض ہے کہ ولی نے فارسی شاعری کی کورانہ تقلید کی (ص۴۴)۔ اس طرح وہ ولی کے اجتہادات کی قدر نہ کر سکے اور سترھویں صدی کے شاعر سے بیسویں صدی کے تصورات کی توقع کرنے لگے۔

تنہا غزل اور قصیدہ دونوں کے خلاف ہیں۔ ایک عنوان دیتے ہیں:

> تغزل اور قصیدہ نگاری نے ارکانِ حکومت کو فکرِ سلطنت سے آزاد کر دیا۔ (ص۴۵)

ص۵۴ پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں: "کیا ہمارے لیے عشقیہ شاعری مناسب ہے؟" اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ہمارا فرض ہے کہ ہم عشقیہ شاعری کو قطعی ترک کرنے اور دیگر اصنافِ شاعری اختیار کرنے کی ترغیب دیں۔
>
> (ص۵۵)

آخر حالی کے شاگرد ہیں نا۔ افادیت کے مسودے میں شاعری کی روح قربان کرنے کو تیار ہیں۔ مزید اقوال ملاحظہ ہوں:

> "تغزل ہمارے تنزل کا ذمے دار ہے تو ہم کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے کہ یہ ہماری شاعری کی عمارت میں اپنا کوئی حصہ قائم رکھے۔
>
> (ص۵۹)
>
> جب تک غزل کے ساتھ سختی سے برتاو نہیں کیا جائے گا یہ سخت جان سر اٹھاتی رہے گی اور ہماری تباہی و بربادی پر تلی رہے گی۔
>
> (ص۶۰)
>
> مشاعروں میں جو غزل گوئی کا رواج ہے اس کو ترک کر دیں ... کیا ہمارے شعرا اب بھی ایرانی شے یعنی غزل کو خیرباد نہ کہیں گے؟
>
> (ص۶۲)

نظم لکھنے کے لیے وہ صنفِ مثنوی کو بہترین سمجھتے ہیں، اس کے بعد مسدس کو۔ باب کے آخر میں وہ اپنی کتاب "شاعرانہ خیالات" کا دیباچہ اور اس کے بعد کئی انگریزی نظموں کے نثری ترجمے نقل کرتے ہیں۔ اس باب کے موضوع پر اعتراض نہیں، لیکن یہ تاریخِ ادب میں نہیں آنا چاہیے تھا۔

Scanned by CamScanner

اگلی مختصر فصل کا عنوان "تعینِ ادوار" ہے۔ وہ ادوار میں آزاد کی تقلید کرتے ہیں لیکن آزاد کے برخلاف ان کے سنین بھی متعین کرتے ہیں، نیز جدید شعرا کے لیے مزید دو دور قائم کرتے ہیں۔ تفصیل یوں ہے:

پہلا دور: ۱۷۰۰ء (ولی کے سفرِ دہلی) سے ۱۷۳۹ء (حملۂ نادری) تک۔

دوسرا دور: ۱۷۳۹ء سے ۱۷۶۱ء (تیسری جنگ پانی پت) تک۔

تیسرا دور: ۱۷۶۱ء سے ۱۸۰۰ء (فورٹ ولیم کالج کے آغاز) تک۔

چوتھا دور: ۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۰ء تک۔ (جب اس دور کے شاعروں کا شباب ختم ہو گیا۔)

پانچواں دور: ۱۸۳۰ء سے ۱۸۷۰ء تک۔ (غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں۔)

چھٹا دور: ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ء تک۔ (اکثر نامی گرامی شاعروں کا انتقال ہو چکا تھا۔)

ساتواں دور: ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۰ء تک۔

آٹھواں دور: ۱۹۴۱ء سے بعد تک۔

ادوار کے ساتھ صحیح صحیح سنہ لکھنے سے یہ خرابی ہوتی ہے کہ اگر کچھ مشاہیر کی شاعری انھیں سنین میں محصور ہوتی ہے تو بعض دوسرے مشاہیر ان ادوار کے ڈانڈے کے دونوں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، مثلاً میر کی شاعری تیسرے دور سے بڑھ کر چوتھے دور میں بھی داخل ہو گئی تھی، اقبال چھٹے اور ساتویں دونوں ادوار میں تھے۔ دراصل دور کی تقسیم کسی ایک یا کئی شاعروں کی زندگی کے مطابق نہیں، بلکہ رجحانات کے عروج و زوال کے ساتھ کی جانی چاہیے۔

انھوں نے ہر دور کی ابتدا میں "آبِ حیات" جیسی محفل جمائی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسی کی طرف معنی خیز اشارہ کیا، نثار احمد فاروقی نے اس کی مذمت کی۔ انھوں نے آزاد اور تنہا کے بیانات کا موازنہ کر کے آخرالذکر کو اول الذکر کی بھونڈی نقل قرار دیا۔ اگر ۱۹۴۹ء میں شائع ہونے والی تاریخ میں ادوار کی ابتدا ۱۸۸۰ء کے انداز میں ہو تو اسے کیا کہیں۔ ملاحظہ ہو:

> بزمِ سخن کے دل دادو! آج کی محفل وہ محفل ہے کہ اب تک اس سرزمین پر قائم نہیں ہوئی تھی۔
>
> (دورِ سوم، ص ۱۵۴)

> اس دور میں ایسے بزرگ تشریف لا رہے ہیں جن کی سیف زبانی نے متانت کے پرزے پرزے کاٹ ڈالے۔
>
> (دورِ چہارم، ص ۲۷۱)

Scanned by CamScanner

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم حال سے اٹھ کر انیسویں صدی کے پارسی تھیٹر کی اسٹیج کے سامنے بیٹھ گئے ہیں۔ زیرِ نظر فصل میں لکھتے ہیں:

ولی کے ساتھ سراج نے دکن میں اور آبرو، مضمون، ناجی اور احسن و یکرنگ نے دہلی میں اپنی اپنی محفلِ سخن جمائی۔

(ص ۷۱)

اوّل تو یہ سب شاعر ولی کے بعد کے ہیں، پھر دہلوی شعرا میں حاتم کا ذکر نہ کرنا تعجب خیز ہے۔ تنہا جی نے محفل کی تمثیل کو آگے بڑھا کر نئی سڑک میں بدل دیا ہے لیکن یہ سڑک عجیب طرح کے چکر لگاتی ہے۔

یہ دہلی کی سڑک پہلے لکھنؤ اور پھر عظیم آباد و مرشد آباد پہنچی۔ وہاں سے رام پور اور رام پور سے حیدر آباد دکن گئی۔

(ص ۷۲)

دلّی سے حیدر آباد جانے کے لیے پہلے مرشد آباد جانا، پھر رام پور واپس آنا اور پھر حیدر آباد جانا ناک پکڑنے کے لیے ہاتھ کو سر کے گرد چکر دینے کے برابر ہے۔ ہر دور کے شعرا کو دو طبقوں یعنی درجوں میں تقسیم کیا ہے، اوّل معیار کے شعرا کو طبقۂ اوّل کے تحت اور ان سے کم رتبہ شعرا کو طبقۂ دوم کے تحت رکھا ہے۔

طبقۂ اوّل کی شروعات ولی سے ہوتی ہے۔ اس میں بغیر کسی بحث یا اظہارِ ماخذ کے بڑے وثوق سے لکھتے ہیں:

آپ بمقام اورنگ آباد دکن ۱۰۷۹ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵۵ھ میں بمقام احمد آباد (گجرات) فوت ہوئے۔

(ص ۷۵)

کاش تاریخِ ادبِ اردو کے قارئین کو بھی یہ دولتِ یقین ملی ہوتی۔ تنہا نے اس سے پہلے ص ۴۳ پر ولی کا سنہِ ولادت ۱۰۸۰ھ لکھا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں ان کے مذکورہ سنینِ ولادت و وفات دونوں کو غلط قرار دیا ہے۔ نثار صاحب نے سنہِ ولادت کی غلطی کا یہ ثبوت بہم پہنچایا کہ ولی کے ہم جد سید عبدالملک نے "ملفوظِ کبیری" (تالیف ۱۰۴۵ھ تا ۱۰۶۰ھ میں شریف محمد (ولی کے والد) کی اولادوں میں ان کا نام میاں ولی اللہ بھی درج کیا ہے، یعنی ولی اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے ("دید و دریافت"، ص ۱۹۰)۔ جمیل جالبی نے اطلاع دی ہے کہ وجدی نے اپنی مثنوی "مخزنِ عشق" (۱۱۴۴ھ) میں ولی کو مرحوم شعرا کی فہرست میں شامل کیا ہے (جلد ۱، ص ۵۳۸)۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں دیوانِ ولی کے ایک

Scanned by CamScanner

قلمی نسخے مکتوبہ ۱۴ محرم سنہ ۸ از جلوسِ محمد شاہ میں ولی کو سیّد ولی محمد مرحوم لکھا ہے (جلد ۱، ص ۵۳۳)۔ ۸ محمد شاہی برابر ہے ۱۱۳۸ھ کے۔ اس کے معنی ہیں کہ ولی کا سنہ وفات ۱۱۵۵ھ قرار دینا بالکل غلط ہے۔

تنہا نے حاتم کے دیوان زادہ سے ۱۱۴۱ھ کی ایک غزل کا مقطع درج کیا ہے:

اے ولی مجھ سے اب آزردہ نہ ہونا کہ مجھے

یہ غزل کہنے کو نواب نے فرمائی ہے

اس سے اخذ کیا ہے کہ ولی اس وقت زندہ تھے اور حاتم نے ان سے خطاب کیا ہے۔ پھر حاشیے میں لکھتے ہیں:

> رسالہ "اردو" کے اڈیٹر نے ۱۱۱۹ھ کو وفات ولی کا سنہ قرار دیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ "زمانہ" کان پور ۱۹۳۴ء میں ہم ان کے خیال کی کافی تردید کر چکے ہیں۔ (ص ۱۰۴)

مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں حاتم کے شعر کو شاعرانہ انداز بیان قرار دیا ہے، اور پھر "باد پناہ ولی ساقیِ کوثر علی" والے قطعے کا اعادہ کرتے ہیں۔ اب کی بار مولوی صاحب نے ولی کے برادرِ نسبتی شیخ فرید صدیقی کا نکالا ہوا ایک مادۂ تاریخ "سن اعیین بدر، خفی" بھی درج کیا ہے جس سے ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتا ہے ("اردو"، ص ۴۳-۱۴۲)۔

اس مادّے میں بدر کو بدراً لکھیں تبھی ۱۱۱۸ھ برآمد ہوگا۔ تنہا نے "مرأۃ الشعرا" جلد دوم کے دیباچے میں مولوی عبدالحق کی دلیلوں کا یوں جواب دیا:

۱۔ قطعے میں سرِ الہام کے تعمیے سے صرف الف کا اضافہ مراد نہیں، بلکہ "الہا" کا تعمیہ مطلوب ہے جس کے ۳۷ عدد ہوتے ہیں۔ انھیں جوڑنے سے ۱۱۵۵ھ ملتا ہے۔ تبصرہ نگار کے مطابق یہ قطعہ عہدِ محمد شاہ کے احمد آباد کے مفتی محمد احسن کا لکھا ہوا ہے۔ محمد شاہ کے زمانے کا مفتی اتنی مدت کے بعد کیوں ولی کا قطعۂ وفات کہتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ولی کا انتقال عہدِ محمد شاہ میں ہوا۔

۲۔ "سن اعیین بدراً خفی" سے جو ۱۱۱۸ھ نکالا ہے، وہ عالم گیر کی تاریخِ وفات معلوم ہوتی ہے کیونکہ "بدر" کا لفظ ولی کی نسبت عالم گیر کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

۳۔ حاتم کے شعر کو شاعرانہ اندازِ بیان نہیں کہہ سکتے۔ (جلد دوم، ص ۷-۶)

نثار احمد فاروقی نے اپنے تبصرے میں اس موضوع پر ص ۱۸۳ سے ۱۹۰ تک بحث کی، جس میں مولوی صاحب کے موقف کی تائید کی۔ مولوی صاحب تنہا کا رسالہ "زمانہ" والا

Scanned by CamScanner

مضمون نہیں دیکھ سکے تھے۔ فاروقی نے یہ مضمون "ولی کے سالِ وفات کی تحقیق" "زمانہ" اپریل ۱۹۳۴ء میں دیکھا۔ اس میں تین نکات ہیں:

۱۔ "ولی نے دہ مجلس کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے اور یہ ۱۱۴۱ھ میں تالیف ہوئی۔" نثار صاحب کا جواب ہے کہ دہ مجلس ولی ویلوری کی تصنیف ہے، ولی اورنگ آبادی یا گجراتی کی نہیں۔

۲۔ "یہ تاریخ ولی رام ولی کی ہو سکتی ہے۔" نثار صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ کون مفتی احسن احمد آباد میں بیٹھ کر ایک پنجابی شاعر کی تاریخِ وفات نظم کرے گا اور ایک ہندو کے لیے ع:

باد پناہِ ولی ساقیِ کوثر علی

کہے گا۔ مزید لطیفہ یہ کہ ولی رام ۱۰۷۰ھ کے قریب مرچکا تھا۔

۳۔ "مفتی احسن کو ولی کے سالِ وفات کی تحقیق کا موقع نہ تھا۔ انھوں نے ایسے ہی تاریخ لکھ ماری۔"

اس کے بعد نثار صاحب نے تفصیل سے لکھا کہ ولی کا ۱۱۵۵ھ تک زندہ رہنا ثابت نہیں ہوتا۔ ("دید و دریافت"، ص ۱۸۵)

تنہا نے ولی کے رسالے "نور المعرفت" کو فنِ سلوک کی کتاب ظاہر کیا (جلد ۱، ص ۵۷)۔ مولوی صاحب نے تصحیح کی کہ یہ فارسی کتاب سلوک میں نہیں، بلکہ مولانا نور الدین کی مسجد اور مدرسے کے بارے میں ہے ("اردو"، ص ۱۴۳)۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس رسالے کا ولی سے انتساب مستحق نہیں۔ وہ حوالہ مل نہیں رہا۔ ہر شاعر کے تبصرے میں تنہا اس کی لسانی اغلاط کی ضرور نشان دہی کرتے ہیں مثلاً ولی کا شعر ہے:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

یہاں دو اردو فقروں کے بیچ واو عطف لانا درست نہیں، "اور" آنا چاہیے۔ ولی کے بے حد رکیک شعروں میں یہ بھی تلاش کیا:

میں نے چھنگی ایہرنی کی ملی
مجھ کو اس نے نہ کچھ ملائی دی

اب میں قدرے اختصار سے کام لیتا ہوں۔ اختلافِ سنین اس جلد کے جائزے کے آخر میں یک جا لوں گا۔

Scanned by CamScanner

ولی کے بعد سراج کا ذکر ہے۔ اس کی مثنوی "بوستانِ خیال" کے اشعار کی تعداد ۱۰۰۷ لکھی ہے اور سنہ تکمیل ۱۱۷۳ھ (ص ۸۳)، حالانکہ شاعر نے مثنوی کے آخر میں لفظوں میں اس کی تاریخ ۱۱۶۰ھ لکھی ہے، نیز "بوستانِ خیال" تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۶۰ھ حاصل ہوتا ہے اور اتنی ہی اس کے اشعار کی تعداد ہے ("بوستانِ خیال"، مرتبہ سروری، حیدر آباد، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۲)۔

شمالی ہند کے شعرا میں انھوں نے آبرو، مضمون، ناجی، احسن و یکرنگ کو دورِ اوّل ۱۷۰۰ء تا ۱۷۳۹ء میں رکھا ہے اور حاتم و آرزو کو دورِ دوم (۱۷۳۹-۶۱ء) میں، حالانکہ یہ سب ہم عصر تھے۔ آرزو کو آبرو کا استاد بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل پہلے اور دوسرے دور کی تقسیم مصنوعی ہے۔ حیرت ہے کہ آبرو کے تبصرے میں اس کے امرد پرستی کے بے جھجک اشعار کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حاتم کے احوال میں مصحفی کے یہاں سے چار سطروں کی ایک فارسی نثر نقل کی ہے۔ نثار احمد فاروقی نے نشان دہی کی کہ اس عبارت کی پونے تین سطریں تذکرۂ "عقدِ ثریا" سے ماخوذ ہیں اور ان کے آگے کی سطر مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" سے ("دید و دریافت"، ص ۱۹۴)۔ دو کتابوں کے اقتباسات کو یوں جوڑ دینا عجیب بات ہے۔ نقل میں متعدد اغلاط بھی ہیں۔ آرزو کے ذکر میں ان کی تصانیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> لغت اردو موسوم بہ "غرائب اللغات" جو اصطلاحاتِ صوفیہ کی ایک لغت مسمیٰ بہ "نوادرالالفاظ" کی شرح ہے۔ (ص ۱۱۳)

مولوی عبدالحق نے یوں تصحیح کی:

> "نوادرالالفاظ" مشہور عالم عبدالواسع ہانسوی کی کتاب اصطلاحاتِ صوفیہ نہیں، بلکہ عام الفاظ کی لغت ہے۔ آرزو نے اس کے الفاظ کی شرح اور تصحیح کی ہے اور مناسب اضافہ کیا ہے۔
>
> ("اردو"، ص ۱۴۳)

تنہا نے "نوادرالالفاظ" کو مقدم کتاب سمجھا اور "غرائب اللغات" کو مؤخر۔ حیرت ہے کہ مولوی عبدالحق بھی "نوادرالالفاظ" کو ہانسوی کی کتاب سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہانسوی کی کتاب کا نام "غرائب اللغات" ہے۔ آرزو نے اس میں اضافہ و تصحیح کر کے "نوادرالالفاظ" نام رکھا۔ اسے "تصحیح غرائب اللغات" بھی کہہ دیتے ہیں۔

مظہر جانِ جاناں کے حالات "آبِ حیات" سے نقل کیے ہیں۔ ان میں جو کچھ اصلاح طلب ہے وہ "آبِ حیات" کے تبصرے میں دیکھا جا سکتا ہے، اعادے کی ضرورت نہیں۔

Scanned by CamScanner

یقین کی جو بہتوں نے خوب تعریف کی ہے، اس سے ناراض ہو کر اس کے کلام پر بہت سے اعتراضات کرتے ہیں۔ تاباں کے ذکر میں تنہا ایک بار پھر مولوی عبدالحق سے معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ آزاد نے لکھا تھا کہ تاباں شاہ حاتم اور محمد علی حشمت دونوں کے شاگرد تھے۔ مولوی صاحب نے مقدمۂ دیوانِ تاباں میں صرف حشمت کو ان کا استاد قرار دیا۔ تاباں نے دو اشعار میں حاتم کو اپنا استاد کہا تھا۔ مولوی صاحب کا خیال ہے کہ یہاں حاتم کی جگہ حشمت ہونا چاہیے۔ اس پر تنہا مولوی صاحب کا نام نہ لے کر دیوانِ تاباں کے مقدمہ نگار پر یوں برستے ہیں:

> واقعی بعض ہاتھوں میں قلمی نسخے پہنچ جانا بھی تحقیق کو کند چھری سے ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔ (ص ۱۳۵)

پھر وہ دیوانِ حاتم سے دو اشعار نقل کرتے ہیں جن میں حاتم نے تاباں کو اپنا شاگرد کہا ہے۔ اس مباحثے میں تنہا کا موقف صحیح ہے۔

دلوؔد کے لیے لکھتے ہیں:

> میر تقی میر نے "نکات الشعرا" میں ان کو "شاگردِ سید..." لکھا ہے۔ معلوم نہیں سید سے میر صاحب کی کیا مراد ہے۔
>
> (ص ۱۴۰)

واقعی میر نے ان کے استاد کا نام محض سید صاحب لکھا ہے۔ میرے سامنے "مرآۃ الشعرا" کا جو عکسی نسخہ ہے اس میں کسی نے قلم سے "سید" کے اوپر "عبدالولی عزلت" لکھا ہے۔ ظاہراً یہ اضافہ مولوی عبدالحق کے قلم سے ہوا ہوگا۔ گردیزی نے اپنے تذکرے میں داؤد کو عبدالولی عزلت ہی کا شاگرد لکھا ہے۔ داؤد کا سنہ وفات ۱۱۶۸ھ لکھنے کے بعد اس کی تائید میں شفیق کا جو قطعۂ تاریخ لکھا ہے اس میں تاریخ کا مصرع یوں چھپا ہے ع:

گو برفتہ میرزا داؤد خانی از جہاں

جب کہ شفیق کے تذکرے میں ہے:

گو برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں

(ص ۸۸)

اور اس سے واقعی ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ بڑی دقت یہ ہے کہ شفیق نے لفظوں میں "در سنہ سبع و خمسین وماتہ والف" لکھا ہے جس کی بنا پر مالک رام نے ۱۱۵۷ھ لکھا ہے۔ یہ عقدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی اور تذکرے میں داؤد کا سنہ وفات نظر نہیں آیا۔ بیان کے لیے لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

خطۂ کشمیر کے رہنے والے تھے۔

(ص ۱۴۴)

یہ صحیح نہیں۔ حالی کے مطابق بیان اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور دہلی میں تربیت پائی (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۴۰۸)۔ آگے ص ۱۴۶ پر خود ہی تذکرۂ میر حسن سے اکبر آباد و دہلی کی بات کہتے ہیں۔

دورِ سوم میں درد کے لیے لکھتے ہیں کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار میں ایک ہزار اشعار نہایت قابلِ تعریف ہیں (ص ۱۶۲)۔ سودا پر لکھتے ہوئے یہ نکتہ خوب پیدا کیا ہے کہ یہ غلط ہے کہ شاہ عالم سودا سے مشورۂ سخن کرتے تھے کیونکہ شاہ عالم سودا کے دہلی چھوڑنے کے بعد تخت نشیں ہوئے (ص ۱۶۶)۔ کلامِ سودا کی تنقید میں قصیدہ "تضحیکِ روزگار" کے مبالغہ آمیز متضاد بیانات کی طرف خوب اشارہ کیا ہے (ص ۶۹-۱۶۸)۔ ان کی مثنوی "زرگر پسر و شیشہ گر" کی امرد پرستی سے بہت ناخوش ہیں۔ کہتے ہیں اسی قسم کی باتوں نے تو ہماری شاعری کو بدنام کیا ہے (ص ۱۷۰)۔ سودا کی ہجوں کے لیے کہتے ہیں:

> ان کی ہجو سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے کی سوسائٹی کس قدر ناشائستہ اور نامہذب تھی جو اس قسم کے اشعار پسند کرتی تھی ... اگر اس وقت قانون کا لگام ایسے منہ زور شاعروں کے دہن میں پڑا ہوتا تو غالباً یہ نوبت نہ آتی۔

(ص ۷۱-۱۷۰)

وکیل تنہا ازخود حیثیتِ عرفی کی دفعات کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔
میر و سودا کا موازنہ اور سودا کے کلام پر تنقید اچھی ہے، بالخصوص سودا کی زبان پر۔ لکھتے ہیں ع:

کہنے لگا کہ یارو رکھیو دھیان مارا

"مارا" بجائے "ہمارا" استعمال کیا ہے۔ یہ مشذ آباد کی زبان ہے، نہ کہ دہلی کی ع:

اٹھے یہ دل جلے نہ ہوئے ایک دم کہیں

مشذ آباد کی زبان میں تو الف کو حذف کر دیتے ہیں اور "کٹھے" پڑھنے سے مصرع ضرور موزوں ہو جائے گا (ص ۷۹-۱۷۸)۔

یہ مشذ آباد کیا ہے۔ غالباً ان کی مراد پنجاب سے ہے۔ ان کے اعتراضات درست ہیں، لیکن انھوں نے شعروں کے ماخذ درج نہیں کیے، کہ کتاب میں دیکھ کر اطمینان کر لیا جاتا۔ ہو سکتا ہے ان میں سہوِ کتابت یا سہوِ قرأت واقع ہوا ہو۔

Scanned by CamScanner

میر کی تنقید اور جسارت سے کی ہے۔ پہلے تو کہتے ہیں:

مسلمہ طور پر آپ اردو کے غزل گو شعرا میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ (ص ۱۹۴)

لیکن پھر یہ کہتے ہیں:

میر صاحب کا کلیات پڑھنے سے جہاں ان کی عظمت اور زیادہ ہو جاتی ہے، وہاں روزِ روشن کی طرح یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کس قدر پوچ گو بھی تھا۔ بعض غزلیں ایسی بھی ہیں کہ جن میں ایک شعر بھی شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ (ص ۱۹۵)

بہت ہی کم غزلیں ایسی ہیں جن میں دو یا تین اچھے شعر نکل آتے ہیں ... میرے اندازے میں میر صاحب کی غزلوں کے اشعار تقریباً چودہ ہزار ہوں گے۔ ان میں سے صرف ایک ہزار اچھے شعر ہیں اور ایک ہزار معمولی۔ باقی بارہ ہزار اشعار صرف اس وجہ سے کہ میر صاحب کا کلام ہے، میر صاحب کا تبرک سمجھنا چاہیے۔

(ص ۱۹۶)

"... تاب میں، ... خواب میں" کی مشہور زمین میں میر کی غزل کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان سے ایک شعر بھی اس طرح میں نہ نکل سکا ... بہرحال ساری غزل ایسی ہے کہ آج کل کے معمولی غزل گو اس سے بہت بہتر اشعار کہہ سکتے ہیں (ص ۹۸-۱۹۷)۔ لیکن تنہا میر کی ایک خوبی کے معترف ہیں کہ وہ بعض جگہ ایک ہی مناسب لفظ سے درد پیدا کر دیتے ہیں (ص ۱۹۸)۔ آگے لفظی گرفتوں کے بعد لکھتے ہیں:

میر صاحب پُرگو تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہر سات اشعار میں صرف ایک شعر کام کا نکلتا ہے۔ باقی چھ شعر بھرتی کے ہوتے ہیں ... ان کے قصیدے بہت پھیکے ہیں اور وہ قصیدہ لکھنا جانتے ہی نہ تھے۔

(ص ۲۰۶)

لیکن آخر میں اس طرح داد دیتے ہیں:

میرے خیال میں کم از کم تین سو اشعار ایسے ہیں جن کا اردو غزلوں میں جواب نہیں۔ اور یہ تین سو اشعار تین سو دواوین کے برابر ہیں۔

(ص ۲۰۷)

مولوی عبدالحق نے "مِرآۃ الشعرا" کے تبصرے میں اعتراض کیا تھا کہ:

Scanned by CamScanner

اثر کے تذکرے میں ان کی مثنوی کا ذکر تک نہیں کیا، حالانکہ اردو زبان میں ان کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی غزلوں کا مختصر دیوان ان کی مثنوی کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

("اردو"، ص ۱۳۸)

تنہا دوسری جلد کے دیباچے میں جواب دیتے ہیں کہ انھوں نے جلد اول کے ص ۲۲۲ پر اس مثنوی کا ذکر بھی کیا اور چند شعر نمونتاً بھی دیے (جلد ۲، ص ۵)، لیکن اس سے بات نہیں بنتی ... یہاں مثنوی کے تین شعر صرف یہ جتانے کے لیے دیے ہیں کہ میر درد نے ان کی پرورش کی۔ تنہا نے مثنوی پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

میر سوز کے لیے لکھتے ہیں:

آپ کا دیوان بہت مختصر ہے۔ تقریباً سات سو اشعار ہوں گے۔

(ص ۲۳۱)

یہ صحیح نہیں۔ کلیات سوز کافی ضخیم ہے۔ ان کے کلام پر تبصرے میں کہتے ہیں:

آپ کے دیوان میں تخیل کی بلندی کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

(ص ۲۳۱)

رنگین کو یوں نوازتے ہیں:

ان کی سخن گوئی کا درجہ بہت اونچا نہیں ہے۔ درجۂ دوم کے شعرا میں بھی وہ کسی اعلیٰ درجہ کے نہیں ہیں، بلکہ متوسط الحال ہیں۔

(ص ۲۵۶)

حیرت ہے کہ میر حسن کی صرف غزل گوئی کو پرکھا ہے، ان کی مثنویوں کا جائزہ نہیں لیا۔ "سحرالبیان" کا تو نام بھی نہیں لیا۔ کیا تنہا نے یہ کتاب صرف غزل گوئی کے جائزے کے لیے لکھی ہے۔ یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ رنگین کو دورِ سوم میں اور انشا کو دورِ چہارم میں رکھا، حالانکہ رنگین کا عہدِ حیات ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء تا ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء ہے اور انشا کا ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء تا ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء۔ یعنی انشا کی ولادت و وفات دونوں رنگین سے پہلے ہوئیں۔ انشا کے سلسلے میں "آبِ حیات" کی نقل میں لکھ دیا ہے کہ وہ علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے سعادت علی خاں کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔ یہ صحیح نہیں، لیکن تنہا نے "آبِ حیات" کی یہ اہم تصحیح کی ہے کہ انشا کی مشاعرے کی آخری غزل "... یار بیٹھے ہیں" مصحفی کے تذکرۂ ہندی (تکمیل ۱۲۰۹ھ) میں موجود ہے (حاشیہ ص ۲۹۰-۹۱)

مبلغِ اخلاقیات تنہا انشا سے بہت ناراض ہیں۔ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

آپ کا کلام تمام کا تمام، جو غزلیات کے نام سے درج ہے، رکاکت اور سخافت کے آخری درجے پر ہے اور اگر اس کو ہم دیوانِ ہزلیات کہیں تو اس میں ہرگز مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے ... آپ کے خیالات عشقِ مجازی کیا معنی، بلکہ بوالہوسی کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں ... تخیل جو شاعری کی جان ہے وہ آپ کے یہاں بالکل مفقود ہے ... کوئی شاعر آج تک ایسا نہیں گزرا جس کا سنجیدہ کلام اس قدر سبک، اس قدر رکیک اور اس قدر لغو ہو۔

(ص ۹۲-۲۹۰)

ان کی ایک مسلسل غزل کو سراہ کر اردو میں مسلسل غزلیں لکھنے کی وکالت کرتے ہیں (ص ۲۹۸)۔ نثار احمد فاروقی نے مصحفی کے بیان کی بہت سی جزئیات کو غلط ٹھہرایا ہے، مثلاً یہ کہنا کہ انھوں نے دلی آنے پر اہلِ کمال کے مجمع میں شعر گوئی شروع کر دی (ص ۳۰۲)۔ نثار صاحب نے "عقدِ ثریا" میں محتشم کا حال اور تذکرہ ہندی میں عبدالرسول نثار کے حالات کے اقتباس دیے، جن میں مصحفی نے امروہے میں اپنی شاعری کی ابتدا کا ذکر کیا ہے ("دید و دریافت"، ص ۹۷-۱۹۶)

مصحفی کی تصنیف سے صرف دو تذکرے لکھتے ہیں (ص ۳۰۳)۔ دراصل انھوں نے تین تذکرے لکھے۔ مزید لکھتے ہیں کہ آزاد نے "سراپا سخن" کے حوالے سے لکھا ہے کہ مصحفی امانی کے شاگرد تھے۔ امانی کون بزرگ وار ہیں، پتا نہیں چلتا۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ "سراپا سخن" دیکھنے کی زحمت کرتے تو معلوم ہوجاتا کہ یہ امانی نہیں، مانی ہیں ("دید و دریافت"، ص ۱۹۹)۔ مصحفی کی شاعری پر یہ دلچسپ تبصرہ کرتے ہیں:

> مصحفی نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی۔ پرانی لکیر کے فقیر بنے رہے۔ جو بزرگوں سے ملا تھا اس میں اضافہ نہیں کیا ... مصحفی نے صرف تقلید سے کام لیا، انشا نے بے راہ روی سے اور جرأت نے عامیانہ پن سے۔

(ص ۳۰۴)

نظیر اکبر آبادی کے رکیک اور فحش کلام کو ابتدائی زمانے کا کہہ کر در گزر کرتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر نظیر کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> نظیر کو ہماری نیچرل شاعری کا موجد سمجھنا چاہیے۔

(ص ۳۱۶)

Scanned by CamScanner

لیکن افسوس ہے کہ اس کی غزلوں ہی کا انتخاب دیا، نظموں کا بالکل نہیں، نظموں کے محض نام لکھنے پر قناعت کی۔ غزل گوئی میں نظیر کی کوئی اہمیت نہیں۔ غزلوں کے انتخاب میں یہ شعر دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ نظیر کا ہے۔

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد

وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا

شاہ نصیر پر لکھتے ہوئے سنگلاخ زمینوں کے بارے میں یہ معرکے کی رائے دیتے ہیں:

> یہ کوئی تعریف کی بات نہیں کہ ایک شاعر سنگلاخ زمینوں میں کسی نہ کسی طرح قافیوں کو بٹھا دے اور جب مروّجہ زمینوں میں قدم رکھے تو وہ کوئی بات شعر میں نہ پیدا کر سکے۔ (ص ۳۳۲)

جوشش عظیم آبادی کے لیے لکھتے ہیں:

> دیوان بھی بہ مشکل دستیاب ہو سکتا ہے۔ صرف شوق نیموی نے کتب خانے میں موجود ہے جس کو ان کے والدِ مرحوم نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ (ص ۳۴۷)

مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں گرفت کی ہے:

> بعض شعرا کے دیوان نہیں ملے۔ اس لیے دوسروں نے تذکروں میں جو کچھ لکھا ہے، اسے نقل کر دیا ہے۔ مثلاً محب، ممنون، فغاں، ناجی کے دیوان ایسے نایاب نہیں ہیں کہ نہ ملیں۔ جستجو کرنے سے مل سکتے تھے۔ جوشش کے دیوان کے متعلق بھی یہی لکھا ہے کہ دستیاب نہ ہوا، حالانکہ کئی سال ہوئے انجمنِ ترقیِ اردو شائع کر چکی ہے۔ ("اردو"، ص ۳۸-۱۳۷)

جوشش کے نام محمد روشن اور روشن علی کے بیچ لڑکھڑاتے ہیں اور روشن علی کو ترجیح دیتے ہیں (ص ۳۴۸)، حالانکہ صحیح محمد روشن ہی ہے۔

دورِ سوم کی ابتدا میں ص ۳۵۴ پر ناسخ کو دبستانِ لکھنؤ کا بانی قرار دیتے ہیں۔ ان کے لیے دو ٹوک لکھتے ہیں:

> ناسخ کا کلام بے نمک ہے اور اس میں شیرینی بھی نہیں جو بے نمکی کا تدارک کر سکے۔ تمام غزلیں پھیکی ہیں، مشکل سے ایک آدھ شعر کہیں کہیں بامزہ نکل جاتا ہے۔ (ص ۳۵۸)

Scanned by CamScanner

ماننا پڑے گا کہ آپ صرف ناظم تھے، شاعر نہ تھے۔

(ص ۳۵۹)

مزید لکھتے ہیں:

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں آپ کو بہترین شاعر کہہ دینا دلیل اس امر کی ہے کہ یہ رائے ظاہر کرنے والا اردو شاعری سے قطعاً نابلد ہے۔

(ص ۳۶۴)

معلوم نہیں انسائیکلوپیڈیا میں یہ کہاں لکھا ہے اور کس نے لکھا ہے۔

تنہا رکیک شعروں کے بہت خلاف ہیں۔ آتش کے رکیک اشعار لکھ کر تدوینِ کلام کے سلسلے میں ایک انوکھا مشورہ دیتے ہیں۔

ہماری یہ رائے ہے کہ اردو شاعروں کے دیوان آئندہ ترتیب کے وقت اس قسم کے اشعار سے پاک کر دیے جائیں۔

(ص ۳۸۰)

اس طرح کا متن نامکمل اور ناقص ہوگا۔ آتش کے لیے لکھتے ہیں:

ہمارے اندازے میں آتش کے دونوں دیوانوں میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار ہیں ... افسوس زیادہ تعداد ایسی ہے جو علاوہ معمولی اشعار ہونے کے بھرتی کے اشعار کہے جانے کے مستحق ہیں ... بجائے اس کے، ساڑھے آٹھ ہزار اشعار چھپوائے گئے، صرف دو ہزار اشعار یا اس سے بھی کم طبع کرائے جاتے تو پڑھنے والوں کو کیف بھی حاصل ہوتا اور آتش کی عظمت اور بڑھ جاتی۔

(ص ۳۸۳)

مومن کے لیے کہتے ہیں:

حکیم مومن خاں نے تمام زورِ تخیل صرف مجازی، بلکہ بازاری عشق پر صرف کر دیا ہے۔

(ص ۳۹۵)

ان کی مثنویوں کے لیے کہتے ہیں:

مثنویات عشقیہ ہیں اور دردانگیز ہونے کی وجہ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

(ص ۴۰۰)

حیرت ہے کہ تنہا کو مثنویوں کے مجازی، بلکہ عریاں بیانوں پر اعتراض نہ ہوا۔ ذوق

Scanned by CamScanner

کے حالات ظاہرا "آبِ حیات" سے لیے ہیں اس لیے اس کی تمام اغلاط در آئی ہیں۔ ان کی نشان دہی تفصیل حاصل ہوگی، "آبِ حیات" کے تبصرے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کلامِ ذوق کی تنقید صرف غزلوں تک محدود ہے، قصیدے کا نام بھی نہیں لیا۔ یہ کیسا نقاد ہے جو میر حسن کی مثنوی، نظیر اکبر آبادی کی نظموں اور ذوق کے قصیدوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، ان سب کو محض غزل گو کے طور پر آنکتا ہے، حالانکہ وہ صنفِ غزل کو بالکل ناکارہ سمجھنے کا مدعی ہے۔

غالب سے انھیں ذاتی طور پر عشق ہے۔ کہتے ہیں:

> "الف" سے "ی" تک تمام دیوان میں سے اگر بہتر شعر نکال دیے جائیں تو باقی تمام اشعار لاجواب نظر آئیں گے (نسخۂ حمیدیہ کا ذکر نہیں۔)
>
> (ص ۲۲۷)

ابھی تک ۷۲ کی تعداد خوبی کی دلیل تھی، اب خرابی کی نشاں گر بھی ہو گئی۔ یہ جس طرح شاعروں کی خردہ گیری میں انتہا سے کام لیتے ہیں اسی طرح غالب کو سراہنے میں بھی غیر معتدل ہیں۔ غالب کے دیوان میں ناہموار اشعار کی تعداد ۷۲ سے کہیں زیادہ ہے۔

اس کے آگے وہ مرثیہ گوئی کا موضوع لیتے ہیں۔ نئے موضوع کو صفحے کے درمیان سے شروع کرنا مستحسن نہیں، یہ ناشر کی جزرسی ظاہر کرتا ہے۔ تنہا نے اس فصل میں بہت کچھ شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" سے لیا ہے۔ شروع میں فارسی مرثیے اور پھر اردو مرثیے کی تاریخ اچھی ہے۔ ص ۴۳۹ پر یہ جو لکھ گئے ہیں کہ ولی نے کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی، مولوی عبدالحق نے اس کی گرفت کر کے تصحیح کی ہے کہ یہ مثنوی مشہور شاعر ولی نے نہیں، ولی ویلوری نے لکھی۔ مرثیے کے ارتقا کے سلسلے ہی میں مختصراً ضمیر و خلیق کا ذکر کیا ہے۔

مرثیہ نگاروں میں انیس پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ایک مرثیے کے ۳۹ بند نقل کر کے حاشیے میں ان کی مداحی کرتے ہیں۔ اتنی شرح و بسط سے کلام نقل کر دینا شبلی ہی کی تقلید ہے۔ شاذ انھوں نے انیس کے بعض بیانات پر اعتراض بھی کیا ہے۔ مجھے ان کے اس عمومی اعتراض سے پورا اتفاق ہے:

> دوسری شکایت مرثیہ گویوں سے عموماً اور میر صاحب سے خصوصاً یہ ہے کہ انھوں نے وہ تمام رسوم جو ہم ہندوستانیوں میں رائج ہیں یا وہ تمام طریقے جن پر ہم عامل ہیں، اہل بیت سے منسوب کر دیے

ہیں ... میں نہایت ادب کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ شاعر کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی تمام معلومات بہم پہنچائے، جن کے ذریعے سے وہ واقعات کی تصویریں ہوبہو کھینچ سکے۔ ہرگز اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اصل شے کی صورت مسخ کردے۔

(ص ۴۷۶)

دبیر کے بہت خلاف ہیں۔ ہر جگہ ان پر اعتراض کیا ہے۔ انیس سے موازنہ کر کے دبیر کے بیانات کو خلاف بلاغت ٹھہرایا ہے۔ یہ بھی شبلی کے موازنے کی تقلید ہے گو انھوں نے یہ فیصلے "المیزان" کو بھی پڑھنے کے بعد کیے ہیں۔ دبیر کے بے نقط مرثیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ہم کو تو یہ سب بے کیف نظر آتے ہیں۔ شاعری کی تضحیک اگر کی جا سکتی ہے تو اسی قسم کی صنائع و بدائع سے، اور شاعری کو بے لطف بنایا جاسکتا ہے تو اسی تکلف و تصنع سے۔

(ص ۴۸۴)

بہت بجا کہا ہے۔ اس فصل کے آخر میں اپنی جرأت نقد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ دبے الفاظ میں کسی شاعر کی تعریف یا مذمت کی جائے ... ہم نے نہ صرف انیس و دبیر کے متعلق، بلکہ ہر شاعر کے متعلق، جس کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے، بلاخوفِ لومِ لائم اپنی آزاد رائے ظاہر کر دی ہے۔

(ص ۴۸۹)

دورِ پنجم کے دوسرے درجے کے شعرا میں مشاہیر کے شاگردوں کو لیا ہے۔ خواجہ وزیر کے لیے بڑی صاف گوئی سے لکھتے ہیں:

> ان کا دیوان پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ شاعری سے تو کوسوں دور ہیں لیکن اس کی نقالی کے لیے مجبور ہیں۔ ارادہ یہ تھا کہ اس قسم کے شاعروں کو اپنی کتاب میں جگہ نہ دوں، لیکن اس خیال سے کہ "تعریف الاشیا باضدادہا"، صرف وزیر کو شاگردانِ ناسخ میں سے منتخب کر لیا ہے اور باقی شاگردوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔
>
> وزیر کی جس غزل کو دیکھو قافیہ بندی کے سوا اس میں کچھ نہیں۔

(ص ۴۹۱)

صبا کے لیے لکھتے ہیں کہ کئی بار وہ شعر کا ایک مصرع اچھا کہتے ہیں لیکن اس پر دوسرا

Scanned by CamScanner

مصرع کمزور لگاتے ہیں (ص ۵۰۵)۔ اس منہ پھٹ نقاد کا یہ جملہ پڑھ کر بہت مزا آیا:
جنابِ رند کو رکیک اشعار کہنے میں بڑا لطف آتا ہے۔

(ص ۵۱۴)

رند کا خاص رنگ عریانی اور بوالہوسی کے سوا اور کچھ نہیں۔

(ص ۵۱۶)

وہ رند کے ایک شعر میں لفظ ہڑتال کی نشان دہی کرتے ہیں جو حیرت انگیز ہے ع:
بند دو کانیں ہیں معشوقوں کی ہڑتال ہے آج

(ص ۵۱۸)

اسیر کا سنہ ولادت یوں لکھتے ہیں:
۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام مظفر ہے۔

(ص ۵۲۲)

اسیر نے ۱۲۹۹ ہجری میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

(ص ۵۲۵)

تاریخی نام مظفر سے ۱۲۲۰ حاصل ہوتا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ عدد لکھ کر اس سے پہلے سنہ ولادت ۱۲۲۹ھ لکھتے ہیں۔ دوسرے جملے میں ۱۲۹۹ سے ۷۰ منہا کیے جائے تو ۱۲۲۹ھ ہی آئے گا۔ گویا یہاں بھی سنہ ولادت ۱۲۲۹ھ دیا ہے، جو غلط ہے۔

تنہا کی برہنہ گوئی ادب سے ہٹ کر حالات میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ معزول ہونے کے بعد واجد علی شاہ کی یوں خبر لیتے ہیں:

یہ بادشاہ اپنے قصور کا الزام دوسروں کے سر رکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہم کو دھوکا دیا گیا... سوال یہ ہے کہ تُو بادشاہ تھا، تیرے دماغ میں بھی کچھ عقل تھی یا نہیں۔ ارکانِ دولت تیری رائے پر عمل کرتے یا تُو اُن کی رائے پر چلنے والا تھا۔ تجھ کو دھوکا کسی نے نہیں دیا، تیری عیش پرستی نے تجھے یہ دن دکھایا۔ تجھے نیک و بد کی تمیز ہی نہ تھی۔

(ص ۵۲۴)

اسیر کے کلام پر یہ رائے دیتے ہیں:

آپ کا کلام پڑھ کر طبیعت خوش نہیں ہوتی... اثر اور جوش سے خالی ہے۔ جو شعر ہے بے کیف اور جو غزل ہے بے لطف ... آپ طباعی اور ذہانت کی داد دے لیجیے مگر شاعری جس کا نام ہے اس کی

Scanned by CamScanner

ہوا بھی اسیر کو نہیں لگی۔ (ص۵۲۵)

آپ کے کلام میں پختگی بھی ہے اور تخیل بھی ... کلام میں دلکشی قلبی نہیں، زیادہ تر خشک ہے۔ (ص۵۲۸)

دیا شنکر نسیم کو صاحب طرز لکھتے ہوئے فیصلہ دیتے ہیں:

"گلزارِ نسیم" کا مصنف واقعی نسیم ہی ہے اور آتش سے اس کو دور کا بھی علاقہ نہیں۔ (ص۵۳۴)

سحرالبیان اور گلزارِ نسیم کا موازنہ کر کے آخرالذکر کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گلزارِ نسیم" میں خوبیاں کم ہیں اور عیوب زیادہ ہیں، لیکن "سحرالبیان" میں محاسنِ کلام زیادہ ہیں اور نقائص اگر ہیں تو بہت کم۔ (ص۵۴۸)

افسوس کہ تنہا نے نسیم کے بھی غزلوں کے منتخب اشعار دیے، مثنوی کے نہیں۔ ممنون کے لیے لکھا ہے کہ یہ سونی پت کے رہنے والے تھے (ص۵۵۲)۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں خود ممنون کی زبانی سونی پت کہلایا ہے ("آبِ حیات" ص۲۱۷)۔ قاضی عبدالودود نے آزاد بحیثیت محقق میں تصحیح کی کہ ممنون دہلوی تھے۔ نثار فاروقی نے بھی مراۃالشعرا کے تبصرے میں ص۱۸۹ پر یہی بات کہی ہے۔ مصنف نسیم دہلوی کے لیے لکھتے ہیں:

معلوم نہیں تغزل کے سوا کچھ اور بھی لکھا ہے یا نہیں۔

(ص۵۵۸)

اور اگلے ہی صفحے پر "گلِ رعنا" کی یہ رائے نقل کرتے ہیں:

خصوصاً مثنوی میں ان کو یدِ بیضا حاصل تھا۔

(ص۵۵۹)

اس قول کے ہوتے اس تذبذب کا کیا مقام تھا کہ غزلوں کے علاوہ کچھ اور کہا ہے یا نہیں۔ میر ٹھ کے غلام مولا عرف مولا بخش قلق شاگردِ مومن کی بہت تعریف کرتے ہیں:

آپ کا کلام پڑھنے سے طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے، ایک کیف آور حالت پیدا ہوتی ہے اور بعض بعض اشعار بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ (ص۵۶۳)

چلیے یہ قاتل کسی کا تو دوست ہوا، وہ اس کا ہم وطن ہی سہی۔ شیفتہ کے سفرنامے کا نام "بره آورد" لکھتے ہیں (ص۵۷۰)۔ نثار احمد فاروقی نے اس فاش غلطی کا پردہ فاش کیا۔ سفر نامۂ حجاز کا پورا نام ہے: "ترغیب السالک الی احسن المسالک معروف به ره آورد۔" فارسی

Scanned by CamScanner

عبارت کو نہ سمجھ کر اس نام کے معنی ہی خبط کر دیے ("دید و دریافت، ص۱۹۹)۔ شیفتہ کی شاعری کے لیے لکھتے ہیں:

> آپ کے دیوان میں بھرتی کے اشعار کم نظر آتے ہیں، تمام کا تمام انتخاب ہے۔ (ص۵۷۴)

شیفتہ کے بعد جلد اول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ خاتمہ وہی آزاد کے انداز میں ہے:

> سنو سنو، یہ کیسی آواز آ رہی ہے۔۔۔
>
> چلو چلو، ان بزرگوں کو عزت و احترام سے لاؤ۔
>
> (ص۵۸۰)

اب اس جلد کے اہم سنین کا، جملہ سنین کا نہیں، جائزہ لیا جاتا ہے۔ صرف وہی سنین درج کروں گا جنھیں دوسرے محققین نے کچھ اور لکھا ہے۔ ذیل کے جدول میں سے تذکروں کے سنین اس باب کے شروع میں بھی دیے جا چکے ہیں۔ جامعیت کی خاطر یہاں مکرر دے رہا ہوں۔

تنہا	دوسرے مؤرخین
ص۶ تذکرہ گردیزی ۱۱۶۵ھ	خاتمۂ تذکرہ کے مطابق ۱۱۶۶ھ
ص۶ میر کا نکات الشعرا ۱۱۷۴ھ	دراصل ۱۱۶۵ھ
ص۶ قائم کا مخزنِ نکات ۱۱۷۸ھ	۱۱۶۸ھ
ص۷ تاریخِ ادبِ ہندوستان (کذا) از دتاسی ۱۲۱۱ھ	دتاسی کی فرنچ تاریخ، "تاریخِ ادبِ ہندوی و ہندوستانی" کی جلد اول ۱۸۳۹ء، جلد دوم ۱۸۴۷ء
ص۷ شاہ کمال کا مجموعۃ الانتخاب ۱۲۱۹ھ	نثار احمد فاروقی ۱۲۱۸ھ (دید و دریافت ص۱۸۰)
ص۷ گلستانِ سخن اندازاً ۱۲۵۰ھ	تاریخی نام جس سے ۱۲۷۱ھ برآمد ہوتا ہے
ص۷ کریم الدین کا تذکرہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء)	خاتمے کے مطابق تکمیل ۱۸۴۷ء۔ طبع ۱۸۴۸ء
ص۷ باطن کا گلستانِ بے خزاں ۱۲۹۱ھ	خاتمۂ تذکرہ کی تاریخوں کے مطابق ۱۲۶۵ھ
ص۷ "آبِ حیات" ۱۸۸۴ء	۱۸۸۰ء
ص۷ خمخانۂ جاوید ۱۳۲۵ھ (۸-۱۹۰۷ء)	جلد اول ۱۹۰۸ء، دوم ۱۹۱۱ء، سوم ۱۹۱۷ء، چہارم ۱۹۲۶ء، پنجم ۱۹۴۰ء

Scanned by CamScanner

ص ۷ اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادبِ اردو ۱۹۴۰ء	مقدمے کے مطابق ۱۹۳۴ء
ص ۱۶ عبدالقدوس گنگوہی ف ۹۴۵ھ	مالک رام: ۲۳ جمادی الثانی ۹۴۴ھ۔ تاریخ "شیخ اجل"
ص ۱۸ شیخ فرید الدین گنج شکر ف ۶۶۴ھ/ ۱۲۳۲ء	ہجری سنہ صحیح ہے۔ یہ مطابق ہے ۶۶-۱۲۶۵ء کے
ص ۱۸ خواجہ (نصیر الدین) چراغ دہلی ف ۷۵۸ھ	مالک رام: ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ
ص ۱۹ خواجہ گیسو دراز ف ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ء عیسوی سنہ سہو کتابت ۱۴۲۱ء کے لیے	مالک رام: ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ/ یکم نومبر ۱۴۲۲ء (تذکرہ ص ۳۴۶)
ص ۱۹ شمس العشاق ف ۹۰۲ھ	گیان چند: ۹۹۴ھ
ص ۲۰ برہان الدین جانم ف ۹۹۰ھ	حسینی شاہد: ۱۰۰۷ھ (شاہ امین ص ۱۱۶)
ص ۲۱ محمد قلی قطب شاہ ف ۱۰۳۵ھ	ڈاکٹر زور: ۱۰۲۰ھ
ص ۲۲ میراں جی حسن خدا نما ف ۱۰۷۰ھ	جالبی: ۱۰۷۴ھ (جلد ۱، حاشیہ ص ۴۹۷)
ص ۲۳ خدا نما کی شرحِ تمہیدِ ہمدانی ۱۰۱۲ھ	جالبی: ۱۰۶۶ھ (جلد ۱، ص ۴۹۹)
ص ۲۳ عبداللہ کی احکام الصلوٰۃ ۱۰۳۲ھ	شمس اللہ قادری: ۱۰۷۷ھ (اردوئے قدیم ص ۸۸)
ص ۲۳ میراں یعقوب کی شمائل الاتقیا ۱۰۷۸ھ	جالبی: ۱۰۸۴ھ (جلد ۱، ص ۵۰۱)
ص ۲۳ ہاشمی ف ۱۰۹۰ھ	شمس اللہ قادری: ۱۱۰۹ھ (اردوئے قدیم ص ۹۱)
ص ۳۰ وجہی کی سب رس ۱۰۴۰ھ کے قریب	خود تنہا: ۱۰۴۵ھ (ص ۲۳)
ص ۴۲ وجدی کی تحفۂ عاشقاں ۱۰۱۵ھ	لطف: ۱۱۵۴ھ (اردو اکتوبر ۴۹ء ص ۱۳۹)
ص ۷۰ شاد عظیم آبادی ف ۱۹۲۶ء	۸ جنوری ۱۹۲۷ء (شاد کی کہانی ص ۲۷۵)
ص ۸۲ سراج پ ۱۱۲۷ھ	سروری: ۱۳ صفر ۱۱۲۴ھ (مقدمۂ بوستانِ خیال حیدر آباد ص ۷)
ص ۸۳ سراج کی بوستانِ خیال ۱۱۷۳ھ	خود مثنوی کے مطابق ۱۱۶۰ھ
ص ۸۷ سراج ف ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۵۰ء	خوشگو: ۲۴ رجب ۱۱۳۶ھ (۲۰ دسمبر ۱۷۲۳ء)

ص ۱۰۳ حاتم ف ۱۲۰۷ھ یا ۱۱۹۶ھ	مصحفی: رمضان ۱۱۹۷ھ (عقدِ ثریا میں)
ص ۱۱۳ آرزو پ ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء	حالی و مالک رام: ۱۰۹۹ھ/۸۸-۱۶۸۷ء
ص ۱۱۵ مرزا مظہر پ ۱۱۱۱ھ	حالی: صحیح تر ۱۱۱۰ھ (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۳۶۰)
ص ۱۱۶ مظہر ف ۱۱۹۱ھ	سودا کے قطعۂ تاریخ سے ۱۱۹۵ھ نکلتا ہے
ص ۱۶۶ سودا پ ۱۱۲۵ھ	حالی: ۱۱۱۸ھ (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۵۳-۶۵۳)
ص ۱۶۷ سودا ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد گئے	حالی: ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان (ایضاً ص ۶۵۷)
ص ۱۸۳ قائم ف ۱۲۱۰ھ	حالی: ۱۲۰۸ھ (ایضاً ص ۶۶۷)
ص ۱۹۲ میر پ تقریباً ۱۱۳۷ھ	حالی: ۱۱۳۵ھ (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۵۰۴)
ص ۱۹۴ میر ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ پہنچے	حالی: بحوالہ قاضی عبدالودود: ۱۱۹۶ھ (ایضاً ص ۱۶-۵۱۵)
ص ۲۱۲ ہدایت ف ۱۲۱۵ھ	حالی: ۱۲۱۹ھ (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۱۸)
ص ۲۳۰ میر سوز ۱۲۱۲ھ میں مرشد آباد گئے	قاضی عبدالودود: ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد چھوڑنے اور ۱۱۸۸ھ جلوسِ آصف الدولہ کے درمیان گئے ہوں گے (آزاد بحیثیت محقق)
ص ۲۶۴ راسخ پ ۱۱۶۲ھ	قاضی عبدالودود: ۱۱۷۱ھ (حالی ۲/۲ ص ۹۳۵)
ص ۲۶۴ راسخ ف ۲۲ جمادی الآخر ۱۲۳۸ھ	حالی: ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۸ھ (۲/۲ ص ۹۳۵)
ص ۲۷۵ میر حسن پ ۱۱۴۰ھ	حالی: تقریباً ۱۱۳۹ھ (ایضاً ص ۸۲۲)
ص ۳۰۳ مصحفی پ ۱۱۶۴ھ	ابواللیث صدیقی: ۳۳-۱۱۳۱ھ (تاریخ مسلمانان جلد ۷، ص ۳۶۵) حنیف احمد نقوی: جمادی الاخریٰ ۱۱۷۰ھ کا دوسرا ہفتہ بتاریخ ۱۷۵۷ء کا پہلا عشرہ
ص ۳۱۱ نظیر اکبر آبادی پ ۱۷۳۹ء	علی احمد فاطمی: ۱۷۳۵ء (نظیر اکبر آبادی - الہ آباد ۸۳ء، ص ۳۶)
ص ۳۲۲ جعفر علی حسرت ف ۱۲۱۷ھ	حالی: ۱۲۰۶ھ (۲/۲ ص ۸۱-۸۸۰) فائق امروہوی: ۱۲۰۷ھ (نذرِ زیدی ص ۲۱۰)
ص ۳۵۶ ناسخ پ ۱۱۹۰ھ کے قریب	مالک رام: ۸ محرم ۱۱۸۶ھ/۱۰ اپریل ۱۷۷۲ء

Scanned by CamScanner

ص ۳۷۳ آتش پ تقریباً ۱۷۶۴ء	ابو اللیث: ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء)۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری
ص ۴۰۳ ذوق پ ۱۲۰۴ھ	تنویر علوی: ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء (مقدمہ کلیاتِ ذوق ص ۳۰)
ص ۴۴۶ انیس ف ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ	اکبر حیدری: ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ (اودھ میں مرثیے کا ارتقا ص ۵۷۶)
ص ۵۱۳ رند زیادہ سے زیادہ ۱۸۵۰ء تک زندہ رہے	مالک رام: بمبئی ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷-۵۸ء) یہی ڈاکٹر عبدالسلام (دبستانِ آتش)
ص ۵۲۲ اسیر پ ۱۲۲۹ھ	۱۲۲۰ھ جو تاریخی نام مظفر سے برآمد ہوتا ہے
ص ۵۳۳ دیا شنکر نسیم ف ۱۸۴۳ء	مالک رام: ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) بموجب مصرعِ رشک

جلد دوم

اس کے دیباچے میں شاعری کے متعلق اسلامی نظریہ بیان کرتے ہیں جس میں رسول اللہ کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ تنہا اس شاعری کو بے کار قرار دیتے ہیں جو فنا کی تعلیم دے یا سکون کو سراہے یا محض حقیقت نگاری پر اس قدر زور دے کہ اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دے، فطرت پرستی سکھائے، عالمِ اسباب و علل کو محض دھوکا سمجھے، ذوقِ عمل سے محروم کر دے، صرف جمالیات کی قدر کرے، سادگی، گرمی، تازگی اور سخت جانی پر ناک بھوں چڑھائے۔ وہ شاعری قابلِ قدر ہے جو تسخیرِ فطرت سکھائے، افادیت کو سامنے رکھے، زندگی میں سوز و یقین کو داخل کرے، جو رندی، مستی اور خود فراموشی کی جگہ جلال و جرأت پیدا کرے (ص ۴)۔

گویا اقبال کی شاعری کو سامنے رکھ کر بول رہے ہیں۔ بظاہر دیباچے کا موضوع ان کا نظریۂ شعر ہے، لیکن غزل اور جنسی شاعری پر پھٹکار بھیج کر مولوی عبدالحق کے تبصرۂ جلد اول پر آجاتے ہیں اور اس کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ دیباچے کے آخر میں لاہور ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء کی تاریخ درج ہے۔

اس کے آگے دورِ ششم ۱۸۷۰ء تا ۱۹۱۰ء ہے۔ اس میں ایک نئے صفحے پر عنوان "نیچرل شاعری" دے کر اس موضوع پر تفصیل سے یعنی ص ۱۱ تا ۲۱ پر لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بحث تاریخِ ادب کے حصار میں نہیں آتی، لیکن تنہا تاریخِ ادب اور "مقدمۂ شعر و شاعری" میں فرق نہیں کر سکتے۔

Scanned by CamScanner

دورِ ششم کا پہلا شاعر امیر مینائی ہے۔ عجیب بات ہے کہ انھوں نے امیر کے کلام میں دبستانِ لکھنؤ کی تمام خرابیاں تلاش کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> آپ نے ایک مشہور طرح میں جو غزل کہا ہے جس میں ۸۳ اشعار ہیں اور لطف یہ ہے کہ از سر تا پا تمام اشعار بے لطف ہیں۔ معلوم نہیں، یہ حضرات قافیہ پیمائی کے سوا بھی شاعری کا کوئی اور مقصد سمجھتے تھے یا نہیں۔ مثلاً گلستاں کا قافیہ گیارہ مرتبہ باندھا ہے اور سب جگہ بے کار خیالات کا انبار ہے۔
> (ص ۲۴)

حالی اور داغ سے امیر کا موازنہ کر کے امیر کو اوّل الذکر دونوں سے فروتر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> امیر کے یہاں آورد اور داغ کے یہاں آمد ہے۔
> (ص ۲۸)

داغ کے لیے لکھتے ہیں:

> داغ کا رام پور کا کلام بہتر ہے۔ حیدر آباد میں فارغ البالی سے دن بسر کیے، نہ کسی کی پروا اور نہ محنت و کاوش سے کچھ کہا ... اب اسے مطلق خیال نہ تھا کہ میں کیا کہتا ہوں۔ جو جی میں آتا تھا وہ کہتا تھا۔
> (ص ۳۵-۳۴)

داغ اور حالی کی غزلوں کا موازنہ کر کے حالی کو ترجیح دیتے ہیں (ص ۳۹-۳۸)۔ حالی کے شمائل و خصائل کی تعریف کر کے ان کی شاعری کے لیے لکھتے ہیں کہ حالی کی شاعری مستغنی عن التعریف ہے (ص ۴۹)۔

اکبر کی ابتدائی شاعری کی تنقید کر کے کہتے ہیں کہ "اودھ پنچ" کے اجرا اور سرسید کی تحریک نے اکبر کو اکبر بنا دیا (ص ۶۴)۔ شکر ہے کہ اکبر کے نمونہ کلام میں زیادہ تر نظمیں اور کم تر غزلیں نقل کی ہیں۔ میر مہدی مجروح کی غزلوں کا حالی سے موازنہ کر کے کہتے ہیں کہ مجروح کے ہاں علوے تخیل ناپید ہے (ص ۸۹)۔ جلال کی ان الفاظ میں داد یا بےداد دیتے ہیں:

> مضمون آفرینی اور مذاقِ صحیح کا پتا ان کے کلام میں نہیں ملتا۔ اگر کہیں اتفاق سے کوئی مضمون ہاتھ آگیا ہے تو آپ نے اس کی ایسی مٹی خراب کی ہے کہ کم از کم بیس جگہ اس مضمون کو باندھا ہے۔
> (ص ۹۷)

Scanned by CamScanner

زیادہ تر کلام بے حد پھیکا اور بے لطف معلوم ہوا۔ ہر گز کوئی حظ
آپ کے اشعار سے حاصل نہیں ہوا۔ (ص ۹۸)

امیر اللہ تسلیم کے لیے بھی کچھ ایسا ہی کہتے ہیں:

بھرتی کے اشعار بکثرت ہیں۔ بہت کم اشعار مرغوب طبع کہے جا سکتے
ہیں ... غزل کے چند مضامین ہیں، وہی آپ کی جولاں گاہ ہیں۔ الفاظ
مختلف ہیں، لیکن ہیر پھیر کر وہی بات کہتے چلے جاتے ہیں ...
دوسرے شعرا کے مضامین بھی نادانستہ طور پر بندھ جاتے ہیں۔

(ص ۶-۱۰۵)

آخرالذکر توارد کی کئی مثالیں دلچسپ ہیں۔ ان کے بعد ذکر ہے محمد حسین آزاد کا۔ یہ صاحب جتنے پُرکیف نثار تھے، اتنے ہی بے کیف شاعر۔ ان کے لیے لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک موجودہ زمانے کے تیسرے درجے کے شعرا
حضرت آزاد سے بہتر غزل کے اشعار کہہ سکتے ہیں ... اگرچہ ادائے
مضمون کا طریقہ طویل اور جی اکتانے والا ہوتا ہے تاہم کچھ بات پیدا
کر دیتے ہیں ... مختصر یہ کہ کلام میں دلاویزی نہیں ہے۔

(ص ۱۱۳)

شبلی کی تعریف کرتے ہیں، اسماعیل میرٹھی کو بھی بہت پسند کرتے ہیں، لیکن انھوں نے آزاد نظم کے بعض اشعار کے مختصر مصرعوں میں جو شکست ناروا کی ہے، یعنی مجرور کو پہلے مصرع میں اور جار کو دوسرے مصرع میں باندھا، اس کی بجا طور پر گرفت کرتے ہیں۔ مثلاً:

جُو ہیں آفتابِ تاباں — نے چھپایا اپنا چہرہ
انھیں ہولناک موجوں — سے مقابلہ ہے کرنا

(ص ۱۳۶)

سیفی پریمی کی کتاب "حیاتِ اسماعیل" سے معلوم ہوا کہ یہ اشعار اسماعیل کی مشہور آزاد نظم "تاروں بھری رات" کے ہیں (دلی، ۱۹۷۶ء، ص ۹۹-۱۹۸)۔ سیفی نے اس نظم کو "عظیم و نادر کارنامہ" کا عنوان دیا ہے، لیکن جار و مجرور کی شکست کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ یہ افسوس ناک ہے۔ محمود محسن کاکوروی کی مثنویوں کی مذہبی آب و تاب سے متاثر ہوئے بغیر کہتے ہیں:

آپ کے یہاں لکھنوی رنگ زیادہ ہے یعنی شعر کے ظاہری محاسن

Scanned by CamScanner

موجود ہیں، لیکن ان کا مطلب عقیدت مندوں کے سوا دوسروں کو
متاثر نہیں کر سکتا۔ مگر حضرتِ حالی کی نعت دیکھیے، جس سے
غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ (ص ۱۳۴)

بعض دوسرے شعرا کی خامیوں کی گرفت کی مثالیں:

بیان یزدانی:

شاعری کا داخلی پہلو ندارد ہے اور اندرونی کیفیات بہت کم، بلکہ
ناپید ہیں۔ مشکل سے غزل میں کوئی ایسا شعر ملے گا جس میں
سوزوگداز ہو یا اس امر کا پتا دے کہ شاعر حقیقتاً اندرونی جذبۂ دل کے
ماتحت(۱) شعر کہہ رہا ہے ... قوتِ بیان موجود ہے لیکن بےجا
تخیلات میں محبوس ہے۔

(ص ۱۴۱)

ریاض:

رطب و یابس سب کچھ آپ کے یہاں موجود ہے۔ بیسویں صدی
میں اس قسم کی شاعری کے لیے کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے۔ یا یوں
کہیے کہ اب طبیعتیں یہی راگ الاپتے الاپتے اکتا گئی ہیں۔

(ص ۱۵۴)

ص ۱۶۱-۱۶۰ پر درگا سہائے سرور کے بعض خلافِ موقع اظہارات و بیانات کی طرف
دھیان دلاتے ہیں۔ اس کے آگے دورِ ہفتم (۱۹۱۰ء تا ۱۹۴۰ء) شروع ہوتا ہے۔ اس کی تمہید
کے آخری حصے میں لکھتے ہیں:

اکثر مسلمان صاحبان سمجھتے ہیں کہ اہلِ ہنود اردو زبان میں مسلمانوں
سے کم رتبہ ہیں اور اسی طرح شیعہ صاحبان سمجھتے ہیں کہ اردو شاعری
ان کے گھر کی لونڈی ہے، لیکن یہ دونوں مفروضات آخری ادوار میں
بیّن طور پر غلط ثابت ہوئے۔ (ص ۱۷۰)

اس کے ثبوت میں دورِ ہفتم کے ہندو اور سنّی شاعروں کے نام لیتے ہیں۔ اس دور کے
پہلے شاعر اقبال ہیں۔ ان کے کلام کے تبصرے میں بعض باتیں بڑی عجیب کہی ہیں۔ مثلاً
مشہور شعر ع:

---

(۱) ماتحت کی جگہ تحت چاہیے۔

Scanned by CamScanner

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے ... الخ

کے لیے کہتے ہیں کہ "سمجھ کے" کے معنی ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ میاں کو دھوکا ہوا۔ اصلاح دیتے ہیں ع:

موتی نہ تھے کہ شانِ کریمی نے چُن لیے

(ص ۱۷۳)

میں اصلاح شدہ مصرع کے معنی سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اقبال نے جب "موتی سمجھ کے" کہا تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اللہ نے دھوکا کھا کر عرقِ انفعال کو موتی سمجھ لیا، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اللہ نے انھیں قیمت میں موتی کے برابر آنک کر چُن لیا۔ تنہا یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اسماعیل میرٹھی اور خواجہ غلام الثقلین اقبال کو اتنا بڑا شاعر نہ سمجھتے تھے (ص ۱۷۴)، پھر بھی تنہا اعتراف کرتے ہیں:

> اقبال شاعر ہے اور شاعر بھی ایسا کہ اس کو صفِ اوّل میں جگہ دینی چاہیے۔ (ص ۱۷۵)

اقبال کی اخوت اسلامی کی شاعری کا ذکر کر کے حسرت سے کہتے ہیں:

> کاش! حالی کی طرح اس کا ظاہر و باطن یک ساں ہوتا تا کہ اس کے قول و فعل میں تطابق پیدا ہو جاتا۔ (ص ۱۷۶)

اخوتِ اسلامی کی شاعری کے لیے مصنف آسان زبان کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

> وہ کیوں ایسا پیرایۂ بیان اختیار نہیں کرتا جو عامی سے لے کر عالم تک اور مزدور سے لے کر بادشاہ تک اس کے کلام کو اپنا حرزِ جان بنالیں۔ کلام کی خوبی عام فہمی ہے، دشوار پسندی کوئی خوبی نہیں۔
>
> (ص ۱۷۷)

بعض ہندو احباب کے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہیں کہ اقبال وطن پرستی سے اسلامی روایات کی طرف مڑ گئے۔ اس کا جواز پیش کرتے ہیں (ص ۷۹-۱۷۸)۔ دوسرے شعرا کی طرح اقبال کی لسانی خامیوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ اپنی مولویت کے تحت نظم "شکوہ" کو خدا کی شان میں گستاخی قرار دیتے ہیں (ص ۸۳-۱۸۲)، لیکن اقبال کے پیغام و فلسفہ کی گہرائیوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے، کیونکہ تنہا کی تنقید میں عام طور سے گہرائی نہیں ہوتی۔ حسرت کے سلسلے میں اقبال کی غزل کے لیے کہتے ہیں:

Scanned by CamScanner

> ظاہر ہے کہ اقبال رنگِ تغزل سے قطعی ناآشنا ہے اور اس کا دل
> قوم کی تنزل پذیری سے متاثر ہے۔ (ص ۱۹۳)

وہ یہ عرفان نہ کر سکے کہ اقبال نے غزل کو وسعت دے کر کن بلندیوں تک پہنچا دیا۔
اصغر گونڈوی کے مجموعے "سرودِ زندگی" پر سر تیج بہادر سپرو کے تحسینی مقدمے کو دیکھ کر
تنبیہ کرتے ہیں:

> اصل میں کسی مجموعہ کلام کے ساتھ مقدمہ، تبصرہ، تقریظ، تعارف اور
> اسی قسم کے دیگر عنوانات کے ماتحت (کذا) مضامین لکھنے کا رواج
> نہایت مضحکہ خیز ہے۔ اگر شاعر میں خود اپنے کلام کی خوبیاں
> بطرزِ احسن ظاہر کرنے کا مادہ موجود نہیں ہے تو اپنے احباب سے
> اپنی شاعری کی عمدگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا بھی کوئی مستحسن فعل
> نہیں ... اور اگر کلام معیارِ سخن سے گرا ہوا ہے تو مقدمہ، تبصرہ،
> تقریظ وغیرہ سب بے کار ہے۔ (ص ۲۰۵)

اس اصول کا اطلاق شاعروں ہی پر کیوں، ناشروں پر بھی ہونا چاہیے۔
صفی کی نظم "تنظیم الحیواۃ" سے ناخوش ہو کر لکھتے ہیں:

> مثنوی "تنظیم الحیواۃ" آپ جیسے پختہ کار شاعر کے لیے باعثِ فخر نہیں
> ہے۔ تعقید، ایطا، ضعفِ تالیف، استعمالِ متروکات، یہ سب
> عیوب اس میں کثرت سے موجود ہیں۔ (ص ۲۱۸)

مقدمہ لکھانے کے موضوع پر فانی کے سلسلے میں پھر طنز سے کام لیتے ہیں کہ اس کا
مقصد یہی نہیں کہ دیوان کی ضخامت میں اضافہ ہو جائے، بلکہ یہ راز بھی پنہاں ہے کہ شاعر کے
کلام کو کسی نہ کسی طرح مرزا غالب مرحوم کے کلام سے بہتر اور مافوق ثابت کیا جائے اور
مقدمہ نگار کی سخن فہمی کے لحاظ سے کچھ ہو یا نہ ہو، کم از کم اس کا سرٹیفکٹ تو حاصل ہو
جائے۔

مقدمہ نگار حضرات اول اردو شعر و شاعری پر بحث کیا کرتے ہیں اور بیسیوں صفحے اس
مبحث کی نذر کر دیتے ہیں، تاکہ ان کی سخن فہمی کے متعلق "ہر کہ شک آرد کافر گردد" والا فقرہ
موزوں ہو جائے۔ مصوری، نقاشی، سنگ تراشی، معماری اور خدا جانے کس کس سے شاعری کا
موازنہ کرتے ہیں اور آخر میں ایک لفظ آرٹ ضرور لاتے ہیں (ص ۲۲۳)۔
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بجنوری کا مقدمہ "محاسنِ کلامِ غالب" ان کی نظر میں ہو۔

Scanned by CamScanner

رشید احمد صدیقی نے "باقیاتِ فانی" کے مقدمے میں فانی کو غالب کے مدِ مقابل کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس کی مفصل تردید کرتے ہیں (ص ۲۴۴-۲۴۷)۔

جگر مراد آبادی پر بھی زبان و بیان کے اعتبار سے بکثرت اعتراض کیے ہیں (ص ۲۴۴-۲۴۶)۔ ان کے برعکس رضا علی وحشت کلکتوی کے مداح ہیں، گو ان کے سلسلے میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

> یہ سچ ہے کہ اب ہم کو اس صنف (غزل) کو خیرباد کہہ دینا چاہیے کیونکہ غالب و مومن کی تقلید سے بھی کچھ زیادہ فائدہ متصور نہیں۔
>
> (ص ۲۴۳)

چکبست کو کس نظر سے دیکھ کر لکھتے ہیں:

> آپ حقیقی شاعری سے کافی طور پر آگاہ نہ تھے، تقلیداً لکھتے تھے، طبیعت میں اُپج نہ تھی۔ حالی اور آزاد کی نظمیں پڑھ کر یہ شوق تو پیدا ہو گیا۔ مگر حقائق و واقعات یا سیدھی اور بچی باتوں کو اس طرح بیان کرنے سے قاصر رہے کہ سامعین اثر پذیر ہوتے۔
>
> (ص ۲۵۳)

لیکن عزیز کے سلسلے میں چکبست کے لیے ایک حرفِ خیر کہہ گئے ہیں:

> جہاں کہیں عزیز نے غالب کی غزل پر غزل لکھی ہے اس میں عزیز کو ناکامی ہوئی ہے۔ چکبست نے البتہ بعض اشعار ایسی غزلوں میں اچھے نکال لیے ہیں۔ (ص ۲۶۳)

یاس یگانہ کی تعلّی اور غالب بیزاری کے سبب بہت سختی سے لکھتے ہیں:

> تین چار سال ہوئے کہ حضرتِ یاس نے ہمارے پاس، خدا جانے کیوں؟ اپنی رباعیات، جن میں مرزا غالب کو گالیاں دی گئی ہیں، بھیجی تھیں۔ ان کو پڑھ کر ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جناب یاس نہ صرف بدزبان ہیں، بلکہ حقیقی شاعری سے کوسوں دور ہیں۔
>
> (ص ۲۷۵)

یگانہ کو بوالہوس اور ان کے تخیل کو محض بام تک پرواز کرنے والا کہتے ہیں، لیکن اس کی غزل کا جو سجیلا لہجہ ہے، اس کی داد نہ دے سکے۔ جلیل کی بھی اسی طرح مٹی پلید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

(کلام) رطب و یابس سے پُر ہے۔ قافیہ گوئی شعر گوئی سے بہتر خیال کی گئی ہے۔ ہر غزل میں اشعار کی تعداد ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ جس شعر کو دیکھیے، بھرتی کا شعر نظر آتا ہے اور آدمی بے نتیجہ بھی کھنتار ہے تو ایک ہزار اشعار میں ایک شعر تو کام کا نکل ہی آئے گا۔ افسوس ہے کہ ہماری شاعری نے ان جیسے اصحاب کے ہاتھوں میں پہنچ کر اپنی کیسی مٹی خراب کی ہے۔

(ص ۲۸۶)

اس دور کے شعرائے تغزل کے سامنے آپ کا کلام بالکل بے نمک اور بے لطف معلوم ہوتا ہے۔ جدت نام کو نہیں۔

(ص ۸۷-۲۸۶)

حیرت ہے کہ ۱۹۵۰ء میں جوش کو درجۂ اوّل کا نہیں، درجۂ دوم کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ اس سے جوش کا تو کچھ نہیں بگڑا، تنہا کی تنقیدی صلاحیت پر حرف آیا۔ ان کے بارے میں ذاتیات والی بات کہہ گئے ہیں۔

رجحان زیادہ تر دہریت کی طرف ہے لیکن حقیقتاً پکے شیعہ ہیں، اگرچہ آباو اجداد سُنّی المذہب تھے۔ (ص ۲۹۳)

کلامِ جوش کے مقدمہ نگاروں اور مداحوں پر برستے ہیں۔ جوش کی نظموں میں جو غزلیت پائی جاتی ہے، اس پر بھی آزردہ ہیں۔

اب معلوم ہوا کہ تغزل کے دل دادہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کا بخار نکالنے کے لیے نیچرل شاعری کو بھی زیر بار احسان کرنے سے باز نہ رہیں گے۔ جو خیالات "نگارخانہ" میں ظاہر کیے گئے ہیں، بہتر ہوتا کہ اردو نظم کو اس بارِ گراں سے مرہونِ منت نہ کیا جاتا۔

(ص ۲۹۶)

حیرت ہے کہ جگہ جگہ جوش کی زبان پر اعتراض کرتے ہیں (ص ۳۰۰-۲۹۷)۔

ذاکر حسین ثاقب لکھنوی کے بارے میں بھی فیصلہ ہے:

زیادہ تر کلام پھیکا معلوم ہوتا ہے۔

(ص ۳۱۳)

لیکن مولانا ظفر علی خاں کی قدر پیمائی سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا:

قافیوں میں جدت آپ کا شیوہ ہے ... بعض اوقات ظرافت تمسخر کی

Scanned by CamScanner

حد میں داخل ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے عام طور پر یہ گمان ہوتا ہے
کہ آپ کا کلام متانت سے خالی ہے۔

(ص ۳۱۹)

وہ صرف ہنگامی شاعر ہیں۔

(ص ۳۲۰)

سیماب کے لیے بھی لکھتے ہیں کہ کلام میں تصنع ہے، آمد کا نشان نہیں۔ پُرگوئی اور زود گوئی کے خراب نتائج نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دل میں کوئی چھٹک نہیں جو نظمیں لکھنے پر اکسا رہی ہے (ص ۲۲-۳۲۱)۔

حیرت ہے کہ ایک شاعر شعیب احمد ندرت ابنِ احمد حسین شوکت میرٹھی کو بھی اس تاریخ میں جگہ دی ہے اور ان کے کلام کو سراہا ہے۔ جلال و جلیل سے تو یہی زیادہ خوش بخت ٹھہرے۔ امرناتھ ساحر کا مولد بریلی لکھا ہے (ص ۳۴۳)۔ مالک رام نے رائے بریلی لکھا ہے اور یہی صحیح ہونا چاہیے۔ لکھتے ہیں کہ:

کلام سے مشاقی اور پختگی ہویدا ہے۔ الفاظ کسی قدر ثقیل اور گراں
ہوتے ہیں، دلکشی کم ہے، بلکہ اکثر و بیشتر کلام بے نمک ہے۔

(ص ۳۴۴)

اگر کلام ایسا ہی ہے تو انھیں کتاب میں جگہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی بڑے مشہور شخص تو تھے نہیں۔ ان کے برخلاف مہاراج بہادر برق اور نوبت رائے نظر کے خلاف ایک لفظ نہیں لکھا۔ سائل دہلوی کے بارے میں یہ دلچسپ اطلاع دیتے ہیں:

وہ عمدہ بندوق لگاتے تھے، بلیرڈ بہت عمدہ کھیلتے تھے۔ پتنگ بازی
کا انتہائی شوق تھا یہاں تک کہ پتنگ اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔
کپڑا نہایت عمدہ سیتے اور تراشتے تھے۔

(ص ۳۶۳)

ہم تو انھیں پرانے انداز کا نواب ہی سمجھتے تھے۔ بے خود دہلوی کے کلام میں لسانی غلطیاں نکالی ہیں۔ معنوی پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہمیں تو حیرت ہے کہ بیسویں صدی میں بے خود جیسے اصحاب خالی
خولی الفاظ جمع کرنے پر اپنی ہمت صَرف کریں اور مضامینِ نو کی
تلاش سے مستغنی ہو جائیں۔

(ص ۳۷۰)

Scanned by CamScanner

روایتی غزل گویوں کے لیے صحیح لکھتے ہیں:

> وہی بار بار عشقیہ باتیں، ملاقاتیں اور گھاتیں، آخر کہاں تک؟ افسوس ہے۔ اگر اندازِ بیان بھی نہ بدلے اور وہی خیال بار بار پیش کیا جائے۔ اس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر کا علم محدود ہے، بلکہ یہ اس امر پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ شاعر کے اپنے جذبات قطعی نہیں ہیں۔ صرف روایاتی اور رسمی طور پر ان کو لوا کیے جاتا ہے۔
>
> (ص ۳۷۱)

بالکل بجا تنقید ہے۔ جگت موہن لال رواں کی غزلوں ہی کے بارے میں لکھا۔ ان کا خاص میدان رباعی ہے، اس پر بالکل توجہ نہیں کی۔ سب سے آخر میں اپنا بیان کیا ہے، جس میں دلچسپ عنوان "کلام پر تبصرہ" بھی ہے۔ ص ۳۹۲ پر "پیش گوئی" کے عجب عنوان سے ایک صفحے کا خاتمہ ہے اور اس کے بعد اشاریہ۔

اب اس جلد کے سنین کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

تنہا	دوسرے مورخین
ص۷ ولی پ مسلمہ طور پر ۱۰۷۹ھ	نثار احمد فاروقی: ۶۰-۱۰۴۵ھ سے قبل (دید و دریافت ص۱۹۰)
ص۳۶ حالی پ ۱۳۵۳ھ/۱۸۳۷ء	ہجری سنہ میں سہوِ کتابت۔ صحیح ۱۲۵۳ھ
ص۳۸ حالی ف ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء	مالک رام: یکم جنوری ۱۹۱۵ء۔ رات کے ڈھائی بجے (تلامذۂ غالب ص۱۴۸)
ص۵۹ اکبر الہ آبادی ف اکتوبر ۱۹۲۱ء	مالک رام: ۶ محرم ۱۳۴۰ھ/۹ ستمبر ۱۹۲۱ء
ص۷۱ شاد عظیم آبادی ف ۱۹۲۶ء	مسلم عظیم آبادی: ۸ جنوری ۱۹۲۷ء (شاد کی کہانی ص۲۷۵)
ص۸۷ میر مہدی مجروح پ ۱۸۳۲ء	مالک رام: تقریباً ۱۸۳۳ء (تلامذۂ غالب ص۳۷۶)
ص۹۵ جلال پ ۱۲۴۸ھ	ابواللیث: ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری)
ص۱۰۴ امیر اللہ تسلیم پ ۱۲۳۵ھ	فضلِ امام: ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء (امیر اللہ تسلیم ص۱۸)
ص۱۰۴ امیر اللہ تسلیم ف ۱۳۲۹ء	مالک رام: ۲۸ جمادی الاول ۱۳۲۹ھ/۲۷ مئی ۱۹۱۱ء

Scanned by CamScanner

ص ۱۱۲ محمد حسین آزاد پ ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۴ء	اسلم فرخی: ۱۰ جون ۱۸۳۰ء
ص ۱۵۲ ریاض خیر آبادی پ ۱۲۵۸ھ یا ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۳ء	مالک رام: ۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ھ
ص ۱۵۲، ۱۵۳ ریاض ف ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ/ ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء	مالک رام: ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء/ ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ
ص ۱۷۲ اقبال پ ۱۸۷۷ء	مالک رام: ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء (سند خالد نظیر صوفی)
ص ۱۹۰ حسرت موہانی پ ۱۲۹۸ھ (۸۱-۱۸۸۰ء)	پاسپورٹ کے مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء (ہماری زبان یکم فروری ۹۳ء)
ص ۲۱۵ صفی پ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۳ء	مالک رام: ۳ جنوری ۱۸۶۲ء/ یکم رجب ۱۲۷۸ھ
ص ۲۲۲ فانی ف آخر ۱۹۴۲ء	مالک رام: ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء
ص ۲۶۱ عزیز پ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء نیز بقولِ رحم علی الہاشمی ۱۸۸۲ء	ڈاکٹر مسعود حسن ردولوی پ ۱۴ فروری ۱۸۸۲ء
ص ۲۶۱ عزیز ف ۱۸۳۵ء (سہوِ کتابت)	ف ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء
ص ۲۹۲ جوش پ ۱۸۹۴ء	مالک رام: ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء
ص ۳۳۰ سیماب پ جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۰ء (یہ ہجری مہینہ اپریل مئی ۱۸۸۲ء کے مطابق ہے)	مالک رام: ۱۸ رجب ۱۲۹۹ھ/ ۵ جون ۱۸۸۲ء ضیا فتح آبادی بھی یہی حیاتِ قلمی کے مطابق ("ذکرِ سیماب"، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶)
ص ۳۶۳ سائل پ ۱۸۶۸ء	مالک رام: ۲۹ مارچ ۱۸۶۴ء
ص ۳۶۴ سائل ف ۱۵ ستمبر سنہ نہیں دیا	مالک رام: ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء

اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے تمہیدی صفحات میں دے چکا ہوں۔ تحقیق کے لحاظ سے اس کی اہمیت صفر ہے کیونکہ کہیں ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا۔ طول طویل انتخابِ کلام کی بھی کوئی افادیت نہیں۔ ہاں، ان کی تنقید عام ڈگر سے مختلف ہے۔ اس میں انھوں نے ذیل کے پہلوؤں پر بطور خاص توجہ کی:

۱۔ زبان و بیان کی غلطیوں کی گرفت کی۔

۲۔ کلام میں سے متروکات کے نمونے ادبدا کر دیے۔

۳۔ رکیک اشعار خاص طور سے درج کیے تاکہ ہر شاعر کی تعریض کر سکیں۔

Scanned by CamScanner

ان کا نقطۂ نظر اخلاقی اور افادی ہے۔ اردو شاعری کی روح سے واقف نہیں، انگریزی شاعری کے شیدا ہیں۔ عشق عاشقی کے بیانات، وارداتِ قلبی، تغزل، غزل سب کے خلاف ہیں۔ اصلاحی اور فلسفیانہ نظمیں پسند کرتے ہیں۔ عام روایت سے ہٹ کر جس بے باکی سے یہ مشاہیر شعرا کے کلام کو بے نمک، پھیکا اور تصنع آمیز کہہ دیتے ہیں اسے پڑھ کر قاری چونک جاتا ہے۔ یا تو یہ ایک جری نقاد ہیں جو کلیم الدین احمد کی طرح کسی سے مرعوب نہیں یا پھر یہ ایک سیدھے سادے تنقید کار ہیں جو اپنا تاثراتی فیصلہ ظاہر کر دیتا ہے لیکن جس کے پاس جدید اہلِ نقد کی گہری نظر نہیں۔ وہ تذکرہ و تاریخ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اپنی تاریخ کی دونوں جلدوں کی ابتدا میں شعریات کے طویل نظریاتی مضمون دیتے ہیں جن کا تاریخِ ادب میں کوئی مقام نہیں۔ وہ ۱۹۵۰ء میں ۱۹۲۵ء کے انداز کی تاریخ لکھتے ہیں۔ پھر بھی اگر ان کی کتاب سے شعرا کی عملی تنقید کے بیانات کو یک جا کر کے ایک مجموعہ تیار کیا جائے تو وہ مفید بھی ہوگا، دلچسپ بھی۔

Scanned by CamScanner

بارھواں باب

عبدالقادر سروری: "اردو کی ادبی تاریخ"

پروفیسر عبدالقادر سروری کی تصنیف "اردو کی ادبی تاریخ" ۱۹۵۸ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ سرورق کے اندر کے ٹائیٹل پیج پر انھیں "سابق پروفیسر اردو و صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی جامعۂ میسور" لکھا ہے۔ تحقیقی کتابوں میں اصطلاحات کی صحت میں خاص توجہ برتنی چاہیے۔ سروری صاحب مہاراجا کالج میسور میں اردو کے پروفیسر تھے۔ وہاں اردو کا پوسٹ گریجویٹ شعبہ نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو اور ایم اے اردو کی جماعت کافی بعد میں وجود میں آئی۔ میسور یونی ورسٹی کی پہلی پروفیسر اور صدر اردو ڈاکٹر حبیب النسا بیگم تھیں۔ جس طرح حمیدیہ کالج بھوپال کے پروفیسر کو بھوپال یونی ورسٹی کا پروفیسر اور بریلی کالج بریلی کے پروفیسر کو روہیل کھنڈ یونی ورسٹی کا پروفیسر نہیں کہہ سکتے، اسی طرح مہاراجا کالج میسور کے پروفیسر کو میسور یونی ورسٹی کا پروفیسر نہیں کہہ سکتے۔ بھوپال اور بریلی کے کالجوں میں تو ایم اے اردو کی جماعت بھی ہے، مہاراجا کالج میسور میں تو اردو صرف بی اے تک تھی۔

اردو میں عام طور سے "تاریخِ ادبِ اردو" کی اصطلاح مستعمل ہے۔ رام بابو سکسینہ، عبدالقیوم نیز جمیل جالبی تینوں کی تاریخوں کا نام "تاریخ ادبِ اردو" ہے۔ اعجاز حسین کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" اور سرور صاحب کی مرتبہ "علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو" میں بھی یہی ترکیب شامل ہے۔ کیا سروری صاحب نے "ادبی تاریخ" کہہ کر اس کی کسی مختلف نوعیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انگریزی میں تاریخِ ادب (history of literature) کے مرکبِ اضافی کے بجائے "ادبی تاریخ" (literary history) کا مرکب توصیفی استعمال ہوتا ہے۔ معلوم نہیں سروری صاحب نے انگریزی کے انداز پر ادبی تاریخ کی ترکیب استعمال کی ہے یا "ادبی" کو وصف قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دوسری تاریخیں محض تاریخی (تحقیقی) ہوتی تھیں، یہ تنقیدی نوعیت کی ہے۔ انھوں نے پیش لفظ کو "چند کلمے" کا عنوان دیا ہے۔ اس میں ترقی پسندوں کے لہجے میں لکھتے ہیں:

ادب حیات کا سایہ ہے اور اسی کے سہارے نشوونما پاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

اس کا خمیر زبان کے بولنے والوں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور فنی روایات سے تیار ہوتا ہے۔۔

آئندہ ادبی تاریخ لکھنے والوں کی یہ ذمےداری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سیاسی، معاشی، سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری سیاسی تاریخ تو مدون ہے لیکن معاشی، سماجی اور فنی تاریخ اتنی مرتب نہیں ہے کہ اس کا مسالا ایک چھوٹی کتاب میں آسانی سے فراہم کیا جاسکے اور اس کے ساتھ ادبی مظاہر کی نشوونما کو جوڑ کر سب کے عمل اور ردِ عمل کو نمایاں کیا جاسکے۔ یہ مختصر سی کتاب اس سعی کا آغاز سمجھی جا سکتی ہے۔ اس میں ادبی تاریخ کو خود مکتفی شعبۂ زندگی کی حیثیت سے، اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہٹا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، بلکہ جہاں تک مواد دستیاری کر سکا ہے، ہر عہد کے کارناموں کو ان کے سیاسی، سماجی اور فنی ماحول کے درمیان پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ مروجہ نوعیت کی تفصیلی تاریخِ ادب نہیں ہے۔ اس میں رجحانات اور محرکات پر زیادہ زور دیا گیا ہے... اس مخصوص نقطۂ نظر کے لحاظ سے یہ بات غیر اہم ہو جاتی ہے کہ ذیلی تفصیلات اس میں ہوں یا نہ ہوں (ص ٦-٥)۔

تاریخی تنقید، سماجی تنقید اور مارکسی تنقید نے ادب کے مطالعے میں سیاسی اور سماجی عوامل کو بہت اہمیت دی۔ اس کے زیرِ اثر اردو میں رواج ہو گیا کہ ہر تحقیقی مقالے کی ابتدا میں تاریخی پس منظر دیا جاتا تھا، خواہ اس مصنف یا شاعر پر معاصر حالات کا کوئی واضح اثر ہو کہ نہ ہو۔ تاریخی پس منظر میں محض انھیں واقعات کا بیان نہیں ہوتا تھا جن کا زیرِ تحقیق ادیب یا صنف پر اثر پڑا ہو، بلکہ ایک مجرد سیاسی یا تہذیبی تاریخ کا مقالہ لکھ دیا جاتا تھا، جو نفسِ موضوع سے غیر متعلق رہتا تھا۔ اس پس منظر میں کوئی نئی اطلاعات نہیں ہوتی تھیں، دلی، اودھ یا دکن کی وہی تاریخ، وہی واقعات، جو بارہا پڑھے اور سنے جا چکے ہیں۔ اس معاملے میں بعض حضرات نے یہ شدت برتی کہ ان کا مقالہ سیاسی یا تہذیبی تاریخ زیادہ ہو گیا، ادبی تاریخ کم۔ اس طرح ان کی کتاب دولخت ہو جاتی تھی۔

یہی خامی سروری صاحب کی کتاب میں در آئی ہے۔ اس میں سیاسی اور سماجی تاریخ زیادہ ہے، ادبی تاریخ کم، بلکہ کم سے کم۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ غیر اہم ہے کہ اس میں ذیلی تفصیلات ہیں کہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ کتاب تاریخ ادب کے سلسلے میں کوئی نئی معلومات فراہم نہیں کرتی۔ سروری ایک نئے قسم کے مورخ کے روپ میں سامنے آنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے محمد حسین آزاد کی طرح افسانوں اور لطیفوں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح آزاد کی "قصصِ ہند" حصۂ دوم تاریخی افسانے کا لطف رکھتی ہے اسی طرح

Scanned by CamScanner

سروری صاحب نے کوشش کی ہے کہ تاریخی قصے اور ضعیف روایات کو بیچ بیچ میں جوڑ کر بات کو دلچسپ بنایا جائے۔ میں نے اس جائزے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔ اس میں تحقیق اور تاریخ کا دور دور تک پتا نہیں، صرف سیاسی تاریخ اور اس سے کم تہذیبی تاریخ ہے۔ ادب کو غلام گردش کے حلقۂ بیرونِ در کی طرح بدر کر دیا ہے۔

کتاب میں ۱۵ باب ہیں۔ ان میں ابتدا کے (ساڑھے آٹھ) ابواب یعنی ص ۹۰ تک سیاسی اور سماجی تاریخ ہی ہے۔ اگر ان میں ادب اور ادیبوں کے ذکر کی سطریں جمع کی جائیں تو دو چار صفحے ہی بنیں گے۔ تاریخ ہے اردو ادب کی، پس منظر دیا جا رہا ہے آریوں سے بھی پہلے زمانے کا۔ پہلے باب کا عنوان "قدیم ہندوستان، عظیم ہندوستان" ہے۔ اس میں آریوں کی آمد سے قبل، آریاؤں کے ورود کے ابتدائی دور اور ہندو مذہب کی تفصیل دی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے نام انگریزی سے لیے ہیں، اس لیے ہندی الفاظ کا تلفظ مسخ کر کے آخر میں "آ" کا اضافہ کیا ہے، مثلاً

سوا، ورونا، رودرا، شیوا (ص ۱۴)۔ وشنوا، شیوا (ص ۱۵)۔

آریوں یا بودھ اور جین دھرم وغیرہ کا اردو تاریخ سے کیا تعلق ہے۔ پھر یہ اطلاعات ہر جگہ صحیح بھی نہیں، مثلاً لکھتے ہیں:

> البیرونی کے زمانے میں شمالی ہند میں شیو کے ماننے والوں کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی، اس کے مقابلے میں وشنو فرقے کے لوگ زیادہ تھے۔ (ص ۱۴)

البیرونی نے جو کچھ لکھا ہوا سے پڑھ کر نقل کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند میں شِو اور وشنو کے ماننے والوں کی دوئی کبھی نہیں ہوئی۔ وہاں پُرانوں کے دھرم یا سناتن دھرم کے ماننے والے برہما، وشنو اور شِو تینوں کے معتقد تھے، محض ایک یا دو کے نہیں۔ جنوب میں وشنو اور شِو کے پرستاروں میں بٹوارا ہے، شمال میں نہیں۔

ابتدائی تین ابواب اردو کے لیے بالکل غیر متعلق ہیں۔ تیسرے باب میں لکھتے ہیں:

> سندھ کے دو حصے ہیں ایک الور اور دوسرے ملتان جو بعد میں سندھ اور ملتان سے موسوم ہوئے۔ (ص ۳۶)

گویا "الور" کا نام سندھ ہو گیا۔ معلوم نہیں سروری صاحب کو یہ غلط فہمی کیوں کر ہوئی۔ الور، دہلی اور جے پور کے بیچ میں ایک قصبہ ہے۔ اسے سندھ سے کوئی تعلق نہیں اور میری معلومات کی حد تک سندھ کو کبھی بھی الور نہیں کہا جاتا تھا۔

محمود غزنوی کے لیے لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

محمود کے ہندوستان پر حملے مذہبی جذبے کا نتیجہ نہیں تھے، بلکہ اسے
دولت سمیٹنے کا بڑا شوق تھا۔ (ص ۳۹)

محمود کی ترک تازیوں کا مقصد اشاعتِ اسلام نہیں تھا۔

(ص ۴۰)

محمود کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مذہبی جذبے سے عاری تھا، صحیح نہ ہوگا۔ اس نے سومناتھ کے مندر میں مورتی توڑ دی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے پجاریوں نے اسے پیش کش کی کہ وہ ڈھیر سارا مال و زر لے لے، لیکن مورتی کو صدمہ نہ پہنچائے، لیکن محمود نے دولت پر مذہبی جذبے کو ترجیح دی۔ اس کا لقب ہی بت شکن پڑ گیا۔

ابتدائی چار بابوں کا اردو ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ پانچویں باب میں مملوک سلطانوں کا بیان ہے۔ یہ پورا باب بھی سیاسی ہے، لیکن اس میں تین اردو شاعروں کا مختصر ذکر ہے، گو ان سے منسوب کوئی بھی تخلیق مصدقہ نہیں۔ حضرت فریدالدین گنج شکر سے منسوب ریختہ غزل کا مطلع اور یہ مقطع لکھتے ہیں:

پندِ شکر گنج بدل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

(ص ۵۰)

اس کی اصل یہ ہے کہ کتب خانۂ الاصلاح دیسنہ کی ایک قلمی کتاب کی جلد خراب ہو گئی تھی۔ جب اس کی نئی جلد باندھنے کو پرانی جلد کھولی تو اس کے اندر ایک کاغذ پر گنج شکر کی یہ غزلِ ریختہ لکھی ہوئی تھی (عبدالحق: ابتدائی نشوونما، ص ۱۲)۔ کچھ معلوم نہیں کہ اس کاغذ پر کس نے اور کب یہ غزل لکھی۔ ظاہر ہے جلد میں کوئی بوسیدہ کاغذ تو استعمال کیا نہ گیا ہوگا۔ شیخ گنج شکر اور کاتبِ ریختہ کے بیچ اتنی صدیوں کے فصل کو دیکھتے ہوئے اس کی بات پر کیوں کر ایمان لایا جائے۔ سید سلیمان ندوی کو یہ تسلیم نہیں کہ یہ غزل شکر گنج کی ہے۔ ان کی رائے میں:

یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے، نہ کہ خود حضرت کی۔

("نقوشِ سلیمانی"، اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء، ص ۴۳)

سروری صاحب نے امیر خسرو سے وہ سب چیزیں منسوب کر کے لکھ دی ہیں جو

Scanned by CamScanner

"آبِ حیات" میں ہیں۔ مثلاً غزلِ ریختہ، پہیلیاں، دوسخنے، اَن مل، کہہ مکرنیاں وغیرہ۔ سروری صاحب نے ایک منٹ کو بھی یہ تأمل نہیں کیا کہ ان کی زبان عہدِ خسرو کی نہیں۔ سروری صاحب نے خسرو کے دوست امیر حسن سجزی سے بھی کچھ اردو کلام منسوب کیا ہے اور ایک غزل کے دو شعر دیے ہیں۔ ان کا ماخذ ظاہر نہیں کیا۔ علی گڑھ تاریخ میں سروری صاحب نے آٹھ شعر کی یہ پوری غزل دی ہے (ص ۴۹-۱۴۸)۔ یہی غزل جمیل جالبی کو بھی ایک قدیمی بیاض میں ملی اور انھوں نے اس کے چھ شعر چھاپ دیے (تاریخ، جلد اول، ص ۲۵)۔ میر نے "نکات الشعرا" میں کسی مجہول الاسم شاعر حسن کا ایک شعر درج کیا ہے:

جب تے سفر پی نے کیا تب تے غریب آوارہ ہوں

پی بیگ تے آنا کریں یا مُج کو لیں بلوائے کر

کسی حسن کے اس متفرق فرد کو بھی سروری صاحب نے حسن سجزی کا مان لیا ہے۔ انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اس غزل کی زبان سو فی صد دکنی ہے۔ رہیا، ملیا، بھوتوں، اجھوں، بیگ (بمعنی جلدی) تے، وغیرہ کو استعمال کرنے والا شاعر حسن سجزی دہلوی نہیں ہو سکتا، کوئی دکنی شاعر حسن ہوگا۔

آٹھویں باب میں حضرت عین الدین گنج العلم کے لیے لکھتے ہیں:

> انھوں نے دکھنی عوام کی اصلاح کے لیے کچھ رسالے پرانی اردو میں بھی لکھے تھے۔ (ص ۷۰)

چونکہ ان رسالوں کا نہ کوئی وجود ہے، نہ ان کا کوئی نمونہ دستیاب ہے اس لیے کوئی تسلیم نہیں کرتا کہ گنج العلم نے واقعی یہ رسالے لکھے تھے۔ ص ۷۲ پر خواجہ بندہ نواز کے پانچ اردو رسالوں کے نام لیے ہیں۔ میں علی گڑھ تاریخِ ادب میں سروری صاحب کے مضمون کے سلسلے میں ان کا مفصّل جائزہ لوں گا۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد یہ ثابت کر چکے ہیں کہ بندہ نواز نے اردو میں کوئی رسالہ نہیں لکھا ("گلدستہ الحقائق، اردو نثر کا پہلا نقش"، "نوائے ادب"، جولائی ۱۹۷۰ء)۔ اسی باب کے آخر میں لکھتے ہیں:

> قطبن ... ایک مثنوی "مرگاوتی" کا مصنف ہے، لیکن ابتدائی اردو کے اکثر اردو کارناموں کی طرح یہ مثنوی بھی ہندی وزن پر لکھی گئی ہے۔ (ص ۷۹)

نہ صرف وزن ہندی ہے، بلکہ زبان بھی خالص ہندی ہے۔ ہوا یہ ہے کہ اردو کے بعض توسیع پسند علما ملک محمد جائسی، کبیر، شیخ عثمان، قطبن، منجھن، شیخ داؤد وغیرہ کو اردو

Scanned by CamScanner

کا شاعر اور ان کی نظموں کو اردو ادب کا جزو قرار دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کی زبان اودھی اور شاذ برج ہے، لیکن چونکہ یہ مسلمان ہیں اس لیے فرض کر لیا جاتا ہے کہ ان کی تخلیقات اردو کے کسی روپ میں ہوں گی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو انھیں بولیوں میں ہندو کویوں کی شاعری کو اردو کیوں نہ کہا جائے۔ اس طرح تو اردو کی انفرادیت اور تشخص ہی ختم ہو جائے گا۔

نواں باب نسبتاً طویل ہے کہ اس میں عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں اور ان کے شعرا کا بیان ہے۔ ابراہیم عادل شاہ اول کے لیے لکھتے ہیں کہ:

ابراہیم نے دفتروں کو فارسی کی بجاے اردو میں منتقل کر دیا۔

(ص ۸۴)

ایسا سمجھنا سخت غلط فہمی ہے۔ اس کی حقیقت ڈاکٹر سید محمد مصطفےٰ کمال نے اپنی کتاب "حیدر آباد میں اردو کی ترقی، تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے" (حیدر آباد ۱۹۹۰ء) میں پوست کندہ بیان کی ہے۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا تھا: "دفترِ فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد۔" ہندوی کو لوگوں نے ہندی کر دیا اور ہندی سے مراد اردو لے لی۔ مصطفےٰ کمال نے مستند ماٰخذ کی مدد سے بحث کر کے طے کیا کہ اس زمانے میں ہندوی یا ہندی سے مراد کوئی بھی ہندوستانی زبان ہو سکتی تھی۔ عادل شاہیوں کے عہد میں ضلعی سطح پر مرہٹی کا استعمال ہوا جسے بعض مورخوں نے ہندی کا نام دے دیا (ص ۳۵-۳۴)۔

ص ۸۴ ہی پر سروری صاحب نے شمس العشاق کے نثری رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں، شمس العشاق کے کسی اردو نثری رسالے کا پتا نہیں چلتا۔ ادبی تاریخ کے اسی باب ۹ میں سروری صاحب نے بہت سے دکنی شعرا کی مثنویوں کے نام لیے ہیں، لیکن کسی کا سنہ دینے کی تو قسم کھائی ہے، الا ماشاءاللہ۔ انھیں سماجی نقاد بننے کا شوق جو ہوا تھا۔ کتاب کا نام ادبی تاریخ ہے، لیکن یہ تاریخوں ہی سے عاری ہے۔

ص ۹۴ پر شاہ امین الدین اعلیٰ کی ایک تصنیف کا نام "محبت نامہ" لکھا ہے، صحیح "محب نامہ" ہے۔ اس باب میں حسبِ گنجائش بہت سے افسانے اور ضعیف روایات شامل کی ہیں۔ مثلاً مرزا مرثیہ گو، محمد قطب شاہ کی تعمیرِ مکہ مسجد، ابوالحسن تاناشاہ کی تخت نشینی وغیرہ کے سلسلے میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعض کا ماٰخذ ڈاکٹر زور کی افسانوی کتاب "گولکنڈہ کے ہیرے" ہے۔ افسانوں کے لیے تو ٹھیک ہے، لیکن تاریخِ ادب میں تخت نشینی کے لیے جوڑ توڑ اور شاہی خاندانوں کی چٹ پٹی تاریخ سے محمد حسین آزاد کی "قصصِ ہند" کا سماں پیدا

Scanned by CamScanner

ہو جاتا ہے۔

ابنِ نشاطی کے لیے لکھتے ہیں کہ اس نے "طوطی نامہ" کے قصّوں کو نثر میں لکھا تھا اور اس کا نام "طوطی نامہ" ہی رکھا تھا (ص ۱۰۹)۔ صورتِ حال یہ ہے کہ غواصی کی مثنوی "طوطی نامہ" ملتی ہے، ابنِ نشاطی کی نہیں۔ سروری صاحب نے اپنے بیان کا ماخذ نہیں دیا، لیکن اس غلط فہمی کی لمبی تاریخ ہے۔ اس کی اصلیت اکبرالدین صدیقی صاحب نے قیاس کی۔ کتب خانۂ ٹیپو سلطان کے فہرست نگار اسٹیوارٹ کو ایک جلد میں مثنوی "پھول بن" اور "طوطی نامہ" مجلد ملیں۔ اس نے "پھول بن" کے مصنف کا نام غواصی کے بجائے محض عواصی سمجھ کر انگریزی میں Avasy لکھا ہوگا۔ پریس میں s کے بجائے r لکھا گیا اور Avary چھپ گیا۔ اسٹیوارٹ نے "پھول بن" کی طرح "طوطی نامہ" کو بھی اسی شاعر کی تصنیف سمجھ لیا(۱)۔ تاویل درست معلوم ہوتی ہے۔ اسی کو گارساں دتاسی نے عوری پڑھا۔ وہ خطبات میں صریحاً "پھول بن" کے مصنف کا نام عوری یا ابنِ نشاطی لکھتا ہے ("خطباتِ گارساں دتاسی"، دہلی، ۱۹۴۳ء، ص ۵۴ نیز ص ۱۳۵)۔

اسٹیوارٹ نے جلد کی دوسری کتاب مثنوی "طوطی نامہ" کو بھی مصنف "پھول بن" کی سمجھ لیا۔ دتاسی نے اس کی تشخیص عوری یا ابنِ نشاطی کی۔ سروری صاحب نظم سے نثر تک کیسے پہنچ گئے اس کا سراغ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے مقالے سے ملتا ہے جو سروری صاحب کی نگرانی میں لکھا گیا۔ برٹش میوزیم میں فارسی طوطی نامۂ ابوالفضل کے ایک مخطوطے کے ساتھ دکنی نثری ترجمہ بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ قیاس کرتی ہیں کہ یہی ابنِ نشاطی کا "طوطی نامہ" ہوسکتا ہے جو نظم کے بجائے نثر میں رہا ہوگا(۲)۔ معلوم ہوتا ہے اس دورِدراز بلکہ بےبنیاد قیاس آرائی کا خالقِ اصلی ڈاکٹر رفیعہ نہیں، میرے بزرگ دوست سروری صاحب تھے۔

دسویں باب میں ایک عنوان ہے: "مغلوں کی آمد۔" اس کے تحت مغل حکومت کی پوری تاریخ لکھ دی ہے، جو چنداں ضروری نہ تھی۔ اس میں ایک غیر معمولی بات یہ لکھی ہے:

> اورنگ زیب اور اس کے مقرّبین اور امرا اردو کے ادبی روپ سے مانوس نہیں تھے اور شاید دکن کی زبان کو وہ شبہے کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ (ص ۱۲۷)

---

(۱) "پھول بن"، مرتبۂ اکبرالدین صدیقی۔ ترقیِ اردو بورڈ دہلی، ۱۹۷۸ء، مقدمہ ص ۳۳۔

(۲) "اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، انیسویں صدی کے اوائل تک"، حیدرآباد، سنہ طبع ندارد، ص ۹۰-۲۸۸۔

Scanned by CamScanner

سروری صاحب دکنی ہی کو اردو کا ادبی روپ سمجھتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب نے دکنی حکومتوں کو تاراج کیا اس سے نتیجہ نکالا کہ وہ اردو (دکنی) سے ہم دردی نہ رکھتا ہوگا۔ اسی سلسلے میں سروری صاحب لکھتے ہیں:

> کہا جاتا ہے کہ نصرتی اس زمانے میں زندہ تھا اور اس نے عالم گیر کی مدح میں ایک اردو قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔
>
> (ص ۱۲۷)

سروری صاحب نے اپنی روایت کا ماخذ نہیں دیا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "نصرتی" میں فتوت کے "تذکرۂ ریاضِ حسنی" کا بیان نقل کیا کہ اورنگ زیب نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا، ان میں نصرتی بھی تھے اور انھیں خطابِ ملک الشعرا سے سرافراز فرمایا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> عبدالجبار نے "تذکرۂ شعرائے دکن" میں ان کا سنہِ وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے۔ عالم گیر نے بیجاپور کو ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا۔
>
> ("نصرتی"، سنہ ندارد، ص ۱۶)

اب ہمیں معلوم ہے کہ "گلشنِ عشق" کے مخطوطۂ سالار جنگ کے ترقیمے کے مطابق نصرتی کا انتقال ۱۰۸۵ھ میں ہوا۔ اس لیے نصرتی کا اورنگ زیب کی مدح میں قصیدہ لکھنے کا سوال ہی نہیں۔

گیارھویں باب میں جا کر ہم شمالی ہند میں پہنچتے ہیں، گویا شمالی ہند کو کتاب کا محض نصف حصہ دیا گیا ہے جو دوسری ادبی تاریخوں سے مختلف ہے۔ شمالی ہند کے باب میں بھی سیاسی تاریخ کا زور ہے جہاں دار شاہ کی لال کنور کی دوگانہ زہرہ اور نظام الملک سے اس کا معرکہ کسی تاریخی ناول کا جزو معلوم ہوتا ہے (ص ۱۳۵)

سروری صاحب کا ایک بڑا ماخذ آزاد کی "آبِ حیات" ہے۔ وہ اس کے بیانات کو تحقیق کی چھلنی میں چھانے بغیر قبول کر لیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ حوالہ کہیں نہیں دیا۔ یوں بھی یہ کتاب ماخذ کے حوالے سے قطعاً داغ دار نہیں۔ اس میں شاہ عالم اور سودا کا جو مکالمہ ہے، اور جس میں سودا نے شاہ عالم کی غزلوں میں بیت الخلا کی بو پائی تھی، سروری صاحب اسے درست مان کر محتاط الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں (ص ۱۴۹)۔ محمود شیرانی نے انکشاف کیا کہ شاہ عالم ۱۱۸۵ھ میں دہلی پہنچا جب کہ سودا ۱۱۷۰ھ میں دہلی چھوڑ چکے تھے ("مقالاتِ شیرانی"، ص ۹۶)۔ آزاد نے جابجا شاعروں مثلاً سودا اور میر کو والیانِ ملک سے گستاخانہ انداز میں گفتگو کرتے دکھایا ہے جو ممکن نہیں، محض قیاسی طوطے مینا ہیں۔

Scanned by CamScanner

سروری صاحب نے بھی سودا کو شاہ عالم سے دریدہ دہنی کرتے دکھایا ہے (ص ۱۴۹)۔
لکھتے ہیں سودا کا شاہ عالم سے بگاڑ ہونے پر بسنت خاں اور مہربان خاں نے قدردانی کی۔ یہ بیان "آبِ حیات" سے ماخوذ ہے۔ قاضی عبدالودود نے واضح کیا کہ مہربان خاں فرخ آباد میں ملازم تھے، دہلی میں نہیں ("محمد حسین آزاد بحیثیت محقق"، پٹنہ، ۱۹۸۴ء، شق نمبر ۲۷۷)۔ چونکہ سروری صاحب کی مختصر کتاب کا کم از کم دو تہائی حصہ سیاسی اور سماجی تاریخ کی نذر ہو گیا ہے، اس لیے ادیبوں کو بہت کم جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً میر درد کو ۱۴ سطریں (ص ۱۵۳) قائم کو محض پانچ سطریں (ص ۱۵۵) اور آتش کو ایک صفحے سے کم (ص ۱۷۹-۸۰)۔

معلوم نہیں کیوں اودھ کے فرماں رواؤں کی کئی تاریخیں غلط دی ہیں، مثلاً
آصف الدولہ ۱۷۷۴ء میں تخت پر بیٹھے (ص ۱۶۰)، صحیح جنوری ۱۷۷۵ء۔
آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۸ء میں ہوا (ص ۱۷۳)، صحیح ۱۷۹۷ء۔
امجد علی شاہ کا انتقال ۱۸۴۸ء میں ہوا (ص ۱۸۴)، سرور کی "فسانۂ عبرت" کے مطابق ۱۸۴۷ء میں۔

ص ۶۸-۱۶۷ پر شاہ عالم اور انشا کا مکالمہ درج کیا ہے، جس میں انشا بادشاہ سے اشرفیاں جھٹکتے ہیں۔ یہ "آبِ حیات" سے منقول ہے گو سروری صاحب اعتراف ضروری نہیں سمجھتے۔ عابد پیشاوری نے اپنی کتاب "انشاء اللہ خاں انشا" میں اس جعلی افسانے کا تجزیہ کیا۔ عابد نے جادوناتھ سرکار کی سند پر شاہ عالم کے اندھا کیے جانے کی تاریخ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء/۱۲۰۲ھ لکھی ہے۔ انشا اس وقت دلی سے جا چکے تھے (لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸-۱۲۵) سروری آگے لکھتے ہیں کہ انشا نے "دریائے لطافت" میں اوزان کو اردو بنانے کے لیے ارکان کو "پی جان، پری خانم" وغیرہ سے بدل دیا (ص ۱۶۹)۔ سروری صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ "دریائے لطافت" انشا اور قتیل کی مشترکہ تصنیف ہے۔ عروض کا حصہ قتیل نے لکھا تھا۔

بارھواں باب "اہلِ نظر کی تازہ بستیاں" سب سے زیادہ طویل اور مفصل ہے، یعنی ۶۰ صفحوں کا۔ اس میں لکھنؤ، مٹیا برج، کلکتہ، دہلی، رام پور، آگرہ، حیدر آباد اور مدراس کا ذکر ہے۔ یہ اردو کے مختلف مراکز ہیں۔ تازہ بستیوں کے عنوان کے تحت کم از کم دہلی کو نہیں آنا چاہیے تھا۔ بہرحال ان مرکزوں کو یکجا کر دینا جامعیت کے تقاضے پورا کرتا ہے۔
تیرھواں باب "مغربی دھارا" ہے۔ اس کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کا ذکر ہے لیکن اتنا سرسری کہ میر امن کو محض سوا دو سطریں دی ہیں۔ اس کے آگے سرسید، آزاد اور حالی

Scanned by CamScanner

وغیرہ کی اصلاحی تحریکوں کا بیان ہے۔ اس میں حالی کے ایک شعر کو یوں لکھا ہے:

صحرا میں کل بکریوں کو خصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمھارے آ گئے یاد احسان ہمیں

(ص ۲۴۸)

حیدر آبادی کاتب قصاب کو خصاب بولتا ہوگا اس لیے اس نے اس لفظ کو "ق" کے بجائے "خ" سے لکھ دیا، کسی نے کتابت کی تصحیح نہ کی۔

آخری ابواب میں تاریخی ترتیب کے ساتھ کشذو کیا ہے۔ مثلاً کانگریس کے قیام، اگست ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک (ص ۲۴۶)، اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام (ص ۲۴۷)، نیز اکبر اور حالی کے اشعار کے بعد غدر ۱۸۵۷ء کی تفصیل آئی ہے (ص ۵۱-۲۴۸)۔ معلوم نہیں کیوں مصنّف ہندوستان کو بالالتزام بھارت لکھتے ہیں، مثلاً صفحات ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۵۸ اور ۲۶۶ پر۔ قاعدہ ہے کہ ہمارے ملک کو انگریزی میں انڈیا، ہندی میں بھارت اور اردو میں ہندوستان کہا اور لکھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہو تو مغائرت محسوس ہوتی ہے۔

شبلی کے مضمون "مسلمانوں کی پولی ٹکل کروٹ" کا اقتباس دیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان کی زبان میں بھی سرسید اور حالی کی طرح بے ضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال ہے:

ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے اور خود اپنے تئیں انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سلف ریسپکٹ کا کچھ بھی اثر باقی ہے...

(ص ۲۵۲)

آج کے انگریزی خواں ان انگریزی لفظوں کی جگہ اردو مترادفات کا استعمال کریں گے۔

ص ۲۷۷ پر عصمت چغتائی کے ناول کا نام "ٹیڑھی لکیریں" لکھا ہے بجائے "ٹیڑھی لکیر" کے۔ اس کتاب میں عام طور سے نثر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ صنف داستان کا علاحدہ عنوان ہی نہیں۔ ناول اور افسانے کو چار صفحوں سے کم دیے ہیں، تنقید کو دو صفحے، ڈرامے کو ایک صفحہ اور انشائیہ یا مضمون کو آخری ایک صفحے سے کم۔ اس میں انشائیہ اور مضمون کو ہم معنی سمجھ کر مقالے کے معنی میں استعمال کیا ہے، چنانچہ سرور، احتشام، اختر رائے پوری، فراق، نورالحسن ہاشمی، عبادت بریلوی وغیرہ سب کو سربرآوردہ انشائیہ نگار کہا

Scanned by CamScanner

ہے (ص ۲۸۲)۔ آج اس اصطلاح کا یہ استعمال بے محل معلوم ہوتا ہے۔

سروری صاحب مجھ سے سینیئر ہونے کے باوجود میرے گہرے دوست تھے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کی اس کتاب کی تصنیف کا مقصد کیا تھا۔ اس کا دو تہائی حصہ سیاسی اور سماجی تاریخ ہے۔ ادیبوں اور ان کی تصانیف کا بیان اتنا تشنہ ہے جیسے اردو ادب کے ارتقا پر ایک طویل مضمون لکھا گیا ہو۔ سنین نہیں دیے گئے، فٹ نوٹ یا کتابیات مفقود ہیں، کہیں بھی مآخذ کا ذکر نہیں۔ پوری کتاب میں کہیں بھی ذاتی تحقیق کا ایک نمونہ نہیں ملتا۔ شعرا کے کلام کے نمونوں کی یہ کمی ہے کہ ذوق کے دو شعر، مومن کے چار شعر اور غالب کا محض ایک شعر دیا ہے۔ پوری کتاب میں شبلی کی ساڑھے پانچ سطروں کے علاوہ نثر کے نمونوں کی اور کوئی سطر نہیں۔ اس طرح یہ کتاب تاریخِ ادب نہیں، ادب کے ارتقا پر ایک طویل مضمون ہے اور بس۔

Scanned by CamScanner

تیرھواں باب

عبدالقیوم: ''تاریخِ ادبِ اردو''، جلد اوّل

ہندوستان کے اہلِ اردو اس تاریخ ادب کے نام سے بھی واقف نہیں۔ پاکستان میں بھی اسے کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کے مرتب عبدالقیوم ایم اے، لیکچرر اردو، کراچی یونی ورسٹی ہیں۔ انھوں نے مجوزہ تاریخ کو چار جلدوں میں تقسیم کیا:

پہلی جلد ۱۲۰۷ء تا ۱۷۰۷ء (اورنگ زیب کی وفات تک۔)

دوسری جلد ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء

تیسری جلد ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء (پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہونے تک۔)

چوتھی جلد ۱۹۱۴ء سے موجودہ دور تک۔

ان میں صرف پہلی جلد لکھی گئی اور شائع ہو سکی۔ بقیہ جلدیں علی گڑھ تاریخ ادب کی طرح کتمِ عدم ہی میں رہیں۔ عبدالقیوم نے چار دوسرے افراد کے ساتھ مل کر جلد اوّل کو دس ابواب میں لکھا۔ صفحات چھوٹے سائز کے ۴۰۷ صفحے ہیں۔ کتاب کو پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز، ۱۲، میری روڈ کراچی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس نادر کتاب کی ذاتی جلد مجھے اسلام آباد سے مستعار بھیجی جس کے لیے میں تہِ دل سے ان کا ممنون ہوں۔

پیش لفظ میں عبدالقیوم شاکی ہیں کہ مغربی اثرات کی وجہ سے ادبی تاریخ کو سیاسی اعتبار سے مرتب کیا جانے لگا جیسے نکلسن اور جرجی زیدان کی عربی ادب کی تاریخیں اور براؤن کی ایران کی ادبی تاریخ۔ قیوم لکھتے ہیں کہ:

> ادبی تاریخ کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ وہ ادبی زیادہ ہو، تاریخی کم۔
>
> (پیش لفظ، ص ۱۹-۱۸)

مرتب کے اس اصول کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ کتاب کے دس ابواب میں چار یا کم از کم تین تاریخی ہیں:

باب ۱: پس منظر۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت، از یونس حسن فروغ علوی، لیکچرر عثمانیہ کالج، کراچی۔

Scanned by CamScanner

باب ۲۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت برِّصغیر کے سیاسی و سماجی حالات، از ڈاکٹر سید معین الحق جنرل سیکریٹری و ڈائریکٹر آف ریسرچ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔

باب ۳۔ مغلیہ عہد کی سیاسی و سماجی حالت، از معین الحق۔

باب ۴۔ دیسی زبانوں کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ، از حبیب اللہ خاں غضنفر، لیکچرر اردو کالج، کراچی۔

باب ۵۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مختلف نظریے، از غضنفر۔

اس طرح پانچ باب تمہیدی ہو گئے ہیں اور محض پانچ تاریخ ادب سے متعلق ہیں۔ ان میں باب ۶ تا ۸ دکنی ادب کے ہیں، جنھیں سخاوت مرزا نے لکھا۔ آخری دو باب یعنی ۸ اور ۹ شمالی ہند کے ادب پر ہیں، انھیں عبدالقیوم نے لکھا ہے۔ پیش لفظ بھی انھیں کے قلم سے ہے کیونکہ یہی مرتب ہیں۔ ذیل میں مختلف تحریروں پر اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

پیش لفظ میں ص ۱۶ پر اردو کی تاریخوں کے نام گنواتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا نام "کاشف الحق" ہے۔ یہ "کاشف الحقائق" کی تخریب ہے۔ دراصل یہ کسی طرح ادبی تاریخ نہیں، "مقدمۂ شعر و شاعری" کی طرح تنقیدی کارنامہ ہے۔ ایک کتاب کا نام "تاریخ نظم و نثرِ اردو" لکھا ہے۔ چونکہ یہ مشہور کتاب نہیں، اس لیے بہتر ہوتا کہ اس کے مولف آغا محمد باقر کا نام بھی دے دیتے۔ تاریخوں کے نام زمانی ترتیب سے لکھنے چاہییں تھے۔ باقر کی تالیف رام بابو سکسینہ کی تاریخ کا خلاصہ ہے، لیکن تلخیص کا نام پہلے اور اصل کتاب کا بہت بعد میں دیا ہے۔ حیرت ہے کہ عبدالقیوم دکنی ادب کی اہمیت کے منکر ہیں۔ لکھتے ہیں:

> اردو میں ادب کی ترقی تقریباً دو سو سال سے شروع ہوئی ہے۔ اس سے قبل جو کچھ ہے وہ محض تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس دور میں اردو کا سرمایہ صوفیاے کرام کے اقوال اور قصوں کہانیوں تک محدود تھا۔ یہ زبان کے ابتدائی نمونے ہیں جو ہمارے لیے بالکل اجنبی ہیں ... اس دور میں فارسی اثرات اس قدر غالب تھے کہ اردو کے دورِ اوّل کے شعرا شعراے فارسی کی لَے سے لَے ملاتے نظر آتے ہیں ... ایک عرصے تک گویا اردو فارسی کے پروں سے اُڑتی رہی۔
>
> (پیش لفظ، ص ۱۸)

دکنی ادب سے مغائرت کی یہ آواز "سیرالمصنفین" کے مصنف کی آوازِ بازگشت ہے۔ ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ دکنی ادب صوفیوں کے فرمودات اور قصے کہانیوں تک محدود تھا۔ انھوں نے دکن کی شاہکار مثنویوں اور غزلوں کو فراموش کر دیا۔ سب سے زیادہ

Scanned by CamScanner

حیرت انگیز یہ ہے کہ وہ دکنی ادب کو فارسی سے متاثر بتاتے ہیں۔ شمالی ہند کے ادب کے مقابلے میں دکنی ادب پر فارسی اثرات کم اور ہندی اثرات بہت زیادہ ہیں۔

ص ۲۰ پر وہ انگریزی اثرات کے تحت ادبی تاریخ میں سیاسی اور سماجی ماحول کی تفصیل دینے پر معترض ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ٹین کا یہ نظریہ انیسویں صدی میں مقبول ہوا، لیکن اس نظریے کی رُو سے معاشرتی حالات کا جاننا جس قدر ضروری سمجھا گیا ہے، وہ بحث طلب ہے۔ (ص ۲۰)

ان کا یہ مشاہدہ توجہ طلب ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو فن کار اپنے ماحول اور تحریکات سے علاحدہ رہ کر اپنا الگ راستہ نکالتے ہیں۔ مثال میں وہ محمد حسین آزاد اور داغ کو پیش کرتے ہیں۔ بقول ان کے آزاد کی "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" سرسید کے جدید اثرات سے آزاد ہیں۔

پیش لفظ ص ۲۴ پر ختم ہوتا ہے جس کے آگے متنِ کتاب ہے۔ اسے ازسرِنو ص ۱ سے شروع کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب میں ص ۱ تا ۲۴ مکرر ہیں۔ متن کے ان صفحوں کا حوالہ دینا ہو تو صفحے کے نمبر شمار کے آگے لاحقہ "متن" بڑھانا ضروری ہو گا۔ باب اوّل کا متن میں کوئی عنوان نہیں دیا، لیکن فہرست میں ہے۔

پس منظر۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت، از یونس حسن فروغ علوی۔ یہ باب قطعاً غیر ضروری ہے۔ اس کا اردو ادب سے دور دور تک کوئی علاقہ نہیں۔ اس میں انھوں نے جو لسانیاتی دعوے کیے ہیں، ان میں سے بعض کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا، مثلاً:

۱۔ نیپالی، بھوٹانی اور آسامی کو ہندوستان کی اصل قدیم زبانیں تسلیم کرنا چاہیے (ص ۶)۔

۲۔ قوم دراوڑ کی زبان سامی قبیلے کی عربی سے ملتی جلتی زبان تھی (ص ۴۳)۔

۳۔ پالی اور شورسینی دو الگ الگ زبانیں نہ تھیں، بلکہ دونوں ایک ہی زبان کے علاقائی نام تھے (ص ۵۲)۔

معلوم ہوتا ہے کہ یا تو لسانیات صرف فروغ علوی صاحب جانتے ہیں، لسانیات کے مشہور علما نہیں جانتے یا پھر علوی صاحب اس فن کی مبادیات سے بھی واقف نہیں کہ دراوڑی زبانوں کو عربی سے مماثل اور بھوٹانی کو ہندوستان کی اصل زبان سمجھتے ہیں۔ وہ ایک اہم انکشاف کرتے ہیں کہ کوٹ ڈیجی کی تہذیب ہندوستان کی قدیم ترین تہذیب تھی۔ کوٹ ڈیجی میں اوپر تلے ۱۱ آبادیوں کی تہیں ملتی ہیں جن کے باشندے تقریباً ۳۰۰۰ ق م میں یہاں

Scanned by CamScanner

آئے اور چار پانچ سو سال تک آباد رہے حتیٰ کہ وادیِ سندھ کے لوگوں نے ان کی جگہ لے لی (ص ۷-۶)

میں نے کوٹ ڈیجی اور اس کی تہذیب کا نام کبھی نہیں سنا۔ فروغ صاحب نے زبانوں اور نسلوں کے معاملے، بغیر سمجھے، انگریزی کتابوں سے نقل کیے ہیں، جن میں اپنے تعصب کی آمیزش کی ہے۔ وہ آریاؤں سے بطورِ خاص پرخاش رکھتے ہیں۔ ان کے لیے لکھتے ہیں:

> یہ ایک جاہل اور پس ماندہ قوم تھی جو تہذیب و ثقافت، علم و عقل میں اس برصغیر کے پرانے باشندوں کی قطعاً ہم سر نہ تھی اور درحقیقت یہی سبب تھا جس کی بنا پر ان کو اپنی دیوبانی زبان یا مذہب اور ثقافت کی غیر معمولی حفاظت کی ضرورت پڑی ... چھوت چھات کے اس قدر شدید اور احمقانہ قاعدے وضع کیے۔
>
> (ص ۲۲)

آریا جاہل نہ تھے۔ وہ ہندوستان میں آنے سے پہلے ہی "رگ وید" کے ابتدائی حصے تصنیف کر چکے تھے۔ نسلوں اور قوموں کے بارے میں بھی فروغ علوی کے کئی نظریات مسلمات سے الگ ہیں، مثلاً:

۱۔ وادیِ سندھ کی آبادی میں نصف سے زیادہ بحرِ روی نسل سے تعلق رکھتے تھے (ص ۱۰)۔

۲۔ بدھ اور مہاویر کے عہد کے چھتری راجا تورانی نسل سے تھے (ص ۲۴)۔

۳۔ راجپوت آریا نہ تھے، بلکہ مغل اور تاتاری نسل سے تعلق رکھتے تھے (ص ۳۴)۔

۴۔ گوجر سب کے سب مسلمان ہیں (ص ۳۸، پہلی سطر)۔

وہ قدیم ہندوستان، وہاں کی زبانوں اور سنسکرت ناموں سے اس قدر ناآشنا ہیں کہ انگریزی کتابوں میں غلط سلط قرأت کر کے مسخ کرتے ہیں۔ چند نام ذیل میں دیے جاتے ہیں۔ قوسین میں بعض کا صحیح تلفظ درج کرتا ہوں۔

ص ۲۴۔ کوشلہ (کوشل)۔ وردھمانا (وردھمان)

ص ۲۵۔ اودایانہ (اُدیان)۔ پریدیوتا پنچالا (پانچال)۔ سیسو ناگا (شِشو ناگ)۔ بمبسارا (بمبسار)۔ پٹالی پُتر (پاٹلی پُتر)۔

ص ۲۸-۲۷ پر آندھرا کو بار بار اندھرا لکھتے ہیں۔

ص ۲۸۔ گوناڈھیا (گناڈھیہ)۔ بربٹ کتھا (بربت کتھا)۔

Scanned by CamScanner

ص ۳۴۔ پارلار (پرمار)۔ گرجارا (گرجر)۔ ناگا بھات (ناگ بھٹ)۔
ص ۳۶۔ گھمان راسو (کھمان راسو)۔
ص ۳۷۔ راجہ بیلدیو (راجہ بیسل دیو)۔ بیلدیو راسو (بیسل دیو راسو)۔
مزید مثالیں نہ دے کر دو جملے نقل کرتا ہوں:

> ۳۲۰ ق م میں چندر گپت موریا، جس کو چناکا بھی کہتے تھے، نے شمالی مغربی راجاؤں کی مدد سے نندا کے بیٹوں کو شکست دی اور خود پٹالی پتر کا راجا بن گیا۔ (ص ۲۶)

"چناکا" تخریب ہے چانکیہ کی۔ چانکیہ چندر گپت کا نام نہیں تھا، وہ چندر گپت کا مُشیر اور وزیر تھا۔ نندا کا صحیح تلفظ نند اور پٹالی پُتر کا پاٹلی پُتر ہے مؤلف: "ایندھرا، چناکا اور پٹالی پُتر۔" لاعلمی کی اس متاع کو لے کر قدیم ہندوستان اور اس کی قدیم زبانوں کی تاریخ لکھنے چلے ہیں، اس جسارت کی داد دینی چاہیے۔ الغرض نیم پختہ معلومات کا یہ باب اردو ادب کی تاریخ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔

دوسرا باب، "مسلمانوں کی آمد کے وقت برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات" ہے اور تیسرا باب، "مغلیہ عہد کی سیاسی و سماجی حالت" ہے۔ یہ باب اورنگ زیب سے آگے نہیں بڑھتا۔ سچ یہ ہے کہ تاریخ کے اہم واقعات سے عام واقفیت کے دورِ حاضر میں یہ دونوں ابواب اردو ادب کی تفہیم میں کوئی مدد نہیں دیتے۔ یہ محض رواجِ عام کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں مغلیہ عہد کے فارسی شاعروں کا ذکر ہے۔ اردو شاعری کو ان سے کیا واسطہ۔ مضمون نگار ان ابواب میں اس قسم کے جملے لکھتے ہیں:

> برہمنی اقتدار اور تقسیم ذات کی سخت گیر پابندیوں نے ہند پاکستانی سماج کے جن اصولوں اور روایات کو مقدس اور محترم بنا دیا تھا۔
> (باب ۲، ص ۴۷)

> ہند پاکستان میں اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کی پالیسی پر عمل کیا۔ (باب ۳، ص ۱۱۶)

پاکستان ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ قرونِ وُسطا میں پاکستان کا ذکر کرنا غیر تاریخی طریق ہے۔ ص ۸۳ پر بابر سے منسوب وہ شعر لکھتے ہیں جس کا مصرعِ ثانی ہے:

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جمیل جالبی کے مطابق یہ مصرع ظہیر الدین بابر کا نہیں، بلکہ اس کے چچا ابوالقاسم مرزا بابر کا ہے ("تاریخِ ادبِ اردو"، جلد اوّل، ص ۳۶۶ فٹ نوٹ)۔

Scanned by CamScanner

مرتب نے پیش لفظ میں اعتراض کیا تھا کہ ادبی تاریخ میں سیاسی اور معاشرتی حالات کی تفصیل ضروری نہیں، اس کے باوصف یہ تین باب لکھوائے جو بالکل حشو ہیں۔ ان کو حذف کر دیا جائے تو اردو ادب کے پس منظر کو سمجھنے میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔

چوتھا باب، "دیسی زبانوں کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ" حبیب اللہ خاں غضنفر نے لکھا ہے۔ اس میں اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں مسلمانوں کے حصے کی جھلک دکھائی ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں صرف بنگالی اور ہندی کی بولیوں، بالخصوص اودھی کو لیا ہے۔ بنگالی کی سترھویں صدی کی دو طویل نظمیں اہلِ اردو کی دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ پہلی محمد کبیر کی "مدھومالتی" ہے۔ اس میں منوہر اور مدھومالتی کا وہی قصہ ہے جو ہندی میں منجھن نے اور دکنی میں نصرتی نے مثنوی "گلشنِ عشق" میں نظم کیا۔ منجھن کی نظم کا سنہ معلوم نہیں، لیکن یہ محمد کبیر پر مقدم معلوم ہوتی ہے۔ دوسری اہم طویل نظم نوازش خاں کی "گل بکاولی" ہے۔ نوازش کا وطن چاٹگام (چٹاگانگ) کے سات کنیا تھانے کا گاؤں سکھ چاری تھا۔ یہ "گل بکاولی" "ودیا ناتھ رائے کی فرمائش پر قلم بند کی گئی (ص ۱۴۶-۱۴۷)۔

ان کے علاوہ دولت قاضی کی نظم "ستی مینا، لور چند رانی" بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس نے یہ اراکان (برما) میں جا کر لکھی (ص ۱۴۷-۱۴۸)۔ اسی قصے کی ایک روایت غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" یا "چندا لورک" ہے۔ بنگلہ کے اہم شاعر علاول نے فارسی کی پانچ مثنویوں کا بنگلہ نظم میں ترجمہ کیا۔ ان میں سے چار جو اردو میں بھی ملتی ہیں، یہ ہیں:

۱۔ "پدماوتی"، ۲۔ "ہفت پیکر"، ۳۔ "سیف الملک"، ۴۔ "سکندر نامہ" (ص ۱۵۰)۔

مقالہ نگار نے کبیر پر تفصیل اور تحقیق سے لکھا ہے۔ ہندی بولیوں کی شاعری کا بیان خوب ہے۔ پورا باب متوازن ہے۔

پانچواں باب، "اردو کے آغاز و ارتقا کے مختلف نظریے" بھی حبیب اللہ خاں غضنفر ہی کا لکھا ہوا ہے۔ لسانیاتی باب اگر کوئی ماہر لسانیات لکھے تو وہ نقد و نظر سے کام لے گا۔ محض ادب شناس اس موضوع کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ غضنفر نے کیا یہ ہے کہ مختلف علما کے بیانوں کو ان کی کتاب سے لے کر متعدد صفحات میں خلاصہ کر دیا ہے۔ میر امن نے "باغ و بہار" میں اپنا نظریہ کوئی سوا صفحے میں لکھا تھا۔ غضنفر نے اسے ایک صفحے میں لکھ کر یہ تبصرہ کیا ہے:

> یہ حقیقت میں کوئی نظریہ نہیں ہے، صرف ایک روایت ہے اور وہ بھی یہ ہے کہ دارالحکومت دہلی کی زبان اس برِصغیر کے تمام شہروں سے بہتر ہے۔ (ص ۱۹۲)

انھوں نے میرامن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ امن نے اردو کے آغاز کا سب سے مقبول نظریہ پیش کیا کہ یہ اکبر و شاہ جہاں کے عہد میں بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ اختلاط کے اس نظریے کو بعد کے متعدد علما نے اپنایا۔

محمود شیرانی کے نظریے کا آغاز ص ۲۰۴ کے آخر سے ہوتا ہے اور ص ۲۶۲ کی ابتدا میں ختم ہوتا ہے، یعنی کُل ۵۷ صفحوں کو محیط ہے۔ بیچ بیچ میں اس پر مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری اور خود غضنفر کی تنقید بھی ہے۔ شیرانی کے نظریے کا خلاصہ ایک صفحے میں اور اس پر تنقید مزید ایک صفحے میں دی جا سکتی ہے۔ پچاس ساٹھ صفحے دینا صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس نظریے کو پڑھ کر ہضم نہیں کر پائے، اس پر عبور نہیں پا سکے کہ اس کا نچوڑ پیش کر سکتے۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شیرانی کے بعد انھوں نے رام بابو سکسینہ کا نظریہ پانچ صفحوں میں پیش کیا ہے۔ انھیں یہ اندازہ نہیں کہ ہر راوی موجد نہیں ہوتا۔ رام بابو سکسینہ نے دوسروں کے خیالات پیش کیے ہیں، وہ خود کسی نظریے کے بانی نہیں۔ غضنفر نے ص ۲۶۹ سے ۲۹۷ تک ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا نظریہ دیا ہے اور اس پر قدرے تنقید کی ہے۔ اس کے بعد تفصیل سے ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتابوں کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ نام لینے کی حد تک ص ۳۲۰ پر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر زور کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن نصیرالدین ہاشمی اور سلیمان ندوی کے نظریوں کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال کسی کے نظریے کو پیش کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ۴۰۔۳۰ صفحوں میں اس کی کتاب کی تلخیص کر دی جائے۔ اس پر تنقید کو بھی بیچ بیچ میں ملا کر پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اسے علاحدہ صراحت سے نہیں پڑھا جا سکتا۔ لسانیاتی جائزے کا یہ باب تشفی بخش نہیں۔

تمہیدی پانچ بابوں کے بعد تاریخِ ادب شروع ہوتی ہے جس میں باب ۶ تا ۸ دکنی ادب کے بارے میں ہیں اور انھیں سخاوت مرزا نے لکھا ہے۔ پوری کتاب میں اسی فاضل مقالہ نگار نے اپنی تحریر کو ماہر کی حیثیت سے لکھا ہے اور اس لیے یہ ابواب معلومات افروز ہیں۔ دکنی نظم کو دو باب دیے ہیں ۶ اور ۷۔ چھٹے باب کے چار حصے ہیں: بہمنی دور، بیدر، گجرات، عادل شاہی دور (یعنی بیجاپور)۔ ساتواں باب محض قطب شاہی نظم کے بارے میں ہے۔ بہمنی حکومت کی ریخت کے بعد اس کی جگہ جو حکومتیں بنیں ان میں سے کم از کم تین اردو ادب کے سلسلے میں اہم ہیں: بیدر کی برید شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی۔ سخاوت مرزا کو بہمنی دور کے بعد اس کی ذریات کو لینا چاہیے تھا، بیچ میں گجرات کو نہیں ڈال دینا چاہیے تھا۔ بہتر ہوتا کہ سب سے پہلے گجرات کا ذکر کرتے اور اس کے بعد بہمنی اور اس کی

Library
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Scanned by CamScanner

وارث دکنی حکومتوں کا، جیسا کہ شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" میں، علی گڑھ تاریخ میں اور جمیل جالبی کی تاریخ کی جلد اول میں کیا گیا ہے۔

پہلے چھٹے باب کو لیں۔ اس کا پہلا جزو بہمنی دور ہے۔ اس سلسلے میں دکنی نثر کا پہلا مصنف شیخ عین الدین گنج العلم کو قرار دیتے ہیں (ص ۳۲۳)۔ لکھتے ہیں:

> آپ کی بعض قدیم اردو نثر کے رسالے بھی تھے (کذا) جس کا ذکر میجر اسٹوارٹ نے کیا تھا جواب ناپید ہیں۔
>
> (ص ۳۲۴)

میجر اسٹیوارٹ کون ہیں، اس کی صراحت کرنی چاہیے تھی۔ اہلِ اردو اسے چارلس اسٹیوارٹ کے نام سے جانتے ہیں جس نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی فہرست شائع کی تھی۔ اس فہرست میں گنج العلم کے رسالوں کا ذکر نہیں۔ ان رسالوں کا پہلا تعارف شمس اللہ قادری نے "اردوے قدیم" میں کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو بتایا کہ انھوں نے یہ رسالے فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس میں دیکھے تھے ("اردو نثر کا آغاز اور ارتقا"، ص ۵۸)۔ لیکن قادری نے ان رسالوں کا کوئی نمونہ، ان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی۔ اسی وجہ سے اردو کے مؤرخ عام طور سے ان کے وجود کے قائل نہیں۔ سخاوت مرزا نے ان کے وجود پر کوئی شک نہیں کیا اور ان کے ماخذ کا صحیح حوالہ بھی نہیں دیا۔

خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ہندی دانی کو ان کی فارسی تصانیف میں ہندی فقروں اور جملوں سے ثابت کیا ہے، حالانکہ مولوی عبدالحق اس کے برعکس لکھتے ہیں:

> فارسی میں ان کی بے شمار تصانیف ہیں۔ بہت تلاش اور کوشش کی کہ ان میں اردو کے کچھ جملے مل جائیں، تاکہ اتنا تو معلوم ہو جائے کہ وہ کبھی کبھی اردو میں بھی کچھ فرماتے تھے، لیکن کچھ نہ ملا۔
>
> (تبصرہ "سیر المصنفین"، رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۷)

سخاوت مرزا نے خواجہ کی دو منظومات بھی دی ہیں جن میں سے دوسری کو "راگ حقیقت" کہا ہے (ص ۳۲۷)۔ دراصل حقیقت کسی راگ کا نام نہیں۔ خانوادۂ بندہ نواز میں جکری کو حقیقت کہتے تھے۔ پہلی نظم کا ماخذ "نقل اشعار بند سماع مرسلۂ سجادہ صاحب بزرگ" دیا ہے۔ دوسری پر حوالے کا نشان ۲ درج ہے، لیکن فٹ نوٹ میں یہ حوالہ دیا ہی نہیں۔ ظاہرا اس کا بھی یہی ماخذ ہوگا۔ درگاہ کے سجادہ نشین صاحب نے سماع میں گائی جانے والی خواجہ سے منسوب نظمیں سخاوت مرزا کو لکھ کر بھیج دیں۔ ظاہر ہے کہ انتساب کے لیے یہ دلیل نہایت نحیف ہے۔

Scanned by CamScanner

اگلا عنوان سعدی دکھنی ہے۔ اس میں بار بار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بزرگ سعدی کاکوروی نہیں، بلکہ سعدی دکھنی ہیں (ص۲۹-۳۲۸)۔ اس کا ثبوت پیش نہیں کیا۔ ان کے بقول سعدی دکھنی خسرو کے معاصر تھے لیکن ان سے منسوب مشہور ریختے کی زبان عہد خسرو سے زیادہ صاف ہے۔ بہرحال نورالحسن ہاشمی نے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے کہ یہ ریختہ دراصل پنجاب کے ملا شیری کی تصنیف ہے۔ واضح ہو کہ اس نظم میں کوئی دکنی عنصر نہیں، سوا لفظ "انجواں" کے۔ ممکن ہے یہ شمالی ہند میں بھی مستعمل ہو۔

سخاوت مرزا ہجری سنہ کے بالمقابل ایک عیسوی سنہ دیتے ہیں جو بہت مخدوش ہے۔ جب تک ماہ و یوم معلوم نہ ہو کیوں کر یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہجری سنہ میں واقع ہونے والی تاریخ کے بالمقابل ایک ہی عیسوی سنہ آئے گا۔ حضرت سید محمد جون پوری کی وفات کا سنہ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء لکھا ہے۔ ہجری سنہ صحیح ہے، عیسوی غلط، ۱۵۰۵ء چاہیے۔ نصرت مہدی کے مطابق صحیح تاریخِ وفات ۱۹ ذی قعدہ ۹۱۰ھ م ۲۳ اپریل ۱۵۰۵ء ہے ("اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ"، ص۱۹)۔ سخاوت مرزا بارہا اشخاص کے ناموں کے بعد ایک سنہ لکھ دیتے ہیں، مثلاً:

> ص۳۳۵ ابوالفیض بیدری (۸۷۹ھ)۔ سلطان کلیم اللہ بہمنی ۹۳۴ھ۔ یہ واضح نہیں کرتے کہ یہ سنہ کس واقعے کے ہیں۔ ظاہرا وفات کے ہونے چاہییں۔

اشرف بیابانی کے سلسلے میں "نوسرہار" کے علاوہ ان کی دوسری تصنیف "قصہ آخرالزماں" کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ماخذ قاضی محمد فاضل کا "تذکرۂ بنج گنج" (تاریخ، ص۳۲-۳۳۱)۔ اسی حوالے سے جمیل جالبی نے بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری تھا کہ اس کتاب کا قاضی کے علاوہ اور کسی نے ذکر نہیں کیا اور یہ اب ناپید ہے۔ مشتاق بہمنی کے زمانے کے بارے میں اچھی تحقیق کی ہے (ص۳۳۵)۔

بہمنی دور کے بعد عہد سلاطینِ برید یہ بیدر کو لیتے ہیں۔ اس میں فیروز بیدری کی مثنوی "پرت نامہ" کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ایک متوسط درجے کی مثنوی ہے جیسے افضل گولکنڈوی کے معاصر عبداللہ قطب شاہ کا "محی الدین نامہ" ہے۔
>
> (ص۳۴۰)

یہ مصنف یا کاتب کی دماغی غیر حاضری کا دلچسپ نمونہ ہے۔ دوسرے جزو کو لکھنا چاہیے تھا جیسے عبداللہ قطب شاہ کے معاصر افضل گولکنڈوی کی "محی الدین نامہ"۔

Scanned by CamScanner

ص ۳۴۲ سے فصل "گجرات میں اردو" شروع ہوتی ہے۔ اس فصل میں انھوں نے کئی ایسے قدیم شعرا کا ذکر کیا ہے جن کا نام بعد کی بڑی ادبی تاریخوں میں بھی نہیں ملتا۔ اگر ملتا بھی ہے تو سبقت سخاوت مرزا ہی کو ہے مثلاً پہلے شاعر سید نورالدین محمد عرف ست گرو ویلی ثم گجراتی ہیں۔ گجری زبان میں ان کے بھجن ست پنتھی رسائل میں ملتے ہیں (ص ۳۴۲)۔ ان کا ذکر جمیل جالبی نے بھی کیا (تاریخ، جلد اوّل، ص ۹۴-۹۳)۔ سخاوت مرزا نے مزید دو شعرا پیر صدرالدین اور پیر امام الدین المعروف بہ امام شاہ کے ہندی اشعار کے نمونے دیے ہیں۔ یہ گجراتی رسم الخط میں ملے ہیں۔ ان کی زبان میں گجراتی کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔

بہاء الدین باجن کا سنہ ولادت ۷۹۰ھ اور سنہ وفات ۹۱۲ھ دے کر ان کی عمر ۱۲۰ سال لکھی ہے (ص ۳۴۴)، حالانکہ ان سنین سے ۱۲۲ سال بنتی ہے اور یہی دوسروں نے لکھی ہے۔ ان کے تخلص باجن کے بارے میں اردو کی تاریخوں میں صرف یہ ملتا ہے کہ آلاتِ موسیقی سے فرطِ شغف کی وجہ سے اپنا تخلص باجن رکھا، لیکن سخاوت مرزا نے مزید لکھا ہے کہ شیخ علی متقی جون پوری ان سے بیعت کرنے آئے تو پیر پر اعتراض کیا کہ سماع میں مزامیر جائز نہیں۔ آلاتِ موسیقی کمرے میں بند تھے۔ دفعتاً آواز آنے لگی۔ پھر کسی کو اعتراض نہ ہوا۔ اس روز سے آپ کا لقب ہی باجن ہو گیا (ص ۳۴۴)۔

گجرات کی ایک شاعرہ، شیخ وجیہ الدین کی ساس، حضرت بی بی خوند کارنی کا تذکرہ اور نمونۂ کلام پہلی بار اس تاریخ میں دکھائی دیے۔ ماخذ "نوائے ادب" جولائی ۱۹۵۷ء۔ شاہ قطب عالم گجراتی کا سنہ وفات ۸۵۰ھ لکھا ہے (ص ۳۵۱)۔ یہی مولوی عبدالحق نے "اردو کی ابتدائی نشوونما..." میں لکھا ہے لیکن نجیب اشرف ندوی نے "علی گڑھ تاریخ..." ص ۱۰۰ پر اور جمیل جالبی نے اپنی تاریخ، جلد اوّل، ص ۹۵ پر ۸۵۷ھ درج کیا ہے۔ ص ۳۵۲ پر سخاوت مرزا بتاتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" میں احمد آباد کی مسجد "رائے کھمبڑ" کا کتبہ یوں درج کرتے ہیں:

تاریخ اس مسیت کی ہوئی سو یوں مشہور
مسجد جامہ پیچ ٹھانہ یا نبی نور

۹۶۱ھ

لیکن جمیل جالبی نے قدرے مختلف متن سے ۹۶۳ھ اور نجیب اشرف ندوی اور انصار اللہ نے ۹۱۶ھ ماخوذ کیا۔ دیکھیے علی گڑھ تاریخ اور جالبی کی تاریخ کے بیان میں۔ سخاوت مرزا نے ایک اور غیر معروف نظم "وفات نامہ شاہ حسینی جند اللہ" (۹۶۳ھ تا ۱۰۳۱ھ) کا ذکر کیا ہے۔ کسی نے ان کی وفات (۱۰۳۱ھ) کے بعد یہ وفات نامہ مثنوی کی شکل میں لکھا

Scanned by CamScanner

(ص۵۶-۳۵۵)۔ اس نظم کا ذکر اور کہیں نظر نہیں آیا۔

"ولی گجراتی" عنوان دے کر ولی کے بارے میں تحقیقی انداز میں لکھا ہے۔ مطلع کرتے ہیں کہ ولی کے والد شریف محمد نے ۱۰۷۲ھ میں وفات پائی۔ ایک سند وراثتِ خاندانی، مکتوبہ ۱۰۱۶ھ میں ولی کا نام بھی درج ہے۔ اس لحاظ سے ولی کا سنہ ولادت قبل ۱۰۶۰ھ ہے (ص۳۵۹)۔ ولی کی شاہ گلشن سے ملاقات کے زمانہ و مقام کے بارے میں انھوں نے فرطِ احتیاط سے محض یہ لکھا:

> جب اس نے دہلی کا سفر کیا، یا اس سے قبل، شاہ گلشن گجراتی ثم دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ (ص۳۶۱)

ولی کی وفات کا سنہ ۱۱۱۹ھ تسلیم کرتے ہیں (ایضاً)۔ ولی کے گجراتی متبعین میں اشرف، صالح اور خروشی کا ذکر کرتے ہیں، اورنگ آبادیوں میں مِن جملہ دوسروں کے قاسم اورنگ آبادی، عاجز اور شاہ صادق اورنگ آبادی کے نام لیتے ہیں (ص۳۶۲)۔ لکھتے ہیں، بعض اکابر کی رائے میں ولی سے رسالہ "نور المعرفت" کا انتساب مشتبہ ہے (ص۳۶۳)۔

گجرات کے بعد عادل شاہی دور آتا ہے جس میں سب سے پہلے میراں جی شمس العشاق کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں میراں جی کی خود نوشت مختصر سوانح الموسوم بہ "نسل نامہ" کا خلاصہ دیتے ہیں (ص۶۶-۳۶۵)، لیکن اس کی صداقت پر کوئی سوال نہیں اٹھاتے۔

یہاں قطعِ کلام کر کے اس کتاب کی کتابت میں انتہا درجے کی بے احتیاطی کے بارے میں دو حرف کہنا چاہتا ہوں۔ ص۳۶۵ کے متن میں "نسل نامہ" پر حوالے کا نمبر۱ لکھا ہے لیکن فٹ نوٹ میں اس کا پتا نہیں۔ یہ حاشیہ ص۳۶۷ کی تہ میں ملتا ہے۔ ص۳۶۶ کے متن میں ایک حوالہ نمبر۱ درج ہے لیکن فٹ نوٹ میں غائب ہے۔ ص۳۶۷ کے متن میں حوالہ نمبر۱ ہے لیکن فٹ نوٹ میں نمبر۱ ص۳۶۵ کے نسل نامے سے متعلق ہے۔ ۳۶۷ کے متن کے حوالہ نمبر۱ کو ص۳۶۶ کے فٹ نوٹ نمبر۲ میں شرح کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ص۳۶۶ کے فٹ نوٹ میں محض حاشیہ نمبر۲ ہے، نمبر۱ ہے ہی نہیں۔ غرض عجیب خلفشار ہے۔

سخاوت مرزا نے شمس العشاق کی مثنوی "خوش نامہ" کو ۱۷۰ دوہوں پر مشتمل قرار دیا جو درست ہے (ص۳۶۸)۔ اس کے بارے میں مدیر صاحب نے فٹ نوٹ میں اعتراض کیا کہ یہ مثالیں دوہوں کی نہیں۔ اعتراض درست ہے، لیکن جناب مدیر کو حوالوں اور فٹ نوٹوں کی عدمِ مطابقت دیکھنے اور صحیح کرنے کی فرصت نہ ملی۔ شمس العشاق کی ولادت و وفات کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ سخاوت مرزا نے ایک طرف یہ اشارہ کیا کہ مؤلفِ "اولیاے

Scanned by CamScanner

دکن" نے ان کے حالات دو جگہ لکھے ہیں جن میں سنہ وفات ۹۷۲ھ اور ۹۷۰ھ درج کیا ہے (ص ۳۶۶)۔ دوسری طرف ان کے پاس "بساتین السلاطین" کا ایک خاص نسخہ ہے جس میں لکھا ہے کہ ورود میراں جی صاحب در سنہ نہ صد و شصت و شش (۹۶۶ھ)۔ اس کی بنا پر سخاوت مرزا "اولیاے دکن" کے دوسرے اندراج ۹۷۰ھ کو صحیح سنہ وفات مانتے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح تر سنہ ۹۹۴ھ ہے جو شاہ جانم کے مرثیے سے مستنبط ہوتا ہے۔

میراں جی کی تصانیف میں پہلا نام "بشارت الذکر" لکھا ہے (ص ۳۶۷)۔ یہ نظم میراں جی کی نہیں، بلکہ ان کے فرزند برہان الدین جانم کی ہے۔ ص ۳۶۸ کے وسط میں ایک پیراگراف شروع ہوتا ہے:

> اس کا صحیح نام "شہادت التحقیق" ہے، "شہادت الحقیقت" نہیں ہے۔۔۔الخ

صاف ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کچھ عبارت اور ایک دو سطریں چھوٹ گئی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں اس کا نام "شہادت الحقیقت" لکھا تھا (رسالہ "اردو"، جولائی ۱۹۲۷ء) لیکن مثنوی کا صحیح نام نہ "شہادت الحقیقت" ہے نہ "شہادت التحقیق"، بلکہ وہی صحیح کہلائے گا جو مصنف نے ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> اس نام ہے تحقیق
>
> سن شہادت التحقیق

لغوی اعتبار سے صحیح ہو کہ نہ ہو لیکن اس کا نام "شہادت التحقیق" ہی ماننا پڑے گا۔

سخاوت مرزا مولوی عبدالحق کی تقلید میں میراں جی کی ایک نثری کتاب کا نام "شرح مرغوب القلوب" لکھتے ہیں (ص ۳۶۹)۔ لیکن شمس اللہ قادری نے اسے میراں جی خدانما کی تصنیف قرار دیا ہے، جس پر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب "میراں جی خدانما" میں صاد کیا ہے۔

برہان الدین جانم کا سنہ وفات ۹۹۰ھ درج کرتے ہیں (ص ۳۶۹)۔ لیکن حسینی شاہد نے اپنی کتاب "شاہ امین الدین علی اعلیٰ" میں صحیح سنہ ۱۰۰۷ھ طے کیا ہے۔ سخاوت مرزا جانم کی ایک نظم "نکتۂ واحد" کے لیے لکھتے ہیں:

> "نکتۂ واحد" کے دو حصے ہیں، جو علی الترتیب ۱۲، ۲۹ بیت پر مشتمل ہیں اور سنین تصنیف ۹۶۷ھ اور ۹۷۷ھ ہیں۔
>
> (ص ۳۷۰)

مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۲۷ء میں اپنے مضمون "حضرت شاہ برہان

Scanned by CamScanner

الدین جانم" میں "نکتۂ واحد" کو ۱۲ شعر کی اور اس کے ساتھ اسی قبیل کی دوسری نظم کو ۲۹ شعر کی کہا ہے ("قدیم اردو"، ص ۳۰)۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ۹۶۷ھ اور ۹۷۷ھ ان کے سنینِ تصنیف ہیں۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ جانم کی نظم "نکتۂ واحد" کے نیچے ان کی زبانی دو فرمان لکھے ہیں۔ ایک کی تاریخ ٦ صفر ۹۶۷ھ اور دوسرے کی صفر ۹۷۷ھ ہے ("قدیم اردو"، ص ۲۶-۲۵)۔ ان فرمانوں کی تاریخ سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہی نظم کی تاریخ ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے کہ انجمن ترقیِ اردو ہند کے کتب خانے میں اسی طرح کی ایک اور نظم ہے، جس میں ۱٦ شعر ہیں (علی گڑھ تاریخ، ص ۲۲۷)۔ اب کون جانے کہ یہ ایک ہی نظم کے اجزا ہیں جو مختلف زمانوں میں لکھے گئے یا تین مختلف نظمیں ہیں۔

جانم کے بعد شاہ داول بیجاپوری کا ذکر ہے۔ پورے بیان میں انھیں ہر جگہ "راول" لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مصنّف نے داول ہی لکھا ہوگا جسے کاتب نے راول بنا دیا۔ عام طور پر اردو ادب کی تاریخوں میں ان کا ذکر الگ سے نہیں ملتا، اس لیے ان پر جو لکھا ہے وہ بسا غنیمت ہے۔ ان کی چار نظموں کا ذکر کیا ہے، جن میں سے پہلی کا نام ص ۳۷۳ پر "کشف وجود" لکھا ہے، لیکن اگلے صفحے پر صحیح "کشف الوجود" لکھتے ہیں۔ ان کی چوتھی نظم کا نام "ناصری نامہ" ۳۵۴ بیت لکھا ہے (ص ۳۷۴)، لیکن جمیل جالبی اس نظم کو دیکھ کر اس کا نام "ناری نامہ" اور اس کے اشعار کی تعداد تقریباً ۱۲۳۰ لکھتے ہیں (جلد اوّل، ص ۳۰۴)

اس کے آگے سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی پر لکھتے ہوئے ان کے کارناموں کے سلسلے میں کہتے ہیں:

سرکاری زبان اردو کو پھر زندہ کیا۔

(ص ۳۷۵)

یہ بات سب سے پہلے شمس اللہ قادری نے "اردوے قدیم" میں لکھی ہے اور میں نے اس موقع پر اس کی حقیقت لکھ دی ہے۔ میرا ماخذ ہے حیدر آباد کے ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کا تحقیقی مقالہ "حیدر آباد میں اردو کی ترقی: تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے" (ص ۳٦-۳۰)۔ انھوں نے فرشتہ اور خافی خاں کے بیانات میں ہندی اور ہندوی کے لیے صراحت کی کہ یہ الفاظ کسی بھی ہندوستانی زبان مثلاً سنسکرت، مراٹھی اور تیلگو تک کے لیے استعمال کر لیے جاتے تھے۔ ابراہیم نے اردو کو کبھی سرکاری زبان نہیں بنایا۔

سخاوت مرزا ابراہیم کی کتاب "نورس" کی تاریخ کے لیے لکھتے ہیں: بقولِ بعض ۱۰۰۱ھ/۱۰۱۲ھ کی تصنیف ہے (ص ۳۷۵)۔ اس کے کیا معنی ہیں، ۱۰۰۱ھ تا ۱۰۱۲ھ؟ اس کے مرتب ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین ۱۰۰۸ھ سے قبل ہو

Scanned by CamScanner

چکی تھی، لیکن اس میں بعض ایسے واقعات کا بھی ذکر ہے جو ۱۰۱۲ھ کے بعد وجود میں آئے (علی گڑھ تاریخ، ص ۲۵۳)۔ اس کی زبان کے پیشِ نظر سخاوت مرزا لکھتے ہیں: "اس کو ایک ہندی کتاب کہہ سکتے ہیں۔"

مولوی عبدالحق نے بھی بیلی کی تاریخ پر "تنقیداتِ عبدالحق" میں تبصرہ کرتے ہوئے "نورس" کو ہندی کی کتاب قرار دیا ہے۔ سخاوت مرزا "نورس" کے معنی آبِ زلال لکھتے ہیں۔ معلوم نہیں انھیں یہ معنی کہاں سے معلوم ہوئے۔ "نورس" سنسکرت شعریات کے نورسوں کی طرف اشارہ ہے اور بس۔ سخاوت لکھتے ہیں:

> ابراہیم عادل شاہ کا دکھنی کلام نہیں ملتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک نئی زبان ایجاد کی تھی جو فارسی، برج بھاشا اور مرہٹی زبان پر مشتمل تھی اور اس زبان میں اس نے ایک مرثیہ چاند سلطان کا لکھا تھا، جواب نہیں ملتا لیکن اس کا انگریزی ترجمہ بیجاپور گزیٹیر میں درج ہے۔ (ص ۳۷۶)

انگریزی ترجمے سے اصل زبان کی نوعیت نہیں کھل سکتی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی نئی زبان نہیں ہو سکتی۔ بنیادی حیثیت سے برج بھاشا ہوگی جس میں فارسی اور مرہٹی کے الفاظ بھی آئے ہوں گے، یعنی ایک قسم کی ہندوی رہی ہوگی جسے اس نے اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہوگا۔

امین کی نامکمل مثنوی "بہرام و حسن بانو" کا مختصر لسانی جائزہ مفید ہے (ص ۸۲-۳۸۱)۔ مقیمی مصنف مثنوی "چندربدن و مہیار" کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ مرزا محمد مقیم نامی کئی اشخاص گزرے ہیں، اس مثنوی کا مصنف مقیمی شہدی ہے (ص ۸۳-۳۸۲)۔ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں تحقیق کر کے واضح کیا ہے کہ مرزا مقیم اور مقیمی دو الگ شخصیتیں تھیں۔ مرزا مقیم کی صرف ایک اردو مثنوی "فتح نامۂ بکھیری" ملتی ہے۔ "چندربدن و مہیار" مقیمی کی تصنیف ہے (جلد ۱، ص ۳۶-۳۳۵)۔ سخاوت مرزا نے اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۰۴۸ھ لکھا ہے (ص ۳۸۲)۔ ڈاکٹر زور نے بھی اسی کا متوازی سنہ ۱۶۳۸ء درج کیا ہے لیکن صاحب "دکن میں اردو" نے ۱۰۵۰ھ لکھا ہے (ص ۱۸۸)۔ مثنوی میں سنہ درج نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے دوسری مثنویوں میں اس کے حوالے کی بنا پر طے کیا کہ "چندربدن و مہیار" کی تصنیف ۱۰۳۵ھ کے بعد اور ۱۰۵۰ھ سے پہلے ہوئی (جلد ۱، ص ۲۴۲)۔ سخاوت مرزا اس قصے کے کئی راویوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں باقر آگاہ (۱۲۲۰) بھی شامل ہیں (ص ۳۸۳)۔

Scanned by CamScanner

مقیمی کے بعد ملک خوشنود کا ذکر ہے۔ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں دو نکات واضح کیے تھے ا۔ "ہشت بہشت" کا صحیح نام "جنت سنگار" ہے۔ ۲۔ ڈاکٹر زور نے ملک خشنود کی ایک مثنوی کا نام "بازارِ حسن" لکھا ہے۔ وہ ناقص مخطوطہ دراصل "جنت سنگار" ہی کا ہے (جلد اوّل، ص ۲۵۲-۲۵۳)۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ڈاکٹر جالبی کی دریافت ہیں۔ معلوم ہوا کہ سخاوت مرزا ان سے کافی پہلے یہ دونوں انکشافات کر چکے ہیں (ص ۳۸۶)۔ وہ یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ علام احمد شاہ جہاں آبادی نے خسرو کی مثنوی کا اردو نثری ترجمہ "ہشت گلشت" کے نام سے قبل ۱۲۴۶ھ کیا (ص ۳۸۹)۔ لیکن کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی فہرست کے مطابق اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۲۰ھ اور سنہ کتابت ۱۲۴۶ھ ہے (فہرست، جلد اوّل، ص ۱۵۲)۔ لیکن انڈیا آفس کی فہرست میں صحیح سنہ ۱۲۱۷ھ درج ہے۔

اس کے آگے رستمی اور "خاور نامہ" کا ذکر ہے۔ اس میں اصل فارسی کا سنہ ۸۳۸ھ اور اردو مثنوی کا سنہ ۱۰۵۹ھ لکھا ہے (ص ۳۸۹) لیکن جمیل جالبی نے فارسی کی تاریخ ۸۳۰ھ اور اردو نظم کی ۱۰۵۰ھ لکھی ہے (جلد اوّل، ص ۲۶۵)۔ ظاہراً انھوں نے شیخ چاند بن حسین کے مرتبہ "خاور نامے (کراچی، ۱۹۶۸ء) کو دیکھ کر لکھا ہے۔ اگلا بیان صنعتی کا ہے جس کی مثنوی کا نام "قصۂ تمیم انصاری" لکھا ہے (ص ۳۹۱)۔ صحیح نام "قصۂ بے نظیر" ہے۔

ایاغی کی مثنوی "نجات نامہ" کے آخری حصے سے ایک فارسی شعرِ تاریخ درج کرتے ہیں جس میں الفاظ میں سنہ ۱۲۰۴ھ کو تاریخِ تصنیف ظاہر کیا ہے۔ سخاوت مرزا کے مطابق یہ غلط ہے۔ ۱۲۰۴ھ سنہ کتابت ہو سکتا ہے (ص ۴۰۵)۔ نصیر الدین ہاشمی نے آصفیہ کی فہرست میں صاف لکھا ہے کہ ۱۲۰۴ھ سنہ کتابت ہے، آخر کے فارسی اشعار ممکن ہے ایاغی کے ہوں (فہرست، جلد اوّل، ص ۱۵۴)۔ یہ یقینی ہے کہ یہ اشعار ایاغی کے نہیں کسی اور کے ہیں۔ مثنوی میں علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کی مدح ہے، سنہ تصنیف انھیں سنین کے بیچ ہونا چاہیے۔

حسن شوقی پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ص ۴۰۷ پر اس کا تخلص شوقی لکھا ہے، لیکن کاتب نے ص ۴۰۸-۴۰۹ پر ہر جگہ اس کا تخلص شرقی دیا ہے اور کسی نے اسے درست نہیں کیا۔ شوقی کے سنہ وفات کے بارے میں سخاوت مرزا نے عجب خلفشار کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ابنِ نشاطی نے اپنی مثنوی "پھول بن" (۱۰۶۶ھ) میں حسن شوقی کو مرحوم لکھا ہے، اس لیے شوقی نے ۱۰۶۷ھ (کذا) میں وفات پائی (ص ۴۰۸)۔ ۱۰۶۶ھ کی نظم میں ۱۰۶۷ھ کے انتقال کی کیوں کر خبر دی جا سکتی تھی۔ جمیل جالبی نے ایک دوسرا استدلال کیا ہے کہ چونکہ ۱۰۴۳ھ میں شوقی کو سفیر کی حیثیت سے گولکنڈہ بھیجا گیا تھا اور وہ "پھول بن" کی تصنیف

Scanned by CamScanner

سے پہلے فوت ہو چکا تھا اس لیے سالِ وفات اندازاً ۱۰۴۳ھ اور ۱۰۵۰ھ کے درمیان متعین کر سکتے ہیں (ص ۲۸۱)۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جالبی نے آخری حد ۱۰۶۶ھ کے بجائے ۱۰۵۰ھ کیوں طے کی۔

شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا سنہ ولادت ۹۹۰ھ اور تاریخِ وفات ۲۴ رمضان ۱۰۸۶ھ لکھتے ہیں (ص ۴۱۲)۔ دونوں تاریخیں غلط ہیں۔ اعلیٰ کے مقالہ نگار حسینی شاہد نے ان کی تاریخِ پیدائش ۲۳ رمضان ۱۰۰۷ھ اور تاریخ وفات ۲۳ جمادی الاوّل ۱۰۸۵ھ لکھی ہے (مقالہ ص ۱۱۹ و ۱۵۰)۔ سخاوت مرزا ہاشمی بیجاپوری کے سنہ وفات کے بارے میں مختلف روایتیں درج کر کے صحیح تاریخِ وفات ۱۱۰۹ھ تسلیم کرتے ہیں (ص ۴۱۶)۔ انھوں نے عبدالمومن مہدوی کی مثنوی "اسرارِ عشق" کی تاریخ ۱۰۹۳ھ درج کی ہے (ص ۴۲۴)، جب کہ جمیل جالبی نے ۱۰۹۱ھ (تاریخ، جلد اوّل، ص ۱۳۳) جو مثنوی میں دیے مصرعِ تاریخ کے پیشِ نظر غلط ہے۔ شاہ حسین ذوقی کے بیان میں مقالہ نگار نے ان کی ایسی کئی تصانیف کے نام لکھے ہیں جو عام طور پر معروف نہیں (ص ۲۷-۴۲۶)۔ لیکن ان کی سب سے مشہور مثنوی "وصال العاشقین" کا ذکر نہیں کرتے جس میں "سب رس" کے قصے کو نظم کیا ہے۔

قاضی محمود بحری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> بحری کی تاریخِ ولادت کا پتا نہیں چلتا۔ ان کے مرشد کا انتقال ۱۰۸۹ھ میں ہوا۔ بحری بیس سال ان کی صحبت میں رہے۔ اس لحاظ سے بحری کی تاریخِ وفات تقریباً ۱۰۴۲ھ قرار پاتی ہے۔
>
> (ص ۴۲۸)

اگلے صفحے پر بحری کا سنہ وفات ۱۱۳۰ھ لکھتے ہیں جو صحیح ہے۔ ظاہر ہے اوپر کے بیان میں ۱۰۴۲ھ کو بحری کی تاریخِ وفات نہیں، تاریخِ ولادت ظاہر کیا ہوگا۔ "وفات" لکھنا کاتب یا مصنف کا سہو ہے۔ مرشد کے انتقال ۱۰۸۹ھ سے خلیفہ کی تاریخِ ولادت ۱۰۴۲ھ کیسے برآمد کی؟ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں ان کے مرشد کا سنہ وفات ۱۰۷۳ھ لکھا ہے (ص ۵۲۰، حاشیہ)۔ کون جانے کہ بحری کس عمر میں مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اس لیے ان کے سنہ ولادت کا تخمینہ لگانا احتیاط کے منافی ہے۔

شاہ طاہر کرنولی پر تفصیل سے لکھا ہے اور یہ معلومات افروز ہے، کیونکہ دوسری تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ان کے "خوانِ یغما یعنی نصاب صبیاں" کا تعارف قابلِ قدر تحقیق ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اس نصاب سے میں واقف نہ تھا۔ سخاوت مرزا کا یہ بیان بھی ان کی معلومات پر دال ہے کہ سب سے قدیم نصاب "نصابِ

آ بے چند" ۹۶۰ھ ہے (ص ۴۳۴)۔ طاہر کا نصابِ صبیان فارسی میں ہے لیکن اس میں اردو الفاظ بھی ملتے ہیں۔ مقالہ نگار نے شاہ طاہر کے چند اردو اشعار بھی دیے ہیں (ص ۳۶-۴۳۵)۔ ص ۴۳۶ پر شاہ قادر لنگا کا سنہ وفات ۱۱۲۶ھ/۱۴۱۷ء دیا ہے جو عام طور سے ادبی تاریخوں میں دکھائی نہیں دیتا۔

ص ۴۳۷ پر شیخ داؤد ضعیفی کی دو کتابوں کے ناموں پر توجہ چاہتا ہوں۔ ایک کتاب کا نام "ہدایت نامہ" لکھا ہے۔ جمیل جالبی نے اس کا مخطوطہ دیکھ کر اس کا نام "ہدایت الہندی" لکھا ہے (جلد ۱، ص ۵۱۲)۔ نصیر الدین ہاشمی نے آصفیہ کی فہرست میں اس کے نسخوں کے عنوان "ہدایت نامۂ ہندی"، "ہدایاتِ ہندی" اور "ہدایات الہندی" لکھے ہیں (جلد دوم، ص ۷۹-۷۵) لیکن خود ہی لکھتے ہیں کہ مصنف نے کتاب کا نام "ہدایت الہندی" لکھا ہے، اسی کو صحیح ماننا چاہیے (ص ۷۶)۔ دوسری کتاب کا نام سخاوت مرزا نے "نقل نامہ یا نصیحتِ بدن" لکھا ہے لیکن نصیر الدین ہاشمی نے اس کا نام "نصیحتِ بدن" لکھا ہے (فہرستِ آصفیہ، جلد ۲، ص ۱۵۴، نیز "دکن میں اردو"، ص ۳۱۰)۔ سخاوت مرزا نے شاہ معظم بیجاپوری کے بارے میں مختصراً لکھا ہے، لیکن اس ایک آدھ صفحے میں ان کی جتنی تصانیف کے نام لکھ دیے ہیں وہ دوسری جگہ نہیں ملتے۔ بعد میں ۱۹۷۸ء میں حسینی شاہد نے شاہ معظم پر اپنی مفصل کتاب شائع کر دی۔

ساتواں باب "اردو نظم، دکن میں قطب شاہی" بھی سخاوت مرزا نے لکھا ہے۔ اس کی ابتدا میں ملا حسین طبسی گولکنڈوی کی فارسی کتاب "صیدیہ یا شکار نامۂ قطب شاہی" کا ذکر کیا ہے جس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں جانوروں کے تقریباً ۷۵ دکنی نام دیے ہیں (ص ۴۴۲-۴۴۱)۔ قلی قطب شاہ کے سیر حاصل بیان میں یہ دلچسپ اطلاع بہم پہنچاتے ہیں کہ اس کی مشہور غزل ع:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا

غواصی کے دیوان میں بھی ہے۔ فارسی دیوانِ وجہی کے ایک شعر سے معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام اسد اللہ تھا۔ اس دریافت کا سہرا حیدر آباد کے اختر حسن کے سر تھا، جنھوں نے متعلقہ فارسی شعر "سب رس" حیدر آباد، جنوری فروری ۱۹۶۲ء میں شائع کیا، لیکن سخاوت مرزا ان سے بہت پہلے اس دریافت کو ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والی کتاب میں درج کر چکے ہیں (ص ۴۵۳)۔ حیرت ہے کہ اپنے انکشاف کے باوجود وجہی کے بیان کا عنوان "وجیہ الدین محمد، وجہی" لکھتے ہیں۔ شاعر کے خود بتائے ہوئے نام پر دوسرے نام کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

Scanned by CamScanner

غواصی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ جامعۂ عثمانیہ میں ایک عربی مخطوطے کا کاتب شیخ حسین بہاءالدین الملقب بہ غواصی ہے۔ قیاس کرتے ہیں کہ یہی شاعر غواصی ہوگا۔ اس سے پہلے وہ یہی بات اپنے مضمون "ملک الشعرا غواصی اور اس کا کلام" ("اورینٹل کالج میگزین"، لاہور، نومبر ۱۹۵۶ء) میں کہہ چکے ہیں۔ اس کی تردید ڈاکٹر جمال شریف نے اپنے مضمون "غواصی کا نام" ("سب رس"، جنوری ۱۹۶۸ء) میں کی۔ انھوں نے دو رباعیوں کی بنا پر غواصی کی کنیت ابو محمد طے کی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر بھی اس پر صاد کرتے ہیں (۱)۔ سخاوت مرزا نے اپنے مضمون "ملک الشعرا غواصی اور اس کا کلام" ("اردو"، اکتوبر ۱۹۵۴ء) میں غواصی کے پیر کا نام شاہ حیدر ثانی لکھا ہے اور یہی بات عبدالقیوم کی تاریخِ ادب میں لکھی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے نہایت تفصیل سے سیّد شاہ ابوالحسن علی حیدر ثانی کا شجرۂ بیعت دیا ہے اور غواصی کا بھی، جس کے مطابق وہ سیّد حیدر ولی اللہ بغدادی کے مرید تھے (اثر: "غواصی"، ص۵۵-۳۸)

ابنِ نشاطی کے حالات میں لکھتے ہیں: شیخ محمد مظہرالدین ابنِ شیخ فخرالدین معروف بہ ابنِ نشاطی المتخلص بہ نشاطی کے حالات تاریکی میں ہیں۔ مدّتوں بعد نام کا پتا چلا ہے (ص۴۸۱)۔ معلوم نہیں ان سے پہلے بھی کسی نے اس کا پورا نام لکھا تھا کہ نہیں، لیکن انھوں نے ایک اور الجھن کھڑی کر دی کہ اس کا عرف ابنِ نشاطی اور تخلص محض نشاطی تھا۔ کسی اور نے تخلص محض نشاطی نہیں لکھا۔ ان کے اس بیان پر میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ کسی کا تخلص یا لقب ابنِ نشاطی اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس کے والد کا تخلص نشاطی ہو۔ کیا شیخ فخرالدین کا تخلص نشاطی تھا، جس کی وجہ سے ان کے بیٹے مظہرالدین کی شناخت ابنِ نشاطی سے کی جاتی ہے۔

سخاوت مرزا اس کی مثنوی "پھول بن" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعض نسخوں میں اس کا سنہِ تصنیف ۱۰۶۶ھ اور بعض میں ۱۰۷۶ھ دیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ص۴۰۸ پر اس کا سنہ ۱۰۶۶ھ اور ص۴۳۹ پر ۱۰۷۶ھ لکھا ہے۔ ص۴۸۱ پر مختلف سطور میں دونوں سنہ دیے ہیں۔ کسی ایک کو ترجیح دے کر اختیار کر لینا چاہیے تھا۔

انھوں نے تمام قطب شاہی اکابر شعرا پر سیر حاصل طریقے پر لکھا ہے۔ اس کے آگے قطبی رازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

خود کو رازی لکھا ہے اور رازی تخلص اختیار کیا ہے۔ (ص۴۸۶)

---

(۱) "غواصی، شخصیت اور فن"، حیدر آباد، اگست ۱۹۷۷ء، ص۴۸-۴۶

Scanned by CamScanner

یہ "تحفۃ النصائح" کا مترجم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق اس کا نام قطب اور تخلص رازی (رازی نہیں) ہے، قطبی ایک دوسرا شاعر ہے (جالبی، جلد ۱، ص۴۸۶)۔ مجھے جالبی صاحب کے دعوے میں شبہ ہے۔ دیکھیے ان کی تاریخ پر تبصرے کے ضمن میں۔

اس باب کے آخری حصے میں سخاوت مرزا نے کئی ایسے شعرا کا بیان کیا ہے جن میں سے بعض کا نام دوسری کتابوں میں بالکل نہیں ملتا، بعض کا سرسری ملتا ہے لیکن سخاوت مرزا نے عنوان کے ساتھ تفصیل اور نمونۂ کلام دیا ہے۔ ایسے شاعروں میں پہلا مرتضیٰ مصنفِ "وصل نامہ" ہے (ص۴۹۹)۔ مثنوی "سہاگن نامہ" کو انھوں نے شاہ راجو قتال ثانی گولکنڈوی سے منسوب کیا جو درست ہے (ص۱-۵۰۰) جنھوں نے ان کے جدِ کلاں شاہ راجو اوّل سے انتساب کیا وہ غلط تھا۔ ص۵۰۵ پر عبداللہ ہاشمی مصنف "دار مجالس" یا "دارالمجالس" کا ذکر پہلی بار یہیں دیکھنے میں آیا۔ دو شعر ایک شاعر مطلبی کی غزل کے درج کرتے ہیں اور یہ صاحب غالباً عبداللہ کے والد ہیں۔ آگے چل کر میراں حسینی کی مثنوی "کوک شاستر" کی تفصیل دی ہے۔ ان سے پہلے اس کا ذکر شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" (ص۶۷-۶۶) ہی میں ملتا ہے، دوسروں نے نہیں کیا۔

سید بلاقی کے "معراج نامہ" کے سلسلے میں ایک عنوان "قدیم اردو میں معراج نامے" دے کر چند معراج ناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ بلاقی کے "معراج نامہ" کا سنہ ۱۰۶۵ھ دیا ہے اور اس کے ثبوت میں شاعر کا شعر دیا ہے: "ہزار یک پنج شصت تھیں سال میں" (ص۵۱۰)، لیکن ڈاکٹر جالبی لکھتے ہیں کہ ان کی نظر سے نو قلمی نسخے گزرے ہیں جن میں سنہِ تصنیف ۱۰۵۶ھ دیا ہے (جلد اوّل، ص۴۹۳)۔ یہ ۱۰۶۵ھ کی تخریب نہیں ہو سکتا، کیونکہ جالبی نے عیسوی سنہ ۱۶۴۶ء بھی دیا ہے جو ۱۰۵۶ھ کے مطابق ہے۔

ص۵۱۳ پر محی الدین فتاحی یا فتحی کے "مولود نامہ" کا سنہ ۱۰۹۵ھ لکھتے ہیں۔ کتب خانۂ سالار جنگ میں یہ "مفید الیقین" کے نام سے ہے اور وہاں شعر میں اعداد میں اس کی تاریخ ۱۰۹۵ھ درج ہے (فہرست مخطوطات، ص۵۳۷)۔ یہی نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو"، ص۱۵۵ پر لکھا ہے، لیکن جمیل جالبی نے ایک مخطوطے میں دیکھ کر ۱۰۸۴ھ درج کی ہے (جلد ۱، ص۵۱۱)۔ یہ درست نہیں۔ سخاوت مرزا نے فتاحی کی دوسری کئی کتابوں کے نام درج کیے ہیں جن میں سے ایک "خاص الفقہ" آصفیہ لائبریری میں ہے (فہرست مخطوطات، جلد دوم، ص۷۵-۷۴)۔ فقہ میں ان کی دوسری مثنوی "شعبِ ایماں" کا ذکر سالار جنگ لائبریری کی فہرست میں ص۱۴۵ پر اور "دکن میں اردو" میں ص۱۵۵ پر ہے۔

Scanned by CamScanner

دقت یہ ہے کہ مختلف کتب میں فتاحی کے مختلف نام دیے ہیں۔ سخاوت مرزا نے اس کا نام محی الدین لکھا ہے۔ کتب خانۂ سالار جنگ میں مثنوی کا نام "شعیب ایماں" ہے (فہرست، ص۱۴۵)۔ مرتبِ فہرست نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں اس کا نام "شعب ایماں" لکھا ہے۔ فہرست کے مطابق اس میں دو شعر یوں ہیں ع:

محمد رفعتی نانوں اپنا دھریا ہوں
سو فتاحی تخلص اب کیا ہوں
سو شعیب ایماں رفعتی اس کا کیا نام
توں کر رب آخرت کو سب سرانجام

یہ اشعار "مفاعیلن مفاعیلن فعولن" کے وزن میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں شعروں کے پہلے مصرع وزن سے طویل تر ہیں۔ "دکن میں اردو" ص۱۵۷ پر دوسرے شعر کا پہلا مصرع یوں لکھا ہے ع:

سو شعب ایماں رفعتی اس کا کیا نام

میرا خیال ہے کہ دونوں اشعار کے پہلے مصرع یوں ہیں ع:

ع: محمد رفعتی نانوں دھریا ہوں
ع: شعب ایماں رفعتی اس کا کیا نام

شاعر نے "شعب" کا "ع" ساکن دبا کر پہلے دو الفاظ کو "شبی ماں" باندھا ہے۔ سالار جنگ میں دوسری مثنوی "مفید الیقین" ("مولود نامہ") ہے۔ ہاشمی نے یہاں شاعر کا نام محی الدین لکھا ہے، لیکن مثنوی میں محمد فتاحی درج ہے ع:

محمد فتاحی نبی کا غلام

ساتھ ہی رفعتی بھی لکھا ہے ع:

کیا رفعتی یو سو نادر بچن

اس طرح فتاحی اور رفعتی میں ایک شاعر کا نام اور دوسرا تخلص ہے۔ "شعب ایماں" کے مطابق رفعتی نام اور فتاحی تخلص ہے۔ آصفیہ میں مثنوی "خاص الفقہ" میں بھی شاعر نے یہی دونوں نام لکھے ہیں ع:

محمد فتاحی کیا یوں کتاب

Scanned by CamScanner

کیا رفعتی محمدِ پروردگار

او فتاحی کر شکر ہزاروں ہزار

اس طرح ایسا لگتا ہے کہ شاعر کا نام محمد رفعتی اور تخلص فتاحی ہے۔ محی الدین نام اور قسمی تخلص کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ وہ تین مثنویوں کا مصنف ہے۔ ۱۔ "مفید الیقین عرف مولود نامہ" ۱۰۹۵ھ، ۲۔ "شعب ایماں"، ۳۔ "خاص الفقہ"۔ ان کے علاوہ سخاوت مرزا نے ان کے ایک اور رسالے "معجزاتِ نبی" کے سالار جنگ میں ہونے کی خبر دی ہے، لیکن فہرست میں اس کا پتا نہ چل سکا۔

اس کے آگے شاہ سلطان ثانی کے حالات، نمونہ کلام اور تنقید بہت تفصیل سے دیے ہیں (ص۲۱-۵۱۶)۔ اور کسی کتاب میں ان کا حال علاحدہ عنوان کے تحت دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کے آگے مسلسل تین زیقوم ناموں کا ذکر ہے۔ پہلا "قصۂ زیقوم بادشاہ" ۱۰۹۲ھ داؤد شاہ فتاحی کا ہے۔ یہ غزلوں میں خاکی تخلص کرتے تھے (ص۵۲۴)۔ دوسرا محمد امین کا "زیقوم نامہ" ۱۱۹۴ھ ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس نے اپنا نام ولی بن محمد لکھا ہے (ص۵۲۵)، لیکن فہرستِ آصفیہ میں صریحاً فضل بن محمد لکھا ہے ع:

فضل بن محمد امیں یو سدا

(فہرست، جلد ۱، ص۱۱۶)

تیسرا "ذی قوم نامہ" قاسم علی کا ہے (ص۵۲۷)۔ فہرستِ سالار جنگ، ص۶۴۶ پر اس کا نام "جنگ نامہ ذقوم" دیا ہے۔

اس طرح نظم قطب شاہی کا باب ختم ہو جاتا ہے۔ دسواں باب "قدیم اردو نثر" ہے اس میں جانم سے پہلے کی جن نثری کتابوں کا ذکر ہے وہ جدید تحقیق کے مطابق غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے خواجہ گیسودراز اور ان کی "معراج العاشقین" کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل اور حسینی شاہد نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ان سے بہت بعد کے ایک بزرگ مخدوم حسینی کا کارنامہ ہے۔ سخاوت مرزا "شکار نامہ" اور "تلاوت الوجود" کا ذکر کر کے دونوں کو مشتبہ قرار دیتے ہیں (ص۵۳۰)۔ یہ ان کی بالغ نظری کی دلیل ہے۔ واضح ہو کہ مولوی عبدالحق نے "سیر المصنفین" جلد اوّل کے دوسرے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> "معراج العاشقین" میں نے ہی مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کے دیباچے میں میں نے اپنا شبہہ ظاہر کیا تھا۔ بعد کی تحقیق سے مجھے قریب قریب یقین ہو گیا ہے کہ یہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے

Scanned by CamScanner

رسالے "شمارنامہ" "معراج نامہ" وغیرہ جو ان سے منسوب کیے
جاتے ہیں۔ در حقیقت ان کی تصنیف نہیں۔ ان کے بعض مریدوں
یا عقیدت مندوں نے ان کے بعض فارسی رسالوں کا ترجمہ اردو میں
کر دیا اور وہ ان کے نام سے منسوب ہو گئے۔ فارسی میں ان کی
بے شمار تصانیف ہیں۔ بہت تلاش اور کوشش کی کہ ان میں اردو
کے کچھ جملے مل جائیں کہ اتنا تو معلوم ہو جائے کہ وہ کبھی کبھی اردو
میں بھی کچھ فرماتے تھے، لیکن کچھ نہ ملا۔

(رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۷)

سخاوت مرزا نے خواجہ گیسودراز کے بعد ان کے بڑے فرزند سید شاہ اکبر حسینی عرف میاں بڑے ف ۸۱۲ھ کا ذکر کیا ہے اور ان کے بعض اردو اشعار درج کیے ہیں۔ یہ بسا غنیمت ہیں، لیکن انھیں نظم کے باب میں درج کرنا چاہیے تھا۔ اِن کے بعد خواجہ کے چھوٹے بیٹے شاہ اصغر حسینی کا ذکر ہے، جن کے ملفوظات میں بابا فرید شکر گنج کا ایک دوہا درج کیا ہے:

کہر کیتی سنگ مری میل سے ملیا کنتہ
سجاویں کھنڈی چاہی جس بھاوے رس پنتہ

(ص ۵۳۶)

معلوم نہیں، صحیح متن کیا ہے۔ اکبر حسینی یا اصغر حسینی کا کوئی نثری جملہ درج نہیں کیا۔ ایک اردو ملفوظہ شاہ ندیم اللہ ابن شاہ ید اللہ ف ۸۳۱ھ کا درج کیا ہے: "اے جد! میں مر گیا" (ص ۵۳۶)۔ سید شاہ عبداللہ حسینی کو خواجہ گیسودراز کا نبیرہ کہا جاتا ہے۔ سخاوت مرزا نے تحقیق کی کہ وہ ان کے نبیرہ نہ تھے۔ خواجہ کے برادر نسبتی مولانا ابوالمعالی کے بیٹے سید شاہ عبداللہ حسینی تھے۔ یہی مترجم "نشاط العشق" ہو سکتے ہیں، لیکن اب یہ کتاب ناپید ہے (ص ۵۳۷)۔

شیخ محمود خوش دہاں کی دو اردو تصانیف کا ذکر کرتے ہیں۔ ۱۔ رسالۂ منظوم تصوف جسے کتب فروش نے غلطی سے "لولونامہ دایم" لکھ دیا ہے (ص ۵۴۰)۔ اس میں سے ان کے پیر شاہ برہان الدین جانم کی مدح کے اشعار نقل کرتے ہیں۔ دوسرا دکنی نثر کا رسالہ "تنبیہ الخلائق" ہے (ص ۴۲-۵۴۱) جالبی نے بھی ان دونوں کا قدرے تبدیلیِ الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے (جلد ۱، ص ۷-۳۰۶)۔ سخاوت مرزا نے نثری رسالے کا نام محض "رسالۂ تصوف" لکھا ہے۔ ان کے آگے ص ۵۴۲ پر محض "امین الدین" عنوان دیتے ہیں اور ان کی ایک کتاب

Scanned by CamScanner

"گفتارِ امین" کا ذکر کرتے ہیں۔ امین الدین کی کوئی شناخت یا تعارف نہیں دیتے۔ دراصل یہ شاہ امین الدین علی اعلیٰ ہیں۔

آگے محمد شریف کی "گنجِ مخفی" ۱۱۱۱ھ کا بیان اور نمونہ ہے (ص۴۵۔ ۵۴۳)۔ اس کا ذکر فہرست آصفیہ، جلد دوم میں ص۲۵۔ ۲۲۴ پر ہے۔ ان کے آگے محمد مخدوم عبدالحق ساوی عرف دستگیر صاحب گیان بھنڈاری متوفی حیدر آباد، ۱۱۶۵ھ کا بیان ہے۔ انھوں نے قدیم دکھنی میں بعض رسائل لکھے، جن میں "مفتح الکل عرف پنج گنج" نئے انداز میں ہے (ص۴۷۔ ۵۴۵)۔ شاہ حضرت حسینی بیجاپوری، ضعیفی (صاحب "ہدایت الہندی") جنکے پیر تھے۔ انھوں نے دکھنی نثر میں ایک رسالہ "محبوب الاسرار" لکھا ہے (ص۴۹۔ ۵۴۸)۔ مخدوم شاہ حسینی بلکانوری کے بارے میں یہ معرکے کی بات لکھی ہے کہ جو رسالہ "تلاوۃالوجود" خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہے وہ دراصل ان کا ہے۔ اس کا دوسرا نام "سوال نامہ" ہے۔ یہ لاہور کے رہنے والے تھے جو بیجاپور آکر شاہ امین کے مرید ہوگئے۔

شیخ فرید بیجاپوری متوفی ۱۰۸۶ھ سید امین الدین اعلیٰ کے بیک واسطہ مرید تھے۔ انھوں نے خواجہ امین کے اقوال پر ایک رسالہ لکھا (ص۵۵۱)۔ وجہی کے بارے میں سب سے پہلے سخاوت مرزا لکھتے ہیں کہ:

> "تاج الحقائق" اس کی تصنیف ہے، جنھوں نے اس کا نام "سبرس" "مصنفہ میرانجی شمس العشاق لکھا ہے، غلط ہے۔
>
> (ص۵۵۳)

"سب رس" کے بارے میں تعارف کا ایک بھی لفظ لکھے بغیر محض دو اقتباسات دیے ہیں۔ شاہ سلطان ثانی گولکنڈوی کے دکنی رسالے "زنجیر" سے اقتباسات دیتے ہیں (ص۵۵۸)۔

سید شاہ راجو گولکنڈوی متوفی ۱۰۹۳ھ کے رسالۂ نثر (ص۶۳۔ ۵۶۲)، ذکا حسن بیگ شاہ جہاں آبادی ثم گولکنڈوی کی "کربل کتھا" (ص۶۵۔ ۵۶۳) اور سید شاہ علی اکبر مرید شاہ امین الدین ثانی متوفی ۱۱۴۰ھ ابنِ میراں جی خدا نُما کی تصنیف "چھے سرہار" (ص۶۶۔ ۵۶۵) کا ذکر اس تاریخ کے علاوہ اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ "چھے سرہار" میں نظم کم اور نثر زیادہ ہے۔

مندرجۂ بالا تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی ادب کے بارے میں سخاوت مرزا کے لکھے ہوئے تینوں باب تحقیق کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہیں۔ انھیں کی بدولت عبدالقیوم کی تاریخ پایۂ اعتبار پاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

نواں باب "اردو نظم شمالی ہند میں" مرتب عبدالقیوم نے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے چندر بردائی کے "پرتھوی راج راسو" پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ شیرانی کے برعکس ان کا نظریہ بہت متوازن ہے۔ انھوں نے کئی علما کے نظریات پیش کیے کہ اس کا بہت کچھ حصہ الحاقی ہے لیکن بہت کچھ بارھویں صدی کی زبان میں بھی ہے۔ کہتے ہیں:

> اس طرح راسو کو کلیتاً جعلی ٹھہرانا مناسب نہیں ہے، کوشش اور تلاش سے اصل تصنیف کو موجودہ تصنیف سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ (ص ۵۷۲)

انھوں نے فرید شکر گنج کا بہت سا غیر مستند ہندی کلام نقل کیا ہے اور بعض کے بارے میں شبہہ بھی کیا ہے۔ میں نے اس کا جائزہ دوسری تاریخوں کے سلسلے میں لیا ہے۔ مخدوم علاء الدین صابر کلیری کا نہایت صاف زبان میں ایک شعر درج کر کے کہتے ہیں کہ یہ ان کا نہیں ہو سکتا (ص ۵۷۸)۔ یہ شعر تو بیسویں صدی کا معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ان کے پاس کوئی اور ہندی تخلیق ہے ہی نہیں تو ان کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ عبدالقیوم نے کچھ صوفیوں کے محض ملفوظات نقل کرنے پر اکتفا کی ہے، لیکن امیر خسرو کے ہندی کلام کو جس کثرت سے نقل کیا ہے اس کا تحقیقی جائزہ تو لیتے۔ "خالق باری" کے سلسلے میں وہ شیرانی کی تحقیق سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ بہت بعد کے کسی دوسرے خسرو کی تصنیف ہے، لیکن ڈاکٹر وحید مرزا کا وہ قول بھی نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے شیرانی سے اختلاف کیا ہے (ص ۵۸۹)۔ وحید مرزا کا قول فُٹ نوٹ میں دیا ہے۔ اتنے اہم موضوع کو متن میں دینے سے کون سی چیز مانع تھی۔

ملفوظات کے سلسلے میں لطیف الدین دریا نوش مرید خواجہ نظام الدین اولیا کا ایک ہندی شعر نقل کیا ہے (ص ۵۹۳)۔ ان کا ذکر اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ص ۵۹۳ پر لطیف الدین کے سلسلے ہی میں شرف الدین یحییٰ منیری اور ص ۶۰۸ پر شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا احوال شروع کر دیا ہے۔ کاتب یا مقالہ نگار علاحدہ عنوان درج کرنا بھول گیا۔ کبیر پر نہایت تفصیل سے اور خوب لکھا ہے۔ ان کی غزل ع:

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا

کے دو شعر نقل کر کے فُٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ اس غزل کا کبیر سے انتساب مشکوک ہے (ص ۶۰۳)۔ مشکوک کیا، یہ ان کی ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر مشکوک کلام کو غیر مشکوک کلام کے بیچ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

مقالہ نگار نے ابتدائی اردو شاعروں کے ضمن میں چندر بردائی، کبیر، گرونانک، قطبن،

Scanned by CamScanner

عبدالرحیم خانِ خاناں اور شیخ عثمان کا ذکر کیا ہے۔ لسانیات کی کتابوں میں کھڑی بولی کے نمونوں کے طور پر ان شعرا کے ہندی کلام سے استفادے میں کوئی ہرج نہیں، لیکن انھیں اردو شاعری کے طور پر کیوں کر پیش کیا جا سکتا ہے، کیا محض اس لیے کہ ان میں سے بیشتر مسلمان ہیں۔ اگر ان کے اودھی یا برج بھاشا کے کلام کو اردو کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے تو ہندی کے دوسرے قدیم شعرا کے کلام کو کیوں نہیں۔ پھر اردو ہندی کی تفریق کی کیا ضرورت ہے۔

مضمون نگار صفیر کی "جلوۂ خضر" (جلد اول، ص ۴۷) اور خیال کی "مغل اور اردو" (ص ۸) سے اکبر اعظم کی ایک اردو رباعی نقل کرتے ہیں۔ صریحاً معلوم ہوتا تھا کہ یہ اکبر کی نہیں ہو سکتی، لیکن عبدالقیوم نے یہ معرکے کا انکشاف کیا کہ فارسی رباعی "تزکِ جہاں گیری" میں درج ہے اور یہ اکبر کی نہیں، جعفر بیگ خاں آصف کی تخلیق ہے۔ "تزکِ جہاں گیری" کا اردو ترجمہ سید احمد علی رام پوری نے کیا، نثر کا نثر میں، فارسی اشعار کا اردو اشعار میں۔ اردو رباعی انھیں کی تالیف ہونی چاہیے۔

(ص ۱۵-۶۱۴)

ریختے کے مصنف سعدی کو قیوم سعدی دکھنی نہیں، سعدی کاکوروی مانتے ہیں (ص ۶/۸)۔ لیکن اسی کتاب میں سخاوت مرزا نے انھیں سعدی دکھنی لکھا ہے اور ان کے کاکوروی ہونے کی تردید کی ہے (ص ۳۲۸)۔ اس طرح ایک ہی کتاب میں سعدی کا حال دو مختلف جگہوں پر سعدی دکھنی اور سعدی کاکوروی کے تحت ہے۔ "بکٹ کہانی" کے مصنف افضل کا نام محمد افضل اور وطن جھنجانہ یا پانی پت لکھا ہے (ص ۶۲۰)۔ قطبی کے "تیرھاسے" کے مطابق اس کا نام کرپال اور وطن نار نول تھا۔ اسے والہ داغستانی کے تذکرے کے فارسی شاعر سے ملتبس کر دیا ہے حالانکہ والہ نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ یہ "بکٹ کہانی" کا مصنف تھا۔ میں اس موضوع پر علی گڑھ تاریخِ ادب کے سلسلے میں تفصیل سے لکھوں گا۔

چندر بھان کا سنہ وفات ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء، حسرت موہانی کے رسالے "اردوے معلّیٰ" بابت اگست ۱۹۰۳ء کے حوالے سے درج کرتے ہیں (ص ۶۳۶)۔ ان سے منسوب مشہور اردو غزل "ڈالا ہے...، پیالا ہے..." بھی درج کی ہے، لیکن انھوں نے اس پر توجہ نہیں کی کہ یہ غزل الحاقی ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی "دلی کا دبستانِ شاعری" (طبعِ دوم، لکھنؤ ۱۹۶۵ء، ص ۵۷-۵۶) اور بعد کی کتاب "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ" از رشید حسن خاں، ص ۱۱-۳۰۹۔ قیوم نے ص ۶۳۷ پر ولی رام ولی متوفی ۱۱۴۹ھ کی ریختہ غزل درج کی ہے۔ رشید حسن خاں نے مندرجۂ بالا حوالے میں اس غزل کو بھی تسلیم نہیں کیا۔

Scanned by CamScanner

ناصر علی اور ولی کے معرکے کے سلسلے میں آزاد نے ناصر علی کا یہ شعر درج کیا ہے:

باعجازِ سخن گر اڑ چلے وہ

ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں

عبدالقیوم یہ اہم معلومات بہم پہنچاتے ہیں کہ یہ شعر عزیز دکنی کے دیوان میں موجود ہے۔ اس نے یہ شعر ناصر علی کی حمایت میں لکھا تھا (ص ۶۴۰)۔ قیوم نے اپنا ماخذ درج نہیں کیا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اپنی مرتبہ کلیاتِ ولی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ تذکرہ محبوب الزمن میں یہ شعر عزیز دکھنی کے نام سے ہے (کلیاتِ ولی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۹)۔

اسپرنگر سے گمراہ ہو کر محبوب عالم کی عرفیت شیخ جیون لکھی ہے اور اس کی تصانیف میں پانچ مثنویاں شمار کی ہیں۔ محمود شیرانی نے ان کا غائر مطالعہ کر کے اپنے مضمون "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" ("اورینٹل کالج میگزین"، نومبر ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۲ء) میں صحیح صورتِ حال پیش کی کہ شیخ جیون ایک علاحدہ شخصیت ہے۔ یہ محبوب عالم کا دوست تھا جس نے "مسائلِ ہندی" کی تالیف کا تقاضا کیا۔ "خوابِ نامۂ پیغمبر" اور "دہیز نامۂ بی بی فاطمہ" (دہیر یا دھیر نہیں،) محبوب عالم کی نہیں، شاہ عبدالحکیم مہی کی تصنیف ہیں۔

جعفر زٹلی پر بہت مفصل اور بہت اچھا لکھا ہے۔ یہ مفید نشان دہی کی کہ ان سے منسوب رسالے "اخبارِ معلٰی" میں کچھ چیزیں الحاقی معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ اس میں عالم گیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کے عہد کے واقعات کا ذکر ہے (ص ۶۵۸)۔ قیوم نے "پنجاب میں اردو" سے لے کر شیخ جنید کا ریختہ درج کیا ہے (ص ۶۶-۶۶۴) لیکن ان کے بعد کے مؤرخین نے اس کا دوسروں سے بھی انتساب کیا ہے۔ نجیب اشرف ندوی نے خان محمد گجراتی متوفی ۱۰۲۸ھ کے اشعار ان کی فارسی کتاب سے لے کر درج کیے ہیں۔ ان میں اس ریختے کا مطلع بہ اختلافِ قلیل موجود ہے (علی گڑھ تاریخ، ص ۱۲۵)۔ دوسری طرف ڈاکٹر جمیل جالبی خبر دیتے ہیں کہ "اورینٹل کالج میگزین" فروری ۱۹۳۳ء کے ایک مضمون نگار کے مطابق ایک بیاض میں یہ ریختہ شیخ فریدالدین کے نام سے درج ہے (جالبی: تاریخ جلد ۱، ص ۶۶۸)۔ مضمون نگار نے بیدل سے منسوب غزل بھی درج کی ہے۔ رشید حسن خاں اپنی کتاب میں اس انتساب کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ نساخ اور شمس اللہ قادری کے حوالے سے مرزا عبدالغنی قبول متوفی ۱۱۳۹ھ کا ایک اردو شعر درج کرتے ہیں۔ اس کی نہایت صاف زبان کے پیشِ نظر مجھے اس انتساب پر شبہہ ہے۔

آنند رام مخلص کے تحت اس کے ۳۳ اردو شعر درج کیے ہیں جن میں سے ۳۲ اس کی

کلیاتِ نظمِ فارسی مخزونۂ رام پور میں درج ہیں (ص ۴۷-۶۷۳) ۳۳ شعروں کو یک جا کر دینا ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔

عبدالقیوم کی تاریخ کے زمانے کی آخری حد ۱۷۰۷ء ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں انھوں نے اس میں بعد کے مشاہیر شعرا کا مختصر حال بھی شامل کر لیا ہے، مثلاً فائز دہلوی، آبرو، مضمون، ناجی، محمد احسن، یکرنگ اور امیر خاں انجام۔ یہ ان کی تاریخ کی مجوزہ جلد دوم (۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء) کے عرصۂ تحریر میں آتے ہیں۔ پہلی جلد میں ان کے شمول کا کوئی جواز نہیں۔ ان میں سے بعض کی وفات کے سنین بھی مشکوک ہیں، مثلاً مضمون کی وفات کا سنہ ۱۷۴۷ء لکھا ہے (ص ۶۸۴)۔ جمیل جالبی نے ۱۱۴۷ھ طے کیا ہے جو ۳۵-۱۷۳۴ء کے مطابق ہے (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۵۸)۔ شاکر ناجی کا سنہ وفات ۱۱۶۸ھ لکھتے ہیں (ص ۶۸۷)۔ جب کہ جالبی نے قریب ۱۱۶۰ھ طے کیا ہے (جالبی، ایضاً، ص ۲۴۵)۔

دسواں باب "اردو نثر شمالی ہند میں" بھی عبدالقیوم کا لکھا ہوا ہے۔ یہ بہت مختصر ہے۔ اس میں پرتھوی راج کے پروانوں، شرف الدین یحییٰ منیری کے کچ مندرے، اشرف جہاں گیر سمنانی کے رسالۂ نثر، گنگ کوی کی "چند چھند"، برنن کی "مہما" اور جعفر زٹلی کے چند فقرات کا بیان ہے جس پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ حیرت ہے کہ وہ سمنانی کے ناپید رسالۂ نثر کو کسی احتجاج کے بغیر قبول کر لیتے ہیں (ص ۷۰۰-۷۰۱)۔ پرتھوی راج کے پروانوں اور گنگ کوی کی کتاب کو اردو نثر کہنا مناسب نہیں۔ اگر یہ اردو ہیں تو بیسویں صدی کے ہندی نثر نگاروں کی تخلیقات کو بھی کیوں نہ اردو کہہ دیا جائے۔

اس تاریخ کے پہلے تین پس منظری باب اردو ادب کی تفہیم میں ممد ثابت نہیں ہوتے، چوتھا باب "دیسی زبانوں کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ" بھی براہ راست اردو ادب کی تاریخ سے متعلق نہیں۔ پانچواں باب "اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے نظریے"، حبیب اللہ خاں غضنفر نے اس عجیب و غریب انداز سے لکھا ہے کہ مختلف نظریہ سازوں کے بیسیوں صفحوں کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ سوا سو صفحے کے اس باب کو تقریباً ۱۵ صفحوں میں پیش کیا جا سکتا تھا۔

تاریخ کی جان سخاوت مرزا کے لکھے دکنی ادب سے متعلق تین ابواب ہیں، جو واقعی تحقیقی انداز سے لکھے گئے ہیں اور جن میں کچھ مواد ایسا مل جاتا ہے، جو اتنے عرصے کے بعد لکھی جانے والی تاریخوں میں بھی نہیں ملتا۔ شمالی ہند کی نظم کے بارے میں عبدالقیوم نے لکھا تو تفصیل سے ہے لیکن ان میں اس استفہامیہ نظر کا فقدان ہے جو ہر قدیم چیز کو پھونک پھونک کے پرکھتی ہے۔ وہ زود ایمان معلوم ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کی نثر کا باب بے جان

Scanned by CamScanner

ہے۔ دراصل اس زمانے تک نثر کا ذخیرہ تھا بھی نہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ شمال کے صوفیوں کے ملفوظات یک جا درج کر دیتے۔

یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مضامین اس سے کچھ پہلے لکھے گئے ہوں گے۔ اس وقت تک تحقیق میں زیادہ حزم و احتیاط کا رواج نہ تھا جو بعد میں قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی تحریروں کی بدولت ہوا۔ اس تاریخ کے بیشتر مضمون نگاروں نے بیشتر موقعوں پر ایک ہجری سنہ کے مقابل ایک عیسوی سنہ دیا ہے جو غلط طریقہ ہے۔ مآخذ درج کرنے کو بھی اکثر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ لکھنے سے پہلے انھیں سختی سے پرکھنا تو دور کی بات ہے، کسی مضمون نگار نے اپنے باب کے آخر میں کوئی مجموعی جائزہ نہیں لیا، ابتدا میں بھی اس دور کی خصوصیات درج نہیں کیں، جس کی وجہ سے یہ ابواب محض مختلف شعرا یا نثر نگاروں کے متفرق حالات کا مجموعہ ہو گئے ہیں۔ انھیں مجموعی نظر سے دیکھ کر کوئی نتیجہ نہیں نکالا گیا۔

کسی مضمون نگار نے اپنی تحریر کے مآخذ پر مشتمل کتابیات نہیں دی۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ نہیں۔ سہو کتابت اس کثرت سے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے پروف پڑھے ہی نہیں۔ انھیں اسقام کی وجہ سے یہ تاریخ پایۂ اعتبار حاصل کرنے میں قاصر رہتی ہے اور اسی وجہ سے بڑی حد تک بالکل گم نام رہتی ہے۔

Scanned by CamScanner

چودھواں باب

"علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو"

۱۹۵۵ء میں شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کو "تاریخِ ادبِ اردو" کا ایک منصوبہ بھیجا جو ۱۹۵۶ء میں منظور ہو گیا اور اس کے لیے معقول رقم عطا کی گئی۔ مارچ ۱۹۵۷ء سے کام شروع ہو گیا۔ صدرِ شعبہ رشید احمد صدیقی ڈائرکٹر تھے اور ڈاکٹر نذیر احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر۔ یکم مئی ۱۹۵۸ء کو رشید احمد صدیقی صاحب کی سبکدوشی کے بعد پروفیسر آلِ احمد سرور صدرِ شعبہ اور اسکیم کے ڈائرکٹر ہو گئے۔ اگست ۵۸ء تک کام کر کے نذیر احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹری سے الگ ہو گئے۔ نومبر ۱۹۵۸ء سے مجنوں گور کھ پوری اس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ وہ ساتھ ہی شعبے میں تدریس اور تحقیقی مقالوں کی نگرانی کا کام بھی کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں ان کا تقرر بہ حیثیت ریڈر ہو گیا۔ سرور صاحب پہلی جلد کی تمہید مؤرخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں لکھتے ہیں کہ مجنوں اس وقت تک بحیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر کام کر رہے ہیں۔

رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آلِ احمد سرور غالباً باعتبار عہدہ اس اسکیم کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ایک، چوٹی کے انشائیہ نگار اور دوسرے، چوٹی کے نقاد۔ لیکن ساتھ ہی اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں عمائد تاریخِ ادب کی گوں کے نہ تھے۔ سرور صاحب نے سب سے بڑا ستم مجنوں گور کھ پوری کو اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کر کے کیا۔ مردم ناشناسی کی اس سے بڑھی مثال کیا ہو گی۔ سرور صاحب نے اپنی سرگزشت "خواب باقی ہیں" میں اعتراف کیا ہے:

> مجنوں صاحب باوجود غیر معمولی صلاحیت کے اب ایک تیر از کمان جستہ تھے۔ (ص ۱۹۶)

مارچ ۱۹۵۷ء میں ایک تیاری کمیٹی بلا کر پانچ جلدوں کی اسکیم بنائی گئی اور اس کے مختلف ابواب مختلف مشاہیر کو سپرد کیے گئے۔ سرور صاحب نے تاریخِ ادب کی تمہید میں لکھا ہے کہ تاریخی و تمدنی جائزے کا مضمون جن صاحب کو دیا گیا تھا، خاصی مدت گزرنے کے بعد

انھوں نے لکھنے سے معذرت ظاہر کی (صفحہ ب)۔ میرے پاس اسکیم کا سائکلواسٹائل کیا ہوا مفصل خاکہ موجود ہے۔ اس میں یہ باب جناب خلیق احمد نظامی کے نام ہے۔ ان کے انکار کے بعد پروفیسر حبیب نے لکھا۔ مضمون نگاروں کے وقت پر مضامین نہ دینے کی وجہ سے خاصی دیر ہوئی۔ پہلی جلد ۱۹۶۲ء کے آخر میں شائع ہو سکی۔ اس پر رشید حسن خاں کا ایک سخت تبصرہ شائع ہوا جس میں کتاب کی گوناگوں خامیوں اور اغلاط کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اس کے بعد کتاب بازار سے واپس لے لی گئی اور بقیہ جلدیں کبھی تیار نہ ہو سکیں۔ سرور صاحب اپنی سوانح میں لکھتے ہیں:

> بہرحال اس سلسلے میں اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرتا ہوں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تخریبی تنقید اچھے کاموں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی۔ (ص۱۹۶)

یہ بڑی حد تک سچ ہے۔ میں حسبِ موقع رشید حسن خاں کی تنقید کا حوالہ دیتا چلوں گا، لیکن اسے پڑھ کر یہ مصرع پڑھنے کو جی چاہتا ہے ع:

عیب مے جملہ بگفتی، ہنرش نیز بگو

علی گڑھ تاریخ میں، باوجود تمام تسامحات کے، معلومات کا جو خزانہ ہے، مُبصر نے اس کی قدر شناسی بھی کی ہوتی تو بات متوازن ہوتی۔ ان کے بعض اعتراضات کی توجیہ کی جا سکتی ہے:

> کتاب کے دو مقالہ نگاروں نے ایک ہی واقعے کا ذکر کیا ہے تو ان میں متضاد باتیں، بالخصوص مختلف سنین دیے ہیں۔ نظرِ ثانی کرنے والوں نے اس اختلاف و تضاد کو دور نہیں کیا۔
>
> ("ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ص۲۶۱)

عرض ہے کہ یہ کتاب ایک مصنف کا کارنامہ نہیں، بلکہ اس کے اجزا مختلف ماہرین نے لکھے ہیں۔ تحقیق میں اختلافِ رائے جائز ہے۔ ایک محقق کسی واقعے کا جو سنہ قرار دیتا ہے، دوسرے کی رائے میں کوئی اور سنہ مرجح ہے۔ ہر باب یا جزو کے ساتھ اس کے مصنف کا نام دیا ہوا ہے۔ اس کے ہر بیان کی ذمےداری اس کے مصنف پر ہے۔ اگر ڈائریکٹر یا اسسٹنٹ ڈائریکٹر مضمون نگار کی تحریر میں ترمیم کرتے تو وہ تحریف قرار دی جاتی۔ قاری کو آزادی ہے کہ وہ مثلاً کسی کے سنہ وفات کے بارے میں دو مضمون نگاروں کی دی ہوئی مختلف تاریخوں میں سے جسے چاہے قبول کرے۔ ہاں، ادارے کو یہ چاہیے تھا کہ اختلافی بیانات کے نیچے فٹ نوٹ میں اپنی رائے دے کر آخر میں "ادارہ" لکھ کر صراحت کر دیتے۔

Scanned by CamScanner

دوسری بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں کے نشاں دادہ کئی اغلاط صریحاً سہوِ طباعت کا نتیجہ ہیں، جو اوّل نظر ہی میں سمجھ میں آجاتے ہیں۔ خاں صاحب نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر مصنّف کی گرفت کی ہے۔ اردو میں ۲ اور ۳، ۲ اور ۶، صفر (۰) اور ۵ میں التباس عام ہے۔ سنین کی عدم مطابقت کے بہت سے مواقع اسی التباس سے پیدا ہوئے ہیں۔

گو اس کتاب کی بقیہ جلدیں وجود میں نہیں آئیں، ان سب کا بیش بہا خاکہ تیار کر لیا گیا تھا۔ پہلی جلد کے لیے جو مفصّل خاکہ بنایا گیا تھا، میں اس کے ابواب کے عنوانات درج کرتا ہوں۔

جلد اوّل ۱۲۰۰ء تا ۱۷۰۰ء

دیباچہ (الف):	لسانیاتی مطالعہ۔ اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا	مسعود حسین خاں
(ب):	زبان و ادب کا تہذیبی و علمی مطالعہ	آلِ احمد سرور
باب اوّل:	سیاسی و تمدّنی پس منظر	خلیق احمد نظامی
باب دوم:	گجرات میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ولی سے پہلے	نجیب اشرف ندوی
باب سوم:	دکنی ادب ۱۳۵۰ء تا ۱۵۸۰ء	

(الف)	دورِ بہمنی	عبدالقادر سروری
(ب)	دورِ عادل شاہی	ڈاکٹر نذیر احمد
(ج)	دورِ قطب شاہی	ڈاکٹر زور

باب چہارم: دکنی ادب ۱۵۸۰ء تا ۱۷۰۰ء

(الف)	دورِ عادل شاہی	نصیرالدین ہاشمی
(ب)	دورِ قطب شاہی	ڈاکٹر زور

میرے پاس اس سے آگے کے اوراق نہیں۔ خیال یہ ہے کہ منصوبے اور مطبوعہ کتاب کے مشمولات میں کوئی فرق نہ ہوگا صرف تقسیمِ ابواب میں جزو و کل کا فرق ہوا ہوگا۔ منصوبے اور کتاب میں یہ فرق نظر آتے ہیں۔

اصل خاکے میں پہلے دو مفصّل مضامین کو باب کا نام نہ دے کر دیباچے کے دو اجزا کہا گیا تھا۔ کتاب میں پہلی دو تحریروں پر نمبر شمار ۱، ۲ پڑا ہے لیکن تیسری تحریر ہی کو باب کا درجہ دے کر پہلا باب کہا ہے۔ نمبر ۱ کی تحریر کا عنوان "تمہید" ہے جسے مدیر پروفیسر سرور نے لکھا ہے۔ یہ روایتی دیباچہ یا پیش لفظ ہے۔ اسے کوئی نمبر نہیں دیا جانا چاہیے تھا۔ نمبر ۲ کا لسانیاتی مقدمہ ایک پُرمغز مقالہ ہے، اسے پہلا باب کہنا چاہیے تھا۔ اب مطبوعہ کتاب میں

Scanned by CamScanner

سات باب اور ۱۱ نمبر شمار ہیں جن میں پیش لفظ کو نمبر ا اور اشاریہ اور صحت نامہ کو نمبر ۱۰ اور نمبر ۱۱ کہا گیا ہے۔ عموماً انھیں نمبر شمار نہیں دیا جاتا۔ بابوں کا نمبر ہی فہرست میں نمبر شمار ہوتا ہے۔ نام نہاد دیباچے کا جزو (ب) "زبان و ادب کا تہذیبی و علمی مطالعہ" سرور صاحب نے نہیں لکھا۔ باب اوّل "سیاسی و تہذیبی پس منظر" خلیق احمد نظامی نے لکھ کر نہیں دیا، اسے پروفیسر حبیب نے لکھا۔

خاکے میں تیسرے باب کے تین جزو (الف) دورِ بہمنی، (ب) دورِ عادل شاہی اور (ج) دورِ قطب شاہی تھے۔ کتاب میں تینوں کو الگ باب کی حیثیت دے کر باب ۳ تا ۵ کہا ہے۔ دورِ عادل شاہی کے دو حصے کر کے ایک نذیر احمد کو اور دوسرا نصیر الدین ہاشمی کو دیا ہے۔

کتاب کا پہلا مقالہ لسانیاتی مقدمہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے۔ معلوم نہیں، کیوں اس طویل اور پُر مغز مقالے کو پہلا باب نہیں کہا گیا۔ اگر تاریخی پس منظر متن کا جزو ہو سکتا ہے تو لسانیاتی پس منظر اس سے بھی بڑھ کر باب کہلانے کا مستحق ہے کہ اس کا تعلق اردو ادب سے اور نزدیکی ہے۔ لسانیاتی مقدمہ مجموعی طور پر اطمینان بخش ہے۔ اس کی بعض جزئیات کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی میں پنجابی اور لہندا کو مختلف گروہوں میں رکھا ہے (ص ۷)۔ یہ گریرسن کی تقلید میں ہے لیکن ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ان دونوں کو ایک ہی گروہ میں رکھا ہے۔ پنجابی کے ماہرینِ لسانیات بھی پنجابی اور لہندا کو الگ زبانیں نہیں مانتے۔

ص ۱۱ پر وسطِ سطر میں عنوان ہے:

اردو کا عہد بہ عہد ارتقا

سنہ ۸۰۰ء تا ۱۲۰۰ء

ص ۱۶ پر وسطِ سطر میں عنوان ہے:

زبانِ دہلوی کا ارتقا

اور ص ۳۱ پر سطر کے شروع میں بغلی عنوان (ride heading) ہے: "دکنی اردو کا ارتقا"، سطر کے وسط کا عنوان زیادہ بڑے اور اہم گروہ کے لیے ہوتا ہے، سطر کے شروع کا بغلی عنوان ذیلی گروہ کے لیے ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کا عہد بہ عہد ارتقا بڑا عنوان ہے جو سطر کے وسط میں ہونا چاہیے اور ہے۔ اس کے تین ذیلی عنوان ہیں:

سنہ ۸۰۰ء تا ۱۲۰۰ء، "زبانِ دہلوی کا ارتقا"، "دکنی اردو کا ارتقا۔"

Scanned by CamScanner

جس طرح تیسرے عنوان کو بغلی حیثیت دی ہے اسی طرح پہلے دو کو بھی وسطِ سطر کے بجائے گوشۂ سطر میں لکھا جاتا تو صراحت کا حق بہتر طریقے پر ادا ہوتا۔ ۸۰۰ء تا ۱۲۰۰ء کے نمونوں کو اردو کا ارتقا نہیں کہہ سکتے۔ اس زمانے میں اردو وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس عنوان کے تحت جن مصنفین اور ان کی تخلیقات کے نام لیے ہیں وہ سب ہندی کے مصنف ہیں۔ کمیٹی نے جلد اوّل کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں اِس فصل کے جزو کی بہتر تصویر تھی، جو یوں ہے۔

اردو کا عہد بہ عہد ارتقا

الف۔ مسلمانوں کے داخلۂ ہند سے قبل۔ اپ بھرنش اور قدیم ہندی کے نمونوں کا جائزہ (۸۰۰ء تا ۱۳۰۰ء)

ب۔ اردو کا ارتقا ۱۳۰۰ء تا ۱۷۰۰ء (سلاطینِ دہلی و دکن)

ج۔ اردو کا ارتقا ۱۷۰۰ء تا ۱۸۰۰ء (دبستانِ دہلی)

د۔ اردو کا ارتقا ۱۸۰۰ء تا ۱۹۰۰ء (دبستانِ لکھنؤ دہلی، علی گڑھ)

اس خاکے میں (الف) کی صحیح صورتِ حال پیش کی گئی ہے۔ اس کے تحت نمونوں کو اردو کا نہیں، قبلِ اردو کا کہا ہے۔ لسانیاتی مقدمہ صرف پہلی جلد میں ہے، بعد کی جلدوں میں نہیں۔ اس لیے اسے ۱۹۰۰ء تک پر حاوی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے جزو (ج) اور (د) کے بارے میں نہیں لکھا۔ شاید مقالہ نگاروں کو اتنی چھوٹ دی گئی ہو کہ وہ لکھتے وقت خاکے میں مناسب ترمیم کر سکیں۔

خسرو کے بارے میں وہ صحیح لکھتے ہیں:

> ان کے ہندی کلام کی کوئی سند اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔
> (ص ۱۶)

اور اس کے آگے لکھتے ہیں:

> خسرو کی ہندی شاعری کا پہلا مستند ماخذ وجہی کی "سب رس" ہے جس میں ان کا حسبِ ذیل دوہا نقل کیا ہے۔ (ص ۱۶)

اور اس کے آگے "پنکھا ہو کر میں ڈلی" والا دوہا دیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی تھی کہ وجہی خسرو سے تین سو سال بعد کا مصنف ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی اسی لیے اس دوہے کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے مضمون "غیر معتبر حوالے" میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے ان بیانات کی سخت تنقید کی ہے (۱)۔ مسعود حسین خاں ص ۱۶ اور ۱۸ پر

Scanned by CamScanner

"نکات الشعرا" میں مندرج خسرو سے منسوب قطعہ درج کرتے ہیں جسے اپنی جدید زبان کے پیشِ نظر یک قلم رد کر دینا چاہیے تھا۔ خود مسعود صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> خسرو کے ہندی کلام کی زبان عالم گیر کے عہد سے قبل کی اردو نہیں کہی جا سکتی۔ (ص ۱۹)

ص ۱۸ پر ایک بہت پُرمغز حاشیہ لکھتے ہیں کہ خسرو کی ہندی شاعری کے مآخذ تین ہیں ...الخ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان اہم سطور کو متن میں شامل نہ کر کے حاشیہ نشینی پر کیوں مجبور کیا۔ سہوِ طباعت سے ص ۲۸ کا حوالہ نمبر ۳، نمبر ۴ کی شرح ص ۲۷ کے فٹ نوٹ میں دی ہے۔ اس مضمون میں یہ عجیب بات ہے کہ زیادہ حوالے مضمون کے آخر میں دیے ہیں لیکن چند کو علاحدہ نمبروں کے تحت فٹ نوٹ میں بھی دیا ہے، مثلاً ص ۲۸ پر متن میں حوالوں کا اشارہ اس ترتیب سے ملتا ہے: ۳، ۴، ۲۷، ۲۸۔ یہ دوہرا سلسلہ الجھن پیدا کرتا ہے۔ ان کی نوعیت کا فرق مجھ پر واضح نہیں، مثلاً ص ۲۸ کے متن کے مندرجہ بالا چاروں حوالے محض مآخذ کی نشان دہی کرتے ہیں، پھر ان میں سے دو کو فٹ نوٹ میں اور دو کو باب کے آخر میں کیوں رکھا گیا۔

ص ۱۷ پر "خیر المجالس" کو حضرت روشن چراغ دہلی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ اس کی گرفت کرتے ہوئے رشید حسن خاں تصحیح کرتے ہیں کہ یہ روشن چراغ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے مولانا حمید قلندر نے مرتب کیا تھا (ادبی تحقیق، ص ۲۷۱)

چندر بھان برہمن سے منسوب اردو غزل کے بارے میں قدرے محتاط انداز میں لکھتے ہیں، لیکن بعد میں وثوق سے لکھ دیتے ہیں:

> غزلِ مذکورہ کو زبانِ دہلوی کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقش کہا جا سکتا ہے۔ (ص ۲۸)

لیکن نورالحسن ہاشمی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

> اس کی زبان اتنی صاف ہے کہ اسے اتنی قدیم ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ (ص ۴۹۴)

رشید حسن خاں اس غزل کے برہمن سے انتساب کے پُرزور مخالف ہیں۔ برہمن کے مطبوعہ فارسی دیوان میں بھی ایک ریختہ غزل ہے۔ مرتبِ دیوان نے لکھا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ برہمن نے اردو میں بھی شاعری کی ہے (۲)۔

مضمون نگار نے "معراج العاشقین" از گیسو دراز کو سب سے مستند نقش قرار دیا ہے (ص ۳۲)، اور اس کے لیے وہ معذور ہیں کیونکہ اس وقت تک حسینی شاہد اور حفیظ قتیل کی

Scanned by CamScanner

تحقیق سامنے نہیں آئی تھی۔

اس باب کے اصل خاکے میں ایک عنوان تھا:

۳۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں نظریات۔ تنقید

الف۔ برج بھاشا اور اردو (آزاد)

ب۔ پنجابی اور اردو (شیرانی)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے یہ اہم عنوان قائم نہیں کیا۔ انھوں نے شیرانی کے نظریے پر تو تفصیلی تنقید کی (ص ۳۶ تا ۴۰) لیکن برج بھاشا اور اردو کے نظریے کا سرسری ذکر کیا، اردو اور برج کے اختلافات نہیں گنائے۔ ان دو کے علاوہ آغازِ اردو کے اور کئی نظریے ہیں، ان کا بھی ذکر کرنا تھا۔ سب سے مقبول نظریہ میراممن کا ہے، جس میں اردو کو مخلوط زبان قرار دیا ہے، اس کا بھی جائزہ لینا تھا۔

رشید حسن خاں مسعود حسین خاں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خانِ آرزو کے ایک لغت کا نام "نوادر الالفاظ" بھی لکھا ہے (ص ۱۸) "تصحیح غرائب اللغات ہندی" بھی (ص ۲۵)۔ اسی "غرائب اللغات ہندی" کو دوسری جگہ "غرائب اللغاتِ عبد الواسع ہانسوی" لکھا گیا ہے (ص ۴۲)۔ (ص ۲۸۲)

یہ اعتراض کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔ میں نے "غرائب اللغات" نہیں دیکھی، اس لیے اس کے صحیح نام کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی مرتبہ "نوادر الالفاظ" کے مقدمے سے یہ اقتباس دیا ہے:

> یکے از فضلائے کامگار و علمائے نامدارِ ہندوستانِ جنت نشاں کتابے در فنِ لغت تالیف نمودہ مسمیٰ بہ غرائب اللغات و لغاتِ ہندی۔
>
> (ڈاکٹر عبداللہ: "اردو"، جنوری ۱۹۵۱ء، ص ۱۳)

گویا "غرائب اللغات" کے علاوہ اس کا دوسرا نام "لغاتِ ہندی" بھی تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ دونوں کو ملا کر "غرائب اللغاتِ ہندی" بھی کہہ دیا ہو۔ بہرحال مسعود حسین خاں کے لکھے تین ناموں میں سے پہلے نام "نوادر الالفاظ" اور تیسرے نام "غرائب اللغاتِ عبد الواسع ہانسوی" پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک دوسرے نام کا تعلق ہے واضح ہو کہ نوادر کے کئی نسخوں میں اس کا نام یوں دیا ہے:

نوادر الالفاظ تصحیحِ غرائب اللغات (۳)

ظاہر ہے کہ "تصحیحِ غرائب اللغات" اس کا دوسرا نام نہیں، بلکہ اس کے موضوع کی

Scanned by CamScanner

صراحت ہے۔

آخر میں کچھ سنین کے بارے میں، جن کا رشید حسن خاں نے بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ مسعود صاحب نے کئی جگہ عیسوی سنین درج کیے ہیں۔ قدیم مآخذ میں اگر ماہ و سال کی تخصیص کے بغیر ہجری سنہ دیا ہوتا ہے تو اس کی جگہ دو عیسوی سنین دینے چاہییں۔ پہلے، دو متضاد بیانات جن کی نشان دہی رشید حسن خاں نے کی:

۱۔ ص ۱۶ پر خسرو کا سنہ ولادت ۱۲۵۳ء، دیا ہے، ص ۳۸ پر ۱۲۵۲ء۔ میں عرض کرتا ہوں کہ نظ انصاری اور ابوالفیض سحر نے خسرو کی ولادت ۱۲۵۲ء/۶۵۱ھ میں لکھی ہے ("خسرو شناسی"، دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۲)۔

۲۔ ص ۱۷ پر حضرت روشن چراغ دہلی کو متوفی ۱۳۵۶ء لکھا ہے، ص ۱۹ پر متوفی ۱۳۵۲ء۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ مالک رام نے "مفتاح التواریخ" کے حوالے سے حضرت کا سنہ وفات ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ/۱۶ ستمبر ۱۳۵۶ء لکھا ہے (تذکرہ، ص ۳۸۹)۔

میرا خیال ہے کہ علی گڑھ تاریخ میں ص ۱۹ پر سہوِ طباعت سے ۶ کی جگہ ۲ لکھ کر سنہ کو ۱۳۵۲ء چھاپ دیا ہے۔

اب سنین سے متعلق میرے مشاہدات:

ص ۲۰ پر نام دیو کا زمانہ ۱۳۲۸ء تا ۱۴۰۸ء دیا ہے۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس نے علی گڑھ تاریخ کے میرے نسخے پر نوٹ درج کیا ہے کہ ۱۳۲۸ و ۱۴۰۸ عیسوی سنین نہیں، بلکہ بکرمی سمبت ہیں (حوالہ۔ رام چندر شکل: "ہندی ساہتیہ کا اتہاس"، طبعِ ہفتم، ص ۶۴) بکرمی سمبت میں سے ۵۷ منہا کر کے عیسوی سنہ حاصل ہوتا ہے۔ اس حساب سے نام دیو کے عیسوی سنین ۱۲۷۱ء تا ۱۳۵۱ء ہونے چاہییں۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی مرتبہ "سنت سمجھاون" ص ۲۰-۱۹ پر نام دیو کا زمانہ ۱۲۷۰ء تا ۱۳۵۰ء دیا ہے۔ یونس اگاسکر نے بھی "مراٹھی ادب کا مطالعہ" میں یہی تاریخیں دی ہیں (بمبئی، ۱۹۷۶ء، ص ۳۶)۔

ص ۲۱ پر کبیر داس کا زمانہ ۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۵ء دیا ہے۔ کبیر کے سنین درج کرنا اتنی مخدوش بات ہے کہ جب تک ساتھ میں تفصیلی بحث نہ کی جائے، اعتراض و اختلاف کا مقام رہتا ہے۔ اتفاق سے نورالحسن ہاشمی نے کبیر کا زمانہ ۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء دیا ہے (ص ۳۸۰)۔ ہندی میں کبیر کے محقق ڈاکٹر رام کمار ورما ہیں۔ ان کی کتاب "کبیر پدلولی" کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد انصاراللہ نے "شعرِ کبیر" کے نام سے کیا (علی گڑھ، ۱۹۷۹ء)۔ ورما نے مختلف سنین پر تبصرہ کر کے لکھا:

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کبیر کی ولادت سمبت ۱۴۵۵ (مطابق

۱۳۹۸ء مطابق ۸۰۰ھ) اور وفات سمبت ۱۵۷۵ء (مطابق ۱۵۱۸ء
مطابق ۹۲۴ھ) میں معلوم ہوتی ہے، یعنی وہ ایک سو بیس برس تک
زندہ رہے۔ ("شعرِ کبیر"، ص ۵۸)

مولانا افضل (وفات ۱۶۲۵ء) (ص ۲۹)

"بکٹ کہانی" کے مصنف کو عام طور سے مولانا افضل یا محمد افضل کہا جاتا ہے لیکن
خود مثنوی سے کچھ اور ثابت ہوتا ہے۔ مطبوعہ نسخے میں ایک مصرع ہے ع:

گھے افضل گھے گوپال می باش

انڈیا آفس کے مخطوطے میں ایک شعر ہے جو معلوم نہیں کیوں، مطبوعہ ایڈیشن میں داخلِ
متن نہیں کیا گیا:

قصہ سارا کہا گوپال افضل
کہ شد معشوق سوں عاشق کو واصل

ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے رسالہ "فکر و نظر" علی گڑھ ۱۹۷۱ء میں مضمون شائع کیا "بکٹ
کہانی کا مصنف اور اس کا وطن"، اس میں بکٹ کہانی کے قدیم ترین حوالے "تیرہ ماسہ" از
اکرم قطبی ربتکی سے یہ شعر درج کیا:

او سیں افضل کہ جس کا ناؤں گوپال
کہا ہے نارنولی صاحبِ حال

قطبی نے افضل تخلص والے شاعر کا نام برملا گوپال بتایا ہے۔ عبدالغفار شکیل اسے
قبول کر کے اپنے مضمون میں عنوان دیتے ہیں:

مصنفِ "بکٹ کہانی" (گوپال) کا وطن

مزید لکھتے ہیں:

قطبی اپنے "تیرہ ماسہ" کا سنِ تصنیف دیتے ہوئے صاف طور پر
افضل کا نام گوپال بتاتا ہے۔

("فکر و نظر"، ص ۱۱۳)

جس شخص کا نام گوپال ہو وہ افضل تخلص کے باوجود مولانا نہیں ہو سکتا، کوئی
غیر مسلم ہی ہوگا۔ والہ داغستانی نے "ریاض الشعرا" (۱۱۶۳ھ) میں جس افضل کا ذکر کیا ہے
اس کے لیے لکھا ہے کہ اس کا انتقال ۱۰۳۵ھ میں ہوا۔ والہ نے اسے "بکٹ کہانی" کا

Scanned by CamScanner

مصنف نہیں لکھا، وہ کوئی دوسری شخصیت ہوگی۔

مسعود حسین خاں نے یہ واضح نہیں کیا کہ افضل کی تاریخ وفات ۱۶۲۵ء انھیں کہاں سے معلوم ہوئی۔ یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے جس کی کہانی یوں ہے:

قائم نے تذکرہ "مخزنِ نکات" میں افضل کا ذکر کر کے لکھا:

> چونکہ فنِ ریختہ اس وقت محلِ اعتبار سے ساقط تھا اس لیے کسی نے اس کی مشق کا اقدام نہیں کیا۔ اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ملکِ دکن کی طرف دکھنی میں ریختہ کہنے کا بہت رواج ہوا۔
>
> ("مخزنِ نکات"، ص ۳)

قائم نے افضل یا عبداللہ قطب شاہ کا کوئی سنہ نہیں لکھا لیکن اس کی تحریر سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ افضل عبداللہ قطب شاہ سے پہلے ہوا ہے۔ اسپرنگر نے اپنی فہرست میں پہلی بار دونوں کو منسلک کر کے عبداللہ کا غلط سلط سالِ جلوس لکھا:

> یہ عبداللہ قطب شاہ سے پہلے گزرے ہیں جو ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" تذکرہ "مخزنِ نکات" کی طباعت سے پہلے کی کتاب ہے۔ انھوں نے شاید "مخزنِ نکات" کو نہیں دیکھا، اسپرنگر کے لکھے پر بھروسا کیا اور "پنجاب میں اردو" میں لکھا کہ "عبداللہ قطب شاہ درحقیقت ۱۰۲۵ھ میں تخت نشیں ہوتا ہے نہ کہ ۱۰۲۰ھ میں، جو محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے۔"
>
> ("پنجاب میں اردو"، لکھنؤ ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۸)

عبداللہ کے جلوس کی صحیح تاریخ ۱۰۲۵ھ بھی نہیں، ۱۰۳۵ھ ہے جو متعدد مآخذ، مثلاً شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" میں دی ہوئی ہے۔ "پنجاب میں اردو" میں ۱۰۲۵ھ سہوِ کتابت ہے، کیونکہ اسی کتاب میں اسی مضمون میں لکھا ہے:

> قائم کا بیان ہے کہ افضل، عبداللہ قطب شاہ کے دور سے پہلے کے آدمی ہیں۔ والہ کا بیان اس کا بھی موید ہے، یعنی عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور افضل اسی سال انتقال کرتے ہیں۔
>
> (ص ۲۱۱)

شیرانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے افضل مصنفِ "بکٹ کہانی" کا سنہِ وفات ۱۰۳۵ھ

Scanned by CamScanner

لکھا ہے۔ یہ عیسوی ۲۶-۱۶۲۵ء کے مطابق ہے۔ مسعود صاحب کا ماخذ یہی ہے۔ وہ آگے لکھتے ہیں:

> پنڈت چندر بھان، تخلص برہمن (۱۶۶۲ء) کا مصرع ہے...
>
> (ص ۴۳)

یہ واضح نہیں کہ ۱۶۶۲ء کا ہے کی تاریخ ہے، موزلہ غزل کی یا برہمن کی وفات کی؟ ظاہرا یہ برہمن کا سنہ وفات ہے۔ "مخانہ جاوید" میں برہمن کا سنہ وفات ۱۰۷۳ھ درج ہے۔ یہ مطابق ہے ۶۳-۱۶۶۲ء کے۔ صحیح تاریخ معلوم نہ ہونے کی صورت میں دونوں عیسوی سنین درج کرنے چاہئیں تھے۔ سنین سے متعلق یہ تسامحات معمولی ہیں۔ ان کے باوصف میں اعتراف کروں گا کہ مضمون نگار نے یہ فصل اطمینان بخش طریقے پر لکھی ہے۔ اگر وہ اردو کے آغاز کے دوسرے نظریوں پر بھی تبصرہ کر دیتے تو اور بہتر ہوتا۔

اس مقدّمے کے بعد پہلا باب سیاسی اور تمدنی پس منظر ہے جو پروفیسر محمد حبیب کا لکھا ہوا ہے۔ اصلاً یہ خلیق احمد نظامی کے ذمے کیا گیا تھا۔ انھوں نے کافی عرصہ گزار کر لکھنے سے معذرت کر لی جس کے بعد یہ کام پروفیسر حبیب کے سپرد ہوا۔ اپنے تبصرے میں رشید حسن خاں اس باب کے نظریاتی پہلو سے بہت خفا ہیں۔ میرا مجموعی تاثر ان سے مختلف ہے، لیکن جب وہ یہ لکھتے ہیں:

> مجموعی طور پر کتاب سے اس کا کم سے کم تعلق ہے۔ یہ بیش تر غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پورا باب پڑھنے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زبان کے آغاز و ارتقا پر ان حالات کا کیا اثر پڑا۔
>
> (ادبی تحقیق، ص ۳۶۰)

مجھے اس سے کامل اتفاق ہے۔ ترقی پسند تنقید کے زیرِ اثر اس بدعت کا فیشن ہو گیا کہ ہر تحقیقی مقالے کے پہلے باب میں ملک کی سیاسی اور شاذ تہذیبی تاریخ بیان کر دی جائے۔ وہی باتیں جو سب کو معلوم ہیں، بار بار لکھ دی جاتی ہیں، خواہ ان کا ادب سے براہِ راست تعلق ہو کہ نہ ہو۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ علاحدہ سے باب نہ لکھا جائے، بلکہ مختلف ابواب میں تخلیقات پر تبصرہ کرتے وقت حسب ضرورت ان پر اثر انداز ہونے والے سیاسی اور سماجی عوامل کا بیان کر دیا جائے اور مجھے یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ علی گڑھ تاریخ کے ہر باب کے لکھنے والے نے (بجز باب ششم، "ولی اور اس کا عہد" از ظہیر الدین مدنی اور سخاوت مرزا، کے) مختصراً اس باب کے ادب کا تاریخی پس منظر دے دیا ہے۔

Scanned by CamScanner

حبیب صاحب کے مضمون میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر اورنگ زیب کے عہد تک کی حکومتِ دہلی کی تاریخ دی ہے۔ شمالی ہند میں اردو ادب کا دور اورنگ زیب کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس طرح یہ پورا باب اردو ادب سے ایک طرح سے غیر متعلق ہے۔ علی گڑھ تاریخ کی یہ جلد بنیادی حیثیت سے گجرات و دکن سے متعلق ہے۔ اگر اس باب میں گجرات، بہمنی حکومت، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کا بیان ہوتا تو بھی کسی قدر مفید ہوتا۔ اصل خاکے میں یہ شامل تھا لیکن پروفیسر حبیب نے ان حکومتوں کی تاریخ سے پوری طرح چشم پوشی کی۔ اس کی تلافی بعد کے مضمون نگاروں نے کر دی ہے کہ انھوں نے ہر باب میں دو چار صفحوں میں پس منظر کے ضروری اشارے کر دیے ہیں۔ ان کے ہوتے حبیب صاحب کا لکھا پہلا باب بالکل حشو ہو گیا ہے۔ اسے حذف کر دیا جائے تو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔

ایک مورّخ کے مضمون کی دو تین تاریخوں کے بارے میں اپنے شبہات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مملوک خاندان (سنہ ۱۲۰۶ء تا ۱۳۲۰ء)، خلجی خاندان (سنہ ۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء)، (ص ۵۹)۔ ظاہر ہے کہ مملوک خاندان کی آخری حد ۱۳۲۰ء نہیں، ۱۲۹۰ء ہونی چاہیے۔

جلال الدین اکبر ۱۵۵۵ء تا ۱۶۴۴ء (ص ۶۰)۔ مالک رام صاحب نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں ان دونوں واقعات کی صحیح تاریخیں یوں دی ہیں:

جلوس ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء (۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ)۔ وفات ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء (۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ)۔

علی گڑھ تاریخ کے صحت نامے میں بھی ان سنین کی تصحیح نہیں کی گئی۔ معلوم نہیں کہ اکبر کا انتقال ۱۶۴۴ء میں کیسے لکھا گیا جب کہ خود اسی باب میں اسی مضمون نگار نے ص ۶۴ پر جہاں گیر کا عہد ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء اور ص ۵۷ پر شاہ جہاں کا عہد ۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء دیا ہے۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ ص ۹۷ پر اورنگ زیب کا عہد ۱۶۵۷ء سے شروع کیا ہے جو درست ہے، یعنی شاہ جہاں کے عہد کا خاتمہ ۱۶۵۸ء پر نہیں ۱۶۵۷ء پر ہونا چاہیے۔

دوسرے باب کا عنوان ہے: "گجرات میں اردو، عہد ولی سے پہلے" اسے نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے۔ انھوں نے مضمون کی ابتدا میں سات صفحوں میں سیاسی اور تاریخی پس منظر دیا جو اس لیے ضروری تھا کہ اردو کے قاری بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کی تاریخ سے تو کچھ نہ کچھ واقف ہوتے ہیں، لیکن گجرات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اس پس منظر میں ایک اقتباس کے تعارفی الفاظ یہ ہیں:

Scanned by CamScanner

"گجرات کی علمی تاریخ" کے مصنف مولانا عبدالحی اس سلسلے میں لکھتے
ہیں۔ (ص ۹۳)
کتاب کے بارے میں مزید تفصیل دینی تھی کہ یہ کب، کہاں سے شائع ہوئی یا قلمی
ہے۔ باب آخر میں جو حوالے ہیں، ان میں بھی اس کتاب کا نام نہیں۔
جین مذہب کے سلسلے میں لکھتے ہیں:
اس کے دونوں فرقوں پتمبروں اور ڈگمبروں کے پیرو یہاں موجود
ہیں۔ (ص ۹۵)
پتمبر یا پتامبر ریشمی چادر کو کہتے ہیں، جسے زرد کندھوں پر ڈالتے تھے۔ ڈگمبر کا صحیح
تلفظ دگامبر ہے۔ جینیوں کے دو نہیں، تین خاص فرقے ہیں اور یہ تینوں گجرات میں بھی
پائے جاتے ہیں۔ شویتامبر، دگامبر اور استھانک واسی، یعنی منھ پٹی والے۔ آخرالذکر کے
سادھو منھ پر ایک پٹی باندھے رہتے ہیں اور اس پٹی کی وجہ سے نمایاں ہوتے ہیں۔ عوام
الناس غلط فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ تمام جینی منھ پٹی والے ہوتے ہیں۔
تاریخی پس منظر کے بعد لسانی اہمیت کے عنوان کے تحت گوجری یا گجری زبان کے
مختلف ناموں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ تحقیقی بیان بہت مفید ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
مختلف ادوار میں گجرات کے شعرا نے اپنی زبان کو کن ناموں سے پکارا ہے۔ ندوی صاحب
نے یہ مفید مشاہدہ بھی کیا کہ گجرات سے جو خاندان ہجرت کرکے دکن گئے انھوں نے اپنی
زبان کو دکنی سے ممتاز کرنے کے لیے گجری ہی کہا (ص ۹۸)۔
ڈاکٹر حسینی شاہد کے بقول محمود شیرانی بھی یہی رائے ظاہر کر چکے ہیں ("شاہ
امین الدین اعلیٰ"، ص ۴۸۳)۔ لسانی اہمیت کے عنوان کے تحت ندوی گجری اور دکنی
بولیوں کے مقامات اشتراک و اختلاف واضح کردیتے تو گجری کا واضح تشخص سامنے آجاتا۔
گجرات میں اس دور میں کوئی نثری تصنیف دکھائی نہیں دیتی۔ وہاں کے اردو زبان و
ادب کے قدیم ترین نمونے صوفیہ کے ملفوظات اور بعض سلاطین کے منھ سے نکلے ہوئے
متفرق فقرے یا جملے یا کہاوتیں ہیں، جنھیں ندوی نے کافی تلاش کے بعد جمع کیا ہے۔ اب
گجرات کے ملفوظات ان سے کافی زیادہ ملتے ہیں۔ علی گڑھ تاریخ کی تالیف تک جو کچھ مل گیا وہ
ایک شاندار ابتدا کے طور پر غنیمت ہے۔
گجرات کے ابتدائی درویشوں میں شیخ احمد کھٹو حضرت قطب عالم اور حضرت شاہ
عالم ہیں۔ ان میں شیخ احمد اور حضرت شاہ عالم کے نام کے آگے قوسین میں ایک سنہ بغیر
کسی صراحت کے دیا ہے۔ ظاہرا یہ سنہ وفات ہے لیکن اس کے ساتھ صراحت کردی گئی

Scanned by CamScanner

ہوتی تو بہتر تھا۔ ہجری سنہ کے ساتھ محض ایک عیسوی سنہ دینا خلافِ احتیاط ہے۔ اس کے علاوہ بعض سنیں دوسرے علما کے یہاں مختلف ملتے ہیں، مثلاً حضرت قطب عالم کا سنہ وفات ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء لکھا ہے (ص ۱۰۰)۔ مولوی عبدالحق نے ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء لکھا ہے (ابتدائی نشو و نما، ص ۲۲)۔ ان کے فرزند شاہ عالم کا سنہ وفات ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء اور پانچ سطر بعد ۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء لکھا ہے۔ آخرالذکر صحیح ہے جسے ڈاکٹر الف د نسیم نے گجرات کی متعدد تاریخوں کے حوالے سے لکھا ہے (ادبیاتِ مسلمانان، جلد ۶، ص ۲۱۱)

شیخ احمد کھٹو کے سنہ (۸۴۹ھ) کے ساتھ سنہ ۱۴۸۵ء دیا ہے۔ ۸۴۹ھ برابر ہے ۱۴۴۵ء کے۔ شاید ندوی نے ۱۴۴۵ء لکھا ہو گا جو سہوِ طباعت سے ۱۴۸۵ء ہو گیا۔ ۸۴۹ھ کے پہلے نو مہینے ۱۴۴۵ء میں اور آخری تین ۱۴۴۶ء میں پڑتے ہیں۔ ظہیرالدین مدنی کی "سخن ورانِ گجرات" کے مطابق شیخ احمد کا انتقال ۱۵ شوال ۸۴۹ھ کو ہوا اور یہ تاریخ ۱۴۴۶ء میں آتی ہے۔ میرے علم کی حد تک شیخ احمد کا کوئی ملفوظ نہیں ملتا۔ ندوی لکھتے ہیں کہ "مرقاۃ الوصول" میں ان کے متعدد گجراتی اشعار ہیں۔ "متعدد" مبالغہ ہے۔ مدنی نے اس مجموعے سے شیخ احمد کے چار دوہے دیے ہیں۔ ہندی کی ایک تاریخ میں ان میں سے مشترک تین دوہے دیے ہیں۔ اس طرح شیخ احمد کے محض چار دوہے ملتے ہیں، متعدد نہیں۔

دکنیات کے محققین نے دکن کے ابتدائی صوفی شعرا کو بہت نمایاں کیا ہے۔ ندوی نے گجرات کے اس قدیم ترین شاعر کو محض دو سطروں میں ختم کر دیا، نہ ان کے حالاتِ زندگی دیے، نہ ان کے دوہے۔ یہ ایک علاحدہ عنوان کے مستحق تھے۔

ندوی رائے کھیر، احمد آباد گجرات کی ایک مسجد سے یہ کتبہ نقل کرتے ہیں:

تاریخ اس مسجد کی ہوئی سو یوں مشہور
مسجد جامع بیچ بشانہ یا نبی نور (؟)

۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء

(ص ۱۰۱)

ندوی صاحب نے مصرع سے اعداد نکال کر نہیں دیکھے۔ اس سے ۹۱۶ نہیں ۱۰۲۸ برآمد ہوتا ہے۔ سخاوت مرزا کے بقول مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" میں دوسرا مصرع یوں درج کیا ہے:

مسجد جامع بیچ شانہ یا نبی نور

۹۶۱ھ

(تاریخِ ادب، مرتبہ عبدالقیوم، ص ۲۵۲)

ڈاکٹر انصار اللہ نے اپنی تاریخِ اقلیمِ ادب، جلد اوّل میں مصرعِ تاریخ یوں لکھا ہے:

مسجد جاما بیچ بشائیا یا نبی نور

۹۱۶ھ

(ص ۳۵)

اگر بشائیا کے ہمزہ کا ایک عدد لیا جائے تو واقعی اس مصرع سے ۹۱۶ھ برآمد ہوتا ہے، دوسری طرف جمیل جالبی نے اس شعر کو یوں دیا ہے اور اس پتھر کا نقش انجمن ترقیِ اردو پاکستان میں ہے:

تاریخ مسیت کی ہوئی سو یوں مشہور

مسجد جامع کے بیچ ڈٹھایا ہے نور

۹۶۳ھ

انھوں نے اسے ادبیاتِ مسلمانان، جلد پنجم، ص ۳۶۹، نیز اپنی تاریخ میں جلد اوّل، ص ۹۹ پر دیا ہے اور وہ ۹۶۳ھ کو تعمیرِ مسجد کی تاریخ مانتے ہیں۔ معلوم نہیں کون سا متن اور کون سا سنہ صحیح ہے۔

شاہ وجیہ الدین علوی کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ لفظ "شیخ" مادّہ ولادت ہے۔ انتقال ۹۹۱ھ/۱۷۸۳ء میں ہوا، "شیخ وجیہ الدین" سے یہ تاریخ نکلتی ہے (ص ۱۰۱)۔ رشید حسن خاں نے اپنے تبصرے میں توجہ دلائی کہ "شیخ وجیہ الدین" سے ۱۰۲۹ھ نکلتا ہے، نیز یہ کہ ۹۹۱ھ برابر ہے ۱۵۸۳ء کے، نہ کہ ۱۷۸۳ء کے (ادبی تحقیق، ص ۲۷۱) اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ ندوی صاحب نے ۱۵۸۳ء ہی لکھا ہو گا جو سہوِ طباعت سے ۱۷۸۳ء بن گیا۔ "تذکرۂ ماہ و سال" میں مالک رام نے شیخ وجیہ الدین کی صحیح تاریخِ ولادت ۲۲ محرم ۹۱۰ھ اور تاریخِ وفات ۲۹ محرم ۹۹۸ھ/۳۰ نومبر ۱۵۸۹ء لکھی ہے۔ انھوں نے بھی مادّۂ وفات "شیخ وجیہ الدین" لکھ کر اس کے آگے (۹۹۸) لکھا ہے۔ میں نے حساب کتاب لگا کر دریافت کیا کہ مادّہ "شیخ وجیہ دین" ہونا چاہیے جس سے ۹۹۸ حاصل ہو جاتا ہے۔ میرے پاس سید حسینی پیر علوی کی تصنیف "تذکرۃ الوجیہ" (گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر، ۱۹۹۰ء) ہے۔ یہ مالک رام کے مآخذ میں بھی ہے۔ اس میں شاہ وجیہ الدین کی ولادت اور وفات کی وہی تاریخیں دی ہیں جو مالک رام نے درج کی ہیں۔ ان کے شاگرد مولانا عبدالعزیز کا فارسی قطعۂ تاریخِ وفات دیا ہے جس میں ان کی وفات کی تاریخ "شیخ وجیہ دین" قافیے میں باندھی گئی ہے (ص ۱۱۸)۔ معلوم نہیں مالک رام نے اسے کیوں کر نہیں دیکھا اور تاریخ "شیخ وجیہ الدین" لکھ

Scanned by CamScanner

دی۔

ندوی صاحب نے شیخ وجیہ الدین گجراتی کے مجموعے "بحر الحقائق" سے یہ ملفوظ نقل کیا ہے:

بھو کوں موئے میں کیا خدا کو انپڑیا، خدا کو انپڑنے کی استعداد ہور۔

(ص ۱۰۲)

عجیب بات یہ ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے عبداللہ بن عبدالرحمان چشتی کے "عشق نامہ" سے خواجہ بندہ نواز کا یہی ملفوظ درج کیا ہے:

بھو کوں موئے سوں خدا کچھ انپڑنا ہے، خدا کوں انپڑنے کی استعداد ہور ہے۔

(ص ۱۵۹)

"بحر الحقائق" میں اس ملفوظ سے قبل کچھ اور جملے اسی کے سیاق میں ہیں، نیز مولوی عبدالحق نے "سیر المصنفین" طبعِ دوم کے تبصرے میں لکھا تھا کہ انھوں نے خواجہ کی فارسی تصانیف میں بہت تلاش کی کہ ان میں اردو کے کچھ جملے مل جائیں لیکن کچھ نہ ملا ("اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۷)، ان وجوہ سے میرا خیال ہے کہ یہ ملفوظ شیخ وجیہ الدین کا ہے، خواجہ بندہ نواز کا نہیں۔

گجرات کے قدیم شعرا میں چار ممتاز ہیں: شیخ بہاء الدین باجن، شاہ علی جیو گام دھنی، قاضی محمود دریائی اور شیخ خوب محمد چشتی۔ ندوی صاحب نے چاروں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے باجن کا سنہ ولادت ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء لکھا ہے جو صحیح ہے (ص ۱۰۵)۔ معلوم نہیں کس غلط فہمی کے تحت ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کا سنہ ولادت ۷۰۲ھ/۱۳۰۲ء لکھ دیا ہے (ص ۲۵۹)۔ باجن کا سنہ وفات ۹۱۲ھ ہے، جس کے برابر اگر ایک سنہ عیسوی لکھا جائے تو ۱۵۰۶ء ہوگا۔ یہی ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ص ۳۸ پر لکھا ہے۔ ندوی نے سنہ وفات نہیں دیا، لیکن یہ لکھا ہے کہ ۱۲۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ رشید حسن خاں تجاہلِ عارفانہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ سنہ ولادت ۱۳۸۸ء میں ۱۲۱ جوڑے جائیں تو سالِ وفات ۱۵۰۹ء ہوگا جب کہ مسعود حسین خاں نے ۱۵۰۶ء لکھا ہے (ادبی تحقیق، ص ۲۶۳)۔ کیا رشید حسن خاں جیسے محقق کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ غدر سے پہلے اردو فارسی کے اہلِ قلم عمروں کا حساب قمری سنہ سے کرتے تھے شمسی سے نہیں۔ ۷۹۰ھ میں ۱۲۱ جوڑنے سے ۹۱۱ھ حاصل ہوتا ہے، یہ مطابق ہے ۱۵۰۵-۶ء کے۔ شمس اللہ قادری نے "اردوے قدیم" ص ۴۶ پر صحیح تاریخ ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ لکھی ہے جو مطابق ہے ۲۸ مارچ

Scanned by CamScanner

۱۵۰۷ء کے۔ نذیر احمد نے ان کا سنہ ولادت تو غلط لکھا ہی تھا، ص۲۵۹ پر سنہ وفات ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء لکھ کر پھر فاش غلطی کی۔

ندوی نے ص۱۰۶ پر باجن کی ایک نظم کے اجزا کو بَین (بہ بائے موحدہ) لکھا ہے۔ یہ نظم دراصل جکری ہے جس کے اجزا کو اکثر جگہ بَین لکھا دیکھا گیا ہے، بَین نہیں۔ باجن شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔ ندوی نے باجن کے مجموعے کا نام "خزینۂ رحمت" لکھا ہے۔ مختلف موقعوں پر اس کتاب کا نام "گلستانِ رحمت"، "خزینۂ رحمت"، "خزانۂ رحمت" اور "خزائنِ رحمت اللہ" ملتا ہے۔ خود باجن نے اس کا نام یوں لکھا ہے:

آیں رسالہ را خزانۂ رحمت اللہ نام نہاد۔

(مدنی: "سخن ورانِ گجرات"، ص۵۰)

اس طرح "خزانۂ رحمت اللہ" کو صحیح نام مانا جائے گا۔

ندوی نے ص۱۰۹ پر شاہ علی جیو گام دھنی کی تاریخ وفات ۱۴ جمادی الاوّل ۹۷۳ھ لکھی ہے، جمادی الثانی ہونی چاہیے۔ شمس اللہ قادری نے جو نظمِ تاریخِ وفات دی ہے اس میں یہ قافیہ ہے:

جانبِ	خُلد	و	جنتِ	اعلےٰ
شد	بماہِ		جمادی	الأخرےٰ

(ص۴۷)

مولوی عبدالحق نے ابتدائی نشوونما میں ص۷۱-۷۰ پر بابا شاہ حسینی کا ذکر کیا ہے جو ان کے خیال میں شاہ علی جیو گام دھنی کے مرید معلوم ہوتے ہیں اور یہ ان کے ایک شعر سے مترشح ہے۔ مولوی صاحب نے ان کے دو شعر اور ایک غزل دی ہے جنھیں ندوی نے علی گڑھ تاریخ میں نقل کیا ہے۔ ابتدائی نشوونما سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ علی گڑھ تاریخ میں نقل میں سہو کتابت بہت کثرت سے ہیں اور انھیں صحت نامے میں بھی درست نہیں کیا گیا۔ بہرحال غزل کی صاف زبان کے پیشِ نظر ندوی کا یہ قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بابا شاہ ان علی جیو گام دھنی کے مرید نہیں معلوم ہوتے، بلکہ ان کے ہم نام پوتے شاہ علی جیو نادر اللہ کے مرید و ہم عصر ہیں (ص۱۱۳)۔

ندوی نے قاضی محمود دریائی کے بیان میں سنین بالکل نہیں دیے، حالانکہ مولوی عبدالحق نے "اُردو کی ابتدائی نشوونما..." میں ان کی وفات ۹۴۱ھ میں بعمر ۷۶ سال لکھی ہے (ص۶۳)۔ ندوی نے ص۱۱۵ پر قاضی محمود کے جو دوہرے (صحیح لفظ دوہے) دیے ہیں وہ دوہے کے اوزان میں نہیں، اس لیے ان پر دوہے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اردو میں کسی بھی

Scanned by CamScanner

ہندی شعر کو دوہا کہہ دیا جاتا ہے خواہ وہ دوہے کے وزن میں ہو یا نہ ہو۔

خوب محمد چشتی کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کی ولادت کا سنہ لفظ "خموش" (۹۴۶ھ) ہے، اور وفات کا مادّہ "خوب تھے" ہے۔ اس طرح مرتے وقت ان کی عمر ۷۴ سال ہوتی ہے (ص۱۲۱)۔ رشید حسن خاں نے بجا دھیان دلایا کہ ۹۴۶ھ میں ۷۴ جوڑ کر ۱۰۲۰ھ حاصل ہوتا ہے جب کہ "خوب تھے" سے ۱۰۲۳ھ بر آمد ہوتا ہے (ادبی تحقیق، ص۲۷۰)۔ اس کا حل یہ ہے کہ مرتے وقت ان کی عمر قمری سال سے ۷۷ سال مانی جائے۔

ندوی لکھتے ہیں کہ مثنوی "خوب ترنگ" ۹۸۶ھ میں لکھی گئی۔ اس کی تاریخ یہ ہے:

ثھانہ اس تاریخ کی لنہ

مانا مصرع ہر عدد پائے

بچار کینے محمد خوب

ہزار برس اس گھاٹ چودہ

ندوی لکھتے ہیں کہ دوسرے شعر کے ہر مصرع سے سنہِ تصنیف نکلتا ہے (ص۱۲۲)۔ ضرور نکلتا ہے، لیکن اس سے پہلے کچھ سہوِ طباعت درست کرنے ہوں گے۔ پہلے شعر کے قوافی کو "ٹھانہہ" اور "تانہہ"، بلکہ "ٹھاں" اور "ماں" لکھا جائے تو شعر موزوں ہوگا۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں تیسرا لفظ "کنے" ہے جو ندوی نے صحیح لکھا ہے، "کینے" نہیں۔ آخری مصرع سے بصورت موجودہ صرف ۹۸۰ بر آمد ہوتا ہے۔ ۶، اعداد کا اضافہ کرنے کے لیے میں نے سوچا کہ "اس" کو اعراب بالحرف سے "اوس" لکھا جائے۔ خوش قسمتی سے "اردو کی ابتدائی نشوونما..." میں یہ مصرع یوں ہی لکھا ہے:

ہزار برس اوس گھاٹ چودہ

(ص۶۸)

"گھاٹ" کے معنی ہیں، ہزار میں سے چودہ گھٹ جائیں۔ اس طرح اس مصرع سے صوری اور معنوی دونوں قسم کی تاریخیں نکلتی ہیں۔

ص۱۲۵ پر خان محمد، متوفی ۱۰۲۸ھ، کی تالیف "ہفت تصور عرف تصورِ طوبیٰ" کا ذکر کیا ہے۔ اس میں ہندی کے ۷۱ دوہے درج ہیں جن کے بارے میں لکھتے ہیں:
یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس کی تصنیف ہیں۔

انھیں میں ایک یہ ہے:

Scanned by CamScanner

ولا حاتل چہ می خسپی کہ آتنی نیند کیوں کریے
کہ وقتِ مرگ در پیش است کہ اپنی نیست سے ڈریے

(ص ۱۲۵)

ظاہر ہے کہ یہ شعر ریختہ ہے، دوہا نہیں۔ شیرانی کے مطابق یہ شیخ جُنید کا ہے۔ انھوں نے اس کی پوری نظم دی ہے ("پنجاب میں اردو"، ص ۶۳-۲۶۲)۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

> قاضی فضلِ حق نے "اورینٹل کالج میگزین"، فروری ۱۹۳۳ء میں ایک مضمون میں ایک بیاض مرقومہ ۱۱۲۸ھ کا تعارف کرایا جس میں یہ ریختہ شیخ فریدالدین کے نام سے درج ہے۔
>
> (جالبی: تاریخ، جلد اول، ص ۶۲۸)

واللہ اعلم کس کا ہے۔ بہرحال حاتل محمد کا نہیں ہونا چاہیے۔

باب کے آخر میں وہ گودھرا کے فتح محمد کی مثنوی "یوسف زلیخا" کا ذکر کرتے ہیں۔ جالبی نے مصنف کا نام محمد فتح بلکی اور مثنوی کا نام "یوسفِ ثانی" لکھا ہے جو انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کے ایک مخطوطے میں درج ہے (جلد اول، ص ۱۴۳)۔

خلاصۃ الکلام کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نجیب اشرف ندوی نے اس باب میں گجرات میں ولی سے پہلے کے اردو ادب کے بارے میں کماحقہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ انھیں کی بنیاد پر ترقی دے کر بعد والوں نے زیادہ تفصیلات دیں۔

تیسرے باب کا عنوان ہے: "اردو ادب بہمنی دور میں" جسے عبدالقادر سروری نے لکھا ہے۔ تاریخ کے اصل خاکے میں یہ ایک طویل باب کا جزو تھا، دوسرے اجزا عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے ادب سے متعلق تھے۔ بعد میں ان سب کو علاحدہ بابوں کی حیثیت دے دی گئی۔ ان کے مواد کو دیکھتے ہوئے یہی مناسب تھا۔

سروری صاحب نے دس صفحوں میں دکن کا تاریخی پس منظر اور اس کا حکومتِ دہلی سے تعلق بیان کیا ہے۔ سیاسی مراسم کے ساتھ ساتھ انھوں نے لسانی مراسم کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ انھوں نے بطورِ خاص دکن کے کئی ایسے صوفیہ کے نام لکھے ہیں جن کے نام کے ساتھ ایک جزو یا لقب ہندی تھا، مثلاً سید یوسف راجا، ان کی اہلیہ بی بی رانی، سید نصیرالدین پَون پیک، کاکا شاہ بخت، سید کمال الدین کھڑکھ پسوڑ، مولانا مسعود چھجو پیر بانک، پیر بیٹھے، پیر جمنا، حاجی چندو اور شاہ کھڑکھ (ص ۱۴۲)۔ اس کے آگے سروری صاحب نے کئی ایسے صوفیوں کا ذکر کیا ہے جن سے اردو میں کوئی ملفوظ، فقرہ یا رسالہ منسوب ہے۔

Scanned by CamScanner

لیکن سروری صاحب نے صحتِ انتساب پر توجہ نہیں کی۔ آج کی تحقیق کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے انتسابات میں سے بیشتر غلط ہیں۔ وہ احتیاط سے پرکھتے تو اس دور میں بھی شبہات پیدا ہونے چاہئیں تھے۔

ان کے مذکورہ اہلِ قلم میں پہلے سیّد یوسف حسینی عرف سید راجا عرف شاہ راجو قتال ہیں۔ ان کی تاریخِ وفات ۵ شوال ۷۳۱ھ/۱۲ ستمبر ۱۳۳۱ء دی ہے (ص ۱۴۵)۔ معلوم نہیں سروری صاحب نے عیسوی سنین کس تقویم سے ماخوذ کیے ہیں۔ ۵ شوال ۷۳۱ھ کے متوازی ۱۲ جولائی ۱۳۳۱ء آتی ہے۔ ایک اور ماخذ سے ان کا سنہ وفات ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء لکھا ہے۔ ۷۹۵ھ کے محض پہلے ڈھائی مہینے ۱۳۹۲ء میں آتے ہیں بقیہ سب ۱۳۹۳ء میں پڑتے ہیں۔

سروری صاحب نے ان سے دو تصانیف منسوب کی ہیں۔ پہلی ایک مختصر مثنوی "تہاگی نامہ" ہے جس کا نسخہ سالار جنگ لائبریری میں ہے۔ مرتبِ فہرست نصیر الدین ہاشمی اسے سیّد راجو ثانی مرشد ابوالحسن تاناشاہ کا قرار دیتے ہیں۔ سیّدہ جعفر کا بھی یہی خیال ہے۔ اس کی صاف زبان کو دیکھتے ہوئے یقینی ہے کہ یہ شاہ راجو اوّل کی تصنیف نہیں۔ دوسری کتاب ایک نثری رسالہ ہے جو کتب خانۂ روضتین گلبرگہ میں موجود ہے اور جس پر رسالۂ شاہ راجو لکھا ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس کے مزید ۱۰ نسخوں کا پتا چلایا جن میں سے چار میں اس کا انتساب سیّد شاہ محمد قادری گوردریا سے ہے (۴)۔ یہ بہت بعد کے بزرگ ہیں جن کا انتقال ۱۰۸۵ھ میں ہوا۔ رسالے کی زبان کے پیشِ نظر یہ انھیں کا ہو سکتا ہے۔ خود سروری صاحب نے اپنے بیان کے آخر میں لکھا ہے:

> اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ رسالہ شاہ راجو ہی کی تصنیف ہے۔ (علی گڑھ تاریخ، ص ۱۴۷)

شاہ راجو کے بعد امیر حسن سجزی کی آٹھ شعروں کی ایک غزل دی ہے۔ سروری صاحب نے اپنا ماخذ نہیں بتایا کہ انھیں یہ غزل کہاں سے ملی۔ اسی غزل کے چھ شعر جمیل جالبی کو انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کی ایک قدیم بیاض میں ملے (جالبی ص ۳۵)۔ دقت یہ ہے کہ اس غزل میں دکنی عناصر کثرت سے ہیں: رہیا، ملیا، اچھوں وغیرہ۔ دہلی کے امیر حسن سجزی دکنی محاورے میں کیوں لکھتے۔

ص ۵۲-۱۵۱ پر شیخ عین الدین گنج العلم کا ذکر ہے۔ رشید حسن خاں نے توجہ دلائی کہ ص ۱۵۱ کی دوسری سطر میں شیخ کا سنہ وفات ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء دیا ہے اور اسی صفحے کی ۲۳ویں سطر میں ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء۔ جہاں تک عیسوی سنین کا تعلق ہے سروری صاحب نے ہجری سنہ

Scanned by CamScanner

کے آغاز میں پڑنے والے عیسوی سنہ کو لکھ دیا ہے، خواہ وہ ایک دو مہینے کے بعد ہی بدل جائے۔ مثلاً ۷۹۵ھ کا ابتدائی ڈیڑھ مہینہ اور ۷۹۹ھ کے ابتدائی تین مہینے ہی مذکورہ عیسوی سنہ میں واقع ہوئے ہیں۔ بہرحال شمس اللہ قادری نے ان کی صحیح تاریخِ وفات ۷ ۲جمادی الاوّل ۷۹۵ھ دی ہے ("اردوے قدیم"، ص ۴۰)۔ یہ مطابق ہے ۱۰اپریل ۱۳۹۳ء کے۔ سروری صاحب نے شمس اللہ قادری کے قول کو تسلیم کر کے انھیں تین دکنی رسالوں کا مصنف مان لیا حالانکہ حکیم صاحب نے نہ تو ان رسالوں کا کوئی نمونہ دیا ہے، نہ یہ رسالے اب کہیں موجود ہیں۔ عام طور سے کوئی محقق ان کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔

گنج العلم دہلی کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور میں ۷۷۳ھ میں پہنچے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں کہ حکیم شمس اللہ کے بیان کی رُو سے یہ رسالے ۷۲۵ھ کی تصنیف ہیں ("اردو نثر کا آغاز اور ارتقا"، ص ۵۸)۔ شمس اللہ قادری نے "اردوے قدیم" میں ۷۲۵ھ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر رفیعہ، قادری صاحب سے مل چکی ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے ملاقات میں یہ بات کہی ہو۔ عین الدین ۷۲۵ھ تک دکن نہیں گئے تھے تو یہ رسالے دکنی میں کیوں کر تصنیف کر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سروری صاحب تحقیق میں شبہہ و استفہام کے قائل نہیں۔ بغیر پرکھے ہر چیز پر ایمان لے آتے ہیں۔

سروری صاحب، گنج العلم کے سلسلے میں ایک دوسرے بزرگ حضرت پیر معبری کھنڈایت کا ذکر کرتے ہیں۔ معبری کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ آپ بہت طاقتور تھے۔ دکنی زبان میں لوگ آپ کو "مبلی" کہا کرتے تھے۔ "مبلی" بگڑ کر "معبری" ہو گیا (ص ۱۵۴)، لیکن سروری اسی باب میں لکھ چکے ہیں کہ جنوب میں ملابار اور تامل ناڈ کے علاقے کو مسلمان معبر (گزرگاہ) کے نام سے موسوم کرتے ہیں (ص ۱۳۵)، "معبر"، یعنی عبور کرنے کی جگہ۔ امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستانی زبانوں کی فہرست دی ہے، ان میں ایک کو "معبری" کہا ہے جس سے مراد تامل یا ملیالم ہونی چاہیے۔ بگڑ کر لفظ کی تسہیل ہوتی ہے نہ کہ اشکال۔ پیر کھنڈایت کو "معبری" اس لیے کہتے ہوں گے کہ وہ تامل ناڈ یا ملابار کے باشندے ہوں گے۔ یہ، لقب "مبلی" کی تخریب نہیں ہو سکتا۔

بندہ نواز گیسودراز کا احوال بہت مفصّل ہے، یعنی ص ۱۵۴ سے ص ۱۸۰ تک۔ اس میں بھی سنین کا خلفشار ہے۔ بندہ نواز کی تاریخِ ولادت ۴ رجب ۷۲۱ھ دی ہے جو صحیح ہے۔ لکھتے ہیں کہ ان کے دل میں یہ شوق پیدا ہو گیا تھا کہ حضرت سلطان المشائخ ہی سے بیعت کریں گے، لیکن حضرت سلطان المشائخ کا انتقال ۷۰۷ھ/۱۳۵۶ء میں ہو گیا تھا (ص ۱۰۴)۔ سروری صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ ۷۲۱ھ میں پیدا ہونے والا شخص ۷۰۷ھ میں مرحوم

Scanned by CamScanner

ہونے والے شیخ سے بیعت کا شوق کیوں کر رکھ سکتا ہے۔ ۷۰۷ھ کا متوازی عیسوی سنہ ۱۳۵۶ء نہیں۔ ۸-۱۳۰۷ ہے لیکن یہ حضرت نظام الدین کی صحیح تاریخ وفات نہیں۔ مالک رام نے "مفتاح التواریخ" کے حوالے سے ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ لکھی ہے جو ۴ مارچ ۱۳۲۵ء کے برابر ہے۔ اگر بندہ نواز نے نوجوان ہونے پر بیعت کی سوچی ہو تو بھی کافی پہلے کے مرحوم سلطان المشائخ سے یہ سعادت حاصل کرنے کا شوق کیوں کر پال سکتے تھے۔

لکھتے ہیں کہ بندہ نواز ۷ ربیع الاول ۸۰۱ھ/۲۷ نومبر ۱۳۹۸ء کو دہلی سے دکن کے لیے روانہ ہوئے (ص ۱۵۵)۔ اس ہجری تاریخ کے مقابل عیسوی تاریخ ۱۷ نومبر ہونی چاہیے، ۲۷ نہیں۔ اگلے صفحے پر لکھتے ہیں:

خواجہ صاحب ۸۰۳ھ/۱۳۹۹ء میں گلبرگہ تشریف لائے۔

(ص ۱۵۶)

رشید حسن خاں نے توجہ دلائی کہ ۸۰۳ھ مطابق ہے ۱۴۰۱-۱۴۰۰ء کے (ادبی تحقیق، ص ۲۷۱)۔ خاں صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ سروری صاحب نے خواجہ صاحب کے گلبرگہ آنے کی تاریخ ۸۰۳ھ/۱۳۹۹ء دی ہے جب کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ص ۴۷۶ پر ۱۴۱۲ء لکھی ہے (ایضاً، ص ۲۶۵)۔ غنیمت ہے کہ رشید حسن خاں نے یہ نہیں دیکھا کہ سروری صاحب نے خواجہ صاحب کے بیٹے محمد اکبر حسینی کے لیے لکھا ہے کہ وہ ۸۰۱ھ/۱۴۰۸ء میں اپنے والد کے ساتھ گلبرگہ آئے (ص ۱۸۱)۔ اتفاق سے ۸۰۱ھ مطابق ہے ۹۹-۱۳۹۸ء کے۔ معلوم ہوتا ہے سنین کے معاملے میں سروری صاحب کے یہاں نراج کا عالم ہے۔

رشید حسن خاں نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ صوفیہ کے حالات میں مختلف تذکروں اور تاریخوں میں واقعات کے سنین میں شدید اختلافات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت لکھتی ہیں کہ:

حضرت گیسو دراز کے گلبرگہ آنے کی تاریخ دیباچۂ "خاتمہ" میں ۸۰۳ھ دی ہے، ترجمۂ "تاریخ حبیبی" میں ۸۰۴ھ، فرشتہ نے ۸۱۵ھ لکھی ہے۔

("شکارنامہ"، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء، ص ۳۱)

۸۱۵ھ مطابق ہے ۱۳-۱۴۱۲ء کے۔ سروری صاحب نے دیباچۂ "خاتمہ" کے اتباع میں حضرت کے ورود گلبرگہ کا سنہ ۸۰۳ھ لکھا اور نورالحسن ہاشمی نے فرشتہ کی تقلید میں ۱۴۱۲ء۔ اگلے زمانے کے واقعات کے تعین میں ایسے اختلافات سے تو سامنا ہوتا ہی ہے۔

Scanned by CamScanner

ص ۱۵۹ پر حضرت سے جو ملفوظ منسوب کیا ہے: "بھوکوں موئے سوں خدا کچھ انپڑتا ہے، خدا کوں انپڑنے کی استعداد ہور ہے،" اس کے بارے میں نجیب اشرف ندوی صاحب کے ضمن میں لکھ چکا ہوں کہ یہ شیخ وجیہ الدین گجراتی کے مجموعے "بحرالحقائق" میں موجود ہے۔ جہاں اس سے پہلے اس کے سیاق میں اور بھی جملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ملفوظ وجیہ الدین ہی کا ہے۔

اس کے آگے سروری صاحب نے ۱۵ صفحوں میں خواجہ صاحب سے منسوب ۱۱ رسالوں کی تفصیل دی ہے۔ واضح ہو کہ مولوی عبدالحق نے "اردو کی ابتدائی نشوونما۔۔۔" میں "معراج العاشقین" کے سلسلے میں مزید پانچ رسائل کا ذکر کر کے لکھا تھا:

> اگرچہ زبان ان کی قدیم ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ انھیں کی تصنیف ہیں یا ان سے منسوب ہیں۔ (ص ۳۱)

"سیرالمصنفین" طبع دوم کے تبصرے میں ان کا یہ اہم مشاہدہ یاد رکھنے کے قابل ہے:

> یہی کیفیت خواجہ بندہ نواز کے اردو کلام کی ہے۔ ان سے منسوب "معراج العاشقین" میں نے ہی مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کے دیباچے میں میں نے اپنا شبہہ ظاہر کیا تھا۔ بعد کی تحقیق سے مجھے قریب قریب یقین ہو گیا کہ یہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے رسالے "شکار نامہ"، "معراج نامہ" وغیرہ جو اُن سے منسوب کیے جاتے ہیں در حقیقت ان کی تصنیف نہیں۔ ان کے بعض مریدوں یا عقیدت مندوں نے ان کے بعض فارسی رسالوں کا ترجمہ اردو میں کر دیا اور وہ ان کے نام سے منسوب ہو گئے۔ فارسی میں ان کی بےشمار تصانیف ہیں۔ بہت تلاش اور کوشش کی کہ ان میں اردو کے کچھ جملے مِل جائیں تا کہ اتنا تو معلوم ہو جائے کہ وہ کبھی کبھی اردو میں بھی کچھ فرماتے تھے، لیکن کچھ نہ ملا۔
>
> ("اردو"، جنوری ۱۹۹۵۰ء، ص ۱۵۷)

دکنیات کے زبردست محقق ڈاکٹر حسینی شاہد نے دعویٰ کیا کہ "جانم کے پیش رووں سے جو نثری رسائل منسوب کیے جاتے ہیں ان کا انتساب شبہے سے خالی نہیں۔"(۵)۔ خواجہ کے مرید و خادم سید محمد علی سامانی نے خواجہ کے انتقال کے چھ سال بعد ۸۳۱ھ میں "سیرِ محمدی" لکھی، جو ان پر سب سے مستند کتاب ہونی چاہیے۔ جالبی توجہ دلاتے ہیں کہ اس

Scanned by CamScanner

میں حضرت کی اہم و غیر اہم جملہ تصانیف کی فہرست ہے، جو ۳۶ ہیں۔ یہ سب عربی و فارسی میں ہیں، اردو میں ایک بھی نہیں (مقدمہ مثنوی "کدم راو پدم راو"، دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۴۴)۔ "سیر محمدی" میں نے بھی دیکھی ہے۔ ان ۳۶ کتابوں میں عربی زبان میں پانچ خلافت نامے ہیں جنھیں تصانیف میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کتابوں کی تعداد ۳۱ رہ جاتی ہے۔

بنگلور کے ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے اپنے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے "خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل" (نومبر ۱۹۸۲ء) میں ایک ایک رسالے سے بحث کر کے اسے رد کیا۔ میں نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت میں جو "اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک" لکھی ہے اور جو ہنوز شائع نہیں ہوئی اس میں ان سب رسالوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ذیل میں سروری صاحب کے مذکورہ رسالوں کے بارے میں مختصر مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

"معراج العاشقین" کے بارے میں حسینی شاہد اور حفیظ قتیل ثابت کر چکے ہیں کہ یہ خواجہ سے بہت بعد کی تصنیف ہے۔ "تشریحِ کلمۂ طیبہ" کے متن میں اسے خواجہ صاحب سے منسوب نہیں کیا گیا۔ اس میں وجود کے پانچ مقاموں کا ذکر ہے۔ شاہ برہان الدین جانم تک محض چار وجودوں کا نام لیا جاتا تھا۔ شاہ امین نے پہلی بار پانچ وجودوں کی تفصیل کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ شاہ امین سے پہلے کا نہیں۔ خلاصۃ التوحید کی اصطلاحیں امین دیکھو، امین شاہد وغیرہ شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے رسالے "گنجِ مخفی" سے ماخوذ ہیں۔ اس کے موضوع کو شاہ امین کے خانوادے کے کئی بزرگوں نے لکھا خصوصاً شاہ میر راے چوٹی نے رسالہ "نو بطون" یا "نہ بطونِ چشتیہ" میں اور شاہ میر کے کسی مرید نے "رسالۂ قادریہ" میں۔ غرضیکہ خلاصۃ التوحید امین الدین اعلیٰ کے خان وادے کے کسی مرید نے لکھی ہوگی۔

اب لیجیے شکارنامے کو۔ اس کے ساتھ ایک شرح اس کے جزولاینفک کی طرح شامل رہتی ہے۔ خواجہ صاحب نے فارسی میں شکار نامہ "برہان العاشقین" کے نام سے لکھا لیکن ان کی فہرستِ تصانیف میں کہیں اردو شکارنامے کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کے کسی قریب العصر مصنف نے بھی شکارنامۂ اردو کو ان سے منسوب نہیں کیا۔ شرح کے آخر میں ایک جملہ ہے: "حضرت بندگی مخدوم فرماتے ہیں،" اس سے صاف ہو جاتا ہے کہ شرح کا مصنف خواجہ کا کوئی مرید ہے۔ کیوں نہ مان لیا جائے کہ اردو شکارنامہ بھی اسی کی تصنیف ہے۔ اس کے متن میں کہیں خواجہ صاحب سے انتساب نہیں ملتا۔ امین الدین اعلیٰ کے ایک خلیفہ جان محمد مری نے اسے اردو مثنوی میں لکھا، جس میں دعویٰ کیا کہ شکارنامہ فارسی میں تھا، میں اسے دکھنی میں لکھ رہا ہوں:

Scanned by CamScanner

اصل میں آتا فارسی میں اوّل
کیا ہوں میں دکھنی میں اس کو بہ عل

(رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱۰۴)

اکبرالدین صدیقی نے خواجہ کا فارسی شکارنامہ اور محری کی اردو مثنوی "اردو" کے مندرجۂ بالا شمارے میں چھاپ دی۔ ان تمام وجوہ سے یہ چند سطری رسالہ خواجہ کی تصانیف سے خارج ہو جاتا ہے۔

"دُرالاسرار" کے لیے سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس کا نام "دراسرار"، "دارالاسرار" یا "دُررِاسرار" نہیں۔ صحیح نام "دُرالاسرار" ہے۔ اس رسالے کی حقیقت ڈاکٹر نورالدین سعید نے دریافت کی۔ آصفیہ لائبریری میں ایک نسخے کا نام "ترجمۂ دُرالاسرار" ہے۔ اس میں متن کے ساتھ کسی نعمت اللہ شاہ نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ اس کے ترقیمے میں لکھا ہے کہ "دُرالاسرار" حضرت سلطان ثانی کی تصنیف ہے (فہرستِ آصفیہ، جلد دوم، ص ۱۰-۲۰۹) اس کے متن میں پانچ عناصر پچیس گُن کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ فلسفہ شاہ امین کے دبستان کا ہے۔ ڈاکٹر نورالدین سعید نے آصفیہ لائبریری میں رسالہ "کشف الاسرار" مصنفہ خواجہ معروف چشتی کی طرف توجہ دلائی۔ یہ "دُرالاسرار" کے جواب میں ہے اور اس میں بہت طعن و تشنیع سے کام لیا ہے۔ اس میں بھی "دُرالاسرار" کے مصنف کا نام سلطان دیا ہے۔

اس کے آگے سروری صاحب نے رسالہ "سہ بارہ" کو خواجہ صاحب سے منسوب کیا ہے۔ اس میں دکنی جمع "اں" کے علاوہ شاید ہی کوئی دکنی لفظ ہو۔ اس کی زبان اتنی صاف ہے کہ کسی طرح خواجہ کی نہیں ہو سکتی۔ رسالہ "ہفت اسرار" کا ذکر شمس اللہ قادری نے "اردوے قدیم" میں کیا۔ اس میں خواجہ صاحب کے محض سات ارشادات ہیں جن کی مبسوط شرح کسی مرید نے لکھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسے خواجہ کی نہیں، ان کے کسی مرید کی تصنیف قرار دیا ہے ("اردو شہ پارے"، ص ۲۰)۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب یہ رسالہ ناپید ہے۔ شمس اللہ قادری نے اپنا ماخذ نہیں بتایا کہ انھیں "ہفت اسرار" کے بارے میں کہاں سے معلوم ہوا۔

"ہدایت نامہ" کا ذکر بھی شمس اللہ قادری ہی نے کیا ہے۔ "اردوے قدیم" کے مطابق اس کا ذکر "عشق نامہ" میں ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ خبر دیتی ہیں کہ حکیم صاحب نے حبیب گنج علی گڑھ کے مخطوطات کی فہرست تیار کرتے وقت دریافت کیا کہ عبدالعزیز بن شیر ملک کی "تاریخِ حبیبی و تذکرۂ مرشدی" کے بابِ ہفتم میں اس کا نام دیکھا تھا (اردو نثر کا

Scanned by CamScanner

آغاز، ص ۸۴)۔ اب فارسی "تاریخ حبیبی" نایاب ہے۔ اردو ترجمہ عام طور سے ملتا ہے۔ اس میں کہیں بھی کسی اردو رسالے کا ذکر نہیں ملتا۔ کسی نے اس رسالے کو نہیں دیکھا، نہ اب یہ کہیں موجود ہے۔ شاید کبھی بھی نہ رہا ہو۔

"ہشت مسائل" کا ذکر مولوی عبدالحق نے کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ کے مطابق آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں ایک نسخہ تھا جو شاہ برہان سے منسوب تھا۔ برہان الدین جانم کے علاوہ ایک شاہ برہان الدین رازالٰہی (۱۰۸۳ھ-۹۶۸ھ) ہوئے ہیں۔ رسالے کی صاف زبان کے پیشِ نظر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انھیں کی تصنیف ہوگا۔

"تلاوت الوجود" کا ذکر بھی سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے کیا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنے تاریخ ساز رسالے "معراج العاشقین کا مصنّف" میں ثابت کر دیا ہے کہ "تلاوت الوجود" مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔ "تمثیل نامہ" کا ذکر بھی پہلی بار مولوی عبدالحق نے کیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو کتب خانۂ شاہ امین بیجاپور میں اس کا ایک نسخہ ملا (اردو نثر، ص۷۹)۔ اسی کا ذکر سروری صاحب نے کیا ہے۔ حسینی شاہد نے یہ نسخہ دیکھا۔ اس میں نہ کہیں اس کا نام "تمثیل نامہ" دیا ہے، نہ خواجہ بندہ نواز سے انتساب ہے۔ یہ شاہ امین کے رسالے "وجودیہ" کا ایک ناقص نسخہ ہے (شاہ امین الدین اعلیٰ، ص۲۶-۳۶۴)

سروری صاحب کو انجمنِ ترقیِ اردو ہند میں کئی رسالے ملے جنھیں کاتب یا فہرست نگار نے خواجہ صاحب سے منسوب کیا ہے، لیکن نہ ان کی زبان اتنی قدیم ہے نہ کوئی اور قرینہ ہے جس سے انھیں خواجہ کی تصنیف مانا جائے۔ مثلاً ایک رسالہ "مشاہدۃالاکبر" ہے، جسے میں نے دیکھا ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے: "محبت پر محبت دھرنا سو بندہ نواز حسینی" کیا خواجہ بندہ نواز خود کو بندہ نواز کہہ سکتے تھے۔ غرض یہ ہے کہ خواجہ سے کسی رسالے کا انتساب ثابت نہیں ہوتا۔

بندہ نواز کے بعد ان کے فرزند محمد اکبر حسینی کا تذکرہ ہے۔ ان کے گلبرگہ آنے کا سنہ ۸۰۱ھ/۱۴۰۰ء درج کیا ہے (ص۱۸۱)۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ۸۰۱ھ مطابق ہے ۹۹-۱۳۹۸ء کے۔ محمد عمر یافعی نے تین صفحات پر مشتمل اکبر حسینی کا اردو رسالہ دریافت کیا اور "مجلۂ مکتبہ" جلد ۱، شمارہ ۱، بابت اپریل ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔ مجلہ کے ایڈیٹر سروری صاحب تھے۔ علی گڑھ تاریخ میں اس کی تفصیل نہیں دی۔ میں نے مجلہ دیکھا ہے۔ اس رسالے میں ۱۵ سطریں نثر کی ہیں اور بعد کے دو صفحوں پر ۴۸ شعر ہیں۔ یافعی نے اسے "آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثرِ اردو کا ایک نمونہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے سرنامے پر لکھا ہے: "ہذا رسالہ بندہ نواز گیسودراز" اور خاتمے پر لکھا ہے: "من تصنیفِ سید

Scanned by CamScanner

محمد اکبر حسینی بندہ نواز۔" انتساب کا یہ تضاد ہی رسالے کو مشکوک بنا دیتا ہے لیکن اس کی زبان اتنی صاف ہے کہ کئی صدی بعد کی ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "کدم راو پدم راو" کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> اہلِ دکن نے دکنی ادب کی تلاش و جستجو کے شوق میں بلا تحقیق تین صفحوں کے اس مختصر رسالے کو نویں صدی ہجری کے دکنی ادب کے دامن میں ٹانک کر یقیناً تحقیقی ستم ظریفی کا ثبوت دیا ہے۔
>
> (مقدمہ، ص ۳۳)

باب کے آخر میں سروری صاحب نے سید عبداللہ حسینی کے ترجمۂ "نشاط العشق" کا ذکر کیا ہے۔ اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی فہرست میں اس ترجمے کا ذکر کیا ہے، "نشاط العشق، شرحِ غوثیہ" کے نام سے، لیکن مؤلف کا نام نہیں دیا۔ اب یہ کتاب ناپید ہے، لیکن اسٹیوارٹ کے زمانے میں موجود تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانم کی "کلمۃ الحقائق" سے پہلے بھی دکنی نثر میں کم از کم ایک کتاب لکھی گئی۔ عبداللہ حسینی کو بعض نے بندہ نواز کا نواسہ لکھا ہے، بعض نے پوتا، سروری صاحب لکھتے ہیں:

> عبداللہ خواجہ صاحب کی نواسی، یعنی آپ کی صاحب زادی بی بی بتول کی بیٹی، کے شوہر ابوالمعالی کے فرزند تھے۔
>
> (ص ۱۸۴)

"نواسی کے شوہر کے فرزند" کہنے کے یہ معنی ہیں کہ نواسی کے شوہر ابوالمعالی کی دو شادیاں ہوئی ہوں گی اور عبداللہ دوسری بیوی سے پیدا ہوئے ہوں گے، یعنی نواسی کے سوتیلے بیٹے تھے۔ میرا خیال ہے کہ مندرجۂ بالا جملہ یوں ہونا چاہیے:

> عبداللہ خواجہ صاحب کی نواسی، یعنی آپ کی صاحب زادی بی بی بتول کی بیٹی کے شوہر تھے اور ابوالمعالی کے فرزند تھے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

> "سیرِ محمدی" میں حضرت گیسودراز کا جو شجرہ دیا گیا ہے اس میں عبداللہ حسینی کا نام خواجہ صاحب کی نواسی کے شوہر کی حیثیت سے بتایا گیا ہے اور عبداللہ حسینی سید ابوالمعالی کے فرزند بتائے گئے ہیں۔
>
> (اردو نثر کا آغاز، ص ۱۱۵)

نواسی کے سوتیلے بیٹے اور نواسی کے شوہر میں ایک پشت کا فرق ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ

Scanned by CamScanner

پچھلے باب میں لکھا گیا، سخاوت مرزا نے تحقیق کی کہ وہ خواجہ بندہ نواز کے نبیرہ نہ تھے، خواجہ کے برادرِ نسبتی مولانا ابوالمعالی کے بیٹے تھے (عبدالقیوم کی تاریخ، ص ۷ ۵۴)۔ گویا یہ تو طے ہو گیا کہ عبداللہ حسینی کے والد کا نام بہر حال ابوالمعالی تھا۔ یہ واضح نہیں کہ حسینی خواجہ بندہ نواز کی نواسی کے شوہر تھے یا خواجہ کے برادرِ نسبتی (سالے یا بہنوئی) کے بیٹے؟

عبداللہ حسینی کے بعد دو شعرا نظامی صاحبِ مثنوی "کدم راو پدم راو" اور قریشی مصنفِ مثنوی "بھوگ بل" کا مختصر ذکر ہے۔ چونکہ ۱۹۶۲ء تک نظامی کے بارے میں زیادہ معلوم نہ تھا اس لیے سروری صاحب معذور ہیں کہ اتنی اہم مثنوی پر اتنا کم لکھا۔

مندرجۂ بالا جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد کی تحقیق نے سروری صاحب کے فرمودات کے بیشتر حصّوں کو غلطِ محض قرار دے دیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقی اعتبار سے علی گڑھ تاریخ میں یہ باب سب سے زیادہ غیر معتبر اور غیر مفید ہے۔ اس کے کسی بیان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھے باب "اردو ادب عادل شاہی دور میں" کے دو حصّے ہیں۔ حصّہ "الف" ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے اور حصّہ "ب" نصیر الدّین ہاشمی نے۔ تاریخ کے اصل خاکے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور آخر تک نذیر احمد نے لکھا ہے اور محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کے دور کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی نے۔ بالفاظِ دیگر ۱۰۳۷ھ تک کے ادیبوں کا جائزہ نذیر احمد نے اور ۱۰۳۷-۹۷ھ کا نصیر الدین ہاشمی نے لیا ہے۔ نذیر احمد کے حصّے کے ادیب بیشتر درویش ہیں جن کی زندگی اور نگارشات کا معاملہ بہت الجھا ہوا ہوتا ہے۔ انھیں پرکھنے کے لیے دکنی ادب سے گہری واقفیت کی ضرورت ہے۔ دونوں حصّوں کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے۔

(الف) از ڈاکٹر نذیر احمد

ڈاکٹر نذیر احمد نے ابتدائی ۱۱ صفحوں میں عادل شاہی دور کی سیاسی تاریخ، لسانی صورتِ حال، نیز احمد نگر کی نظام شاہی کا ذکر کیا ہے اور یہ ضروری تھا۔ ہندوستان کے عہدِ قدیم کی طرح عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے بارے میں سنین کا معاملہ اتنا قطعی نہیں، جتنا کہ جدید دور میں ہے۔ دکن کی تاریخ نذیر احمد کا خصوصی موضوع نہیں، اس لیے اُن سے اس میں تسامحات ہو گئے ہیں۔ کہیں کہیں ہجری و عیسوی سنین کا تطابق درست نہیں۔ معلوم نہیں اس میں سہوِ طباعت کا کتنا ہاتھ ہے۔ چند سنین جو محلِّ نظر ہیں، یہ ہیں:

ص ۱۹۲ اور بعد کے صفحات پر متعدد جگہ بادشاہوں کے ناموں کے آگے قوسین میں

Scanned by CamScanner

ایک سنہ درج ہے، لیکن یہ صراحت نہیں کہ یہ سنہ ولادت ہے، سنہ جلوس ہے یا سنہ وفات؟ زیادہ تر صورتوں میں یہ سنہ وفات ہے۔ اس کی صراحت سنہ سے پہلے م یا ف لکھ کر کر دی جاتی تو بہتر ہوتا۔ رشید حسن خاں نے توجہ دلائی کہ ص ۱۹۲ پر پہلی سطر میں علی عادل شاہ اول کے آگے سنہ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء لکھا ہے، جب کہ انیسویں سطر میں ۹۸۸ھ/۱۵۹۰ء۔ ظاہرا یہ سنہ وفات ہے۔ ۹۸۸ھ مطابق ہے ۸۱-۱۵۸۰ء کے اس طرح ۱۵۸۰ء صحیح ہونا چاہیے، ۱۵۹۰ء سہو ہے۔ یوسف عادل شاہ کا سنہ وفات ۹۱۶ھ/۱۵۱۱ء لکھا ہے (ص ۱۹۲)۔ ڈاکٹر محمد چراغ علی نے اپنی کتاب "اردو مرثیے کا ارتقا، بیجاپور اور گولکنڈہ میں" (حیدر آباد، ۱۹۷۳ء) میں دکنی بادشاہوں کے سنین دکنی تاریخوں کو دیکھ کر لکھے ہیں۔ ان کے مطابق "تاریخ فرشتہ" میں یوسف عادل شاہ کا سنہ وفات ۹۱۶ھ م ۱۵۱۰ء درج ہے (ص ۲۱)۔

معلوم نہیں عیسوی سنہ فرشتہ نے لکھا ہے کہ چراغ علی کا اضافہ ہے۔ ۹۱۶ھ کا زیادہ تر حصہ ۱۵۱۰ء میں پڑتا ہے۔ اس لیے صحیح تاریخ معلوم نہ ہونے کی صورت میں اسی کو ترجیح دی جائے گی۔ نذیر احمد نے محمد عادل شاہ کا سنہ وفات ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء درج کیا ہے۔ اس کی صحیح تاریخ ۲۸ محرم ۱۰۶۷ھ ہے (چراغ علی، ص ۲۵)۔ یہ تاریخ ۱۶۵۶ء میں پڑتی ہے، ۱۶۵۷ء میں نہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے فرشتہ اور خافی خاں کے بیانات کا اقتباس دیا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ نے دفتروں میں سے فارسی برطرف کر کے ہندوی کو داخل کر دیا۔ نذیر احمد نے ہندوی سے دکنی مراد لی ہے (ص ۹۴-۱۹۳)۔ یہ غلطی بہت عام ہے۔ جیسا کہ میں شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" کے تبصرے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے اپنے تحقیقی مقالے میں تفصیلی بحث کر کے ثابت کیا کہ ہندوی سے مراد کوئی بھی ہندوستانی زبان ہوتی تھی۔ بیجاپور میں فارسی کے بجائے نچلی سطح پر مراٹھی کو رائج کیا گیا، لیکن اعلیٰ سطح پر فارسی ہی کا استعمال ہوتا تھا (۶)۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے دکن کی مختلف حکومتوں اور علاقوں کے تاریخی اور سماجی پس منظر کو بہت خوبی سے پیش کیا اور یہ سب اسی حد تک ہے جس کا اردو زبان و ادب سے کوئی تعلق ہے۔ لکھتے ہیں:

> نظام شاہی حکومت کے بانی احمد نظام شاہ نے ۹۰۰ھ/۱۵۱۵ء میں احمد نگر کی بنیاد ڈالی۔ (ص ۱۹۷)

لیکن ۹۰۰ھ مطابق ہے ۹۵-۱۴۹۴ء کے۔ ۱۵۱۵ء اس لیے غلط ہے کہ احمد نظام شاہ کا انتقال ۹۱۴ھ/۹-۱۵۰۸ء میں ہو چکا تھا ("دکن میں اردو"، ص ۲۶۰)۔ نذیر احمد نے یہ بہت درست

Scanned by CamScanner

لکھا ہے کہ احمد نگر کی نظام شاہی حکومت کے اردو مصنّفین سے ہم آگاہ نہیں، وہ سخاوت مرزا کے ایک مضمون کا اقتباس دیتے ہیں کہ انھوں نے غالباً شاہ طاہر کاشانی کی ایک لغت مکتوبہ ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں قدیم اردو الفاظ اور ان کے معانی کو لفظ ریختہ سے موسوم کیا گیا تھا (ص ۱۹۹)۔ ڈاکٹر نذیر احمد سخاوت مرزا کے بیان میں لفظ "غالباً" کی وجہ سے کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے۔ انھوں نے شاہ طاہر کاشانی کے حالات لکھے ہیں، جو چنداں ضروری نہ تھے۔ وہ دورِ نظام شاہی کے دو شعرا آفتابی اور اشرف بیابانی کا ذکر کرتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے نظام شاہی میں تیسرے شاعر حسن شوقی کو بھی لیا ہے جس نے "فتح نامۂ نظام شاہ" جیسی مثنوی لکھی۔

معلوم نہیں علی گڑھ تاریخ میں سنین پر کیا بددعا لگی ہے کہ ہجری سنہ کے مقابل عیسوی سنہ بارہا غلط ہوتا ہے۔ نذیر احمد جیسا محقق بھی سہو کر جاتا ہے۔ اشرف کی "نوسرہار" کا سنہِ تصنیف ۹۰۹ھ/۱۵۲۳ء لکھا ہے (ص ۱۸۰)۔ ۹۰۹ھ صحیح ہے، لیکن یہ برابر ہے ۴-۱۵۰۳ء کے۔ انھیں کے سلسلے میں ایک شخص سیّد علی سانگڑے قندھاری کا زمانہ ۱۸۴۲ھ/۱۴۴۳ء چھپا ہے (ص ۲۰۰)، ہجری سنہ ۸۴۶ھ ہونا چاہیے۔ کتاب کے صحت نامے میں اس کی تصحیح نہیں کی گئی۔ اس سے قطعِ نظر مقالہ نگار نے اشرف کی تحقیق بھی خوب کی ہے اور مثنوی کا لسانی تجزیہ بھی بھرپور ہے۔

اشرف کے بعد شاہ میراں جی شمس العشاق کا بیان ص ۲۰۸ تا ۲۲۱ پر ہے۔ میراں جی کے سنہِ ولادت و وفات کا معاملہ بہت نزاعی ہے۔ نذیر احمد نے اس وقت تک کی تمام شہادتیں درج کرنے کے بعد ڈاکٹر زور کے نتائج سے اتفاق کیا جو ان کے غیر شائع شدہ مقدمۂ "ارشاد نامہ" میں دیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر زور نے مختلف شواہد کی بنا پر ان کا سنہِ وفات ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء
> بتایا ہے جو زیادہ قرینِ قیاس ہے۔
>
> (ص ۲۱۰)

۹۰۲ھ برابر ہے ۹۷-۱۴۹۶ء کے۔ یہ ۱۴۹۶ء کہاں سے آگیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر زور کو سنہِ وفات ۹۰۲ھ کا موید قرار دینا غیر ذمےدارانہ ہے کیونکہ ان کے سارے دلائل اسی بات کے خلاف تھے۔ ڈاکٹر زور نے مقدمۂ "ارشاد نامہ" میں میراں جی کا سنہِ وفات ۹۷۰ھ تسلیم کیا ہے (حسینی شاہد: "امین الدین اعلیٰ"، ص ۸۹)۔ یہ سنہ مطابق ہے ۶۳-۱۵۶۲ء کے۔ معلوم نہیں غلط سنین نذیر احمد نے لکھے تھے کہ مطبع میں ان کی دُرگت ہو گئی۔ نذیر احمد نے میراں جی کی مثنویوں کے سلسلے میں ایک کا نام "شہادت الحقیقت" یا "شہادت

Scanned by CamScanner

التحقیق" لکھا ہے(۲۱۳)۔ یہ صحیح نہیں۔ خود میراں جی نے اس کا نام "شہادت التحقیق" باندھا ہے:

اس نام ہے تحقیق
سُن شہادت التحقیق

کسی کو اختیار نہیں کہ شاعر کے رکھے ہوئے نام کو بدل دے، وہ قواعد کے اعتبار سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ میراں جی کی نثری تصانیف کے ذکر میں شمس اللہ قادری کے مذکورہ رسالے "گل باس" اور "جل ترنگ" کا نام لیتے ہیں۔ حکیم صاحب نے نہ ان کا کوئی نمونہ دیا، نہ یہ اب کہیں دستیاب ہیں، اس لیے ان کا عدم و وجود برابر ہے۔ اس کے بعد نذیر احمد نے "شرحِ مرغوب القلوب" کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب "میراں جی خدانما" میں "شرحِ تمہیدات" اور "شرحِ مرغوب القلوب" کے جملے دے کر ثابت کیا کہ موخرالذکر "میراں جی خدانما" ہی کی تصنیف ہے۔

نذیر احمد نے ایک اور رسالہ "سبع صفات" کو میراں جی سے منسوب کیا۔ انجمنِ ترقیِ اردو ہند میں یہ پانچ صفحوں کا رسالہ ہے جس کے سرورق پر مصنف کا نام میراں جی لکھا ہے۔ گجرات و دکن میں متعدد درویش ایسے ہوئے ہیں جن کے نام کا ایک جزو میراں جی ہے۔ اس رسالے کی زبان کو جانم کی "کلمۃ الحقائق" سے ملایا جائے تو صاف اندازہ ہوگا کہ اتنی صاف زبان میراں جی کی نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر محمد ہاشم، جنھوں نے میراں جی پر ایک کتاب بھی لکھی ہے، رائے دیتے ہیں:

> میراں جی شمس العشاق سے منسوب جتنے بھی نثری رسالے ہیں ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ یہ میراں جی شمس العشاق ہی کی تصنیف ہے۔
>
> (مقدمہ "مغز مرغوب" و "چہارم شہادت"، ص۸۶)

ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی ان کے کسی نثری رسالے کا انتساب تسلیم نہیں کیا ("نوائے ادب"، جولائی ۱۹۷۰، ص ۲۲)۔ نذیر احمد کی یہ رائے درست ہے کہ سالار جنگ کے کتب خانے میں جس مخطوطے کو میراں جی کا "سب رس" کہا ہے وہ دراصل وجہی کی "تاج الحقائق" ہے (ص ۱۹-۲۱۸)۔ ان سے پہلے سخاوت مرزا نے عبدالقیوم کی مرتبہ تاریخِ ادبِ اردو میں ص ۵۵۳ پر یہی بات کہی ہے۔ آخر میں نذیر احمد نے میراں جی کی نظم و نثر سے اس وقت کی زبان کے بارے میں کچھ مشاہدات پیش کیے ہیں۔ ان میں جو نتائج نثر سے

Scanned by CamScanner

ماخوذ کیے ہیں وہ بے بنیاد ہیں، لیکن بیشتر نتائج نظم پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اور درست ہیں۔

شمس العشاق کے بعد برہان الدین جانم آتے ہیں۔ نذیر احمد مولوی عبدالحق سے اتفاق کرتے ہیں کہ جانم کا انتقال ۹۹۰ھ کے قریب ہوا ہوگا، لیکن حاشیے میں لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے "اُردو کی ابتدائی نشوونما ..." طبع دوم میں اس سنہ کے بعد مانا ہے (ص ۲۳۲)۔ بعد میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے صحیح تاریخ ۱۰۰۷ھ دریافت کرلی (شاہ امین الدین اعلیٰ، ص ۱۲۰) نذیر احمد اس کے آگے جانم کی تصانیف کے بارے میں بڑے ماہرانہ انداز میں لکھتے ہیں۔ انھوں نے جانم کے اس اجتہاد کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ اصوات کے تشابہ کو قافیے کے لیے کافی سمجھتے ہیں، اس لیے وہ ایسے قافیے بھی استعمال کر جاتے ہیں:

عارف، فاسق۔ شرف، فرق۔ عارف، فارق۔ طرف، حق۔ مالک، خالق۔ انصاف، ارشاد۔ گروہ، شروع۔ روح، شروع وغیرہ (ص ۳۳-۲۳۲)

اگر ہماری شاعری قافیوں میں تشابہ اصوات کو کافی سمجھتی تو شاید بے قافیہ معرا نظموں کی ضرورت نہ پڑتی۔

جانم سے جو نثری رسالے منسوب کیے ہیں ان میں سے دو ایک کے بارے میں شبہہ ہوتا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں ایک چھوٹا سا نسخہ "مجموعۃ الاشیا" ہے۔ یہ میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ اس کے آخر میں امین تخلص کی ایک نظم ہے اور نثر میں بھی بار بار "امین" کا لفظ آتا ہے۔ اس سے مجھے گمان ہوتا ہے کہ یہ جانم کے بجائے امین کا رسالہ ہو سکتا ہے۔ مجھے "معرفت القلوب" کے انتساب پر بھی شک ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے:

> زبان و بیان دونوں اعتبار سے یہ رسالہ برہان جانم ہی کا معلوم ہوتا ہے، اس سے زیادہ سرِدست اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔
>
> (ص ۲۴۳)

اس میں شریعت، حقیقت، طریقت اور معرفت کا بیان ہے۔ جانم کے ارشاد نامہ نثر میں یہ موضوعات اس ترتیب سے ہیں:

شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، وحدت۔

لیکن میراں جی خدانما کی "شرحِ مرغوب القلوب" کے دوسرے باب میں "معرفت القلوب" والی ترتیب ہے۔ دونوں کتابوں میں ایک جملہ تقریباً مشترک ہے۔ دونوں کے نام "معرفت القلوب" اور "شرحِ مرغوب القلوب" بھی مماثل ہیں۔ ان وجوہ سے مجھے شبہہ ہے کہ "معرفت القلوب" شاہ جانم کی نہیں، میراں جی خدانما کی تصنیف ہے۔

Scanned by CamScanner

رسالوں کے تذکرے کے بعد نذیراحمد نے جانم کی زبان کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔
مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے شمس العشاق اور جانم دونوں پر ایک اہلِ نظر کی طرح
بحث کی ہے۔ان کے بعد دیدار فانی پر بھی بڑے عبور کے ساتھ تحقیقی انداز میں لکھا ہے۔
ابراہیم عادل شاہ ثانی مصنّفِ "نورس" نذیراحمد کے مطالعے کا خاص موضوع ہے۔
"نورس" کے موضوع سے متعلق نذیراحمد کے دو جملے ملاحظہ ہوں:

یہ علمِ موسیقی سے متعلق ایک مختصر دکنی نظم ہے۔

(ص ۲۵۱)

کتابِ "نورس" میں صرف راگ راگنیوں کی توضیح مقصود تھی۔

(ص ۲۵۵)

اس پر ڈاکٹر پرکاش مونس اپنے مقالے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس کتاب کو قوانینِ موسیقی یا علمِ موسیقی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، نہ یہ ایک نظم ہے، بلکہ وہ مختلف ایسے گیتوں کا مجموعہ ہے جنھیں ایک دوسرے سے دور کا بھی تعلق نہیں، نہ اس میں راگ راگنیوں کی توضیح کی گئی ہے۔ گیت یا چھند کے شروع میں عنوان کے طور پر محض اس راگ یا راگنی کا نام لکھ دینے سے جس میں وہ کبھی گائے گئے ہوں گے یا چار راگنیوں کی مفروضہ اور خیالی دیویوں کی لفظی عکاسی سے کوئی کتاب قوانینِ موسیقی یا علمِ موسیقی کی کتاب نہیں ہوجاتی ... یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ... غزلوں کے اوپر بحر کا نام لکھ کر کسی دیوان کو فنِ عروض کی کتاب بتانے لگے۔

("اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، ص ۲۳۲)

"نورس" کی نہایت فرسودہ اور سنسکرت زدہ زبان کے باوجود نذیراحمد اس کا اچھا مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔
انھوں نے عبدل کے "ابراہیم نامہ" میں ذیل کی بیت کی بنا پر شام کا نام قیاس کیا ہے:

تو عبدالکیتی صفت کر شہ بیاں
رہی ہے سو بھر کر زمیں آسماں

ممکن ہے عبدالغنی کی طرح کا کوئی نام ہو۔

Scanned by CamScanner

(ص ۲۵۸)

لیکن مرتبِ نظم ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تاویل بہتر معلوم ہوتی ہے کہ یہاں "کیتی" بمعنی "کتنی" ہے۔ ع:

تو عبدل کیتی صفت کر شہ بیاں

یعنی عبدل تو شہ کی کتنی بھی صفت بیان کر، یہ پھر بھی زمین آسمان میں بھری رہے گی۔
عبدل کے بیان میں ص ۲۵۹ پر ضمناً شاہ بہاء الدین باجن کا عرصۂ حیات "۷۰۲ھ/۱۳۰۳ء - ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء" لکھا ہے۔ ان تاریخوں کو دیکھ کر حیرت، بلکہ عبرت ہوتی ہے۔ شمس اللہ قادری نے ان کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ وہ ۷۹۰ھ میں پیدا اور ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ میں فوت ہوئے ("اردوے قدیم"، ص ۴۶)۔ علی گڑھ تاریخ میں نجیب اشرف ندوی نے بھی ان کا سنہ ولادت ۷۹۰ھ لکھا ہے۔ معلوم نہیں کس طرح نذیر احمد نے سنہ ولادت کو سنہ وفات بنا دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نذیر احمد سنین کے بارے میں محتاط نہیں۔ انھوں نے "ابراہیم نامہ" کا سنہ تکمیل ۱۰۱۲ھ لکھا ہے جیسا کہ اس عنوان سے ظاہر ہے۔

در تاریخ ختم کتاب ابراہیم نامہ شہور ۱۰۱۲۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "ابراہیم نامہ" مرتب کیا تو انکشاف کیا کہ شہور ایک علاحدہ تقویمی سنہ ہے جو ہجری سے الگ ہے۔ شہور سنہ ۱۰۱۲ مطابق ہے ۲۵ مئی ۱۶۱۱ء تا ۲۴ مئی ۱۶۱۲ء کے، جو مطابق ہے ہجری سنہ ۱۰۲۰-۲۱ھ کے۔ مسعود صاحب نے سنہ شہور کی بات محکمۂ آثار قدیمہ کے ضیاء الدین ڈیسائی کی سند پر لکھی ہے۔ شہور کی تاویل صحیح ہو سکتی ہے لیکن اس سنہ کی حدود کے بارے میں شبہہ ابھرتا ہے کہ یہ سنہ سولھویں صدی عیسوی یعنی شمسی سنہ کے مطابق کیوں کر ہے۔ عادل شاہی دور میں شمسی سنہ کیوں کر مروّج ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر انصار اللہ نظر کو کسی ڈاکٹر اوشا اتھاپے سے معلوم ہوا کہ ۱۰۱۲ شہور مطابق ہے ۱۰۲۱ھ اور ۱۶۱۲ء کے (۷)۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے شہباز حسینی کا الگ عنوان قائم کر کے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تحقیق کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ انھوں نے ان کی وہ غزل بھی درج کر دی ہے جسے بہتوں نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیا تھا:

تول تو سگی ہے لشکری، کر نفس گھوڑا سار تول

ان میں سب سے اہم مولوی عبدالحق ہیں، جنھوں نے "اردو کی ابتدائی نشو و نما..." میں اسے بندہ نواز کے سلسلے میں دے کر ایک غلط فہمی کو رائج کیا۔ نذیر احمد نے اس سلسلے

Scanned by CamScanner

میں خواجہ گیسودراز کا سنہ وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء لکھا ہے۔ ۸۲۵ھ کا پہلا مہینا ہی ۱۴۲۱ء میں پڑتا ہے، بقیہ ۱۱ مہینے ۱۴۲۲ء میں آتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے توجہ دلائی کہ اسی کتاب میں سروری صاحب نے خواجہ کی صحیح تاریخ وفات ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ ایکم نومبر ۱۴۲۲ء لکھی ہے۔ نذیر احمد نے محض ایک سنہ عیسوی درج کر کے گویا غلط سنہ کا تعین کیا۔

اس سے قطع نظر انھوں نے شہباز حسینی کے بعد عاشق دکنی اور شاہ ابوالحسن قادری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمی اعتبار سے بہت قابلِ قدر ہے۔ ہم بے تأمل کہہ سکتے ہیں کہ نذیر احمد نے عادل شاہی دور کے جس حصے پر لکھا ہے وہ سنین کے سہو کے باوصف، تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

(ب) از نصیر الدین ہاشمی

ہاشمی نے سب سے پہلے مقیمی کو لیا ہے۔ وہ شروع ہی میں نذیر احمد کے اس شبہے کا ازالہ کرتے ہیں کہ مرزا محمد مقیم کا تخلص مقیمی نہ تھا اور وہ اردو میں شعر نہ کہتا تھا (ص۲۷۸)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مسئلے کو اپنی تاریخ میں اٹھایا ہے اور طے کیا ہے کہ مرزا محمد مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخصیتیں تھیں، مقیمی "چندر بدن و مہیار" کا مصنف تھا اور مرزا محمد مقیم بنیادی حیثیت سے فارسی کا شاعر تھا، گو اس نے ایک اردو مثنوی بھی لکھی ہے (جلد اول، ص۲۳۸-۲۳۵)۔ ہاشمی یہ ثابت کرنے کے لیے کہ فارسی کے ایرانی شاعر بھی اردو میں اتنی مہارت حاصل کر لیتے تھے کہ پوری کتابیں تصنیف کر دیتے تھے، من جملہ دوسروں کے یہ دو مثالیں بھی دیتے ہیں۔

سید محمد والہ موسوی نے مثنوی "طالب و موہنی" کے علاوہ "خالق باری" کے طرز پر "رازق باری" بھی لکھی (ص۲۷۸)، لیکن اس مثنوی کے مرتب ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ "رازق باری" ۱۲۹۰ھ میں مدراس سے شائع ہوئی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ رسالہ سید محمد والہ کی تالیف نہیں ہے (مقدمہ "طالب و موہنی"، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء، ص۱۶)۔ محمود شیرانی نے منظوم لغات کی جو فہرست دی ہے اس میں دو مؤلفوں کی "رازق باری" شامل ہیں۔ "رازق باری" از اسماعیل ۱۷۰۱ھ، "رازق باری" از مصطفےٰ ۱۰۸۵ھ، لیکن والہ موسوی کی "رازق باری" کا مذکور نہیں (نذیر احمد: "آج چند نامہ"، "غالب نامہ"، دہلی، جنوری ۱۹۸۶ء، ص۹۵)۔

ہاشمی نے دوسرا نام مرزا علی لطف کا لیا ہے جنھوں نے اردو میں "تذکرۂ گلشنِ ہند" لکھا۔ علی لطف کے والد نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے لیکن علی لطف کی تمام عمر

Scanned by CamScanner

ہندوستان میں گزری، وہ کاہے کا ایرانی تھا اور اس کے لیے اردو میں لکھنا کیا مشکل تھا؟ ہاشمی نے "چندر بدن و مہیار" کی داستان کو سچا واقعہ اور واقعی سر گزشت کہا ہے (ص ۲۸۰)، حالانکہ اس کی حیثیت ایک سنی سنائی روایت سے زیادہ نہیں۔ کون جانے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اس میں زیبِ داستاں کے لیے کتنا اضافہ کیا گیا ہے۔

ہاشمی نے ملک خوشنود کی دو مثنویوں کے نام "ہشت بہشت" اور "بازارِ حسن" دیے ہیں (ص ۲۸۳)۔ اَدارہ اَدبیات اردو میں "کلیات ولی" کے حاشیے پر محض نو اوراق میں اس مثنوی کے اشعار ہیں جنھیں ڈاکٹر زور شناخت نہ کر سکے کہ یہ "ہشت بہشت" ہی کے ہیں ("تذکرۂ اردو مخطوطات"، جلد سوم، ص ۳۰۲-۳۰۶)۔ ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" اور "دکنی ادب کی تاریخ" میں ملک خوشنود کی دو مثنویوں "ہشت بہشت" اور "بازارِ حسن" کا ذکر کیا۔ سخاوت مرزا نے تاریخِ عبدالقیوم میں اپنے مقالے میں تصحیح کی کہ "ہشت بہشت" کا صحیح نام "جنت سنگار" ہے اور ناقص مخطوطہ کسی علاحدہ مثنوی کا نہیں، بلکہ "جنت سنگار" ہی کا ایک جزو ہے (تاریخِ قیوم، ص ۳۸۶)۔ ان کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں ان دونوں امور پر تفصیل سے لکھا۔

ہاشمی "جنت سنگار" کے لیے لکھتے ہیں:

یہ مثنوی دراصل امیر خسرو کی "رس" نام کی مثنوی کا ترجمہ ہے۔

(ص ۲۸۳)

مجھے یقین ہے کہ ہاشمی نے "اِس" لکھا ہوگا جسے اہلِ مطبع نے رس پڑھ لیا۔ مثنوی کا سنِ تصنیف شاعر کے نام سے نکلتا ہے:

ملک خوشنود موتی صاف رولیا
اپس کے نانوں کا تاریخ بولیا

ہاشمی نے ملک خوشنود سے ۱۰۵۶ھ اخذ کیا (ص ۲۸۴)۔ جالبی نے جس نسخے کو دیکھا اس میں مندرجۂ بالا شعر میں شاعر کا نام "ملکِ خشنود" لکھا ہے اور اس کی بنا پر انھوں نے مثنوی کا سنہ ۱۰۵۰ھ طے کیا ہے لیکن ۱۰۵۰ھ اور ۱۰۵۶ھ دونوں میں ایک الجھن پیدا کرنے والی بات ہے کہ اس کی ابتدا میں بادشاہ محمد عادل شاہ اور پیشوائے سلطنت میر محمد مومن دونوں کی مدح ہے۔ محمد عادل شاہ کا عہدِ حکومت ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ ہے لیکن میر محمد مومن کا انتقال ڈاکٹر زور کے مطابق ۲۱ جمادی الاوّل ۱۰۳۴ھ کو ہوا ("تذکرۂ اردو مخطوطات"، جلد سوم، ص ۳۰۳)۔ اس کی مدح اس طرح کی گئی ہے جیسے وہ برسرِ اقتدار ہو۔ معلوم نہیں کیا ماجرا ہے؟ ظاہر ہے کہ شاعر ایسے امیر کی مدح کرنے سے رہا جو ۱۶ یا ۲۲ سال

Scanned by CamScanner

قبل انتقال کر چکا ہو۔ مومن کی تاریخِ وفات عیسوی سنہ ۱۶۲۵ میں پڑتی ہے۔ جالبی نے ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء لکھ کر ایک سال کی غلطی کی (تاریخ ا، ص ۲۵۴)۔

ہاشمی لکھتے ہیں کہ مثنوی "ہشت بہشت" کا کوئی نسخہ موجودہ معلومات کے لحاظ سے حیدر آباد یا ہندوستان کے کتب خانوں میں نہیں ہے، (ص ۲۸۴)۔ ہندوستان کی حد تک یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ جالبی اطلاع دیتے ہیں کہ انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان میں اس مثنوی کے دو نسخے موجود ہیں (حاشیہ ص ۲۵۳)۔

رستمی کے "خاور نامہ" کا سنہ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء دیتے ہیں (ص ۲۸۶)۔ جالبی نے شیخ چاند کی مرتبہ مطبوعہ "خاور نامہ" کو دیکھ کر سنہ تصنیف ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء دیا ہے جو صحیح ہونا چاہیے (جلد ا، ص ۲۶۵)۔ شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا سنہ وفات ۱۰۸۶ھ/۱۶۸۵ء دیا ہے (ص ۲۸۸)، لیکن ہجری سنہ برابر ہے ۷۶-۱۶۷۵ء کے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کی تحقیق ہے کہ وصال کی صحیح تاریخ ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء ہے (شاہ امین الدین اعلیٰ، ص ۱۵۰)۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی کا سنہ ولادت ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء دیا ہے (ص ۲۹۶)۔ صحیح ۱۶۳۸ء ہے، ۱۶۲۸ء سہوِ طباعت ہو سکتا ہے۔ نصرتی کے سنہِ وفات کا قطعہ سہوِ طباعت کا شکار ہے اور اس پر رشید حسن خاں نے اعتراض کیا ہے۔ مصرعِ تاریخ یوں چھپا ہے ع:

یوں کہے نصرتی شہید رہے

اس سے ۱۰۸۵ھ ماخوذ کیا ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ دراصل اس سے ۱۲۸۴ نکلتا ہے (ادبی تحقیق، ص ۲۶۹)۔ اگر خاں صاحب سمجھنے کی کوشش کرتے تو صاف ظاہر تھا کہ مصرع کا آخری لفظ "رہے" نہیں "اہے" ہے، جو فہرستِ سالار جنگ میں ص ۷۰۱ پر دیا ہے اور اس ماخذ کا حوالہ علی گڑھ تاریخ میں موجود ہے۔ پہلے شعر کا دوسرا مصرع علی گڑھ تاریخ میں چھپا ہے ع:

جا کے جنت میں خوش ہو رہے

جب کہ فہرستِ سالار جنگ میں ہے ع:

جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے

مصرع کے آخری تین الفاظ میں سہوِ قرأت ہے۔ جالبی نے اپنی تاریخ میں ص ۳۳۰ کے حاشیے میں اس مصرع کو علی گڑھ تاریخ کے مطابق دیا ہے، لیکن حوالہ دیا ہے فہرستِ سالار جنگ ص ۷۰۱ کا۔ ظاہر ہے انھوں نے فہرست سے نہیں، علی گڑھ تاریخ سے یہ قطعہ نقل کیا ہے۔

معلوم نہیں کیوں نصرتی کی "گلشنِ عشق" کی تاریخ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء دی ہے۔ صحیح

۱۰۶۸ھ ہے جو مادۂ تاریخ ہے:

مبارک ہے یہ ہدیۂ نصرتی

سے بر آمد ہوتا ہے۔ جالبی نے اس کی تاریخ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء دی ہے (ص ۳۳۱)۔ بحری کی "من لگن" کا سنہ ۱۱۱۲ھ/۵-۱۷۰۰ء درج کیا ہے (ص ۳۱۰)۔ ۱۱۱۲ھ مطابق ہے۔ ۱-۱۷۰۰ء کے۔ شاید مسودے میں ۱۷۰۰ء لکھا ہو گا جسے سہو قرأت سے ۱۷۰۵ء پڑھ لیا گیا۔

مشہور شعرا کے بعد کم اہم شعرا کا ذکر ہے۔ ص ۳۲۲ پر شاہ معظم بیجاپوری سے جو مثنویاں منسوب کی ہیں ان میں "گنج مخفی"، "رسالۂ وجودیہ" اور "وجود العارفین" ان کی نہیں۔ حسینی شاہد نے اپنی کتاب "شاہ معظم" (حیدر آباد، ۱۹۷۸ء) میں ان کی جملہ کتابوں کی تفصیل دی ہے۔ ان میں یہ تین مثنویاں شامل نہیں۔ ان شعرا کے حالات کے بعد ہاشمی نے مرثیہ نگاری کا عنوان لیا ہے اور اس کے تحت عادل شاہی مرثیہ نگاروں کی تخلیقات کے مختصر نمونے دیے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی تحقیق میں عدم احتیاط اور تسامحات کے لیے بدنام ہیں۔ علی گڑھ تاریخ میں ان کا مضمون تاریخ کے چند اغلاط کو چھوڑ کر بسا غنیمت ہے۔ تفصیلات کافی دی ہیں جو عام طور پر قابلِ اطمینان ہیں۔

پانچواں باب "اردو ادب قطب شاہی دور میں" ڈاکٹر زور نے لکھا ہے۔ اس دور پر لکھنے کے لیے قلی قطب شاہ کے اس پرستار سے زیادہ اور کس کا استحقاق ہو سکتا ہے، لیکن ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری جیسے بزرگ محققین کے ساتھ ایک قباحت ہے کہ وہ اپنی پرانی معلومات پر تکیہ کرتے ہیں، ان میں تازہ بہ تازہ نت نئی معلومات کو نہیں سموتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک پرانی منزل پر رکے ہوئے ہیں۔ بعد کی تحقیق کے پیشِ نظر ان کے یہاں تسامحات دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے ابتدائی دو تین صفحات میں قطب شاہی خاندان کی تاریخ بیان کی۔ وہ قطب شاہی حکومت کا دور ۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ء تک قرار دیتے ہیں (ص ۳۴۷)، لیکن سلطان قلی نے محمود شاہ بہمنی کی وفات (۱۵۱۸ء) کے بعد ہی خود مختاری کا اعلان کیا اور زور بھی اسے تسلیم کرتے ہیں (ص ۳۴۸)۔ پھر ص ۳۴۷ اور ۳۴۸ پر قطب شاہی عہد کو ۱۵۰۸ء سے کیوں شروع کرتے ہیں۔ انھوں نے قطب شاہی عہد کے اردو ادب کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ سنین کو حل کرنے سے ذیل کے فرماں رواؤں کے عہد ظاہر ہوتے ہیں:

۱۔ ابتدائی کوششیں، ابراہیم قطب شاہ کے انتقال تک۔

۲۔ دورِ عروج، قلی قطب شاہ سے عبداللہ قطب شاہ تک۔

Scanned by CamScanner

۳۔ دورِ انتشار، ابوالحسن تاناشاہ کا عہد۔

اس تقسیم پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ابتدائی دور میں وہ ملا خیالی، محمود اور فیروز کا ذکر کرتے ہیں اور یہی اس عہد کے قابلِ ذکر شاعر تھے، لیکن ملا خیالی کا ذکر انھوں نے محض اس کی مسجد تک محدود رکھا، اس کی شاعری کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ڈاکٹر زور خیالی کے اردو کلام سے واقف نہ تھے۔ یہی کیفیت محمود کے ساتھ ہوئی جس کا کوئی شعر پیش نہ کر سکے۔ حیرت ہے۔ ہاں، فیروز کی مثنوی "پرت نامہ" کا بخوبی بیان کرتے ہیں۔ آخر میں اس دور کے کلام اور زبان کی خصوصیات گناتے ہیں جو فیروز کی زبان تک محدود ہیں۔ فیروز کے ضمن میں اپنی کتاب "اردو شہ پارے" کا سنہِ اشاعت ۱۹۲۷ء لکھتے ہیں (ص ۳۵۶)۔ دراصل یہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔

دورِ عروج میں سب سے پہلے اپنے محبوب شاعر قلی قطب شاہ پر تفصیل سے لکھتے ہیں۔ ص ۳۶۱ پر اس کا دورِ حیات ۱۵۶۶ء تا ۱۶۱۲ء صحیح درج کیا ہے، لیکن ص ۳۶۵ پر اس کے انتقال کی تاریخ ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء لکھی ہے۔ یہ ہجری تاریخ ۱۶۱۲ء میں پڑتی ہے۔ اپنی کتاب "معانیِ سخن" (حیدر آباد، ۱۹۵۸ء) میں اس کی وفات کی تاریخ ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء بالکل ٹھیک لکھی ہے (ص ۱۹)۔ آگے چل کر ایک بار پھر لڑکھڑاتے ہیں۔ لکھتے ہیں: قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد سلطان محمد بروزِ عیدِ قرباں ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء تخت نشین ہوا (ص ۳۸۵)۔ ۱۰۲۰ھ کی عیدِ قرباں ۱۶۱۱ء میں نہیں ۱۶۱۲ء میں پڑتی ہے اور محمد قطب ۱۶۱۲ء میں تخت نشین ہوا۔

ہجری سنہ کے مطابق عیسوی سنہ لکھنے میں ڈاکٹر زور محتاط نہیں۔ رشید حسن خاں نے ایسی کئی اغلاط کی نشان دہی کی ہے، مثلاً وجہی کی "قطب مشتری" کا سنہ ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۰ء لکھا ہے (ص ۳۶۸)، لیکن ص ۳۵۷ پر ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء لکھ چکے ہیں۔ ص ۲۶۵ پر لکھا ہے کہ "قطب مشتری" "ابراہیم نامہ" سے صرف پانچ سال بعد لکھی گئی اور ص ۲۶۰ پر "ابراہیم نامہ" کا سنہ ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۴ء لکھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "قطب مشتری" ۱۰۱۷ھ میں لکھی گئی (ادبی تحقیق، ص ۲۶۶)۔

"قطب مشتری" کی صحیح تاریخ ۱۰۱۸ھ/۱۰-۱۶۰۹ء ہے۔ ص ۳۵۷ اور ۳۸۴ پر انھوں نے ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء ہی لکھا ہے۔

رشید حسن خاں نے اسی قسم کے مزید دو تسامحات کی طرف توجہ دلائی۔ ص ۳۷۳ پر محمد قطب شاہ کا سالِ وفات ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء درج ہے، ص ۳۸۵ پر ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء (ادبی تحقیق، ص ۲۶۵)۔ دراصل ۱۰۳۵ھ برابر ہے ۲۶-۱۶۲۵ء کے۔ ڈاکٹر زور نے ایک جگہ ۲۵

Scanned by CamScanner

اور دوسری جگہ ۳۶ لکھ دیا۔ جاوید وششٹ کے مطابق محمد قطب شاہ کی وفات ۳۱ جنوری ۱۶۲۶ء کو ہوئی (ملا وجہی، دہلی ۸۴، ص ۱۵)۔ وجہی کے سنہ وفات کے بارے میں بھی وہ تضاد کا شکار ہوئے ہیں۔ ص ۳۸۰ کی چھٹی سطر میں لکھتے ہیں کہ "وجہی نے ۱۰۷۷ھ/۱۶۵۶ء اور ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۱ء کے درمیانی زمانے میں وفات پائی" لیکن اسی صفحے کی سولھویں سطر میں لکھا ہے "وجہی ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء کے قریب فوت ہوئے تھے" یہ لکھنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ ۱۰۷۷ھ ۱۶۵۶ء کے بجائے ۶۷-۱۶۶۶ء کے مطابق ہے (ادبی تحقیق، ص ۲۶۶)۔ ایک ہی صفحے پر وجہی کی وفات کے سنہ میں یہ تضاد ڈاکٹر زور کی کمال بے احتیاطی کا آئینہ دار ہے۔ سنین سے قطعِ نظر وجہی پر خاطر خواہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کی نثری تصانیف میں "سب رس" کے علاوہ "تاج الحقائق" کا ذکر کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیتے ہیں:

مجھے شبہہ ہے کہ یہ وجہی کی تصنیف ہے بھی یا نہیں۔

(ص ۳۷۸)

بعد میں نورالسعید اختر اور جاوید وششٹ نے "سب رس" اور "تاج الحقائق" کا تفصیلی تقابلی مطالعہ کر کے ثابت کر دیا کہ "تاج الحقائق" کا مصنف وجہی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ غواصی کے سلسلے میں ملک خوشنود کی ایک مثنوی کا نام "بازارِ حسن" لکھا ہے (ص ۳۸۵)۔ ملک خوشنود کے سلسلے میں پیچھے دکھایا جا چکا ہے کہ سخاوت مرزا نے عبدالقیوم کی تاریخ (۱۹۶۱ء) میں واضح کیا کہ "بازارِ حسن" دراصل خوشنود کی مثنوی "جنت سنگار" (ہشت بہشت) ہی ہے۔

ڈاکٹر زور نے غواصی کے پیر کا نام سید شاہ ابوالحسن علی حیدر ثانی لکھا ہے (ص ۳۹۳)۔ انھوں نے اعتراف نہیں کیا کہ یہ انکشاف سخاوت مرزا کے ایک مضمون سے لیا ہے (۸)۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کی رائے میں یہ بزرگ غواصی کے مرشد نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ چشتی ہیں اور غواصی قادری۔ دوسرے یہ کہ حیدر ثانی ان کا لقب ہے، نام نہیں۔ غواصی نے اپنے مرشد کا نام حیدر بتایا ہے ع:

اے پیرِ دستگیر جو حیدر ترا ہے نانوں

اثر نے مختلف شواہد کی بنا پر طے کیا کہ غواصی کے مرشد حضرت میراں سید شاہ حیدر ولی اللہ ہیں جن کا وصال غواصی سے پہلے ۱۰۳۳ھ میں ہوا ("غواصی، شخصیت اور فن"، ص ۵۲-۵۱)

ڈاکٹر زور نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اورینٹل کالج میگزین"، لاہور، نومبر ۱۹۵۶ء میں شائع شدہ ایک مضمون کے مطابق عثمانیہ یونی ورسٹی میں ایک عربی کتاب "نصاب الاحتساب" ۱۰۸۹ھ میں کاتب کا نام "شیخ حسین بہاءالدین الملقب بہ غواصی" لکھا ہے۔ یہ توثیق طلب

Scanned by CamScanner

ہے کہ یہ مشہور شاعر غواصی ہے یا کوئی اور؟ (ص۳۹۵)۔ معلوم نہیں کیوں، ڈاکٹر زور نے مضمون نگار کا نام پوشیدہ رکھنا چاہا۔ یہ سخاوت مرزا ہیں اور ان کے اس مضمون کا عنوان بھی "ملک الشعرا غواصی اور اس کا کلام" ہے۔ ان کے انکشاف کی تردید ڈاکٹر جمال شریف نے اپنے مضمون "غواصی کا نام" ("سب رس"، حیدر آباد، جنوری ۱۹۶۸ء) میں کی۔ انھوں نے غواصی کی ایک رباعی نقل کی، جس میں اس کا نام ابو محمد دیا ہے (اثر: "غواصی، شخصیت اور فن"، ص۴۸-۴۶)۔

ابنِ نشاطی جیسے اہم شاعر کے بارے میں محض ایک صفحہ لکھا ہے، جس میں "پھول بن" پر تنقید کا ایک جملہ بھی نہیں۔ یہ بڑی کمی ہے۔ ہاں، "پھول بن" کی تاریخ کے بارے میں ضرور خلفشار کا ثبوت دیا ہے۔ ص۳۵۵ پر اس کی تاریخ ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء لکھی ہے، جب کہ ص۳۵۷، ۳۸۰، ۳۸۲ اور ۳۹۶ پر ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء دی ہے۔ ۱۰۷۶ھ مطابق ہے ۶۶-۱۶۶۵ء کے اور ۱۰۶۶ھ برابر ہے ۵۶-۱۶۵۵ء کے۔ "پھول بن" کا مصرعِ تاریخ یہ ہے ع:

اگیارہ سو کوں کم تھے تیس پر چار

بعض نسخوں میں تیس کی جگہ بیست یا بیس لکھا ہے۔ ۱۱۰۰ میں ۳۴ کم کرنے سے ۱۰۶۶ھ، اور ۲۴ کم کرنے سے ۱۰۷۶ھ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے مختلف محققین نے مختلف تاریخیں دی ہیں۔ "پھول بن" کے دو ایڈیشنوں کے مرتبین پروفیسر سروری اور شیخ چاند ابنِ حسین نے ۱۰۷۶ھ اور نصیر الدین ہاشمی ("دکن میں اردو"، نیز "علی گڑھ تاریخ..."، ص۲۹۲) اور جمیل جالبی (جلد اول، ص۴۸۷) نے ۱۰۶۶ھ لکھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اپنے باب میں ایک جگہ ۱۰۷۶ھ اور تین جگہ ۱۰۶۶ھ لکھی ہے۔ اس سے پہلے "داستانِ ادبِ حیدر آباد" (ص۴۷) میں ۱۰۶۶ھ اور "دکنی ادب کی تاریخ" (ص۶۶) میں ۱۶۵۵ء لکھی ہے جو جزواً ۱۰۶۶ھ کے مطابق ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا رجحان ۱۰۶۶ھ کو تسلیم کرنے کا ہے۔ دراصل اردو ادب کے قدیم دور کے لیے ہجری سنہ زیادہ معتبر ہوتا ہے بہ نسبت عیسوی سنہ کے۔

لکھتے ہیں:

> اسی دور کا ایک شاعر قطبی بھی تھا جس نے شیخ یوسف دہلوی کی کتاب "تحفۃ النصائح" کا اردو ترجمہ ۱۶۳۷ء میں کیا تھا۔ یہ ۱۵۰۰ شعر کی ایک مذہبی نظم ہے۔ (ص۳۹۸)

ڈاکٹر زور غالباً فارسی مصنف کی شناخت نہ کر سکے کہ یہ شیخ یوسف راجا المعروف بہ

Scanned by CamScanner

راجو قتال ہیں۔ انھوں نے اردو نظم کے اشعار کی تعداد ۱۵۰۰ لکھی ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق اس میں ۷۸۶ شعر ہیں (تاریخ، جلد اوّل، ص۴۸۶)۔ دراصل اس میں ایک شعر کو چار اجزا میں توڑ کر لکھا ہے جس سے ایک شعر پر دو شعر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کے اشعار کو ۲×۷۸۶ یعنی تقریباً ۱۵۰۰ سمجھ لیا، یا انھیں بیلی کے بیان سے غلط فہمی ہوئی ہو۔

اسی صفحے پر ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ علی اکبر جنیدی نے ۱۶۵۴ء میں مثنوی "ماہ پیکر" لکھی۔ سیدہ جعفر نے اس مثنوی کو مرتب کر کے حیدر آباد سے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ وہ اپنے مقدمے میں تحقیق کر کے لکھتی ہیں کہ جنیدی کا نام علی اکبر نہیں، شیخ احمد تھا (ص ۱۳)۔ مثنوی میں اس کی تاریخ تکمیل ۱۰ محرم ۱۰۶۴ھ دی ہے جو مطابق ہے ۲۰ نومبر ۱۶۵۳ء کے۔ ڈاکٹر زور نے ہجری سنہ کے بجائے عیسوی سنہ دیا اور ایک سال کا فرق کر دیا۔

بلاقی کے "معراج نامہ" کی تاریخ ص۳۹۹ پر ۱۶۶۹ء لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے نو مخطوطے دیکھے ہیں اور سب میں اس کی تاریخ ۱۰۵۶ھ دی ہے جو جالبی کے مطابق ۱۶۴۶ء کے برابر ہے (جلد اوّل، ص۴۹۳)۔ زور مذہبی کتب کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ میراں یعقوب نے برہان الدین اولیا اورنگ آبادی کی "شمائل الاتقیا" کا اردو نثر میں ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء میں ترجمہ کیا (ص ۴۰۰)۔ جمیل جالبی نے اس ضخیم کتاب کا مفصل مطالعہ کیا ہے۔ ان کے مطابق فارسی اصل شاہ برہان الدین غریب کے مرید رکن عمادالدین دبیرِ معنوی کی تصنیف ہے جس کے ترجمے کا سنہ خود مخطوطے میں ۱۰۸۴ھ دیا ہے (جلد اوّل، ص۵۰۱)۔

زور لکھتے ہیں ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء میں امین نے "قصۂ ابو شحمہ" لکھا (ص۴۰۴)۔ یہی ڈاکٹر بیلی نے لکھا تھا جن کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے تصحیح کی تھی کہ اس مثنوی کا مصنف امین نہیں لولیا ہے ("تنقیدات عبدالحق")۔ چنانچہ نصیرالدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" ص۱۴۶ پر اور جالبی نے اپنی تاریخ کی جلد اوّل ص ۵۱۳ پر اس کے شاعر کا نام اولیا ہی لکھا ہے۔ نجیب اشرف ندوی نے اپنے مضمون "ایک کہانی، چار شاعروں کی زبانی" میں لکھا ہے کہ اس قصے کا اصل مصنف امین نہیں ہے، بلکہ کوئی نامعلوم شاعر ہے جس نے اسے نعمت اللہ کے فارسی قصے سے ترجمہ کیا ہے(۹)۔

ڈاکٹر زور نے اس باب کے آخری حصے میں کم اہم شاعروں اور اس کے بعد مرثیہ نگاروں کے بارے میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ مضمون کے آخری صفحات میں زوالِ حکومتِ قطب شاہی اور سقوطِ گولکنڈہ کا بڑی دل سوزی سے بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق

Scanned by CamScanner

آخری دور کے مرثیہ گویوں کے کلام میں سوزو گداز ان کی ذہنی کیفیت کا غماز ہے۔ ان شاعروں نے مرثیوں کو اپنے سیاسی جذبات کا آلۂ کار بنایا تھا (ص ۴۱۴)۔

ڈاکٹر زور کے مضمون میں کہیں کہیں تاریخوں میں گڑبڑ ہے۔ مثنویوں کی تنقید عام طور پر سرسری ہے، یا ہے ہی نہیں۔ ان کمزوریوں سے قطعِ نظر مقالے کا معیار اچھا خاصا ہے۔

چھٹا باب "ولی اور اس کا عہد" ہے جسے ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی، بمبئی اور سخاوت مرزا، حیدر آباد نے مل کر لکھا۔ مشترکہ تحریر کی عام صورت یہ ہے کہ کچھ حصہ ایک مصنف کا لکھا ہوا ہوتا ہے، بقیہ دوسرے کا۔ شاذ یہ صورت ہو سکتی ہے کہ پوری تحریر کے والدین دونوں مصنف بنیں، گویا دونوں نے اسے لکھا اور پڑھا ہے اور دونوں ہر بیان کی ذمے داری لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس باب کا ولی کا حصہ محض ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی کی تحریر ہے اور بقیہ سب سخاوت مرزا کی۔

اس باب میں ولی کے عہد کا تاریخی یا سماجی پس منظر نہیں دیا اور مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ولی کے بارے میں ڈاکٹر مدنی کے تحقیقی نظریات مشہور ہیں۔ انھوں نے انھیں اپنی کتاب "ولی گجراتی" میں تفصیل سے لکھا ہے اور اس مضمون میں ان سب کا اعادہ کیا ہے جن میں اہم ترین ولی کا وطن گجرات قرار دینے کی بات ہے۔ ولی کا مشہور شعر ہے:

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

مدنی یہ حیرت انگیز اطلاع دیتے ہیں کہ دیوانِ ولی مرتبہ حیدر ابراہیم سایانی میں اس کے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے:

وطن گو اس کا گجرات و دکن ہے

(ص ۴۲۰، حاشیہ)

مدنی نے یہ نہیں لکھا کہ کیا دیوان کے کسی قلمی نسخے میں بھی مصرع کی یہ صورت ملتی ہے۔ مدنی نے ولی کے حالاتِ زندگی بہت تفصیل سے تحقیق کر کے لکھے ہیں گو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مضامین اور تاریخِ ادب میں ان سے اختلاف کیا ہے۔ مدنی کی تحقیق کے بعد ہی عام طور سے ولی کو دکنی کے بجائے گجراتی کہا جانے لگا۔

ولی کے دوستوں میں ان کے ہندو احباب گوبند لال، امرت لال، ہیرالال اور کھیم داس کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ اس سے ان کی رواداری اور بے تعصبی کا پتا چلتا ہے (ص ۴۲۷)،

Scanned by CamScanner

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ولی نے اپنی غزلوں میں جن احباب کے نام لیے ہیں وہ زیادہ تر اس کے محبوب ہیں اور یہ سب امرد پرستی کی نشانیاں ہیں۔ ہندو لڑکوں سے عشق کرنا بے تعصبی کی وجہ سے نہیں۔

ولی کا احوال ص ۴۱۸ سے ۴۴۹ تک یعنی ۳۲ صفحوں پر ہے جو تاریخ کی اس جلد کے لیے عدم توازن ہے۔ پوری جلد میں خواجہ بندہ نواز کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کو شاید اس کے نصف صفحے بھی نہیں دیے گئے۔

اس کے آگے دو عنوانات ہیں: "ولی اور اس کے عہد کی لسانی خصوصیات" اور "ولی کی شاعری کے اثرات اور اس کا تتبع"۔ یہ حصے مزید سات آٹھ صفحوں پر ہیں۔ طوالت سے قطعِ نظر دونوں اجزا ہیں بہت خوب۔ غرض یہ ہے کہ ولی پر بڑے بھرپور انداز میں لکھا ہے۔ اس جامعیت سے تحقیق و تنقید دونوں کا حق ادا ہو گیا ہے۔

ولی پر لکھتے لکھتے مصنفین کا زورِ قلم ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد معاصرین کے بارے میں محض سات آٹھ صفحے ہیں جن میں ہاشمی، محمود بحری، عبدالولی عزلت، عارف الدین خاں عاجز، سراج اور داؤد جیسے مشاہیر کے ساتھ ساتھ کئی مجہول الاسم شعرا بھی ہیں۔ ان سب کے بارے میں محض چند سطور ہیں۔ ان میں سے محمود بحری اور ہاشمی کے بارے میں پچھے بعض مضمون نگار لکھ چکے ہیں۔ سراج اور داؤد کے بارے میں کُل چھ چھ سطریں ہیں اور ہاشمی کے بارے میں ساڑھے چار سطریں۔ اتنے اہم شعرا کو چند سطروں میں ٹالنا اشک شوئی ہے۔ نمونے کے اشعار کے علاوہ تعارف و تنقید کو تین چار سطریں ہی دی ہیں۔

چند مشاہدات تاریخوں کے متعلق

ص ۴۵۵ پر شاہ حاتم کی وفات ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء میں دکھائی ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق یہ رمضان ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں واقع ہوئی (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۷-۴۲۶) ص ۴۵۵ ہی پر مظہر جانِ جاناں کی تاریخِ وفات ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء لکھی ہے۔ ہجری سنہ صحیح ہے، عیسوی غلط۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ "مقاماتِ مظہری" کے مطابق مظہر کی صحیح تاریخِ وفات ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ ہے جو مطابق ہے ۶ جنوری ۱۷۸۱ء کے (ادبی تحقیق، ص ۲۶۸)۔ ص ۴۵۹ پر ہاشمی کی تاریخِ وفات ۱۱۰۹ھ/۱۶۱۷ء میں عیسوی سنہ میں سہو طباعت ہے ۱۶۹۷ء کے لیے۔

اسی صفحے پر محمود بحری کی وفات ۱۱۲۰ھ/۱۷۱۷ء میں لکھی ہے۔ یہ ہجری سنہ زیادہ تر ۱۷۰۸ء میں پڑتا ہے۔ دیکھیے ص ۳۰۹ پر نصیر الدین ہاشمی نے ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء درج کی ہے اور اس کی تائید میں تاریخ کا شعر بھی دیا ہے جس سے ۱۱۳۰ برآمد ہوتا ہے۔ ص ۴۶۲ پر

سراج کی ولادت ۱۱۲۷ھ میں لکھی ہے۔ سروری صاحب نے "بوستانِ خیال کے مقدمے میں ۱۳ صفر ۱۱۲۴ھ لکھی ہے (حیدر آباد، ۱۹۶۹ء، ص ۷) یہی مالک رام نے لکھی ہے اور اس کے ساتھ تاریخ کے مادّے بھی دیے ہیں۔ یہی صحیح تاریخ ہے۔

اس باب کے بارے میں مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے بارے میں بہت اعلیٰ انداز میں لکھا ہے لیکن بقیہ شاعروں کو محض چند سطروں میں ٹالا ہے جس سے ان کا تعارف نہایت تشنہ رہ جاتا ہے۔

ساتواں اور آخری باب ہے: "شمالی ہند میں اردو ادب کے نمونے ۱۷۰۰ء تک"۔ اسے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے۔ ۱۷۰۰ء تک شمالی ہند میں اردو ادب کی مسلسل استوار روایت نہیں ملتی۔ کچھ متفرق مشکوک نمونوں کو اکٹھا کر لیا جاتا ہے تاکہ تاریخِ ادب کے خلا کو پُر کیا جا سکے۔ روایات کے بل پر قائم اس قبل تاریخ ادب دور میں صحتِ انتساب بہت اہم ہو جاتی ہے۔ بیشتر انتسابات کو حزم و احتیاط کی چھلنی میں گزارا جاتا ہے تو یہ خزف ریزے ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے محققین نے غیر معتبر چیزوں کو شرفِ اعتبار بخشا ہے۔ نورالحسن ہاشمی بھی اس لالچ سے محفوظ نہ رہ سکے۔

انھوں نے شروع میں دو صفحوں میں تاریخی پس منظر اور آدھے صفحے میں لسانی پس منظر بیان کیا ہے۔ تاریخی پس منظر اس قدر کافی ہے، لسانی پس منظر یعنی اردو زبان کا آغاز نہایت ناکافی، لیکن یہ موضوع کتاب کے ابتدائی لسانیاتی مقدمے میں کماحقہ تفصیل سے آچکا ہے، اس لیے بالکل بھی نہ ہوتا تو کوئی ہرج نہ تھا۔ ص ۴۰۷ پر دو فٹ نوٹوں میں لسانی بیان کے متن کی تردید یا تصحیح کی گئی ہے۔ واضح نہیں کیا کہ یہ دونوں حواشی مضمون نگار کے لکھے ہوئے ہیں یا ادارے کا اضافہ ہیں۔ ظاہرا یہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر نذیر احمد کے لکھے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا تھا تو صراحت کرنی چاہیے تھی۔

خواجہ بندہ نواز سے منسوب دو ریختے دینے سے پہلے لکھتے ہیں کہ ان کی صحت ابھی پوری طرح موثق نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے بعد دو ریختے دیے ہیں (ص ۴۰۷-۴۱۱)۔ ان کی صحت موثق ہونا تو درکنار، ان کی عدمِ صحت کا امکان کہیں زیادہ ہے۔ خسرو سے منسوب دنیا بھر کی چیزیں دے دی ہیں۔ اگر ان کی زبان اور ان کے راویوں کے زمانے کی جانچ کی ہوتی تو اتنی فراخ دلی سے اتنے نمونے نہ دیتے۔ ص ۴۷۳ پر خسرو کے چار دوہے دیے ہیں۔ فٹ نوٹ میں کسی ظاہرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے انکشاف کیا ہے کہ یہ چاروں "چمنستانِ شعرا" ص ۱۰۲ سے نقل کیے گئے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ "چمنستانِ شعرا" کے اس صفحے پر ہاشم دکھنی (یعنی ہاشمی بیجاپوری) کے بیان میں خسرو کا محض ایک دوہا دیا ہے۔ تذکرے میں جہاں خسرو کا

Scanned by CamScanner

بیان ہے وہاں ایک بھی دوہا نہیں دیا۔ حاشیہ نگار کو اعتراض یا تصحیح کرنے سے پہلے اپنے ماخذ کو جانچ لینا چاہیے تھا۔ ہاشمی صاحب کو بھی پہلے تین دوہوں، بلکہ چاروں دوہوں کا ماخذ دینا چاہیے تھا۔ چار مینہ دوہوں میں ع:

وہ گئے بالم وہ گئے ندیا کنار ... الخ

دوہا نہیں۔

لکھتے ہیں: "جواہرِ خسروی" کی پہیلیوں میں سے کچھ ضرور خسرو کی ہوں گی (ص ۴۷۴)۔ کیوں؟ وہ جن دو پہیلیوں کو نمونتاً لکھتے ہیں، کیا ان کی زبان خسرو کے زمانے کی ہے؟ ایک آدھ لفظ کو چھوڑ کر یہ ہمارے عہد کی زبان ہے۔ غرض یہ ہے کہ ضعیف انتسابات کو ہاشمی صاحب نے سختی سے نہیں جانچا۔

خسرو کے انتقال کی تاریخ ۱۰ نومبر ۱۳۲۴ء لکھی ہے (ص ۴۷۴)۔ ظ انصاری اور ابوالفیض سحر نے "خسرو شناسی" ص ۳۱ پر اور مالک رام نے تذکرے میں ۱۸ء شوال ۷۲۵ھ دی ہے۔ یہ برابر ہے ۲۷ ستمبر ۱۳۲۵ء کے۔ خود علی گڑھ تاریخ میں مسعود حسین خاں نے خسرو کے انتقال کا سنہ ۱۳۲۵ء درج کیا ہے (ص ۱۶)۔ معلوم نہیں ہاشمی صاحب نے ۱۳۲۴ء کہاں سے لیا۔

اردو زبان و ادب کو رائج کرنے والوں میں [illegible]ن الدین گنج العلم اور بندہ نواز کا نام لیا ہے (ص ۴۷۶)۔ عین الدین کے مفقود رسالوں کو عام طور سے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ "معراج العاشقین" کے لیے ہاشمی قابلِ معذرت ہیں کیونکہ اس کے انتساب کی تردید علی گڑھ تاریخ کے بعد ہوئی ہے۔ مولوی عبدالحق نے ضرور "سیرالمصنفین" کے تبصرے میں قریب قریب یقین سے کہا کہ یہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے رسالے در حقیقت خواجہ کی تصنیف نہیں ("اردو"، کراچی، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۷)۔ شاید ہاشمی صاحب نے اس انکشاف کو نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ خواجہ بندہ نواز کی ایک ریختہ غزل یوں کہہ کر درج کرتے ہیں کہ ابھی تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت موصوف ہی کی ہے (ص ۴۷۷)۔ یہ غزل ع:

توں تو صحی ہے لشکری، کر نفس گھوڑا سار توں

ہرگز خواجہ کی نہیں۔ اسی تاریخ میں ڈاکٹر نذیر احمد اس غزل کو شہباز حسینی کے نمونہ کلام میں دے چکے ہیں (ص ۲۶۹)۔

کبیر کا عرصۂ حیات ۱۵۱۸-۱۴۴۰ء دیا ہے (ص ۴۸۰)۔ لسانیاتی مقدمے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ۱۵۱۵ء-۱۴۴۰ء لکھا ہے (ص ۲۱)۔ کبیر کے سنین بہت جھگڑے کے ہیں۔ چیچھے ڈاکٹر رام کمار ورما کا "کبیر پدماولی" میں مندرج فیصلہ دیا جا چکا ہے جس کے مطابق

Scanned by CamScanner

کبیر کے سنین ۱۵۱۸ء-۱۳۹۸ء ہیں۔ سعدی کے نام سے جو ریختہ، "... گیت ہے، ... پر ت ہے،" مشہور ہے اس کے بارے میں انجمن ترقی اردو کے ایک قدیم نسخے مکتوبہ ۱۰۲۰ھ سے دریافت کرنا کہ یہ ملا شیری کا ہے، ہاشمی صاحب کی اہم تحقیق ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ملا شیری کی تفصیلاتِ حیات معلوم کر کے درج کیں (ص ۴۸۸)۔

اگلے صفحے ۴۸۹ پر خالق باری کو یقین کے ساتھ ضیاء الدین خسرو سے منسوب کیا ہے لیکن ڈاکٹر صفدر آہ کی تحقیق کے بعد پھر سے قوی امکان ہو گیا ہے کہ اس کا نقشِ اول امیر خسرو ہی کا ہے۔ "بکٹ کہانی" کے سلسلے میں تذکرہ "ریاض الشعرا" میں مندرج ناقابلِ وقوع افسانہ درج کر دیا ہے۔ ایک منٹ کے لیے رک کر نہیں سوچا کہ "ریاض الشعرا" میں افضل کو کب "بکٹ کہانی" کا مصنف کہا ہے۔ مسعود حسین خاں کے مضمون کے سلسلے میں اس موضوع پر لکھ چکا ہوں۔

ص ۴۹۳ پر بہاء الدین برناوی کا ہندی شعر درج کرتے ہیں:

ان نینن کا یہی بسیکھ
ہوں تجھ دیکھوں تو مجھ دیکھ

معلوم نہیں کس روایت سے لے کر میر امّن نے باغ و بہار میں اسے یوں لکھا ہے:

ان نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ

(مرتبہ رشید حسن خاں، دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۶)

ڈاکٹر ہاشمی نے یہ اچھا کیا کہ چندر بھان برہمن سے منسوب غزل کو اس بنا پر نہیں دیا کہ اس کی زبان اُس عہد کے لیے زیادہ صاف ہے۔ پیچھے لسانیاتی مقدّمے کے سلسلے میں اس غزل پر لکھا جا چکا ہے۔ ص ۴۹۵ پر محبوب عالم عرف شیخ جیون سے "محشر نامہ"، "درد نامہ"، "خواب نامۂ پیغمبر"، "دھیر نامۂ بی بی فاطمہ" وغیرہ کا انتساب کیا۔ اس غلط فہمی اور غلط بیانی کا منبع اسپرنگر ہے جس نے اپنی فہرست میں غلط انتساب کیا۔ اسے شہرت ملی محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" کی وجہ سے، لیکن انھوں نے چند سال بعد ہی اپنے مضمون "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" (شائع شدہ "اورینٹل کالج میگزین"، لاہور، بابت نومبر ۱۹۳۱ء، فروری ۱۹۳۲ء) میں ذیل کی دو اہم تصحیحات کیں:

۱۔ شاعر کا نام صرف محبوب عالم ہے، شیخ جیون ایک علاحدہ شخصیت ہے۔ یہ محبوب عالم کا دوست ہے، جس نے ان سے کتابیں لکھنے کا تقاضا کیا۔

Scanned by CamScanner

۲۔ "خواب نامۂ پیغمبر" اور "دہیر نامۂ بی بی فاطمہ" ("دھیر نامہ" نہیں،) شاہ عبدالحکیم ہی کی تصنیف ہیں۔ محبوب عالم کی صرف تین مثنویاں "محشر نامہ"، "مسائلِ ہندی" اور "درد نامہ" ہیں۔

افسوس کہ محمود شیرانی کی یہ ترمیمات عام طور سے مشہور نہیں ہوئیں اور اب بھی سب "پنجاب میں اردو" کے بیان کو دہراتے رہتے ہیں۔ شیرانی کا یہ دو قسطی مضمون "مقالاتِ شیرانی" جلد دوم میں بھی شامل ہے۔

جعفر زٹلی کے مفصل تذکرے کے بعد اٹل نارنولی کی ایک غزل ص ۵۰۲ پر درج کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس کے دوسرے اور چوتھے مصرع کو بظاہر غلط کہا ہے (ادبی تحقیق، ص ۲۷۷)۔ اس غزل کے یہی دو مصرع نہیں، پہلا مصرع بھی غلط ہے۔ سب غالباً سہوِ طباعت ہیں، مضمون نگار کا سہوِ قرأت نہیں۔ بادی النظر ہی میں صحیح لفظ سمجھ میں آ جاتا ہے۔

غلط مطبوعہ متن	قیاسی صحیح متن
ع: گیسوے تاب دار ہیں یا ناگ ہے بھونگ	... بھرنگ
ع: یا زلفِ مشک رنگ ہے نافہ ختن	... یا نافۂ ختن
ع: جوں ماہتاب روئے او کرتا ہے جھمک جھمک	... کرتا...

اسی صفحے پر بیدل سے منسوب غزل کے دو اشعار کی صاف زبان دیکھ کر ان کی صحت میں شبہہ کرتے ہیں۔ بعد میں وہ اشعار بھی دے دیے ہیں (ص ۳-۵۰۲)۔ مرزا معز فطرت اور مرزا محمد رضا مخاطب بہ قزلباش خاں اُمید کے اشعار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ کیا لکھا جا سکتا تھا۔ رشید حسن خاں نے اُمید کی غزل کے تین مصرعوں کو غلط قرار دیا (ادبی تحقیق، ص ۲۷۷-۲۷۶)۔ مشفق خواجہ نے اپنے ایک مضمون میں ان اشعار کا صحیح متن دیا ہے جس کے مطابق رشید حسن خاں کا معترضہ پہلا مصرع صحیح ہے۔ باقی دو مصرعوں میں سہوِ کتابت سے ایک آدھ لفظ کا فرق ہو گیا ہے (۱۰)۔ وہ مصرع یہ ہیں۔

غلط علی گڑھ تاریخ ص ۵۰۴	صحیح
ع: رفتم بہ پیش و گفتمش "جانم فدائے تشت"	... فدائے تست
ع: ایسی نہ سیتا اور نہ بھوانی رادھکا	... نہ رادھکا

اتنے صریح سہوِ طباعت کو نہ پہچاننا تجاہلِ عارفانہ نہیں تو اور کیا ہے۔ ریختوں کے ذکر میں ہاشمی نے ص ۵۰۵ پر جنید کی ایک ریختہ غزل دی ہے ع:

دلا غافل چہ ی خسپی کہ اپنی سیج تیں ڈرپے

Scanned by CamScanner

اسی کتاب میں ص۱۲۵ پر نجیب اشرف ندوی نے اس شعر کو گجرات کے خان محمد سے منسوب کیا ہے۔ اس سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ جمیل جالبی کے مطابق ایک مضمون نگار نے اسے کسی شیخ فریدالدین سے منسوب کیا ہے (جلد اول، ص۶۲۸)۔ کیا شیخ فریدالدین سے مراد بابا فرید شکر گنج ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر ہاشمی نے مسعود حسن رضوی صاحب کی "بیاضِ مراثی" سے اس دور کے شمالی ہند کے شعرا کے مرثیے درج کیے ہیں۔ بے چارے ہاشمی کے لیے دقت یہ ہے کہ انھیں ایسے دور کے اردو ادب پر لکھنے کو کہا گیا جس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ جو کچھ ملتا ہے اس میں سے بیشتر کا استناد مشتبہ ہے۔ انھوں نے بہت تلاش و تدقیق کر کے روایتوں کے مختلف نمونے اکٹھے کیے۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں شبہہ کیا۔ ہم مزید کچھ اور کو مشکوک کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہاشمی صرف یہ لکھ دیتے کہ اس دور کی کوئی تخلیق سو فی صدی معتبر نہیں، اس لیے میں کسی کو پیش نہیں کر رہا ہوں، تو کوئی بات نہ ہوتی۔ مختلف روایتوں میں جو تخلیقات درج کی جاتی ہیں، انھیں لکھنا بھی ضروری تھا تاکہ ان کا جائزہ اور تجزیہ کیا جا سکے۔ ماننا پڑے گا کہ ہاشمی نے کمالِ جستجو کے بعد اس باب میں زیادہ سے زیادہ مواد پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا اشاریہ نہایت ناقص ہے۔ اس میں ایک حرف کے تحت تمام اندراجات کو بغیر کسی ترتیب کے درج کر دیا گیا ہے۔ اس کے نقائص کا بیان رشید حسن خاں نے تفصیل سے کیا ہے (ادبی تحقیق، ص۸۵-۲۸۳)۔ آخر میں چھ صفحوں کا صحت نامہ ہے لیکن یہ بہت تشنہ ہے، متعدد اغلاط کا احاطہ نہیں کرتا۔

مندرجۂ بالا جائزے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کا پہلا باب "سیاسی اور تمدنی پس منظر" غیر متعلق ہے، اسے حذف کر دینا چاہیے۔ سروری صاحب کا لکھا ہوا باب "اردو ادب بہمنی دور میں" تحقیقی اعتبار سے بہت غیر معتبر اور کمزور ہے۔ اس کے بیشتر انتسابات بے بنیاد ہیں۔ نذیر احمد اور نجیب اشرف ندوی کے ابواب خاص طور سے اچھے ہیں۔ بقیہ سب مضامین میں بھی بیش بہا معلومات موجود ہیں۔ میں اس سے بالکل اتفاق نہیں کرتا کہ مختلف مضامین میں ایک دوسرے سے متضاد بیانات کو ایڈیٹر کے قلم کی چھری چھیل چھال کر یک ساں کر دے۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر یا ڈائریکٹر کو مقالہ نگار پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ ایسی تاریخ ادب کا قاری تحقیق کا شائق ہوتا ہے۔ اگر وہ دو مصنفوں کی تحریروں میں کسی ایک واقعے کے بارے میں اختلاف پائے، مثلاً تاریخوں میں، تو قاری کو آزادی ہے

Scanned by CamScanner

کہ جس کے نقطۂ نظر سے متفق ہو، اسے پسند کرے۔ ہاں، ادارے کو حاشیوں میں ان اختلافی بیانات کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے تھا اور ان کے بارے میں کوئی پختہ رائے ہو تو وہ نرم الفاظ میں درج کر دینا چاہیے تھی۔ ضروری نہیں کہ یہ تصحیحی رائے مقالہ نگار کے بیان سے زیادہ معتبر سمجھی جائے۔

رشید حسن خاں نے یہ ستم کیا کہ کتاب کی خوبیوں کی طرف سے آنکھ موند لی۔ اگر اسی مواد کے ساتھ بقیہ جلدیں بھی سامنے آ جاتیں تو یہ صورتِ حال مفید ہوتی کہ ان جلدوں کا بالکل شائع نہ ہونا؟ ڈاکٹر ابنِ فرید کا دعویٰ ہے کہ رشید حسن خاں کے تبصرے سے پہلے ان کا تبصرہ شائع ہو چکا تھا اور کتاب اس سے بھی ۱۵ دن پہلے بازار سے اٹھالی گئی تھی(۱۱)۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ یہ ان کے تبصرے کی قیمت کم کرنے کو کہا جا رہا ہے، تاریخ کی جلدیں انھیں کے تبصرے کے بعد اٹھالی گئیں۔ رشید حسن خاں کی معترضانہ تنقید کا یہ مناسب ردِعمل نہ تھا کہ کتاب کو بازار سے واپس لے لیا جائے۔ جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ مناسب تصحیح کے بعد کتاب کا ایڈیشن بازار میں لایا جاتا لیکن مالیہ تو ختم ہو چکا تھا۔ اس منصوبے کے لیے مناسب اربابِ حل و عقد کے نہ ہونے کا یہی انجام ہوا کہ بقیہ جلدیں تیار ہی نہیں ہوئیں، جو زیورِ طبع سے مجلّیٰ ہوئی، اسے نئی دلہن کی طرح پھونک دیا گیا۔

IHSAN UL HAQ (Bs urdu)

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

(۱) رشید حسن خاں: "غیر معتبر حوالے"، مشمولہ "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ص ۲۰-۱۹

(۲) "چندربھان برہمن لائف اینڈ ورک" مرتبہ ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی، ص ۱۱۷ بحوالہ رشید حسن خاں: "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ص ۱۱-۳۱۰

(۳) ڈاکٹر ریحانہ خاتون (مرتب): "مثمر" از خان آرزو۔ کراچی یونی ورسٹی، پاکستان، ۱۹۹۱ء، مقدمہ ص ۲۹

(۴) حسینی شاہد: "گلشنِ الحقائق، اردو نثر کا پہلا مستند نقش"، "نوائے ادب"، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱۱

(۵) "گلشنِ الحقائق، اردو نثر کا پہلا مستند نقش"، "نوائے ادب"، جولائی ۱۹۷۰ء

(۶) "حیدرآباد میں اردو کی ترقی (تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے)"، حیدرآباد، ۱۹۹۰ء، ص ۳۶-۳۱

(۷) "تاریخِ اقلیمِ ادب"، پہلا حصہ، ص ۹۴

(۸) "ملک الشعرا غواصی اور اس کا کلام"، رسالہ "اردو" کراچی، اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۲-۱۱۱، بحوالہ ڈاکٹر محمد علی اثر، "غواصی، شخصیت اور فن"، حیدرآباد اگست ۱۹۷۷ء، ص ۴۹

(۹) ندوی، "نوائے ادب"، اکتوبر ۱۹۵۰ء بحوالہ "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان ..." چھٹی جلد، ص ۲۳۴

(۱۰) مشفق خواجہ: "میرزا محمد رضا قزلباش خاں اُمید" مشمولہ "تحقیق نامہ"، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۳۵

(۱۱) "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ پر تبصرہ" از ابنِ فرید، رسالہ "الفاظ"، علی گڑھ، بابت جنوری، فروری ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۰

Scanned by CamScanner

پندرھواں باب

احتشام حسین کی تاریخیں

سید احتشام حسین رضوی کا وطن ماہل، ضلع اعظم گڑھ تھا لیکن وہ گاؤں اترڈیہ، ضلع جون پور میں ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے اردو پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی میں اردو کے لیکچرر ہو گئے اور بعد میں ریڈر۔ نومبر ۱۹۶۱ء میں الہ آباد یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ وہیں یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا(۱)۔ انھوں نے اردو ادب کی دو تاریخیں لکھی ہیں:

۱۔ "اردو کی کہانی"

۲۔ "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔"

(الف) "اردو کی کہانی"

احتشام صاحب ۵۳-۱۹۵۲ء میں امریکا کے سفر پر گئے۔ وہاں ہارورڈ یونی ورسٹی میں ڈاکٹر آئی اے رچرڈس سے ملے تو خیال ہوا کہ بچوں کو اپنی زبان کی تاریخ اور ادب کی رفتار سے واقف ہونا چاہیے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر انھوں نے اردو کی یہ چھوٹی سی کہانی لکھی کہ "بچے اور اَن پڑھ بالغ کم سے کم صفحات میں اس کی مسلسل تاریخ سے واقف ہو جائیں۔" (دیباچہ)۔ اردو کی کہانی پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ اگست ۱۹۶۰ء میں احباب پبلشرز، گولا گنج لکھنؤ نے اسے ہندی میں اسی نام سے چھاپا۔ اردو میں یہ اتنی مقبول ہوئی کہ ۱۹۶۷ء میں اس کا آٹھواں ایڈیشن شائع ہوا۔ ترقیِ اردو بیورو نے اسی کا ایک ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ وہی میرے پیشِ نظر ہے۔

یہ کہانی محض ۹۲ صفحات میں سمائی گئی ہے۔ اگر کسی تحریر کے لیے صفحات کی تعداد مختصر ہو تو لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ احتشام صاحب نے دکن سے دورِ حاضر تک کے ادب کو ان چند صفحات میں سمو دیا ہے اور یہ بڑا کارنامہ ہے۔ چونکہ یہ کہانی بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے ان کا زاویۂ نظر تحقیقی نہیں۔ احتشام صاحب محقق تھے بھی نہیں۔ موجودہ

Scanned by CamScanner

معلومات کی روشنی میں اس کے بعض بیانات غلط ہو گئے ہیں۔ جہاں تک سنین کا سوال ہے وہ بیش تر صورتوں میں غلط ہیں، شاذ ہی صحیح ہیں۔ اس سے قطعِ نظر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ انھوں نے کتاب کو بہت دل نشین اور متوازن طریقے سے لکھا ہے مثلاً اردو کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جس کو ہم اردو کہتے ہیں وہ پنجاب ہی میں پیدا ہوئی۔ یہ بات کچھ کچھ صحیح ہے کہ شروع میں ہم کو اردو میں پنجابی کا اثر ملتا ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ جس طرح پنجابی زبان بن رہی تھی اسی طرح دلّی کے پاس کی بولیوں میں مل کر اردو بھی بن رہی تھی ... دلّی اور اس کے پورب میں جو بولی بولی جاتی تھی اس کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے..... اردو زبان کھڑی بولی کے اندر نکھر کر ایسی زبان بن گئی جس میں تھوڑے ہی دنوں میں شعر لکھے جانے لگے۔
>
> (ص ۱۹)

ان چند صفحات میں سیاسی اور سماجی پس منظر بھی ہے، تاریخ بھی، تنقید بھی۔ غرضیکہ دریا کو کوزے میں سمانے کا منظر نظر آتا ہے۔ دکن کی غیر دلچسپ ادبی تاریخ کو چند صفحوں میں اس فن و خوبی سے سمو دیا ہے کہ بچوں کو غیر دلچسپ بھی معلوم نہ ہو گا اور تمام ضروری معلومات بھی مل جائیں گی، مثلاً گولکنڈہ کے لیے کہتے ہیں کہ یہاں کے تین شاعر بہت مشہور ہوئے: وجہی، ابنِ نشاطی اور غوّاصی۔ بیجاپور کے لیے کہتے ہیں کہ وہاں کے تین مشہور شاعر نصرتی، ہاشمی اور رستمی تھے۔ ان کے علاوہ دونوں مقامات کے سخن طراز بادشاہ قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے کلام کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

میرے چند مشاہدات

امیر خسرو سے منسوب کھڑی بولی کے پورے کلام کو بے چون و چرا ان کا تسلیم کر لیا ہے (ص ۲۱)۔ لکھتے ہیں: "ان کی دو پہیلیاں پڑھ کر تم کو تیرھویں اور چودھویں صدی کی دلّی کی زبان کا اندازہ ہو گا" اور اس کے بعد چراغ اور خربوزے کی پہیلیاں ہیں:

> بالا تھا جب سب کو بھایا
> بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
>
> دس ناری ایک ہی گھر
> بستی باہر وا کا گھر
>
> (ص ۲۲)

ظاہر ہے کہ یہ اُس دور کی زبان نہیں۔ پہلا شعر چراغ کی پہیلی کا ہے۔ اس کے دوسرے مصرع میں ہر نسخے میں "بڑا" لکھا ہوا ملتا ہے۔ میری رائے میں "بڑھا" ہونا چاہیے۔ دونوں میں دو ذو معنین الفاظ ہیں "بالا" بمعنی "ننھا" اور "جلایا ہوا"۔ "بڑھا" بمعنی "بڑا" اور "بجھا ہوا"۔ "ص ۲۴ پر "معراج العاشقین" کو گیسودراز سے منسوب کیا ہے۔ یہ ان کی مجبوری تھی کیونکہ حفیظ قتیل کی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی اور احتشام صاحب کی زندگی میں "اردو کی کہانی" کا آخری ایڈیشن ۱۹۶۷ء کا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "سیرالمصنفین" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اب انھیں قریب قریب یقین ہے کہ "معراج العاشقین" خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں (رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص۱۵۷)۔ ظاہر ہے یہ احتشام صاحب کی نظروں سے نہ گزرا ہوگا۔

ص ۲۹ پر لکھتے ہیں: "ولی صوفی مزاج السان تھے۔" مجھے یہ ماننے میں تأمل ہے۔ وہ ایک حسن پرست شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں تصوّف اسی قدر ہے جتنا اس دور کے شعرا کے یہاں عام طور سے پایا جاتا ہے۔

آزاد نے "آبِ حیات" میں میر کی زبانی جو اس کے عہد میں پونے تین شاعر کا لطیفہ کھلا دیا ہے، اسے درج کر کے لکھتے ہیں، شاید یہ قصہ صحیح نہ ہو (ص ۳۴)۔ میری رائے میں یہ آزاد کے ذہن کی اُپج ہے۔

اب ایک سہوِ طباعت۔ دلّی سے لکھنؤ جانے والے مشہور شاعروں کے یہ نام گِنائے ہیں۔

> غلام ہمدانی مصحفی، یحییٰ، لمان، جرأت اور انشاء اللہ خاں انشا۔
>
> (ص ۴۰)

جرأت کا نام یحییٰ امان عرف قلندر بخش تھا۔ کاتب نے یحییٰ، امان، جرأت کے بیچ دو کاما لگا کر ایک شاعر کے تین بنا دیے، ویسے امان کے بجائے "مان" صحیح تر ہے۔

نثر کی ترقی کے باب میں خواجہ گیسودراز کی "معراج العاشقین" اور میراں جی شمس العشاق کی نظم و نثر کا ذکر کرتے ہیں (ص ۵۵)۔ جیسا کہ میں پیچھے بار بار کہہ چکا ہوں، ان دونوں نے اردو نثر میں کچھ نہیں لکھا۔ لکھتے ہیں:

> اٹھارویں صدی میں سید محمد قادری نے "طوطی نامہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔
>
> (ص ۵۶)

انھوں نے قادری کو دکنی اردو کے مصنف کے طور پر پیش کیا ہے، حالانکہ اس کا

Scanned by CamScanner

"طوطی نامہ" فارسی میں ہے۔ اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ ممکن ہے یہ سترھویں صدی کا ہو۔

ذوق و غالب کے عہد کے مشہور شاعروں کے نام گنواتے ہوئے ایک کا نام "حکیم احسن اللہ خاں بیان" لکھتے ہیں (ص ۶۷)۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے دو شخصیتوں میں التباس کر دیا ہے، ایک احسن اللہ خاں بیان شاگردِ مرزا مظہر ہیں۔ ان کا صحیح نام بقولِ جالبی خواجہ احسن الدین خاں تھا، گو مشہور احسن اللہ خاں ہے، دوسرے بہادر شاہ کے وزیر حکیم احسن اللہ خاں تھے۔ یہ شاعر نہ تھے۔

> ترقی پسندی کی تحریک سے متاثر شعرا میں ذیل کے نام بھی لیتے ہیں:
> حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، ساغر نظامی، آنند نرائن ملا، روش صدیقی۔
> (ص ۹۰)

جہاں تک میں سمجھتا ہوں مندرجۂ بالا شعرا کو ترقی پسندی سے کوئی گہرا ربط نہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد آزاد نظم گوئی کی تحریک میں چند نمایاں شاعروں میں الطاف گوہر اور مختار صدیقی کے نام بھی شامل کیے ہیں (ص ۹۲)۔ مختار صدیقی کو ایک دفعہ کو برداشت کیا جا سکتا ہے، لیکن الطاف گوہر کوئی نمایاں شاعر نہیں۔ نقادوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے تنقید کا دائرہ وسیع کیا اور عملی تنقیدوں سے ادب فہمی میں مدد کی۔
> (ص ۹۳)

ڈاکٹر زور اور سروری نے کسی طرح تنقید کا دائرہ وسیع نہیں کیا۔

اب کچھ بات سنین کی جو احتشام صاحب کی کمزوری ہے۔

احتشام صاحب	دوسرے مؤرخین
ص ۳۴، میر درد: وفات ۱۷۷۵ء	مالک رام: ۶ جنوری ۱۷۸۵ء، جالبی ۷ جنوری ۱۷۸۵ء (تاریخ، جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۲۳)
ص ۳۵، سودا: ف ۱۷۹۵ء	مالک رام: ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء
ص ۴۵، نظیر اکبر آبادی: پ ۱۷۴۰ء کے قریب	علی احمد فاطمی: ۱۷۳۵ء کے اِرد گِرد (نظیر اکبر آبادی، الٰہ آباد ۱۹۸۳ء، ص ۴۴ تا ۴۶)

Scanned by CamScanner

ص ۵۱، ناسخ: ف ۱۸۳۷ء	مالک رام: ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ / ۱۶ اگست ۱۸۳۸ء
ص ۷۷، سرشار: ف ۱۹۰۰ء	لطیف حسین ادیب: ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء ("سرشار کی ناول نگاری"، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۴۲) مالک رام: ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء (بحوالہ پریم پال اشک)
ص ۸۱، شاد عظیم آبادی: ف ۱۹۲۸ء	محمد مسلم عظیم آبادی: ۸ جنوری ۱۹۲۷ء ("شاد کی کہانی شاد کی زبانی"، علی گڑھ، ص ۲۷۵)
ص ۸۲، صفی: ف ۱۹۵۱ء	مالک رام: ۲۵ جون ۱۹۵۰ء
ص ۸۲، فانی: ف ۱۹۴۲ء	مالک رام: ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء
ص ۸۴، فانی کی "صبحِ وطن" طبعِ اول ۱۹۲۶ء میں	کالی داس گپتا: ۱۹۱۸ء ("کلیاتِ چکبست"، بمبئی، ۱۹۸۱ء، مقدمہ ص ۱۳)
ص ۸۴، خواجہ حسن نظامی: ف ۱۹۵۸ء	ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی: ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء ("خواجہ حسن نظامی، حیات اور ادبی خدمات"، لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ص ۵۳)

تاریخوں کے ان تسامحات کے باوجود کتاب بچوں اور کم خواندہ بالغوں کے لیے گاگر میں ساگر کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

(ب) "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ"

یہ کتاب ترقیِ اردو بیورو دہلی نے پہلی بار ۱۹۸۳ء میں شائع کی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ احتشام صاحب کی وفات دسمبر ۱۹۷۲ء سے پہلے تیار ہو چکی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں آیا اور یہی میرے سامنے ہے۔ ہندی میں احتشام صاحب نے اردو ادب کی تین تاریخیں شائع کیں:

۱۔ "اردو ساہتیہ کا اتہاس"، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، طبعِ اول، دسمبر ۱۹۵۴ء۔
۲۔ "اردو کی کہانی"، احباب پبلشرز، لکھنؤ، طبعِ اول، اگست ۱۹۶۰ء۔
۳۔ "اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس"، لوک بھارتی، الہ آباد، طبعِ اول، ۱۹۶۹ء۔

مجھے ان کتابوں کے بارے میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے ڈاکٹر محمود الحسن رضوی اور

Scanned by CamScanner

الہ آباد کے ڈاکٹر سید محمد عقیل نے بہت سی معلومات بہم پہنچائیں۔ ان دونوں کی یادداشتوں نیز "اردو ساہتیہ کا اِتہاس" ۱۹۵۴ء کے دیباچے کو ملا کر اس کے ارتقا کی داستان کچھ یوں بنتی ہے۔

۱۹۵۰ء کے لگ بھگ، شاید اس سے کچھ پہلے، احتشام صاحب نے ہندی میں اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ابھی چند صفحے ہی لکھے تھے کہ واردھا کی راشٹر بھاشا پرچار سمیتی نے انھیں ہندی میں اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ لکھنے کے لیے منتخب کیا۔ انھوں نے منظور کر لیا۔ احتشام صاحب ہندی اچھی خاصی جانتے تھے، لیکن دیوناگری خط میں لکھنے میں دقت ہوتی تھی۔ لکھنؤ یونی ورسٹی کے بی اے ہندی کے ایک طالب علم سُریش شری واستو کو بول کر کتاب املا کرانی شروع کی جو ۱۹۵۱ء کے اواخر میں مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد احتشام صاحب یورپ اور امریکا کے دورے پر چلے گئے۔ معلوم نہیں کیوں، اسے واردھا سے شائع نہیں کرایا، بلکہ انجمن ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ سے کرایا۔ دیباچے پر یکم نومبر ۱۹۵۴ء کی تاریخ پڑی ہے، کتاب میں تاریخ اشاعت دسمبر ۱۹۵۴ء درج ہے۔ میرا خیال ہے کہ ۱۹۵۵ء کے اوائل میں بازار میں آئی ہو گی۔

۱۹۶۱ء میں احتشام صاحب الہ آباد چلے گئے۔ انھوں نے کتاب کو توسیع دی اور اس کے نقش ثانی کے لیے اس وقت تک کے چھوٹے موٹے مصنفین کے نام بھی شامل کر لیے۔ اس طرح ایک نئے باب کا اضافہ کرنا پڑا۔ اسے دیوناگری میں لکھنے کے لیے ڈاکٹر جعفر رضا کی مدد لی گئی۔ ترمیم و اضافہ کے بعد یہ ہندی کتاب "اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اِتہاس" کے نام سے لوک بھارتی پبلی کیشن الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس میں تاریخِ طبع ندارد ہے، لیکن مصنف کے مقدمے (پرستاونا) پر ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کی تاریخ درج ہے(۲)۔ کہا جاتا ہے کہ کتاب اسی سال میں شائع ہو گئی۔

احتشام صاحب نے سوچا کہ ہندی کے علاوہ یہ کتاب اردو میں بھی شائع ہونی چاہیے۔ غالباً مصروفیت کی وجہ سے احتشام صاحب نے خود یہ کام نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ کے ایک اہلِ علم چودھری سبطِ محمد نقوی سے کرایا۔ چودھری صاحب قسطوں میں ترجمہ کر کے احتشام صاحب کو بھیجتے رہتے تھے۔ احتشام صاحب کو کہیں کوئی خفیف سی ترمیم یا اضافہ کرنا ہوتا تو کر دیتے۔ میں نے سبطِ محمد صاحب سے پوچھا کہ کیا احتشام صاحب زبان پر بھی نظرِ ثانی کرتے تھے، مترجم نے اصرار کیا کہ اردو ترجمے کی زبان سو فی صدی انھیں کی ہے، احتشام صاحب کو کہیں اضافہ کرنا ہوتا تو اپنی زبان میں کر دیتے۔ بالکل پریم چند اور پیارے لال شاکر والا معاملہ ہے۔

Scanned by CamScanner

میں نے ہندی کے نقشِ اول اردو ساہتیہ کا اِتہاس ۱۹۵۴ء اور اردو کتاب کا مقابلہ کیا۔ دونوں کتابیں بہت کچھ یک ساں ہیں۔ ظاہر ہے ۱۹۵۴ء کے ہندی ایڈیشن میں اردو ایڈیشن کا آخری باب "موجودہ ادبی صورت حال" نہیں۔ یہ سب سے پہلے اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس ۱۹۶۹ء میں ظاہر ہوتا ہے۔ آخرالذکر ہندی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں آیا۔ اس کے مقدّمے کے آخری پیراگراف اور آخری باب کے آخری دو ایک صفحوں میں قدرے ترمیم و اضافہ ہے لیکن ہمیں اس سے سروکار نہیں کیونکہ اردو کتاب ہندی کتاب کی طبعِ اول ۱۹۶۹ء کا ترجمہ ہے۔

اب "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" طبعِ دوم کو سامنے رکھ کر اظہارِ خیال کرتا ہوں۔ یہ واضح ہو کہ یہ تاریخ ہندی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ غیر اردو داں قارئین کے لیے لکھی گئی ہے۔ اسی لیے اس میں گاڑھی تحقیقی بحثیں نہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ تنقیدی تاریخ ہے اور اس نقطۂ نظر سے سروری صاحب کی "اردو کی ادبی تاریخ" اور رالف رسل کی "اردو ادب کا تعاقب" کے مقابلے میں بدرجہا کامیاب ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ اردو کی اونچی جماعتوں کے طلبہ کے لیے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی اصل ۱۹۵۴ء کی ہندی کتاب ہے جس کی تالیف کے لیے راشٹر بھاشا پرچار کمیٹی نے شرط رکھی تھی:

> یہ تاریخ نہ تو بہت دقیق ہو نہ بہت معمولی اور لگ بھگ تین سو صفحوں میں آجائے۔

اسی لیے احتشام صاحب نے ہندی کتاب کی تصنیف میں یہ ملحوظ رکھا:

> اس کی سطح نہ اتنی اونچی رکھی گئی ہے کہ اس سے محض اردو ادب کے عالم ہی محظوظ ہو سکیں، نہ اتنی نیچی ہے کہ قاری کو ٹھیک سے اردو ادب کا تعارف بھی حاصل نہ ہو۔

اس طرح احتشام صاحب نے بڑے توازن اور سلامت روی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ تاریخ کو سیاسی اور سماجی ماحول کے آئینے میں دیکھتے ہیں، لیکن اس کتاب میں تاریخی پس منظر مناسب حدود میں رہتا ہے۔ غرض ہر اعتبار سے یہ کتاب توازن، میانہ روی، نقطۂ نظر میں اعتدال اور علمی باخبری کا ثبوت دیتی ہے۔ کہیں کوئی خاص غلطی نہیں۔ اُس وقت تک کی تحقیق سے جو کچھ میسّر آسکتا تھا، اسے ذہن میں رکھتے ہوئے بلکی عالمانہ اور تنقیدی تاریخ لکھ دی ہے۔ مشہور ہے کہ سرور و احتشام محض مضمون لکھتے رہے ہیں، ایک موضوع پر مستقل کتاب نہیں لکھتے، لیکن احتشام صاحب نے کم از کم دو مستقل کتابیں لکھی ہیں:

۱۔ ساحل اور سمندر

Scanned by CamScanner

۲- اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

کتاب میں ۱۴ ابواب ہیں جن میں کوئی باب محض تاریخی پس منظر کا نہیں۔ پہلا باب "اردو زبان و ادب کی ابتدا" ہے جس میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اردو کے آغاز و ارتقا کو پیش کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

دلی کی کھڑی بولی میں عربی فارسی کے الفاظ داخل ہونے سے ہندوستانی بنی، جس کی دو ادبی شکلیں اردو اور ہندی ہیں۔ شور سینی اَپ بھرنش سے ارتقا پانے والی دوسری زبانوں میں ایک زبان اردو بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو، پنجابی اور ہریانی کے قواعد میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ (ص ۱۶)

میرا خیال ہے کہ یہ میل ملاپ کو ذرا زیادہ آگے بڑھانا ہے۔ اردو اور پنجابی کے قواعد بعض اہم معاملوں میں مختلف ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو سے منسوب ہندی چیزوں کی اصلیت کے بارے میں بعض علما کے شک کا ذکر کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں تسلیم کرنے کو مائل ہیں۔ لکھتے ہیں:

امیر خسرو کی پہیلیاں بھی لسانیات کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ پہیلیاں دیکھیے۔
بالا تھا جب من کو بھایا...الخ
ایک تھال موتی سے بھرا...الخ (ص ۲۱)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک یہ زبان خسرو کی ہے۔ میرے نزدیک خسرو سے منسوب ہر ہندی چیز مشکوک ہے اور ایسی صاف زبان والی پہیلی تو عہد خسرو کی اسی وقت ہو سکتی ہے جب تیرھویں صدی میں گردشِ ایام نے آگے کی طرف دوڑ کے انیسویں صدی کی زبان میں تخلیقات کرا دی ہوں۔

احتشام صاحب کی کتاب کی قدر و قیمت تسلیم کرتے ہوئے میں صرف ان دو چار مقامات کی نشان دہی کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جہاں ان کا بیان مجھے محلِ نظر معلوم ہوا۔

"اردو دکن میں" کے باب میں لکھتے ہیں:

اگر تاریخ فرشتہ کی سند درست مانی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بعض بہمنی بادشاہوں نے نظم و نسق اور راج کاج کے کاموں میں ہندی زبان کو وسیلہ بنایا۔ (ص ۲۶)

ابراہیم کے دربارِ شاہی کا سارا بندوبست اردو میں ہوتا تھا۔

(ص ۳۲)

Scanned by CamScanner

میں شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" کے سلسلے میں اس بیان کی تردید کر چکا ہوں۔ فرشتہ نے ہندوی یا ہندی کہہ کر بقول ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال مراٹھی مراد لی ہو گی، اردو نہیں۔ ابراہیم کے دربار کا کام فارسی میں ہوتا تھا۔ نچلی سطح پر مراٹھی اور دوسری مقامی زبانوں کو بھی کام میں لایا جاتا تھا، اردو کو نہیں۔ خواجہ بندہ نواز کے سلسلے میں بڑے توازن سے لکھتے ہیں:

> تقریباً آٹھ کتابیں ان کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں مگر کسی کی نسبت قطعی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں کی اردو تصنیف ہے۔

احتشام صاحب نے اپنی ہندی تاریخ جب پریس میں دی ہو گی اس وقت تک ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق سامنے نہیں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گیسودراز کی کتابوں میں "معراج العاشقین"، "شکارنامہ" اور "تلاوت الوجود" کا ذکر کرتے ہیں (ص ۲۸ و ص ۷۵)۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور بنگلور کے ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے ثابت کر دیا ہے کہ خواجہ سے منسوب کوئی اردو رسالہ ان کا نہیں۔ احتشام صاحب مزید لکھتے ہیں:

> گیسودراز کی کتابوں کی زبان کھڑی بولی ہے جس پر پنجابی اور برج کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ (ص ۲۸)

اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ گیسودراز سے منسوب کتابوں کی زبان دکنی ہے، کھڑی بولی نہیں۔ میراں جی شمس العشاق کی کتابوں میں "شرحِ مرغوب القلوب" کا بھی نام لیتے ہیں (ص ۳۰ و ص ۷۶)۔ یہ دراصل میراں جی خدانما کی تالیف ہے۔ لکھتے ہیں:

> مقیمی فارسی شاعر تھا مگر اس نے ایک ہندی لوک کتھا "چندربدن اور مہیار" بڑے دلکش ادبی اسلوب میں لکھی ہے۔
>
> (ص ۳۳-۳۲)

جمیل جالبی نے واضح کیا کہ محمد مقیم فارسی شاعر تھا، مقیمی مصنّف "چندربدن و مہیار" اس سے الگ شخصیت ہے جو دکنی کا شاعر ہے۔ چندربدن اور مہیار علاقۂ دکن کی لوک کتھا ہے، اسے ہندی کی لوک کتھا کہنا صحیح نہیں۔

نصرتی کی "تاریخ سکندری" (کذا۔ صحیح: "تاریخِ اسکندری") کے لیے لکھتے ہیں کہ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ نصرتی کی تصنیف نہیں ہے (ص ۳۳)۔ یہ شبہہ بے بنیاد ہے۔ یہ مثنوی بالیقین نصرتی کی ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ محمد قلی قطب شاہ نے ایک لاکھ سے زائد اشعار کہے (ص ۳۵)۔ مشہور ہے کہ اس کے کلیات میں ۵۰ ہزار شعر تھے۔ بیلی نے اپنی انگریزی تاریخ میں مصرعوں کو سطر مان کر ایک لاکھ سطریں لکھ دیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کی تاریخ (۱۹۴۰ء) میں انھیں ایک لاکھ شعر لکھ دیا۔ احتشام صاحب نے وہیں سے نقل کیا ہو گا۔

Scanned by CamScanner

موجودہ "کلیاتِ قلی قطب شاہ" میں اس سے بہت کم اشعار ہیں۔
لکھتے ہیں:

اردو کے بعض علما کا خیال ہے کہ شمالی ہند میں اردو کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں جائسی، قطبن، کبیر، میرا اور تلسی داس کی تخلیقات کے کچھ حصّوں کو اردو ہی کا ابتدائی روپ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت تک زبانیں دورِ تغیر میں تھیں اور اردو بھی اودھی، برج یا پوربی سے اتنی ہی قریب یا دور تھی جتنی کھڑی بولی پر مبنی ہندی مگر اس مختصر تاریخ میں اس بحث کو چھیڑنا ... ضروری نہیں ہے۔ (ص ۴۹)

علی جواد زیدی اور انصار اللہ ان سب شعرا کو اردو میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

اس موضوع پر احتشام صاحب نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ "اردو نثر کی ابتدا اور تشکیل" کے باب میں وہ بہار کے شاہ عماد پھلواروی کی مبیّنہ تصنیف "سیدھا راستہ" (۱۶۷۰ء) کو اہمیت دیتے ہیں (ص ۸۱-۸۰)۔ مالک رام نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ تمنا عمادی مجیبی پھلواروی کی وضع کی ہوئی جعلی کتاب ہے ("تحقیقی مضامین"، ص ۲۴۹)۔

اس باب کے آخر میں دکنی نثر کی دو غیر معروف کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلی ایک تاریخی کتاب ہے جس میں تیمور کے حملۂ ہندوستان سے لے کر ۱۷۸۰ء تک کے تاریخی وقائع کا ذکر ہے، دوسری کتاب ۱۷۹۸ء کی "بہادر نامہ" ہے جس میں فسر لگا پٹم (کذا) کی تاریخ، ٹیپو سلطان کی جنگ تک بیان کی گئی ہے۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں (ص ۵۴)۔ معلوم ہوتا ہے ان کی مذکورہ پہلی کتاب غلام لام خاں ہبر کی ۷۹۰ صفحات کی "تاریخِ رشید الدین خانی" طبع ۱۲۷۰ھ ہے۔ اس کا ذکر "دکن میں اردو" دلی ایڈیشن ص ۵۳۱، نیز "فہرست مخطوطاتِ آصفیہ لائبریری"، جلد اوّل، ص ۲۴۱-۲۴۴ پر ہے۔ "بہادر نامہ" کے بارے میں مجھے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔

باب ۵ "اودھ کی دنیائے شاعری" میں "آبِ حیات" کی تقلید میں لکھتے ہیں کہ:

انشا اس زمانے میں دہلی آئے جب شاہ عالم کی آنکھیں نکالی جا چکی تھیں۔ (ص ۸۹)

میں "آبِ حیات" کے سلسلے میں دکھا چکا ہوں کہ یہ درست نہیں۔ انشا شاہ عالم کے اندھا کیے جانے سے قبل دہلی سے جا چکے تھے۔ آگے لکھتے ہیں کہ:

ناسخ نے ایک مثنوی لکھی تھی۔ (ص ۹۸)

Scanned by CamScanner

یہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ ناسخ نے کُل چار طویل مثنویاں لکھی تھیں۔ دبیر کے لیے لکھتے ہیں کہ:

وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مرشد آباد اور پٹنہ گئے۔

(ص ۱۰۹)

پٹنہ جانے کی بات درست ہے، مرشد آباد کی غلط۔ دبیر کے شاگرد میر محمد رضا نے واضح کیا کہ دبیر نے مرشد آباد کبھی نہیں دیکھا (قاضی عبدالودود: "آزاد بحیثیت محقق"، نقوش نمبر ۹۲) ص ۱۰۳ پر رشک کا نام اوسط علی لکھا ہے، صحیح علی اوسط ہے۔ دیاشنکر نسیم کے لیے لکھتے ہیں:

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے "الف لیلہ" کی کچھ کہانیوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا لیکن وہ دستیاب نہیں۔ (ص ۱۰۴)

یہ تسامح افسوس ناک ہے۔ "الف لیلہ" کے ابتدائی حصّے کا منظوم ترجمہ اصغر علی خاں نسیم دہلوی نے کیا تھا جو نول کشور پریس سے شائع ہوا اور اب بھی "الف لیلہٗ نو منظوم" کے حصّۂ اول کی شکل میں ملتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود احتشام صاحب نے ص ۱۵۸ پر لکھا ہے کہ نسیم دہلوی نے نول کشور پریس میں "الف لیلہ" کو نظم کرنا شروع کیا مگر اسے پورا نہ کر سکے۔ شاہ نصیر اور ذوق کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

شاہ نصیر نے ان کا نام پھیلتے دیکھا تو انھیں اس خوف سے ٹالنا شروع کیا کہ کہیں وہ ان سے آگے نہ بڑھ جائیں۔

(ص ۱۲۶)

یہ سب آزاد کے تراشے ہوئے بہتان ہیں جن کی عابد پیشاوری شافی تردید کر چکے ہیں۔ دیکھیے "آبِ حیات" پر تبصرہ زیرِ نظر کتاب میں۔

آٹھواں باب ہے "اردو نثر فورٹ ولیم اور اس کے بعد" اس میں میر امن کے لیے لکھتے ہیں کہ:

ان کا نام غالباً میر امان تھا۔ (ص ۱۴۲)

یہ متعدد مؤرخوں نے لکھا ہے لیکن جیسا کہ رشید حسن خاں نے ثابت کیا میر امن کا نام امان نہیں تھا ("باغ و بہار"، مقدمہ۔ ص ۲۹-۲۸)۔ حیدری کی "توتا کہانی" کے لیے لکھتے ہیں کہ:

حیدری نے محمد قادری کے دکنی اردو میں لکھے ہوئے "طوطی نامہ" کو بول چال کی اردو میں لکھ دیا۔ (ص ۱۴۴)

یہ سخت غلط فہمی ہے۔ قادری کا طوطی نامہ فارسی میں ہے۔ حیدری کی "توتا کہانی" اسی کا ترجمہ

Scanned by CamScanner

ہے۔ ولا کی "مادھونل اور کام کنڈلا" کے لیے لکھتے ہیں کہ:

یہ موتی رام کبیشر کی برج بھاشا کی کتاب کا ترجمہ ہے

(ص ۱۴۶)

خود ولا نے بھی یہی لکھا ہے لیکن میرے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس نے تقابلی مطالعے کے بعد ثابت کیا کہ ولا کا ماخذ عالم کی اودھی نظم ہے۔ برج میں کسی موتی رام کبیشر نے اس کہانی کو نہیں لکھا۔

محمد حسین کلیم کے ترجمۂ "فصوص الحکم" کو نثری ترجمہ سمجھتے ہیں (ص ۱۴۸)۔ یہ محض غلط فہمی ہے۔ قائم اور میر حسن نے اپنے تذکروں میں واضح کر دیا ہے کہ کلیم نے "فصوص الحکم" کا منظوم ترجمہ شروع کیا تھا لیکن چند صفحات کے بعد چھوڑ دیا۔ انھوں نے نثر میں کوئی دوسرا قصہ لکھا تھا جس کا صرف ایک جملہ ملتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کے لیے لکھتے ہیں کہ:

غازی الدین حیدر نے کسی بات پر ناراض ہو کر انھیں لکھنؤ بدر کر دیا تھا۔

(ص ۱۵۰)

یہ درست نہیں۔ سرور قتل کے ایک معاملے میں ملوث تھے۔ اس سے بچنے کے لیے از خود لکھنؤ سے کان پور چلے گئے۔ تفصیلات نیر مسعود کی کتاب "رجب علی بیگ سرور" میں دیکھیے۔ احتشام صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

سرور مہاراجا بنارس، مہاراجا الور اور مہاراجا پٹیالہ کے یہاں عزت کے ساتھ رہے۔

(ص ۱۵۰)

حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف بنارس رہے، الور اور پٹیالہ نہیں رہے، وہاں کے حکمرانوں نے ان کے ساتھ سلوک کیا، یہ دوسری بات ہے۔

داغ کے لیے لکھتے ہیں کہ:

۱۸۹۱ء میں نظام حیدر آباد نے انھیں بلا بھیجا اور ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

(ص ۱۶۰)

حقیقت مختلف ہے۔ نظام نے انھیں نہیں بلایا تھا۔ یہ خود پریشاں حال ۳ یا ۴ اپریل ۱۸۹۰ء کو حیدر آباد پہنچے۔ ۶ فروری ۱۸۹۱ء کو نظام نے غزل اصلاح کے لیے بھیجی اور ۴۵۰ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی (محمد علی زیدی: "مطالعۂ داغ"، ص ۹۹)۔

بے خبر کے خسر غلام امام شہید بھی ایک اچھے نثر نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

(ص ۱۷۵)

Scanned by CamScanner

اس سے قدرے غلط فہمی ہوتی ہے۔ حامد حسن قادری نے واضح کیا کہ شہید، بے خبر کے رشتے کے خسر تھے ("داستانِ تاریخِ اردو"، طبعِ دوم، ص ۲۳۵)۔ احتشام صاحب نے سرسید کی کتابوں کے سلسلے میں لکھا:

غدر سے پہلے کی کتابوں میں "تاریخِ ضلع بجنور" بھی اہم ہے۔

(ص ۱۸۷)

یہاں اس کے متعلق یہ اہم تربات بھی لکھنی چاہیے تھی کہ یہ غدر کے زمانے میں تلف ہو گئی اور اب ناپید ہے۔ اسی صفحے پر سرسید کے اخبار کا نام "علی گڑھ سائنٹیفک گزٹ" لکھتے ہیں۔ صحیح "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ہے۔ حیرت ہے کہ محمد حسین آزاد کے کارناموں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

دیوانِ ذوق کی ترتیب و تدوین بھی اس عہد کو دیکھتے ہوئے ایک اعلیٰ پائے کا کام ہے۔ (ص ۱۹۰)

احتشام صاحب محمود شیرانی کے سات قسطوں کے مضمون "محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق" سے واقف نہیں ("ہندوستانی"، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۴۴ء تا جنوری و اپریل ۱۹۴۷ء)۔ اس سے انھیں اندازہ ہوتا کہ آزاد کا دیوانِ ذوق تدوین کا نہیں، تحریف اور جعل سازی کا اعلیٰ پائے کا کام ہے۔

شبلی کی سوانح میں ان کے قیامِ حیدر آباد کا ذکر نہیں کیا (ص ۱۹۶)۔ شرر کے لیے لکھتے ہیں:

شرر نے کچھ ناٹک بھی لکھے ہیں مگر شہیدوں کے سوا ان کو کسی میں کامیابی نہیں ہوئی۔ (ص ۲۰۶)

"شہیدوں" تحریبِ کتابت ہے، "شہیدِ وفا" کی۔ کاتب نے اسے "شہیدوں" پڑھ لیا، کسی نے پروف درست نہیں کیا۔ اسی طرح کا ایک اور سہوِ کتابت یہ ہے کہ وقار عظیم کی کتابوں میں ایک کتاب کا نام "ہماری دو کتابیں" (ص ۳۲۴) لکھا ہے۔ یہ تحریبِ قرأت و کتابت ہے "ہماری داستانیں" کی۔ شرر کی قدر بندی میں لکھتے ہیں:

ان سب باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ شرر ایک معمولی اہلِ قلم تھے، گو ان کی تخلیقات کا تھوڑا ہی حصہ وقت کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔ (ص ۲۰۲)

مجھے اس فیصلے سے اتفاق نہیں۔ تمام کمزوریوں کے باوجود "فردوسِ بریں"، "زوالِ بغداد" اور "ایامِ عرب" اردو کے اہم ناول ہیں۔ پھر بحیثیت انشائیہ نگار شرر کو بھی نظر انداز نہیں

Scanned by CamScanner

کر سکتے۔ اگر وہ کچھ اور نہ لکھتے، صرف "گزشتہ لکھنو" ہی چھوڑ جاتے تو بھی ان کے نام کو امر رکھنے کے لیے کافی تھا۔ احتشام صاحب نصیر حسین خیال کے لیے لکھتے ہیں:

> انھوں نے بھی اردو زبان کی پیدائش اور ارتقا کے بارے میں کئی اہم تحقیقیں کیں اور انھیں کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ ان میں "داستانِ اردو" اور "مغل اور اردو" مشہور ہیں۔ (ص۲۱۵)

خیال ایک نہایت غیر معتبر اور بے احتیاط لکھنے والے ہیں۔ وہ اکبر بادشاہ کی جدید اردو میں ایک رباعی نیز نورجہاں کے اردو اشعار تک درج کرتے ہیں ("مغل اور اردو"، ص۸، ۱۸)۔ "داستانِ اردو" اور "مغل اور اردو" دو مختلف کتابیں نہیں۔ وہ ایک کتاب "داستانِ اردو" لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے جس کا ایک باب "مغل اور اردو" کے نام سے ۱۹۳۳ء میں چھاپا۔ باقی کتاب کا کہیں پتا نہیں چلتا۔

لکھتے ہیں کہ:

> لاہور سے آنے کے بعد حالی کو دلی کالج میں ملازمت مل گئی۔
> (ص۲۲۶)

یہ درست نہیں۔ اپنی خود نوشت کے مطابق حالی اینگلو عربک اسکول میں استاد مقرر ہوئے تھے، کالج میں نہیں۔ حیدر آباد سے وظیفہ ملنے پر اسکول کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

احتشام صاحب محققوں کے اسلوبِ نثر میں رنگینی تلاش کرتے ہیں اور اسے نہ پا کر اسے بے رس قرار دیتے ہیں۔ محمود شیرانی کے نثری اسلوب کو روکھا پھیکا اور بے جان کہتے ہیں (ص۲۱۸)۔ "ڈاکٹر زور کا اسلوب بھی سیدھاسادھا (کذا) اور بے کیف ہوتا ہے" (ص۲۲۰)۔ احتشام حسین چاہتے کیا ہیں؟ کیا تحقیق کو انشائیہ بنا دیا جائے۔ وہ محقق اور نقاد میں فرق نہیں کر پاتے۔ محمود شیرانی کے مقلدوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> اس ڈھنگ کا کام کرنے والوں میں اس وقت بھی کئی نقادوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جیسے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر عبداللہ، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی۔ (ص۲۱۸)

ڈاکٹر عبداللہ نقاد تھے بقیہ تینوں حضرات اہم محقق ہیں، نقاد بالکل نہیں۔ معلوم نہیں ان میں مالک رام کا نام کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اپنے اور میرے استاد پروفیسر ضامن علی کے لیے لکھتے ہیں:

> انھوں نے بھی اپنا زیادہ وقت قدیم ادب، خاص کر مرثیے کی تحقیق میں لگایا ہے۔ (ص۲۱۹)

Scanned by CamScanner

یہ شاگردانہ سعادت مندی ہو سکتی ہے، لیکن اسے حقیقت سے دُور دُور تک کوئی واسطہ نہیں۔ ضامن صاحب نے نہ قدیم ادب کی تحقیق کی نہ مرثیے کی۔ انھوں نے کسی بھی موضوع پر کچھ بھی نہیں لکھا۔

مصنف چکبست کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

انتقال سے کچھ دن پہلے انھوں نے اپنا مجموعہ کلام "صبحِ وطن" شائع ہونے کے لیے بھیج دیا تھا مگر وہ ان کی رحلت کے بعد نکلا۔

(ص ۲۳۸)

لیکن کالی داس گپتا رضا کا بیان ہے:

"صبحِ وطن": یہ مجموعہ کلام پہلے پہل ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا ("انتخابِ زرّیں" از راس مسعود و "کملا" از حطیہ نشاط، ص ۱۸)۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چکبست کے انتقال (۱۲ فروری ۱۹۲۶ء) کے بعد اُسی سال میں سر تیج بہادر سپرو کے مقدّمے کے ساتھ شائع ہوا۔

(مقدمہ کلیاتِ چکبست، بمبئی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳)

رضا نے کلیات میں دیباچۂ حطیہ نشاط کے ص ۱۸ کا حوالہ دیا ہے جو سہو ہے۔ صحیح ص ۸ ہے۔

مصنف لکھتے ہیں: اقبال نے ۱۸۹۹ء میں اپنی پہلی نظم "ہمالیہ" لکھی۔

(ص ۲۴۲)

اس نظم کا نام "ہمالیہ" نہیں، "ہمالہ" ہے۔ یہ ۱۸۹۹ء میں نہیں، ۱۹۰۱ء میں لکھی۔ یہ ان کی پہلی اہم نظم نہیں۔ اس سے پیش تر کی چند اہم نظمیں یہ ہیں۔

"نالۂ یتیم" فروری ۱۹۰۰ء، "اشکِ خون" (ملکۂ وکٹوریا کا مرثیہ) جنوری ۱۹۰۱ء، "دردِ دل" یا "یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے"، فروری ۱۹۰۱ء

تلوک چند محروم کے لیے لکھتے ہیں کہ:

ان کی ولادت سرحدی صوبے میں ہوئی۔ (ص ۲۵۵)

یہ درست نہیں۔ محروم کا مولد گاجراں والا نام کا گاؤں، ضلع میانوالی تھا (جگن ناتھ آزاد: "افکارِ محروم"، طبعِ دوم، ص ۱۴۳)۔ میانوالی مغربی پنجاب میں ہے، صوبۂ سرحد میں نہیں۔

اختر اورینوی کی کتابوں میں دو کے نام یوں لکھے ہیں:

بہار میں اردو، زبان و ادب (ص ۳۲۵)

دراصل اختر صاحب کا تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" کے عنوان

Scanned by CamScanner

سے شائع ہوا۔ کاتب نے اس ایک کتاب کو کالا گا کردو بنا دیا ہے۔ آخری باب ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۹ء کے بیچ کے ادیبوں اور ان کی کتابوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اس میں میری کتابوں "تحریریں" (۱۹۶۴ء) اور "اردو مثنوی شمالی ہند میں" (۱۹۶۹ء) تک کے نام آ گئے ہیں۔

اب میں پوری کتاب کے سنین کا ایک جگہ جائزہ لیتا ہوں۔ یہاں صرف انھیں سنین کی نشان دہی کروں گا جو دوسروں نے کچھ اور لکھے ہیں اور جن کے بارے میں قوی امکان ہے کہ احتشام صاحب کا مذکورہ سنہ صحیح نہیں۔

احتشام حسین	دوسرے مؤرخین
ص ۱۹، حمید الدین ناگوری: ف ۱۲۷۴ء (ظاہرا بہ تقلیدِ عبدالحق: ابتدائی نشوونما)	مالک رام: ۱۴ جنوری ۱۲۴۷ء، ۵ رمضان ۶۴۳ھ
ص ۱۹، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر: ف ۱۳۲۳ء	مالک رام: ۹ رمضان ۷۲۴ھ / ۱۳۰ اگست ۱۳۲۴ء
ص ۱۹، شرف الدین یحیٰ منیری: ف ۱۳۰۷ء	مالک رام: ۷۸۲ھ / ۱۳۸۰ء، مولوی عبدالحق نے ۷۸۲ھ / ۱۳۰۷ء لکھا ہے لیکن صحیح عیسوی سنہ ۱۳۸۰ء ہے۔
ص ۱۹، اشرف جہاں گیر سمنانی: ف ۱۳۵۵ء	حامد حسن قادری و مالک رام: ۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء (قادری: "داستانِ تاریخِ اردو"، طبعِ دوم، ص ۱۷)
ص ۱۹ و ص ۴۷، خواجہ بندہ نواز: ف ۱۴۲۱ء	مالک رام: ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ / یکم نومبر ۱۴۲۲ء (تذکرہ، ص ۳۴۶)
ص ۱۹، بہاء الدین باجن: ف ۱۵۰۶ء	شمس اللہ قادری: ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ / ۲۷ مارچ ۱۵۰۷ء ("اردوے قدیم")
ص ۴۷، خواجہ بندہ نواز ۱۳۹۹ء کے قریب گلبرگہ آئے۔	ثمینہ شوکت: ۸۰۳ھ یا ۸۰۴ھ (۱۴۰۲ء - ۱۴۰۰ء) ("شکار نامہ گیسو دراز"، مقدمہ ص ۳۱)
ص ۳۰، شمس العشاق: ف ۱۵۷۳ء یا ۱۴۹۷ء	جانم کے مرثیے کے مطابق ۲۵ شوال ۹۹۴ھ / ستمبر ۱۵۸۶ء
ص ۳۲، "خاور نامہ" تصنیف تقریباً ۱۶۴۹ء	جالبی: ۱۶۴۰ء (تاریخ، جلد ۱، ص ۲۶۵)

Scanned by CamScanner

ص ۳۵، قطب شاہی حکومت ۱۵۰۸ء میں قائم	عبدالمجید صدیقی: ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء، "تاریخِ گولکنڈہ" ص ۲۵ ("دکن میں اردو"، ص ۷۵)
ص ۳۷، محمد قطب شاہ ۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۴ء	صحیح عہدِ حکومت ۱۶۱۲ء تا ۱۶۲۶ء
ص ۳۹، غواصی: "سیف الملوک و بدیع الجمال"، ۱۶۲۴ء	جالبی: "سیف الملوک" بقولِ شاعر ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵-۲۶ء (تاریخ، جلد ۱، ص ۴۷۷)
ص ۳۹، غواصی: "طوطی نامہ"، ۱۶۳۱ء	جالبی: ۱۶۳۹ء (جلد ۱، ص ۴۸۱)
ص ۴۰، اشرف: "نوسرہار"، ۱۵۲۵ء	جالبی: ۹۰۹ھ/۱۵۰۳-۴ء (جلد ۲، ص ۱۷۶)
ص ۵۲، آبرو: وفات ۱۷۳۴ء کے لگ بھگ	جالبی: ۱ نومبر ۱۷۳۳ء (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۱۲)
ص ۵۳، حاتم: وفات ۱۷۸۱ء یا ۱۷۹۲ء	مالک رام: ۱ اگست ۱۷۸۳ء
ص ۵۷، لارڈ لیک کی فتحِ دہلی، ۱۸۰۴ء	صحیح ۱۸۰۳ء (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد ۷، ص ۸)
ص ۶۸، میر: ولادت تقریباً ۱۷۲۵ء	دیوان کے نسخۂ محمود آباد پر ایک نوٹ کے مطابق آخرِ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء
ص ۷۹، فضلی کی "کربل کتھا"، ۱۷۳۱ء	مالک رام: ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲-۳۳ء (مقدمۂ "کربل کتھا"، ص ۱۶)
ص ۸۰، شاہ رفیع الدین کا "ترجمۂ قرآن"، ۱۷۸۶ء	عبدالحق: سنہ معلوم نہیں ("قدیم اردو"، ص ۱۳۲)۔
ص ۸۱، آیت اللہ جوہری: ف ۱۷۹۵ء	مالک رام: ۱۲ جنوری ۱۷۹۶ء
ص ۸۱، جوشش: ف ۱۸۰۰ء	جالبی اور مالک رام: ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱-۲ء تک زندہ تھے (جالبی جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۶۱)
ص ۸۳، باقر آگاہ: ف ۱۸۰۵ء	مالک رام: ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ/۱۵ مارچ ۱۸۰۶ء
ص ۸۸، انشا: پ ۱۷۵۶ء کے لگ بھگ	مالک رام: دسمبر ۱۷۵۲ء ("تحقیقی مضامین"، ص ۱۵۵)
ص ۹۲، رنگین: ف ۱۸۳۴ء	مالک رام: ۱ اکتوبر ۱۸۳۵ء۔ ڈاکٹر حسن آرزو ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵-۳۶ء ("سعادت یار خاں رنگین"، ص ۸۴-۸۵)
ص ۱۰۲، خواجہ وزیر: ف ۱۸۵۳ء	مالک رام: ۱۷ اگست ۱۸۵۴ء
ص ۱۰۴، دیاشنکر نسیم: ف ۱۸۴۳ء	رشک کے مصرعِ تاریخ کے مطابق ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء

Scanned by CamScanner

ص۱۱۵، نظیر پ ۱۷۴۰ء کے آس پاس	علی احمد فاطمی: ۱۷۳۵ء ("نظیر اکبر آبادی"، ص ۳۶)
ص۱۲۳، شاہ نصیر: ف ۱۸۳۵ء	شکیل احمد: ۲۳ نومبر ۱۸۳۸ء ("دلّی کے مشاہیر ادب"، غیر مطبوعہ مقالہ)
ص۱۲۵، مومن: ف ۱۸۵۱ء	مالک رام: ۱۴ مئی ۱۸۵۲ء
ص۱۳۵، ظفر: ف ۱۸۶۸ء	مالک رام: ۷ نومبر ۱۸۶۲ء
ص۱۴۰، گِل کرسٹ کا ورودِ ہند، ۱۷۸۳ء	عتیق صدیقی: ۱۷۸۳ء نہیں، ۱۷۸۴ء ("گِل کرسٹ اور اس کا عہد"، طبعِ اول، ص ۳۰)
ص۱۴۰، گِل کرسٹ: "انگریزی ہندوستانی ڈکشنری"، ۱۷۹۰ء	عتیق صدیقی: پہلا حصہ ۱۷۸۶ء میں، دوسرا ۱۷۹۰ء (ایضاً، ص ۹۱) یہی ڈاکٹر عبیدہ، ص ۸۲
ص۱۴۰، گِل کرسٹ: "رہنمائے زبانِ اردو"، ۱۸۰۴ء	عبیدہ بیگم: The Stranger's East India Guide to Hindoostani or the Grand Popular Language of India ۱۹۰۲ء، یہی سمیع اللہ ("انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے"، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۷)
ص۱۴۰، گِل کرسٹ: "انگریزی بول چال"، ۱۸۲۰ء	سمیع اللہ: Dialogues, English or Hindoostani ۱۸۰۹ء، ("تصنیفی ادارے"، ص ۱۰۹)
ص۱۴۳، حیدری: "آرائشِ محفل"، ۱۸۰۲ء	خود حیدری کے مطابق کتاب میں ۱۸۰۱ء
ص۱۴۴، شیر علی افسوس ۱۸۰۱ء میں کلکتے پہنچے۔	عتیق صدیقی: افسوس ۱۵ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم میں مقرر (طبعِ اول، ص ۱۹۸)
ص۱۴۵، "گلشنِ ہند" کا مخطوطہ ۱۹۰۶ء کے سیلاب میں ملا۔	ناشر کے مطابق ۱۳۲۰ھ کی برسات میں یعنی ۱۹۰۲ء میں ملا ("گلشنِ ہند"، طبعِ اول، ۱۹۳۴ء)
ص۱۴۵، مرزا علی لطف: ف ۱۸۲۲ء	شمیمہ شوکت: قطعۂ تاریخ کے مطابق ۱۲۳۳ھ/۱۸-۱۸۱۷ء (مثنویِ لطف، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء، مقدمہ، ص ۴۲)

ص ۱۳۵، حسینی کا "رسالۂ گل کرسٹ" ۱۸۱۶ء میں شائع۔

حبیدہ بیگم: پہلی بار ۱۸۲۰ء میں شائع (فورٹ ولیم، ص ۶۱۱)

ص ۱۳۶، ولا ۱۸۰۲ء میں کلکتے پہنچے۔

دیوانِ ولا کے دیباچے کے مطابق ۱۰ مارچ ۱۸۰۰ء کو کلکتے پہنچے (حبیدہ بیگم، ص ۱۴۳)

ص ۱۴۷، دیوانِ جہاں ۱۸۱۴ء میں۔

حبیدہ: ۱۸۱۲ء (۱۸۱۴ء درست نہیں۔) (ص ۵۸۰)

ص ۱۵۰، رجب علی بیگ سرور ۱۸۶۳ء میں آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتے پہنچے۔

نیر مسعود: رمضان ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں پہنچے۔ ("رجب علی بیگ سرور"، ص ۱۱۷)

ص ۱۵۰، سرور: ف ۱۸۶۷ء

حنیف نقوی: ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) ("رجب علی بیگ سرور، چند تحقیقی مباحث"، ص ۲۲)

ص ۱۵۱، سرور کی "شررِ عشق"، ۱۸۵۶ء

گیان چند: "شرارِ عشق" ۱۲۷۶ھ/۶۰-۱۸۵۹ء ("اردو کی نثری داستانیں"، لکھنؤ ص ۵۰۷)

ص ۱۵۱، گویا: ف ۱۸۵۰ء

ان کے بھانجے داماد کے مطابق ۱۸۵۱ء (جعفر ملیح آبادی: "گویا، صاحب سیف و قلم"، ص ۱۳۱)

ص ۱۵۱، گویا کی "بستانِ حکمت"، ۱۸۳۸ء

خود مصنف کے مطابق ۱۴ ذی قعدہ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۶ء میں مکمل (ایضاً، ص ۱۴۲)

ص ۱۵۴، دلی کالج ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم۔

سمیع اللہ: ۱۸۴۳ء (اردو کے تصنیفی ادارے، ص ۲۰۶)

ص ۱۵۷، میر مہدی مجروح کا دیوان ۱۸۹۲ء میں شائع۔

مالک رام: جولائی ۱۸۹۹ء میں ("تلامذۂ غالب"، طبعِ دوم، ص ۴۷۶)

ص ۱۵۷، مجروح ۱۹۰۲ء کے قریب فوت۔

مالک رام: ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء

ص ۱۵۹، کلب علی خاں: ف ۱۸۸۶ء

مالک رام: ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء (ص ۳۹۴)

ص ۱۶۴، منیر شکوہ آبادی: ف ۱۸۸۱ء

مالک رام: ۱۱ اگست ۱۸۸۰ء

ص ۱۶۵، امیر مینائی: پ ۱۸۲۸ء

ابو محمد سحر: ۲۲ فروری ۱۸۲۹ء ("مطالعۂ امیر"، ص ۶۷)

Scanned by CamScanner

ص۱۶۹، جلال: ف ۱۹۱۰ء	سلیمان حسین اور مالک رام: ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء (سلیمان حسین: "لکھنؤ کے چند نامور شعرا"، ص۲۴۷)
ص۱۷۰، امانت: ف ۱۸۵۸ء	مالک رام: ۲۸ جمادی الاول ۱۲۷۵ھ/۳۱ جنوری ۱۸۵۹ء
ص۱۷۵، بے خبر: ف ۱۹۰۵ء	مالک رام: ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء
ص۱۸۶، سرسید ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ پہنچے تو سائنٹیفک سوسائٹی بھی وہاں منتقل۔	سمیع اللہ: ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ تبادلہ اور سوسائٹی کی منتقلی (تصنیفی ادارے، ص۳۱۰)۔ حامد حسن قادری بھی ۱۸۶۴ء (ص۲۵۸)
ص۱۸۸، محمد حسین آزاد: پ ۱۸۳۳ء	مالک رام بحوالۂ اسلم فرخی: ۱۰ جون ۱۸۳۰ء
ص۱۹۰، حالی: پ ۱۹۳۷ء	سہوِ کتابت ۱۸۳۷ء کے لیے۔
ص۱۹۱، حیاتِ سعدی ۱۸۸۲ء	پہلا ایڈیشن: ۱۸۸۶ء (تاریخِ مسلمانان، جلد ۹، ص۱۲۱)
ص۱۹۳، نذیر احمد: پ ۱۸۳۳ء	اشفاق اعظمی: ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء ("نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے"، ص۱۱)۔ افتخار احمد صدیقی ۱۸۳۰ء (ڈپٹی نذیر احمد، کتابیات، ص۵)
ص۱۹۴، "مرأۃ العروس" ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔	اشفاق اعظمی: ۱۸۶۷ء (ص۱۳۹)۔ افتخار اعظمی ۱۸۶۸ء (کتابیات، ص۱۱)
ص۱۹۴، "توبۃ النصوح"، ۱۸۷۷ء	اشفاق اعظمی: ۱۸۷۳ء کے اوائل میں مکمل (ایضاً، ص۱۸۴) افتخار احمد صدیقی: ۱۸۷۳ء (ص۱۲)
ص۱۹۵، شبلی ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد ہو کر چلے گئے۔	ظفر احمد صدیقی: جنوری ۱۸۸۳ء کے آخر میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر گئے ("شبلی"، ص۱۵)
ص۱۹۸، سرشار: ف ۱۹۰۲	لطیف حسین ادیب: ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء ("سرشار کی ناول نگاری"، ص۴۲)
ص۲۰۱، شرر ۱۵ مہینے کے لیے حیدرآباد سے انگلستان گئے	علی احمد فاطمی: ۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۶ء تین سال کے لیے گئے ("عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار"، ص۱۵۹)

Scanned by CamScanner

ص ۲۰۳، رسوا: پ ۱۸۵۹ء	مالک رام: ۱۸۵۸ء۔ ملک حسن اختر: ؟ ری ۱۸۵۸ء
ص ۲۰۹، ابوالکلام آزاد: پ ۱۸۸۹ء	مالک رام: اگست ستمبر ۱۸۸۸ء
ص ۲۱۱، نیاز: پ ۱۸۸۵ء	اسیر عارفی: ۱۸۸۴ء ("نیاز فتح پوری"، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۱)
ص ۲۱۴، لالہ سری رام دہلوی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۲۹ء	پنڈت کیفی: پ ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء، ف ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء (دیباچۂ "خمخانۂ جاوید"، جلد پنجم)
ص ۲۱۶، وحید الدین سلیم: ف ۱۹۱۶ء	مالک رام: ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء
ص ۲۲۶، حالی کی "مناجاتِ بیوہ"، ۱۸۸۷ء	غلام مصطفے خاں: ۱۸۸۴ء ("حالی کا ذہنی ارتقا"، ص ۹۲، بحوالۂ تاریخِ مسلمانان، جلد ۹، ص ۱۱۵ حاشیہ)
ص ۲۴۰، اقبال: پ ۱۸۷۴ء	نظیر احمد صوفی: ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء (بحوالۂ مالک رام: "تحقیقی مضامین"، ص ۱۶۶)
ص ۲۴۲، اقبال کی نظم ہمالہ ۱۸۹۹ء	گیان چند: اپریل ۱۹۰۱ء میں "مخزن" میں شائع ("ابتدائی کلامِ اقبال"، ص ۱۰۸)
ص ۲۴۸، عزیز لکھنوی: پ ۱۸۸۰ء	ڈاکٹر مسعود حسن ردولوی: ۱۸۸۲ء ("عزیز لکھنوی"، ص ۲۶)
ص ۲۴۹، ذاکر حسین ثاقب لکھنوی: پ ۱۸۶۰ء	مالک رام: ۲ جنوری ۱۸۶۹ء
ص ۲۵۰، فانی: ف ۱۹۴۲ء	مالک رام: ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء
ص ۲۵۱، جگت موہن لال رواں: ف ۱۹۴۹ء	مالک رام: ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء
ص ۲۵۱، سیماب: پ ۱۸۸۰ء، ف ۱۹۵۰ء	مالک رام: پ ۵ جون ۱۸۸۲ء، ف ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء
ص ۲۵۲، آرزو لکھنوی پ ۱۸۷۲ء	مالک رام: ۱۶ فروری ۱۸۷۳ء
ص ۲۵۳، حسرت موہانی: پ ۱۸۷۵ء	پاسپورٹ کے مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء ("ہماری زبان"، یکم فروری ۱۹۹۳ء)
ص ۲۵۵، محروم: پ ۱۸۸۵ء کے آس پاس	جگن ناتھ آزاد: یکم جولائی ۱۸۸۷ء ("افکارِ محروم"، طبعِ دوم، ص ۱۲۳)
ص ۲۵۸، جعفر علی خاں اثر ف ۱۹۶۶ء	مالک رام: ۶ جون ۱۹۶۷ء

Scanned by CamScanner

ص ۲۷۱، اختر شیرانی: ف ۱۹۴۳ء — یونس حسنی: ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء ("اختر شیرانی اور جدید اردو ادب"، کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۶۱)

ص ۲۷۲، روش صدیقی: پ ۱۹۱۱ء — مالک رام نیز عبداللطیف اعظمی: ۱۹۰۹ء (اعظمی: "مشاہیر کے خطوط")

ص ۲۷۶، فیض: پ ۱۹۱۲ء — مالک رام: ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء

ص ۲۷۹، جمیل مظہری: پ ۱۹۰۵ء۔ — مالک رام: ستمبر ۱۹۰۴ء، سرٹیفکیٹ کی تاریخ جنوری ۱۹۰۵ء، غلط ہے۔

ص ۲۷۹، مخدوم محی الدین: پ ۱۹۰۷ء — مالک رام: ۴ فروری ۱۹۰۸ء

ص ۲۸۱، سردار جعفری: پ ۱۹۱۲ء — مالک رام: ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء

ص ۲۸۲، ساحر لدھیانوی: پ ۱۹۲۲ء — مالک رام: ۸ مارچ ۱۹۲۱ء

ص ۲۸۴، کیفی اعظمی: پ ۱۹۱۷ء — صابرہ دت: جنوری ۱۹۲۰ء ("تصویرِ بتاں")

ص ۲۸۵، شمیم کرہانی: پ ۱۹۱۶ء — مالک رام: ۸ جون ۱۹۱۳ء (۲ رجب ۱۳۳۱ھ)

ص ۲۸۶، عرش ملسیانی: پ ۱۹۸۸ء، سہوِ کتابت — مالک رام: ۲۰ ستمبر ۱۹۰۸ء

ص ۲۸۸، سکندر علی وجد: پ ۱۹۱۴ء — مالک رام: ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء

ص ۲۹۹، "انگارے" شائع ۱۹۳۳ء — ڈاکٹر عقیل: نومبر ۱۹۳۲ء ("اعجاز حسین کی مختصر تاریخِ ادبِ اردو"، ص ۳۹۴)

ص ۳۰۰، رشید جہاں: ف ۱۹۵۴ء — شاہدہ بانو: ۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء ("ڈاکٹر رشید جہاں، حیات اور کارنامے"، ص ۹۶)

ص ۳۰۱، کرشن چندر: پ ۱۹۱۴ء — ڈاکٹر بیگ احساس: ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء (غیر مطبوعہ مقالہ)

ص ۳۰۳ راجندر سنگھ بیدی: پ ۱۹۱۰ء — مالک رام: یکم ستمبر ۱۹۱۵ء۔ یہی ڈاکٹر عقیل نے لکھی۔

ص ۳۲۲، آلِ احمد سرور: پ ۱۹۱۲ء — بقولِ خود ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء

ص ۳۲۳، ممتاز حسین: پ ۱۹۱۴ء — مالک رام: یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء

ص ۳۲۴، کلیم الدین احمد: پ ۱۹۰۹ء — مالک رام: ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء، حوالہ آپ بیتی، "اپنی تلاش میں"

ص ۳۲۵، نورالحسن ہاشمی: پ ۱۹۱۳ء — بقولِ خود ۲۱ اگست ۱۹۱۱ء (مجموعہ کلام "اندرونم"، ص ۱۵۷)

Scanned by CamScanner

ص ۳۳۳، باقر مہدی: ۱۹۲۸ء | مالک رام: ۱۱ فروری ۱۹۲۷ء

یہ مسلم ہے کہ احتشام صاحب محقق نہ تھے لیکن جب انھوں نے تاریخِ ادب لکھنے کی ذمے داری لی اور اس میں جگہ جگہ سنین درج کیے تو ان سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کی درستی میں تھوڑی بہت کد بھی کریں گے۔ انھوں نے نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے جہاں بھی کوئی تاریخ لکھی دکھائی دی، اسے صدقِ ایمان کے ساتھ قبول کر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تاریخوں کے معاملے میں اس تاریخِ ادب پر مطلق بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے قطعِ نظر، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، یہ ایک بہت خوش گوار اور متوازن تاریخ ہے۔ اس میں کہیں انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ اس میں کوئی ایسا تنقیدی فیصلہ نہیں جس سے شدت سے اختلاف کیا جائے۔ متوسط صفات کی، اوسط عالیت کی یہ تاریخ ایسی ہے جس کو پڑھنا بار نہیں ہوتا، بلکہ پسندِ خاطر ہوتا ہے۔ کاش اگلے ایڈیشن میں ترقیِ اردو بیورو کسی سے میرے تبصرے کی روشنی میں سنین کی تصحیح کرا لے۔

حواشی:

(۱) اکبر رحمانی جل گانوی، "احتشام حسین، حیات اور شخصیت" ("فروغِ اردو"، احتشام نمبر، فروری ۱۹۷۴ء)

(۲) مجھے اس کتاب کا یہ نسخہ نیز اس کا دوسرا ایڈیشن (۱۹۸۴ء) ڈاکٹر جعفر رضا نے مستعار دیا، جس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔

Scanned by CamScanner

سولھواں باب

"تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند"

پنجاب یونی ورسٹی لاہور نے ۱۶ جلدوں میں "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" لکھنے کا منصوبہ بنایا اور کمال یہ ہے کہ اسے معینہ مدت میں پورا بھی کر دیا۔ چھٹی جلد میں جو اردو ادب کی پہلی جلد ہے، اس کا منصوبہ یوں دیا ہے:

پہلی جلد: مقدمہ، دوسری جلد: عربی ادب، ۳ تا ۵: فارسی ادب، ۶ تا ۱۰: اردو ادب، ۱۱ تا ۱۲: بنگالی ادب، ۱۳ تا ۱۴: علاقائی ادبیاتِ مغربی پاکستان، ۱۵: علاقائی ادبیاتِ ہند، ۱۶: جملہ جلدوں کا انگریزی میں خلاصہ۔

شاید عملاً کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ جلد ۱۵ "اشاریۂ اردو" کے مرتب ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ ۱۳ جلدیں شائع ہوئیں جو یہ ہیں:

ایک جلد: عربی ادب، تین جلدیں: فارسی ادب، پانچ جلدیں: اردو ادب، دو جلدیں: بنگالی ادب، دو جلدیں: پاکستان کی علاقائی زبانوں کی ادبیات۔ پندرھویں جلد اردو کی پانچ جلدوں کا اشاریہ ہے۔

یہ شمار بھی صحیح نہیں، کیونکہ اس میں چودھویں جلد غائب ہے۔ اصل میں ذیل کی جلدیں چھپ کر آئیں:

جلد ۱، ۲: عربی ادب، جلد ۳ تا ۵: فارسی ادب، جلد ۶ تا ۱۰: اردو ادب، جلد ۱۱، ۱۲: بنگالی ادب، جلد ۱۳، ۱۴: علاقائی ادبیاتِ مغربی پاکستان، جلد ۱۵: اشاریۂ اردو۔

بہر حال اشاریے کے علاوہ ۱۴ جلدیں شائع کر دینا اتنا بڑا اکتساب ہے جس کی نظیر دوسری جگہ شاید ہی مل سکے۔

اس مجموعے کی سات رکنی مجلسِ منتظمہ ہے، جس کے صدر پروفیسر علاء الدین صدیقی ہیں۔ دو رکنی مجلسِ ادارت ہے، جس میں علاء الدین صدیقی مدیرِ اعلیٰ ہیں اور گروپ کیپٹن سید

Scanned by CamScanner

فیاض محمود مدیر عمومی۔ ہم نہیں جانتے کہ پروفیسر علاء الدین صدیقی کون صاحب ہیں۔ ممکن ہے اورینٹل کالج کے پرنسپل یا ڈین ہوں، اردو کے اہلِ قلم تو ہیں نہیں۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود کا ذکر اپندر ناتھ اشک کے سلسلے میں ملتا ہے۔ ۱۹۳۹ء سے قبل انھوں نے پروفیسر فیاض محمود کے ساتھ بیٹھ کر نو ضخیم جلدوں میں اپنا ناول "گرتی دیواریں" لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ فیاض محمود اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد تھے۔ بعد میں، پہلے انڈین ایرفورس میں اور قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان ایرفورس میں ملازم رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد تاریخِ ادبیات کی اسکیم کے مدیرِ عمومی ہوئے۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رشید حسن خاں نے رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری کو علی گڑھ تاریخِ ادب اردو کے ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے لیے ناموزوں کہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان میں تاریخِ ادبیات کے لیے گروپ کیپٹن صاحب کو کیوں مدیرِ عمومی بنایا گیا، وہ نہ محقق تھے نہ نقاد۔

اس منصوبے میں اردو ادب کی پانچ جلدیں ہیں۔ جلد ۶ تا ۱۰، جنھیں اردو کی جلد اوّل تا پنجم کہا گیا ہے، پندرھویں جلد انھیں کا اشاریہ ہے، گویا اردو ادب کی تاریخ چھے جلدوں میں پیش کی ہے۔ بہتر ہوتا کہ اشاریے کی جلد بھی تاریخِ ادب کی پانچوں جلدوں کے فوراً بعد ہوتی۔ علی گڑھ تاریخِ ادب کی جلد اوّل کے لکھنے والوں میں سب کے سب اردو کے نام ور محققین تھے، جو پورے برصغیر میں ایک مقام رکھتے تھے۔ لاہور کی تاریخ کے بیش تر مقالہ نگار اہلِ ہند کے نقطۂ نظر سے گم نام شخص ہیں۔ دونوں ممالک کی متحدہ اردو دنیا میں ان کا مسلّمہ مقام نہیں، مثلاً ذیل کے نام دیکھیے:

علاء الدین صدیقی، سید فیاض محمود، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر الف د نسیم، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، فیضان دانش، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجید یزدانی، مشرف علی انصاری، محمد زبیر منگلوری، ممتاز منگلوری، خواجہ محمد زکریا، راحت افزا بخاری، نادرہ زیدی، ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، ڈاکٹر اسد اریب، ڈاکٹر عبدالغنی، پروفیسر محمد فرمان، ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر عبیداللہ خاں، سہیل احمد خاں، خورشید احمد، صدیق کلیم۔

تبسم کاشمیری سے میری ملاقات ٹوکیو میں ہوئی تھی۔ ۱۹۹۲ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے ان کی کتاب "ادبی تحقیق کے اصول" چھاپی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمان کی کتاب "اردو تحقیق، یونی ورسٹیوں میں" سے معلوم ہوا کہ وہ اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اردو میں تھے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بھی اورینٹل کالج اور ملتان یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ الف د نسیم کے مضامین رسالہ "اردو" میں دیکھنے میں آئے ہیں، لیکن ہندوستان میں

Scanned by CamScanner

ان کے بارے میں اس سے زیادہ علم نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیش تر مضمون نگار لاہور میں اردو کے استاد ہیں۔ چونکہ یہ حضرات زعمائے دنیائے اردو نہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ تاریخ مکمل ہو سکی اور وہ بھی مناسب میعاد کے اندر۔

اس کتاب کا عنوان ہے: "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند۔" گویا یہ اس مفروضے کے ساتھ شروع کی گئی ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان اور ادب ہے۔ مدیرِ اعلیٰ اپنے مختصر پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائرِ زندگی کی نشان دہی کی جائے جس سے اس برِصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔

گو یہ تاریخ ملی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے لیکن ڈاکٹر الف د نسیم یہ کہہ گئے ہیں:

> اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے اردو زبان کی ابتدائی تعمیر میں اس وقت سے حصّہ لینا شروع کیا تھا جب دہلی میں ابھی تک اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کے کوئی آثار بھی نہ تھے ... اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو رسم الخط، زبان اور ادب کی بنیاد اور ان کا وجود ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔
>
> چھٹی جلد، ص ۱۹۲

کتاب کی جلدوں کی تقسیم زمانی اعتبار سے کی گئی ہے، جو یہ ہے:

چھٹی جلد: ۱۷۰۷ء - ۱۲ء

ساتویں جلد: ۱۸۰۳ء - ۱۷۰۷ء

آٹھویں جلد: ۱۸۵۷ء - ۱۸۰۳ء

نویں جلد: ۱۹۱۴ء - ۱۸۵۷ء

دسویں جلد: ۱۹۷۲ء - ۱۹۱۴ء

میں ایک ایک جلد کو لے کر جائزہ لوں گا۔

چھٹی جلد - اردو ادب (اوّل)

پہلی جلد کو ۱۲ء سے شروع کرنا بے کار بات ہے۔ اس وقت نہ اردو زبان تھی نہ اردو ادب۔ چودھویں صدی عیسوی سے پہلے تو اردو کے ٹوٹے پھوٹے فقرے بھی نہیں ملتے۔

Scanned by CamScanner

اس سے قبل کی صدیوں کا ذکر پس منظر میں کیا جا سکتا تھا، لیکن اردو ادب کی تاریخ چودھویں صدی عیسوی سے شروع کرنی چاہیے تھی۔ حسبِ معمول پہلا باب "سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر" ہے، ایک اصولی بحث۔

جیسا کہ میں پہلے علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں، سماجی تنقید اور ترقی پسندی کے زیرِ اثر ہر مقالے کی ابتدا میں سیاسی اور تہذیبی پس منظر دینا ضروری مان لیا گیا۔ اس میں محض تاریخ دہرا دینے کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ اُن واقعات کا اردو ادب سے براہِ راست کوئی رشتہ قائم نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر کتاب میں وہی تاریخ، وہی واقعات، وہی پس منظر جو باہوش قاری کو پہلے سے معلوم ہے۔ یہ باب بقیہ کتاب سے دولخت ہوتا تھا۔ پس منظر میں صرف وہ واقعات دینے چاہییں جن کا جاننا اس دور کے ادب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہو۔ یہ مختصر ہونا چاہیے، یعنی زیادہ سے زیادہ آٹھ دس صفحات (۱) کا۔ اس تاریخِ ادب کی ہر جلد میں سیاسی پس منظر دیا ہے۔ پانچوں جلدوں کے تاریخی پس منظر کو ملا کر ۲۰۲ صفحے ہوتے ہیں۔ انھیں ایک جلد میں یک جا دے دیا جاتا تو تاریخ کے مضمون کے نصاب میں بھی کام آ جاتا۔

دوسری تا پانچویں جلد میں تاریخی پس منظر کے بعد ادبی پس منظر کا باب ہے۔ چاروں جلدوں میں اس پس منظر کو ۱۰۷ صفحے دیے ہیں، گویا سیاسی اور ادبی پس منظر کو جملہ ۳۰۹ صفحات دیے ہیں۔ پانچوں جلدوں کے سیاسی پس منظر اور جلد ۳ تا ۵ کے ادبی پس منظر کے جملہ آٹھ باب ایک ہی مضمون نگار نے لکھے ہیں۔ اردو کی کسی تاریخ میں ۳۰۹ صفحے پس منظر کی نذر نہیں کیے گئے ہوں گے۔ اس تاریخ کی گویا ایک جلد پس منظر ہی کے کام آ گئی۔ اردو ادب کو دیکھ کر تھرّانا پڑتا ہے، جسے سمجھنے کے لیے تین سو صفحوں سے زیادہ کے پس منظر کو گھُورنا ضروری ہے۔

پہلی جلد کا دوسرا باب "اردو کی پیدائش اور ارتقا" ہے۔ چاہیے تھا کہ اس کے بعد کے ابواب علاقے اور زمانے کے اعتبار سے بانٹے جاتے، لیکن مجھے تقسیمِ ابواب میں عجب خلفشار دکھائی دیتا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان "اردو زبان و ادب کے ابتدائی نمونے" ہے جو زمانوی تقسیم کی پہلی سیڑھی ہے۔ اس کے بعد "مشائخ اور دوسرے مصنفین" کے عنوان سے مسلسل دو باب ہیں جن میں مختلف علاقوں کے مشائخ کو لیا ہے۔ یہ دونوں باب مذہبی شاعری اور مذہبی رسالوں پر مشتمل ہیں، گویا یہاں موضوعی تقسیم ہے۔

اس کے بعد چھٹا باب "اصنافِ سخن" ہے۔ یہ بیچ میں کیوں کود پڑا۔ اسے یا تو کتاب کی ابتدا میں دوسرے باب کے بعد دینا تھا یا اس سے بھی بہتر یہ ہوتا کہ آخری باب "مجموعی جائزہ" سے فوراً پہلے دیا جاتا۔ ادب کی سلسلے وار تاریخ کے بیچ میں اس موضوع کو دخل در

Scanned by CamScanner

معقولات کا کوئی حق نہ تھا۔

ساتویں باب کا عنوان "دکنی اور گجراتی ادب" ہے جس میں ان علاقوں کے ادب کی نوعیت کے بارے میں مجموعی طور پر لکھا گیا ہے، متفرق ادیبوں کا نام بہ نام بیان نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد علاقائی تقسیم کے تین ابواب ہیں: ادبیاتِ گولکنڈہ، ادبیاتِ بیجاپور، ادبیاتِ گجرات۔ ان تینوں بابوں کے مضامین کہیں کہیں ساتویں باب سے ٹکرا جاتے ہیں۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یہ بہتر ہوتا کہ پہلے ادبیاتِ گجرات کا باب ہوتا، اس کے بعد گولکنڈہ اور بیجاپور کے۔ گیارھواں باب "ولی اور اس کے معاصرین" ہے۔ اس کے معاصرین کا ذکر پہلے کے ابواب میں بھی آچکا ہے۔ اس طرح کئی ادیب ایسے ہیں جن پر دو ابواب میں دو مضمون نگاروں نے لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کتاب کا خاکہ اس تفصیل سے نہیں بنایا گیا کہ ہر باب کے ذیل میں اس کے ادیبوں کے نام بھی ٹانک دیے جاتے تاکہ ایک ادیب کو دو ابواب میں رونما نہ ہونا پڑتا۔

کتاب کا بہتر خاکہ یوں ہوتا کہ مشائخ اور دوسرے مصنفین کے دو الگ ابواب نہ ہوتے۔ ان سب مشائخ کو گجرات، گولکنڈہ اور بیجاپور کے تحت اپنے زمانے کے مطابق درج کر دیا جاتا۔ اس طرح ان ابواب اور باب آٹھ تا دس میں بعض صوفیہ کا اندراج مکرر نہ ہوتا۔ اصنافِ سخن کا باب کتاب کے آخر میں مجموعی جائزے سے قبل آنا چاہیے تھا۔ ساتواں باب "دکنی اور گجراتی ادب" بھی غیر ضروری ہے۔ اسے بھی باب آٹھ تا دس میں ضم کیا جا سکتا تھا۔ بصورتِ موجودہ مختلف ابواب میں ایک دوسرے سے گوشت و ناخن کا تعلق نہیں۔ ان میں ایک مقالے کے اجزا کی سی چسپیدگی نہیں۔ وہ مل کر ایک کتاب کی شکل نہیں پیش کرتے، بلکہ متفرق مضامین کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض مضامین میں ویسا اندرونی تسلسل اور داخلی ارتباط نہیں جیسا کہ جمیل جالبی کے باب سات "دکنی اور گجراتی ادب" میں ملتا ہے اور جہاں نظر آتا ہے کہ لکھنے والے کو اپنے موضوع پر مکمل عبور حاصل ہے۔

کتاب میں سنین بہت کثرت سے ہیں، ان سب کو پرکھنا مشکل ہے۔ کچھ کو میں نے جانچا ہے۔ ہجری سنہ کے مقابلے میں ہمیشہ دو عیسوی سنہ درج کرنے چاہییں، الا ان صورتوں کے جب ماہ و یوم معلوم ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایک عیسوی سنہ کافی ہے۔ لگتا ہے کہ بیشتر مضمون نگاروں نے اس حزم و احتیاط سے کام نہیں لیا جو قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کا مطالبہ ہوتا ہے۔

اب ایک ایک باب کو لے کر اس کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

پہلا باب "سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر" کا ہے۔ اس کے عام ماحول

Scanned by CamScanner

کے بارے میں ایک حرف کہنا چاہتا ہوں۔ جمیل جالبی کی تاریخ ادب میں اسلامی پہلو پر اتنا زور نہیں، جتنا پنجاب یونی ورسٹی کی تاریخ میں ہے۔ رشید حسن خاں نے جالبی کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> مولف نے جگہ جگہ اردو کو مسلمانوں اور اسلام سے اس طرح وابستہ کیا ہے جیسے ان میں لازم و ملزوم کی نسبت ہو۔ پاکستان میں تہذیب اور ثقافت کے مسائل جس طرح معرضِ بحث میں لائے جا رہے ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ جذباتی سطح پر یہ دل خوش کرنے والی بات ہو سکتی ہے لیکن لسانی ارتقا کی حقیقی بحث کو اس سے کچھ تعلق نہیں...
>
> پاکستان میں یہ رُجحان نشوونما پا رہا ہے کہ مختلف تہذیبی مظاہر کو "اسلامی" بنا لیا جائے۔ زبان بھی اسی کا شکار ہوئی ہے۔ حکومتِ پاکستان کے شعبۂ نشرواشاعت کی فرمائش پر "ثقافتِ پاکستان" کے نام سے شیخ محمد اکرام (مرحوم) نے ایک کتاب مرتب کی تھی۔ اس میں زبان کے آغاز کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے: "اردو کی ابتدا کہیں بھی ہوئی ہو۔ اس کی اصل ابتدا برِصغیر کے مسلمانوں کے دل میں ہوئی... "الخ۔
>
> اس طرح کے بیانات جذباتی سطح پر کیسے ہی دل فریب ہوں، مگر اصولی بحثوں میں وہ کارآمد نہیں ہو سکتے، البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ادب کے طالبِ علم مغالطے میں مبتلا ہو جائیں۔
>
> ("ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ص۹۶-۲۹۵)

کتاب کے پہلے باب میں یہ رنگ شدید ہے۔ اس میں ہندوؤں میں طرح طرح کے اسقام اور خامیاں دکھائی گئی ہیں اور مسلمانوں کو جملہ محاسن اور برتری کا امین قرار دیا ہے۔ مضمون میں ایسے عنوانات ہیں:

> ہندومت کا احیا، ہندو مزاحمت، ہندوؤں کا رویّہ، ہندو افکار کا اثر و نفوذ، ہندو اثرات کا استحکام، ہندو توہمات کا دخل وغیرہ۔

یہ تاریخِ ادب لکھی جا رہی ہے کہ تاریخِ ملت؟ ہندوستان میں ایک ادبی تاریخ میں ہم ایسے عنوانات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں کے محترم سنتوں رامانج آچاریہ اور رامانند کے نام بغیر کسی تعظیمی لاحقے کے فعلِ واحد کے ساتھ لکھے ہیں، مثلاً:

> رامانج کے کام کو جاری رکھنے والوں میں رامانند تھا۔ (ص ۲۱)

یہ اردو کی تہذیب نہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم خواجہ معین الدین چشتی یا سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے لیے لکھے: "معین الدین کہتا تھا..."، "نظام الدین کہتا تھا..." تو کیسا معلوم ہوگا۔ پاکستانی ثقافت پر کوئی کتاب لکھی جائے تو اس میں جس طرح جی چاہے لکھیے۔ اردو ادب کی تاریخ میں قبلِ اردو کے اختلافی مطالب کی کیا ضرورت ہے۔

تحقیقی مقالوں میں تاریخی پس منظر کے ابواب میں تاریخ کو بار بار اس طرح دہرایا گیا کہ تحصیلِ حاصل ہو گیا۔ تاریخی واقعات کا ادب پر اثر دکھانے کے بجائے صرف سیاسی تاریخ کو دہرانا کافی سمجھا گیا۔ اب اسے غیر ضروری مانا جاتا ہے۔ اس جلد کے پہلے باب میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس میں بہت کچھ اردو ادب سے پہلے کے دور سے تعلق رکھتا ہے، مثلاً مسجدِ قوت الاسلام کے بارے میں یہ لکھنا:

> ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مندروں کو توڑ کر عجلت میں جمع کیے ہوئے سامان اور ان معماروں سے عمارت بنوا لینا مقصود تھا جو مقامی طور پر میسر آئے۔ (ص ۳۵)

اس اعتراف سے کہ مندروں کو توڑ کر مسجد بنائی گئی، اردو ادب کے ارتقا پر کون سی روشنی پڑتی ہے، اردو کی کون سی ادبی تخلیق کا اس سے تعلق ہے؟ جیسا کہ میں علی گڑھ تاریخ کے سیاسی پس منظر کے باب کے بارے میں لکھ چکا ہوں اس باب کا وہ تمام حصہ غیر متعلق ہے جو اردو ادب کے نشو و نما سے پہلے کا ہے۔ اردو ادب کے دور میں بھی صرف انھیں سیاسی اور معاشرتی واقعات کو بیان کرنا چاہیے جو اردو کی ادبی تخلیقات سے براہِ راست متعلق ہوں۔ آگے کے مختلف ابواب مثلاً باب ۶ تا ۱۰ پر لکھنے والوں نے ضروری تاریخی اور سماجی پس منظر دے دیا ہے، اتنا کافی ہے۔ پہلا باب بیش تر یا تمام تر حشو ہے۔ اس سے تاریخی معلومات ہی حاصل ہوتی ہیں، ادبی معلومات نہیں، اور یہ تاریخی معلومات ایک ہوش مند قاری کو پہلے ہی سے معلوم ہیں۔

اس باب میں ص ۱۸ پر حضرت نظام الدین اولیا کو متوفی ۱۳۲۴ء لکھا ہے، ہجری سنہ نہیں لکھا۔ صحیح ہجری تاریخ بقولِ مالک رام ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ ("تذکرۂ ماہ و سال") اور بقولِ ظ انصاری ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ ("خسرو شناسی"، ص ۳۰) ہے۔ یہ دونوں تاریخیں ۱۳۲۵ء میں آتی ہیں۔ ہجری سنہ کے متوازی ایک عیسوی سنہ لکھنے سے یہ تسامح پیش آ سکتا ہے۔ مقالہ نگار پس منظر پر لکھتے لکھتے بہک کر ادب پر پہنچ جاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے "معراج العاشقین" لکھی (ص ۵۴)۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" ۱۹۶۸ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کے بعد "معراج العاشقین" کا

Scanned by CamScanner

ذکر نہیں کرنا تھا، چنانچہ اسی جلد کے ص ۳۸۱ پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ "معراج العاشقین" خواجہ بندہ نواز سے کئی صدی بعد ایک دوسرے بزرگ نے لکھی۔

دوسرا باب، "اردو کی پیدائش اور ارتقا"، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع "اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر" ہے۔ مقالہ شائع ہو چکا ہے اور اپنے موضوع پر قابلِ قدر کام ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ذوالفقار صاحب کو لسانیات کا کتنا درک ہے۔ انھوں نے اس باب کو خالص لسانیاتی انداز سے نہیں لکھا، جیسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے علی گڑھ تاریخِ ادب اردو میں لکھا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت میں "قدیم اردو ادب کی تاریخ، ۱۷۰۰ء تک" لکھی ہے جو ترقیِ اردو بیورو، دہلی میں زیرِ طبع ہے۔ اس کے لسانیاتی باب کا بیش تر حصہ میں نے "نقوش" شمارہ ۱۴۰ میں شائع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر ذوالفقار لکھتے ہیں کہ اردو کی ابتدا سے متعلق چار علاقوں کا ذکر کیا جاتا ہے ۱۔ دکن ۲۔ سندھ ۳۔ پنجاب ۴۔ دہلی۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ دکن میں اردو کا نظریہ کس کا ہے۔ عام طور سے اسے نصیرالدین ہاشمی سے منسوب کیا جاتا ہے، لیکن انھوں نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں اسے صاف طور پر رد کیا ہے۔ ڈاکٹر ذوالفقار پہلے دو نظریوں کو تسلیم نہ کر کے پنجاب پر آکر اٹک جاتے ہیں۔ کیا یہ ان کی علاقہ پروری ہے کہ وہ اردو کا آغاز ۱۰۰۰ء کے قریب مغربی پاکستان کے علاقے میں کرتے ہیں (ص ۷۹)۔ اس کے لیے انھوں نے محمود شیرانی کے دلائل کی تائید کی اور سنیتی کمار چٹرجی کے بیانات کا بھی سہارا لیا، لیکن ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے مقالوں میں اس نظریے کے رد میں جو دلائل دیے ہیں، مضمون نگار نے ان کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی۔

پنجاب میں اردو کا آغاز کر کے وہ دوسرے علاقوں کو یہ رعایت دیتے ہیں کہ بعد میں "مسئلہ اردو زبان کے آغاز کا نہیں رہتا، بلکہ اس کے نشوونما کے مختلف مرحلوں کا آجاتا ہے" (ص ۷۹)۔ ان کے نزدیک دہلی اردو کے ارتقا کی دوسری منزل ہے، جہاں سے اردو گجرات و دکن میں جاتی ہے (ص ۸۴-۸۳)۔ کاش وہ اردو سے پہلے کی وسطی ہند آریائی زبانوں پر توجہ کرتے اور فیصلہ کرتے کہ اردو کس اپ بھرنش سے ماخوذ ہے اور وہ اپ بھرنش کس علاقے میں بولی جاتی تھی۔

اردو کے پھیلاؤ کے سلسلے میں وہ ادبیات کے کوچے میں نکل جاتے ہیں اور عہد بعہد نمونے دیتے ہیں۔ یہ حصہ لسانیاتی کم اور ادبی زیادہ ہے اور اس وجہ سے اس میں ادبی تاریخ کے تسامحات در آتے ہیں۔ چند مشاہدات:

Scanned by CamScanner

امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کی ۱۲ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ذوالفقار لکھتے ہیں:

> انھوں نے لاہوری ... اور دہلوی (برج بھاشا) کے علی الرغم "ہندوی" کا ذکر کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ یہ زبان مذکورہ بالا صوبائی یا علاقائی زبانوں کے مابین ایک بین العلاقائی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ (ص ۶۷)

دہلوی کے معنی برج بھاشا کبھی نہیں لیے گئے۔ خسرو نے زبانوں کی فہرست میں دہلوی نہیں کہا، بلکہ بارھویں زبان کو اس کے علاقے سے ظاہر کیا ہے ع:

دہلی و پیرامنش، اندر ہمہ حد

یہ اس علاقے کی کھڑی بولی ہو سکتی ہے۔ جہاں تک ہندوی کا تعلق ہے خسرو نے ان کی ۱۲ کی ۱۲ زبانوں کو صریحاً ہندوی، یعنی ہندوستان کی زبانیں کہا ہے ع:

این ہمہ ہندویست ز ایام کہن
عامہ بہ کارست بہ ہر گونہ سخن

اس طرح ڈاکٹر ذوالفقار کا یہ خیال درست نہیں کہ خسرو نے ہندوی کو دہلوی پر فوقیت دے کر بین العلاقائی زبان کہا ہے۔

مضمون نگار نے صوفیہ کے ابتدائی ملفوظات نقل کیے، یہ اچھا کیا، لیکن ان کے انتساب کی پرکھ اور متن کی صحت میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ خواجہ بندہ نواز کا یہ ملفوظ دیکھیے:

> بھوکوں موے سوں خدا کچھ اپڑتا ہے، خدا کوں اپڑنے کی استعداد ہور ہے۔ (ص ۹۱)

لیکن یہ ملفوظ شاہ وجیہ الدین گجراتی کے مجموعے "بحرالحقائق" میں زیادہ تفصیل سے ہے۔ وہاں اس سے پہلے اس کے سیاق میں فارسی کے چند جملے بھی دیے ہیں جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ وجیہ الدین کا ہے، خواجہ بندہ نواز کا نہیں۔ دیکھیے: علی گڑھ تاریخ، ص ۱۰۲۔

یہاں انھوں نے خواجہ بندہ نواز کا سنہ وفات ۱۴۳۱ء/۸۲۵ھ درج کیا ہے۔ دونوں میں مطابقت نہیں۔ ہجری سنہ صحیح ہے، عیسوی غلط۔ ان کے انتقال کی صحیح تاریخ ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ ہے جو مطابق ہے ۱۴۲۲ء کے۔ ص ۹۳-۹۴ پر امیر خسرو کے دو دوہے دیے ہیں۔ ان میں سے کسی کی پرانی سند نہیں ملتی، اس لیے خسرو سے منسوب کسی بھی ہندی شعر

Scanned by CamScanner

کو مشکوک کے ضمن میں رکھنا ہوگا۔ ص ۹۴ پر "معراج العاشقین" کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا ہے، حالانکہ ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ کتاب بندہ نواز سے کئی صدی بعد کے شاہ مخدوم حسینی کی تصنیف ہے۔ جیسا کہ پیچھے لکھا گیا اسی تاریخ کی اسی جلد کے ص ۳۸۱ پر جمیل جالبی نے اسے شاہ مخدوم سے منسوب کیا ہے۔

ص ۹۵ پر میراں جی شمس العشاق کا سنہ وفات ۱۴۹۶ء/۹۰۲ھ لکھا ہے۔ میں پیچھے کئی تواریخ بالخصوص علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ ان کا سنہ وفات نہیں، سنہ ولادت ہے۔ ان کی ایک مثنوی کا نام "شہادت الحقیقت" لکھا ہے (ص ۹۵)۔ اسے بداحتیاطی سے کبھی "شہادت الحقیقت" اور کبھی "شہادت التحقیق" کہہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے نام کو خود شاعر نے قافیے میں "شہادت الحقیق" نظم کیا ہے:

اس نام ہے تحقیق
سن شہادۃ الحقیق

اگلے ص ۹۶ پر "شرح مرغوب القلوب" کو میراں جی کی تصنیف قرار دیا ہے، حالانکہ یہ میراں جی خدانُما کی تصنیف ہے۔ شمس اللہ قادری نے اسے خدانُما ہی سے منسوب کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: علی گڑھ تاریخ پر میرا تبصرہ۔

لکھتے ہیں:

> شاہ میراں یعقوب نے ۱۶۶۷ء/۱۰۷۸ھ میں برہان الدین اولیا کی کتاب "شمائل الاتقیا" کا اردو ترجمہ کیا۔ (ص ۱۰۷)
>
> اس بیان میں ترجمے کا سنہ اور فارسی اصل کے مصنف کا نام غلط ہے۔ ہمیں جمیل جالبی کی تحقیق کو تسلیم کرنا ہوگا جن کے مطابق اردو ترجمے کی تکمیل ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں ہوئی اور فارسی کتاب کے مصنف شاہ برہان الدین غریب کے مرید رکن عمادالدین دبیر معنوی تھے۔ (جالبی، ص ۵۰۱)

"محمد افضل جھنجھانوی م ۱۶۲۵ء" (ص ۱۰۹)۔ میں علی گڑھ تاریخ کے لسانیاتی مقدمے کے سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ والہ داغستانی نے جس محمد افضل م ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) کا ذکر کیا ہے اس کے لیے یہ نہیں لکھا کہ وہ "بکٹ کہانی" کا مصنف تھا۔ وہ ایک دوسری شخصیت ہے۔ قدیم ترین سند کے مطابق "بکٹ کہانی" کے مصنف افضل کا نام گوپال تھا جس کا سنہ وفات معلوم نہیں۔

بہتر یہ ہوتا کہ ڈاکٹر ذوالفقار اردو زبان کے آغاز تک محدود رہتے اور اردو کے عہد بعہد

Scanned by CamScanner

نمونے نہ دیتے۔ یہ اگلے باب "اردو زبان و ادب کے ابتدائی نمونے" کے حصار میں آتے ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان ہے: "اردو زبان و ادب کے ابتدائی نمونے" جسے ڈاکٹر الف د نسیم نے لکھا ہے۔ اپنے مشمولات کے لحاظ سے اس باب کا عنوان "قدیم اردو ادب کی شعری اصناف" ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس میں تاریخی اعتبار سے نمونے دینے کے بجائے اصناف ہی کا بیان کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اصناف ادب کا مفصل بیان کیا ہے۔ تیسرے باب کو اسی میں سمویا جا سکتا تھا۔ بصورت دیگر اس باب میں اصناف سے قطع نظر محض ابتدائی نمونے دینے چاہیے تھے اور ان کے لیے آخری تاریخی حد مقرر کردی جاتی ۱۷۰۰ء یا ۱۵۰۰ء۔ فی الحال ڈاکٹر نسیم کی شرح کردہ اصناف کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

انھوں نے ملفوظ سے الگ ایک نثری صنف "قول" قائم کی ہے۔ ان کے نزدیک قول میں کوئی نہ کوئی بنیادی اصولی بات ہوتی ہے، ایسی بات جو پند و نصیحت اور راہبری اور راہنمائی کے طرز پر ہر دور اور ہر شخص کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہے، جب کہ ملفوظ پیر کی زبان سے نکلا ہوا کوئی عام فقرہ ہوتا ہے جس کی کوئی آفاقی اہمیت نہیں (ص ۱۱۹)

اول تو ملفوظے کو ایک صنفِ نثر کہنا ہی محلِ نظر ہے۔ ابتدائی صوفیاء کے متفرق اردو جملوں کا ایک زمرہ قائم بھی کرلیا جائے تو قول کو اس سے علاحدہ کرنا کارِ زائد ہے۔ کسی نے ایسا نہیں کیا۔ ایسے اقوال جن میں کہاوت کی سی آفاقی اور دوامی حقیقت ہو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے اضافی مدارج کی بنا پر قول کو ملفوظے سے الگ حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

اُنھوں نے ایک صنفِ رسالہ (ص ۱۲۱) اور دوسری صنفِ گفتار (ص ۱۲۲) قائم کی ہے۔ رسالے کے لیے لکھتے ہیں:

> "عربی میں مکتوب کو رسالہ بھی کہتے ہیں... اردو میں رسالہ مکتوب سے مختلف معنوں میں مستعمل ہے۔ یہاں رسالہ نثری کتابچہ کے مترادف ہے جس کا موضوع کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" (ص ۱۲۱)

اگر رسالہ موضوع کی تخصیص کے بغیر نثری کتابچہ ہوتا ہے تو نثر میں دو اصناف ۱۔ بڑی نثری کتاب ۲۔ رسالہ یعنی چھوٹی نثری کتاب، قرار دی ہوں گی۔ تسلیم کہ ہم سہولت کے لیے قدیم نثری کتابچوں کو رسالہ کہتے ہیں لیکن محض حجم کی بنا پر کتاب اور رسالے کی دو اصناف قرار دینا کوئی اصولی بات نہ ہوتی۔ فی زمانہ رسالہ کا اطلاق مقررہ مدت میں نکلنے والے جریدوں پر کیا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

گفتار: اسے انھوں نے ملفوظ کے مقابل رکھا، حالانکہ اسے رسالے سے ٹکرانا چاہیے تھا۔ گفتار اور ملفوظ میں وہ یہ فرق کرتے ہیں کہ ملفوظات صوفی کی زبانی باتیں ہیں جو کسی دوسرے نے قلم بند کر دیں، گفتار خود صاحب گفتار کی اپنی تحریر ہوتی ہے۔ ملفوظ اور قول عموماً ایک دو جملوں کا ہوتا ہے جب کہ صاحبِ گفتار اپنی بات کو پھیلا کر اور وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ دکنی زبان میں "گفتارِ شاہ امین"، "گفتارِ شاہ برہان الدین جانم" اور "گفتارِ ملک محمد" اس صنف کی چند مثالیں ہیں (ص ۱۳۲)۔

یہاں پھر ڈاکٹر نسیم سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بعض تحریروں میں ایک مشترک لفظ گفتار دیکھ کر مغالطے میں پڑ گئے ہیں۔ ان تینوں گفتاروں کی حقیقت دیکھیے۔ "گفتارِ شاہ امین" ایک نثری رسالہ ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> شاہ صاحب نے بعض رسالے نثر میں بھی لکھے ہیں۔ ایک چھوٹا سا رسالہ "گفتارِ حضرت شاہ امین" کے نام سے ملتا ہے۔

(رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۲۸ء۔ باز طباعت "قدیم اردو"، ص ۵۶)

ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی اسے رسالہ کہا ہے۔ "گفتارِ شاہ برہان" ایک دوسری صنفِ نظم "سی حرفی" ہے اور "گفتارِ ملک محمد" منظوم شہر آشوب ہے۔ ان تینوں میں کیا مشترک ہے۔ محض نام میں گفتار کا لفظ شامل کر دینے سے کسی تحریر کو امتیازی جداگانہ حیثیت نہیں مل جاتی۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ پھر رسالے اور گفتار کو کس صنف کے تحت رکھا جائے۔ میرے نزدیک ایک نثری صنف مقالہ قرار دینی چاہیے، جس کے مختلف موضوعی ذیلی گروہ ہو سکتے ہیں۔ مندرجۂ بالا رسالے اور نثری گفتار مذہبی یا عارفانہ مقالے ہیں۔ قدیم غیر افسانوی تحریروں کو ملفوظ اور مقالے کے دو زمروں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

نامہ کا لاحقہ رکھنے والی نظموں کو علاحدہ صنف یا زمرہ قرار دیا ہے (ص ۱۳۲)۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں علاحدہ گروہ قرار دیا جائے کہ نہیں، کیونکہ ان میں مختلف موضوعات کی نظمیں ملتی ہیں، جو عموماً مثنوی کی ہیئت میں ہوتی ہیں، مثلاً سماجی و اخلاقی، جیسے "سوری نامہ"، "سہاگن نامہ"، "چرخہ نامہ"، "چکی نامہ"۔ مذہبی، جیسے "مولود نامہ"، "نور نامہ"، "شمائل نامہ"، "وفات نامہ"، "درد نامہ"۔ تاریخ و سیاسی، جیسے "ظفر نامہ"، "فتح نامہ"، "جنگ نامہ"، "میزبانی نامہ"۔ ہمارے دور میں تو "نہرو نامہ"، "تحقیق نامہ"، "منظر نامہ"، "شہر نامہ" جیسے عنوان بھی ملتے ہیں۔ بہر حال دکنی ناموں کو ایک زمرہ مان سکتے ہیں کہ وہ مذہبی، اخلاقی یا عارفانہ نظمیں تھیں۔ اس بڑے زمرے کو صنف کہا جائے، اس میں کلام ہے۔ کم از کم "جنگ نامہ"، "ظفر نامہ"، "فتح نامہ" تو دوسرے رنگ کی رزمیہ نظمیں ہیں۔

Scanned by CamScanner

ص۲۵-۱۲۴ پر دوہا اور سورٹھ کا بیان کیا ہے۔ یہ دونوں ہندی کی عروضی بحر یا صنف ہیں۔ مضمون نگار ان کی فنی خصوصیت، یعنی مخصوص عروضی وزن سے واقف نہیں۔ دوہے میں دو مقفیٰ، مصرعے ہوتے ہیں۔ ہر مصرع کے دو اجزا ہوتے ہیں، پہلے جزو میں ۱۳ ماترا اور دوسرے جزو میں ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں۔ سورٹھ کا صحیح نام سورٹھا ہے۔ یہ وزن میں دوہے کا الٹا ہوتا ہے، یعنی اس کے ہر مصرع میں ۱۱ اور ۱۳ ماتراؤں کے دو جزو ہوتے ہیں۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ سورٹھ کا قافیہ درمیان میں ہوتا ہے (ص۱۲۴)، لیکن اس سے اہم یہ ہے کہ مصرعوں کے آخر میں قافیہ ضرور ہوتا ہے، درمیان میں ہو یا نہ ہو۔ اگر پہلے مصرع کے دو اجزا "الف" "ب" ہیں تو دوسرے مصرع کے بھی یوں ہی ہوں گے، یعنی دو مصرعوں کے چار اجزا میں پہلا اور تیسرا باہم مقفیٰ ہوں گے اور دوسرا اور چوتھا باہم۔ اردو میں سورٹھا نہیں ملتا۔ گنج شکر کا نمونہ مستند نہیں اور خانِ خاناں کا کلام ہندی ہے، اردو نہیں۔

ص۱۲۷ پر چوپائی کے بیان میں اس کی یہ اہم ترین خصوصیت نہیں لکھی کہ اس کے ہر مصرع میں ۱۶ ماترائیں ہوتی ہیں، یعنی یہ ہماری بحرِ متقارب یا متدارک جیسی ہوتی ہے۔ اسی صفحے پر سی حرفی کا ذکر ہے جس کے لیے لکھا ہے کہ:

> سی حرفی بھی چار مصرعی صورت میں ہوتی ہے۔

یہ صحیح نہیں۔ سی حرفی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر حرف ہجا کے بارے میں ایک مصرع یا ایک شعر یا اس سے کم و بیش لکھا جاتا ہے۔ اس کی ہیئت مقرر نہیں۔ یہ مثنوی بھی ہو سکتی ہے، مثلث، مربع، مخمس یا مسدس بھی۔ ص۱۲۹ پر جسن پد کا محض نام لیا ہے، اس کی تعریف نہیں دی۔ یہ بھی ہندی کا ایک عروضی وزن ہے، سنسکرت میں نہیں ملتا۔ اس میں ۲۶ ماترائیں ہوتی ہیں، ۱۶ ماتراؤں کے بعد وقفہ ہوتا ہے۔ آخر میں فع ضرور آنا چاہیے گویا اس کا وزن:

> فعلن فعلن فعلن فعلن ۔ فعلن فعلن فع

ہوتا ہے۔ جن گیتوں کے مصرع اس پد میں ہوں، انھیں جسن پد کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مثالیں شیخ بہاء الدین برناوی اور برکت اللہ پیمی مارہروی کے یہاں ملتی ہیں، لیکن یہ نمونے اردو کے بجائے ہندی کے معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر الف د نسیم نے دھرپد اور جسن پد کے بارے میں لکھا ہے:

> ان میں باطنی روح صوفیہ نے پھونکی ہے۔ گویا وہ انھیں کفر و شرک سے نکال کر اسلامی فضا میں لائے ہیں۔ (ص۱۲۹)

ایک ادبی کتاب میں اس طرح کا مناظراتی بیان افسوس ناک ہے۔ دھرپد اور جسن پد

Scanned by CamScanner

(صحیح نام وِشنو پد) خارجی ہیتیں ہیں، شاعر کی مرضی کہ وہ ان میں کون سا موضوع لاتا ہے۔ یہ اصناف یا اوزان اردو میں نہیں ملتے۔ ان کے جو نمونے ملتے ہیں انھیں اردو کے بجاے ہندی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ان کی فضا کسی طرح اسلامی نہیں۔ شبد، ساکھی اور شلوک (ص ۴۵-۱۴۴) کو بھی اردو کی صنف کہتے ہوئے قدرے تکلف ہوتا ہے۔ ان کے نمونے بھی دراصل ہندی ہیں، جنھیں بمشکل اردو کہا جائے گا۔ ص ۳۶-۱۳۵ پر "نکتہ" کا ذکر ہے جس کے ذیل میں "نکتۂ اول در مکاشفہ"، "نکتہ دوہا"، "عقدہ" وغیرہ کے عنوان ہیں۔ گجرات کی مشہور صنفِ جکری کے اجزا عقدہ، پَین ہوتے ہیں۔ شاہ علی محمد جیوگام دھنی نے جکری کو مکاشفہ کہا اور اس کے بندوں کو نکتہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب: "ادبی اصناف" (گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر، ۱۹۸۹ء)۔

ریختے کے نمونوں کو اردو فارسی مخلوط مصرعوں والی نظموں تک محدود رکھنا بہتر ہوتا، لیکن انھوں نے ایسی نظمیں بھی شامل کرلی ہیں جو محض اردو میں ہیں (ص ۴۲-۱۴۱)۔ اس میں شہباز حسینی کی غزل ع:

مُوں تو سمی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں

کو غلطی سے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیا ہے۔ ص ۱۴۲ پر بابا فرید شکر گنج کے جو ریختے دیے ہیں ان کا انتساب بھی نہایت مشکوک ہے۔

لکھتے ہیں:

جھولا جھولنے یا پینگیں بڑھانے کے سلسلے میں بھی اشعار کہے اور ان کا نام جھولنا رکھا۔ (ص ۱۴۴)

یہ سخت غلط فہمی ہے۔ اس نظم کا جھولے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہندی کی ایک عروضی ہئیت ہے۔ اس میں چار مصرع یعنی دو اشعار ہوتے ہیں۔ جھولنے کے ہر مصرع میں ۳۷ ماترائیں ہوتی ہیں۔ تفصیل دیکھیے میری کتاب "ادبی اصناف" کے صفحات ۸۷-۸۶ پر۔

مضمون نگار نے صحتِ انتساب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ص ۱۴۵ پر "معراج العاشقین" کو بندہ نواز سے منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ان سے کئی صدی بعد کی ہے۔ ص ۱۴۶ پر "شرحِ مرغوب القلوب" شاہ میراں جی شمس العشاق کو بخش دی ہے، حالانکہ وہ میراں جی خدانما کی ہے۔ ایک اقتباس کا ماخذ یوں ہے:

"شرحِ تمہیدِ ہمدانی" از سید میراں حسینی شاہ۔ (ص ۱۴۷)

Scanned by CamScanner

کتاب کا صحیح نام "شرحِ تمہیداتِ ہمدانی" اور مصنف کا
نام میراں جی حسین خدانما ہے۔

(جالبی، جلد اوّل، ص۹۸-۴۹۷)

اس باب کا عنوان "اردو زبان و ادب کے ابتدائی نمونے" مغالطہ خیز ہے۔ دراصل اس میں قدیم اصناف ہی کا تعارف ہے۔ جب نادرالوقوع اصناف کا ذکر ہی ٹھہرا تو اور کئی صنفوں کے نام لیے جا سکتے تھے، مثلاً حقیقت، سہیلا، کبت، گیت، شہادت نامہ وغیرہ۔

"مشائخ اور دوسرے مصنفین" کا بیان دو ابواب ۴ اور ۵ پر حاوی ہے۔ اسے بھی تیسرے باب والے ڈاکٹر الف د نسیم نے لکھا ہے۔ ادیبوں کا بیان مختلف علاقائی گروہوں کے تحت ہے۔ یہ گروہ ہیں:

چوتھا باب۔ (الف) سرحد، پنجاب، ملتان اور سندھ (ب) دہلی اور وسطِ ہند (ج) بنگال (د) بہار۔

پانچواں باب۔ (الف) گجرات، (ب) دکن۔

اس تقسیم سے تاریخی ترتیب بہت گڑبڑا گئی ہے۔ اٹھارویں صدی کے عطا اور فائز دہلوی سولھویں صدی کے قطب عالم، شاہ عالم اور شیخ باجن وغیرہ سے پہلے آ گئے ہیں۔ گجرات کے سترھویں صدی کے شعرا پہلے آ جاتے ہیں اور دکن کے چودھویں صدی کے شاہ راجو قتال ان کے بعد۔ علاقے اور صدی دونوں میں مفاہمت کر کے لکھا جاتا تو بہتر ہوتا، بہرحال! ذیل میں مشائخ کے بیانات میں جہاں مجھے شبہہ ہے، اس کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

چوتھا باب۔ مسعود سعد سلمان کو اردو مصنفین میں علاحدہ عنوان کے ساتھ جگہ نہیں دینی چاہیے تھی۔ لکھتے ہیں کہ خسرو نے "نُہ سپہر" میں لاہوری کا ایک الگ زبان کی حیثیت سے ذکر کیا۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے اسے لاہوری ہندی کہا ہے۔ مسعود سعد سلمان نے اس زبان میں دیوان مرتب کر لیا تھا تو کون سی تعجب کی بات ہے (ص۱۵۶)۔ جیسا کہ پیچھے لکھا گیا خسرو نے ہندوستان کی تمام زبانوں کو ہندوی (ہندی نہیں،) کہا ہے۔ لاہوری کے معنی پنجابی کے ہیں، اردو کے نہیں۔ مسعود سعد سلمان نے پنجابی میں دیوان مرتب کیا ہو گا، اردو میں نہیں۔ وہ بھی ناپید ہے۔

بابا فرید شکر گنج کی منظومات کے بیشتر نمونے مجہول الکلام بیاضوں سے لیے گئے ہیں اور ان کا انتساب شبہے سے خالی نہیں۔ مضمون نگار نے استفہام کی جگہ یقینِ کامل سے کام لیا ہے ؎:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے

Scanned by CamScanner

والے ریختے کو سلیمان ندوی اس لیے الحاقی مانتے تھے کہ مقطع میں شاعر کا نام شکر گنج آیا ہے اور حضرت خود کو شکر گنج نہیں کہہ سکتے تھے ("نقوشِ سلیمانی"، ۱۹۳۹ء، ص ۴۳) ع:

تن دھونے سے دل جو ہوتے پوک

کسی خام کار کے اشعار ہیں، جس نے پاک کو پوک باندھا ہے۔

ص ۱۶۳ پر حضرت سید محمد جون پوری سے دو اشعار منسوب کیے ہیں ع:

راول دیول کہیں نہ جائیں ... الخ

ان اشعار کو انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کی ایک بیاض میں بابا فرید سے منسوب کیا گیا ہے (جالبی، جلد ۱، ص ۶۱۲)۔ لاہور میں باجن کے کلام کا جو مجموعہ "گلستانِ رحمت" کے نام سے ہے اس میں ان اشعار کو باجن کا لکھا ہے ("مقالاتِ شیرانی"، جلد دوم، ص ۲۵۰) اور مہدوی روایات میں انھیں حضرت سید محمد جون پوری سے منسوب کیا گیا ہے ("مقالاتِ شیرانی"، دوم، ص ۲۵۰)۔ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس کے ہیں۔ ص ۱۶۴ پر محمد افضل جھنجھانوی م ۱۰۳۵ھ سے "بکٹ کہانی" منسوب کی ہے۔ میں علی گڑھ تاریخ کے لسانیاتی مقدمے کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ محمد افضل م ۱۰۳۵ھ فارسی کا شاعر تھا، "بکٹ کہانی" کا مصنف نہ تھا۔ آخرالذکر کا نام گوپال تھا، جس کا سنہ وفات معلوم نہیں۔

ص ۱۶۷ پر شیخ جنید کا ریختہ دیا ہے۔ اس کے مختلف انتسابات کے بارے میں علی گڑھ تاریخ میں نجیب اشرف ندوی کے مضمون پر تبصرہ کرتے وقت لکھ چکا ہوں۔ ص ۱۷۱ پر محبوب عالم عرف شیخ جیون، کا عنوان دے کر ان سے پانچ مثنویاں منسوب کی ہیں۔ انھوں نے کمال کیا ہے کہ ایک مثنوی "خواب نامۂ پیغمبر" کو توڑ کر دو مثنویاں "خواب نامہ"، "پیغمبر نامہ" بنادی ہیں۔ لاہور میں بیٹھ کر انھیں محمود شیرانی کے مضمون "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" ("اورینٹل کالج میگزین"، نومبر ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۲ء) سے واقفیت نہیں جس میں انھوں نے انکشاف کیا کہ شیخ جیون، محبوب عالم سے علاحدہ شخص ہے۔ محبوب عالم نے تین مثنویاں "محشر نامہ"، "مسائلِ ہندی"، "درد نامہ" لکھیں جب کہ "خواب نامۂ پیغمبر" اور "دہیز نامۂ بی بی فاطمہ" شاہ عبدالحکیم مہی کی تصنیف ہیں۔

ص ۱۷۳ کے حاشیے میں لکھا ہے:

ملمع اس نظم کو کہتے ہیں جس کا ایک مصرع عربی اور دوسرا ہندوی ہو یا نصف مصرع عربی اور نصف ہندوی ہو۔ یہ ریختہ سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ ریختہ میں ہندی فارسی کا عقد ہوتا ہے اور ملمع میں

Scanned by CamScanner

ہندوی عربی کا۔ لیکن کبھی ہندی فارسی آمیزش کے لیے بھی ملمع کی اصطلاح استعمال کر لیتے ہیں۔

یہ پوری طرح درست نہیں۔ "غیاث اللغات" اور "فرہنگِ آصفیہ" میں ملمع کے معنی ہیں: ایک مصرع یا ایک بیت عربی اور دوسرا مصرع یا بیت فارسی۔ لیکن "بحرالفصاحت" میں صنعتِ تلمیع کے معنی لکھے ہیں: کلام میں زبان ہائے مختلف کو جمع کرنا۔ وہ اردو، فارسی، عربی میں سے کچھ بھی ہوں۔ پھر انھوں نے ملمع کی کئی قسمیں درج کی ہیں (ص ۹۸۶)۔ میرا خیال ہے کہ فارسی میں عربی و فارسی کے امتزاج کو ملمع کہا گیا، اردو میں اردو و فارسی یا اردو و عربی دونوں کے امتزاج کو ملمع کہتے ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتی کو ایک علاحدہ عنوان کے تحت تفصیل سے لکھنے کا کوئی جواز نہیں، کیونکہ ان کا کوئی اردو شعر یا جملہ دستیاب نہیں۔ ص ۱۸۱ پر امیر خسرو سے منسوب پہیلیوں، چیستانوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کی صحتِ انتساب پر کوئی شک نہیں کیا۔ وہ خسرو کو اردو کا پہلا شاعر قرار دیتے ہیں (ص ۱۸۳)، لیکن ان کا کوئی ایک اردو شعر تو پیش کریں جو کسی مستند روایت پر مبنی ہوں۔ شیخ محمد غوث گوالیاری (ص ۱۸۷) اور عبدالرحیم خانِ خاناں (ص ۱۸۹) کو بھی اردو ادب کی تاریخ میں پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

ص ۱۹۱ پر لکھتے ہیں کہ چندر بھان برہمن نے اردو شعر گوئی کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ میں علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ ان کے دیوان میں محض ایک ریختہ غزل ملتی ہے اور وہ مشکوک ہے۔ مضمون نگار نے عہدِ جہاں گیر کے کسی شاعر پیارے لال شوخی کی ایک غزل دی ہے (ص ۱۹۱)۔ اس کی صاف زبان کے باوجود انھیں کوئی شک نہیں ہوا کہ یہ اس عہد کی ہو بھی سکتی ہے کہ نہیں۔ انھوں نے اسے "بحرالفصاحت" سے لیا ہے، "بحرالفصاحت" نے "خمخانۂ جاوید" سے لیکن "خمخانۂ جاوید" میں مجھے اس شاعر کا سراغ نہ مل سکا۔ بہرحال یہ عہدِ جہاں گیر کی نہیں ہو سکتی۔ ص ۱۱۹ پر مندرج بیدل کے فارسی اشعار بھی اپنی زبان کے پیشِ نظر مشکوک کے ضمن میں آتے ہیں۔

مشائخ کے دو ابواب میں بعض مشائخ کا تذکرہ پہلی بار کیا گیا ہے اور یہ قابلِ قدر ہے۔ ان میں ایک حضرت نور قطب عالم شیخ نورالحق پنڈوی ہیں (ص ۱۹۹)۔ چودھویں پندرھویں صدی کے اس شاعر کی زبان اسی عہد کی معلوم ہوتی ہے۔ ص ۲۰۱-۲۰۰ پر بہرام سقہ بخاری کے ریختے کا متن نہایت غلط دیا ہے۔ صحیح متن ملاحظہ ہو، ڈاکٹر امیر الحسن عابدی کے مضمون "عہد ہمایوں و اکبر کی دو اردو غزلیں" میں (رسالہ "تحریر"، شمارہ ۲، ۱۹۶۸ء، ص ۶-۲۰۵)۔ ڈاکٹر نسیم کا مطلع اور اس کے نیچے صحیح متن درجِ ذیل ہیں:

Scanned by CamScanner

مطبوعہ غلط متن: صحیح متن

مطبوعہ غلط متن	صحیح متن
بازہندو بچہ آہ دلم دھرتے ہیں	بازپندو بچہ قصدِ دلم دھرتی ہے
کچھ نہیں جانوں ازیں خستہ کیا کرتے ہیں	کوچھ ناہی جانوں ازیں خستہ کیا کرتی ہے

ص ۲-۲۰۱ پر ہندی کے مشہور شاعر قطبن کو اردو ادب کی تاریخ میں شامل کرنے کا جواز نہیں۔ کیا انھیں محض اس لیے لے لیا گیا کہ وہ مسلمان ہیں۔ ص ۲۰۴ پر مولانا مظفر بلخی م ۱۴۰۰ء کے دو دوہے دیے ہیں، ان کی زبان اُس قدیم عہد کی نہیں۔

ص ۲۰۶ پر عمادالدین پھلواروی کے رسالے "سیدھا راستہ" کے بارے میں قاضی عبدالودود کی رائے دیتے ہیں کہ یہ کتاب عماد کی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے باوجود وہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ ایک جعلی کتاب ہے جسے بیسویں صدی میں سجادہ نشینی کے ایک جھگڑے میں تمنا مجیبی پھلواروی نے وضع کیا۔

پانچویں باب میں ڈاکٹر نسیم نے گجرات اور دکن کے مشائخ پر لکھا ہے۔ شمالی ہند سے پہلے کے اردو ادب کا مرکزی علاقہ یہی ہے۔ ابتدا حضرت قطب عالم سے کی ہے۔ ان کا ایک ملفوظ یوں لکھا ہے:

چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی۔

(ص ۲۱۱)

یہاں قدیم زبان کو جدید بنادیا ہے۔ "اور اسے" کی جگہ ایک لفظ "آنے" ہے جس کے معنی "اور" ہیں۔ ملاحظہ ہو اسی کتاب میں ص ۹۱ پر ڈاکٹر ذوالفقار کا مضمون۔ ص ۲۱۴ پر باجن کی تاریخِ وفات ۱۵۰۶ء/۹۱۲ھ لکھی ہے۔ ظاہرا ہجری سنہ میں ۶ سہوِ طباعت ہے، ۲ کے لیے۔ صحیح تاریخِ وفات ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ/مارچ ۱۵۰۷ء ہے۔ باجن اور محمود دریائی کے کلام کا نہ کوئی نمونہ دیا ہے، نہ تنقید کی ہے، حالانکہ یہ تاریخِ ادب میں متوقع تھے۔

معلوم نہیں کیوں، محمود دریائی کے بعد دو سو سال کی چھلانگ لگا کر محمود بحری م ۱۷۱۸ء کا بیان کیا ہے اور ان کے بعد پیچھے لوٹ کر گام دھنی م ۱۵۶۵ء اور خوب محمد م ۱۶۱۴ء کا۔ بحری اور حسن شوقی دونوں کا تعلق بیجاپور سے تھا، سمجھ میں نہیں آتا ان دونوں کا ذکر گجرات کے تحت کیوں کیا گیا۔ گام دھنی اور خوب محمد چشتی دونوں کے محض تین تین شعر دیے ہیں، جن سے ان کے کلام کے تعارف کا حق ادا نہیں ہوتا۔ حسن شوقی کا تو ایک بھی شعر نہیں دیا۔

ص ۲۳۰ پر عنوان ہے: "گفتارِ ملکِ محمد۔" یہ موضوع دو صفحات پر ہے۔ اس کے

Scanned by CamScanner

بعد ص ۲۳۲ پر عنوان ہے: "شہر آشوب ملک محمد"۔ مضمون نگار کو جاننا چاہیے کہ یہ دونوں ایک ہی نظم ہیں۔ گفتار کا موضوع شہر آشوب ہی ہے۔ انھوں نے گفتار کا جو شعر درج کیا ہے وہ علی گڑھ تاریخ میں "شہر آشوب ملک محمد" کے تحت دیا ہے (ص۱۲۶)۔ گجرات کے مشائخ کے تحت بی بی خوند کاردی کا بھی ذکر ہے (ص ۴۳-۲۴۲)۔ یہ کیوں، جب یہ اردو کی ادیبہ ہیں ہی نہیں؟

گجرات کے بعد دکن کے صوفیہ کا ذکر ہے۔ ان میں سب سے پہلے سید محمد یوسف راجا ہیں۔ یہ اردو کے ادیب نہیں، اس لیے ان کا ذکر پس منظر کے تحت کیا جا سکتا تھا۔ علاحدہ عنوان دے کر نہیں۔ امیر حسن سجزی کا ذکر دکن کے مشائخ میں کیا ہے۔ یہ دہلوی تھے، گو بعد میں دولت آباد (مہاراشٹر) چلے گئے۔ اُن کا صحیح مقام مشائخ دکن کے تحت تھا۔ ان کے نام سے جو ریختہ ص ۲۴۹ پر دیا ہے اس کے دکنی عناصر شبہہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کا سنہ وفات سہو طباعت سے ۷۳-۱۳۳۵-۷/۳۸-۱۳۳۶ھ دیا ہے۔ ہجری سنہ ۳۸-۷۳۶ چاہیے، جمیل جالبی نے ان کا سنہ وفات ۷۳۸ھ/ ۱۳۳۷ء لکھا ہے۔

شیخ برہان الدین غریب اور حضرت زین الدین خلد آبادی اردو کے ادیب نہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر بھی بے موقع ہے۔ ڈاکٹر نسیم موقع بے موقع مذہبی چوٹ کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ ذکر ہے زین الدین خلد آبادی کا، لیکن ان کے بیان کے آخر میں لکھتے ہیں:

> اس عمل کو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور ان کے خلفا اور مریدین نے، جن کا دائرۂ اثر زمانی اور مکانی لحاظ سے دُور دُور تک پھیلا تھا، جاری رکھا اور اس طرح جنوبی ہند کی دراوڑ قومیں برہمنوں کی ساحری اور شمالی ہند کے آریاؤں کی جادوگری سے آہستہ آہستہ نکل کر اپنی خودی کا احساس اور اپنی عظمت کی پہچان کرنے لگیں۔
>
> (ص ۲۵۴)

مضمون نگار کو جاننا چاہیے کہ کرناٹک اور آندھرا کے مسلمان دراوڑی نسل سے نہیں، بلکہ شمالی ہند سے آئے ہوئے مسلمانوں کی اولاد ہیں۔ جنوبی ہند کی دراوڑ آبادی تقریباً تمام برہمنوں اور شمالی ہند کے آریاؤں کی ہم مذہب ہے۔

شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے محض ایک افسانہ ہیں، لیکن ڈاکٹر نسیم کو ان کے وجود پر کوئی شبہہ نہیں (ص ۲۵۲)۔ سید محمد عبداللہ حسینی کو تمام مؤرخین کے برخلاف "حسنی" لکھتے ہیں۔ ان کا ترجمہ "نشاط العشق" بھی مفقود ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ:

Scanned by CamScanner

محمد عبداللہ حسنی حضرت خواجہ بندہ نواز کے نبیرہ تھے۔

(ص ۲۵۴)

پھر کیا ستم ظریفی ہے کہ نبیرہ کا ذکر پہلے کرتے ہیں اور جد کا اُن کے فوراً بعد۔ ویسے یہ خواجہ کے نبیرہ نہیں تھے۔ صحیح رشتے کے لیے علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں میرا تبصرہ دیکھیے۔ ص ۲۵۵ پر خواجہ بندہ نواز کے کئی رسالوں کا نام لکھا ہے، جن میں "معراج العاشقین" کو بھی شامل کیا ہے۔ میں علی گڑھ تاریخ کے ضمن میں لکھ چکا ہوں کہ ان میں سے کوئی بھی بندہ نواز کا نہیں۔ محمد اکبر حسینی کے رسالے (ص ۲۶۰) کی حقیقت بھی علی گڑھ تاریخ میں سروری صاحب کے مضمون کے سلسلے میں زیرِ بحث آچکی ہے۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کو متوفی ۹۰۲ھ لکھا ہے (ص ۲۶۰)۔ ان سے کئی نثری رسالے منسوب کیے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں مفصل لکھ چکا ہوں کہ ۹۰۲ھ ان کا سنہ وفات نہیں، سنہ ولادت ہے۔ ص ۲۶۱ کی پہلی سطر میں ان کی ایک تصنیف کا نام "خوش نظر" چھپا ہے۔ صحیح "خوش نغز" ہے۔ ایک دوسری نظم کا نام "شہادت الحقیقت" بھی صحیح نہیں، کیونکہ خود مصنف نے "شہادت الحقیق" لکھا ہے۔ مضمون نگار نے نظم و نثر کی تصانیف کو ملا جلا کر لکھا ہے۔ میں علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ شمس العشاق سے کسی نثری رسالے کا انتساب درست نہیں۔

شاہ برہان الدین جانم کو متوفی ۹۹۰ھ لکھا ہے۔ حسینی شاہد کی تحقیق کے مطابق صحیح سنہ ۱۰۰۷ھ ہے۔ حامد حسن قادری کی سند پر ان کے ایک رسالے کا نام "بحرالحقائق" لکھا ہے (ص ۲۶۳)، حالانکہ قادری نے صحیح نام "کلمۃ الحقائق" دیا ہے۔ خود ڈاکٹر نسیم اگلے صفحے پر "کلمۃ الحقائق" کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک نثری رسالے کا نام "دکن میں اردو" کے حوالے سے "معروف القلوب" لکھا ہے (ص ۲۶۴)۔ "دکن میں اردو" میں اس کا صحیح نام "معرفت القلوب" دیا ہے۔ ناموں کی ان تحریفات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار ماخذ سے نقل کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ میں علی گڑھ تاریخ میں ڈاکٹر نذیر احمد کے مضمون کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ "معرفت القلوب" کا شاہ جانم سے انتساب درست نہیں۔ یہ میراں جی خدانما کی تصنیف ہے۔

ص ۲۶۶ پر فارسی کتاب "شمائل الاتقیا" کے مصنف کا نام برہان الدین غریب لکھا ہے۔ پیچھے ڈاکٹر ذوالفقار کے مضمون کے سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ فارسی کتاب کے مصنف شاہ برہان الدین غریب کے ایک مرید تھے۔ ص ۲۶۹ پر شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا سنہ وفات ۱۶۷۵ء/۱۰۸۶ھ دیا ہے۔ ان کے محقق ڈاکٹر حسینی شاہد کے مطابق

Scanned by CamScanner

۱۶۷۴ء/۱۰۸۵ھ ہے۔ ص۲۶۹ پر ان سے جو "نور نامہ"، "ذکر نامہ"، "وصیت نامہ"، "وصل نامہ"، "محبت نامہ"، "وجود نامہ" منسوب کیے ہیں، ان میں سے کوئی شاہ امین کا نہیں۔

ص۲۷۳-۲۷۵ پر شاہ صدرالدین م ۱۴۷۱ء/۸۷۶ھ کا بیان ہے، جن سے کئی کتابیں منسوب کی ہیں۔ مضمون نگار ان کتابوں کے مصنف کی تعیین اور اس کے زمانے کے بارے میں سخت غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابوں اور مضامین کے حوالے دیے ہیں، لیکن شاید انھیں توجہ سے پڑھ کر تجزیہ نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دو تین شاہ صدرالدین ہوئے ہیں، جن میں التباس ہوتا ہے۔ ان میں دو مشہور ہیں:

۱۔ حضرت صدرالدین م ۸۷۶ھ، ناسک کے باشندے۔ ان کی کوئی مشہور کتاب نہیں۔

۲۔ حضرت صدرالدین ابنِ سید عبدالقادر عرف شاہ میراں ولی، جو بارھویں صدی ہجری میں علاقہ میسور میں رہتے تھے اور جنھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں (۲)۔

سخاوت مرزا نے واضح کیا کہ "کسبِ محویت" اور "رموزالکاسبین" ایک ہی مثنوی کے دو نام ہیں۔ اس مثنوی میں ایک شعر کا مصرعِ اولیٰ ہے:

قُم باذنی کوئی انا مہدی کہے

یہ اشارہ حضرت سید محمد جون پوری (۸۴۷ھ تا ۹۱۰ھ) کی طرف ہے۔ یہ مثنوی بارھویں صدی ہجری کی ہے۔ مضمون نگار نے اپنی تحریر میں جتنی کتابوں کے نام لکھے ہیں، وہ اور ان کے علاوہ مزید کچھ اور بارھویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی کے شاہ صدرالدین کی ہیں، ناسک کے صدرالدین م ۸۷۶ھ کی نہیں (۳)۔ اس باب کا آخری شاعر شیخ آذری ہے (ص۲۷۸)۔ یہ اردو کے شاعر نہیں، پھر ان کا نام تاریخِ ادب میں کیوں شامل کیا گیا۔

ڈاکٹر الف د نسیم نے بڑی تلاش سے تخلیق کاروں کا انبار لگایا ہے اور ان میں بہت سے غیر معروف یا کم معروف، لیکن قابلِ ذکر، مصنفین بھی ہیں۔ ان کی تحریر کے چند پہلو محلِ نظر ہیں:

۱۔ انھوں نے بہت سے ایسے مشائخ کو علاحدہ عنوان کے تحت لیا ہے، جو اردو کے ادیب نہیں۔ یہ کتاب تاریخِ ادب ہے، تذکرۃ الاولیا نہیں۔

۲۔ انھوں نے صحت انتساب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ضعیف اور غیر مستند روایات کی تقلید میں مشائخ سے بارہا ایسی تخلیقات منسوب کر دی ہیں جو اُن کی نہیں۔

۳۔ ایک علاقے کے صوفیہ کو دوسرے علاقے میں رکھ دیا۔

Scanned by CamScanner

۴- زمانی ترتیب کی سختی سے پابندی نہیں کی۔

چھٹا باب "اصنافِ سخن" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا اثرِ خامہ ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا، اس فنی باب کو تاریخی ابواب کے درمیان میں نہیں لانا چاہیے تھا۔ انھوں نے ص ۲۸۹ پر ہندی کی جن مبینہ اصناف کا ذکر کیا ہے، ان میں سے کئی کا تلفظ غلط ہے۔ انھوں نے رومن رسم الخط میں پڑھا ہوگا، اس لیے صحیح گرفت نہ کر سکے، مثلاً نمبر ۳ "اتہاسا" کو "اتہاس" اور نمبر ۴ "کاویا" کو "کاویہ" لکھنا چاہیے (الف) کے تحت کچھ راگوں کے نام واضح نہیں، مثلاً "کھروا لمیریا"، "سادھرا" اور "سونٹھ"۔ "کھروا" بالیقین "کھروا" ہے، لیکن "ملیریا" کا ہے کی تخریب ہے، معلوم نہیں۔ "پر باتی واگ" "پر بھاتی راگ" ہونا چاہیے۔

(ب) کے تحت بہت سی ایسی اصناف کا نام لکھتے ہیں جو ہندی میں بھی معروف نہیں۔ ان میں سے بعض گیتوں کے لیے لکھتے ہیں:

> جن کا تعلق رام اور کِشن کی پوجا سے ہے اور جن میں ان ہی دونوں بھگتوں کی مدح میں گیت گائے جاتے ہیں۔ (ص ۲۸۹)

کِشن کا صحیح تلفظ اور املا "کرشن" بہ سکونِ شین ہے۔ بھگت کے معنی عقیدت مند یا پرستار کے ہیں۔ ہندو عقیدے میں رام اور کرشن بھگت نہیں، بھگوان ہیں۔ ان کے لیے "بھگتوں" کی جگہ مناسب لفظ "اوتاروں" ہونا چاہیے تھا۔ ص ۲۹۰ پر موسمی نظموں میں جھولنا کو بھی شامل کیا ہے۔ میں تیسرے باب کے سلسلے میں اس کی حقیقت بیان کر چکا ہوں۔ صنف جھولنا کا جھولے سے کوئی تعلق نہیں اور یہ موسمی نظم نہیں۔

حیرت ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث اردو کی اصناف کا شمار گارساں دتاسی کی "تاریخِ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی" جلد اوّل کے مقدمے کے حوالے سے کرتے ہیں، گو کہیں کہیں اس سے اختلاف کرتے ہیں (ص ۹۲-۲۹۱)۔ گارساں دتاسی سے استفادہ کر کے انھیں مناسب گروہ بندی کے ساتھ خود فہرستِ اصناف تیار کرنی چاہیے تھی۔ دتاسی نے متعدد ایسی چیزوں کو صنفِ ادب میں داخل کر دیا ہے جو نہیں ہیں۔ نمبر ۱ پر "بند" اور نمبر ۲ پر "بیت" کو درج کیا ہے۔ "بند" کے لیے پہلا جملہ ہے۔

> سات شعروں کے بند کو ہفت بند کہتے ہیں۔ (ص ۲۹۱)

گویا بسم اللہ ہی غلط ہو گئی ہے۔ مضمون نگار نے دتاسی کی اس تعریف پر اعتراض نہیں کیا، یعنی وہ اس کی تائید کرتے ہیں۔ ہفت بند اس ترکیب بند یا ترجیع بند کو کہتے ہیں جس میں سات بند ہوں۔ بند کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ فارسی میں "ہفت بندِ کاشی" سب سے زیادہ مشہور ہے۔

Scanned by CamScanner

میں زیادہ تفصیل میں نہ جا کر خلاصتاً یہ کہہ سکتا ہوں کہ دتاسی کی مندرجہ ذیل کی ہیئتیں صنف نہیں:

بند۔ بیت۔ قول۔ خیال۔ مدح۔ منقبت۔ مبارک باد۔ لغت۔ نبشین(؟)۔ نکتہ۔ سالگرہ۔ ساقی نامہ۔ سرود۔ شکار نامہ۔ ترانہ۔ تشبیب۔

نمبر۷ ہزلیات کے ہوتے نمبر۲۳ ریختیات غیر ضروری ہے۔ نمبر۵ چیستان اور نمبر۱۴ معما ایک ہی نہیں۔ نمبر۴ قول، نمبر۸ خیال، نمبر۲۸ سرود، نمبر۳۱ ترانہ موسیقی کے ذیل میں آتے ہیں، صنف ادب نہیں۔

نمبر۹ مدح، نمبر۱۰ منقبت، نمبر۱۵ مبارک باد، نمبر۱۹ لغت، نمبر۲۶ سالگرہ، نمبر۲۷ ساقی نامہ، نمبر۲۹ شکار نامہ موضوعات ہیں، آزاد اصناف نہیں۔ نمبر۳۸ جکری کے ہوتے نمبر۲۱ نکتہ غیر ضروری ہے، کیونکہ یہ جکری ہی کے دوسرے نام کا جزو ہے۔ نمبر۱۶ مقطعات اور نمبر۳۲ قطعہ ایک ہی چیز ہیں۔

اس خلفشار اور تکرار کو دیکھتے ہوئے مناسب ہوتا کہ ڈاکٹر ابواللیث دتاسی کے بیان کو پرکھتے اور خود سے اردو کی اصناف کا شمار اور گروہ بندی کرتے۔

انھوں نے ریختے پر تفصیل سے لکھا ہے، اس کی مختلف اقسام پر غور کیا ہے، لیکن بعد میں انھوں نے ان غزلوں پر بھی ریختے کا اطلاق کیا ہے جن میں بھاشا کی تقلید میں اظہار عشق عورت کی جانب سے ہے (ص۹۶-۲۹۴)۔ یہ ضرور ہے کہ اردو میں محض نظم یا اردو نظم کے معنی میں بھی ریختے کی اصطلاح کا استعمال کیا گیا:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں
(میر)

لیکن عورت کی طرف سے تخاطب کو بعض حضرات نے ریختی کہہ دیا۔ انھیں تخصیص سے ریختہ نہیں کہا جاتا۔ ڈاکٹر ابواللیث نے اصناف سخن پر بہت تحقیق کے بعد لکھا ہے، لیکن اس باب میں وہ جگہ جگہ موضوع سے ہٹ جاتے ہیں اور اصناف کی تعریف و تحدید تک محدود نہیں رہتے، مثلاً ص۲۹۵ سے ۳۱۵ تک غزل کے بارے میں جس پھیلے ہوئے انداز سے صفحات سیاہ کیے ہیں، وہ غیر ضروری تھا۔ اگر وہ اس تاریخِ ادب میں اس صنف کا ارتقا دکھانا چاہتے تھے تو اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی حق ادا نہ کر سکے۔

مثنوی پر لکھتے ہوئے دکن کی جملہ اہم مثنویوں کی فہرست دی ہے، لیکن یہ جامع نہیں۔ ارتقا دکھانا تھا تو بحث کر کے ان مثنویوں کا سنہ تصنیف اور شاعر کے علاقے کا بھی

Scanned by CamScanner

اظہار کیا ہوتا۔ اس کے بجائے صرف یہ بتایا ہے کہ یہ طبع زاد ہے یا فارسی سے ترجمہ۔ ابنِ نشاطی کی "پھول بن" کو فارسی "بساتین" سے ترجمہ لکھا (ص ۳۱۸)۔ اس کے نیچے طبیبی (کذا۔ صحیح: طبعی) کی "بہرام و گل اندام"، امین کی "قصۂ ابو شحمہ" اور فائز کی "رضوان شاہ و روح افزا" کو بھی فارسی "بساتین" کا ترجمہ لکھا ہے۔ یہ درست نہیں۔ ممکن ہے یہ سہو طباعت ہو۔ واضح ہو کہ "قصۂ ابو شحمہ" امین کی نہیں، "اولیا" کی مثنوی ہے۔

باب کے حصۂ "الف" میں انھوں نے غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، شہر آشوب اور ریختی پر لکھا۔ دوسرا حصہ (ب) "دیگر اصناف" بہت قابلِ قدر ہے۔ اس میں انھوں نے مشہور اصناف کے ساتھ بعض غیر مشہور یا ہندی سے در آمدہ اصناف کے بارے میں بھی لکھا ہے، مثلاً ثلاثی، چار در چار، جھولنہ، بارہ ماسہ، انمل، کبت، دوہرہ وغیرہ، لیکن یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان غیر روایتی اصناف کے بارے میں صاحبِ نظر کی طرح نہیں لکھا۔ ص ۳۴۵ کی ثلاثی محض مثلث ہے اور ص ۳۴۶ کی چار در چار مربع۔ مسمط کی قسموں کی بہت سی ذیلی ہیئتیں ہوتی ہیں۔ وہ "بحر الفصاحت" میں دیکھتے تو ان دونوں کی ایسی مثالیں مل جاتیں اور ثلاثی نیز چار در چار کی علاحدہ صنف قائم کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ ص ۳۵۰ پر لکھتے ہیں:

> عورتوں کے گیتوں ہی میں ایک گیت جھولنہ یا لوری ہے۔ لوری کی مثالیں دنیا کی مختلف زبانوں میں ملتی ہیں، جھولنہ بھی اس قبیل کی نظم ہے۔ (ص ۳۵۰)

میری رائے میں "جھولنہ" کا "لوری" سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے گیت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر ابواللیث نے اس کے بارے میں یہ اصولی بات نہیں لکھی کہ اس کے ہر مصرع میں ۳۷ ماترائیں ہوتی ہیں، یعنی یہ ہندی کی ایک عروضی صنف ہے۔ یہ بات قابلِ قدر ہے کہ ابواللیث نے ہندی سے لی ہوئی مختلف اصناف کو اردو میں قبول کیا۔ انمل کا اردو میں ایک ہی نمونہ ملتا ہے جسے خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی صاف زبان کے پیشِ نظر اسے خسرو کا نہیں مانا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ اس ایک لطیفے کی بنا پر ایک نئی صنف نہیں قائم کی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسے ایک صنفِ معنوی کہہ سکتے ہیں۔

کبت کا ذکر ص ۵۴-۳۵۳ پر ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث اس کی عروضی خصوصیت سے واقف نہیں کہ اس کے ہر مصرع میں ۳۱ اکشر ہوتے ہیں، وہ طویل ہوں یا خفیف۔ یہ محض چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ مضمون نگار ص ۳۵۴ پر چار مصرعوں کا ایک کبت دے کر لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

یہ ایک مکمل بند ہے اور ایک کبت میں اس طرح کے کئی بند ہوتے
ہیں۔
(ص ۳۵۴)

یہ صحیح نہیں۔ کبت میں کئی بند نہیں ہوتے۔ اگلی صنف کا نام انھوں نے "دہرہ" لکھا ہے۔ ہندی میں اسے دوہا کہتے ہیں۔ معلوم نہیں اہلِ اردو پر کیا کشف ہوا ہے کہ وہ اسے "دوہرہ" کہتے ہیں۔ ابواللیث نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی۔ یہ نہیں بتایا کہ یہ دو مصرعوں کا ایک شعر ہوتا ہے، ہر مصرع کے دو جزو ہوتے ہیں جن میں ۱۳+۱۱ ماتراؤں کے حساب سے ایک مصرع میں ۲۴ ماترائیں ہوتی ہیں۔ دونوں مصرع مقفیٰ ہوتے ہیں۔

ص ۳۵۸ پر "معراج العاشقین" کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا ہے۔ شاید حفیظ قتیل کی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" (۱۹۶۸ء) ان کے مطالعے سے نہ گزری ہو۔

بعض ہندی اصناف کا بیان ڈاکٹر الف د نسیم نے تیسرے باب میں کیا ہے، بعض کا ڈاکٹر ابواللیث نے چھٹے باب میں۔ کتاب کا خاکہ بنانے والوں نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ اصناف کے بیان کو ایک باب میں ہونا چاہیے تھا اور یہ باب کتاب کے آخر میں ہوتا تو بہتر تھا۔ شاذالوقوع غیرروایتی اصناف کو متعارف کرنا بڑی بات ہے لیکن ان کی فنی خصوصیات کو صحت کے ساتھ افشا نہ کرنا ایک ستم ہے۔ میں نے اپنی کتاب ادبی اصناف (گجرات اردو اکادمی ۱۹۸۹ء) میں جملہ اصناف کا احاطہ کیا ہے۔

ساتویں باب کا عنوان "دکنی اور گجراتی ادب" ہے جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے۔ مشائخ کے سلسلے میں ڈاکٹر الف د نسیم نے بھی گجرات ودکن کے مشائخ پر لکھا۔ آٹھویں تا دسویں باب میں بھی گولکنڈہ، بیجاپور اور گجرات کے ادب پر لکھا گیا ہے۔ پھر ان مختلف ابواب کی امتیازی حدود کیا ہیں یا کیا ہونی چاہییں، ان پر کتاب کا خاکہ بنانے والوں نے غور نہیں کیا۔

جمیل جالبی کا یہ باب اس کتاب میں بہترین معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلا ہے جسے اپنے موضوع پر پورا عبور ہے اور جو ایک صاحبِ نظر کی طرح پورے اعتماد سے لکھتا ہے۔ اس میں وہ بکھرا اکھڑا انداز کہیں نہیں جو بعض دوسرے ابواب کے حصوں میں دکھائی دیتا ہے۔ جالبی نے ص ۳۶۰-۶۷ پر سیاسی اور ذہنی پس منظر بہت خوبی سے لکھا ہے۔ اس کے بعد گجراتی کے ابتدائی نمونوں اور ادیبوں کا بیان ہے۔ میں ص ۳۶۷ کے عنوان کو "گجراتی ادب" کے بجائے "گجری ادب" پسند کرتا۔ گجراتی ایک علاحدہ، قائم بالذات ترقی یافتہ زبان ہے، گجری سے مراد علاقہ گجرات کی ہندوستانی بولی ہے۔ گجری ادیبوں میں جالبی نے شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی جیو گام دھنی اور خوب محمد چشتی کا ذکر کیا

Scanned by CamScanner

ہے۔ ان پر الف د لسیم بھی لکھ چکے ہیں۔ اس تکرار سے خاکہ بنانے والوں کا ذہنی خلفشار نمایاں ہوتا ہے۔

دکنی ادب میں انھوں نے ایک جان کار محقق کی طرح گنج العلم کے رسالوں، خواجہ بندہ نواز سے "معراج العاشقین" اور دوسرے رسالوں کے انتساب نیز سید اکبر حسینی کے رسالے کو رد کیا۔

انھوں نے "واحد باری" کو اشرف بیابانی سے منسوب کر کے ٹھوکر کھائی ہے (ص۸۵-۳۸۲)۔ نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں اس کا نسخہ دیکھ کر انکشاف کیا کہ یہ دورِ آصفیہ کے نظام سکندر جاہ (متوفی ۱۸۲۹ء) کے عہد کے ایک اشرف کی تصنیف ہے (فہرست، ص۳۵۵)۔ یہ شخص بریلی سے حیدر آباد آیا تھا۔

جالبی نے ص ۳۸۳ پر نظامی کی ایک دوسری مثنوی "خوف نامہ" کا ذکر کیا ہے اور نمونے کے تین شعر بھی دیے ہیں لیکن اپنی تاریخِ ادب میں اس کی صاف زبان کو دیکھ کر اسے گیارھویں صدی ہجری کے آخر کا قرار دیتے ہیں جس کا مصنف کوئی اور نظامی ہے (جلد اول، ص۱۶۶ حاشیہ)۔

ص۳۸۶ پر ضمناً اور ص۳۹۷ پر تفصیل سے "شرحِ مرغوب القلوب" کو میراں جی شمس العشاق سے منسوب کیا ہے، لیکن یہ میراں جی خدا نُما کی تصنیف ہے۔ سب سے پہلے شمس اللہ قادری نے اسے خدا نُما کی قرار دیا۔ جالبی نے ص ۳۹۳ پر ملک خوشنود کی لکھی ہوئی ہارون نامی ایک گھوڑے کی ہجو کے دو اشعار لکھے ہیں۔ یہ انکشاف دلچسپ ہے۔ ملک خوشنود نے سودا کی ہجو "تضحیک روزگار" پر سبقت کی۔ خلاصۂ کلام کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جمیل جالبی نے جس طرح گجری و دکنی ادب کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اس سے اس ادب کی تفہیم میں روشنی ہی روشنی ملتی ہے۔ کاش انھوں نے کچھ اور ابواب لکھے ہوتے۔ لیکن بعد میں انھوں نے تو ادب کی پوری تاریخ ہی لکھنے کا بیڑا اٹھالیا۔

آٹھواں باب ادبیات گولکنڈہ خواجہ حمید الدین شاہد نے باشتراک تبسم کاشمیری لکھا ہے۔ شاہد ڈاکٹر زور کے رفیقِ کار رہ چکے ہیں اور گولکنڈہ سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں، تبسم کاشمیری کو اس موضوع سے کیا تعلق ہے۔ نواں باب ادبیاتِ بیجاپور تنہا حمید الدین شاہد نے لکھا ہے۔ چونکہ وہ خود دکنی ہیں اور عُمر کا بڑا حصہ حیدر آباد میں ڈاکٹر زور کی نگاہوں کے تلے گزار چکے ہیں، اس لیے ان ابواب کو وہ ایک واقف کار کی طرح لکھتے ہیں۔

اول آٹھویں باب گولکنڈہ کے بارے میں چند مشاہدات:

انھوں نے باب کے شروع میں آٹھ صفحوں پر معاشرتی اور ادبی پس منظر دیا ہے جو

Scanned by CamScanner

بہت برمحل اور بامعنی ہے۔ اس کے اور نویں باب کے پس منظر نے کتاب کے دوسرے باب کے بیان کو حشو کر دیا ہے۔ اس میں وہ ص۴۰۷ پر محمد قلی قطب شاہ کا زمانۂ حیات ۱۵۱۰ء تا ۱۶۱۱ء لکھ گئے ہیں، گویا قلی ۱۰۱ برس کے ہوئے۔ ص۴۱۲ پر ۱۵۶۵ء/۱۴۱ رمضان ۹۷۳ھ کو سنہ پیدائش لکھا ہے۔ یہ ہجری تاریخ صحیح ہے، لیکن اس کے مطابق ۱۵۶۶ء آتا ہے۔ قلی کی وفات ص۴۰۷ کے علاوہ ص۴۱۶ پر بھی ۱۶۱۱ء میں لکھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے محمد قلی کا عرصۂ حیات ۴ اپریل ۱۵۶۶ء تا ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء لکھا ہے جو صحیح ہے ("معانیِ سخن"، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء، ص۱۹)۔

چونکہ گولکنڈہ میں شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لیے خواجہ حمید الدین اُنھیں مختصراً لکھنے پر مجبور ہوئے۔ بڑے شاعروں کو بھی دو تین صفحوں سے زیادہ نہ دے سکے، کیونکہ محدود اوراق کی تحریر رہی ہوگی۔ بہر حال انھوں نے اپنی تنگ دامنی کے باوجود تمام ضروری باتیں لکھ دی ہیں۔

مضمون نگار ابنِ نشاطی کی "پھول بن" کے سلسلے میں شاعر کا صحیح نام درج کرتے ہیں اور مختلف نسخوں میں مصرعِ تاریخ کو دیکھ کر ۱۰۶۷ھ طے کرتے ہیں۔ انھوں نے "پھول بن" جیسی اہم مثنوی کے بارے میں تنقید کا ایک جملہ بھی نہیں لکھا۔ ابنِ نشاطی کو صرف ایک صفحہ دینا اس کے ساتھ زیادتی ہے۔

میراں جی خدا نُما کی تصانیف دوسروں سے منسوب ہوتی آئی ہیں، جیسا کہ خود اس تاریخ میں بارہا دوسرے مضمون نگاروں نے کیا ہے۔ خواجہ شاہد نے ترجمۂ "شرحِ تمہیداتِ عین القضاۃ" اور "شرحِ مرغوب القلوب" دونوں کو میراں جی خدا نُما کی تصانیف قرار دے کر ان کے ساتھ انصاف کیا (ص۴۲۹-۴۲۸)۔ ان کے تیسرے رسالے کا نام خواجہ حمید نے "وجودیہ" لکھا ہے (ص۴۲۹)، لیکن جالبی نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور اس کا نام "چہار وجود" لکھا ہے (جلد ۱، ص۲۹۸-۲۹۷)۔

خواجہ حمید الدین نے ص۴۳۸ پر مثنوی "سہاگن نامہ" کو شاہ راجو ثانی سے منسوب کر کے پھر انصاف کا حق ادا کیا، کیونکہ بہت سے مؤرخ اسے شاہ راجو قتال اوّل کی تصنیف قرار دیتے رہے ہیں۔ ص۴۳۹ پر فتاحی جیسے غیر معروف لیکن چار مثنویوں کے مصنف کے بارے میں خوب لکھا ہے۔ غرض یہ ہے کہ شاہد نے اختصار کے باوجود تحقیق کی داد دی ہے اور تسامحات کا ارتکاب کم سے کم کیا ہے۔

نواں باب ادبیاتِ بیجاپور خواجہ حمید الدین شاہد نے بلا شرکت غیرے لکھا ہے۔ اس کی ابتدا میں سات صفحوں کا سیر حاصل سیاسی، معاشرتی اور ادبی پس منظر ہے اور اس کے بعد

مختصراً ادیبوں کا تعارف ہے۔ ہجری سنہ کے متوازی ایک عیسوی سنہ لکھنے کی وجہ سے یہاں بھی کہیں کہیں عیسوی سنہ میں ایک کی غلطی ہو گئی ہے، مثلاً لکھتے ہیں اسماعیل عادل شاہ کے انتقال کے بعد ۱۵۳۴ء/۹۴۱ھ میں اس کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ حکمراں ہوا (ص ۴۴۲)۔ سچ یہ ہے کہ اسماعیل کے بعد اس کا بڑا بیٹا ملو عادل شاہ تخت نشین ہوا، لیکن نااہلی کی وجہ سے اسے چھ مہینے کے بعد ہی تخت چھوڑنا پڑا اور پھر اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم عادل شاہ حکمراں ہوا۔ اس وقت ہجری سنہ ۹۴۱ ہی تھا، لیکن عیسوی سنہ بڑھ کر ۱۵۳۵ء ہو گیا تھا۔

اشرف بیابانی کا سنہ ولادت ۱۴۵۹ء، ۲۱ ذی قعدہ ۸۶۴ھ لکھا ہے۔ اگر خواجہ صاحب تقویم دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ ہجری تاریخ ۱۴۶۰ء میں پڑتی ہے۔ ص ۴۵۲ پر ڈاکٹر زور کی تقلید میں اشرف سے "واحد باری" بھی منسوب کر دی ہے، حالانکہ خود لکھتے ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی کے خیال میں یہ کسی اور اشرف کی ہے (ص ۵۳-۴۵۲)۔ کیا انھوں نے ہاشمی کی فہرستِ سالار جنگ میں "واحد باری" کے وہ اشعار نہیں پڑھے جن میں اشرف نے خود کو نظام سکندر جاہ کے عہد میں دکھایا ہے۔

ص ۴۵۴ پر "ابراہیم نامہ" کے مصنف عبدل کا نام عبدالغنی یا عبدالقادر لکھا ہے۔ معلوم نہیں، "عبدالقادر" کہاں سے ملا۔ "ابراہیم نامہ" کے مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا یہ خیال صحیح ہے کہ اس کا نام محض عبدل تھا جو عبداللہ کا مخفف ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد نے ص ۴۵۴ پر "ابراہیم نامہ" کی تاریخ ۱۰۱۲ھ لکھی ہے۔ مثنوی میں اسے سنہ شہور لکھا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی رائے ہے کہ یہ سنہ ہجری سے مختلف ہے اور ۱۰۱۲ شہور مطابق ہے ۲۱-۱۰۲۰ھ کے ("ابراہیم نامہ" مشمولہ "قدیم اردو"، جلد سوم، ۱۹۶۹ء، مقدمہ)۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب "نورس" کی تصنیف کی آخری ۱۵۰۳ء/۱۰۱۲ھ لکھی ہے (ص ۴۵۵)۔ ۱۵۰۳ء سہو ہے، یہاں ۱۶۰۳ء ہونا چاہیے۔ مقالہ نگار نے یہ اچھا کیا کہ شہباز حسینی کا الگ ذکر کر کے ع:

تُوں تو صحی ہے لشکری...

والی غزل کو ان کے حوالے کر دیا (ص ۴۵۶)۔ دوسرے تو اسے خواجہ بندہ نواز کی جھولی میں ڈالنے پر مُصر تھے۔ ان کے بعد فارسی شاعر آتشی کا ذکر خواہ مخواہ کیا۔ اگر انھوں نے "چندر بدن و مہیار" کو فارسی میں ترجمہ کیا تو بھی وہ اردو کے شاعر تو نہیں کہلا سکتے۔ ص ۴۵۷ پر اردو مثنوی "چندر بدن و مہیار" کے مصنف کو فارسی شاعر مرزا محمد مقیم مقیمی استر آبادی کہا ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے بعد میں واضح کیا کہ اردو مثنوی کا مصنف مقیمی ایک شخص ہے اور فارسی کا شاعر مرزا محمد مقیم اس سے مختلف ہے (جلد ۱، ص ۳۸-۲۳۵)۔ خواجہ حمید الدین

Scanned by CamScanner

نے ص۳۵۹ پر مقیمی کی ایک اور مثنوی "سوہار" کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں اسپر نگر اور شمس اللہ قادری نے لکھا، لیکن عام طور پر اردو کی تاریخیں خاموش ہیں۔

ص۳۶۴ پر ڈاکٹر زور کی تقلید میں ملک خوشنود کی ایک مثنوی "بازار حسن" کا ذکر کرتے ہیں۔ عبدالقیوم کی مرتبہ تاریخ میں سخاوت مرزا نے واضح کیا کہ یہ ملک خوشنود کی مثنوی "جنت سنگھار" ہی ہے اور "ہشت بہشت" کا صحیح نام "جنت سنگھار" ہے (قیوم کی تاریخ، ص۳۸۶)۔ یہی بات جمیل جالبی نے لکھی ہے (جلد۱، ص۵۳۔ ۲۵۲)۔ سخاوت مرزا کی صراحت سے قبل ہی ڈاکٹر زور اگر مینئہ "بازار حسن" کے اشعار کو توجہ سے دیکھ لیتے تو معلوم ہوجاتا کہ یہ "ہشت بہشت" ہی ہے۔ شاہد نے ص۴۶۷ پر "خاور نامہ" کی تاریخ تکمیل ۱۰۵۹ھ دی ہے۔ جمیل جالبی نے مطبوعہ نسخے کو دیکھ کر ۱۰۵۰ھ لکھی ہے اور یہ صحیح ہونی چاہیے (جالبی، ص۲۶۵)۔ ص۴۸۶ پر شاہ معظم کی مثنوی "معراج نامہ" کی تاریخ ۱۰۸۰ھ ذیل کے شعر سے ماخوذ کی ہے:

یہ نامہ جہاں میں ہوا جب تمام
اگیارہ صدی میں اتھے بہت کام

"بہت" تحریب ہے "بیست" کی۔ کام کو "کم" کے معنی میں لیا ہے جو عجیب ہے۔ جامع مسجد بمبئی کے مخطوطے میں شعر کا متن یہ ہے:

یو نامہ جہاں میں ہوا جب ختم
اگیارہ صدی میں اتھے بیست کم

(حامد اللہ ندوی: "کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات"، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۱۷۳)

شاہ معظم کے محقق ڈاکٹر حسینی شاہد نے دوسرے مصرع میں "بیست" کی جگہ "تیس" لکھا ہے اور اس طرح نظم کی تاریخ ۱۰۷۰ھ مانی ہے ("شاہ معظم"، حیدر آباد، ۱۹۷۸ء، ص۶۴)۔ حمید الدین شاہد نے معظم کی ایک مثنوی کا نام "گنج مخفی" لکھا ہے۔ حسینی شاہد کے مطابق دراصل یہ مثنوی "آزادنامہ" ہے (ایضاً، ص۱۱۶)۔ معظم کے "معراج نامہ" کے بعد انھوں نے مختار کے "معراج نامہ" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار چھپی ہے (ص۴۸۷، متن کی آخری سطر)۔ صحیح ۳ ہزار ہے۔ مضمون نگار نے مختار کے مشہور "مولودنامہ" کا ذکر نہیں کیا۔

ادبیات گولکنڈہ والے باب کی طرح یہ باب بھی بہت جامع ہے۔ اس میں مضمون نگار نے بڑی تلاش و تدقیق سے جملہ قابل ذکر شعرا کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تنقید کی طرف توجہ کم کی ہے لیکن تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔

Scanned by CamScanner

دسواں باب ادبیات گجرات سخاوت مرزا نے باشتراک مشفق خواجہ لکھا ہے۔ یہ واضح نہیں کہ اس میں دونوں کا کتنا کتنا ہاتھ ہے۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے گجرات کو گولکنڈہ و بیجاپور سے پہلے رکھنا چاہیے تھا۔ اس باب کی ابتدا میں بھی سات صفحوں کا پس منظر ہے جو اس سے پیش تر کے دو بابوں کے پس منظر کی طرح مفید ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

ناگ بھٹ دوم کا پوتا راجا بھوج پرتی ہار راجاؤں میں بہت مشہور ہے۔
وہ قنوج میں ۱۸۳۶ء میں تخت نشین ہوا ... اس کا نام عوامی قصے کہانیوں میں داخل ہو گیا۔ (ص ۴۹۴)

میرا خیال ہے کہ "پرتی ہار" دراصل "پریہار" ہے۔ ۱۸۳۶ء سہوِ طباعت ہے۔ اس کا پوتا ۹۱۴ء میں تخت نشین ہوتا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ۱۸۳۶ء دراصل ۸۳۶ء ہو گا۔ عوامی قصے کہانیوں والا، یعنی "سنگھاسن بتیسی" کا راجا بھوج مختلف شخص ہے۔ ڈاکٹر پرکاش مونس آخرالذکر، دھار کے راجا بھوج کا عہد ۱۰۱۸ء تا ۱۰۵۵ء لکھتے ہیں (۴)۔ سخاوت مرزا نے ص ۴۹۹ پر شاہ علی جیو گام دھنی کو مصنفِ "جواہر الاسار" لکھا ہے۔ گام دھنی کے دیوان کا صحیح نام "جواہرِ اسرار اللہ" ہے، "جواہر الاسار" نہیں۔ اسی صفحے پر لکھتے ہیں:

ولی گجراتی الاصل، اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔

(ص ۴۹۹)

حیرت ہے کہ مضمون نگار ابھی تک "آبِ حیات" سے آگے نہیں نکلے۔ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہے۔ اس کے علاوہ کتنے ہی دکنی شعرا کے دیوان اور کلیات چھپ چکے ہیں، مثلاً حسن شوقی، نصرتی، ہاشمی، غواصی، عبداللہ قطب شاہ وغیرہ۔

پس منظر کے بعد باب کا متن "شعرا کا تفصیلی بیان" کے عنوان کے تحت ہے۔ یہ تفصیلی نہیں، کیونکہ صفحات کی تحدید ہو گی۔ اس میں پہلا شاعر امین گجراتی ہے۔ اس کی تین مثنویوں کے نام "تولد نامہ"، "معراج نامہ"، "وفات نامہ" دیے ہیں (ص ۵۰۱)۔ جمیل جالبی کے مطابق یہ ایک ہی نظم "تولد نامہ" کے تین حصے ہیں (جلد ۱، ص ۱۴۲) لیکن ظہیر الدین مدنی نے بھی انھیں تین مختلف نظمیں مانا ہے جو ایک ہی سلسلے میں ہیں ("گجری مثنویاں"، گجرات اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۵-۳۳)۔ مضمون نگار نے "معراج نامہ" کو نایاب کہا ہے، لیکن جالبی اور مدنی کے مطابق یہ بھی موجود ہے۔

مضمون نگار نے خروشی گجراتی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا ذکر کسی تاریخ یا تذکرے میں نہیں آیا (ص ۵۰۳)۔ یہ بڑی حد تک درست ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کی ضخیم تاریخ "دکن میں اردو" اور جمیل جالبی کی تاریخ میں اس کا نام نہیں، لیکن عبدالقیوم کی مرتبہ

Scanned by CamScanner

"تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل ۱۹۶۱ء اور "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو" ۱۹۶۲ء میں ہے (علی گڑھ ص ۶۱-۴۶۰)۔ ان دونوں میں موجودہ تاریخ کی طرح سخاوت مرزا ہی نے لکھا ہے۔ زیرِ نظر تاریخ میں اس کا حال زیادہ مفصّل ہے اور بہت خوب ہے۔ اسی طرح ثنا، اشرف، احمد گجراتی، قادر، ہاشم علی، علامی اور رضا گجراتی پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔

معلوم نہیں، مضمون نگاروں کو اس باب کی دونوں زمانی حدیں کیا دی گئی تھیں لیکن اُنھوں نے جس مختصر دور پر لکھا ہے اسے بہت تشفی آمیز طریقے سے لکھا ہے۔

گیارہواں باب "ولی اور اس کے معاصرین" ہے جس کے تین حصے ہیں۔ ولی پر ڈاکٹر محمد صادق نے لکھا ہے، ولی کے دکنی معاصر شعرا پر سخاوت مرزا نے باشتراکِ فیضانِ دانش اور ولی کے غیر دکنی معاصر شعرا پر تنہا فیضانِ دانش نے لکھا ہے۔ ولی کا سیاسی اور معاشرتی پس منظر دیتے ہوئے مضمون نگار نے "ڈاکٹر چاند مرحوم" کا ایک طویل اقتباس دیا ہے (ص ۵۲۷)۔ واضح ہو کہ شیخ چاند ڈاکٹر نہیں تھے۔ انھوں نے سودا پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس کے جلد بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ مقالے پر ڈگری نہیں ملی۔ شاید یہ ڈگری کے لیے تھا ہی نہیں۔

مضمون نگار ڈاکٹر صادق نے ولی پر اختلافی بیانات کا بڑی ژرف نگاہی سے تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے خاص طور سے اس خیال کو رد کیا کہ ولی کا جدید زبان کا کلام اس کے سفرِ دہلی کے بعد کا ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہاں جانے سے پہلے ہی ان کے کلام میں غیر دکنی رنگ آ چکا تھا (ص ۵۳۱)۔ انھوں نے ولی کی زبان کے مجموعی رنگ پر کئی صفحوں میں اچھی بحث کی ہے۔ ولی پر ص ۵۲۸ سے ۵۵۲ تک لکھا ہے۔ اس جلد میں کسی اور شاعر کو اس سے آدھے صفحے بھی نہیں دیے گئے۔ اتفاق سے علی گڑھ تاریخ میں بھی ولی نے سب سے زیادہ، بہت زیادہ صفحات پر قبضہ کیا ہے۔

دوسرا عنوان "ولی کے معاصر شعرا (دکن)" کا ہے۔ ان میں سب سے پہلے عاجز کا ذکر ہے جس کی دو مثنویوں "قصۂ فیروز شاہ" اور "قصۂ ملکہ" کا نام لیا ہے۔ دونوں کو ۱۶۸۸ء/۱۱۰۰ھ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ اس کا نام سیّد محمد یا سیّد محمد علی لکھا ہے (ص ۵۵۳)۔ جمیلی نے اپنی تاریخِ ادب میں اس کو محمد علی عاجز لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بیلی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تصحیح کی کہ شاعر کا تخلص عاجز نہیں۔ ابتدائی اشعار میں اس نے اپنے لیے لفظی معنی میں عاجز استعمال کیا ہے۔ خود اپنی تصنیف میں اس نے اپنا نام اور تخلص محمود لکھا ہے ("تنقیداتِ عبدالحق"، طبعِ اوّل، ص ۱۵۶)۔ بعد میں ڈاکٹر غلام عمر خاں بھی مختلف مخطوطات کا بہ نظرِ غائر جائزہ لے کر اسی نتیجے پر پہنچے۔ انھوں نے یہ بھی واضح

Scanned by CamScanner

کیا کہ "قصۂ فیروز شاہ"، "قصۂ ملکۂ مصر" وغیرہ ایک ہی مثنوی کے نام ہیں۔ صحیح نام "قصۂ ملکۂ مصر" ہے ("مقدمہ لیلیٰ مجنوں" از عاجز، حیدر آباد، ۱۹۶۷ء، ص ۶-۵)

ص ۵۵۶ پر ضعیفی کی ایک مثنوی کا نام "نصیحت مدن" دیا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے "فہرستِ مخطوطاتِ آصفیہ" جلد دوم ص ۱۵۴، نیز "دکن میں اردو" ص ۳۱۰ پر اس کا نام "نصیحتِ بدن" لکھا ہے۔ دراصل "نصیحتِ مدن" اور "نصیحتِ بدن" دونوں بڑی عجیب ترکیبیں ہیں۔

اس تاریخ کے خاکے کے خلفشار کا یہ مرقع دیکھیے کہ زیرِ نظر باب میں ص ۶۴-۵۶۳ پر شاہ معظم کا ذکر ہے جب کہ اس سے پہلے دسویں باب میں بھی ص ۸۷-۴۸۵ پر معظم کا بیان آچکا تھا اور لطف یہ ہے کہ دونوں جگہ سخاوت مرزا ہی نے لکھا ہے۔ دوسری بار معظم کی زیادہ مثنویوں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان میں "گنجِ مخفی" صحیح نام نہیں۔ اس کا نام "آزادنامہ" ہے۔ اس جزو میں دوسرے شعرا رضی، صالح، عبدالمد (کذا) وغیرہ پر اچھی طرح لکھا ہے لیکن عبدالمد کے بعد جو لکھا ہے:

(سید محمد نام صحیح نہیں۔) (ص ۵۶۸)

یہ بھی پوری تصحیح نہیں۔ بیلی نے اس کا نام "سید محمد" لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "تنقیداتِ عبدالحق" میں تصحیح کی کہ اس کا نام عبدالمحمد ہے۔ میرے شاگرد سید نصرت مہدی نے اپنے مقالے "اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ" میں اس شاعر اور اس کی مثنوی "فیضِ عام" پر تفصیل سے لکھا ہے۔ خود مثنوی میں اس نے کئی جگہ اپنا نام عبدالمحمد لکھا ہے۔

یہ عبدالمحمد جو ہے مہدوی
زہے مجتبیٰ، مہدیِ مقتدی
سو عبدالمحمد نبی کا غلام
خدا کے فضل سوں کیا یو تمام

(اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ، ص ۱۱۶)

ولی کے غیر دکنی معاصرین پر مختصراً لکھا ہے۔ یہاں بھی محبوب عالم کی عرفیت شیخ جیون دی ہے (ص ۵۷۱)۔ یہ صحیح نہیں۔ جیون، محبوب عالم کے دوست کا نام ہے۔ زٹلی، اٹل، خواجہ محمد عطا بالکہ وغیرہ پر بھی لکھا ہے لیکن سب پر کافی مختصر نوٹ۔ آخر میں مدیرِ عمومی نے اس دور کے اردو ادب کا عمومی جائزہ لیا ہے جو بہت مختصر ہے۔

Scanned by CamScanner

تاریخ ادبیات کی اس جلد کا جائزہ بہت مفصل ہو گیا۔ ابھی چار جلدیں اور باقی ہیں۔ مجھے زیادہ اختصار کے ساتھ لکھنا ہوگا۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس جلد میں مواد کافی ہے، کم معروف شعرا کو بھی جگہ دی ہے، لیکن مضمون نگاروں میں سے بیش تر نے ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا، جس کی وجہ سے انتساب کی غلطیاں اور سنین کے تسامحات در آئے ہیں۔ اس جلد کا عرصہ علی گڑھ تاریخ جلد اوّل کے متوازی ہے، لیکن علی گڑھ تاریخ کا علمی پایہ اس سے کہیں زیادہ ٹھوس اور بلند ہے اور ان سب کے بعد جمیل جالبی کی تاریخ کی جلد اوّل بھی اسی دور کے بارے میں ہے۔ اسے دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ اِس دور پر کس طرح لکھا جانا چاہیے۔

تاریخِ ادبیات، ساتویں جلد، اردو ادب (دوم)

(۱۷۰۷ء تا ۱۸۰۳ء)

اس جلد کی دونوں حدود سیاسی واقعات کے مطابق رکھی گئی ہیں۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی کو فتح کیا جس کے بعد مغلوں کی قلم رو محض لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ تاریخی اعتبار سے یہ واقعات اہم ہیں، لیکن یہ ادبیات میں سنگ میل نہیں۔ ضروری نہیں کہ ادب کا مطالعہ سیاسی تاریخ کی متابعت میں کیا جائے۔ سہولت کا تقاضا یہ تھا کہ اٹھارویں صدی، انیسویں صدی، بیسویں صدی کی حدود قائم کی جاتیں۔ بہر حال:

اس جلد کے پہلے باب کا عنوان ہے: "سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر" جسے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ میں "معاشرتی" اور "تہذیبی" کے نازک فرق کو نہیں سمجھتا۔ اگر مضمون نگار کے ذہن میں انگریزی اصطلاحیں "سیولزیشن" اور "کلچر" ہیں تو انھیں بالترتیب "تہذیبی" اور "ثقافتی" سمجھنا چاہیے تھا۔ کم از کم اردو ادب کی تاریخ میں ان کے فلسفیانہ فرق کو ملحوظ نہیں رکھنا چاہیے۔ اس باب میں عنوان کے مطابق جملہ عناصر میں توازن رکھا گیا ہے۔ اس میں سیاسی تاریخ کم سے کم اور تہذیبی اور فکری پہلو زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہ باب موضوعِ تاریخ سے غیر متعلق نہیں، معلومات افزا اور دلچسپ ہے، بالخصوص معاشرتی اور فکری حصہ۔ خوش قسمتی سے یہی اس باب پر حاوی ہے۔

مجھے اس باب کی صرف دو جزئیات کے بارے میں اپنے مشاہدے پیش کرنے ہیں:

۱۔ داستان "بوستانِ خیال" کے لیے لکھتے ہیں:

اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور وہ اسی کے زمانے

Scanned by CamScanner

میں اور اسی کے حکم سے اختتام کو پہنچی۔ (ص ۱۹)

اس کتاب کا یہ جزو تو صحیح ہے کہ محمد شاہ نے اس کتاب کو پسند کیا، لیکن یہ نہ اس کے زمانے میں، نہ اس کے حکم سے مکمل ہوئی۔ "بوستانِ خیال" کا مصنف محمد تقی خیال حملۂ نادری (۱۷۳۹ء) میں دلّی چھوڑ کر مرشد آباد چلا گیا تھا۔ محمد شاہ کا انتقال ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ میں ہوا۔ یہ داستان عالم گیر ثانی کے عہد میں ۱۱۷۰ھ/۵۷-۱۷۵۶ء میں مرشد آباد میں مکمل ہوئی۔

۲۔ ص ۲۸ پر آصف الدولہ کا سنہِ وفات ۱۷۹۸ء لکھا ہے۔ دراصل ۲۹ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء ہے۔

دوسرا باب "ادبی منظر" ڈاکٹر الف د نسیم نے لکھا ہے۔ یہاں ہم پہلے باب سے بھی زیادہ اپنی جانی پہچانی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ یہ باب بہت مفید اور معلومات افروز ہے۔ اس میں ص ۳۹ پر صاحب "بکٹ کہانی" کا نام محمد افضل لکھا ہے لیکن جیسا کہ میں علی گڑھ تاریخ کے لسانیاتی مقدمے کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں، محمد افضل، والہ داغستانی کے "ریاض الشعرا" کے فارسی شاعر کا نام ہے۔ "بکٹ کہانی" کے افضل کا نام اس کے ایک نسخے میں، نیز قدیم ترین حوالے "تیرہ ماسہ" میں گوپال دیا ہے۔

تیسرا باب "ایہام گو اور دیگر شعرا" ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات، مثلاً ۶۶ میں ایہام کے بارے میں بہت اچھی طرح لکھا ہے۔ اس سلسلے میں ص ۶۷، نیز ص ۸۵ وغیرہ پر "ذو معنی" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ تثنیہ کے معنی میں "ذو معنیین" یا "ذوالمعنیین" کہنا چاہیے۔ اس دور کے اساتذہ پر مختصراً لکھا ہے۔ پانچ جلدوں کی تاریخِ ادب میں زیادہ تفصیل متوقع تھی، ہاں حاتم پر مفصّل لکھا ہے۔

چوتھا باب "مرزا محمد رفیع سودا" ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا تحریر کردہ ہے۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے سودا پر نہ صرف اچھی، بلکہ بہت اچھی طرح لکھا ہے۔ اس میں ص ۱۲۵-۱۳۴ پر ایک ضمیمہ ہے جس میں کلامِ سودا میں شامل ایسی الحاقی تخلیقات کی نشان دہی کی ہے جو دوسرے محققین، مثلاً قاضی عبدالودود کی دریافت پر اضافہ ہے۔ اس مضمون کا تحقیق کے علاوہ تنقیدی معیار بھی قابلِ تشفی ہے۔ اگر جملہ ادیبوں پر اسی نظر اور اسی شرح و بسط سے لکھا جاتا تو کتاب کا مرتبہ اور بلند ہو جاتا۔

پانچواں باب "میر تقی میر" ڈاکٹر سید عبداللہ کا لکھا ہوا ہے، جو مشہور نقاد ہیں۔ اس کی ابتدا میں میر کا عرصۂ حیات ظاہر کرتے ہوئے ان کا سنہِ ولادت ۱۷۲۴ء/۱۱۳۷ھ لکھا ہے۔ ۱۱۳۷ھ مولوی عبدالحق کی تقلید میں لکھا ہے۔ اب ۱۱۳۵ھ کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو: "محمد تقی میر" از جالبی (دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۱-۲۰)۔ ص ۱۲۸ پر میر کے لکھنؤ

Scanned by CamScanner

جانے کا سنہ ۱۷۹۷ء دیا ہے۔ جالبی نے قاضی عبدالودود کے حوالے سے ۱۹۶اء لکھا ہے (ایضاً، ص ۳۲)۔ میر کی سوانح بہت مختصر ہے۔ ص ۱۳۰ پر میر کی تصانیف کی فہرست میں صرف کلیات کے مشمولات گنا دیے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں، ان کی نثری تصانیف "نکات الشعرا"، "ذکرِ میر"، "فیضِ میر" کا نام تک نہیں لیا۔

ص ۱۳۱ پر میر کی ایک مثنوی کا مشہور نام "شعلۂ عشق" لکھا ہے۔ اس کا صحیح نام "شعلۂ شوق" ہے۔ دیوان میر کے قدیم ترین نسخے، نسخۂ حیدر آباد میں اس کا نام "شعلۂ شوق" ہی ہے۔ رام پور کے نسخۂ کلیاتِ میر میں بھی یہی نام درج ہے۔ قاضی عبدالودود کے مطابق کلیاتِ میر کی اوّلین اشاعت میں بھی اس کا نام "شعلۂ شوق" ہی تھا ("معاصر"، نمبر ۱۵، بابت نومبر، ۱۹۵۹ء، ص ۴)۔ مثنوی کے ایک شعر کا پہلا مصرع ہے ع:

ہوا شعلۂ شوق سر سے بلند

اس مضمون میں میر کی تنقید بہت مفصل اور ایک صاحب نظر کے انداز کی ہے، لیکن سوانحی اور تحقیقی حصہ بہت تشنہ ہے۔ نثر کو سرے سے غائب ہی کر دینے کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون کے آخر میں مدیرِ عمومی گروپ کیپٹن سید فیاض محمود نے تین صفحوں کا ایک تنقیدی ضمیمہ لکھا ہے۔ یہ مدیرِ عمومی کے عہدے کا غلط استعمال ہے، یہ سوءِ ادب ہے۔ جناب مدیر ڈاکٹر عبداللہ سے بڑے نقاد نہیں۔ جو کچھ مضمون نگار نے لکھا ہے، اس پر قناعت کرنی چاہیے تھی۔ تنقید میں مختلف زاویہ ہائے نظر ہوتے ہی ہیں۔

چھٹے باب کے پانچ ذیلی حصے ہیں، جنھیں پانچ مختلف اہلِ قلم نے لکھا ہے۔ ان میں ایک ایک حصہ میر درد، میر حسن، قائم، میر اثر کے بارے میں ہے اور پانچواں دوسرے دہلوی شعرا پر۔ میر درد پر ڈاکٹر الف د نسیم نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ یہاں بھی مدیرِ عمومی نے تین صفحات کا ایک ضمیمہ شامل کیا ہے جس میں نثر کی سطور آدھے صفحے کے برابر ہیں۔ بقیہ سب، اشعار ہی اشعار ہیں۔ دوسرا حصہ "میر حسن اور سحرالبیان" ڈاکٹر وحید قریشی کا لکھا ہوا ہے۔ وہ میر حسن کے محقق ہیں۔ انھوں نے سوانح مختصر لکھی ہے لیکن ہے محققانہ۔ اس میں "سحرالبیان" ہی پر توجہ کی گئی ہے، دوسری مثنویوں پر نہیں لکھا۔ حیرت ہے کہ حسن کی غزل گوئی اور تذکرے کے بارے میں ایک لفظ نہیں۔ شاید تذکرے پر اس لیے نہ لکھا ہو کہ تذکرے تیرھویں باب کا موضوع ہیں، لیکن میر حسن کے مضمون میں بھی تذکرے کے بارے میں دو چار سطور تو لکھنی چاہییں ہی تھیں۔ پھر غزلیات کو بالکل نظرانداز کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

Scanned by CamScanner

تیسرا جزو قائم چاند پوری افتخار احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ ان کی سوانح اچھے تحقیقی انداز سے لکھی ہے۔ تنقید بھی مفصل اور خوب ہے۔ چوتھے حصے "اثر" کو مجید یزدانی نے لکھا ہے۔ انھوں نے ص۱۹۰ پر اثر کا نام خواجہ سیّد میر محمدی لکھا ہے۔ درد اور اثر دونوں بھائیوں کے نام یکساں تھے۔ درد کا نام "خواجہ میر" تھا اور اثر کے لیے جالبی لکھتے ہیں:

> محمد میر نام اور اثر تخلص تھا۔ خاندانی نسبت کی وجہ سے خواجہ اور سلسلے کی نسبت سے محمدی بھی نام کا حصہ ہیں۔
>
> (تاریخ، جلد ۲، حصہ ۲، ص۸۰۰)

گویا مجید یزدانی صاحب کو اثر کا نام خواجہ سیّد میر کے بجائے خواجہ محمد میر لکھنا چاہیے تھا۔ ص۱۹۴ پر اثر کا سالِ وفات اندازاً ۷-۱۸۱۲ء کے درمیان لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ صحیح ۱۲۰۹ھ ہے جو ان کی قبر کے تعویذ پر لکھی ہے ("اردو مثنوی شمالی ہند میں"، ۱۹۶۹ء، ص۲۸۴)۔ جالبی کے مطابق صحیح صفر ۱۲۰۹ھ/اگست ۱۷۹۴ء ہے (جلد ۲، حصہ ۲، ص۷۹۹)۔ یزدانی نے سنہ ولادت ۱۷۵۶ء، ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ قیاس کی ہے۔ جالبی نے ایک قطعۂ تاریخ سے اخذ کر کے ۱۱۴۸ھ لکھا ہے (ایضاً، ص۸۰۰، ۸۱۵) یزدانی نے اثر کی مثنوی پر مفصل تنقید کی ہے، لیکن غزلوں پر ایک لفظ نہیں لکھا جو ضروری تھا۔ آخری جزو "دوسرے دہلوی شعرا" ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ اس میں تاباں، سوز، یقیں، فغاں، بیاں، ہدایت، بیدار، حسرت اور طپش کو لیا ہے اور تشفی آمیز طریقے سے حق ادا کیا ہے۔ ص۲۱۹ پر بیدار کا نام میر مہدی لکھا ہے اور اسے غلط نامے میں بھی درست نہیں کیا گیا۔ صحیح میر محمدی ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ چھٹا باب قابلِ قدر ہے۔ کمی یہ ہے کہ میر حسن اور میر اثر کی غزلیات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ساتویں باب کے تین حصوں میں آتش، ناسخ اور مصحفی پر ڈاکٹر ابواللیث نے لکھا۔ آٹھویں باب میں جرأت، انشا اور رنگین کو لیا گیا ہے۔ اس تاریخِ ادب کا خاکہ بنانے والوں پر حیرت ہے کہ انھوں نے انیسویں صدی کے شعرا آتش و ناسخ کو جلد دوم میں جگہ دی جو اٹھارویں صدی کو محیط ہے اور ۱۸۰۳ء پر ختم ہوتی ہے۔ مزید حیرت یہ ہے کہ انھوں نے آتش کو پہلے رکھا اور ان کے استاد مصحفی کو ان کے بعد۔ پھر مصحفی کو ایک باب میں رکھا اور ان کے حریف انشا کو دوسرے میں۔ کم عمر کے آتش و ناسخ کو زیادہ عمر کے جرأت، انشا اور رنگین پر سبقت دی۔ بغیر کسی بڑی تحقیق کے میں ان شعرا کا سنہ ولادت اس ترتیب سے درج کروں گا:

Scanned by CamScanner

مصحفی ۱۷۴۷ء، جرأت ۱۷۴۹ء، انشا ۱۷۵۲ء، رنگین ۵۷-۱۷۵۶ء، ناسخ ۱۷۷۲ء، آتش ۱۷۷۸ء۔

چاہیے یہ تھا کہ ساتویں باب میں جرأت، مصحفی، انشا اور رنگین کو لیتے اور آتش و ناسخ کو تیسری جلد میں بھیج دیتے۔ اس طرح شعرا کے سنین اور باہمی قُرب دونوں کا لحاظ ہو جاتا۔

ساتواں باب دبستان لکھنؤ کے مورّخ ابواللیث صدیقی نے آتش، ناسخ اور مصحفی کے بارے میں لکھا ہے۔ آتش کی زبان اور رنگ سخن کے بارے میں خوب لکھا ہے۔ ناسخ کی سوانح مختصر ہے۔ اس میں آتش و ناسخ کے معرکوں کا کوئی ذکر نہیں۔ انھیں درج کر کے ان کی صحت کو جانچنا چاہیے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کلامِ ناسخ کا وسیع مطالعہ کیا جائے تو اس میں بکثرت اس طرح کے اشعار مل جائیں گے جو آتش کا مخصوص رنگ سمجھا جاتا ہے۔ رشید حسن خاں کا کہنا ہے کہ جن اصطلاحاتِ زبان کا ناسخ کو ذمے دار قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل ان کے شاگردوں نے کیں۔ ڈاکٹر ابواللیث نے ان مطالب کا جائزہ نہیں لیا۔ وہ مصحفی پر ایک کتاب لکھ چکے ہیں، "مجمع الفوائد" کا مطالعہ کر چکے ہیں، اس لیے ان پر قدرت کے ساتھ لکھا ہے۔ ص ۲۶۵ پر مصحفی کی ولادت کا عیسوی سنہ سہوِ طباعت کی وجہ سے ۱۸۲۸ء اور ۱۸۲۹ء درج ہو گیا ہے۔ ۱۷۲۸ء اور ۱۷۲۹ء چاہیے۔ سب سے بڑی حیرت یہ ہے کہ انشا سے ان کے معرکوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا، جس سے بڑی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثنوی "بحر المحبت" پر محض دو جملے لکھے ہیں۔ یہ اس سے زیادہ کی سزاوار تھی (ص ۲۷۴)۔

آٹھویں باب میں "جرأت اور انشا" پر مشرف علی انصاری نے اور "رنگین اور صنفِ ریختی" پر مجید یزدانی نے لکھا ہے۔ اس طرح مصحفی، انشا اور رنگین تینوں پر الگ الگ اہلِ قلم نے لکھا ہے حالانکہ انشا کے تعلق سے ان تینوں پر کسی ایک مورّخ ہی کو لکھنا چاہیے تھا۔

بہر حال انشا پر تحریر کا پہلا جملہ ہی یہ ہے:

انشاء اللہ خاں انشا (م ۱۷۵۶ء/۱۸۱۸ء)۔ (ص ۲۹۵)

"م" متوفّٰی کا مخفف مانا جاتا ہے۔ یہاں سنہ ولادت سے پیش تر لکھا ہے۔ ترچھی لکیر کھینچ کر اس کے ایک طرف سنہ ہجری اور دوسری طرف سنہ عیسوی لکھا جاتا ہے۔ یہاں زندگی کی دو حدود یعنی ولادت و وفات ظاہر کی ہیں اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ مالک رام کو ایک مجلد میں انشا کی ولادت و وفات کی یہ تاریخیں ملیں:

ولادت صفر ۱۱۶۶ھ (دسمبر ۱۷۵۲ء)۔ وفات ۳۰ جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ (۱۹ مئی ۱۸۱۷ء)

("تحقیقی مضامین"، ص ۱۳۹، نیز "تذکرۂ ماہ و سال"، ص ۵۴)

واضح ہو کہ دو سنین کو اعداد میں لکھا جائے تو چھوٹے سن کو بائیں طرف اور بڑے کو دائیں طرف لکھنا چاہیے، مثلاً انشا کے سنین ۱۸۱۷ء-۱۷۵۲ء- اس تاریخ میں اکثر اس کے برخلاف لکھا گیا ہے۔ ص۲۹۶ پر شجاع الدولہ کا انتقال ۱۷۸۴ء/۱۱۸۸ھ میں دکھایا ہے۔ ہجری سنہ صحیح ہے، عیسوی غلط۔ صحیح تاریخ وفات ۲۳ یا ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ/ جنوری ۱۷۷۵ء ہے۔ معلوم نہیں ۱۷۸۴ء کہاں سے آ گیا۔

ص۳۰۲ پر انشا کا ۱۱ زبانوں میں خصوصی عبور دکھایا ہے۔ عابد پشاوری جو انشا کے طرف دار ہیں، انکشاف کرتے ہیں کہ انشا پنجابی، پشتو، مرہٹی اور کشمیری کے محض دو چار لفظ یا لہجہ جانتے تھے، اس سے زیادہ نہیں۔ عبور تھا اردو، فارسی، عربی اور ترکی پر ("انشاء اللہ خاں انشا"، ص۱۰۷-۱۰۰)۔ مضمون نگار نے انشا پر کافی لکھا ہے لیکن ان کی نثری تصانیف کو چند ہی سطروں میں نمٹا دیا ہے۔ "دریائے لطافت" اور "رانی کیتکی کی کہانی" دونوں تفصیلی مطالعے کی مستحق تھیں۔ سعادت یار خاں رنگیں کی سوانح تشنہ ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست اور ان کی گروہ بندی دینی چاہیے تھی، نہیں دی۔

اس باب کا اگلا جزو "ریختی" ہے۔ اسے یہاں رنگیں کی قربت کی وجہ سے دیا ہے، لیکن اس کا مقام تو "اصناف سخن" کے باب میں ہونا چاہیے۔ اس میں ممتاز ریختی گویوں کے نام بھی لیے ہیں، لیکن اس میں غیر حاضر ہیں تو رنگیں اور انشا۔ پہلے سے ان کے بارے میں علاحدہ سے مضمون لکھے گئے ہیں، لیکن ریختی کے بیان کا، رنگیں اور انشا کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور اہم ریختی گو نازنیں کو بھی بھلا دیا گیا ہے۔

باب کا آخری جزو "دبستانِ لکھنؤ کے اوسط درجے کے شعرا" ادارے نے لکھا ہے۔ واضح کرنا چاہیے تھا کہ کس مخصوص شخص نے لکھا ہے۔ اس کے شروع میں پس منظر ہے، جس میں شجاع الدولہ کا انتقال ۱۷۷۴ء میں دکھایا ہے (ص۳۳۷)۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا، اس واقعے کا سنہ عیسوی ۱۷۷۵ء ہے، ۱۷۷۴ء نہیں۔ اس باب میں شعرا کی تلاش میں کد سے تو کام لیا گیا، لیکن ان میں تین چار کے سوا اور کوئی اس قابل نہ تھا کہ اسے جلی عنوان دے کر لکھا جائے۔ آخر تاریخِ ادب تذکرہ نہیں ہوتی۔ ذیل کے نام دیکھیے: علی نقی محشر، قاسم علی رقت، لچھمن بیگ رفاقت، محمد عظیم تجمل، اکبر علی اختر، سبقت، غضنفر علی خاں۔

یہ سب مجہول الاسم اور غیر اہم شاعر ہیں۔ ان کے محض نام لکھنا کافی تھا۔

نواں باب "دہلی اور لکھنؤ سے باہر کے شعرا" محمد زبیر منگلوری نے لکھا ہے۔ غیر مشہور اور غیر اہم ادیبوں پر لکھنے کا جواز صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔

۱۔ وہ قدیم دور کے ہوں تاکہ ان کے ذکر سے اردو ادب کی قدامت استوار کی جا سکے اور

Scanned by CamScanner

اُس گئے گزرے زمانے میں بھی کچھ ادبی سرمایہ دکھایا جاسکے۔

۲۔ ان کی تخلیقات میں ادبی محاسن پائے جاتے ہوں۔ ان کے نمونے پیش کر کے دکھایا جاسکے کہ اس شاعر یا نثار کو نظر انداز کر کے ہمارے مؤرخوں اور نقادوں نے انصاف نہیں کیا اور اگر کوئی قدیم بھی ہو اور ادبی اعتبار سے بھی قابلِ ذکر، تو سونے پر سہاگا ہے، مثلاً شاعروں میں فائز دہلوی اور داستاں نویسوں میں عیسوی خاں صاحبِ "قصہ مہر افروز و دلبر" اور مہر چند کھتری کی صاحبِ "قصہ ملک محمد و گیتی افروز عرف نو آئینِ ہندی"۔ یہ تینوں ادیب حال میں دریافت کیے گئے۔

زیرِ نظر باب میں چار علاقوں کے اوسط درجے کے شعرا کا بیان ہے، پنجاب، سندھ، بہار اور بنگال۔ ان میں اہم اور غیر اہم، معروف اور غیر معروف دونوں قسم کے شعرا کا تعارف ہے۔ جو غیر معروف شعرا ادبی اعتبار سے قابلِ ذکر نہیں، ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ واضح ہو کہ کسی علاقے کی خدمات کے بارے میں مقالہ لکھا جائے تو اس میں غیر اہم اور ادبی اعتبار سے کمزور اہلِ قلم کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک کل ہند و پاک تاریخِ اردو میں ان کا ذکر نہیں آنا چاہیے۔

سندھ کے شعرا میں ص ۳۰۷ کے میر علی شیر قانع اردو کے ادیب نہیں، پھر انھیں اس تاریخ میں کیوں جگہ دی گئی۔ سچل سرمست سندھی کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کو بحیثیت اردو شاعر پیش کرنا قابلِ قدر ہے۔ ص ۳۸۲ پر لکھا ہے کہ مہاراجا رام نرائن موزوں کا فارسی دیوان مطبوعہ موجود ہے۔ بڑی حیرت انگیز خبر ہے۔ اس دیوان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی۔ ص ۳۸۶ پر غلام یحییٰ حضور عظیم آبادی کے نام کے آگے (۱۷۹۱/۱۲۰۶ھ) لکھا ہے۔ یہ واضح نہیں کیا کہ یہ سنہ کس واقعے کا ہے؟ ولادت کا یا وفات کا؟ ظاہرا یہ وفات ہی کا ہے جس کا ہجری سنہ صحیح ہے لیکن عیسوی سنہ میں ایک سال کی غلطی ہے۔ "دیوانِ حضور" کے مرتب ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کے مطابق حضور کی تاریخِ وفات ۷ جمادی الثانی ۱۲۰۶ھ ہے جو تقویم کے مطابق یکم فروری ۱۷۹۲ء کو پڑتی ہے ("دیوانِ حضور"، ۱۹۷۷ء)۔

ص ۳۸۷ پر حسرت عظیم آبادی کا نام ہیبت علی خاں لکھا ہے۔ صحیح ہیبت قلی خاں ہے۔ اس کا سنہ وفات ۱۷۹۵ء لکھنے کے بجائے ۱۲۱۰ھ لکھنا چاہیے تھا جو برابر ہے ۹۶-۱۷۹۵ء کے (مقدمۂ "دیوانِ حسرت عظیم آبادی" مرتبۂ اسما سعیدی، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۲)۔ شیخ غلام علی راسخ کو محض دو صفحے دیے ہیں جو بہت کم ہیں۔ راسخ اوسط درجے کے نہیں، اس سے بڑے شاعر ہیں، بالخصوص مثنوی نگاری میں۔ ان کی مثنویوں کی

Scanned by CamScanner

محض تعداد لکھی ہے، لیکن نہ ان کے نام دیے ہیں نہ تنقید کی ہے۔ ص۳۹۸ پر دردمند کا نام محمد فقیر لکھا ہے، صحیح محمد فقیہ ہے۔ صحت نامے میں اس صفحے کے ایک دوسرے لفظ کی تصحیح کی گئی ہے، محمد فقیر کی نہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار ہی نے فقیر لکھا ہوگا۔ ان کے نام کے آگے بغیر کسی صراحت کے (۱۷۶۷ء) لکھا ہے۔ یہ کہاں کا قاعدہ ہے؟ ہر سنہ سے پہلے اشارہ کرنا چاہیے کہ یہ کس واقعے کا ہے۔ وفات ہی کا ہوگا، لیکن جمیل جالبی نے ان کی وفات کا صحیح سنہ ۱۱۷۹ھ/۶۶-۱۷۶۵ء لکھا ہے (جلد دوم، ص ۹۳-۳۹۲)۔ انھیں شعرائے بنگال میں شامل کرنے کا کیا جواز ہے۔ یہ دکن میں پیدا ہوئے، خود مضمون نگار کے مطابق ۳۰ سال دہلی میں رہے۔ قہر نادری میں بنگال چلے گئے تو یہ بنگال کے شاعر تو نہیں ہو جائیں گے۔ اگر داغ اور امیر حیدر آباد گئے تو وہ دکن کے شاعر تو نہیں کہلائیں گے۔

یہ باب یکایک کسی شاعر کے بیان پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے کا باب جزو آخر دبستانِ لکھنؤ کے اوسط درجے کے شعرا بھی اسی طرح ختم ہوا تھا۔ آخر میں مجموعی جائزے کا کم از کم ایک پیراگراف تو لکھنا چاہیے۔ اس کے بغیر ان دونوں تحریروں میں تذکرے کا رنگ آجاتا ہے۔

دسواں باب "نظیر اکبر آبادی" ڈاکٹر محمد صادق نے لکھا ہے۔ یہ باب بہت اچھا ہے بالخصوص تنقید بہت اعلیٰ درجے کی ہے۔ تحقیقی پہلو کی طرف مزید توجہ کی جا سکتی تھی۔ گیارھواں باب دہلی اور لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں کے بارے میں سیّد عابد علی عابد نے لکھا ہے۔ یہ بھی بہت خوب ہے۔

بارھواں باب "اس دور کے نثر نگار" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے۔ انھوں نے پس منظر کے طور پر ص۶۹-۴۶۸ کے فٹ نوٹ میں جن دکنی نثری رسالوں کے نام لیے ہیں ان میں سے زیادہ تر غیر مستند ہیں۔ افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو کی اوّلین نثری کتابوں میں اشرف جہاں گیر سمنانی کے رسالے اور شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کا ذکر کیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خواجہ بندہ نواز سے منسوب جملہ رسالے، نیز محمد اکبر حسینی کی تصانیف محض خیالی ہیں، جن کا وجود نہیں۔ ص۴۶۹ پر میراں جی شمس العشاق سے "شرح مرغوب القلوب" کو منسوب کرنا اور ۹۰۲ھ کو ان کا سنہ وفات کہنا دونوں غلط ہیں۔ شرح، میراں جی خدا نُما کی تالیف ہے اور ۹۰۲ھ شمس العشاق کا سنہ ولادت ہے، سنہ وفات نہیں۔

برہان الدین جانم کا سنہ وفات ۹۹۰ھ دیا ہے۔ حسینی شاہد کی تحقیق کے مطابق ۱۰۰۷ھ ہے۔ ان سے دو رسالے منسوب کیے ہیں، ایک "معرفت قلوب" (صحیح نام: "معرفت القلوب") جس کے بارے میں علی گڑھ تاریخ کے تبصرے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بھی

Scanned by CamScanner

میراں جی خدا نُما کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا رسالہ "ہشت مسائل" ہے۔ اِس کی زبان کے پیشِ نظر اِس کا بھی "کلمۃ الحقائق" کے مصنف شاہ برہان کا ہونا مشکوک ہے۔

شمالی ہند میں نثری ادب کے سلسلے میں مستشرقین کی یورپی زبانوں کی قواعدوں کا ذکر کرتے ہیں (ص۴۷۵-۴۷۶)۔ انھیں اردو کی نثری ادب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ میر بہادر علی حسینی نے گِل کرسٹ کی "قواعدِ اردو" کی تلخیص کی تھی جسے "رسالۂ گِل کرسٹ" کہا جاتا ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اس کا سنہ اشاعت کہیں ۱۸۱۶ء اور کہیں ۱۸۲۰ء ملتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج پر تحقیق کرنے والی ڈاکٹر عبیدہ بیگم کہتی ہیں کہ ۱۸۱۶ء کے کسی مطبوعہ نسخے کا سراغ نہ مل سکا، ۱۸۲۰ء ہی صحیح تاریخِ اشاعت ہے ("فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمت"، ص۲۱۱)۔

مذہبی تصانیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کا پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے ۱۷۷۶ء/۱۲۰۰ھ کے قریب کیا (ص۴۷۹)۔ واضح ہو کہ ۱۲۰۰ھ برابر ہے ۸۶-۱۷۸۵ء کے، ۱۷۷۶ء کے نہیں۔ اس ترجمے کی تاریخ معلوم نہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کے لیے لکھتے ہیں:

ان کا ترجمۂ قرآنِ مجید اردو میں "موضح القرآن" کے نام سے ہے۔

(ص۴۸۱)

صحیح نام "موضحِ قرآن" ہے جس سے ۱۲۰۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ غالباً اس میں ترجمہ اور تفسیر ملی جُلی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے خود دیباچے میں لکھا ہے۔ لیکن تفسیر کا علاحدہ نسخہ بھی ملتا ہے(۵)۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمے کے بارے میں لوگوں نے قیاس کر لیا کہ بڑے بھائی نے پہلے ترجمہ کیا ہوگا اس لیے قیاساً اس کا سنہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے کچھ سال پہلے کا لکھ دیا۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ پہلے کا ہے اور بڑے بھائی کا ان کے بعد کا (رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۳۷ء، نیز "قدیم اردو"، ص ۱۳۲-۱۳۳)۔ دوسری طرف جمیل جالبی کا خیال ہے کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ مقدّم ہے (تاریخ، جلد۲، حصّہ۲، ص ۱۰۵۳)۔ دونوں ترجموں کی زبان کو دیکھ کر مجھے بھی جمیل جالبی کا موقف درست معلوم ہوتا ہے۔

مضمون نگار اس کے آگے حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخِ اردو" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دراصل پہلا ترجمہ حکیم شریف خاں دہلوی (متوفّی ۱۸۰۷ء/۱۲۲۲ھ) کا ہے جو شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے تقریباً بیس سال پہلے کا ہے (ص۴۷۹)۔ قادری نے یہ بات ضرور لکھی ہے لیکن اس کے سنہ کے قیاس کا کوئی ثبوت نہیں دیا (داستان، طبعِ دوم،

Scanned by CamScanner

ص۴۶-۱۴۵)۔ ان سے پہلے مولوی عبدالحق نے موٴلۂ بالا مضمون میں اس ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اسے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس کے ترقیمے میں دن اور تاریخ موجود تھی، لیکن سنہ ندارد تھا، اس لیے مولوی صاحب نے اس کا کوئی سنہ نہیں دیا ("قدیم اردو"، ص۱۳۶)۔ اس موضوع کے محقق ڈاکٹر شطاری نے اس ترجمے کے بارے میں تفصیل سے لکھ کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکیم صاحب نے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ترجموں کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد انھیں بھی تفسیر (ترجمہ نہیں،) لکھنے کا خیال پیدا ہوا (شطاری، ص۲۱۲)۔

مضمون نگار عیسوی خاں کے "قصہ مہر افروز و دلبر" کے بارے میں مسعود حسین خاں کی رائے لکھتے ہیں کہ یہ ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء کے درمیان لکھا گیا ہوگا (ص۴۸۹)۔ ڈاکٹر پرکاش مونس نے تحقیق کی ہے کہ یہ قصہ ۱۷۵۲ء سے پہلے کا ہونا چاہیے ("اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، ص۳۳۳)۔ اس سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اتفاق کیا ہے (جلد ۲، حصہ ۲، ص۸۶-۱۰۸۵)۔ اس کے بعد مضمون نگار نے "رانی کیتکی کی کہانی" اور "نوطرز مرصع" کا ذکر کیا ہے۔ قدامت کے لحاظ سے "نوطرزِ مرصع" کو پہلے لینا چاہیے تھا۔ شاہ عالم کی داستان "عجائب القصص" کا ذکر ص۹۶-۴۹۵ کے حاشیے میں کرنے پر اکتفا کی ہے۔ اس کو متن کے شایاں کیوں نہیں سمجھا گیا۔ اٹھارویں صدی کی داستان مہر چند کھتری کی "نو آئینِ ہندی معروف بہ قصہ ملک محمد و گیتی افروز" کا ذکر بالکل کیا ہی نہیں، حالانکہ میں اپنی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" (طبعِ دوم، کراچی، ۱۹۶۹ء) میں اس کے بارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

غرض یہ ہے کہ تحقیقی اعتبار سے نثری تصانیف کا یہ باب تشنہ معلوم ہوتا ہے۔

تیرھواں باب "تذکرے" مجید یزدانی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی ابتدا میں "بیاض"، "تذکرہ"، "گل دستہ" وغیرہ پر بہت اچھی بحث کی ہے۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی کے تذکروں کا تعارف ہے جو کافی عمدہ ہے۔ ص۵۰۶ پر آٹھویں سطر میں "گلزارِ نسیم"، گلزارِ ابراہیم" کی تخریب ہونی چاہیے۔ ص۹-۵۰۷ پر اس صدی کے تذکروں کی فہرست دی ہے۔ ان میں بعض تذکروں کا جو سنہ تکمیل دیا ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ اس کے بعد بھی ان میں عرصے تک اضافے ہوا کیے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر حنیف نقوی کی کتاب "شعرائے اردو کے تذکرے" (لکھنؤ ۱۹۷۶ء)۔ بعض تذکروں کے بارے میں میرے مشاہدات:

تذکرہ نمبر ۴ کا نام "ریختہ گویاں" لکھا ہے۔ ڈاکٹر انصاراللہ نظر خبر دیتے ہیں کہ "قومی زبان"، کراچی: مئی ۱۹۶۳ء میں اس کے ایک نسخے سے اس کا صحیح نام "گلشنِ راز یعنی تذکرہ بے بدلِ ہندی" معلوم ہوا (انصاراللہ: "شعرائے اردو کے اولین تذکرے"، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء، ص۳۵)

Scanned by CamScanner

تذکرہ نمبر۶ کا نام "ریاضِ حسینی" اور سنہ تکمیل ۱۱۹۶ھ لکھا ہے۔ اس کا نام "ریاضِ حسنی" ہے، "حسینی" نہیں۔ یہ میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس کا تفصیلی مطالعہ کر کے طے کیا کہ یہ شعبان ۱۱۷۲ھ کے بعد مرتب ہوا ہے ("شعرائے اردو کے تذکرے"، ص۹۲۔ ۲۹۱)۔ تذکرہ نمبر۷ کا نام "چمنستان الشعرا" لکھا ہے، صحیح "چمنستانِ شعرا" ہے جو خود مصنف نے خاتمۂ کتاب میں لکھا ہے۔ میر حسن کے تذکرے کا نام "شعرائے اردو" لکھا ہے۔ خود تذکرے میں نام کی وضاحت نہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے مطابق ایک قدیم نسخے سے اس کا نام "تذکرۂ شعرائے ہندی" معلوم ہوا اور حیدری نے اسے اسی نام سے مرتب کیا ہے۔ نمبر۱۰ "بہاروخزاں" از عروج کی اب یہ کیفیت ہے کہ اس کا وحید نسخہ اتنا کرم خوردہ ہو گیا تھا کہ اسے ضائع کر دیا گیا۔

نمبر۱۱ "تذکرۂ شورش" کو دوسری بار ڈاکٹر محمود الٰہی نے مرتب کیا اور انھوں نے اس کا صحیح نام "رموزالشعرا" معلوم کیا۔ نمبر۱۳ "گلشنِ سخن" کا سنہِ تکمیل ۱۱۹۳ھ لکھتے ہیں۔ صحیح ۱۱۹۴ھ ہے کیونکہ خود اس تذکرے میں ایک واقعے کو ۱۱۹۴ھ سے متعلق قرار دیا ہے (حنیف، ص۵۲۴)۔ نمبر۱۴ "گلِ عجائب" کا سنہِ تکمیل ۱۱۹۷ھ دیا ہے۔ خود نسخے کے آخر میں جو دو قطعات تاریخ ہیں ان میں سے دوسرے سے ۱۱۹۶ھ حاصل ہوتا ہے اور اسی کو تاریخِ تکمیل ماننا چاہیے۔ نمبر۱۷ "عیارالشعرا" کا سنہ ۱۲۱۳ھ دیا ہے۔ اس کا مطالعہ کر کے حنیف نقوی نے لکھا ہے:

> اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ "عیارالشعرا" ۱۲۰۸ھ/۹۴-۱۷۹۳ء یا اس سے کچھ دن پہلے سے، ۱۲۴۷ھ/۳۲-۱۸۳۱ء کے کچھ بعد تک مؤلف کی خصوصی توجہات کا مرکز بنا رہا۔
>
> (ص۱۰۷)

نمبر۱۵ "تذکرۂ عشقی" کا سنہ ۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ لکھا ہے۔ حنیف احمد نقوی نے مطالعے کے بعد طے کیا کہ اس کا آغاز ۱۱۸۸ھ سے قبل اور اختتام ۱۲۴۶ھ کے قریب ہوا ہے ("شعرائے اردو کے تذکرے"، ص۶۲۵)۔

مضمون نگار نے معدوم تذکروں کا بیان بڑے عمقِ نظر سے کیا ہے۔ فہرست دینے کے بعد اہم تذکروں پر مختصراً، لیکن واقف کارانہ انداز سے لکھا ہے۔ ص۵۱۶ پر "بہاروخزاں" کے تعارف میں سہواً اس کے مصنف کا نام اسد علی خاں تمنا لکھ دیا ہے، جب کہ ص۵۰۸ پر صحیح نام بہاءالدین حسین عروج لکھا تھا۔ ص۵۱۷ پر "تذکرۂ شورش" کا نام

Scanned by CamScanner

"یادگارِ دوستاں" لکھتے ہیں لیکن محمود الٰہی نے اس کا نام "رموز الشعرا" طے کیا ہے۔
کہا جا سکتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے اس مشکل موضوع کے باب کو بڑی تحقیقی دقتِ نظری کے ساتھ لکھا ہے۔ جلد کے آخر میں مدیرِ عمومی کا مختصر مجموعی جائزہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مجموعی جائزہ ضرور دیا جانا چاہیے اور اسے مدیرِ عمومی کے سوا اور کون لکھ سکتا تھا۔ میری رائے میں اس جلد کا معیار پہلی جلد کے مقابلے میں بہتر اور بلند تر ہے۔ بعض مضامین بہت اچھے ہیں، بعض میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے، جیسا کہ مختلف مصنفین پر لکھتے ہوئے صراحت کردی گئی ہے۔ ابواب کی ترتیب، یعنی خاکہ قدرے بہتر ہو سکتا تھا۔

آٹھویں جلد۔ اردو ادب (سوم)

(۱۸۰۳ء تا ۱۸۵۷ء)

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بھی ایک اہم موڑ ہے اور معاشرتی، ذہنی اور ادبی اعتبار سے بھی ایک سنگِ میل ہے، لیکن اردو کی تاریخِ ادب میں ایک دشواری یہ نظر آتی ہے کہ اردو نظم و نثر کے کئی عمائد کے کارنامے آدھے ادھر، آدھے اُدھر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس پھیلاو اور چھلاو کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ پوری انیسویں صدی کو ایک ہی جلد میں سمیٹ لیا جاتا تو بہتر تھا۔
حسبِ معمول پہلا باب سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر کا ہے جسے ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ اس میں دہلی اور اودھ دونوں کو لیا ہے۔ مختصراً کہہ سکتا ہوں کہ یہ باب اچھے سے اچھا ہے، معلومات افروز بھی اور دلچسپ بھی، جسے ایک علمی داستان کے طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ دوسرا باب "ادبی پس منظر" بھی خوب ہے۔ اس میں ص ۵۷ پر ذوق کی ایسی چار غزلوں کی نشان دہی کی ہے جو ناسخ کے رنگ میں ہیں۔ ذوق پر ناسخ کے اثرات کا یہ بیان مفید ہے۔ ص ۶۴ پر صہبائی کے تذکرے "انتخابِ دواوین" کا سنہ ۱۸۴۴ء یا ۱۸۴۶ء لکھا ہے۔ اسے ڈاکٹر تنویر علوی نے دہلی یونی ورسٹی سے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ وہ اطلاع دیتے ہیں کہ یہ اصلاً ۱۸۴۴ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا (ص ۶۴)۔ اسی صفحے پر کریم الدین کے تذکرے کا نام "طبقات الشعرا" لکھا ہے۔ یہ نام قدرت اللہ شوق کے تذکرے کا ہے۔ کریم الدین کے تذکرے کا نام "طبقاتِ شعرائے ہند" ہے۔
تیسرا باب، "فورٹ ولیم کالج کے مصنفین،" ممتاز منگلوری نے لکھا ہے۔ اس کی ابتدا میں گِل کرسٹ پر بہت اچھا لکھا ہے۔ ص ۷۰-۷۹ پر اس کی کتابوں کی فہرست بہت

Scanned by CamScanner

جامع ہے۔ اس میں عتیق صدیقی کی فہرست کی ایک کتاب نظر نہیں آئی۔

The Hindoostanee Directory or Students Introductor

("گل کرسٹ اور اس کا عہد"، ص ۱۹۰)

ڈاکٹر سمیع اللہ نے اس کتاب کا نام یوں لکھا ہے:

The Hidoostanee Dictionary or Student's Introductor to the Hindoostanee Language.

("اردو کے تصنیفی ادارے"، ص ۱۰۸)

ممتاز منگلوری نے ایک کتاب کا نام The Hindee Orthoepical Elocution لکھا ہے جب کہ عتیق صدیقی، عبیدہ بیگم اور سمیع اللہ نے آخری لفظ Elocution کے بجائے Ultimatum لکھا ہے جو صحیح ہونا چاہیے۔

مضمون نگار نے ص ۲۷ پر میر امن کی "گنج خوبی" کی تاریخ تکمیل ۱۸۰۳ء لکھی ہے، جب کہ خود کتاب کے آخر میں دیے قطعات تاریخ سے ۱۲۱۹ھ بر آمد ہوتا ہے جو برابر ہے ۵-۱۸۰۴ء کے (عبیدہ بیگم، ص ۴۵۱)۔ ص ۵۷ پر عزت اللہ بنگالی کی "گل بکاولی" کی تاریخ ۱۱۲۴ھ لکھی ہے۔ یہ دراصل اس کے محبوب نذر محمد کے انتقال کا سنہ ہے۔ ۱۱۲۴ھ نہیں، ۱۱۳۴ھ جو فارسی مخطوطے میں الفاظ میں موجود ہے۔ عزت اللہ نے نذر محمد کی یاد میں یہ قصہ لکھا، معلوم نہیں کتنے عرصے کے اندر؟ (عبیدہ بیگم، ص ۷-۲۳۶)۔

مضمون نگار نے فورٹ ولیم کے اہم مصنفین پر مختصراً لکھا ہے، ان کی تصانیف پر کماحقہ بحث نہیں کی۔ میر امن پر کُل ڈھائی صفحے بہت کم ہیں جب کہ ایک اور باب میں رجب علی بیگ سرور کو نو دس صفحے دیے ہیں۔ نہال چند لاہوری اور مذہب عشق کو ایک صفحے سے بھی کم ملا ہے۔ ص ۷۷ پر للولال کی "لطائف ہندی" کے بارے میں یہ اہم اطلاع دینی تھی کہ اس کے اردو اور ہندی متون کی زبان مختلف ہے (عبیدہ، ص ۴۱۵)۔ حیدر بخش حیدری جیسے کثیر التصانیف اہلِ قلم کو محض سوا صفحہ دیا ہے، جو بہت کم ہے۔ ص ۷۹ پر ان کی مثنوی "ہفت پیکر" کی تاریخ ۱۸۰۵ء دی ہے۔ صحیح ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء ہے۔ ہجری سنہ کئی قطعات تاریخ سے بر آمد ہوتا ہے (عبیدہ، ص ۳۹۵، ۳۹۷)۔ حیدری کی "گلزار دانش" کو نایاب لکھا ہے لیکن اب اسے عبادت بریلوی نے شائع کر دیا ہے۔ ص ۸۰ پر بہادر علی حسینی کی ایک تالیف کا نام "تاریخِ آسام" دیا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ، جو اس کا مطالعہ کر چکی ہیں، اسے "تاریخ آشام" یا "تاریخِ آشام" لکھتی ہیں (ص ۵۴۷)۔

ص ۸۵ پر مرزا جان طپش کی "بہارِ دانش" کا سنہ ۱۸۰۹ء لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ نے اس کی تاریخ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء لکھی ہے (ص ۱۸۳)۔ ص ۸۶ پر حفیظ الدین کی "خرد افروز" کے

Scanned by CamScanner

لیے لکھا ہے کہ یہ ۱۸۰۴ء میں چھپی۔ عتیق صدیقی نے اپنی کتاب میں ایک فہرست ان کتابوں کی دی ہے جو طباعت کے لیے تیار کی جا رہی ہیں۔ ان میں "خرد افروز" کے آگے ۱۸۰۴ء لکھا ہے (طبع اول، ۱۹۶) لیکن ڈاکٹر عبیدہ بیگم لکھتی ہیں کہ اس کے ترقیمے میں سنہ تکمیل ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء دیا ہے۔ یہ ۱۸۰۹ء میں مکمل طور سے شائع ہوئی (عبیدہ بیگم، ص ۳۵۳)۔ مضمون نگار نے ص ۸۶ پر حمید الدین کی کتاب "خوانِ الوان" کی تاریخ تالیف ۱۸۰۴ء دی ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ ان کے مطابق اس کی فارسی اصل کا نام "خوانِ الوان" ہے جب کہ حمید الدین کے اردو ترجمے کا نام "خوانِ نعمت" ہے۔ یہ ۱۸۰۳ء میں طبع ہوئی (عبیدہ؛ ص ۵۱۰)۔

کہہ سکتے ہیں کہ مضمون نگار نے فورٹ ولیم کالج کے جملہ مصنّفین کو لیا، لیکن ان پر کمی کے ساتھ لکھا ہے، خاص طور سے ان کی کتابوں کے نمونے نہیں دیے، ان پر خاطر خواہ تبصرہ بھی نہیں کیا۔

اسی باب کا دوسرا حصّہ "دہلی کالج کی علمی خدمات" ہے جو ممتاز صاحب ہی نے لکھا ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے اسے دلّی کالج لکھنا چاہیے تھا، دہلی کالج نہیں۔ اس کالج کے مصنّفین پر میری نظر نہیں۔ صرف دو ایک مشاہدات پیش کرتا ہوں:

ص ۹۴ پر مولوی ذکاء اللہ کی تاریخِ ولادت یکم اپریل ۱۸۳۲ء لکھی ہے۔ مضمون نگار فٹ نوٹ میں درست لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی ایک کتاب میں ۱۸۳۷ء لکھا ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا۔ ذکاء اللہ کے سوانح نگار سی ایف اینڈروز نے ان کی تاریخِ ولادت ۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء لکھی ہے جو صحیح تسلیم کی جانی چاہیے (۲)۔ ص ۹۵ پر مولانا محمد حسین آزاد کی ولادت ۱۸۲۷ء لکھی ہے۔ دراصل ۱۰ جون ۱۸۳۰ء ہے جو خود اسی تاریخ ادبیات کی چوتھی جلد میں ڈاکٹر صادق نے ص ۳۰۸ پر دی ہے۔ آزاد کے عالمِ جنون کی ایک کتاب کا نام "سپاکِ غم ناک" چھپا ہے (ص ۹۵)۔ صحیح نام "سپاک و نماک" ہے۔ ص ۹۶ پر کریم الدین کا نام مولوی کریم اللہ لکھا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ۱۸۵۷ء تک کی جلد میں مولوی ذکاء اللہ اور مولانا آزاد جیسے مصنّفین کا برائے نام ذکر کیا جائے جن کے جملہ کارنامے ۱۸۵۷ء کے بعد کے، یعنی چوتھی جلد کے ہیں۔ خاکہ بنانے والوں کو ان کے شمول کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ ظاہرا دہلی کالج کے مصنّفین پر بھی مختصر لکھا ہے۔ لیکن یہ کیوں کر کہا جائے، کیونکہ ان مصنّفین کا زیادہ کام ۱۸۵۷ء کے بعد ظہور میں آیا۔

چوتھا باب بھی نثر نگاروں کے متعلق ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ رجب علی

Scanned by CamScanner

بیگ سرور کے بارے میں ہے، جسے پروفیسر وقار عظیم نے لکھا ہے۔ دوسرا حصہ سرسید وغیرہ کے بارے میں ہے، جسے خواجہ محمد زکریا نے لکھا ہے۔ پہلے لیجیے سرور کا حصہ۔ وقار عظیم "ہماری داستانیں" کے مصنف ہیں، اچھے نقاد ہیں، لیکن تحقیق سے انھیں شغف نہیں۔ ص ۱۰۰ پر "گلزار سرور" کی تاریخ ۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ لکھی ہے۔ میں نے اس کی تاریخ ۱۲۷۶ھ طے کی ہے (نثری داستانیں، لکھنؤ، ص ۵۶۷)۔ اسی صفحے پر "شبستانِ سرور" کی تاریخ ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ لکھی ہے۔ صحیح ۱۲۷۹ھ ہے (نیر مسعود: "رجب علی بیگ سرور"، ص ۲۹۱)۔ نیر مسعود کی کتاب وقار عظیم کے ماخذ میں ہے۔ ص ۱۰۰ پر بھی کئی جگہ اس سے حوالے دیے ہیں، لیکن انھوں نے اس سے تحقیقی استفادہ نہیں کیا۔ ص ۵-۱۰۴ پر "فسانۂ عبرت" جیسی اہم کتاب کی تنقید کمزور ہے۔ تحقیقی اعتبار سے تو یہ حصہ تشنہ ہے ہی۔ مجموعی طور پر اس سے تشفی نہیں ہوتی۔

دوسرے حصے "سرسید احمد خاں" کے اس جلد میں دینے کا جواز نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء تک "آثار الصنادید" کے علاوہ ان کی کوئی اہم کتاب سامنے نہیں آئی۔ ان کی زندگی کا بیشتر کارنامہ ۱۸۵۷ء کے بعد، یعنی چوتھی جلد کے دور میں آتا ہے، جہاں ان پر ۳ صفحے لکھے گئے ہیں۔ تیسری جلد میں ان پر ۱۱ صفحے ہیں۔ یہ کیسی تاریخ ہے جس میں ایک ادیب دو دو جلدوں میں آتا ہے۔ کس نے اس کا خاکہ بنایا۔ اس طرح ایک مصنف کے حصے بخرے کر دیے گئے ہیں۔ بہرحال سرسید کی ۱۸۵۷ء تک کی کتابوں کی فہرست تلاش کے ساتھ دی ہے۔ چوتھی جلد میں جو فہرست دی ہے اس میں ۱۸۵۷ء سے قبل ایک کتاب زیادہ ہے جو تیسری جلد میں مندرج نہیں۔ وہ یہ ہے:

ترجمۂ فیصلہ جاتِ صدرِ مشرقی و صدرِ غربی، ۱۸۴۹ء۔

(جلد ۴، ص ۱۷۵)

زیرِ نظر تیسری جلد میں ص ۱۱۳ پر ایک کتاب کا نام "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" چھپا ہے۔ صحت نامے میں پہلے لفظ "فوائد" کی تصحیح کر کے "فوائد" لکھا ہے لیکن آخری لفظ "الفرجار" کی تصحیح نہیں کی جو "الفرجار" ہونا چاہیے۔ اس کی تاریخ دو حوالوں سے ۱۸۴۶ء یا ۱۸۶۴ء دی ہے، لیکن ترجیح ۱۸۴۶ء کو دی ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے کتاب کو دیکھ کر اس کے نام میں "الفرجار" لکھا ہے اور سنہ طباعت ۱۸۴۶ء درج کیا ہے (سرسید اور ہندوستانی مسلمان، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۳)۔ یہی تاریخ جلد ۴، ص ۵۷ پر ہے۔ مضمون کے آخری حصے میں "آثار الصنادید" کی پہلی اور دوسری اشاعت کا تقابلی مطالعہ خوب ہے۔ اشاعتِ اوّل نوادر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اقتباس اہلِ نظر کے لیے نعمت ہے۔ اس

Scanned by CamScanner

طرح ۱۸۵۷ء تک کے سرسید کے بارے میں قابلِ قدر انداز میں لکھا ہے۔

سرسید کے بعد مولوی کریم الدین پر لکھا ہے۔ ان کی کتابوں کی فہرست بہت تلاش سے دی ہے۔ اس میں ص ۱۲۰ پر ان کے مشہور تذکرے کا نام "طبقات الشعراے ہند" لکھا ہے، صحیح "طبقاتِ شعراے ہند" ہے۔ غلام امام شہید کی تاریخِ وفات کے لیے لکھتے ہیں کہ عبداللہ خاں خویشگی نے ۱۸۷۹ء لکھی ہے لیکن غلام غوث بے خبر کے مادّۂ تاریخ ع:

وائے امام شعرا شہید شد

سے ۱۸۷۶ء (۱۲۹۲ھ) نکلتا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(ص ۱۲۳)

مادّۂ تاریخ موجودہ صورت میں غیر موزوں ہے۔ صحیح متن ہے ع:

وائے امام شعرا شد شہید

اس سے ۱۲۹۲ھ نکلتا ہے جو مطابق ہے ۱۸۷۵ء کے۔ مضمون نگار نے ۱۸۷۶ء کو پہلے لکھ کر ۱۲۹۲ھ کو قوسین میں دیا ہے جس سے ایسا لگتا ہے کہ مادّۂ تاریخ کے اعداد ۱۸۷۶ء ہیں۔ مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں شہید کے انتقال کے مندرجۂ بالا مادّے کے علاوہ دو اور مادّے دیے ہیں ع:

شد شہیدِ عشق شاہِ عالمیں

۱۲۹۶ھ

اور

آہ "اربابِ درد" پر طاری پھر ہوا "ماتمِ امامِ شہید"

۴۱۴+ ۱۲۹۶=۸۸۲ھ

مالک رام نے صحیح تاریخِ وفات ۴ صفر ۱۲۹۶ھ/۲۸ جنوری ۱۸۷۹ء بھی دی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۲۹۶ھ ہی صحیح سنہِ وفات ہے۔ بے خبر کے مادّے کا پہلا مصرع نہیں دیا۔ ممکن ہے اس میں "۴" اعداد جوڑنے کا قرینہ ہو۔ ص ۱۲۳ پر ان کی دوسری کتاب کا نام "مولا شریفِ شہید" چھپا ہے جو سہوِ طباعت ہے۔ پہلا لفظ "مولا" کے بجاے مولد ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں مولود کی جگہ مولد کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ یہ مادّۂ تاریخ بھی نہیں کیونکہ اس نام سے محض ۹۸۹ حاصل ہوتا ہے۔ اس کتاب کی صحیح تاریخ مجھے معلوم نہیں۔ ان کی دوسری کتاب "انشاے بہارِ بے خزاں" ۱۸۶۶ء کی ہے۔ اگر ان کی کتابیں ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہیں تو انھیں تیسری جلد کے بجاے چوتھی جلد میں جگہ دینی چاہیے تھی۔

Scanned by CamScanner

ص ۱۲۶ پر لکھا ہے کہ آزردہ کا تذکرہ ناپید ہے۔ اب مختار الدین احمد نے اسے دریافت کر کے شائع کر دیا ہے۔ ص ۱۲۷ کے حاشیہ نمبر ۲ میں "فرہنگ عامرہ" کے مرتب کا نام عبدالحکیم خاں خویشگی لکھا ہے۔ صحیح محمد عبداللہ خاں خویشگی ہے۔ اس حصے میں متعدد مجہول الاسم مصنفین کا ذکر ہے۔ مولوی قطب الدین دہلوی، منشی چرنجی لال، مفتی سعد اللہ رام پوری، عباس بن ناصر، مولوی ضیاء الدین۔ ان میں سے کوئی بھی تاریخ ادب میں جلی عنوان کا مستحق نہ تھا۔ خواجہ امان کو تیسری جلد میں دینے کا جواز نہیں، کیونکہ ان کا ترجمہ "بوستانِ خیال" ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے۔ لکھتے ہیں پہلی جلد ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی (ص ۱۳۰) واقعی یہی تاریخ اشاعت ہے، لیکن ترجمہ ۱۸۵۸ء میں ہو چکا تھا۔

اس کے بعد دکن کے نثر نگار دیے ہیں۔ ان میں ص ۱۳۴ پر محمد ابراہیم بیجاپوری کی "انوار سہیلی" کا سالِ طبع ۱۸۴۴ء لکھا ہے۔ صحیح سنِ طبع ۱۸۲۴ء اور سنِ تکمیل ۱۸۲۲ء ہے، جو خود کتاب میں دیا ہے۔ کتاب کا نام "دکن انجمن" بھی مترجم نے دیا ہے: (فرزانہ بیگم: "دکھنی کی نثری داستانیں"، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۳)۔ ص ۱۳۵ پر لکھتے ہیں کہ حسین علی خاں نے ۱۸۳۴ء میں "چار درویش" کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔ یہاں یہ بھی واضح کرنا چاہیے تھا کہ یہ ترجمہ نامکمل ہے۔ اس میں دوسرے درویش کی سیر کے صرف تین صفحے ہیں۔ چونکہ مصنف کا نسخہ ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ آگے ترجمہ کیا ہی نہیں (نثری داستانیں، ص ۲۵۶)۔ لکھتے ہیں کہ اسی سال، یعنی ۱۸۳۴ء میں "بہار دانش" کا ترجمہ "ہمیشہ بہار" کے نام سے کیا (ص ۱۳۵)۔ لیکن فرزانہ بیگم نے اپنی کتاب کے ص ۲۰۴ پر ترجمے کی تاریخ ۱۲۴۴ھ لکھی ہے جو مطابق ہے ۲۹-۱۸۲۸ء کے۔

اس کے آگے ذیلی فصل کا عنوان ہے: "نثری داستانیں"۔ چونکہ اس سے پہلے ابراہیم بیجاپوری اور حسین علی خاں بھی حکایت و داستاں نویس تھے اس لیے بہتر ہوتا کہ امتیاز کے لیے نئی فصل کا عنوان "شمالی ہند کی نثری داستانیں" ہوتا۔ اس جزو میں ص ۱۳۵ پر انشا کی ولادت ۱۷۶۰ء میں لکھی ہے۔ مالک رام نے تحقیقی مضامین نیز "تذکرۂ ماہ و سال" میں اس کا صحیح سنہ صفر ۱۱۶۶ھ (دسمبر ۱۷۵۲ء) درج کیا ہے۔ مضمون نگار نے اگلے صفحے ۱۳۶ پر "رانی کیتکی کی کہانی" کا سنہ ۱۸۰۳ء لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ سنہ کیوں رائج ہو گیا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ انشا کے محقق ڈاکٹر عابد پیشاوری کا قیاس ہے کہ یہ داستان ۱۷۸۸ء اور ۱۷۹۰ء کے بیچ لکھی گئی ("انشاء اللہ خاں انشا"، ص ۴۴۴)۔

ص ۱۳۹ پر "گلشنِ نوبہار" کی تاریخ ۱۸۰۷ء لکھی ہے۔ خود کتاب میں درج قطعۂ تاریخ میں اس کا سنہ ۱۲۲۰ھ دیا ہے۔ اس کے پہلے نو مہینے ۱۸۰۵ء میں پڑتے ہیں اور آخری تین

Scanned by CamScanner

مہینے ۱۸۰۶ء میں۔ اگر ایک عیسوی سنہ لکھنا ہے تو ۱۸۰۵ء لکھا جا سکتا ہے۔ ص ۱۴۰ پر وہ ڈاکٹر محمود نقوی (سہیل بخاری) کے مقالے کی سند پر "گل صنوبر" کے مصنف کا نام پیم چند لکھتے ہیں اور نیم چند کو غلط قرار دیتے ہیں، لیکن مجھے اصرار ہے کہ صحیح نام نیم چند ہی ہے۔ پرانے نسخوں میں یہی ملتا ہے، دتاسی اور کریم الدین نے یہی لکھا ہے۔ اس داستان کے مرتب رفیق مارہروی نے بھی نیم چند ہی تسلیم کیا ہے۔

مضمون نگار ص ۱۴۰ پر "اگر گل" کے مصنف کا نام عاصی لکھتے ہیں۔ دراصل اس کا مؤلف سعادت علی خاں ناصر ہے۔ مشفق خواجہ نے "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" کے دیباچے میں یہ ثابت کر دیا، چنانچہ خلیل الرحمان داؤدی کے مرتب کردہ نسخے (جنوری ۱۹۶۷ء) میں ایک چیپی چپکا کر اسے ناصر ہی سے منسوب کیا ہے (نثری داستانیں، ص ۶۰۸)۔

اس باب میں کافی اہلِ قلم کا ذکر کیا گیا، لیکن کئی تحقیقی تسامح در آئے جن کی وجہ سے اسے اوسط درجے کی تحریر کہا جا سکتا ہے۔

پانچویں باب میں تین حصّوں میں تین شعرا کو لیا ہے، شاہ نصیر، ذوق اور ظفر۔ شاہ نصیر پر ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے لیکن انھوں نے "آبِ حیات" میں لکھے ہوئے ذوق و نصیر کے مبینہ معرکوں کی صحت کا جائزہ نہیں لیا، بلکہ ان کا ذکر ہی نہیں کیا۔ نصیر پر ساڑھے نو صفحے لکھے ہیں اور اچھے لکھے ہیں، لیکن اردو ادب کی تاریخ میں شاہ نصیر اتنے بڑے شاعر نہیں کہ اس تاریخ میں انھیں اتنے زیادہ صفحے دیے جائیں جب کہ اسی جلد میں میر امن کو ڈھائی صفحے ملے ہیں، گو تاریخِ ادب میں میر امن کا مقام شاہ نصیر سے بدرجہا زیادہ بلند ہے۔

ذوق پر راحت افزا بخاری نے باشتراک نادرہ زیدی لکھا ہے۔ انھوں نے ذوق کی تاریخِ ولادت ۱۸ دسمبر ۱۷۹۵ء/۱۱ ذی الحجہ ۱۲۵۴ھ لکھی ہے (ص ۱۵۲)۔ یہ عیسوی تاریخ مطابق ہے ۱۲۱۰ھ کے اور ہجری تاریخ مطابق ہے ۱۸۳۹ء کے۔ ظاہرا ہجری تاریخ ۱۲۰۴ھ لکھی ہوگی لیکن اسے صحت نامے میں بھی درست نہیں کیا گیا۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ مطابق ہے ۱۷۹۰ء کے۔ ذوق کا صحیح سنہِ ولادت ۱۲۰۳ھ/۸۹-۱۷۸۸ء ہے (تنویر علوی، "کلیاتِ ذوق"، ص ۳۰۔ عابد پیشاوری: "ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص ۴۳)۔ یہی ہجری سنہ "اودھ اخبار" میں دیا ہے۔ مضمون نگاروں نے ذوق کی تاریخِ وفات درست لکھی ہے لیکن ان کا یہ حاشیہ صحیح نہیں کہ "اردو اخبار" نے تاریخِ وفات ۱۷ دسمبر ۱۸۵۴ء/۲۵ ربیع الاول ۱۸۵۴ء (کذا) لکھی ہے۔ "اردو اخبار" میں تاریخِ وفات ۲۳ صفر ۱۲۷۱ھ/۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء دی ہے (عابد، ص ۶۲)۔ یہی مضمون نگاروں نے متن میں درج کی ہے۔

Scanned by CamScanner

مضمون نگاروں نے ذوق کے سلسلے میں "آبِ حیات" پر بھروسا کیا ہے، حالانکہ آزاد نے ذوق کے معاملے میں اپنے عقیدت پرست تخیل سے بھرپور کام لیا ہے۔ وہ شاہ نصیر کی ذوق سے خفگی کی وجہ اِس غزل "...ہوشِ نقشِ پا، ...ہم آغوشِ نقشِ پا" کو قرار دیتے ہیں جسے ڈاکٹر صادق اور ڈاکٹر عابد پیشاوری جعلی مانتے ہیں، یعنی یہ ذوق کی تصنیف نہیں، آزاد کی تصنیف ہے جو انھوں نے شاہ نصیر کو غیر معقول دکھانے کے لیے گھڑلی ہے (عابد: "ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص۴۱-۴۰، نیز ۴۷-۱۴۶)۔ مضمون نگاروں نے ص۱۵۶ پر اور پھر ص۱۶۷ پر کتابیات میں کریم الدین احمد کے تذکرے "طبقات الشعرا" کا ذکر کیا ہے۔ دونوں نام غلط ہیں۔ تذکرہ نگار کے نام کے آخر میں ایک لفظ زیادہ اور تذکرے کے آخر میں ایک لفظ کم ہے۔ تذکرہ نگار کا نام کریم الدین اور تذکرے کا نام "طبقات شعرائے ہند" ہے۔ "طبقات الشعرا" قدرت کے تذکرے کا نام ہے۔ مماثل ناموں میں صحت کا زیادہ ہی خیال رکھنا چاہیے۔

ص۱۵۶ پر "آبِ حیات" کی تقلید میں ایک قصیدے کو "قصیدۂ ہفت دہ زبان" سمجھ کر اس پر "خاقانیِ ہند" کا خطاب دلا دیا، لیکن اس قصیدے کے محض تین شعر ملتے ہیں۔ کون جانے کہ اس میں ۱۷ زبانیں تھیں کہ نہیں اور یہ بھی ثابت نہیں کہ "خاقانیِ ہند" کا خطاب اسی قصیدے پر ملا (عابد، ص۲۷-۲۶)

ذوق پر یہ مضمون تحقیقی اعتبار سے بالکل سپاٹ ہے۔ تنقید کے اعتبار سے غنیمت ہے۔ اس پر گروپ کیپٹن صاحب نے ایک تنقیدی ضمیمہ چپکا دیا ہے۔

تیسرا جزو "بہادر شاہ ظفر" نادرہ زیدی نے لکھا ہے۔ ظفر کا کلام ذوق کا کہا ہوا نہیں، اس کے رد کے لیے داخلی شہادت بہم پہنچائی ہے، یعنی اس کے موضوع اور لہجے کو ظفر سے مخصوص کیا ہے۔ اس کے خارجی اور تحقیقی پہلو پر ایک لفظ نہیں لکھا۔ چوتھا جزو "تلامذۂ ذوق" ڈاکٹر اسلم فرخی نے لکھا ہے۔ کاش پہلا جزو "ذوق" اس ماہرِ ذوق سے لکھایا ہوتا۔ زمانی اعتبار سے تلامذۂ ذوق کو چوتھی جلد میں آنا چاہیے، کیونکہ ان کا کلام ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے۔ ان تلامذہ میں ظفر، داغ، آزاد، ظہیر، انور، ویران اور مذاق بدایونی کا ذکر ہے۔ ظہیر کا ایک دیوان انیسویں صدی کے بالکل آخر میں تیار ہوا اور بقیہ دو دیوان بیسویں صدی میں مرتب اور شائع ہوئے۔ قبلِ ۱۸۵۷ء کی جلد میں ایسے شاعر کا نام بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ مضمون نگار نے دوسرے دیوان کا سنہ اشاعت ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء دیا ہے۔ تیسرے دیوان "دفترِ خیال" کا ذکر ہی نہیں کیا۔ دوسرا اور تیسرا دونوں دیوان ۱۳۲۵ھ میں مکمل ہوئے (مختار شمیم: "ظہیر دہلوی"، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص۹۰)۔ تلامذۂ ذوق کا موضوع، حالانکہ اس جلد کی حدود سے آگے کا

Scanned by CamScanner

ہے، لیکن مضمون نگار نے اسے بہت اچھی طرح لکھا ہے۔

چھٹے باب کا پہلا جزو "مومن" ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے۔ یہ سوانح اور تنقید دونوں اعتبار سے اعلیٰ ہے۔ عبادت لکھتے ہیں:

کلیاتِ مومن کو شیفتہ نے ۱۸۲۵ء/۱۲۴۳ھ میں جمع کیا۔

(ص ۲۰۱)

لیکن ۱۲۴۳ھ مطابق ہے ۲۸-۱۸۲۷ء کے۔ دوسرا جزو "شیفتہ" شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ یہ بھی تحقیق و تنقید دونوں کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ تیسرا جزو "تلامذۂ مومن" ناظر حسین زیدی کا لکھا ہوا ہے۔ مومن کے دو شاگرد تسکین اور آہی ابنِ تسکین تھے۔ حیرت ہے کہ بیٹے آہی کا ذکر پہلے ہے، ص ۲۳۲ پر، پھر ایک اور شاگرد کا اور اس کے بعد ص ۲۳۳ پر آہی کے والد تسکین کا۔ خاکہ نگاری کا نقص دیکھیے کہ تسکین کا ذکر بعد میں ایک اور باب میں ص ۲۹۰-۹۱ پر بھی ہے اور وہاں بھی انھیں ناظر حسین زیدی نے لکھا ہے۔ بہر حال تلامذۂ مومن کا باب ٹھیک ہے۔

ساتواں باب "مرزا اسد اللہ خاں غالب" پروفیسر موسےٰ کلیم نے لکھا ہے۔ ہندوستان میں ہمارے لیے یہ نام بالکل اجنبی ہے۔ انھوں نے سوانح نہایت مختصر لکھی ہے۔ حد یہ ہے کہ غالب کا سنہ ولادت تک نہیں دیا۔ طرح طرح کے ماحول کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ تحقیقی اعتبار سے یہ باب بہت تشنہ ہے۔ شاعری کی تنقید میں اردو اور فارسی شاعری کو ملا کر پیش کیا ہے۔ آٹھویں باب کے چار حصے ہیں جن میں سے چوتھے کا ذکر کتاب کے شروع میں فہرست میں محذوف ہو گیا ہے۔

(الف) اس دور کے دیگر شعرا۔

(ب) تلامذۂ غالب۔

(ج) دہلی کے دیگر شعرا۔

(د) لکھنؤ کے شعرا۔

پہلے تین اجزا کو ناظر حسین زیدی نے لکھا ہے۔ چوتھے جزو کے مصنف کا نام فہرست ابواب میں چھوٹ گیا ہے۔ ظاہراً اسے بھی زیدی نے لکھا ہوگا۔ اس جزو کے بیشتر شعرا آتش و ناسخ کے شاگرد ہیں۔ اس جلد میں انھیں شاگردوں کا ذکر مناسب تھا جو ۱۸۵۷ء تک انتقال کر گئے، مثلاً صبا، رند، نسیم۔ اس موڑ کے بعد زندہ رہنے والوں، مثلاً نواب مرزا شوق، اسیر، بحر وغیرہ، کو چوتھی جلد میں لیا جا سکتا تھا۔ کچھ سنین دیکھ لیں:

Scanned by CamScanner

مضمون نگار	دوسرے مؤرخ
ص۲۹۵، وزیر: ف ۱۸۶۰ء (۱۲۷۷ھ)	ڈاکٹر ابواللیث: ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، ص۲۵۱) مالک رام بھی یہی ہجری تاریخ۔ عیسوی سنہ دونوں کتابوں میں غلط۔
ص۲۹۸، منیر شکوہ آبادی: ف ۱۸۹۱ء	ابواللیث: ۱۲۹۷ھ (ص۳۶۹) مالک رام: ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء
ص۲۹۹، اسیر: پ ۱۸۰۲ء	ابواللیث و مالک رام: ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱-۱۸۰۰ء)
ص۲۹۹، اسیر: ف ۱۸۸۱ء	ابواللیث: ۱۲۹۹ھ۔ مالک رام: ۱۷ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ/۷ فروری ۱۸۸۲ء
ص۳۰۲، واجد علی شاہ: ولادت ۱۸۲۷ء	مسعود حسن رضوی: ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۲ء ("سلطانِ عالم واجد علی شاہ"، ص۲۷)

اس باب میں کئی شعرا کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ صبا، وزیر، نسیم، رشک، منیر، نواب مرزا شوق اور واجد علی شاہ کو محض آدھا یا پون صفحہ دیا ہے جو عدمِ توازن ہے۔ نسیم کی "گلزارِ نسیم" کا کوئی نمونہ نہیں دیا۔ نسیم، شوق اور اختر کو محض آدھا آدھا صفحہ دینا اس تاریخِ ادب کے رخ پر ایک داغ رہے گا۔

نویں باب کے تین اجزا ہیں: "انیس،" "دبیر،" "مرثیہ نگاری بعدِ انیس۔" ان تینوں کو ڈاکٹر ناظر حسین زیدی نے لکھا ہے۔ وہ ص۳۰۶ پر انیس کا سنہِ ولادت ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۵ء کے بیچ لکھتے ہیں۔ سنہِ وفات دیا ہی نہیں۔ قطعی سنہِ ولادت ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء ہے جو مالک رام نے تذکرے میں اور اکبر حیدری نے اپنی کتاب "اودھ میں مرثیے کا ارتقا" ص۵۶۹ پر لکھا ہے۔ مضمون نگار نے انیس کی سوانح کم لکھی ہے، تنقیدی حصہ وافر ہے۔ دبیر کی سوانح بھی بقدرِ بایست نہیں۔ اسی صفحے کے فٹ نوٹ (۲) میں سہواً "فسانۂ عجائب" کے مصنف کا نام "آزاد، محمد حسین" چھاپ دیا گیا ہے اور اسے صحت نامے میں بھی درست نہیں کیا گیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقالہ نگار کی غائب ذہنی کا نتیجہ ہے۔ تیسرا جزو "مرثیہ بعدِ انیس" ہے۔ انیس کا انتقال ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ بعدِ انیس یعنی بعدِ ۱۸۷۴ء کا جزو چوتھی جلد میں پیش کرنا چاہیے تھا۔ یہاں مضمون نگار نے صرف دو مرثیہ گویوں میر مونس اور

Scanned by CamScanner

حسین مرزا عشق لکھنوی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں عشق کا سنہ ولادت و وفات معلوم نہ ہو سکا (ص ۳۴۴)۔ ان کی وفات کی صحیح تاریخ ۲۴ شعبان ۱۳۰۳ھ (۲۸ مئی ۱۸۸۶ء) ہے۔ چونکہ انھوں نے ہجری سنہ سے ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا تھا اس لیے سنہ ولادت ۱۲۳۳ھ مانا جا سکتا ہے (ڈاکٹر جعفر رضا: "دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی" (الہ آباد، طبعِ دوم، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰-۱۰۶)۔

دسواں باب "صحافت" عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے۔ اس جلد کا عرصہ ۱۸۵۷ء تک ہے، لیکن مضمون نگار اس میں ص ۳۴۵ پر عنوان دیتے ہیں: "مغربی پاکستان کے دوسرے اخبارات" اور ص ۳۴۶ پر عنوان لگاتے ہیں: "ہندوستان کے دوسرے اخبار" گویا ملک کی تقسیم ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ ادبی تاریخ میں مورخ کو ناموں کی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس سے قطعِ نظر، ڈاکٹر خورشید صحافت کے ماہر ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت تحقیقی صحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

گیارھواں باب، "تذکرے"، خواجہ محمد زکریا نے لکھا ہے۔ اس کے بعض اندراجات پر اپنے مشاہدات پیش کرتا ہوں:

ص ۳۵۷ کے آخری پیرے میں "گلشنِ بے خزاں" کو سہواً "گلدستۂ بے خزاں" لکھ دیا ہے۔ ص ۳۵۸ کے فٹ نوٹ میں "عمدۂ منتخبہ" کے مرتب کا نام نثار احمد فاروقی لکھا ہے۔ ہونا چاہیے: خواجہ احمد فاروقی۔ متن میں اس کی ابتدا کی تاریخ کے لیے لکھتے ہیں:

> "عمدۂ منتخبہ" کے الفاظ سے بھی ۱۸۰۱ء (۱۲۱۶ھ) سن نکلتا ہے۔
> (ص ۳۵۸)

اس سے ایسا لگتا ہے کہ نام سے ۱۸۰۱ کے اعداد حاصل ہوتے ہیں جن کا متوازی ہجری سنہ قوسین میں دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ۱۲۱۶ھ سنہ آغاز نکلتا ہے۔ لکھنا چاہیے تھا "۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء)"۔ مضمون نگار نے سنہ تکمیل ۱۸۰۴ء (۱۲۱۹ھ) لکھا ہے لیکن ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے دکھایا کہ اس میں ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء تک اضافے ہوتے رہے ("شعرائے اردو کے تذکرے"، ص ۴۴۷)۔

ص ۳۵۹ پر شاہ کمال کے تذکرے کا نام "مجموعۃ الانتخاب" دیا ہے۔ سالار جنگ لائبریری میں اس کے دو نسخے ہیں، ایک مکمل اور دوسرا نامکمل۔ میری نظر سے گزرے ہیں۔ مکمل نسخے کے ترقیمے میں نام "مجمع الانتخاب" دیا ہے اور تاریخ ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ۔ نثار احمد فاروقی نے "تین تذکرے" میں اس کی تاریخ ۱۲۱۸ھ اور سنہ کتابت ۱۲۱۹ھ لکھا ہے۔ فاروقی کے مطابق نسخۂ انجمن میں سلیمان شکوہ کی ۱۲۵۳ھ میں وفات کا ذکر ہے، یعنی اس تاریخ تک

Scanned by CamScanner

اضافے ہوتے رہے ("تین تذکرے"، دہلی، ۱۹۶۸ء)۔

مضمون نگار نے "مجموعۂ نغز" کے سلسلے میں ایسے ۱۵ واقعات کی فہرست دی جنھیں "آبِ حیات" میں "مجموعۂ نغز" سے لیا گیا (ص ۳۶۱)۔ میں اسے ان کی ذاتی تحقیق سمجھ کر متاثر ہوا، لیکن "مجموعۂ نغز" نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ محمود شیرانی نے یہ سب دیے ہیں۔ کاش مضمون نگار نے اپنے ماخذ کا اعتراف کر لیا ہوتا۔ ص ۳۶۷ پر "مدائح الشعرا" کی تاریخ ۱۸۴۴ء دی ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی کتاب "شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" میں ۱۲۵۳ھ لکھی ہے جو ۳۸-۱۸۳۷ء کے برابر ہے۔ ص ۳۷۰ پر کریم الدین کے تذکرے کا نام "طبقات الشعرائے ہند" لکھا ہے۔ صحیح "طبقاتِ شعرائے ہند" ہے۔

ص ۳۷۲ پر نصر اللہ خویشگی کے تذکرے "گلشنِ ہمیشہ بہار" کا سالِ تصنیف فرمان فتح پوری کے مطابق ۱۲۵۳ھ اور اسلم فرخی کے مطابق ۱۲۵۷ھ درج کرتے ہیں۔ اسلم فرخی کے دلائل کو پڑھا جائے تو ۱۲۵۷ھ ہی صحیح سنہ معلوم ہوتا ہے (مقدمہ "گلشنِ ہمیشہ بہار"، مرتبۂ اسلم فرخی، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۸-۳۷)۔

اس مضمون کو پڑھ کر مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے باب کے اختصار کے باوجود اسے بہت تشفی بخش طریقے پر لکھا ہے۔ بارھواں باب، "لسانی خصوصیات"، ابواللیث صدیقی کے قلم سے ہے۔ اس میں انھوں نے زبان کی تبدیلیوں اور زبان کے ارتقا کی شرح کی ہے۔ ان کا پورا مضمون اعلیٰ درجے کا ہے۔

تیرھویں مضمون کے تین اجزا ہیں: "بچوں کا ادب" از ڈاکٹر اسد اریب، "عورتوں کا ادب" از نادرہ زیدی، "سوانح عمریاں" از ڈاکٹر سید شاہ علی باشتراکِ ڈاکٹر عبدالغنی۔ اسد اریب بچوں کے ادب پر تحقیقی مقالے کے مصنف ہیں۔ اس جلد کے دور میں بچوں کا ادب تو ملتا نہیں، صرف نصابی کتابیں ہیں اور اریب نے انھیں کی تفصیل دی ہے۔ انھوں نے ص ۴۰۰ پر "خالق باری" کا سنہ ۱۶۲۱ء/۱۰۳۱ھ لکھا ہے۔ یہ تاریخ ضیاء الدین خسرو کے نسخے کی ہے، جسے محمود شیرانی نے دریافت کیا، لیکن اس کے برعکس کافی مضبوط دلائل ہیں کہ امیر خسرو نے "خالق باری" لکھی تھی، گو موجودہ نسخے میں بہت سا الحاق اور ترمیم در آئی ہے۔ مجھے اس میں شبہہ ہے کہ بچوں کے ادب میں بچوں کی درسی کتابیں یا ابتدائی قاعدے شامل کیے جا سکتے ہیں۔ بہر حال ان کے بارے میں مضمون نگار نے بہت اچھی تحقیق کی ہے۔ مجھے محمد ابراہیم مقبہ کا نام اسی مضمون سے معلوم ہوا (ص ۴۰۲)۔ آخر میں انھوں نے جو مفصل کتابیات دی ہے اس میں ۱۸۵۷ء تک کی درسی کتابوں کو الگ کر کے لکھ دیتے تو بہتر ہوتا۔

Scanned by CamScanner

اگلا جزو "عورتوں کا ادب" ہے۔ اس عنوان کے کیا معنی ہیں، وہ ادب جو عورتوں کے لیے لکھا جائے یا وہ جسے عورتیں تخلیق کریں؟ میرے نزدیک پہلی تعریف صحیح ہے۔ اس دور میں عورتوں کے لیے ادب تو ہے نہیں، مضمون نگار نے زبردستی کچھ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ ص ۱۶-۴۱۴ پر "کربل کتھا" کا ذکر ہے۔ اوّل تو یہ کتاب اس جلد کی زمانی حد سے پہلے کی ہے، دوسرے اسے عورتوں کا ادب کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ کیا یہ مردوں کے پڑھنے کے لیے نہیں۔ اس کے آگے "باغ و بہار"، "اخلاقِ ہندی"، "توتا کہانی" اور "بیتال پچیسی" کو عورتوں کے ادب میں شامل کرنے کو کیا کہا جائے، جو مضمون نگار نے کیا ہے۔ اس کے بعد عورتوں کی لکھی ہوئی کتابوں مثلاً "قصہ سوداگر" از نصوبی نیز شاعرات کی شاعری کا ذکر ہے۔ یہ عورتوں کی تخلیقات ہیں، لیکن ان کا موضوع خصوصیت سے عورتوں کے لیے نہیں۔

تیسرا جزو سوانح نگاری کا ہے۔ مضمون نگار نے بہ مشکل چند سوانحات تلاش کیں۔ سرسید کی "آثار الصنادید"، "سیرتِ فریدیہ" اور ماسٹر رام چندر کی "تذکرۃ الکاملین"۔ لکھتے ہیں:

> "حزنِ اختر" مثنوی ہے۔ یہ ۱۸۴۸ء میں واجد علی شاہ اختر نے تصنیف کی، جب وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قید تھے۔
>
> (ص ۴۲۹)

ان دو جملوں سے کئی باتیں معلوم ہوئیں: واجد علی شاہ ۱۸۵۶ء میں نہیں، اس سے بہت پہلے ۱۸۴۸ء میں نظر بند ہو چکے تھے۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۴۸ء میں موجود تھا۔ یہ محض درسی ادارہ نہ تھا، بلکہ جیل خانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔

افسوس ہوتا ہے، ان جملوں کے مصنف ڈاکٹر سید شاہ علی ہیں جو فنِ سوانح نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھ چکے ہیں۔ مسعود حسن رضوی اطلاع دیتے ہیں کہ واجد علی شاہ ۱۵ جون ۱۸۵۷ء سے ۹ جولائی ۱۸۵۹ء تک فورٹ ولیم کلکتہ میں نظر بند رہے۔ مثنوی قید کی حالت میں لکھی۔ اس کی تاریخِ طبع ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹-۶۰ء) ہے ("سلطانِ عالم واجد علی شاہ" ص ۸۲-۱۸۱)۔ سچ یہ ہے کہ اس دور میں صرف ایک سوانح "سیرتِ فریدیہ" ہی لکھی گئی۔ "آثار الصنادید" کے آخری حصے اور "تذکرۃ الکاملین" میں سوانحی مضامین ہیں۔

اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تینوں موضوعات: "بچوں کا ادب"، "عورتوں کا ادب"، "سوانح عمریاں" اس جلد کی حد تک اس لائق نہیں کہ کتاب میں علاحدہ عنوانات کے تحت دیے جائیں۔ ان کے لیے مواد کا فقدان ہے، یہ حشو ہیں، خاکے میں ان کو علاحدہ

Scanned by CamScanner

حیثیت دبستان کم نظری کا غماز ہے۔ آخر میں مدیرِ عمومی کا مختصر جائزہ ہے، جو محض رسمی ہے، بے جان ہے۔ اس میں ص ۳۳۴ پر عنوان "نثر" ہے جس کے بعد منظومات کا ذکر ہے لیکن ص ۴۳۶ پر عنوان "داستان نویسی" ہے گویا یہ نثر کے تحت نہیں آتی۔ اگر اس دور کی نثر سے داستانوں کو الگ کر لیا جائے تو اس میں کیا بچے گا۔ اس عنوان سے سوا نو سطریں لکھ کر داستانوں کے جائزے کا حق ادا کر دیا۔ کیا اس میں داستان کا مفصل ارتقا نہیں دکھانا چاہیے تھا۔

اس جلد میں معدودے چند باب اچھے ہیں، بقیہ ابواب پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو اس جلد کو عالمانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی حد نے متعدد ادیبوں کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔

نویں جلد۔ اردو ادب (چہارم)

(۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)

حسبِ معمول پہلا باب سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر کا ہے جیسے حسبِ معمول ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے اور جو ۴۴ صفحوں کو محیط ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شرح و بسط سے لکھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس میں جو واقعات دیے گئے ہیں وہ ہمارے زمانے سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ایک ہوش مند قاری کو پہلے ہی سے معلوم ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ابواب کے شروع میں بھی مضمون نگاروں نے حسبِ ضرورت مختصر پس منظر دے دیا ہے جو ادب سے براہِ راست متعلق ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ ایک باب "علی گڑھ تحریک" کے عنوان سے دے دیا جاتا اور اسی میں مختصراً سیاسی اور سماجی پس منظر آ جاتا۔ مجھے چند مشاہدات پیش کرنے ہیں:

تاریخی واقعات کے بیان میں تاریخی ترتیب ضروری ہے۔ یہاں بعض اوقات اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے، مثلاً ص ۹ پر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام اور ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کا ذکر کرتے ہیں۔ ص ۱۱ پر ۱۸۶۷ء پر پلٹ آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> کانگریسی راہنما بال گنگادھر تلک کی مسلم دشمن سرگرمیوں کے ردِ عمل کے طور پر اور ہندوؤں کے مذہبی و لسانی تعصبات اور مسلم آزاری کے جذبات کی شدت سے متاثر ہو کر "انجمنِ دفاعِ مسلمین"، یعنی "محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن" قائم ہوئی۔
>
> (ص ۱۷)

میرے لیے یہ اطلاع نئی ہے کہ تلک مسلم دشمن تھے۔ کانگریس میں اس وقت گرم دل اور نرم دل تھے۔ گوپال کرشن گوکھلے نرم دل کے لیڈر تھے، بال گنگادھر تلک گرم دل کے جو انگریزی حکومت سے تندی سے لڑنے والا تھا۔ حسرت موہانی اسی لیے ان کے بھگت تھے:

مغموم نہ ہو خاطرِ حسرت کہ تلک تک
پیغامِ وفا بادِ سحر لے کے گئی ہے

حسرت کی تلک سے عقیدت کے سلسلے میں ملاحظہ ہو: احمر لاری کا تحقیقی مقالہ "حسرت موہانی حیات اور کارنامے" (گورکھ پور، ۱۹۷۳ء) ص۸۶-۸۵۔ حسرت نے زمانۂ طالبِ علمی میں تلک کو اپنا سیاسی پیشوا قرار دیا۔ ۱۹۰۷ء میں گرم دل کے مقتدر تلک اور ان کے پیرو حسرت موہانی کانگریس سے نکل آئے (لاری، ص۸۶)۔ نومبر ۱۹۰۹ء کے "اردوے معلیٰ" میں لکھا:

> پالیٹکس میں ہم مقتداے وطن پرستاں مسٹر تلک اور سرگروہِ احرار بابو اربندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔
>
> (لاری، ص۹۰)

مضمون نگار لکھتے ہیں:

> سرسید کے انتقال کے دو سال بعد ۱۹۰۰ء میں ہندوؤں کے اصرار پر صوبجات متحدہ کی سرکاری، تعلیمی، قانونی اور تجارتی زبان ہندی اور رسم الخط ناگری قرار دے دیا گیا، جس سے مسلمانوں کو نہ صرف جذباتی دھکّہ (کذا) لگا، بلکہ ان کے اقتصادی اور ثقافتی مفادات بھی متاثر ہوئے۔ (ص۱۷)

ہمیں، ہندوستان میں، ادبی تاریخ میں ہندو مسلمان کی اصطلاح میں بات کرنا بڑا عجیب لگتا ہے۔ ہندی والوں کی جگہ ہندو اور اردو والوں کی جگہ مسلمان کہہ کر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو مسلمانوں کی۔ ہندوستان میں ہم اس مطابقت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ جہاں تک میکڈانل کے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کے فیصلے کا تعلق ہے اس کے بارے میں اردو میں یہ غلط تاثر دیا جاتا ہے کہ اس کی رُو سے اردو کو ہٹا کر ہندی کو یوپی کی واحد سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ اس کے برعکس ہوا یہ تھا کہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کی بھی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کی تین دفعات یہ تھیں:

۱۔ ہر شخص اپنی درخواستیں حسبِ خواہش ناگری یا اردو رسم الخط میں دے سکتا ہے۔
۲۔ عدالتوں یا افسرانِ مال کی جانب سے پبلک کے لیے تمام سمن، اعلان اور مراسلے

Scanned by CamScanner

فارسی اور ناگری دونوں خطوط میں ہوں گے۔

۳۔ خالص انگریزی دفتروں کے سوا کسی بھی دفتری اسامی پر ایسے شخص کا تقرر نہیں کیا جائے گا جو ناگری اور فارسی حروف کو روانی سے لکھ پڑھ نہ سکے (۷)۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں اردو کے ساتھ کون سی حق تلفی کی گئی۔ اگر اردو یہ چاہتی تھی کہ وہ بلاشرکت غیرے دفتروں اور عدالتوں پر قابض رہے تو یہ اس کی زیادتی تھی۔ بہر حال اس حکم کے باوجود عملاً عدالتوں کی زبان اردو رسم الخط میں اردو ہی رہی۔ اگر کبھی دیوناگری خط استعمال کیا گیا تو بھی زبان وہی عدالتی اردو تھی۔

لکھتے ہیں:

"رلما کرشنا"، "سوامی وو کنندا" (ص ۳۲)

ہندو ناموں سے اتنی ناواقفیت! معلوم ہوتا ہے محض انگریزی میں پڑھا ہے۔ ان کے صحیح نام سوامی رام کرشن، سوامی وویکانند ہیں۔ وویکانند کے انداز کو "جارحانہ عسکری انداز" کہنا نامناسب ہے، دیانند سرسوتی کے انداز کو ایسا کہا جا سکتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اس جلد کے پس منظری باب میں پہلی جلد کے پس منظری مضمون کی طرح جہاں بھی ہندوؤں کا ذکر آتا ہے وہاں ان میں ساری خرابیاں بسا دی جاتی ہیں۔ مذہبی کتابوں میں جیسے جی چاہے لکھیے لیکن ادبی تاریخ میں جو صرف پاکستانی قارئین کے لیے نہیں، بلکہ ہندوستان کے غیر مسلم قارئین کے لیے بھی ہے، جارحانہ مذہبی انداز مناسب نہیں۔

دوسرا باب "ادبی پس منظر" کا ہے۔ وہ بھی شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ اس میں ص ۴۹-۴۸ پر مدیر عمومی نے فٹ نوٹ میں اکبر الہ آبادی کے بارے میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ مدیر کا فٹ نوٹ میں کچھ لکھنا صرف اسی صورت میں مناسب ہے کہ اسے کسی مضمون نگار کے بیان میں کچھ تصحیح کرنی ہو۔ کیا اسے اضافے کا بھی حق ہے، میں نہیں کہہ سکتا۔ مضمون نگار کی تحریر پر مدیر عمومی نے اکتفا نہیں کیا اور انھوں نے "ادبی ماحول، مجموعی تاثر" کے عنوان سے دو صفحوں کا اضافہ بھی کیا۔ یہ چنداں ضروری نہ تھا کیونکہ مضمون نگار کی "ادبی پس منظر" کی تحریر کافی بھرپور ہے۔

تیسرا باب "سرسید احمد خاں" پروفیسر محمد فرمان نے لکھا ہے۔ سوانح، تحقیق اور تنقید ہر اعتبار سے یہ بہت خوب ہے۔ اس میں ص ۷۱ پر سرسید کے دو بیٹوں کے نام سید احمد اور سید محمود لکھے ہیں۔ سید احمد سہو طباعت ہو سکتا ہے۔ صحیح سید حامد ہے (عتیق صدیقی: "سرسید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ"، ص ۴۷)۔ چوتھا باب "مولانا الطاف حسین حالی" ڈاکٹر عبدالقیوم نے لکھا ہے۔ اس میں ص ۱۲۱ پر "حیاتِ سعدی" کی تاریخ کی بحث

Scanned by CamScanner

اچھی ہے۔ مضمون مفصل اور قابلِ تحسین ہے۔ اس میں حالی کی کسی نثری کتاب کا اقتباس نہیں دیا۔ ہوتا تو جامعیت کو اور تقویت ملتی۔ پانچواں باب اکبر الہ آبادی کے بارے میں ہے، جسے ڈاکٹر محمد صادق نے لکھا ہے:

یہاں مجھے اس جلد کے خاکے یعنی تقسیم ابواب کے بارے میں دو حروف کہنے ہیں۔ ابواب میں تاریخی ترتیب اور موضوعی ہم آہنگی دونوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ سرسید کے ساتھ علی گڑھ تحریک اور انجمنِ پنجاب کے نثر نگاروں کا بیان کرنا چاہیے تھا۔ ان ادیبوں کے سنہ ولادت یہ ہیں:

سرسید: ۱۸۱۷ء، محمد حسین آزاد: ۱۸۳۰ء، نذیر احمد: ۳۱-۱۸۳۰ء، حالی: ۱۸۳۷ء، شبلی: ۱۸۵۷ء۔

علی گڑھ اور لاہور کی مناسبتوں کو تاریخ کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہوئے ترتیب یوں ہو سکتی تھی۔ سرسید، نذیر احمد، آزاد، حالی، شبلی۔ اس طرح اردو نثر کے عناصرِ خمسہ ایک جگہ ہو گئے۔ سرسید کے بعد ان کے مخالف نذیر احمد، نذیر احمد کے بعد ان کے دوست آزاد، آزاد اور حالی کا انجمنِ پنجاب میں ساتھ ہے، حالی اور شبلی دونوں اردو کے بڑے سوانح نگار ہیں۔ ساتویں باب میں سے ذکاء اللہ کو نکال کر شبلی کے بعد رکھا جا سکتا تھا تاکہ دونوں مؤرخ پہلو بہ پہلو بیٹھ جاتے۔ گیارھویں باب میں شرر اور سرشار کا ذکر ہے۔ چودھواں باب، "دوسرے ناول نگار" ان کے فوراً بعد آنا چاہیے تھا۔ ان کے بعد ساتویں باب کے دوسرے مصنفین یعنی کم اہم اہلِ قلم کو لے سکتے تھے، یعنی مندرجۂ بالا تمام اساطینِ ادب کے بعد۔ ان کے بعد شاعروں کو لیتے۔ فی الوقت انھیں دو باب دیے ہیں۔

پانچواں باب: "اکبر الہ آبادی"

آٹھواں باب: (الف) غزل گو شعرا (ب) دیگر شعرا

چونکہ آٹھویں باب کے جزو غزل گو شعرا میں امیر و داغ وغیرہ کا ذکر ہے اور وہ شاعری کے ارتقا کے لحاظ سے اکبر الہ آبادی کے مقابلے میں فرسودہ ہیں اس لیے آٹھویں باب کا عنوان ہونا چاہیے تھا: "امیر و داغ اور ان کے معاصرین"۔ اس کے بعد اکبر الہ آبادی کو لاتے پھر جزو "دیگر شعرا" کو جو نسبتاً کم اہم ہیں۔ بہرحال ترتیب ابواب کئی طریقے سے ممکن ہے۔ کیسے بھی کی جائے کوئی معترض یا مصلح کسی دوسرے طریقے کو بہتر قرار دے گا۔

ڈاکٹر صادق نے ص ۱۳۸ پر اکبر کی تاریخِ وفات ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء لکھی ہے۔ رام بابو سکسینہ اور مالک رام نے ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء درج کی ہے۔ اس باب میں ص ۱۶۹ پر ایک شعر یوں لکھا ہے:

Scanned by CamScanner

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ سید سے
اڈے کو گر چھوڑ جائیں کہاں

دوسرا مصرع صریحاً بےوزن ہے، یعنی غلط نقل ہوا ہے۔ مضمون میں اکبر کی تنقید بہت اچھی ہے لیکن انھیں ۳۵ صفحے دینا دوسرے شعرا کو دیے گئے صفحوں کے پیش نظر عدم توازن ہے تاریخ میں میر کو ۲۳ صفحے، غالب کو ۳۲ صفحے اور اکبر کو ۳۵ صفحے نذر کرنا خاکہ بنانے والوں کی کوتاہی ہے۔ علی گڑھ تاریخ کے خاکے میں ہر باب اور ذیلی موضوعات و مصنّفین کے لیے صفحوں کی تعداد پہلے سے مقرر کر دی گئی تھی۔ ایسا نہ ہو تو ہر قلم کار بے مہار ہو کر اطناب کرنا چاہے گا کیونکہ اسے معاوضہ بھی فی صفحہ ملتا ہے۔

چھٹا باب، "محمد شبلی نعمانی"، پروفیسر محمد فرمان نے لکھا ہے۔ کل ۳۳ صفحے ہیں جن میں سوانح کے محض ڈھائی صفحے ہیں جو کم ہیں، مثلاً اس میں عطیہ کا ذکر ہی نہیں۔ شبلی کی شخصیت اور کارناموں پر تفصیل سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ مضمون نگار نے شاید عقیدت و سعادت مندی کے سبب ان کی شخصیت کے رومانی پہلو سے بالکل صَرفِ نظر کرنا مناسب سمجھا۔ ساتواں باب، "دوسرے مصنّفین"، عبیداللہ خاں نے لکھا ہے۔ اس میں محسن الملک، چراغ علی، وقار الملک، ذکاء اللہ، سید احمد دہلوی، سید علی بلگرامی، صفیر بلگرامی، امداد امام اثر، وحید الدین سلیم، عزیز مرزا، مرزا حیرت دہلوی، سجاد مرزا، محمد جعفر تھانیسری اور پیارے لال آشوب کو لیا ہے۔ اس باب کے مصنّفین میں سب سے پہلے ذکاء اللہ پر لکھنا چاہیے تھا کیونکہ وہ اہم مصنّف بھی ہیں اور سنہ ولادت کے لحاظ سے بھی دوسروں پر سبقت رکھتے ہیں۔ وہ صرف مؤرخ ہی نہیں، انھوں نے بہ کثرت مضمون نگاری بھی کی ہے۔

محسن الملک کے بارے میں ایک دلچسپ واقعے کو حذف کر بیٹھے ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں جب گورنر یوپی نے اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتوں میں بار دے دیا اس فیصلے کے خلاف "اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" نے لکھنؤ میں ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو ایک بڑا جلسہ کیا جس کی صدارت محسن الملک نے کی اور جہاں انھوں نے مصرع پڑھا ع:

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس کے بعد گورنر میکڈانل نومبر ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ گیا اور وہاں محسن الملک پر دباؤ ڈالا کہ اگر وہ کالج کے سیکریٹری بنے رہنا چاہتے ہیں تو اردو تحریک سے وابستگی اور ناگری ہندی کی مخالفت ترک کرنی ہوگی۔ محسن الملک کا حوصلہ ع:

واں چیں جبیں پہ آئی، یہاں رنگ زرد تھا

Scanned by CamScanner

سے زیادہ نہ تھا۔ انھوں "اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" سے قطع تعلق کر لیا، اردو کے سلسلے میں عرض داشت پر دست خط کرنے سے انکار کر دیا اور گورنر سے تحریری معافی مانگی (۸)۔

ص۲۱۶ پر چراغ علی کے چار رسائل کی اشاعت کی اطلاع دیتے ہیں۔ مجھے عرض کرنا ہے کہ میں نے چراغ علی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ۳۰ تا ۳۵ پتلے رسالے مرکزی حیدر آباد یونی ورسٹی لائبریری میں خریدوائے تھے۔ ص۲۱۷ پر وقار الملک کا سنہ ولادت ۱۸۳۹ء دیا ہے لیکن ساتھ ہی فٹ نوٹ لکھتے ہیں کہ مولانا غلام رسول مہر نے "نقوش" شخصیات نمبر میں تاریخ پیدائش ۱۴ مارچ ۱۸۴۱ء تحریر کی ہے۔ مضمون نگار نے اس تاریخ پر ۱۸۳۹ء کو ترجیح دینے کی وجہ نہیں لکھی۔ مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں "وقارِ حیات" کے حوالے سے ۱۹ محرم ۱۲۵۷ھ/۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء لکھی ہے۔ ان کی ہجری اور عیسوی تاریخ میں مطابقت ہے اور یہی تاریخیں صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ حامد حسن قادری نے "داستانِ تاریخِ اردو"، طبعِ دوم، ص۳۶۴ پر ۱۸۳۹ء/۱۲۵۷ھ لکھ کر "اِدھر بھی ہے، اُدھر بھی" کی کیفیت پیدا کر دی ہے کیونکہ ان کے ہجری اور عیسوی سنہ میں مطابقت نہیں۔ ۱۲۵۷ھ برابر ہے ۱۸۴۱ء کے۔

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی کو محض دو صفحات دیے ہیں۔ مضمون نگار اور قارئین کو یہ اندازہ نہ ہوگا کہ ذکاء اللہ کے مضامین کی تعداد گیارہ سو کے لگ بھگ ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے تحقیقی مقالے "اردو مضمون کا ارتقا، ۱۹۵۰ء تک" (حیدر آباد، ۱۹۷۲ء) سے یہ چونکانے والا انکشاف ہوا۔ صفیر بلگرامی نے تین اردو دیوان، تین فارسی دیوان اور ۲۶ مثنویاں لکھی ہیں (ص۲۲۸)۔ مضمون نگار کو یہ علم نہ ہوگا کہ اردو کے جملہ اہلِ قلم میں اپنے بارے میں صفیر جس دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں کوئی دوسرا نہ لیتا ہوگا۔ ایک جگہ انھوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ۹۵۲ لکھی ہے جس میں تین سو رباعیات کو ۳۰۰ تصانیف کے طور پر شمار کیا ہے۔

(ظفر اوگانوی: "صفیر بلگرامی"، کلکتہ، ۱۹۷۶ء، ص۹۷-۹۶)

ظفر کو اُن کی کل ۳۰ تصانیف کا پتا چلا، جن میں چھ دیوان یا مجموعۂ منظومات ہیں اور پانچ مثنویاں۔ دیوان سب کے سب اردو میں ہیں، فارسی کا ایک دیوان نہیں (ایضاً، ص۱۰۱ اور اس کے بعد)۔ مضمون نگار کو صفیر بلگرامی پر لکھتے وقت ان کے تذکرے "جلوۂ خضر" کے بارے میں کچھ تفصیلات دینی چاہیے تھیں کہ وہ اردو زبان کے عہد بعہد ارتقا کے لحاظ سے اہم تذکرہ ہے۔

امداد امام اثر کو پورا ایک صفحہ بھی نہیں دیا، حالانکہ "کاشف الحقائق" تنقیدی حیثیت سے اہم ہے۔ وحید الدین سلیم کی اہم ترین کتاب "وضعِ اصطلاحات" کے بارے میں محض

Scanned by CamScanner

ایک جملہ لکھا ہے، حالانکہ وہ زیادہ توجہ، بلکہ تحسین کی سزاوار تھی۔ حیدر آباد کے عزیز مرزا کے بیٹے سجاد مرزا بیگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی ولادت اور وفات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا (ص ۲۳۴)۔ حیدر آباد کے ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کے مطابق سجاد مرزا کی ولادت ۲۱ مارچ ۱۸۹۸ء کو اور وفات ۲۰ جنوری ۱۹۷۴ء کو ہوئی ("محمد عزیز مرزا، شخصیت اور کارنامے"، حیدر آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۹۸-۹۷)۔

اس باب میں تاریخی ترتیب کی یہ کمی ہے کہ سجاد مرزا (ولادت: ۱۸۹۸ء) پہلے، اور محمد جعفر تھانیسری نیز پیارے لال آشوب، (دونوں کی ولادت: ۱۸۳۸ء) بعد میں مذکور ہیں۔ مضمون میں معلومات کافی ہیں، مضمون نگار نے کافی محنت کی ہے، لیکن بعض مصنّفین کے بارے میں اور زیادہ لکھنا چاہیے تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ ادارے کی طرف سے صفحات کی تحدید تو نہیں تھی؟

آٹھواں باب، "غزل گو شعرا"، ناظر حسین زیدی نے لکھا ہے۔ اس کے شروع میں کئی صفحوں کا ادبی منظر نامہ ہے جس میں دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد کے اس دور کے ادبی ماحول کا بیان خوب ہے۔ یہ باب بالخصوص داغ و امیر اور ان کے معاصرین کے بارے میں ہے۔ حیرت ہے کہ داغ کے سلسلے میں مثنوی "فریادِ داغ" کا نہ ذکر ہے نہ تبصرہ ہے، نہ اس کا ذکر ہے۔ ص ۲۶۵ پر امیر مینائی کی تاریخِ وفات ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۰ء لکھی ہے، لیکن امیر کے محقق ڈاکٹر ابو محمد سحر نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء طے کی ہے ("مطالعۂ امیر"، ص ۲۷۹)۔ مالک رام نے بھی ۱۳ اکتوبر ہی لکھی ہے۔ جلال پر بہت مختصر لکھا ہے۔ حالات محض آدھے صفحے پر ہیں۔ ان کی جملہ کتابوں کے نام ہیں، نہ زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات کی تفصیل۔ غرضیکہ یہ باب تشنہ معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا حصّہ (ب) "دیگر شعرا" بھی ڈاکٹر ناظر حسین کی تحریر ہے۔ یہاں بھی آٹھ صفحوں کا ادبی منظر نامہ یا اس عہد کے ادب کا مجموعی جائزہ ہے جو پہلے جزو (الف) کے متوازی بیان کی طرح قابلِ قدر ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے محسن کاکوروی کا ذکر ہے۔ ص ۲۷۹ پر ان کا سنہ ولادت ۱۸۲۷ء لکھا ہے مالک رام نے ۲۳ صفر ۱۲۴۲ھ/ ۲۶ ستمبر ۱۸۲۶ء لکھا ہے جو صحیح ہونا چاہیے۔ محسن کے بعد اسماعیل میرٹھی، نوبت رائے نظر، نادر کاکوروی، درگا سہائے سرور، خوشی محمد ناظر اور غلام بھیک نیرنگ ہیں۔ اس طرح اس دور کے تمام قابلِ ذکر شعرا کو لے لیا ہے۔

تیسرا جزو (ج) "قومی اور ملّی شاعری" سہیل احمد خاں نے لکھا ہے۔ ۱۳ صفحے کا یہ جزو اطمینان بخش ہے۔

Scanned by CamScanner

نواں باب محمد حسین آزاد، ماہر آزاد ڈاکٹر محمد صادق نے لکھا ہے۔ انھوں نے "آبِ حیات" میں آزاد کے بعض بیانات کو اس سختی سے نہیں پرکھا جو محمود شیرانی، اسلم فرخی یا عابد پیشاوری کا وطیرہ ہے، مثلاً ڈاکٹر صادق نے ص ۳۰۹ پر بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہے کہ آزاد ذوق کے شاگرد تھے جب کہ اس کے خلاف اسلم فرخی نے بہت سی شہادتیں پیش کی ہیں (۹)۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر صادق نے بغیر پرکھے آزاد کا یہ لچر دعویٰ تسلیم کر لیا کہ وہ ۲۰ برس تک دن رات ذوق کی حضوری میں رہے ہیں (ص ۳۱۰)۔ عابد نے دکھایا کہ ذوق کے انتقال کے وقت آزاد کی عمر محض ساڑھے چوبیس سال تھی۔ بیس برس حضوری میں رہنے کے معنی ہیں کہ وہ ساڑھے چار سال کی عمر سے مصاحبت کرنے لگے تھے۔ مضمون نگار نے ص ۳۱۵ پر "آبِ حیات" کا سنہ تصنیف ۱۸۸۱ء لکھا ہے۔ اسلم فرخی نے واضح کیا کہ یہ ۱۸۸۰ء کے آخر میں شائع ہوئی (حوالہ: "مکتوباتِ آزاد" ص ۱۹۔ اسلم فرخی، جلد ۲، ص ۱۴)۔

ان معمولی مشاہدات سے قطعِ نظر ڈاکٹر صادق نے یہ باب بہت عالمانہ انداز سے لکھا ہے۔ ص ۳۱۹ پر "نیرنگِ خیال" کے مضامین کے انگریزی مآخذ کی مفصل فہرست اس کا ثبوت ہے، لیکن انھوں نے "آبِ حیات" کی غلطیوں کی جس طرح کمزور صفائی پیش کی ہے وہ آزاد کی طرف داری کے سوا کچھ نہیں۔ "آبِ حیات" کی ان غلطیوں کو وہ کیا کہیں گے جن میں قصداً غلط بیانی کی گئی ہے۔

دسواں باب نذیر احمد دہلوی افتخار احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ نذیر احمد ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۷ء تک اعظم گڑھ میں کلکٹر رہے (ص ۳۳۶)۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ انیسویں صدی میں کسی ہندوستانی کے کلکٹر ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی نے لکھا ہے کہ ۱۸۷۲ء کے قریب ان کا تبادلہ اعظم گڑھ میں سینیر ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ہو گیا ("نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے"، ص ۱۹) یہی صحیح ہونا چاہیے۔ اس سے قطعِ نظر افتخار احمد صدیقی کا یہ باب تحقیقی اعتبار سے بہت عالمانہ ہے، کتابوں کا تعارف بہت دقتِ نظر سے کرایا ہے اور تنقیدی اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے۔

گیارھواں باب عبدالحلیم شرر سید وقار عظیم نے لکھا ہے۔ وقار عظیم کی تحریروں میں تحقیقی پہلو نمایاں نہیں ہوتا، لیکن یہ باب تحقیق و تنقید دونوں کے اعتبار سے اعلیٰ ہے۔ اس باب کا حصہ (ب) "رتن ناتھ سرشار" ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے سرشار کی وفات کی تاریخ نہیں دی، تصانیف کی فہرست میں سنہ نہیں دیا جو کہ تاریخِ ادب میں متوقع ہے۔ غرضیکہ تحقیقی اعتبار سے تو یہ باب صفر ہے ہی، تنقید میں بھی سرسری اور تشنہ ہے۔

Scanned by CamScanner

بارھواں باب "اردو ڈراما" عشرت رحمانی نے لکھا ہے۔ وہ ڈرامے کے ماہر ہیں، چنانچہ انھوں نے اس باب کو اپنے اعلیٰ معیار سے لکھا ہے۔ اتنا پھیلا ہوا موضوع تھا لیکن انھوں نے ہر پہلو یعنی ڈرامے کی اقسام، ڈراما نگار اور ان کی تخلیقات سب پر خوب خوب لکھا ہے۔ انھوں نے ص ۴۳۲ پر طالب بنارسی کا سنہ ولادت ۱۸۵۲ء لکھا ہے۔ مالک رام نے اپنے تذکرے میں ص ۲۵۲ پر ۱۸۴۸ء درج کیا ہے۔ ص ۴۳۳ پر احسن لکھنوی کا سنہ وفات ۱۹۳۰ء لکھا ہے۔ صحیح تاریخ ۳۱ اگست ۱۹۳۹ء ہے جو مسعود حسن رضوی نے ان کی قبر کے کتبے سے نقل کی اور مجھے نیر مسعود نے فراہم کی۔ ڈراموں کے سنین کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

تیرھویں باب کے چار حصے ہیں۔ جزو (الف) "سوانح" الطاف فاطمہ نے لکھا ہے جو ان کا موضوع ہے۔ انھوں نے بعض کتابوں کا سنہ تکمیل دینے کے بجائے کئی سالوں پر پھیلا ہوا زمانۂ تخلیق دیا ہے، جس سے انتشار پیدا ہوتا ہے، مثلاً ص ۴۳۹ پر "حیاتِ جاوید" کا سنہ تصنیف و اشاعت ۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۱ء لکھا ہے۔ بہتر یہ ہوتا کہ اس کا سنہ اشاعت ۱۹۰۱ء قطعی طور پر لکھ دیا جاتا۔ ص ۴۴۲ پر انھوں نے شبلی کی لکھی سوانح عمریوں کے آگے اکثر دو دو سنین لکھے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی ہند، دہلی کی طرف سے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا کتابچہ "شبلی" ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس کی مدد سے مضمون نگار کی مندرجہ تاریخوں کی تصحیح کرتا ہوں:

الطاف فاطمہ	دوسرے مؤرخین
ص ۴۴۲، شبلی: "المامون"، ۸۹-۱۸۸۷ء	ظفر احمد: ۱۸۸۸ء میں شائع ("شبلی"، ص ۴۹)
ص ۴۴۲، "سیرۃ النعمان"، ۹۰-۱۸۸۹ء	[ظفر احمد: پہلا حصہ ۱۸۸۹ء میں، دوسرا ۱۸۹۰ء میں تصنیف۔ طباعت آخر ۱۸۹۱ء (ایضاً، ص ۵۱)
ص ۴۴۲، "الفاروق"، ۹۸-۱۸۹۴ء	ظفر احمد: تکمیل ۱۸۹۸ء، اشاعت ۱۸۹۹ء (ص ۵۳)
ص ۴۴۲، "الغزالی"، ۱۹۰۲ء	[ظفر احمد: تصنیف ۱۹۰۱ء (ص ۵۳) حامد حسن قادری: دسمبر ۱۹۰۱ء ("داستانِ تاریخِ اردو"، ص ۶۸۶)
ص ۴۴۲، "سوانحِ مولانا روم"، ۱۹۰۲ء	ظفر احمد: تصنیف ۱۹۰۴ء، اشاعت ۱۹۰۶ء
ص ۴۵۵، امجد علی اشہری کی "حیاتِ انیس"، ۱۸۵۷ء	نیر مسعود: طبعِ اوّل ۱۹۰۷ء

Scanned by CamScanner

اس باب میں مضمون نگار نے متعدد سوانح نگاروں اور سوانح عمریوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ان میں کئی نام ایسے ہیں جو اس سے پہلے پڑھنے، سننے میں نہیں آئے۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ الطاف فاطمہ نے یہ باب اچھی طرح لکھا ہے۔

جزو (ب) "مکاتیب" ڈاکٹر عبدالقیوم نے لکھا ہے اور یہ بھی قابلِ قدر ہے۔ جزو (ج) "عورتوں کا ادب" ڈاکٹر نادرہ زیدی کی تحریر ہے۔ اس میں حسب معمول مواد کی کمی کی وجہ سے بعض ایسی تصانیف کو شامل کر لیا ہے جو نہیں ہونی چاہییں تھیں۔ وہ مذہبی اور اخلاقی کتابیں جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہوتی ہیں، انھیں عورتوں کا ادب نہیں کہا جا سکتا، مثلاً وزیر علی خاں کی "سراج الہدایت" چھوٹے بچوں اور بچیوں کے لیے ۱۸۴۷ء کی (ص ۴۸۷)۔ اس کا ذکر اس سے پہلے کی جلد میں آچکا ہے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے بعد کی جلد میں اسے دوبارہ کیوں شامل کیا گیا۔ "بحرِ دانش" (ص ۴۸۲)، "سیرِ ظلمات"، "تفریح القلوب" (ص ۴۸۴) بھی ایسی کتابیں ہیں جو عورتوں سے مخصوص نہیں۔ جزو (د) "بچوں کا ادب" اسد اریب نے لکھا ہے۔ اس میں چند درسی کتابوں کا نام آتا ہے: باقی یہ سوا پانچ صفحوں کا پورا مضمون بچوں کے ادب کے بارے میں ایک نظریاتی مقالہ ہے، تاریخی نہیں۔ ہاں، آخر میں انھوں نے جو کتابیات دی ہے، اس میں سے اس دور کی کتابیں الگ کر لیں تو بچوں کے ادب کی مفید فہرست بن جاتی ہے، لیکن اس فہرست میں نصابی کتابوں کے علاوہ شاید ہی کچھ اور ہو۔

چودھواں باب، "دوسرے ناول نگار"، خواجہ زکریا نے لکھا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا اس باب کو بڑے ناول نگاروں کے فوراً بعد چھپنا چاہیے تھا۔ اس میں ص ۵۱۰ پر یہ اطلاع ہے کہ رسوا نے امریکا کی کسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ رسوا پر ۱۱، ۱۲ صفحے لکھے ہیں اور خوب ہیں۔ دراصل رسوا اتنے اہم ناول نگار ہیں کہ انھیں غیر اہم ناول نگاروں کے ڈھیر میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا، بلکہ ان پر ایک علاحدہ باب ہونا چاہیے تھا۔ رسوا کے علاوہ منشی سجاد حسین، محمد علی طبیب اور پھر ناول نگار شعرا کا تذکرہ ہے جن میں حالی، ریاض، شاد عظیم آبادی، آغا شاعر قزلباش، بے خود دہلوی اور دوسرے کئی ناول نگار ہیں۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ریاض نے بھی ناول لکھا تھا۔ اس باب کے مختلف ادیبوں کے نام دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ یہ معلومات افزا باب مضمون نگار کا کارنامہ ہے۔

پندرھواں باب، "صحافت"، مسکین علی حجازی نے لکھا ہے۔ یہ صحافت کے عالم ہیں اور حسبِ توقع انھوں نے اس بکھرے ہوئے موضوع کو نہایت عمدگی سے سمیٹا ہے۔

سولھواں باب، "اردو شعرا کے تذکرے"، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے جو

Scanned by CamScanner

تذکروں کے ماہر ہیں۔ حیرت پر حیرت ہے کہ یہ باب ۱۸۵۷ء تک کے تذکروں کے بارے میں ہے۔ چنانچہ آخری تذکرے "گلستانِ سخن" کے بارے میں یوں شروع کیا ہے:

> ۱۸۵۷ء تک لکھے جانے والے تذکروں میں آخری تذکرہ "گلستانِ سخن" ہے۔ (ص۵۷۹)

یہ جلد ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء کو محیط ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے اس سے پہلے کی جلد کے زمانے کے اندر لکھا ہے۔ کیا انھیں تیسری جلد پر لکھنے کو کہا گیا تھا، لیکن اس میں تو تذکروں کا باب خواجہ محمد زکریا نے لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے چوتھی جلد کے لیے فرمان صاحب کو جو لکھ کر دیا گیا تھا اس میں زمانے کا تعین غلط تھا یا صحیح تھا تو وہ غلط سمجھے۔ مدیر عمومی کیا کر رہے تھے کہ انھوں نے چوتھی جلد میں اس سے پہلے کے دور کے مواد کو شامل کیا۔ اس میں ص ۵۷۲ پر کریم الدین کے تذکرے کا نام عنوان میں "طبقات الشعرا" اور متن میں "طبقات الشعرائے ہند" لکھا ہے۔ جیسا کہ پہلے بارہا کہہ چکا ہوں، کریم الدین کے تذکرے کا نام "طبقاتِ شعرائے ہند" ہے۔

سترھواں باب، "مناظراتی ادب"، ادارے نے لکھا ہے۔ موضوع نرالا اور اچھوتا ہے۔ اس میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کے بارے میں بہت غیر تعظیمی لہجے میں لکھا ہے، مثلاً:

> سوامی اعتراض میں تحقیق کی ٹانگ توڑتا ہے... بایں عقل و دانش بباید گریست۔ (ص۶۱۶)

عقیدے کے اختلاف کے باوجود دوسرے مذاہب و مسالک کے علما کے بارے میں بے ادبی خلافِ تہذیب ہے۔ اس باب میں غیر مسلموں کی اردو میں لکھی مناظراتی کتابوں کی نمائندگی بہت کم ہے، زیادہ تر اہلِ اسلام کے مناظراتی ادب ہی کا تذکرہ ہے۔ بہر حال یہ مفصل، اور اس میں دادِ تحقیق دی ہے۔

اٹھارواں باب، "اردو زبان کا جائزہ"، ڈاکٹر ابواللیث نے لکھا ہے اور تسلسل کے ساتھ بہت اچھی طرح لکھا ہے۔ اس دور میں تذکیر و تانیث، شعریات، قواعد وغیرہ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان سب کا نام دے دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ آخری مختصر باب، "اس دور کے ادب کا عمومی جائزہ"، ادارے نے لکھا ہے۔

اس جلد کے بارے میں میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ عام طور سے اس کے لکھنے والوں نے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے، صرف معدودے چند ایسے ہیں جن کی تحریر تشنہ رہی۔ ترتیبِ ابواب میں ترقی کی بہت گنجائش ہے، اس کے باوجود یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ اس

Scanned by CamScanner

سلسلے کی اچھی جلدوں میں ہے۔

دسویں جلد: اردو ادب (پنجم)

۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۲ء

یہ جلد فروری ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی ہے اس لیے اس کے زمانی حصار کی آخری حد ۱۹۷۲ء ظاہر کرنا ایک معصوم فریب دہی ہے۔ مضمون نگار ۱۹۷۰ء تک اپنی تحریریں دے چکے ہوں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ۱۹۶۹ء یا ۱۹۷۰ء تک کے ادب کا جائزہ لے سکتے تھے۔ اس جلد میں ایک اور جدت یا بدعت یہ ہے کہ اس کے دو حصے کیے گئے ہیں: پہلا حصہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۳۶ء کو محیط ہے اور دوسرا حصہ ۱۹۳۶-۱۹۷۰ء کو۔ دوسرے حصے کے ابواب نئے نمبر شمار، پہلا، دوسرا سے شروع کیے گئے ہیں۔ دونوں حصوں کے ابواب کے بیش تر وہی موضوعات و عنوانات ہیں، مثلاً "ناول اور افسانہ"، "تحقیق و تنقید"، "ڈراما"، "صحافت"، "مزاح نگاری" وغیرہ۔ حد یہ ہے کہ دوسرے حصے میں پہلے حصے کی طرح معاشرتی اور ادبی پس منظر بھی ہے۔ اگر یہ دوئی منظور تھی تو دو جلدیں کیوں نہ کر دیں۔ یہ توأم بادام یا سنگھاڑے کی سی کیفیت کیوں؟

اردو کی ادبی تاریخ میں ۱۹۳۶ء کی یہ اہمیت ہے کہ اس سال لکھنؤ میں پہلی ترقی پسند کانفرنس ہوئی، گویا اردو میں ترقی پسندی کا افتتاح ہوا، لیکن ترقی پسندی تو اس سے پہلے ہی جھکڑ کے انداز میں "انگارے" (۱۹۳۲ء) میں نمودار ہو چکی تھی، جوش کی باغیانہ شاعری اس سے بھی پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اقبال کی نظم "خضرِ راہ" (۱۹۲۲ء) کا بند "سرمایہ و محنت" خالص اشتراکیت ہے۔ ۱۹۳۶ء کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسی سال منشی پریم چند کا انتقال ہوا، گویا اردو افسانے کا ایک دور ختم ہوا۔ پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ کا ڈانڈا ۱۹۳۶ء کے بجائے ۱۹۴۷ء کو بنانا موزوں تر ہوتا اور ان سب سے بہتر یہ کہ سہولت کی خاطر بیسویں صدی کو ایک زمرہ مان لیا جاتا۔ ۱۹۳۶ء کے ساتھ بڑی قباحت یہ ہے کہ متعدد زعمائے ادب اس سنہ کے دونوں طرف بٹے ہوئے ہیں۔ یوں تو کسی بھی سنہ کے ارد گرد بڑے ادیبوں کی زندگی بچھی ہوئی ملے گی، لیکن ۱۹۳۶ء کے ارد گرد ان کی تعداد قابلِ لحاظ ہے۔ موجودہ جلد میں یہ تثنیاتی تقسیم نہ ہوتی اور ہر موضوع کا ۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۰ء کے حصار میں یک جا جائزہ لیا جاتا تو انتشار میں قدرے کمی ہوتی۔

پہلے حصۂ اول کو لیتے ہیں۔ پہلا باب حسبِ معمول سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر کا ہے اور اسے شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ غنیمت ہے کہ سیاسی پس منظر

Scanned by CamScanner

محض ساڑھے چار صفحے کا ہے۔ یہ لاہور میں، ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان تک آتا ہے، حالانکہ اسے ۷-۱۹۳۶ء پر رک جانا چاہیے تھا۔ معاشرتی پس منظر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "رنگیلا رسول" کے مصنف راج پال کو ایک پُرجوش مسلمان نے ۱۹۲۴ء میں قتل کر دیا (ص ۶)۔ افسوس کہ راج پال کا قاتل محقق نہ تھا۔ راج پال اس کتاب کا مصنف نہ تھا، ناشر تھا۔ جگن ناتھ آزاد نے مجھے اپنے مکتوب مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۷۸ء میں مطلع کیا کہ مصنف جموپتی ایم اے، گورنر گروکل کانگڑی تھے۔ اس طرح مصنف مزے کرتا رہا، ناشر مارا گیا۔

دوسرا باب، "ادبی منظر"، بھی شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ یہ ادبی جائزہ کتاب کے حصۂ اول کے آخر میں ہوتا تو مناسب تھا کیونکہ وہاں ادارے کی طرف سے کوئی خاتمہ نہیں۔

تیسرا باب "اقبال" ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے۔ انھوں نے پہلے پیراگراف ہی میں اقبال کے اجداد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ عام روایت کے مطابق ہے، لیکن ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے بڑی گہری تحقیق کر کے بڑی شدومد سے دعوا کیا کہ اقبال کو اپنے اجداد کے بارے میں کوئی واقفیت نہ تھی۔ فوق نے اقبال کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا۔ حیدری لکھتے ہیں:

> دراصل فوق نے اقبال اور دوسرے لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا کہ اقبال کشمیری برہمن زاد اور سپرو خاندان سے ہیں (۱۰)۔

حیدری نے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے اندراجات، نیز ایک بیع نامہ مورخہ ۱۸۹۵ء کی بنا پر یہ بھی دعویٰ کیا کہ علامہ کے والد کا نام محض نتھو تھا، نور محمد بعد کو اختراع کر لیا گیا ہے (۱۱)۔ ڈاکٹر عبداللہ نے اقبال کی تاریخ ولادت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا، لیکن جملہ دلائل کا احاطہ کر کے مالک رام اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کی تاریخ ولادت ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے جو نظیر احمد صوفی اور خالد نظیر صوفی نے پیش کی ("اقبال کی تاریخِ ولادت"، مشمولہ "تحقیقی مضامین"، دہلی، دسمبر ۱۹۸۴ء)۔

مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ۱۹۰۲ء میں شیخ عبدالقادر کی ادارت میں "مخزن" شائع ہونا شروع ہوا (ص ۵۸)۔ یہ صحیح نہیں۔ "مخزن" کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۰۱ء میں آیا۔ فاضل مضمون نگار نے اقبال پر مفصّل تنقید کی ہے اور یہ اعلیٰ درجے کی ہے، اس میں جملہ پہلوؤں کو لے لیا ہے۔ آخر میں ضمیمے میں اقبال کی تصانیف کی مکمل فہرست بھی بہت جامع اور معتبر ہے جس کی تائید ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب "تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" (لاہور، ۱۹۸۲ء) سے ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

چوتھا باب، "دیگر شعرا (۱۹۳۶ء-۱۹۱۴ء)" جیلانی کامران کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں شروع میں ڈھائی صفحوں کی تمہید ہے اور پھر ظفر علی خاں، چکبست، جوش، حفیظ جالندھری وغیرہ کا ذکر ہے۔ مضمون نگار نے ص ۹۸ پر جوش کا سنہ ولادت ۱۸۹۴ء لکھا ہے۔ کاظم علی خاں نے "جوش شناسی" میں صحیح تاریخ ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء لکھی ہے (لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۲)۔ اس کی تائید مالک رام نے بھی کی ہے۔ ص ۱۱۱ پر جلی عنوان ہے: فاخر ہریانوی۔ مشاہیر کے اس زمرے میں اس مجہول الاسم شاعر کو علاحدہ عنوان کے ساتھ جگہ نہیں دینی چاہیے تھی۔ ص ۱۱۲ پر شوق قدوائی کا سنہ وفات ۱۹۲۸ء لکھا ہے لیکن ابواللیث صدیقی نے ۱۹۲۵ء لکھا ہے ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، طبع اول، ص ۳۱۵)۔ مالک رام نے اور باریک کات کر ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء مقرر کی ہے۔ اس تحریر میں شوق کو محض تین سطریں دی ہیں جو شرم ناک حد تک کم ہیں۔

ص ۱۱۳ پر امجد حیدر آبادی کی ولادت ۱۸۸۶ء میں لکھی ہے۔ مالک رام نے "حیاتِ امجد" کے حوالے سے ۶ رجب ۱۳۰۵ھ/۱۹ مارچ ۱۸۸۸ء درج کی ہے۔ ص ۱۱۴ پر کسی نظم نگار خاتون ز-خ-ش کا ذکر ہے۔ میں اس نام سے واقف نہیں ہوں "ز" سے زہرا، زرینہ یا زلیخا، خ سے خاتون یا خانم اور ش سے شیروانی ہو سکتا ہے۔ جیلانی کامران نے اس پورے باب میں کسی کے کلام کے نمونے میں ایک شعر بھی نہیں لکھا جو ضروری تھا۔ یوں بھی اکثر کا بیان تشنہ ہے۔

پانچواں باب، "اس دور کے غزل گو"، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا لکھا ہوا ہے۔ بہتر ہوتا کہ یہ موضوع پہلے ہوتا اور چوتھے باب کا "دیگر شعرا" اس کے بعد، تاکہ "دیگر" کا جواز ہو جاتا۔ بصورتِ دیگر "دیگر شعرا" کو "دیگر نظم گو شعرا" عنوان دیا جاتا تاکہ ایک طرف اس کا پہلے باب "اقبال" سے رشتہ ہو جاتا اور دوسری طرف متعاقب باب "غزل گو شعرا" سے۔ ابواللیث نے اپنی تحریر سے پہلے پانچ چھ صفحوں کی تمہید دی ہے: اس کے بعد شاد عظیم آبادی، عزیز، آرزو، صفی وغیرہ مشاہیر کا ذکر ہے۔

ص ۱۳۸ پر آرزو کا سنہ ولادت دیا ہے، زیادہ ضروری، سنہ وفات نہیں دیا۔ مالک رام کے مطابق وہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء کو فوت ہوئے۔ ص ۱۳۹ پر ثاقب کا سنہ ولادت ۱۸۶۹ء دیا ہے، سنہ وفات غیر حاضر ہے۔ مالک رام نے تاریخ ولادت ۱۶ جنوری ۱۸۷۳ء اور سنہ وفات ۱۹۴۱ء درج کیا ہے۔ ص ۱۴۰ پر مرزا اثر کا سنہ وفات نہیں دیا جو ۱۹۶۷ء ہے۔ ص ۱۴۳ پر حسرت موہانی کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء لکھا ہے۔ ان کے پاسپورٹ کے مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۸۷۸ء ہے ("ہماری زبان"، یکم فروری ۱۹۹۳ء)۔ ص ۱۴۷ پر جگر مراد آبادی کا سنہ وفات

Scanned by CamScanner

۱۹۶۱ء لکھا ہے۔ ضامن مراد آبادی نے اپنی مرتبہ کتاب میں ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء لکھی ہے (جگر مراد آبادی، دہلی، ۱۹۸۴ء، پیش لفظ) اس باب کے بھی بعض شعرا کو اور زیادہ جگہ ملنی چاہیے تھی لیکن جو کچھ بھی ہے اس میں مناسب تنقید کر دی گئی ہے۔

چھٹا باب، "اردو ناول اور افسانہ"، ممتاز منگلوری نے لکھا ہے۔ انھوں نے کسی مصنف کی عبارت کا کوئی نمونہ نہیں دیا جو بڑی کمی ہے۔ اس باب کی ابتدا راشد الخیری سے ہوتی ہے، جن کے بعد آتے ہیں پریم چند۔ ان کی تاریخِ ولادت ۳۱ جون ۱۸۸۰ء لکھی ہے (ص ۱۵۹)۔ جون میں ۳۱ دن نہیں ہوتے۔ صحیح تاریخ ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء ہے جو مالک رام نے دی ہے۔ ص ۱۶۶ پر قاضی عبدالغفار کو محض ایک تہائی صفحہ دیا ہے جو انصاف نہیں۔ ص ۱۷۰ پر قاری محمد سرفراز حسین پر لکھا ہے۔ ان پر جلد ۴ میں بھی ص ۲۱-۵۲۰ پر لکھا گیا تھا اور وہی صحیح مقام تھا، کیونکہ ان کے ناول چوتھی جلد کے دور ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ ص ۱۷۲ پر نیاز فتح پوری کی ولادت ۱۸۸۷ء میں دکھائی ہے، لیکن ان کے محقق ڈاکٹر امیر عارفی نے ۱۸۸۴ء لکھی ہے ("نیاز فتح پوری"، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۳۱)۔ مضمون نگار نے نیاز کو محض دو صفحے دیے ہیں جن میں سوانح محض سات سطروں میں ہے۔ نیاز کے پاکستان منتقل ہونے کی وجوہ اور تاریخ تک نہیں دی۔ بقولِ امیر عارفی وہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۳ء کو کراچی پہنچے ("نیاز فتح پوری"، ص ۸۸)۔

ص ۱۷۴ پر علی عباس حسینی کی تاریخِ ولادت ۷ فروری ۱۸۹۷ء لکھی ہے۔ مالک رام نے ۲۹ شعبان ۱۳۱۴ھ / ۳ فروری ۱۸۹۷ء لکھی ہے۔ انجمن کی تقویم کے مطابق یہ ہجری تاریخ ۲ فروری کے مطابق آتی ہے۔ حسینی کی سوانح محض پانچ سطروں میں دی ہے۔ اتنی بڑی تاریخ میں اس سے زیادہ کی توقع تھی۔ ان کی کتابوں کے سنہ نہیں دیے۔ ص ۱۷۶ پر خان احمد حسین خاں کا احوال ہے۔ ناول و افسانہ کی دنیا میں یہ صاحب بالکل گم نام ہیں۔ انھیں سوا دو صفحے ملے ہیں جب کہ علی عباس حسینی کو ایک اور ایک تہائی صفحہ ہی مقسوم ہوا تھا۔ ص ۷۸-۱۷۷ پر حفیظ جالندھری کے دو افسانوی مجموعوں کی اطلاع دی ہے جو میرے لیے ایک انکشاف ہے۔ ان میں سے مجموعہ "ہفت پیکر" (۱۹۲۴ء) طبع زاد ہے، دوسرا مجموعہ ترجمہ ہے۔

مضمون نگار نے افسانہ نگاروں کی سوانح مختصر دی ہے اور ان کی تخلیقات کے نمونے نہیں دیے جن کے بغیر تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔

ساتواں باب، "تحقیق و تنقید"، شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ اس میں تحقیق سے زیادہ تنقید پر توجہ کی ہے۔ سنین کے بارے میں ضروری چھان بین اور احتیاط سے کام نہیں لیا۔ کچھ نمونے:

Scanned by CamScanner

ص ۱۸۳ پر مولوی عبدالحق کا سنہ ولادت ۱۸۷۱ء لکھا ہے۔ مالک رام نے ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء لکھا ہے۔ سید محمد نے بھی رسالہ "اردو" بابائے اردو نمبر، ۱۹۶۲ء میں ۱۸۷۰ء درج کیا ہے (ص ۹۰)۔ مضمون نگار نے ص ۱۸۳ پر مولوی صاحب کی مرتبہ کتابوں میں خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" کا نام بھی گنایا ہے۔ چونکہ بعد میں یہ طے ہو گیا کہ یہ خواجہ کی نہیں اس لیے لکھنا چاہیے تھا: "خواجہ بندہ نواز سے منسوب معراج العاشقین۔" انھوں نے مولوی صاحب کی کتابوں کے نام لیے ہیں لیکن ان کے سنینِ تالیف نہیں دیے جو ایک تاریخِ ادب کے لیے بڑی کمی ہے۔ ص ۱۸۶ پر حبیب الرحمان خاں شیروانی (کذا۔ صحیح: شِروانی) کا سنہ ولادت ۱۸۶۵ء درج کیا ہے۔ مالک رام کے مطابق ۲۸ شعبان ۱۲۸۳ھ/ ۵ جنوری ۱۸۶۷ء ہے۔

ص ۱۸۷ پر وحید الدین سلیم اور عظمت اللہ خاں کا ذکر ہے۔ ان دونوں پر اس سے پہلے کی چوتھی جلد میں بھی لکھا جا چکا ہے۔ یہاں وحید الدین سلیم کا سنہ وفات ۱۹۲۷ء درج ہے۔ جلد چہارم ص ۲۳۰ پر ڈاکٹر عبیداللہ خاں نے ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء لکھا تھا اور یہی مالک رام کے تذکرے میں ہے جس کے پیش نظر ۱۹۲۷ء کو غلط قرار دیا جائے گا۔ عظمت اللہ خاں پر نہ صرف جلد چہارم میں بھی لکھا گیا تھا، بلکہ جلد پنجم میں ص ۱۰۷ پر بحیثیت شاعر اور ص ۱۸۷ پر بحیثیت تنقید نگار لکھا گیا ہے۔ اگلے صفحے ۱۸۸ پر مہدی افادی کا سنہ ولادت ۱۸۷۴ء لکھا ہے۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے ان کی تاریخِ ولادت کے سلسلے میں ایک مختار نامہ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۸۸۶ء کا اقتباس دیا ہے جس میں دو خواتین نے انھیں مختارِ عام مقرر کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس وقت کم از کم ۱۸ سال کے ہوں گے، یعنی مارچ ۱۸۶۸ء میں یا اس سے پہلے پیدا ہوئے ہوں گے ("مہدی افادی"، گورکھ پور، ۱۹۸۵ء، ص ۵۲ و ۵۴)۔

ص ۱۸۹ پر عبدالرحمان بجنوری کا سنہ وفات لکھا ہے، سنہ ولادت نہیں جو مالک رام کے مطابق ۱۰ جون ۱۸۸۵ء ہے۔ ص ۱۹۰ پر ڈاکٹر سید عبداللطیف کے سنین نہیں دیے۔ مالک رام کے مطابق ولادت ۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء اور وفات ۴ نومبر ۱۹۷۱ء کو ہوئی۔ ص ۱۹۲ پر شمس اللہ قادری جیسے محقق کو کل آٹھ سطروں میں ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اسی صفحے پر نصیر الدین ہاشمی کی وفات ۱۹۶۵ء میں رکھی ہے۔ مالک رام کے "تذکرۂ ماہ و سال"، نیز "دکن میں اردو" کے مقدمے کے مطابق صحیح تاریخ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۴ء ہے (دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۳)۔ ص ۱۹۳ پر محمود شیرانی کے سنین ۱۸۸۸ء تا ۱۹۴۵ء قلم بند کیے ہیں۔ "پنجاب میں اردو" کے دیباچے میں عبدالمجید سالک نے ولادت اکتوبر ۱۸۸۰ء میں اور وفات ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو درج کی ہے۔ یہی مالک رام نے لکھا ہے۔

ص ۱۹۴ پر سلیمان ندوی کی وفات ۱۹۳۵ء میں لکھی ہے۔ صحیح ۱۹۵۳ء ہے۔ صحت

Scanned by CamScanner

نامے میں تصحیح نہیں کی گئی۔ معلوم نہیں یہ سہو مصنف ہے یا سہو مطبع۔ ص۱۹۵ پر ڈاکٹر زور کا سنہ ولادت ۱۹۰۵ء لکھا ہے۔ مالک رام کے مطابق ۶ دسمبر ۱۹۰۴ء ہے جب کہ خلیق انجم نے ۲۵ دسمبر ۱۹۰۵ء لکھا ہے ("محی الدین قادری زور"، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۱۱)۔ معلوم نہیں کیا درست ہے۔ ان کی کتابوں کے سنین نہیں دیے۔ عبدالقادر سروری اور حامد اللہ افسر کے بھی سنین نہیں دیے۔ سروری صاحب کو نصف صفحے سے کم دیا ہے جس میں ان کی تدوینات کا ذکر نہیں۔ ص۱۹۷ پر حامد حسن قادری کی ایک کتاب کا نام "شاہکارِ انیس" لکھا ہے۔ قادری کی اس نام کی کوئی کتاب نہیں، مسعود حسن رضوی کی ایک تدوین ہے۔ مسعود حسن رضوی کو صرف نصف صفحہ دیا ہے۔ ان کا بیان نہایت تشنہ ہے۔

نیاز کا سنہ ولادت ۱۸۸۶ء لکھا ہے جب کہ اسی جلد کے چھٹے باب میں ص۱۷۲ پر ۱۸۸۷ء درج ہے۔ جیسا کہ میں نے اس کے سلسلے میں واضح کیا، صحیح ۱۸۸۴ء ہے۔ ص۱۹۹ پر رشید احمد صدیقی کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں لکھی ہے۔ مالک رام نے ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء درج کی ہے۔ ص۲۰۱ پر غلام رسول مہر کو محض سوا چھ سطریں نصیب ہوئیں۔ ان کی ولادت ۱۸۹۴ء میں لکھی ہے، مالک رام کے مطابق ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء ہے۔ اسی صفحے پر مالک رام کی ولادت کا سنہ ۱۹۰۷ء لکھا ہے۔ صحیح تاریخ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء ہے۔ مالک رام کو بھی محض آٹھ سطریں دی ہیں۔ اتنی سطور تو ان کی کتابوں کے نام اور سنین لکھنے ہی میں صرف ہو جاتیں۔ ص۲۰۲ پر قاضی عبدالودود کی پیدائش ۱۸۹۸ء میں ظاہر کی ہے۔ مالک رام کے مطابق صحیح تاریخ ۸ مئی ۱۸۹۶ء ہے۔

معلوم نہیں صفحات کی تحدید تھی یا مصنف کا فیصلہ، اس باب کے بیشتر اہلِ قلم کا بیان تشنہ ہے۔ ان کی کتابوں کے سنین نہیں دیے، ان کے تحقیقی کاموں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس باب کا عنوان "تحقیق و تنقید" ہے لیکن سنین کی حد تک مضمون نگار نے کسی تحقیق سے کام نہیں لیا اور وہ نہایت غیر معتبر ہے۔ کاش، اس باب کو کسی مسلّم محقق سے لکھایا ہوتا۔

آٹھواں باب، "ڈراما"، عشرت رحمانی نے لکھا ہے۔ ص۲۲۲ پر ظفر علی خاں کے سنین ۱۸۷۰ء۔۱۰۵۰ء لکھتے ہیں۔ ظاہرا ۱۰۵۰ء تخریبِ طباعت ہے ۱۹۵۰ء کی، لیکن مالک رام نے ان کی ولادت ۱۸۷۳ء میں اور وفات ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو لکھی ہے۔ ص۲۲۵ پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا سنہ ولادت ۱۹۱۰ء لکھا ہے، لیکن مقتدرہ قومی زبان کی "کتابیات" کے مطابق وہ ۲ نومبر ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے ("کتابیات"، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص۵) ص۲۲۶ پر پروفیسر محمد مجیب کا سنہ ولادت نہیں دیا۔ مالک رام کے مطابق وہ ۳۰ اکتوبر

Scanned by CamScanner

۱۹۰۲ء کو پیدا اور ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء کو فوت ہوئے۔ اس باب میں رحمانی نے بعض غیر مشہور ڈراما نگاروں کا تعارف بھی دیا ہے۔ آخر میں مغربی ڈراموں کے تراجم کی فہرست بہت مفید ہے۔ مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے موضوع کے جملہ پہلوؤں کا بہت اعلیٰ طریقے سے حق ادا کیا ہے۔

نواں باب، "صحافت"، مسکین علی حجازی نے لکھا ہے۔ وہ بھی اپنے موضوع کے ماہر ہیں۔ یہ باب نسبتاً مختصر ہے۔ دسواں باب "مزاح" وزیر آغا کے قلم سے ہے۔ وہ بڑے نقاد ہیں اور مزاح نگاری پر مقالہ لکھ چکے ہیں۔ شاید صفحات کی تحدید کے سبب نمونے بالکل نہیں دیے۔ انھوں نے ص ۲۵۰ پر فرحت اللہ بیگ کی وفات ۱۹۵۰ء میں لکھی ہے۔ مالک رام کے مطابق وہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو فوت ہوئے۔ ص ۲۵۳ پر عبدالعزیز فلک پیما کا سنہ وفات ۱۹۵۰ء لکھا ہے۔ مالک رام نے صحیح تر تاریخ ۷ مئی ۱۹51ء درج کی ہے۔ ص ۲۵۴ پر رشید احمد صدیقی کی ولادت ۱۸۹۶ء میں لکھی ہے۔ جیسا کہ پیچھے لکھا گیا، مالک رام نے ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء طے کی ہے اور یہ خود رشید صاحب سے پوچھ کر لکھی۔ نمونے نہ دینے کی کمی کے علاوہ یہ باب تنقیدی اعتبار سے خوب لکھا گیا ہے۔

اس کے آخر میں ادارے نے ایک مختصر ضمیمے میں عظیم بیگ چغتائی پر اضافہ کیا ہے اور ملا رموزی اور حاجی لق لق پر مختصراً لکھا ہے جنھیں مضمون نگار نے حذف کر دیا تھا۔ اس میں ملا رموزی کا سنہ ولادت ۱۸۹۵ء لکھا ہے جب کہ مالک رام کے مطابق وہ ۱۸ اپریل ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے بھی اپنے مقالے "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" میں ۱۸۹۶ء لکھا ہے (بھوپال، ۱۹۶۵ء، ص ۴۴۲)۔ ممکن ہے، مضمون نگار نے یہ سنہ سلیم حامد کی کتاب ہی سے لیا ہو۔

گیارھواں باب، "دینی ادب (بیسویں صدی)" خورشید احمد صاحب نے لکھا ہے۔ یہ مقالہ نہیں، ایک کتابچہ ہے جو نسبتاً باریک ٹائپ میں ص ۲۶۱ سے ۳۷۶ تک کو محیط ہے۔ مضمون اتنا عالمانہ ہے کہ داد سے بے نیاز ہے۔ اس کی کتابیات ہی پر ایک نظر دوڑائیے جو ص ۳۵۷ سے ۳۷۶ تک ہے، مضمون نگار کے علم و فضل اور دیدہ ریزی کا اندازہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ کی پانچوں جلدوں میں یہی سب سے زیادہ عالمانہ مقالہ ہے۔

اس کے بعد کتاب کا حصہ دوم (۱۹۳۶ء تا ۱۹۷۰ء) شروع ہوتا ہے۔ اس کے شروع میں معاشرتی اور ادبی پس منظر کو ملا کر ایک باب میں بیان کیا ہے۔ اسے صدیق کلیم صاحب نے لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے۔ اس باب میں سیاست پر توجہ کم کی ہے، معاشرتی حصہ بھی زیادہ نہیں، بیش تر صفحات ادبی پس منظر کو وقف کیے ہیں جو تنقیدی اعتبار سے خوب ہیں۔

Scanned by CamScanner

دوسرا باب، "شعرا"، بھی صدیق کلیم نے لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں تحقیق کی ضرورت نہیں، تنقید و تجزیہ پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور اسے مضمون نگار نے خاطر خواہ کیا ہے۔ آخر میں ادارے نے ساڑھے چار صفحوں کا ضمیمہ شامل کیا ہے۔ وہ بھی قابلِ قدر ہے۔

تیسرا باب، "افسانہ نگار اور ناول نگار"، ممتاز سنگوری کی تحریر ہے۔ اس میں شروع میں پانچ صفحوں کا تمہید یہ ہے۔ اس میں ص ۴۳۶ پر "انگارے" کی تاریخ ۱۹۳۵ء دی ہے۔ صحیح ۱۹۳۲ء ہے۔ ص ۴۳۷ پر دو جلی عنوانات "پریم چند"، "انگارے" بالکل بے موقع چھپ گئے ہیں انھیں حذف ہونا چاہیے یا پھر ان کے صحیح مقام پر منتقل کر دینا چاہیے۔ ناول اور افسانہ لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام مدیر عمومی سید فیاض محمود (پ ۱۹۰۶ء) کا ہے، ہونا ہی چاہیے۔ کسی اور تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آیا، لیکن ان کی زیرادارت تاریخ میں تو ان کا تعارف و تنقید دینا ہی چاہیے۔ انھیں ڈھائی صفحے دیے ہیں جب کہ راجندر سنگھ بیدی کو پون صفحہ، عزیز احمد کو آدھا اور قرۃ العین حیدر کو آدھے سے بھی کم۔ مجھے فیاض محمود کے بارے میں کوئی شکایت نہیں، شکایت ہے عمائدِ افسانہ کو ایک اور پون صفحہ دینے پر۔

ص ۴۴۴ پر کرشن چندر کا سنہ ولادت ۱۹۱۲ء لکھا ہے۔ ڈاکٹر محمد عقیل نے اعجاز صاحب کی "مختصر تاریخ ادب اردو"، اضافہ شدہ ایڈیشن، میں ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء لکھی ہے۔ میری نگرانی میں حیدر آباد کے بیگ احساس نے کرشن چندر پر مقالہ لکھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق بھی ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء صحیح تاریخ ہے۔ مضمون نگار نے ص ۴۴۶ پر سعادت حسن منٹو کی ولادت ۱۹۱۳ء میں لکھی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کی منٹو کی کتابیات (۱۹۸۶ء)، نیز مالک رام کے تذکرے میں ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء لکھی ہے۔ ص ۴۵۰ پر راجندر سنگھ بیدی کو صرف پون صفحہ دے کر مضمون نگار نے اپنے ذوقِ نقد کا اچھا مظاہرہ نہیں کیا۔

دوسرا جزو "ناول" ہے۔ مضمون نگار کو یہ معلوم ہی نہیں کہ بیدی نے ایک ناول بھی لکھا ہے، تبھی تو انھوں نے ان کا بحیثیت ناول نگار ذکر نہیں کیا۔ قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کے لیے آدھے صفحے سے بھی کم دے کر مضمون نگار نے اپنی سبکی کا سامان کیا ہے۔ وہ اے آر خاتون اور اے حمید کو بحیثیت ناول نگار کے لے سکتے ہیں، لیکن عبداللہ حسین اور ممتاز مفتی کو نظر انداز کرتے ہیں۔ آخر میں ادارے نے ایک مفید ضمیمہ لکھ کر دونوں کو ایک ایک پیرا گراف دیا، حالانکہ یہ اس سے زیادہ کے مستحق تھے۔ ادارے نے دوسرے قابلِ ذکر ناولوں، مثلاً رضیہ فصیح احمد کے "آبلہ پا"، خدیجہ مستور کے "آنگن"، جمیلہ ہاشمی کے "تلاشِ بہاراں"، شوکت صدیقی کے "خدا کی بستی" اور بیدی کے "ایک چادر میلی سی" پر لکھ کر مضمون نگار کے تغافل کی تلافی کی۔

Scanned by CamScanner

چوتھا باب، تحقیق و تنقید پر، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے۔ یہاں مجھے ذیل کے سنین میں کلام ہے:

مضمون نگار	دوسرے مورخین
ص۴۶۹، عندلیب شادانی پ ۱۸۹۶ء	مالک رام: ۱۸۹۷ء
ص ۴۸۳، صلاح الدین احمد پ ۱۹۰۳ء	مالک رام: ۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء
ص۴۸۶، آل احمد سرور پ ۱۹۱۲ء	صحیح: ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء
ص۴۸۸، وقار عظیم پ ۱۹۱۰ء	مالک رام: ۲۷ ۱۳۲ھ/۱۹۰۹ء
ص ۴۹۴، کلیم الدین پ ۱۹۰۷ء	مالک رام: ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء
ص۴۹۷، ڈاکٹر عابد حسین ف ۱۹۷۰ء	مالک رام: ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء
ص۴۹۸، حمید احمد خاں پ ۱۹۰۳ء	مالک رام: یکم نومبر ۱۹۰۲ء
ص ۵۰۰، مسعود حسین خاں پ ۱۹۱۸ء	"ورودِ مسعود": ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء

محسوس یہ ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید کو یکجا ایک باب میں نہیں رکھنا چاہیے۔ دونوں پر لکھنے والے ماہرین کے لیے مختلف قسم کی صلاحیت اور مزاج درکار ہیں۔ اس دور میں محقق اور نقاد دونوں بہت کثرت سے ہیں۔ مضمون نگار نے تحقیق نگاری کا تجزیہ اس قدر نہیں کیا، جتنا تنقید نگاری کا۔ انھوں نے یہ اچھا کیا کہ تنقیدوں کا نمونہ بھی دے دیا ہے۔

پانچواں باب "ڈراما" ہے جسے حسبِ معمول عشرت رحمانی نے لکھا ہے۔ اس میں ایک جگہ تاریخی ترتیب میں خلفشار ہو گیا ہے کہ ص۵۲۶ پر ڈاکٹر محمد حسن (پ ۱۹۲۵ء) کو پہلے لیا اور افسر میرٹھی ولادت ۱۸۹۸ء (کذا۔ صحیح: ۱۸۹۵ء) کو اسی صفحے پر اُن کے بعد۔ بعض دوسرے مصنفین کے سنین کے اختلاف حسبِ ذیل ہیں اور یہ زیادہ تر پیدائش، سے متعلق ہیں:

عشرت رحمانی	دوسرے
ص۵۲۰، عابد حسین پ ۱۸۶۹ء	صحیح: ۱۸۹۶ء۔ صحت نامہ میں بھی تصحیح نہیں۔
ص۵۲۱، فضل الرحمان ف ۱۹۵۳ء	[۱۱ نومبر ۱۹۹۳ء ("ہماری زبان"، یکم دسمبر ۱۹۹۳ء)]
ص۵۲۶، افسر میرٹھی پ ۱۸۹۸ء	مالک رام: ۲۹ نومبر ۱۸۹۵ء
ص۵۲۹، انتظار حسین پ ۱۹۲۶ء	مالک رام: دسمبر ۱۹۲۵ء

Scanned by CamScanner

ص ۵۴۱، سعادت حسن منٹو ۱۹۱۳ء تا ۱۹۵۴ء	[کتابیاتِ منٹو، مقتدرہ، ولادت ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء وفات ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء]
ص ۵۴۳، شوکت تھانوی پ ۱۹۰۴ء	مالک رام: ۲ جنوری ۱۹۰۵ء
ص ۵۴۴، شاہد احمد دہلوی ف ۱۹۶۹ء	مالک رام: ۲۸-۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب۔
ص ۵۴۸، عابد علی عابد ۱۹۰۳ء تا ۱۹۷۰ء	[مالک رام: پ ۲۱ ستمبر ۱۹۰۶ء، ف ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء]
ص ۵۵۰، جاوید اقبال پ ۱۹۲۷ء	مالک رام: ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء
ص ۵۵۳، نیاز فتح پوری پ ۱۸۸۷ء	اسیر عارفی: ۱۸۸۴ء ("نیاز فتح پوری"، ص ۲۱)

عشرت رحمانی کا یہ باب نہایت جامع ہے۔ اس میں کئی ایسے ڈراما نگاروں کے نام ہیں جو معروفِ عام نہیں۔ کئی ناموں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، مثلاً مجھے گمان نہ تھا کہ جاوید اقبال نے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ رحمانی نے ٹیلی ورژن ڈراموں کا علاحدہ سے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چوتھی اور پانچویں جلد میں ڈرامے کے موضوع پر عشرت رحمانی نے جس طرح لکھا ہے، اس سے بہتر ممکن نہ تھا۔

چھٹا باب، "صحافت"، مسکین حجازی نے لکھا ہے۔ وہ صحافت کے ماہرین میں سے ہیں اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے ص ۵۶۹ پر جو لکھا ہے کہ رسالہ "آج کل" دہلی ۱۹۴۲ء میں جوش ملیح آبادی کی ادارت میں جاری ہوا، یہ صحیح نہیں۔ جوش تقسیمِ ملک کے بعد "آج کل" کے ایڈیٹر ہوئے۔ اس سے قطعِ نظر حجازی نے اس باب کو ایک عارف کی طرح لکھا ہے۔

ساتواں باب، "سفرنامے"، ادارے نے لکھا ہے۔ یہ بیان اس جلد کے دور تک محدود نہیں، بلکہ انیسویں اور بیسویں صدی کے پورے عہد کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں تمام اہم سفرنامے لے لیے گئے ہیں۔ ص ۵۸۸ پر سر رضا علی کی آپ بیتی "اعمال نامہ" کو سفرناموں میں شامل کرنا مناسب نہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے رپورتاژ کو سفرنامے کی ایک قسم قرار دیا ہے (ص ۵۹۱)۔ یہ درست نہیں۔ بعض رپورتاژوں میں سفر کا بیان ہوتا ہے، دوسروں میں کسی جلسے یا تقریب کی روداد ہی ہو سکتی ہے، جس میں سفر کا عنصر بالکل نہیں ہوتا۔ رپورتاژ سفرنامے سے علاحدہ ایک آزاد صنفِ ادب ہے۔ رپورتاژ کے بعد پھر سفرناموں کو لیا ہے، جن میں حج کے سفرناموں، اندرونِ ملک کے سفرناموں، خطوطی سفرناموں اور ترجمہ شدہ سفرناموں کو لیا ہے۔

Scanned by CamScanner

آٹھواں باب متفرق نثر کا ہے جس کے کئی جزو ہیں (الف) "اردو سوانح نگاری" ہے۔ اس کی ابتدا میں ادارے کی طرف سے گل حسن شاہ کے "تذکرۂ غوثیہ" کا ذکر اس معذرت کے ساتھ ہے کہ انیسویں صدی کے اس تذکرے کا ذکر چوتھی جلد میں آنا چاہیے تھا، وہاں رہ گیا، اس لیے اب کیا جارہا ہے۔ ادارہ اس سے متعلق اس اہم ترین پہلو سے واقف نہیں کہ یہ دراصل اسماعیل میرٹھی کی تصنیف ہے (ڈاکٹر سیفی پریمی: "حیاتِ اسماعیل"، دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۵۹)۔

ادارے کے نوٹ کے بعد الطاف فاطمہ نے اس جزو کو تحریر کیا ہے، یعنی اس مدت کی اہم سوانح عمریوں کا تعارف دیا ہے۔ اس کے بعد "قلمی خاکے اور جھلکیاں" کے عنوان سے انھیں بھی سوانح نگاری کی ذیلی اصناف قرار دیا ہے (ص ۶۱۲)۔ میری رائے میں کچھ ہی خاکے سوانح کی ذیل میں آسکتے ہیں، لیکن بیشتر خاکے نہیں۔ اس کے بعد "آپ بیتی" کے عنوان سے اہم آپ بیتیوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ اب تو آپ بیتیوں کی باڑھ آگئی ہے۔ آخر میں ادارے نے ایک اور مختصر ضمیمے میں اشرف صبوحی اور یوسف بخاری کے خاکوں کا ذکر کیا ہے۔ میں تو یہ پسند کرتا کہ خاکے کو سوانح سے علاحدہ صنف مان کر الگ آزاد حیثیت سے ذکر کیا جاتا۔

اگلا جزو (ب) "مکاتیب" عبدالقیوم نے لکھا ہے۔ جزو (ج) "طنز و مزاح" ادارے نے لکھا ہے اور بڑی جامعیت سے حق ادا کیا ہے (د) "عورتوں کا ادب (ناول)" بھی ادارے نے لکھا ہے جس میں صراحت کی ہے کہ عورتوں کا ادب سے مراد وہ تخلیقات بھی ہیں جن کی مصنف عورتیں ہیں اور وہ ادب بھی جو عورتوں کے لیے لکھا جاتا ہے۔ اس طرز کے تین رجحانات کو لے کر ایک ایک قسم پر الگ الگ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ متفرقات کا یہ پورا باب قابلِ قدر ہے۔

نواں باب، "زبان اور مطالعۂ زبان"، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے۔ ابواللیث صدیقی اصطلاحی معنی میں ماہر لسانیات نہیں۔ اس باب میں ادب کے حوالے سے اردو کے پیرایۂ زبان وغیرہ کی تشریح ہے۔ لغت اور اصطلاحوں کا ذکر ہے، یونی ورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کی نہایت ناقص فہرست ہے، لیکن لسانیات کا نام نہیں۔ اس میں ص ۷۰۵ پر میری تحقیق "شمالی ہند کی مثنویاں" کو وکرم یونی ورسٹی اجین سے وابستہ کیا ہے، حالانکہ میں نے اس پر آگرہ یونی ورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری لی تھی۔

دسواں باب، ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں اردو زبان اور مطالعۂ زبان"، بھی ڈاکٹر ابواللیث کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں بھی لسانیات کے سوا سب کچھ ہے۔ پہلے صفحے ہی پر لکھتے

Scanned by CamScanner

ہیں:

گاندھی نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اردو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ (ص۷۰۸)

مہاتما گاندھی کے نام کو محض "گاندھی" لکھنے پر مضمون نگار کی تہذیب کی جتنی داد دی جائے، کم ہے۔ اس سے قطع نظر، اس اتہام کو مہاتما گاندھی پر عائد کرنا بالکل لچر ہے۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں کسی اردو والے نے مہاتماجی کو چٹھی لکھ کر اس قول کے بارے میں دریافت کیا۔ مہاتماجی نے یہ چٹھی اور اس کا جواب ۸ فروری ۱۹۴۲ء کے "ہریجن سیوک" میں چھاپا ہے، جہاں انھوں نے چٹھی کی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ حیدر آباد کے مشہور گاندھی وادی ڈاکٹر جعفر حسن نے اس سلسلے میں ۱۵ ستمبر ۱۹۴۱ء کو مہاتما گاندھی سے استفسار کیا۔ خط و کتابت کے بعد مہاتماجی نے ۱۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو جعفر حسن کو لکھا کہ میرا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو میں اس قسم کے ریمارک کر سکتا۔ ڈاکٹر جعفر حسن نے اس موضوع سے متعلق تمام مراسلت ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ء کے "ہماری زبان" میں چھپوادی۔

مہاتما گاندھی کی اس تردید کا ذکر جون ۱۹۹۴ء میں حیات اللہ انصاری صاحب نے بھی کیا۔ وہ اور ان کی اہلیہ سلطانہ حیات عرصے تک مہاتماجی کے آشرم میں ٹھہرے تھے۔ وہاں سلطانہ صاحبہ نے مہاتماجی سے ان کے اس مبینہ قول کے بارے میں دریافت کیا، انھوں نے سختی سے اس سے انکار کیا۔ دراصل اس زمانے میں مولوی عبدالحق بہت اونچا سنتے تھے۔ ان کے کسی مقرب نے یہ قول خود وضع کر کے گاندھی جی سے منسوب کر دیا اور مولوی صاحب کے کان بھر دیے۔ میں نے اس سلسلے میں ہاشمی فرید آبادی کا نام سنا تھا لیکن حیات اللہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ کام ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا تھا۔ مہاتما گاندھی اگر مہاتما نہیں تو اہلِ سیاست ضرور تھے۔ وہ ایسی غیر دانش مندانہ بات نہ کہہ سکتے تھے کہ مسلمان چاہیں تو اردو کو رکھیں اور پھیلائیں۔

اس باب میں مضمون نگار نے صرف دو یونی ورسٹیوں یعنی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور دہلی یونی ورسٹی کے تحقیقی مقالوں کی فہرست دی ہے، جو ناقص ہے۔ بعض مقالوں کے سنین غلط ہیں۔ مقالوں کے بعد چند تدونیات کی فہرست دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تحقیقی مقالوں اور ترتیبِ متون کو مطالعۂ زبان تو نہیں کہہ سکتے۔ مضمون نگار کو عنوان کچھ دیا گیا اور انھوں نے لکھ مارا: "ہندوستان میں اردو تحقیق کی رفتار ۱۹۴۷ء کے بعد"۔ اگر یہ تحقیقی کتابیات جامع ہوتی تو بہت مفید ہوتی لیکن پاکستان میں بیٹھ کر کوئی ہندوستان کے تحقیقی کاموں کی کتابیات کیوں کر بنا سکتا ہے۔

Scanned by CamScanner

دسویں باب کا دوسرا جزو "اس دور کے ادب کا عمومی جائزہ" ہے، جو ادارے نے لکھا ہے۔ اس دور میں اردو ادب کی بہت ترقی ہوئی ہے، جسے دیکھتے ہوئے جائزہ مختصر ہے، کچھ اور صفحات چاہیے تھے۔

اس جلد میں بیسویں صدی کو دو حصّوں میں توڑنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یک جا لکھا جاتا تو شکست و ریخت کم ہوتی۔ اس سے قطع نظر بیش تر ابواب اچھے ہیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں ادیبوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے اس دور سے انصاف کرنے کے لیے دو جلدیں دی جاتیں تو مناسب ہوتا۔ بڑے بڑے قلم کاروں کو ایک آدھ صفحے میں نپٹانے سے نہ صرف اس مصنف کے ساتھ بلکہ قاری کے ساتھ بھی انصاف نہیں ہوتا۔

اس تحریر کے خاتمے کے طور پر میں پانچوں جلدوں کے بارے میں اپنا مجموعی تاثر و مشاہدات پیش کرتا ہوں۔

یہ بڑی بات ہے کہ اردو ادب کی ایک مفصّل تاریخ تیار ہو گئی۔ اسے دیکھ کر اردو ادب کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں ادیبوں کی وہ ریل پیل ہے کہ ان کے لیے ایک جلد تنگیِ داماں کی شاکی نظر آتی ہے۔ اس صدی کو دو جلدیں ملنی چاہیے تھیں، یعنی یہ تاریخ پانچ کے بجائے چھے جلدوں میں لکھی جاتی۔ جمیل جالبی ۱۷۰۰ء تک دو جلدیں صرف کر چکے ہیں اور انیسویں بیسویں صدی کے ادب کی مقدار و معیار پہلے کی صدیوں سے فزوں تر و بلند تر ہے۔

اس تاریخ کا نام "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" ہے، لیکن جیسا کہ شروع میں لکھا گیا، اس میں غیر مسلم اردو ادیبوں کا اسی طرح ذکر ہے جیسے ہندوستان میں لکھی جانے والی کسی تاریخ میں ہوتا۔ ادارے اور مضمون نگاروں کو اپنی یہ غلط فہمی جھٹک دینی چاہیے کہ اردو ادب محض مسلمانوں کا ادب ہے۔ اس میں دیاشنکر نسیم، سرشار، پریم چند، فراق، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، آنند نرائن ملا اور مالک رام جیسے غیر مسلم ادیب ہوئے ہیں، جن کا مقام اپنی صنف میں کسی مسلم ادیب سے کم نہیں۔

برِعظیم کی تقسیم ہوئی ہے، لیکن اردو زبان و ادب کی تقسیم نہیں ہوئی۔ مضمون نگاروں کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا کہ یہ تاریخ پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے قارئین، مسلمانوں کے علاوہ ہندو قارئین کے استفادے کا سامان بھی بنے گی، اس لیے سیاسی اور تہذیبی پس منظر، نیز دوسرے مقامات پر، مسلم مناظراتی انداز میں نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ ہندو ہادیانِ دین و عمائدِ سیاست سے ہزار اختلاف کے باوجود سنجیدہ مہذب تعظیمی لہجے میں کلام کرنا تھا۔

Scanned by CamScanner

تاریخ کے خاکے میں طرح طرح سے ترقی کی گنجائش تھی۔ دیکھیے حسبِ موقع اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ادبی تاریخ میں ادوار کی تقسیم ہمیشہ ایک ٹیڑھی کھیر ہوتی ہے۔ آسان طریقہ یہی ہے کہ صدیوں کے ساتھ تقسیم کر دی جائے۔ زمان کے علاوہ ہم علاقے اور صنف ادب سے، بالخصوص نثر و نظم کی تقسیم سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ سب کا تھوڑا بہت لحاظ کرنا ہوگا، مثلاً اگر پہلی جلد کو ۱۷۰۰ء تک محدود کیا جائے تو اس میں گجرات، بہمنی دور، بیجاپور، گولکنڈہ، مغل دور کو الگ الگ کرنا ہوگا۔ کتاب میں کہیں مختلف ادبی صنفوں کے ارتقا کو بھی سمیٹنا ہوگا۔

چونکہ اتنا بڑا کام ایک فردِ واحد کرے تو بیس سال لگ جائیں اس لیے یہ طریقہ نکالا گیا کہ مختلف ابواب مختلف ماہرین کے سپرد کر دیے جائیں۔ اس تقسیم میں سب سے بڑی اہمیت مجلسِ ادارت اور مدیرِ اعلیٰ کی ہے۔ وہ ایسے افراد ہونے چاہییں جن کا مقام اردو ادب میں مسلّم ہو، بالخصوص بحیثیت مورّخِ ادب کے۔ مدیرِ اعلیٰ ایک محقق ہونا چاہیے۔ اس تاریخ کے مدیروں میں یہ وصف نہیں دکھائی دیتا۔ مدیرِ عمومی صاحب نہ بطور محقق، نہ بطور نقاد کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تو تخلیق کار کے طور پر بھی ممتاز نہیں۔ معلوم نہیں مجلسِ ادارت اور مدیر کے کیا کیا فرائض طے کیے گئے تھے اور وہ ان سے کس حد تک عہدہ برآ ہو سکے۔

ظاہر امدیر کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ متفرق مضامین کو سمو کر ایک کُل کی شکل دلا سکے۔ وہ مضمون نگاروں کی تحریروں کو پڑھے اور اگر ان میں کوئی سہو دکھائی دے یا مختلف مضامین میں ایک ہی واقعہ مختلف طریقے پر بیان کیا گیا ہو تو مضمون نگار کو مضمون واپس کر کے نظرِ ثانی کے لیے کہا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ایک ادیب کی زندگی یا کتابیات کے سنین ایک باب میں کچھ دیے ہوں، دوسرے میں کچھ۔ ایسا ہو تو مضمون واپس کر کے درست کرایا جائے۔ پھر بھی اختلاف باقی رہیں تو مدیر فٹ نوٹ میں اپنی رائے لکھ دے۔

معلوم نہیں مضمون نگاروں کا انتخاب ملک گیر پیمانے پر کیوں نہیں کیا گیا۔ اس میں بیش تر مضمون نگار پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ جمیل جالبی، مشفق خواجہ اور فرمان فتح پوری جیسے باہر کے ادیب خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے پھر یہ دریدہ دہنی کرنی پڑتی ہے کہ بیش تر مضمون نگار ایسے ہیں جن کا تحقیق یا تنقید میں پایۂ استناد بہت کمزور ہے۔ جن کی تحریر کو کسی دوسری جگہ سند کے طور پر پیش کرنے میں تأمل ہوتا ہے۔ اگر پورے پاکستان کے اہلِ قلم میں سے ہر موضوع کے ماہرین کا تعاون لیا جاتا تو کتاب بہتر ہوتی گو اس میں وقت قدرے زیادہ لگتا۔

بہ صورتِ موجودہ کتاب میں وحدت کا عنصر مفقود ہے، انتشار کا عالم زیادہ ہے۔

Scanned by CamScanner

ادارے نے نظرِ ثانی نہ خود کی ہے، نہ کرائی ہے۔ مختلف مضامین کے اختلافی بیانات برقرار ہیں۔ مختلف ادیبوں کے بارے میں عدمِ توازن دکھائی دیتا ہے، مثلاً جلد سوم میں میر انیس کو سوا دو صفحے اور رجب علی بیگ سرور کو ۱۱ صفحے دیے ہیں، جلد پنجم حصۂ اوّل میں فکشن نگار خان احمد حسین خاں کو سوا دو صفحے اور علی عباس حسینی کو سوا صفحہ ملا ہے، اسی جلد کے حصۂ دوم میں افسانہ نگار فیاض محمود کو ڈھائی صفحے، راجندر سنگھ بیدی کو پون صفحہ اور قرۃ العین حیدر کو آدھے سے بھی کم صفحہ تفویض کیا گیا ہے۔

میری رائے میں تاریخِ ادب بنیادی حیثیت سے تاریخ ہے، اس میں تنقید سے زیادہ اہمیت تحقیق کی ہے۔ تنقیدی کتابیں تو بہت لکھی جاتی ہیں، کسی کو کسی مصنف کے سنہ ولادت یا سنہ وفات یا اس کی کسی کتاب کی تاریخِ تصنیف جاننی ہو تو وہ تاریخِ ادب کو نکال کر اس میں سے قابلِ اعتماد جواب چاہے گا۔ یہ تاریخ سنین کے معاملے میں کمزور ہے۔ کسی مضمون نگار نے سنین کی صحت کے لیے زیادہ چھان بین سے کام نہیں لیا۔

تمام مضامین کا معیار یکساں نہیں۔ بعض بہت بلند ہیں۔ بعض بہت کمزور، بیش تر اوسط درجے کے ہیں اور یہ غنیمت ہے۔ ماہرین سے لکھایا جائے تبھی جمیل جالبی، عشرت رحمانی، فرمان فتح پوری، مسکین حجازی، عبدالسلام خورشید اور خورشید احمد (مصنف "دینی ادب") کا سا معیار حاصل ہو سکتا ہے۔ غیر ماہرین لکھیں گے تو "لسانیاتی جائزے اور مطالعۂ زبان" کے سے غیر مستند معیار پر قناعت کرنی ہوگی۔

کئی کمیوں کے باوجود اس تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ لکھی گئی، مکمل ہو گئی، قارئین کو میسر آ گئی۔ دورِ جدید کے بارے میں یہ اتنی طمانیت بخش نہیں، جتنی قدیم اور وسطی دور کے سلسلے میں ہے، اور اس کی وجہ مضمون نگاروں کے علم کی کوتاہی نہیں، صفحات کی تحدید معلوم ہوتی ہے۔ کاش انھیں قدرے تفصیل سے لکھنے کا موقع فراہم کیا جاتا۔

جب تک ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ مکمل ہو کر سامنے نہیں آ جاتی، پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی یہ تاریخ پورے اردو ادب کی اہم ترین تاریخ رہے گی۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱) خود میں نے اپنی دو کتابوں "اردو کی نثری داستانیں" اور "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کی ابتدا میں طویل پس منظر دیا ہے۔ آخرالذکر کے تبصرے میں جب ڈاکٹر محمد حسن نے اعتراض کیا تب سے مجھے سوجھا کہ پس منظر کم سے کم ہونا چاہیے۔

(۲) سخاوت مرزا: "شاہ صدرالدین میسوری دکھنی قدس سرہ"، "نوائے ادب"، اپریل ۱۹۶۳ء، ص۲۶-۶۳

(۳) سخاوت مرزا کا مندرجۂ بالا مضمون، نیز ڈاکٹر حبیب النسا بیگم: "ریاست میسور میں اردو کی نشوونما" (بنگلور، ۱۹۷۲ء، ص۴۷-۶۵)

(۴) "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، ص۴۷۳، بحوالۂ انگریزی کتاب "ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا"، ۱۹۶۱ء

(۵) ڈاکٹر سید حمید شطاری: "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر"، حیدرآباد، ۱۹۸۲ء، ص۱۳۶

(۶) ڈاکٹر رفعت جمال: "ذکاءاللہ، حیات اور ان کے علمی وادبی کارنامے"، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۵۷

(۷) "گجرال کمیٹی رپورٹ"، حکومتِ ہند، ۱۹۷۵ء، ص۱۰-۲۰۹۔ نیز ڈاکٹر حکم چند نیر: "اردو کے مسائل"، بنارس، ۱۹۷۷ء، ص۱۴۰

(۸) "کارروائیاں، عموی انتظاماتِ شمالی مغربی صوبجات"، اکتوبر ۱۹۰۰ء، بحوالۂ ڈاکٹر حکم چند نیر: "اردو کے مسائل"، بنارس، ۱۹۷۷ء، ص۱۳۹

ظاہرا یہ رپورٹ حسب ذیل ہے:

Proceedings of the Govt. of North West Provinces and Oudh, in the Administrative Department 1893-1901

یا جنرل اینڈ ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ کی ۱۸۵۶ء تا ۱۹۰۱ء کی روئیداد ہیں (ایضاً، ص۱۸۹)۔

(۹) اسلم فرخی: "محمد حسین آزاد"، جلد۲، ص۶۷-۲۶۶ وغیرہ۔ نیز عابد پیشاوری: "ذوق اور محمد حسین آزاد"، ص۲۳-۱۲۰

(۱۰) "اقبال سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ"، "ہماری زبان"، دہلی، ۱۵ مارچ ۱۹۸۰ء، ص۱

(۱۱) "اقبال کے والد شیخ نتھو کا سفر، شیخ نور محمد اَن پڑھ فلسفی تک۔ ماہرینِ اقبالیات کے لیے لمحۂ فکریہ"، ("ہماری زبان"، ۱۵اگست، ۲۲اگست و یکم ستمبر ۱۹۸۰ء)

Scanned by CamScanner

سترھواں باب

اینی میری شِمل: "کلاسیکی اردو ادب"
(انگریزی)

میری کتاب میں اردو ادب کی ان عمومی تاریخوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں لیکن زیرِ بحث تحریر پوری کتاب نہیں، ایک کتاب کا جزو ہے۔ اس کی ضخامت اور مصنف کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے بھی تواریخِ ادب کی بزم میں بار دے رہا ہوں۔ جرمنی میں "ہندوستانی ادب کی تاریخ" تیار کرانے کا ایک منصوبہ بنایا گیا جس کے مدیر جان گونڈا (Jan Gonda) تھے۔ اس کی آٹھویں جلد میں پانچ فصلیں ہیں جن میں ہندوستان کے اسلامی ادبوں: اردو ادب، بنگالی ادب اور ہندی ادب کی تاریخ ہے۔ تیسری فصل "کلاسیکل اردو لٹریچر، آغاز سے اقبال تک" ڈاکٹر اینی میری شِمل (Annemarie Schimmel) نے لکھی ہے۔ یہ جزو Wiesbaden، Otto Harrasso Witz سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا(۱)۔ چوتھی فصل "جدید اردو ادب" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سپرد تھی، لیکن انھوں نے نہیں لکھی۔ اب کیا لکھیں گے۔ شِمل نے اپنی نگارش کو "ہفتاد سالہ ڈاکٹر سید عبداللہ" کو معنون کیا ہے۔

معلوم نہیں کتاب اصلاً جرمن زبان میں لکھی گئی یا انگریزی میں۔ میرے سامنے انگریزی تحریر ہے جس کا متن ص ۱۲۵ سے ص ۲۵۰ تک ہے، یعنی ۱۲۶ صفحوں پر۔ اس کے بعد ۱۱ صفحوں کا اشاریہ ہے۔ اگر نارنگ یا کوئی اور "جدید اردو ادب" بھی لکھ دیں تو تقریباً ۳۰۰ صفحوں کی تاریخِ ادبِ اردو ہو جائے گی۔ یہ انگریزی میں اردو کی چوتھی ادبی تاریخ ہے۔ اس سے پہلے رام بابو سکسینہ، گراہم بیلی اور محمد صادق لکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر شِمل نے یورپی زبانوں اور اردو میں اس کثرت سے کتب سے استفادہ کیا ہے جسے دیکھ کر عش عش کرنا پڑتا ہے، مثلاً انھوں نے یورپی زبانوں کی یہ کتابیں بھی دیکھیں:

1- A Bausani, Storia delle letterature del pakistan, Milano, 1958 (اطالوی میں)

2- S. Ehtisham Husain, Istoriya literatury Urdu, Moscow, 1961 (روسی)

3- N. Glebov, A sucho Cev, literatura Urdu, Moscow, 1967 (روسی)

دکنی ادبیات کی جتنی تدوینیں ہوئی ہیں انھوں نے تقریباً ان سب کو دیکھا ہے۔ غرضیکہ مغربی زبانوں اور اردو کی جتنی زیادہ کتابوں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، عام طور سے محض سو سوا سو صفحے لکھنے کے لیے کوئی دوسرا نہ کرتا۔ انھوں نے مصنفوں کی ولادت، حیات اور کتابوں کی تصنیف یا اشاعت کے سنین دینے پر خصوصی توجہ کی ہے۔ ہر صفحے پر سنین بھرے پڑے ہیں، لیکن چونکہ ان کے مطالعے کا میدان محض اردو ادب نہیں اور وہ ہندوپاک سے دور رہتی ہیں اس لیے ہم امید نہیں کرسکتے کہ وہ اردو ادب میں اس قدر ڈوبی ہوں گی جتنے ہندوپاک کے محققین۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں سنین کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ میں نے ان کی تصحیح کے لیے چند ہی کتابوں سے کام لیا ہے، اس لیے پورے اطمینان سے دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میری تجویز یں سو فی صدی صورتوں میں صحیح ہیں۔

ابتدا سے اقبال و جوش تک تقریباً پورے اردو ادب کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سوا سو صفحوں میں نام شماری ہی ہوسکتی ہے، کسی موضوع، تحریک، مصنف یا کتاب پر تفصیل سے نہیں لکھا جاسکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تنقیدی پہلو اتنا مفصل نہیں جیسا کہ چاہیے تھا۔ ویسے جو کچھ لکھا ہے وہ سلیم الطبعی اور توازن کے ساتھ لکھا ہے۔ میں عموماً ان مختصر بیانات پر تبصرہ نہ کرکے سنین کے جائزے پر توجہ مرکوز کروں گا، لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ان کے طریقِ املا کے بارے میں ایک حرف:

انھوں نے اردو کے عربی الاصل حروف کو رومن خط میں نشانات کے اضافے سے الگ الگ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ بہتر ہوتا کہ وہ ہندوپاک میں اردو سے متعلق رومن خط میں تحریروں کی تقلید کرتیں۔ اہلِ اردو میں عربی کی مخصوص آوازوں کا وہ تلفظ نہیں جو عربی میں ہے۔ انھیں مماثل فارسی یا ہندی آوازوں کے مطابق کرلیا گیا ہے اور اسی مماثلت کی بنا پر رومن میں لکھا جاتا ہے، مثلاً اہلِ اردو "ث"، "ص" کو سو فی صدی "س" بولتے ہیں اس لیے رومن میں ان تینوں حروف کو "s" سے لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر شمل خ کو h، H لکھتی ہیں جس سے سخت الجھن ہوتی ہے۔ g سے انھوں نے تین حروف کا کام لیا ہے: G،g (گ)۔ G،g (غ)۔ G،g (ج)۔ ہندوپاک میں "ج" کی

آواز کے لیے J، گ کے لیے g اور غ کے لیے gh لکھا جاتا ہے۔ حاے حطّی کو وہ H,h لکھتی ہیں جب کہ اہلِ اردو ہاے ہوز اور حاے حطّی دونوں کا تلفظ یکساں کرتے ہیں اور دونوں کو H,h سے لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شِمل کی نزاکتوں سے پڑھنے میں دِقت ہوتی ہے، بالخصوص "خ" کے لیے h لکھنا بہت پریشان کن ہے۔

ڈاکٹر شِمل نے اپنی تحریر کو تین بابوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا باب: دورِ اوّل، ۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک۔

دوسرا باب: اردو ادب، ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک۔

تیسرا باب: تیسرا دور، غالب سے اقبال تک۔

ہر باب میں کئی اجزا ہیں۔ پہلے باب میں پہلا جزو "تعارف" ہے۔ اس میں لکھتی ہیں کہ تحریری زبان کے طور پر شمالی ہند میں اردو بارھویں صدی میں نشوونما پانے لگی (ص۱۲۶)۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ اردو کے قدیم ترین ملفوظات تیرھویں صدی کے ہیں۔ وہ بیلی کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ کھڑی بولی کی اصطلاح پہلی بار ۱۸۰۳ء میں استعمال کی گئی (ص۱۲۶)۔ میرا خیال ہے کہ اسے ایک سال قبل لے جایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے اپنے مقالے "مانک ہندی کا اِتہاسِک ویاکرن" میں لکھا ہے کہ گِل کرسٹ نے ۱۸۰۲ء میں یہ بیان دیا:

> ان کہانیوں میں سے کئی کھڑی بولی ہندوستانی کے شدھ ہندوی ڈھنگ کی ہیں اور کچھ برج بھاشا میں دی جائیں گی۔

(The Hindee Story Tella, Vol-2, 1802, P.7)

قطعے کی تعریف میں لکھتی ہیں کہ یہ غزل ہوتی ہے جس کے پہلے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا (ص۱۲۷)۔ یہ تعریف کافی نہیں۔ بڑا فرق یہ ہے کہ قطعے کے تمام اشعار معنوی اعتبار سے منسلک ہوتے ہیں جب کہ غزل کے اشعار ایک دوسرے سے آزاد۔ بیسویں صدی میں متعدد شعرا، بالخصوص اقبال نے ایسے قطعے لکھے جن میں مطلع ہے، یعنی پہلے مصرع میں بھی قافیہ ہے۔

اس باب کا دوسرا جزو ہے: "شمالی ہند میں اردو ادب کا آغاز، (بارھویں سے چودھویں صدی تک"۔ اس زمانے کے لسانیاتی نقشے کے طور پر "سرہندی بولی" کا ذکر کرتی ہیں (ص۱۲۷-۲۸)۔ میں نے اس سے پہلے یہ نام نہیں دیکھا۔ لسانیات میں اسے بانگرو اور اردو تحریروں میں ہریانی کہا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتی ہیں کہ برج اور اودھی بولیوں کی آسان و سادہ شکل کو کھڑی بولی کہتے تھے (ص۱۲۸)۔ یہ سخت غلط فہمی ہے۔ لسانیات میں مشرقی

Scanned by CamScanner

ہندی اور مغربی ہندی دو الگ زبانیں ہیں۔ مشرقی ہندی کی خاص بولی اودھی ہے۔ مغربی ہندی کی معیاری بولی کو کھڑی بولی کہتے ہیں۔ برج اس سے علاحدہ بولی ہے۔ لکھتی ہیں:

> خواجہ اشرف جہاں گیر سمنانی کے ہندوی رسالے "اخلاقِ تصوف" کے کچھ حصے باقی ہیں۔ (ص۱۲۹)

اردو کی ادبی تاریخ کے قارئین عام طور سے جانتے ہیں کہ سمنانی کا یہ رسالہ محض خیالی ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کتاب "اردو نثر کا آغاز اور ارتقا (انیسویں صدی کے اوائل تک)" ص۵۷-۵۶)۔ خسرو کے سلسلے میں "پہیلیاں" کو سہواً پہیرلیاں (Paheriiyan) لکھا ہے (ص۱۲۹)۔ انھوں نے ان پہیلیوں کے استناد پر شبہہ کیا ہے لیکن اتنا کافی نہیں۔ خسرو سے منسوب ایک بھی اردو شعر، دوہا، پہیلیاں یا ریختہ وغیرہ مستند نہیں، مشکوک ہیں۔ اس سلسلے میں حاشیے میں ایک کتاب کا ذکر کرتی ہیں:

> انتظام اللہ شہابی و درد کاکوروی: "حضرت امیر خسرو اور ان کا اردو کلام"، کراچی، ۱۹۶۱ء۔

سبحان اللہ! دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ کر غیر ثقہ راوی ہیں۔ مجھے ان کی اس کتاب کے بارے میں کوئی علم نہیں، لیکن درد کا ایک مضمون "امیر خسرو، ایک اردو شاعر کی حیثیت سے" "نگار"، دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔ میرا خیال ہے مندرجۂ بالا بھی کوئی مضمون ہوگا، کتاب نہیں۔ اس باب کے بقیہ پانچ اجزا گجرات و دکن میں اردو ادب کے ارتقا پندرھویں اور سولھویں صدی، سے متعلق ہیں۔

میں سنین کے اختلاف کو بعد میں لوں گا۔ اوّل دوسرے مشاہدات:

وہ صحیح لکھتی ہیں کہ شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں مقامی زبان کے ادب کے ابھرنے کے لیے حالات زیادہ موافق تھے، مثلاً فارسی عربی کے اثر کا کمزور ہونا، ہندو مسلمانوں کے رہن سہن میں زیادہ مماثلت وغیرہ (ص۱۳۱)۔ ابتدائی دکنی ادب کی تاریخ میں وہ ان تمام مغالطوں کا شکار ہیں جن کے ابتدائی مؤرخین اردو تھے۔ "معراج العاشقین" کے لیے ڈاکٹر حفیظ قتیل ثابت کر چکے ہیں کہ یہ خواجہ سے کئی صدی بعد کے ایک دوسرے بزرگ مخدوم حسینی کی تصنیف ہے۔ "سیرالمصنفین" طبعِ دوم پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا:

> ان سے منسوب "معراج العاشقین" میں نے ہی مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کے دیباچے میں میں نے اپنا شبہہ ظاہر کیا تھا۔ بعد کی تحقیق سے مجھے قریب قریب یقین ہو گیا کہ یہ اور اس قسم کے بعض

Scanned by CamScanner

رسالے "شکارنامہ"، "معراج نامہ" وغیرہ جو اُن سے منسوب کیے
جاتے ہیں در حقیقت ان کی تصنیف نہیں ... حال کے بعض مولفین
نے لکھا ہے کہ عین الدین گنج العلم (ولادت ۷۰۶ھ) نے بعض
رسائل اردو یا دکنی اردو میں تصنیف فرمائے، لیکن اس کا ثبوت یا
حوالہ نہیں دیتے۔

("اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۷)

میں پیچھے ڈاکٹر حسینی شاہد اور بنگلور کے ڈاکٹر ن م سعید کی اس تحقیق کا ذکر کر چکا ہوں کہ خواجہ نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ شِمل نے ان کے تین سینہ رسالوں کا نام لیا ہے: "ہدایت نامہ"، "ہشت اسرار"، "رسالہ سہارا" (کذا۔ صحیح: سہ بارہ)۔ میں ان کی تفصیل علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں دے چکا ہوں، یہاں ایک بار پھر مختصراً عرض کرتا ہوں:

"ہدایت نامہ" کا ذکر شمس اللہ قادری نے کیا ہے۔ انھیں یاد ہے کہ انھوں نے "تاریخِ حبیبی" کے بابِ ہفتم میں اس کا نام دیکھا تھا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ فارسی "تاریخِ حبیبی" نایاب ہے، اردو ترجمہ عام طور سے ملتا ہے۔ اس میں کہیں بھی کسی اردو رسالے کا ذکر نہیں۔ "ہشت اسرار" کا ذکر بھی شمس اللہ قادری نے کیا۔ اس میں خواجہ صاحب کے سات ارشادات ہیں: جن کی مبسوط شرح کسی مرید نے لکھی ہے۔ ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" میں اسے خواجہ کی نہیں، کسی مرید کی تصنیف قرار دیا۔ یہ نام نہاد رسالہ اب ناپید ہے۔ رسالہ "سہ بارہ" میں ملاحظہ "ان" کی دکنی جمع کے علاوہ کوئی فرسودگی نہیں۔ اتنی صاف زبان خواجہ کے عہد کی نہیں ہو سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ کسی طرح "شکارنامہ" کی شرح نہیں۔

گجرات کے صوفی قطب عالم کے بیٹے کا نام شاہ احمد لکھا ہے (ص ۱۳۴) ان کا نام شاہ عالم تھا۔ اسی صفحے پر شاہ علی محمد جیوگان کا ذکر کیا ہے۔ "گان" کی جگہ "گام دھنی" چاہیے۔ خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" کا ترجمہ "خوب کی لہریں" (Waves of Khub) کیا ہے (ص ۱۳۴)۔ "فرہنگِ آصفیہ" کے مطابق فارسی لفظ "ترنگ" کے معنی تیر چلاتے وقت کمان کے چلّے کی آواز یا ساز بجاتے وقت تار کی آواز ہیں۔ اردو لفظ "ترنگ" کے معنی امنگ، جوشِ طبع، ولولہ، شیخی وغیرہ ہیں۔ "خوب ترنگ" کے معنی "اچھی لَے" یا "خوب محمد چشتی کی لَے" یا "خوب محمد چشتی کا جوشِ طبع" ہو سکتے ہیں۔ شِمل کا یہ کہنا بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ "خوب ترنگ" کی تحریک "قصۂ لیلیٰ مجنوں" سے ہوئی۔

اردو اور فارسی روایات کی مماثلت دکھاتے ہوئے کہتی ہیں کہ دکنی شعرا نے فارسی مثنویوں کا جواب لکھا یا ان کا تتبع کیا، مثلاً پندرھویں صدی میں نظامی نے نظامی کی "مخزن الاسرار"

Scanned by CamScanner

کو نئے قالب میں پیش کیا (ص ۱۳۵)۔ یہ حیران کن اطلاع ہے۔ مجھے دکن یا شمال میں کسی شاعر کلامی کا پتا نہیں چلتا، نہ "مخزن الاسرار" سے متاثر کوئی مثنوی دیکھنے میں آئی۔

اس باب کے پانچویں جزو کا عنوان "بیجاپور" ہے اس میں شاہ میراں جی شمس العشاق سے "شرحِ مرغوب القلوب" منسوب کی ہے۔ میں پچھے مختلف تواریخ کے جائزے میں لکھ چکا ہوں کہ شمس اللہ قادری اور حفیظ قتیل نے اسے شاہ میراں جی خدانُما کی تصنیف مانا ہے۔ شمس العشاق سے کسی رسالۂ نثر کا انتساب مصدقہ نہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے میراں جی کی ایک مثنوی کا صحیح نام "شہادت التقیق" لکھا ہے، جسے دوسرے لکھنے والے "شہادت التحقیق" یا "شہادت الحقیقت" سمجھ دیتے ہیں۔ اس کے لیے لکھتی ہیں کہ اس میں ۱۱۰۰ لائنوں سے زیادہ ہیں (ص ۱۳۶)۔ یہ بیلی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے، جنھوں نے اس میں ۱۱۲۶ لائنیں بتائی ہیں۔ بیلی لائن کو مصرع کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس مثنوی میں ۵۶۳ شعر ہیں ("قدیم اردو"، ص ۱۸) معلوم نہیں شِمل نے لائن کو مصرع کے معنی میں لیا ہے یا وہ اس میں واقعی ۱۱۰۰ سے زیادہ ابیات سمجھتی ہیں۔ اردو میں بالعموم ایک شعر کے دونوں مصرع ایک سطر میں لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے مصرع کو لائن کہنے سے غلط فہمی ہوتی ہے۔

شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے ایک قصیدے کا نام "محبت نامہ" لکھتی ہیں (ص ۱۳۷)۔ یہ صحیح ہے کہ "قدیم اردو" میں مولوی عبدالحق نے اس کا نام "محب نامہ" یا "محبت نامہ" لکھا ہے لیکن شاہ امین کے محقق ڈاکٹر حسینی شاہد نے اسے محض "محب نامہ" ہی کہا ہے(۲) شِمل ص ۱۳۷ پر میراں جی خدانُما کی ایک نظم کا نام "چکری نامہ" لکھتی ہیں۔ صحیح "چکّی نامہ" ہے۔ اسی صفحے پر سترھویں صدی عیسوی کی ایک نظم "رتن کھن" کا ذکر کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ "رتن پدم" کی تحریب ہے۔ بقولِ جالبی، دکن میں اس موضوع پر تین مثنویاں لکھی گئیں۔

غلام علی کی "پدماوت" ۱۰۹۰ھ/۸۰-۱۶۷۹ء۔ سید محمد عشرتی کی "دیپک پتنگ" ۱۱۰۷ھ/۹۶-۱۶۹۵ء۔ ولی ویلوری کی "رتن پدم" ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء (جالبی: "تاریخِ ادب اردو"، جلد ۲، حصہ دوم ص ۱۰۱۹)

اگر شِمل سترھویں صدی کے بجائے اٹھارویں صدی کے اوائل کی بات کہتیں تو صاف ظاہر تھا کہ وہ آخر الذکر کی مثنوی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ص ۱۳۸ پر وہ مرزا محمد مقیمی صاحب مثنوی "چندربدن و مہیار" کا ذکر کرتی ہیں۔ جمیل جالبی کی تحقیق ہے کہ مرزا محمد مقیم مختلف شخص ہے اور مقیمی مختلف۔ آخر الذکر "چندربدن و مہیار" کا مصنف ہے

Scanned by CamScanner

(جالبی، جلد ۱، ص ۷-۳-۲۳۵)۔ شمل حاشیے میں لکھتی ہیں کہ بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس اردو مخطوطات کی فہرست میں لکھا ہے کہ غواصی کے دوست عزیز نے اس قصے کو تفصیل سے بیان کیا، نیز بیانی نے اسی موضوع پر ۱۶۹۴ء میں مثنوی "عشق نامہ" لکھی (ص ۱۳۸)۔ میں عزیز بیانی اور اس کی مثنوی "عشق نامہ" سے واقف نہیں۔

نصرتی کے مجموعۂ غزلیات و قصائد کا نام "گل دستۂ عشق" لکھتی ہیں (ص ۱۳۸)۔ محققین نصرتی نے اس کی کسی تصنیف کا نام "گل دستۂ عشق" نہیں لکھا۔ وہ اسی صفحے پر نصرتی کے "معراج نامہ" کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ صاحب "گلِ رعنا" نے نصرتی کے "معراج نامہ" کا تعارف کرایا اور اس کے اشعار دیے۔ انھیں دیکھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ دراصل نصرتی کا "قصیدۂ حجریہ" ہے۔ وہ یہ دلچسپ اطلاع دیتی ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ کے لیے شیخ عبدالکریم ابنِ شیخ فرید انصاری نے ایک کتاب "جواہرِ موسیقاتِ محمدی" لکھی اور مصور کی؛ یہ مرقع برٹش میوزیم میں موجود ہے (ص ۱۴۲)۔ یہ واضح نہیں کہ کتاب فارسی میں ہے یا دکنی میں۔ وہ حاشیے میں ہندی کی ایک کتاب "علی عادل شاہ کاویہ سنگرہ"، (آگرہ، ۱۹۵۸ء) کا حوالہ دیتی ہیں۔ اہلِ اردو کے لیے یہ نئی اطلاع ہے۔

اس باب کا چھٹا جزو گولکنڈہ ہے۔ اس میں یہ مفید مشاہدہ پیش کرتی ہیں کہ قلی قطب شاہ پہلا اردو شاعر ہے جس نے غزلِ مسلسل لکھی (ص ۱۴۳)۔ ایک طویل پیراگراف میں اس کی عشقیہ شاعری کی داد دیتی ہیں۔ ہندی کے ایک شاعر کا نام "منگن" لکھتی ہیں (ص ۱۴۴)۔ صحیح منجھن ہے جس نے "مدھومالتی" لکھی۔ گارساں دتاسی کے حوالے سے اردو نثر کے ایک "طوطی نامہ" کا ذکر کرتی ہیں جس کا مصنف منصور علی سبزواری ہے (حاشیہ ص ۱۴۶)۔ مجھے ایسی کسی کتاب کی اطلاع نہیں۔ دتاسی ضروری احتیاط سے کام نہیں لیتا، اس لیے اس کے قول کی مزید تفتیش کی ضرورت ہے۔ اسی حاشیے سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ وِملا واگھرے اور نصیر الدین ہاشمی نے مل کر "قطب مشتری" کا ہندی ایڈیشن حیدر آباد سے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا۔ حیرت ہے کہ حیدر آباد کی ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے اپنے اردو ایڈیشن (نئی دہلی، ۱۹۹۲ء) میں اس کا ذکر نہیں کیا۔

شمل وجہی کی غیر مطبوعہ مثنوی "تاج الحقائق" کا ذکر کرتی ہیں (ص ۱۴۷)۔ اس بیان میں دو غلطیاں ہیں: "تاج الحقائق" مثنوی نہیں، نثر ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ غیر مطبوعہ نہیں۔ اسے ڈاکٹر نورالسعید اختر نے بمبئی سے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ شمل نے "سب رس" پر مفصل تنقید کی ہے۔ انھوں نے ایک نیا اور دلچسپ نکتہ پیدا کیا کہ وجہی نے اس دور میں عقل کی تعریف کر کے اپنی ترقی پسندی کا ثبوت دیا (ص ۱۴۹)۔

Scanned by CamScanner

تحسین الدین کی مثنوی "قصۂ کام روپ" کے لیے لکھتی ہیں کہ شہزادہ کام روپ "کلا" کی تلاش کرتا ہے (ص ۱۵۰)۔ اس کی مثنوی کا صحیح نام "قصۂ کام روپ و کلاکام" ہے، ہیروئن کا نام کلاکام ہے جو قصے کے دوسرے نسخوں میں کام لتا کے نام سے سامنے آتی ہے۔ ریشل ایک اور انکشاف کرتی ہیں۔

"گولکنڈہ" اور غالباً دکن کے دوسرے مقامات پر بھی درباروں کے علاوہ ایک اور عوامی شاعری کا ارتقا ہوا۔ شعرا سعید بُل کی، میراں یعقوب، فاروقی اور دوسرے اسے بازاروں اور مجمعوں میں سناتے تھے۔ گھومنے والے بھاٹ شاعر انھیں زبانی یاد کر لیتے اور پورے ملک میں گاتے۔ ان شاعرانہ کارناموں کا بیش تر حصہ ضبطِ تحریر میں نہیں آیا اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ تلف ہو گیا(۳) "سعید بُل کی" سید بلاقی کی تخریب معلوم ہوتی ہے جس نے ۱۰۵۶ھ میں "معراج نامہ" لکھا۔ میراں یعقوب کی شہرت شمائل الاتقیا نثر کے مترجم کے طور پر ہے، بحیثیت شاعر ان کا کوئی ذکر دیکھنے میں نہیں آیا۔ فاروقی سے ایک "چکی نامہ" منسوب ہے۔ سیدہ جعفر نے "چکی نامہ"، "چرخہ نامہ"، "لگن نامہ"، "سہاگن نامہ"، "شادی نامہ"، "آنکھ مچائی"، "بھنگ نامہ"، "لوری نامہ"، "پھگڑی" وغیرہ کا ذکر کیا ہے(۴) ادبی مورخین نے انھیں کو عوامی شاعری کہا ہوگا، لیکن یہ کوئی باقاعدہ تحریک نہ تھی، انفرادی سطح پر عوامی گیت یا نظمیں تھیں۔ انھیں خواہ مخواہ اشتراکی رنگ دینے کی ضرورت نہیں۔

ص ۱۸۲ پر اشرف کی مثنوی کا نام "جنگ نامۂ حیدری" لکھا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ کی فہرست مخطوطات میں اس کا نام محض "جنگ نامہ" (فہرست، ص ۶۲۱) اور "دکن میں اردو میں" "جنگ نامۂ حیدر" لکھا ہے (۱۹۸۵ء، ص ۳۳۱) ریشل ایک دوسرے شاعر محمد فیضی آزاد کی مثنوی "جنگ نامہ" کا ذکر کرتی ہیں (ص ۱۵۲)۔ کریم الدین کے تذکرے کے مطابق اس کا نام محمد فاضل تھا ("طبقات شعرائے ہند"، ص ۴۷۵)۔ وجدی کی مشہور مثنوی کا نام "بنگھی باچھا" لکھا ہے (۱۵۲)۔ صحیح "پنچھی باچھا" ہے۔ اسی صفحے پر ریشل نے دتاسی کی مرتبہ "قصۂ شاہ منور و شمشاد بانو" از دیدار کا ذکر کیا ہے۔ مجھے نہ کہیں دیدار کا نام مل سکا نہ اس مثنوی کا۔ ڈاکٹر ثریا حسین کی کتاب "گارسیں دتاسی، اردو خدمات، علمی کارنامے" (لکھنؤ ۱۹۸۴ء) کا باریکی سے جائزہ لیا، کہیں اس کتاب کا تذکرہ بھی نہیں۔ اگر دتاسی نے یہ کتاب مرتب کی ہے تو یہ ثریا حسین کی نظر سے چوک گئی۔

اس جزو باب کے آخر میں خبر دیتی ہیں کہ دکھنی میں ایک صنف "بارہ ماسائی" یا "دوازدہ تمّسا" (کذا) ابھری جس میں ہندی کے بارہ مہینوں کے پس منظر میں جدائی کے جذبات بیان کیے جاتے ہیں (ص ۱۵۳)۔ دونوں نام غلط ہیں۔ اس صنف کا ہندی نام

"بارماسہ" اور فارسی نام "دوازدہ ماہیہ" ہے۔ یہ صنف شمالی ہند میں ابھری۔ میں دکنی کے کسی بارہ ماسے سے واقف نہیں۔ اردو میں قدیم ترین بارہ ماسہ افضل کی "بکٹ کہانی" ہے۔ اس کے بعد اکرم قطبی ربتکی کا "تیرہ ماسہ" ہے (۱۱۴۳ھ) اور پھر شاہ آیت اللہ جوہری کی مثنوی "گوہر جوہری" (۱۱۶۱ھ) کا بارہ ماسہ ملتا ہے۔

اس باب کی ساتویں فصل اورنگ آباد سے متعلق ہے اس میں پہلے ولی کا ذکر ہے جس کے وطن اور سنہ وفات کے اختلافات کا ذکر کرتی ہیں، خود کوئی فیصلہ نہیں کرتیں۔ اس کے بعد سراج کا ذکر ہے لیکن اس کے آگے داؤد کا نہیں۔ غرض یہ ہے کہ مصنفہ نے ۳۶ صفحوں میں دکن کے بارے میں اتنا سواد پیش کر دیا ہے جو ایک بڑے کتابچے میں آتا ہے۔

اب سنین کے اختلافات پر ایک نظر:

شمل	دوسرے موَرخین
ص ۱۳۴، شاہ احمد (دراصل شاہ عالم) فوت ۱۴۴۴ء	نجیب اشرف: ۱۴۷۵ء (علی گڑھ تاریخ، ص ۱۰۰) جالبی: ۱۴۸۳ء (تاریخ، جلد ۱، ص ۹۶)
ص ۱۳۴، شاہ علی محمد جیو گان (گام دھنی) ف ۱۵۱۵ء۔ لکھتی ہیں کہ بیلی ۱۵۶۵ء لکھتا ہے۔	نجیب اشرف ندوی: ۷ دسمبر ۱۵۶۵ء (علی گڑھ ص ۱۰۰) جالبی ۱۵۶۵ء (جلد ۱، ص ۱۶۴)
ص ۱۳۶، میراں جی شمس العشاق ف ۱۴۹۶ء (۹۰۲ھ)	میری رائے میں یہ سنہ ولادت ہے۔ جانم کے لکھے مرثیے کے مطابق میراں جی ۹۹۴ھ کو فوت
ص ۱۳۶، برہان الدین جانم ف ۱۵۸۲ء	حسینی شاہد: ۱۰۰۷ھ (۱۵۹۹ء)۔ "شاہ امین الدین علی اعلیٰ"، ص ۱۱۴
ص ۱۳۶، امین الدین اعلیٰ ف ۱۶۷۵ء	حسینی شاہد: ۲۳ جمادی الاول ۱۰۸۹ھ / اگست ۱۶۷۴ء (ایضاً، ص ۱۵۰)
ص ۱۳۷، میراں جی خدا نُما ف ۱۶۵۹ء	جالبی: ۱۶۶۳ء (جلد ۱، ص ۴۹۷)
ص ۱۳۷، اردو "خاور نامہ" ۱۶۴۹ء	جالبی: ۱۶۴۰ء (ایضاً، ص ۲۶۵)
ص ۱۳۷، فارسی "خاور نامہ" ۱۴۰۷ء	جالبی: ۱۴۲۶ء (ایضاً)
ص ۱۴۰، نصرتی ف ۱۶۸۴ء	نصیر الدین ہاشمی: ۱۰۸۵ھ (۷۵-۱۶۷۴ء) (فہرست سالار جنگ، ص ۲۰۱) نیز جالبی: ص ۳۳۰

Scanned by CamScanner

ص ۱۴۳، قلی قطب شاہ ف ۱٦۱۱ء
[زور: ۱۱ جنوری ۱٦۱۴ء ("معانیِ سخن"، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹)]

[ص ۱۴۸، مجری کی دکنی "گلشنِ حسن و دل" ۱٦۷۵ء (مولوی عبدالحق کے مطابق صحیح نام "گلشنِ جشنِ دل")]
[منترا عظمی: ۱۷۰۴ء ("اردو میں تمثیل نگاری"، ص ۱۷۳)۔ نیز نورالسعید اختر ("نقوشِ دکن"، بمبئی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰)]

[ص ۱۴۸، ولی اللہ قادری: "سب رس" منظوم ۱۷٦٦ء]
[منترا عظمی و نورالسعید اختر: ۱۷۴۵ء (ایضاً)]

ص ۱۴۹، "پھول بن" ۱٦۵۵ء (۱۰٦٦ھ)
شیخ چاند مرتبِ "پھول بن": ۱۰۷٦ء

[ص ۱۵۰، دولت: تکمیلِ مثنوی "بہرام و بانو حسن" ۱٦۳۹ء]
[جالبی۔ بحوالۂ متنِ مثنوی: ۱۴ ربیع الاول یا آخر ۱۰۵۰ھ (۱٦۴۰ء) (جلد اول، ص ۲٦۲)]

[ص ۱۵۰، باقر آگاہ: "رضوان شاہ و روح افزا" ("گلزارِ عشق") ۱۷۴۵ء]
[جالبی: ۱۲۱۱ھ/ ۱۷۹٦ء (جلد ۱، ص ۲۲۳)۔ یہی سنہ فہمیدہ بیگم نے "کتابیاتِ مثنوی" بنگلور میں۔]

[ص ۱۵۲، وجدی کی "بنگھی باچھا" (صحیح: "پنچھی باچھا") ۱۷۱۲ء]
[نصیر الدین ہاشمی: ۱۱۳۱ھ/ ۱۹-۱۷۱۸ء ("دکن میں اردو"، ص ۳۲۴)۔ نیز فہمیدہ بیگم "کتابیاتِ مثنوی" میں]

[ص ۱۵۵، سراج اورنگ آبادی: ولادت ۱۷۱۴ء، وفات ۱۷٦۳ء]
[سروری و مالک رام: ولادت ۳ صفر ۱۱۲۴ھ (مارچ ۱۷۱۲ء)۔ وفات ۴ شوال ۱۱۷۷ھ (اپریل ۱۷٦۴ء) (سروری مقدمہ مثنویِ "بوستانِ خیال"، حیدر آباد، ۱۹٦۹ء، ص ۷، ۹۔ مالک رام: "تذکرۂ ماہ و سال"، ص ۱۹۱)]

اب لیجیے دوسرا باب: "اردو ادب ۱۷۰۰ء تا ۱۸۵۰ء"

اس کے پہلے جزو میں سیاسی و ادبی پس منظر ہے جس میں کوئی غیر متعلق بات نہیں۔ ساڑھے آٹھ صفحے کے اس پس منظر سے ایک نمونہ ملتا ہے کہ تمہید میں کن موضوعات تک محدود رہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں لکھتی ہیں کہ فائز دہلوی اردو میں پہلا مخمس نگار تھا (ص ۱٦۳)۔ یہ درست نہیں۔ علی عادل شاہ شاہی اور ولی کے کلام میں کئی مخمس ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں شاہ حاتم اور شاکر ناجی کے دور میں بھی مخمس ہیں۔ کون جانے کہ فائز نے پہلے لکھا کہ شاہ حاتم نے۔

Scanned by CamScanner

دوسرے جزو کا عنوان ہے: "اردو کے چار ستون اور ان کے تلامذہ۔" یہ چار ستون کون ہیں۔ آزاد نے مظہر جانِ جاناں، درد، میر اور سودا کو یہ مقام دیا تھا۔ شِمل کے مطابق جدید نقاد مظہر کو خارج کر کے میر حسن کو رکھیں گے۔ مظہر کی اہمیت شاعری کی وجہ سے اتنی نہیں، جتنی ان کے دہلی کے تین بڑے صوفیہ شاہ ولی اللہ، مرزا مظہر اور میر درد میں رکنیت کی وجہ سے ہے (ص ۱۶۷) شِمل کا یہ کہنا درست نہیں۔ آزاد نے ان چار بزرگوں کو شاعری کا ستون نہیں کہا تھا، اس نے انھیں "زبانِ اردو کو خراط اتارنے والا" کہا تھا ("آبِ حیات"، ص ۱۳۰) اگر زبان و ادب دونوں پر اثر ڈالنے والے اساتذہ کو لیا جائے تو خان آرزو، شاہ حاتم اور مرزا مظہر سرِ فہرست ہیں۔ شاعرانہ عظمت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو میر، سودا اور درد اہم ترین ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی اہمیت صوفی کی طرح نہیں بادیِ دینیات کے طور پر ہے۔ وہ طریقت کے نہیں، شریعت کے یکہ تاز ہیں۔ ڈاکٹر شِمل نے ص ۱۶۷ پر انھیں شاعر سمجھ کر ان کا تخلص اشتیاق لکھا ہے، حالانکہ یہ شاعر نہ تھے۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق ایک دوسرا شخص ہے۔ تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" اور "گلشنِ ہند" میں بھی یہ التباس در آیا ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر شِمل کو ایک مغالطہ ہوا ہے۔ انھوں نے ص ۱۶۶ پر شاکر ناجی کو قائم چاندپوری کا بھائی قرار دیا ہے جو بے اصل ہے۔ دونوں میں کوئی عزیزداری نہ تھی۔ ص ۱۶۹ پر میر درد کے والد کا نام ناصر محمد لکھا ہے، صحیح محمد ناصر ہے۔ ص ۱۷۳ پر بیدار کا نام میر محمد لکھا ہے۔ جالبی کے مطابق اس کا نام شیخ عمادالدین اور عرفیت میر محمدی تھی (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۰۰) میر درد کے حلقے کے ہندو شعرا میں ایک کا نام بھکارے لال عزیز لکھا ہے (ص ۱۷۳)۔ یہ ہندو ناموں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے عزیز میر درد کے شاگرد تھے۔ ان کا نام رائے بھکارے لال تھا۔ میر حسن اور عشقی نے بھکاری داس لکھا ہے۔

ص ۱۷۶ پر سودا کی ہجوں اور ان کے طنزیہ پہلوؤں کی تعریف کرتی ہیں۔ ص ۷۹-۱۷۸ پر میر کے کلام کی تنقید بہت اچھی ہے۔ اس مختصر کتابچے میں اقبال اور غالب کے بعد میر ہی کو سب سے زیادہ جگہ دی ہے۔ ص ۱۷۲ پر میر کے مشہور مصرع:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

کے ابتدائی الفاظ کو سہواً "پتا پتا" بغیر تشدید کے لکھا ہے ص ۱۸۴ پر میر، سودا اور میر درد کا مختصر موازنہ بھی خوب ہے۔ تیسری فصل، "اٹھارویں صدی کے آخر کا مقبول شاعر"، نظیر اکبر آبادی کے بارے میں ہے۔ ص ۱۸۵ کے حاشیے میں ان کے سوانح نگار کا نام "محمد عبدالغفار شاہباز" لکھا ہے۔ صحیح عبدالغفور شہباز ہے۔ معلوم نہیں کس طرح ان کی نظم "اچار چوہوں کا" کو "اچار جوتوں کا" لکھا ہے (ص ۱۸۶)۔ ڈاکٹر صادق کے برعکس شِمل نے

Scanned by CamScanner

نظیر کی تنقید بہتر طریقے سے کی ہے۔

اس باب کی چوتھی فصل "لکھنؤ کے شعرا" ہے۔ اس میں لکھتی ہیں کہ اردو کے ارتقا میں دہلی کی مرکزی اہمیت نصف صدی سے زیادہ نہیں (ص ۱۸۸)۔ وہ ایسا میر، سودا، اور درد وغیرہ کے عہد کو سامنے رکھ کر کہتی ہیں، لیکن انیسویں صدی کے وسط میں غالب، ذوق، مومن اور ظفر کے عہد کو کیوں نظرانداز کر دیتی ہیں۔ دہلی کی اہمیت ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بالیقین ہے۔ ص ۱۸۹ پر لکھتی ہیں کہ واجد علی شاہ اختر نے فارسی اور اردو شعرا کا ایک تذکرہ چھوڑا۔ یہ سخت غلط فہمی ہے۔ انھوں نے التباس کیا ہے، قاضی صادق خاں اختر کے فارسی شعرا کے تذکرے "آفتابِ عالم تاب" سے۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں کہ اس غلطی کا بانی گارساں دتاسی ہے جس نے اپنی "تاریخِ ادبیاتِ ہندی و ہندوستانی" میں اسے واجد علی شاہ کی تصنیفات میں شامل کیا (جلد اول، طبعِ دوم، ص ۸۲-۱۸۱)۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اسے واجد علی شاہ کی تصنیف سمجھا ("سلطانِ عالم واجد علی شاہ"، لکھنؤ ۱۹۷۷ء، ص ۲۴۰)

میں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "شعرائے اردو کے تذکرے" میں بہت تلاش کیا لیکن اس تذکرے کا بیان نہ ملا۔ شِمل نے ص ۱۹۰ پر واجد علی شاہ کی ایک کتاب "صحیفۂ اختر" کا ذکر کیا ہے جو دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ مسعود حسن رضوی کی مندرجۂ بالا کتاب سے معلوم ہوا کہ اس فارسی کتاب کا نام "صحیفۂ سلطانیہ" ہے (ص ۱۵۹)۔

انشا کے دوست مرزا قتیل کو فارسی کا بنگالی عالم لکھا ہے (ص ۱۹۳)۔ قتیل کا بنگال سے کوئی تعلق نہ تھا۔ غالب ہمیشہ اسے "فرید آباد کا کھتری" کہتے تھے۔ شِمل کو شاید اس لیے غلط فہمی ہوئی ہو کہ قتیل کے معتقدوں نے کلکتے میں غالب سے فارسی کے سلسلے میں معرکہ آرائی کی تھی۔ شِمل لکھتی ہیں کہ "دریائے لطافت" میں انشا نے عروضی ارکان کے لیے نئے نام ایجاد کیے تھے۔ مثلاً "مفاعلین" کو "پری خانم" (ص ۱۹۳)۔ جیسا کہ آزاد نے "آبِ حیات" میں صراحت کی ہے، "دریائے لطافت" کا عروض کا حصہ مرزا قتیل نے لکھا ہے، وہی عروضی ارکان کے شوخ ناموں کے موجد ہیں۔ شِمل انشا کے بارے میں درست مشاہدہ کرتی ہیں کہ اپنی تمام اہلیت و جودتِ طبع کے باوجود وہ توازن کو بھلا کر بھٹک جاتا تھا۔ اس کی صناعیاں لفظوں سے بازی گری ہیں (ص ۱۹۳)۔ ص ۱۹۴ کے حاشیے میں رنگین کی نظموں کے مجموعوں، بالخصوص مطبوعات کی تفصیل اچھی خاصی ہے۔

ص ۱۹۶ پر یہ جو لکھتی ہیں کہ ناسخ رباعی گوئی میں ممتاز تھا، میری رائے میں درست نہیں۔ ناسخ کی اہمیت محض غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ اس نے بہت کم رباعیاں لکھیں ہیں، وہ

Scanned by CamScanner

بالعموم معروفِ عوام نہیں۔ شِمل نے ص ۹۷-۱۹۶ پر ناسخ کے تصنع اور مشکل پسندی پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ بیلی کے ایک بیان سے گمراہ ہو کر لکھتی ہیں کہ زبان کے معنی میں لفظ اُردو، سب سے پہلے مصحفی نے استعمال کیا، لیکن اسے رواج دیا ناسخ نے (ص ۱۹۷)۔ یہ درست نہیں۔ لفظ اردو کا استعمال سب سے پہلے میر محمدی مائل دہلوی نے کیا ہے جس کا دیوان ۱۱۷۶ھ (۶۳-۱۷۶۲ء) میں مرتب ہو چکا تھا(۵)۔ ص ۱۹۹ پر مثنوی "لذتِ عشق" کو نواب مرزا شوق کی تصنیف بتایا ہے حالانکہ یہ ان کے بھانجے آغا حسن نظم کی ہے۔

اردو کے مرثیہ گویوں پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے عراق کے ساتویں صدی کے جذباتی، معاشرتی اور جغرافیائی ماحول کو انیسویں صدی کے اودھ سے ملتبس کر دیا، اس کا شِمل دفاع کرتی ہیں کہ یہ تقصیر محض ایسی ہے جیسے یورپی مصوّر بائبل کے منظروں کو اطالوی ماحول میں پیش کرتے ہیں (ص ۲۰۰)۔ میرا خیال ہے کہ ایک غلطی دوسری غلطی کا جواز نہیں۔ مسیح و مریم کو یورپی انداز میں پیش کرنا بھی غلط ہے اور عربی کرداروں کو انیسویں صدی کے لکھنوی رنگ میں پیش کرنا بھی حقیقت کا خون کرنا ہے۔ وہ یہ حیران کن بیان دیتی ہیں کہ میر انیس حیدر آباد جا کر بس گئے (ص ۲۰۱)۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ وہاں مجلس پڑھنے ۱۱ مارچ ۱۸۷۱ء کو پہنچے اور وہاں سے ۱۵ اپریل ۱۸۷۱ء کو لکھنؤ کے لیے واپس چل دیے(۶)۔

پانچواں جزو "نثری ادب کا آغاز" ہے اس میں نثری کتابوں کی ترتیب تاریخ کے مطابق نہیں۔ پہلے "داستانِ امیر حمزہ" اور اس کے لامتناہی ترجموں کا ذکر ہے۔ پھر رجب علی بیگ سرور کا اور پھر فورٹ ولیم کالج کا۔ زمانی ترتیب کا مطالبہ تھا کہ پہلے فورٹ ولیم کالج، پھر سرور اور آخر میں "داستانِ امیر حمزہ" کو لیا جاتا۔ ص ۲۰۷ پر شیر علی افسوس کو میر منشی لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ ان کے عہدے کا نام "مترجم" تھا۔ چیف منشی میر بہادر علی حسینی تھے(۷)۔ ص ۲۰۸ پر امانت اللہ شیدا کے ترجمۂ قرآن کا ذکر کرتی ہیں۔ دراصل یہ محض شیدا کا کارنامہ نہیں، اس میں شیدا، بہادر علی حسینی، جوان اور دوسرے دو منشی بھی شریک تھے(۸)۔ فورٹ ولیم کے سلسلے میں میر امن اور "باغ و بہار" کا ذکر سب سے آخر میں کرتی ہیں، حالانکہ ادبی مرتبے کے لحاظ سے سب سے پہلے امن کا بیان کرنا چاہیے تھا۔

داستانوں کے بعد تذکروں کی باری آتی ہے۔ ان کے ضمن میں ایک تذکرے "گل رعنا" (۱۷۶۸ء) کا ذکر کرتی ہیں، لیکن تفصیل نہیں دی۔ یہ لچھمی نرائن شفیق کا فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ اردو شعرا کے تذکروں میں اس کا شمول مناسب نہیں۔ شِمل "مجموعۂ نغز" کے مصنف کا نام میر قدرت اللہ قادری لکھتی ہیں، جو صحیح ہے، لیکن اجنبی ہے۔ وہ تخلص کے

Scanned by CamScanner

ساتھ میر قدرت اللہ قاسم سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ تذکروں کے بعد آخری جزو کا عنوان ہے: "تھیٹر آرٹ میں پہلا مقالہ" اور اس کے تحت امانت کی "اندر سبھا" کا ذکر ہے۔ لکھتی ہیں کہ "اِندر سبھا" ہند و پاکستان سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوئی ہے۔ میر، سودا اور غالب کی شاعری سے کہیں زیادہ (ص ۲۱۴)۔ یہ ایک انکشاف ہے۔ اسی پر دوسرے باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب اس باب کے ماہ و سال کا تصیحات

شیمل	دوسرے محققین
ص ۱۶۱، شاہ عالم کا داخلۂ دہلی، جنوری ۱۷۷۲ء	اِروِن: ۱۷۷۱ء، (Late Mughals) مرتبہ جادوناتھ سرکار، جنوری، ۱۹۷۱ء)
ص ۱۶۳، بیدل: فوت ۱۷۲۱ء	مالک رام: ۴ صفر ۱۱۳۳ھ/۲۴ نومبر ۱۷۲۰ء
ص ۱۶۵، "آبِ حیات" کی طبعِ اول ۱۸۸۱ء	اسلم فرخی: اواخر ۱۸۸۰ء ("مکتوبات آزاد"، ص ۱۹ بحوالہ فرخی: "محمد حسین آزاد"، کراچی، ۱۹۶۵ء، جلد ۲، ص ۱۴)
ص ۱۶۵، شاہ مبارک آبرو ۱۶۹۲ء تا ۱۷۳۳ء	جالبی: ولادت ۱۶۸۳ء (قاضی عبدالودود: ۱۶۸۴ء)، وفات ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء (تاریخ، جلد ۲، حصہ ۱، ص ۳۱۲)
ص ۱۶۶، مضمون: ولادت ۱۶۸۹ء، ماخذ؟	ڈاکٹر صادق: قبلِ ۱۶۸۹ء (انگریزی میں تاریخِ اردو ادب، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۰۰)
ص ۱۶۶، شاکر ناجی: فوت ۱۷۵۴ء	جالبی: ۱۷۴۷ء (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۴۲)
ص ۱۶۶، شاہ حاتم فوت ۱۷۸۱ء یا ۱۷۹۳ء	جالبی: جولائی ۱۷۸۳ء (ایضاً، ص ۳۲۱)
ص ۱۶۶، "دیوان زادہ" از حاتم کی ترتیب ۱۷۵۷ء	جالبی: ۵۶-۱۷۵۵ء (ایضاً، ص ۳۲۸)
ص ۱۶۸، مظہر: ولادت ۱۶۹۹ء	مالک رام: ۲۰ فروری ۱۷۰۰ء
ص ۱۶۹، سعد اللہ گلشن: فوت ۱۷۲۸ء	مالک رام: ۲۴ دسمبر ۱۷۲۷ء
ص ۱۷۰، میر درد کے والد عندلیب: فوت ۱۷۵۸ء	مالک رام: ۲ شعبان ۱۱۷۲ھ/مارچ ۱۷۵۹ء
ص ۱۷۲، قائم: ف ۱۲۱۰ھ/۹۶-۱۷۹۵ء	جالبی: ۱۲۰۸ھ (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۶۳) نیز مالک رام

Scanned by CamScanner

ص ۱۷۳، میر محمدی بیدار: ف ۱۷۹۴ء	جالبی: ۱۷۹۶ء (ایضاً، ص ۹۰۱)
ص ۱۷۳، بقا اکبر آبادی: ف ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۰ء	ہجری سنہ صحیح ہے۔ یہ مطابق ہے ۹۲-۱۷۹۱ء کے
ص ۱۷۴، سودا: ولادت ۱۷۱۳ء	جالبی: ۷-۱۷۰۶ء (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۶۴۹ و ۶۵۴)
ص ۱۷۵، سودا نے ۱۷۵۷ء میں دہلی چھوڑی۔	جالبی: نومبر ۱۷۵۹ء میں (ایضاً، ص ۶۵۶)
ص ۱۷۵، سودا کا ورودِ فیض آباد ۱۷۷۱ء	جالبی: ۷۱-۱۷۶۹ء کے بیچ (ایضاً، ص ۶۵۷)
ص ۱۸۶، نظیر: ولادت ۱۷۴۰ء	سب کا اتفاق: ۱۷۳۵ء پر، مثلاً عبدالغفور شہباز، فرحت اللہ بیگ
ص ۱۸۸، آصف الدولہ: ف ۱۷۹۸ء	مالک رام: ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء
ص ۱۸۹، سعادت علی خاں کا جلوس ۱۷۹۷ء	مالک رام: ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء
ص ۱۹۱، میر سوز نے ۱۷۷۷ء میں دلی چھوڑی۔	جالبی: ۱۷۵۴ء کے قریب (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۹۴)
ص ۱۹۱، میر سوز نے دلی چھوڑنے پر درویشی اختیار کی۔	جالبی: درویشی دلی چھوڑنے پر نہیں بلکہ ۱۲۰۴ھ/۹۰-۱۷۸۹ء میں بیٹے کی وفات پر اختیار کی (ایضاً، ص ۷۹۵)
ص ۱۹۱، مصحفی: ولادت ۱۷۵۰ء	ابواللیث صدیقی: ۱۱۴۱ھ یا ۱۱۴۲ھ/۳۰-۱۷۲۸ء (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد ۲، ص ۲۶۵) حنیف احمد نقوی: جمادی الآخر ۱۱۷۰ھ کے دوسرے ہفتے/مارچ ۱۷۵۷ء کے عشرۂ اول میں۔
ص ۱۹۱، اسیر: ف ۱۸۸۱ء	مالک رام: ۷ فروری ۱۸۸۲ء
ص ۱۹۲، انشا: ولادت ۱۷۶۶ء، فوت ۱۸۱۸ء	مالک رام: ولادت صفر ۱۱۶۶ھ/دسمبر ۱۷۵۲ء، وفات ۳۰ جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ/۱۹ مئی ۱۸۱۷ء، ("تحقیقی مضامین"، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۴)
ص ۱۹۴، رنگین: ولادت ۱۷۵۶ء	ڈاکٹر حسن آرزو: ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۷۱ھ/جولائی ۱۷۵۸ء ("سعادت یار خاں رنگین"، ۱۹۸۴ء، ص ۶۱)

Scanned by CamScanner

ص۱۹۵، جان صاحب ۹۷-۱۸۱۷ء	ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی: ولادت ۱۸۱۰ء۔ وفات ۱۸۸۶ء ("ریختی کا تنقیدی مطالعہ"، لکھنؤ ۱۹۷۳ء، ص۳۸۷ و ۳۹۷)
ص۱۹۶، راسخ: ف ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۵ء	مالک رام: ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۳۸ھ/۲ فروری ۱۸۲۳ء
ص۱۹۶، شاہ نصیر فوت انیسویں صدی کے پانچویں دہے کی ابتدا میں۔	مالک رام: ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء۔ کفیل احمد: ۲۵ شعبان ۱۲۵۴ھ/۲۳ نومبر ۱۸۳۸ء ("اردو کے مشاہیر ادب ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء")
ص۲۰۰، میر خلیق: ولادت ۱۷۷۴ء	مسیح الزماں: ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء ("اردو مرثیے کی روایت"، ص۵۰۵)۔ مالک رام ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء
ص۲۰۰، میر خلیق: وفات ۱۸۰۴ء (صریحاً غلط)	اکبر حیدری: ۱۸۴۴ء ("اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا"، ص۳۳۸)۔ مالک رام بھی یہی
ص۲۰۰، انیس: ولادت ۱۸۰۲ء	اکبر حیدری: ۱۸۰۳ء (ایضاً، ص۵۶۹)
ص۲۰۰، ضمیر: فوت ۱۸۴۸ء	مالک رام: ۲۳ محرم ۱۲۷۲ھ/۵ اکتوبر ۱۸۵۵ء۔ اکبر حیدری بھی یہی ہجری تاریخ (ص۳۹۷)
ص۲۰۱، علی محمد عارف: ولادت ۱۸۶۱ء	مالک رام: ۱۸۵۹ء
ص۲۰۲، گلشن: ف ۱۸۹۱ء	مالک رام: ۱۲ اپریل ۱۸۹۲ء
ص۲۰۲، پیارے صاحب رشید ۱۹۱۷ء-۱۸۳۵ء	مالک رام: ۱۸۴۷ء تا ۱۹۱۸ء (ص۱۶۷)
ص۲۰۴، رجب علی بیگ سرور ۱۸۶۷ء-۱۷۸۱ء	نیر مسعود: ولادت ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء۔ فوت نصفِ اوّل محرم ۱۲۸۶ھ/نصف آخر اپریل ۱۸۶۹ء (رجب علی بیگ سرور الٰہ آباد ۱۹۶۷ء، ص۴۰۱)
ص۲۰۷، شیر علی افسوس: ولادت ۱۷۳۶ء	عابدہ بیگم: ۱۷۳۶-۴۷ء (ص۱۱۱) رسالہ "تحقیق" سندھ یونی ورسٹی ۱۹۹۱ء، ص۴۱۶ پر بھی یہی
ص۲۰۸، عزت اللہ بنگالی کی فارسی "گل بکاولی" ۱۷۱۲ء	عابدہ بیگم: عزت کے محبوب نذر محمد کی وفات ذی الحجہ ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء میں، جس کے فوراً بعد "گل بکاولی" لکھی (عابدہ، ص۲۳۷)۔

ص ۲۰۸، کاظم علی جوان: "شکنتلا" ۱۸۰۲ء	عبیدہ: ۱۸۰۱ء، خود جوان کے مطابق (ص ۲۴۸)۔
ص ۲۱۰، "نوطرزِ مرصّع" ۱۷۸۰ء کے قریب	[نورالحسن ہاشمی: ۱۷۷۵ء میں مکمل (مقدمہ۔ "نوطرزِ مرصّع"، الہ آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۳۲)
ص ۲۱۰، "باغ و بہار" ۱۸۰۳ء	[عتیق صدیقی: ۱۸۰۱ء ("گل کرسٹ اور اس کا عہد"، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۳)
ص ۲۱۴، "اندر سبھا" ۱۸۵۳ء	بقول مسعود حسن رضوی: ۱۲۶۸ھ/۵۲-۱۸۵۱ء

تیسرے باب کا عنوان ہے: "تیسرا دور غالب سے اقبال تک" اور اس باب کے پہلے جزو کا عنوان ہے: "کلاسیکی شاعری کا خاتمہ۔" ابتدا غالب سے ہوتی ہے جس میں ضمناً بہادر شاہ ظفر کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ ان سے منسوب شعر:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

وغیرہ کا انگریزی ترجمہ دیا ہے (ص ۲۱۷)۔ اب یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ یہ غزل دراصل مضطر خیر آبادی کی ہے (۹)۔ لکھتی ہیں کہ ظفر سے ایک لاکھ تیس ہزار اشعار منسوب ہیں (ص ۲۱۷)۔ یہاں پھر بیلی کے بیان کو غلط سمجھ کر ٹھوکر کھائی ہے۔ بیلی نے اتنی سطور لکھی ہیں جس سے اس کی مراد مصرع ہیں۔ ان کے ۶۵۰۰۰ اشعار بنتے ہیں لیکن یہ تعداد بھی مبالغہ ہے۔ شِمِل نے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ ظفر کے بہت سے اشعار ذوق کی تخلیق کہے جاتے ہیں لیکن اس کی تردید نہیں کی۔ ص ۲۱۸ کے حاشیے میں تفتہ کا نام "ہار گوپال" لکھا ہے۔ صحیح "ہرگوپال" ہے۔ غالب کی تنقید میں یہ انوٹھا نکتہ پیدا کیا ہے کہ کم شعرا ایسے ہوں گے جنھوں نے آگ کی علامت کو اس کے مختلف رموزات میں استعمال کیا ہوگا۔ سرخ شررا سے سرخ گلاب کی یاد دلاتے ہیں اور سرخ گلاب سرخ لہو اور صہبائے احمر کی، جو سب موج کی شکل میں متحرک ہیں (ص ۲۲۰)۔

ص ۲۲۴ پر لکھتی ہیں کہ سرسید نے "آئینِ اکبری" کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ درست نہیں۔ سرسید نے فارسی کے کئی نسخوں سے اس کی تصحیح و تدوین کی، اردو میں ترجمہ نہیں کیا۔ ص ۲۲۵ کے حاشیے میں سرسید کے رسالے "تہذیب الاخلاق" کے سلسلے میں ایک دلچسپ معلومات فراہم کی ہے کہ شاید اس کا نام سیزدرد کی کتاب "علم الکتاب" کے اس اندراج سے لیا گیا ہے:

> کشف عقلی تہذیب الاخلاق سے حاصل ہو سکتا ہے اور فلسفیوں اور دانش وروں کو اس کا تجربہ ممکن ہے۔

("علم الکتاب"، بھوپال، ۱۳۰۹ھ، ص ۳۴۳)

Scanned by CamScanner

آزاد کی "آبِ حیات" کے سلسلے میں لکھتی ہیں کہ آزاد نے اصلاً غالب کو "آبِ حیات" میں شامل نہیں کیا تھا۔ بعد میں مجبوراً شامل کرنا پڑا۔ مومن کو بھی پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا تھا (ص ۲۲۸)۔ مومن کی حد تک ان کا بیان صحیح ہے، غالب کے لیے نہیں۔ غالب "آبِ حیات" کے پہلے ایڈیشن میں بھی موجود ہیں۔

لکھتی ہیں کہ "آبِ حیات" کی اہمیت جدید مفہوم میں شعرا کی تنقیدی قدر بندی میں نہیں، بلکہ جان دار مرقعوں کی وجہ سے ہے (ایضاً) لیکن وہ "آبِ حیات" کی اس کمزوری کو نظرانداز کر گئیں کہ یہ غیر معتبر، بےاصل حکایات سے معمور ہے۔ ڈاکٹر صادق کی تقلید میں انھوں نے بھی "قصصِ ہند" کو آزاد کا اہم کارنامہ قرار دیا ہے (ایضاً)۔

اہلِ اردو کی نظر میں یہ آزاد کی اہم کتابوں میں شامل نہیں کی جا سکتی۔ ابوالکلام آزاد پر محض ۷، ۸ سطریں لکھی ہیں جن میں "الہلال"، "البلاغ"، اور "ترجمان القرآن" کا ذکر ہے۔ ان کی سب سے اہم ادبی کتاب "غبارِ خاطر" کو شاید اس لیے حذف کر دیا ہوگا کہ یہ شبلی کے دور ("۔۔اقبال تک") سے باہر ہے (ص ۲۳۰)۔

تیسرا جزو "ناول اور ڈراما" ہے۔ اس باب میں کئی اہلِ قلم کے بعض ناولوں کا ذکر متن میں ہے اور بعض کے نام اور سنین فٹ نوٹ میں گنائے ہیں، مثلاً نذیر احمد کی "توبۃ النصوح" کا ذکر متن میں نہیں، ص ۲۳۲ کے حاشیے میں ہے۔ راشد الخیری کے ناولوں کا ذکر حاشیۂ ۲۳۳ میں اور سرشار اور شرر کی متعدد کتابوں کا حاشیۂ ۲۳۴ میں ہے۔ متعدد ڈراما نگاروں کے کاموں کی تفصیل ص ۲۳۶ کے حاشیے میں ہے۔ حاشیے یعنی فٹ نوٹ کا استعمال حتی الامکان حوالے ہی کے لیے کیا جانا چاہیے۔ شاذ ایسا تبصرہ دے سکتے ہیں جو متن میں دیں تو دخل در معقولات ہوگا۔ حواشی کو متن کا حریف نہیں ہونا چاہیے۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے کتابچے میں لکھا ہے کہ تشریحی فٹ نوٹ کم سے کم ہوں اور زیادہ سے زیادہ مختصر ہوں۔ جو بات متن میں جگہ پانے کی مستحق نہ ہو، اسے حاشیے میں بھی دینے کی ضرورت نہیں (۱۰)۔ پارسنس مطلع کرتا ہے کہ بعض درس گاہوں کے شعبے کہتے ہیں کہ فٹ نوٹ محض حوالوں کے لیے استعمال کیجیے، بقیہ مواد متن میں شامل کیجیے یا ضمیمے کے طور پر دیجیے (۱۱)۔

"ابن الوقت" کو نذیر احمد کا سب سے کامیاب ناول قرار دیتی ہیں (ص ۲۳۲)۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی۔ بعض حضرات "توبۃ النصوح" کو نذیر احمد کا سب سے اہم ناول قرار دیتے ہیں، لیکن "ابن الوقت" میں جو سیاسی شعور ہے وہ "توبۃ النصوح" میں کہاں۔ شبلی نے "توبۃ النصوح" کو متن میں بیان کے شایانِ شان بھی نہ سمجھا اور محض فٹ نوٹ میں ذکر کیا۔ وہ

Scanned by CamScanner

ایک اطلاع دیتی ہیں کہ "توبۃ النصوح" کی ترکیب قرآن کی سورہ ۶۶/۸ میں آتی ہے۔ اس سے بھی انوکھی اطلاع یہ ہے کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی کی جلد ۵، ۲۲۲۸ میں نصوح کو علم کے طور پر استعمال کیا ہے اور اسے اپنا ہیرو قرار دیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں بہت سے مصنفوں نے ان کی تقلید کی۔ نذیر احمد نے بھی یہی کیا (ص ۲۳۲)۔ شمیل عربی اور اسلامیات پر اپنی نظر کے سبب یہ سب انکشاف کر سکتی ہیں۔ میں نے مولانا مودودی کا "ترجمۂ قرآن مجید" نکال کر دیکھا۔ مندرجۂ بالا سورہ اور آیت میں "توبۃً نصوحاً" کی ترکیب مل گئی (مکتبۂ اسلامی، دہلی، بارِ ششم، جون ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۴۶)

عورتوں کی تعلیم سے متعلق شرر کی ایک کتاب "قوت انتظامیہ" ۱۸۸۹ء کا ذکر کرتی ہیں (ص ۲۳۴)۔ مجھے اس کتاب کا حوالہ کہیں نہ مل سکا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ شرر کے کسی مضمون کا عنوان ہو، کتاب کا نہیں۔ حاشیے میں شرر کے مزید ناولوں میں "حسن بن صباح" کا نام بھی دیا ہے۔ یہ ناول نہیں، سوانح عمری ہے (۱۲)۔

میرے لیے یہ اطلاع نئی ہے کہ اردو کا پہلا جاسوسی افسانہ حلیم الدین کا "کمند گیسو" (کان پور، ۱۸۹۴ء) ہے۔ یہ فرنچ خفیہ پولیس کے بارے میں ہے (فٹ نوٹ ص ۲۳۶)۔ اگر یہ مختصر افسانہ ہے تو کس رسالے یا مجموعے میں شائع ہوا، اگر ناول ہے تو یہ واضح کرنا چاہیے تھا۔ جو مختصر افسانہ ۱۸۹۴ء میں لکھا گیا ہو وہ نوعِ افسانہ کا قدیم ترین نمونہ ہو سکتا ہے۔ متن میں بے تاب کے ڈراموں کا ذکر کرنے کے بعد مصنفہ فٹ نوٹ میں لکھتی ہیں کہ بے تاب الفریڈ تھیٹریکل کمپنی سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے جاسوسی ڈرامے کی کامیابی کے بعد ہندو اصلاح کے ڈراموں کی طرف مڑ گیا۔ اب پوچھیے کہ یہ جزو متن میں نہ دے کر فٹ نوٹ میں کیوں دیا گیا۔

ص ۲۳۸ پر حسین رضوی اکبر الہ آبادی کا ذکر ہے۔ ان کا نام سید اکبر حسین رضوی تھا، محض حسین رضوی نہیں۔ احمد علی شوق قدوائی کی مثنوی "ترانۂ شوق" کے لیے لکھتی ہیں کہ یہ بیانیہ مثنویوں کا مجموعہ ہے (ص ۲۳۸)۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک واحد داستانی مثنوی ہے۔ ص ۲۴۰ پر مولانا محمد علی کا تخلص گوہر لکھا ہے۔ صحیح جوہر ہے، گوہر سہوِ طباعت بھی ہو سکتا ہے۔ ص ۲۴۳ پر وحشت رضا علی کلکتوی کا ذکر ہے۔ ان کا نام رضا علی اور تخلص وحشت تھا۔ چونکہ اس کتاب میں ناموں کے سلسلے میں اردو قاعدے کی تقلید کی گئی ہے کہ تخلص کو نام کے بعد دیا ہے، اس لیے یہاں بھی اندراج رضا علی وحشت کلکتوی ہونا چاہیے تھا۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے لیے لکھتی ہیں، یہ انگریزی، سنسکرت، عربی اور بنگالی سے منظوم ترجموں کے لیے مشہور ہیں (ص ۲۴۳)۔ یہ پوری طرح درست نہیں۔ ان کے مجموعے "رنگ بست"

Scanned by CamScanner

ہیں ایسی نظمیں ہیں جو مندرجۂ بالا زبانوں اور بعض دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں لیکن ان کی شہرت کا انحصار محض اس مجموعے پر نہیں۔ ان کی باقی شاعری ترجمہ نہیں، طبع زاد ہے۔

شمیل نے کتاب کے آخری صفحے ۲۵۰ پر حفیظ جالندھری کے شاہ کار کا نام "شاہ نامۂ ہند" لکھا ہے، صحیح "شاہ نامۂ اسلام" ہے۔ کتاب کا آخری شاعر جوش ملیح آبادی ہے جس پر ایک پیراگراف لکھا ہے۔ ان کی چند کتابوں کے نام متن میں دیے ہیں اور بقیہ حاشیے میں۔ اس تفریق کی کوئی وجہ نہیں۔ جوش پر تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔ شاید یہ دوسرے حصے کے مصنف گوپی چند نارنگ کے لیے چھوڑ دی گئی ہے جو جدید اردو ادب یعنی اقبال سے بعد کے دور پر لکھنے والے تھے۔

اب حسبِ معمول اس باب کے سنین سے متعلق میرے مشاہدات:

شمیل	دوسرے محققین
ص۲۱۸، میر مہدی مجروح: فوت ۱۹۰۲ء	مالک رام: ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء
[ص۱۹-۲۱۸، "عودِ ہندی" غالب کی موت سے آٹھ مہینے قبل شائع ہوئی۔]	[کالی داس گپتا رضا: ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع، یعنی موت سے ساڑھے تین ماہ قبل ("دیوانِ غالب کامل (تاریخی ترتیب سے)" بمبئی، ۱۹۸۸ء، ص۹۵)]
ص۲۲۱:۲۲۸، "یادگارِ غالب شائع" ۱۸۹۲ء	["یادگارِ غالب"، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ایڈیشن پہلے ایڈیشن کا آفسیٹ عکس ہے۔ سرورق پر ۱۸۹۷ء درج ہے۔]
ص۲۲۱، مومن: فوت ۱۸۵۱ء	مالک رام: ۲۴ر رجب ۱۲۶۸ھ/۱۴ مئی ۱۸۵۲ء
[ص۲۲۲، مومن کا "دیوانِ بے نظیر" ۱۲۴۳ھ/۲۴-۱۸۲۳ء]	ہجری سنہ مطابق ہے ۲۸-۱۸۲۷ء کے۔
ص۲۲۲، امیر مینائی: ولادت ۱۸۲۸ء	ابو محمد سحر: فروری ۱۸۲۹ء ("مطالعۂ امیر"، ص۶۷)
ص۲۲۳، محسن کاکوروی: ولادت ۱۸۲۵ء	مالک رام: ۶ ستمبر ۱۸۲۶ء
[ص۲۲۴، "آئینِ اکبری" کا اردو ترجمہ ۱۸۵۷ء]	[عتیق صدیقی: تصحیح و تدوین ۱۸۵۵ء، ترجمہ نہیں۔ ("سر سید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ"، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص۳۳)]

Scanned by CamScanner

ص ۲۲۵، سرسید کا "تہذیب الاخلاق" ۸۲-۱۸۷۰ء	حامد حسن قادری: تین دور ۷۱-۱۸۷۰ء، ۸۱-۱۸۷۹ء، ۹۷-۱۸۹۴ء ("داستانِ تاریخِ اردو"، ۱۹۵۷ء، ص ۲۶۳)
ص ۲۲۶، وقار الملک: ولادت ۱۸۳۹ء	مالک رام: ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ/۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء
ص ۲۲۶، چراغ علی: ولادت ۱۸۴۴ء	مالک رام و حامد حسن قادری: ۱۸۴۶ء
ص ۲۲۸، محمد حسین آزاد: ولادت ۱۸۴۴ء	مالک رام اور عابد پیشاوری: ۱۰ جون ۱۸۳۰ء (عابد: "ذوق اور محمد حسین آزاد"، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۲)
ص ۲۲۹، شبلی ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد گئے۔	ظفر احمد صدیقی: پہلی بار اگست ۱۸۹۶ء میں گئے، وظیفہ مقرر ہوا، واپس آ گئے۔ ملازمت کے لیے فروری ۱۹۰۱ء میں گئے۔ ۸ مئی ۱۹۰۱ء تا فروری ۱۹۰۵ء ملازم رہے ("شبلی"، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۱-۲۰)
ص ۲۲۹، شبلی: "المامون" ۱۸۸۷ء	ظفر احمد صدیقی: ۱۸۸۸ء (ایضاً ص ۴۹)
ص ۲۲۹، شبلی: "النعمان" ۱۸۹۲ء	ظفر احمد صدیقی: پہلا حصہ ۱۸۸۹ء، دوسرا ۱۸۹۰ء، اشاعت ۱۸۹۱ء (ایضاً، ص ۵۱)
ص ۲۲۹، شبلی: "الغزالی" ۱۹۰۲ء	ظفر احمد صدیقی: تصنیف ۱۹۰۱ء (ایضاً، ص ۵۳)
ص ۲۲۹، شبلی: "سوانحِ مولانا روم" ۱۹۰۳ء	ظفر احمد صدیقی: تصنیف ۱۹۰۴ء، اشاعت ۱۹۰۶ء (ایضاً، ص ۵۴)
ص ۲۲۹، شبلی: "سفر نامہ" ۱۸۹۴ء	ظفر احمد صدیقی: اشاعت ۱۸۹۴ء (ایضاً ص ۹۱)
ص ۲۲۹، شبلی: "موازنۂ انیس و دبیر" ۱۹۰۷ء	ظفر احمد صدیقی: تصنیف ۱۹۰۴ء، اشاعت ۱۹۰۶ء (ایضاً، ص ۶۳)
ص ۲۲۹، عبدالحق ۱۹۶۳ء-۱۸۷۵ء	مالک رام: پ ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء۔ ف ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء۔
ص ۲۳۰، شبلی نے ۱۹۱۳ء میں دار المصنفین کی بنیاد ڈالی۔	خورشید نعمانی ردولوی: شبلی کے انتقال کے بعد ۴ جون ۱۹۱۵ء کو دار المصنفین کی رجسٹری ہوئی۔ ("دار المصنفین کی ادبی خدمات"، بمبئی، ۱۹۷۷ء، ص ۴۱)

Scanned by CamScanner

ص ۲۳۱، نذیر احمد: ولادت ۱۸۳۶ء	ڈاکٹر اشفاق اعظمی: ۱۸۳۰ یا ۱۸۳۱ء ("نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے"، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۳)۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: ۱۸۳۰ء ("ڈپٹی نذیر احمد، کتابیات"، اسلام آباد)
ص ۲۳۴، سرشار: "کامنی" ۱۸۸۳ء	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب: ۱۸۹۴ء میں چھپی ("سرشار کی ناول نگاری"، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۵۴)
ص ۲۳۴، سرشار: "سیرِ کہسار" ۱۸۹۴ء	لطیف: ۱۸۹۰ء (ایضاً، ص ۳۸۳)
ص ۲۳۴، شرر کی "تاریخِ سندھ" ۱۹۰۸-۱۹۰۶ء	علی احمد فاطمی: ۱۹۰۵ء میں شائع ("عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار"، لکھنؤ ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۲)
ص ۲۳۴، ناول "حسن انجلینا" ۱۸۹۲ء	فاطمی: ۱۸۸۹ء (ایضاً، ص ۱۶۹)
ص ۲۳۴، "منصور موہنا" ۱۸۹۳ء	فاطمی: ۱۸۹۰ء (ایضاً، ص ۱۶۹)
ص ۲۳۴، "نیکی کا پھل" "قریب ۱۹۶۷ء" (کذا)	فاطمی: ۱۹۲۴ء (ص ۱۶۴ و ص ۱۷۱)
ص ۲۳۴، "مفتوح فاتح" "قریب ۱۹۶۸ء" (کذا)	فاطمی: ۱۹۱۶ء۔ صحیح نام: "فاتح مفتوح" (ایضاً، ص ۱۷۱)
ص ۲۳۵، یلدرم: ولادت ۱۸۸۰ء	مالک رام: ۱۸۸۳ء۔ عقیل: ۱۸۸۸ء (اعجاز حسین کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو"، ص ۳۴۳)
ص ۲۳۵، یلدرم: "خیالستان" ۱۹۰۸ء	ڈاکٹر عبدالودود: ۱۹۱۰ء ("اردو نثر میں ادبِ لطیف"، لکھنؤ، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۶)
ص ۲۳۵، "جلال الدین خوارزم شاہ" ۱۹۲۴ء	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، طبعِ اول، ۱۹۲۵ء ("ببلو گرافیا اردو ڈراما"، بمبئی، ۱۹۶۷ء، جلد دوم، ص ۳۹۱)
ص ۲۳۵، یلدرم: وفات ۱۹۴۳ء	مالک رام اور عقیل: ۱۲ فروری ۱۹۴۳ء،
ص ۲۳۶، آغا حشر: وفات ۱۹۳۱ء	مالک رام ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء۔ بحوالہ "نقوش"، لاہور نمبر، ص ۹۲۷
ص ۲۳۶، نرائن پرشاد بے تاب: وفات ۱۹۲۵ء	مالک رام: ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء
ص ۲۳۷، امتیاز علی تاج: ولادت ۱۹۰۸ء	مالک رام: ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء۔ عشرت رحمانی: ۱۹۰۰ء (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد ۵، ص ۵۱۴)

Scanned by CamScanner

ص ۲۳۷، تاج: "انار کلی" ۱۹۴۲ء میں۔	عشرت رحمانی: تصنیف ۱۹۲۲ء، طبعِ اول ۱۹۳۲ء (ایضاً، ص ۵۱۵)
ص ۲۳۸، واجد علی شاہ: فوت ۱۹۰۵ء۔	مسعود حسن رضوی۔ ۲۰ اور ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کی درمیانی رات کو ۲ بجے یعنی ۲۱ ستمبر کو ("سلطانِ عالم واجد علی شاہ"، ص ۳۰۶)
ص ۲۳۸، شوق قدوائی: فوت ۱۹۲۸ء۔	مالک رام: ۲۷ اپریل ۱۹۲۵ء۔ ابواللیث بھی یہی ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، طبعِ اول، ص ۳۱۵)
ص ۲۳۸، شوق کی "ترانۂ شوق" ۱۸۸۷ء۔	گیان چند: تصنیف قبل ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء، طباعت ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء ("اردو مثنوی شمالی ہند میں"، طبعِ دوم، جلد ۲، ص ۶۹-۲۶۸)
ص ۲۳۹، پنڈت کیفی: فوت ۱۹۵۴ء۔	خلیل احمد بیگ: یکم نومبر ۱۹۵۵ء ("پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی"، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۸)
ص ۲۴۰، چکبست: ولادت ۱۸۸۰ء۔	کالی داس گپتا رضا: ۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء (مقدمہ کلیاتِ چکبست، بمبئی، ۱۹۸۱ء، ص ۹)
ص ۲۴۱، مولانا ظفر علی خاں ۱۹۵۰-۱۸۷۰ء۔	مالک رام: ۱۹۵۶ء-۱۸۷۳ء (بحوالہ: "نقوش"، لاہور نمبر، ص ۹۳۵)
ص ۲۴۱، عبد المجید سالک: ولادت ۱۸۹۵ء۔	مالک رام: ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء۔
ص ۲۴۲، خوشی محمد ناظر: وفات ۱۹۲۴ء۔	مالک رام: یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء۔
ص ۲۴۲، امجد حیدر آبادی: ولادت ۱۸۸۶ء۔	مالک رام: ۱۹ مارچ ۱۸۸۸ء۔
ص ۲۴۲، یاس یگانہ ۱۹۵۳-۱۸۸۳ء۔	مالک رام: ۱۹۵۶-۱۸۸۴ء۔
ص ۲۴۲، انور حسین آرزو: ولادت ۱۸۸۲ء۔	مالک رام: ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ/۱۶ فروری ۱۸۷۳ء۔ ڈاکٹر عقیل بھی یہی
ص ۲۴۳، حسرت موہانی: ولادت ۱۸۷۵ء۔	نفیس احمد صدیقی: ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء، پاسپورٹ کے مطابق ("ہماری زبان"، یکم فروری ۱۹۹۴ء)۔
ص ۲۴۳، رضا علی وحشت کلکتوی: فوت ۱۹۶۵ء۔	مالک رام: ۳۰ جولائی ۱۹۵۶ء۔
ص ۲۴۴، اقبال: ولادت ۱۸۷۷ء۔	مالک رام: ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء۔ بحوالہ نظیر احمد صوفی و خالد نظیر صوفی (مالک رام: "تحقیقی مضامین"، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۶)

Scanned by CamScanner

ص ۳۴۶، اقبال: "بالِ جبریل" اشاعت ۱۹۳۶ء	[رفیع الدین ہاشمی: جنوری ۱۹۳۵ء ("تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ"، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۳۹)]
ص ۳۴۶، اقبال: "ضربِ کلیم" ۱۹۳۷ء	رفیع الدین ہاشمی: جولائی ۱۹۳۶ء (ایضاً، ص ۳۵)
ص ۳۴۹، حفیظ جالندھری: ولادت ۱۹۰۳ء	مالک رام: ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء
ص ۳۵۰، جوش ملیح آبادی: ولادت ۱۸۹۴ء	[کاظم علی خاں: ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء ("جوش شناسی"، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۲)]

ظاہرا ڈاکٹر شیمل کی کتاب یا ابواب مغربی قارئین کے لیے لکھے گئے ہیں، اردو قارئین کے لیے نہیں۔ تقریباً سو سوا سو صفحوں کی کتاب میں اردو ادب کے ارتقا کو پیش کرنا تھا تو یہی مناسب ہوتا کہ یہ تاریخ تحقیقی کم، تنقیدی زیادہ ہوتی تاکہ مغربی قارئین کو اردو ادب کی رفتار، اس کے بہاو، اس کے نثری و شعری رجحانات سے واقفیت ہو سکتی۔ تحقیقی انداز کی تاریخ کے لیے سوا سو صفحوں کا ظرف بہت تنگ پڑتا ہے۔ ڈاکٹر شیمل نے شعریات و رجحانات اور تخلیق کاروں کی قدر بندی سے زیادہ نام شماری اور سنین پر توجہ کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کا بیش تر حصہ انھیں کی نذر ہو گیا، اس کتاب میں جتنے زیادہ قلم کار، ان کی کتابوں کے نام اور تاریخیں آئی ہیں اتنی تو شاید ڈاکٹر صادق کی سوا چھ سو، ساڑھے چھ سو صفحوں کی تاریخ میں بھی نہ ہوں گی۔

سنین کا دینا بہت مخدوش بات ہے۔ ان کے بارے میں گہری تحقیق کرنی ہوتی ہے، نیز کئی سنین کے بارے میں مختلف محققوں کے اختلاف رائے کی تفصیل دینی ہوتی ہے۔ سوا سو صفحوں میں یہ سب ممکن نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر شیمل کے بہت سے سنین میں تسامح دکھائی دیتا ہے۔ اس پہلو پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے وہ تنقیدی پہلو پر بقدر بایست توجہ نہ کر سکیں۔ صفحات کی تحدید کے باعث انھیں متعدد ناموں کو ہی جانے پر قناعت کرنی چاہیے تھی۔ صرف عمائد کے کارناموں تک محدود رہتیں تو ادب کی تفہیم کا حق بہتر طریقے پر ادا ہوتا۔

کتاب کے آخر میں اشاریہ ہے، کتابیات نہیں۔ کتاب کے فٹ نوٹوں میں جس کثرت کے ساتھ کتابوں کے نام اور ان کے سنہ اشاعت دیے ہیں، وہ ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اگر ان کے حواشی سے کتابوں کے نام ترتیب سے دیے جائیں تو اندازاً ۲۰ صفحوں کی کتابیات تیار ہو جائے گی۔ ان میں اردو ادب سے متعلق انگریزی میں لکھی گئی کتابیں، عربی فارسی کی کتابیں، رسالے، مضامین، اردو کے متون، ہندوستان اور پاکستان دونوں کی کتابیں

Scanned by CamScanner

شامل ہیں۔ یہ کتابیں اور رسالے وہ ہیں جو شِیمِل نے خود دیکھے ہیں، اس لیے ان کی تفصیل میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ کاش، ان سب کی کتابیات مرتب کر دی جائے تو اہلِ تحقیق کے لیے حوالے کا بیش بہا مواد فراہم ہو جائے گا۔ اس کی افادیت متن کے مندرجات سے کم نہیں ہوگی۔

ان مشاہدات کے باوجود میں یہ اعتراف کروں گا کہ انھوں نے تنگیِ داماں کے باوصف جتنا زیادہ مواد پیش کیا ہے، وہ اردو ادب کی بڑی خدمت ہے۔

حواشی

(۱) مجھے اس جزو کا عکس شمس الرحمان فاروقی سے ملا جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

(۲) "شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے"، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۱۳۷

(۳) شِیمِل، ص ۱۵۱، بحوالۂ گلے بوف و سنوچیف: "اُردو لٹریچر"، ماسکو، ۱۹۶۷ء، ص ۲۸

(۴) مقدمہ "سکھ انجن" از شاہ ابوالحسن قادری، حیدر آباد، ۱۹۶۸ء

(۵) محمد اکرم چغتائی: "اردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق"، "اردو نامہ"، کراچی، شمارہ ۲۶، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۳

(۶) مسعود حسن رضوی: "میر انیس کا سفرِ حیدر آباد"، مشمولہ "انیسیات"، لکھنؤ ۱۹۷۶ء، ص ۸۱

(۷) محمد عتیق صدیقی: "گِل کرسٹ اور اس کا عہد"، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۱۵۹، ۱۹۸

(۸) ڈاکٹر عبیدہ بیگم: "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۳۴-۳۴۳۔ نیز عتیق صدیقی: "گِل کرسٹ اور اس کا عہد"، ص ۱۷۹

(۹) رسالہ "نیا دور"، لکھنؤ، جون ۱۹۵۹ء، ص ۱۹ بحوالۂ ڈاکٹر کشور سلطان: "جاں نثار اختر، حیات و فن"، لکھنؤ ۱۹۷۷ء، ص ۴۰

(10)University of Oxford, members of the faculty of English language and literature, "notes on the presentation of thesis on literary subjects." (2nd edition,1958.) p.4

(11)Parsons, thesis and project work- A guide to research and writing." (London, 1973.) p.60

(۱۲) علی احمد فاطمی: "عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار"، لکھنؤ ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۷

Scanned by CamScanner

اٹھارواں باب

ملک حسن اختر: "تاریخِ ادبِ اردو"

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی ضخیم "تاریخِ ادبِ اردو" ۱۹۷۹ء میں یونی ورسٹی بک ایجنسی انار کلی لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں پیش لفظ کے بعد ۱۲۱۲ صفحے ہیں۔ اس ضخیم تاریخ کا کمال یہ ہے کہ ہندوستان میں اہلِ تحقیق بھی اس کے وجود سے واقف نہیں۔ ڈاکٹر اختر نے ۱۹۷۹ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے "شمالی ہند کی اردو شاعری، عہد محمد شاہی میں" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ نگراں تھے، ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ اختر کے مقالے کا ایک حصہ "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" کے عنوان سے لاہور سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا(۱)۔

ملک اختر ڈاکٹر سلیم اختر کی "مختصر ترین تاریخِ ادبِ اردو" کے لیے لکھتے ہیں:

> مگر اسے تاریخِ ادب کہنا مناسب نہیں ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہ صرف ایک طویل مضمون ہے۔

میرا خیال ہے کہ اسے مضمون کہنا مناسب نہیں، ایک سرسری تاریخِ ادب کہہ سکتے ہیں۔ مصنف "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" پر یوں تعریض کرتے ہیں:

> اس میں جو انتشار اور غلطیوں کی بھرمار ہے، اس کے پیشِ نظر تو یہ کتاب مرتب کر کے یونی ورسٹی نے اپنے نیک نام کو بدنام کیا ہے۔ اس میں تحقیق، تنقید، ترتیب، حتیٰ کہ پروف پڑھنے کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں ... غالب کی نثر پر محض ایک صفحہ اور سرور کے لیے پورا باب یعنی اہم اور غیر اہم کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔

میری رائے میں یہ اعتراض بے جا ہے۔ گزشتہ صفحات میں اس تاریخ پر میرا مفصل جائزہ آچکا ہے۔ ملک اختر تاریخِ ادب کے بارے میں اپنا نظریہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ادب کی تاریخ بھی ایک تاریخ ہے اور اس میں ادب کو تاریخ کے انداز

پر لکھا جانا چاہیے ورنہ اسے تاریخِ ادب کہنا زیادتی ہوگی۔ (صفحہ م)

مجھے اس سے اتفاق ہے۔ ادبی تاریخ بنیادی حیثیت سے تاریخ ہے، اس لیے اس میں زمانے اور تاریخوں کی تفصیل اور صحت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ مصنف واضح کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء تک انھوں نے ہجری و عیسوی دونوں سنین دیے ہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد محض عیسوی سنہ دیے ہیں کہ لوگوں کو انہیں کا ربط ہوگیا تھا۔ انھوں نے ہجری سنہ کے ساتھ کسی جگہ دو عیسوی سنہ دیے ہیں لیکن ایسی مثالیں بھی کم نہیں جہاں محض ایک ہی سنہ دیا ہے۔ ماہ و یوم معلوم نہ ہو تو ایک سنہ دینا غلط ہے۔

انھوں نے تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے:

پہلا دور ابتدا سے ۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ تک۔

دوسرا دور ۱۷۱۹ء سے ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ تک۔

تیسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۶ء تک۔

چوتھا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۷ء تک۔

ان ادوار کی شرح ۳۴ ابواب میں ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ شروع میں سماجی اور تاریخی پس منظر کا غیر ضروری باب نہیں۔ ہاں، اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی شرح کر دی جاتی تو مناسب ہوتا۔ انھوں نے بابِ اوّل کا عنوان "اردو زبان کے مختلف نام" رکھا ہے، محض اتنا کافی نہیں۔ لکھتے ہیں کہ اصطلاح "ریختہ" کے استعمال کی قدیم ترین مثال سعدی کاکوروی متوفی ۱۰۰۲ھ/۱۹۴۱-۱۵۹۳ء کے یہاں ملتی ہے۔ جیسا کہ میں نے علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں لکھا ہے، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی تحقیق کے مطابق یہ ریختہ ملا شیری متوفی ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء یا متوفی ۹۸۹ھ کا ہے۔

"ہندوستانی" کے لیے لکھتے ہیں کہ اس کا قدیم ترین استعمال فرشتہ کے یہاں ہے جو ابراہیم عادل شاہ (۱۰۳۷-۹۸۸ھ) کے لیے لکھتا ہے کہ وہ جب تک ہندوستانی میں بات نہیں کرتا تھا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ فارسی کے علاوہ دوسری زبان سے بھی آشنا ہے (ص ۲)۔

غالباً "مقالاتِ شیرانی"، جلد اوّل، ص ۲ کا حوالہ ہے۔ مجھے اس میں شبہہ ہے کہ فرشتہ نے "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کیا۔ وہ "ہندوی" یا "ہندی" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اس سے اس کی مراد کوئی ہندوستانی زبان مثلاً مراٹھی ہوتی ہے (ڈاکٹر مصطفےٰ کمال: "حیدر آباد میں اردو کی ترقی، تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے"، ص ۳۲ وغیرہ)۔

اس کے آگے لکھتے ہیں کہ ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" میں "ہندوستانی" کا لفظ

Scanned by CamScanner

اردو کے لیے استعمال کیا ہے جسے وہ زبانِ روزگار بھی کہتا ہے۔ اس نے ۳۷ میدوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں سے بقولِ شیرانی ۶۱ پلاٹس کی ڈکشنری میں موجود ہیں (ص ۲)۔ کاش ڈاکٹر اختر "آئینِ اکبری" کا وہ جملہ لکھ دیتے جس میں لفظ "ہندوستانی" ایک مخصوص زبان کے معنی میں آیا ہے۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اردو کا نام سب سے پہلے خان آرزو نے "غرائب اللغات" کی اصلاح شدہ اشاعت" میں لیا ہے، پھر "نکات الشعرا" وغیرہ میں آیا (ص ۳)۔ یہاں پھر ملک اختر نے بجا احتیاط نہیں برتی۔ میر نے "نکات الشعرا" میں "زبانِ اردوے معلّیٰ شاہ جہاں آباد دہلی" کہا ہے۔ آرزو نے "نوادر الالفاظ" میں بھی ایسا کچھ ہی کہا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ تنہا "اردو" کا لفظ کس نے استعمال کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مصحفی کا مشہور شعر ع:

کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے ... الخ

بقولِ گل کرسٹ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء کا ہے۔ ان سے پہلے ۱۲۰۳ھ میں پیر مرلد نے "نامۂ منظوم" میں استعمال کیا (ص ۴)، لیکن قدیم ترین مثال مائل کے قطعے کی ہے، جیسا کہ پیچھے لکھا جا چکا ہے۔

پھر وہ اپنا اردو زبان کے آغاز کا نظریہ بیان کرتے ہیں جو سوفی صد محمود شیرانی کا ہے (ص ۱۲)۔ اس نظریے پر کئی اہلِ لسانیات تنقید کر چکے ہیں، میں بھی اپنی کئی تحریروں میں لکھ چکا ہوں۔ فی الحال اعادہ نہ کروں گا۔ اس کے بعد وہ ادبی تاریخ کی شرح کرتے ہیں، جس میں پہلا دور ابتدا سے ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تک ہے۔ کسی اور مؤرخِ ادب نے ۱۷۱۹ء کو اردو ادب کی تاریخ کا سنگِ میل قرار نہیں دیا۔ اس سنہ کو محمد شاہ کا جلوس ہوا۔ حسن اختر کا تحقیقی مقالہ عہدِ محمد شاہی کی اردو شاعری سے متعلق ہے، اسی لیے انھوں نے ۱۷۱۹ء سے ایک نیا دور شروع کیا۔ پہلے دور کو علاقائی بنیاد پر تین بابوں میں بیان کیا ہے: دوسرے باب میں "اردو شمالی ہند میں" تیسرے باب میں "گجرات میں اردو" اور چوتھے باب میں "دکن میں اردو۔"

قدیم دور میں انھوں نے مشکوک نمونوں کے انتساب کو بغیر پرکھے تسلیم کر لیا ہے، مثلاً خواجہ فرید شکر گنج سے وہ پر مثنوی منسوب کرتے ہیں ع:

تن دھونے سے دل جو ہوتے پوک

(ص ۱۵)

تھوڑا سا ٹھٹک کر کہتے ہیں کہ ممکن ہے بابا فرید کی اولاد میں دسویں صدی ہجری کے دیوان ابراہیم کی ہو (ص ۱۶)۔ کیوں؟ دیوان ابراہیم کہاں سے آ گئے؟ ص ۱۷ پر خسرو سے منسوب پہیلیوں اور "نکات الشعرا" میں مذکور قطعے کے انتساب پر نہیں ٹھٹکتے۔ ہاں ع:

Scanned by CamScanner

زحالِ مسکیں مکن تغافل ...

والی غزل کے بارے میں محمود شیرانی کی رائے لکھ دی ہے (ص ۱۸-۱۷)۔ حد ہے کہ وہ اشرف جہاں گیر سمنانی کے موہوم ۲۰۷ صفحوں کے رسالے کے وجود کے بارے میں بھی کوئی سوال نہیں کرتے۔

وہ "بکٹ کہانی" کے مصنف کا نام محمد افضل لکھتے ہیں، گو قطبی کے "تیرہ ماسے" کا شعر نقل کرتے ہیں ع:

لوسیں افضل کہ جس کا نانوں گوپال

اس شعر پر غور نہیں کرتے کہ قدیم ترین روایت میں اس کا نام گوپال لکھا ہے جس کا تخلص افضل ہے۔ ص ۲۴-۲۳ پر بیدل سے منسوب غزل درج کر دی ہے، لیکن اس کے انتساب پر کوئی استفہام نہیں کیا۔ پنجاب میں چند مثنویوں کے نام دیے ہیں جن میں یہ دو بھی شامل ہیں:

۱- "سیف السلوک و بدیع الجمال" از عاجز

۲- "چندر بدن و مہیار" از سیف اللہ ۱۲۰۲ھ اور ۱۲۲۱ھ کے درمیان (ص ۲۴)۔

شیرانی کی "پنجاب میں اردو" اور جمیل جالبی کی تاریخ ان شعرا کے ذکر سے خالی ہیں۔ پنجابی میں خالق محمد بخش کی مثنوی "سیف السلوک" کا ضرور پتا چلتا ہے (جالبی: جلد اول، ص ۶۳۶)، لیکن یہاں سوال ہے شمالی ہند میں ان ناموں کی اردو مثنویوں کا۔ تاریخ نگار نے اپنا ماخذ درج نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کو پرکھا نہیں جا سکتا۔ تیسرا باب "گجرات میں اردو" ہے۔ اس میں محمود شیرانی سے کافی استفادہ کیا ہے۔ خوب محمد چشتی کی عروضی مثنوی کا نام سہوِ طباعت سے "چھند چھندری" چھپا ہے (ص ۳۳) صحیح "چھند چھنداں" ہے۔ شیخ محمد امین گودھراوالے کی مشہور مثنوی "یوسف زلیخا" (۱۱۰۹ھ) کے علاوہ چار اور تصانیف کا ذکر کرتے ہیں:

۱- "معجزہ نامۂ بی بی فاطمہ" ۱۰۹۹ھ

۲- "تولد نامہ"

۳- "معراج نامہ"

۴- "وفات نامہ" ۱۱۰۴ھ۔

حسن اختر نے "معجزہ نامۂ بی بی فاطمہ" کی تفصیل نہیں دی۔ یہ ایک قصیدے کی شکل میں ہے جس کا نسخہ کتب خانۂ سالار جنگ میں ہے اور جس کا ذکر فہرست مخطوطات ص ۵۰۶ پر ہے۔ ان کی تقلید میں ایک غیر مشہور شاعر جنونی گجراتی نے بھی اسی زمین میں ۱۱۰۲ھ میں

Scanned by CamScanner

معجزۂ فاطمہ کا قصیدہ لکھا۔ اس کا قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو میں ہے (ڈاکٹر محمد علی اثر: "تحقیقی نقوش"، حیدر آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷)۔ بقیہ تین مثنویاں ایک سلسلے میں لکھی گئی ہیں جن کی بنا پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ تین نہیں، ایک ہی مثنوی ہے (جلد اوّل، ص ۱۴۲)۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے انھیں تین مثنویاں ہی مانا ہے ("گجری مثنویاں"، گجرات اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۳)

چوتھا باب "دکن میں اردو" زیادہ اہم ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی کی تاریخ کی طرح اس میں سیاسی اور سماجی پس منظر کے بعد ادبی پس منظر بھی ہے، لیکن یہ سب محض نو صفحوں پر ہے اور اتنا کافی ہے۔ اس میں انھوں نے عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی بادشاہوں کی فہرست مع سنینِ حکومت دی ہے اور یہ مفید ہے۔ ص ۴۰ پر سلطان قلی قطب شاہ کا سنہ جلوس ۹۱۶ھ/۱۱-۱۵۱۰ء لکھا ہے، صحیح ۹۲۴ھ ہے جو نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے ("دکن میں اردو"، ص ۴۷)۔ اصل میں غلط فہمی کا ماخذ شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ۹۱۶ھ میں جب محمود شاہ کا انتقال ہوا تو سلطان قلی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا (ص ۵۶-۵۵)۔ سلطنتِ بہمنیہ کے چارٹ میں وہ خود محمود شاہ کے انتقال کی تاریخ ۹۲۴ھ لکھتے ہیں (ص ۳۵)۔

بہمنی عہد کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اشرف جہاں گیر سمنانی کی کتاب ملنے کے بعد خواجہ بندہ نواز کو اردو کا پہلا مصنف نہیں کہا جا سکتا، ہاں، دکنی میں اولیت کا شرف انھیں کو ہے (ص ۴۵)۔ یہ حامد حسن قادری کی صداے بازگشت ہے۔ افسوس کہ وہ خواجہ اشرف کے رسالے کے بارے میں کچھ بھی شبہہ نہیں کرتے؛ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کے بارے میں تو حاشیہ لکھتے ہیں کہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انھیں کے ہیں۔ مجھے ضمناً یہ عرض کرنا ہے کہ اتنی اہم بات حاشیے میں کیوں لکھی، متن میں کیوں نہیں۔ انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ عین الدین کے یہ رسالے دستیاب نہیں۔ خواجہ بندہ نواز کی تین کتابوں کے نام لیتے ہیں: "معراج العاشقین"، "معراج نامہ"، "سہ پارہ" (کذا) (ص ۴۶)۔ وہ "معراج العاشقین" کے بارے میں حفیظ قتیل کی تحقیق سے واقف نہیں۔ بقیہ دونوں رسالوں کی تردید کے لیے دیکھیے، علی گڑھ تاریخ پر میرا تبصرہ۔

اس باب کے دیگر مصنفین میں خواجہ محمد اکبر حسینی فرزند خواجہ بندہ نواز کی کتاب کا ذکر ہے۔ یہ ان کی نہیں، اس کے بارے میں دیکھیے علی گڑھ تاریخ کا باب۔ اسی صفحے پر شاہ صدرالدین متوفی ۸۷۶ھ کی "کسب محویت" مصنفہ ۸۷۰ھ کا ذکر ہے۔ میں تاریخ ادبیات مسلمانان، جلد ہشتم، ص ۷۵-۷۴ کے سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ یہ ناسک کے

Scanned by CamScanner

صدرالدین متوفّٰی ۸۷۶ھ کی تصنیف نہیں، بلکہ بارھویں صدی ہجری کے شاہ صدرالدین میسوری کی تخلیق ہے۔ ص ۴۸ پر بندہ نواز کے نبیرہ خواجہ عبداللہ حسینی کی "نشاط العشق" (ترجمہ "نشاط العشق") کا ذکر ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ یہ کتاب ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں تھی، لیکن اب کہیں موجود نہیں ہے۔

قطب شاہی عہد کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ خان رشید کی رائے میں "قطب مشتری" اور "سب رس" کے مصنف مختلف ہیں۔ ان کی رائے میں خان رشید کی دلیلیں مضبوط ہیں جن کی بنا پر قیاس کرتے ہیں کہ ممکن ہے "سب رس" کا مصنف "قطب مشتری" والے وجہی کا بیٹا یا پوتا ہو (ص ۶۰-۵۹) اس قیاس آرائی اور شک کا جواز نہیں۔ لکھتے ہیں: غواصی کی تینوں مثنویاں فارسی سے ترجمہ ہیں (ص ۶۴)۔ بقیہ دو کے لیے تو یہ ٹھیک ہے لیکن "مینا ستونتی" فارسی سے نہیں، ہندی سے لی گئی ہے۔

اگلا جزو عادل شاہی عہد ہے جس کے شروع میں ڈھائی صفحوں پر ادیبوں کی تصانیف کی سنہ وار فہرست ہے۔ اس میں کئی اندراجات محلِ نظر ہیں، مثلاً میراں جی شمس العشاق م ۹۰۲ھ کی کتابوں کے نام "خوش نعت"، "شرحِ مرغوب القلوب"، "جل ترنگ"، "گل باس"، "سب رس" دیے ہیں (ص ۶۷)۔ میں پہلے واضح کر چکا ہوں کہ ۹۰۲ھ میراں جی کا سنہ وفات نہیں، سنہ ولادت ہے۔ "خوش نغز" کو "خوش نعت" لکھنا سہو کاتب ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد کے تین رسالوں کی تغلیط رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے ضمن میں کر چکا ہوں۔ "سب رس" دراصل وجہی کی "تاج الحقائق" ہے۔ شاہ جانم کی کتابوں میں نمبر ۹ پر "مسافرت شیخ خان میاں و بیانِ خلاصہ حضرت شاہ برہان" کا نام ہے (ص ۶۷)۔ واللہ اعلم یہ کون سی اور کس کی کتاب ہے۔

اگلے صفحے پر انھوں نے "معرفت القلوب" اور "ہشت مسائل" کو بھی جانم سے منسوب کیا ہے (ص ۶۸)۔ جیسا کہ میں علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں، "معرفت القلوب" میراں جی خدانما کی تصنیف معلوم ہوتی ہے اور "ہشت مسائل" بعد کے برہان الدین رازالٰہی کی۔ ملک اختر نے مقیمی کی مثنوی "سوہار کی کہانی" کا نام درج کیا ہے (ص ۶۸)۔ اسپرنگر نے مقیمی کی "چندربدن و مہیار" کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اسی جلد میں اسی مصنف کی ایک اور نظم "قصۂ سوہار" ہے جو ۲۴ صفحوں کی ہے اور ہر صفحے پر ۱۵ شعر ہیں (اسپرنگر، ص ۶۲۵)(۳)۔ اس نظم کا ذکر نصیرالدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں کیا ہے اور اسپرنگر کا حوالہ بھی دیا ہے۔ علی گڑھ تاریخ یا جمیل جالبی کی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں۔ غالباً یہ مثنوی اب کہیں دستیاب نہیں۔

Scanned by CamScanner

اسی صفحے پر صنعتی کی تین مثنویوں "نجات نامہ"، "گلدستہ"، "بے نظیر" کے نام دیے ہیں (ص۶۸)۔ "نجات نامہ" ایاغی کی تصنیف ہے، "گلدستہ" کا ناقص الاوّل و ناقص الآخر نسخہ سالار جنگ میں ہے (فہرست، ص۹۵-۵۹۴) معلوم نہیں اس کا نام واقعی "گلدستہ" ہے کہ نہیں۔ جمیل جالبی اور دوسرے مؤرخوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس میں صنعتی تخلص باربار آتا ہے۔ بہت ممکن ہے یہ اسی صنعتی کی ہو۔ تیسری مثنوی کا پورا نام "قصۂ بے نظیر" ہے۔ اختر نے ادیبوں کی فہرست کے بعد شعرا کا بیان کیا ہے۔ حیرت ہے کہ ابراہیم عادل شاہ صاحبِ "نورس" کا ذکر نہیں کیا۔ نصرتی کے بارے میں مولوی عبدالحق کا یہ قول درج کیا ہے کہ وہ ولی سے کہیں بلند شاعر تھا (ص۷۶)۔

ص۸۷ پر "نظام شاہی عہد" کا عنوان دے کر فہرست کے طور پر اشرف کی مثنوی کا نام "نوسرباز" لکھا ہے۔ سہوِ کتابت ہونا چاہیے۔ صحیح "نوسرہار" ہے۔ اس کے آگے عنوان ہے: "ملکیہ عہد۔" یہاں پھر شاعروں اور نثر نگاروں کی فہرست دی ہے۔ اس میں کسی "بلبل" کی "چندر بدن" بھی شامل ہے۔ اس کا نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں ہے اور اس کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں ص۲۲-۳۲۱ پر کیا ہے۔ حسن اختر نے مغلیہ عہد کے ۲۵ قلم کاروں کی فہرست دی ہے۔ ان میں سے صرف ولی پر لکھا ہے۔ ولی کے دکنی و گجراتی ہونے کی بحث کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ وہ دکنی تھا جو احمد آباد گجرات میں کافی عرصہ رہا (ص۸۳)۔ ص۹۳ پر مولوی عبدالحق کے طے کردہ ولی کے سنہ وفات ۱۱۱۹ھ کو رد کر دیا ہے۔ قاضی نورالدین نے "تذکرۂ شعرائے گجرات" میں لکھا ہے کہ ولی نے محمد شاہ کے ابتدائی عہد میں وفات پائی۔ محمد شاہ کا جلوس ۱۱۳۱ھ میں ہوا۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے دیوانِ ولی مکتوبہ ۱۱۳۸ھ میں اسے مرحوم لکھا ہے، اس لیے حسن اختر کے مطابق ولی نے ۱۱۳۱ھ اور ۱۱۳۸ھ کے بیچ انتقال کیا۔ واضح ہو کہ جمیل جالبی نے ۱۱۳۳ھ اور ۱۱۳۸ھ کے درمیان کی تاریخ طے کی ہے (جلد۱، ص۵۳۸)۔

فہرست کے بعد ڈھائی صفحوں میں "دورِ اوّل پر ایک نظر" ہے جس میں ۱۴ شقوں کے تحت خلاصہ دیا ہے۔

دوسرا دور ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء تا ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء ہے۔ اس کے تین حصے کیے ہیں: حصۂ اوّل دہلوی شاعری، حصۂ دوم لکھنوی شاعری، حصۂ سوم نثر۔ یہ دور پانچویں سے انیسویں باب تک کو محیط ہے۔ انھوں نے یہ اچھا کیا کہ دو حصوں کو "دہلوی شاعری" اور "لکھنوی شاعری" عنوان دیا، "دبستانِ دہلی" اور "دبستانِ لکھنؤ" نہیں۔ کیونکہ اتنے لمبے عرصے کے ایک مرکز کے شعرا آپس میں یک رنگ نہیں۔ پانچویں باب میں ص۱۰۰ تا ۱۱۱ پر سیاسی اور

Scanned by CamScanner

سماجی پس منظر ہے۔ چھٹا باب "شمالی ہند میں اردو شاعری کی ترقی" ہے۔ آبرو اور مظہر کے معرکے میں آبرو کے شعر کا دوسرا مصرع یوں چھپا ہے ع:

آبرو جگ میں رہے تو جانِ جاناں آپ رہے

(ص ۱۱۶)

لیکن آزاد نے آبِ حیات میں اس مصرع کے آخری دو الفاظ، "چشم ہے،" لکھے ہیں (ص ۹۷)۔ حسن اختر نے مضمون کے ایک شعر کا مصرعِ اُولا یوں لکھا ہے ع:

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا

(ص ۱۲۰)

"آبِ حیات" میں یوں درج ہے:

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا

(ص ۱۰۲)

حسن اختر کا متن صحیح ہونا چاہیے، کیونکہ حالی نے بھی یہی دیا ہے۔ یکرنگ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "تذکرہ مخطوطات حیدر آباد" میں "داستانِ بارہ لام" کو یکرنگ کی تصنیف بتایا ہے، ممکن ہے یہ وہ مرثیہ ہو جس کا ذکر میر نے "نکات الشعرا" میں کیا ہے (ص ۱۲۳)۔ میں نے تذکرہ مخطوطات کی چھ جلدوں کی فہرست بغور دیکھی ہے۔ مجھے "داستانِ بارہ لام" یا یکرنگ کے کسی نسخے کا سراغ نہ مل سکا۔

حسن اختر ساتویں باب کے لیے لکھتے ہیں کہ اس باب میں اُن شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے ایہام گوئی کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا (ص ۱۳۹)۔ یہ بات ہے تو یکرنگ اور حاتم کا ذکر اس باب میں آنا چاہیے تھا، نہ کہ پہلے باب میں، کیونکہ ان دونوں نے ایہام گوئی کو ناپسند کیا ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ یقین کا دیوان شیخ مظہر کا کہا ہوا ہے، اس کی تردید میں اختر نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ اگر مظہر یقین کو ایک دیوان مرتب کر کے دیتے تو اپنے لیے بھی اردو کلام کا کچھ ذخیرہ چھوڑتے (ص ۱۴۳)۔ تاباں کی موت کی تاریخ کی بحث اچھی ہے۔ انھوں نے طے کیا ہے کہ تاباں نے ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان انتقال کیا ہوگا (ص ۱۴۷)۔

بیان کے لیے لکھتے ہیں کہ اس کی ایک مثنوی کے نام میں اختلاف ہے۔ سکینہ نے "نیچ نامہ" لکھا ہے، میر حسن نے "چخ نامہ" اور قاسم نے "چنگ نامہ" (ص ۱۵۵)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نام میں سہوِ کتابت کا بھی دخل ہے۔ "چخ" یا "چپک" شکرے یا ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ ہوتا ہے۔ میر حسن نے اس مثنوی کا نام "چخ نامہ" لکھا ہے، سکینہ نے

Scanned by CamScanner

تذکرۂ میر حسن ہی کے اقتباس میں اس کا نام "زیج نامہ" لکھا ہے (اردو ترجمہ، ص۲۱۸)۔ یہ سہو قرأت یا سہو کتابت کے سبب ہوگا۔ قاسم نے "چپک نامہ" لکھنا چاہا ہوگا جو "مجموعۂ نغز" کے مطبوعہ نسخے میں "چنگ نامہ" چھپ گیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہی نظم "در ہجو ہیچ میرزا فیضو" کے نام سے کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخوں میں ملتی ہے۔ معلوم نہیں اصلاً سودا کی ہے کہ بیان کی۔ حسن اختر نے اسی باب میں سراج اور نگ آبادی پر بھی لکھا ہے۔ اس کا جواز یہ دیتے ہیں:

> ان کا ذکر دبستانِ دہلی کے زمرے میں عجب معلوم ہوگا۔ خصوصیاتِ شعری کے اعتبار سے انھیں دبستانِ دہلی کے شعرا کا ساتھی کہا جا سکتا ہے، اس لیے ان کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے۔ (ص۱۵۸)

یہ عذرِ لنگ ہے۔ جب ابواب کو علاقے کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے اور چوتھا باب "دکن میں اردو" ہے اور دوسرے دور کا حصۂ اول دہلوی شاعری سے مخصوص ہے تو سراج کا ذکر چوتھے باب میں آنا چاہیے تھا، نہ کہ ساتویں باب میں۔

آٹھویں باب میں بھی دہلوی شعرا کا ذکر ہے۔ سودا کے سنہ ولادت کے بارے میں مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ اختر نے ۱۱۲۴ھ لکھا ہے (ص۱۶۷)۔ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں مفصل بحث کر کے ۱۱۱۸ھ طے کیا ہے (جلد۲، حصہ۲، ص۶۵۰-۶۵۴)۔ لکھتے ہیں، دہلی میں بسنت خاں اور عماد الملک نے سودا کی سرپرستی کی (ص۱۶۸)۔ قاضی عبدالودود نے واضح کیا کہ بسنت خاں عہد شاہ عالم سے پہلے کے امرا میں ہے۔ وہ سودا کی سرپرستی کیوں کر کر سکتا تھا ("آزاد بحیثیت محقق"، ص۲۷۷)۔ اختر آگے لکھتے ہیں کہ سودا ۱۱۶۸ھ میں فرخ آباد گئے۔ جالبی کی تحقیق کے مطابق سودا ربیع الآخر ۱۱۷۳ھ میں دہلی سے فرخ آباد گئے (جلد۲، حصہ۲، ص۶۵۶-۶۵۷)۔

اختر نے یہ تسلیم کیا کہ میر کا سنہ ولادت معلوم نہیں۔ پھر کچھ حساب کتاب لگا کر لکھتے ہیں کہ میر ۱۱۲۷ھ میں یا اس سے پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ میر کے دیوانِ چہارم کی سند پر "سنہ ۱۱۳۵ھ" ص۱۹۵ حاشیے میں لکھتے ہیں حالانکہ اب اسے عام طور پر مانا جاتا ہے۔ اسے حاشیے کے بجائے متن میں دینا چاہیے تھا۔ میر کی مثنویوں پر محض آدھے صفحے کا ایک پیراگراف لکھا ہے، جو ناکافی ہے۔ میر درد پر اچھا لکھا ہے اور تنقید بھی قابلِ قدر ہے۔ حسن اختر نے عہد محمد شاہی کے شعرا پر تحقیق کی تھی اس لیے اٹھارویں صدی کے شعرا، مثلاً حاتم، تاباں، بیان وغیرہ پر تفصیل سے لکھتے ہیں اور میر، سودا، درد وغیرہ پر بھی خوب لکھا ہے۔ ص۱۹۵ کے حاشیے میں یہ صراحت قابلِ قدر ہے کہ درد کا نام خواجہ میر اور اثر کا نام محمد میر

Scanned by CamScanner

تھا۔ یہی نام جالبی نے اپنی تاریخ میں لکھے ہیں۔

میر سوز کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا۔ جالبی نے ان کا سنہ ولادت قیاس نہیں کیا، لیکن حسن اختر نے اس سے بحث کر کے ۱۱۳۳ھ طے کیا۔ ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ کلب علی خاں فائق نے ۱۱۳۶ھ درج کیا ہے۔ حسن اختر نے متن اور حاشیے میں نیز کتاب میں دوسرے مقامات پر بھی "سنہ" کو "سَن" لکھا ہے۔ رشید حسن خاں کی رائے میں یہ فاحش غلطی ہے، صحیح "سنہ" ہے ("اردو املا"، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۸۷ و ۳۱۳)

قائم کے لیے لکھا ہے کہ ۱۱۳۸ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے (ص ۲۱۱)۔ جالبی نے اپنی تاریخ میں قائم کا سنہ ولادت قیاس نہیں کیا۔ حسن اختر نے اپنا ماخذ نہیں بتایا، لیکن سنہ درست معلوم ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر محمد اپین نے اپنی کتاب "قائم اور ان کا کلام" میں بغیر کسی حوالے کے قطعیت سے سنہ ولادت ۱۱۳۸ھ لکھ دیا ہے (علی گڑھ ۱۹۸۳ء، ص ۷)۔ "مخزن نکات" کے مختلف بیانات کی بنا پر اس کی ابتدا ۱۱۶۵ھ میں اور اضافے ۱۱۷۶ھ تک دکھاتے ہیں (ص ۲۱۴)۔ ان بیانات کو دیکھ کر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اندراجات کا بنائر تجزیہ کر کے یہ سنین برآمد کیے ہیں۔ کسی ماخذ کی طرف اشارہ نہیں کیا، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ سب باتیں ڈاکٹر حنیف احمد نقوی اپنی کتاب "شعرائے اردو کے تذکرے" (لکھنؤ، ۱۹۷۶ء) میں لکھ چکے ہیں اور ان سے پہلے دوسرے محقق بھی یہ دریافت کر چکے ہیں تو خیال آتا ہے کہ کاش ملک حسن اختر دوسروں کے نتائج درج کرتے وقت ان کا اعتراف بھی کر لیا کرتے تو بہتر ہوتا۔

میر کے بہنوئی محمد حسین کلیم کے لیے لکھتے ہیں کہ انھوں نے "فصوص الحکم" اور "دہ مجلس" کا نظم میں ترجمہ کیا (ص ۲۱۵)۔ "فصوص الحکم" کے منظوم ترجمے کی بات تو کئی تذکروں میں ملتی ہے لیکن "دہ مجلس" کے ترجمے کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ مالک رام و مختار الدین احمد نے "دہ مجلس" کے نظم و نثر کے ترجموں کی فہرست دی ہے، اس میں بھی کلیم کے ترجمے کا ذکر نہیں (مقدمہ "کربل کتھا"، ۱۹۶۵ء، ص ۱۳-۱۲)۔ کاش حسن اختر نے اپنا ماخذ درج کر دیا ہوتا۔ میر محمدی بیدار کے سنہ وفات کے لیے لکھتے ہیں کہ عشقی نے ۱۲۱۲ھ اور "گلِ رعنا" میں ۱۲۰۹ھ لکھا ہے (ص ۲۱۶)۔ جالبی نے صحیح تاریخ ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۱۰ھ لکھی ہے اور یہ سنہ ان کے مزار پر بھی کندہ ہے (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۰۱)۔

نویں باب کا موضوع ہے: "وہ دہلوی شعرا جن کی شہرت لکھنؤ میں ہوئی۔" ان میں میر حسن، جعفر علی حسرت، جرأت، مصحفی، انشا اور رنگین کا ذکر ہے۔ میر حسن کے سنہ ولادت کے بارے میں مختلف علما کی رائیں لکھی ہیں، نیز میر حسن کی چند مثنویوں کے سنہ

Scanned by CamScanner

تصنیف بھی دیے ہیں (ص ۲۲-۲۲۱)۔ کیا خوب ہوتا کہ وہ اپنے ماخذ کا بھی حوالہ دے دیتے۔
یہ سب ڈاکٹر وحید قریشی کے مقالے میں موجود ہے۔ شاہ عالم کے اندھا کیے جانے کا سنہ
۱۲۰۲ھ/ ۸۸-۱۷۸۷ء دیا ہے (ص ۲۳۰)۔ ہجری سنہ صحیح ہے، عیسوی غلط۔ ایک ہجری سنہ کے
مقابل بے تامل ایک عیسوی سنہ لکھ دیا، گو ۱۲۰۲ھ کے متوازی دو عیسوی سنہ ۱۷۸۷ء اور
۱۷۸۸ء ہیں۔ جادوناتھ سرکار کی "زوالِ سلطنتِ مغلیہ" کے مطابق شاہ عالم کے اندھا کیے
جانے کی تاریخ ۷ ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ م ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء ہے۔ اختر لکھتے ہیں جعفر علی حسرت
کا سنہِ وفات قطعہ نے ۱۲۱۰ھ لکھا ہے لیکن فائق رام پوری نے ۱۲۰۷ھ تحقیق کیا اور یہی
درست ہے (ص ۲۳۰)۔ لیکن جمیل جالبی نے جرأت کے کسی قطعۂ وفات کی بنا پر ۱۲۰۶ھ
طے کیا ہے اور یہی صحیح ترین ہے (جالبی ۲/۲ ص ۸۱-۸۸۰)

جرأت کی بینائی سلب ہونے کے لیے لکھتے ہیں کہ تذکرۂ میر حسن (۱۱۹۲ھ) میں اس
کا ذکر نہیں جب کہ مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" (۱۲۰۰ھ) میں ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ
۱۱۹۲ھ اور ۱۲۰۰ھ کے بیچ اندھے ہوئے۔ جرأت نے مثنوی "حسن بخشی" (۱۱۹۱ھ) میں اپنے
دوست خواجہ حسن کے ساتھ شاہد پرستی کا ذکر کیا ہے، نابینائی کا نہیں (ص ۲۳۳)۔ یہی
دلائل ابواللیث صدیقی نے "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان..." میں دیے ہیں (جلد ۷،
ص ۸۷-۲۸۶)۔ ابتدائی حد درست ہے، انتہائی تاریخ میں شبہات ہیں۔ مصحفی کا "تذکرۂ
ہندی" ۱۲۰۰ھ میں شروع ہوا لیکن اس کا سالِ تکمیل ۱۲۰۹ھ ہے۔ اس میں غالباً ۱۲۱۰ھ میں
بھی اضافے ہوئے۔ کون جانے کہ جرأت کا حال کب لکھا گیا۔ جرأت کی مثنوی "حسن بخشی"
کی تاریخ ۱۱۹۱ھ قطعی نہیں۔ یہ ۱۲۰۰ھ یا ۱۲۰۱ھ بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح جرأت کی نابینائی
کی تاریخ ۱۲۰۰ھ اور ۱۲۰۹ھ کے بیچ ہو سکتی ہے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ حسن اختر
نے جرأت کے کلام پر تنقید اچھی کی ہے۔

مصحفی کے سنہ ولادت اور جائے ولادت دونوں کا معاملہ اختلافی ہے۔ حسن اختر نے
بحث کیے بغیر لکھا ہے کہ وہ ۱۱۴۱ھ اور ۱۱۵۶ھ کے بیچ اکبر پور میں پیدا ہوئے (ص ۲۴۱)،
ماخذ نہیں دیا۔ ابواللیث نے ۴۲-۱۱۴۱ھ طے کیا ہے (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد ۷،
ص ۲۶۵)۔ جرأت کی طرح مصحفی کے کلام پر بھی تنقید اطمینان بخش ہے۔ لکھتے ہیں، انھیں
سرخ کے بعد سیاہ رنگ سب سے زیادہ عزیز تھا (ص ۲۴۷)۔ انشا کا سنہِ ولادت عہد سراج
الدولہ میں ۷۰-۱۱۶۹ھ لکھتے ہیں (ص ۲۵۱)۔ مالک رام کی تحقیق صفر ۱۱۶۶ھ/ نومبر ۱۷۵۲ء
کے حق میں ہے ("تحقیقی مضامین"، ص ۱۴۲)۔

حسن اختر یہ چونکانے والی بات لکھتے ہیں کہ انشا سعادت علی خاں کے انتقال ۱۲۲۹ھ

کے بعد غازی الدین حیدر کے زمانے میں دوبارہ دربار میں جانے لگے تھے (ص ۲۵۴)۔ اتنے اہم بیان کو کسی حوالے اور سند کے بغیر درج کرنا ادبی تاریخ کے منافی ہے۔ میں نے یہ کہیں اور بھی پڑھا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ عابد پیشاوری کے مطابق انشا کی مالیخولیائی کیفیت آخر تک برقرار رہی۔ صادق اختر کے تذکرے "آفتابِ عالم تاب" کے بموجب انشا کو عوارض سے شفا نہ ملی اور اسی میں انتقال کر گئے ("انشا اللہ خاں انشا"، ص ۲۷۹)۔ رنگین کے بارے میں صابر علی خاں کے مقالے سے لے کر مفصل لکھا ہے۔

دسواں باب نظیر اکبر آبادی کے بارے میں ہے۔ لکھتے ہیں کہ سنہ ولادت کا پتا نہیں چل سکا (ص ۲۷۱)۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز نے "زندگانیِ بے نظیر" میں ۱۷۳۵ء لکھی ہے جس کی تائید بعد کے متعدد لکھنے والوں نے کی ہے (۳)۔ گیارھویں باب میں انشا اور مصحفی کے بعد کے شعرائے دہلی کا ذکر ہے۔ شاہ نصیر کے لیے صحیح لکھتے ہیں کہ ۱۲۵۴ھ میں حیدر آباد میں وفات پائی، لیکن پھر تذکرۂ "گلستانِ سخن" سے نقل کرتے ہیں کہ ان کا مزار محلہ روشن پورہ دہلی میں ہے (ص ۲۸۴)۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنف کو "گلستانِ سخن" کی عبارت سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔ تذکرے میں شاہ نصیر کے احوال کی ابتدا ہی میں لکھا ہے کہ وہ میر جہاں مرحوم کے سجادہ نشیں تھے اور یہ مرحوم و مغفور وہ ہے کہ اس کا مزارِ پُرانوار محلہ روشن پورہ شاہ جہاں آباد میں ہے ("گلستانِ سخن"، ص ۴۵۹)۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ شاہ نصیر کے پیر کے مزار کی نشان دہی ہے۔ شاہ نصیر کے احوال کے آخر میں صاحبِ تذکرہ نے صاف لکھا ہے کہ ان کا انتقال حیدر آباد میں ہوا (ص ۴۶۰)۔

ذوق کے بارے میں یہ انوکھی اطلاع ہے کہ ان کے آباواجداد کھتری تھے اور نو مسلم۔ وہ ضلع مظفر نگر سے ترکِ وطن کر کے دہلی آئے تھے (ص ۸۸-۲۸۷) اس کا ماخذ دینا چاہیے تھا جس کی عدم موجودگی میں یہ بیان بازاری گپ سے زیادہ نہیں۔ اختر نے ذوق کے بارے میں آزاد کی لکھی بیش تر باتوں کو تسلیم کر لیا ہے، مثلاً یہ کہ ان کے شاہ نصیر سے معرکے ہوئے، ذوق نے ۱۸ زبانوں میں شعر کہے اور ۱۹ برس کی عمر میں خاقانیِ ہند کا خطاب حاصل کیا (ص ۲۸۹)۔ عابد پیشاوری نے اپنی کتاب "ذوق اور محمد حسین آزاد" میں ان سب کی تردید کی ہے۔ حسن اختر نے آزاد کے صرف اس بیان کو غلط قرار دیا ہے کہ معروف کا پورا دیوان ان کا اصلاح شدہ ہے۔ وہ ڈاکٹر تنویر علوی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے آزاد کے کاغذات میں ذوق کے ہاتھ کی معروف کے نام سے لکھی ہوئی ایک غزل دیکھی (ایضاً) لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ذوق ہی کے خط میں ہے یا ذوق کے پاس اصلاح کے لیے آئی تھی؟

ذوق کے بیٹے خلیفہ محمد اسماعیل کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ اُن ۵۰ ممتاز افراد میں ہیں

Scanned by CamScanner

جنھیں غدر کے سلسلے میں پھانسی دی گئی یا گولی مار دی گئی (ص ۲۹۰)۔ حسبِ معمول اس اہم بیان کا ماخذ درج نہیں۔ آگے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر تنویر علوی نے "ذوق، سوانح اور انتقاد" کی ابتدا اس فقرے سے کی ہے: ذوق اپنے زمانے کے بہترین شاعر اور استادِ وقت تھے۔

اگر ذوق کو بہترین شاعر قرار دیا جائے تو غالب کا کیا مقام ہوگا۔ ہماری تنقید کا المیہ یہ ہے کہ جب نقاد کسی شاعر پر قلم اٹھاتے ہیں تو دوسرے شاعروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ (ص ۲۹۱)

حسن اختر نے آخری مشاہدہ کتاب میں بار بار کیا ہے اور مجھے اس سے کامل اتفاق ہے۔

غالب پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس بیان کے کئی اندراجات قابلِ توجہ ہیں، مثلاً ڈاکٹر خالد حسن قادری نے غالب کے زائچے کی بنا پر غالب کی تاریخ ولادت ۱۲۱۱ھ قرار دی ہے (ص ۳۰۰، بحوالۂ "اردو نامہ"، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۱۴۹)۔ ص ۳۰۳ پر غالب کے تخلص کی تبدیلی کے سنہ پر اچھی بحث کی ہے جس میں آزاد کے بیان کی تردید کی ہے۔ غالب کی تصانیف کی فہرست بھی بہت خوب ہے (ص ۳۰۶)۔ کلامِ غالب کے مخطوطوں میں نمبر ۶ نسخۂ کراچی نوشتۂ ۹ شعبان ۱۲۶۱ھ م اگست ۱۸۴۵ء کو شامل کیا ہے (ص ۳۰۷)۔ معلوم نہیں یہ کون سا نسخہ ہے، کیونکہ مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی کی ترتیب میں اس کا ذکر نہیں کیا (طبعِ اول، مقدمہ ص ۱۶-115)

انکشاف کرتے ہیں کہ مومن کی تین کتابوں کے مسودے ضائع ہو گئے۔ ان کے نام ہیں "جانِ عروض"، "شرحِ سدیدی"، "خواص پان" (ص ۳۲۵)۔ ماخذ کا حوالہ دے دیا ہوتا تو بہتر تھا، میں نے اور کہیں ان کے نام نہیں دیکھے۔ اختر کی تاریخ میں انوکھی معلومات کی کمی نہیں۔ لکھتے ہیں کہ قلعے کے لاہوری دروازے کے باہر انگریزوں نے ظفر کی ایسی تصویر بنوا دی تھی جس کے گلے میں پھانسی تھی (ص ۳۳۴)۔ مجھے یہ بھی عوامی گپ معلوم ہوتی ہے۔ بحث کرتے ہیں کہ کیا ظفر کا کلام ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں بیانات درج کرتے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ڈاکٹر تنویر علوی کو ذوق کے ہاتھ کی لکھی دو غزلیں اور ایک مادۂ تاریخ ظفر کے نام سے ملا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ظفر کا پہلا دیوان ذوق کی شاگردی سے قبل کا ہے اور اس کا رنگ ذوق کے رنگ سے مختلف ہے (ص ۳۳۵)۔ سوال یہ ہے کہ کیا کہیں ذوق کی مصدقہ لکھاوٹ ملتی ہے۔

Scanned by CamScanner

اختر نے شیفتہ کی سوانح اور تنقید اچھی لکھی ہے۔ اس باب میں چند دوسرے شعرا، مثلاً مجروح، آزردہ اور ممنون کا بھی ذکر ہے۔

دوسرے دور کا دوسرا حصہ لکھنوی شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں بارھواں باب سیاسی اور سماجی پس منظر کا ہے جس کے بعد لکھنوی ادب کا جائزہ ہے۔ ص۳۵۵ سے ۳۶۷ تک کا یہ پورا بیان عمدہ ہے، لیکن اس میں ص۳۵۵ پر جو یہ لکھا ہے کہ اکبر کے عہد سے لکھنؤ اودھ کا دارالسلطنت بن گیا، یہ درست نہیں۔ بانیِ سلطنت اودھ سعادت علی خاں برہان الملک کے دور سے آصف الدولہ کے عہد کے اوائل تک فیض آباد دارالخلافہ تھا۔ آصف الدولہ تخت نشینی کے پہلے ہی سال فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔

ص۳۶۸ پر ناسخ کا سالِ ولادت ۱۱۷۵ھ کے پاس لکھا ہے۔ اس کی دلیل دینی چاہیے تھی۔ مالک رام نے ان کی صحیح تاریخ ولادت ۸ محرم ۱۱۸۶ھ دی ہے ("تذکرۂ ماہ و سال"، ص۳۸۰)۔ آزاد نے "... دہن بگڑا" کے سلسلے میں آتش کی تعلّی اور مصحفی کا ایک نوشق شاگرد کی غزل میں انھیں قافیوں کو باندھنے کا واقعہ لکھا ہے۔ حسن اختر اسے بجاطور پر صحیح نہیں سمجھتے کہ یہ دونوں کے مزاج کے خلاف معلوم ہوتا ہے، پھر مصحفی کی غزل کم تر ہے (ص۳۸۱)۔

لکھتے ہیں امیر مینائی نے "تذکرہ کاملانِ رام پور" میں ۱۲۹۰ھ/۷۴-۱۸۷۳ء میں امیر کی عمر ۷۵ سال بتائی ہے (ص۴۰۰)۔ اس بیان میں دو غلطیاں ہیں۔ "تذکرہ کاملانِ رام پور" امیر مینائی کی نہیں، حافظ احمد علی خاں شوق کی تالیف ہے۔ یہ تذکرہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں امیر کا ذکر ہے ہی نہیں۔ امیر مینائی تذکرۂ "انتخابِ یادگار" کے مؤلف ہیں، اس میں امیر کے بارے میں مذکورہ بیان ہے، لیکن یہ تذکرہ ۱۲۹۰ھ میں نہیں، ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوا۔ حسن اختر مزید لکھتے ہیں کہ امیر کی سات داستانیں کتب خانۂ رام پور میں محفوظ ہیں (ص۴۰۲)۔ یہ صحیح نہیں۔ میں دو بار رضا لائبریری رام پور میں تمام داستانوں کو کھنگال چکا ہوں۔ مجھے وہاں امیر کی کوئی داستان نہ ملی۔ امیر نے "انتخابِ یادگار" میں امیر کی نثری تصانیف کی بھی فہرست دی ہے، ان میں کوئی داستان شامل نہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنے مقالے "اردو داستان" (اسلام آباد، ۱۹۸۰ء) اور ڈاکٹر آغا سہیل نے "دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا" (لاہور، ۱۹۸۸ء) میں بھی امیر کی کسی داستان کی نشان دہی نہیں کی۔

غلط فہمی کا ماخذ ڈاکٹر سلیمان حسین کا ۷۶ صفحوں کا مضمون "سید مظفر علی اسیر" ہو سکتا ہے جو ان کے مجموعے "لکھنؤ کے چند نام ور شعرا" میں شامل ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ رضا لائبریری میں اسیر کی ۷ قلمی داستانیں موجود ہیں:

Scanned by CamScanner

۱- طلسمِ باطنِ بالا باختر
۲- طلسمِ باطنِ آفات
۳- طلسمِ صنّاکیہ
۴- طلسمِ نادرِ فرنگ
۵- طلسمِ باطنِ نیرنجات
۶- طلسمِ زریمان
۷- ترجمۂ لعل نامہ (ص ۴۰۲)

انھوں نے پہلی داستان کا نام "طلسمِ باطنِ بالا باختر"، غلط لکھا- صحیح نام "طلسمِ باطنِ بلاخیز" ہے- یہ سب دراصل "منشی غلام رضا رضا کی تخلیق ہیں، اسیر سے انھیں کوئی واسطہ نہیں- دیکھیے میری کتاب "اردو کی نثری داستانیں"، لکھنؤ ایڈیشن، ص ۱۱۷- سہیل بخاری نے اپنی کتاب میں منشی غلام رضا کے تحت ان سب کے اوراق کا شمار اور ان میں سے دو کی تاریخ بھی دی ہے (ص ۶۴- ۳۶۳)-

واجد علی شاہ اختر کے لیے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں کہ ان کا پہلا لڑکا پیدا ہوا تو انھیں کئی خطابات صولت جنگ وغیرہ ملے-

> اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے بجائے بچے پیدا کرنے کو ہی بہادری سمجھا جاتا تھا اور خطابات دیے جاتے تھے- (ص ۴۰۵)

واجد علی شاہ اختر کے حالات دیے ہیں لیکن حیرت ہے کہ محض تخت نشینی ہی تک- اس سلسلے میں ایک بے بنیاد بات یہ لکھ دی ہے:

> اسی زمانے میں وہ بیمار ہو گئے تھے اور ان کی تمام بیگمات ان کا ساتھ چھوڑ گئیں- (ص ۴۰۵)

چودھویں باب میں لکھنؤ کے تین مثنوی نگاروں شوق، نسیم اور قلق کا بیان ہے- تاریخی ترتیب سے شوق کا ذکر نسیم اور قلق کے بعد آنا چاہیے تھا- اختر، شوق کے بارے میں عطاء اللہ پالوی کے "تذکرۂ شوق" سے متاثر ہیں- شوق کی "فریبِ عشق" کی تاریخ قبلِ ۱۲۶۳ھ لکھی ہے اور "بہارِ عشق" کی ۱۲۶۷ھ (ص ۴۰۷)- "فریبِ عشق" کی صحیح تاریخ کسے معلوم ہے؟ "بہارِ عشق" کا پہلا ایڈیشن ۱۲۶۶ھ میں شائع ہوا- اسے اسی سال کی تصنیف مانا جا سکتا ہے- حالی نے شوق کی مثنویوں کے بارے میں لکھا تھا:

> ان مثنویوں میں اکثر مقامات اس قدر آن سورل اور خلافِ تہذیب

Library
man Taraqqi U...

Scanned by CamScanner

ہیں کہ ایک مدّت سے ان تمام مثنویوں کا چھپنا حکماً بند کر دیا گیا
ہے۔ (مقدمہ، مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۳۱)

اسی کو نظر میں رکھ کر، لیکن قول یا قائل کا ذکر کیے بغیر، حسن اختر صحیح لکھتے ہیں کہ شوق کی تمام مثنویاں نہیں، صرف "زہرِ عشق" ممنوع ہوئی تھی اور وہ بھی ام بارل ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ جنازہ اٹھنے کے منظر کی خواتین تاب نہ لا سکتی تھیں (ص ۴۱۱ حاشیہ)۔ اس صراحت کو حاشیے میں کیوں دیا، متن میں لکھنے میں کون سی قباحت تھی۔ مثنوی "گلزارِ نسیم" کے لیے لکھتے ہیں کہ دیاشنکر نسیم نے ریحان کی اردو مثنوی اور رفعت لکھنوی کی فارسی مثنوی سے فائدہ اٹھایا (ص ۴۱۴)۔ میں بارہا واضح کر چکا ہوں کہ میکولال کا ئستھ رفعت لکھنوی کی فارسی مثنوی "گلزارِ نسیم" پر موخّر ہے، مقدّم نہیں۔ ڈاکٹر اختر نے قلق کا ذکر بہت اختصار سے کیا ہے۔

پندرھواں باب لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا کے بارے میں ہے، ضمیر تا انیس و نفیس۔ دوسرے دور کا تیسرا حصّہ نثر کے بارے میں ہے۔ اس میں ص ۴۴۳ پر تحسین کا نام "عطا حسین" لکھا ہے، صحیح "حسین عطا خاں" ہے۔ حکیم محمد بخش مہجور کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ان کی کتاب "چار چمن" "علمِ طب میں ہے۔ محسن نے "تذکرۂ سراپا سخن" (۱۲۶۹ھ) میں لکھا کہ ان سے "چار چمن" "علمِ حکمت میں یادگار ہے۔ نسّاخ نے تذکرۂ "سخنِ شعرا" میں اسی بات کو بڑھا کر نقل کیا کہ "نورتن" اور "چار چمن" "علمِ حکمت میں ان سے یادگار ہیں۔
"چار چمن" ناپید ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی میرے مقالے "اردو کی نثری داستانیں" کے ممتحن تھے۔ انھوں نے مقالے کی رپورٹ میں اعتراض کیا کہ میں نے طب کی کتاب "نورتن" کو قصّوں میں شامل کر لیا ہے۔ شادانی نے شاید "نورتن" بچشم خود نہیں دیکھی ہوگی۔ محسن اور نسّاخ کے تذکروں میں اسے حکمت کی کتاب سمجھ کر طب سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ حکمت کے معنی دانش وری کے ہیں۔ اردو میں طب کے لیے مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ مہجور کی داستان "گلشنِ نوبہار" کے مرتب ڈاکٹر سلیمان حسین نے بھی حکمت اور طب کو مترادف سمجھ کر اعتراض کیا کہ ان حضرات نے "چار چمن" کو علمِ حکمت (طب) کی کتاب قرار دیا ہے۔ وہ "نورتن" کے دیباچے کے اس بیان کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

> انشاے چار چمن، دلِ لگن، پُر از قصصِ دل فریب، فسانہ ہاے عجیب۔
>
> (دیباچۂ "گلشنِ نوبہار"، لکھنؤ ۱۹۸۵ء، ص ۱۲-۱۱)

Scanned by CamScanner

حسن اختر نے مفتی محمد انتظام اللہ شہابی کی کتاب "یوپی میں اردو" سے لے کر فورٹ ولیم کالج سے باہر کی ۱۶ نثری کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس میں متعدد نامعلوم قدیم کتابیں ہیں، مثلاً:

> بندرا بَن متھراوی متوفی ۱۱۶۷ھ کی "تذکرۂ معاصرین"، ہری چرن شاد سنبھلی کی "بدائع الفنون" ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء، محمد حسین کلیم دہلوی کی "ترجمۂ فصوص الحکم"، نادر علی شاہ قادری کا "رسالۂ تصوف" ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء، مولوی قمر عالم کا "قصّۂ محفوظ خانی" ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء، حکیم محمد شریف خاں دہلوی متوفی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کی "ترجمہ قرآن"، محمد جعفر کی "روح الایمان والاسلام" ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء وغیرہ (ص ۴۹-۴۴۸)۔

محمد حسین کلیم کے لیے قائم نے "مخزنِ نکات" میں لکھا ہے:

> پیش ازیں ترجمانِ فصوص بزبانِ ریختہ نظم می کرد و بسبِ بعضے عوارض دست ازاں باز داشت۔

یعنی یہ ترجمہ نظم میں تھا، نثر میں نہیں اور وہ بھی مکمل نہ ہو سکا۔ حکیم محمد شریف کے "ترجمۂ قرآن" (دراصل "تفسیرِ قرآن") کا ذکر مولوی عبدالحق نے "قدیم اردو" میں کیا ہے، لیکن حکیم صاحب کا سنِ وفات ۱۲۰۳ھ درست نہیں۔ ڈاکٹر حمید شطاری، "تذکرۂ علمائے ہند" میں درج قطعۂ تاریخ وفات کی بنا پر ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء طے کرتے ہیں (۴)۔ بقیہ کتابیں مفتی صاحب کے زرخیز تخیل کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ انتظام اللہ شہابی اردو کے سب سے غیر معتبر راویوں میں ہیں۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اٹھارویں صدی میں نثر کی اتنی ساری کتابوں کے وجود کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا، اس سے اُن کی تحقیقی نظر کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ اگر یہ کتابیں واقعی موجود ہوتیں تو یہ غیر معمولی دریافت تھی۔

کتاب کے ص ۴۵۰-۵۱ پر مستشرقین کی قواعد و لغت کی ۲۶ کتابوں کی فہرست مع سنین کے قابلِ قدر ہے۔ کاش کوئی محقق یورپ جا کر ان کتابوں کا جائزہ لے سکے، لیکن اس کے لیے لاطینی اور اطالوی جیسی یورپی زبانوں کا جاننا ضروری ہے۔ اختر نے مستشرقین کے سلسلے ہی میں دتاسی کے کاموں کو لیا ہے۔

سترھواں باب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین پر ہے۔ گِل کرسٹ کی سوانح اچھی ہے۔ لکھتے ہیں کہ فروری ۱۸۰۴ء میں گِل کرسٹ کے جانے کے بعد میر بہادر علی حسینی کا کالج سے

Scanned by CamScanner

تعلق منقطع ہو گیا (ص۴۶۱)۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ حسینی نے ۱۸۰۵ء مطابق ۱۲۲۰ھ میں فورٹ ولیم کالج میں "تاریخِ آشام" کا ترجمہ کیا جو ہربرٹ ہارنیٹن صاحب اور کول بروک صاحب کی فرمائش پر ہوا۔ میر امن کے بارے میں ڈاکٹر اختر کی غیر مصدقہ قیاس آرائیاں ایک تحقیقی کتاب کے شایانِ شان نہیں۔

لکھتے ہیں کہ دلی پر سورج مل جاٹ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیان ہوئے۔ اس وقت میر امن دلی سے نکلے ہوں گے، چونکہ وہ اپنے اہل و عیال کا ذکر نہیں کرتے اس کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے عظیم آباد میں شادی کی ہوگی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵، ۲۰ سال رہی ہوگی، اس لیے ان کا سالِ پیدائش ۱۱۴۶ھ اور ۱۱۶۱ھ کے بیچ متعین کیا جا سکتا ہے (ص۴۶۴)۔ میر امن کا اس زمانے میں دلی چھوڑنا خود اس کے بیان سے مستنبط ہوتا ہے۔ اس کے آگے سب کچھ حسن اختر کا ایسا قیاس ہے جس کی کوئی ٹھوس شہادت نہیں۔ اس کمزوری سے قطعِ نظر اختر نے فورٹ ولیم کے مصنفین کی سوانح عام طور سے اچھی پیش کی ہے۔

میر شیر علی افسوس کے بارے میں انھوں نے یہ درست لکھا کہ نظرِ ثانی کے کام کی وجہ سے افسوس کو بہتوں کی مخالفت مول لینی پڑی اور اس سے تنگ آ کر وہ اس کام سے دست بردار ہو گئے (ص۴۷۳)۔ آگے لکھتے ہیں کہ فائق نے میر شیر علی افسوس کی شاعری کو جرأت، انشا اور مصحفی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

> "ہمارے نقاد جس شاعر پر قلم اٹھائیں اس کو آسمان پر بٹھا دیتے ہیں اور اس وقت دوسروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کجا افسوس اور کجا مصحفی!"
> (ص۴۷۴)

میں اختر کی اس جرأتِ فکر کی داد دیتا ہوں اور ان کے اس فیصلے سے اتفاق کرتا ہوں۔

اٹھارواں باب فورٹ ولیم کالج کے بعد کے اور باہر کے مشہور مصنفین کے بارے میں ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ غازی الدین حیدر نے رجب علی بیگ سرور سے خفا ہو کر انھیں جلاوطن کر دیا تھا (ص۴۹۵)۔ اختر نے یہ بات رام بابو سکسینہ کی تاریخ سے لی ہوگی۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اس بیان کا ماخذ اصلی نوبت رائے نظر کے ایک مضمون میں دریافت کیا۔ نیر کی رائے میں سرور قتل کے ایک مقدمے میں ملوث تھے جس سے بچنے کے لیے کان پور چلے گئے ("رجب علی بیگ سرور"، ص۸۶-۸۵)۔ اس باب میں غالب کے خطوط پر اچھی تنقید کی ہے۔

انیسویں باب میں دوسرے دور میں اردو ڈرامے اور اردو صحافت کی نشوونما دکھائی ہے۔ دو موضوعات کو ایک باب میں سمانا مناسب نہ تھا۔ انھوں نے امانت کی "اِندر سبھا"

Scanned by CamScanner

کی تاریخ کی بحث اچھی کی ہے اور اس سلسلے میں عشرت رحمانی کی تصحیح بھی کی ہے۔ اردو صحافت کے جزو میں ص ۲۵-۲۴ پر اخباروں کی فہرست خوب ہے۔ ڈیڑھ صفحے کے تبصرے پر دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۵۸ء تا ۱۹۳۵ء ہے۔ اس کا بیسواں باب سیاسی اور سماجی پس منظر کا ہے۔ اس میں میرے لیے یہ خبر نئی ہے کہ سائمن کمیشن کے معاملے میں مسلم لیگ دو فریقوں میں بٹ گئی تھی۔ قائداعظم نے کمیشن کے بائیکاٹ کی حمایت کی، جب کہ دوسرے دھڑے نے تعاون کیا۔ جس کے صدر سر محمد شفیع اور سکریٹری علامہ اقبال تھے۔ پس منظر کا دوسرا حصہ حسبِ معمول "اُس دور کا ادب" ہے۔ ادبی پس منظر لکھنے کی یہ روایت "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان..." کی تقلید ہے۔

تیسرے دور کا اکیسواں باب حصہ نظم ہے، جس میں داغ، امیر، جلال، ریاض، جلیل وغیرہ پر لکھا ہے۔ یہ تنقیدی فیصلہ بہت صائب ہے کہ داغ اور امیر کے مزاج میں بڑا اختلاف ہے، چنانچہ امیر نے داغ کا مقلد بن کر بہت بڑی غلطی کی۔ اس باب میں جلال کے دواوین کے نام دیے ہیں جن میں سے تین صحیح نہیں۔

حسن اختر، ص ۵۵۵	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، ص ۲۸۱
"شاہدِ شوخ"	"شاہدِ شوخ طبع"
"کرشمہ جاتِ سخن"	"کرشمہ گاہِ سخن"
"نظمِ رنگین"	"نظم نگارین"

امیر اللہ تسلیم کا سنہ ولادت امیر مینائی کے تذکرے "انتخاب شعرا" کی سند پر ۱۸۲۲ء بتایا ہے (ص ۵۵۸)۔ افسوس ہے کہ اختر کتابوں کے صحیح نام لکھنے کی طرف مناسب توجہ نہیں کرتے۔ امیر کے تذکرے کا نام "انتخابِ یادگار" ہے۔ اس سے پہلے حسن اختر ص ۴۰۰ پر امیر کے تذکرے کا نام "تذکرہ کاملانِ رام پور" لکھ چکے ہیں۔ تسلیم کے محقق ڈاکٹر فضلِ امام کی رائے میں تسلیم کا سنہ ولادت ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء ہے (۵)۔ "انتخابِ یادگار" کا بیان غلط ہے۔ ریاض کا سنہ ولادت ۱۲۷۰ھ/۵۴-۱۸۵۳ء لکھا ہے (ص ۵۶۰) مالک رام کے مطابق ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء ہے۔ چونکہ ان کے ماخذ "رند پارسا" اور "دبستانِ امیر مینائی" ہیں اس لیے سنہ صحیح ہونا چاہیے۔ ریاض پر اچھا لکھا ہے۔ جلیل مانک پوری کی ولادت ۱۸۶۹ء میں دکھائی ہے (ص ۵۶۹)۔ ذکی کاکوروی نے جلیل کے دو فرزندوں کے حوالے سے ۱۲۸۰ھ/۶۴-۱۸۶۳ء لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے (۶)۔

Scanned by CamScanner

بائیسواں باب "طرزِ قدیم کے پیرو؛۲" ہے۔ اس باب کے شعرا نے جدید کے ساتھ قدیم روایت کو بھی برقرار رکھا۔ ان میں سب سے پہلے حسرت موہانی آتے ہیں۔ ان کے سنہ پیدائش کے بارے میں محققوں کے اختلافی بیانات سامنے آرہے ہیں۔ حسن اختر نے ۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ھ لکھا ہے۔ حوالہ ڈاکٹر خالد حسن: "غالب و حسرت کے کچھ سن و سال"، "اردونامہ"، مارچ ۱۹۷۵ء، ص ۱۵۱ (اختر، ص ۵۷۱)۔ صحیح ترین دریافت نفیس احمد صدیقی کی ہے، جن کے پاس حسرت کے دو پاسپورٹ ہیں جن میں ان کی تاریخِ پیدائش ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء درج ہے ("ہماری زبان"، یکم فروری ۱۹۹۳ء، ص ۲)۔

جلیل قدوائی نے اصغر گونڈوی کو یہ کہہ کر میر درد سے بڑھا دیا کہ درد کے یہاں شعریت نہیں۔ اس پر حسن اختر احتجاج کرتے ہیں کہ ہماری تنقید کی بڑی خرابی یہ ہے کہ جس شاعر پر قلم اٹھایا جائے اسے باقی سب سے بلند مقام پر بٹھادیا جائے (ص ۵۸۵)۔ معلوم ہوتا ہے حسن اختر کی تنقیدی رائیں بہت صائب ہوتی ہیں۔ انھوں نے فانی کو ۲۰ صفحے دیے ہیں ص ۵۸۹ تا ۶۰۸ جو زیادہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ ماننا ہوگا کہ ان پر اچھا لکھا ہے۔

اس باب کی بعض تاریخوں پر حسن اختر اور دوسرے مولفین کے مختلف بیانات درجِ ذیل ہیں:

حسن اختر	دوسرے محققین
ص ۶۱۲، ثاقب ف ۲۹ ذی الحج ۱۳۶۵ھ/۲۱ نومبر ۱۹۴۶ء	مالک رام: ۲۴ نومبر ۱۹۴۶ء
ص ۶۱۹، جعفر علی خاں اثر ۱۹۴۰ء میں ریٹائر، ۱۹۳۵ء میں فوت (ظاہر اسہوِ کتابت۔ ۱۹۶۵ء مراد ہوگی۔)	مالک رام: وفات ۶ جون ۱۹۶۷ء، نیز محمود خاور بھی یہی ("اثر لکھنوی، حیات اور کارنامے"، حیدر آباد، ۱۹۷۷ء، ص ۴۳)
ص ۶۲۱، نوبت رائے نظر پ ۱۸۶۶ء، ف ۱۸ اپریل ۱۹۲۳ء	خورشید احمد خاں یوسفی: پ ۱۸۶۴ء ("خمخانہ جاوید"، جلد ششم، ص ۵۳۰، اسلام آباد)
	مالک رام و خورشید احمد خاں: ف ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء
ص ۶۲۶، جوش ملسیانی پ یکم فروری ۱۸۸۴ء، تصنیفِ کتاب کے وقت زندہ دکھایا ہے۔	مالک رام: پ یکم فروری ۱۸۸۴ء، یہی سنہ کالی داس گپتا رضا کی تحریروں میں۔ ف ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء، یہی کالی داس گپتا نے لکھا ("منشوراتِ جوش ملسیانی"، بمبئی، ۱۹۷۷ء، ص ۶)

Scanned by CamScanner

تیئیسواں باب "جدید اردو شاعری" ہے۔ اُن کے اس بیان سے میرے علم میں اضافہ ہوا کہ انجمنِ پنجاب لاہور کے مبینہ مشاعرے بے شک انجمنِ پنجاب کے مکان میں منعقد ہوتے تھے، لیکن ان کا انعقاد محکمۂ تعلیم، حکومتِ پنجاب کرتا تھا (ص ۶۲۸)۔ لکھتے ہیں کہ ان مشاعروں کے خلاف طوفان اٹھنے پر ۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء کو یہ بند کر دیے گئے۔ اس سلسلے میں آزاد، حالی سے ناراض ہو گئے (ص ۶۳۰)۔ حالی پر بہت اچھا لکھا ہے۔ اکبر الہ آبادی کو ۱۷ صفحے دیے ہیں اور ان پر تنقید بھی اچھی ہے۔ ان کی تاریخِ ولادت اکتوبر ۱۸۴۵ء، شوال ۱۲۶۱ھ درج کی ہے (ص ۶۴۴)۔ مالک رام نے "بزمِ اکبر" کے حوالے سے ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ/ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء درج کی ہے۔

اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے اجداد نے پندرھویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کیا تھا (ص ۶۶۸)۔ میرا خیال ہے کہ یہ محض قیاس ہے۔ کون جانے کس صدی میں کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

> پٹنے میں ایک متنازعہ لفظ کے بارے میں رائے دینے کے لیے اقبال کو ایک ہزار روپیہ روزانہ پر بلایا گیا۔ دو ماہ ٹھہر سکتے تھے لیکن وہ دوسرے دن ہی اپنا بیان دے کر واپس آ گئے۔
>
> (ص ۶۷۱)

اس واقعے کو جگن ناتھ آزاد نے تفصیل سے لکھا ہے (۷)۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایک وکیل کو ایک لفظ کے معنی بتانے کے لیے ایک ہزار روپے روزانہ دیے جائیں، اسے دو مہینے تک رہنے کی آزادی ہو اور وہ ایک ہی دن میں واپس آ جائے۔ تارا چرن رستوگی بھی اس بات کو غیر مصدقہ مانتے ہیں۔

ص ۷۰۴ پر خوشی محمد ناظر کی تاریخِ ولادت اگست ۱۸۶۹ء لکھی ہے۔ مالک رام نے ۱۸۷۲ء/ ۱۲۸۹ھ لکھی ہے۔ سیماب کی ولادت جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۵۲ء درج کی ہے (ص ۷۰۷)۔ یہ ہجری ماہ و سال ۱۸۸۲ء میں پڑتا ہے، جسے سہوِ کتابت سے ۱۸۵۲ء لکھ دیا گیا ہے۔ خود سیماب نے اپنے مجموعے "کلیم عجم" میں تاریخ "جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ بروز شنبہ ۱۸۸۰ء" قلم بند کی ہے (آگرہ، جولائی ۱۹۴۷ء، ص ۲۱)۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی عیسوی سنہ غلط ہے، ۱۸۸۲ء چاہیے۔ زرینہ ثانی نے ایک قلمی بیاض میں سیماب کی پیدائش کا مہینہ رجب ۱۲۹۹ھ پایا (۸)۔ مالک رام نے اور قطعی طور پر ۱۸ رجب ۱۲۹۹ھ/ ۵ جون ۱۸۸۲ء لکھی ہے۔ اختر نے مولانا ظفر علی خاں کا سنہ پیدائش ۱۸۷۰ء/ ۱۲۹۰ھ لکھا ہے (ص ۷۱۸)۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہجری سنہ کے ساتھ عیسوی سنہ کی مطابقت طے کرنے میں مصنف زیادہ

Scanned by CamScanner

غیر محتاط ہیں کہ ان کا کاتب۔ ۱۸۷۰ء مطابق ہے ۸۷-۱۲۸۶ھ کے۔ "نقوش"، لاہور نمبر کے مطابق ۱۸۷۳ء ہے (ص ۹۳۵)۔ مالک رام نے بھی ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ لکھا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر اختر نے بھی ۱۸۷۳ء لکھا ہو جسے کاتب نے ۱۸۷۰ء لکھ دیا۔

اس باب میں جوش ملیح آبادی پر اچھا لکھا ہے۔

تیسرا دور حصۂ نثر ۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۶ء ہے۔ اس میں یہ اطلاع ہے کہ محسن الملک پہلے شیعہ تھے، بعد میں سُنی ہو گئے (ص ۷۷۴)۔ یہ بیان بالکل صحیح ہے۔ اس کی تصدیق محسن الملک کی کتاب "آیاتِ بیّنات" سے ہوتی ہے۔ اختر نے وقار الملک کا سنہ ولادت ۱۸۳۹ء، مولد امروہہ لکھا ہے (ص ۷۷۵)۔ ظاہراً یہ حامد حسن قادری کی کتاب سے لیا ہے، لیکن مالک رام نے وقار الملک کی سوانح "وقارِ حیات" سے لے کر ان کا مولد سراوہ، ضلع میرٹھ اور تاریخِ ولادت ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ/۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء لکھی ہے، تاریخی نام چراغ احمد جس سے واقعی ۱۲۵۷ھ بر آمد ہوتا ہے۔ اس طرح ۱۸۳۹ء صریحاً غلط ہے۔ حسن اختر نے ص ۷۷۷ پر سیّد احمد بریلوی کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مراد سیّد احمد دہلوی ہے جنھیں سہواً بریلوی لکھ دیا ہے۔ سیّد احمد بریلوی دراصل سیّد احمد شہید رائے بریلوی تھے، جو وہابی تحریک کے رہ نما تھے۔

پچیسواں باب "رومانوی تحریک" ہے۔ رومان سے صفت نسبتی "رومانی" بننا چاہیے، اس میں واو کہاں سے آ گیا۔ یہ بدعت ڈاکٹر محمد حسن کی ہے جس کی تقلید میں بہت سے لوگ، غور کیے بغیر "رومانوی" لکھ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر نے مہدی افادی کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء لکھا ہے (ص ۸۰۱) لیکن مہدی کے محقق ڈاکٹر فیروز احمد نے بعض عدالتی دستاویزوں کی بنیاد پر طے کیا کہ وہ مارچ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے تھے ("مہدی افادی"، گورکھپور، ۱۹۸۵ء، ص ۵۴)۔ ص ۸۰۳ پر قاضی عبدالغفار کا سنہ ولادت ۱۸۸۸ء لکھتے ہیں۔ بنارس یونی ورسٹی کی ایک محقق سنجیدہ خاتون کے غیر مطبوعہ مقالے کے مطابق ۱۸۸۵ء صحیح ہے۔

چھبیسواں باب "ناول اور افسانہ" ہے۔ مجھے اس کی بعض تاریخوں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "حیات النذیر" کے مصنف نے نذیر احمد کی ولادت ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء لکھی ہے لیکن یہ صحیح نہیں، ۱۸۳۰ء صحیح ہو سکتی ہے (ص ۸۱۲)۔ نذیر احمد کے مقالہ نگار ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی نے ایک دوسرے محقق افتخار احمد صدیقی کی تقلید میں ۱۸۳۱ء مقرر کی ہے (۹)۔ جس کو ۱۸۳۰ء پر ترجیح دی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر اختر نے نذیر احمد کی وفات کی تاریخ ۳ مئی ۱۹۰۲ء لکھی ہے (ص ۸۱۲)۔ ۱۹۰۲ء سہو کتابت ہو سکتا ہے، ۱۹۱۲ء کے لیے۔ اشفاق اعظمی نے وفات کی تاریخ ۳ اور ۴ مئی ۱۹۱۲ء کی درمیانی شب قرار دی ہے (ص ۳۲)۔

Scanned by CamScanner

معلوم نہیں کیوں شوق قدوائی کو ناول اور افسانے کے باب میں جگہ دی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "فیضانِ شوق" میں شوق قدوائی کی پیدائش ۱۸۸۹ء میں دکھائی ہے، لیکن یہ تاریخ غلط ہے (ص۸۲۹)۔ ڈاکٹر ابواللیث نے "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" طبعِ اوّل ص ۴۱۵ پر "فیضانِ شوق" ہی کے حوالے سے ۱۸۸۲ء لکھ کر اسے مشتبہ قرار دیا۔ طبعِ دوم ص۶۰۸ پر پھر یہی تاریخ لکھ دی ہے جو صریحاً اتنی لچر ہے کہ اسے متن میں درج ہی نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ ۱۸۸۷ء میں ان کی مشہور مثنوی "ترانۂ شوق" چھپ چکی تھی۔ "خمخانۂ جاوید" جلد پنجم میں ان کا سنہ ولادت ۱۸۵۲ء درج ہے۔ مرزا رسوا کی ۱۴۱ کتابوں کی فہرست دی ہے جو میری توقع سے کہیں زیادہ طویل ہے۔ ظاہراً ان کا ماخذ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری کی کتاب "رسوا کی ناول نگاری" ہونا چاہیے کیونکہ رسوا کی تاریخِ ولادت اسی کتاب سے لی ہے۔ علی عباس حسینی کی پیدائش ۷ فروری ۱۸۹۷ء کو لکھی ہے (ص۶۸۴)۔ مالک رام کے مطابق ۲۹ شعبان ۱۳۱۴ھ/۳ فروری ۱۸۹۷ء ہے۔

ستائیسواں باب "طنز و مزاح" ہے۔ اس میں رشید احمد صدیقی کی تصانیف میں "گریاں" "پیامِ اقبال" اور "اردو شاعری پر ایک نظر" بھی شامل کی ہیں (ص۸۷۲)۔ ہم رشید صاحب کے مضمون اور کتاب "خنداں" سے تو واقف ہیں "گریاں" سے نہیں۔ "پیامِ اقبال" ان کی کوئی کتاب نہیں، ایک مضمون ہے جو رسالہ سہیل میں دو قسطوں میں جنوری اور اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا (۱۰)۔ "اردو شاعری پر ایک نظر" کلیم الدین احمد کی مشہور کتاب ہے۔ ۱۹۲۷ء میں رشید صاحب نے باقیاتِ فانی پر مقدمہ "سرود بستاں" کے عنوان سے لکھا تو اس کا پہلا باب "اردو شعر و شاعری پر ایک نظر" کے عنوان سے تھا (معین الرحمان ص۴۰)۔ باقیاتِ فانی کا جو ایڈیشن مکتبۂ شاہراہ دہلی سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، اس میں مقدمے کا عنوان "اردو شاعری پر ایک نظر" تھا (اصغر عباس: رشید احمد صدیقی، ص۴۰۰)۔ یہ ہے حقیقت رشید صاحب کی مبینہ کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" کی۔

اس باب کا دوسرا حصہ "اردو ڈراما" ہے۔ اس میں آغا حشر پر مفصل لکھا ہے۔ باب ۲۷ سے آخری باب ۳۴ تک کے سنین جدولِ آخر میں دوں گا۔

اٹھائیسویں باب کا عنوان "تنقید و تحقیق" ہے۔ اس باب میں جن نقادوں کا ذکر ہے ان میں سے اکثر ۱۹۳۶ء کے بعد بھی زندہ رہے مگر ان کی تنقید کا مزاج اس سے پہلے ہی متعین ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کی مشہور کتاب کا نام "اردو زبان کی ترقی میں اولیائے کرام کا حصہ" لکھا ہے (ص۹۰۳) صحیح نام ہے۔ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"۔ ص۹۱۶ پر محمود شیرانی کی ایک کتاب کا نام "تنقیدِ آبِ حیات" لکھا ہے۔ یہ ان کی

Scanned by CamScanner

کوئی مستقل کتاب نہیں۔ ایک مضمون تھا جس کی تین قسطیں اورینٹل کالج میگزین لاہور میں اگست ۱۹۴۱ء، نومبر ۱۹۴۱ء اور فروری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئیں۔ ابھی یہ سلسلہ میر ضاحک تک پہنچا تھا کہ آزاد کے پوتے آغا محمد باقر کی آزردگی کی وجہ سے بند کردیا گیا۔ شیرانی کی کتابوں میں "مجموعۂ نغز از قدرت الٰہی قاسم" کو بھی شامل کیا ہے۔ اس تذکرے کے مصنف کا نام قدرت اللہ قاسم تھا۔ شیرانی کو اس کتاب کا مصنف قرار دینے کے بجائے اس کا مرتب کہنا چاہیے تھا۔ شیرانی کی تصانیف میں مقالاتِ شیرانی کی چار جلدیں لکھی ہیں گو یہ کم از کم سات ہیں۔ ان کی اہم کتاب "نصاب الصبیاں" (خالق باری) کا نام نہیں دیا۔

نصیر الدین ہاشمی کی جملہ اہم کتابوں کا ذکر نہیں اور جن کا ہے ان میں سے کم از کم ذیل کے نام غلط لکھے ہیں۔

غلط	صحیح
دکنی ہندی اور اردو	دکھنی ہندو اور اردو
دکھن کے چند تحقیقی مضامین	دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین
حیدر آباد کی تمدنی اور سیاسی سماجی تاریخ	آج کا حیدر آباد۔ ۲ دکنی کلچر (معلوم نہیں اختر کی مراد کون سی کتاب ہے)

مصنف نے نصیر الدین ہاشمی مرحوم کے بارے میں ایک نہایت نازیبا بات لکھ ماری ہے کہ وہ طوائف پرستی کرتے تھے اور انھیں عورتوں کی ذات سے ہمیشہ دلچسپی تھی (ص ۹۱۹)۔ میں ہاشمی مرحوم سے ملا ہوں، ان کی زندگی میں ان کے مشہور معاصرین سے بھی ملاقات ہوئی ہے، بعد میں ۱۱ سال حیدر آباد میں قیام کرچکا ہوں، میں نے کبھی اس مرحوم کے بارے میں یہ الزام نہیں سُنا۔ ڈاکٹر اختر نے حامد حسن قادری کی ایک کتاب کا نام "شاہکارِ انیس" لکھا ہے (ص ۹۲۰)۔ اس نام کی کتاب کے مؤلف مسعود حسن رضوی ہیں نہ کہ حامد حسن قادری۔ عبدالقوی دسنوی کا اشاریہ انیس نما ملاحظہ ہو۔ حسن اختر کی غلط فہمی کا ماخذ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان جلد پنجم ص ۱۹۷ میں حامد حسن قادری کا مختصر بیان ہے جس میں شمس الدین صدیقی نے ان کی کتابوں میں "شاہکارِ انیس" کو بھی شامل کردیا ہے۔ پوری تاریخِ ادبیات مسلمانان کے اشاریے، جلد ۱۵ میں ص ۳۰۶ پر "شاہکارِ انیس" از حامد حسن قادری کے حوالے کی نشان دہی کی ہے جلد سوم ص ۳۱۰ پر۔ تاریخ ادبیات کی اس جلد اور صفحے پر مسعود حسن رضوی کے "شاہکارِ انیس" ہی کا حوالہ ہے۔ معلوم نہیں شمس صدیقی کو کیوں غلط فہمی ہوئی۔

Scanned by CamScanner

چوتھا دور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۷۷ء کے بارے میں ہے۔ اس دور کا انتیسواں باب سیاسی اور سماجی پس منظر کا ہے جس میں پاکستان کی صورت حال پیش کی ہے۔ تیسواں باب شاعری سے متعلق ہے۔ اس کے تین حصے ہیں: پہلے میں ترقی پسند شعرا، دوسرے میں ابہام والے، تیسرے میں وہ شعرا جو پہلے اور دوسرے حصے میں شامل نہیں کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ ابہام والے سے مراد جدیدیت کے شعرا ہیں۔ اُن کے لیے "ابہام والے" جامع و مانع اصطلاح نہیں۔ اس باب میں فیض، مجاز، احمد ندیم قاسمی، ن۔ م۔ راشد اور میراجی پر بہت اچھا لکھا ہے بالخصوص تنقیدی جائزہ قابلِ قدر ہے۔

تیسرے حصے کے شاعر حفیظ جالندھری کے لیے لکھا ہے کہ ان میں بہ یک وقت اقبال اور عظمت اللہ خاں کی روایت یکجا ملتی ہے (ص ۱۰۰۸)۔ مزید لکھتے ہیں کہ اختر شیرانی اپنے والد کی نسبت سے شیرانی کہلائے (ص ۱۰۱۸)۔ یہ غلط ہے۔ والد کی نسبت سے محمودی کہلائے جاتے۔ بقول عبدالمجید سالک، شیرانی، سرحدی پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے (پنجاب میں اردو کا دیباچہ۔ لکھنؤ ۱۹۸۱ء)۔ آنند نراین ملا کے لیے لکھا ہے کہ ملا ان کا تخلص تھا (۱۰۲۲)۔ یہ صحیح نہیں۔ ملا کشمیریوں کے ایک فرقے کا نام ہے جسے آنند نراین ملا نے تخلص کے طور پر بھی استعمال کیا جیسے برج نراین چکبست نے چکبست کو۔

میرے لیے یہ اطلاع بالکل نئی ہے کہ ۲۹ مئی ۱۹۳۹ء کو احسان دانش کی صدارت میں "بزمِ افسانہ گویاں" قائم ہوئی۔ اسی سال اس کا نام بدل کر حلقۂ اربابِ ذوق رکھ دیا گیا۔ ایک مضمون سے معلوم ہوا کہ ۱۹۳۹ء میں لاہور میں حفیظ ہوشیارپوری، شیر محمد اختر، تابش صدیقی اور محمد افضل نے "انجمنِ داستاں گویاں" قائم کی۔ اکتوبر ۳۹ء میں حفیظ ہوشیارپوری نے تجویز رکھی کہ اس کے اجلاس میں افسانوں کے علاوہ شاعری پر بھی تنقید ہونی چاہیے۔ اس کے لیے اس کا نام بدل کر حلقۂ اربابِ ذوق کر دیا گیا (۱۱)۔

ساغر نظامی کو ص ۳۹-۱۰۳۸ کے فٹ نوٹ میں جگہ دی ہے جو مناسب نہیں۔ میں اس طریق کا بھی قائل نہیں کہ جن ادیبوں کو کم اہم سمجھا جائے ان کا احوال حاشیے میں ہو۔ حاشیے کا یہ صحیح مصرف نہیں۔

۳۱واں باب "ناول اور افسانہ" ہے۔ اس میں منٹو پر چھ صفحے لکھے ہیں جو مناسب ہے لیکن کرشن چندر پر محض ڈیڑھ صفحہ ہے جو کم ہے۔ کرشن چندر کا مولد گوجرانوالہ لکھا ہے (ص ۱۰۷۰)۔ مختلف حضرات کی تحریروں میں یہ کہیں گوجرانوالہ، کہیں وزیر آباد اور کہیں پونچھ ملتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا کے مجموعۂ مضامین "سود سراغ" کے مرتب صابر دت لکھتے ہیں کہ وہ جب فن و شخصیت کا سندر ناتھ نمبر نکالنا چاہتے تھے تو اس کا پروفسر کرشن چندر کو

Scanned by CamScanner

دکھایا۔ کرشن چندر نے اس میں ان کی جائے پیدائش بھرت پور سے کاٹ کر پونچھ کردی۔ ضابروت مہندر ناتھ سے ملے اور مولد کے بارے میں پوچھا تو مہندر نے کہا... "ویسے ہم دونوں بھائی تو بھرت پور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ اب اگر بھائی صاحب کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، پونچھ ہی رہنے دو" (سہو سراغ، بمبئی ۱۹۸۰ء مقدمہ ص ۸)۔ کرشن چندر پیدا ہوئے بھرت پور میں، رومانی رنگ دینے کے لیے پونچھ کہنے لگے۔ واضح ہو کہ پونچھ وادیِ کشمیر میں نہیں، یہ جموں ڈویژن کا قصبہ ہے جہاں کی زبان کشمیری نہیں۔

اختر نے راجندر سنگھ بیدی کی تصانیف میں محض دانہ ودام، گرہن، بے جان چیزیں اور کمینی درج کی ہیں (ص ۱۰۷۸)۔ بے جان چیزیں اور کمینی نام کی بیدی کی کوئی کتابیں نہیں، کسی افسانے یا ڈرامے کے نام ہوں تو مجھے معلوم نہیں۔ اختر نے بیدی کی مشہور تصانیف "ایک چادر میلی سی" "اپنے دکھ مجھے دے دو" "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" کا ذکر نہیں کیا۔

خواجہ احمد عباس کے لیے لکھتے ہیں "عباس کے طنز میں سطحیت اور عامیانہ پن ہے، مخالفین پر اعتراض کرتے ہوئے نہایت پست سطح پر اتر آتے ہیں" (ص ۱۰۸۴)۔ عباس پر یہ اعتراض کسی اور نے نہیں کیا۔ غالباً حسن اختر خواجہ عباس کے سیکولرازم، مسلم لیگ، قائداعظم جناح صاحب، پردے اور مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی مخالفت کی وجہ سے ناخوش ہیں۔

۲۳واں باب "تنقید و تحقیق" ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور کی سوانح میں لکھا ہے کہ وہ علی گڑھ کی لیکچرر شپ کے بعد لکھنؤ میں ریڈر ہوگئے اور ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ میں پروفیسر ہوگئے (ص ۱۱۲۰)۔ اس بیان میں دو غلطیاں ہیں۔ سرور صاحب علی گڑھ کی لیکچرر شپ کے بعد رضا انٹر کالج رام پور کے پرنسپل ہوئے اور وہاں سے لکھنؤ گئے۔ علی گڑھ میں ان کی پروفیسری کے آغاز کی تاریخ یکم دسمبر ۱۹۵۵ء ہے، ۱۹۵۰ء نہیں۔ دیکھیے ان کی خود نوشت "خواب باقی ہیں" ص ۱۱۳۳ پر شوکت سہروردی کا ذکر ہے جو ظاہر ہے شوکت سبزواری ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کی ایک کتاب کا نام "اردو شاعری کا تمدنی پس منظر" لکھا ہے، صحیح سماجی پس منظر ہے۔ ان کی دو کتابوں کے نام "اکبر الہ آبادی" اور "اردو ادب کا ارتقا" لکھے ہیں (ص ۱۱۴۷)۔ ادیبوں کی کتابوں کے نام لکھنے میں حسن اختر کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے کہ جو جی چاہے لکھ دیں۔ اکبر الہ آبادی اعجاز حسین کی کوئی کتاب نہیں۔ ان کے مجموعے "ادبی ڈرامے" میں ایک ڈراما ہے (۱۲)۔ "اکبر الہ آبادی" کے نام سے طالب

الہ آبادی نے ایک اچھی کتاب لکھی ہے۔ اعجاز صاحب سے منسوب "اردو ادب کا ارتقا" ان کی "مختصر تاریخِ ادب اردو" یا "اردو ادب آزادی کے بعد" کی ترتیب ہو سکتی ہے۔ اس باب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ذیل کے نقاد بھی تنقید کی دنیا میں معروف ہیں (ص ۱۱۵۲)۔ ان میں چند نام یہ ہیں۔

غلام مصطفےٰ خاں، جمیل جالبی، گوپی چند نارنگ، عنوان چشتی، گیان چند، پروفیسر محمد عثمان، خواجہ احمد فاروقی، امتیاز علی عرشی، قمر رئیس، جگن ناتھ آزاد۔

ان میں سے کئی نام ایسے ہیں جو تنقید میں نہیں، تحقیق میں نامور ہیں مثلاً غلام مصطفےٰ خاں، خواجہ احمد فاروقی، امتیاز علی عرشی۔ کئی عمائد کے نام ایسے ہیں جو ۱۹۷۰ء میں بھی ایک علاحدہ مضمون کے شایاں تھے، فہرست میں محض نام کے طور پر نہیں۔ پروفیسر محمد عثمان کی شخصیت کو میں شناخت نہیں کر سکتا۔ اس نام کے ایک صاحب بریلی کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ حسن اختر نے پاکستان کے کسی مجہول الاسم پروفیسر کے بارے میں لکھا ہوگا۔

۳۳واں باب "طنز و مزاح" ہے۔ اس میں مجید لاہوری پر اچھا لکھا ہے۔ اس باب کا دوسرا حصہ خاکہ نگاری کے بارے میں ہے۔ آخری باب نمبر ۳۴ کے تین چار حصے ہیں: الف: ڈراما۔ ب: صحافت۔ ج: متفرقات اور آخری عنوان "سفرنامہ" ہے جو ایک صفحے سے بھی کم کا ہے۔ ڈراما نگاروں میں ایک نام "خادم محی الدین" کا ہے جو ہندوستان میں کبھی نہیں سنا گیا گو تاریخِ ادبیات مسلمانان جلد ۹ بجم اردو میں ان کا ذکر ص ۳۴۔ ۵۲۳ پر ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ اپندر ناتھ اشک کا اصل نام مادھو رام ہے (ص ۱۱۹۹)۔ حد ہو گئی، یہ اشک کے والد کا نام ہے۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے لیے لکھتے ہیں کہ ان کا انتقال نیویارک میں ہوا جب کہ مالک رام نے بفیلو (امریکہ) میں لکھا ہے۔

متفرقات میں ص ۱۲۰۴ پر شورش کاشمیری کا مولد امرتسر لکھا ہے جب کہ مالک رام نے لاہور درج کیا ہے۔ "سفرنامہ" کا ایک صفحے سے کم کا بیان لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔ باب کے آخر میں اس دور کی نمایاں خصوصیات سوا یا ڈیڑھ صفحے پر دی ہیں اور اس کے بعد کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ پوری کتاب کے لیے بھی کوئی جامع خاتمہ لکھنا چاہیے تھا۔

اب باب ۲۷ تا ۳۴ کے سنین کا تقابلی جائزہ پیش کرتا ہوں۔

Scanned by CamScanner

ملک حسن اختر	دوسرے مورخین
ص۸۶۶ فرحت اللہ بیگ پ ۱۸۸۴ء	مالک رام: ستمبر ۱۸۸۳ء
ص۸۷۲ رشید احمد صدیقی ف ۱۶ جنوری ۱۹۷۷ء	مالک رام: ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء۔ یہی معین الرحمان ص۳۰۰ و اصغر عباس ص ۱۱
ص۸۷۴ فلک پیما پ ۱۸۸۵ء ف ۱۹۵۷ء	مالک رام: پ جنوری ۱۸۸۱ء۔ ف ۷ مئی ۱۹۵۱ء (تذکرہ ص ۲۶۴۔ یہی نقوش لاہور نمبر ص ۹۳۸ پر، فوت بہ عمر ۷۲ سال)
ص۸۷۵ ملا رموزی پ ۲۷ مئی ۱۸۹۶ء	سنجیدہ خاتون: ۳۱ مئی ۱۸۹۶ء
ص۸۸۶ نراین پرشاد بیتاب پ ۱۹۲۹ بکری	مالک رام: یکم مارگ برش ۱۹۲۹ بکری/ ۳۱ اگست ۱۸۷۱ء
ص۸۹۵ تاج: انار کلی شائع ۱۹۳۴ء	عشرت رحمانی: ۱۹۳۲ء (تاریخِ مسلمانان پنجم ص ۵۱۵)
ص۹۰۱ حکیم احمد شجاع پ ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۲ء (۱۳۱۲ھ برابر ہے ۹۵-۱۸۹۴ء کے)	ڈاکٹر اے بی اشرف: پ ۷ اکتوبر ۱۸۹۳ء/ ۲۶ ربیع الاول ۱۳۱۱ھ (حکیم احمد شجاع کتابیات۔ اسلام آباد ۱۹۸۷ء)
ص۹۰۳ مولوی عبدالحق پ ۱۸۷۱ء	مالک رام: ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء
ص۹۱۲ عبدالماجد پ شعبان ۱۳۱۰ھ/ مارچ ۱۸۹۲ء (شعبان ۱۳۱۰ھ برابر ہے فروری، مارچ ۱۸۹۳ء کے)	مالک رام: شعبان ۱۳۰۹ھ/ وسط مارچ ۱۸۹۲ء۔ عبدالماجد کی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ۱۶ مارچ ۱۸۹۳ء ۱۶ شعبان ۱۳۱۰ھ کو پیدا ہوئے۔ مارچ اور شعبان دونوں کی ۱۶ تاریخ تھی (آپ بیتی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۸ء لکھنؤ ص ۵۹) لیکن ۱۶ شعبان ۱۳۱۰ھ برابر ہے ۵ مارچ ۱۸۹۳ء کے۔ ہجری تاریخ کو صحیح مان کر آخرالذکر ۵ مارچ ۱۸۹۳ء صحیح ترین۔
ص۹۱۹ قاضی عبدالودود ۱۸۹۲ء کے لگ بھگ پیدا	مالک رام: ۲۵ ذی قعدہ ۱۳۱۳ھ/ ۸ مئی ۱۸۹۶ء نیز سپاس نامہ میں جو ۱۹۸۳ء میں قاضی صاحب کو پیش کیا گیا (غالب نامہ، قاضی عبدالودود نمبر دہلی جنوری ۸۷ء، ص ۲۵۲)

Scanned by CamScanner

ص ۶۳۰ غلام رسول مہر پ ۱۵ اپریل ۱۸۹۵ء	مالک رام: ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء
ص ۹۴۵ سجاد ظہیر پ ۱۹۰۵ء	مالک رام: ۵ نومبر ۱۹۰۴ء
ص ۹۸۳ مخدوم محی الدین پ ۱۹۱۰ء	مالک رام: ۴ فروری ۱۹۰۸ء، یکم محرم ۱۳۲۶ھ (نیز دلاور افسر: مخدوم ایک مطالعہ، حیدر آباد ۱۹۶۷ء، ص ۱۰)
ص ۹۸۵ ساحر: پ غالباً ۱۹۲۲ء	مالک رام: ۸ مارچ ۱۹۲۱ء۔ یہی ناز صدیقی: ساحر، شخص اور شاعر حیدر آباد ۱۹۷۸ء، ص ۱۳
ص ۹۹۱ ن۔م۔ راشد ف ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء	مالک رام: ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء
ص ۱۰۰۱ مختار صدیقی پ ۱۹۱۹ء	مالک رام: یکم مارچ ۱۹۱۷ء
ص ۱۰۱۷ حامد اللہ افسر پ ۱۸۹۸ء	مالک رام: ۲۹ نومبر ۱۸۹۵ء
ص ۱۰۲۱ غلام مصطفےٰ تبسم ف ۷ فروری ۱۹۷۹ء	مالک رام: ۷ فروری ۱۹۷۸ء۔ مصرع ہائے تاریخ سے بھی ۱۹۷۸ء/ ۱۳۹۸ھ بر آمد
ص ۱۰۲۶ احسان دانش پ ۱۹۱۴ء	مالک رام: ۱۹۱۱ء
ص ۱۰۳۳ ناصر کاظمی ف ۲ مارچ ۱۹۷۴ء	مالک رام: ۴ مارچ ۱۹۷۴ء
ص ۱۰۵۲ احمد فراز پ کوہاٹ ۱۹۳۱ء	مالک رام: پشاور ۱۲ جنوری ۱۹۳۰ء
ص ۱۰۷۰ کرشن چندر پ ۱۹۱۲ء	ڈاکٹر بیگ احساس: ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء (غیر مطبوعہ مقالہ)۔ یہی ڈاکٹر عقیل: اعجاز صاحب کی مختصر تاریخ ۶۷۳
ص ۱۰۷۴ قرۃ العین حیدر ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء (یا ممکن ہے ۱۹۳۰ء لکھا ہو۔ طباعت واضح نہیں)	مالک رام: ۱۸ فروری ۱۹۲۷ء۔ یہی ڈاکٹر عقیل بھی ۱۹۲۷ء اعجاز صاحب کی تاریخ میں۔ لیکن رسالہ ایوانِ اردو نومبر ۱۹۹۴ء، ص ۲ کے مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء جو صحیح معلوم ہوتی ہے
ص ۱۰۷۶ عزیز احمد پ ۱۹۱۸ء	مالک رام: ۱۹۱۴ء۔ یہی عقیل نے ص ۴۰۹ پر
ص ۱۰۸۲ خواجہ احمد عباس پ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ	مالک رام: ۷ جون ۱۹۱۴ء
ص ۱۱۲۰ آلِ احمد سرور پ ۱۹۱۲ء	خلیق انجم: ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء (پروفیسر آلِ احمد سرور، شخصیت اور ادبی خدمات، دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۸۷) یہی سرور صاحب نے مجھ سے کہا

ص ۱۱۲۲ احتشام حسین ف ۱۹۷۳ء پڑھا جاتا ہے	صحیح ۱۹۷۲ء
ص ۱۱۲۵ عندلیب شادانی پ سنبھل ۱۸۹۶ء	[مالک رام: رام پور ۱۸۹۷ء (عقیل: اصلی وطن سنبھل، ننھیال رام پور۔ ص ۴۸۴)
ص ۱۱۳۰ ڈاکٹر زور پ ۱۹۰۵ء	مالک رام دسمبر ۱۹۰۴ء
[ص ۱۱۳۸ وقار عظیم پ دسمبر ۱۹۳۰ء (ظاہرا سہو کتابت کیونکہ بی اے ۱۹۳۲ء میں پاس کرتے دکھایا ہے)	سنجیدہ خاتون: دسمبر ۱۹۱۰ء
ص ۱۱۴۰ شیخ اکرام پ ۱۹۰۷ء	مالک رام: ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء
[ص ۱۱۴۸ مالک رام پ مارچ ۱۹۰۱ء (بہ حوالہ نریش کمار شاد: مالک رام سے ایک ملاقات۔ چٹان مورخہ ۱۷/۶۵ یا ۱۹۶۶ء)	مالک رام: ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء
ص ۱۱۴۹ صلاح الدین احمد پ ۱۹۰۳ء	مالک رام: ۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء
[ص ۱۱۶۲ کنھیا لال کپور: پ کی دوسری روایت یکم نومبر ۱۹۱۱ء	[سرگزشت کے مطابق ایک روایت ۲۷ جون ۱۹۱۰ء اور دوسری یکم نومبر (عقیل، مختصر تاریخ ص ۴۶۶) اس کے معنی دوسری روایت یکم نومبر ۱۹۱۰ء کی ہے)
ص ۱۱۸۰ سید محمد جعفری پ ستمو ۱۹۱۱ء	[مالک رام: پ بھرسر (بھرت پور) ۲۷ دسمبر ۱۹۰۷ء
ص ۱۱۹۴ ڈاکٹر عابد حسین پ ۱۸۶۹ء	مالک رام: ۱۸۹۶ء
ص ۱۱۹۵ انتظار حسین پ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۲ء	مالک رام: دسمبر ۱۹۲۵ء۔ حوالہ تخلیقی ادب
ص ۱۲۰۳ ممتاز شیریں پ ۱۹۲۵ء	مالک رام: ۱۹۲۴ء

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تاریخ دیکھ کر مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی تحقیقی تاریخ نہیں۔ علی گڑھ تاریخ یا جمیل جالبی کی تاریخ کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنفین نے ذاتی تحقیق سے کام لیا ہے۔ حسن اختر کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے چند ادبی تاریخیں اور چند کتابیں سامنے رکھ کر ایک مجموعہ تیار کیا ہے۔ قدیم مخطوطات یا قدیم کتب کو براہ راست نہیں دیکھا۔ سنین کے معاملے میں اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ ادیبوں کی کتابوں کے نام لکھنے میں انھوں نے جس لاپروائی سے کام لیا ہے، اسے دیکھ کر جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ غیر مصدقہ اور ضعیف روایات کو پرکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

Scanned by CamScanner

دراصل اب اردو ادب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اگر اسے ایک جلد کی تاریخ میں سمایا جائے تو بیشتر اہلِ قلم اور اصناف کے بیان تشنہ اور سرسری ہوں گے۔ یہی کیفیت حسن اختر کی تاریخ کی ہے۔ تنقید کی حد تک یہ ضرور قابلِ قدر ہے۔ ایک بات تسلیم کرنی ہو گی کہ ایک جلد کی ادبی تاریخوں میں یہ جتنی زیادہ جامع ہے اتنی اردو کی کوئی دوسری تاریخ نہیں۔ ہندوستان میں یہ جس طرح سوفی صدی غیر معروف رہی ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ قارئین سلیم اختر کی مختصر ترین تاریخ کو تو جانتے ہیں، ملک حسن اختر یا ان کی کتاب سے کوئی بھی واقف نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اپنے دیس میں اس کی کیسی پذیرائی ہوئی۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر سید معین الرحمان: یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق، لاہور ۱۹۸۹ء، ص۱۷۹

(۲) اسپرنگر کی کتاب ڈاکٹر نیر مسعود کے پاس ہے۔ مندرجہ بالا تفصیلات انہیں سے ملیں جس کے لیے مشکور ہوں

(۳) ڈاکٹر محمد علی اثر، نظیر کے مختصر حالاتِ زندگی، مشمولہ نظیر شناسی، حیدر آباد ۱۹۸۷ء، ص۳۰۶

(۴) شطاری: قرآنِ مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، حیدر آباد ۱۹۸۲ء، ص۲۰۷-۲۰۶

(۵) امیر اللہ تسلیم، حیات اور شاعری۔ الہ آباد ۱۹۷۴ء، ص۱۸

(۶) جلیل مانک پوری "حیات اور کارنامے" لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ص۳۴

(۷) محمد اقبال، ایک ادبی سوانحِ حیات دہلی ۱۹۸۳ء، ص۱۰۲-۱۰۰

(۸) سیماب کی نظمیہ شاعری، بمبئی ۱۹۷۸ء، ص۳۸

(۹) نذیر احمد "شخصیت اور کارنامے" لکھنؤ ۱۹۷۴ء، ص۱۱

(۱۰) حوالہ ۱۔ ڈاکٹر سید معین الرحمان: آپ بیتی رشید احمد صدیقی۔ لاہور ۱۹۸۳ء، ص۴۴، ۲۔ اصغر عباس: رشید احمد صدیقی: آثار و اقدار۔ علی گڑھ ۱۹۸۴ء، ص۳۹۲

(۱۱) آفاق علی ہاشمی: "حلقہ اربابِ ذوق"۔ مشمولہ "علمی ادبی اور تعلیمی ادارے" ناشر گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی بابت ۷۴-۱۹۷۳ء۔ ص۳۲۱-۳۲۰

(۱۲) ڈاکٹر شتید علی حیدر: ڈاکٹر اعجاز حسین، حیات اور کارنامے، الہ آباد ۸۴-۱۹۸۳ء، ص۱۸۳

Scanned by CamScanner

انیسواں باب

ڈاکٹر محمد انصار اللہ: تاریخِ اقلیم ادب

ڈاکٹر انصار اللہ نظر اردو کے مشہور محقق ہیں۔ انھوں نے طالب علموں کے لیے ایک مختصر تاریخِ ادبِ اردو لکھنے کا ارادہ کیا۔ طلبہ کی ضرورتوں کے پیشِ نظر کئی تاریخیں لکھی جا چکی ہیں لیکن وہ سرسری ہیں اور ان میں تازہ ترین تحقیقات بھی نہیں۔ اس لیے انصار اللہ کو ایک نئی تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے اسے لکھ کر خود ہی چھپوایا لیکن دو حصّوں (یعنی جلدوں) کے بعد بددل ہو گئے اور اپنے کام کو بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔ انھوں نے اس کا تاریخی نام "تاریخِ اقلیم ادب" رکھا ہے جس کے اعداد ۱۳۹۹ھ ہیں۔ کتاب کا مقدمہ ۵ فروری ۱۹۷۹ء کو لکھا اور یہ تاریخ ۱۳۹۹ھ میں پڑتی ہے۔

کتاب کے سرورق پر اقلیم کے الف پر نمایاں طور سے فتحہ بنایا گیا ہے۔ صحیح املا اور تلفظ اِقلیم بہ کسرۂ الف ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اقلیم زبر سے کیوں لکھا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ عوامی تلفظ میں اسے زبر ہی سے بولا جاتا ہے، اس لیے میں نے وہی لکھا۔ میں اس توجیہ سے قائل نہیں ہوا۔ شاید اسی اعتراض کے پیشِ نظر انھوں نے دوسرے حصّے کے سرورق پر اِقلیم بہ کسرۂ الف لکھا ہے۔

کتاب چھوٹے سائز میں ہے۔ پہلا حصّہ ۱۹۷۹ء میں اور دوسرا ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ پہلے میں ۲۴۴ صفحے ہیں اور دوسرے میں ۳۰۰۔ دونوں حصّے باسانی ایک جلد میں آسکتے تھے لیکن مصنّف نے انھیں ایک ساتھ تیار نہیں کیا ہوگا۔ میں ان دونوں حصّوں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتا ہوں۔

پہلا حصّہ (فتح دکن ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۶ء تک):

نصابی ضرورتوں کے لیے جو تاریخیں پیشتر لکھی گئی تھیں اُن سے وہ اس لیے ناآسودہ ہیں کہ وہ تحقیقی اعتبار سے سرسری ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کو تحقیقی انداز سے لکھا ہے لیکن دوسری طرف وہ یہ کہتے ہیں:

> "یہ کتاب میں اپنے طالب علموں کے لیے لکھ رہا ہوں، ماخذ کے حوالے اور طولانی حواشی لکھ کر یا جگہ جگہ مختلف ناقدوں اور محققوں کی

Scanned by CamScanner

تحریروں سے اقتباسات نقل کر کے الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"
(ص ۶-۵)

اس حذر کی وجہ سے کتاب میں یہ بڑی کمی رہ گئی ہے کہ قسم کھا کر کہیں کسی بیان کا ماخذ نہیں دیا، کسی سے استفادے کا اعتراف نہیں کیا، کہیں کوئی فٹ نوٹ نہیں لکھا اور حد یہ ہے کہ پہلی جلد کے آخر میں کتابیات کی فہرست بھی نہیں دی۔ انھوں نے یہ غیر محققانہ وتیرہ بھی اپنایا ہے کہ ہجری سنہ کے متوازی محض ایک عیسوی سنہ دیا ہے، دو نہیں، جس سے عیسوی سنہ میں غلطی کا کافی امکان ہو جاتا ہے۔

کتاب کے خاکے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عام طور پر اردو ادب کے مورخوں نے تاریخ کو مراکز کے تعلق سے تقسیم کیا ہے لیکن اس سے ایک زمانے میں زبان و ادب کے مجموعی ارتقا کا علم نہیں ہوتا اس لیے انھوں نے پورے ملک کے زبان و ادب کو زمانی اعتبار سے تقسیم کیا ہے، یعنی آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی، نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی، دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی اور گیارھویں صدی ہجری/ سترھویں صدی عیسوی میں۔ ہر صدی کے تحت مختلف علاقوں کو لیا ہے۔ کتاب کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا، جو ایک کمی ہے۔

چونکہ یہ کتاب ظاہرا بی اے اور ایم اے کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے، اہلِ تحقیق کے لیے نہیں، اس لیے میں اس کا تفصیلی جائزہ نہ لوں گا، صرف تحقیقی اور تاریخی پہلو پر نظر کروں گا۔

ابتدا میں اردو کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ درست کہا ہے کہ اردو مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی عوامی گری پڑی بولی کی شکل میں موجود تھی، لیکن ان کے بعض لسانیاتی نظریات سے مجھے اختلاف ہے۔

۱۔ وہ اس پوری جلد میں بول چال کی زبان یا ہندوستانی کو ہندوی کہتے ہیں، اس لفظ کے شیدا معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ لسانیات کی کتابوں، بولی ایٹلس، لسانی جائزۂ ہند وغیرہ میں ہندوی نام کی کوئی زبان نہیں۔ فارسی میں لکھنے والوں نے ہندوستان کی زبانوں کو ہندوی کہا، محض ہندی یا ہندوستانی کو نہیں۔ خسرو نے جو مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کی ۱۲ زبانوں کے نام دے کر کہا:

این ہمہ ہندویست ز ایام کہن

ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال نے اپنے تحقیقی مقالے میں ایک عنوان قائم کیا ہے، "ہندوی

سے کیا مراد ہے،" اس میں دکھایا ہے کہ فرشتہ نے ایک جگہ سنسکرت کو ہندی کہا ہے۔ قلی قطب شاہ نے تیلگو کو ہندی کہا ہے، نیز فرشتہ نے مراٹھی کے لیے بھی ہندوی کا لفظ استعمال کیا ہے(۱)۔ اگلے زمانے کے مصنفین ایسی مبہم اصطلاح استعمال کرتے تھے لیکن بیسویں صدی میں کوئی شخص کسی زبان کو ہندوی کہہ کر پکارے تو وہ غیر لسانی استعمال ہوگا۔

۲۔ اس کتاب میں موقع بے موقع وہ اردو پر پوربی کے اثر دکھاتے ہیں۔ اپنی دوسری کتابوں میں انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو زبان دہلی میں نہیں، مشرقی یوپی میں پیدا ہوئی۔ ان کا ایک مضمون "پوربی (اودھی) یا اردو" مشمولہ "اردو ادب" (شمارہ نمبر ۲، ۱۹۷۲ء) قابلِ توجہ ہے۔ انھیں جہاں بھی موقع ملتا ہے، کسی طریقۂ اظہار کو پوربی سے جوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً ص ۱۱ پر "نکات الشعرا" میں خسرو سے منسوب قطعے کے مصرع میں ترمیم کردی ع:

کچھ گوٹیے سنوریے پکارا

سوال یہ ہے کہ جب کسی روایت میں یہ متن نہیں تو انھیں اس تحریف کا اختیار کیوں کر ہوا۔ آگے کہتے ہیں:

> "اس قدیم زمانے میں پوربیوں کی اتنی بڑی تعداد کے اثر سے لسانی اعتبار سے گویا دہلی بھی پوربیوں کا شہر ہو گیا تھا۔"
>
> (ص ۱۸)

محمود شیرانی کہیں یا انصار اللہ نظر، دہلی کی قدیم زبان کے نمونوں سے شہادت لائے بغیر دلی کی زبان میں پوربی غلبہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ سب سے زیادہ قابلِ اعتراض پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی پورب پسندی سے کشتہ ہو کر اودھی کے شعرا کو بھی اردو میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان کی زبان کو نام دیتے ہیں ہندوی۔ انھوں نے ملک محمد جائسی، کبیر، تلسی داس، ملا داؤد مصنف "چنداین،" شیخ عثمان مصنف "چتراولی" وغیرہ سب کو اردو کا شاعر کہا ہے۔ اگر تلسی داس اور کبیر اردو کے شاعر ہیں تو وہ اتنے عظیم ہیں کہ انھیں وجہی، ابنِ نشاطی اور نصرتی وغیرہ سے زیادہ جگہ دینی چاہیے۔ اگر اودھی کو اردو میں شامل کرتے ہیں تو برج، راجستھانی، بھوج پوری اور بندیلی وغیرہ کے شعرا کو کیوں نہیں۔ اس طرح اردو کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور وہ ہندی میں ضم ہو جائے گی اور ہندی کی ایک بولی یا شیلی (اسلوب) ہو کر رہ جائے گی۔ اردو نے صرف کھڑی بولی اور اس سے پیدا ہونے والی دکنی کو اپنایا ہے۔ دوسری بولیوں کو اپنے حصار میں نہیں لیا۔

Scanned by CamScanner

اب جزئیات پر مشاہدات:

ص۹ پر حضرت معین الدین چشتی کی وفات ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء میں دکھائی ہے۔ ہجری سنہ صحیح ہے، عیسوی سنہ غلط۔ ایک ہجری سنہ کے مطابق محض ایک عیسوی سنہ لکھنے کا بھی نقصان ہے۔ ۶۳۳ھ مطابق ہے ۳۶-۱۲۳۵ء کے۔ مالک رام نے تذکرۂ ماہ و سال میں خواجہ کی صحیح تاریخ وفات ۶ رجب ۶۳۳ھ (۱۶ مارچ ۱۲۳۶ء) دی ہے۔

ص۱۷ پر لکھتے ہیں کہ "ڑ" ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت میں بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنے مضمون "اردو کی ہکاری آوازیں اور حروف" میں سنسکرت کے کئی عالموں کے بیانات کو نقل کر کے دکھایا ہے کہ ویدک بھاشا اور سنسکرت میں یہ آواز کسی شکل میں موجود رہی ہوگی، پالی میں تو صریحاً آ گئی ("کھوج"، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۳۸-۳۴۷)۔ مصنف ص۲۰ پر لکھتے ہیں کہ ہندوی کی پہلی تصنیف جو ہمیں دستیاب ہو سکی ہے ملا داؤد کی "چنداین" ہے۔ ان کا عندیہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے اردو کی پہلی کتاب مانا جائے۔ یہ کتاب ۱۳۷۷ء کی ہے۔ اگر ہندی ادب کو بھی اردو میں شامل کیا جائے تو پرتھوی راج راسو، بیسل دیو راسو وغیرہ کو کیوں نہ لیا جائے۔ پچھلی ڈیڑھ صدی کی کھڑی بولی ہندی کی نظم و نثر تو اردو کے اور بھی مماثل ہے، اسے بھی اردو کہہ لیجیے اور اس طرح اردو ادب ہندی ادب کے سیلاب میں بہ جائے گا۔ ملا داؤد کے بعد ملا سادھن مصنف "مِیناست" کا ذکر کرتے ہیں۔ داؤد کی طرح یہ بھی اردو کے شاعر نہیں، اودھی کے ہیں۔ انصار اللہ اور علی جواد زیدی توسیع پسندی کے شوق میں اودھی شاہکاروں کو اردو کہنا چاہتے ہیں، لیکن برج، بندیلی، راجستھانی وغیرہ کو نہیں۔ آخر کیوں؟ کیا اردو اور ہندی ادب اپنی قواعد، شعریات اور تہذیبی پس منظر کے لحاظ سے ایک ہی ہیں؟

پندرھویں صدی عیسوی میں مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے مصنف نظامی، شیخ باجن، عبدالقدوس ردولوی اور کبیر کا ذکر کرتے ہیں۔ باجن کے مجموعے کا نام "خزاینِ رحمت" لکھتے ہیں (ص۲۷)۔ خود باجن نے اس کا نام "خزائنِ رحمت اللہ" لکھا ہے۔ عبدالقدوس گنگوہی کو وہ ان کے مولد کی نسبت سے عبدالقدوس ردولوی لکھتے ہیں۔ انھوں نے محمود شیرانی کے اس قول کو نہیں پرکھا جو انھوں نے گنگوہی کے لیے کہا تھا:

> ہندی کے بلند مرتبہ شاعر ہیں، الکھ داس تخلص کرتے تھے۔

("پنجاب میں اردو"، لکھنؤ ۱۹۸۱ء، ص۱۸۸)

ان کے بعد کبیر کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر کبیر کو اردو کا شاعر مانا جائے تو وہ اور دوسرے ہندی عمائد اردو ادب کی تاریخ پر چھا جائیں گے۔

Scanned by CamScanner

دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کے بیان میں لکھتے ہیں کہ ہندو اہلِ علم کی ہندوی میں ایسی کوئی کتاب نہیں ملی جو نویں صدی ہجری یا اس سے پہلے کی ہو (ص ۳۲)۔ خدا معلوم "ہندوی" کس زبان کا نام ہے۔ داؤد کی کتاب بھی کھڑی بولی میں نہیں۔ کھڑی بولی کے علاوہ دوسری بولیوں کو لیا جائے تو ہندوؤں نے ہندی میں متعدد تصانیف کی ہیں مثلاً مختلف راسو، بارھویں صدی عیسوی کے آخر کی "جگت سندری پریوگ مالا"، گیارھویں صدی کے آخر یا بارھویں صدی کے اوائل کی نثری کتاب "اُکتی ویکتی شاستر"۔

لکھتے ہیں:

محققین کا اس امر میں اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ جدید ہندوستانی بولیاں سولھویں صدی عیسوی (دسویں صدی ہجری) سے پہلے وجود پذیر نہیں ہوئی تھیں (ص ۳۲)۔ یہ درست نہیں۔ محققین اس پر متفق ہیں کہ جدید ہند آریائی گیارھویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی۔ گیارھویں اور بارھویں صدی کو عبوری زمانہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان صدیوں کی زبانوں میں جدید بولیوں میں اَپ بھرنش کا شدید اثر ہوتا تھا۔ تیرھویں صدی سے ہندی ادبیات کے باقاعدہ نمونے ملنے لگتے ہیں۔ ہندی ادب کی کسی بھی بڑی تاریخ میں دیکھ لیجیے۔

سولھویں صدی میں اردو کے سلسلے میں انصار اللہ سب سے پہلے گجرات کو لیتے ہیں۔ وہاں کی رائے کھیڑا کی مسجد کا یہ کتبہ نقل کرتے ہیں:

تاریخ اس مسیت کی ہوئی سو یوں مشہور
مسجد جاما بیچ بشھائیا یا نبی نور
۹۱۶ھ

(ص ۳۵)

مصنف نے دوسرے مصرع کے ہر لفظ کے نیچے ان کے اعداد لکھ کر ان کی میزان ۹۱۶ دی ہے۔ انھوں نے "بشھائیا" کے ۳۲۰ عدد لیے ہیں۔ یہ تبھی حاصل ہوتے ہیں جب ہمزہ کا ایک عدد لیا جائے۔ معلوم نہیں انھوں نے یہ متن کہاں سے لیا، ماخذ درج کرنے کے تو وہ قائل نہیں۔ "علی گڑھ تاریخِ ادب" میں نجیب اشرف ندوی نے اس مصرع کو یوں لکھا ہے ع:

مسجد جامع بیچ بشانہ یا نبی نور

۹۱۶ھ

لیکن اس مصرع سے ۹۱۶ نہیں، ۱۰۲۸ برآمد ہوتا ہے۔ سخاوت مرزا کے بقول، مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو میں یہ کتبہ یوں درج کیا ہے:

تاریخ اس مسیت کی ہوئی سو یوں مشہور

مسجد جامہ بیچ ثشانہ یا نبی نور

۹۶۱ھ

("تاریخِ ادبِ اردو"، مرتبہ عبدالقیوم، ص ۲۵۲)

جمیل جالبی نے اس شعر کو یوں دیا ہے:

تاریخ مسیت کی ہوئی سو یوں مشہور

مسجد جامع کے بیچ ڈشایا ہے نور

۹۶۳ھ

انھوں نے پہلے اس شعر کو "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند"، جلد پنجم (ص ۳۶۹) میں دیا، بعد میں اپنی تاریخِ ادب جلد اوّل (ص ۹۹) میں۔ تاریخ میں لکھتے ہیں کہ اس کتبے کا ایک نقش انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کے کتب خانۂ خاص میں بھی موجود ہے۔ اس کی بنا پر انھوں نے مسجد کی تاریخ ۹۶۳ھ طے کی ہے۔ واللہ اعلم ۹۱۶ھ، ۹۶۱ھ اور ۹۶۳ھ میں کون سا صحیح ہے۔

مصنف نے ص ۳۵ پر شاہ وجیہ الدین کا سنہ وفات ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء لکھا ہے لیکن سید حسینی پیر علوی نے اپنی کتاب "تذکرۃ الوجیہ" میں ۲۹ محرم ۹۹۸ھ درج کیا ہے (گاندھی نگر، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۷)۔ یہی تاریخ مالک رام نے اور یہی سنہ جالبی نے لکھا ہے۔ انصاراللہ نے شاہ علی جیو گام دھنی کی تاریخِ انتقال ۱۴ جمادی الاوّل ۹۷۳ھ/۷ دسمبر ۱۵۶۵ء لکھی ہے۔ ہجری تاریخ کے برابر ۷ دسمبر نہیں، ۶ دسمبر آتا ہے۔ مالک رام نے اسی ہجری تاریخ کے متوازی ۶ دسمبر لکھا ہے۔ انصار صاحب کو گام دھنی کے دیوان "جواہرِ اسرارِ اللہ" کا نام بھی درج کرنا چاہیے تھا۔ لکھتے ہیں کہ گام دھنی سے ایک غزل بھی منسوب ہے۔ اگر اس انتساب کی صحت ثابت ہوجائے تو یہی بزرگ گجرات کے پہلے غزل گو شاعر بھی قرار پاتے ہیں (ص ۳۸)۔ انھوں نے غزل کا ایک شعر بھی نہیں دیا۔ انھیں لکھنا چاہیے تھا کہ وہ کون سی

Scanned by CamScanner

غزل ہے اور اس کا ماخذ کیا ہے۔ میں نے گام دھنی کی غزل کا کہیں ذکر نہیں دیکھا۔ یہ غیر مستند ہونی چاہیے۔

ص ۳۹ پر شاہ میراں جی شمس العشاق کا سنہ وفات ۹۰۲ھ درج کرتے ہیں۔ مصنف کی نظر سے ڈاکٹر حسینی شاہد کی کتاب "شاہ امین الدین علی اعلیٰ" گزر چکی ہے، پھر اس میں شمس العشاق کے سنین کی بحث کو کیوں نظرانداز کر دیا۔ جیسا کہ میں دوسری تواریخِ ادب کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں، میری رائے میں شمس العشاق کا انتقال ۹۹۴ھ میں ہوا۔ مصنف نے شمس العشاق کی شعری تصانیف میں ایک کا نام "مغزخوب" لکھا ہے (ص ۳۹)، صحیح "مغزِ مرغوب" ہے۔ ایک مثنوی کا نام حسبِ رواج "شہادت الحقیقت" یا "شہادت التحقیق" لکھا ہے۔ شاعر نے خود اس کا نام "شہادت الحقیق" درج کیا ہے، صرف اسی کو صحیح مانا جائے گا۔ ان کی دو نثری کتابوں کے نام بھی درج کیے ہیں۔ جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں، شمس العشاق سے کسی نثری کتاب کا انتساب ثابت نہیں۔ "شرح مرغوب القلوب" میراں جی خدانُما کی تصنیف ہے۔ رسالہ "سبع صفات" کی زبان شمس العشاق کے عہد سے زیادہ صاف ہے اور اس کا انتساب بھی ثابت نہیں۔ ص ۴۰ پر شمس العشاق کے مرثیے کو "کسی شاعر" کا لکھا کہتے ہیں حالانکہ کئی محققین اسے برہان الدین جانم کی تصنیف مانتے ہیں۔

جانم کی تصانیف کی فہرست، "علی گڑھ تاریخ ادب" میں ڈاکٹر نذیر احمد کے مضمون سے ماخوذ ہے گو اس کا حوالہ نہیں دیا۔ جس طرح حسینی شاہد نے "شاہ امین الدین علی اعلیٰ" پر کام کیا، ضرورت ہے کہ کوئی شاہ جانم پر بھی کام کرے۔ ان سے منسوب دو نثری رسالوں پر اپنے شبہات کا اظہار علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں کر چکا ہوں، یعنی "مجموعۃ الاشیا" میں امین تخلص کی ایک نظم ہے اور نثر میں بھی کئی بار امین کا ذکر آیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ جانم کے بجائے ان کے فرزند کی تصنیف ہے۔ معرفت القلوب شاہ میراں جی خدانُما کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ "ہشت مسائل" میں ایک جگہ حضرت برہان کا نام آیا ہے لیکن اس کی زبان کے پیشِ نظر یہ شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ شاہ جانم کے بعد کے حضرت برہان رازالٰہی کی تخلیق تو نہیں۔

خواجہ محمد دہدار فانی کی محض ایک چھوٹی سی مزاحیہ نظم کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ ہندوی زبان میں فانی کی کسی تصنیف کا علم نہیں (ص ۴۴-۴۳)۔ ۱۹۷۹ء میں کسی زبان کو ہندوی کہنا کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جمیل جالبی کی تاریخ ادب کی جلد اوّل پاکستان میں ۱۹۷۵ء میں اور ہندوستان میں ۱۹۷۷ء میں چھپ گئی تھی۔ اگر اسے دیکھ لیتے تو فانی کی کئی اردو غزلوں کا علم ہو جاتا۔

Scanned by CamScanner

سولھویں صدی کے سفر میں بیدر کے فیروز بیدری اور نظام شاہی کے اشرف بیابانی پر تفصیل سے لکھتے ہیں۔ اشرف پر بطورِ خاص بہت جامعیت سے لکھا ہے۔ اشرف سے ایک مثنوی "واحد باری" بھی منسوب کی ہے۔ میں جمیل جالبی کی تاریخ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ مثنوی عہدِ آصفی کے بریلی یوپی کے ایک شاعر اشرف کی تخلیق ہے۔ انصاراللہ بھی لکھتے ہیں کہ اشرف بیابانی سے اس کا انتساب صحیح نہیں (ص۵۵)۔ اس صدی کے علاقائی سفر میں ص۵۹-۵۸ پر اودھی کے سَنت روی داس کی شاعری کا نمونہ دیتے ہیں جو ان کے خیال میں اردو ادب کا حصہ ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور مؤرخِ اردو نے روی داس کی شاعری کو اردو نہیں کہا۔

شمالی ہند کے شعرا میں عبدالقدوس ردولوی (گنگوہی) کا ذکر کرتے ہیں۔ پندرھویں صدی کے تحت بھی ص۲۸ پر اُن کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہاں ان کا سنہ وفات ۹۴۴ھ درج کرتے ہیں (ص۶۲) لیکن شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں اور جالبی نے اپنی تاریخ کے ص۳۹ پر یہ سنہ ۹۴۵ھ لکھا ہے۔ انصاراللہ ص ۶۳ پر ان کا تخلص الکھ داس رقم کرتے ہیں لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ ایسا تخلص کبیر داس، روی داس، تلسی داس، سورداس کے قبیل سے ہو سکتا ہے، کسی اردو شاعر کا نہیں۔ محمود شیرانی کا قول نقل کرتے ہیں کہ شیخ عبدالقدوس اپنے ہندی اشعار برج بھاشا میں لکھتے تھے لیکن انصار صاحب ان کے بعض نمونے دے کر دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی زبان پورب کے داؤد اور قطبن وغیرہ کی سی تھی (ص۶۴)، یعنی اودھی تھی۔ انصار صاحب نے جو نمونے دیے ہیں ان میں سے ایک اودھی میں اور ایک برج میں معلوم ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ گنگوہی دونوں زبانوں کا استعمال کرتے تھے۔

ملک محمد جائسی کا بیان آدھے صفحے پر ہے۔ اگر وہ واقعی اردو کے شاعر ہیں تو ان کی عظمت کے پیش نظر انھیں اشرف بیابانی کے آٹھ صفحوں سے کہیں زیادہ جگہ دینی چاہیے تھی۔ اس کے آگے تلسی داس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> ہندوی کے غیر مسلم شعرا میں سب سے زیادہ اہمیت تلسی داس کو حاصل ہے۔ (ص۶۵)

گویا ان کے نزدیک ہندوی کھڑی بولی اودھی پر مشتمل ہے۔ تلسی داس کو ڈھائی صفحے دیے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخوں میں یہی نرالی تاریخ ہے جس میں اودھی کے شعرا کو (لیکن برج کے شعرا کو نہیں) اردو ادب میں ضم کر لیا گیا ہے۔ کسی اور نے اس جدت کی تائید نہیں کی۔ واضح رہے کہ برج کھڑی بولی سے زیادہ نزدیک ہے، بمقابلہ اودھی کے۔

اردو میں جو ریختہ سعدی کے نام سے مشہور ہے، نورالحسن ہاشمی نے علی گڑھ تاریخ میں

Scanned by CamScanner

انکشاف کیا تھا کہ وہ پنجاب کے ملا شیری کا ہے۔ انصار اللہ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ انھوں نے علی گڑھ تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا ہے، کاش اس کا اظہار بھی کرتے چلتے۔ شمالی ہند کے جائزے میں اودھی کے شاعر عالم کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد بہار و بنگال کے سلسلے میں ریختہ گو بہرام سقاو غیرہ کا۔ اس کے آگے سترھویں صدی شروع ہوتی ہے جس میں گجرات کے خوب محمد چشتی پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کی "خوب ترنگ" کی تاریخ کے اشعار اس طرح نقل کرتے ہیں۔

لنو کی تاریخ اس ٹھانا
پاے عدد ہر مصرع مانا (معنی)

بچار	کنے	محمد	خوب
۲۰۶ +	۸۰ +	۹۲ +	۶۰۸

۹۸۶

چودہ گھالے اس برس ہزار
گھٹاؤ ۱۰۰۰-۱۴
۹۸۶

(ص ۷۸)

اس متن کے ساتھ پہلے شعر میں ایک ماترا بڑھ جاتی ہے۔ اس کے قوافی "ٹھانا"، "مانا" بروزنِ "فعلن" نہیں، بلکہ "ٹھانہ"، "مانہ" بروزنِ "فاع" ہیں۔ پہلے شعر کا آخری لفظ "مانا" بمعنی "معنی" نہیں، بلکہ "مانہ" (ماں) بہ معنی "میں" ہے۔ مصرع کے معنی ہیں، "ہر مصرع میں عدد پائے۔" دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں کے حروف سے الگ الگ تاریخ ۹۸۶ نکلتی ہے۔ اس کے لیے دوسرے مصرع کا صحیح املا یوں ہے ع:

چودہ گھاٹ اوس برس ہزار

یعنی ہزار میں سے چودہ گھٹاؤ۔ اس مصرع میں صدری اور معنوی دونوں طرح کی تاریخیں ہیں۔ تاریخِ جمل کے لیے "اُس" کو اعراب بالحرف کے ساتھ "اوس" لکھا جائے گا اور اس میں واو کے اعداد بھی محسوب ہوں گے۔

مصنف رسالہ "بھاو بھید" کے لیے لکھتے ہیں:

اس میں مثالیں گجراتی زبان کی دی ہیں لیکن تشریح فارسی اور گجراتی دونوں زبانوں میں ہے۔ (ص ۸۰)

Scanned by CamScanner

یہاں اصطلاحوں کے استعمال میں مناسب احتیاط نہیں برتی۔ دو مختلف زبانیں ہیں، گجراتی اور گجری۔ گجراتی ایک علاحدہ زبان ہے جو اہلِ اردو کے لیے ناقابلِ فہم ہے، جس کا عظیم ادب ہے۔ ہندوستان کے علاقہ گجرات کی بولی کو گجری کہتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخوں میں گجری ہی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مصنف نے خوب محمد اور اس کی زبان کی تفصیل قابلِ قدر طریقے پر دی ہے۔

بیدر کے سلسلے میں قریشی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں تین نئی، بلکہ چونکانے والی معلومات فراہم کی ہیں:

۱۔ "سخاوت مرزا کے بقول وہ قطب الدین فیروز بیدری کا مرید تھا"، مصنف واضح کر دیتے کہ سخاوت مرزا نے یہ کہاں لکھا ہے، شاید "اردو ادب" میں شائع شدہ کسی مضمون میں۔

۲ اور ۳۔ قریشی نے ایک مثنوی "ولایت نامہ" لکھی ہے جس میں اپنا نام پیار محمد بن عیسیٰ خاں قریشی لکھا ہے۔

(ص ۸۳)

میں نے اس مثنوی کا ذکر کہیں نہیں دیکھا۔ اسپرنگر نے "فہرستِ کتب خانۂ اودھ" میں "بھوگ بل" کے مصنف کا نام شہاب الدین لکھا ہے (فہرست، ص ۶۳۷) جس سے خیال ہوتا ہے کہ قریشی کا یہی نام ہوگا۔ انصاراللہ مثنوی "ولایت نامہ" کا ماخذ لکھ دیتے تو اچھا ہوتا۔ بغیر حوالے کے کوئی بھی بیان معتبر نہیں ہوتا۔

بیجاپور کے سلسلے میں تاریخِ فرشتہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ اوّل نے فارسی کے دفتر برخواست کر کے ہندوی کر دیے (ص ۸۹-۸۸)۔ دوسروں کی طرح انصاراللہ بھی یہ سمجھے ہوں گے کہ اردو کو دفتروں کی زبان بنا دیا گیا لیکن ڈاکٹر مصطفےٰ کمال واضح کر چکے ہیں کہ یہاں ہندوی سے مراد مراٹھی ہے جس میں ادنیٰ سطح کے دفتری کام ہونے لگے تھے (۲)۔

عبدل کے "ابراہیم نامہ" سے یہ شعر نقل کرتے ہیں:

زباں ہندوی مجھ سوں ہور دہلوی
نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

(ص ۹۲)

ڈاکٹر زور نے پہلے مصرع میں "ہور" پڑھ لیا تھا جس کی تقلید میں ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی علی گڑھ تاریخ میں "ہور" لکھ دیا (ص ۲۵۹)۔ وہی انصاراللہ نے لکھ کر نتیجہ نکالا کہ عبدل

Scanned by CamScanner

نے ہندوی اور دہلوی دو زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "ابراہیم نامہ" کے دو نسخوں کو بغور پڑھ کر طے کیا کہ عبدل نے "ہوں" لکھا ہے ع:

زبانِ ہندوی مجھ سو ہوں دہلوی

("قدیم اردو"، جلد سوم، ۱۹۶۹ء، مقدمہ)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عبدل کہتا ہے، میں دہلوی ہوں اور میری زبان ہندوی ہے۔ ڈاکٹر انصاراللہ خواہ مخواہ دہلوی کو ہندوی سے الگ کوئی زبان سمجھ بیٹھے۔

مثنوی کے خاتمے میں اس کی تاریخ شہور ۱۰۱۲ لکھی ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

ڈاکٹر اوشا اتھاپے نے بتایا ہے کہ شہور ۱۰۱۲ مطابق ہے ۱۰۲۱ھ سے جو ۱۶۱۲/۱۰۱۲ء (کذا) سے مطابق ہوتا ہے اور یہی اس کتاب کا سالِ تصنیف ہے۔ (ص ۹۴)

یہ ڈاکٹر اوشا اتھاپے کون ہیں، یہ وضاحت ان کی کسی تحریر میں ہے یا ان سے زبانی معلوم ہوئی، واضح کرنا چاہیے تھا۔ میں ایک اوشا اُتھپ سے واقف ہوں جو انگریزی گانے گاتی ہے۔ انصاراللہ کی کتاب میں ۱۰۲۱ھ سے مطابق دو عیسوی سنین اوپر نیچے چھپے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں ۱۶۱۲ء ہونا چاہیے جسے کاتب صحیح نہ پڑھ سکا۔ سنِ شہور کی بات سب سے پہلے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ضیاء الدین ڈیسائی کے حوالے سے "ابراہیم نامہ" کے مقدمے میں لکھی لیکن چونکہ انصاراللہ اور مسعود حسین خاں میں لاگ ڈانٹ کا رشتہ ہے اس لیے انصار صاحب نے ان کے حوالے سے لکھنا نہ چاہا ہوگا۔ مسعود حسین خاں کے بقول:

شہور سنہ ۱۰۱۲ مطابق ہے ۲۵ مئی ۱۶۱۱ء تا ۲۴ مئی ۱۶۱۲ء کے اور یہ مطابق ہے ہجری سنہ ۲۱-۱۰۲۰ھ کے۔

اس طرح شہور سنہ کا طول عیسوی سنہ کی طرح پورے ۳۶۵ دن ہوا۔ مجھے اس کی صحت میں شبہہ ہے کہ یہ سنہِ شہور اتنا بڑا سال ہوگا۔ انصاراللہ نے اس کی مطابقت میں ایک ہجری اور ایک عیسوی سال لکھا ہے جب کہ مسعود صاحب نے دو عیسوی اور دو ہجری سال لکھے تھے۔ واللہ اعلم!

مثنوی "چندربدن و مہیار" کے مصنف مقیمی کے لیے لکھتے ہیں:

قیاساً اس کا نام مرزا محمد مقیم بتایا گیا ہے۔ (ص ۹۶)

جمیل جالبی نے ثابت کیا کہ "چندربدن و مہیار" کا مصنف مقیمی ہے اور مرزا محمد مقیم اس سے علاحدہ ایک شخص ہے (جلد ۱، ص ۲۳۶)۔ ص ۱۰۶ پر آتشی شاعر کا ذکر کیا ہے۔ یہ فارسی کا شاعر تھا جس کا ایک بھی اردو شعر نہیں ملتا۔ پھر اردو کی تاریخ میں اس کا ذکر

Scanned by CamScanner

کیوں؟ علی عادل شاہ شاہی کے قصیدۂ چار در چار کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس کی بحر شانزدہ رکنی ہے جس کی ہر بیت میں ۱۶ ارکان ہیں یعنی ۴×۴ کہہ کر سولہ رکن ظاہر کیے ہیں (ص ۱۱۱)۔ مبارزالدین رفعت نے بھی کلیاتِ شاہی کے مقدمے میں یہی تاویل کی ہے (علی گڑھ ۱۹۶۲ء، ص ۵۱-۴۸) یہ صحیح نہیں۔ چار در چار ایک صنعتِ معنوی ہے جس کی تفصیل "بحرالفصاحت" ص ۹۵۱ یا ترقی اردو بیورو کی "درسِ بلاغت" ص ۸۲ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

نصرتی کے "علی نامہ" کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> یہ خیال کہ "علی نامہ" اردو کی پہلی رزمیہ تصنیف ہے، درست نہیں، رزمیہ کے عناصر تو ہندوی کی سب سے پہلی دستیاب تصنیف "چندایں" میں بھی موجود ہیں۔ (ص ۱۲۲)

گویا ہندوی سے مراد اردو ہے اور "علی نامہ" اور "چندایں" دونوں ایک ہی زبان کی کتابیں ہیں۔ ص ۱۵۱ پر دکن کے محمود بحری کی زبان کا تعلق پورب دیس سے دکھاتے ہیں۔ موصوف کو ہر طرف پورب اور پوربی زبان ہی نظر آتی ہے۔ شاہ معظم بیجاپوری کی ایک مثنوی کا نام "گنجِ خوبی" لکھتے ہیں (ص ۱۵۴)۔ اسے عام طور سے "گنجِ مخفی" سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حسینی شاہد نے طے کیا ہے کہ دراصل یہ مثنوی آزاد نامہ ہے (شاہ معظم، حیدر آباد ۱۹۷۸ء ص ۱۱۷)

گولکنڈہ کے شعرا وجہی، غواصی وغیرہ پر خوب لکھا ہے۔ ص ۲۰۴ پر ابنِ نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کی تاریخ ۱۰۶۷ھ لکھی ہے اور اس کے مصرعِ تاریخ کو یوں پڑھا ہے:

اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پر چار

ممکن ہے یہی ٹھیک ہو لیکن انھوں نے اس کی دوسری قرأت کا ذکر نہیں کیا جس میں بیس یا بست کی جگہ "تیس" لکھا ہے۔ جالبی نے آخرالذکر قرأت کو صحیح مان کر "پھول بن" کی تاریخ ۱۰۶۶ھ طے کی ہے۔ (جلد ۱، ص ۴۸۷)

ص ۲۱۶ پر ایک شاعر لطف کی مثنوی "ظفرنامہ" کا ذکر کیا ہے۔ دراصل اس شاعر کا تخلص لطیف ہے، لطف نہیں۔ عبدی کی "فقہ ہندی" کو شیرانی کی تقلید میں پنجاب کی ٹھہراتے ہیں لیکن اختر اورینوی کی اس رائے کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ عبدی کا تعلق بہار سے تھا (ص ۲۲۳)۔ بعد میں شیرانی نے اس مثنوی کو قطعی طور پر ہریانہ سے متعلق کیا تھا۔ ص ۲۲۴ پر جُنید کے ریختے کا ذکر ہے لیکن جیسا کہ میں نے علی گڑھ تاریخ میں نجیب اشرف ندوی کے بیان میں لکھا، اس ریختے کو دوسرے کئی شاعروں سے بھی منسوب کیا جاتا ہے چنانچہ انصاراللہ نے اس کا ایک مصرع بیرم خاں سے منسوب ریختے میں تلاش کیا ہے (ص ۲۲۶)۔

Scanned by CamScanner

ص ۲۲۹ پر ضیاء الدین خسرو کی "خالق باری" کا مادۂ تاریخ "تصنیف آخر" لکھا ہے۔ صحیح "نصیف آخر" ہے جس سے ۱۰۳۱ھ حاصل ہوتا ہے۔ "نصیف" کے معنی ہیں کسی چیز کا نصف حصہ۔ لیکن یہ کہاں مسلّمہ ہے کہ "خالق باری" امیر خسرو کی تصنیف نہیں۔ ڈاکٹر صفدر آہ، جمیل جالبی اور ممتاز حسین کے دلائل کے بعد یہی مؤقف درست معلوم ہوتا ہے کہ "خالق باری" اصلاً خسرو نے لکھی تھی جس میں کثرت سے الحاق و ترمیم و تحریف ہوئی ہے۔ ضیاالدین خسرو اس کے ایک مؤلف ہو سکتے ہیں۔

ص ۲۳۰ پر "بکٹ کہانی" کے مصنف افضل کو والہ داغستانی کے فارسی شاعر محمد افضل پانی پتی سے وابستہ کیا ہے حالانکہ یہ دونوں الگ شخصیتیں ہیں۔ کتاب کے آخر میں اودھی کے شاعر عثمان مصنفِ "چتراولی" کا بطور اردو شاعر کے ذکر کرتے ہیں (ص ۳۸-۲۳۷)

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر انصار اللہ کے اردو اور اودھی کی آمیزش کے شوق سے ہٹ کر دیکھا جائے تو ان کی کتاب تحقیقی اعتبار سے اچھی خاصی ہے۔ انھوں نے ماخذ کے حوالے نہ دے کر مبادیاتِ تحقیق کی خلاف ورزی کی ہے۔ وہ اسے طلبہ کے ڈھب کی بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے لیکن جب اس میں تحقیقی معلومات سموتے ہیں تو فٹ نوٹ میں ان کے ماخذ کا حوالہ دینا ضروری تھا۔ طلبہ ان فٹ نوٹوں سے صرفِ نظر کر سکتے تھے، اہلِ تحقیق ان کے ذریعے متن کے بیانات کو پرکھ سکتے تھے۔

"تاریخِ اقلیم ادب"، دوسرا حصہ، ۱۹۸۰ء

اس جلد کے سرورق پر اقلیم میں الف کے نیچے زیر لگایا ہے۔ غالباً پہلی جلد کے زبر پر اعتراض کے پیشِ نظر ایسا کیا ہوگا۔ سرورق کے اندر کے صفحے پر اس کے زمانے کا تعین یوں کیا ہے۔

احمد شاہی دور ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تک

اس عنوان سے ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ احمد شاہی دور کی ابتدا تک کا احاطہ کرتی ہے لیکن سنین پر نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ احمد شاہی دور اس میں شامل ہے۔ جلد کا جو مختصر مقدمہ انھوں نے لکھا ہے اس میں ان کی مایوسی، ہزیمت خوردگی، تلخی، جھنجھلاہٹ اور یونی ورسٹیوں کے پروفیسروں کے خلاف شکوہ پھوٹ پھوٹ کر بہ رہا ہے۔ ان کی تلخی کی

Scanned by CamScanner

اصل وجہ یہ ہے کہ انھیں اس وقت تک شعبے کے مدارج میں وہ ترقی نہیں ملی جس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس جھلاہٹ کا یوں اظہار کیا ہے کہ متعدد پروفیسر علی گڑھ تاریخ ادب پر لاکھوں روپیہ خرچ کر کے کچھ حاصل نہ کر سکے لیکن انھوں نے اپنی بے بضاعتی کے باوجود "تاریخ اقلیم ادب" حصۂ اول جیسا کارنامہ کر دیا۔

یہ بے بضاعت اردو کا پروفیسر نہیں ہے۔ (ص ۵-۳)

موصوف تاریخ ادب لکھ رہے ہیں، اس میں ریڈر پروفیسر کا جھگڑا کہاں سے آ گیا۔ بہر حال، شکر ہے کہ اب وہ اردو کے پروفیسر ہیں۔

اس کتاب میں چار باب ہیں۔ یاد رہے کہ پہلے حصے کی، ابواب میں تقسیم نہ تھی۔ دوسرے حصے میں ابواب کو بادشاہوں کے عہد کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے یعنی پہلا باب وفاتِ عالم گیر ۱۷۰۷ء تک، دوسرا باب بہادر شاہ اول سے قبل محمد شاہی تک، یعنی ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۹ء۔ تیسرا باب عہد محمد شاہ، یعنی ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک۔ چوتھا باب احمد شاہ کا عہد، یعنی ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک۔ یہ دور بہت مختصر ہیں مثلاً دوسرا دور ۱۲ سال کا اور چوتھا دور ۶ سال کا ہے۔ دراصل ۱۷۰۷ء سے ۱۷۵۴ء تک، بلکہ اٹھارویں صدی کے آخر تک ایک ہی دور ماننا چاہیے۔ ۶ اور ۱۲ سال میں کسی ادیب کے پورے کارنامے نہیں سما سکتے۔ وہ ادیب اس طرح کے دو تین ادوار پر پھیلا ہوا ہوگا۔

زمانی ادوار کے بجائے اس پورے عرصے کو ایک دور مان کر سلسلے وار مختلف شعرا کو لے سکتے تھے مثلاً ولی، سراج، ان کے معاصر دوسرے شعرا، حاتم، آبرو اور ان کے معاصرین، میر، سودا وغیرہ۔ اس طرح یہ نہ ہوتا کہ محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہد کے مشہور شعرا، یعنی سودا اور میر کی شاعری پر بحث نہ کر کے میر کو محض بحیثیت تذکرہ نگار کے پیش کیا جائے اور سودا پر کچھ لکھا ہی نہ جائے۔ دراصل تذکرہ نگاری ایک الگ موضوع ہے، اس کے لیے ایک علاحدہ باب وقف کرنا چاہیے تھا۔

پہلے باب کی ابتدا میں اورنگ زیب کی اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا بیان کیا ہے کہ اس کے زمانے میں کئی ہندوی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا (ص ۱۴)۔ اگر مملکت میں بادشاہ کی فرمائش کے بغیر کسی نے آزادانہ طور پر ہندی یا اردو کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تو اس سے بادشاہ کی دلچسپی کیوں کر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں فتوت کے تذکرے "ریاضِ حسنی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے فتحِ دکن کے بعد جن شعرا کو حاضر ہونے کا حکم دیا ان میں نصرتی بھی تھا (ص ۱۵-۱۴)۔ اس بیان کی غلطی پچھلے ابواب میں ظاہر کی جا چکی ہے۔ اورنگ زیب نے بیجاپور کو ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا جب کہ نصرتی کا انتقال ۱۰۸۵ھ

میں ہو چکا تھا۔

اورنگ زیب کی اس املائی اصلاح کا ذکر کرتے ہیں کہ ہندی الفاظ کے آخر میں ہاے مختفی کے بجاے الف لکھا جائے۔ اس اطلاع کے ماخذ کے لیے حوالہ دیتے ہیں "پنجاب میں اردو" کا، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اس کتاب کے کس ایڈیشن کے کس صفحے پر یہ مذکور ہے۔ حوالہ دینے کا یہ طریقہ ناقص ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ مقامی لفظوں کے تلفظ پر بھی اس کا اثر ہوا مثلاً پیسَ، راجَ، لوٹَ، سونَ کو پیسا، راجا، لوٹا، سونا بولنے لگے (ص۱۶)۔ یہ دعویٰ بغیر ثبوت کے ہے۔ انھیں کہاں سے معلوم ہوا کہ ان لفظوں کے آخر میں مختصر مصوتہ بولا جاتا تھا۔ راجا قدیم ترین خالص سنسکرت لفظ اور تلفظ ہے۔ اسے کبھی راجَ نہیں بولتے تھے۔ میرا خیال ہے پیسَ، لوٹَ، سونَ جیسا تلفظ جدید ہند آریائی دور میں ممکن نہیں کیونکہ ہندی میں متحرک الآخر تلفظ متروک ہو چکا تھا۔

عہدِ عالم گیر کے مرزا روشن ضمیر کے رسالے کا تعارف معلومات افروز ہے۔ شاید انصار اللہ سے پہلے کسی اور نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ انصار صاحب نے ص۱۶ تا ۱۹ پر اس کی تفصیل دی ہے۔ مسلم یونی ورسٹی لائبریری میں روشن ضمیر کے ۱۰۲ ہندی اشعار ہیں جن کے پہلے فارسی میں ایک سہ ورقی رسالہ ہے جس میں اردو رسم الخط میں ہندی الفاظ لکھنے کے بارے میں کچھ تجاویز ہیں۔ اس میں ایک عنوان شاہ عالم کی سخاوت کے بیان میں ہے۔ چونکہ روشن ضمیر عہدِ عالم گیری سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے انصار اللہ نے اسے بہادر شاہ عالم اوّل سے متعلق کیا ہے۔ اس کے نیچے کسی نے لکھا ہے:

"بتاریخ سنہ ۲۰ از... بندہ... قیمت..."

تاریخ میں جو ۲۰ چھپا ہے وہ دراصل ۳۰، یعنی ۱۱۳۰ھ ہوگا (ص۱۷)۔ ۱۱۳۰ھ برابر ہے ۱۸-۱۷۱۷ء کے۔ گویا رسالہ اس سے پہلے کی تصنیف ہے۔

اس باب میں شمالی ہند کے کُدبُد ریختہ کہنے والوں کے بعد اہلِ دکن کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ بہتر یہ ہوتا کہ دکنی شعرا کا ذکر پہلے ہوتا تاکہ اس سے پہلے کے دکنی ادب کا سلسلہ برقرار رہتا۔ دکنی شعرا میں سب سے پہلے عاجز کی دو تصانیف "قصۂ فیروز شاہ" اور "قصۂ ملکۂ مصر" مصنفہ ۱۱۰۰ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ عاجز کا نام سیّد محمد یا محمد علی لکھا ہے (ص۳۴)۔ یہ غلط فہمی بہتوں کو ہوئی ہے اور میں پچھے کئی بار اس کی تصحیح کر چکا ہوں۔ مولوی عبدالحق نے بیلی کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے واضح کیا کہ نہ اس کا نام محمد علی ہے نہ تخلص عاجز۔ اس نے خود اپنی مثنوی میں اپنا نام محمود لکھا ہے ("تنقیداتِ عبدالحق"، طبعِ اوّل، ص۱۵۶)۔ غلام عمر خاں نے اپنی مرتبہ مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کے مقدمے میں مولوی عبدالحق کا ذکر کیے بغیر یہی بات

Scanned by CamScanner

لکھی۔ انھوں نے بتایا کہ شاعر نے ایک جگہ اپنے لیے "عاجز" کا لفظ لغوی معنی میں استعمال کیا ہے نیز "قصۂ فیروز شاہ" اور "قصۂ ملکۂ مصر" ایک ہی مثنوی کے دو نام ہیں (حیدر آباد، ۱۹۶۷ء، ص ۶-۵)

عاجز کے بعد ضعیفی کا بیان اچھا ہے۔ اس کے آگے شیخ محمد امین ساکنِ گودھرا گجرات کا ذکر ہے۔ اس کی پہلی کتاب کا نام "معراج نامۂ بی بی فاطمہ" لکھا ہے جو ان کے نزدیک امین کی پہلی دستیاب مثنوی ہے ... اس کا مخطوطہ کتب خانۂ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے (ص ۳۸-۳۷)۔ شاید انصار اللہ صاحب نے فہرست سالار جنگ نہیں دیکھی جس کے مطابق اس کا نام "معجزۂ فاطمہ" دیا ہے۔ یہ مثنوی نہیں، قصیدہ ہے جیسا کہ نمونے کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ شاعر اور فہرست نگار سالار جنگ دونوں نے اسے قصیدہ کہا ہے۔ اس کے نام میں "معراج نامہ" کا تو سوال ہی نہیں کیونکہ حضرت فاطمہ کو معراج نہیں ہوئی تھی۔ خود ڈاکٹر انصار اللہ نے ص ۴۱-۴۰ پر جس قصیدے کا ذکر کیا ہے وہ یہی ہے۔ انھوں نے امین کی تین مثنویوں "تولد نامہ"، "معراج نامہ" اور "وفات نامہ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ جالبی کے مطابق یہ ایک ہی مثنوی کے تین اجزا ہیں (جلد ۱، ص ۱۴۲)۔ شاید صحیح تر صورت یہ ہے کہ یہ ایک سلسلے میں کہی ہوئی تین مثنویاں ہیں۔ جس طرح دو غزلہ اور سہ غزلہ ہوتا ہے اسی طرح یہ سہ مثنوی ہے۔

ولی کا بیان بہت مفصل، یعنی ص ۴۲ سے ۶۳ تک ہے۔ اس میں ولی کے بارے میں تحقیقی بحث اور اس کے کلام کا لسانی تجزیہ اچھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کے سنہ وفات ۱۱۱۹ھ کے خلاف جو دلائل دیے تھے، ڈاکٹر نظر نے نے انھیں بہت اچھی طرح رد کیا ہے۔ انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن کی تاریخِ وفات ۲۱ جمادی الاول ۱۱۴۰ھ مطابق جنوری ۱۷۲۸ء لکھی ہے (ص ۴۸)۔ ہجری تاریخ صحیح ہے، عیسوی غلط۔ معلوم نہیں مصنف کے پاس کون سی تقویم سنینِ ہجری و عیسوی ہے۔ مالک رام نے اس ہجری تاریخ کے ساتھ ۲۴ دسمبر ۱۷۲۷ء لکھی ہے اور یہی صحیح ہے۔

اس دور میں شمالی ہند کے شعرا کے سلسلے میں جلیسر ضلع ایٹہ کے شاعر محمد ناصر سلطان کا بیان معلومات افروز ہے۔ اس کی مثنوی "اعتقاد نامہ" تصنیف ۱۱۷۰ھ کا ذکر اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ مصنف سلطان کے لیے لکھتے ہیں:

> اسے پورب دیس کے ان دو چار شاعروں میں شمار کرنا چاہیے جنھوں نے اپنے تخلص کے لیے عربی یا فارسی کے کسی لفظ کا انتخاب کیا تھا۔ (ص ۶۶)

Scanned by CamScanner

یہ صاف صاف وہی پوربی ہے جو دکن میں ترقی پا کر دکنی کہلائی اور
بالآخر اردوے معلیٰ بن کر عام ہوئی۔ (ص ۷۰)

جلیسر اور ایٹہ، ہاتھرس کے پاس ہیں۔ یہاں پورب دیس کہاں سے آ گیا اور یہاں کے شاعر کی زبان پوربی (اودھی) کیسے ہو گئی۔ ڈاکٹر انصار اللہ کی "پورب پرستی" ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ یہ انوکھا لسانی نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اودھی ترقی کر کے دکنی بنی۔ ان کی پورب کی طرف داری کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو ان کا یہ باب اچھا خاصا ہے۔ ایسے باب کے ہوتے وہ کیوں کر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب طالبِ علموں کے لیے لکھی گئی ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ہے، "جلوسِ محمد شاہی ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء سے پہلے تک۔" عنوان میں آخری حد دی ہے، پہلی حد بھی دینی چاہیے تھی ورنہ اس میں نہ صرف اورنگ زیب کا، بلکہ شاہ جہاں اور جہاں گیر تک کا عہد آ سکتا ہے۔ صحیح عنوان ہوتا، "وفاتِ عالم گیر سے جلوسِ محمد شاہ تک" اس میں مہدی علی بیگ قبول کے لیے لکھتے ہیں:

خدا نے تخلص کی مناسبت سے ایسا حسنِ قبول عطا کیا کہ باید و شاید
(ص ۷۷-۷۶)

یہ مبالغہ ہے۔ قبول نہ فارسی کا بڑا مقبول شاعر ہے نہ اردو کا۔

ص ۸۳ تا ۸۶ پر میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی کا ذکر ہے۔ ان کے بارے میں یہ اہم ترین بات آخر میں نہیں، شروع ہی میں لکھنی چاہیے تھی کہ یہ جعفر زٹلی کے ساتھی اٹل ہیں۔ لیکن کیا یہ طے ہے کہ اٹل نارنولی اور میر عبدالجلیل بلگرامی ایک ہی شخص ہیں؟ گجرات کے ایک شاعر اشرف کا بیان ص ۸۷ سے ۹۵ تک ہے۔ ایسے غیر اہم شاعر کو ۹ صفحے دینا توازن کے خلاف ہے۔ ص ۱۰۰ سے ۱۰۷ تک شاہ برکت اللہ پیمی مارہروی کا بیان ہے۔ ان کے بارے میں یہ لکھنا ضروری تھا کہ بنیادی حیثیت سے یہ ہندی کے شاعر ہیں اور ان کا مجموعہ کلام "پیم پرکاش" ہندی کی کتاب مانی جاتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں، ڈاکٹر انصار اللہ ہمیشہ "ہندی" کے بجاے "ہندوی" ہی لکھتے ہیں۔ پیمی پر تفصیل سے لکھا ہے۔

تیسرا باب "محمد شاہ کی وفات تک" ہے جو دراصل عہد محمد شاہ سے متعلق ہے۔ اس میں اردو کے کئی مشاہیر مثلاً آرزو، مضمون، آبرو، حاتم، فائز، مظہر وغیرہ کا ذکر ہے۔ ص ۱۱۲ پر محمد شاہ سے متعلق "کسی" کا ایک فارسی اقتباس دیتے ہیں۔ "کسی" سے ہم کیا سمجھیں۔ یہ تصریح کیوں نہیں کرتے کہ کس کی عبارت ہے اور کس کتاب سے لی گئی ہے۔ ان تفصیلات کو حذف کرنا کتاب کے تحقیقی منصب کو ضرر پہنچانا ہے۔ وہ فارسی اقتباسات کے

Scanned by CamScanner

ساتھ ان کا اردو ترجمہ بھی دیتے ہیں۔ یہ چنداں ضروری نہ تھا۔ ترجمے کے لیے وہ صفحے کی نصف چوڑائی میں فارسی عبارت اور اس کے ساتھ کے بقیہ نصف میں اردو ترجمہ لکھتے ہیں۔ انھیں دیکھنے سے بادی النظر میں شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ صحیح صورت یہ ہوتی کہ پہلے پورے صفحے کے عرض میں فارسی عبارت درج کی جاتی، اس کے ختم ہونے پر اس کے نیچے پوری وسعت میں اردو ترجمہ قلم بند کر دیا جاتا۔

اس باب کا سیاسی پس منظر ے صفحات پر ہے جو بہت مناسب ہے۔ اس کے بعد ادبی صورتِ حال ہے۔ ص ۲۵۔۱۲۴ پر زبان اور رسم الخط کے بارے میں بھی خوب لکھا ہے۔ ص ۱۳۳ پر خان آرزو کی تصانیف کا ذکر ہے۔ ان میں اُن کی ضخیم کتاب "مثمیر" کو بھی شامل کرنا چاہیے تھا جو بلاغت سے متعلق ہے اور کراچی یونی ورسٹی سے شائع ہوئی ہے۔ اہلِ اردو کے لیے ان کا اہم کارنامہ "نوادر الالفاظ" ہے۔ اس کا بھی نام محذوف ہے۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں:

> آرزو پہلے شخص ہیں جنھوں نے زبانِ اردوے معلّٰی کے لیے صرف لفظ "اردو" کا استعمال کیا ہے۔ (ص ۱۳۳)

لکھنا چاہیے تھا کہ آرزو نے کس سنہ کی کس کتاب میں ایسا کیا ہے۔ ابھی تک تو لفظ "اردو" کا پہلا استعمال میر محمدی مائل دہلوی کے دیوان مرتبہ ۱۱۷۶ھ میں ملتا ہے۔

ص ۱۳۶ پر شرف الدین مضمون کا سنہ وفات ۱۱۵۷ھ لکھا ہے۔ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں ۱۱۴۷ھ طے کیا ہے (جلد دوم، حصہ ا، ص ۲۵۸)۔ اس سے قطعِ نظر انصاراللہ نے مضمون پر بہت اچھا لکھا ہے۔ ص ۱۴۲ پر آبرو کی تاریخِ وفات ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ مطابق جنوری ۱۷۳۴ء لکھی ہے۔ ہجری تاریخ صحیح ہے، عیسوی غلط۔ مالک رام نے عیسوی تاریخ ۲۰ دسمبر ۱۷۳۳ء اور جمیل جالبی نے ۲۱ دسمبر ۱۷۳۳ء لکھی ہے۔ ۲۴ رجب انھیں دو تاریخوں میں سے کسی کے مطابق ہوگا۔ آبرو کا بیان بہت مفصّل یعنی ۱۳ صفحوں پر ہے۔ سوانح اور لسانی جائزے میں انصاراللہ بہت کام یاب رہتے ہیں لیکن شاعری کے تنقیدی جائزے سے نسبتاً صرفِ نظر کرتے ہیں۔

شاکر ناجی کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ محمد شاہ کی وفات (۱۱۶۱ھ) سے دو تین برس پہلے فوت ہوئے ہوں گے (ص ۱۵۴)۔ قاضی عبدالودود نے اپنے ایک مکتوب میں ۱۱۶۰ھ کے لگ بھگ قیاس کیا (۳)۔ جمیل جالبی نے ۱۱۵۹ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان طے کیا لیکن انھوں نے بھی ۱۱۶۰ھ کو قرینِ قیاس کہا۔ دوسری طرف مالک رام نے اپنے تذکرے میں "دانشِ دارالقرار" کے مادّے کی بنا پر ۱۰۶۸ھ درج کیا ہے۔ انھوں نے مادّے کا ماخذ نہیں دیا۔

Scanned by CamScanner

ممکن ہے پورے شعر میں کوئی تحریف ہو۔ اس طرح انصار اللہ کی مندرجہ دونوں تاریخیں غلط ہیں۔

ص ۱۶۱ پر معترض ہیں کہ ناجی نے ایک غزل میں "ر" اور "ڑ" کا قافیہ کیا ہے۔ مطلع درج کرتے ہیں جس میں "پھیرا" اور "الجھیڑا" کے قوافی ہیں۔ اسی طرح غزل کے بعض قافیوں میں "ر" اور بعض میں "ڑ" ہے (ص ۱۶۱)۔ چار شعر کی یہ غزل مطبوعہ دیوانِ ناجی میں ص ۱۹ پر ہے۔ مرتب نے اس کے قوافی میں "ڑ" والے الفاظ "الجھیڑا"، "چھیڑا" اور "بیڑا" میں "ر" ہی لکھی ہے لیکن یہ غیر ضروری بھی ہے غلط بھی۔ مطلع میں "پھیرا" اور "الجھیڑا" کا قافیہ اسی طرح صحیح ہے جس طرح "پھیرا" اور "لڑکا" کا۔ اس طرح ان قافیوں میں مشترک صرف "الف" ہے۔ اگر مطلع میں صرف "الف" کے اشتراک کی پابندی ہو تو بقیہ اشعار میں بھی صرف اسی کا اشتراک کافی ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ کے ایک روزمرہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

یہاں تک کہ اپنی خوبیوں کے سبب شاہ حاتم کرکے مشہور ہو گئے۔

(ص ۱۶۴)

"کر کے" کا یہ استعمال معیاری اردو روزمرّہ نہیں۔ اس تاریخ میں مصنف نے اسے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔

اس باب میں انھوں نے تمام مشاہیر شعرا پر تفصیل سے اور اچھی طرح لکھا ہے۔ مظہر جانِ جاناں کے قتل کے سلسلے میں تذکرۂ لطف کے بیان کا تو تحقیقی جائزہ لیا لیکن اس سلسلے میں آزاد نے جو غلط بیانی کی ہے، اس کے بارے میں ایک لفظ نہ لکھنا بڑی فروگزاشت ہے۔ چھوٹے شعرا میں فضلی نقش بندی اورنگ آبادی پر ایک صفحہ لکھنا نامناسب ہے۔ اس شاعر کی اتنی اہمیت نہیں کہ اسے علاحدہ عنوان دے کر لکھا جائے۔ اس کے بعد قزلباش خاں امید پر تین صفحوں میں خوب لکھا ہے۔

آگے بیجاپور کے سید حسینی پیر کا ذکر ہے۔ فضلی اورنگ آبادی کی طرح حسینی پیر بھی بحیثیت شاعر دکنی ادب میں بھی کوئی مقام نہیں رکھتے۔ پھر محض دور کا خیال رکھ کر مختلف علاقوں کو اس طرح خلط ملط کر دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بہتر یہ ہوتا کہ ولی کے ساتھ ہی جن دکنی شعرا کا ذکر کرنا تھا، کر دیا جاتا۔ باب کی فصل (۷) میں بہار، بنگال سے تعلق رکھنے والے تحقیق اور دلدار کا ذکر ہے۔ ان کا شمول بھی استحقاق کے زیرِ اثر نہیں، مصنف کا کرم ہی سمجھیے۔ ادبی تاریخ میں علاحدہ عنوان کے تحت انھی ادیبوں کا ذکر ہونا چاہیے جو ادبی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے ہوں۔ آخر میں یہ کہوں گا کہ مجموعی حیثیت سے یہ باب بہت اچھا ہے، بالخصوص تحقیقی اور سوانحی نقطۂ نظر سے۔

Scanned by CamScanner

چوتھا اور آخری باب عہد احمد شاہ سے متعلق ہے، یعنی ۶۷-۱۱۶۱ھ تک۔ ظاہر ہے کہ اس میں جن شعرا اور تذکرہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علمی و ادبی کارنامے محض ۶ سال کے اندر محصور نہ تھے۔ اس باب کی ابتدا میں چار صفحوں کا سیاسی پس منظر اور تین صفحوں کا ادبی منظر پیش کیا ہے جو مفید اور متوازن ہے۔ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

احمد شاہی دور کے شاعر اور ناقد کا صاف صاف قول یہ ہے،

"دماغِ تطویل ندارم۔"

(ص ۲۲۸)

لکھنا چاہیے تھا کہ یہ کون سی پُراسرار شخصیت ہے جو شاعر بھی ہے، ناقد بھی۔ قائل کے نام کے بغیر قول کی اہمیت کیوں کر پرکھی جا سکتی ہے۔ ظاہرا یہ کسی تذکرے کا فقرہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس باب کی ابتدا میں چار تذکروں کا ذکر ہے۔ یہ ہیں، "تحفۃ الشعرا"، "گلشنِ گفتار"، "گلشنِ راز" (گردیزی) اور "نکات الشعرا۔"

ڈاکٹر انصاراللہ کی جملہ محققین کے علی الرغم یہ کوشش رہی ہے کہ گردیزی کے تذکرے "گلشنِ راز" (تذکرۂ ریختہ گویاں) کو اردو کا پہلا تذکرہ اور "نکات الشعرا" کو اس کے بعد کا اور اس کی تقلید میں لکھا ہوا قرار دیں لیکن ان کی یہ سعی نامشکور رہی۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق اور حنیف نقوی ("شعرائے اردو کے تذکرے") کے دلائل دیکھے جا سکتے ہیں۔ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کون کس کا ناقل ہے۔ اس کی ایک دلیلِ مسکت مجھے حنیف نقوی نے بتائی تھی۔ "نکات الشعرا" میں میر نے شاہ حاتم کا ایک شعر نقل کیا ہے:

ہائے بےدرد سے ملا کیوں تھا
آگے آیا مرے کیا میرا

دیوانِ حاتم میں مصرعِ اولا کا متن ہے:

ہائے بیدرد سوں ملا کیوں تھا (۴)

اس پر طنزیہ اصلاح کی ہے کہ اگر میرا شعر ہوتا تو میں پہلا مصرع یوں کہتا:

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں

اس مصرع کی گرمی اور اُس شعر کی خنکی روشن ہے۔ ("نکات الشعرا"، مرتبہ محمود الٰہی، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۷)۔ لطیفہ دیکھیے کہ گردیزی نے اپنے تذکرے میں حاتم کے نمونہ کلام میں اس شعر کا پہلا مصرع:

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں

Scanned by CamScanner

ہی لکھا ہے (اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۵۰)۔ اس سے گردیزی کی پھوہڑ نقالی ہی نہیں، مذاقِ سخن کے معیار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس باب میں میر کا ذکر بحیثیت تذکرہ نگار کے ہے، شاعر کے طور پر نہیں۔ انھوں نے میر کی تاریخ ولادت ۴ ربیع الاول ۱۱۳۵ھ لکھی ہے (ص ۲۳۹)۔ ۱۱۳۵ھ تو بہتوں نے لکھی ہے اور اس کا ماخذ معلوم ہے لیکن ۴ ربیع الاول کا کیا ماخذ اور ثبوت ہے، ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ مزید لکھتے ہیں:

> اوائلِ ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں انھوں نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھا "نکات الشعرائے ہندیہ" ۱۱۶۷ھ اس کا تاریخی نام رکھا۔ یہ تاریخی نام طویل تھا اس لیے تذکرے کو "نکات الشعرا" کے نام سے شہرت دی۔ (ص ۲۴۲)

"نکات الشعرائے ہندیہ" سے ۱۱۶۷ھ نہیں ۱۱۵۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ ہاں "یے" پر ہمزہ لگا کر اس کے بھی ۱۰ عدد لیے جائیں تو ۱۱۶۷ھ ہوگا۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ "نکات الشعرا" کے کسی نسخے میں اس کا نام "نکات الشعرائے ہندیہ" نہیں لکھا۔ میر نے یا کسی اور نے یہ نہیں لکھا کہ یہ نام تاریخی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی۔ اقلیمِ ادب سے فوراً پہلے کی اپنی کتاب "شعرائے اردو کے اوّلیں تذکرے" (علی گڑھ ۱۹۷۸ء) میں لکھتے ہیں"

> اگر محمد تقی میر کے تذکرے کا نام "نکات الشعرا" تاریخی نہیں ہے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ مؤلف نے بھی کسی جگہ وضاحت کے ساتھ اس کے آغاز یا اختتام کے زمانے کا بیان نہیں کیا ہے۔
>
> (ص ۹۴)

"نکات الشعرا" تاریخی نام نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس سے محض ۱۰۷۳ھ نکلتا ہے۔ یہ ماننے میں کسی کو تکلف نہ ہوگا کہ میر نے اس کے آغاز یا اختتام کی تاریخ نہیں لکھی لیکن جن قرائن کی بنا پر محققین نے ۱۱۶۵ھ کی تاریخ طے کی ہے انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی پہلی کتاب کے ۱۹۷۸ء کے بیان کے بعد انھیں کس ماخذ سے طویل توسیع شدہ نام کی اطلاع ملی؟ جب تک وہ قابلِ وثوق ماخذ کا پتا نہ دیں گے قاری یہی شبہہ کرے گا کہ یہ مبینہ تاریخی نام وضعی ہے۔

انعام اللہ خاں یقین پر کئی صفحوں میں بہت اچھا لکھا ہے۔ ان کے بعد کم اہم شعرا مثلاً محمد باقر حزیں، دردمند، عاجز، سراج، بلھے شاہ اور صابر پر لکھا ہے۔ دردمند کا نام فقیہ صاحب

Scanned by CamScanner

لکھا ہے۔ خوشگو کی سند نقل کی ہے:

ظاہراً لفظ صاحب جزو اسم عمدہ ہائے خطۂ دکن۔ (ص ۲۶۴)

خوشگو کا یہ قول معتبر نہیں کہ دکن کے عمائد کے نام میں "صاحب" بطور جزو ہوتا تھا۔ معاصر تذکروں مثلاً "نکات الشعرا"، تذکرہ گردیزی، "مخزنِ نکات"، "چمنستانِ شعرا"، "سروِ آزاد" وغیرہ میں دردمند کا نام محمد فقیہ ہی لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ (جالبی، جلد ۲، حصہ ۱، ص ۳۹۳)۔ انصار اللہ نے ص ۲۶۷ پر دردمند کا سالِ وفات ربیع الاول ۱۱۶۹ھ مطابق ۱۷۵۵ء لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود نے اور ان کی تقلید میں جالبی نے ۱۱۷۹ھ قیاس کیا ہے جسے درست تسلیم کرنا چاہیے (ایضاً، ص ۳۹۴)۔ بہرحال دردمند پر، بالخصوص اس کے "ساقی نامہ" پر انصار نے خوب لکھا ہے۔

ص ۲۸۰ پر سراج کی ولادت ۱۱۲۸ھ مطابق ۱۷۱۶ء میں لکھی ہے۔ عبدالقادر سروری نے "سراجِ سخن" (حیدر آباد، ۱۹۳۶ء) کے ص ۲۰ پر یہی تاریخِ ولادت تسلیم کی ہے لیکن بعد کی تدوین مثنوی "بوستانِ خیال" (حیدر آباد، ۱۹۶۹ء) کے ص ۷ پر ۱۳ صفر ۱۱۲۴ھ لکھی ہے جس کی تائید میں مادّہ "ظہور احمد" دیا ہے۔ اس کے اعداد ۱۱۲۴ ہیں۔ میں اسی کو ترجیح دوں گا۔ آخر میں پنجاب کے بلّھے شاہ اور سندھ کے میر محمود صابر پر لکھا ہے۔ ص ۲۹۳ پر کتاب کے آخری پیرے میں صابر کی تاریخِ وفات ۸۵-۱۱۸۴ھ مطابق ۱۷۷۱ء درج کی ہے۔ جمیل جالبی نے ۱۱۸۱ھ لکھی ہے اور اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۳۱۹)

یہاں کتاب یک بہ یک ختم ہو گئی ہے۔ کوئی خاتمہ یا مجموعی جائزہ نہیں۔ آخر میں کتابیات ہے، لیکن کتاب کے نام اور مصنف پر اکتفا کیا ہے، ان کا سنہ یا مقامِ اشاعت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ اس جلد کا معیار قابلِ قدر ہے۔

کتاب کی قدر بندی میں اس کی ہیئتِ ظاہری کا اہم رول ہوتا ہے۔ "تاریخِ اقلیمِ ادب" کتابت و طباعت و حسنِ ظاہر کے لحاظ سے پست معیار ہے۔ اگر وہ ہر بیان کا ماخذ اور حوالہ درج کریں، دونوں جلدوں کو ملا کر آفسیٹ میں سلیقے سے چھپوائیں تو یہ تاریخ اہلِ نظر کی نظر میں یقیناً اپنا مقام بنا سکتی ہے۔ موجودہ ہیئت نے اس کی قدر پست کر دی ہے۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱) "حیدر آباد میں اردو کی ترقی، تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے"، حیدر آباد، ۱۹۹۰ء، ص۳۶-۲۸

(۲) ایضاً، ص۳۱تا۳۶

(۳) مکتوب مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء بنام ڈاکٹر فضل الحق۔ مقدمہ دیوانِ شاکر ناجی، مرتبہ فضل الحق، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص۱۸

(۴) "انتخابِ حاتم، دیوانِ قدیم"، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص۹۹

Scanned by CamScanner

بیسواں باب

ڈاکٹر محمد صادق: اردو ادب کی تاریخ (انگریزی)

ڈاکٹر محمد صادق ۱۶ اگست ۱۸۹۸ء کو پشاور میں پیدا ہوئے اور ۱۷ جون ۱۹۸۴ء کو وفات پائی (۱)۔ انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں پی ایچ ڈی کا مقالہ "مولوی محمد حسین آزاد، حیات، کارنامے اور اثرات" جنوری ۱۹۳۹ء میں داخل کیا جس پر ۱۹۴۰ء میں ڈگری عطا ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ "محمد حسین آزاد، احوال و آثار" کے نام سے لاہور میں نومبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا (۲)۔ ڈاکٹر صادق انگریزی کے استاد تھے لیکن ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اردو کے صدر رہے (معین الرحمان: گورنمنٹ کالج لاہور ص۹۹)۔ ان کی "تاریخ ادب" پر ان کے نام کے ساتھ جو عہدے لکھے ہیں ان میں صدر شعبۂ انگریزی، گورنمنٹ کالج لاہور نیز پرنسپل، دیال سنگھ کالج لاہور بھی شامل ہیں۔

انھوں نے انگریزی میں اردو ادب کی ایک تاریخ لکھی۔ اس کی طبع اول کے دیباچے پر لاہور ستمبر ۱۹۵۷ء کی تاریخ پڑی ہے لیکن یہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ دوسرے ایڈیشن کے دیباچے پر کوئی تاریخ نہیں لیکن یہ ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب طلبہ اور باذوق عام قاری (Cultivated layman) کے لیے اردو ادب کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ تاریخ محققوں کے لیے نہیں، اور تحقیقی انداز میں نہیں لکھی گئی۔ ترقی پسند تحریک کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چونکہ انھوں نے اس پر اپنی کتاب "بیسویں صدی کا اردو ادب" (Twentieth Century Urdu Literature) میں تفصیل سے لکھا ہے اس لیے موجودہ کتاب میں اسے حذف کردیا۔ ادیبوں کے نمونے دینے ضروری تھے لیکن جگہ کی قلت کے سبب نہیں دیے۔ وہ اردو ادب کے اقتباسات کی ایک جلد شائع کرنے کا ارادہ کررہے ہیں جس سے اس کی تلافی ہوجائے گی۔ یہ دو کتابیں ہمیں رام بابو سکسینہ کی یاد دلاتی ہیں کہ انھوں نے بھی "جدید اردو شعرا" اور "مجموعۂ اقتباسات" کا وعدہ کرکے ان کی آڑ میں اپنی تاریخ کو ان سے مبرا رکھا تھا۔ اقتباسات پر

Scanned by CamScanner

مشتمل جلد تو نہ رام بابو سکسینہ نے شائع کی نہ صادق نے، جدید ادب سے متعلق کتابوں کی اشاعت کا بھی مجھے کوئی علم نہیں۔

طبعِ اوّل کے دیباچے میں وہ اپنے طریقِ کار سے متعلق چند مفید اشارے کرتے ہیں۔

۱۔ سوانحی اور تاریخی طریقوں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی طریقے کو بھی استعمال کیا ہے۔ عام تحریکوں اور مصنفوں کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ادیبوں اور ان کے کاموں کی فہرست سازی اور تاریخیں درج کرنا اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ کام ادبی تاریخ کے بجائے کتابیات کے ذیل میں آتا ہے اس لیے اس کتاب میں اسے نمایاں جگہ نہیں دی۔

۲۔ ادب اور زندگی میں ایک تسلسل ہوتا ہے۔ اردو ادب کا جدید حصّہ بھی بار بار قدیم دھاروں سے ٹکراتا ہے۔

۳۔ ادب کو محض ادب کے طور پر دیکھتا ہے، اپنے ملک اور مذہب کی محبت غیر ادبی ملحوظات ہیں جو تنقید کو مسخ کرتے ہیں۔

مجھے ان کے پہلے اصول کے جزِ دوم سے سخت اختلاف ہے کہ ادبی تاریخ میں تاریخوں کو نمایاں مقام نہیں دینا چاہیے۔ اس صنف کے نام ہی میں "تاریخ" کا لفظ شامل ہے۔ اردو میں History اور Date دونوں کا ترجمہ "تاریخ" ہے جس سے ہسٹری کی اس نوعیت پر روشنی پڑتی ہے کہ اس میں سنین ہونے چاہئیں۔ تنقیدی مضامین میں انھیں نظرانداز کیا جاسکتا ہے لیکن تاریخِ ادب میں نہیں۔ ہمیں کسی مصنف کی زندگی یا اس کی کتابوں کے سنین جاننے کی ضرورت ہوتی ہے تو تاریخِ ادب اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ تاریخ اس سلسلے میں ہماری مدد نہ کرے تو اپنے ایک اہم منصب میں ناکام رہے گی۔ اگر سنین دینے ہیں تو صحیح دینے چاہئیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر تحقیقی بحث سے مفر نہیں۔

دوسرے ایڈیشن کے پیش لفظ میں ان اضافوں اور ترمیموں کی نشان دہی کرتے ہیں جو اس میں اور سابقہ ایڈیشن میں ہیں۔ لکھتے ہیں کہ نئے مواد کی وجہ سے یہ ایک نئی کتاب ہو گئی ہے۔ باب ۱۹ "اقبال کے معاصرین"، باب ۲۰ "سب سے زیادہ بکنے والے" اور باب ۲۱ "فراق، جوش، حفیظ" میں کئی ایسے مصنفوں کو شامل کیا ہے جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھے۔ باب ۲۲ "جدید اردو ادب۔ شاعری" میں اقبال کے بعد کے ادب پر روشنی ڈالی ہے۔ باب ۴ "ولی دکنی اور دوسرے" نیز باب ۷ "دلی کا دبستانِ شاعری، عہدِ میر و سودا" نئے مواد کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ نظیرؔ اکبر آبادی کو ایک الگ باب نمبر ۸ دیا ہے۔ جدیدیت کے شاعروں اور تجریدی افسانہ نگاروں پر نہیں لکھا کیونکہ ان کے بارے میں کوئی رائے دینا قبل از وقت ہے، صراحت کرتے ہیں کہ اگر کتاب میں کسی شاعر کا ذکر نہیں تو وہ ارادی ہے کہ وہ

Scanned by CamScanner

ادبی معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ سوشلسٹ (ترقی پسند) ادب کا بیشتر حصہ ادب ہے کہ نہیں، یہ ادبی پیمانوں ہی سے طے کرنا ہوگا۔ طبعِ دوم میں دکنی ادب کے باب میں کوئی ترمیم نہیں کی کیونکہ اس کا اسلوب انھیں اجنبی معلوم ہوتا ہے اور وہ اس کی قدر بندی نہیں کر سکتے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اقبال سے پہلے کے ادیبوں کا ذکر ہے۔ اس کے گیارہ باب ص ۲۹۱ پر ختم ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اتنے بڑے دور کا جائزہ محض سرسری ہی لیا ہوگا۔ دوسرے حصے میں مزید ۱۶ باب اور ۲۳۷ صفحے ہیں۔ حصۂ اوّل کے خاتمے کے بعد فورٹ ولیم کالج کے مترجمین کے بارے میں محض دو صفحوں کا نوٹ ہے۔ دوسرے حصے کے آخر میں داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کے بارے میں چار صفحوں کا ضمیمہ ہے جو پہلے حصے میں ہونا چاہیے تھا۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا کتاب زیادہ تر تنقیدی ہے، تحقیقی نہیں۔ سنین پابندی سے نہیں دیے اور جہاں دیے ہیں ان کی صحت کی تحقیق نہیں کی گئی جس کی وجہ سے ان میں کثرت سے اغلاط ہیں۔ پہلا باب تاریخی پس منظر کا ہے جو ۱۳ صفحوں کو محیط ہے۔ اس میں سیاسی تاریخ نہیں، معاشی، معاشرتی اور ذہنی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ مصنف انگریزی کا معلم ہے اس لیے اس کے لکھنے کا ڈھنگ اردو کے مورخوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا نقطۂ نظر جدید اور مغرب سے متاثر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں عہد وسطیٰ کا تجزیہ کرنا بہت پیچیدہ عمل ہے۔ ہندوستان میں اسلام کا یہ متضاد رول رہا ہے کہ اس نے غیر مسلم معاشرے کے لیے ایک لبرل طاقت کا فریضہ انجام دیا لیکن اپنی ملت کے بیچ سختی سے جابرانہ طریق اختیار کیا۔ اکبر کے دور میں اسلام اور ہندوئیت میں امتزاج کی کوشش کی گئی، اس سے ہٹ کر مسلم اقتدار میں کہیں بھی افکار میں ترقی نہیں دکھائی دیتی۔ (ص ۲، ۳)

قرونِ وسطیٰ کے معاشرے میں تحرک نہ تھا۔ جابرانہ حکومت کی وجہ سے لوگ قنوطی ہوگئے تھے۔ سیاسی نظام کو دینیاتی نظام نے شدید تر کر دیا تھا۔ مغل دور میں کوئی مقبول تعلیمی نظام نہ تھا۔ ابتدائی تعلیم مسجدوں سے ملحق مکتبوں میں اور اعلیٰ تعلیم مدرسوں میں ہوتی تھی جہاں ماضی کا سرمایہ پیش کیا جاتا تھا، ذہن کو آزاد نہیں کیا جاتا تھا۔ معاشی پس ماندگی کی وجہ سے قرونِ وسطیٰ رجعتی ہوگئی تھیں۔ دو اور اداروں نے زندگی اور ادب کو متاثر کیا۔ پہلا تصوف ہے جس نے ترک کی تعلیم دی۔ کہا کہ اہلِ اقتدار کی ملازمت اور اس سے حاصل شدہ وقار سے بچ کر اپنے ضمیر کو محفوظ رکھو۔ دوسرا ادارہ اُمرا کی سرپرستی تھی جس سے دنیوی مراتب ملتے تھے۔ القصہ تاریخی پس منظر کا باب خوب ہے۔ اردو میں ایسا نہیں ملتا۔

دوسرے باب کا عنوان "عہدِ وسطیٰ کی اردو شاعری کی خصوصیات" ہے۔ یہ بھی ایک

قسم کا تمہیدی تنقیدی مضمون ہے، باقاعدہ داستانِ تاریخ کی ابتدا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسے ادبی منظر نامہ سمجھیے۔ لکھتے ہیں کہ اردو شاعری فارسی شاعری کا تسلسل نیز مقلد ہے۔ اس میں موضوعات، ہیئتیں، عروض سب کچھ فارسی ہیں، انھیں اپنے ملک سے کوئی علاقہ نہیں۔ اردو شاعری میں مقامی رنگ کا نہ ہونا سب سے بڑی کمی ہے۔ مواد اور اسلوب میں طبّاعی کی کوئی گنجائش نہیں۔ نظامی عروضی نے کہا تھا کہ شاعر کو قدما کے دو لاکھ اشعار حفظ کرلینے چاہئیں۔ تاکہ وہ انھیں کی طرح لکھ سکے۔ چودھویں صدی کے اواخر میں شرف الدین رامی نے فارسی میں انیس العشاق لکھی جس کے ۱۹ ابواب میں محبوب کے مختلف اعضا کی تشبیہیں اور ان کے اشعار درج تھے (ص۱۸)۔ سب سے مقبول اصناف غزل، قصیدہ اور مرثیہ تھیں۔ مصنف نے غزل کے سلسلے میں مشاعروں کا ذکر کیا جن میں ذاتی رنجشیں اور مناقشے سامنے آتے تھے۔ حالی نے مسدس میں اردو شاعری پر تنقید کرتے ہوئے دو بند لکھے جن کے یہ مصرع مشہور ہیں۔ ع:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر

اور ع:

جہنم کو بھردیں گے شاعر ہمارے

تیسرے باب سے باقاعدہ تاریخ ادب شروع ہوتی ہے۔ اس کا عنوان ہے "گولکنڈہ اور بیجاپور کا اردو ادب"۔ ۱۱ صفحات کے اس باب میں ولی سے قبل کے پورے دکنی ادب کو نمٹا دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دکنی زبان کے بارے میں دو نظریے ہیں: ۱۔ شمالی ہند کے فاتحوں نے اپنی زبان دکن پر لاد دی۔ ۲۔ شمال والوں کی بول چال کی زبان اور قدیم دکنی کے امتزاج سے دکنی زبان تشکیل پذیر ہوئی۔ دونوں میں حقیقت کیا ہے کہہ نہیں سکتے (ص۵۰)۔ میں نے کہیں یہ باقاعدہ نظریے نہیں دیکھے۔ دوسرا نظریہ اس لیے ناقص ہے کہ یہ دکنی کی تاویل ایک اور قدیم تر دکنی سے کرتا ہے، ہمیں اسی اصل دکنی ہی کے آغاز کی جستجو ہے۔

صادق مزید لکھتے ہیں کہ دکنی میں پنجابی کا کافی عنصر ہے۔ ایک پنجابی قدرے محنت سے دکنی شاعری کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے بہ نسبت اُن کے جن کی مادری زبان اردو ہے (ص۵۱)۔

ان کا یہ دعویٰ شیرانی کی "پنجاب میں اردو" کا اثر ہے جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ قدیم دکنی شاعری کو نہ صرف پنجابی اور یوپی کا باشندہ مشکل سے سمجھتا ہے، بلکہ آج کے دکن کے باشندے کو بھی مشکل درپیش آتی ہے۔ یہ میں ان تینوں زبانوں کے طالبِ

Scanned by CamScanner

ملوں کے تجربے کے پیشِ نظر کہہ رہا ہوں۔ چند الفاظ کی بات دوسری ہے جواب بھی بول چال میں باقی ہیں۔ بیشتر متروک اور فرسودہ الفاظ دکنی طلبہ کے لیے بھی ناقابلِ فہم ہیں۔ مصنف کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ دکنی نے مراٹھی، تامل اور تیلگو سے بے تامل مستعار لیا (ص ۵۱)۔ ادبی دکن میں مراٹھی کے چند الفاظ ضرور ہیں لیکن دراوڑی زبانوں تامل یا تیلگو کا کوئی لفظ نہیں۔ بول چال کی دکنی میں تیلگو کے چند الفاظ در آگئے ہیں لیکن وہ ادبیات میں نہیں۔

اس باب میں دکنی ادیبوں کا ذکر سرسری ہے اور اس میں تحقیقی اغلاط ہیں۔ ص ۵۲ پر بہمنی حکومت کا خاتمہ ۱۵۲۶ء میں دکھاتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۷ء لکھا ہے (دکن میں اردو ص ۴۹)۔ ۹۳۴ھ مطابق ہے ۲۸-۱۵۲۷ء کے۔ صادق لکھتے ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ مسلم رعایا کے بجائے ہندوؤں کا طرف دار تھا جس کی وجہ سے اسے استہزا کے طور پر جگت گرو کہنے لگے (ص ۵۳)۔ اس لقب کی یہ تاویل غلط ہے۔ اس میں طنز یا استہزا کا کوئی شائبہ نہیں۔ ص ۵۴ اور ۵۸ پر وجہی کی مثنوی کا نام "قطب و مشتری" لکھا ہے۔ صحیح قطب مشتری بدونِ اضافت ہے۔ مثنوی کے آخر میں نام یوں دیا ہے ع:

قطب مشتری میں جو بولیا کتاب

وجہی نے عربی تلفظ کے برخلاف قطب کی "طا" کو متحرک باندھا ہے۔ بقولِ مصنف بیجاپور کے شعرا میں صرف کمال خاں رستمی اور نصرتی ہی قابلِ ذکر ہیں۔ ص ۵۴ پر خاور نامے کی تاریخ ۱۶۴۹ء لکھتے ہیں۔ جالبی نے شیخ چاند کے مرتبہ خاور نامے کو دیکھ کر اس کی تاریخ ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء درج کی ہے (جلد ۱، ص ۲۶۵)۔ صادق نے فارسی خاور نامے کی تاریخ ۱۴۷۰ء لکھی ہے (ص ۵۵) جالبی کے مطابق ۱۴۳۶ء ہے۔

بیجاپور کے محض ان دو شعرا کے ذکر کے بعد گولکنڈہ پر آجاتے ہیں۔ اس میں قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۱۱ء لکھتے ہیں (ص ۵۶)۔ صحیح تاریخ ۱۷ ذی قعدہ ۱۰۲۰ھ/ ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء ہے (۳) ڈاکٹر صادق ہجری سنہ کے برابر محض ایک عیسوی سنہ فرض کر لیتے ہیں اور ہجری سنہ نہ دے کر محض عیسوی سنہ دیتے ہیں جس سے بارہا ایک سال کا فرق ہوجاتا ہے۔ ص ۵۸ پر وجہی کی سب رس کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تحقیق و تاریخ سے کتنے دور ہیں۔ "سب رس" کا خاص عیب یہ قرار دیتے ہیں کہ اس کے قصے کی ابتدا آبِ حیات کی تلاش سے ہوتی ہے لیکن بعد میں یہ مقصد بالکل پسِ پشت جا پڑتا ہے اور اصل قصہ حسن و دل کا معاملہ قرار پاتا ہے۔

ص ۶۰ پر غواصی کی "سیف الملوک و بدیع الجمال" میں بیلی کی تقلید میں ۱۴۰۰۰ سطور

قرار دیتے ہیں حالانکہ اس میں دراصل تقریباً دو ہزار شعر ہیں (۴)۔ ابنِ نشاطی کی "پھول بن کا ذکر" ایک سطر سے کم میں کیا ہے۔ اس میں ۳۵۰۰ سطریں لکھی ہیں جب کہ جالبی نے اس کے اشعار کی صحیح تعداد ۱۷۴۴ لکھی ہے (جلد ۱، ص ۴۸۸)۔ ظاہر ہے کہ بیلی نے سطر سے مصرع مراد لیا تھا گو اس کے شمار میں بھی چوک ہو گئی۔ طبعی کی "بہرام و گل اندام" کا نام بھر ہی لیا ہے۔ دوسرے شعرا اس لائق بھی نہ ٹھہرے۔ اس باب کے آخر میں یہ حیرت ناک دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر عبدالحق کے علاوہ کسی اور ریسرچ اسکالر سے واقف نہیں جس نے اپنا وقت اور توجہ دکنی ادب کے باقاعدہ مطالعے کی نذر کیے ہوں اور اسے صحیح شکل میں پیش کیا ہو (ص ۶۰)۔ دکنی کے محققین میں شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری اور ان کے اخلاف کو بالکل نظر انداز کر کے انصاف نہیں کیا۔

چوتھا باب "ولی دکنی اور دوسرے" ہے۔ اس میں (ص ۶۲) پر شیخ چاند کو ڈاکٹر چاند لکھا ہے حالانکہ انھوں نے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل نہیں کی۔ شیخ چاند کا قول نقل کرتے ہیں کہ مغل عہد میں احمد آباد، احمد نگر اور سورت کی زبان و ادب شمال ہند سے مختلف نہ تھی۔ اس کی تائید میں عزیز اللہ ہمر نگ اورنگ آبادی کی آخری سورۂ قرآن کی تفسیر موسومہ بہ "تفسیر چراغِ ابدی" (۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ) سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ اورنگ آباد کی زبانِ ہندی میں ہے جو دکھنی زبان سے مختلف ہے (ص ۶۳-۶۴)۔ ڈاکٹر صادق کی غیر تحقیقی تاریخ میں یہ اہم نادر اقتباس قابلِ قدر ہے۔ مولوی عبدالحق کے مجموعے "قدیم اردو" میں یہ ص ۱۴۴ پر ملتا ہے۔

ولی کے وطن کی بحث اچھی کی ہے۔ یہ فیصلہ بھی بجا ہے کہ ولی احمد آباد میں ہوئے اور اورنگ آباد میں پروان چڑھے (ص ۶۶)۔ ولی کے دکنی الاصل نہ ہونے کے دو وکلا قاضی میاں احمد جونا گڑھی (کذا) اور ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کا نام لیتے ہیں (ص ۶۵)۔ اول الذکر کا صحیح اور پورا نام قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی ہے، لیکن یہ ولی کی تحقیق میں ممتاز نہیں۔ مصنف نے گجرات کی اردو کو گجراتی کہا ہے، صحیح گجری ہے کیونکہ گجراتی "گجری اردو" سے مختلف زبان ہے۔ جمیل جالبی کی طرح صادق بھی سوال کرتے ہیں کہ اگر ولی کی اردو دہلی، پہنچنے کے بعد ابھرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے دیوان کا بڑا حصہ عمر کے آخری سات برسوں کی تخلیق ماننا ہوگا جو درست نہیں (ص ۶۸)۔ محمد اکرم (چغتائی) کی اس تحقیق کا ذکر کرتے ہیں کہ جب ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی گیا تو شاہ سعد اللہ گلشن وہاں نہ تھے اور اس کی دو شہادتیں دیتے ہیں۔ ولی کے سنہ وفات کے معاملے میں مولوی عبدالحق کی تحقیق کو درست مانتے ہیں۔ اس طرح کم از کم ولی کے بیان میں مصنف نے تحقیق کا اچھا ثبوت دیا ہے۔ ولی

Scanned by CamScanner

کی شاعری کی تنقید بہت مفصّل ہے۔ ص ۰۷ پر ولی کی تین غزلیں نقل کرتے ہیں جن میں سے دو ظاہراً ریختے میں ہیں اور تیسری ولی کے مقطعے کے مطابق دکنی میں، لیکن تینوں کی زبان یکساں ہے۔

ولی کے بعد دکن کے دو شعرا داؤد اور سراج کا بیان ہے۔ داؤد کا سنہ وفات ۱۷۳۴ء لکھا ہے (ص ۸۳)۔ شفیق نے چمنستانِ شعرا میں لکھا ہے کہ انھیں داؤد کے لڑکے نے بتایا کہ داؤد کا انتقال ۱۱۵۷ھ میں ہوا، لیکن شفیق نے جو اس کا قطعۂ تاریخ کہا اس میں یہ بیت ہے۔

مصرعِ تاریخ خوش گفت از من ہاتفے

کہ "برفتہ میرزا داؤد از فانی جہاں"

اس مادّے سے ۱۱۶۸ھ حاصل ہوتا ہے۔ ۱۱۵۷ھ کا زیادہ حصّہ ۱۷۴۴ء کے برابر ہے اور ۱۱۶۸ھ مطابق ہے ۵۵۔ ۱۷۵۴ء کے۔ نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" ص ۳۷۹ پر ۱۱۶۸ھ درج کیا ہے اور ڈاکٹر زور نے "دکنی ادب کی تاریخ" میں ۱۷۵۴ء (حیدر آباد، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۴)۔ مالک رام نے تذکرۂ ماہ و سال میں ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء لکھا ہے۔ ۱۷۳۴ء لکھنا صادق ہی کا اجتہاد ہے۔ انھوں نے سراج پر کوئی تنقید نہیں کی۔ اس کی غزلوں کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ حیرت ہے کہ اس کی مثنوی "بوستانِ خیال" کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔

پانچویں باب کا عنوان ہے "اردو کی موافقت میں ردِّ عمل" اس کی ابتدا میں تاریخی پس منظر دیا ہے کہ کس طرح دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوئی اور صوبوں میں حاکم خود مختار ہو گئے۔ اس سے فارسی کا اثر کمزور پڑ گیا اور اردو کو ترجیح دی جانے لگی جس کی وجہ سے فارسی کے شعرا خانِ آرزو، مظہر جانِ جاناں اور شاہ گلشن وغیرہ نے اردو شعرا کی ہدایت کی۔

چھٹا باب ہے "دہلی کا دبستانِ شاعری۔ حصّۂ اوّل حاتم کا دور" اس کے شروع میں دہلی کے متقدمین شعرا کی دو بد قسمتیوں کا ذکر ہے۔ اوّل یہ کہ ان کی کتابیں غدر میں تلف ہو گئیں، دوسرے یہ کہ وہ ایہام کے شوقین تھے جو اُن کے عہد میں مقبول تھا لیکن ان کے اخلاف نے اس پر سخت تنقید کی (ص ۹۶)۔ مصنّف کا یہ مفروضہ درست نہیں کہ متقدمین کا کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ استدادِ زمانہ سے کچھ تلف ہو گیا ہوگا، بیشتر موجود ہے۔ صادق نے ایہام کی مقبولیت اور زوال کے اسباب پر تفصیل سے غور کیا ہے (ص ۹۸۔ ۹۷) پر لکھتے ہیں۔

آبِ حیات کے مطابق یہ ہندی کا اثر تھا لیکن ولی کے ان متبعین نے ہندی روایت کو چھوڑ کر فارسی شعرا کی تقلید کی تھی۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ ایہام زوال آمادگی کی پیداوار تھا لیکن کیا سودا اور میر کے عہد میں انحطاط ختم ہو گیا تھا۔ صاحب "جواہرِ سخن" نے دکھایا ہے کہ عہدِ محمد شاہ میں یہ فارسی شعرا کا مسلّمہ طرزِ کلام تھا چنانچہ اورنگ آباد تک کے فارسی شعرا

Scanned by CamScanner

میں بھی مقبول تھا۔ دراصل یہ شاعری کا محض ایک فیشن ہو گیا تھا اور فیشن ہمیشہ بہت قلیل مدت تک جاری رہتا ہے (ص ۹۸-۹۷)۔

حاتم پر نسبتاً تفصیل سے یعنی پانچ صفحوں میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے جس میں اس کی اصلاحِ زبان پر توجہ مرکوز کی ہے۔ اس کی شاعری بالخصوص قصیدہ شہر آشوب کے نمونے قابلِ قدر ہیں۔ متقدمین کے اس مختصر باب میں بعض سنین درست نہیں۔ دیکھیے:

صادق	جمیل جالبی
ص ۹۹ آبرو: ولادت ۱۶۹۲ء	ولادت ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء۔ قاضی عبدالودود ۱۰۹۰ھ/۱۶۸۳ء (تاریخ، جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۱۲)
۱۰۰ آبرو: وفات ۱۷۴۷ء	وفات ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ (ایضاً)
ص ۱۰۰ مضمون: ولادت قبل ۱۶۸۹ء (ماخذ؟) وفات قریب ۱۷۴۵ء	وفات ۱۱۴۷ھ/۳۵-۱۷۳۴ء (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۵۸)
ص ۱۰۰ شاکر ناجی: وفات ۱۷۵۴ء	وفات ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء (ایضاً ص ۲۴۲)
ص ۱۰۰ حاتم: فوت ۱۷۸۱ء یا ۱۷۹۲ء	صحیح رمضان ۱۱۹۷ھ/ اگست ۱۷۸۳ء (ایضاً ص ۴۲۷)
ص ۱۰۰ حاتم کے دیوان زادہ کی ترتیب ۱۷۵۷ء	۱۱۶۹ھ/۵۶-۱۷۵۵ء (ایضاً ص ۴۲۸)

ساتواں باب "دلّی کا دبستانِ شاعری حصہ دوم عہدِ سودا و میر" ہے۔ اس میں مرزا مظہر جانِ جاناں کے لیے لکھتے ہیں کہ مرزا مظہر کو تذکروں میں بہت اعلیٰ مقام دیا گیا ہے لیکن اس کے کلام کی مقدار و معیار سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل اس کی اہمیت دو وجوہ سے ہے: ۱۔ بطور صوفی کے ۲۔ ایہام کے خلاف احتجاج کر کے اردوئے معلّیٰ کی وکالت کرنے کی وجہ سے (ص ۱۰۷) مظہر کے بارے میں مختصراً لکھنے کے بعد سودا پر ص ۱۰۷ کے آخر سے ص ۱۳۰ تک لکھا ہے۔ اس تاریخ میں کم شعرا کو ۲۲ صفحے دیے گئے ہوں گے۔ اول حیاتِ سودا کی چند تاریخیں۔

ص ۱۰۸ پر سودا کی ولادت کا سنہ ۱۷۱۳ء لکھا ہے۔ جالبی نے اپنی تاریخ کی جلد ۲، حصہ دوم میں طویل بحث کے بعد ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء طے کی ہے (ص ۶۴۹ و ۶۵۴)۔ مصنف لکھتے ہیں کہ سودا ۱۷۵۷ء میں دہلی سے گئے (ص ۱۰۸)۔ جالبی کے مطابق ربیع الآخر ۱۱۷۳ھ/ نومبر

Scanned by CamScanner

۱۷۵۹ء میں دہلی چھوڑی (ص ۶۵۶)۔ صادق نے ص ۱۰۸ پر سودا کی وفات کی تاریخ ۲۶ جون ۱۷۸۰ء لکھی ہے۔ اس میں ایک سال کا سہو ہوا ہے۔ جالبی کے مطابق ۴ رجب ۱۱۹۵ھ/ ۲۷ جون ۱۷۸۱ء ہے (ص ۶۵۶)۔ مالک رام نے اسی ہجری تاریخ کے مطابق عیسوی تاریخ ۲۶ جون ۱۷۸۱ء لکھی ہے۔

تنقیدِ کلام میں مصنف سودا سے زیادہ خوش نہیں۔ کہتے ہیں وہ حقیقت سے دور تھا (ص ۱۱۳)۔ وہ مطلق تھا یعنی صنعت گری میں استادی دکھاتا تھا (ص ۱۱۴) لیکن بہت سے اشعار درد آمیز بھی ہیں۔ ص ۱۱۷ پر "مخمسِ آشوب" کا اقتباس ہے۔ اس کا صحیح نام "مخمس شہر آشوب" ہے۔ ص ۱۲۵ پر ڈاکٹر چاند کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں وہ ڈاکٹر نہیں تھے۔ ان کا پورا نام شیخ چاند تھا۔ سودا سے آزردگی کے باوجود مصنف نے ان کے شہر آشوب، قصیدوں اور حد یہ ہے کہ ہجووں کی بھی تعریف کی ہے۔

سودا کے ۲۲ صفحوں کے مقابلے میں میر کو ۱۱ صفحے دیے ہیں۔ ان پر اچھا لکھا ہے لیکن آخر میں کہہ گئے ہیں کہ میر کی جس طرح بڑھ چڑھ کر تعریف کی جاتی ہے دراصل وہ اتنے نہیں۔ ان کا پست بہت پست ہے (ص ۱۳۸)۔ حیرت ہے کہ میر کی عشقیہ مثنویوں کو سرے سے نظرانداز کردیا ہے۔ میر درد کا سنہ ولادت ۱۷۱۹ء لکھا ہے۔ جالبی کے مطابق ۱۱۳۳ھ/ ۲۱-۱۷۲۰ء ہے (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۲۳)۔ قائم کے لیے لکھتے ہیں کہ اسے نظرانداز کرنا اردو ادب کا سب سے زیادہ افسوس ناک واقعہ ہے اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ آزاد نے اسے "آبِ حیات" میں علاحدہ باب نہیں دیا (ص ۱۴۳)۔ میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" پر فکرانگیز طریقے سے لکھتے ہیں کہ یہ ایک پُراسرار نظم ہے جو نفسیاتی مطالعہ چاہتی ہے کیونکہ یہ بہت عُریاں اور فحش ہے (ص ۱۴۸)۔ ص ۱۵۰ پر میر حسن کا سنہ ولادت ۱۷۲۷ء لکھا ہے۔ جالبی کے مطابق ۱۱۴۹ھ/ ۳-۱۷۳۶ء متعین کیا جاسکتا ہے (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۸۲۲)۔ ص ۱۵۱ پر پھر لائن بمعنی مصرع استعمال کرتے ہیں۔ "سحرالبیان" پر مختصر لکھا ہے، نقد کا حق بالکل ادا نہیں کیا لیکن اس مثنوی کی داد دی ہے۔

آٹھواں مختصر باب پورے کا پورا نظیر اکبر آبادی پر ہے۔ رام بابو سکسینہ نے بھی نظیر کو ایک باب دیا تھا۔ ص ۱۵۴ پر نظیر کی ولادت ۱۷۴۰ء میں دکھائی ہے حالانکہ ۱۷۳۵ء پر بیشتر لکھنے والوں کو اتفاق ہے مثلاً عبدالغفور شہباز زندگانیِ بے نظیر میں اور فرحت اللہ بیگ دیوانِ نظیر کے مقدمے میں۔ صادق نظیر سے بہت خوش ہیں موضوع اور زبان دونوں کے اعتبار سے۔ فیلن کی ہندوستانی انگریزی لغت (۱۸۷۹ء) کے مقدمے سے نظیر کے بارے میں ایک تحسینی اقتباس نقل کرتے ہیں لیکن نظیر کی فلسفیانہ نظموں مثلاً بنجارہ نامہ، آدمی نامہ

Scanned by CamScanner

وغیرہ کا بالکل ذکر نہیں کیا جو نظیر کو اردو کا کبیر بنا دیتی ہیں۔ ص ۱۶۱ پر ان کی طرف ایک اُچٹتا سا اشارہ ہے اور بس۔ آزاد پر یہ دلچسپ تنقید کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ۱۸۷۴ء کے لیکچر میں ابنائے وطن کو تلقین کی کہ شاعری کو زنجیروں سے آزاد کرائیں لیکن "آبِ حیات" میں نظیر کا نام بھی آنے کے روادار نہیں ہوئے (ص ۱۶۴)

نواں باب اردو شاعری کے دبستانِ لکھنؤ پر ہے۔ اس میں کئی ایسے شعرا کو شامل کرلیا ہے جو دِلّی سے لکھنؤ آئے۔ انھیں دبستانِ لکھنؤ کا رُکن قرار دینا محلِ نظر ہے۔ ایسے شعرا ہیں مصحفی، میر سوز، انشا جرأت اور رنگین، لیکن یہ سچ ہے کہ انشا، رنگین اور جرأت نے دبستانِ لکھنؤ کی تشکیل میں ضرور مدد دی۔ اس باب کی ابتدا میں مختصر سا سیاسی پس منظر دیا ہے اور اس حد تک ٹھیک ہے۔ ص ۱۶۷ پر یہ جو لکھا ہے کہ واجد علی شاہ ڈرامے میں کرشن بنتے تھے اس بات کو مسعود حسن رضوی بے بنیاد ثابت کر چکے ہیں۔ لکھنؤ کے معاشرتی تجزیے میں یہ درست لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کی تاریخ کے دو نمایاں پہلو مذہبیت اور نشاط ہیں (ص ۱۶۸)۔ اس سلسلے میں لکھنؤ میں طوائفوں کی مقبولیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے ماحول اور پسندیدگیوں کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ دہلوی شعرا کا عشق روحانی تھا (ص ۱۶۹)۔ میری رائے میں ڈاکٹر صادق نے لکھنؤ کے معاشرتی اور ذہنی پہلو کا تجزیہ و مرقع کشی بہت خوش اسلوبی سے کی ہے۔

شعرا کے ذکر میں ایک فاش غلطی یہ کی ہے کہ بارہا انشا کو مصحفی کا شاگرد لکھتے ہیں۔ ص ۱۷۳ پر انشا کی تعارفی سطر میں ہی اسے مصحفی کا شاگرد قرار دیا ہے۔ اگلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ انشا اپنے استاد مصحفی سے لڑ گئے، داؤں پیچ سے مصحفی کو سلیمان شکوہ کی استادی سے ہٹا دیا اور خود استادِ شہزادہ بن گئے۔ سلیمان شکوہ نے مصحفی کی تنخواہ ۲۵ روپے سے گھٹا کر پانچ روپے کردی (ص ۱۷۴)۔ مصنف نے یہ سب آب حیات سے لیا ہے گو حوالہ نہیں دیا۔ مآخذ کا حوالہ وہ بالعموم دیتے بھی نہیں۔ ان بیانات کی تکذیب قاضی عبدالودود، اسلم فرخی اور عابد پیشاوری کر چکے ہیں۔ انشا پہلے سے سلیمان شکوہ کے استاد تھے۔ ان کی سفارش سے مصحفی اس دربار میں پہنچے۔ مصحفی کا ۲۵ اور پانچ روپے والا شعر انشا سے معرکے کے بہت بعد کا ہے۔ اس میں سلیمان شکوہ کا نہیں، کسی اور رئیس کا ذکر ہے (۵)۔ انشا کی شرارت پسندی، جنگجوئی، ظرافت اور خفیف الحرکاتی پر خوب لکھا ہے (ص ۱۷۵)۔ حیرت ہے کہ انشا کا سنہ وفات نہیں لکھا۔

ص ۱۹۸ پر نواب مرزا شوق سے چار مثنویاں منسوب کی ہیں جن میں "لذتِ عشق" کو بھی شامل کیا ہے۔ "لذتِ عشق" شوق کی نہیں، بلکہ ان کے بھانجے آغا حسن نظم کی تصنیف

Scanned by CamScanner

ہے۔ "زہرِ عشق" کے ہیرو کے کردار کی خامی اور مثنوی "زہرِ عشق" کے انجام پر تنقید بہت مناسب ہے (ص ۹۹-۱۹۸)۔ ایک باب میں پورے دبستانِ لکھنؤ: غزل، مثنوی اور حد ہے کہ نثر کو بھی نمٹا دیا۔ مثنوی نگاروں میں صرف نسیم اور شوق کو لیا ہے۔ اس باب کے آخر کے ایک صفحے میں رجب علی بیگ سرور پر لکھا ہے۔ "فسانۂ عجائب" میں مہر نگار کے علاوہ بقیہ سب کرداروں کو بے جان کہتے ہیں (ص ۲۰۲)۔ عام طور سے "فسانۂ عجائب" کے خلاف ہیں۔

اب اس باب کے سنین کے تسامحات پر ایک نظر۔

"سودا شجاع الدولہ کے عہد کے آخری ایام میں ۱۷۷۳ء میں لکھنؤ آئے"۔ (ص ۶۸-۱۶۷)

اس بیان میں دو غلطیاں ہیں۔ شجاع الدولہ کا دارالخلافہ لکھنؤ نہیں، فیض آباد تھا۔ سودا ۸۵-۱۱۸۳ھ/ ۷۱-۱۷۶۹ء کے بیچ فیض آباد آئے (جالبی، جلد ۲، حصہ ۲، ص ۵۲-۶۵۱)

مزید مشاہدات:

دوسرے	صادق
جالبی: ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء میں آئے (جلد ۲/۱، ص ۵۱۵)	ص ۱۶۸ میر ۱۱۸۳ھ میں لکھنؤ آئے
ابو اللیث: ۱۱۹۸ھ/ ۸۴-۱۷۸۳ء اور ۱۲۰۱ھ/ ۸۷-۱۷۸۶ء کے بیچ آئے (تاریخِ مسلمانان، جلد ۷، ص ۲۶۹)	ص ۱۶۸ مصحفی ۱۷۹۰ء میں لکھنؤ آئے
جالبی: ۱۷۷۱ء کے بعد فیض آباد گئے، بعد میں لکھنؤ آئے (جلد ۲/۲، ص ۷۹۵)	ص ۱۶۸ میر سوز ۱۷۹۷ء میں لکھنؤ آئے
عابد پیشاوری: آصف الدولہ کے عہد میں ۱۷۸۸ء/ ۳-۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں تھے (انشا اللہ خان انشا، ص ۱۳۱)	ص ۱۶۸ انشا سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ آئے
عابد: ۱۷۹۰ء میں آئے (ایضاً ص ۱۳۵)	ص ۱۶۸ مرزا سلیمان شکوہ ۱۷۸۸ء میں لکھنؤ آئے
ابو اللیث: ولادت ۴۲-۱۱۴۱ھ/ ۳۰-۱۷۲۸ء (تاریخِ مسلمانان، جلد ۷، ص ۲۶۵) حنیف نقوی: جمادی الاخریٰ ۱۱۷۰ھ/ مارچ ۱۷۵۷ء (غیر مطبوعہ مضمون مصحفی کا سالِ ولادت)	ص ۱۷۱ مصحفی: ولادت ۱۷۵۰ء

Scanned by CamScanner

ص ۱۷۳ انشاء: ولادت ۱۷۵۶ء اور ۱۷۵۸ء کے بیچ	مالک رام: صفر ۱۱۶۶ھ/دسمبر ۱۷۵۲ء (تحقیقی مضامین، ص ۱۴۲)۔
ص ۱۹۳ دیا شنکر نسیم کی حیات ۴۳-۱۸۱۱ء	ابواللیث: ۴۴-۱۸۱۲ء (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، طبع اول، ص ۳۵۴)۔ شاہ عبدالسلام (دبستانِ آتش، عبدالسلام (دبستانِ آتش، دہلی، ۷۷، ص ۲۲۶)
ص ۱۹۷ رنگین کی حیات ۱۸۳۴-۱۷۵۶ء	حسن آرزو: پ ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۷۱ھ/۲۳ جولائی ۱۷۵۸ء ف ۱۲۵۱ھ/۳۶-۱۸۳۵ء (سعادت یار خاں رنگین ۱۹۸۴ء۔ ص ۶۱ و ص ۸۴)
ص ۱۹۷ جان صاحب: ف ۱۸۹۷ء	خلیل احمد صدیقی: ۱۸۸۶ء/۱۳۰۲ھ (ریختی کا تنقیدی مطالعہ۔ لکھنؤ ۱۹۷۴ء۔ ص ۳۹۷)
ص ۲۰۱ مرزا سرور: پ ۱۷۸۷ء یا آس پاس	نیر مسعود: پ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء، ف ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء (رجب علی بیگ سرور، الہ آباد ۱۹۶۷ء۔ ص ۷۵ و ص ۴۰۱)

دسواں باب "مرثیۂ انیس و دبیر" ہے۔ مصنف نے مذہبی ملحوظات کو پرے رکھ کر عمومی حیثیت سے اردو مرثیے کی جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے وہ تنقیدی اور فکری اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ ملاحظہ کیجیے ص ۲۰۸ تا ص ۲۱۳۔ کہتے ہیں کہ مرثیے کو رزمیہ کہنا بے سود ہے۔ یہ ایک مذہبی صنف ہے جس میں بَین کرنا ثواب مانا جاتا ہے (ص ۲۱۱)۔ انیس کا عرصۂ حیات ۱۸۰۲ء تا ۱۸۷۴ء قرار دیتے ہیں (ص ۲۱۳)۔ اکبر حیدری نے اپنی کتاب "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا" میں ص ۵۶۹ پر سنہ ولادت ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء لکھا ہے، تاریخِ وفات ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ/۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء لکھی ہے (ص ۵۷۶)۔ صادق نے دبیر کی ولادت و وفات دونوں انیس کے ایک ایک سال بعد طے کی ہیں۔ ڈاکٹر محمد زماں خاں آزردہ کے مطابق ولادت ۱۹ اگست ۱۸۰۱ء کو اور وفات ۹ مارچ ۱۸۷۵ء کو ہوئی (مرزا سلامت علی دبیر۔ سری نگر ۱۹۸۱ء، ص ۵۱)

مصنف شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" کو جانبدارانہ مانتے ہیں۔ انیس سے ان کی شکایات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کی نظر میں انیس کا اسلوب اکثر ناقص ہے اور جذبات غیر اصلی ہیں (ص ۲۱۳)۔ انیس کے کئی مصرع درج کرکے ان میں نسوانی محاوروں کو عامیانہ قرار دیتے ہیں (ص ۲۱۴)۔ صغریٰ کی پوری گفتگو کو مصنوعی کہا ہے (ص ۲۱۷)۔ دبیر کے مرثیے کے مرصع اسلوب کے نمونے کے بعد ایک اور مرثیے کا طویل اقتباس پیش کرتے

Scanned by CamScanner

ہیں جو صاف روزمرہ میں ہے۔ کہتے ہیں کہ دبیر کے یہاں اس انداز میں پورے مرثیے ملتے ہیں (ص ۲۲۳-۲۲۴)۔ بیانیہ میں انیس اور دبیر دونوں تصنع اور مبالغے کے گناہ گار ہیں لیکن زبان کے باب میں انیس، دبیر سے بہت آگے ہیں (ص ۲۲۶)۔

گیارھواں باب غالب کا دور ہے۔ اس باب میں ذوق، مومن، غالب، شاہ ظفر، داغ اور امیر مینائی کو لیا ہے۔ ص ۲۲۹ پر ذوق کے والد کو سپاہی لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ وہ دربان تھے، بلکہ بعض لوگوں نے تو انھیں نائی لکھ کر کہا ہے کہ آزاد نے انھیں استرے کے بجائے تلوار پکڑا دی۔ عجیب ترین بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صادق نے ذوق کو محض غزل گو کے طور پر پیش کیا ہے، قصیدے کا بالکل ذکر ہی نہیں کیا۔ مومن پر مختصراً لکھ کر غالب پر بہت تفصیل سے یعنی ص ۲۴۱ سے ۲۷۷ تک (جملے ۳ صفحے) بحث کی ہے۔ غالب کے ایرانی استاد کا نام ہرمز (عبدالصمد) لکھتے ہیں (ص ۲۴۲)۔ درست ہرمزد ہے۔ غالب کی شخصیت کی سخت تنقید کرتے ہیں۔ اس کی انگریزوں کی قصیدہ گوئی کو موقع پرستی قرار دیتے ہیں (ص ۲۴۵)۔ اگلے صفحے پر "برہانِ قاطع" کے معرکے میں غالب کے موقف کو غلط قرار دیتے ہیں۔ غالب کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسے عوام سے چڑ تھی، وہ دنیادار تھا، اس کی شخصیت نہیں، شاعری قابلِ قدر ہے (ص ۲۴۷)۔ شخصیت کے تجزیے میں غالب کے کئی فارسی اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

داغ کی سوانح ایک چھوٹے پیراگراف میں دی ہے۔ داغ کے مقابلے میں امیر کی کمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان میں داغ کے مقابلے میں خوداعتمادی اور لوچ بھی کم تھی اور حسبِ ضرورت اپنا رنگِ سخن تبدیل کرتے رہتے تھے۔ امیر کے ایک دیوان کا نام "مرآۃ الغالب" چھپا ہے جو سہوِ طباعت معلوم ہوتا ہے (ص ۲۸۵) صحیح "مرآۃ الغیب" ہے۔

کتاب کے پہلے حصے کے خاتمے کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کے مترجمین پر ایک نوٹ ہے (ص ۲۹۰-۲۹۱) پورے فورٹ ولیم کالج کو دو صفحوں میں نمٹا دیا ہے۔ اس میں صرف میر امن اور گلکرسٹ پر لکھا ہے۔ اس طرح اس تاریخ میں میر امن داغ کے بعد آتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج پر محض دو صفحے لکھنا اردو ادب کی کسی تاریخ کو زیب نہیں دیتا۔

کتاب کے دوسرے حصے کی ابتدا بارھویں باب، تاریخی پس منظر سے ہوتی ہے۔ اس میں ہندوستانی ذہن کو آزاد کرانے کے عوامل میں انگریزی تعلیم، چھاپہ خانہ، انگریزی اور امریکی عیسائی مبلغوں کی تلقینات اور ان سب کے بعد قومی جذبے کی بیداری کو گنواتے ہیں۔ اس باب میں سرسید، وہابی تحریک اور مسلم لیگ وغیرہ سب کا ذکر کیا ہے۔ ص ۳۰۷

Scanned by CamScanner

پر جو یہ لکھتے ہیں کہ اپریل ۱۹۰۰ء میں میکڈانلڈ گورنر یوپی نے اردو کو ہٹا کر ہندی کو عدالتی زبان بنادیا اس بیان کی غلطی تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان کے سلسلے میں دکھائی جاچکی ہے۔ میکڈانلڈ نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کی بھی اجازت دی تھی، اردو کو ہٹا کر نہیں۔ تاریخی واقعات کے بیان میں مصنف نے زمانی ترتیب کا خیال نہیں رکھا مثلاً اس باب کا جزو ۹ مسلم لیگ اور پاکستان کے مطالبے کا ذکر کرتا ہے اور اگلا جزو ۱۰ شاہ ولی اللہ اور وہابی تحریک کے بارے میں ہے۔ سیاسی تجزیے میں مصنف کی یہ جسارت قابلِ داد ہے کہ وہ ملت پرستی کے جوش میں نہیں بہہ جاتا مثلاً وہ پین اسلامزم اور مسلم لیگ کی کمزوریوں سے صرفِ نظر نہیں کرتا (ص ۱۰-۳۰۸)

تیرھواں باب "جدید اردو ادب کی خصوصیات" ہے۔ اس میں اس خصوص کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں فرد محض اپنے بارے میں سوچتا تھا، جدید عہد میں اجتماعیت اور غریبوں کے لیے ہمدردی سامنے آتی ہے۔ اس باب اور اس سے پہلے باب کا تجزیہ مصنف کے روشن جدید ذہن کا آئنہ دار ہے۔ چودھواں باب علی گڑھ تحریک پر ہے۔ لکھتے ہیں کہ قرآن میں جو حقائق موجودہ سائنسی معلومات کے خلاف ہیں سر سید نے ان سے انکار کیا۔ انھوں نے معجزوں، ہبوطِ آدم اور روزِ حساب میں خدا کے دیدار ہونے سے بھی انکار کیا۔ حق یہ ہے کہ سید احمد قرآن کو عقل کے مطابق ثابت کرنے میں ناکام رہے (ص ۳۴۰)۔ ص ۳۴۳ پر سر سید کے ۱۰ مضامین کی انگریزی اصل دریافت کرنا قابلِ داد ہے۔ تسلیم کرنا ہوگا کہ سر سید پر ۱۴ صفحوں میں بہت اچھی طرح لکھا ہے۔ حالی کے بارے میں ان کا یہ مشاہدہ کتنا درست ہے کہ وہ اردو کے جملہ مصنفین میں سب سے زیادہ شریف تھے۔ اس سلسلے میں مصنف کا یہ فیصلہ بھی قابلِ داد ہے کہ آزاد مزاجاً مصلح نہیں تھے، حالی تھے (ص ۳۴۸)۔ حالی کے مقدمے اور تنقید نگاری پر توازن کے ساتھ لکھا ہے۔

اب چند سنین کا جائزہ۔

صادق	دوسرے
[ص ۳۴۳ سر سید کی خطباتِ احمدیہ ۱۸۷۶ء میں]	[نورالحسن نقوی: الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ ۱۸۷۰ء (سر سید اور ہندوستانی مسلمان، علی گڑھ ۱۹۷۹ء)]

ص ۳۵۹ شبلی کی سیرت النعمان ۱۸۹۲ء	[ظفر احمد صدیقی: پہلا حصہ ۱۸۸۹ء میں تصنیف، دوسرا حصہ ۱۸۹۰ء میں۔ اشاعت ۱۸۹۱ء (شبلی، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۵۱)]
ص ۳۶۰ شبلی الغزالی ۱۹۰۲ء	ظفر احمد۔ تصنیف ۱۹۰۱ء (ایضاً ص ۵۳)
ایضاً علم الکلام ۱۹۰۳ء	ایضاً ۱۹۰۲ء (ایضاً ص ۵۹)
ایضاً موازنۂ انیس و دبیر ۱۹۰۷ء	[ایضاً تصنیف ۱۹۰۴ء۔ شائع ۱۹۰۶ء (ایضاً ص ۶۳)]
[ایضاً شبلی نے ندوہ کا انتظام ۱۹۰۴ء میں ہاتھ میں لیا]	[ظفر احمد۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں لیا کیونکہ فروری ۱۹۰۵ء تک حیدر آباد میں تھے (ایضاً ص ۲۱)]
ص ۳۷۱ چراغ علی: ولادت ۱۸۴۴ء	[حامد حسن قادری: ۱۸۴۶ء (داستانِ تاریخ اردو، ص ۳۷۲)]
ص ۳۷۳ سید احمد دہلوی: وفات ۱۹۴۰ء	حامد حسن قادری: ۱۹۱۹ء (ایضاً ص ۵۷۷)

باب ۱۵ "محمد حسین آزاد" ہے جو ڈاکٹر صادق کا پی ایچ ڈی کا موضوع بھی تھا۔ باب کی ابتدا میں محمد حسین آزاد اور علی گڑھ تحریک کا فرق دکھاتے ہیں۔ اگلے دو صفحوں یعنی ص ۳۷۶۔۳۷۷ پر "نیرنگ خیال" کے ۱۳ مضامین کی انگریزی اصل درج کی ہے۔ یہ فہرست جگہ جگہ ملتی ہے، غالباً ڈاکٹر صادق ہی نے سب سے پہلے دریافت کی۔ انھوں نے ص ۳۷۸ پر "آبِ حیات" کی اشاعت کی تاریخ ۱۸۸۱ء لکھی ہے۔ اسلم فرخی نے مکتوباتِ آزاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء کے آخر میں آیا (۶)۔ مجھے ڈاکٹر صادق کے اس قول پر حیرت ہے کہ آزاد کی شہرت کا مدار ان کی تین کتابوں پر ہے۔ "سخندانِ فارس"، "قصصِ ہند" اور "آبِ حیات" (ص ۳۷۸)۔ اول الذکر دو کتابوں کو شامل کرنا اور "نیرنگِ خیال" کو نظرانداز کر دینا عجیب بات ہے۔ آزاد کی شہرت "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" دو کتابوں، نیز ان کے ۱۸۷۴ء کے لیکچر کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر صادق نے "قصصِ ہند" اور "سخندانِ فارس" کی بہت تعریف کی ہے۔ انھوں نے قصص کے اس پہلو پر توجہ نہیں کی کہ یہ تاریخ کم ہے، چٹ پٹا قصہ زیادہ۔

آزاد پر لکھتے ہوئے "آبِ حیات" کا دفاع کیا ہے جو بےجا ہے (ص ۳۸۲)۔ اسی صفحے پر قاسم کے تذکرے "مجموعۂ نغز" کا نام "تذکرۂ شعرائے اردو" لکھتے ہیں حالانکہ اس وقت تک محمود شیرانی کا مرتبہ ایڈیشن شائع ہوچکا تھا۔ ص ۳۸۴ پر آزاد کا نفسیاتی تجزیہ قابلِ داد

Scanned by CamScanner

ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ صادق اپنے ہیرو آزاد کی شاعری کو ناقص تسلیم کرتے ہیں کہ آزاد فطرتاً شاعر نہ تھے (ص ۳۸۸)۔

سولھواں باب "اکبر الہ آبادی" ہے۔ حیرت ہے کہ ایک جلد کی پورے اردو ادب کی تاریخ میں اکبر کو ۱۷-۱۶ صفحوں کا پورا باب نذر کیا۔ اکبر پر تین خارجی اثرات دریافت کیے ہیں: "دبستانِ لکھنؤ"، "اودھ پنچ" اور "علی گڑھ تحریک" (ص ۳۹۲)۔ میری رائے میں "دبستانِ لکھنؤ" اتنا اہم اثر نہیں۔ اس کے بجائے انگریزی تہذیب بہتر عامل کہا جاسکتا تھا۔ بہرحال اکبر کے موضوع، اسلوب اور زبان پر تشفی بخش طریقے سے لکھا ہے۔

سترھواں باب ناول نویسوں کے بارے میں ہے۔ اس میں بطورِ خاص نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا اور پریم چند پر لکھا ہے۔ نذیر احمد کے بارے میں ان کی معرکے کی تحقیق یہ ہے کہ ان کی "بنات النعش" ٹامس ڈے کی ہسٹری آف سینڈفورڈ اینڈ مرٹن (Thomas Day, History of Sandford and Merton) کے پیرایے پر لکھی گئی ہے اور "توبۃ النصوح" کا پلاٹ ڈینیل ڈیفو کی فیملی انسٹرکٹر حصہ اوّل (Daniel Defoe, Family Instructor Part1) سے لیا گیا ہے (ص ۴۱۵)۔ واضح ہو کہ بابو شیو پرشاد نے قصۂ سینڈفورڈ مرٹن اردو میں ترجمہ کیا تھا جس کے دوسرے ایڈیشن کی تاریخ ۱۸۶۰ء ہے۔

سرشار کے فسانۂ آزاد کے بارے لکھتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ سروینٹز کے ڈان کوئکزاٹ کے نمونے پر لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد دونوں ناولوں کی مماثلت اور اختلاف کا جائزہ لیتے ہیں (ص ۴۱۹)۔ انگریزی کے ناول نگار رچرڈسن کے ناولوں کے بارے میں کسی Phelps کا یہ دلچسپ قول نقل کرتے ہیں۔

> "یہ ناول فرد کے پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ خاندانوں اور پُشتوں (Generation) کے لیے ہیں۔ دادا ناول کو ایک حد تک پڑھ کر اس پر "بُک مارک" (Book Mark) رکھ دیتا ہے اور مرجاتا ہے۔ والد اس کے آگے سے پڑھنے لگتا ہے"۔

یہی کیفیت "فسانہ آزاد" کی ہے۔ اس سے زیادہ منتشر (Chaotic) کتاب کا تصور نہیں کیا جاسکتا (ص ۴۲۰)۔ اس کے باوجود صادق فسانۂ آزاد کے بہت سے پہلوؤں کو سراہتے ہیں۔ شرر کے ناولوں کی کردار نگاری کی شدت سے تنقید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ وہ انسانی فطرت سے واقف نہ تھا۔ اس کے ناولوں میں غزل کی طرح خواہ مخواہ عشق کی بھرمار

Scanned by CamScanner

ہے (ص ۴۳۴-۴۳۳) حیرت ہے کہ صادق نے شرر کے دو اہم ناولوں "زوالِ بغداد اور ایامِ عرب کا نام نہیں لیا اور "فردوسِ بریں" پر بھی بہت مختصر لکھا ہے۔ پریم چند کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "فسانۂ آزاد" کی اشاعت کے بعد دو دہائی تک اردو میں کوئی فکشن نہ تھا بجز شرر کے رومانوں کے (ص ۴۳۸) لیکن وہ "امراؤجان ادا" کو کیوں نظر انداز کر گئے ہیں۔

پریم چند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بہترین کوششوں کے باوجود وہ کبھی (ناول لکھنے کی) صلاحیت حاصل نہ کر سکے (Could not win his way to competence) (ص ۴۳۸)۔ یہ ایسا حیرت انگیز فیصلہ ہے جس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ ص ۴۳۹ پر اُن کا یہ کہنا درست نہیں کہ "پریم چند کے تمام ناول ہندی سے اردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں"۔ کئی ناول بالیقین پہلے اردو میں لکھے گئے۔ لکھتے ہیں کہ یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں نے پریم چند کو غیر سمجھا گو یہ حقیقت ہے کہ اس نے اردو غیر معمولی امتیاز کے ساتھ لکھی (ایضاً)۔ پریم چند کو مثالیت پسند قرار دیتے ہیں۔

ان کے ناولوں میں "بازارِ حسن" کو سب سے زیادہ تشفی بخش قرار دیتے ہیں۔ اس کی ہیروئن کا نام سمن (س کے زبر سے) لکھتے ہیں (ص ۴۴۰)۔ صحیح س پر پیش سے ہے یعنی یہ فارسی کا لفظ سمن نہیں بلکہ ہندی کا لفظ سمن ہے۔ صادق نے "بازارِ حسن" کے علاوہ "چوگانِ ہستی" پر لکھا ہے، "گوشۂ عافیت" کا برائے نام ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے بہترین ناول گئودان کے نام سے بھی وہ واقف نہیں۔ ان کے نزدیک پریم چند کا سب سے بڑا نقص اُن کا جذبۂ اصلاح ہے (ص ۴۴۳)۔ پریم چند کے افسانوں پر گہرائی سے نہیں لکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے واقفیت سرسری ہے۔

اب چند تاریخوں کی تصحیح:

صادق	دوسرے
ص ۴۰۸ نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں پیدا	[اشفاق اعظمی: ۱۸۳۱ء صحیح تر (نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے" دہلی ۱۹۷۴ء، ص ۱۳)
ص ۴۰۹ توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء	[افتخار احمد صدیقی: تصنیف ۱۸۷۳ء اشاعت ۱۸۷۴ء (ڈپٹی نذیر احمد، کتابیات۔ اسلام آباد ۱۹۸۷ء، ص ۱۲)
ص ۴۳۰ شرر کا ناول فلورا فلورنڈا ۱۸۹۷ء	علی احمد فاطمی: ۱۸۹۶ء (عبدالحلیم شرر، ص ۱۷۰)

Scanned by CamScanner

ص ۴۳۰ شرر کا قیس ولبنیٰ ۱۸۹۱ء | ایضاً ۱۸۹۱ء میں نامکمل - ۱۹۰۸ء میں مکمل
ص ۴۳۵ رسوا: ولادت ۱۸۵۶ء | [مالک رام اور ڈاکٹر عقیل: ۱۸۵۸ء (عقیل: مختصر تاریخِ ادبِ اردو، از اعجاز حسین)]

اٹھارواں باب "محمد اقبال" ہے۔ حیرت ہے کہ مصنف نے ص ۴۴۹ پر اقبال کی تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۸ء لکھی ہے حالانکہ حکومتِ پاکستان نے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء تسلیم کی ہے۔ حقیقت وہی ہے جو خالد نظیر صوفی اور مالک رام وغیرہ نے طے کی ہے یعنی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء۔ اقبال پر مغربی اثرات ہیں کہ نہیں اس سلسلے میں بڑی جرأت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

> "جس گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کے ساتھ اس نے ممنونیتِ مغرب سے انکار کیا اُس سے اس کے تحت الشعوری خوف کی غمازی ہوتی ہے کہ تنقید نگار صحیح خطوط پر چل رہے ہیں"۔
>
> (ص ۴۵۶)

اقبال کو ۱۴ صفحے دیے ہیں جو اس تاریخ میں ایک فرد پر سب سے زیادہ ہیں۔ اقبال سے اختلاف کرتے ہوئے ہیں اسلازم کو ایک سراب اور قوم پرستی کو ایک قابلِ عمل تصور قرار دیتے ہیں (ص ۶۴ - ۴۶۳)۔ انیسواں باب اقبال کے معاصرین پر ہے۔ اس میں کئی شعرا کا ذکر ہے۔ مجھے اس کی کچھ تصحیحات کرنی ہیں۔ اس میں پہلے شاعر کا نام ظفر علی لکھا ہے (ص ۴۹۰)۔ یہ شخصیت کی پہچان کے لیے ناکافی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں یا کم از کم ظفر علی خاں لکھنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کہ چکبست کی صبحِ وطن کا سنہ اشاعت ۱۹۳۱ء لکھا ہے (ص ۴۹۳)۔ دراصل اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں اور دوسرا ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا (۷)۔ ص ۴۹۵ پر نادر کاکوروی کی ولادت ۱۸۵۷ء میں لکھی ہے۔ رام بابو سکسینہ اور ناظر حسین زیدی کے مطابق ۱۸۶۷ء ہے (آخرالذکر: تاریخِ مسلمانان، جلد ۹، ص ۲۸۵)

لکھتے ہیں "جوالا پرشاد برق ۱۸۷۸ء میں سیتاپور میں پیدا ہوئے" (ص ۵۰۰)۔ گنپت سہائے شری واستو کے مطابق موضع محمدی ضلع لکھیم پور میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے (۸)۔ مالک رام نے ۲۰ اکتوبر لکھی ہے، بقیہ تفصیلات یہی ہیں۔ ص ۵۰۲ پر جگر مرادآبادی کی وفات ۱۹۶۱ء میں لکھی ہے۔ صحیح تاریخ ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ہے (۹)۔ ص ۵۰۹ پر "مرزا یگانہ لکھنوی" کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا تخلص یگانہ کے علاوہ یاس بھی لکھنا چاہیے تھا نیز انھیں لکھنوی کے بجائے عظیم آبادی کہنا درست ہے۔

بیسویں باب کا عجیب سا عنوان بہترین بکنے والے (Best Sellers) ہے۔ لکھتے ہیں کہ اردو میں بہت کم لکھنے والے ایسے ہوئے ہیں جو محض قلم کی بدولت روزی کماتے

Scanned by CamScanner

ہیں۔ ان میں صرف راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی مستثنیٰ ہیں (ص ۵۱۲)۔ خواجہ حسن نظامی نے قلم کاری میں اپنی تجارتی اہلیت کو شامل کیا جس سے وہ دس لاکھ پتی (Millionaire) ہو گئے۔ اس میں ان کی صوفیانہ وضع سے بھی مدد ملی (ص ۵۱۴)۔ چار صفحوں کا یہ باب محض ان دو ادیبوں کے بارے میں ہے۔ اسے ایک علاحدہ باب کا درجہ دینے کا جواز نہیں۔ اکیسویں باب کا عنوان "فراق، جوش، حفیظ اور دوسرے" ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ فراق کے یہاں ہیئت اور مفہوم کی بہت غلطیاں پائی جاتی ہیں (ص ۵۱۷)۔ اس باب میں فراق، جوش، حفیظ اور اختر شیرانی کے علاوہ دو غیر مشہور شاعروں فاخر ہریانوی اور محمد رفیق خاور پر بھی لکھا ہے۔

بائیسواں باب "جدید اردو ادب: شاعری" ہے۔ یہ باب ص ۵۳۲ سے ۵۸۳ تک کو محیط ہے اور اس میں متعدد نئے شاعروں کا ذکر ہے۔ مجھے ان کی تنقید کے بارے میں کچھ نہیں کہنا، صرف چند سنین کی تصحیح کرنی ہے۔

صادق	دوسرے
[ص ۵۳۴ ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم ۱۹۳۸ء میں قائم ہوئی]	[عقیل رضوی: ۱۹۳۵ء میں لندن میں بنیاد رکھی۔ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں کانفرنس (تاریخ، ص ۳۸۸)]
ص ۵۴۳ میراجی: فوت ۱۹۵۰ء	مالک رام: ۳ نومبر ۱۹۴۹ء
ص ۵۵۱ ن۔ م۔ راشد ۷۶ - ۱۹۱۲ء	[مغنی تبسم: ولادت یکم اگست ۱۹۱۰ء۔ فوت ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء (ن۔ م۔ راشد۔ دہلی ۱۹۸۱ء، ص ۱۳)]
ص ۵۶۵ اختر الایام (سہوِ طباعت)	صحیح اختر الایمان

تیئسواں باب "مختصر افسانہ" ہے جس میں عصمت چغتائی، کرشن چندر، منٹو، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، غلام عباس، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور پر مختصراً لکھا ہے۔ ان بیانات میں تنقید کے اُتھلے پن اور موضوع سے واقفیت کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور کے ناولوں کے بارے میں محض پون صفحہ لکھا ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے "آگ کا دریا" کا اُچٹتا سا ذکر ہے اور بس حالانکہ اس زمانے میں کئی اہم ناول لکھے گئے مثلاً "خدا کی بستی"، "اداس نسلیں"، "آنگن"، "آبلہ پا" وغیرہ۔ قرۃ العین کو بطور افسانہ نگار لیا ہی نہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں انتظار حسین پر بھی لکھنا چاہیے تھا۔

چوبیسواں باب "متفرق نثر" تنقید و تحقیق کے بارے میں ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق، محمود شیرانی، عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر عبداللطیف، ڈاکٹر عبداللہ، شیخ محمد اکرام،

Scanned by CamScanner

سید احتشام حسین، کلیم الدین احمد اور حسن عسکری پر نہایت مختصراً لکھا ہے جس میں کسی سے انصاف نہیں ہوا۔ محمود شیرانی کے لسانی نظریے پر تنقید کرتے ہیں کہ لاہور میں جو زبان بنی وہ نئی پنجابی تھی، اردو نہیں۔ پنجاب سے دہلی اتنی فوجیں نہیں گئیں کہ وہاں کی زبان کو بدل دیتیں۔ فوجیوں نے دہلی میں رہ کر وہاں کی زبان اختیار کرلی ہوگی۔ اردو اور پنجابی میں لفظوں کے اشتراک کی وجہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں ہم جدی ہیں (ص ۵۹۴)۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے اس تضاد پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ مغرب کی متابعت پر احتجاج کرتے ہیں لیکن خود کم از کم تین درجن یورپی مصنفوں سے غالب کا مقابلہ کرتے ہیں (ص ۵۹۵)۔ لکھتے ہیں شیخ محمد اکرام کی "یادگارِ شبلی" سلیمان ندوی کی کتاب ("حیاتِ شبلی") سے بہتر ہے (ص ۵۹۷)۔ کلیم الدین احمد کی "سخن ہائے گفتنی" کے تبصروں کو سراہتے ہیں لیکن جدید رجحانات کے تئیں ان کے مخالفانہ جذبے سے ناخوش ہیں (ص ۵۹۹)۔

افسانہ نگاروں کی طرح محققین اور ناقدین میں بھی تاریخی ترتیب کا خیال نہیں رکھتے۔ سب سے بزرگ افسانہ نگار اپندر ناتھ اشک کو کئی اخلاف کے بعد لیا۔ اس باب میں بھی احتشام حسین پر کلیم الدین احمد سے پہلے لکھتے ہیں، اور یہ کیا وجہ ہے کہ احتشام حسین پر لکھا آلِ احمد سرور کو نظرانداز کردیا۔ باب کے دوسرے جزو میں پہلے مزاح نگاروں پر اور پھر خاکہ نگاری، آپ بیتی اور سفرناموں پر مختصراً لکھا ہے۔ دو ناموں کو قدرے مسخ کیا ہے۔ ص ۶۰۳ پر ایک مزاح نگار کا نام آر۔ ایل۔ کپور لکھا ہے، مراد ہے کنھیا لال کپور۔ انھیں کم از کم کے۔ ایل۔ کپور لکھنا چاہیے تھا حالانکہ ان کی شناخت پورے نام کنھیا لال کپور ہی سے ہوتی ہے۔ ص ۶۰۴ پر خاکہ نگار محمد طفیل کا نام طفیل محمد لکھا ہے۔

اس پورے باب میں مختلف اہلِ قلم پر جس اختصار سے لکھا ہے، بلکہ نام گنائے ہیں، وہ محض خانہ پُری معلوم ہوتا ہے۔ اس سے تاریخ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ سنین کی چند اصلاحیں:

صادق	دوسرے
ص ۵۹۳ محمود شیرانی ۱۸۸۸ تا ۱۹۴۵ء	[عبدالمجید سالک: پ اکتوبر ۱۸۸۰ء۔ ف ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء ("مقدمۂ پنجاب میں اردو"، محررہ ۱۹۴۹ء) یہی مالک رام نے لکھا۔]
ص ۵۹۳ عبدالحق: ولادت ۱۸۷۱ء	مالک رام: ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء
ص ۵۹۶ شیخ اکرام ۱۹۰۷ء تا ۱۹۷۶ء	[مالک رام: پ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء۔ ف ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء]

Scanned by CamScanner

ص۵۹۷ احتشام حسین: وفات ۱۹۷۶ء	مالک رام: یکم دسمبر ۱۹۷۲ء
ص۵۹۹ کلیم الدین احمد: ولادت ۱۹۰۷ء	مالک رام: ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء
ص۶۰۳ رشید احمد صدیقی: ولادت ۱۸۹۶ء	مالک رام: ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء

پچیسواں باب "ڈراما" ہے جو محض تنقیدی مضمون ہے۔ اس میں صرف امانت کی "اندر سبھا" کا ذکر ہے اور بس۔ چھبیسواں باب "صحافت" ہے۔ موضوع کی وسعت کے مقابلے میں یہ بھی مختصر ہے۔ آخر میں کتاب کے حصۂ دوم پر ڈیڑھ صفحے کا خاتمہ ہے جس میں اعتراف کرتے ہیں "جہاں تک میرا تعلق ہے، میں صفائی سے اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی بہترین کوششوں کے باوجود میں تازہ ترین رجحانات سے واقفیت نہیں رکھتا"۔

کتاب کے آخر میں ایک مختصر ضمیمے میں آزاد کی "سخندانِ فارس" کا اقتباس ہے۔ اس کے بعد داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال پر ایک نوٹ ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ "میں ڈاکٹر گیان چند کے عالمانہ کام سے استفادہ کر رہا ہوں"۔ امیر حمزہ پر سوا دو صفحے لکھے ہیں اور بوستانِ خیال پر آٹھ سطریں۔ اول الذکر کے سلسلے میں ایک جلد کی داستان امیر حمزہ ہی پر لکھتے ہیں۔ طلسمِ ہوشربا کا نام بھی نہیں لیتے۔ ظاہر ہے کہ اس گلِ سرسبد کے بغیر داستانِ امیر حمزہ کا بیان محض فروعی ہی ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صادق سے پہلے انگریزی میں اردو ادب کی دو تاریخیں ملتی تھیں: رام بابو سکسینہ اور گراہم بیلی کی۔ سکسینہ کی تاریخ کی تصنیف کے بعد اردو ادب میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ اسی ضخامت کی ایک اور جلد درکار تھی۔ بیلی کی تاریخ بہت مختصر ہے جو نام شماری پر توجہ کرتی ہے۔ صادق کی ایک جلد کی تاریخ بھی پورے اردو ادب کا احاطہ کرنے کو نہایت ناکافی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو ادب کے بہت سے منطقے رواروی میں نظر سے گزار دیے گئے ہیں۔ دکنی ادب اور جدید ادب، دونوں میں سے کسی کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صادق کو ان میں سے کسی سے دلچسپی نہیں۔ شبل لکھتی ہیں کہ صادق کو کلاسکی شاعری سے واضح ہمدردی نہیں (۱۰)۔ فورٹ ولیم کالج کو محض دو صفحوں میں ٹال دیا ہے۔

تحقیق کے اعتبار سے اس تاریخ کی کوئی اہمیت نہیں لیکن تنقید کے اعتبار سے ہے۔ ڈاکٹر صادق انگریزی کے استاد رہے ہیں اس لیے ان کا نقطۂ نظر جدید، صالح اور روشن ہے۔ وہ ملت پرستی کے جوش میں نہیں بہہ جاتے۔ وہ مسلم عہد حکومت کے سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی نظام کی خرابیاں بھی پیش کرتے ہیں اور وہابی تحریک، مسلم لیگ اور پین اسلامزم وغیرہ پر بھی تنقید کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ میر، غالب، انیس، آزاد، شبلی وغیرہ کی ذات یا نگارشات کی کمیوں کے بارے میں لکھنے سے نہیں جھجکتے، اقبال پر لکھتے ہوئے توازن

Scanned by CamScanner

اور سلیم الطبعی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ بہتر ہوتا کہ وہ اپنے کام میں دو فقرکا اور لے لیتے، ایک دکنیات پر لکھنے کے لیے، دوسرا ۱۸۵۷ء کے بعد کے ادب پر لکھنے کو۔ نیز اپنی تاریخ کو اس حجم کی دو جلدوں میں تحریر کرتے۔ عام طور سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے نثر پر اس طرح نہیں لکھا جیسے نظم پر۔ داستانوں، ناولوں اور مختصر افسانوں کے سمندر میں سے محض قطرے ہی پیش کرتے ہیں۔ بہرحال اردو نہ جاننے والے اور انگریزی جاننے والے قارئین کے لیے یہ کتاب بساغنیمت ہے۔ میں ان کے نقطۂ نظر کو بالعموم تشفی بخش پاتا ہوں۔

حواشی

(۱) مالک رام: تذکرہ، ص ۳۴۳۔ ڈاکٹر سید معین الرحمان: گورنمنٹ کالج لاہور، شعبۂ اردو کوائف اور کارکردگی (لاہور ۱۹۸۹ء) ص ۱۰۳

(۲) ڈاکٹر سید معین الرحمان: یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق (لاہور ۱۹۸۹ء) ص ۲۷

(۳) ڈاکٹر سیدہ جعفر: مقدمہ کلیات محمد قلی قطب شاہ، دہلی ۱۹۸۵ء ۔ص ۵۹

(۴) سروری: اردو مثنوی کا ارتقا۔ علی گڑھ ۱۹۶۸ء، ص ۷۷

(۵) ڈاکٹر عابد پشاوری: انشا کے حریف و حلیف۔ الہ آباد ۱۹۷۹ء، ص ۸۶-۸۴

(۶) مکتوباتِ آزاد، ص ۱۹ بحوالۂ اسلم فرخی: محمد حسین آزاد۔ کراچی ۱۹۶۵ء - جلد دوم، ص ۱۴

(۷) کالی داس گپتا رضا: کلیات چکبست۔ بمبئی ۱۹۸۱ء - مقدمہ، ص ۱۳

(۸) گنپت سہائے فری واستو: اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ۔ الہ آباد ۱۹۶۹ء، ص ۴۴۹

(۹) مناسن علی مراد آبادی: جگر مراد آبادی۔ دہلی ۱۹۸۴ء - پیش لفظ، ص ۱

(۱۰) اینی میری شمل: تاریخِ ادبِ اردو (انگریزی)۔ جرمنی ۱۹۷۵ء - ص ۱۲۵ حاشیہ

Scanned by CamScanner

اکیسواں باب

ڈاکٹر اعجاز حسین و محمد عقیل:

"مختصر تاریخِ ادبِ اردو"

ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنی سوانح "میری دنیا" میں لکھا ہے کہ وہ ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء میں اگست کے مہینے میں پیدا ہوئے (الہ آباد، ۱۹۶۵ء، ص۱۱)۔ ان کے مقالہ نگار ڈاکٹر علی حیدر کا خیال ہے کہ وہ ۱۸۹۸ء یا اس سے پہلے پیدا ہوئے ("ڈاکٹر اعجاز حسین، حیات اور کارنامے"، الہ آباد، ۸۴-۱۹۸۳ء، ص۵۱)۔ جب وہ الہ آباد یونی ورسٹی میں لیکچرر تھے، انھوں نے ۱۹۳۴ء میں "مختصر تاریخ ادب اردو" شائع کی۔ چونکہ اس سے قبل کی، تنہا کی "سیر المصنفین" اور رام بابو سکسینہ کی "تاریخِ ادب اردو" دورِ حاضر کا کماحقہ احاطہ نہیں کرتی تھیں اور ضخیم بھی تھیں اس لیے اعجاز صاحب نے طلبہ کی ضروریات کے تحت ایک مختصر جلد میں پوری تاریخِ نظم و نثر کا احاطہ کیا۔ ان کی کتاب ہوئی بھی بہت مقبول، متعدد ایڈیشن نکلے۔ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے ترمیم شدہ ایڈیشن شائع کیا جس میں اس وقت تک کے مشہور ادیبوں کا احاطہ کر لیا۔

ترمیم کے دوران اعجاز صاحب بیمار ہو گئے اس لیے ڈاکٹر عقیل اور پروفیسر احتشام حسین نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں پر تنقیدی مضامین لکھے۔ کتاب میں صراحت نہیں کی گئی کہ کون سے بیانات یا عبارتیں ان دونوں اصحاب کی تراوشِ خامہ ہیں۔ ڈاکٹر علی حیدر نے اعجاز صاحب پر اپنے مقالے میں مطلع کیا ہے کہ ان کی نظر سے ۱۹۵۳ء کے ایڈیشن کی وہ کاپی گزری ہے جس میں اضافے کر کے ۱۹۶۴ء کا ایڈیشن تیار کیا گیا۔ اس میں عقیل صاحب نے ہجری سنین کو عیسوی سنین میں بدلا ہے اور احتشام صاحب نے تنقیدی عبارتوں کا اضافہ کیا ہے (علی حیدر، ص۱۷۷)۔ سنین کی تبدیلی میں ایک ہجری سنہ کے مقابل دو عیسوی سنین دینے چاہییں لیکن عقیل صاحب نے محض ایک ہی سنہ لکھنا کافی سمجھا جو بعض اوقات ایک سال کم زیادہ ثابت ہوتا ہے۔ علی حیدر نے یہ صراحت نہیں کی کہ عقیل صاحب اور احتشام صاحب نے کن کن ادیبوں پر لکھا ہے۔

Scanned by CamScanner

۱۹۶۴ء کے بعد اعجاز صاحب نے اس تاریخ میں ترمیم نہیں کی۔ ۲۱ فروری ۱۹۷۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا (علی حیدر، ص ۷۷)۔ کتاب کی تیسری منزلِ ارتقا ڈاکٹر محمد عقیل کا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ "اپنی بات" کے تحت عقیل صاحب اعجاز صاحب کی تاریخ کے نئے ایڈیشن کے جواز میں جمیل جالبی کی تاریخ کے لیے لکھتے ہیں:

> ابھی ایک ہی جلد آئی تھی کہ معلوم ہوا وہ بھی اغلاط سے پُر ہے۔

یہ لکھنا بڑی زیادتی ہے۔ میری رائے میں جمیل جالبی کی تاریخ کے برابر معتبر کوئی دوسری تاریخ نہیں آئی۔ اعجاز صاحب کی تاریخ کے ۱۹۸۴ء کے ایڈیشن کے لیے عقیل صاحب نے نہ صرف متعدد نئے اہلِ قلم پر لکھا ہے، بلکہ ہر دور کے ادیبوں کے احوال میں ترمیم اور اضافے بھی کیے ہیں۔ کاش وہ "اپنی بات" کے تحت صراحت کر دیتے کہ کون سے حصے ان کی تصنیف ہیں۔ اس کے فقدان کے باعث ڈاکٹر عقیل کی بعض تحریروں کو ڈاکٹر اعجاز حسین سے منسوب کر دیا جاتا ہے مثلاً ڈاکٹر عقیل نے ۱۹۸۴ء کے ایڈیشن میں حقِ دوستی نبھاتے ہوئے مجھ کم سواد کی بہت توصیف کی ہے۔ جموں یونی ورسٹی سے جدید تنقید پر محمد رمضان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مقالہ نگار نے میرے بارے میں طویل رائے کو یہ کہہ کر نقل کیا ہے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے گیان چند کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے، اگر یہ الفاظ واقعی استاذی ڈاکٹر اعجاز حسین کے ہوتے تو میں پھولا نہ سماتا۔

میں نے ۱۹۶۴ء اور ۱۹۸۴ء کی منزلوں کا تفصیلی تقابلی مطالعہ کر کے دریافت کیا ہے کہ عقیل صاحب کے اضافے اور ترامیم کون کون سی ہیں۔ ۱۹۶۴ء کی منزل کے لیے میرے سامنے اس کے ناشر فروغِ اردو، لکھنؤ کی ۱۹۸۱ء کی چھاپ (Reprint) ہے جس میں اغلاط کثرت سے ہیں۔ عقیل صاحب کی ترمیم کے بعد یہ کتاب طلبہ کے لیے ایک جلد کی سب سے مفید "تاریخِ ادبِ اردو" ہے۔

پہلے ایڈیشن کے "عرضِ حال" میں اعجاز صاحب نے لکھا ہے کہ وہ اردو زبان کے "مخرج اور ارتقا" کے بارے میں کماحقہٗ نہیں لکھ سکے، اس موضوع کو اپنی دوسری تصنیف میں لیں گے جو اردو زبان کی ابتدا، مخرج اور ارتقا کے لیے مخصوص ہوگی۔ سُوءِ اتفاق سے وہ کتاب کبھی وجود ہی میں نہ آئی۔ اسی دیباچے میں اعجاز صاحب نے فرضِ شاگردی و ماتحتی کے تحت صدرِ شعبہ پروفیسر ضامن علی کا شدومد سے شکریہ ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> آپ کی ذات اور قابلِ قدر کتاب "تاریخِ ادبِ زبانِ اردو" سے میں نے جو فائدہ اٹھایا ہے اس کا بے حد ممنون ہوں۔

یہ بات بڑی الجھن میں ڈالنے والی ہے۔ ضامن صاحب کی کوئی کتاب "تاریخِ ادبِ

Scanned by CamScanner

زبانِ اردو" نہیں ہے۔ دراصل انھوں نے کبھی کوئی کتاب لکھی ہی نہیں۔ ایک مختصر سی "اردو سروے کمیٹی رپورٹ" ہے اور بس۔ کیا خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسی کو "تاریخِ ادبِ زبانِ اردو" بنا دیا ہے جو یہ دُور دُور تک نہیں۔ خود اعجاز صاحب نے اپنی تاریخِ ادب میں ضامن صاحب پر جو باب لکھا ہے اس میں ان کی کسی تاریخِ ادب کا ذکر نہیں۔

عقیل صاحب نے کتاب میں جو ترمیم و تصحیح و حذف و اضافہ کیا ہے اس کی تفصیل مَیں متن پر مشاہدات کے سلسلے میں دوں گا لیکن سرِدست مختلف مصنفوں کے اضافے کا شمار کراتا ہوں۔

اوّل، حصۂ نظم:

باب اوّل میں شاہ امین الدین اعلیٰ، باب۸ میں نوح ناروی، باب۱۱ میں تاباں کے بعد کے تمام شعرا عقیل صاحب کا اضافہ ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

ن۔ م۔ راشد، میراجی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، سلام مچھلی شہری، پرویز شاہدی، وحید اختر، شہریار، خلیل الرحمان اعظمی، باقر مہدی، رضا نقوی راہی، نازش پرتاپ گڑھی، شور واحدی۔

اعجاز صاحب نے نمبر ۹۲ پر کسی فطرت واسطی کے بارے میں لکھا تھا۔ عقیل صاحب نے اچھا کیا کہ اسے حذف کر دیا۔ دراصل اور بھی دو تین نام قابلِ حذف تھے۔ کچھ اور ناموں کو شامل کیا جا سکتا تھا، بالخصوص جدیدیت کے بڑے ناموں کو۔

حصۂ نثر:

باب۱ کے آخر میں مولوی اکرام علی کا اضافہ کیا ہے۔ سہوِ کتابت سے بینی نرائن جہاں اور اکرام علی دونوں کو نمبر ۱۱ عطا کیا ہے۔ اکرام علی کو نمبر ۱۲ دینا چاہیے تھا۔ باب ۲ میں واجد علی شاہ کا بطور نثر نگار اضافہ کیا ہے جو چنداں ضروری نہ تھا۔ باب۴ "ناول اور مختصر افسانہ" میں راجندر سنگھ بیدی کے بعد حسبِ ذیل ۱۶ ادیبوں کا اضافہ کیا۔

خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، رشید جہاں، صالحہ عابد حسین، حیات اللہ انصاری، قاضی عبدالستار، رام لعل، اقبال متین، جیلانی بانو، جوگیندر پال، عزیز احمد، اپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، سہیل عظیم آبادی، قرۃ العین حیدر۔

باب۴ کے ایک جزو کے تحت عنوان "ڈراما" دے کر تین ڈراما نگاروں: امانت، آغا حشر اور تاج کا اضافہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نام کم ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ ڈراما نگاروں کو رام بابو سکسینہ نے پیش کیا ہے۔ باب۵ "مقالات و صحافت" میں نصیر حسین خیال کو حذف کیا ہے اور ڈاکٹر عابد حسین کا اضافہ کیا ہے۔ کچھ اور نام بھی شامل کیے جا سکتے تھے۔

باب۷ کا عنوان "تنقید" ہے۔ اس میں نمبر ۸۸ پر علی جواد زیدی اور نمبر ۹۰ پر

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر اعجاز حسین کا اضافہ کیا۔ پھر نمبر ۹۹ تا نمبر ۱۰۲ پر خورشید الاسلام، خواجہ احمد فاروقی، محمد حسن اور قمر رئیس کو شامل کیا۔ باب ۸ "تحقیق" اور باب ۹ "حرف آخر" پورے کے پورے ڈاکٹر عقیل کے لکھے ہوئے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ باب ۷ "تنقید" اور باب ۸ "تحقیق" کے بعض مصنفین کو ایک سے دوسرے میں پہنچا دیا جاتا، مثلاً، باب ۷ "تنقید" کے مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر زور، مسعود حسین خاں اور خواجہ احمد فاروقی کے اہم تر کارنامے تحقیق میں ہیں، تنقید میں نہیں۔ اسی طرح شارب ردولوی کو باب ۸ "تحقیق" میں نہ رکھ کر، باب ۷ "تنقید" میں ڈالنا چاہیے تھا۔ کئی اور اہلِ قلم ایسے ہیں جنھیں آزاد عنوان کے تحت لکھنا چاہیے تھا۔ ان میں سے بعض کا ذکر باب ۹ میں "حرف آخر" کے تحت آگیا ہے لیکن وہ اس سے بڑھ کر آزاد مضمون کے مستحق تھے، مثلاً محققین میں عابد پیشاوری، کالی داس گپتا رضا، حنیف احمد نقوی، خلیق انجم، مشفق خواجہ اور جمیل جالبی اور نقادوں میں حسن عسکری، وزیر آغا، شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ اور مغنی تبسم۔ شاید کتاب کا حجم مانع رہا ہو۔ بحیثیتِ مجموعی کتاب میں پاکستان کے قلم کاروں نیز جدیدیت کے پیرووں کی نمائندگی کمزور ہے۔

اب اعجاز حسین ایڈیشن ۱۹۸۱ء (جو ۱۹۶۴ء کے ایڈیشن کی بازطباعت ہے) نیز عقیل ایڈیشن ۱۹۸۴ء کو سامنے رکھ کر کچھ مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ اوّل الذکر کے صفحہ نمبر سے پہلے "الف" اور ثانی الذکر کے نمبر سے پہلے لکھ کر نشان دہی کی جائے گی۔

الف ۳۱ میں بندہ نواز سے "معراج العاشقین" سمیت پانچ نثری رسالے منسوب کیے ہیں۔ ڈاکٹر عقیل نے ع ۱۸ پر "معراج العاشقین" کو ان میں سے خارج کر دیا، بقیہ چار کو لے کر ایک مزید رسالے "چکی نامہ" کا اضافہ کر دیا۔ مختلف مورخین نے بندہ نواز سے مختلف رسالے منسوب کیے ہیں لیکن نثری "چکی نامہ" کو کسی نے نہیں کیا۔ ڈاکٹر زور نے ایک منظوم "چکی نامہ" کو خواجہ سے منسوب کیا ہے ("تذکرہ مخطوطات"، جلد اوّل، ص ۶۸، بحوالہ سیدہ جعفر: "سکھ انجن"، حیدر آباد، ۱۹۶۸ء، ص ۶۴)۔

بہت سے دکنی شعرا نے منظوم چکی نامے لکھے لیکن کسی نثری چکی نامے کی مجھے کوئی اطلاع نہیں۔ ڈاکٹر عقیل نے "معراج العاشقین" کا نام تو بندہ نواز کے آثار میں سے خارج کر دیا لیکن ان کی زبان کا نمونہ دیا تو کتاب کا نام لیے بغیر اسی سے (ص ۱۸)۔ حقیقت یہ ہے کہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ ایک بات اور، دکنیات کا یہ بیان کتاب کے حصۂ نظم میں ہے۔ اس میں نثری کتابوں مثلاً وجہی کی "سب رس" کا بیان بے موقع ہے۔ یہ حصۂ نثر میں کیا جانا چاہیے تھا۔

Scanned by CamScanner

"الف" اور "ع" دونوں میں میراں جی شمس العشاق کا سنہ وفات ۹۷۰ھ دیا ہے۔ یہ سنہ بہت اختلافی ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے ان کا سنہ وفات ۹۸۱ھ طے کیا ہے(۱)، میری رائے میں ۹۹۴ھ ہونا چاہیے (۲) الف ۳۴ پر شاہ میراں جی کی مثنوی "خوش نامہ" کے اشعار کی تعداد یوں لکھی ہے:

خوش نامہ ؟ شعر کی ایک مثنوی ہے۔

ع ۱۹ میں اتنی ترقی ہوئی

خوش نامہ ... ؟ ایک مثنوی ہے۔

بہتر ہوتا کہ اشعار کی تعداد اور سوالیہ نشان دونوں کو حذف کر دیا ہوتا، ورنہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل (دہلی، ۱۹۷۷ء) میں ص ۱۶۹-۱۶۸ دیکھ لیے جاتے جن میں اشعار کی تعداد ۱۷۰ دی ہے۔ الف ۳۴ میں میراں جی کی مثنوی "شہادت التحقیق" میں ۵۶۳ بند دکھائے ہیں۔ دراصل اس میں ۵۶۳ شعر ہیں۔ ڈاکٹر عقیل نے اشعار کی تعداد حذف کر دی۔

برہان الدین جانم کی وفات، "الف" اور "ع" دونوں میں ۹۹۰ھ درج ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے مندرجہ بالا کتاب میں کئی قطعات تاریخ سے ۱۰۰۷ھ طے کیا ہے (ص ۱۱۴)۔ "الف" اور "ع" دونوں میں شاہ برہان الدین جانم کی ایک مثنوی کا نام "رمزالواصلین" دیا ہے، صحیح "رموزالواصلین" ہے۔ یہ ان کی اہم مثنوی نہیں۔ دونوں مورخین نے شاہ امین الدین اعلیٰ کا سنہ وفات ۱۰۸۶ھ دیا ہے۔ ان کے محقق ڈاکٹر حسینی شاہد کے مطابق صحیح سنہ ۱۰۸۵ھ ہے (کتاب، ص ۱۴۹)۔ ع ۲۰ میں شاہ امین کی دو کتابوں کے نام "محبت نامہ" اور "نظمِ وجود" لکھے ہیں۔ حسینی شاہد کے مطابق ان کے صحیح نام "محب نامہ" اور "وجودیہ" ہیں۔ شاہ امین کی نثری کتابوں "گنجِ مخفی" اور "گفتار شاہ امین" کو ملفوظات قرار دیا ہے۔ "ملفوظات" متفرق اقوال کو کہتے ہیں جب کہ یہ مستقل موضوع کی کتابیں ہیں۔

حیرت ہے کہ اعجاز صاحب نے ہاشمی کی ریختی گوئی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ ع ۲۲ میں اس پہلو کا اضافہ ہے۔ ع ۲۳ میں قطب شاہی دور کے خاص شعرا میں ایک کا نام سید احمد دیا ہے جو مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کا مصنف ہے۔ دراصل یہ سید نہیں، شیخ احمد گجراتی ہے۔

الف ۳۷ اور ع ۲۳ دونوں میں ڈاکٹر زور کی مرتبہ کلیاتِ قلی قطب شاہ کی اشاعت کا سال ۱۹۴۱ء درج ہے۔ صحیح ۱۹۴۰ء ہے۔ الف ۳۸ پر "سب رس" کے متعلق لکھا ہے کہ نصیر الدین ہاشمی کی رائے میں غالباً وجیہ الدین گجراتی کی تالیف کا ترجمہ ہے۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں ہاشمی کی یہ رائے رہی ہو لیکن "دکن میں اردو" کے نئے ایڈیشنوں میں ایسا نہیں

Scanned by CamScanner

لکھا- یہ بے اصل بات ہے۔ "سب رس" کو وجیہ الدین گجراتی سے کوئی تعلق نہیں۔ حیرت ہے کہ ع ۲۵ میں اس بات کو دہرا دیا گیا ہے۔

"طوطی نامۂ غواصی" کے بارے میں ڈاکٹر عقیل نے اضافہ کیا ہے کہ کچھ لوگ اسے "منطق الطیر" کا چربہ جانتے ہیں (ع ۲۶)۔ یہ درست نہیں۔ دونوں کتابیں بالکل مختلف ہیں۔ وجدی کی مثنوی "پنچھی باچھا" ضرور عطار کی "منطق الطیر" کا آزاد ترجمہ ہے۔ ولی کے بارے میں اعجاز صاحب نے پہلا جملہ لکھا کہ ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے (الف ۴۴)۔ ع ۲۹ میں اس کی تصحیح کر کے لکھ دیا گیا ہے کہ گجرات کے رہنے والے تھے، اورنگ آباد میں عمر کا زیادہ حصہ گزرا۔

الف ۴۷ میں ولی پر دکنی شعرا کی ایک فصل ختم کر کے لکھا ہے:

> دکنی اردو شعرا کے ذکر کے بعد ضروری ہے کہ شمالی ہند کے اردو ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا جائے، چنانچہ اب یہاں سے ہم شمالی ہند کے شعرا کا تذکرہ پیش کریں گے۔

یہی جملے ع ۳۱ میں نقل کیے گئے ہیں۔ حیرت پر حیرت ہے کہ دونوں ترتیبوں میں اس کے بعد کے صفحے پر عنوان ہے، "دکن کی ابتدائی خدمات۔" اور اس کے بعد سات صفحات پر دکنی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مندرجۂ بالا جملے اس جائزے، یعنی بابِ اوّل کے آخر میں لکھے جانے چاہییں تھے جس کے بعد باب ۲ سے شمالی ہند کا بیان شروع ہوتا ہے۔

"الف" میں آبرو کا سنہ وفات ۱۱۶۵ھ درج ہے۔ ع ۴۲ میں تصحیح کر کے ۱۱۴۶ھ دیا ہے جو بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے سنہ ولادت ۱۰۹۶ھ کے گرد و پیش لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود نے ۱۰۹۵ھ متعین کیا ہے۔ ("تعیینِ زمانہ" در "معاصر"، جلد ۲، حصہ ۸، ص ۱۱۸، بحوالۂ جالبی: تاریخ، جلد دوم، حصۂ اوّل، ص ۲۱۲)

"الف" میں ناجی کا سنہ ولادت و وفات نہیں دیا۔ "ع" میں دونوں دیے ہیں۔ اس تاریخِ ادب کی دونوں منزلوں کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ بیانات کے ماخذ کا اظہار نہیں کیا، الّا ماشاءاللہ۔ "الف" اور "ع" دونوں میں مضمون کا سنہ وفات ۱۷۴۷ء درج ہے جو غلط ہے۔ جمیل جالبی نے صراحت کی ہے کہ تاباں کے قطعۂ تاریخِ وفات کے مطابق مضمون کا انتقال ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴-۳۵ء میں ہوا (جالبی، جلد دوم، حصۂ اوّل، ص ۵۸-۲۵۷)۔ مضمون کے سلسلے میں ڈاکٹر عقیل نے اضافہ کیا ہے کہ جو شعر ولی کے نام سے مشہور تھا، دراصل مضمون کا ہے:

Scanned by CamScanner

دل لیا مضمون کا دلی نے چھین

جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

عقیل صاحب نے پہلا مصرع درست نہیں لکھا۔ حمید اورنگ آبادی کے تذکرہ "گلشنِ گفتار" میں پوری غزل درج ہے جس میں اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہے:

اس گدا کا دل لیا دِلی نے چھین

شفیق کے "چمنستانِ شعرا" میں ہے ع:

اس گدا کا دل لیا دلی میں چھین

ڈاکٹر عقیل نے ص۸۴ پر خان آرزو کی نادر تصنیف "مُثمر" کا ذکر کیا ہے۔ اس کا صحیح املا "ث" سے "مثمر" ہے جسے ریحانہ خاتون نے مرتب کر کے کراچی یونی ورسٹی سے شائع کر دیا ہے۔ ابھی تک علم بدیع سے متعلق یہ ضخیم کتاب اہلِ نظر کی نظر سے اوجھل تھی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے حاتم کا سنہ وفات ۱۲۷۰ھ لکھا ہے۔ ساتھ میں لکھتے ہیں کہ مصحفی کو اس سنہ سے اختلاف ہے اور وہ ۱۱۹۹ھ میں ان کا مرنا بتاتے ہیں (الف ۷۷)۔ ڈاکٹر عقیل نے اس قضیے سے گھبرا کر سنہ وفات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ حق یہ ہے کہ مصحفی نے تذکرہ "عقدِ ثریا" میں حاتم کا قطعۂ وفات بھی لکھا ہے اور سنہ وفات بالتصریح رمضان ۱۱۹۷ھ درج کیا ہے جس کی دوسروں کے بیان سے بھی تصدیق ہوتی ہے (جمیل جالبی، جلد دوم، ص ۴۳۱-۳۳۳)۔ ڈاکٹر اعجاز نے میر درد کا سنہ ولادت نہیں دیا تھا، ڈاکٹر عقیل نے اس کا صحیح اضافہ کیا۔

جرأت کا سنہ وفات الف ۱۰۶ پر ۱۲۲۵ھ دیا ہے۔ ع ۷۷ پر اسے بدل کر ۱۲۳۵ھ کر دیا۔ ناسخ کے مصرع:

ہائے ہندستان کا شاعر موا

سے ۱۲۲۵ھ ہی نکلتا ہے لیکن مصحفی کے مصرع:

از قلندر بخش شصت و دو نگن

سے ۱۲۲۴ھ بر آمد ہوتا ہے (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد ۷، ص ۲۸۷)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنین کا معاملہ کتنا الجھا ہوا ہوتا ہے۔ اختلاف کی صورت میں سنہ درج کرنے کے ساتھ پوری بحث بھی دینی ہوگی۔

الف ۱۱۳ پر انشا کی "دریائے لطافت" کا سنہ تصنیف ۱۸۰۲ء دیا ہے، ع ۸۲ پر

Scanned by CamScanner

۱۸۰۶ء، یہ بھی قدرے کم ہے۔ کتاب کے قطعۂ تاریخ سے اس کا سنہ ۱۲۲۲ھ نکلتا ہے جو ۰۸-۱۸۰۷ء کے متوازی ہے۔ اعجاز صاحب نے "رانی کیتکی کی کہانی" کا کوئی سنہ نہیں دیا۔ عقیل صاحب نے ع ۸۲ پر ۱۸۰۴ء اور ع ۲۸۶ پر ۱۸۰۵ء لکھا ہے۔ دراصل اس کتاب میں کہیں سنہ مذکور نہیں۔ ڈاکٹر عابد پیشاوری نے طویل بحث کے بعد ۹۰-۱۷۸۸ء قیاس کیا ہے (انشاء اللہ خاں، ص ۴۴۴)

الف ۱۱۵ پر لکھا ہے کہ مصحفی مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں ملازم ہوئے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان سنین میں سہوِ کتابت ہے، اسی لیے ڈاکٹر عقیل نے یہ بیان حذف کر دیا، لیکن اعجاز صاحب اور عقیل صاحب دونوں نے سالِ وفات کو مشتبہ قرار دیتے ہوئے ۱۲۴۰ھ لکھا ہے۔ یہ سنہ مشتبہ نہیں، قطعاً صحیح ہے جو اُن کے شاگرد غلام اشرف کے مصرعِ تاریخ سے برآمد ہوتا ہے (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی؛ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد ۷، ص ۲۶۹)

ناسخ کے بیان میں ڈاکٹر عقیل نے ص ۹۵ کے آخر میں ایک پیراگراف میں ناسخ کی مثنوی اور دواوین کے ناموں اور تاریخوں کا اضافہ کیا۔ اس میں مثنوی "سراجِ نظم" کی تاریخ سہوِ کتابت سے ۱۹۳۸ء چھپ گئی ہے جو ۱۸۳۸ء ہونی چاہیے۔ اسی طرح ع ۹۶ میں آتش کے سنہ ولادت کا اضافہ کیا ہے جو صحیح ہے۔ ذوق کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر تنویر علوی کے مطابق ذوق کے کلام میں محمد حسین آزاد نے کچھ غزلیں کہہ کر شامل کر دی ہیں (ع ۱۰۶)۔ یہ تحقیق ڈاکٹر تنویر کی نہیں۔ اس کا انکشاف سب سے پہلے محمود شیرانی نے رسالہ "ہندوستانی" میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کیا۔ بعد میں ڈاکٹر صادق اور اسلم فرخی نے اس پر صاد کی۔

مرزا غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر عقیل نے ایک پیراگراف کا اضافہ کیا ہے کہ دیوانِ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ڈیڑھ جزو کا دیوان ہے۔ اتنا مختصر دیوان اس وقت تک کسی دوسرے اردو شاعر کا نہ تھا (ع ۱۵۹)۔ خوش قسمتی سے کالی داس گپتا رضا نے اس ایڈیشن کا عکس چھاپ دیا ہے۔ یہ ڈیڑھ جزو کا نہیں، پورے ۱۰۹ صفحوں کا ہے۔ فائز دہلوی اور نسیم لکھنوی کے دیوان اس سے بھی زیادہ مختصر ہیں۔ الف ۱۴۸ میں انتقال کے وقت مومن کی عمر ۵۴ سال، لیکن ع ۱۱۰ میں ۵۱ سال لکھی ہے۔ ایک نے ہجری سنہ سے عمر کا اندازہ لگایا، دوسرے نے عیسوی سنہ سے۔

جلال لکھنوی کی بعض کتابوں کے نام لکھنے میں دونوں مولفین سے تسامح ہوا۔ الف ۱۵۹ نیز ع ۱۱۹ میں جلال کے دو دیوانوں کے نام "کرشمہ جاتِ سخن" اور "نظمِ رنگیں" لکھے ہیں۔ صحیح "کرشمہ گاہِ سخن" اور "نظم نگارین" ہیں ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" ۱۹۴۴ء،

Scanned by CamScanner

ص ۲۸۱) رام بابو سکسینہ کی انگریزی "تاریخِ ادبِ اردو" میں جلال کی عروض کی کتاب کا نام "مفید الفصحا" لکھا ہے۔ اردو مترجم مرزا عسکری نے اس کی تصحیح کر کے "دستور الفصحا" لکھا۔ الف ۱۵۹ میں انگریزی ایڈیشن کی تقلید میں "مفید الفصحا" ہی لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے اس کی تصحیح کر کے "مفید الشعرا" لکھا (ع ۱۱۹)۔ دراصل جلال کی دو مختلف کتابیں "دستور الفصحا" عروض میں اور "مفید الشعرا" تذکیر و تانیث میں ہے۔ عقیل صاحب کو "مفید الفصحا" کی تصحیح "دستور الفصحا" سے کرنی چاہیے تھی، "مفید الشعرا" سے نہیں۔

جلال کے بعد ع ۱۲۰ پر نوح ناروی کا اضافہ ہے۔ بجا ہے، لیکن تاریخی ترتیب سے نوح کو بہت بعد میں آنا چاہیے تھا۔ فی الحال یہ دبیر، انیس، آزاد، حالی، اسماعیل، سرور جہاں آبادی، اکبر، عزیز، چکبست، اقبال اور صفی وغیرہ پر مقدم ہو گئے ہیں۔ انھیں باب ۱۱ "دورِ حاضر" میں رکھنا چاہیے تھا۔

دبیر کی تنقید میں ع ۱۲۸ پر تیسرے پیراگراف کے آخری جملے "کہیں خالی نہ ملے گا" کے بعد ڈاکٹر عقیل نے سوا صفحات کا اضافہ کیا ہے۔ شاد عظیم آبادی کی تاریخ وفات میں کسی قدر گھپلا ہو گیا ہے الف ۱۹۲ پر ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء درج ہے۔ ہجری سنہ صحیح ہے عیسوی غلط۔ ع ۱۵۰ پر ۲۰ رجب ۱۳۴۵ھ مطابق ۷ جنوری ۱۹۲۷ء لکھا ہے۔ یہاں ۲۰ رجب سہوِ کتابت ہے۔ مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں ۲ رجب ۱۳۴۵ھ (۶ جنوری ۱۹۲۷ء) لکھا ہے۔ تقویم کے مطابق ان دونوں تاریخوں کا تطابق ہوتا ہے۔ دوسری طرف "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی" مرتبہ محمد مسلم عظیم آبادی میں شاد کی تاریخِ وفات ۸ جنوری ۱۹۲۷ء لکھی ہے جو سب سے زیادہ معتبر ہے (ص ۲۷۵)۔ یہ ۳ رجب کے مطابق ہے۔ شاد کے بیان کی آخری سطروں میں ڈاکٹر عقیل نے ان کی بعض کتابوں کے ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ ع ۱۶۰ پر آخری پیرے میں کلامِ چکبست کے ایڈیشنوں کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ الف ۲۱۳ پر میرے لیے یہ اطلاع حیرت انگیز ہے کہ فانی نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۷ء تک پورے ۱۱ سال کوئی شعر نہیں کہا۔

اعجاز صاحب نے اپنے دو اساتذہ مہدی حسن ناصری اور پروفیسر ضامن علی پر بھی لکھا ہے۔ ضامن صاحب ان کے صدرِ شعبہ بھی تھے اس لیے ان کی توصیف شدومد سے کی ہے۔ کلیم الدین احمد نے "اردو شاعری پر ایک نظر" میں ضامن صاحب کے شمول اور انھیں ادبی حیثیت عطا کرنے کی کوشش کو نامناسب قرار دیا ہے (بحوالہ علی حیدر، ص ۱۷۵)۔ یہی اعتراض ناصری صاحب جیسے مجہول الاسم ادیب کے شمول پر بھی کیا جانا چاہیے۔ ان دونوں کے شمول کو ایک شاگرد کا خراجِ عقیدت سمجھ کر معذور کیا جا سکتا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ

Scanned by CamScanner

ہے کہ الف ۲۱۹ پر ضامن صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۸۸ء لکھا ہے جب کہ ع ۱۷۲ پر ۱۸۸۰ء۔ وہ اپریل ۱۹۵۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ اس وقت الہ آباد یونی ورسٹی میں سبکدوشی کی عمر ۶۲ سال تھی۔ گویا ان کی ولادت ۱۸۹۲ء میں ہوئی ہو گی لیکن حکومت ہند نے ان کے نام پر جو ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے اس میں بھی ان کی ولادت ۱۸۸۰ء کی دکھائی ہے۔ اس طرح وہ ۷۴ سال کی عمر میں ریٹائر ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں اعجاز صاحب نے ۱۹۶۴ء کے ایڈیشن میں بھی ضامن صاحب کی سبکدوشی اور وفات کی تاریخیں نہیں دیں۔ عقیل صاحب نے دی ہیں۔

اعجاز صاحب نے فطرت واسطی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں حالات کا تقریباً فقدان ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کون صاحب ہیں، کہاں کے ہیں۔ اچھا ہوا کہ عقیل صاحب نے ان کو خارج کر دیا۔ ان کے بعد ہمارے ہم عصر ادیبوں کا بیان ہے۔ واضح ہو کہ اعجاز صاحب نے تاریخ کا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس میں تقریباً ۱۹۶۳ء تک کے واقعات کا اندراج ہو سکتا ہے۔ جو ادیب اس سنہ کے بعد زندہ رہے ان کے بارے میں عقیل ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ملے گا، بالخصوص ان کی ۱۹۶۴ء کے بعد کی تصانیف اور ان کے سنہ وفات کے سلسلے میں۔ عقیل صاحب ان کے حالات میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر کے حال تک لے آئے ہیں۔ انھوں نے تاباں کے بعد ۱۳ مشہور شاعروں کا اضافہ کیا۔ مجھے ان کے حالات پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا ہے، صرف ان کے بعض سنین کے بارے میں عقیل صاحب اور دوسرے مورخین کے اختلاف کو پیش کر رہا ہوں۔ ان میں بیش تر صورتوں میں دوسرے مورخین کا بیان صحیح تر معلوم ہوتا ہے۔ اول الذکر کے ۱۹۸۴ء کے ایڈیشن کے صفحات کے نمبر درج کر رہا ہوں۔

مختصر تاریخِ ادب کے سنین	دوسرے مورخین
ص ۱۵۷ جگت موہن لال رواں: ف اکتوبر ۱۹۳۴ء	مانک رام: ۲۶ ستمبر ۱۹۳۴ء
ص ۱۶۰ چکبست کی "صبحِ وطن" کی طبعِ اول ۱۹۲۶ء	کالی داس گپتا رضا: ۱۹۱۸ء (کلیاتِ چکبست، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳ بحوالہ "انتخابِ زریں" از راس مسعود و "کملا" از عطیہ نشاط، ص ۸)
ص ۶۴: حسرت موہانی: پ ۱۸۸۱ء	نفیس احمد صدیقی: ان کے پاسپورٹ کے مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء۔ ("ہماری زبان"، یکم فروری ۱۹۹۳ء)

Scanned by CamScanner

اندراج	تصحیح
ص۱۷۶ جلیل: پ ۱۸۶۵ء	ذکی کاکوروی: ۱۲۸۰ھ (۶۴-۱۸۶۳ء)
ص۱۷۷ جوش: پ ۱۸۹۵ء	کاظم علی خاں: ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء ("جوش شناسی"، ص ۲۵۳)
ص۱۷۸ جوش ۱۹۵۶ء میں پاکستان گئے	کاظم علی خاں: ۱۹۵۵ء میں (ایضاً، ص ۲۵۶)
ص۱۸۶ ظریف: پ ۲۴ فروری ۱۹۷۰ء	سہوِ کتابت: صحیح ۱۸۷۰ء
ص۱۸۷ آرزو: پ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء (محض ایک عیسوی سنہ لکھنے سے ایک سال کا فرق)	مالک رام: ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ/۱۶ فروری ۱۸۷۳ء
ص۱۹۱ ریاض: پ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء	مالک رام: ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء (بحوالہ "رندِ پارسا")
ص۱۹۳ اصغر گونڈوی: پ ۱۸۸۲ء	مالک رام: یکم مارچ ۱۸۸۴ء
ص۱۹۹ سائل: پ ۱۸۶۸ء	مالک رام: ۲۹ مارچ ۱۸۶۴ء
ص۲۰۱ یاس یگانہ: پ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء	مالک رام: ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ/۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء
ص۲۱۲ حفیظ جالندھری: ف ابتدائے ۱۹۸۳ء	مالک رام: ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء۔ بحوالہ "افکار" حفیظ نمبر
ص۲۱۳ سیماب: پ ۱۸۸۰ء	سیماب نے اپنے مجموعے "کلیم عجم" کے شروع میں "شعر الحیات" میں اپنی تاریخ ولادت جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۰ء بتائی ہے (ص ۲۱)۔ یہ ہجری ماہ ۱۸۸۲ء میں پڑتا ہے۔ اپنی قلمی بیاض میں رجب ۱۲۹۹ھ لکھی ہے (زرینہ ثانی: "سیماب کی نظمیہ شاعری"، بمبئی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۸)۔ مالک رام: ۱۸ رجب ۱۲۹۹ھ
ص۲۱۳ سیماب: ف ۱۹۵۲ء	زرینہ ثانی: ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء ("سیماب کی نظمیہ شاعری"، ص ۴۵)
ص۲۱۵ جمیل مظہری: پ ۱۹۰۵ء	قمر سلطانہ: ستمبر ۱۹۰۴ء ("علامہ جمیل مظہری"، دلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱)
ص۲۱۷ احسان دانش: پ ۱۹۱۳ء	مالک رام: ۱۹۱۱ء۔ ملک حسن اختر: ۱۹۱۴ء
ص۲۲۷ وامق: پ ۱۹۱۲ء	ادارہ کتاب نما: ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء، بحوالہ مکتوبِ وامق (شمارہ نومبر ۱۹۹۴ء، ص ۹۱)

Scanned by CamScanner

ص۲۲۹- مجروح: پ ۱۹۱۹ء	صحیح ۱۷ جنوری ۱۹۲۰ء - خود انھوں نے کالی داس گپتا کو بتائی۔
ص۲۳۴ مخدوم: پ ۱۹۱۰ء	مالک رام: ۴ فروری ۱۹۰۸ء
ص۲۴۳ اسکندر علی وجد: پ بیجاپور ضلع اورنگ آباد ۱۹۱۴ء	مالک رام: وجے پور ضلع اورنگ آباد، ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء
ص۲۴۹ ن م راشد: ف ۱۹۸۰ء	صحیح ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء ("ہماری زبان"، ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء، ص۸)
ص۲۵۲ جاں نثار اختر: ف ۱۹۷۹ء	صحیح ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء ("ہماری زبان"، یکم ستمبر ۱۹۷۶ء، ص۸)
ص۲۵۳ کیفی: پ ۱۹۱۸ء	صابروت: ۱۴ جنوری ۱۹۲۰ء ("تصویر بتاں")
ص۲۵۵ سلام مچھلی شہری: پ ۱۹۲۰ء	مالک رام: یکم جولائی ۱۹۲۱ء
ص۲۶۳ خلیل الرحمان اعظمی: ف مئی ۱۹۷۸ء کی آخری تاریخیں	مالک رام: یکم جون ۱۹۷۸ء
ص۲۶۵ باقر مہدی: پ ۱۹۲۹ء	مالک رام: ۱۱ فروری ۱۹۲۷ء

تاریخ کا دوسرا حصۂ نثر کا ہے۔ اس میں ابتدا میں پانچ چھ صفحوں میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی نثر کی تاریخ سمیٹی ہے، لیکن سنین کے اعتبار سے یہ معتبر نہیں۔ پورے حصۂ نثر کے سنین کا جائزہ اس کے تبصرے کے آخر میں لوں گا۔

اعجاز صاحب نے ص۳۲۱ پر "معراج العاشقین" کو حضرت گیسودراز کی تصنیف بتایا ہے۔ عقیل صاحب نے ص۲۸۰ پر اس انتساب کو تو رد کیا لیکن یہ ستم کیا کہ اسے گیسودراز کے نواسے سید محمد عبداللہ حسینی کی تصنیف قرار دے دیا۔ خدا معلوم ان کا ماخذ کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی انگریزی تاریخ میں اسے "نشاط العشق" کا ترجمہ لکھا ہے (ص۲۴۰)۔ ان کے اردو مترجم مرزا عسکری نے لکھا ہے کہ بندہ نواز کے نواسے سید محمد عبداللہ الحسینی نے "نشاط العشق" کا دکھنی میں ترجمہ کیا (تاریخ، حصۂ نثر، ص۲) شاید ڈاکٹر عقیل نے ان دونوں بیانات کو سمو کر "معراج العاشقین" کو عبداللہ حسینی سے منسوب کر دیا حالانکہ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی مشہور تحقیق سامنے آ چکی تھی کہ "معراج العاشقین" بہت بعد کے بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔

عقیل صاحب نے اپنی کتاب کے ص۱۸ پر عبداللہ حسینی کو بندہ نواز کا پوتا اور ص۲۸۰ پر نواسا لکھا ہے۔ دکنیات کے بڑے محققین کے اختلافی بیانات کے سبب ایسا

Scanned by CamScanner

ہوا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے "سیرِ محمدی" کے شجرے کے حوالے سے انھیں بندہ نواز کی نواسی کا شوہر قرار دیا ہے ("اردو نثر کا آغاز اور ارتقا"، حیدر آباد، ص ۱۱۵)۔ سروری صاحب نے لکھا ہے کہ بندہ نواز کے دونوں فرزندوں کی اولاد میں کوئی عبداللہ نامی بزرگ نہیں گزرے۔

عبداللہ خواجہ صاحب کی نواسی... کے شوہر ابوالمعالی کے فرزند تھے۔
(علی گڑھ تاریخ، ص ۱۸۴)

نواسی کا فرزند نہ کہہ کر نواسی کے شوہر کا فرزند کہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ابوالمعالی کی کسی دوسری بیوی کی اولاد ہوں گے۔

ص الف ۳۲۲ اور ع ۲۸۱ پر شاہ میراں جی شمس العشاق سے تین نثری رسالے منسوب کیے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کی تحقیق ہے کہ انھوں نے اردو میں کوئی نثری رسالہ نہیں لکھا۔ مجھے اس فیصلے سے اتفاق ہے۔ ع ۲۸۱ پر لکھا ہے:

۱۰۷۷ھ مطابق ۱۶۷۷ء کے قریب ایک بزرگ میراں یعقوب نے "شمائل الاتقیا" اور "دلائل الاتقیا" کا ترجمہ دکھنی زبان میں کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولفین کے نزدیک یہ دو کتابیں ہیں۔ دراصل یہ ایک ہی کتاب ہے جس کا فارسی نام غالباً "شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا" ہے۔ اردو ترجمے کا نام محض "شمائل الاتقیا" ہے۔ (دیکھیے، شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم"، ص ۱۱۸، نیز ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی "اردو نثر کا آغاز اور ارتقا"، ص ۲۱۴)۔ جمیل جالبی کے مطابق اردو ترجمے کی تاریخ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) ہے۔

"فورٹ ولیم کالج" کے عنوان کے تحت عقیل صاحب نے سوا صفحے کا مفید اضافہ کیا ہے لیکن اضافے کے درمیانی حصے میں لغزش کر گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

بینی نراین جہاں نے "قصۂ گل و صنوبر" اور "نثرِ بے نظیر" نے (کذا) نثر میں سلیس قصہ گوئی کو رواج دیا جس سے "قصۂ مہر افروز و دلبر" مصنفۂ عیسوی خاں بہادر، "نوآئینِ ہندی" مصنفۂ مہر چند کھتری اور "عجائب القصص" مصنفۂ شاہ عالم ثانی کی تصانیف وجود میں آئیں اور اس طرح قصہ گوئی میں سادگی کو فروغ ملا۔

(ص ۲۸۵)

بینی نرائن جہاں کا غیر مطبوعہ "گل و صنوبر" اور بہادر علی حسینی کی "نثرِ بے نظیر" انیسویں صدی کی اور "قصۂ مہر افروز و دلبر"، "نوآئینِ ہندی" اور "عجائب القصص"

Scanned by CamScanner

اٹھارویں صدی کی تخلیق ہیں۔ بعد کی کتابیں پیش تر کی کتابوں کا اسلوب متعین نہیں کر سکتیں۔

عقیل صاحب نے فورٹ ولیم کالج کے کئی مصنفین کے بارے میں خاصے اضافے کیے ہیں، بالخصوص میرامن، للولال اور بینی نرائن جہاں میں۔ ان کی تفصیل قطع کرتا ہوں، لیکن انھوں نے ص ۲۸۷ پر میرامن کے بارے میں یہ جو لکھا ہے کہ غالباً ۱۸۰۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا، یہ بے بنیاد بات ہے۔ ص ۲۹۲ پر عام خیال کے مطابق لکھا ہے کہ مظہر علی ولا کی "مادھونل اور کام کندلا" موتی رام کبیشر کی ہندی کتاب کا ترجمہ ہے۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالم کی اودھی نظم کا ترجمہ ہے، موتی رام نے اس موضوع پر کبھی نہیں لکھا۔ خود ولا کو اپنے ماخذ کے مصنف کے بارے میں غلط فہمی تھی۔ بینی نرائن جہاں پر اعجاز صاحب نے چند سرسری سطور لکھی تھیں۔ عقیل صاحب نے ڈیڑھ سوا صفحوں میں مفید تحقیقی معلومات فراہم کیں جن میں "تفریح طبع" تک کا ذکر آ گیا ہے۔ ان کے بعد عقیل صاحب نے مولوی اکرام علی پر لکھ کر شامل کیا۔ آگے کے اوراق میں ذیل کے اضافے قابلِ ذکر ہیں:

ص ۳۰۵-۳۰۴ پر "واجد علی شاہ اختر بحیثیت نثر نگار"، باب سوم "نثر کی ترقی" کے شروع میں، ص ۳۱۴-۳۱۳ پر دہلی کالج کا بیان، حالی اور شبلی کی تصانیف کے ناموں کا اضافہ، ص ۳۳۷ پر نذیر احمد کے ناولوں "توبۃ النصوح" اور "بنات النعش" کے ماخذوں کی نشان دہی۔ اس میں "بنات النعش" کے ماخذ کا بیان زیادہ معتبر ہے۔

اعجاز صاحب نے الف ۳۸۸ پر مرزا محمد ہادی کا تخلص رسوا لکھا ہے جیسا کہ معروفِ عام ہے۔ عقیل صاحب نے تصحیح کی کہ ان کا تخلص مرزا تھا۔

> امراؤ جان ادا ایک فرضی نام رسوا رکھ کر شائع کیا تو پھر رسوا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (ص ۳۴۶)

عقیل صاحب نے ص ۳۴۸ پر مبینہ شاعرہ امراؤ جان ادا کی مثنوی "جنونِ انتظار" کو رسوا کی تصنیف قرار دیا۔ عقیل صاحب ماہرِ پریم چند ہیں اس لیے انھوں نے ان کے بیان کو تحقیق کا ایک خوشگوار نمونہ بنا دیا ہے۔ پریم چند کی مفصل سوانح اور کتابوں کی تاریخ وار فہرست کی وجہ سے یہ تاریخِ ادب کے لیے مثالی تحریر بن گئی ہے۔ انھوں نے یلدرم کے بیان میں بھی کئی کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ اعجاز صاحب نے ص الف ۴۰۷ پر یلدرم کے مسلم یونی ورسٹی کا رجسٹرار مقرر ہونے کی بات کہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں عقیل صاحب نے اسے حذف کر دیا۔ "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم

Scanned by CamScanner

یونی ورسٹی کے قیام پر وہ ۱۹۲۰ء میں پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں سبکدوش ہوئے۔ (دسویں جلد، ص ۱۶۷)

کرشن چندر کے بارے میں الف ۴۲۶ اور ع ۳۷۶ دونوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی کشمیر میں گزری۔ یہ درست نہیں۔ ان کے والد چند سال پونچھ میں ملازم رہے جو جموں ڈویژن میں ہے، کشمیر میں نہیں۔ اس سے ہٹ کر ڈاکٹر عقیل نے کرشن چندر اور اسی طرح بیدی کے بیان میں بہت اضافہ کیا ہے۔ عصمت چغتائی کے سنہ ولادت کا اضافہ کیا۔ نمبر ۴۸ خواجہ احمد عباس سے لے کر نمبر ۶۳ قرۃ العین حیدر تک ۱۶ افسانہ نگاروں پر عقیل صاحب کی تحریر ہے۔ ع ۴۰۵ پر یہ جو لکھا ہے کہ جیلانی بانو کو "ایوانِ غزل" پر ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا، یہ سخت غلط فہمی ہے۔ یہ ناول ضرور اس ایوارڈ کا مستحق تھا لیکن جیلانی بانو کو ابھی تک یہ ایوارڈ نہیں ملا۔ ع ۴۰۸ پر عقیل صاحب نے اپنے ہم شہر اپندر ناتھ اشک کا سنہ ولادت ۱۹۰۸ء لکھا ہے۔ صحیح ۱۹۱۰ء ہے۔

عقیل صاحب نے ڈرامے کی فصل لکھی۔ یہ اچھا کیا، لیکن محض امانت، آغا حشر اور تاج پر لکھنا ناکافی ہے۔

انھوں نے عظیم بیگ چغتائی کے سلسلے میں یہ جملہ لکھا ہے:

> عظیم بیگ نے "گل بوٹ" اور "خانم" میں اور تفویض (dream sequence) کی تکنیک کو اردو کے افسانوی ادب میں پہلی مرتبہ شعوری طور پر پیش کیا۔ (ع ۴۶۲)

صاف ظاہر ہے کہ اس جملے میں "اور تفویض" وغیرہ میں کوئی بڑا سہو کتابت واقع ہوا ہے۔ "صحیح نامہ" میں بھی تصحیح نہیں کی گئی۔ ملا رموزی کے بیان میں عقیل صاحب نے معلوم نہیں کیوں، اعجاز صاحب کا لکھا ہوا ایک تنقیدی صفحہ حذف کر دیا ہے۔ اعجاز صاحب نے ڈاکٹر زور کو تنقید نگار کے طور پر پیش کیا تھا، وہی عقیل صاحب نے کیا، زور کی تحقیق کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھا، حالانکہ ڈاکٹر زور بنیادی حیثیت سے محقق ہیں، نقاد نہیں۔

عقیل صاحب نے عندلیب شادانی کے بارے میں لکھا ہے:

> بنگلہ دیش بننے کے بعد شادانی مغربی پاکستان چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ (ع ۴۸۵)

بنگلہ دیش ۱۹۷۱ء کے آخری دنوں میں بنا۔ مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں عندلیب کی تاریخِ وفات ڈھاکا، ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء (۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ)، مصرعِ تاریخ اور مدفن قبرستانِ عظیم پور، ڈھاکا کی اطلاع دی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عندلیب کا انتقال

Scanned by CamScanner

مغربی پاکستان میں نہیں ہوا۔

اعجاز صاحب نے اختر حسین رائے پوری کا ذکر محض نقاد کے طور پر کیا ہے۔ عقیل صاحب نے پہلے افسانہ نگار کے طور پر اور بعد میں مگر تنقید نگار کے طور پر کیا۔ نیاز فتح پوری کو بطور تنقید نگار کے پیش کیا ہے، افسانہ نگاروں میں جگہ نہیں دی۔

عجیب بات ہے کہ عقیل صاحب نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو حذف کر دیا ہے۔ ان کی پوری کتاب میں اعجاز صاحب کے لکھے ہوئے صرف دو ادیبوں، فطرت واسطی اور ڈاکٹر عبداللہ کو بزم سے خارج کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام کا وطن ص ۵۰۶ پر سیوہارہ ظاہر کیا ہے۔ وہ ضلع مراد آباد میں اومری یا عُمری کے رہنے والے ہیں، سیوہارہ ان کی ننھیال ہے۔

مالک رام کو عام طور سے اردو تحقیق کے چار ستونوں میں جگہ دی جاتی ہے، لیکن عقیل صاحب نے ص ۵۲۸ پر انھیں ایک محقق کی حیثیت سے متنازع فیہ کہہ کر انصاف نہیں کیا۔ ان کے سلسلے میں "اردو تحقیق اور مالک رام" جیسی جعلی کتاب کا ذکر ایک تاریخ ادب میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس کا مبینہ مولف شاہد اعظمی ایک فرضی شخصیت ہے جس کے پس پردہ کوئی اور بول رہا ہے۔

حرف آخر کے تحت ڈاکٹر عقیل نے متعدد ہم عصر شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں کئی اشخاص علاحدہ مضمون کے مستحق تھے۔ اس تحریر میں کہیں کہیں ان کی طرف داری مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی سے وہ بہت بدگمان ہیں۔ لکھتے ہیں:

> محمد حسن نے ان کے لیے یہ مناسب جملہ لکھا ہے کہ ان کی اردو دانی اور ادب فہمی کا معاملہ مشتبہ ہے کہ یہ دونوں ان کی انگریزی دانی اور ان کی پوسٹ آفس والی ملازمت کے بیچ سے کہیں نکل بھاگی ہیں۔
>
> (ص ۵۵۹)

ذاتیات پر مشتمل ایسے جملے کسی رسالے کے مناظراتی مضمون میں تو کھپ سکتے تھے لیکن ایک تاریخِ ادب کے شایاں نہیں۔ نہ انگریزی دانی کوئی عیب ہے نہ پوسٹ آفس کی ملازمت۔ فاروقی ممبر پوسٹل بورڈ کے اعلا عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ راجندر سنگھ بیدی پوسٹ آفس میں کلرک تھے، اس سے اُن کی ذات پر کون سا حرف آتا ہے۔

اب حصۂ نثر کے سنین کا دوسرے مؤرخوں کے بیانات سے تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

مختصر تاریخ میں دیے سنین	دوسرے مورخ
ص ۲۸۱ شمس العشاق ف ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء)	گیان چند ۹۹۴ھ (مضمون "نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۸۶ء)
ص ۲۸۱ وجہی کی "سب رس" ۸۴۵ھ/ ۱۴۴۱ء	خود وجہی ۱۰۴۵ھ ("سب رس" کے آخر میں)
ص ۲۸۶ "رانی کیتکی کی کہانی" ۱۸۰۵ء	عابد پیشاوری: ۱۷۸۸ء کے قریب ("انشاء اللہ خان انشا"، ص ۴۴۵)
ص ۲۹۲ ولا کی "مادھونل اور کام کندلا" ۱۸۰۲ء	خود ولا کے مطابق ۱۸۰۱ء (پرکاش مونس: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، ص ۳۸۱)
ص ۲۹۳ ولا کی "ہفت گلشن" ۱۸۰۲ء	خود ولا: ۱۸۰۱ء (عبیدہ بیگم: "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، ص ۴۱۲)
ص ۲۹۴ للولال کی "پریم ساگر" ۱۸۰۹ء	عبیدہ بیگم: نقش اول ۱۸۰۳ء، نظر ثانی کے بعد ۱۸۰۹ء (ایضاً، ص ۴۷۵-۴۷۴)
ص ۲۹۵ بینی نرائن جہاں کی "تفریح طبع" ۱۲۲۷ھ سے ۱۲۴۰ھ کے بیچ	مصنف کے دیباچے کے مطابق ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۳۱ء (صفیہ احمد نقوی: "رائے بینی نراین دہلوی"، "نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۸)
ص ۲۹۸ فقیر محمد گویا: ف ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۵۰ء۔ ظاہرا ۱۲۳۶ھ سہو کتابت ۱۲۶۶ھ کے لیے	جعفر ملیح آبادی: بھانجے اور داماد (ایک ہی شخص) کے مطابق ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء ("گویا، صاحب سیف و قلم"، ص ۱۳۱)
ص ۲۹۹ "فسانۂ عجائب" ۱۸۲۴ء سے ۱۸۶۷ء کے درمیان	صحیح ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء
ص ۲۹۹ سرور: ف ۱۸۶۷ء	نیر مسعود ۱۸۶۹ء ("رجب علی بیگ سرور"، ص ۴۰۱)
ص ۳۰۰ "فسانۂ عجائب" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء	اطہر پرویز: ۹ جمادی الثانی ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۴۳ء) ("فسانۂ عجائب"، الہ آباد ۱۹۶۹ء۔ مقدمہ ۳۳۱)
ص ۳۰۷ غلام غوث بے خبر: ف ۱۹۰۵ء	مالک رام: ۲۶ دسمبر ۱۹۰۴ء/ ۱۸ شوال ۱۳۲۲ھ
ص ۳۱۱ ۱۸۳۳ء میں اردو کو فارسی کے بجائے سرکاری زبان قرار دیا گیا۔	حکم چند نیر۔ شمال مغربی صوبجات (یوپی) کے گورنر نے ۲۵ اگست ۱۸۳۶ء کو عدالتوں میں فارسی کے بجائے اردو رائج کرنے کی اجازت دی ("اردو کے مسائل"، بنارس، ۱۹۷۷ء، ص ۳۰)

ص۳۱۳ دہلی کالج کا قیام ۱۹۲۷ء میں، کشمیری گیٹ میں منتقلی ۱۹۴۳ء میں (ظاہرا ایک صدی کا سہوِ کتابت)	عبدالحق: ۱۸۲۵ء میں قیام ("مرحوم دہلی کالج"، ص۶-۵، بحوالہ مسیح اللہ: "انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے"، ص۱۹۵)
ص۳۲۳ ذکاء اللہ: پ ۱۸۳۳ء	رفعت جمال: ۲۰ اپریل ۱۸۳۲ء (ذکاء اللہ، ص۵۷۸)
ص۳۲۶ حالی کی "حیاتِ سعدی" ۱۸۸۸ء	ڈاکٹر عبدالقیوم: طبعِ اول ۱۸۸۶ء (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد۹، ص۱۲۱)
ص۳۲۶ حالی کی "مقدمۂ شعروشاعری" ۱۸۹۲ء	ڈاکٹر عبدالقیوم: ۱۸۹۳ء (ایضاً، ص۳۰)
ص۳۲۶ حالی کی "یادگارِ غالب" ۱۸۹۶ء	طبعِ اول ۱۸۹۷ء (سرورق، "یادگارِ غالب"، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۸۶ء میں دیکھیے)
ص۳۲۶ حالی کی "حیاتِ جاوید" ۱۹۰۲ء	ڈاکٹر عبدالقیوم: ۱۹۰۱ء (تاریخِ مسلمانان، جلد۹، ص۱۲۶)
ص۳۳۴ نذیر احمد: پ ۱۸۳۶ء	اشفاق اعظمی: ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء ("نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے"، ص۱۳۹)- افتخار احمد صدیقی: ۱۸۳۰ء (کتابیات)
ص۳۳۷ نذیر احمد کی "بنات النعش" ۱۸۷۳ء	افتخار احمد صدیقی: ۱۸۷۱ء (ڈپٹی نذیر احمد، کتابیات)
ص۳۳۷ نذیر احمد کی "توبۃ النصوح" ۱۸۷۷ء	افتخار احمد صدیقی: تصنیف ۱۸۷۳ء، شائع ۱۸۷۴ء (ایضاً)
ص۳۳۷ نذیر احمد کی "مراۃ العروس" ۱۸۶۹ء	اشفاق اعظمی: ۱۸۶۸ء، اشاعت ۱۸۶۹ء (نذیر احمد، ص۱۳۹)
ص۳۴۱ سرشار: ف ۱۹۰۲ء	لطیف حسین ادیب: ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء ("سرشار کی ناول نگاری"، ص۴۲)
ص۳۶۳ یلدرم: پ ۱۸۸۸ء	سنجیدہ خاتون: ۱۸۸۰ء
ص۳۶۵ سلطان حیدر جوش: ف ۱۴ مئی ۱۹۵۳ء	۱۸ مئی ۱۹۵۳ء ("علی گڑھ میگزین" ۹۱-۱۹۹۰ء، ص۱۸)
ص۳۷۱ علی عباس حسینی: ف ستمبر ۱۹۷۱ء	مالک رام: ۲۷ ستمبر ۱۹۶۹ء
ص۳۸۸ "انگارے"، اشاعت ۱۹۳۱ء	صحیح: نومبر ۱۹۳۲ء (خود اسی کتاب میں ص۳۹۴)

Scanned by CamScanner

ص۳۹۸ حیات اللہ انصاری: پ ۱۹۱۲ء	یکم مئی ۱۹۰۸ء، خود انھوں نے مجھے بتائی۔
ص۴۰۵ جیلانی بانو: پ ۱۹۳۳ء	مالک رام: ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ء (ص۴۲۴)
ص۴۱۱ عزیز احمد: ف ۱۹۸۱ء	مالک رام: ۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء (ص۲۸۵)
ص۴۱۲ اپندر ناتھ اشک: پ ۱۹۰۸ء	گیان چند: ۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء (مقدمہ "انبوباجی"، ص۹)
ص۴۱۲ "ستاروں کے کھیل" ۱۹۳۴ء میں ہندی میں شائع	گیان چند: ۱۹۴۰ء میں ہندی میں شائع، یہ معلومات خود اشک سے ملی۔ (ایضاً، ص۱۸)
ص۴۱۷ قرۃ العین حیدر: پ ۱۹۲۷ء	۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء ("ایوانِ اردو" نومبر ۱۹۹۴ء، ص۴)
ص۴۲۵ آغا حشر: پ ۱۸۸۰ء	ملک حسن اختر: یکم اپریل ۱۸۷۹ء/۸ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ ("تاریخ ادب اردو"، ص۱۱۸۸)
ص۴۳۲ محمد علی جوہر: پ ۱۹۷۹ء (ظاہرا سہو کتابت ۱۸۷۹ء کے لیے)	مالک رام: ۱۸۷۸ء (صحیح تر: ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء)
ص۴۳۴ جالب دہلوی: ف ۵ جولائی ۱۹۳۰ء	مالک رام: ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء (بحوالہ "نقوش"، لاہور نمبر، ص۹۲۵)
ص۴۳۹ ظفر علی خاں: پ ۱۸۷۰ء	مالک رام: ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء۔ تاریخی نام ظفر علی سے ۱۲۹۰ بر آمد ہوتا ہے۔ (حوالہ ایضاً، ص۹۳۵)
ص۴۴۷ قاضی عبد الغفار ۱۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو ۶۲ سال کی عمر میں مرے۔	حبیب خاں۔ دسمبر ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے (اس طرح ۷۰ سال کی عمر میں مرے۔) "قومی زبان"، کراچی، مارچ ۱۹۹۴ء، ص۳۹
ص۴۵۶ رشید احمد صدیقی: پ ۱۸۹۶ء	مالک رام: ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء
ص۴۶۸ کنھیا لال کپور: ف ۱۹۸۱ء	مالک رام: ۱۸ مئی ۱۹۸۰ء (میں جون ۱۹۸۰ء میں پونا گیا۔ وہ وہاں اس سے پہلے مر چکے تھے۔)
ص۴۷۴ عبد الحق: ف ۱۹۶۳ء، الف ۳۹۳ پر ۱۲۶۳ء (ظاہرا ۱۹۶۲ء کی تخریب)	مالک رام: ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء
ص۴۷۷ مسعود حسن رضوی: پ ۱۵ جولائی ۱۸۹۳ء	مالک رام: ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء
ص۴۸۱ علی جواد زیدی: پ ۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء	مالک رام: ۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء (ص۱۸۱) یہی زیدی نے مجھے بتائی۔

Scanned by CamScanner

ص ۴۹۰ آلِ احمد سرور: پ ۱۹۱۲ء	۹ ستمبر ۱۹۱۱ء مطابقِ سرگزشت
ص ۴۹۳ وقار عظیم: پ ۷ ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۸ء (۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں شروع ہوتا ہے۔)	سنجیدہ خاتون: ۷ ۱۳۲۷ھ/نومبر ۱۹۰۹ء
ص ۴۹۵ وقار عظیم: ف ۱۹۸۱ء	مالک رام: ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء
ص ۵۰۲ اختر اورینوی: ف ۱۹۷۵ء	مالک رام: ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء
ص ۵۰۲ کلیم الدین احمد: پ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۸ء	مالک رام: ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء (حوالۂ مصنف: "اپنی تلاش میں"، ص ۱)
ص ۵۱۲ محمد حسن: پ جولائی ۱۹۲۶ء	مالک رام: ۱۵ اگست ۱۹۲۵ء۔ جولائی ۲۶ سرکاری تاریخ ہے،
ص ۵۲۹ نورالحسن ہاشمی: پ ۱۹۱۳ء	صحیح ۲۱ اگست ۱۹۱۱ء (ان کے مجموعۂ کلام "اندرونم"، ص ۱۵۷)
ص ۵۳۳ تنویر علوی: پ ۱۹۲۲ء	مالک رام: ۱۶ جولائی ۱۹۲۵ء
ص ۵۳۵ رشید حسن خاں: پ ۱۹۲۵ء	مالک رام: ۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء (ص ۳۲۵)

واضح ہو کہ مخمور اکبر آبادی نے اپنی کتاب "صحیفۂ تاریخِ اردو" میں اعجاز صاحب کی زبان پر بہت سخت اور طولانی تنقید کی۔ دیکھیے مخمور کے بیان میں۔ یہ کتاب درسی ضروریات کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا اظہار نہ صرف اعجاز صاحب نے کیا، بلکہ ڈاکٹر عقیل نے ۱۹۸۴ء میں بھی کیا ہے جیسا کہ ان کے جملے، "... جس سے مزید طلبہ اس کتاب سے استفادہ کر سکیں،" (صفحہ د) سے اندازہ ہوتا ہے۔ اعجاز صاحب نے طبعِ اوّل میں لکھا۔

> اس کمی کی شکایت صرف انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طلبا تک محدود نہ تھی، ایم اے کے طلبا نے بھی بارہا تکلیف کے ساتھ اسی بات کو کہا۔
>
> (صفحہ ز، ۱۹۸۴ء ایڈیشن)

۱۹۳۴ء میں یہ کتاب ایم اے اردو کے طلبہ کے لیے مفید ہو سکتی تھی۔ اب تحقیق و تنقید میں جتنی وسعت آ گئی ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب ایم اے کے طلبہ کے ڈھب کی نہیں، صرف انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طلبہ کے لیے مفید ہے۔ ان کے لیے ضروری تحقیقی اور تنقیدی معلومات فراہم کرتی ہے۔ لیکن تاریخ ادب کا تحقیقی پہلو اہم ہوتا ہے۔ اعجاز صاحب کے مقالہ نگار ڈاکٹر علی حیدر اعجاز صاحب کی کتاب "اردو شاعری کا سماجی پس منظر" کے لیے لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر اعجاز حسین کی دوسری تصانیف کی طرح اس کا تحقیقی پہلو کم

Scanned by CamScanner

زور ہے اور حوالے اس کتاب میں بھی کم ہیں۔ جو ہیں بھی وہ یا تو
نامکمل ہیں یا ان کی کوئی تشریح نہیں کہ مصنف یا مرتب کون ہے
اور کب شائع ہوئی اور کون سا ایڈیشن ان کے پیشِ نظر تھا۔ بعض
اوقات حقائق کے بیان میں تسامح ہوا ہے۔

("اعجاز حسین، حیات اور کارنامے"، ص ۱۴۷)

یہ تبصرہ "تاریخِ ادبِ اردو" پر بھی صادق آتا ہے۔ اعجاز صاحب محقق نہ تھے۔ جیسا کہ دکھایا گیا۔ ان کی تاریخِ ادب میں سنین اور حقائق کی غلطیاں بکثرت ہیں۔ حوالے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عقیل صاحب نے شاذ ان کی تصحیح کی ہے لیکن اس کے بعد بھی اغلاط برقرار رہ گئی ہیں۔ خود عقیل صاحب نے جن ادیبوں پر لکھا ہے ان میں بھی کہیں کہیں سنین میں تسامح ہوا ہے۔ ماخذ کے حوالے وہ بھی نہیں دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں دیے گئے سنین پر اس وقت تک بھروسا نہیں کیا جا سکتا جب تک ان کی دوسرے ماخذ سے جانچ نہ کر لی جائے۔ دقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر عقیل رضوی جیسے پروفیسروں کی تحریر پر عام قاری آنکھ موند کر بھروسا کر لیتا ہے۔

اس کے باوصف یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ کتاب ڈگری کلاس کے طلبہ کی ضروریات پوری کرتی ہے۔ ایم اے کے طلبہ کو بھی اس سے ابتدائی معلومات مل جائیں گی۔ تنقیدی اعتبار سے یہ کتاب اچھی خاصی ہے۔ اس کی ایک کمی یہ ہے کہ چند مستثنیات کے علاوہ اس میں نمونے بالکل نہیں دیے۔ لیکن اگر نمونے شامل کیے جائیں تو ضخامت بڑھ جائے گی۔ سنین کے بارے میں بحثیں دی جائیں تو بھی یہی خدشہ ہے۔ کتاب کے نام میں مختصر کا لاحقہ مانع آتا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آئندہ ایڈیشن کی تیاری کے وقت میرے مشاہدات کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

حواشی

(۱) "سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے"، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۹۷

(۲) "میراں جی شمس العشاق اور ان کی نثری تصانیف"، "نوائے ادب"، اکتوبر ۱۹۸۶ء

Scanned by CamScanner

بائیسواں باب

ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخِ ادبِ اردو"

اردو کی ادبی تاریخ نویسی کی ابتدا "آبِ حیات" سے ہوئی ہے جس کے بعد دو سب سے اہم سنگِ میل رام بابو سکسینہ کی "تاریخ کا اردو روپ" اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخِ ادبِ اردو" ہیں۔ جالبی نے وہ کام اپنے ذمے لیا ہے جسے ادارے بھی سَر نہیں کر سکتے۔ وہ تن تنہا پورے اردو ادب کی تاریخ چار جلدوں میں لکھنا چاہتے ہیں۔ دو جلدیں آ چکی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

> "جلد اوّل: آغاز سے ۱۷۵۰ء تک"، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، نیز ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، جنوری ۱۹۷۷ء
> "جلد دوم: اٹھارویں صدی" یہ دو حصّوں میں ہے۔ طبعِ اوّل، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء، نیز ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۵ء۔ جلد دوم کا دوسرا ایڈیشن لاہور میں ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔
> (بحوالہ نسیم فاطمہ: "ڈاکٹر جمیل جالبی، سوانحی کتابیات"، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۶)

ایک جلد کے دو حصّے کرنا، جو دراصل علاحدہ جلدیں ہیں، التباس کا باعث ہے۔ انھیں سیدھی سادی طرح دوسری اور تیسری جلد کہنا چاہیے تھا۔ ادوار کی تقسیم فہرستِ ابواب میں واضح کر دی جاتی۔ دراصل اب اردو ادب اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ پانچ جلدوں میں بھی بمشکل سما سکتا ہے۔ اگر اہمیت کے لحاظ سے مختلف ادیبوں میں توازن رکھا جائے تو بڑے سے بڑے ادیب کو دس صفحوں سے زیادہ نہیں دینے چاہییں۔ اگر میر، غالب یا اقبال پر لکھتے وقت قلم کو آزاد چھوڑ کر بیس پچیس صفحے لکھ دیے جائیں تو کیا ان سے قدرے کم حیثیت کے ادیبوں کو دس پندرہ صفحے دے سکیں گے؟ اس کی گنجائش کہاں۔ اس لیے بڑے سے بڑے ادیب پر قلم روک کر لکھیے کہ تاریخ میں ادیبوں کے علاوہ دور، علاقے، صنف، دبستان وغیرہ کے بارے میں بھی تو مجموعی طور پر کچھ لکھنا ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

ظاہرا جمیل جالبی کی تیسری جلد انیسویں صدی کو اور چوتھی جلد بیسویں صدی کو محیط ہوگی لیکن ان صدیوں کا نظم و نثر کا سرمایہ اتنا وسیع اور وسیع ہے کہ ایک ایک جلد میں حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ "کیمبرج تاریخِ ادبِ انگریزی" ۱۵ جلدوں میں اور ہندی ادب کی بڑی تاریخ ۱۶ جلدوں میں ہے۔ جالبی صاحب انیسویں اور بیسویں صدی کو دو دو جلدوں میں سمیٹیں تو کل سات جلدیں ہوں گی۔ انھوں نے اپنا ادبی تاریخ کا نظریہ جلد اوّل کے پیش لفظ میں سرسری طور پر اور جلد دوم حصۂ اوّل کے پیش لفظ میں وضاحت سے پیش کیا ہے۔ جلد اوّل کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت اور ایک اکائی بن جاتے ہیں اور تاریخِ ادب ان سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات و رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے...
>
> اب تک جتنی ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں مختلف علاقوں کا قدیم اردو ادب الگ الگ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے گویا یہ سب الگ الگ جزیرے ہیں جن کے ادب و زبان کے مطالعے کا مجموعی نام تاریخِ ادب رکھ دیا گیا ہے۔ میرے لیے یہ بات قابلِ قبول نہیں تھی کہ گجرات، دکن اور شمال کا ادب الگ الگ جزیروں کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک کا تعلق دوسرے سے کچھ نہیں ہے۔

دوسری جلد کے پیش لفظ میں دو مفید بیانات یہ ہیں:

> بنیادی طور پر میں نے ادب کو ادب کی حیثیت سے دیکھا ہے لیکن کلچر، فکر اور تاریخ کے تخلیقی امتزاج سے میں نے تاریخِ ادب کو ایک وحدت، ایک اکائی بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ادبی تاریخ کی سطح پر تحقیق، تنقید اور کلچر مل کر ایک ہو گئے ہیں۔
>
> (ص ۱۱)

تاریخِ ادب نہ صرف ادب کی، بلکہ سماجی تبدیلیوں کے زیرِ اثر زبان و بیان کی تبدیلیوں کی تاریخ بھی ہوتی ہے...

میں نے ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل و تعمیر اور ردِ عمل و تبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور روحِ ادب بہ یک وقت سامنے آجائیں (ص ۱۴-۱۳)

Scanned by CamScanner

اردو ادب کی تاریخ کا خاکہ کیوں کر بنایا جائے؟ دور، علاقہ اور نظم و نثر کی تقسیم کیوں کر کی جائے؟ کیا متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی تقسیم کی جائے؟ کیا دکن، دہلی، کلکتہ، لکھنؤ، پاکستان وغیرہ کے ادیبوں کا الگ الگ بیان کیا جائے؟ نظم اور نثر کو تاریخ کے الگ الگ حصوں میں رکھا جائے یا ملا جلا کر؟ ڈاکٹر جمیل جالبی کو اعتراض ہے کہ اب تک لکھی گئی ادبی تاریخوں میں مختلف علاقوں کو الگ الگ جزیرے مان کر ان کے ادب کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اعتراض میں قدرے مبالغہ ہے۔ ادبی تاریخوں میں سہولت کے لیے مختلف مراکز کے ادب کی تاریخ ضرور دی جاتی ہے لیکن کسی مورخ نے انھیں ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں رکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی علاقہ خود کفیل آب بند خانہ نہیں، ایک علاقے میں دوسرے علاقے کے ادیب آتے جاتے رہے ہیں۔

دور، علاقہ اور نظم و نثر ان تینوں مطالبوں میں سے کسی ایک ہی کی متابعت نہیں کی جا سکتی نہ بقیہ دو کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ تینوں کے ساتھ مفاہمت کر کے اس طرح خاکہ بنانا ہوگا کہ کسی نہ کسی حد تک تینوں ملحوظ رہیں۔ جالبی بھی نہ ادوار کو نظر انداز کر سکے ہیں نہ علاقے اور بیان کو۔ ان کی جلد اوّل کی فصلوں (ابواب کے جمگھٹوں) پر نظر ڈالیے، وہ بیش تر علاقوں اور شاذ دور سے متعلق ہیں۔ فصلِ اوّل شمالی ہند کا ادب، فصلِ دوم گجرات کا ادب، فصلِ سوم بہمنی دور کا ادب جو دراصل دور اور علاقے دونوں کو ظاہر کرتا ہے۔ فصلِ چہارم کو عادل شاہی دور اور فصلِ پنجم کو قطب شاہی دور کہا گیا ہے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی کی تقسیم کو دور کہنا مناسب نہیں کہ یہ دونوں معاصر ہیں۔ یہ دراصل علاقے ہیں۔ ضمیمے میں تو صریحاً علاقائی جزیروں کا بیان ہے۔ پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان۔

چار علاقوں کے ادب کا ضمیمے میں بیان کرنا خاکہ نگاری کا بہترین طریقہ نہیں۔ اوّل تو ضمیمے کا مجموعی عنوان "پاکستان میں اردو" ہی قابلِ اعتراض ہے۔ پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ اس سے پہلے کے ادب کو کس طرح پاکستان کا ادب کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جالبی جب دورِ حاضر کی آخری جلد لکھیں اور اس میں تقسیم ملک کے بعد کے علاقہ پاکستان کے ادب کا بیان کریں تو عنوان "پاکستان میں اردو" مناسب ہوگا۔ انھوں نے جلد اوّل کو بنیادی طور پر علاقائی اعتبار سے بانٹا ہے۔ فصلِ اوّل شمالی ہند، فصلِ دوم گجرات، فصلِ سوم تا ششم دکن۔ پھر ان فصلوں کی زمانی تقسیم کی ہے۔ انھیں کے بیچ حسبِ موقع پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے ادیبوں کے لیے جگہ نکالنی چاہیے تھی۔

کتاب کے ذیلی اجزا کی دوہری تقسیم: پہلے فصل اور پھر ابواب، بھی الجھن کا باعث

Scanned by CamScanner

ہے۔ ہر فصل کے ذیلی ابواب نئے نمبر شمار سے یعنی پہلا باب، دوسرا باب وغیرہ ہیں۔ اس طرح کسی باب کا حوالہ دینا ہو تو لکھنا پڑے گا: فصل چہارم چھٹا باب یا فصل پنجم دوسرا باب، فصلوں کی تقسیم پر اعتراض نہیں لیکن ایک جلد میں مختلف فصلوں کے جملہ ابواب کو ایک ہی سلسلۂ شمار میں پرونا چاہیے تھا۔

اس کے باوجود ماننا ہوگا کہ ان کے یہاں دور اور علاقے میں جس قدر اتحاد اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس قدر کسی دوسری تاریخ میں نہیں۔ اس ہم آہنگی کا شیرازہ ہے ادبی روایات، جن پر انھوں نے خاص طور سے زور دیا ہے اور جن کے سہارے انھوں نے تاریخ ادب کی کشود کی ہے۔ ہاں، نظم و نثر کی دوئی کو انھوں نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے اور ہر ادب کی نظم و نثر کا ایک ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ نثر کا ارتقا وضاحت سے سامنے نہیں آیا۔ نثر کا ارتقا لازماً شاعری کے ارتقا کے متوازی نہیں چلتا۔ اٹھارویں صدی میں شاعری کی زبان سادہ و سہل ہے، نثر کی اس کے برعکس دقیق و مرصع۔ یاد کیجیے "کربل کتھا" اور "نوطرز مرصع" کو۔ بیسویں صدی کے رُبع اول میں نثر کی سب سے ممتاز نوع ادبِ لطیف تھی اور نظم کی اقبال کی فکری شاعری یا چکبست وغیرہ کی حبِ وطن کی شاعری۔ دونوں رجحانات مختلف ہیں۔ ادبی تاریخ بیان کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوتا کہ ایک دور یا علاقے کی نثر کو الگ باب دیا جاتا اور جالبی نے دوسری جلد کے دوسرے حصے میں یہی کیا ہے۔

انھوں نے اپنی تاریخ کی جلد اوّل میں (جلد دوم میں نہیں،) روایت کو مرکز بنایا ہے۔ ہر فصل اور اس کے اکثر ابواب میں روایت کا لفظ فراخ دلی سے استعمال کیا ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے ملاقات میں بھی کہا تھا کہ میں نے یہ تاریخ روایت کے اعتبار سے لکھی ہے۔ ان روایتوں میں ایک طرف فارسی ادب کی روایت کو لیا ہے، دوسری طرف گجری، عادل شاہی اور قطب شاہی روایت کو۔ بعض اوقات وہ روایت کو بہت تنگ زمانی عرصے میں محدود کر دیتے ہیں، مثلاً:

فصل ۴، باب ۳	ہندوی و فارسی روایت کی کشمکش	(۱۶۴۰ء-۱۶۲۷ء)
فصل ۴، باب ۴	فارسی روایت کا عروج	(۱۶۵۷ء-۱۶۴۰ء)
فصل ۵، باب ۳	فارسی روایت کا رواج۔ محمد قلی قطب شاہ	(۱۶۱۰ء-۱۵۸۰ء)

کیا روایتیں اتنی جلدی جلدی بنتی بگڑتی رہتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ روایت کا نام دینے کے لیے زمان کا زیادہ لمبا پھیلاؤ چاہیے۔ جالبی جنھیں روایت کہہ رہے ہیں وہ محض لسانی اور ادبی خصوصیات ہیں جنھیں "روایت" کے لفظ سے موسوم کر کے ایک نئی فکر کا بھرم

Scanned by CamScanner

پیدا کیا ہے۔ انھوں نے جہاں فارسی روایت کا عروج یا زوال دکھایا ہے، وہاں ان کے تجزیے سے ہر جگہ اتفاق نہیں کیا جا سکتا، مثلاً ان کا یہ فیصلہ کہ قلی قطب شاہ کی شاعری یا دور میں فارسی روایت کا غلبہ تھا۔

ان کے خاکے پر یہ مشاہدات پیش کرنے کے بعد میں تاریخ کے مشمولات کا تحقیقی جائزہ لیتا ہوں۔ ان جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے علم و فضل، دیدہ ریزی اور اَن تھک لگن کا جو احساس ہوا وہ میرے لیے ہوش رُبا ہے۔ جو کام انجمنیں اور بورڈ بھی نہیں کر پاتے ہیں وہ ایک فردِ واحد نے کیوں کر سرانجام دیا ہے، اور یہ سب اپنے فرائضِ منصبی کے باوجود۔ میں جانتا ہوں کہ ملازم آدمی کے دن کا بیش تر حصہ مکروہاتِ منصبی کی نذر ہو جاتا ہے۔ جالبی کو کن مراحل سے گزرنا پڑا اس کی ایک جھلک اس بیان میں ملتی ہے:

> دن بھر گردشِ روزگار اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے مشقت کی چکی، نہ کوئی مددگار، نہ کوئی ساتھی۔ ایک ایک کتاب کے لیے مختلف کتب خانوں کے چکّر کاٹنے پڑے۔ آتشی شیشے کی مدد سے مخطوطات پڑھ پڑھ کر آنکھوں پر موٹا چشمہ چڑھ گیا۔ بہرحال یہ کام جیسا کچھ ہے، ایک فرد کا کام ہے جس نے اسے اپنی لگن سے کیا ہے۔ اس میں کسی کی فرمائش، مدد یا سرپرستی شامل نہیں ہے۔

(پیش لفظ، جلد اوّل، صفحہ ح)

اور دوسری جلد حصہ اوّل کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> میں نے ادبی تاریخ نویسی کی بنیاد دوسروں کی آرا یا سُنی سُنائی باتوں پر نہیں رکھی، بلکہ سارے کلیات، ساری تصانیف، کم و بیش سارے اصل تاریخی، ادبی و غیر ادبی مآخذ سے براہِ راست استفادہ کر کے روحِ ادب تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ (ص ۱۱)

اور ان کا یہ دعویٰ بیانِ واقعی ہے، ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ ان کی تاریخ کی دونوں جلدوں کو پڑھنے، فٹ نوٹ کے حوالوں، کتابیات اور اشاریوں پر نظر ڈالیے تو یہ دیکھ کر ہوش پراں ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے کتنے زیادہ اصل مآخذ کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مخطوطات بھی اسی قدر ہوں گے جتنے مطبوعات۔ قلمی کتاب کی چند سطروں کو بھی صحیح پڑھنا کارے دارد۔ جالبی صاحب نے گجری اور دکنی کے جتنے زیادہ مخطوطات، جتنی زیادہ قدیم بیاضوں اور جتنی تاریخ و سوانح کی کتابوں کو دیکھا ہے، وہ بے نظیر و بے ہمتا ہے۔ وہ شعری یا

Scanned by CamScanner

نثری نمونے نقل کرتے ہیں تو دوسری تحقیقی یا تنقیدی کتابوں سے نقل نہیں کر دیتے، بلکہ اصل نثری رسالے یا مثنوی و دیوان سے لیتے ہیں اور یاد رہے کہ دکنی ادب کا بیش تر حصہ آج بھی غیر مطبوعہ ہے۔

ان کی اس مشقت کا ثمرہ یہ ہے کہ ہمیں ان کی تاریخ سے جتنی زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں اتنی دوسری کسی تاریخ ادب سے نہیں ہوتیں۔ رشید حسن خاں نے اپنی کتاب "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ" (علی گڑھ ۱۹۷۸ء) کے آخری مضمون "تاریخِ ادبِ اردو" میں جالبی صاحب کی تاریخ پر تبصرہ کیا ہے۔ تبصرہ بہت عالمانہ ہے لیکن بنیادی حیثیت سے معترضانہ ہے۔ اس میں کتاب کی خوبیوں کا بہ قدر بایست اعتراف نہیں کیا گیا۔ میں تبصرے کی ان بیشتر مثالوں سے متفق ہوں جن میں مصنف کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے لیکن تبصرے میں جو اصول پیش کیے گئے ہیں ان سے پورا اتفاق نہیں کرتا۔ تبصرے میں منجملہ دوسرے اعتراضات کے دو یہ ہیں:

۱۔ انھوں نے غیر معتبر کتابوں سے حوالے دیے ہیں، ایسی کتابوں سے جو متعلقہ ادب سے قریب العصر نہیں۔

۲۔ نمونے درج کرتے وقت یہ نہیں بتایا کہ یہ کس مخطوطے یا ایڈیشن سے لیے ہیں۔ اس امر میں پوری سعی نہیں کی کہ نمونے کے اشعار یا عبارت کے مختلف متون کا مقابلہ کر کے ایسا معتبر ترین متن درج کیا جائے جو اصولِ تدوینِ متن پر چوکھا اترے۔

یہ مطالبے بے عیب ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہوا جائے تو تحقیق مکمل ہو گی لیکن عملی دنیا میں کاملیت ممکن نہیں۔ اگر ہمیشہ اصلی ماخذ کو دیکھ کر حوالے دیے جائیں تو سال بھر میں دس صفحے سے زیادہ لکھنا ممکن نہ ہو گا۔ اگر محض ہم عصر یا قریب العصر راوی کے بیان پر اصرار کیا جائے تو اردو ادب یا دنیا کے کسی بھی ادب کا معتد بہ ابتدائی حصہ خارج کر دینا ہو گا۔ کیا "رامائن"، "مہابھارت"، کالی داس کی تصانیف، ہومر کی "ایلیڈ"، "اوڈیسی" اور دوسرے یونانی شاہکاروں کے قریب العصر نسخے موجود ہیں۔ ان کے قدیم ترین نسخے مصنف سے کئی صدی بعد کے ہیں۔ کیا انھیں حرف غلط قرار دیا جائے۔

قدیم اردو ادب کے ان قدیم مخطوطوں کو لیجیے جن کے مصنف، مرتب، کاتب، سنہ تصنیف یا سنہ کتابت میں سے کسی کا علم نہیں۔ اہلِ حزم و احتیاط کا فرمان ہو گا کہ ان کا ایک حرف بھی قبول نہ کیا جائے۔ لیکن ایسا کیا گیا تو آئندہ کے لیے قدیم اردو ادب میں ایک نظم، ایک شعر، ایک نثر، ایک سطر کا اضافہ ممکن نہ رہے گا۔ کئی دکنی ادیبوں کی تصانیف کا قدیم ترین نسخہ ان کے عہد سے کافی بعد کا ہے۔ کیا اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

Scanned by CamScanner

جس طرح یہ غلط ہے کہ ہر قدیم تحریر کو اصلی مان کر تسلیم کر لیا جائے اسی طرح یہ بھی نامناسب ہے کہ ہر مجہول الاسم قدیم مخطوطے یا بیاض کے مشمولات کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ دکنی کی بیش تر داستانوں اور حکایتوں کے مجموعوں کا یہ حال ہے کہ ان کے مصنّف یا زمانۂ تصنیف کا کوئی علم نہیں۔ اگر انھیں گردن زدنی رکھا جائے تو دکنی داستانوں میں "سب رس" کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ میری نظر سے ایسے متعدّد دکنی مخطوطے گزرے ہیں جن کے نام، مصنّف، سنہ تصنیف اور سنہ کتابت میں سے کسی کا علم نہیں۔ کیا اس سارے قدیم خزانے کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ میری رائے میں محقّق کو ہر مجہول نسخے کا داخلی رنگ و آہنگ دیکھ کر طے کرنا ہوگا کہ یہ کہاں تک قابلِ اعتماد ہے۔

جالبی نے بیاضوں سے ڈھونڈ کر دکنی شاعر محمود کی چند غزلیں بہم پہنچائیں۔ مشتاق، خیالی، حسن شوقی، فیروز وغیرہ کی غزلیں بھی اسی طرح متفرق ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں۔ اگر عبدالودودی محقّق بن کر ان کو ماننے سے انکار کر دیا جائے تو اردو غزل گوئی کی تاریخ سے ان سب شعرا کو القط کر دینا ہوگا۔ کیوں صاحب، نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ بھی تو ایک مجہول الاسم، ناقص الطرفین و ناقص الاوسط نسخے میں بر آمد ہوئی جس کے کاتب اور زمانے کا علم نہیں۔ اس کے شاعر نظامی کا کہیں حوالہ نہیں ملتا۔ یہ مثنوی صحیح معنی میں مجہول الاسم ہے کیونکہ اس کا نام بھی معلوم نہیں۔ کیا اسے غیر معتبر قرار دے کر اس کی طرف سے آنکھ موند لینا اردو ادب و ادبی تحقیق کی زریں خدمت ہوگی؟

یہ بہت ممکن ہے کہ جالبی نے بیاضوں سے جو نمونے درج کیے ہیں ان میں سے بعض معتبر نہ ہوں لیکن ان کی زبان کے معیار کو دیکھ کر انھیں غیر معتبر قرار دیجیے۔ شمالی ہند کے جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور کے جو شعری نمونے پیش کیے جاتے ہیں ان کی زبان کو سختی سے جانچیے۔ ان میں سے بیش تر نامعتبر ٹھہریں گے۔ لیکن یہ فیصلہ ان کی زبان و بیان کی بنا پر کیا جائے گا، اس بنا پر نہیں کہ یہ سب سے پہلے جس نسخے میں ملے ہیں وہ مصنّف سے قریب العصر نہیں یا ان کے عہدِ کتابت کا علم نہیں۔

رشید حسن خاں کا یہ مطالبہ بڑی حد تک مناسب ہے کہ نمونے درج کرتے وقت یہ حوالہ دیا جائے کہ یہ کس نسخے یا کتاب سے لیے گئے ہیں، لیکن سو فی صدی صورتوں میں یہ ضروری نہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہر صفحے کے فٹ نوٹ میں حوالوں کا ایک گل دستہ (یا خارزار؟) سج جائے گا۔ میں یہ بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ کسی بھی ادیب کی تخلیق کا کوئی نمونہ دینے سے پیشتر اس کے مختلف نسخے دیکھ کر تدوینِ متن کی منزلیں قطع کی جائیں۔ اگر ایسا کرنا لازم گردانا جائے تو پانچ صفحوں کا ایک مضمون لکھنے میں پانچ ماہ درکار ہوں گے۔ مورخِ ادب

Scanned by CamScanner

کو چاہیے کہ نمونے درج کرتے وقت کسی بہتر لنسخے یا ایڈیشن کو استعمال کرے۔ اس کا یہ فرض نہیں کہ وہ ہر شعر کو درج کرنے سے پہلے اس کے خالق کے جملہ مخطوطوں کی چھان بیان کرے۔ جو نمونے کسی غیر مطبوعہ متن کے ہیں ان کے ماخذ ی لنسخے کا حوالہ دینا ضروری ہے لیکن مشہور متون کے سلسلے میں ماخذ کا حوالہ نظرانداز کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

رشید حسن خاں کو شکوہ ہے کہ جالبی صاحب نے ثانوی حوالوں پر تکیہ کیا ہے۔ میں مبہوت ہو کر ایک عالم حیرت میں ہوں کہ جالبی نے نمونے درج کرتے وقت کس کثرت سے اصل ماخذوں کو دیکھا ہے۔ جو متون شائع ہو گئے ہیں ان کے بھی مخطوطوں کو ٹٹولا ہے اور پھر لیجیے صوفیہ کے تذکروں اور گجرات و دکن کی سیاسی تاریخوں کو۔ ان کے مندرجات کو بھی انھوں نے دوسری کتابوں سے نقل نہیں کیا، بلکہ اصل کتاب سے لیا ہے۔ فٹ نوٹوں کی سیر کیجیے، کس کثرت سے اصل ماخذوں کا صفحہ وار حوالہ موجود ہے۔ ان مآخذ کی بنا پر میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ اردو ادب کے جس قدر تخلیقی اور تحقیقی کام ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے گزرے ہیں اتنے کسی دوسرے کی نظر سے نہیں گزرے۔ دکنی ادب کے جتنے مخطوطات میں وہ ڈوب چکے ہیں اتنا کوئی معاصر محقق نہیں ہو سکا۔

یہ تاریخ ادب تحقیق کے لحاظ سے جس قدر بار آور ہے اسی قدر تنقید کے میدان میں بھی ہے۔ ادبی تاریخ کے ایک نظریہ ساز، اسپلر نے کہا ہے کہ "ادبی مورخ کو ادبی نظریے اور تنقیدی تجزیے کا کام دوسروں پر چھوڑنا ہوگا"۔ اس نے اسی مضمون میں مزید یہ بھی کہا تھا کہ "ادبی مورخ کا کام تاریخی تنقید کرنا ہے جو ادبی تنقید سے مختلف ہے۔ وہ ان عوامل کی نشاندہی کرتا ہے جن کے زیر اثر تخلیقات وجود میں آئیں۔ وہ کوئی نظریہ قائم کر کے اسے جانچتا ہے اور اس عمل میں وہ کسی حد تک نقاد بن جاتا ہے۔" (حوالہ ص ۱ کے فٹ نوٹ میں)

میرا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی شخص بہ یک وقت بڑا محقق اور بڑا نقاد نہیں ہو سکتا۔ مجھے اردو میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی لیکن جمیل جالبی کو دیکھ کر میرے عقیدے میں تزلزل ہونے لگتا ہے۔ وہ تحقیق میں تو ارفع مقام پر فائز ہیں ہی، تنقید میں بھی اچھا خاصا مقام رکھتے ہیں۔ اس ادبی تاریخ میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں شرح و بسط سے جلوہ گر ہوئی ہیں۔ معلوم نہیں تنقید و تبصرے کی اس وسعت کو اس تاریخ کی خوبی قرار دیا جائے کہ خامی۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> محاسنِ کلام کو سمجھنے اور بیان کرنے کا ملکہ ان کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ولی اور سراج کی خصوصیات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، اس سے مولف کی تنقیدی بصیرت کے جوہر کھلتے ہیں۔ اس

Scanned by CamScanner

سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ تنقیدی بیانات بعض جگہ تاریخ نگاری
کے پیمانے سے نکل گئے ہیں اور اس طول بیانی نے تاریخ کے
دائرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ "تاریخِ ادب" اور "تنقیدِ ادب" یہ دو
مستقل موضوعات ہیں۔

("ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ص ۲۹۲)

جالبی نے مختلف ادوار اور علاقوں کی ادبی روایات کا ان کے سماجی و فکری پس منظر میں جس طرح تجزیہ کیا ہے وہ قابلِ داد ہے، لیکن ان عمومی جائزوں سے ہٹ کر انھوں نے مختلف اہلِ قلم کی تخلیقات پر جس گہرائی اور بالغ نظری سے تنقید کی ہے وہ اس لیے اور بھی قابلِ ستائش ہے کہ اس کے لیے انھیں ان قدما کی نظم و نثر کے بڑے حصے کو کھنگالنا پڑا ہوگا، واضح ہو کہ جدید ادب کے مقابلے میں قدیم ادب کی تنقید زیادہ مشکل اور محنت طلب ہے۔ جدید ادب میں تو باتوں کے طوطا مینا اڑائے جا سکتے ہیں لیکن قدیم تخلیقات میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ میں رشید حسن خاں سے اس حد تک متفق ہوں کہ بحیثیت مورخِ ادب جالبی صاحب کو اس شرح و بسط سے تنقید نہیں کرنی چاہیے تھی، مثلاً انھوں نے ولی پر جلد اوّل میں ص ۵۳۹ سے ص ۵۵۷ تک، میر پر جلد دوم حصہ اوّل میں ص ۵۷۲ سے ص ۶۴۵ تک اور سودا پر جلد دوم حصہ دوم میں ص ۶۶۳ سے ص ۷۱۶ تک تنقید کی ہے۔ تاریخِ ادب میں تنقید کو اتنے زیادہ صفحات نہیں دینے چاہییں، لیکن جب انھوں نے لکھنے کی زحمت کر ہی ڈالی تو قاری کو اس سے کوئی زیاں نہیں ہوتا، سُود ہی سُود ہے۔ عام قارئین بالخصوص نصاب کے طالب علموں کو اس تنقیدی تجزیے سے تفہیم ادب میں مدد ملے گی۔ جالبی دوسری جلد کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

میں نے تنقیدی رائے دیتے وقت بے جا تعمیم، بے بنیاد کُلیوں اور
ہر مصنف کے لیے یک ساں الفاظ و صفات کے استعمال سے گریز
کیا ہے۔ جن مصنفوں کی تصانیف غیر مطبوعہ تھیں ان کے
اقتباسات، اپنے نقطۂ نظر یا تنقیدی رائے کی وضاحت کے لیے، اس
لیے زیادہ دیے ہیں کہ یہ مخطوطات قاری کی دست رس سے باہر
ہیں۔ (ص ۱۴)

آپ کو اندازہ ہوا قدیم ادب کی تنقید کی دشواریوں کا۔ تحقیق اور تنقید کا عمل مختلف ہوتا ہے۔ جالبی کو مختلف ادیبوں پر تنقید کرنے کے لیے ذہن پر کتنا بار ڈالنا پڑا ہے وہ ان کے الفاظ میں سنیے:

Scanned by CamScanner

جب آپ کسی ایک شاعر یا مصنّف کا ڈوب کر مطالعہ کرتے ہیں تو پھر دوسرے شاعر یا مصنّف کا مطالعہ کرنے کے لیے ذہن کو نئے سرے سے تیار کرنا پڑتا ہے تاکہ زیرِ مطالعہ شاعر یا مصنّف آپ کی تخلیقی و تنقیدی شخصیت کا حصّہ بن جائے۔ تاریخ لکھتے ہوئے میں نے ہر شاعر و مصنّف کے ساتھ اسی طرح شب و روز بسر کیے ہیں۔

(ص ۱۱)

رشید حسن خاں اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں:

اس کتاب کا نام "تاریخِ ادبِ اردو" ہے مگر پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ "جلد اوّل ۱۷۵۰ء تک قدیم ادب اور زبان کا احاطہ کرتی ہے۔" زبان اور ادب کے اس خلطِ مبحث نے زبان کی بحث کو قیاسات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یقیناً زبان و ادب کا باہمی تعلق ہے، لیکن تاریخ نگاری کے لیے زبان اور ادب بجائے خود دو مستقل موضوع ہیں اور دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔

(ادبی تحقیق، ص ۲۹۳)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں کے نزدیک مورّخِ ادب کو لسانی پہلو سے صرفِ نظر کرنا چاہیے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ اردو ادب کی تاریخ میں پہلے باب میں لسانی پس منظر دینا ہوگا، پھر آگے چل کر مختلف علاقوں اور ادیبوں کی زبان کا مختصر جائزہ بھی لینا ہوگا۔ جمیل جالبی ماہرِ لسانیات نہیں، انھوں نے اردو کے آغاز کے بارے میں جگہ جگہ جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے رشید حسن خاں نے اختلاف کیا ہے اور یہ تقریباً ہر جگہ صحیح ہے مثلاً جالبی کا یہ کہنا کہ محمد تغلق کے عہد میں اردو زبان بین الاقوامی زبان کی حیثیت میں پھلتی پھولتی رہی (جلد اوّل، ص ۱۳)۔ رشید حسن خاں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ جلد اوّل کے ضمیمے میں جالبی صاحب نے جس صوبے کا ذکر کیا، اسے اردو کے مولد ہونے کا اعزاز دے دیا، مثلاً

پنجاب: "یہ سارے حالات و عوامل ... اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اردو کا مولد پنجاب ہے۔" (ص ۶۰۲)

سندھ: "غرض کہ یہ زبان اپنی ابتدائی شکل میں سندھ و ملتان کے علاقے میں عربوں کے زیرِ اثر بننی شروع ہوئی۔"

(ص ۶۷۳)

صوبۂ سرحد اور بلوچستان کے ماہرین کی رائے یوں نقل کرتے ہیں:

Scanned by CamScanner

صوبہ سرحد کے اہلِ علم جب ان حالات و اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: "اردو کی جنم بھومی در حقیقت سرحد کا کوہستانی خطہ ہے۔" (ص۶۹۹)

بلوچستان کے بارے میں وہاں کے ماہرینِ تاریخ و ادب اس نتیجے پر پہنچے: "اردو کی تشکیل کی ابتدا بلوچستان سے ہوئی۔"

(ص۷۱۱)

ان بیانات پر کوئی احتجاج یا تردید نہ کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصنف کو ان سے اتفاق ہے۔ رشید حسن خاں نے ان بیانات کا خلاصہ اپنی کتاب کے ص۹۵-۲۹۴ پر دیا ہے اور یہ ان کی دلچسپ کھوج ہے۔ وہ ڈاکٹر جالبی کی اس اطلاع کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ "اورنگ زیب کے دور میں اردو مکتبوں میں عام طور پر ذریعۂ تعلیم بن جاتی ہے۔" (جالبی، ص۷۷، رشید حسن خاں، ص۳۰۰)۔ رشید حسن خاں محمود شیرانی اور ڈاکٹر جالبی کے اس انکشاف کا بھی تجزیہ کرتے ہیں کہ شاہ جہاں اردو میں خط و کتابت کرتا تھا (جالبی، ص۷۰، رشید حسن خاں، ص۱۵-۳۱۲)۔ خاں صاحب ان دونوں بیانات کو بے اصل اور محض خوش خیالی قرار دیتے ہیں۔

لسانیات کے باب میں جالبی صاحب کے ان بیانات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع کے عارف نہیں، انھیں اردو سے پہلے کی لسانی صورتِ حال، ہندوستان میں زبانوں کے ارتقا اور اردو کے آغاز کے نظریوں کا کوئی واضح شعور نہیں۔ وہ اردو کی قدامت اور ہر صوبے میں اس کی پیدائش دکھا کر اپنے اور ان صوبوں کے باشندوں کے جذبات کو آسودہ کرتے ہیں لیکن حقیقت کی تلاش نہیں کرتے۔ ہاں، جالبی صاحب نے جہاں کہیں کسی "دَور" علاقے یا مصنف کی زبان کا تجزیہ کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے اور اس پر قلم اٹھانے کے لیے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔

اب مجھے ہیئتِ تسوید کے ایک نکتے پر بحث کرنی ہے۔ متن کے نیچے فٹ نوٹ (حاشیہ) کو کن مطالب کے لیے استعمال کیا جائے؟ محمد حسین آزاد نے کم اہم مصنفوں کے حالات لکھنے کے لیے حاشیے کا استعمال کیا۔ ایسا ہی "گلِ رعنا" میں کیا گیا ہے۔ عابد پیشاوری نے اپنی کتاب "انشاءاللہ خاں انشا" میں طویل طویل حاشیے لکھے ہیں جو کئی صفحات تک چلے جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں اپنی کتاب "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ" میں فٹ نوٹ میں ایسے اہم مطالب لکھ جاتے ہیں جو متن کے اندراج سے مربوط اور اسی قدر اہم ہوتے ہیں، مثلاً ص۶۸ پر دولتِ مستعجل سے متعلق، ص۱۱۹ پر ناسخ کے مطلع کا متن، ص۲۱۴ پر "آہو"

Scanned by CamScanner

بامنافت کا تلفظ، ص۳۰۵ پر خسرو سے منسوب ایک مقطع کا متن، ص۳۰۶ پر ریختے سے متعلق نوٹ۔ یہ سب مضامین متن کے مندرجات سے اس طرح دست و گریباں اور مربوط ہیں کہ کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ انھیں فٹ نوٹ میں کیوں جگہ دی جائے۔

اردو کے ادیبوں کے ذہن میں فٹ نوٹ کے مطالب کی کوئی تعیین نہیں، جس بات کو جی چاہا فٹ نوٹ میں ٹانک دیا۔ یہی کیفیت ڈاکٹر جالبی کی کتاب کی ہے۔ یہاں بھی اکثر حواشی کے مطالب کو حاشیے میں جگہ دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، مثلاً کئی مثنویوں کی تاریخِ تصنیف کی بحث متن میں ہے، لیکن اسی سے متعلق کوئی جزو، مصرعِ تاریخ کا کوئی دوسرا نسخہ فٹ نوٹ میں درج کر دیا، مثلاً:

ص۳۳۰ پر نصرتی کا سنہ وفات، ص۴۸۷ پر مثنوی "پھول بن" کی بیتِ تاریخ، ص۵۱۷ پر ذوقی کی "وصال العاشقین" کی تاریخ، "کربل کتھا" کے سالِ تصنیف اور سالِ نظرِ ثانی کی بحث متعلقہ باب کے آخر کے نوٹ میں جلد ۲، حصہ ۲، ص۱۰۷۱ سے ۱۰۷۳ تک ہے۔

میں نے انگریزی کتب کے مطالعے کے بعد "تحقیق کا فن" میں لکھا ہے:

> خیال رکھیے کہ حواشی متن پر غالب نہ ہونے پائیں۔ اس کے حریف نہ ہو جائیں۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے کتابچے میں لکھا ہے کہ تشریحی (تبصراتی) فٹ نوٹ کم سے کم ہوں اور زیادہ سے زیادہ مختصر ہوں۔ جو بات متن میں جگہ پانے کی مستحق نہ ہو اسے حاشیے میں بھی دینے کی ضرورت نہیں۔ پارسنس مطلع کرتا ہے کہ بعض درس گاہوں کے شعبے کہتے ہیں کہ فٹ نوٹ محض حوالوں کے لیے استعمال کیجیے، بقیہ مواد (تبصراتی حاشیے) متن میں شامل کیجیے یا ضمیمے کے طور پر دیجیے۔ (ص۳۲۳-۲۴)

مختصر حوالے متن ہی میں دیے جا سکتے ہیں۔ طویل حوالوں کو حاشیے میں دیجیے۔ تبصراتی نوٹ حتی الامکان متن ہی میں دیجیے۔ ہاں، کسی دوسرے ادیب کا نظم یا نثر کا متن ترتیب دے رہے ہوں تو اس کے کسی اندراج سے متعلق تبصرے حاشیے ہی میں دینے ہوں گے کیونکہ متن میں تو دوسرے ادیب کی تخلیق دی جا رہی ہے۔ جمیل جالبی نے غور نہیں کیا کہ جو بات وہ حاشیے میں دے رہے ہیں اسے متن میں کیوں نہ رکھا جائے۔ انھوں نے دوسری جلد میں ایک اور انوکھی بات کی ہے کہ ایک طرف باب کے آخر میں حواشی دیے ہیں، دوسری طرف چند حواشی فٹ نوٹ میں لکھے ہیں۔ آخرالذکر کو متن میں "ف" کی علامت لکھ

Scanned by CamScanner

کر فٹ نوٹ میں دیا ہے۔ "ف" عموماً "فوت" کا مخفف ہوتا ہے۔ غور کرنے سے میری سمجھ میں آیا کہ یہ فٹ نوٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس تاریخِ ادب کی دو پہلوؤں سے اہمیت ہے: تحقیق اور تنقید۔ تنقیدی جائزے کا کام دوسروں کے لیے چھوڑ کر میں اس کے تحقیقی پہلو کے بارے میں مختصراً اپنے مشاہدات درج کرتا ہوں۔ رشید حسن خاں کے مشاہدات ان کے مضمون میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں ان میں سے بعض کا ذکر کروں گا، بقیہ کو اطناب کے خوف سے شامل نہ کروں گا۔

کتاب کا پہلا جزو "تمہید" ہے جس کا ذیلی عنوان "اردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اسباب" ہے۔ یہ جزو کسی حد تک سماجیاتی پس منظر ہے، زیادہ تر اردو زبان کے پھیلنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں سنسکرت کی دو تصانیف کے نام یوں لکھے ہیں:

"وکرامورواسیا"، "کاوی ال ام کارا" (ص۵)

جالبی صاحب نے یہ نام ایک انگریزی کتاب سے لیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ ہندی سے بالکل نابلد ہیں۔ پہلی کتاب کالی داس کی مشہور تصنیف "وکرم اُروشی" ہے، دوسری ایک دوسرے ادیب کی "کاویالنکار" (یعنی "کاویہ النکار") ہے۔

کتاب کی پہلی فصل شمالی ہند کے ادب (۱۰۵۰ء تا ۱۷۰۷ء) اور دوسری فصل اسی دور کے گجری ادب سے متعلق ہے۔ اردو نظم و نثر کی باقاعدہ ابتدا سے پہلے متفرق اردو فقرے اور الفاظ، فارسی تحریروں میں ملتے ہیں۔ ان کے مآخذ یہ ہیں:

۱۔ صوفیہ کے اردو ملفوظات

۲۔ فارسی تاریخوں اور سفرناموں میں ہندی الفاظ

۳۔ فارسی لغات میں ہندی الفاظ۔

جلد اوّل کی پہلی اور دوسری فصل میں ایسے ملفوظات اور الفاظ جمع کیے گئے ہیں۔ اردو ملفوظات کو اس وفور سے یک جا کر دینا اچھی کھوج ہے۔ اس سے قدیم اردو نثر کی ساخت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنے تبصرے میں ملفوظات کے غیر مستند مجموعوں "انیس الارواح" اور "دلیل العارفین" کا ذکر کیا ہے (ادبی تحقیق، ص۳۱۹)۔ مجھے جالبی کی تاریخ میں ملفوظات والے باب میں کہیں ان کا حوالہ نہیں ملا۔ حد یہ ہے کہ اشاریے میں بھی ان دونوں کتابوں کے نام نہیں۔ خاں صاحب نے اپنے ص ۳۲۰ پر "افضل الفوائد" کے خسرو سے انتساب کو بھی مشکوک قرار دیا ہے (جالبی ص۷۳)۔ ہو سکتا ہے ملفوظات کے مجموعوں کا استناد اتنا پختہ نہ ہو جتنا مثلاً "باغ و بہار" کا میرامن سے یا "فسانۂ عجائب" کا سرور سے، لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ماضی کبھی حال کی طرح شفاف اور واضح نہیں ہو سکتا۔ ملکوں کی قدیم تاریخ کے

Scanned by CamScanner

لیے جس مواد پر تکیہ کرنا پڑتا ہے وہ اس حد تک معتبر نہیں ہوتا جتنا عہد وُسطا اور عہد حاضر کی دستاویزیں۔ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے مواد کو جوڑ کر قدیم دور کی تاریخ کی باز تشکیل کی جاتی ہے۔ اگر ہم قدیم ترین دَور کے لیے عہدِ وُسطا اور عہدِ حاضر کے پیمانوں کا مطالبہ کریں تو عہدِ قدیم کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح ہمیں ادبیات کے قدیم نمونوں کو ان کے داخلی رنگ و آہنگ کی بنا پر پرکھنا ہوگا اور اس کے بعد بھی ہم انھیں اس سَو فی صدی وثوق کے ساتھ قبول نہیں کر سکتے جتنا بعد کے نمونوں کو لیکن ہم انھیں نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ میں جالبی صاحب کی کھوج کی قدر کرتا ہوں۔

لغات کی حد تک وہ محمود شیرانی کی تحقیق تک محدود رہے ہیں۔ سفرناموں اور تاریخوں کی طرف انھوں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی بجز "تحفۃ الکرام" اور "مِراۃ احمدی" میں مشتمل چند ناموں کے۔ اب چند مزید مشاہدات:

کتاب میں اکثر ہجری سنہ کے متوازی ایک عیسوی سنہ دیا ہے۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ ماہ و یوم معلوم نہ ہوں تو دو عیسوی سنہ دیے جائیں۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں اردو شعرا کے جن قدیم نمونوں کو پیش کیا گیا ہے ان کے انتساب کے بارے میں اطمینانِ کلی نہیں ہوتا، رشید حسن خاں تو ان کو قلم زد کرنے کے حق میں ہیں۔ میں اس پر قانع ہوں کہ ان کا ذکر مشکوک کے زمرے میں رکھ کر دیا جاتا، مثلاً خسرو سے منسوب ہندی کلام کی کوئی قدیم سند نہیں۔ حسن سجزی کی غزل کے دکنی افعال رہیا، ملیا اور اچھوں جیسے الفاظ کو دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ یہ واقعی دلی کے شاعر کا کلام ہے کہ نہیں۔ ناصر علی کی غزل میں بھی دکنی رنگ ہے (ص ۶۳۵)۔ یہ گنجائش ضرور ہے کہ چونکہ یہ دونوں شعرا دکن چلے گئے تھے اس لیے ممکن ہے وہاں کے لہجے میں لکھا ہو۔ جالبی نے ص ۲۷ پر برہمن کی مشہور غزل، "... لائے ڈالا ہے،" درج کی ہے۔ رشید حسن خاں کے اعتراض کے بعد اس کے انتساب کی صحت میں واقعی شبہہ پیدا ہوتا ہے۔

ص ۳۳ "خالق باری" کا امیر خسرو سے انتساب ثابت کرنے کے لیے جالبی صاحب نے صفی کی "مطبوع الصبیان" اور اشرف کی "واحد باری" سے مدد لی۔ انھوں نے صفی کا زمانہ نہیں دیا۔ اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد میں ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کی زبان کی بنا پر اس کا زمانہ قبلِ ۱۲۰۰ھ قیاس کیا ہے ("تذکرۂ اردو مخطوطات"، جلد اوّل، ص ۷۹-۲۷۸)۔ انجمن ترقیِ اردو پاکستان میں صفی دکنی کی "بدر انوار" کا ایک مخطوطہ ہے جس کی تاریخِ تصنیف ۱۱۶۳ھ ہے ("فہرست مخطوطات انجمن"، جلد سوم، ص ۱۸۳)۔ دونوں کتابوں میں ابیات کا شمار دیا ہے اور دونوں کی زبان میں مماثلت ہے۔ قیاس چاہتا

Scanned by CamScanner

ہے کہ دونوں کا مصنف ایک ہی صفی دکنی ہو۔ اس طرح "مطبوع الصبیان" بھی ۱۱۶۳ھ کے لگ بھگ کی تصنیف ہوگی۔ اس وقت تک "خالق باری" کو خسرو سے منسوب کیا جا چکا تھا، اس لیے "مطبوع الصبیاں" کو اس انتساب کی دلیل نہیں ٹھہرایا جانا چاہیے۔

"واحد باری" کا ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اردو میں ہے۔ محض تخلص کو دیکھ کر ڈاکٹر زور التباس کا شکار ہو گئے کہ یہ اشرف بیابانی ہے (تذکرۂ مخطوطات، جلد اوّل، ص ۲۸۴)۔ انھیں کی تقلید میں جالبی صاحب نے بھی "واحد باری" کو اشرف بیابانی سے منسوب کر دیا لیکن نصیرالدین ہاشمی نے سالار جنگ کے مخطوطات کی فہرست میں صحیح صورتِ حال واضح کی ہے کہ اس کا مصنف آصفی دور کا شاعر ہے جو سکندر جاہ کے عہد میں بریلی یوپی سے یہاں آیا۔

رئیس سردار سکندر جاہ

منیر روشن چندا ماہ

اشرف دیں سے واحد باری

ایسا نہیں کوئی جگ میں خواری

باس بریلی وطن ہے میرا

حیدرآباد میں رہیا بسیرا

سالار جنگ کے نسخے کے آخر میں تاریخ ۱۲۲۶ھ دی ہے جو ہاشمی کے نزدیک تصنیف و کتابت دونوں کی تاریخ ہے (سالار جنگ کی فہرست، ۱۹۵۷ء، ص ۳۵۵)

جالبی نے ص ۷۴ پر شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مکاتیب سے گرونانک کا ایک برج بھاشا کا شعر درج کیا ہے، میں اس سے واقف نہ تھا۔ ص ۵۲ پر شیخ جمالی کا جو ریختہ نقل کیا ہے، "خوار شدم، زار شدم، لٹ گیا،" اس کا انتساب اس لیے مشکوک ہے کہ یہ دوسروں کے نام سے بھی ملتا ہے (دیکھیے، میری کتاب "کھوج"، ص ۶۳-۶۲)

ص ۶۵ پر "بکٹ کہانی" کے مصنف کا نام "محمد افضل افضل پانی پتی (م ۱۰۳۵ھ- ۱۶۲۵ء)" لکھا ہے۔ "بکٹ کہانی" کے سب سے قدیم حوالے اکرم قطبی رہتکی کے تیرہ ماسے کے مطابق افضل کا نام گوپال اور وطن نارنول تھا۔ خود "بکٹ کہانی" کے ایک مخطوطے میں لکھا ہے ع: قصہ سارا اکھا گوپال افضل۔ اس کا سنہِ وفات ۱۰۳۵ھ لکھنا بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ غلط فہمی دو وجوہ سے ہوئی ہے:

۱۔ والہ داغستانی نے اپنے تذکرے "ریاض الشعرا" میں فارسی شاعر افضل پانی پتی کے

Scanned by CamScanner

لیے لکھا کہ اس کا انتقال ۱۰۳۵ھ میں ہوا، لیکن والہ نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس افضل نے "بکٹ کہانی" بھی لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ والہ کا محمد افضل "بکٹ کہانی" والے افضل سے مختلف ہے۔

۲۔ قائم نے اپنے تذکرے میں اردو شاعروں کو زمانی اعتبار سے تین طبقوں میں تقسیم کیا۔ طبقۂ اول میں سعدی اور نوری کے بعد افضل کا ذکر ہے۔ اس کے بعد غیر متعلق طور پر نئے پیراگراف میں لکھتا ہے کہ اس دور میں ریختہ محلِ اعتبار سے ساقط ہو گیا جس کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں زبانِ دکھنی میں ریختہ کہنے کا رواج ہو گیا ("مخزنِ نکات"، طبع ۱۹۲۹ء، متن ص ۳)۔ اسپرنگر نے قائم کے بیان کو غلط سمجھ کر لکھ دیا کہ:

> قائم نے لکھا ہے کہ یہ عبداللہ قطب شاہ سے پہلے گزرے ہیں جو
> ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک نظم لکھی ہے
> جس کا نام "بکٹ کہانی" ہے۔

دراصل قائم نے عبداللہ قطب شاہ کا سنِ جلوس لکھا ہی نہ تھا۔ اسپرنگر نے اپنی طرف سے لکھا اور غلط لکھا۔ صحیح سنہ جلوس ۱۰۳۵ھ ہے۔ اسی کی بنا پر بعد والے یہ لکھنے لگے کہ افضل کا انتقال ۱۰۳۵ھ میں ہوا۔

ص ۹۲ پر شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) کی کتاب "مرشد نامہ" کا ذکر ہے۔ اس کتاب کا صحیح نام "رُشد نامے" ہے اور خود جالبی نے ص ۴۰ پر "معاصر" پٹنہ دسمبر ۱۹۵۷ء سے "رُشد نامہ" کا کچھ کلام نقل کیا ہے۔ ص ۹۲ پر سہوِ طباعت سے "مرشد نامہ" چھپ گیا ہوگا چنانچہ کتاب کے آخر کے اشاریے میں "رُشد نامہ" اور "مرشد نامہ" دونوں اندراجات ہیں۔ "معاصر" کے ایک مضمون میں گنگوہی کا سالِ وفات ۹۴۴ھ دیا ہے(۱)۔ حسن عسکری کا یہ مضمون جالبی کے مآخذ میں سے ہے اس کے باوجود انھوں نے سنہ وفات ۹۴۵ھ لکھا۔ مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" میں "نزہۃ الخواطر" سے لے کر ان کی تاریخِ وفات ۲۳ جمادی الثانی ۹۴۴ھ (۲۷ نومبر ۱۵۳۷ء) لکھی ہے۔ "شیخِ اجل" مادۂ تاریخ ہے جس سے ۹۴۴ھ برآمد ہوتا ہے۔

ص ۹۳ پر سید نورالدین محمد عرف ست گرو (م ۱۰۹۴ھ/۱۰۹۴ء) کے ست پنتھی رسائل کا ذکر کرتے ہیں اور اگلے صفحے پر کچھ ہندی شعر دیے ہیں جو قابلِ فہم آسان زبان میں ہیں۔ ماخذ ہے، "نوائے ادب"، بمبئی، جولائی ۱۹۵۷ء۔ مضمون کا عنوان اور مضمون نگار کا نام نہیں دیا۔ رشید حسن خاں پوچھتے ہیں کہ اس مجہول الاسم اور مجہول الاحوال مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے کیا وہ بجائے خود درست ہے (ادبی تحقیق، ص ۳۲۰)۔ میں نے تلاش کر کے

Scanned by CamScanner

مضمون کا حسب نسب دریافت کر لیا۔ مضمون نگار کا نام قاضی سید نورالدین شیرازی اور مضمون کا عنوان "گجراتی مسلمان اور گجراتی زبان" ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں ان اشعار کی صاف زبان ناممکنات میں سے ہے۔ یہ اشعار بہت بعد کے ہونے چاہییں۔

حضرت قطب عالم نے اپنے فرزند شاہ محمود کے گھر میں بیٹا پیدا ہونے پر ان سے اردو میں کچھ کہا۔ جالبی صاحب نے "تحفۃ الکرام" کے حوالے سے فرزند شاہ محمود کا نام حضرت راجو قتال دیا ہے (ص۹۵)۔ شیرانی کے مطابق پوتے کا نام "شاہ شیخ جو" تھا ("مقالات شیرانی"، جلد اول، ص ۱۵۲)۔ مجھے معلوم نہیں "تحفۃ الکرام" میں کیا لکھا ہے۔ ظاہرا "جو" کو "راجو" اور پھر راجو قتال سمجھ لینا غلط فہمی ہے۔

گجرات میں اردو کی مقبولیت کے سلسلے میں رائے کھیڑ، احمد آباد کی مسجد کے کتبے (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء) کو نقل کرتے ہیں:

تاریخ اس مسیت کی ہوئی سو یوں مشہور
"مسجد جامع کے بیچ ڈٹھایا ہے نور"

۹۶۳ھ

(ص۹۹)

اس سے پہلے "تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند"، جلد نہم ص۳۶۹ پر بھی یہی متن لکھ چکے ہیں۔ وہاں پہلے مصرع میں "اس" حذف ہے لیکن تاریخ کا مصرع یہی ہے۔ دقت یہ ہے کہ مصرع کے مختلف متون سے مختلف محققین نے مختلف تاریخیں نکالی ہیں۔

۱۔ سخاوت مرزا لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" میں مسجد کا ۹۶۱ھ کا دکھنی کتبہ نقل کیا ہے:

تاریخ اس مسیت کی ہوئی سو یوں مشہور
مسجد جامہ بیچ ٹھانہ یا نبی نور

۹۶۱ھ

("تاریخ ادبِ اردو"، مرتبہ: عبدالقیوم، ص ۳۵۲)

۲۔ نجیب اشرف ندوی یوں لکھتے ہیں:

مسجد جامع بیچ بٹھانہ یا نبی نور (؟)

۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء

(علی گڑھ تاریخ، ص۱۰۱)

Scanned by CamScanner

دقت یہ ہے کہ اس مصرع سے ۹۱۶ نہیں، ۱۰۲۸ برآمد ہوتا ہے۔
۳۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے مصرع کو مع اعداد کے یوں لکھا ہے:

مسجد جابا بیچ بشائیا یا نبی نور

۱۰۷ + ۴۵ + ۱۵ + ۴۳۰+ ۱۱+ ۶۲ +۲۵۶۰ ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء

("تاریخ اقلیم ادب"، پہلا حصہ، ص ۳۵)

گویا نجیب اشرف ندوی اور انصار اللہ کے مطابق ۹۱۶ھ، مولوی صاحب کی رائے میں ۹۶۱ھ اور جالبی کے مطابق ۹۶۳ھ صحیح ہے۔ واللہ اعلم!

گودھرا (گجرات) کے امین کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی مثنوی "تولد نامہ" کے تین حصے ہیں: "تولد نامہ"، "معراج نامہ"، "وفات نامہ" (ص ۱۴۲)۔ بعض دوسرے لکھنے والوں نے انھیں تین مثنویاں مانا ہے، مثلاً ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے جو شعرائے گجرات کے عارف ہیں۔ انھوں نے تینوں مثنویوں کے آخری شعر بھی دیے ہیں اور ابیات کی تعداد بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں مثنویاں ایک بحر میں، ایک سلسلے میں یکے بعد دیگرے لکھی گئیں (۲) جیسے سہ غزلے کی کیفیت ہو۔ میرا خیال ہے کہ گریز کے شعر کی بنا پر انھیں جداگانہ مثنویاں ماننا صحیح تر ہے۔

فصلِ سوم کا عنوان "اردو بہمنی دور میں" ہے۔ اس کی حدود (۹۳۲ھ-۷۵۰ھ/ ۱۵۲۵ء-۱۳۵۰ء) دی ہیں (ص ۱۴۵)۔ مجھے ان کی صحت میں شبہہ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں بہمنی سلطنت کی ابتداء ۷۴۷ھ/ ۱۳۴۷ء سے اور خاتمہ ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۷ء میں قرار دیتے ہیں (ص ۴۴ و ۴۹)۔ انھوں نے یہ سنین پروفیسر عبدالمجید صدیقی کی کتاب "بہمنی سلطنت" سے لیے ہیں اور یہ صحیح ہونے چاہییں۔

شاہ راجو قتال کا سنہ وفات ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء دیا ہے (ص ۱۵۱)۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت اپنے مرتبہ "شکار نامہ" کے مقدمے میں لکھتی ہیں کہ مولانا محمد علی سامانی نے "سیرِ محمدی" میں اور غلام علی آزاد بلگرامی نے "روضۃ الاولیا" میں ان کا انتقال ۷۳۱ھ میں دکھایا ہے ("شکار نامہ"، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء، ص ۱۵)۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے درست نہ مانا جائے۔ جالبی یہ مفید اطلاع دیتے ہیں کہ "بھوگ بل" (۱۰۲۳ھ) کا مصنف قریشی پہلا شخص ہے جس نے اس زبان کو "دکھنی" کے نام سے پکارا (جالبی، ص ۱۵۶)۔ مجھے جالبی کے اس بیان پر بھی خوشی ہے کہ خواجہ بندہ نواز اور ان کے فرزند سید محمد اکبر حسینی سے جو اردو نثری رسالے منسوب کیے جاتے ہیں ان کا انتساب درست نہیں (ص ۱۶۰)۔

Scanned by CamScanner

بہت سے محققین نے شاہ میراں جی شمس العشاق کے مرثیے از جانم کے ایک شعر کی بِنا پر اوّل الذکر کی وفات کا سنہ ۹۰۲ھ یا ۹۰۴ھ طے کیا ہے۔ پہلا مصرع یہ ہے:

تاریخِ حضرت سال نو سَو، اس پر اگلے بھی دو

یا

تاریخِ حضرت سال نو سَو دو، اس پر اگلے بھی دو

جالبی نے بھی اس کی بِنا پر سنہِ وفات ۹۰۲ھ یا ۹۰۴ھ فرض کیا ہے۔ لیکن ان مصرعوں میں یہ کہاں لکھا ہے کہ یہ سنہِ وفات ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں اس مسئلے پر مفصل بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ سنہِ ولادت کا مصرع ہے:

تاریخِ حضرت سال نو سَو دو، اس پر اگلے بھی دو

وِیں مدّتِ وفات یو سنو جے کچ حکم الٰہی کا

اربع تسعوں یو سال ہے، ماہے کوں شوّال ہے

رحلت کیے اس حال ہے، جے کچ حکم الٰہی کا

"اربع تسعوں" کے معنی ہیں ۹۴۔ اکثر حضرات نے اسے میراں جی کی عمر کا شمار مانا ہے۔ میرے نزدیک مندرجۂ بالا دو اشعار میں پہلے مصرع میں سنہِ ولادت دیا ہے، دوسرے مصرع میں اطلاع ہے کہ وفات کے بارے میں آگے سنو۔ یہ تاریخ ماہِ شوال ۹۴ھ (۹۹۴ھ) ہے۔ میراں جی کی سوانح میں ۹۰۴ھ کے بعد زندہ رہنے کے متعدد شواہد ملتے ہیں (۳)۔

ص ۱۷۱ پر میراں جی کی ایک مثنوی کا نام "شہادت التحقیق" درج کرتے ہیں۔ اسے کوئی "شہادت الحقیقت" کہتا ہے، کوئی "شہادت التحقیق" لیکن خود شاعر نے اس کا نام "شہادت الحقیق" لکھا ہے:

اس نام ہے تحقیق

سن شہادت الحقیق

اس طرح "تحقیق" اور "حقیق" میں قافیہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔ مانا کہ "حقیق" کوئی مسلّمہ لفظ نہیں لیکن جب شاعر نے اس کا نام "شہادت الحقیق" لکھا ہے تو دوسروں کو اس میں ترمیم کرنے کا کیا اختیار ہے۔ ص ۱۷۵-۱۷۴ پر "نو سرہار" کے مصنف اشرف بیابانی سے "واحد باری" کا انتساب کیا ہے۔ میں خسرو کی "خالق باری" کے سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ "واحد باری" کا مصنف دورِ آصفی کا اشرف ہے۔

Scanned by CamScanner

ص ۱۸۴ پر عادل شاہی دور کی ابتدا ۸۹۷ھ / ۱۴۹۰ء سے کی ہے لیکن ۸۹۷ھ کے ابتدائی دو مہینے ۱۴۹۱ء میں آتے ہیں اور بعد کے دس مہینے ۱۴۹۲ء میں۔ نصیر الدین ہاشمی کے مطابق یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ (۹۰-۱۴۸۹ء) میں عادل شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی ("دکن میں اردو"، ص ۱۷۱)۔ ڈاکٹر محمد چراغ علی نے بشیر الدین احمد دہلوی کی "واقعاتِ مملکت بیجاپور" کے حوالے سے اس کی تاریخ ۱۴۸۹ء لکھی ہے۔(۴) جس کے معنی ہیں کہ صحیح سنہ ۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء ہے۔ جالبی نے ص ۱۸۵ پر ابراہیم عادل شاہ اول کا سنہ جلوس ۹۴۵ھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر چراغ علی نے "واقعاتِ مملکت بیجاپور" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسماعیل عادل شاہ کا انتقال ۱۶ صفر ۹۴۱ھ کو ہوا۔ اس کے بعد ۶ مہینے اور چند روز ملو عادل حکمراں رہا اور پھر ۹۴۱ھ ہی میں ابراہیم عادل شاہ اول تخت نشین ہوا (چراغ علی، ص ۲۲-۲۱)۔ نصیر الدین ہاشمی نے بھی ۹۴۱ھ لکھی ہے۔

ڈاکٹر جالبی نے "بکٹ کہانی" کی تاریخ ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء لکھی ہے (ص ۱۹۳)۔ اس کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔ بعض مؤرخوں نے افضل کا سنہ وفات ۱۰۳۵ھ لکھا ہے نہ کہ "بکٹ کہانی" کا سنہ تصنیف۔ جالبی نے ص ۱۹۴ و ۲۱۹ پر عبدل کے "ابراہیم نامہ" کا سنہ ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء لکھا ہے۔ ظاہراً یہ صحیح ہونا چاہیے کیونکہ خود عبدل نے لکھا ہے:

کیا سس پر برس بارہ تمام

لیکن کتاب کے لکھنے میں "در تواریخ ختم کتاب ابراہیم نامہ شہور سنہ ۱۰۱۲ھ" لکھا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھنے کی تدوین کرتے وقت انکشاف کیا کہ شہور سنہ، ہجری سنہ سے الگ ہوتا ہے، ۱۰۱۲ شہور مطابق ہے ۱۲-۱۶۱۱ء اور ۲۱-۱۰۲۰ھ کے۔ واللہ اعلم!

جالبی نے ص ۲۰۰-۱۹۷ پر عادل شاہی دور کی لسانی خصوصیات بہت خوبی سے لکھی ہیں۔ شاہ برہان الدین جانم کا سنہ وفات "۹۹۰ھ یا اس کے کچھ بعد" لکھا ہے (حاشیہ ص ۲۰۲) ڈاکٹر حسینی شاہد کی تحقیق کے مطابق صحیح سنہ ۱۰۰۷ھ ہے(۵)۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب "نورس" کے لیے لکھتے ہیں کہ اس میں "مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق الگ الگ گیت ترتیب دیے ہیں" (ص ۱۵-۲۱۴)۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ "نورس" ابراہیم کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ ہر گیت کی ابتدا میں وہ راگ لکھ دیا ہے جس میں گیت گایا جانا چاہیے، یعنی سبقت گیت کو ہے، راگ اس کے تابع ہے۔ آگے چل کر ص ۲۱۸ پر لکھتے ہیں:

"کتابِ نورس" کے گیتوں کی زبان مشکل ہے اور آج اس سے لطف اندوز ہونا آسان نہیں ہے۔

لیکن اسے اردو کی کتاب کیوں قرار دیا جائے۔ کیا محض اس لیے کہ اس کا مصنف مسلمان ہے اور اس کا مخطوطہ اردو رسم الخط میں ملتا ہے۔ اگر یہی اصول ہے تو جائسی کی "پدماوت" اور اودھی کے دوسرے صوفی شاعروں کی نظموں کو بھی اردو ادب میں داخل کر لینا چاہیے۔ "نورس" سے "بھیرو راگ" کی تصویر دیکھیے:

بھیرو کر پور گورا بھال تلک چندرا
ترِی نیترا جٹا مکٹ گنگا دھرا
ایک ہست رُند زرا ترسول جگل کرا
باہن بلی ور دسیت جات گسائیں ایشورا
کاس کرت کنبر پرشٹھ چرم دیاگرا
سرپ سنگار تشٹھن پرچھائیں کلپترا (۲)

کیا اس زبان کو اردو کہا جا سکتا ہے؟ کم از کم میں تو اس کے لیے تیار نہیں۔

جالبی شہباز حسینی قادری بیجاپوری (م ۱۰۱۵ھ) اور خواجہ بندہ نواز کے کلام میں امتیاز کرنے کے لیے دکنی صوفیوں کے کلام کی اس خصوصیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ وہ کسبِ برکت کے طور پر اپنے بزرگ کا نام اپنے کلام میں ڈال دیتے تھے۔ انھوں نے کئی مثالیں دیں جن میں نام کسی بزرگ کا ہے اور کلام کسی خورد کا ہے (ص ۲۲۶-۲۲۷)۔ یہ رہ نما اصول اور اس کی مثالیں قابلِ قدر ہیں۔

ڈاکٹر زور اور نصیرالدین ہاشمی کا خیال تھا کہ مرزا محمد مقیم اور مقیمی ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ جس نے مثنوی "چندر بدن و مہیار" لکھی۔ جالبی صاحب نے اس التباس کو دور کر کے بتایا کہ یہ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ مقیمی نے "چندر بدن و مہیار" لکھی۔ مرزا محمد مقیم بنیادی طور پر فارسی کا شاعر ہے۔ جالبی نے اس کی ایک اردو مثنوی "فتح نامۂ بکھیری" دریافت کی اور اس کا تعارف درج کیا (ص ۲۳۶-۲۳۸)۔ اسپرنگر نے مقیمی کی ایک اردو مثنوی "سوہار کی کہانی" کا ذکر کیا ہے۔ اب اس مثنوی کا پتا نہیں چلتا۔ اگر جالبی اس کا بھی ذکر کر دیتے تو جامعیت کا حق ادا ہو جاتا۔

مقیم اور مقیمی کے بعد انھوں نے محمد بن احمد عاجز کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے صراحت کی کہ احمد گجراتی اور اس کے بیٹے محمد (بن احمد) عاجز دونوں نے مثنویاں "یوسف زلیخا" اور "لیلیٰ مجنوں" لکھی ہیں (ص ۲۴۶-۲۴۷)۔ علاقے وار بیان کا ایک خسارہ ملاحظہ ہو۔

Scanned by CamScanner

جالبی نے پہلے عادل شاہی ادب کا بیان کیا، بعد میں قطب شاہی کا۔ محمد بن احمد عاجز کا تعلق بیجاپور سے تھا، اس لیے اس کا بیان ص ۲۴۷ سے شروع ہوتا ہے جب کہ اس کے باپ احمد کا ذکر، جو گولکنڈے سے متعلق تھا، تقریباً دو سو صفحے بعد ص ۴۲۳ پر ہے (۷)۔

ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے ملک خوشنود کی دو مثنویوں "ہشت بہشت" اور "بازارِ حسن" کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے تصحیح کی کہ یہ دونوں ایک ہی مثنوی ہیں جس کا صحیح نام "جنت سنگار" ہے (ص ۲۵۲)۔ اُن سے پہلے سخاوت مرزا "تاریخِ ادبِ اردو" مرتبہ عبدالقیوم میں یہ دونوں باتیں لکھ چکے ہیں۔ اردو کی تاریخوں میں عام طور سے شاعر کا نام خوشنود لکھا ہوتا ہے لیکن جالبی نے "جنتِ سنگھار" کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

ملک خشنود، موتی صاف رولیا

اپس کے ناؤں کا تاریخ بولیا

(جالبی، ص ۲۵۳)

"ملک خشنود" بغیر واؤ سے ۱۰۵۰ھ نکلتا ہے اور بقولِ جالبی یہی مثنوی کا سنہِ تصنیف ہے۔ دوسری طرف نصیر الدین ہاشمی نے علی گڑھ تاریخ اور "دکن میں اردو" میں اس مصرع میں "خوشنود" لکھ کر ۱۰۵۶ھ تاریخ طے کی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مثنوی کی ابتدا میں میر مومن مرحوم پیشوائے سلطنت (م ۱۰۳۴ھ) کی مدح ہے۔ مدح کے الفاظ سے یہ آشکارا نہیں ہوتا کہ یہ کسی مرحوم شخص کے بارے میں ہیں۔

ملک خشنود نے ایک مختصر نظم ہارون نامی گھوڑے کی ہجو میں لکھی ہے۔ جالبی نے اس کے اشعار نقل کیے ہیں (ص ۲۶۰)۔ انھیں دیکھ کر سودا کی ہجو "تضحیکِ روزگار" کی یاد آ جاتی ہے۔ جالبی ص ۲۶۷ پر لکھتے ہیں کہ "خاور نامہ" اردو زبان کی طویل ترین مثنوی ہے۔ دراصل اردو کی طویل ترین مثنوی نول کشور پریس کی "الف لیلہٗ نو منظوم" ہے جس میں تقریباً ۵۴ ہزار شعر ہیں۔ واجد علی شاہ کی مثنوی "ثبات القلوب" میں تقریباً ۴۴ ہزار اشعار ہیں۔ اس طرح ۲۴ ہزار اشعار کی مثنوی "خاور نامہ" اردو کی تیسری طویل ترین مثنوی ہے۔

جالبی "قصہ بے نظیر" کے مصنف صنعتی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ یہ ابراہیم خاں صبحی ہوگا جس کا ذکر "محمد نامہ" میں ظہور ابنِ ظہوری نے کیا۔

جیسا کہ اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ صبحی کاتب کی غلطی سے بگڑ کر صنعتی ہو گیا۔

جالبی نے اس بیان کی تائید میں ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری اور نصیر الدین ہاشمی کا

حوالہ دیا ہے (ص۲۷۵)۔ حقیقت اس کے برعکس ہونی چاہیے۔ صنعتی بگڑ کر صبحی ہو گیا۔ مثنوی میں صنعتی کا تخلص موجود ہے جو وزن کے اعتبار سے صحیح ہے۔ وہاں صبحی نہیں آ سکتا۔ میرا خیال ہے "صبحی" کوئی بامعنی لفظ نہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے صنعتی کی ایک اور مثنوی "گل دستہ" کا ذکر کیا ہے جو سالار جنگ لائبریری میں ہے۔ جالبی صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

دکنی شعر کی اہم ترین صنف مثنوی ہے لیکن غزل بھی ایسی پس ماندہ نہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر محمد علی اثر نے دکنی غزل پر ایک نہایت قابلِ قدر مقالہ لکھا لیکن ان سے پہلے ڈاکٹر جالبی نے دکنی کے قدیم غزل گویوں: خواجہ محمد دیدار فانی، حسن شوقی، فیروز، محمود، ملا خیالی اور احمد گجراتی کو اپنی تاریخ کی چوتھی اور پانچویں فصل میں افشا کیا۔ تاریخِ ادب لکھنے سے پہلے ہی وہ ۱۹۷۱ء میں "دیوانِ حسن شوقی" اور ۱۹۷۲ء میں "دیوانِ نصرتی" ترتیب دے کر شائع کر چکے تھے۔ اس طرح وہ دکنی غزل کے مورخِ اول ہیں۔ محمود اور احمد گجراتی کی غزلیں ان سے پہلے شاید ہی کسی نے دی ہوں۔

شاہ برہان الدین جانم کے ایک خلیفہ شیخ داول تھے۔ دکنیات کی کتابوں اور تواریخِ ادب میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں ملتا۔ جالبی نے نہ صرف ان کا نام اور تاریخِ وفات دریافت کی، بلکہ ان کی چار نظمیں اور کچھ خیال بھی پیش کیے (ص۲۹۹ تا ۳۰۵)۔ اسی خانوادے کے شاہ امین الدین اعلیٰ کا سنہ ولادت ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء اور سنہ وفات ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء دیتے ہیں (ص۳۰۶)، لیکن اعلیٰ کے محقق ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے مقالے میں یہ سنین ۱۰۰۷ھ/ ۱۵۹۹ء اور ۱۰۸۵ھ/ ۱۶۷۴ء طے کیے ہیں (ص۱۲۰ و ص۱۵۰)۔

ص۳۳۰ کے حاشیے میں فہرستِ سالار جنگ ص۶۰۱ سے ابنِ نشاطی کے قطعۂ تاریخِ وفات میں دوسرا مصرع یوں لکھا ہے:

جا کے جنت میں خوش ہو رہے

یہ مصرع غیر موزوں ہے۔ فہرست میں یوں ہے:

جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے

نصرتی کی "گلشنِ عشق" کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ اس کا ماخذ آخری شیخ منجھن کی ہندی کتاب نایاب ہے (ص۳۳۱)، لیکن ڈاکٹر پرکاش مونس مطلع کرتے ہیں کہ اس کے ورق ۱۷ سے ۱۳۳ تک مل گئے ہیں ("اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، ص۲۵۴)۔ میراں ہاشمی بیجاپوری کی ریختی غزلیں اور مثنوی "یوسف زلیخا" مشہور ہے لیکن جالبی نے انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان میں ایک مزید عشقیہ مثنوی دریافت کی اور اس کا تعارف کرایا (ص۵۹-۳۵۶)۔

Scanned by CamScanner

یہ قابلِ قدر دریافت ہے۔

فصل پنجم قطب شاہی دور سے متعلق ہے۔ اس کا پہلا باب "پس منظر، روایت اور ادبی و لسانی خصوصیات" ہے جو تنقیدی قدر بندی کا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں انھوں نے گولکنڈہ اور بیجاپور کے اسالیب کا فرق واضح کیا اور مثالوں سے یہ تنقیدی انکشاف کیا کہ گولکنڈہ میں نسبتاً فارسی کے اور بیجاپور میں ہندی کے اثرات زیادہ ہیں (ص ۳۸۶-۸۷)۔

ص ۳۹۶ پر فیروز بیدری کے ایک شعر سے اس کا نام "قطب دین" ظاہر کیا ہے۔ "کدم راؤ پدم راؤ" کے مصنف نظامی کا نام فخر دین کہا جاتا ہے۔ عام طور سے ناموں کی اس ترتیب میں دین سے پہلے اضافتی لاحقہ "ال" شامل ہوتا ہے۔ اس امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا کہ ان شعرا کا نام قطب الدین، فیروزالدین ہو جسے وزنِ شعری کی مجبوری سے قطب دین، فخر دین باندھا گیا ہو۔

ص ۴۰۱ پر لکھتے ہیں:

جھولنا میں، جو گجری کی ایک صنف ہے...

دراصل یہ ہندی کی ایک عروضی صنف ہے جس میں چار مصرع ہوتے ہیں اور چاروں میں ملا کر ۳۷ ماترائیں ہوتی ہیں۔ اردو میں جھولنا کے جو نمونے ملتے ہیں ان کے ہر مصرع میں ۳۷ ماترائیں ملتی ہیں۔

قلی قطب شاہ کی شاعری کی تنقید ص ۴۱۱ سے ۴۲۲ تک ہے۔ تاریخِ ادب کے لحاظ سے یہ قدرے زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تنقیدی جائزہ ہے اعلیٰ درجے کا۔ آگے چل کر وجہی کے باب میں "تاج الحقائق" کے لیے لکھتے ہیں۔

"تاج الحقائق" کو ملا وجہی سے منسوب کرنا ایک تحقیقی اندھیر ہے۔

(ص ۴۳۵)

ڈاکٹر جالبی کی نظر سے ڈاکٹر نورالسعید اختر کی مرتبہ "تاج الحقائق" (بمبئی، ۱۹۷۰ء) نہیں گزری۔ اس کے دلائل پڑھ کر جالبی صاحب بھی قائل ہو جاتے۔ "تاج الحقائق" اور "سب رس" کے اسلوب اور فقروں میں اس قدر مماثلت ہے کہ کوئی شبہہ ہی نہیں رہتا کہ "سب رس" کا مصنف ہی "تاج الحقائق" کا نقاش ہے۔ وجہی کے دوسرے اہم محقق ڈاکٹر شوپرشاد جاوید وشسٹ بھی اسے وجہی کی تصنیف مانتے ہیں۔

("ملا وجہی"، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۶۹-۶۴)

میرے لیے یہ اطلاع ایک انکشاف کا درجہ رکھتی ہے کہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں ابصار علی شاہ قادری نے "تاج الحقائق" کو عام فہم زبان میں لکھ دیا (ص ۳۵-۴۳۴)۔ وجہی کی

Scanned by CamScanner

مثنوی "قطب مشتری" کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ قلی قطب شاہ نے:

> کچھ عرصے کے بعد بھاگ متی کو... مشتری کے نام سے نوازا اور حیدر محل کا خطاب عطا کیا۔ (ص۴۳۶)

لیکن کئی محققوں نے بھاگ متی کے وجود اور اس کی پوری روایت پر شک کیا ہے۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ میں ۱۲ پیاریوں کا ذکر ہے۔ ان میں حیدر محل اور مشتری دو مختلف پیاریاں ہیں جب کہ بھاگ متی ہے ہی نہیں۔ پوری بحث ڈاکٹر سیدہ جعفر کی مرتبہ کلیاتِ قلی قطب شاہ کے دیباچے میں جزو "بھاگ متی اور بھاگ نگر" میں ملاحظہ ہو (دہلی، ۱۹۸۵ء، ص۸۹ تا ۱۰۱)۔ اس میں سیدہ جعفر یہ معرکے کا دعویٰ کرتی ہیں:

> مختصر یہ کہ محمد قلی کے کلیات میں ایک مصرعہ بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ محمد قلی کی محبوبہ بھاگ متی کو مشتری بھی کہتے تھے اور اس کے نام پر بھاگ نگر آباد ہوا تھا۔
>
> (مقدمہ، ص۹۶)

جالبی صاحب نے وجہی کی "سب رس" کا خلاصہ ص۴۴۸ سے ۴۵۶ تک دیا ہے۔ یہ تاریخِ ادب کے صفحات کی فضول خرچی ہے۔ مشہور کتاب ہے، اس کا خلاصہ دو تین صفحوں میں دینا کافی تھا۔

فرشتہ نے اپنی تاریخ میں ظہیر الدین بابر کا مصرع لکھا تھا:

> بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جالبی صاحب نے دریافت کر کے تصحیح کی کہ یہ مصرع ظہیرالدین بابر کے چچا ابوالقاسم مرزا بابر کا ہے (ص۴۶۶)۔ رشید حسن خاں نے اپنے تبصرے میں بجا گرفت کی ہے کہ جالبی نے اپنی دریافت کے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا (ادبی تحقیق، ص۱۰۰-۳)۔ جالبی صاحب حوالے کو حذف کرنے کے گنہ گار ہیں لیکن انھوں نے جس اعتماد سے دعویٰ کیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ دریافت کے پیچھے کوئی مضبوط سند ہو گی۔

فارسی "تحفۃ النصائح" کے مترجم کے لیے جالبی لکھتے ہیں کہ اس کا تخلص رازی ہے، رازی نہیں جیسا کہ انجمن ترقیِ اردو پاکستان کے مخطوطے میں مذکور ہے۔ قاضی ایک دوسرا شاعر ہے جس نے مثنویاں "مینانامہ" اور "چڑیانامہ" لکھیں (ص۴۸۶)۔ لیکن آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں اس کے سات مخطوطے ہیں۔ بیش تر میں اس کا تخلص رازی لکھا ہے، دو ایک میں یہ تحریف "راضی" جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ رازی ہی صحیح ہے، راضی نہیں۔ سروری صاحب نے اس کا نام قطب الدین رازی لکھا ہے (علی گڑھ تاریخ، ص۱۲۵)۔

Scanned by CamScanner

نصیر الدین ہاشمی بحث کرتے ہیں کہ کیا قطبی اور رازی دو شخص تھے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک ہی شخص ہے جس کا نام غالباً قطب الدین ہے ("دکن میں اردو"، ص ۱۲۲)۔ اس کے مصرع کے جزو "راضی تخلص قطب کا" سے صاف ہو جاتا ہے کہ اس کا نام قطب (الدین) تھا۔ وہ حسب ضرورت اپنے نام کو بھی قطبی کی شکل میں تخلص کے طور پر باندھ لیتا تھا۔ جالبی کی مذکورہ دو مثنویاں بھی اسی کی ہو سکتی ہیں۔

اردو کے مؤرخین ادب فارسی "شمائل الاتقیا" کے مصنّف کا نام شاہ برہان الدین غریب لکھتے ہیں (۸)۔ ڈاکٹر جالبی نے تصحیح کی کہ یہ کتاب برہان الدین غریب کے مرید رکن عمادالدین دبیر معنوی کی تصنیف تھی (ص ۵۰۱)۔

پانچویں فصل کا چھٹا باب "فارسی روایت کی تکرار" ہے۔ اس روایت کے سلسلے میں انھوں نے دکنی نثر کے دو اہم نمونوں کی طرف توجّہ دلائی:

۱۔ فائز دکنی کی مثنوی "رضوان شاہ و روح افزا" میں فصلوں کے عنوانات اردو نثر میں ہیں۔ جالبی نے انھیں نقل کیا ہے (ص ۵۱۵)۔

۲۔ دوسرا اہم نمونہ باقر آگاہ کی مثنوی "گلزارِ عشق" کا نثری دیباچہ ہے جس میں دکنی اور شمالی ریختے پر روشنی ڈالی ہے (ص ۵۲۳)۔

اتفاق سے "گلزار عشق" میں بھی رضوان شاہ و روح افزا کا قصہ ہے۔ ان دونوں نثری نمونوں کا ذکر اور کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔

چھٹی فصل کا پہلا طویل باب "ولی دکنی" سے متعلق ہے۔ اس میں ولی سے متعلق تین امور ... ولی کے نام، وطن اور سنہ وفات کی بحث بہت بھرپور ہے گو میں ان کے کسی فیصلے سے پوری طرح اتفاق نہیں کر سکتا۔ وہ ولی کا نام "ولی محمد" طے کرتے ہیں (ص ۵۳۴) جب کہ محمد اکرم چغتائی نے اپنے ایک طویل مضمون میں متعدد نسخوں، تذکروں اور دوسری کتابوں سے نام نقل کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ولی کا نام محمد ولی اللہ تھا (۹)۔

ولی کے وطن کے تعلق سے ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے کہ اس کے باپ دادا گجرات سے انتقال کر کے دکن چلے گئے تھے (ص ۵۳۴)۔ جالبی ولی کے دو اشعار سے استدلال کرتے ہیں جن میں ولی نے خود کو "شاعر ملک دکھن" کہا ہے۔ یہ ثبوت کافی نہیں۔ بعض اوقات نربدا کے جنوب کے پورے علاقے کو دکن کہہ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ولی کی شاعری اورنگ آباد میں پروان چڑھی، اس لیے بھی وہ خود کو "شاعرِ ملکِ دکھن" کہہ سکتا ہے۔

ولی کا سنہ وفات عام طور پر ۱۱۱۹ھ مانا جاتا ہے لیکن جالبی ۱۱۳۳ھ اور ۱۱۳۸ھ کے بیچ طے کرتے ہیں (ص ۵۳۸)۔ ان کے فیصلے سے اتفاق کیا جائے کہ نہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا

Scanned by CamScanner

کہ انھوں نے ایسے دلائل دیے ہیں جن کی روشنی میں ولی کے سنِ وفات ۱۱۱۹ھ کے بارے میں دوبارہ سوچنا پڑتا ہے۔

کتاب کے آخر میں "پاکستان میں اردو" کے نام سے جو ضمیمے ہیں، ان کے بارے میں میں پہلے ہی کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس جزو میں پنجاب کے باب میں پنجابی اور اردو کا جو تعلق دکھایا ہے وہ کتاب کی ابتدا میں لسانی جائزے کے جزو کے طور پر آنا چاہیے تھا۔ اس سے قطعِ نظر ان ضمیموں میں پنجاب، سندھ اور سرحد کے قدیم شعرا کی اردو شاعری کے جو نمونے دیے ہیں ان سے اردو ادب کی قدیم شاعری میں قابلِ قدر اضافہ ہوتا ہے۔ ان شعرا میں پنجاب کے شاہ حسین (سولھویں صدی عیسوی)، بلھے شاہ، وارث شاہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں (ضمیمہ: "پنجاب اور اردو")۔ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں شیخ جُنید کا ایک ریختہ دیا تھا:

دِلا غافل چہ ی غیبی کہ اپنی سیج تھیں ڈرے

جالبی نے اس کے بارے میں سوال اٹھایا کہ یہ جنید کا ہے بھی کہ نہیں کیونکہ یہ ایک بیاض میں شیخ فریدالدین کے نام سے درج ہے (ص ۶۲۸)۔ میں عرض کرتا ہوں کہ نجیب اشرف ندوی نے اسے خان محمد (م ۱۰۳۸ھ) سے منسوب کیا ہے (علی گڑھ تاریخ، ص ۱۲۵)۔ سندھ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> سندھ کا اٹھارویں صدی عیسوی کا شاعر سچل سرمست اردو میں صاحبِ دیوان تھا۔ (ص ۶۹۲)

"سرحد میں اردو روایت" کے ضمیمے میں انکشاف کرتے ہیں کہ اردو کے سیکڑوں ٹکسالی الفاظ پشتو ہی سے آئے ہیں (ص ۳-۷۰۲)۔ یہ جزو بھی کتاب کی ابتدا میں لسانی جائزے میں آنا چاہیے تھا۔ سرحد میں اردو کی ادبی تخلیقات کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم پیر روشان بایزید انصاری کی نثری کتاب "خیرالبیان" کا تعارف ہے جو ہندوستان کے قارئین کے لیے سب سے زیادہ مفید اور چونکانے والا ہے (ص ۵۸-۵۷، ص ۶۹۹، ص ۴-۷۰۳)۔ یہ کتاب ۹۲۸ھ میں تصنیف ہوئی اور اس طرح اردو نثر کی قدیم ترین کتاب ہے۔ یہ پشتو اکیڈیمی پیشاور کی طرف سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکی تھی لیکن عام اردو قارئین، بالخصوص ہندوستان کے قارئین کو اس کا علم جالبی صاحب کی تاریخ ہی سے ہوا۔ اس کے آگے سرحد کے قدیم اردو شعرا کا ذکر ہے جن میں سترھویں صدی عیسوی کے عبدالرحمان بابا قابلِ ذکر ہیں (ص ۷۰۵)۔

مثنوی کے ضمیمے میں دو تین اشعار ملتے ہیں جن میں سے پہلا یہ ہے:

Scanned by CamScanner

راول دیول ہم نجانا

پہاٹا پہنہ اوکھا کھانہ

(ص ۶۱۲)

شیرانی نے انھیں شاہ بہاءالدین باجن سے منسوب کیا ہے (مقالات، جلد اوّل، ص ۱۷۳) لیکن جالبی انھیں شکر گنج کا مانتے ہیں کیونکہ بقولِ جالبی خود باجن نے اپنی کتاب "خزائنِ رحمت اللہ"، باب ہفتم، نسخۂ کراچی میں انھیں بابا فرید کا کہا ہے لیکن جالبی صاحب کو یہ خبر نہیں کہ خزائنِ رحمت کے نسخۂ لاہور موسومہ بہ "گلستانِ رحمت" میں باجن نے انھیں اپنا مال ہی کہا ہے(۱۰)۔ نسخۂ کراچی سے نسخۂ لاہور زیادہ مکمل معلوم ہوتا ہے۔ اوّل الذکر میں اس کے دو شعر ہی ہیں جب کہ لاہوری نسخے میں تین شعر ہیں۔ دوسری طرف مہدوی روایات میں ان اشعار کو حضرت سیّد محمد جون پوری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بعد میں شیرانی نے ایک اور مضمون میں بغیر کسی احتجاج کے ان اشعار کا حضرت سیّد محمد سے انتساب قبول کر لیا(۱۱)۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شعر باجن کے ہیں یا حضرت سیّد محمد جون پوری کے۔ مختلف نسخوں میں ان کا متن مختلف ہے۔

ص ۷۱۶ سکھوں کی گرو گرنتھ صاحب میں شیخ فرید کے نام سے ۱۳۰ اشلوک یا دوہے دیے ہیں۔ ایک بحث ہے کہ یہ شیخ فرید شکر گنج کے ہیں یا شیخ برہم فریدالدین ابراہیم کے، جنھیں فرید ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ مختلف حضرات کے بیانات دیکھ کر جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ شیخ فرید اوّل کا کلام ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر اشلوکوں کی زبان اتنی صاف ہے کہ شکر گنج کے عہد میں ہونی ناممکن تھی۔ گرو ارجن دیو نے ۱۶۰۴ء میں گرنتھ صاحب کا جو نسخہ تیار کیا تھا وہ تو موجود نہیں۔ اس کی چار نقلیں بنوائی تھیں جن میں سے ایک ہندوستانی پنجاب کے قصبے کرتارپور میں محفوظ ہے۔ شعبۂ پنجابی جموں یونی ورسٹی کے ڈاکٹر دیوِندر سنگھ نے بابا فرید پر تحقیق کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کرتارپور کے مخطوطے کو دیکھا۔ متن میں ۱۲۵ دوہے ہیں جن میں سے دو گرو امر داس (یا رام داس) کے ہیں اور حاشیے پر لکھ کر اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے۔ حاشیے ہی میں کسی دوسرے قلم اور روشنائی سے مزید پانچ دوہے ہیں۔ مروجہ مطبوعہ گرنتھ صاحب میں جو ۱۳۰ اشلوک ملتے ہیں اُن میں سے دو گرو نانک کے اور ایک دوہا گرو ارجن دیو کا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ گرنتھ صاحب میں موجود ہونا ان دوہوں کے شکر گنج سے انتساب کی حتمی دلیل نہیں۔

گرنتھ صاحب میں سنتوں اور صوفیوں کا کلام زمانی ترتیب سے ہے۔ شیخ فرید کے

Scanned by CamScanner

اشلوک کبیر کے بعد درج ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ مرتب کی رائے میں یہ شیخ فرید ثانی کا کلام ہے۔ شیخ فرید کے محقق ڈاکٹر دیویندر سنگھ کی رائے میں یہ تیرھویں سے سترھویں صدی تک کے مختلف شعرا کا ملا جلا کلام ہے(۱۲)۔

ص۹۷، ص۶۱۲ اور ص۶۲۴: جالبی صاحب نے ص۹۷ پر مولانا شیخ عبداللہ انصاری کی "فقہ ہندی" (۱۰۷۴ھ) کا ذکر کیا۔ ص۶۱۲ اور ص۶۶۴ پر پنجابی کے شاعر مولانا عبداللہ عبدی کا احوال ہے جن کی کئی پنجابی تصانیف کی تفصیل "پنجاب میں اردو" سے لی ہے۔ شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں پنجابی کے شاعر مولانا عبداللہ سے ان تصانیف کا انتساب کیا ہے (ایڈیشن لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص۸۱) جب کہ ص۲۶۴ پر "مولانا عبدی" کے عنوان کے تحت "فقہ ہندی" کے مصنف کا تفصیلی ذکر ہے۔ جالبی صاحب نے ان دونوں شعرا کو ایک سمجھ لیا۔ رشید حسن خاں اپنے تبصرے میں اعتراض کرتے ہیں کہ:

> "فقہ ہندی" کا مصنف عبدی مشہور ہے۔ جالبی نے ص۹۷ پر شیخ عبداللہ انصاری کو مصنف ظاہر کیا ہے۔ یہ دوسرے بزرگ کون ہیں؟

شیرانی کو "فقہ ہندی" کا ۱۲۴۷ھ کا مکتوبہ ایک نسخہ ملا جس میں مصنف کا نام شیخ عبداللہ انصاری درج ہے ("مقالات شیرانی"، جلد دوم، ص۳۱۶)۔ میرا خیال ہے کہ "فقہ ہندی" کے مصنف کا نام مولانا شیخ عبداللہ انصاری ہے جن کے نام کو مخفف کر کے عبدی لقب بنا لیا گیا ہے۔ ان کا تخلص امین معلوم ہوتا ہے۔

ص۶۲۶ پر جالبی نے سولھویں، سترھویں صدی عیسوی کے حاجی محمد نوشہ گنج بخش کی مثنوی "گنج الاسرار" کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کی صاف زبان و بیان کی بنا پر شبہہ کیا ہے کہ یہ حاجی محمد نوشہ کی تصنیف نہیں ہے۔ ان کا گمان بجا ہے۔ خورشید احمد خاں نے پول کھولی کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے جس میں کچھ اشعار بارھویں صدی ہجری کی ایک مثنوی سے لیے ہیں اور کچھ اس کے مرتب شرافت نوشاہی نے تصنیف کر کے شامل کر دیے ہیں (خورشید احمد خاں: "نوشہ گنج بخش سے منسوب اردو کلام کی حقیقت"، "اورینٹل کالج میگزین"، شمارۂ خاص سلسلۂ جشنِ جامعۂ پنجاب، ۱۹۸۲ء)

رشید حسن خاں نے جالبی صاحب کے یہاں کہیں کہیں محمد حسین آزاد کے اسلوب کی نقل پر اعتراض کیا ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میں نے اپنی کتاب "تحقیق کا فن" میں مفصل بحث اور مثالوں کے بعد سفارش کی ہے کہ تحقیق میں بھی غیر شخصی کے بجائے شخصی لہجہ استعمال کرنا چاہیے (ص۲۶۸ تا ۲۷۶) لیکن اس حد تک نہیں جیسے ایک مقام پر جمیل جالبی

Scanned by CamScanner

پھوٹ رہے ہیں:

... لیکن اب جمیل جالبی! آخر کس کس کا ذکر کرو گے ... وہ لوگ جو اصل دھارے سے دور یا الگ ہیں یا صرف "نقل" اور "تکرار" کے ذریعے ادب و شاعری کا تبرک تقسیم کر رہے ہیں؟ ان کا ذکر تذکرہ نویسوں پر چھوڑ دو کہ یہ ان کا کام ہے اور تم آگے بڑھو۔

(ص ۵۸۵)

رشید حسن خاں نے جالبی صاحب کے اس قسم کے اسلوب پر بھی اعتراض کیا ہے۔

یہ وہ دور ہے کہ فارسی کا طوطی اب بھی سارے برِصغیر میں بول رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ ہُمائے اردو کی آواز بھی دلوں کو موہ رہی ہے۔

(ص ۶۳۲)

شاذ وہ کہیں کہیں ناظرین سے (قارئین سے نہیں،) خطاب کرنے لگتے ہیں، مثلاً:

ناظرین! یہ وہ دور ہے کہ دہلی میں شعرا کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو چکا ہے جو باقاعدگی سے ریختہ میں دادِ سخن دے رہا ہے۔

(جلد اوّل، ص ۵۶۲)

ناظرین! اب ہم انیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

(جلد دوم، حصۂ دوم کا آخری جملہ، ص ۱۱۲۷)

"ناظرین" کا استعمال غیر ادبی، تاریخی یا جاسوسی ناولوں میں ہوتا تھا۔ چونکہ ادبی مورخ کوئی "آنکھوں دیکھا حال" نہیں بیان کر رہا اس لیے "ناظرین" کے لفظ سے احتراز بہتر ہے۔

جلد اوّل کے اس تفصیلی جائزے کے بعد میں یہ کہوں گا کہ دکنی ادب، اردو کے مورخوں کے لیے عموماً اور شمالی ہند کے باشندوں کے لیے خصوصاً ایک اجنبی مملکت معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے میں جس عارفانہ نظر کا ثبوت دیا ہے، جس طرح متعدد نئی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور پہلے کی غلط معلومات کی تصحیح کی ہے وہ داد و تحسین سے بالاتر ہے۔

جلد دوم

جلد دوم میں وہ زیادہ خود اعتمادی اور قدرت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے ادب کے لیے میں اس جلد کو حوالے کی بنیادی کتاب کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ اس کے

Scanned by CamScanner

اور دوسرے مورخین کے بیانوں، بالخصوص سنین میں اگر کہیں اختلاف ہوتا ہے تو میں جالبی کے پیچھے چلنا پسند کرتا ہوں۔ یہ جلد تحقیق اور تنقید دونوں لحاظ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہے، اس لیے میں اس پر اتنی تفصیل سے نہیں لکھوں گا جیسے جلد اوّل پر لکھا۔ یہ جلد دو حصّوں میں منقسم ہے اور یہ تقسیم محض ضخامت کی بنا پر کی گئی ہے، کسی دور یا روایات کی وجہ سے نہیں، مثلاً حصۂ اوّل کے آخر میں میر کا بیان ہے، حصۂ دوم کے شروع میں سودا کا اور یہ دونوں ایک دور کے عمائد ہیں۔

دونوں حصّوں کی وحدت کی وجہ سے فہرستِ مضامین صرف پہلے حصّے کے شروع میں ہے، اشاریہ صرف دوسرے حصّے کے آخر میں۔ اس طرح ایک حصّے کا مطالعہ کرتے وقت دوسرے حصّے کو بھی دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پہلے حصے میں فہرستِ عنوانات بہت مختصر ہے۔ اس میں چند بڑے ادیبوں ہی کے نام ہیں۔ اب ہمیں مثلاً یہ جاننا ہو کہ اس جلد میں سراج یا داؤد اورنگ آبادی کا ذکر ہے کہ نہیں تو فہرستِ عنوانات میں یہ غیر حاضر ہیں، دوسری جلد کے اشاریے میں ان شعرا سے متعلق متعدد حوالے ملتے ہیں۔ ان سب کو تلاش کرنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حالات جلد دوم میں ہیں ہی نہیں۔ اشاریے میں ولی دکنی اور مصحفی کے حوالے بہت تفصیل سے ہیں، انشا اور جرأت کے بھی ہیں۔ واضح نہیں ہوتا کہ ان شعرا کا بیان جلد دوم میں ہے کہ نہیں۔ ایک ایک حوالے کو دیکھیے، تبھی معلوم ہو سکے گا کہ یہ شعرا اس جلد کی بزم سے باہر ہیں۔ ولی کے اشاریے میں تو ایک عنوان سالِ وفات بھی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو، ولی ضرور جلد دوم میں ہیں لیکن دراصل نہیں۔

اسی طرح حصۂ اوّل میں جو کم اہم شعرا آئے ہیں، انھیں فہرستِ عنوانات میں تو جگہ ملی نہیں، ان کے بیان کو دریافت کرنے کے لیے جلد دوم میں اشاریے سے مدد لینی ہوتی ہے۔ دقت یہ ہے کہ اشاریے میں ایک ادیب سے متعلق متعدد صفحات کا حوالہ ہوتا ہے، ہمیں صرف یہ جاننا ہے کہ اس ادیب کا مفصّل یک جا بیان کہاں ہے مثلاً شاہ عالم یا عیسوی خاں بہادر کی تصنیف کی بحث تلاش کرنی ہو تو اشاریے کے کئی غیر ضروری حوالوں سے ٹکرانے کے بعد ہی ہم صحیح مقام پر انگلی رکھ سکیں گے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ ہر حصّے کی ابتدا میں فہرستِ عنوانات ہو جس میں اس جلد میں بیان کردہ تمام ادیبوں، اہم و غیر اہم کے نام ہوں اور صفحے کا نمبر ہو۔ ہر حصّے کے آخر میں اس حصّے میں مذکور ادیبوں کا اشاریہ۔ یہ حصّے دراصل آزاد جلدیں ہیں۔

اب حصۂ اوّل کے بارے میں تفصیلی مشاہدات:

Scanned by CamScanner

تمہید کے دو ابواب ہیں، پہلا باب "سیاسی منظر، طرزِ فکر، تہذیبی و معاشرتی رویّے" کا ہے جو بہت متوازن ہے۔ اس سے بھی زیادہ بیش بہا ہے۔ دوسرا باب "اردو شاعری، رواج، کشمکش، اثرات، محرکات و میلانات"۔ اس میں ص ۳۴-۳۲ پر اساتذہ کے کئی اشعار سے مماثل فارسی اساتذہ کے اشعار دیے ہیں۔ بیشتر صورتوں میں اردو شعر فارسی سے ترجمہ ہیں۔ ان میں سے بعض اشعار کا ذکر اوروں نے بھی کیا ہے۔ جالبی صاحب نے کہیں زیادہ مثالیں پیش کیں۔ ص ۳۵-۳۴ پر انھوں نے انکشاف کیا کہ ہندی کے مشہور شاعر بہاری نے کئی دوہے فارسی اشعار سے ماخوذ کیے ہیں۔ انھوں نے ایسی پانچ مثالیں دی ہیں اور یہ دوہے واقعی فارسی اشعار سے مماثل ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ نمونہ فارسی شعرا بہاری سے مقدم ہیں کہ نہیں۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ یہ تقابلی مطالعہ جالبی صاحب کے مطالعے کا نتیجہ ہے یا ان سے پہلے کسی اور نے بھی لکھا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "عاشور نامہ" کے مصنف کے وطن سہارنگ پور کو سہارن پور قیاس کیا تھا۔ ڈاکٹر جالبی نے خیال ظاہر کیا کہ یہ مالوے کا قصبہ سارنگ پور ہے۔ انھوں نے فارسی کی دو قدیم تاریخوں میں اس کا حوالہ عہدِ بابر و ہمایوں میں دریافت کیا۔

فصلِ اوّل کے تینوں باب بہت عمدہ ہیں۔ پہلا باب (الف) "مذہبی شاعری" اور (ب) "لسانی خصوصیات، شمال و دکن کی زبانوں کا فرق" اچھا مطالعہ ہے۔ دوسرے باب میں رزم نامے اور ایپک (رزمیہ نظم) کا فرق صحیح طور پر واضح کیا ہے۔ دکن میں کئی جنگی مثنویاں لکھی گئیں، شمال میں بہت شاذ ہیں اور معروف بھی نہیں۔ ان میں ضلع الہ آباد کے سید زاہد ثنا کی مثنوی "وقائع ثنا" کا بیان اہم انکشاف ہے۔ ۲۱۱۹ شعروں کی یہ مثنوی ۷۶-۱۱۷۴ھ/ ۶۲-۱۷۶۰ء کے بیچ لکھی گئی۔ اس کا موضوع پانی پت کی تیسری لڑائی ہے۔ جالبی نے اس کا تفصیلی تعارف دیا ہے۔ میں نے شمالی ہند کی مثنویوں پر تحقیق کی ہے لیکن میں اس قدیم طویل مثنوی سے واقف نہ تھا۔ ڈاکٹر جالبی نے یہ تعارف رسالہ "ہندوستانی" الہ آباد بابت اکتوبر ۱۹۳۴ء سے لیا ہے۔ وہ نہ لکھتے تو میں کہاں یہ رسالہ دیکھتا۔

تیسرا باب جعفر زٹلی پر ہے جسے ص ۹۰ سے ۱۱۶ تک، یعنی ۲۷ صفحے دیے ہیں جو قدرے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ص ۹۵-۹۱ پر جعفر کی سوانح خوب ترتیب دی ہے۔ شروع ہی میں ص ۹۱ پر واضح کیا کہ جعفر سید نہیں، مرزا تھا۔ ص ۹۵-۹۲ میں اس کے دور کی حدود کا تعین صاحب نظری سے کیا ہے۔ تحقیق سے زیادہ اہم ہے جعفر کی تحریروں کی قدر بندی۔ اس میں اور بعض دوسرے صفحات پر جو اشعار درج ہیں ان میں سہو طباعت سے متن غلط ہو گیا ہے۔ بعض اوقات مصرع کی بےوزنی سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر نے کچھ اور لکھا ہو گا۔

Scanned by CamScanner

چند مثالیں:

۱۔

تربوزہ و خربوزہ زسد گر ترا بدست
یک سبز پھانکِ کھیرۂ بالم غنیمت است

جعفر، ص۱۰۰

پہلے مصرع کے ابتدائی الفاظ "تربوز و خرپزہ" رہے ہوں گے۔

۲۔

داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں
نہیں مقدور جا چھین لوں تختِ طاؤس

تاباں، ص۳۴۷

دوسرے مصرع میں "مقدور" کے بعد "کہ" چھوٹ گیا ہے۔

۳۔

جو بھی آوے تو ٹک جھانک اپنے دل کی طرف
کہ اس طرف کو ادھر سے بھی راہ گزرے ہے

حاتم، ص۳۵۵

"جو بھی" کی جگہ فعول کے وزن کے الفاظ چاہییں۔ دیوان زادہ میری دسترس میں نہیں۔

۴۔

طرف مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

میر، ص۶۰۰

طرف کے بعد "ہونا" چھوٹ گیا ہے۔

۵۔

سوار شد آں بادشاہِ کشورِ حسن
کہ آفتابِ کشادہ نشانِ زرّیں را

لاعلم، دوسرا حصہ، ص۶۷۷

Scanned by CamScanner

یہاں "شد" کے بعد "مگر" آنا چاہیے۔ سودا کا متوازی شعر ہے:

ہوا سوار وہ شاید مرا شہنشہِ حسن
کہ آفتاب نے زرّیں نشان کھول دیے

۔۶

یاں تک میں سویا بختِ بیدار
کھلی آنکھ تو کارواں نہیں ہے

قائم، حصہ دوم، ص۷۸۵

عروضی اعتبار سے دونوں مصرع مختلف یا غلط اوزان میں ہیں۔ یہ مثالیں بادی النظر میں دکھائی دیں! کچھ اور بھی ہو سکتی ہیں۔ سہوِ طباعت ناگزیر ہے لیکن اتنی ضخیم دو جلدوں میں سہوِ طباعت کی اتنی کم مثالیں حیرت انگیز ہیں۔

فصلِ دوم کے دو ابواب میں فارسی شعرا کی ریختہ گوئی کے بیان میں خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ یہ دونوں ابواب پڑھے لکھے قارئین کی معلومات میں بھی خاصا اضافہ کرتے ہیں۔ ولی کے ہم عصر شمالی ہند کے شاعر خواجہ عبدالاحد گل متوفی ۱۱۲۶ھ کی اردو شاعری کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

میر نے "نکات الشعرا" میں مرزا بیدل کی ایک اردو غزل کا مطلع و مقطع درج کیا تھا۔ انتساب پر شک ہوتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے ڈاکٹر جالبی کو کسی مولانا غلام کبریا خاں افغانی کی بیاض میں پانچ اشعار پر مشتمل یہ پوری غزل مل گئی (حصہ اول، ص۱۳۶)۔ زبان بیدل کے دور سے قدرے صاف ہے۔ ہو سکتا ہے اصلاً بعض لفظوں کا املا و تلفظ فرسودہ تر رہا ہو۔ "جلوۂ خضر" میں بیدل کے نام سے ایک اور اردو شعر دیا ہے لیکن جالبی نے پتا چلا لیا کہ یہ میر درد کا ہے (ص۱۳۶)۔ رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۲۳ء میں ایک کبت بھی بیدل کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن جالبی نے عبدالجلیل بلگرامی کے چشم دید بیان سے حوالہ دیا ہے کہ بیدل ہندوی نہیں سمجھتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کبت بیدل کا نہیں (ایضاً)۔ دراصل یہ ہندی شعر کبت نہیں، دوہا ہے۔

میرے لیے یہ بھی نئی خبر ہے کہ شاہ گلشن نے تبرک اور نمونے کے طور پر ولی کو ایک غزل دے دی تھی جس کے مقطعے میں ولی نے اپنا تخلص ڈال کر اپنا لیا (ص۱۲۹)۔ بعد میں دیکھا تو ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بھی کلیاتِ ولی میں یہ بات لکھی ہے (لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص۱۹۹)۔ خانِ آرزو نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان کے والد نے فارسی مثنوی "حسن و عشق"

Scanned by CamScanner

میں "قصہ کام روپ و کام لتا" نظم کیا۔ شاید آرزو نے یہ مثنوی دیکھی نہ تھی یا پھر اس پر سے سرسری گزر گئے ہوں گے۔ جالبی گھر کے بھیدی سے بھی زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مثنوی کو مفصل طور پر دیکھ کر انکشاف کیا کہ اس میں کام روپ و کام لتا کا قصہ نہیں۔ منوہر و مدھ مالتی کا ہے (ص ۱۵۰)۔ اس بیان میں سہواً "گلشن عشق" کے مصنف کا نام غواصی لکھ دیا ہے، نصرتی ہونا چاہیے تھا۔ ص ۵۳-۱۵۱ پر خان آرزو کی فارسی تصانیف کی طویل فہرست دی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ غیر ضروری تھا۔ کراچی یونی ورسٹی سے ڈاکٹر ریحانہ خاتون نے آرزو کی کتاب "مثمر" کو مدون کر کے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔ اس کے انگریزی دیباچے سے آرزو کی مزید ۵ کتابوں کے نام معلوم ہوئے:

۱۔ مثنوی عبرت فسانہ

۲۔ معیار الافکار (قواعد)

۳۔ آداب عشق

۴۔ رقعات آرزو

۵۔ احقاق الحق (شیخ علی حزیں سے متعلق)

(مقدمہ "مثمر"، ص ۳۶-۲۷)

خانِ آرزو کی اولیات کے سلسلے میں انکشاف کیا کہ زبان کے معنی میں لفظ "اردو" سب سے پہلے خان آرزو نے "نوادر الالفاظ" میں کئی جگہ استعمال کیا، مثلاً:

"لیکن کھتوڑا در عرفِ اردو وغیرہ بہ معنی حرفِ نازو عزاست۔"

"لیکن ہرپھنا زبانِ اردو و اہلِ شہرہا نیست۔"

(ص ۱۵۴)

ہو سکتا ہے دوسری مثال میں آخری لفظ "نیست" کے بجائے "ئیست" ہو، صاف نہیں پڑھا جاتا۔ جالبی کے مطابق "نوادر الالفاظ" ۱۱۵۶ھ میں زیرِ تالیف تھی (ص ۱۵۲)۔ اب تک کی معلومات کے مطابق میر محمدی مائل کے دیوان (سنہ ترتیب ۱۱۷۶ھ) کے ایک قطعے میں مجرد اردو کو زبان کے معنی میں استعمال کیا گیا تھا۔

آرزو نے "نوادر الالفاظ" میں تشریح لفظ کے سلسلے میں بعض لطیفے بھی لکھ دیے ہیں، مثلاً ایک ظریف نے سلاطینِ ہند کی کسی بیگم کو لکھ بھیجا کہ "سنبوسہ بے سن" کی خواہش ہے۔ بیگم سمجھ گئیں اور لکھا کہ سنبوسہ بے سن پیغام سے کبھی نہیں ملتا۔ نکتہ یہ ہے کہ سنبوسہ اگر بغیر سن کے پڑھا جائے تو بوسہ رہ جاتا ہے (ص ۱۵۸)۔ میں نے زیب النسا کی حیات سے متعلق ایک افسانوی قسم کی سوانح میں اسے بہتر شکل میں پڑھا تھا۔ اس میں عاقل

Scanned by CamScanner

خاں رازی کو زیب النسا کا عاشق دکھایا ہے۔ کسی ضیافت کے موقع پر اس نے زیب النسا کو پرچہ بھیجا کہ "سنبوسہٗ بیسن می خواہم"۔ زیب النسا نے جواب لکھ بھیجا "از توشۂ ما در طلب۔"

تیسری فصل میں دہلی کے ابتدائی شعرا کا بیان ہے۔ ان میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی بحث بہت پُر مغز ہے۔ اس سلسلے میں آبرو، حاتم اور فائز کی اردو شاعری کے آغاز کا سال بھی زیرِ بحث آگیا۔ جالبی کا فیصلہ ہے کہ آبرو کا دیوان ۱۱۳۹ھ میں یا اس سے بھی پہلے، فائز کا دیوانِ اردو ۱۱۴۳ھ میں اور شاہ حاتم کا دیوانِ قدیم ۱۱۴۴ھ میں مرتب ہوا۔ مختلف مآخذ کو دیکھ کر شاکر ناجی کا سنہ وفات بڑی خوش اسلوبی سے دریافت کیا ہے۔ ناجی ۱۱۵۹ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان فوت ہوا۔ زیادہ امکان ہے ۱۱۶۰ھ کے لگ بھگ (ص ۲۴۵)۔ آزاد کی تقلید میں لکھتے ہیں کہ مضمون جاجِ مؤ اکبر آباد کے رہنے والے تھے (ص ۲۵۸)۔ قاضی عبدالودود کے مطابق صحیح نام جاجو ضلع کان پور ہے ("آزاد بحیثیت محقق"، شق نمبر ۱۰۵)

ولی سے متاثر شعرا کے سلسلے میں اشرف کا بیان کرتے ہیں، اور پہلے اس تخلص کے دو اور شعرا کا ذکر کرتے ہیں جن میں پیر اشرف بیابانی سے "واحد باری" کو منسوب کر دیا ہے (ص ۲۸۹)۔ اس غلط فہمی کے بارے میں پیچھے لکھا جا چکا ہے۔ انجمنِ ترقیِ اردو ہند میں اشرف گجراتی کے دیوان کا نسخہ ۱۱۲۹ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ ولی کے رنگ کا شاعر ہے (ص ۹۱-۲۹۰)۔ اتنے قدیم صاحبِ دیوان شاعر کے بارے میں مجھے پہلی بار جالبی کی تاریخ سے علم ہوا۔ جالبی لکھتے ہیں کہ کئی اشعار ایسے ہیں جو ولی اور اشرف دونوں کے دیوان میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ولی اور اشرف کے دیوان میں کم و بیش ۱۵ غزلیں مشترک ہیں (ص ۲۹۲)۔ پھر ص ۹۳-۲۹۲ کے حاشیے میں ان غزلوں کے بارے میں مزید اظہارِ خیال کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بحث اور توجیہ حاشیے میں کیوں دی گئی۔ اسے متن میں دینے میں کون سا امر مانع تھا۔ اسے دیکھ کر میں یہی کہنے پر مجبور ہوں کہ ڈاکٹر جالبی کے ذہن میں متن اور حاشیے کے مطالب کی تفریق کا کوئی تصور نہیں۔

ولی سے متاثر شعرا میں رضی اور ثنا کا بیان بھی خوب ہے۔ ص ۷-۳۰۶ پر عبیداللہ خاں مبتلا کا ذکر ہے۔ یہ کسی میر جملہ کا بیٹا تھا۔ جالبی کے نزدیک وہ میر جملہ عبیداللہ خاں کا بیٹا تھا (ص ۳۰۷)۔ یہ تو دیکھنے میں آتا ہے کہ پوتے کا نام دادا کے نام پر رکھ دیتے ہیں۔ لیکن باپ اور بیٹے دونوں کا نام عبیداللہ خاں ہونا تعجب خیز ہے۔ "سیَر المتاخرین" میں باپ کا نام میر جملہ عبیداللہ خاں لکھا ہے لیکن "مآثرالامرا" میں عبداللہ ہے (جالبی، ص ۳۰۷)۔ جالبی نے "سیَر المتاخرین" کا بیان قبول کیا، "مآثرالامرا" کا بیان زیادہ معقول ہے۔

Scanned by CamScanner

عہد ولی کے ریختہ گو شعرا کی دریافت کے سلسلے میں ایک شاعر میر محمود صابر سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کا ذکر جلد اول میں بھی ہے (ص۹۰-۶۸۷) جلد دوم میں تکرار کی وجہ یہ ہو گی کہ ولی کے مقلدوں کا ذکر یک جا ہو جائے۔ صابر کے والد استر آباد سے آ کر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ صابر وہیں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی دیوان تیار کیا۔ اس کی تکمیل نیز صابر کی وفات کی تاریخ ۱۱۸۱ھ/۶۸-۱۷۶۷ء ہے۔ ضخیم اردو دیوان میں ۷۱۶ غزلیں ہیں۔ اس کا مخطوطہ سندھ یونی ورسٹی پاکستان میں ہے۔ میر سے بھی قبل کے اس شاعر کے بارے میں پہلی بار جالبی نے ذکر کیا ہے (ص۲۵-۳۱۹)۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تاریخِ ادب تاریخی ترتیب کے بجاے رجحانات اور روایات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ ایسی صورت میں اشرف گجراتی اور میر محمود صابر کا ذکر ولی کے سلسلے ہی میں کر دینا چاہیے تھا کیونکہ یہ دونوں ولی کے رنگ میں لکھتے ہیں۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کے قتل کے سلسلے میں ص ۳۶۲ پر جالبی کی یہ تاویل کہ "مرزا کی شہادت کا واقعہ دراصل سیاسی نوعیت کا تھا،" جی کو لگتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مظہر نواب مجدالدولہ عبدالاحد خاں کے حامی تھے۔ آخرالذکر کے حریف نجف خاں وزیر نے مظہر کے خلاف یہ افواہ پھیلائی کہ انھوں نے محرم کے جلوس پر لعن طعن کی ہے اور پھر ایک ایرانی سے انھیں قتل کرا دیا (ص۳۶۳)۔ جالبی کی یہ دریافت اُس دور کی ادبی تاریخ کی اہم معلومات ہے۔ ان کی یہ تحقیق بھی قابلِ قدر ہے کہ عبدالرزاق قریشی کا جمع کیا ہوا مرزا مظہر کا اردو کلام مشکوک ہے کہ اس کے کئی اشعار دوسروں کے دیوان میں ملتے ہیں۔

یقین پر لکھتے ہوئے خلافِ معمول پہلے ص۶۷-۳۷۲ پر شاعری پر تنقید ہے، اس کے بعد حالات لکھے ہیں، اس کے بعد پھر مفصل تنقید ہے۔ ابتدائی صفحات کی تنقید بھی حالات کے بعد دی جاتی تو بہتر تھا۔ عبدالحی تاباں کا سنہ وفات معلوم نہیں۔ اسے جس طرح تین سال کے عرصے میں محصور کیا ہے اس تحقیق کی داد دینی چاہیے (ص۳۸۶)۔ بیان کے بارے میں انھوں نے مدلل صراحت کی ہے کہ اس کا نام احسن اللہ نہیں، احسن الدین خاں تھا (ص۴۰۷)۔ اس کا سنہ وفات ص۴۰۷ پر صفر ۱۲۱۳ھ/۱۷۸۸ء لکھتے ہیں اور ص۴۱۰ پر صفر ۱۲۱۳ھ/ جولائی یا اگست ۱۷۹۸ء لکھتے ہیں۔ آخرالذکر عیسوی سنہ صحیح ہے کیونکہ صفر ۱۲۱۳ھ کے متوازی ۱۷۹۸ء ہے، ۱۷۸۸ء نہیں۔ مالک رام نے بھی گلاب چند ہمدم کے مادۂ تاریخ سے یہی سنین دیے ہیں۔

چوتھی فصل کے تیسرے باب میں شاہ حاتم پر تفصیل سے لکھا ہے۔ حاتم کی پانچ اوّلیات گنائی ہیں۔ ان میں انکشاف کیا ہے کہ حاتم نے اردو کا پہلا واسوخت ۱۱۳۹ھ میں اور

Scanned by CamScanner

پہلا شہر آشوب ۱۱۴۱ھ میں لکھا۔ کوئی ثبوت نہیں کہ آبرو کا واسوخت حاتم سے قبل کا ہے (ص ۴۴۲-۴۴۱) جالبی نے یہ اچھا کیا کہ شاہ حاتم کی دلچسپ اردو نثر تمام و کمال نقل کر دی جس سے یہ سب کی دسترس میں آ گئی (ص ۴۴۹-۴۴۷)۔

جالبی کا یہ تنقیدی فیصلہ نہایت قابلِ قدر ہے:

> اس دور کی اردو شاعری کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو شاعری کا عام مزاج مذہبی نہیں ہے۔ اس میں جو علامات یا تلمیحات عام طور پر استعمال ہوتی ہیں وہ بھی غیر مذہبی (secular) ہیں۔ (ص ۴۹۲)

ہندوستانی نقاد تو یہ کہا ہی کرتے ہیں لیکن ایک پاکستانی نقاد کا یہ فیصلہ بہت اطمینان بخش ہے۔

حصۂ اول کی آخری فصل پنجم کے آخری دو باب میر سے متعلق ہیں۔ جلد دوم میں میر پر سودا سے پہلے لکھا ہے جو تاریخی ترتیب کے خلاف ہے۔ حواشی سمیت میر کو ۱۴۷ صفحات دیے ہیں۔ میر کی تمام عظمت کے باوجود ان پر اتنی شرح و بسط سے لکھنا عدمِ توازن ہے۔ دراصل ان اوراق میں ان کی پوری کتاب "محمد تقی میر" لفظ بہ لفظ پوری کی پوری سما دی ہے۔ بہرحال میر کی سوانح خوب ہے، بالخصوص میر کے ورودِ لکھنؤ کے سنین کی بحث، جس کے لیے انھوں نے قاضی عبدالودود سے استفادہ کیا ہے۔ میر کے تذکرے اور معاصر تذکروں کا معاملہ بھی خوب سلجھا کر پیش کیا ہے (۵۲۹-۳۲)۔ یہ دلچسپ مشاہدہ ملاحظہ ہو:

> "ذکرِ میر" کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ سنین سے میر صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ (ص ۵۴۷)

اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جالبی نے میر کی تذکرہ نگاری پر بھی خوب لکھا ہے اور ان کی شاعری پر بھی۔ حیات ہو کہ تصانیف سب کا حق ادا کر دیا ہے۔

یہی کیفیت جلد دوم، حصۂ دوم کی ہے۔ واضح ہو کہ اس جلد کی فصل پنجم کے پہلے تین باب حصۂ اول میں آئے ہیں اور بعد کے چھ باب حصۂ دوم میں۔ اس طرح جلد دوم حصۂ دوم کی ابتدا چوتھے باب سے ہوتی ہے جو سودا سے متعلق ہے۔ اس میں سودا کی سوانح خوب ترتیب دی ہے۔ جالبی نے مفصل بحث کے بعد سودا کا سالِ ولادت ۱۱۱۸ھ/۰۷-۱۷۰۶ء طے کیا ہے (ص ۶۵۴) جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میر درد کی سوانح میں ان کی فارسی تصانیف کا مطالعہ قابلِ داد ہے (ص ۷۳۱-۳۵)۔ ان سے درد کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ اس باب کے آخر میں جو اصل فارسی اقتباسات دیے

Scanned by CamScanner

ہیں، انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کاش یہ حسب موقع متن کے بیچ ہی میں ٹانک دیے جاتے۔ متن کا بیان پڑھتے وقت آخر میں ورق پلٹ کر کون دیکھتا ہے۔ اس طرح ان کے شمول کی افادیت بہت کم ہو گئی ہے۔

قائم کی ہجویات کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کر کے وہ اس فیصلے پر پہنچتے ہیں:

ہجووں میں قائم عام طور پر گالیوں پر اتر آتے ہیں ... بحیثیت مجموعی قائم کی ہجویات میں غصے اور پھکڑپن کا اظہار تو ہوتا ہے لیکن طنز و مزاح کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ (ص ۷۸۷)

جالبی نے قائم کی مثنوی "قصہ نٹ مسمیٰ بہ حیرت افزا" کا فوق الفطرت لیکن دلچسپ قصہ بیان کیا ہے (ص ۸۹-۷۸۸)۔ اس کو نثار احمد فاروقی نے اور بھی تفصیل سے شرح کیا ہے (۱۳)۔ مجھے یاد آیا کہ لڑکپن میں مَیں نے کہیں ہندوستان کے مشہور رسی کے شعبدے (rope trick) کا قصہ پڑھا تھا۔ یہ کچھ اس طرح تھا:

جہانگیر کے دربار میں ایک نٹ اور نٹنی نے اپنا تماشا دکھایا۔ نٹ نے آسمان کی طرف ایک رسی پھینکی جو ایک بڑے بنڈل میں سے کھلتی ہوئی بہت اوپر کو پہنچ گئی۔ نٹ نے کہا کہ اسے آسمان پر جا کر اپنے دشمن سے جنگ کرنی ہے۔ اس کے بعد وہ اس رسی پر اوپر کو چڑھتا گیا تا آنکہ حدِ نظر سے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اوپر سے خون ٹپکا اور نٹ کے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں، دھڑ، سر وغیرہ نیچے گرے۔ اس پر نٹنی نے ماتم کیا اور اس کے اعضا کو لے کر چتا بنا کر ستی ہو گئی۔ بادشاہ کو بہت افسوس ہوا۔

کچھ دیر بعد دیکھتے کیا ہیں کہ رسی پر سے نٹ نیچے اُتر آیا اور بتایا کہ جنگ میں اس کی فتح ہوئی ہے۔ اس کے بعد اپنی نٹنی کو دیکھنے کی خواہش کی۔ بادشاہ نے افسوس کے ساتھ سارا ماجرا سنایا۔ اس پر نٹ نے کہا کہ "حضور نے میری بیوی کو چھپا کر رکھا ہے، یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔" اس کے بعد اس نے آواز لگائی تو نٹنی بادشاہ کے تخت کے نیچے سے زندہ سلامت باہر نکل آئی۔ اس پر بادشاہ نے نٹ کو بہت سا انعام دیا۔ ظاہر ہے کہ اس قصے میں نٹ کا کرتب ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک فوقِ فطری خیالی داستان ہے۔ قائم کا بیان کردہ قصہ اسی رسی کے شعبدے کی تخریب ہے جس میں مرکزی شے، یعنی رسی ہے ہی نہیں۔

جالبی نے میر اثر کی تصانیف میں "خواب و خیال" اور "دیوان اثر" کے علاوہ ایک فارسی مثنوی "بیانِ واقع" کی بھی خبر دی (ص ۸۰۱)۔ میر اثر کی "خواب و خیال" کا بغور مطالعہ کر کے جالبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مثنوی "خواب و خیال" دو دفعہ میں لکھی گئی (ص ۸۰۳)، یعنی "بہارِ عشق" کے رنگ کے شدتِ عشق کے اشعار ایک بار کہے گئے، تو یہ و

Scanned by CamScanner

استغفار کے اشعار اس کے بعد۔ جالبی کا یہ مشاہدہ قابلِ قبول ہے۔

میر حسن اور خواجہ حسن حسن کے کلام میں کئی حضرات نے التباس کیا ہے۔ جالبی اطلاع دیتے ہیں کہ "آبِ حیات" میں آزاد نے خواجہ حسن کی ایک غزل میر حسن کے نمونۂ کلام میں دے دی ہے (ص ۸۱۹، حاشیہ)۔ جالبی نے اس غزل کی نشان دہی نہیں کی لیکن یہ بالیقین وہ غزل ہے جس کا مقطع ہے:

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی

حسن اس نے احساں دوبارہ کیا

خواجہ حسن اپنی محبوبہ بخشی طوائف کا نام ضرور مقطعے میں لاتے تھے۔ "آبِ حیات" میں اس غزل کے التباس کی بات سب سے پہلے قاضی عبدالودود نے "آزاد بحیثیت محقق" (نقوش نمبر ۵۴) میں لکھی تھی۔ ان کا حوالہ دے دیا جاتا تو مناسب ہوتا۔ جالبی نے میر حسن کے جد میر امامی موسوی کے خاندان کے بارے میں ایک بات متن میں لکھی ہے اور اسی سے متعلق دوسری بات ("صاحب کے مورثِ اعلیٰ فیل بان تھے،") ص ۸۱۹ کے حاشیے میں لکھی ہے۔ ایک ہی موضوع کا ایک جزو متن میں اور دوسرا جزو فٹ نوٹ میں دینا بالکل بے اصولی ہے۔

میر حسن کا سالِ ولادت کسی تذکرے میں درج نہیں۔ قاضی عبدالودود نے ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ طے کیا (۱۴)۔ وحید قریشی نے تمام تذکروں کے بیانات کا مفصل تجزیہ کر کے ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ قیاس کیا ("میر حسن اور ان کا زمانہ"، ص ۲۰۴)۔ جالبی کچھ حساب کتاب کر کے ۱۱۴۹ھ کے حق میں ہیں (ص ۸۲۲)۔ میر حسن کی وفات کا سال اور مہینا متفقہ ہے لیکن یوم پر اختلاف ہے۔ جالبی صحیح یوم مقرر نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں کہ بقولِ میر شیر علی افسوس ۵ محرم ۱۲۰۱ھ کو اور بقولِ مصحفی عشرۂ محرم میں کسی تاریخ کو انتقال کیا (ص ۸۲۴)، لیکن مسعود حسن رضوی نے "اسلاف میر انیس" میں کریم الدین کے حوالے سے یکم محرم طے کی ہے ("اسلاف میر انیس" لکھنؤ ۱۹۷۰ء، ص ۷۹)

جالبی نے "سحر البیان" جیسی مشہور مثنوی کا قصہ چار صفحوں میں (۵۵-۸۵۲) دیا ہے جو زیادہ ہے۔ انھوں نے بہت سے غیر مشہور شعرا کو اپنی تاریخ میں متعارف کرایا ہے لیکن حیرت ہے کہ فضائل علی خاں کی مثنوی کا علاحدہ سے ذکر نہیں کیا، صرف ص ۵۸-۸۵۷ پر ضمناً "سحر البیان" کے سلسلے میں دوبار اس کا نام لیا ہے حالانکہ یہ اپنی قدامت کی وجہ سے تفصیلی بیان کی سزاوار تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے اس مثنوی کا نام "خوانِ کرم" لکھا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ نام کہاں سے معلوم ہوا۔ جن تین قدیمی تذکروں میں فضائل

Scanned by CamScanner

علی خاں کا ذکر ہے ان میں سے کسی نے مثنوی کا نام نہیں دیا۔

میر حسن کے باب کے آخری صفحے پر جالبی نے "سحرالبیان" کے ترجموں، اس کی اردو نثر، نیز ڈراموں کی فہرست اچھی تیار کی ہے (ص ۸۷۱)۔ اس باب کے بعد حوالوں کی جو فہرست ہے اس میں میری کتاب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے ناشر کا نام سہواً انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۹ء لکھا ہے (حوالہ نمبر ۵۸ ص ۸۷۴)۔ اسے دراصل انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔ پاکستان کی انجمن نے اسی سال میں میری دوسری کتاب "اردو کی نثری داستانیں" کا دوسرا ایڈیشن جاری کیا۔ جالبی صاحب کو دونوں میں التباس ہو گیا۔

اس فصل کا آٹھواں باب دوسرے شعرا سے متعلق ہے۔ ان میں سب سے پہلے جعفر علی حسرت کا ذکر ہے۔ ان کی وفات پر ان کے شاگرد جرأت نے ص ۸۹۰ (آخری سطر) کے مطابق دو رباعیاں اور ص ۸۸۱ کے فٹ نوٹ کے مطابق دو قطعے لکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرأت نے سنہ وفات کے لیے ایک رباعی اور ایک قطعہ لکھا تھا۔ حسرت کی مثنوی "طوطی نامہ" کے بارے میں ڈاکٹر جالبی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی کلیات میں شامل نہ ہو سکی (ص ۸۸۴)۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اس مثنوی کی تدوین کی ہے۔ انھیں یہ کلیات حسرت مخزونۂ جلسۂ تہذیب لائبریری لکھنؤ میں ملی (۱۵)۔

محمدی بیدار کی تحقیق خوب ہے، حالات معلومات افروز ہیں۔ جالبی نے واضح کیا کہ ان کا نام شیخ عماد الدین تھا، گھر میں محمدی کے نام سے پکارے جاتے تھے اور بیدار تخلص تھا۔ اردو کی تاریخوں میں انھیں شیخ کے بجائے میر محمدی بیدار لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بیر بھائی میر محمدی مائل کی مماثلت پر انھیں بھی میر سمجھ لیا گیا۔

قدرت اللہ قدرت کی وفات کا سنہ "۱۲۰۴ھ کے بعد یا شاید ۱۲۰۵ھ" لکھتے ہیں (ص ۹۰۹) مالک رام نے ناسخ کے تذکرے "سخنِ شعرا"، ص ۳۸۳ کے حوالے سے ۱۲۰۵ھ لکھا ہے اور ناسخ کا مادۂ تاریخ "داخلِ گلشنِ نعیم" بھی لکھا ہے۔ یوپی اردو اکادمی نے "سخنِ شعرا" کا جو عکسی ایڈیشن شائع کیا ہے اس میں تاریخ ۱۲۰۵ھ دی ہے لیکن حیرت ہے کہ مادۂ تاریخ نہیں۔ مالک رام نے کہیں اور سے لیا ہوگا۔

اس باب میں جن متفرق شعرا کا بیان ہے میری رائے میں ان میں سے بیشتر آزادانہ طور پر تفصیلی بیان کے سزاوار نہیں، مثلاً قدرت اللہ قدرت، بہبت قلی خاں حسرت، یحییٰ حضور، عشق، فدوی، جوشش، محمد عابد دل وغیرہ۔ اس باب کے بیشتر شعرا بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہار کے اردو ادب کی علاقائی تاریخ لکھی جائے تو ان سب کو اعزاز کے ساتھ شامل

Scanned by CamScanner

کیا جا سکتا ہے لیکن برِ صغیر کے پورے اردو ادب کی تاریخ میں یہ علاحدہ نمایاں بیان کے مستحق نہیں۔ دوسری طرف اس باب کے تقریباً آخر میں راسخ عظیم آبادی کا مفصل ذکر ہے۔ اپنی اہمیت کے لحاظ سے انھیں "چند اور شعرا" کے ضمن میں نہیں، بلکہ علاحدہ سے درج کرنا چاہیے تھا۔ اس باب میں لینا تھا تو ان کا بیان باب کے ابتدائی حصے میں مناسب ہوتا۔ ص ۷۹۴ پر ان کے رسالۂ عروض کی اطلاع دی ہے۔ میں اس سے واقف نہ تھا۔

فصلِ ششم کا موضوع نثر نگار ہیں۔ اس فصل میں اردو نثر کو موضوعات کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: تنقیدی، مذہبی، تاریخی اور افسانوی۔ یہ تقسیم مناسب ہے۔ ہم لوگ عام طور سے "کربل کتھا" اور داستانوں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، بقیہ موضوعات پر توجہ نہیں کرتے۔ اس فصل میں تنقیدی نثر اور مذہبی نثر کے ابواب بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر میں سید برکت اللہ عشقی مارہروی کی "عوارفِ ہندی" کا ذکر ہے جس میں سے جالبی نے ۴۷ اردو کہاوتیں درج کی ہیں۔ اسی طرح دوسرے شعرا کے یہاں سے تنقیدی نثر کے نمونے دیے ہیں۔ ان میں طپش کی "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان"، دیوان عزلت کا اردو نثری دیباچہ، انصاف حیدر آبادی م ۱۱۹۵ھ کے رسائل کا دیباچہ، باقر آگاہ کے نثری دیباچے اور غلام علی عشرت کے "پدماوت" کے دیباچے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی تنقیدی نثر کے ان نمونوں کو تلاش کر کے یک جا کر دینا نہایت قابلِ قدر ہے۔ یہ اور کسی تاریخ ادب میں نہیں پائے جاتے۔ ص ۱۰۱۰ پر باقر آگاہ کو ایلوری لکھا ہے۔ یہ مشہور شہر ویلور کے رہنے والے تھے اس لیے صحیح ویلوری ہے، جیسا کہ خود جالبی نے اشاریے میں ص ۱۱۸۶ پر اندراج کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ کی جلد اول و جلد دوم میں باقر آگاہ کی ولادت و وفات کی تاریخیں کئی جگہ لکھی ہیں۔ مالک رام نے اپنے تذکرے میں اور باقر آگاہ کے ایک محقق علیم صبا نویدی نے اپنی کتاب "مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر" (مدراس، ۱۹۹۴ء) میں بھی لکھی ہیں۔ تقابلی مطالعے کے لیے ان اندراجات کی فہرست یہ ہے:

کتاب	آگاہ کی ولادت	آگاہ کی وفات
جالبی: جلد اول ص ۷۷۳، ۵۲۳	۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء	۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء
جالبی: جلد اول ص ۴۹۳		۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء
جالبی: جلد دوم ص ۹۷۰، ۹۸۴		۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵-۶ء
جالبی: جلد دوم ص ۱۰۱۰	۱۱۲۰ھ/ ۱۷۴۵ء	۱۱۵۸ھ/ ۱۸۰۵-۶ء

Scanned by CamScanner

مالک رام: "تذکرہ ۱۴ رجب ۱۱۵۸ھ / ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ / ۵ مارچ ۱۸۰۶ء
ماہ و سال" ص ۷۲ یکم اگست ۱۷۴۵ء مادۂ تاریخ "کمالاتِ فرد العصر"
علیم صبا نویدی: "مولانا باقر آگاہ" ۱۴ رجب ۱۱۵۸ھ (ص ۳۶) ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ (ص ۵۴)

جالبی کی جلد دوم ص ۱۰۱۰ کی تاریخیں صریحاً غلط ہیں کیونکہ ۱۱۲۰ھ برابر ہے ۹-۱۷۰۸ء کے، نہ کہ ۱۷۴۵ء کے۔ ۱۱۵۸ھ برابر ہے ۱۷۴۵ء کے، نہ کہ ۶-۱۸۰۵ء کے۔ ظاہرا جالبی نے یہاں عیسوی سنینِ ولادت و وفات صحیح لکھے ہیں۔ سنہ ہجری میں وہ ولادت و وفات کے سنین کو آپس میں اول بدل گئے ہیں۔ سنہ ولادت ۱۱۲۰ھ دراصل سنہ وفات ۱۲۲۰ھ ہے۔ ہجری سنہ وفات ۱۱۵۸ھ دراصل سنہ ولادت ہے۔ جلد اول میں ۱۱۵۰ھ سنہ ولادت صحیح نہیں۔ صحیح تاریخیں وہی ہیں جو مالک رام نے لکھی ہیں۔ آگاہ کی نثر کی تفصیل خوب ہے خصوصاً ان کے آٹھ رسالوں کی تفصیل مع سنین (ص ۱۰۱۲)۔

مذہبی نثر کے سلسلے میں "کربل کتھا" پر بحث کرتے ہوئے ص ۱۰۲۸ کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں:

> سالِ تصنیف اور سالِ نظرِ ثانی کے سلسلے میں تفصیلی بحث حواشی میں حاشیہ نمبر ۶۴ کے ذیل میں دیکھیے۔

دراصل یہ بحث حاشیہ ۶۳ میں ہے، ۶۴ میں نہیں۔ جالبی باب کے آخر کے حواشی کو بالعموم محض مآخذ کے حوالے کے لیے استعمال کرتے ہیں، تبصراتی نوٹ فٹ نوٹ میں دیتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حاشیہ نمبر ۶۳ کا مواد متن میں "کربل کتھا" پر تسوید کے بعد دستیاب ہوا ہو اور بدرجۂ مجبوری اسے متن کے ساتھ فٹ نوٹ میں نہ دے کر آخر کے حاشیے میں دینا پڑا ہو۔ سوال یہ ہے کہ کتاب کی تصنیف یا نظرِ ثانی کے سال کو فٹ نوٹ یا اخیری حاشیے میں کیوں موضوعِ بحث بنایا جائے، متن میں کیوں نہیں۔ پھر وہی نکتہ کہ جالبی کے ذہن میں متن اور حاشیے کی تفریق واضح نہیں۔ بہرحال بحث پُرمغز ہے۔

"کربل کتھا" کے بعد حیدرآباد کے شاہ معین الدین حسین علی کے نثری رسالے "فتوح العین" کا بیان ہے جو ظاہرا ۷۵-۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء کی تصنیف ہے (ص ۴۳-۱۰۴۱)۔ اگر یہ شمالی ہند کی نثر ہوتی تو اس صدی میں بیش بہا دریافت ہوتی۔ دکن کے علاقے کے لحاظ سے اسے قدیم نہیں کہا جا سکتا لیکن چونکہ اس کی زبان شمالی ہند جیسی ہے اس لیے یہ غنیمت ہے۔ اس باب میں دوسری تفسیروں اور تراجمِ قرآن کا بیان قابلِ اطمینان ہے۔ جالبی نے شاہ مراد سنبھلی کی "تفسیر مرادیہ" کو پہلی اردو تفسیر کہا ہے (ص ۱۰۴۴)۔ اس سے پہلے دکن اور گجرات میں قرآن کے بعض پاروں کی تفسیریں لکھی جا

Scanned by CamScanner

چکی تھیں، اس لیے "تفسیرِ مرادیہ" کو پہلی تفسیر کہنا محلِ نظر ہے۔ اس کی صحیح تاریخِ تکمیل خود جالبی نے ۲۴ محرم ۱۱۸۵ھ لکھی ہے۔ پھر ص ۱۰۴۳ اور ص ۱۰۴۴ پر ہجری سنہ کے متوازی دو عیسوی سنین ۷۲-۱۷۷۱ء دینے کی کیا ضرورت تھی۔ محض ۱۷۷۱ء کافی اور صحیح ہوتا۔

جالبی نے مفید اطلاع دی کہ شاہ رفیع الدین نے ترجمۂ قرآن کے علاوہ ایک "تفسیرِ رفیعی" بھی لکھی تھی جسے ان کے ایک شاگرد نے درس کے طور پر لکھا۔

جالبی کا خیال ہے:

"تفسیرِ رفیعی" شاہ رفیع الدین کی وہ اردو تفسیر ہے جس کا ذکر بہت کم ہوا ہے۔ (ص ۱۰۵۰)

ڈاکٹر سید حمید شطاری کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفسیر" ۱۹۸۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس میں اس تفسیر کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے (ص ۱۷۹)۔ واضح ہو کہ شاہ عبدالقادر نے بھی ترجمۂ قرآن کے علاوہ اس کا حاشیہ "موضح القرآن" کے نام سے لکھا (شطاری: ص ۱۴۶)۔ مولوی عبدالحق کی رائے میں چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کا ترجمہ شاہ رفیع الدین کے ترجمے پر مقدم ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اول الذکر نے اپنے ترجمے میں والد کے فارسی ترجمے کا ذکر کیا ہے لیکن شاہ رفیع کے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کیا ("قدیم اردو"، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۳-۱۳۲)

شطاری نے مولوی عبدالحق کی رائے درج کر دی ہے لیکن اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کیا (ص ۱۴۳)۔ جالبی نے یہ نکتہ افشا کیا کہ اگر شاہ عبدالقادر نے شاہ رفیع کے ترجمے کا ذکر نہیں کیا تو شاہ رفیع نے بھی شاہ قادر کے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ دونوں بھائیوں نے صرف والد کے فارسی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ جالبی کی دلیل صحیح ہو سکتی ہے کہ شاہ رفیع کا ترجمہ مقدم ہے، شاہ قادر کا موخر (ص ۱۰۵۳)۔ دو بھائیوں میں ترجمۂ قرآن کے سلسلے میں معاصرانہ چشمک عجیب معلوم ہوتی ہے۔

جالبی نے حکیم محمد شریف خاں (م ۱۲۱۶ھ/ ۲-۱۸۰۱ء) کے ترجمے و تفسیر کا ذکر مولوی عبدالحق کے حوالے سے کیا ہے۔ مولوی صاحب نے حکیم شریف خاں کا سنہ وفات ۱۲۱۶ھ لکھا ہے ("قدیم اردو"، ص ۱۳۶)۔ جالبی بھی یہی سنہ لکھ کر حاشیے میں کہتے ہیں کہ یہ سنہ کتبۂ مزار پر کندہ ہے (ص ۱۰۷۰، حاشیہ ۴) لیکن یہ دعویٰ درست نہیں، شطاری نے پورا کتبہ درج کیا ہے جس میں سنہ وفات "دخل الجنۃ بلاحساب" سنہ ۱۲۲۲ھ لکھا ہے۔ اس مادے سے واقعی ۱۲۲۲ھ نکلتا ہے۔ "تذکرۂ علمائے ہند" میں اس کتبے میں سنہ ۱۲۱۶ھ لکھا ہے جو

Scanned by CamScanner

کتابت کی غلطی ہونی چاہیے (شطاری، ص ۷-۲۰۶)۔ شریف خاں کے سنہ وفات کو دیکھتے ہوئے شبہ ہوتا تھا کہ ان کا ترجمہ شاہ صاحبان کے تراجم سے بھی قدیم تر تو نہیں؟

جالبی نے صرف اسلامی مذہبی کتابوں پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے مستشرقین کی مسیحی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ضمناً ان کی لغات و قواعد کی کتابوں کی تفصیل بھی دی ہے۔ مستشرقین کا یہ چند صفحات کا بیان خوب ہے۔ اس سلسلے میں لفظ "ہندوستانی" کے استعمال کی تحقیق کرتے ہیں کہ زبان کے معنی میں اس لفظ کا قدیم ترین استعمال ٹیری (Terry) کی ۱۶۵۵ء کی کتاب میں ملتا ہے (ص ۱۰۶۳)۔ آخر میں مول رام کے ترجمہ بھگوت گیتا (۱۷۸۱ء) کا ذکر کرتے ہیں جس کی اکھڑی اکھڑی نثر میں ہندی اور ہندو اثرات کثرت سے ہیں (ص ۷-۱۰۶۶)۔

تاریخی نثر میں سید رستم علی بجنوری کی کتاب "قصہ و احوال روہیلہ" (۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء) کا بیان کرتے ہیں۔ اعتراف کرتے ہیں کہ اس کا پہلا تعارف ڈاکٹر نجم الاسلام نے "نقوش" شمارہ ۱۰۵، ۱۹۶۶ء میں کرایا تھا۔ میں ضلع بجنور کا رہنے والا ہوں لیکن اس کتاب سے واقفیت نہیں رکھتا تھا۔

جلد کا آخری باب "افسانوی تصانیف اور اسالیب" بھی خوب سے خوب تر ہے۔ اس میں ص ۸۶-۱۰۸۴ پر ڈاکٹر جالبی نے "قصۂ مہر افروز و دلبر" کے مصنف عیسوی خاں بہادر کے حالات جس تفصیل سے لکھے ہیں ان سے میں بھی واقف نہ تھا۔ جالبی صاحب کا ماخذ میرے بڑے بھائی کی کتاب "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" (الہ آباد، ۱۹۷۸ء) نیز ان کا ایک مضمون "قصۂ مہر افروز و دل بر کے مصنف عیسوی خاں بہادر کی شخصیت" ("ہماری زبان"، ۲۲ مارچ ۱۹۷۹ء) ہے۔ "ہماری زبان" میرے پاس آتا ہے لیکن ۲۵ مارچ ۷۹ء کو میں الہ آباد کی ملازمت چھوڑ کر حیدر آباد کے لیے روانہ ہوا تھا اس چکر میں ۲۲ مارچ کا شمارہ مجھے نہ مل سکا اور آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ اسی وجہ سے جالبی صاحب کے بیان سے مجھے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

ص ۷-۱۰۹۶: "نوطرزِ مرصع" کے ایک نسخے، مخزونۂ شعبۂ اردو، لکھنؤ یونی ورسٹی، کے ترقیمے میں لکھا ہے کہ تحسین نے "نوطرزِ مرصع" کا ایک ہی قصہ لکھا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا، باقی ماندہ تین قصے کسی اور نے لکھے۔ نورالحسن ہاشمی نے بھی اپنی مرتبہ "نوطرزِ مرصع" کے مقدمے میں اس پر توجہ دلائی ہے لیکن اس کو اہمیت نہیں دی (الہ آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۱۲)۔ جالبی نے اس پر سنجیدگی سے بحث کی ہے۔ انھوں نے "نوطرزِ مرصع" کے ایسے کئی نسخوں کی نشان دہی کی جن میں محض ایک ہی قصہ ملتا ہے۔ انھوں نے "وقائع عبدالقادر خانی" کے

Scanned by CamScanner

ایک بیان کو بھی درج کیا جس میں دو متضاد بیانات ہیں۔ ایک کے مطابق "نوطرزِ مرصع" تحسین کی تصنیف ہے، دوسرے کے مطابق اس کا نثری حصہ کسی علی الدین خاں کا لکھا ہوا ہے۔

حق یہ ہے کہ "نوطرزِ مرصع" میں چار نہیں، پانچ قصے ہیں اور سب کا اسلوبِ تحریر یک ساں ہے، یعنی یہ ایک ہی مصنف کے قلم سے نکلے ہیں۔

ص۱۱۰۹: "نوآئینِ ہندی" کے مصنف مہرچند کھتری پر پہلی بار میں نے تفصیل سے لکھا تھا، لیکن میں ان کے حالات سے واقف نہ تھا۔ جالبی نے "تذکرۂ بے جگر" سے لے کر مفصل حالات فراہم کیے۔ کتاب کی جلد اول میں فارسی اقتباسات اصل فارسی میں دیے ہیں، لیکن جلد دوم کے دونوں حصوں میں ہر جگہ متن میں ان کا محض اردو ترجمہ دیا ہے جب کہ باب کے آخر میں اصل فارسی عبارت دی ہے۔ یہ طریقہ مناسب نہیں۔ یہ تاریخ تحقیقی کتاب ہے۔ اس کے قارئین سے توقع ہے کہ وہ فارسی میں اتنی شُدبُد تو رکھتے ہی ہوں گے کہ فارسی عبارت سمجھ سکیں۔ متن میں اصل فارسی ہی دینی چاہیے تھی۔ ضرورت سمجھتے تو بعد میں ان کا اردو ترجمہ اس کے فوراً نیچے دیا جا سکتا تھا۔

دونوں جلدوں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان کے آخر میں کتابیات نہیں دی۔ حوالے اور اشاریے کتابیات کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ کتابیات سے یہ بھی نشان دہی ہو جاتی ہے کہ مصنف نے کون سا ایڈیشن استعمال کیا ہے۔

آخر میں اس تاریخ کے بارے میں اپنا مجموعی تأثر بیان کرتا ہوں۔

یہ ایک فردِ واحد کا کارنامہ ہے اور اس میں شبہہ نہیں کہ اس وسیع و عریض کام کو اس قدر عُمق کے ساتھ کوئی ادارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سامنے شعبۂ اردو علی گڑھ یونی ورسٹی اور ترقیِ اردو بیورو حکومتِ ہند کی مثالیں ہیں جو جلد اول سے آگے نہیں بڑھ سکے؛ پنجاب یونی ورسٹی لاہور ضرور ایک مکمل تاریخ شائع کر سکی، لیکن جالبی صاحب کا کام اس سے کس قدر آگے بڑھا ہوا ہے، اسے اہلِ نظر پہچان سکتے ہیں۔ جالبی نے جس کثرت سے اصل ادبی و غیر ادبی مآخذ کو دیکھا ہے، اس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ ان کا یہ کارنامہ خراجِ احترام کا طالب ہے، اس تاریخ میں معلومات کے انبار لگے ہیں۔ کوئی محقق ایسا نہ ہوگا جسے اس کے مطالعے سے متعدد نئی معلومات نہ ملیں۔ کوئی نقاد ایسا نہ ہوگا جسے اس کے تنقیدی بیانات سے رہبری و روشنی نہ ملے۔

کتاب میں خوبیوں کے مقابلے میں خامیاں بہت کم ہیں۔ یاد رہے کہ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ جو شخص اتنے بڑے دور اور بڑے علاقے کے اتنے وسیع موضوع پر قلم اٹھائے گا

Scanned by CamScanner

اس سے کہیں نہ کہیں، بلکہ کئی جگہ، تسامح تو ہو گا ہی۔ کوئی شبہہ نہیں کہ یہ "تاریخ ادب اردو" اب تک کی بہترین تاریخ ہے۔ کوئی توقع نہیں کہ عرصے تک اس سے بہتر، بلکہ اس کی ہم پلہ تاریخ لکھی جا سکے گی۔ ہم انتظار کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر جالبی اپنے شاہکار کی بقیہ جلدیں بھی اسی جامع اور معتبر انداز میں پوری کر لیں۔

حواشی

(۱) سید حسن عسکری: "حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور ان کا ہندی کلام"، "معاصر"، پٹنہ، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۵۳

(۲) ظہیر الدین مدنی: "گجری مثنویاں"، گجرات اردو اکادی، گاندھی نگر، گجرات، ۱۹۹۰ء، ص ۳۴

(۳) "شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کی نثری تصانیف"، "نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۸۶ء

(۴) "اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور اور گولکنڈہ میں"، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۱۹

(۵) سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱۴

(۶) "نورس"، مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، ص ۶۷، بحوالہ ڈاکٹر پرکاش مونس: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، ص ۲۲۰

(۷) زور: "اردو شہ پارے"، ص ۴۹۔ "دکنی ادب کی تاریخ"، حیدر آباد، اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۳۸۔ "تذکرۂ اردو مخطوطات"، جلد سوم، ص ۵-۳۰۲-۳۔ نصیر الدین ہاشمی: علی گڑھ تاریخ، ص ۲۸۳۔ "دکن میں اردو" ص ۱۹۸

(۸) ڈاکٹر زور: علی گڑھ تاریخ، ص ۴۰۰۔ ڈاکٹر الف د نسیم: تاریخ ادبیاتِ مسلمانان، چھٹی جلد، ص ۲۶۶

(۹) "ولی گجراتی کا نام اور اس کے اختلافات"، "اردو نامہ"، شمارہ ۲۵، ستمبر ۱۹۶۶ء، ص ۴۱

(۱۰) شیرانی: "تاریخِ غریبی ۷۰- ۱۱۶۴ھ" اورینٹل کالج میگزین نومبر ۳۸ء، فروری ۳۹ء۔ بازطباعت مقالات شیرانی جلد دوم ص ۲۵۰

(۱۱) شیرانی: "دائرہ کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ"، "اورینٹل کالج میگزین" نومبر ۱۹۴۰ء و فروری ۱۹۴۱ء۔ بازطباعت: "مقالاتِ شیرانی"، جلد دوم، ص ۱۹۸

Scanned by CamScanner

(۱۲) مجھے یہ معلومات جموں یونی ورسٹی کے پروفیسر اردو ڈاکٹر عابد پیشاوری نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء میں بہم پہنچائیں۔

(۱۳) نثار احمد فاروقی: "مثنویاتِ قائم چاندپوری"، مشمولہ "دراسات"، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۶۷-۶۳

(۱۴) "میر حسن اور ان کا زمانہ"، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۰۲

(۱۵) "طوطی نامہ"، مقدمہ مرتب ص ۶، لکھنؤ، سنہ طبع ندارد، لیکن ۱۹۶۱ء میں طبع۔

Scanned by CamScanner

تیئسواں باب

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین: تاریخِ ادبیاتِ اردو

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین کی مادری زبان بنگالی ہے۔ وہ بنگلہ دیش کے ضلع میمن سنگھ کے رہنے والے ہیں۔ ڈھاکا یونی ورسٹی سے ایم۔اے اردو کیا۔ اس کے بعد اقبال اکیڈیمی کراچی سے وظیفہ ملنے پر مولوی عبدالحق کی نگرانی میں "اسلامی تصوف اور اقبال" کے موضوع پر ریسرچ شروع کی۔ بعد میں یہ کام ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رہبری میں مکمل ہوا اور اس پر ۱۹۵۹ء میں کراچی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ کراچی یونی ورسٹی کی اردو میں پہلی پی۔ایچ۔ڈی ہے، نیز وہ پہلے مشرقی پاکستانی ہیں جنھوں نے اردو میں تحقیقی کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو ادب کی ایک مبسوط تاریخ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہرا یہ کام ۱۹۶۹ء کے اوائل میں پورا ہوا۔ اس پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو تعارف لکھا۔ شادانی اطلاع دیتے ہیں کہ نورالدین کسی علمی ادارے سے وابستہ نہیں بلکہ مشرقی پاکستان صنعتی کارپوریشن میں ایک معزز عہدے پر فائز ہیں۔

شادانی مزید لکھتے ہیں کہ رام بابو سکسینہ کی ہسٹری آف اردو لٹریچر پرانی ہو گئی۔ اس کے بعد ادبیاتِ اردو کی چند مختصر تاریخیں وجود میں آئیں لیکن کوئی مبسوط تاریخ نہ تھی جو ادب کے تمام گوشوں اور ادبی تحریکوں پر حاوی ہو۔ ڈاکٹر صادق کی انگریزی تاریخ ۱۹۶۴ء میں آئی لیکن وہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس لیے ڈاکٹر نورالدین نے ۱۴۰۰ صفحات پر مشتمل ایک مفصل اور مکمل تاریخ لکھ ڈالی۔ کتاب پر مؤلف کے دیباچے کی تاریخ اور مقام ڈھاکا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۹ء درج ہے۔ لکھتے ہیں ڈاکٹر کلیم سہسرامی (راج شاہی یونی ورسٹی) اور افسانہ نویس شام بارک پوری کے اصرار پر انھوں نے کام پر نظرِ ثانی کی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی لاہور سے ۱۹۹۷ء میں دو جلدوں میں شائع کیا۔ پہلی جلد اردو نثر ہے جو ص ۳۷۹ پر ختم ہوتی ہے۔ صفحات کا سلسلہ دوسری جلد اردو نظم میں چلا جاتا ہے جو ص۱۰۶۶ پر ختم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ان سے پہلے کی ادبی تاریخوں میں کیڑے نکالے ہیں لیکن مجھے نورالدین کی تاریخ سے کوئی تحقیقی اضافہ نظر نہیں آیا۔ انھوں

Scanned by CamScanner

سے ہر ادیب پر لکھنے کے لیے کسی ایک آدھ پرانی تاریخ پر تکیہ کرنا کافی سمجھا، اسے تحقیقی نظر سے پرکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ادبی تاریخ نگار کے سامنے سب سے مشکل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ادب کے دَور کیوں کر قائم کیے جائیں ادیبوں کی زمرہ بندی کس طرح کی جائے۔ اُردو ادب مختلف علاقوں میں نشوونما پاتا ہے۔ اس کے بیان میں ذیل کے متنوع تقاضوں سے کس طرح جُوجھا جائے:

تاریخی ادوار، نظم و نثر، علاقے، اصناف، تحریکیں

کیا نظم اور نثر کا بیان الگ الگ کیا جائے یا دور کو ترجیح دی جائے۔ کیا قدیم دور میں گجرات، گولکنڈہ، بیجاپور، اورنگ آباد اور شمالی ہند کا علاحدہ علاحدہ بیان کیا جائے۔ شمالی ہند میں آ کر فورٹ ولیم کالج، دہلی اور لکھنؤ کے دبستان، داستان، علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، ناول، افسانہ، ڈراما، جدید شاعری وغیرہ سے کیوں کر نپٹا جائے۔ ساتھ ہی تاریخی تسلسل میں زیادہ فرق نہ آنے پا ئے۔ میری رائے میں نظم و نثر کا بیان بالکل الگ الگ نہ کیا جائے۔ مندرجہ بالا جملہ مطالبات کو ملا جُلا کر ان کے بیچ مفاہمت کرنی ہوگی۔

وہ لکھتے ہیں:

"کتاب میں ابواب کی ترتیب میں زبان کی نسبت مکان کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔" (ص ۱۴)

مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ زبان و ادب کے ارتقا کو پیش کرنے کے لیے زمانے کی زیادہ اہمیت ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

"اردو ادب کے ہر مرکز، اسکول اور دبستان کے ادیبوں کی ترتیب بالعموم سنہ وفات کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ اس لیے بعض جگہ بڑی عمر کے ادیب کا ذکر چھوٹی عمر کے ادیب کے بعد ہوا ہے لیکن اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔"

انھوں نے ایسا اس لیے کیا ہے کہ ان کے استاد ابواللیث صدیقی نے بھی "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں یہی اصول برتا تھا جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں۔ فرض کیجیے۔ ایک ادیب ۱۸۰۰ء سے ۱۸۹۹ء تک زندہ رہتا ہے اور اس کا پوتا ۱۸۵۰ء سے ۱۸۹۰ء تک، تو پوتے کا بیان دادا سے پہلے کیا جائے گا حالانکہ ذہنی ارتقا اور ادبی نظریوں کے لحاظ سے دادا بہت قدیم اور پوتا بہت جدید ہوگا۔ نورالدین کو یقین کے سلسلے میں اس الجھن کا احساس ہے۔ لکھتے ہیں:

"مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے، اس لحاظ سے ان کا ذکر مظہر کے

Scanned by CamScanner

بعد آنا چاہیے تھا لیکن چونکہ ان کی وفات مظہر سے پہلے ہوئی، اس لیے تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔"

(ص ۵۰۶)

تاریخی ترتیب کو جہاں تک قائم رکھا جا سکے بہتر ہے۔ مولف نے کچھ ایسے تقسیم کی ہے کہ نثر کے حصے میں رجب علی بیگ سرور اور غالب پہلے آتے ہیں اور میر امن اور فورٹ ولیم کے دوسرے نثر نگار بعد میں۔ اصناف کے معاملے میں ناول کے بعد ڈراما اور پھر افسانہ ہے حالانکہ ناول اور افسانے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نظم کے حصے میں شعرا کی علاقائی تقسیم اور بھی حیرت انگیز ہے۔ امیر، جلال اور تسلیم کو ساتویں باب "اردو نظم دہلی میں" کے تحت درج کیا ہے۔ ان کے نزدیک ان شعرا کے یہاں دہلوی رنگ پایا جاتا ہے نہ کہ لکھنوی۔ اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ کہنے کو تو آتش، میر خلیق اور میر انیس کے یہاں بھی دہلوی رنگ کہا جاتا ہے۔ نورالدین انھیں بھی دہلی کے تحت لا سکتے تھے۔ آٹھویں باب "اردو نظم لکھنؤ میں" کے تحت سب سے پہلے جعفر علی حسرت، انشا، رنگین اور مصحفی کا ذکر ہے۔ کیا ان شعرا کے یہاں دہلویت مفقود ہے؟۔ ابواللیث صدیقی نے "لکھنؤ کا دبستان شاعری" میں شعرا کے بیان میں سب سے پہلے "مہاجرین شعرائے دہلی" کا عنوان قائم کر کے سودا، میر حسن، میر خلیق، جعفر علی حسرت، میر سوز، میر، جرأت، انشا، مصحفی اور رنگین وغیرہ کا بیان کیا۔ اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہاں زور ہجرت پر ہے، شعری رجحانات پر نہیں۔ غرضیکہ ان کی دہلی اور لکھنؤ کی تقسیم ذہن میں خلفشار اور التباس پیدا کرتی ہے۔

بہرحال اب جائزہ لیتا ہوں۔ میں تصحیح پر زیادہ توجہ کروں گا۔ سنین کو پرکھنے میں میں نے دورِ قدیم پر زیادہ توجہ کی ہے۔ دورِ جدید کے اندراجات کو کم پرکھا ہے۔

حصہ اول اردو نثر:

مقدمہ حصہ اوّل میں لکھتے ہیں کہ اولیں نثر نگار عین الدین گنج العلم تھے جنھوں نے قدیم اردو میں چند مختصر رسالے مرتب کیے تھے (ص ۱۹)۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ ان کا کوئی رسالہ کسی نے نہیں دیکھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ باب اوّل میں کہتے ہیں:

"جب تک ان کا کوئی رسالہ منظرِ عام پر نہ آئے۔ اس وقت تک محض روایت کی بنا پر اتنی بڑی بات کہہ دینا حقیقت سے بعید ہے۔" (ص ۳۱)

محترم! پھر مقدمے میں غیر مشروط پر پر اتنی بڑی بات کیوں کہہ دی تھی؟۔ خواجہ

Scanned by CamScanner

بندہ نواز ـ کے رسالوں کو انھیں کی تصنیف ماننے پر اصرار کرتے ہیں:

"اگر یہ کتاب (معراج العاشقین) خواجہ صاحب کی تصنیف نہیں ہے تو ان کے کسی ہم عصر یا اس سے قریب زمانے کی تصنیف ضرور ہے... موجودہ تحقیقات کی رو سے اسے خواجہ صاحب کی تصنیف مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" (ص ۳۲)

وہ کون سی موجودہ تحقیق ہے؟ بہر حال اب یہ عام طور سے مان لیا گیا ہے کہ خواجہ صاحب نے اردو نثر میں کچھ نہیں لکھا۔ ان کے ملفوظات جوامع الکلم اردو میں نہیں اس لیے اکبر حسینی کے سلسلے میں ان کے تذکرے کا جواز نہیں۔ عبداللہ حسینی کے ترجمہ نشاط العشق کا ذکر کرتے ہیں (ص ۳۳)۔ اب یہ ناپید ہے۔ اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں ایک کتاب "نشاط العشق، شرح غوثیہ" کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے مصنف یا مترجم کا نام نہیں لیا۔ معلوم نہیں کس ستم ظریف نے اس کے ساتھ عبداللہ حسینی کا نام چپکا دیا۔

مؤلف نے شاہ میراں جی شمس العشاق کے جن رسالوں کا ص ۳۴۔۳۳ پر ذکر کیا ہے، ان کے انتساب کی غلطی کی طرف میں پچھلی تاریخوں کے جائزے میں بحث کر چکا ہوں۔ مؤلف نے ایک نثری رسالے ارشاد نامہ کا ذکر کیا ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں (ص ۳۷)۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے مطابق یہ برہان الدین جانم کی تصنیف ہے (علی گڑھ تاریخ ص ۴۲۔ ۲۴۰)

وجہی کی تاج الحقائق کے لیے لکھتے ہیں "ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کتاب کو مرتب کر کے سلسلۂ یوسفیہ سے چھپوا دیا ہے" (ص ۴۲)

لیکن علی گڑھ تاریخ میں خود ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

"میں نے اس کو مرتب کر کے سلسلۂ یوسفیہ کی طرف سے چھپوا دیا ہے، مگر یہ کتاب دفتری تصدیق کے باعث اب تک نہیں چھپی۔" (ص ۳۷۸)

دونوں جملے متضاد ہیں اور ہاں نہیں کی اچھی مثال۔ انھوں نے کتاب چھپنے کو دی ہوگی لیکن چھپی نہیں۔ دکنی نثر کے اس باب میں آخری مصنف ذکا حسن بیگ ہے جو دہلی کا رہنے والا تھا لیکن بعد میں گولکنڈے میں جا کر بس گیا۔ اس نے شمالی ہند کے فضلی سے ۳۰ سال قبل ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء میں اسی نام سے اسی موضوع پر دکنی میں کربل کتھا لکھی (ص ۴۳)۔ جناب مؤلف نے اپنے ماخذ کا کوئی اتا پتا نہیں دیا مجھے کسی کتاب میں ان کا ذکر نہ ملا۔ نمونے

Scanned by CamScanner

کے پارے کی زبان دکنی ہے جو شمالی ہند کے کسی باشندے سے متوقع نہیں۔

باب دوم اردو نثر شمالی ہند میں:

اس میں سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالے کو تسلیم کرکے کہتے ہیں:

"یہ اردو نثر کی اولین تصنیف ہے۔" (ص ۴۸)

لیکن وہ یہ غور نہیں کرتے کہ اس رسالے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایمان بالغیب لانے میں وہ کافی تیز ہیں۔ فضلی کے لیے لکھتے ہیں کہ "مولانا احسن مارہروی اور مولانا حامد حسن قادری کی رائے ہے کہ ان کا تعلق اصل میں دکن سے تھا مگر وہاں رہے نہیں، شمالی ہند میں آکر بس گئے تھے۔" (ص ۴۸)

دونوں مولاناؤں پر یہ اتہام لگانا صحیح نہیں۔ احسن نے مدلل لکھا ہے کہ فضلی دکنی نہیں تھے (نمونۂ منثورات ص ۱۷)۔ قادری نے بھی اس فیصلے کی تائید کی ہے (داستانِ تاریخ اردو، طبع دوم آگرہ ۱۹۵۷ء، ص ۵۰)۔ مؤلف لکھتے ہیں کہ فضلی کی کربل کتھا دلی یونی ورسٹی کی طرف سے شائع ہو گئی ہے (ص ۴۹)۔ حقیقت یہ ہے کہ شعبۂ اردو دلی یونی ورسٹی کی طرف سے یہ کتاب چھپی ضرور لیکن شائع نہیں ہوئی۔ مالک رام و مختار الدین احمد نے شائع کی۔ شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کی تاریخ ۱۲۰۳ھ/۱۷۹۱ء درج کی ہے (ص ۵۱) انھیں یہ تاریخ کہاں سے معلوم ہوئی؟ اور کسی کو ترجمۂ رفیعی کی تاریخ معلوم نہیں۔ تحسین کی نوطرزِ مرصع کے لیے کہتے ہیں کہ اسکی تکمیل آصف الدولہ کے دربار میں ۱۷۹۷ء سے قبل عمل میں آئی (ص ۵۲) خیال ہے کہ یہ شجاع الدولہ کے عہد میں ۱۷۷۵ء میں مکمل ہو گئی ہوگی۔ ان کی وفات کی وجہ سے اسی سال میں آصف الدولہ کو پیش کر دی ہوگی۔

لکھتے ہیں میر محمد حسین کلیم دہلوی نے فصوص الحکم کا ترجمہ نثر کیا جس کا صرف ایک فقرہ ملتا ہے۔ حوالہ ہے میر حسن کے تذکرے کا (ص ۵۳)۔ ظاہر ہے کہ مؤلف نے میر حسن کے تذکرے کو دیکھے بغیر یہ بات کہہ دی ہے۔ میں شمس اللہ قادری کی اردوئے قدیم کے سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں نیز مصحفی نے تذکرۂ ہندی گویاں میں صریحاً لکھا ہے کہ فصوص کا ترجمہ منظوم تھا، نثر کی کتاب اس کے علاوہ تھی جواب موجود نہیں ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ منظوم ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ مؤلف انشا کی رانی کیتکی کی کہانی کے لیے کہتے ہیں کہ یہ ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی۔ وہ کتاب اب نایاب ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کی نقل حاصل کرکے اُردو اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع کر دی (ص ۵۴)۔ اگر یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں شائع ہو گئی تو یہ نایاب کیوں کر ہوئی۔ یہ کتاب کبھی نایاب نہیں ہوئی۔ ہندی میں اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں چھپا۔ اس کے بعد سے یہ

Scanned by CamScanner

ہندی میں چھپتی رہی ہے۔ ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۵ء کی ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں اس کا اردو متن اور انگریزی ترجمہ چھپا۔ اس قصے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ ۱۸۰۳ء کی کوئی دلیل نہیں۔ انشا کے محقق ڈاکٹر شیام لال کالرہ عابد پیشاوری نے معقول بحث کے بعد طے کیا کہ یہ ۱۷۸۸ء سے ۱۷۹۰ء کے بیچ لکھی گئی (انشاءاللہ خاں انشا۔ لکھنؤ ۱۹۸۵ء، ص ۴۴۴)۔

مؤلف نے ص ۵۸ پر مکتوباتِ قتیل سے اردو نثر کا ایک نمونہ دیا ہے۔ یہ قابلِ قدر ہے کہ عام طور سے دیکھنے میں نہیں آتا۔ ویسے اس سے پہلے اردو نثر میں پوری کتابیں ملتی ہیں۔

اس تاریخِ ادب کی ترتیب اتنی ناقص ہے کہ رجب علی بیگ سرور کا ذکر دوسرے باب میں ہے اور میر امن اور فورٹ ولیم کالج کا بہت بعد میں تیسرے باب میں حالانکہ فسانۂ عجائب میں میر امن سے ٹکر لی ہے۔ سرور کی شررِ عشق کا صحیح نام شررارِ عشق ہے۔ اسے اور شگوفۂ محبت کو غیر مطبوعہ کہا ہے (ص ۶۵)۔ دونوں قصے انیسویں صدی میں چھپ چکے تھے۔

ایک غیر اہم نثر نگار سدا سکھ لال کے لیے لکھتے ہیں:

> "یہ ہندو اہلِ قوم ہیں۔ انھوں نے تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں اردو نثر میں مجموعۂ قوانین (ایکٹ ہائے سپریم گورنمنٹ) چار جلدوں میں مرتب کیا۔" (ص ۶۶)

گویا ہندو تعصب کی وجہ سے اردو میں نہیں لکھتے۔ انھیں خیال نہیں کہ سدا سکھ لال سے پہلے مہر چند کھتری نے نو آئینِ ہندی، نہال چند لاہوری نے مذہبِ عشق اور بینی نرائن جہاں نے متعدد کتابیں اردو میں لکھیں۔ سدا سکھ لال سے پہلے اور بعد میں متعدد ہندو نثار اور شاعر ہوئے ہیں۔ سدا سکھ لال کو کمپنی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا حکم ملا انھوں نے کیا، بڑا سیکولرزم کا جھنڈا نہیں گاڑ دیا۔ واضح ہو کہ سدا سکھ لال نے چار جلدوں کا ترجمہ نہیں کیا، صرف آخری تین جلدوں کا کیا ہے، پہلی جلد کا دوسرے حکام کمپنی نے کیا ہے۔ دیکھیے احسن کی نمونۂ منشورات ص ۸۳ اور ص ۱۰۵۔ رام چندر شکل نے ہندی ساہتیہ کا اتہاس میں اردو ہند کے ادیب منشی سدا سکھ لال نیاز پر تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ کمپنی کے ملازم تھے اور ۱۸۲۴ء میں فوت ہوئے (بنارس پندرھواں ایڈیشن ۱۹۶۵ء، ص ۳۹۴)۔ ظاہرا یہ کوئی دوسرے شخص ہیں۔

ڈاکٹر نورالدین نے نیم چند کھتری مترجمِ گل صنوبر کو "ایک اور ہندو اہلِ علم کہا ہے (ص ۶۷)۔ ماسٹر رام چندر کے لیے لکھتے ہیں:

> "جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ہندو اہلِ قلم تھے لیکن بعد میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔" (ص ۷۱)

Scanned by CamScanner

"ہندو اہلِ قوم، ہندو اہلِ علم، ہندو اہلِ قلم" ڈاکٹر صاحب کو ہندوئیت کا بڑا احساس ہے۔ غالب کی اردو خطوط نویسی کی تاریخ ۱۸۵۰ء درج کرتے ہیں (ص ۹۷) محققین کا خیال ہے کہ انھوں نے ۱۸۴۸ء بلکہ ۱۸۴۷ء ہی میں اُردو میں خط لکھا۔ وہ کلکتے کے سفر میں اپنی بیگم کے لیے جو خط بھیجتے تھے قیاس کہتا ہے وہ فارسی میں نہ ہو کر اردو میں رہے ہوں گے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات واضح کر دوں کہ نثری ادب کی اس جلد میں نورالدین جو مختصر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں وہ بہت متوازن، بے لاگ اور بلیغ ہوتا ہے۔ تحقیق میں وہ جتنے نیازمند ہیں، اس کی قدرے تلافی ان کے تنقیدی فیصلوں سے ہو جاتی ہے۔

سرور اور غالب کے بعد باب سوم آتا ہے اردو نثر بنگال میں (فورٹ ولیم کالج)۔ تاریخی کتاب میں تاریخ کی صحت اور عہد کا خیال رکھنا چاہیے۔

لکھتے ہیں "حیدری کا تذکرہ گلشنِ ہند شائع نہیں ہوا (ص ۹۸)۔ اسے ہندوستان میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے رسالہ اردو ادب میں اور پاکستان میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ دیکھیے ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی کتاب فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات (لکھنؤ ۱۹۸۳ء ص ۵۹۶) مظہر علی ولا کی "مادھونل اور کام کندلا" کے لیے کہتے ہیں کہ اسے موتی کیسور (کذا، صحیح کولیشور) نے ہندی میں لکھا تھا۔ ولا کا ترجمہ آج تک شائع نہیں ہوا (ص ۱۱۵)۔ ڈاکٹر پرکاش مونس کی تحقیق ہے کہ ولا کے دعوے کے علی الرغم اس کا قصہ عالم کی اودھی نظم سے ماخوذ ہے۔ موتی رام نے کوئی قصہ، مادھونل نہیں لکھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اردو قصے کو ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا ہے۔ جوان کی شکنتلا کو ڈراما قرار دیا ہے (ص ۱۲۱)۔ یہ ڈرامے کی شکل میں نہیں، قصے کا مسلسل بیانیہ ہے۔ یہاں بھی اس کے ہندی مصنف کا نام نواز کیسور لکھا ہے۔ معلوم نہیں کولیشور کو کیسور لکھنا کاتب کا سہو ہے کہ مؤلف کا۔

مؤلف نے گل کرسٹ کی تصانیف کے سلسلے میں نمبر ا انگریزی ہندوستانی لغت اور نمبر ۲ ہندوستانی علم اللسان کا ذکر کیا ہے (ص ۳۳-۱۳۲)۔ ان کتب کے ناموں اور سنین کی تصحیح عتیق صدیقی کی کتاب کے مختلف بیانوں سے ہو سکتی ہے۔ اس کے مطابق گل کرسٹ نے ہندوستانی لسانیات سے متعلق تین کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کیا:

۱۔ انگریزی ہندوستانی لغت جس کا پہلا حصہ ۱۷۸۶ء میں اور دوسرا حصہ ۱۷۹۰ء میں شائع ہوا۔ دونوں کا مکمل و یک جائی ایڈیشن ایڈن برا سے ۱۸۱۰ء میں آیا۔

۲۔ اے گرامر آف دی ہندوستانی لینگویج ۱۷۹۶ء، کلکتہ

۳۔ لغت اور قواعد کا ضمیمہ (The Appendix) ۱۷۹۸ء (گل کرسٹ اور اس کا عہد

طبعِ اول ص ۹۱، ۹۲، ۹۹)۔ سر سید کی مرتبہ آئینِ اکبری کے لیے کہتے ہیں کہ اس کی پہلی جلد اور دوسری جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئیں، تیسری جلد غدر کے ہنگامے کی وجہ سے نہ چھپ سکی اور تلف ہو گئی (ص ۱۴۵)۔ حامد حسن قادری نے صراحت کی ہے کہ پہلی اور تیسری جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئیں اور دوسری جلد غدر میں مطبع میں ضائع ہو گئی (طبعِ دوم ص ۲۷۲)۔ آزاد کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ ذوق کے شاگرد تھے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے (ص ۱۶۸)۔ میں پچھلے آبِ حیات کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں کہ آزاد نہ ذوق کے شاگرد تھے نہ ان کے ساتھ کسی مشاعرے میں شریک ہوئے۔

لکھتے ہیں نذیر احمد بجنور میں پیدا ہوئے (ص ۱۸۲)۔ صحیح ریہڑ، ضلع بجنور ہے۔

• وقار الملک کے لیے لکھتے ہیں کہ ان کا نام مشتاق تھا (ص ۲۲۸)۔ پورا نام "مشتاق حسین" لکھنا چاہیے۔ سر سید کے رفقا اور اس پورے دور پر تبصرہ بہت خوب کیا ہے۔

مؤلف نے مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے لکھا ہے کہ چند روز کی محنت سے فرنچ کے مطالعے پر حاوی ہو گئے (ص ۲۴۲)۔ مجھے اس میں شبہہ ہے۔ مولوی عبدالحق کے لیے لکھتے ہیں کہ قواعدِ اردو کے علاوہ ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے (ص ۲۴۹)۔ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" کو محض کتابچہ کہتے ہیں۔ کیا نصرتی، مرحوم دہلی کالج، مرہٹی زبان پر فارسی کے اثرات مستقل کتابیں نہیں؟ راشد الخیری کے ۲۶ خاص ناولوں کی فہرست معلومات افروز ہے۔ اُن پر مختصر تنقید بہت جامع ہے کہ وہ عورتوں کی مظلومیت میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ احسن فاروقی نے انھیں طبقۂ نسواں کا مرثیہ خواں کہا ہے (ص ۲۹۳)۔ نسیم حجازی کے لیے بھی ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں:

> "وہ اپنے ناولوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ دنیا بھر کے مذاہب کے خلاف قاری کو اکساتے رہتے ہیں۔ ان کا انداز غیر مسلمان کے لیے باعث تکلیف ہے۔ ان کا مقصد ہمیشہ اپنے مذہب کی تبلیغ ہوتا ہے۔ ان کے مکالمے حد سے زیادہ طویل اور غیر فطری ہیں۔"
>
> (ص ۳۰۱)

مؤلف نے ناولوں کے ذیل میں مزاح نگار عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کو بھی لیا ہے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ مزاح نگاری کا علاحدہ باب ہوتا جس میں مزاحیہ انشائیہ، ناول، افسانہ سب کو لے لیا جاتا۔ ان کی تنقید قرۃ العین حیدر کے باب میں غیر متوازن ہو گئی ہے۔ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ انگریزی کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ، بلکہ بعض جگہ مکمل جملے استعمال کرتی ہیں، ان کا اسلوب انگریزی ہے۔ افرادِ خاندان کے سوچنے کا انداز انگریزی

Scanned by CamScanner

ہے۔ ان کے یہاں کردار کا ارتقا نہیں پایا جاتا (ص ۳۰۸)۔ میری رائے میں وہ قرۃ العین کی عظمت کی گرفت میں ناکام رہے ہیں۔

وہ ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "آگے چل کر ترقی پسندی کا دوسرا نام عریانیت قرار پایا۔ جنسی جذبات و میلانات کے اظہار پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس سے رفتہ رفتہ سنجیدہ لوگوں کو ترقی پسندی سے نفرت پیدا ہونے لگی۔"
>
> (ص ۳۱۴)

ظاہر ہے کہ وہ ترقی پسندی اور حلقۂ اربابِ ذوق میں التباس کر رہے ہیں۔ ان کا عدمِ توازن مختلف ادیبوں کو نسبتاً جگہ دینے میں بھی نظر آتا ہے۔ بطور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کو محض چھ سطریں دی ہیں جب کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی "سچی کہانیاں" کو ڈھائی صفحے اور شام بارک پوری کو دو صفحے نذر کیے ہیں۔

بحیثیت مورخِ ادب ان کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق اور تلاش سے کام نہیں لیا۔ ایک ادیب کے لیے کسی پرانی تاریخ میں جو کچھ لکھا مل گیا اس کو نقل کرنے پر اکتفا کی۔ اسے جانچنے اور حالیہ تحقیق سے تصحیح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ سنین کے معاملے میں بھی انھوں نے تحقیق نہیں کی۔ انھیں عیسوی سنہ دینے کا شوق ہے حالانکہ ایک ہجری سنہ کے مقابلے میں محض ایک عیسوی سنہ درج کرنے سے ایک سال کا فرق ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ان کے بعض سنین کی تصحیح کی جاتی ہے:

نورالدین کی مندرجہ تاریخ	صحیح تر تاریخ
ص ۵۴ انشا کی کیتکی کی کہانی ۱۸۰۳ء میں	۱۷۸۸ء اور ۱۷۹۰ء کے بیچ
ص ۶۴ سرور کی شرارِ عشق ۱۸۵۶ء میں	۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹-۶۰ء
ص ۶۷ نسیم چند کا گلِ صنوبر ۱۸۳۷ء	۱۸۳۶ء (نثری داستانیں طبعِ سوم)
ص ۱۹۱ حسن کی گنج خوبی کی طبعِ اول ۱۸۷۵ء	عبیدہ بیگم: ۱۸۰۵ء میں ہندی میں اور ۱۸۴۶ء میں اردو میں چھپی (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۴۵۱)
ص ۹۳ حیدری ف ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۳ء	عبیدہ: ۱۸۲۳ء (ایضاً ص ۱۳۸)
ص ۹۴ طوطا کہانی طبعِ اول ۱۸۰۴ء	عبیدہ: ۱۸۰۱ء (ایضاً ص ۲۸۸)
ص ۱۳۶ محمد حسین آزاد کی ولادت غالباً ۱۸۳۲ء	مالک رام: ۱۰/جون ۱۸۳۰ء (تذکرۂ ماہ و سال)

Scanned by CamScanner

ص ۱۷۶ اذکا الله ف ۱۷/ نومبر ۱۹۱۰ء — مالک رام: ۷/ نومبر ۱۹۱۰ء (ایضاً)

ص ۱۸۲ نذیر احمد پ ۶ نومبر ۱۸۳۶ء — اشفاق اعظمی ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء

ص ۲۲۸ وقار الملک پ ۱۸۳۹ء — مالک رام: ۱۸۴۱ء

ص ۲۷۸ سرشار فوت ۱۹۰۲ء — لطیف حسن ادیب: جنوری ۱۹۰۳ء (سرشار کی ناول نگاری)

ص ۳۶۵ انگارے اشاعت ۱۹۳۵ء — عقیل رضوی: نومبر ۱۹۳۲ء (مختصر تاریخ ادبِ اردو ص ۳۹۴)

حصہ دوم اردو نظم

نظم کا حصہ صفحات میں نثری حصے سے تقریباً دو گنا ہے لیکن یہ تنقید کے معاملے میں اتنا عمیق نہیں جتنا نثری حصہ ہے۔ اس میں تحقیق کا اظہار بھی نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات آبِ حیات، گلِ رعنا اور رام بابو سکسینہ پر انحصار کیا ہے۔ تنقید ہو کہ تحقیق، بیسویں صدی کے اواخر میں ان ابتدائی کتابوں کی قیادت پر اکتفا کرنے سے معیار کی بلندی معلوم۔ تحقیق میں حزم و احتیاط سے نابلد ہونے کے باعث مؤلف کسی قدیم مصنف سے تخلیقات کے انتساب کو نہیں پرکھتے، ہر بادی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو مائل رہتے ہیں۔

انھوں نے شیخ فرید شکر گنج اور امیر خسرو سے جو اردو کلام منسوب کیا ہے اس میں سے زیادہ تر غیر مستند ہے۔ میں اس پر پچھلے کی تاریخوں کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں۔ اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ جنوبی ہند میں اردو نظم کے پہلے شاعر خواجہ بندہ نواز ہیں۔ ان کے نام سے ایک طویل غزل درج کی ہے ع:

توں تو صی ہے لشکری کو (کذا، صحیح کر) نفس گھوڑا اسار توں (ص ۳۸۸)

یہ غزل بہت بعد کے ایک صوفی شاعر شہباز حسینی کی ہے۔ دیکھیے ڈاکٹر نذیر احمد کی مفصل بحث (علی گڑھ تاریخ ص ۶۹-۲۶۶) نیز جمیل جالبی (جلد اول ص ۲۲۸)۔ نورالدین نے خواجہ کے نام سے بعض ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن کی زبان اُن سے دو تین صدی بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے ایک بزرگ صدرالدین م ۸۷۶ھ/۱۴۷۱ء سے ایک مثنوی کسبِ محویت منسوب کی ہے۔ میں تاریخِ مسلمانانِ ہند چھٹی جلد ص ۲۷۳ کے صدرالدین کے سلسلے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ اس نام کے دو بزرگ ہوئے ہیں، ایک ناسک کے (متوفی ۸۷۶ھ)، دوسرے میسور کے بارھویں صدی کے کسبِ محویت آخرالذکر کی تصنیف ہے۔

مؤلف نے چندر بدن و ماہیار کے مصنف کا نام مرزا محمد مقیم مقیمی استر آبادی لکھا ہے (ص ۳۹۹)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے واضح کیا ہے کہ مرزا مقیم استر آبادی ایک ایرانی

Scanned by CamScanner

الاصل شاعر تھا، ایک دوسرا شاعری مقیمی بیجاپوری تھا جو مثنوی کا مصنف ہے (تاریخ جلد اوّل ص۳۸-۲۳۵)۔ خاور نامۂ رستمی میں، عام روایت کے مطابق، ۲۴۰۰۰ شعر لکھے ہیں (ص۴۰۱)۔ ڈاکٹر جالبی کے مطابق اس میں ۲۲۰۶۱ شعر ہیں (تاریخ جلد اوّل ص۳۶۶)۔ مؤلف نے ملک خوشنود کی تین مثنویوں یوسف زلیخا، بازار حسن اور ہشت بہشت کا ذکر کیا ہے (ص۴۰۲)۔ جالبی نے بتایا کہ یوسف زلیخا ناپید ہے، ڈاکٹر زور نے ہشت بہشت کے ایک نسخے کو سہواً ایک علاحدہ مثنوی بازار حسن سمجھ لیا۔ جالبی کی رائے میں اس کا صحیح نام "جنت سنگار" ہے (تاریخ جلد اوّل ص۵۳-۲۵۲)۔

قطب شاہی دور کے ملا احمد (گجراتی) سے ایک مثنوی معصیبت اہلِ بیت منسوب کی ہے (ص۴۱۷) ڈاکٹر زور نے علی گڑھ تاریخ میں رائے دی ہے کہ اس کی زبان محمد قلی کے دور کی نہیں (ص۳۸۲) یہ مثنوی ہندی کے عوامی وزن میں ہے۔ لیلیٰ مجنوں کے پختہ شاعر احمد سے یہ ڈھیلاوزن متوقع نہیں۔ غواصی کے سلسلے میں مؤلف لکھتے ہیں کہ ان کا کلیات نیز ان کی مثنوی چندا اور لورک ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں (ص۴۲۱)۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ کلیات غواصی کو محمد بن عمر نے ۱۹۵۹ء میں شائع کر دیا تھا۔ مثنوی چند اور لورک کا نام مینا ستونتی ہے۔ اسے ڈاکٹر غلام عمر خاں نے عثمانیہ یونی ورسٹی کے رسالہ قدیم اردو جلد اوّل میں شائع کیا تھا۔ مؤلف نے مثنوی پھول بن کی فارسی اصل کا نام بساطین لکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کا صحیح نام "بساتین الانس (مصنفہ احمد حسن دبیر عیدروسی)" لکھتے ہیں (جلد اوّل ص۴۸۷)۔

مؤلف تاریخ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

میں نے کتاب میں بالخصوص ان ہی نثر نگاروں اور شعرا کو شامل کیا ہے، جن کا ادبیاتِ اردو کے آغاز و ارتقا میں نمایاں حصہ رہا ہو، اور جن کی وجہ سے مختلف رجحانات وجود میں آئے ہوں" (ص۱۶)۔

لیکن نثر اور نظم دونوں حصوں میں انھوں نے بعض ایسے اہلِ قلم کو لیا ہے جو مندرجہ بالا معیار پر پورے نہیں اترتے، جنھیں ادب کے شائقین شاید ہی جانتے ہوں مثلاً نثر میں محمد شریف، محمد مخدوم عبدالحق ساوی، ذکا حسن بیگ، سدا سکھ لال اور نظم میں فتح شریف، شاہ عبداللہ عاشق (ص۴۷-۴۴۶)۔ انھیں چھوڑ کر دوسرے اہم ادیبوں کو مزید جگہ دی جاتی تو زیادہ سودمند ہوتا۔

باب ہفتم "اردو نظم دہلی میں" ہے۔ ان میں پہلا شاعر کبیر ہے۔ اگر انھیں اردو کا شاعر کہا جائے تو ہندی کی بولی اودھی کے جملہ شاعروں کو کیوں نہ لیا جائے۔ دوسرے شاعر

Scanned by CamScanner

عبدالقدوس گنگوہی ہیں۔ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں لکھا ہے کہ یہ ہندی کے شاعر ہیں اور ان کا تخلص الکھ داس ہے۔ ان کے بارے میں بھی یہی سوال اٹھتا ہے۔

سعدی کا کوروی کا عنوان دے کر مؤلف لکھتے ہیں کہ ان کے مولد و مسکن کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے (ص ۴۶۹)۔ علی گڑھ تاریخ میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ ان سے منسوب ریختہ ایک مخطوطے میں پنجاب کے ملا شیری (م ۹۹۴ھ یا ۹۸۹ھ) کے نام سے ملا (ص ۴۸۸)۔ محمد افضل جھنجانوی کے بارے میں مؤلف نے نثر کی صرف ساڑھے چھے سطریں لکھی ہیں جو ظاہراً پنجاب میں اردو سے ماخوذ ہیں (مؤلف: ص ۷۰-۴۶۹)۔ اردو کی ادبی تاریخوں میں افضل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں۔ میں نے علی گڑھ تاریخ ص ۲۶ کے تبصرے میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے، وہ دیکھی جا سکتی ہے۔ چندر بھان برہمن سے منسوب غزل (ص ۴۷۰) پر بھی شکوک کیے جاتے ہیں۔ اس پر بھی میں نے علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں لکھا ہے۔

مؤلف شاہ مبارک آبرو کے لیے لکھتے ہیں کہ ان کے دیوان کا انتخاب حسرت موہانی نے شائع کیا تھا (ص ۴۸۰)۔ انھیں معلوم نہیں کہ ایک زمانہ ہوا ڈاکٹر محمد حسن نے پورا دیوانِ آبرو شائع کر دیا ہے۔ ص ۴۸۳ پر شاہ ولی اللہ اشتیاق کا ذکر ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشہور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ ایسا بیان متعدد تذکروں میں ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "تذکرہ گلزارِ ابراہیم مع تذکرہ گلشنِ ہند" کے دیباچے میں وضاحت کر دی ہے کہ یہ شاہ ولی اللہ اشتیاق دوسرے شاعر ہیں (علی گڑھ ۱۹۳۴ء، دیباچہ ص ۲۵) شاکر ناجی کے لیے مؤلف لکھتے ہیں کہ وہ ہجو لکھنے میں بہت تیز تھے "(ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کریم الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اگر وہ اس بنا پر حاجی تخلص کرتے تو بہتر تھا" (ص ۴۸۴)۔ کریم الدین نے صحیح املا "ہاجی" لکھا ہے۔ لیکن مؤلف کے کاتب یا مؤلف نے حاجی لکھ دیا۔

مؤلف نے سودا کی سوانح کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ شاہ عالم کے استاد تھے لیکن کسی بات پر تعلقات منقطع ہو گئے (ص ۵۱۷)۔ یہ سب آبِ حیات سے نقل کیا ہے، مؤلف اس سے آگے کی تحقیق سے واقف نہیں۔ محمود شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین میں ۴۲-۱۹۴۱ء میں تنقید بر آبِ حیات لکھی، اس میں ثابت کیا کہ سودا اور شاہ عالم کبھی ایک دوسرے سے ملے ہی نہیں۔ سودا شاہ عالم کے دہلی آنے سے بہت پہلے وہاں سے جا چکے تھے۔ شیخ چاند نے اپنی کتاب میں اس بات کی تردید کی کہ سودا کو نواب شجاع الدولہ کا دعوت نامہ دہلی میں ملا تھا، ان کے مطابق فرخ آباد میں آیا تھا۔ مؤلف کہتے ہیں کہ شیخ چاند کے دلائل وزنی نہیں معلوم

Scanned by CamScanner

ہوتے (ص ۵۴۴)۔ آبِ حیات اور مؤلف غلط ہیں، شیخ چاند درست معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھیے میرا آبِ حیات کا جائزہ۔ مؤلف رام بابو سکسینہ اور نورالحسن ہاشمی کے دیوانِ سوز کے ذکر پر معترض ہیں۔ ان کے خیال میں سوز نے دیوان مرتب ہی نہیں کیا (ص ۵۶۲)۔ جالبی نے اپنی تاریخ میں دیوانِ سوز کی تفصیل دی ہے (جلد ۲، قصہ ۲، ص ۷۹۶)۔

اس کتاب میں بعض ادیبوں کے بیان میں ایک ذیلی عنوان کے تحت لکھنے کے بعد سادہ صفحہ چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے ایسا لگتا ہے کہ اس ادیب کا بیان ختم ہو گیا۔ ملاحظہ ہو سودا، میر حسن، میر کا بیان۔ ایک ادیب کے ذیلی اجزا کو نئے صفحے سے شروع نہیں کرنا چاہیے۔

میر کی دلچسپ مثنویوں میں "مناجاتِ عاشقاں" اور "عشقِ خانماں آباد" کا نام لیتے ہیں (ص ۵۸۰)۔ ان ناموں کی میر کی کوئی مثنوی نہیں۔ کسی ناشر یا مرتب نے مثنوی کے اجزا کو یہ عنوان دے دیا ہوگا لیکن "عشقِ خانماں آباد" کے بجائے "عشقِ خانماں برباد" لکھا ہوگا۔ بعض اوقات مؤلف شاعر نے صحیح مرتبے کا تعین نہیں کر پاتے۔ بڑے شعرا مومن اور ذوق کے بیچ دو صفحوں پر شاہ حسین تسکین شاگردِ مومن پر لکھا ہے۔ وہ اس اہمیت کے مستحق نہ تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کو شاعر کی حیثیت سے پورے چار صفحے دیے ہیں، حالانکہ اردو میں ان کی اہمیت نثر نگاری کی وجہ سے ہے، شاعر کے طور پر نہیں۔

مؤلف نے ذوق کے بیان میں سب کچھ آنکھ موند کر آبِ حیات سے لے لیا ہے، انھیں پرکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی مثلاً ذوق اور شاہ نصیر کے معرکے، معروف کا ذوق سے تلمذ۔ ان بیانات کی حقیقت میں آبِ حیات کے جائزے میں افشا کر چکا ہوں۔ ذوق کے شاگردوں میں ایک کا نام شجاعت الدین نور لکھا ہے (ص ۶۰۲)۔ شجاع الدین عرف امراؤ مرزا انور دہلوی لکھنا چاہیے۔ جلال پر تنقید میں بہت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں (ص ۶۶۴)۔ مجھے ان پر اعتراض نہیں، صرف یہ کہنا ہے کہ رام بابو سکسینہ کی رائے دہرا دی ہے جس میں بیشتر الفاظ اور جملے بھی سکسینہ کے ہیں۔

مؤلف کی ترتیب کے اُلٹ پھیر کی وجہ سے جعفر علی حسرت، انشا، رنگین اور مصحفی وغیرہ کا بیان داغ، جلال اور امیر اللہ تسلیم کے بعد آتا ہے۔ ابواب قائم کرتے وقت مؤلف کو تاریخی ادوار کا کچھ تو لحاظ کرنا تھا۔ انشا کے بیان میں ایک دلچسپ سہو کتابت نے عظیم کے "حواریوں" کو "جواریوں" بنا دیا ہے (ص ۶۹۲)۔ مصحفی کے لیے لکھتے ہیں کہ انھیں سلیمان شکوہ کے استاد ہونے کا شرف ملا (ص ۷۱۲)۔ قاضی عبدالودود نے "آزاد بحیثیت محقق" میں ثابت کیا کہ مصحفی کبھی بھی سلیمان شکوہ کے استاد نہ تھے۔ مؤلف ناسخ کے لیے مصحفی کی سند

Scanned by CamScanner

پر لکھتے ہیں کہ ناسخ مصحفی کے شاگرد تنہا سے اصلاحِ سخن لیتے تھے(ص ۷۳۱)۔ میں نے گلِ رعنا ص ۳۴۴ کے سلسلے میں صراحت کی ہے کہ مصحفی کے دیوانِ ششم کے دیباچے کے جملے کے معنی یہ ہیں کہ "ناسخ نے، جو محمد عیسیٰ تنہا کے دوست ہیں، مجھ سے استفادہ کیا۔"

صبا کے دیوان کا نام غنچۂ اُردو لکھا ہے(ص ۷۷۹)۔ صحیح "غنچۂ آرزو" ہے جو تاریخی نام ہے۔ نواب مرزا شوق کی تصانیف میں مثنوی لذتِ عشق اور دیوانِ غزلیات کو بھی شامل کیا ہے۔(ص ۷۸۵) لذتِ عشق شوق کی تصنیف نہیں، آغا حسن نظم کی ہے۔ بیسویں صدی کے تیسرے چوتھے رُبع میں اسے شوق سے منسوب کرنا قابلِ افسوس ہے۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام دبستانِ آتش میں لکھتے ہیں کہ شوق کا دیوان آج تک دستیاب نہ ہوا۔ شاید اُنھوں نے کوئی دیوان مرتب ہی نہیں کیا تھا۔ اِدھر اُدھر سے تلاش کر کے غزلیات کے ۶۱ شعر مل سکے۔ (دبستانِ آتش لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۵۷-۱۵۶)

میر ضمیر کے حالات میں دو جملے یوں چھپے ہیں:

"البتہ وہ مصحفی (م ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء) کے خواجہ سرا میاں الماس کے ملازم تھے۔ نواب نے جب دارالحکومت فیض آباد سے منتقل کیا، تو یہ بھی مع اپنے صاحبزادے کے لکھنؤ چلے آئے۔"(ص ۷۹۵)

پہلے جملے میں کچھ چھوٹ گیا ہے۔ یہ جملے بہ تبدیلیِ چند الفاظ ابواللیث کی "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں ملتے ہیں۔ وہاں یہ جملے یوں ہیں:

"ان کے والد... نواب آصف الدولہ کے خواجہ سرا میاں الماس کے ملازم تھے۔ نواب آصف الدولہ نے جب فیض آباد کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو دارالامارہ قرار دیا تو یہ بھی مع اپنے صاحبزادے کے لکھنؤ چلے آئے۔"(طبع اوّل ۱۹۴۴ء، ص ۴۷۵)

معلوم نہیں یہاں مصحفی کے نام کا کیا موقع تھا۔ ان کا سنہ وفات غلط درج ہے۔ خود ابواللیث نے اپنے مندرجہ بالا مقالے میں ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء درج کیا ہے۔ زیرِ نظر تاریخ میں ایک عنوان ہے "میر انیس و مرزا دبیر کا مقابلہ" اس کے تحت ڈھائی صفحوں میں بڑی متوازن اور بلیغ تنقید کی ہے۔(ص ۲۳-۸۲۱)

چکبست کے فالج اور انتقال کا واقعہ بریلی اسٹیشن کا بتایا ہے(ص ۹۰۱)۔ دراصل یہ رائے بریلی اسٹیشن کی بات ہے۔ شاد عظیم آبادی کے بیان میں لکھا ہے:

"سیّد شاہ الفت حسین فریاد کی شاگردی اختیار کی جو خواجہ میر درد کے

شاگرد تھے۔" (ص۹۰۷)

شاد ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ کیا انھیں کوئی ایسا استاد مل سکتا تھا جو میر درد متوفی جنوری ۱۷۸۵ء کا شاگرد رہا ہو۔ نساخ نے تذکرہ سخن شعرا میں فریاد کے حال میں لکھا ہے کہ وہ راجہ پیارے لال الفتی کے شاگرد تھے۔ مؤلف فراق کے لیے لکھتے ہیں:

"آئی سی ایس کے لیے نامزد ہوئے لیکن اُنھوں نے وہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا" (ص۱۰۳۵)

یہ خود فراق کی اڑائی ہوئی بات ہے۔ وہ آئی سی ایس کے لیے نہیں، پی سی ایس کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ مؤلف نے ان کے کلام کے یہ مجموعے گنائے ہیں:

۱۔ شعلۂ ساز، ۲۔ روحِ کائنات، ۳۔ رمزو کنایات، ۴۔ روپ (ص۱۰۳۶)

میری معلومات کی حد تک شعلۂ ساز اور رمزو کنایات ان کے کسی مجموعے کے نام نہیں۔ حیرت ہے کہ مؤلف نے ان کے سب سے اہم مجموعے "گلِ نغمہ" کو شامل نہیں کیا جس پر فراق کو ساہتیہ اکادمی اور گیان پیٹھ کا انعام ملا نہ ان کے سب سے ضخیم مجموعے "گلبانگ" کا ذکر کیا۔

اب حصۂ نظم کی بعض تاریخوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

ڈاکٹر نورالدین	صحیح تر تاریخیں
ص۳۸۴ امیر خسرو پ ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء	ڈاکٹر وحید مرزا: ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء
ص۳۸۴ امیر خسرو ف ۷۱۵ھ/۱۳۲۵ء	ہجری سنہ ۷۲۵ھ چاہیے۔ عیسوی سنہ درست ہے۔
ص۴۰۱ خاور نامۂ رستمی کا سنہ ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء	جالبی: ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء (تاریخِ اول ص۲۶۵)
ص۴۰۶ امین الدین اعلیٰ ۱۵۹۱ء تا ۱۶۷۵ء	حسینی شاہد: ۱۵۹۹ء تا ۱۶۷۴ء (اعلیٰ پر کتاب)
ص۴۶۳ سراج پ ۱۷۱۱ء	جالبی و محمد علی اثر: ۱۷۱۵ء (تاریخِ ادب ص۵۶۶ و دکنی غزل کی نشوونما ص۴۱۸)
ص۵۰۶ یقین ف ۱۱۳۹ھ/۱۷۵۵ء	ہجری سنہ سہوِ کتابت۔ صحیح ۱۱۶۹ھ
ص۵۸۵ نظیر اکبر آبادی پ ۱۷۳۸ء	علی احمد فاطمی: تقریباً ۱۷۳۵ء (نظیر اکبر آبادی الہ آباد ۱۹۸۳ء ص۴۶)

Scanned by CamScanner

ص ۶۰۱ ذوق پ ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء	عابد پشاوری: ۱۲۰۳ھ (ذوق اور محمد حسین آزاد ص ۳۵) تنویر علوی: ۱۷۸۸ء (مقدمہ کلیاتِ ذوق)
ص ۶۴۳ شیفتہ پ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۲ء	عیسوی سنہ ۱۸۰۶ء چاہیے
ص ۶۴۹ امیر مینائی پ ۱۸۲۶ء	ابو محمد سحر: ۱۸۲۹ء (مطالعۂ امیر ص ۶۷)
ص ۶۵۷ داغ پ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء	عیسوی تاریخ ۱۸۳۱ء چاہیے
ص ۶۶۷ امیر اللہ تسلیم پ ۱۲۳۴ھ/۱۸۲۰ء	ڈاکٹر فضل امام: ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء (امیر اللہ تسلیم ص ۱۸)
ص ۷۰۱ رنگین پ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء	حسن آرزو: ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء) (سعادت یار خاں رنگین ص ۶۱)
ص ۷۱۱ مصحفی پ ۱۱۴۲ھ/۱۷۳۹ء	عیسوی سنہ ۱۷۲۹ء چاہیے
ص ۷۱۴ مصحفی ف ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء	مسلّمہ طور پر ۱۲۴۰ھ/۲۵-۱۸۲۴ء
ص ۷۴۶ امانت ف ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء	مالک رام: ۲۸ جمادی الاوّل ۱۲۷۵ھ/۳ جنوری ۱۸۵۹ء (بحوالہ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج)
ص ۹۳۷ اقبال ف ۱۶، اپریل ۱۹۳۸ء	صحیح ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء
ص ۹۸۸ حسرت موہانی پ ۱۸۷۵ء	ان کے پاسپورٹ کے مطابق ۱۸۷۸ء (ہماری زبان یکم فروری ۱۹۹۳ء)

حصہ دوم کے آخر میں ایک صفحے کا عنوان "خاتمہ" ہے۔ اس میں ہندوستان میں اُردو کے فروغ اور چہل پہل کی کئی سطروں میں داد دی ہے۔ آخری جملہ ہے:

> "اُردو ادبیات سے متعلق باقاعدہ اور اہتمام کے ساتھ سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں لیکن چونکہ وہاں کی قومی زبان ہندی ہے۔" (ص ۱۰۶۳)

اس نامکمل جملے پر صفحے کا، خاتمے کا اور کتاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے حالانکہ سطر میں کئی الفاظ کی گنجائش ہے۔ کتابیات میں تاریخِ ادبِ اُردو کے مصنف کا نام راج بابو سکسینہ چھپا ہے بجائے رام بابو سکسینہ کے۔ کلیم الدین احمد کی کتاب کا نام "فنِ داستاں گوئی" لکھا ہے حالانکہ پورا نام "اُردو اور فنِ داستاں گوئی" ہے۔ کچھ کتابوں کے نام مقدمۂ قطب مشتری، مقدمہ کلیاتِ ولی، دیباچۂ نظمِ آزاد درج کیے ہیں۔ یہ مان لیا کہ مؤلف نے ان کتابوں کے محض مقدمے سے استفادہ کیا ہے لیکن ان ناموں کی کوئی کتاب نہیں۔ انھیں کتاب کے نام کو

Scanned by CamScanner

مسخ کرنے کا اختیار نہیں۔ لفظ مقدمہ اور دیباچہ حذف کر کے لکھنا چاہیے۔ کتاب میں اشارہ یہ نہیں۔ جلد اوّل میں دیباچے میں لکھتے ہیں کہ انھیں اس کی افادیت پر اعتقاد نہیں کہ عام طور پر لوگ اس پر رجوع نہیں کرتے (ص ۱۷)۔ یہ عذرِ لنگ ہے۔

اس تاریخ کے مطالعے کے بعد میرے سامنے یہی سوال آتا ہے کہ اس کے لکھنے کا کیا جواز ہے۔ ظاہراً انھوں نے ۱۹۶۹ء کے اوائل میں یہ کتاب تیار کی گو ستمبر ۱۹۸۹ء میں لکھے مقدمے میں اعلان کرتے ہیں کہ کتاب پر نظرِ ثانی کی ہے۔ کتاب بالکل سرسری ہے۔ ایک ادیب کے لیے عموماً کسی ایک کتاب کی مدد سے لکھ دیا گیا ہے۔ ۱۹۸۹ء تو درکنار ۱۹۶۹ء تک اُردو میں متعدد تحقیقی کتابیں اور تاریخیں لکھی جا چکی تھیں لیکن ڈاکٹر نورالدین "آبِ حیات"، "گلِ رعنا" اور رام بابو سکسینہ کی کتابوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ پوری کتاب میں مجھے کوئی تحقیقی بحث نہیں دکھائی دی، اُنھوں نے اپنی طرف سے ایک بھی تحقیقی انکشاف نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ اور ان کے استاد ڈاکٹر عندلیب شادانی ان سے پیشتر کی لکھی تاریخوں سے ناآسودگی ظاہر کرتے ہیں اور زیرِ نظر کام سے اطمینان۔ مجھے ڈاکٹر شادانی کی اس قدردانی پر ان کے معیارِ تحقیق میں بھی شبہہ ہونے لگا ہے۔

نثر کے حصے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ مؤلف میں تنقیدی صلاحیت ہے لیکن نظم کے حصے میں وہ بھی نہیں دکھائی دی۔ اُنھوں نے دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں جس طرح التباس و اختلاط کیا ہے اس سے مزید وحشت ہوتی ہے۔ اگر یہ کتاب تقسیمِ ملک سے پہلے لکھی گئی ہوتی تو اس پر کچھ توجہ کی جا سکتی تھی، سنہ اشاعت ۱۹۹۷ء یا سنہ دیباچہ ۱۹۸۹ء میں دوسری عالمانہ تاریخوں کے ہوتے اس سے کوئی خلا پُر نہیں ہوتا۔

Scanned by CamScanner

چوبیسواں باب

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: تاریخِ زبان و ادبِ اُردو

مالک رام صاحب کے تذکرۂ ماہ و سال کے مطابق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۵ جون ۱۹۱۶ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۹۹۴ء میں کراچی میں ہوا۔ زیرِ نظر تاریخ ان کی آخری تصنیف ہے جسے ان کے پس مرگ رہبر پبلشرز، اُردو بازار کراچی نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ ابتدائی ۱۲ صفحات کے بعد کتاب میں ۱۲۵۲ صفحات ہیں۔ اس ضخامت کی کتاب دفتی کی جلد کے بغیر پیپر بیک میں ہے۔ کاغذی جلد اس بوجھ کو کب تک برداشت کر پائے گی۔ مصنف کے قلم سے دو ابتدائیے ہیں، شروع میں دو صفحوں کا "کچھ اس کتاب کے بارے میں" کے عنوان سے جس کے آخر میں کوئی تاریخ نہیں، اس کے بعد ص ا تا ۱۳ میں پیش لفظ ہے جس کے آخر میں کراچی ۱۹۹۰ء درج ہے۔ پہلے ابتدائیے میں لکھا ہے:

> "اس کی تیاری میں نیک نیتی کے ساتھ ان تمام حوالوں کا اعتراف کیا گیا ہے جن سے مدد ملی۔ اکثر پاورقی حوالوں سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری کتاب میں فٹ نوٹ نہایت کم ہیں، زبان سے متعلق ابواب میں تو کچھ ہیں، ادبی ابواب میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ متن میں بھی شاید ہی کہیں کسی ماخذ کا اعتراف ہو۔ کتاب یا باب کے آخر میں حواشی نہیں، آخر میں کتابیات نہیں، اشاریہ نہیں۔ شروع میں فہرست میں ابواب کے نمبر دیے ہیں، متنِ کتاب میں عنوان ہے لیکن باب کا عدد شمار کہیں نہیں۔ چونکہ عنوانات بیچ بیچ میں بھی ہیں اس لیے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کون سا عنوان باب کا ہے، کون سا باب کے اندر کا ذیلی عنوان ہے۔ بارہا باب کے ذیلی حصے نئے صفحے سے جلی عنوان کے ساتھ شروع کر دیے ہیں جس سے وہ تازہ باب معلوم ہوتے ہیں جیسے باب ۱۹ یا ۲۲ کے تمام شعرا۔ بہت سے ادیبوں کو بغیر عنوان کے شروع کر دیا ہے مثلاً ضمیر ص ۴۳۱، دبیر ص ۴۳۸، مخدوم محی الدین ص ۷۸۳، سیراجی ص ۷۸۶ وغیرہ۔ دبیر کے مرتبے کے شاعر کو نیا صفحہ، جلی یا خفی عنوان تو در کنار نئی سطر سے بھی شروع نہیں کیا۔ انیس کے سلسلے میں ص ۴۴۸ پر سطر ۲ کے بیچ سے بیان کرنے لگے ہیں۔

Scanned by CamScanner

فہرست اور متن میں کئی ابواب کے عنوان میں لفظی اختلاف ہے۔ فہرست نیز متن میں باب ۳ کا عنوان "سنسکرت سے اُردو تک" اور باب ۴ کا عنوان "پراکرت سے اُردو تک" ہے حالانکہ مطالب کے اعتبار سے باب ۳ کا عنوان "سنسکرت سے پراکرت تک" ہونا چاہیے۔ فہرست میں باب ۸ "اُردو کا رسم الخط" ہے۔ کتاب میں یہ باب اس جگہ غائب ہے، اگلے تین ابواب کے بعد نمبر ۱۱ پر ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کم از کم باب ۸ سے ۱۶ تک فہرست اور متن میں ابواب کے صفحہ نمبر سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ملاحظہ ہو۔

فہرست میں عنوان	فہرست میں صفحہ نمبر	متنِ کتاب کا واقعی صفحہ
باب ۸ اُردو رسم الخط	ص ۹۷	ص ۱۳۰
باب ۹ اُردو کے اصناف سخن	ص ۱۲۴	ص ۹۷
باب ۱۰ اُردو کا علم عروض	ص ۱۴۰	ص ۱۱۳
باب ۱۱ اُردو قواعد نگاری	ص ۱۴۳	ص ۱۲۰
باب ۱۲ ہندوی، ہندی یا اُردو کے قدیم نمونے	صفحہ نمبر غائب	ص ۱۴۵
باب ۱۳ اُردو زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات	ص ۱۶۳	ص ۱۵۷
باب ۱۴ اُردو شاعری کا دکنی دور	ص ۱۷۳	ص ۱۶۸
باب ۱۵ ولی اور ان کے معاصرین	ص ۱۹۹	ص ۱۸۴
باب ۱۶ دورِ شعرائے ایہام گو	ص ۲۰۲	ص ۱۹۱
باب ۱۷ شمالی ہند میں شعر و ادب کے پہلے دور کا تاریخی اور سیاسی پس منظر	صفحہ نمبر غائب	ص ۲۲۲

فہرست میں باب ۱۶ کے جملہ آٹھ شاعروں کے آگے قوسین میں صفحہ نمبر درج کیا ہے، سب غلط ہیں۔ اس سے کہیں بڑا اعتراض کتاب میں موضوعات کے خلفشار، خلط مبحث اور تقسیم ابواب کی بے ترتیبی پر ہے۔ اُردو کی تمام ادبی تاریخوں کے برخلاف اس تاریخ میں ادب کے ساتھ تاریخِ زبان کو بھی گڈمڈ کرلیا گیا ہے۔ لسانیات اور ادب دو علاحدہ علوم ہیں۔ تاریخِ ادب میں اُردو زبان کا آغاز و ارتقا دیا جاسکتا ہے لیکن مولف (۱) نے کہیں قدیم ہند آریائی کے ذیلی خاندان دیے ہیں تو کہیں زبانوں کی ساختی گروہ بندی (ترکیبی، شمول وغیرہ)۔ اُردو ادب کی تقسیم کے لیے یہ غیر متعلق ہے۔ یہ کسی علاحدہ کتاب کا موضوع ہوسکتا ہے، تاریخِ ادب کا نہیں۔ ستم یہ ہے کہ اس کے بعد اُردو کے اصناف سخن اور اُردو کا علم عروض کے ابواب بھی شامل کیے ہیں۔ آخر وہ کوئی بلاغت کی کتاب تو لکھ نہیں رہے تھے۔ اصناف اور عروض کو محض چھوا ہے، نہایت تشنہ اور سرسری فہرست میں مکمل کر تو نہیں

Scanned by CamScanner

کہا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کو نظم و نثر کے الگ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب ۱۲ سے تاریخِ ادب شروع ہوتی ہے "اُردو نے قدیم کے ابتدائی نمونے" اس کے بعد باب ۱۳ "اُردو زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات" ہے۔ یہ لسانیات کے حصّے میں جانا چاہیے تھا۔ باب ۱۴ "اُردو شاعری کا دکنی دور" ہے لیکن اس سے پہلے باب ۱۲ میں کئی دکنی شعرا آجاتے ہیں مثلاً خواجہ بندہ نواز، شاہ شمس العشاق، برہان الدین جانم۔ باب ۱۲ سے باب ۴۸ تک یعنی ص ۹۶۲ تک شاعری کا بیان ہے اور اس کے بعد باب ۴۹ تا ۵۹ میں نثر کا۔ شعرا کا بیان کہیں دہلی اور لکھنؤ کے تحت ہے، کہیں صنف سے (مرثیہ)، کہیں تحریک سے (علی گڑھ تحریک) وغیرہ بہتر ہوتا کہ زمانی ترتیب کو فوقیت دی جاتی۔

شمالی ہند کے ادب کے ابتدائی تین ابواب یہ ہیں۔

۱۶ دورِ شعرائے ایہام گو۔ ۱۷ شمالی ہند میں شعروادب کے پہلے دور کا تاریخی اور سیاسی پس منظر۔ ۱۸ ادبلویت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریخی پس منظر سب سے پہلے، پھر دہلویت اور پھر شعرائے ایہام گو آنا چاہیے۔ ابواب بندی میں زمانی ترتیب کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے مثلاً مصحفی و جرأت وغیرہ باب ۱۹ میں ہیں، ان سے قدیم تر میر اثر، عبدالحی تاباں، میر سوز اور جرأت کے استاد جعفر علی حسرت باب ۲۰ میں ہیں۔ امیر مینائی اور شوق قدوائی باب ۲۳ میں ہیں، غالب و ذوق ان کے بعد باب ۲۴ میں۔ نظیر اکبر آبادی کو داغ کے بعد باب ۲۷ میں رکھا ہے اور واجد علی شاہ تشریف لاتے ہیں باب ۳۳ میں چکبست، اکبر الہ آبادی، ظفر علی خاں، ریاض و مضطر خیر آبادی کے بعد۔

شاعری کے حصّے میں علی گڑھ تحریک کو تین ابواب ۲۹ تا ۳۱ کا عنوان بنانا مناسب نہیں۔ انجمنِ پنجاب کو اسی کے تحت ڈال دیا ہے۔ فہرست میں کئی ابواب کے مماثل عنوانات مصنّف کی ذہنی پراگندگی کے نشاں گر ہیں۔

باب ۲۷ اُردو شاعری کے کلاسیکی دور کی بزمِ آخر۔ باب ۳۲ اُردو کی کلاسیکی شاعری کا آخری دور باب ۳۹ اُردو ادب قیامِ پاکستان کے بعد (شاعری تک محدود ہے) باب ۴۱ اُردو شاعری قیامِ پاکستان کے بعد، باب ۴۳، اُردو شاعری کے پاکستانی دور کا آغاز، ۴۵ اُردو ادب میں پاکستانی مزاج کا تصوّر۔

ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کے ابواب نہیں۔ نثر نگاری کے حصّے میں خطوطِ غالب باب ۵۰ میں ہیں، فورٹ ولیم کالج باب ۵۱ میں ہے اور ستم یہ ہے کہ اس باب میں پہلے دلّی کالج ہے، بعد میں فورٹ ولیم کالج۔ رجب علی بیگ سرور اور فسانۂ عجائب کسی باب میں نہیں۔ انھیں جگہ ملتی ہے تو باب ۵۶ ناول کے تمہیدیے میں، محض آدھا صفحہ جہاں

Scanned by CamScanner

کلیم الدین احمد کے ایک اعتراض کا ذکر ہے۔ اس طرح اس تاریخ میں رجب علی بیگ سرور کا ذکر ابوالکلام آزاد اور سلیمان ندوی کے بعد آتا ہے۔

ترقی پسندی کے زیرِ اثر اُردو کی تحقیقی کتابوں، بالخصوص ڈاکٹریٹ کے مقالوں میں یہ رواج ہو گیا کہ تاریخی اور سیاسی پس منظر کی طویل داستان درج کی جائے گو اس کا مذکورہ ادبی تخلیقات پر براہِ راست اثر پڑا ہو کہ نہ پڑا ہو۔ اب اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ انھیں افسانوں کو دہرانا جنھیں ۵۰ بار سن چکے ہیں تحصیلِ حاصل، بلکہ سعیِ لاحاصل ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث جو اپنے دینی عقیدے میں بہت راسخ ہیں، اس پس منظر کو بڑے جوش اور جذبے سے بیان کرتے ہیں مثلاً ذیل کے ابواب ملاحظہ ہوں:

باب ۷ اشمالی ہند میں شعروادب کے پہلے دور کا تاریخی اور سیاسی پس منظر

باب ۱۸ دہلویت کیا ہے، باب ۲۸، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کا اثر شعروادب فکرونظر پر

باب ۲۹ تحریکِ سرسید اور اس کا اثر شعروادب پر۔ باب ۳۶ تحریکِ آزادی اور شعروادب پر اس کے اثرات

باب ۳۸ ۱۹۴۷ء کا تاریخی انقلاب، پاکستان اور بھارت کی آزاد ریاستوں کا قیام

باب ۴۵ اُردو ادب میں پاکستانی مزاج کا تصور

اس پس منظر کا بنیادی موضوع عیسائیوں اور انگریزوں پر عموماً اور ہندوؤں پر خصوصاً تعریض کرنا ہے۔ انھیں موضوعات کی بار بار تکرار کرتے ہیں۔ ان ابواب کے علاوہ کوئی بھی موضوع ہو مثلاً اُردو غزل کا نشاۃ الثانیہ (حسرت، فانی، جگر وغیرہ) اس میں بھی جب تک چند صفحات میں ہندوؤں پر سب وشتم نہ کرلیں انھیں چین نہیں آتا۔ میں کوئی نمونہ نہ دوں گا کیونکہ مجھے مناظرے کا باب نہیں کھولنا ہے لیکن عرض یہ کرنا ہے کہ یہ ادبی کتاب ہے دینی مناظرے یا سیاسی اور سماجی تاریخ کی نہیں۔ اگر انھیں یہ سب کچھ لکھنا تھا تو کتاب کے سرورق پر اعلان کردیتے کہ اس کتاب کو غیر مسلم نہ پڑھیں۔ حیرت ہے کہ ان کی اتنی ہی ضخیم کتاب "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" کے ۱۹۸۷ء کے ایڈیشن میں ایک جملہ بھی ہندوؤں کے خلاف نہیں۔ افسوس کہ وہ ہندوؤں کی محترم ترین ہستیوں اور بادیوں کا ذکر کرتے ہیں تو کمال بے حرمتی کے ساتھ بغیر کسی تعظیمی سابقے اور لاحقے کے مثلاً ص ۴۶، ص ۵۲، ص ۷۷ پر۔

مہاراشٹری کو مہابیر نے اسی طرح تقویت پہنچائی جس طرح بدھ نے مگدھ (کذا) کو دی تھی۔ (ص ۵۲)

Scanned by CamScanner

گوتم نے جو برہمنوں کا زور توڑنے کے لیے ماگدھی پراکرت کو اختیار کی (کذا) (ص ۷۷)

مہابیر جین نے جینی کو بھی یہی اعتبار بخشا۔ (ص ۷۷)

راماین کے قصے میں بھی رامچندر کی بیوی سیتا کو لنکا کا ایک راون بھگا کر لے جاتا ہے۔ (ص ۱۵۰)

ان کا ایک رہنما دیانند سرسوتی تھا۔ (ص ۸۱۶)

مہاتما گاندھی کا ذکر یہاں جگہ تو آیا ہی ہوگا۔ میں ان سے یہ مطالبہ تو نہیں کرتا کہ وہ مہاتما گاندھی کہیں لیکن کم از کم گاندھی جی تو کہہ سکتے تھے۔ مجھے صرف تین موقعوں پر گاندھی جی لکھا ملا بقیہ سب جگہ محض "گاندھی" ہے اور وہ بھی کس کس خرابی سے۔ یہ اہلِ علم کا اندازِ گفتار نہیں۔

کتاب کا انداز تحقیقی نہیں۔ کسی امر میں اگر کئی اہلِ قلم کی مختلف رائیں ہیں تو ان سب کو درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، اپنا فیصلہ نہیں دیتے۔ قدیم تعلیقات کے ضعف انتساب کو نہیں پرکھتے، سنین کی صحت کی تحقیق نہیں کرتے۔ ایک ہجری سنہ کے متوازی ایک ہی عیسوی سنہ درج کرتے ہیں حالانکہ جب تک ماہ و تاریخ معلوم نہ ہو، دو عیسوی سنین لکھنے چاہئیں۔ کتاب میں سہو کتابت کی کثرت ہے جس کی وجہ سے کئی بار نہیں کہا جاسکتا کہ سنہ کی غلطی کی ذمےداری مؤلف کی ہے کہ کاتب کی؟ خود اشتہاری کثرت سے ہے اپنی ہر دریافت، ہر تحریر، ہر کام، ہر مقالے کی نگرانی کا بار بار ذکر کرتے ہیں اور بسااوقات صیغۂ واحد غائب میں "ڈاکٹر ابواللیث صدیقی" لکھ کر ان کمزوریوں کے باوجود ہندو کشی اور ترقی پسند تحریک دشمنی کو نظرانداز کرکے میں کہوں گا کہ تنقیدی اعتبار سے کتاب بسا غنیمت ہے۔ کتاب ضخیم ہے، تفصیلی جائزہ بہت طویل ہوجائے گا، اس لیے اہم تر نکات کو لوں گا۔ تصحیح پر خصوصی توجہ کروں گا۔

۱۳ صفحوں کے پیش لفظ پر صرف دو مشاہدات پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ ادوار کی تقسیم کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ شعرا کو روایتی تین طبقوں (یعنی ادوار) میں تقسیم کرنا درست نہیں۔ اس کی تردید میں لکھتے ہیں:

"کیا فیض احمد فیض کے یہاں مرزا سودا کی بازگشت سنائی نہیں دیتی۔" (ص ۴)

میں قدرے گراں گوش ہوں، مجھے تو سنائی نہیں دیتی۔ مجھے تو فیض اور سودا انیل دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم نہیں مؤلف نے فیض کے سلسلے میں سودا ہی کا انتخاب کیوں کیا۔

Scanned by CamScanner

دوسری بات۔ اُنھوں نے پنجاب یونی ورسٹی کے ذخیرے سے مصحفی کی سوانح مجمع الفوائد تلاش کی۔ اس کارنامے پر ان کا دمدمۂ فخر بجانا بجا ہے لیکن جب وہ کہتے ہیں کہ "قاضی عبدالودود اور محمود شیرانی بھی اسی میدان کے شہسوار تھے، مجمع الفوائد ان کو بھی دستیاب نہیں ہوا" (ص۵) تو میں یہ انکشاف کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ غالباً ۱۹۵۶ء میں قاضی عبدالودود نے مجھ سے یہ شکایت کی کہ وہ لاہور بطور خاص مجمع الفوائد کو دیکھنے گئے لیکن ڈاکٹر ابواللیث نے اس کا نسخہ لائبریری سے نکلوا کر اپنے گھر رکھا ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے ہزار کوشش کی لیکن ڈاکٹر صاحب نے انھیں نسخہ نہیں دیکھنے دیا۔ آخر وہ بے نیلِ مرام واپس آگئے۔

مولف نے یہ بہت مفید اطلاع دی ہے کہ قدیم ہندوستان میں بھوج وغیرہ کے پتّوں پر تحریر کر کے "ان کے درمیان ایک سوراخ کر کے ڈوری سے گانٹھ دے کر اس کی جلد بندی کر لیتے تھے۔ گرہ اور گرنتھ جو بعد میں، میں کتاب کے لیے استعمال ہونے لگا اس کی وجہِ تسمیہ یہ ہے "(ص۱۸) ان کی یہ توجیہ صحیح ہے کیونکہ گرنتھ کے ایک معنی گانٹھ بھی ہیں۔ گرہ کتاب کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ میں نے میسور میں بھوج پتر پر ایسی تحریروں کی مختصر کتابیں دیکھی ہیں۔ قدیم آریوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "آریوں کی یورش اور مقامی لوگوں کے ساتھ ان کے سلوک کا یہ اثر ضرور ہوا کہ شودر برِصغیر کے شمال سے تقریباً ناپید ہوگئے۔" (ص۲۲)

کس غضب کی ناواقفیت ہے۔ وہ نہ یہ جانتے ہیں کہ شُدر کسے کہتے ہیں نہ ہندوستان کی قدیم تاریخ جانتے ہیں۔ شمالی ہند کے ہر علاقے میں شُدر (ہریجن یعنی درجِ فہرست اقوام یا نیچی ذاتوں کے لوگ) بھرے پڑے ہیں۔ ان کے لیے ہندوستان کے آئین میں درس گاہوں اور ملازمتوں میں تقریباً ۲۲ فی صد نشستیں محفوظ ہیں۔ ان کی اپنی سیاسی پارٹیاں ہیں مثلاً شمال میں بھوجن سماج، مہاراشٹر میں ری پبلکن پارٹی۔ اتر پردیش میں کم از کم دو بار اُنھوں نے حکومت بنائی۔

قدیم ہند آریائی کی شاخیں گِناتے گِناتے ایک موضوع "ساخت کے اعتبار سے زبانوں کے اہم گروہ" لیتے ہیں (ص۲۹)۔ ہندوستان میں اس کے لیے اصطلاح "زبانوں کی نوعیاتی گروہ بندی" استعمال کی جاتی ہے۔ اس موضوع کا ادب کی تاریخ سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔

اس تاریخ میں نو ابواب لسانیات سے متعلق ہیں: پہلے سات باب اور "اُردو رسم الخط" نیز "اُردو زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات" والے ابواب۔ میں لسانیاتی ابواب پر تیری

Scanned by CamScanner

سے گزر جاؤں گا۔ باب ۳ کا عنوان ہے "سنسکرت سے اُردو تک"۔ دراصل یہ "سنسکرت سے پراکرت تک" ہونا چاہیے۔ اس میں لکھتے ہیں "پانِنی نے اپنی قواعد میں چار پراکرتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے" ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری اور پیشاچی" (ص ۴۵)

مجھے اس میں بہت شبہہ ہے کہ پانِنی نے ان پراکرتوں کا ذکر کیا ہوگا۔ ہند آریائی کے تین دور ہیں جن میں وسطی ہند آریائی تقریباً ۵۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے بھی تین ذیلی دور ہیں: ۵۰۰ ق م سے مولودِ مسیح تک پالی، مولودِ مسیح سے ۵۰۰ یا ۶۰۰ء تک پراکرت اور اس کے بعد اپ بھرنش۔ بعض غیر محتاط علما نے پالی کو پہلی پراکرت کہہ دیا ہے لیکن یہ اصطلاحوں میں خلفشار پیدا کرتا ہے۔ مؤلف کی مندرجہ بالا چاروں پراکرت مولودِ مسیح کے بعد ابھرتی ہیں۔ اس کے آگے کا باب "پراکرت سے اُردو تک" ہے۔ اس میں مختلف پراکرتوں کی گروہ بندی کر کے ان سے جدید زبانیں ماخوذ کی ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث کو ہند آریائی کی تاریخ سے سرسری واقفیت ہی معلوم ہوتی ہے۔ جدید زبانیں پراکرت سے نہیں، ان کے بعد آنے والی اپ بھرنشوں سے ارتقا پاتی ہیں۔ بعد میں قدرے سنبھل کر لکھتے ہیں:

"کسی ایک پراکرت کی کوئی ایک اپ بھرنش شکل اُردو کا منبع اور ماخذ قرار نہیں دی جاسکتی۔" (ص ۵۳)

پراکرتوں کے بعد اپ بھرنش آتی ہیں، ان میں سے ایک بھرنش سے کھڑی بولی نکلی اور اس سے اس کا اُردو روپ۔ کھڑی بولی کس اپ بھرنش سے نکلی اس کے بارے میں سنسکرت اور ہندی کے ماہرینِ لسانیات بھی وثوق اور قدرت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے لیکن یہ طے ہے کہ یہ نکلی ایک ہی اپ بھرنش سے، کئی سے نہیں۔ داستانِ زبانِ اُردو میں ڈاکٹر شوکت سبزواری واضح کر چکے ہیں کہ ایک زبان کسی ایک ہی قدیم تر زبان سے ارتقا پاتی ہے، کئی زبانیں مل کر ایک نئی زبان کو جنم نہیں دے سکتیں۔ اُردو محض کھڑی بولی سے ارتقا پاتی ہے، دخیل الفاظ کسی زبان کا نسبی شجرہ طے نہیں کرتے۔

"اُردو کی ابتدا کے مختلف نظریات" میں وہ ایک عجیب نظریے کی اطلاع دیتے ہیں۔ ایک شخص بنجمن شلزینو نے ۱۷۴۱ء میں لاطینی میں ہندوستانی زبان کی ایک قواعد لکھی۔ اس کا ایک ناقص انگریزی ترجمہ انڈیا آفس لندن میں ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث نے ۱۹۷۷ء میں اس کا انگریزی متن اور اُردو ترجمہ لاہور سے شائع کیا۔ قواعد نگار کا صحیح نام کیا ہے اس کے بارے میں وہ تذبذب میں ہیں۔ اُنھوں نے چار جگہ اس کا ذکر کیا ہے، ص ۱۶، ص ۶۱ اور ص ۱۲۴ پر وہ اسے "شلز یا شلزے" لکھتے ہیں لیکن ص ۱۵۸ پر شلزینو۔ ص ۱۵۹ کے فٹ نوٹ میں اُنھوں

Scanned by CamScanner

نے اس کا نام انگریزی میں Schulzino لکھا ہے جس کا تلفظ شلزینو ہی ہونا چاہیے۔ اس کے مطابق ہندوؤں اور فارسیوں کے میل جول سے جو زبان ہندوستانی یا ہندی بنی وہ دراصل فارسی کی ایک بولی تھی۔ ہندوستان کے مختلف صوبے سرحد ایران سے جتنی دور ہوتے تھے ان کی بولی فارسی سے اتنی ہی زیادہ مختلف ہوتی تھی۔(ص ٦١) عجیب نظریہ ہے آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اُردو میں فارسی کے جو الفاظ ہیں ان کا ایک بڑا حصہ خود عربی الاصل ہے لیکن اس کی بنا پر اُردو کو عربی زبان کی ایک شاخ نہیں کہہ سکتے۔" (ص ٦٢)

اردو میں جو فارسی الفاظ ہیں میری فہم کی حد تک وہ عربی الاصل نہیں۔ اگر ہوتے تو انھیں فارسی لفظ کیوں کہا جاتا۔ مؤلف نے اُردو کی ابتدا کے مختلف نظریوں۔ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اطناب سے بچنے کے لیے میں اس پر تبصرہ قلم زد کرتا ہوں۔

اگلے باب "اُردو کے مختلف نام" میں خبر دیتے ہیں کہ اُنھوں نے کوئی پچاس برس پہلے میر کے دیوانِ فارسی کا سراغ لگا کر شائع کردیا(ص ۷۲) یہ اطلاع اس تاریخ میں کس جگہ دی ہے۔ "اُردو کے مختلف نام" کے باب میں یہ بالکل غیر متعلق ہے۔ معلوم نہیں کس طرح میر کے نکات الشعرا کا سال ۱۱٦۱ھ مطابق ۱۷۸۷ء لکھتے ہیں(ص ۷۳) صحیح ۱۱٦۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء ہے۔ اس کتاب میں سہو کتابت اتنے ہیں کہ نہیں کہہ سکتے۔ مؤلف نے ۱۱٦۱ھ کے ساتھ واقعی کون سا عیسوی سنہ لکھا تھا۔ میر ہی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ وہ جب دہلی سے فیض آباد اور لکھنؤ کے لیے گئے تو بہلی میں کوئی شخص شریکِ سفر تھا۔ اس سے بات چیت کرنے کو انکار کردیا کہ زبان بگڑے گی۔(ص ۷٦-۷۵۔ مکرر ص ۲۰۲)

ظاہراً یہ لطیفہ آب حیات سے لیا ہے اور اسے بغیر پرکھے قبول کرلیا۔ قاضی عبدالودود ذکر میر کی سند پر لکھتے ہیں کہ آصف الدولہ نے اخراجات سفر بھیج کر انھیں بلایا تھا۔ اہلِ خانہ ساتھ تھے۔ کسی کی شرکت میں گاڑی لینے کی کوئی ضرورت نہ تھی(۲)۔ بیل گاڑی سے دلی تا لکھنؤ کے سفر میں دو تین ہفتے لگنے چاہئیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نک چڑھا اتنے عرصے تک ہم سفر سے ہم کلام نہ ہو۔ مؤلف اگلے صفحے پر لکھتے ہیں:

"گو تم نے جو برہمنوں کا زور توڑنے کے لیے ماگدھی پراکرت کو اختیار کی (کذا) اور اسے اتنی ترقی دی کہ اس نے سنسکرت کی کمر توڑ دی اور پھر کبھی اسے وہ اقتدار نصیب نہیں ہوا جو آریوں نے سنسکرت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔" (ص ۷۷)

Scanned by CamScanner

آریوں اور سنسکرت سے بُغض کے سبب مؤلف نے اتنی غلط بیانیوں کے ڈھیر لگا دیے۔ بھگوان بدھ خود آریہ تھے، غیر آریہ نہیں۔ اُنھوں نے پالی کا استعمال کیا، ماگدھی پراکرت کا زمانہ ان سے کوئی ۶۰۰ سال بعد مولودِ مسیح سے ہے۔ پالی میں صرف بودھوں کے مذہبی صحیفے ملتے ہیں، اس سے ہٹ کر اور کچھ نہیں۔ یہ مسلّم کہ سنسکرت تقریباً ۵۰۰ ق م کے بعد عام بول چال کی زبان نہیں رہی لیکن سنسکرت ادب کے تمام شاہکار اور بڑے ادیب مہاتما بدھ کے بعد کے ہیں وہ کالی داس ہو کہ بھو بھوتی۔ ان سے پہلے صرف سنسکرت رزمیے اور پُران وغیرہ ملتے تھے۔ سنسکرت تقریباً ۱۲۰۰ء تک ہندو راجاؤں کے دربار میں جاری رہی۔ مؤلف مزید فرماتے ہیں:

"مہابیر جین نے جینی کو بھی یہی اعتبار بخشا۔" (ص ۷۷)

جینی کسی زبان یا بولی کا نام نہیں۔ مہابیر سوامی کی تصنیف سے کوئی کتاب یا ایک صفحہ نہیں ملتا۔ جین دھرم کی کتابیں ان کے کئی صدی بعد پراکرتوں میں لکھی گئیں۔

مؤلف نے ص ۷۹ پر قدیم مشنریوں کی غیر انگریزی تحریروں سے ہماری زبان کا نام ہندی، ہندوستانی، اندوستانا وغیرہ کی مفید مثالیں دی ہیں لیکن نہ ان کے راوی کا نام دیا ہے نہ زمانہ۔ ان دونوں کو ظاہر کر دیتے تو بات مستند ہو جاتی۔ آگے چل کر ص ۸۱ پر لکھتے ہیں کہ فرشتہ کے مطابق کالنجر کے راجہ آنند نے ۱۰۲۲ھ میں سلطان کی مدح میں ہندی اشعار لکھ کر بھیجے۔ اسی صفحے پر لکھتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان کا ہندی دیوان بھی تھا۔ میں شمس اللہ قادری کی اُردوئے قدیم کے سلسلے میں حیدر آباد کے ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کی کتاب "حیدر آباد میں اُردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے" (حیدر آباد ۱۹۹۰ء) کی سند پر لکھ چکا ہوں کہ قدیم مورّخ، بالخصوص فرشتہ کسی بھی ہندوستانی زبان حتّیٰ کہ سنسکرت تک کو ہندی یا ہندوی کہہ دیتے تھے۔

لکھتے ہیں کہ ہندوؤں نے اپنے لفظوں کا ترجمہ بھی فارسی میں کر لیا۔ کایستھ ہندوؤں کی اپنی فارسی ہو گئی جس میں چھپکلی کو پوشیدہ غنچی اور گڑگڑی (حقہ) کو قند قندی کہنے لگے۔ (ص ۸۲)

ان لفظوں کے ہندی اجزا کا فارسی ترجمہ کیا ہے: چھپ = پوشیدہ، کلی = غنچی، گڑ = قند۔ گڑی؟ قندی انھیں حوالہ دینا چاہیے تھا کہ کس ثقہ کایستھ کے یہاں یہ ترجمے ملتے ہیں۔ ایسے بازاری لطیفوں کو ایک علمی کتاب میں لسانی واقعے کے طور پر درج نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اگلے باب کا عنوان ہے "اُردوئے قدیم اور اُردوئے جدید" ظاہراً اُردوئے قدیم سے مراد دکنی ہے لیکن اُنھوں نے اس میں شمالی ہند کے قدیم الفاظ بھی دے دیے ہیں۔ فہرست

Scanned by CamScanner

صرف الف سے پ تک کے الفاظ کی ہے۔ واضح نہیں کہ یہ انھیں نے تیار کی ہے کہ کہیں سے نقل کی ہے۔ اس کے بعد کے باب کا عنوان ہے "اُردو کی اصنافِ سخن" یہ ص۹۷ سے ص۱۱۲ تک یعنی ۱۶ صفحوں پر ہے۔ قدیم اصناف ہوں کہ جدید دونوں کے معاملے میں بیان تشنہ ہے۔ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان جلد ۶ میں اُنھوں نے جواسی عنوان کا مضمون لکھا ہے وہ ص۲۸۲ سے ص۳۵۹ تک ہے یعنی ۷۸ صفحات کو محیط ہے۔ بے ترتیبی اور خلطِ مبحث وہاں بھی ہے لیکن صفحات کی کثرت کی وجہ سے تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اپنی تاریخ میں وہ اتنے صفحے تو نہیں دے سکتے تھے لیکن جملہ اہم اصناف کی فہرست اور گروہ بندی تو کرسکتے تھے۔ ہیئتی اور موضوعی اصناف کا الگ الگ بیان کرنا چاہیے تھا۔ نامہ کے لاحقے والی قدیم اصناف کے سلسلے میں خواجہ بندہ نواز کا ایک چکّی نامہ مثال میں دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطات میں درج کیا ہے لیکن اس کی زبان اتنی صاف ہے کہ اس دور کی نہیں ہوسکتی۔

وہ ایک صنف "جھولنا" کا ذکر کرتے ہیں جس کو لوری گیت یا گانے سے ملتبس کیا ہے۔ وہ اس کی نوعیت سے واقف نہیں۔ یہ قدیم ہندی کی ایک عروضی صنف ہے۔ اُردو جھولنا ۳۷ ماتراؤں کے چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ آگے چل کر مؤلف کبت کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بھی ہندی کی عروضی صنف ہے۔ یہ ۳۱ اکشر (Syllable) کے چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے، اکشر خواہ طویل ہو خواہ خفیف۔ ان اصناف کی تفصیل میری کتاب ادبی اصناف میں ملاحظہ ہو(ص۸۷-۸۶ احمد آباد ۱۹۸۹ء) مؤلف نے ہندی کی تیسری صنف "دوہرہ" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں ان کی ناواقفیت ہمالیائی ہے۔ لکھتے ہیں "عام طور پر اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے دو مصرع ہم قافیہ اور دوسرے دو مصرعے الگ ہم قافیہ ہوتے ہیں۔"(ص۱۰۲)

عزلت کے یہاں سے نمونہ بھی چار مصرعوں کا دیا ہے۔ اس صنف کا صحیح نام دوہا ہے، دوہرہ نہیں۔ مبتدی بھی جانتے ہیں کہ دوہا دو مصرعوں کا ہوتا ہے، چار کا نہیں۔ ہر مصرع کے دو جزو ہوتے ہیں پہلا جزو ۱۳ ماترا کا، دوسرا ۱۱ ماترا کا۔ جس دوہے کا مصرع ۲۴ ماترا کا نہ ہو اسے دوہا نہیں کہہ سکتے۔ دوہے کے مصرع کے اجزا آپس میں ہم قافیہ نہیں ہوتے۔ دوہے کے سلسلے میں مؤلف ص۹۵۹-۹۵۸ پر مزید لڑکھڑائے ہیں۔ اس کا تجزیہ وہاں پہنچنے پر کیا جائے گا۔ مؤلف جکری کا بھی نام لیتے ہیں اور نمونہ دیتے ہیں(ص۱۰۳-۱۰۲) اسے چکری لکھا ہے لیکن وہ سہوِ کتابت ہونا چاہیے۔ مؤلف اس کی ساخت اور اجزا کے بارے میں نہیں بتاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اصناف کے نام ہی جانتے ہیں، ان کی خصوصیت

Scanned by CamScanner

کا عرفان نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں:

"ان مثالوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اُردوئے قدیم یا
ہندوی/ہندی کے دور کے صوفیا، شعراء اور مصنفین کسی لسانی
تعصب کا شکار نہیں تھے۔" (ص ۱۳۰)

کاش مؤلف خود بھی اس مسلک پر عمل کرتے۔ اُردو اصناف میں وہ قصیدہ، مثنوی اور غزل، محض تین کا ذکر کرتے ہیں، بقیہ اہم اصناف کا کم از کم نام تو درج کرنا تھا۔ پھر موضوعی اصناف کو کیوں نظر انداز کیا۔ وہ قیامِ پاکستان کے بعد نئی عوامی اصناف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مثلاً اشور جان جو کھوار شاعری کی ایک قدیم اور مقبول صِنف
ہے۔" (ص ۱۰۸)

میں نہ اشور جان سے واقف ہوں نہ کھوار سے۔ مجھے اصناف سے دلچسپی ہے۔ کاش وہ اشور جان کی مزید تفصیل دے دیتے۔ اُنھوں نے "نثری نظم" کی متضاد ترکیب پر جو اعتراض کیا ہے، اس سے مجھے اتفاق ہے۔ نظم کے بعد وہ نثری روپ پر آتے ہیں لیکن اس کی ایک بھی صِنف کا نام نہیں دیتے۔ چند قدیم کتابوں کا نام لیا ہے اور بس مثلاً اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ، معراج العاشقین۔ لکھتے ہیں:

"دوسرا رسالہ جس کا ہم ذکر کر چکے معراج العاشقین ہے۔" (ص ۱۱۰)
"دکن میں ان رسالوں کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا حضرت میراں
جی کی تصنیف مقلوب القلوب (کذا، صحیح مرغوب القلوب) جس کا
نمونہ ہم اوپر دے چکے۔" (ایضاً)

ان رسالوں کا نہ کہیں ذکر کیا ہے، نہ نمونہ دیا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ باب اصلاً کسی اور کتاب یا رسالے میں چھپا ہوگا جہاں نمونہ درج کیا ہوگا۔ یہاں نمونے کو حذف کرنے کے باوجود وہی بات لکھ دی۔ ان کتابوں کی صحتِ انتساب کو آئندہ ابواب میں لوں گا۔ فضلی کی کتاب کا نام وہ مجلس لکھتے ہیں حالانکہ اس میں ۱۲ مجلسیں ہیں۔ اس کا صحیح نام "کربل کتھا" ہے، لیکن یہ سب کتابوں کے نام ہیں، اصنافِ نثر کے ذیل میں انھیں درج کرنا کیا معنی؟

اگلا باب "اُردو کا علم عروض" ہے محض پانچ صفحوں کا جس میں ہندی اور اُردو دونوں کے عروض کو نمٹا دیا ہے۔ محض نام لکھ دینے سے فائدہ؟ اس کے بعد کا باب اُردو قواعد نگاری ہے۔ اس میں مستشرقین کی ۱۹ قدیم قواعدوں کے نام اور سنین مفید ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ ہندوستانی قواعد نگاروں کے نام بھی لیے ہیں۔ اتفاق سے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

Scanned by CamScanner

کی کتابیاتِ قواعد میں سیکڑوں قدیم و جدید کتابوں کی تفصیل ملتی ہے۔ بہرحال مؤلف کا یہ باب گزشتہ کئی بابوں کے مقابلے میں تشفی بخش ہے۔ فہرست کے برخلاف عروض والے باب کے بعد اُردو رسم الخط کا باب ہے۔ اس میں اُردو رسم الخط کی بین الاقوامی افادیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"یہ مسلمانوں کے اتحاد کی ایک بڑی علامت تھی اور اسی خطرہ کا احساس گاندھی نے اسے قرآنی حروف کہہ کر کیا تھا۔" (ص ۱۳۸)

وہ مہاتما گاندھی پر یہ الزام بار بار عائد کرتے ہیں:

اُردو ہندی قضیہ میں گاندھی جی کا کھل کر ہندی ہندوستانی کے جھگڑے میں ایک فریق کا ساتھ دینا اور اُردو کو اس بنا پر مسلمانوں کی زبان قرار دینا کہ اس کا رسم الخط قرآنی تھا عجب لسانی مغالطہ تھا۔" (ص ۱۱۵۸)

اگر مہاتما گاندھی نے واقعی ایسا کہا ہوتا تو ان سے ڈاکٹر ابواللیث کی تمام خفگی برحق تھی لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کہا۔ اس کی تردید بارہا ہو چکی ہے۔ میں نے اپنے مضمون "مہاتما گاندھی اور مشترکہ زبان کا مسئلہ" میں اسے تفصیل سے لکھا ہے۔ (۳) ایک بار پھر اعادہ کرتا ہوں۔

مہاتما گاندھی ۱۹۰۹ء سے تادمِ مرگ، بغیر کسی تزلزل کے ملک کی قومی زبان کے لیے دونوں رسوم الخط کی حمایت کرتے رہے۔ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء کے ہند سوراج میں یہ مطالبہ کیا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں وہ دوسری بار ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر ہوئے تو سمیلن سے دونوں رسوم الخط کی بات منوالی جیسا کہ اُنھوں نے ۳ جولائی ۱۹۳۷ء کے ہریجن سیوک میں لکھا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے ڈاکٹر جعفر حسن نے مہاتما جی سے قرآنی حروف والے قول کی وضاحت چاہی۔ مہاتما جی نے ۲۹ ستمبر ۱۹۴۲ء کو جواب دیا کہ "میں نے خود اُردو سیکھی ہے اور مولانا شبلی کی سیرت النبی اور اُردو کی دوسری تحریریں پڑھی ہیں۔" بعد میں ۱۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو بردولی سے لکھا:

"میرا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میرے ریمارک اسی طرح کے ہو سکتے تھے جس طرح کا وہ ایڈریس تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مولانا صاحب کے اعتراض کو ٹھیک قرار دے۔"

ڈاکٹر جعفر حسن نے یہ ساری مراسلت ہماری زبان علی گڑھ بابت ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع کر دی ہے۔ مہاتما گاندھی کی اس تردید کے دوسرے شاہد حیات اللہ انصاری ہیں۔

Scanned by CamScanner

اُنھوں نے پہلے بھی مجھے بتایا تھا اور ۲۹ نومبر ۱۹۹۵ء کو پھر واضح کیا کہ مولوی عبدالحق بہت اونچا سنتے تھے۔ ناگپور پریشد کے اجلاس میں ان کے پاس ڈاکٹر اختر رائے پوری بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے مولوی صاحب کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لیے یہ جملے وضع کر کے مہاتما گاندھی سے منسوب کر دیے اور مولوی صاحب نے باور کر لیا۔ انصاری صاحب نے مجھے بتایا کہ اختر رائے پوری علی گڑھ میں ان کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ انصاری ان کے مزاج کو جانتے تھے۔ انصاری صاحب اور بیگم سلطانہ حیات مرحومہ نے بہ نفسِ نفیس مہاتما جی سے ان جملوں کی تصریح چاہی۔ مہاتما جی نے ان دونوں کے سامنے انکار کیا کہ اُنھوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ انصاری صاحب ایک بار پاکستان گئے اور وہاں اختر رائے پوری سے اس کا ذکر چھیڑا تو اختر ٹال گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے حال میں مجھ سے کہا کہ یہ کام حکیم اسرار کریوی کا تھا، لیکن حیات اللہ انصاری معاصر شاہد ہیں، ان کا قول صحیح ہوگا۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے بٹوارے کا فیصلہ ہو گیا اور انھیں بتایا گیا کہ قومی زبان ہندی ہوگی اور دیوناگری میں لکھی جائے گی تو اُنھوں نے لکھا کہ میں اس پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتا۔ (اخبار ہریجن ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء)

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آیندہ سے یوپی کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری لپی کے ساتھ ہوگی۔ اس سے مجھے دکھ ہوا۔"

ان کا آخری قول ۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کا ہے:

"کیا وہ ایک اکھل بھارتیہ بھاشا (کل ہند زبان) کی سیوا کر سکتے ہیں اگر اُردو لپی اور بھاشا کو اس سے نکال دیا جائے۔ میں تو ہمیشہ تمھارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے شبدوں کو یاد کرو گے۔"

مہاتما گاندھی مسلمانوں کے بین الاقوامی اتحاد کے مخالف نہ تھے یہ ان کی خلافت تحریک کی حمایت سے ظاہر ہے۔ وہ قرآن مجید کا احترام کرتے تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ روزانہ شام کے پانچ بجے ہونے والی پرارتھنا سبھا میں ہمیشہ کلامِ مجید کی بھی قرأت کی جاتی تھی۔ اُردو رسم الخط کے اس قدر مضبوط وکیل کو اس کا دشمن قرار دینا معترض کی ناواقفیت اور تنگ نظری کی دلیل ہے۔

باب ۱۲ "ہندوی، ہندی یا اُردوئے قدیم کے ابتدائی نمونے" سے تاریخِ ادب شروع

Scanned by CamScanner

ہوتی ہے۔ ص ۱۴۶ پر وہ کئی صوفیا کے ملفوظات نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے نام کے آگے ایک عیسوی اور ہجری سنہ لکھا ہے۔ واضح نہیں کہ یہ سنہ کا ہے کا ہے ولادت کا، وفات کا یا ملفوظ والی کتاب کا؟ قدیم ترین ادبی تخلیقات میں وہ صنعتِ انتساب کو نہیں جانچتے۔ امیر خسرو سے منسوب وہ ایسی چیزیں بھی لکھ دیتے ہیں:

خوار شدم زار شدم لٹ ہے (کذا)

در غم ہجر تو کمر ٹوٹہ ہے

(ص ۱۴۸)

خسرو کہے باتاں عجب دل میں نہ لاوے کچھ عجب

قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا دل لائے کر

(ص ۱۴۹)

پہلے شعر والی غزل محمود شیرانی نے شیخ جمالی م ۹۴۲ھ کے نام سے دی ہے۔ وہ سکندر لودھی تا ہمایوں کے عہد کا شاعر ہے۔ شیرانی نے اس کا قافیہ و ردیف "ٹٹ گیا" لکھی ہے۔ (پنجاب میں اُردو۔ لکھنؤ ایڈیشن ص ۴۳)

مؤلف ان تخلیقات کے بارے میں گول مال رہتے ہیں، اپنی دو ٹوک رائے نہیں دیتے۔ بکٹ کہانی کے مصنف کا نام محمد افضل جھنجانوی م ۱۰۳۵ھ لکھتے ہیں۔ میں پیچھے علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ "بکٹ کہانی" کا مصنف افضل، "ریاض الشعرا" والا فارسی شاعر افضل نہیں۔ شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے کا ذکر بغیر تذبذب کے کرتے ہیں۔ "معراج العاشقین" کے انتساب کے بارے میں بھی اپنا موقف ظاہر نہیں کرتے۔" (ص ۱۵۱)۔ یہ تحقیقی ذمےداری سے گریز کرنا ہے۔ میراں جی شمس العشاق سے شرحِ مرغوب القلوب کو بلا کسی تامل کے منسوب کرتے ہیں۔ (ص ۱۵۲) ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب میراں جی خدا نما میں ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب دراصل خدا نما کی ہے۔

مؤلف مزید لکھتے ہیں:

"جانم کے ایک مرید اور خلیفہ شیخ محمود عین الحق تھے۔ اُنھوں نے ایک رسالہ خوش دہاں کے نام سے لکھا ہے۔" (ص ۱۵۴)

رسالے کا نام خوش دہاں نہیں، کوئی بھی نام نہیں مصنف کا لقب خوش دہاں ہے۔ تاریخِ ادب کے اس باب کے بعد پھر لسانیات کا باب لے آتے ہیں۔ "اُردو زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات" اس میں دریائے لطافت سے انشا اور مرزا مظہر جانِ جاناں کا مشہور مکالمہ شرفا اور عالموں

Scanned by CamScanner

کی آپس کی عام گفتگو کے طور پر پیش کیا ہے۔ میں یہ ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں کہ "ابتدائے سن صبا سے تا اوائلِ ریعان اور اوائلِ ریعان سے تا الی الآن اشتیاقِ مالایطاقِ عتبۂ عالیہ نہ بحدّے تھا...الخ کسی بقراط کی بھی عام گفتگو کیا خاص گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں بھی انشا کی خوش طبعی شامل ہے۔ یا تو وہ یہ جملے لکھ کر لے گئے ہیں یا اپنی معمول کی گفتار کو قارئین کے تفننِ طبع کے لیے مرصع بنا کر پیش کیا ہے۔ مؤلف نے اس باب میں اُردو پر دوسری ہندوستانی زبانوں مثلاً ہندی، پنجابی، اودھی، مراٹھی وغیرہ کے اثرات کا ذکر نہیں کیا۔

اگلا باب اُردو شاعری کا دکھنی دور ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ دکن کی خود مختار ریاست میں فارسی کی جگہ یہی ہندوی/ہندی/ہندوستانی/دکھنی سرکاری اور عدالتی زبان ٹھہری (ص۱۷۱) میں پیچھے "اُردو کے مختلف نام" ص۸۱ کے سلسلے میں ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کی تحقیق کا ذکر کر چکا ہوں کہ دورِ جدید سے پہلے اُردو کبھی دفتری زبان نہیں تھی۔ قدیم فارسی مؤرخ کسی بھی ہندوستانی زبان کو ہندی/ہندوی/ہندوستانی کہہ دیتے تھے۔

دکنیات کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث کی معلومات کتنی سرسری ہیں اس کا اندازہ قلی قطب شاہ کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ پہلے تو صحیح لکھتے ہیں کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ پھر لکھتے ہیں:

> "اس کا دربار شاعروں اور ادیبوں کا مجمع تھا جن کی وہ دل کھول کر قدر کرتا تھا جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور سے شروع ہوا۔ اس کا زمانہ ۱۶۲۵ء، ۱۶۷۲ء ہے۔" (ص۱۷۴)

وہ محمد قلی کے دور کو عبداللہ کے دور کے بعد رکھ رہے ہیں اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اگلے صفحے پر اور کھل کر کہتے ہیں کہ وجہی نے "سب رس" عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی اور پھر قلی قطب شاہ کے دربار میں عزت پائی (ص۱۷۵)۔ میں حیران تھا۔ نثری حصے میں بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ""سب رس" کا مصنف وجہی عبداللہ قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا، اس کا بیٹا سلطان محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ تا ۱۰۶۰ھ کو (کذا) جب وہ شاہزادہ تھا وجہی نے اپنی ایک مثنوی قطب مشتری کا ہیرو بنایا ہے۔" (ص۹۷۳)

ان بیانات میں متعدد غلطیاں ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۰۶۰ھ نہیں، ۱۰۲۰ھ ہے۔ عبداللہ کا نام عبداللہ قلی قطب شاہ نہیں، عبداللہ قطب شاہ ہے۔ محمد قلی، عبداللہ کا بیٹا نہیں، نانا تھا۔ مثنوی قطب مشتری محمد قلی قطب شاہ کے دور شہزادگی میں

Scanned by CamScanner

نہیں، اواخرِ دورِ سلطنت میں لکھی گئی گو قصے میں محمد قلی کو شاہزادہ دکھایا ہے۔ مثنوی قطب مشتری "سب رس" کے بعد نہیں، بہت پہلے لکھی گئی۔ واپس آئیے شعری حصے کی طرف۔ لکھتے ہیں:

"بعض حضرات نے وجہی کی ایک اور اُردو نثر کی تصنیف "تاج الحقائق" کا ذکر کیا ہے لیکن وہ اب تک شائع نہیں ہوئی۔" (ص ۱۷۶-۷۷)

مؤلف صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ ان کی رائے میں یہ وجہی کی ہے کہ نہیں۔ ان کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ "تاج الحقائق" اب تک شائع نہیں ہوئی۔ اسے ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر نورالسعید اختر نے ترتیب دے کر بمبئی سے شائع کردیا ہے۔ اختر اور وجہی کے محقق ڈاکٹر جاوید وشسٹ کی رائے میں یہ کتاب وجہی ہی کی ہے۔ یہی میری رائے ہے۔ مؤلف لکھتے ہیں کہ مثنوی "قطب مشتری" میں شہزادہ محمد قلی قطب شاہ اور اس کی محبوبہ بھاگ متی کے عشق کی داستان نظم کی ہے (ص ۱۷۷)۔ نہیں۔ یہ دونوں مختلف شخصیتیں ہیں، بھاگ متی ایک طوائف تھی، مشتری بنگال کی داستانی انداز کی شہزادی ہے۔
غواصی کی مثنویوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اس کے علاوہ ایک اور مثنوی مینا ستونتی اور ایک چندا اور لورک کے بھی حوالے ملتے ہیں۔" (ص ۱۷۹)

مینا ستونتی ہی میں چندا اور لورک کا قصہ ہے۔ اسے عرصہ ہوا ڈاکٹر غلام عمر خاں شائع کرچکے ہیں۔ رستمی کی مثنوی "خاور نامہ" میں روایت کے مطابق ۲۴ ہزار اشعار بتاتے ہیں (ص ۱۸۲)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اس میں ۲۲۰۶۱ شعر ہیں (تاریخ جلد اوّل، ص ۲۶۶)۔ ظاہراً اُنھوں نے یہ تعداد "خاور نامہ" مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء کو دیکھ کر لکھی ہے۔
نصرتی کے سلسلے میں اس روایت کو بیان کرتے ہیں کہ اورنگ زیب نے نصرتی کو بلا کر "ملک الشعرا" کا خطاب دیا تھا (ص ۱۸۲) انھیں یہ معلوم نہیں کہ نصرتی ۱۰۸۵ھ میں قتل ہوا اور اورنگ زیب نے ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور کو فتح کیا۔ نصرتی کی تین مثنویوں کے علاوہ غزلوں کے ایک مجموعے "گلدستۂ عشق" کا نام بھی لیتے ہیں (ص ۱۸۳) وہ نہ تحقیق کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ اپنا ماخذ درج کرنے کی۔ میں شمس اللہ قادری کی اُردوئے قدیم کے سلسلے میں اس غلط فہمی کا پردہ چاک کرچکا ہوں۔ اسٹیوارٹ نے لکھا ہے کہ کتب خانۂ ٹیپو سلطان میں نصرتی کی دو مثنویاں "علی نامہ" اور "گلشنِ عشق" تھیں۔ آخرالذکر کے ساتھ ایک اور کتاب "گلدستۂ عشق" مجلد تھی۔ اسٹیوارٹ نے یہ نہیں لکھا کہ یہ بھی نصرتی کی تصنیف تھی۔

Scanned by CamScanner

دوسروں نے اپنے تخیل سے کیا کیا ایزاد کردیا۔

اگلا باب "ولی اور ان کے معاصرین" ہے۔ یہ ان کی فیصلہ نہ کرنے کی خو کی معراج ہے۔ ولی کے نام اور وطن کے بارے میں کئی رائیں درج کی ہیں، صرف اپنی رائے پوشیدہ رکھی ہے۔ ولی کی ولادت کے سنہ ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۸ء کے لیے لکھتے ہیں کہ اس پر اکثر حضرات نے اتفاق کیا ہے (ص ۱۸۴)۔ کنھوں نے؟ اس کی صراحت نہیں کی۔ اس سے کہیں زیادہ اہم تاریخِ وفات نہ درج کی ہے نہ بحث اٹھائی ہے۔ ولی جیسے سنگ میل شاعر کو محض سوا دو صفحے دیے ہیں جب کہ آگے چل کر شاہ حاتم کو ۱۲ صفحے اور نظیر اکبر آبادی کو ۳۰ صفحے دیے ہیں۔ ریختی کے بارے میں یہ بات کام کی کہی ہے کہ یہ عورتوں کی زبان نہیں، ان کے صرف ایک طبقے یعنی بازاری عورتوں کی زبان ہے۔ (ص ۱۸۸)

اگلے باب "دورِ شعرائے ایہام گو" سے شمالی ہند کی داستان شروع ہوجاتی ہے۔ جلوۂ خضر میں شہنشاہ اکبر اور نورجہاں سے جو اُردو اشعار منسوب کیے ہیں ان کی حقیقت بیان کرتے ہیں، ماخذ کو حسبِ معمول چھپا جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے بھی اپنی کتاب "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ" میں نورجہاں سے منسوب یہ اشعار لکھ کر ان کے مصنف کا نام لکھا ہے لیکن ساتھ ہی ازراہِ دیانت قوسین میں یہ لکھ دیا ہے:

(یاد پڑتا ہے کہ کوئی صاحب اس انتساب کی نشان دہی کہیں کرچکے ہیں)

کاش ابواللیث بھی اس اصول پر کاربند ہوتے۔ رشید حسن خاں نے زیب النسا سے منسوب دو اشعار درج کرکے ان کے مصنف کا انکشاف کیا۔ یہ ان کی تحقیق ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے ص ۱۹۲ کے آخری الفاظ ہیں "لکھنؤ میں رہتے تھے اور وفات" ص ۱۹۳ کی ابتدا ہوتی ہے "ظاہر کچھ ہوتا ہے اور مقصود اس سے بالکل مختلف۔" ظاہر ہے دونوں صفحوں کے بیچ کچھ چھوٹ گیا ہے۔ ایہام کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"سنگؔ شاہ حاتم (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۰ء) کے یہ دو شعر دیکھیے" (ص ۱۹۳)

یہ سنہ کا ہے کا ہے؟ حاتم نے دیوان زادہ ۱۱۶۹ھ میں مرتب کیا، انتقال ۱۱۹۷ھ میں ہوا۔ پھر یہ ۱۱۷۱ھ کیا ظاہر کرتا ہے؟ اُردو میں صنعتِ ایہام کہاں سے آئی اس کے بارے میں ایک صفحہ ۱۹۳ کی بحث اچھی ہے۔ آبرو کی "مثنوی در موعظِ آرائشِ معشوق" کے لیے لکھتے ہیں:

"کہتے ہیں اس میں آبرو نے اس عہد کے معشوقوں کی آرائش اور سامانِ آرائش کی تفصیل لکھی تھی۔" (ص ۱۹۵)

حیرت ہے کہ مولف نے یہ مثنوی نہیں دیکھی۔ اسے فرحت اللہ بیگ نے رسالہ اُردو

Scanned by CamScanner

۱۹۳۰ء میں شائع کردیا تھا۔ میں نے اُردو مثنوی پر اپنی کتاب میں اس پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ "معشوقوں کی آرائش" سے اگر مؤلف کا مطلب ہے "اس عہد کی نازنینوں کی آرائش" تو وہ غلطی پر ہیں، آبرو نے اس مثنوی میں امردوں کی آرائش کا ذکر کیا ہے۔

شرف الدین مضمون کے بارے میں سکسینہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کا دو سو اشعار کا دیوان موجود ہے۔ اکثر جگہ فحش مضامین ہیں (ص ۱۹۶) لیکن جمیل جالبی لکھتے ہیں "مضمون کا دیوان نایاب ہے" (جلد ۲، حصہ ۱، ص ۲۵۹)۔ یہی درست ہونا چاہیے۔ "آبِ حیات" اور جالبی کی تاریخ میں مضمون کے جو اشعار درج ہیں ان میں کوئی فحش نہیں، ہاں امردوں کا ذکر کثرت سے ہے۔ شاکر ناجی کے لیے لکھتے ہیں کہ ان کا دیوان تلف ہوگیا۔ (ص ۱۹۸) سچ یہ ہے کہ ان کے دیوان ڈاکٹر فضل الحق نے ۱۹۶۸ء میں دہلی سے شائع کیا۔ ڈاکٹر جالبی نے مجھے بتایا کہ پاکستان میں بھی کسی نے ترتیب دیا ہے۔ حاتم کا بیان ص ۲۰۲ سے ۲۱۴ تک ہے۔ اس میں نثر کم، نمونہ کلام زیادہ ہے۔ مختلف شعرا کی زمین میں حاتم کی پوری غزلیں نقل کی ہیں۔ جیسے یہ طول کلامی کم تھی، کاتب اور طابع کے کھیلے سے ص ۲۰۸-۲۰۷ کا مضمون مکرر ص ۲۱۱-۲۱۰ پر چھپ گیا ہے۔ یہ دراز نفسی حاتم کی محبت یا اہمیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ مؤلف نے دیوانِ حاتم ترتیب دیا ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ (ص ۲۵، سطر ۲۰)

حاتم کے بعد ایرانی اور ہندوستانی فارسی کی مسابقت کا بیان ہے۔ ان کے بقول "ایرانی ہندوستان والوں کی فارسی کے متعلق کہنے لگے "بوئے کھچڑی می آید" کھچڑی خالص ہندی کھانا تھا اور بلاشبہ اس کی خاص بُو تھی۔" (ص ۲۱۴)

مجھے اس میں شبہہ ہے کہ یہ طنزیہ جملہ ایرانی، ہندوستان کے مسلمان فارسی ادیبوں پر کرتے تھے۔ مسلمانوں کے دسترخوان میں کھچڑی کہاں ہوتی ہے۔ یہ خالص ہندوانہ پکوان ہے۔ یہ طنز ہندوستان کے فارسی ادیب، ہندو، بالخصوص کایستھ ادیبوں پر کرتے تھے، آخرالذکر کی فارسی، نیز اُردو دونوں پر۔ ایرانی ہندی فارسی مسابقت کے سلسلے میں مؤلف نے شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے معرکے کی اطلاع دی ہے نیز یہ کہ ان کی نگرانی میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے کسی کو خان آرزو کے کارنامے مشر کی ترتیب پر پی۔ ایچ۔ ڈی دی ہے۔ (ص ۲۱۶)

مؤلف تذکرۂ مصحفی سے مرزا مظہر جانِ جاناں کے دیوانِ ریختہ کے بارے میں ذیل کی رائے نقل کرتے ہیں ان کا دیوان حقیقت یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت کا مجموعہ ہے اور شانِ استادی اس سے ظاہر ہے۔" (ص ۲۱۶)

Scanned by CamScanner

ہندی گویاں میں مصحفی نے ترجمۂ مظہر میں اُن کے شاگرد انعام اللہ خاں یقیں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہور می دہد"

ڈاکٹر ابواللیث یہ سمجھے کہ یہ بات خود مظہر کے بارے میں ہے۔ مرزا مظہر فارسی کے شاعر تھے ان کا دیوانِ ریختہ غالباً وجود ہی میں نہیں آیا۔ تذکروں میں ان کے چند اُردو اشعار ملتے ہیں۔ عبدالرزاق قریشی نے اپنی کتاب میں ان کے ۱۲۴ اشعار جمع کیے، ان میں سے کئی دوسرے شاعروں کے نام سے بھی ملتے ہیں (جالبی تاریخ جلد دوم، ص ۶۷-۳۶۶)۔ مؤلف نے مظہر کے بعد خان آرزو پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ شمال کے ادب پر اتنا لکھنے کے بعد باب آتا ہے۔

"شمالی ہند میں شعروادب کے پہلے دور کا تاریخی اور سیاسی پس منظر"

اسے تاریخ ادب سے پہلے آنا چاہیے تھا، بیچ میں نہیں۔ اب اس قسم کے ابواب کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ پس منظر کا جو بیان اورنگ زیب کے بعد کے آخری مغلوں کے بارے میں ص ۲۲۵ تا ۲۳۳ پر ہے اسی کے مطالب کی تکرار ص ۲۵۱ تا ۲۵۷ پر ہے۔ ان میں وہ باتیں ہیں جنھیں اب خاص و عام سب جانتے ہیں۔ دراصل اس تاریخ ادب میں حسنِ ترتیب کی بڑی کمی ہے۔ اس باب کے بعد ایک باب آتا ہے۔ "دہلویت" کیا ہے۔ اس میں وہ شریعت کے محتسب اعظم بن کر تصوف اور اُردو غزل کے غیر اسلامی موضوعات کی سخت تنقید کرتے ہیں۔ تاریخی ترتیب کے برعکس اُردو غزل کی خبر لے کر واپس دور اکبر تک جاتے ہیں اور اکبر کی شدید سب وشتم کرتے ہیں۔ عتاب نامے کے بعض جملے "اکبر ایک جاہل آدمی تھا لیکن وہ ریاستِ دنیوی اور دینی دونوں کا طالب تھا۔" (ص ۲۴۷)

"اکبر نے قلعہ کے دروازہ پر خاتون دربان کے اہتمام سے جو اصل میں کسی کلال کی نسل سے تھی، شراب کی ایک دوکان کھلوائی اور شراب کا نرخ مقرر کیا۔ مستوں کے لیے شہر میں ایک دوکان اور بھی تھی اور مشہور یہ تھا کہ اس شراب میں سور کا گوشت بھی شامل تھا۔ سارے ملک سے رنڈیاں لا کر دارالخلافہ میں آباد کی گئیں اور ان کے محلہ کا نام شیطان پورہ رکھا اور وہاں داروغہ اور محافظ مقرر کر کے حرام کاری کو قانونی جواز اور تحفظ فراہم کیا... دربار میں ناقوس بجانے اور نصاریٰ کی طرح باپ بیٹے اور روح القدس کی تصاویر دکھانے کا رواج ہوا، لوگوں کو ترکِ اسلام کے اعلان پر مجبور کیا گیا۔" (ص ۴۹-۲۴۸)

بڑی بھیانک تصویر ہے۔ اورنگ زیب کے لیے لکھتے ہیں:

"اورنگ زیب اس سلسلے کی آخری کڑی تھا جس نے اپنی تمام

قوت اس کے استحکام کے لیے صرف کردی لیکن اس کی آنکھ بند ہوتے ہی پوری عمارت اس طرح بیٹھ گئی جیسے اس کی بنیاد ریت پر رکھی گئی تھی۔ دکن کی طویل فوج کشی نے خزانہ تقریباً خالی کردیا تھا۔" (ص ۲۵۰)

مؤلف نے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اکبر کی پالیسی میں کیا بات تھی کہ اس نے ہمایوں کی لڑکھڑاتی حکومت کے بعد چار ستونِ اعظم دیے اکبر تا اورنگ زیب، اور اورنگ زیب کی پالیسی میں کیا کمی تھی کہ اس کے بعد، بقول اُن کے، عمارت یوں بیٹھ گئی جیسے اس کی بنیاد ریت پر رکھی گئی تھی۔ ان بیانات کے بعد پھر وہی جہاندار شاہ، لال کنور کے قصے، نادرشاہ کا حملہ۔ تین صفحوں پر سودا کا مخمس شہر آشوب نقل کردیا ہے۔ وہ اپنی تحریر کو مرتب کرکے اس میں سے لمبے چوڑے بیانات کی تکرار کیوں نہیں دور کرتے۔ اکبر تا اورنگ زیب کی سیاسی داستان کی لکھنویت کے مقابلے میں دہلویت کے تعین میں کیا معنویت ہے؟

اگلا طویل باب "دور میرومرزا" ہے جس میں پہلی فصل میر پر ہے۔ لکھتے ہیں:
"باستثنائے اقبال شاید ہی کسی اور شاعر پر اتنا لکھا گیا ہو جتنا میر پر" (ص ۲۶۴)۔ یہ درست نہیں۔ غالب پر میر کے مقابلے میں بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ وہ خود میر کے بیانات سے متاثر ہوکر لکھتے ہیں کہ ان کے والد ایک باکمال درویش اور صوفی تھے (ص ۲۶۵)۔ یہ میر کا مبالغہ ہے۔ قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی کہ صوفیا کے کسی تذکرے میں میر کے والد کا نام نہیں ملتا۔ مؤلف میر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کہتے ہیں کہ ان کے کلام کا حال یہ ہے کہ ان کے بلند اشعار بہت بلند اور پست اشعار بہت پست ہیں۔" (ص ۲۷۰)

میں شعرالہند کے سلسلے میں اس قول کی تصحیح کرچکا ہوں۔ شیفتہ نے "گلشنِ بےخار" میں سودا کے احوال میں لکھا ہے کہ آزردہ نے اپنے تذکرے میں میر کی "شرحِ کلام" میں لکھا "پستش اگرچہ اندک پست است امّا بلندش بسیار بلند" مؤلف اندک پست کا ترجمہ بہت پست کرنے میں صاحب "شعرالہند" کے شریک ہوگئے۔ میر کے نمونۂ کلام میں زبانی اس کی، روانی اس کی والی غزل کے دوسرے شعر کا مصرعِ ثانی یہ ہے۔ ع:

اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

قاضی عبدالودود نے اس مصرع میں "ثانی اس کی" کی نامعقولیت پر توجہ دلائی۔ مولف جو بڑے نقاد ہیں اس مصرع کی ردیف وقافیہ کی عدم مطابقت پر نہیں ٹھٹکے۔ میر پر بیان کے

Scanned by CamScanner

آخر میں مصرع لکھتے ہیں۔ ع:

جہاں سے کھولیے ایک شورِدرد انگیز نکلے ہے

اس مشہور مصرع میں درد انگیز نہیں شور انگیز ہے جس سے شمس الرحمان فاروقی نے اپنی تاریخ ساز کتاب کا نام ماخوذ کیا۔ حیرت ہے کہ مؤلف نے میر کی مثنویوں کے بارے میں ایک جملہ نہیں لکھا۔

میر کا بیان ص ۲۷۵ کے شروع میں پورا ہوجاتا ہے۔ اگلے نئے صفحے پر مرزا محمد رفیع سودا کے عنوان سے ان کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح اس باب کے تمام شعرا نئے صفحے سے شروع ہوتے ہیں جس سے یہ تاثر ہوتا ہے جیسے یہ نیا باب ہو لیکن فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک باب کے اجزا ہیں۔ یہ کیسی کتاب بندی ہے۔ سودا کے بارے میں اُنھوں نے بڑی عجیب بات لکھی ہے:

"تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت مند باپ کے عاشق مزاج بیٹے نے سارا ترکہ اور ورثہ عیش و عشرت کی نذر کردیا۔" (ص ۲۷۶)

میں نے ایسا نہیں پڑھا۔ انھیں اپنے بیان کا مدلّل ثبوت دینا چاہیے تھا۔ آزاد نے جو یہ لکھ دیا تھا کہ شجاع الدولہ کے بلاوے کے جواب میں سودا نے رباعی لکھ بھیجی ع: سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک۔ قاضی عبدالودود نے تردید کی کہ اس رباعی کا شجاع الدولہ سے کوئی تعلق نہیں۔ مؤلف لکھتے ہیں کہ ٹانڈے کے نواب محمد یار خاں کی دعوت کے جواب میں لکھ بھیجی (ص ۲۷۸)۔ وہ اس انکشاف کا ماخذ درج کردیتے تو تشفی ہوجاتی۔ خبر دیتے ہیں کہ ان کے پاس کلیاتِ سودا کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جس میں ہجویات میں بہت فحش اشعار ہیں (ص ۲۷۹)۔ معلوم نہیں اب یہ نادر نسخہ کہاں ہوگا۔ وہ ہجویاتِ ضاحک کے سلسلے میں یہ بیش بہا اطلاع دیتے ہیں کہ میر حسن نے بھی باپ کی طرف سے جواب دہی کا پورا پورا حق ادا کردیا (ایضاً)۔ سودا کے قصیدوں کے سلسلے میں مؤلف نے سودا کا قصیدہ تضحیک روزگار پورا نقل کردیا۔ یہ عجیب تاریخ نگاری ہے۔ سودا کی ہجویات کے سلسلے میں ان کے ذیل کے بیانات مجھے پسند ہیں:

"اس طرح کی ہجو نگاری کو ہم اخلاقی معیار سے ادنیٰ درجے کی شاعری سمجھتے ہیں۔" (ص ۲۸۶)

"معلوم ہوتا ہے کہ سودا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احساسِ برتری میں مبتلا تھے۔" (ص ۲۸۷)

سودا کے بعد پہلے میر درد، پھر میر حسن ہیں۔ آخر الذکر کی تاریخِ ولادت معلوم نہیں۔

Scanned by CamScanner

مؤلف نے ۱۱۴۱ھ سے ۱۱۵۴ھ تک لکھی ہے(ص۲۹۴)۔ میر حسن کے محقق ڈاکٹر وحید قریشی نے ان کی تاریخ ۱۱۵۴ھ کے قریب قیاس کی ہے(میر حسن اور ان کا زمانہ ص۲۰۴) جمیل جالبی ۱۱۴۹ھ کے لگ بھگ مانتے ہیں(جلد ۲، ص۸۲۲)۔ مؤلف نے ان کی مثنوی گلزارِ ارم کے دو طویل اقتباس دیے ہیں لیکن حیرت پر حیرت ہے کہ سحرالبیان پر نہ کوئی تنقید ہے نہ نمونے کا ایک بھی شعر۔ یہ کیسے نقاد ہیں۔ مصحفی کے بارے میں نسبتاً تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ مؤلف نے پنجاب یونی ورسٹی کے کتب خانے میں ان کی سوانح مجمع الفوائد کا نسخہ دریافت کیا تھا اور پھر ان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

مصحفی کی جنسی آزادیوں کے سلسلے میں کئی بار متعہ کا ذکر آتا ہے(ص۳۰۰)۔ میرے لیے یہ قدرے حیرانی کی بات ہے میرے علم کی حد تک متعہ صرف شیعوں میں جائز ہے، سنیوں میں نہیں اور مصحفی کو میں سنی سمجھتا ہوں۔ ایک مدخولہ عصمت کے بارے میں رباعی کا ایک مصرع ہے۔ع:

مرجاویں گے یوں ہی عصمت عصمت کرتے

اس میں دوسرے لفظ عصمت کا عین ساقط ہو رہا ہے جو جائز نہیں۔ مؤلف لکھتے ہیں، کہ سلیمان شکوہ نے مصحفی کو اپنا کلام دکھایا(ص۳۰۲ نیز ص۳۱۱) اور اس سلسلے میں وہ اشعار درج کرتے ہیں۔ع: "اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے"، قاضی عبدالودود نے واضح کیا کہ مصحفی کبھی سلیمان شکوہ کے استاد نہیں رہے۔ ڈاکٹر ابواللیث مصحفی کے محقق ہیں، انھیں یہ غلط فہمی کیوں کر ہے۔ وہ خبر دیتے ہیں کہ مصحفی کے بعض اشعار نہایت رکیک اور مبتذل ہیں۔ مصحفی اور انشا کے معرکے کے بارے میں دونوں شعرا کے ذیل میں "آبِ حیات" پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔

رنگین کے بیان میں ان کتابوں کی فہرست اور تفصیل و تنقیدِ کلام میں پھر کوئی التباس اور خلط معلوم ہوتا ہے۔ ص۲۲-۳۲۱ پر کتابوں کی گروہ بندی ہے، پھر تنقید آجاتی ہے، پھر ص۲۵-۳۲۴ پر فہرست و گروہ بندی ہے۔ فہرست کی دوسری قسط سے پہلے کہتے ہیں، "ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے"، اس کے نمونے کے بعد فہرست اور غزل کے اشعار ہیں۔ پھر کہتے ہیں، "ایک اور قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے" ظاہر ہے کہ دونوں قصیدوں کا ذکر مسلسل رہا ہوگا۔ دہلی کے بعض دیگر شعرا کے سلسلے میں ایک شاعر کا نام سرب سنگھ دیوانہ لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود نے کہیں تصحیح کی ہے کہ دیوانہ کا نام "سربُ سکھ" تھا۔

اس کے آگے "لکھنؤ اور لکھنویت" کے عنوان کا باب ہے، محض تین صفحوں کا جس

Scanned by CamScanner

میں ایک صفحہ میر حسن کی مثنوی گلزارِ ارم کے اقتباس کی نذر ہے۔ لکھنؤ کے شعرا کے بارے میں ہم ڈاکٹر ابواللیث کے بیانات پر زیادہ بھروسا کرسکتے ہیں کیونکہ انھوں نے لکھنؤ کے دبستانِ شاعری پر تحقیق کی ہے لیکن کہیں کہیں ان کے قول کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے مثلاً ناسخ کے لیے کہتے ہیں "علمی حیثیت صرف واجبی تھی" (ص۳۳۹) لیکن انھیں تو لکھنؤ کی اصلاحِ زبان کا منبع مانا جاتا ہے۔ آتش کے کلام پر تنقید کرتے ہیں:

"اکثر اشعار فارسی کا ترجمہ یا سرقہ ہیں۔" (ص۳۴۵)

یہاں وہ استعمالِ الفاظ میں محتاط نہیں۔ "اکثر" کی جگہ "چند" کہنا چاہیے تھا۔ رشک کے تیسرے دیوان کے بارے میں گلِ رعنا میں لکھا ہے کہ وہ ضائع ہوگیا۔ مؤلف کہتے ہیں "خوش قسمتی سے یہ نسخہ بھی راقم السطور کو دستیاب ہوگیا (ص۳۵۱)۔ یہ کچھ ایسا نایاب تو نہیں۔ ڈاکٹر سلیمان حسین اطلاع دیتے ہیں کہ اس کے تین قلمی نسخے مسلم یونی ورسٹی کے کتب خانے میں اور ایک لکھنؤ یونی ورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ (۴) منیر شکوہ آبادی کی ضخیم مثنوی کا نام سراج الصنایین لکھا ہے (ص۳۵۵)۔ صحیح معراج الصنامین ہے۔ ظاہراً سہوِ کتابت ہے جس کی تصحیح نہیں کی گئی۔ دیاشنکر نسیم کی مثنوی کا نام گلزارِ ارم لکھا ہے (ص۳۷۴)۔ یہ کوئی نہیں سوچ سکتا کہ مؤلف کو "گلزارِ نسیم" معلوم نہ تھا۔ یا تو وہ غائب ذہنی میں غلط نام لکھ گئے یا کاتب نے نام مسخ کردیا۔

نواب مرزا شوق کی تصانیف میں مثنوی "لذتِ عشق" اور ایک "دیوانِ غزلیات" کو بھی شامل کیا ہے۔ (ص۳۷۹) "لذتِ عشق" شوق کی تصنیف نہیں اُن کے عزیز آغا حسن نظم کی ہے۔ جہاں تک غزلیات کا تعلق ہے، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کو بہت تلاش کے بعد غزلیات کے محض ۷۱ شعر مل سکے (دبستانِ آتش ص۵۷-۱۵۶)۔ ڈاکٹر ابواللیث دبستانِ لکھنؤ کے کیسے محقق ہیں جو ان مبادیات سے بھی واقف نہیں۔ "زہرِ عشق" کے تذکرے کے بعد "فریبِ عشق" کے لیے لکھتے ہیں "یہ قصہ بھی خود ان کی اپنی داستان ہے۔" (ص۳۸۱)

اس سے پہلے احسن لکھنوی کی روایت پر "زہرِ عشق" کو ان کے سالے کی سرگزشت بتایا ہے۔ مثنویاتِ شوق کے مرتب رشید حسن خاں نے تفصیلی بحث کے بعد طے کیا کہ تینوں مثنویوں میں سے کوئی بھی شوق کی سرگزشت نہیں۔ زبان کے اعتبار سے بہارِ عشق ان کی بہترین مثنوی ہے۔ اس کے بارے میں ایک جملہ بھی نہیں لکھا۔

امیر مینائی کی تصانیف کی فہرست اور بیان قابلِ قدر ہے۔ شوق قدوائی کی مثنوی "عالمِ خیال" کے لیے لکھتے ہیں:

"اگر بعض ا ے اسے میر حسن اور نسیم کی مثنویوں پر بھی ترجیح

Scanned by CamScanner

دی جائے تو عجب نہیں... بلاشبہ یہ اُردو شاعری کا ایک شاہکار ہے۔" (ص ۳۹۸)

وہ شاہکار ہو کہ نہ ہو لیکن مولف کا بیان ضرور مبالغے کا شاہکار ہے۔ اُردو کا عام طالبِ علم اس مثنوی کے نام سے بھی واقف نہیں۔

اب مولف لکھنؤ کو چھوڑ کر پھر دہلی کی طرف لوٹتے ہیں۔ عنوان ہے "شعرائے دہلی کی آخری بہار، غالب اور مومن کا دور" غالب اور مومن کے بعد ذوق کا ذکر ہے۔ جو "آبِ حیات" سے ماخوذ ہے۔ میں "آبِ حیات" کے سلسلے میں اس کی غلط بیانیوں کو ظاہر کر چکا ہوں یعنی ذوق اور شاہ نصیر کے معرکے آزاد کے تخیل کی ایجاد ہیں، ذوق کی مینہ غزل "ہوشِ نقشِ پا" کی زمین میں خود آزاد کی کہی ہوئی ہے، آزاد ذوق کے شاگرد نہ تھے وغیرہ وغیرہ۔

مرثیے کے باب میں ایک بار پھر فضلی کی کربل کتھا کا نام وہ مجلس لکھتے ہیں (ص ۴۲۹) حالانکہ اس میں ۱۲ مجلسیں ہیں۔ انیس کے لیے کہتے ہیں کہ بعض روایات کے بقول دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے... کلام کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا۔ اب جو موجود ہے وہ بھی پچاس ہزار اشعار سے اوپر ہے (ص ۴۳۴)۔ قاضی عبدالودود نے "آزاد بحیثیت محقق" میں انیس کے مراثی کے اشعار شمار کیے ۵۲ ہزار سے زیادہ نہ نکلے۔ ابواللیث دو لاکھ اشعار کی بے سروپا روایت کو لکھتے ہیں اور اس کی تردید نہیں کرتے۔ اُنھوں نے انیس پر احسن فاروقی کے اعتراضات درج کیے ہیں۔ انھیں ماننے کو مائل ہیں لیکن اس اعتراض کو مناسب نہیں سمجھتے کہ مراثی انیس کی تہذیبی فضا لکھنؤ کی ہے، عرب کی نہیں۔ (ص ۴۳۷) انیس کے بیان میں شبلی کی طرح صفحوں کے صفحے مرثیوں کے بند نقل کرنے میں صرف کر دیے ہیں۔ پورے اُردو ادب کی یک جلدی تاریخ میں اس اسراف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ دبیر کے بیان کو نیا صفحہ تو در کنار، نئی سطر سے بھی شروع نہیں کیا۔ اسے کوئی عنوان نہیں دیا۔

ایک باب کا عنوان ہے "متقدمین کے دور کی شاعری پر عمومی تبصرہ۔ اس میں بھی تنقید پر ان کا دینی جوش غالب ہے، تصوف اور طریقت کو ناپسند کر کے شریعت کے حق میں ہیں۔ غزل کے مضامین سے سخت نالاں ہیں اور اس کے لیے غالب کی غزلوں سے شہادت لاتے ہیں مثلاً "روحِ اسلام سے گریز" کے عنوان سے مثال کے اشعار چار صفحوں پر ہیں۔ پورے جائزے میں وہ اُردو شاعری کے نقاد سے زیادہ ڈاکٹر نذیر احمد کے ناصح معلوم ہوتے ہیں۔ ایک باب ہے "اُردو شاعری کے کلاسیکی دور کی بزمِ آخر" اس میں غالب کے چند شاگردوں کے بعد بغیر کسی عنوان کے داغ کا بیان ہے اور داغ کے بعد ظہیر اکبر آبادی ہیں۔ اس حسنِ ترتیب پر جاں نذر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ذوق کو ساڑھے چار صفحے دیے تھے،

Scanned by CamScanner

داغ کو ڈھائی صفحے اور نظیر اکبر آبادی کو ۳۰ صفحے یعنی ص ۴۸۲ تا ۵۱۱۔ جائزہ بہت اچھا ہے لیکن نمونۂ اشعار زیادہ ہے۔

پھر آتا ہے "۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کا اثر شعروادب پر" ۴۳ صفحوں کے اس باب میں بھی حسبِ معمول ہندو بیزاری سب سے اہم عنصر ہے۔ لکھتے ہیں "بعض حوالوں میں اُردو کا پہلا اخبار جامِ جہاں نما تھا" (ص ۵۵۲)۔ اس کے مدیر سدا سکھ لال تھے۔ کیا اس کے پہلا اخبار ہونے میں کوئی شبہہ ہے؟ مزید لکھتے ہیں:

> "بعض تحریروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سلطان ٹیپو نے ایک ہفتہ وار اخبار فوجی اخبار کے نام سے جاری کیا تھا جو سرکاری چھاپہ خانہ میں چھپتا تھا اور اس کی اشاعت صرف فوجیوں تک محدود تھی۔" (ص ۵۵۲)

ایسی گول مال بات سے کیا فائدہ؟ کیا یہ اُردو کا اخبار تھا۔ اپنے ماخذ کا کوئی ثبوت تو دیتے۔ یہ صرف "جامِ جہاں نما" کی اولیت کو ختم کرنے کی کوشش ہے۔ حصۂ نظم میں شبلی پر لکھتے ہوئے عطیہ سے تعلقات کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک صاحب نے شبلی کی داستانِ معاشقہ عطیہ اور شبلی کی خط کتابت اور میل ملاقات کو اپنے مزاج کے مطابق سوقیانہ انداز میں پیش کیا ہے حالانکہ عطیہ سے علامہ اقبال اور شبلی کے مراسم ایک لطیف جذبے کے ترجمان ہیں... اسے عامیانہ عشق بازی کا رنگ دینا بدمذاقی اور بدذوقی کی دلیل ہے۔" (ص ۵۸۱)

ایک صاحب سے مراد ڈاکٹر وحید قریشی ہیں جن سے مؤلف کے تعلقات خوشگوار نہیں۔ عطیہ کی طرف دونوں علاموں کی کشش سیدھا سادہ عشق تھی۔ اس کی افلاطونی تاویل قائل کرنے والی نہیں۔ شبلی کی مسلم لیگ پر تنقیدی نظموں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "شبلی اور ان کے ہم خیال حضرات کا خیال تھا کہ مسلم لیگ اس انتظار میں تھی کہ کانگریس اپنی جدوجہد سے آزادی حاصل کرلے تو پھر مسلمان بھی اس میں اپنا حصہ لینے کے لیے سامنے آجائیں...
>
> یعنی جاکر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار
> لومڑی پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی اے سرکارِ من"
>
> (ص ۵۸۵)

عملاً ایسا نہیں ہوا۔ مسلم لیگ نے اپنا حصہ کانگریس سے نہیں بلکہ انگریزوں ہی سے حاصل کیا۔ مؤلف نے سر سید کی مدح میں شبلی کی مثنوی صبحِ امید کے اقتباسات دیے ہیں

Scanned by CamScanner

لیکن یہ اہم پہلو چھپا گئے کہ سلیمان ندوی کے مطابق شبلی نے آخر میں اس مثنوی کو اپنی تصانیف سے خارج کردیا ("حیاتِ شبلی" ص ۱۳۹) مؤلف نے شبلی کی شاعری پر اچھا لکھا ہے۔ ابواللیث چونکہ انگریزوں اور مغربی اثرات کے مخالف ہیں اس لیے انجمنِ پنجاب کی خدمات کے بھی منکر ہیں۔ لکھتے ہیں:

"انجمنِ پنجاب کے قیام اور جدید مشاعروں کے انعقاد سے اُردو شاعری کی روایت میں جو ایک خوشگوار تبدیلی آئی تھی اسے بعض ادبی تاریخ لکھنے والوں نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اہمیت دی ہے۔" (ص ۵۹۰)

اگر انجمن کی بدولت خوشگوار تبدیلی آئی تو اس کی خدمات کا کیوں نہ اعتراف کیا جائے۔ نذیر احمد کے سلسلے میں ان کے مسجد کے استاد کا نام مولوی عبدالحق لکھ گئے ہیں (ص ۵۹۲، سطر ۱۰) مولوی عبدالخالق چاہیے۔ مولانا محمد حسین آزاد پر لکھتے ہوئے اُنھوں نے لائٹنر کی کتاب "دردستان" کا ذکر کیا ہے جس میں شینا اور دوسری شمالی بولیوں کا جائزہ لیا گیا ہے (ص ۵۹۸)۔ یہ مفید معلومات ہے۔ لسانیات کی کتابوں میں اس اہم تصنیف کا نام بھی نہیں آتا۔ لائٹنر (Lietner) سے مولانا آزاد کے تعلقات کشیدہ ہونے کا بنیادی سبب افشا کرتے ہیں کہ "لائٹنر کی بعض کتابوں کے لیے اصل مواد آزاد نے فراہم کیا تھا اور کتاب لائٹنر کے نام سے شائع ہوئی۔" (ص ۵۹۸)

اس دور کے دیگر شعرا کے سلسلے میں دہلی کی تباہی کی نظموں کے مجموعے "فغانِ دہلی" (طبع ۱۲۹۹ھ) کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ وہ دہلی کے ان مرثیوں کو علی گڑھ تحریک سے متاثر کہتے ہیں۔ اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ ان شعرا نے اپنے وطن کی محبت کے تحت لکھا کسی خارجی تحریک کی وجہ سے نہیں۔ مؤلف نے اس مجموعے کے ۴۲ شاعروں کی فہرست دے کر مجموعے کا تعارف خوش اسلوبی سے کرایا ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کی بہبود کے لیے مغربیت پسند اور مذہبیت پسند دو جماعتوں کو سرسید اور اکبر کی جماعتیں کہا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کے تحت اچھا تجزیہ کیا ہے (ص ۶۰۷-۶۰۶) امجد علی اشہری کو بطور شاعر پیش کر کے معلومات میں اضافہ کیا۔

اکبر الہ آبادی پر تفصیل سے ۱۸ صفحوں میں لکھا ہے اور بہت اچھا لکھا ہے۔ اکبر کے کٹر حامی ہونے کے باوجود اقبال کہتے ہیں کہ اکبر کے ایک طوائف سے تعلقات تھے۔ "ان کے سوانح نگار پہلی بیوی کے ساتھ ان کے ظلم اور بے انصافی کے شاکی نظر آتے

Scanned by CamScanner

ہیں "(ص ۶۱۷)۔ سرسید کی وفات پر اکبر نے جو اشعار لکھے "ان میں یہ مصرع اب تک زباں زد ہے۔ع:

ہمارا نام ہی نام ہے سید کام کرتا تھا"

(ص ۶۱۸)

مصرع کا صحیح متن ہے "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا۔" ڈاکٹر ابواللیث نے کام کی مناسبت سے "نام" یاد رکھا لیکن انھیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ ان کا نقل کردہ مصرع غیر موزوں ہے۔ ص ۹۰۸ پر وہ جوش کا مصرع غیر موزوں کر کے لکھتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں موزونیت نہیں تھی۔ وہ سرسید اور اکبر کے موازنے میں رشید احمد صدیقی کا فیصلہ درج کرتے ہیں:

"ایک اعتبار سے وہ [اکبر] سرسید سے آگے دیکھتے اور ان سے زیادہ دیکھتے تھے۔" (ص ۶۱۸)

مؤلف، حالانکہ دونوں قائدین سے عقیدت رکھتے ہیں لیکن وہ بھی مشرقیت پسند اکبر کو ترجیح دیتے ہیں:

"اگر ہم اکبر کے بعد سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا جائزہ لیں تو شاید ہمیں اکبر سرسید سے زیادہ دور بیں معلوم ہوں۔" (ص ۶۲۸)

شرر کی شاعری پر لکھتے ہوئے کتاب کے جزو شاعری میں دو صفحوں پر ان کے ناولوں اور مضامین کا ذکر کرتے ہیں جو اس حصے میں بے موقع ہے۔ اگلے باب "دبستانِ علی گڑھ کے بعد" میں ظفر علی خاں پر سات صفحے لکھے ہیں اور ان کی شاعری اور شخصیت کا اچھا تجزیہ کیا ہے:

"ظفر علی خاں کی شاعری کا ایک حصہ طنزیاتی، مضحک اور ہجویاتی شاعری کا بھی ہے لیکن اس کا تعلق محض وقتی معاملات اور حالات سے ہے اور اس کا لہجہ بھی زیادہ بلند نہیں ہے... نقادوں کا کہنا ہے کہ ظفر علی خاں اگر سیاست و صحافت اور خاص کر اس طرح کی وقتی شاعری میں وقت نہ ضائع کردیتے تو ان کا شمار بلاشبہ اُردو کے گنے چنے صفِ اوّل کے شعرا میں ہوتا۔" (ص ۵۲-۶۵۱)

جدید اور جدید رنگ میں اتنے آگے پہنچ جانے کے بعد مؤلف پھر "اُردو کی قدیم کلاسیکی شاعری کا آخری دور" کی طرف پلٹتے ہیں۔ ریاض اور مضطر خیر آبادی پر لکھ کر ایک صفحے میں واجد علی شاہ کو نمٹاتے ہیں۔ کیا مؤلف کو ترتیب کا کوئی خیال نہیں۔ واجد علی شاہ پر لکھنا تھا تو اتنا سرسری لکھنے سے فائدہ؟ معلوم نہیں ان کو ترتیبِ ادوار کا کیا شعور ہے کہ

Scanned by CamScanner

کلاسیکی شاعری کے بعد باب آتا ہے "لکھنوی شاعری کا دورِ آخر" اس میں امانت تشریف لاتے ہیں۔ ان کے واسوخت کا محض ذکر کر کے ان کی رعایتِ لفظی والی غزلیہ شاعری کے نمونے دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

"اُردو شاعری کی صدیوں کی تاریخ میں ایسی بےمزہ اور بےمعنی شاعری کی مثال مشکل سے ملے گی۔" (ص ٦۷۰)

درست، لیکن اس کی مثال کے طور پر ۱۴ شعروں کی پوری غزل نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک باب کا عنوان ہے "اُردو غزل کی نشاۃ الثانیہ۔" اس جدید صنف کے پس منظر میں بھی پلٹ کر اپنے مرغوب موضوع پر آدھے صفحے میں اکبرِ اعظم کی خبر لیتے ہیں، پھر ولی اللہٰی تحریک اور ہندو دشمنی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حسرت، اصغر، فانی اور جگر کی غزل کا شہنشاہ اکبر اور شاہ ولی اللہ سے کیا تعلق ہے۔

حسرت موہانی پر لکھتے ہوئے ان کی پہلی سزائے زنداں کا پس منظر بیان کرتے ہیں کہ رسالہ اُردوِ معلیٰ ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون مصر کے لیڈر مصطفےٰ کمال کی موت پر شائع ہوا جس میں انگریزوں پر تنقید تھی۔ مصنّف کا نام نہ تھا۔ حسرت نے مضمون نگار کا نام بتانے سے انکار کر دیا اور اس کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ مضمون اقبال احمد سہیل (رشید احمد صدیقی کے دوست) کا تھا (ص ۷۰۰)۔ یہ مفید معلومات ہے۔ ممکن ہے ان سے پہلے کسی اور نے بھی ذکر کیا ہو لیکن مجھے معلوم نہیں۔ جب فانی حیدر آباد میں ایک اسکول میں مدرس تھے ان کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

"ہم ایک طالبِ علم کی حیثیت سے ایک بڑے عالم کے یہاں مہمان تھے کہ ایک سہ پہر فانی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے اور ان عالی مزاج عالم نے حقارت سے ان کو ملاقات کا شرف نہ بخشا۔" (ص ۷۰٦)

وہ ان عالم کا نام خواہ مخواہ چھپا رہے ہیں کہ یہ خود اس کتاب میں ٹنکا ہوا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب اُنھوں نے انٹرمیڈیٹ کر کے بی اے سال اوّل میں داخلہ لیا تو انھیں تربیت کی غرض سے مولوی عبدالحق کے پاس حیدر آباد بھیجا گیا اور قیام بھی انھیں کے ساتھ رہا (ص ۱۰۹۰)۔ حیرت ہے کہ مولوی صاحب نے فانی جیسے بڑے شاعر کی یہ ذلت کیوں کی۔ جگر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ جگر اور اصغر کی بیویاں سابق طوائفیں تھیں (ص ۷۱۰-۱۱) شاد عظیم آبادی اور یاس عظیم آبادی پر جگر کے بعد لکھا ہے حالانکہ جگر ان کے بعد آتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کے لیے لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

"بعض شعرا نے حفیظ کی شاعری میں نغمۂ شباب اور بعض نے
فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی سطح
زیادہ بلند نہیں ہے۔" (ص ۷۵۳)

ترقی پسند تحریک پر ص ۷۶۷ سے ۷۷۶ تک لکھتے ہیں اور جم کر اس کی مذمت کی ہے۔ وہ حلقۂ اربابِ ذوق کے بعض شاعروں کی جنسی شاعری کو بھی ترقی پسندی کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ سلام مچھلی شہری نے ایک نظم میں ایک نادار دوشیزہ کے بارے میں لکھا ہے۔ ع:

بری کیا ہے اگر اک رات اس کے ساتھ کٹ جائے

نظم قابلِ مذمت ہے لیکن یہ ترقی پسند کدھر سے ہے۔ اسی طرح ن۔ م۔ راشد کی نظم انتقام کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ہونٹوں سے لیے ہوئے رات بھر کے انتقام کی منزل کیا ہوگی،
خیر گزری۔ جو ن۔م۔ راشد نے اس کی تفصیل نہیں
لکھی۔" (ص ۷۷۶)

راشد پر پیشکار کی آخری بات یہ ہے:

"اپنے خیال میں مرنے کے بعد جلائے جانے کو اپنا انجام بخیر جانتے
ہیں۔" (ص ۷۸۳)

سردار جعفری کے لیے لکھتے ہیں:

"ایسے بحرانی دور میں شاعر کے یہاں بڑی گہرائی اور گیرائی کم ہی ملتی
ہے۔" (ص ۷۹۳)

ایک باب کا عنوان ہے "۱۹۴۷ء کا تاریخی انقلاب، پاکستان اور بھارت کی آزاد ریاستوں کا قیام" اس کے پس منظر میں بھی اوّل مغلِ اعظم اکبر بادشاہ کی تضحیک و تنقیص کی کیونکہ وہ ہر موضوع کی ابتدا کئی سو سال پہلے جا کر ہی کر سکتے ہیں۔ اکبر کے بعد دوسرا معتوب داراشکوہ ہے۔

مؤلف دلّی کالج کے ماسٹر رام چندر کا نام ہر جگہ رام چندر داس لکھتے ہیں (ص ۸۱۵)۔ میں نے اور کہیں ان کے نام کے ساتھ داس کا لاحقہ نہیں دیکھا۔ ہاں عیسائی ہونے کے بعد اُنھوں نے اپنا نام یسوع داس رکھ لیا تھا۔ مؤلف راجہ رام موہن رائے کے برہمو سماج کو بھی اسلام دشمن تحریک سمجھتے ہیں حالانکہ وہ عیسائیت سے متاثر ہندو اصلاحی تحریک تھی۔ آگے لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

"رابندر ناتھ ٹیگور جن کو بعض لوگ امن کا دیوتا سمجھتے ہیں اُنھوں نے
راجہ رام موہن رائے کے بعد اس تحریک کو جاری رکھا اور ۱۸۳۹ء
میں تتوا بودھنی سبھا کے نام سے ایک اور انجمن قائم
کی۔" (ص ۸۱۶)

وہ یہی بات ص ۶۹۴ پر کہہ چکے ہیں۔ تاریخی شعور کے فقدان کی انتہا ہے۔ راجہ رام موہن رائے کا انتقال ۲۷ ستمبر ۱۸۳۳ء کو ہوا۔ ٹیگور جو ہمارے دور میں ہوئے ہیں وہ ۱۸۳۳ء میں ایک تحریک کی قیادت کیوں کر سنبھال سکتے تھے۔ ہاں اگر وہ ڈیڑھ سو سال کی عمر پاکر مرے ہوں تو ایسا ممکن ہے۔ مالک رام کے تذکرۂ ماہ و سال کے مطابق ٹیگور ۷ مئی ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے اور ۷ اگست ۱۹۴۱ء کو فوت ہوئے۔ برہمو سماج کی قیادت سنبھالنے والے ان کے والد مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور رہے ہوں گے یا کوئی اور ٹیگور۔

باب ۴۰ "قدیم رنگ سخن کی آخری بہار" ہے جس میں بیخود دہلوی، نوح اور سائل کا ذکر ہے۔ باب ۳۲ اُردو کی "کلاسیکی شاعری کا آخری دور" تھا جس میں احسن مارہروی، ریاض خیر آبادی اور مضطر خیر آبادی کا بیان ہے۔ باب ۴۰ کے شعرا باب ۳۲ ہی میں سما سکتے تھے۔ اس طرح یہ الٹی گنگا بھی نہ بہتی کہ نوح اور سائل کو جذبی اور احمد ندیم قاسمی کے بعد لیا گیا۔ باب ۴۱ کا عنوان ہے "اُردو شاعری قیامِ پاکستان کے بعد۔" اس سے پہلے باب ۳۹ تھا "اُردو ادب قیامِ پاکستان کے بعد"۔ چونکہ تاریخ کا یہ پورا حصہ شاعری کو وقف ہے اس لیے ۳۹واں باب بھی عملاً اُردو شاعری قیامِ پاکستان کے بعد ہی تھا۔ اس میں بھی محض شاعروں کا ذکر تھا۔ اس طرح باب ۳۹ اور باب ۴۱ کو ضم کیا جا سکتا تھا۔ دراصل فاضل مولف نے ابواب بندی پر کوئی غور نہیں کیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کے لیے لکھتے ہیں "یہ ایک طرح سے ترقی پسند مصنفین کی مجلس کی جانشین تھی۔" یہ درست نہیں۔ یہ ترقی پسند انجمن کی حریف تھی۔ دونوں کی نظریاتی بنیادیں مختلف تھیں۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن حلقۂ اربابِ ذوق کے بعد بھی قائم رہی، آج بھی ہے۔ ایک بار پھر مانتے ہیں:

"یہ حقیقت ہے کہ زبان اور شاعری کا کوئی مذہب نہیں
ہوتا۔" (ص ۸۴۹)

اس حقیقت شناسی کی سب سے زیادہ ضرورت خود جناب مولف کو ہے۔ میرے لیے یہ اطلاع نئی ہے کہ جوش نے پاکستان جا کر سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ کیا۔ ع: کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا۔ جگن ناتھ آزاد کے بارے میں بڑی جرأت سے اس

Scanned by CamScanner

حقیقت کا اظہار کرتے ہیں:

"بعض حضرات نے ان کے کلام پر اقبال کا اثر بتایا ہے لیکن اقبال
کی فکر کا رخ ایسا ہے جس سے جگن ناتھ آزاد تاریخی اور تہذیبی طور پر
اپنا رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔ اس لیے اگر کوئی اتفاقی ہم رنگی نظر آتی
ہے تو اسے بہت سطحی سمجھنا چاہیے۔" (ص ۸۷۰)

معلوم ہوتا ہے مولف کی رائے میں غیر مسلم شعرا اقبال سے متاثر نہیں ہوسکتے، لیکن وہ اقبال کی اسلامیات کو چھوڑ کر ان کے انسانی نظریات نیز فنِ شعر سے تو متاثر ہوسکتے ہیں۔ کیا ڈاکٹر ابواللیث کا خیال ہے کہ اقبال کے پاس غیر مسلموں کے لیے کچھ نہیں۔ میں جگن ناتھ آزاد کے مقابلے میں اسلامی تہذیب سے کم متاثر ہوں لیکن میں اقبال کو اُردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں اور یہ کہہ کر مجھے کسی کی خوشنودی نہیں بٹورنی۔ میرا غیر مسلم ہونا ان کے پیغامِ عمل کو پسند کرنے نیز ان کی شاعرانہ خوبیوں کی داد دینے کی راہ میں سدِّ راہ نہیں۔

باب ۴۲ کا عنوان ہے "اُردو شاعری کے پاکستانی دور کا آغاز۔" چونکہ یہ عنوان بدیہی ہے اس لیے وہ اس باب میں کچھ بھی کہیں، مجھے اعتراض نہیں۔ اُنھوں نے مجاز کی نظم "ترانۂ پاکستان" کے دو بند نقل کیے ہیں۔ ظاہرا یہ پُرجوش نظم قیامِ پاکستان سے پہلے ہی لکھی گئی ہوگی۔ باب ۴۳ کا طویل عنوان ہے:

"جشنِ بہاراں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُردو شاعری میں جشنِ آزادی
کی نظمیں"

جب کہ بعض ابواب مثلاً باب ۱۹ کے تمام ذیلی عنوانات کو نئے صفحے سے شروع کرنے کی توقیر دی تھی، باب ۴۳ کو باب ۴۲ کے ختم ہونے والے صفحے کے درمیان سے شروع کردیا ہے۔ اس کے جزو "قیامِ پاکستان کے بعد" میں لکھتے ہیں:

"اسی لیے جسے جدید شاعری ترقی پسند شاعری کے ناموں سے پکارا گیا
اس میں لادینی کا ایک بڑا عنصر شامل تھا۔" (ص ۸۹۶)

ان کی نظریں ترقی پسند شاعری، حلقۂ اربابِ ذوق کی شاعری، جدیدیت کی شاعری سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں جن کے مقابل دوسرا گروہ اسلامی شاعری کا ہے۔ وہ جوش کا ایک شعر یوں نقل کرتے ہیں:

شیخ صاحب اور خدا کو نہ جانیں
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

(ص ۹۰۸)

Scanned by CamScanner

پہلے مصرع کا صحیح متن یہ ہے: خدا کو اور نہ پہچانیں یہ حضرت (نظم: "مقامِ شیخ")
موجودہ صورت میں یہ مصرع سراسر غیر موزوں ہے اور یہ کاتب کا قصور نہیں ہوسکتا۔ اس
تخریب کی ذمےداری مؤلف کی ہے۔ اس سے پہلے ص۶۱۸ پر وہ اکبر کے ایک مصرع کے
ساتھ ایسا ہی تشدد کر چکے ہیں۔ حیرت ہے اتنا پرانا استاد اور نقاد موزوں اور غیر موزوں میں
امتیاز نہیں کرسکتا۔ اُنھوں نے ص۹۱۱ سے ۹۱۶ تک قرآن مجید کے ترجموں پر لکھا ہے۔ یہ
جزو معلوماتی ہے۔

باب ۷۴ "قصۂ جدید شاعری کا" ہے۔ اس کی ابتدا میر، قائم، ولی میر حسن،
مظہر جانِ جاناں، آصف الدولہ، جنگِ پلاسی، انجمنِ پنجاب وغیرہ سے ہوتی ہے۔ اس میں
سابق میں لکھی بات کا اعادہ کرتے ہیں:

"میر حسن نے بھی اپنے والدِ محترم کی تعریف میں جو سودا کی
ہجویات لکھی ہیں وہ سودا اور میر حسن کے کلام کو مرتب و شائع
کرنے والوں نے حذف کردیں حالانکہ اسے چھپانے کی ضرورت کیا
تھی۔" (ص۹۳۰)

لکھ رہے ہیں بیسویں صدی کے نصفِ دوم کی شاعری پر، مندرجہ بالا مشاہدے کا تعلق
ہے۔ اٹھارویں صدی کے نصفِ آخر سے۔ جس طرح بچوں سے درمیان کے کسی حرف ہجا یا
گنتی سے آگے کو سنانے کو کہا جائے تو وہ ابتدا سے شروع کرتے ہیں جناب مؤلف کا بھی
وہی حال ہے۔ جدید شاعری کے قصے میں پورے اُردو ادب اور اس کے سیاسی پس منظر کی کیا
ضرورت تھی۔ شاعری کے حصے کا آخری باب ۴۸ "عوامی شاعری، لوک گیت، تجربے اور
ترجمے" کے عنوان سے ہے اور اچھا ہے۔ اس میں ص۹۵۹-۹۵۸ پر ہندی اوزان، بالخصوص
دوہے کے اوزان کے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں، وہ نہ لکھتے تو بہتر تھا کیونکہ یہ تحریر ان کی
ناواقفیت کی غماز ہے۔ لکھتے ہیں:

"قدیم دوہوں کے چاروں چرنوں میں اس طرح اڑتالیس ماترائیں ہوتی
ہیں اور دو دو مصرعے ایک سطر میں ہوتے ہیں۔" (ص۹۵۸)
"اُردو میں ایسے دوہے اڑتالیس ماترائیں ہوں نہیں ملتے (کذا)، عام
طور پر تیس یا بتیس ماتراؤں والے دوہے ملتے ہیں۔" (ص۹۵۹)

وہ دوہے کے جزو چرن اور اُردو کے مصرع میں التباس کر رہے ہیں۔ دوہے کی ایک
سطر میں دو مصرعے نہیں ہوتے، دو اجزا ہوتے ہیں جنھیں چرن کہتے ہیں۔ یہ دو چرن مل کر
ایک مصرع کے برابر ہوتے ہیں۔ اُردو میں دونوں مصرعوں میں ۴۸ ماتراؤں والے دوہے بہ

Scanned by CamScanner

کثرت ملتے ہیں۔ جس طرح رباعی اگر مقررہ ۲۴ اوزان میں نہ ہو تو رباعی نہیں کہلاتی اسی طرح ہندی میں دوہے کے دونوں مصرعے مل کر ۴۸ ماتراؤں کے نہ ہوں تو اسے دوہا نہیں کہتے۔ اُردو کی بات دوسری ہے۔ یہاں ایک مصرع میں ۲۴ سے زیادہ ماتراؤں کے دوہے لکھے گئے ہیں۔ میری نظر سے ایسا دوہا نہیں گزرا جس کے دونوں مصرعوں میں ملا کر محض ۳۰ یا ۳۲ ماترائیں ہوں۔ حالی کے منقول دوہے میں ایک مصرع میں ۲۷ اور پورے دوہے میں ۵۴ ماترائیں ہیں۔

اُنھوں نے یہ دلچسپ اطلاع دی ہے کہ "اُردو ہائیکو کے مشاعرے بھی ہوئے ہیں۔" (ص ۹۶۲) پاکستان میں ہوتے ہوں گے، ہندوستان میں تو نہیں۔

اس کے بعد نثر کا جزو شروع ہوتا ہے۔ نظم و نثر کو الگ الگ بیان کرنے کا یہ بڑا نقصان ہے کہ ہائیکو کے بعد ابتدائی دکنی نثر پر لوٹنا ہوتا ہے۔ علی گڑھ تاریخ اور جمیل جالبی کی تاریخ نظم و نثر کو ایک ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت میں جو "اُردو ادب کی تاریخ جلد اوّل ۱۷۰۰ء تک" لکھی اور جو ہنوز زیرِ طبع ہے، اس میں بھی دونوں کو ملا جلا کر لکھا ہے۔

مؤلف نے ابتدا ملفوظات سے کی ہے۔ اس میں ایک فقرہ "برکت شیخ بشما، ایک سوا، ایک نشما" شیخ حسین عرف شیخ بشما سے متعلق کیا ہے (ص ۹۶۶)۔ اُردو کی قدیم تاریخوں میں اس فقرے کو برکت شیخ تھیا لکھا جاتا تھا، ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخِ زبانِ اُردو میں تصحیح کی کہ یہ برکت شیخ تھپا ہے، ابواللیث ان کا نام شیخ بشما لکھ رہے ہیں۔ واللہ اعلم صحیح کیا ہے۔ اُنھوں نے اشرف جہانگیر سمنانی سے منسوب رسالے کا پہلا حوالہ دینے والے کا نام نادر کاکوروی لکھا ہے (ص ۹۶۸)۔ یہ انگریزی شاعری کے تراجم کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا زمانہ ۱۸۶۷ء تا ۱۹۱۲ء ہے۔ رسالے والے صاحب کا نام میر نذر علی درد کاکوروی (۱۸۹۱ء تا ۱۹۷۲ء) تھا۔ اُنھوں نے نگار دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایک مضمون میں سمنانی کے رسالے کا ذکر کیا تھا۔ نام کا غلط لکھنا مؤلف کی بے احتیاطی یا نسیانِ پیری کا نتیجہ ہوسکتا ہے کیونکہ آگے چل کر ص ۹۸۱ پر وہ صحیح نام میر نذر علی درد کاکوروی لکھتے ہیں۔

مؤلف نے شرحِ مرغوب القلوب کو میراں جی شمس العشاق سے منسوب کیا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب میراں جی خدا نما میں ثابت کیا کہ یہ میراں جی خدا نما کی تصنیف ہے اور وجہی کے سلسلے میں یہ تاریخ ساز بیان ملتا ہے:

> "وجہی... عبداللہ قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا، اس کا بیٹا سلطان محمد قلی قطب شاہ کو... وجہی نے اپنی ایک مثنوی قطب مشتری کا ہیرو بنایا ہے۔" (ص ۹۷۳)

Scanned by CamScanner

جیسا کہ میں پیچھے ص ۷۴۷ کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں عبداللہ کے نام کے ساتھ قلی کا لفظ نہیں آتا۔ گولکنڈہ کی حکومت کو قطب شاہی حکومت کہتے تھے، قلی قطب شاہی نہیں۔ محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ کا بیٹا نہیں، نانا تھا۔ "معراج العاشقین" کے لیے لکھتے ہیں:

"اور اب تو بعض حضرات کا استدلال ہے کہ یہ کتاب نہ اس دور سے تعلق رکھتی ہے اور نہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف ہے بلکہ اس کے مصنف معصوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں۔" (ص ۹۷۹)

معصوم شاہ حسینی نہیں، مخدوم شاہ حسینی لکھیے۔ مؤلف یقینِ واثق کی دولت سے محروم ہیں۔ اس تذبذب سے لکھتے ہیں جیسے یہ بات مسلّم نہیں۔ انھوں نے فضلی کی کربل کتھا کا مفصل بیان پانچ صفحوں میں ص ۹۸۲ تا ۹۸۶ پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "بعض حوالوں میں جو فضلی کو اشرف علی خاں کا بیٹا بتایا گیا ہے وہ درست نہیں۔" (ص ۹۸۲)

کیوں نہیں۔ کربل کتھا میں انھیں صاف صاف اپنا بابا قبلۂ حقیقی لکھا ہے۔ شمس اللہ قادری کے پاس کریم الدین کے تذکرے کا ایک مخطوطہ تھا، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اسے دیکھا ہے۔ اس میں جو کربل کتھا کا دیباچہ دیا ہے اس میں فضلی نے "میرے والد" کا فقرہ بھی استعمال کیا ہے (اُردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۳۵۹)۔ واضح ہو کہ فضلی کے والد کا نام اشرف علی نہیں، شرف علی تھا۔ تاریخ میں ڈاکٹر ابواللیث کے بیان سے مجھے دو نئی معلومات ملیں۔
۱۔ ڈاکٹر احسان الحق نے خواجہ احمد فاروقی کے مطبوعہ لیکن غیر شائع شدہ متن کا عکس ۱۹۸۲ء میں لاہور سے شائع کردیا۔ ۲۔ اس کے آخر میں ایک تبرّا بھی تھا جسے خواجہ احمد فاروقی نے خارج کردیا۔ ابواللیث لکھتے ہیں:

"رفعِ شر کے لیے تو یہ ٹھیک ہوگا لیکن اسے خارج کرنے میں ایک تحقیقی بددیانتی شامل ہوجاتی ہے۔" (ص ۹۸۲)

خواجہ صاحب نے اسے خارج کردیا یہ اچھا کیا۔ اسے برقرار رکھ کر بلوا تو کرانا نہ تھا۔ کیا اس کتاب میں واقعی تبرا شامل تھا؟ مالک رام و مختارالدین احمد کے نسخے میں بھی نہ ہے، نہ طویل مقدمے میں اس کی طرف اشارہ ہے مؤلف اور احسان الحق کو مالک و مختار کے ۱۹۶۵ء کے ایڈیشن کا علم نہیں، نہ مؤلف کو یہ معلوم ہے کہ اس نسخے کو ڈاکٹر مختارالدین احمد نے دریافت کیا تھا۔ فاروقی کے مطبوعہ نسخے میں صرف دس مجلسیں تھیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ محمد احسان الحق نے کسی اور ذریعے سے ان کے مکمل نسخے کا عکس حاصل کیا ہوگا۔

مؤلف نے شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کا نام "موضح القرآن" لکھا ہے (ص ۹۸۹)۔ صحیح موضحِ قرآن ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۰۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

موضح القرآن یہ ۱۲۳۶ھ حاصل ہوگا۔ مؤلف نے ڈاکٹر زور کے مذکورہ قرآن کے ایک ترجمہ و تفسیر ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء کا ذکر کیا ہے اور نمونہ دیا ہے (ص ۹۹۰)۔ اس کی زبان ۱۱۵۰ھ سے زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے۔ انشا کی دریائے لطافت کی تاریخ ص ۹۹۴ پر ۱۸۰۲ء درج کی ہے، ص ۱۲۵ پر ۱۸۱۰ء لکھی تھی، صحیح ۱۸۰۷ء ہے۔

قصۂ مہر افروز و دلبر کے مرتب مسعود حسین خاں اس کے مصنف عیسوی خاں بہادر کی شخصیت کا صحیح تعین نہ کر سکے تھے۔ مؤلف انہیں کی قیاس آرائیوں کو دہراتے ہیں۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس نے صحیح دریافت کیا جسے میں نے اپنی کتاب نثری داستانیں میں اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۱۰۸۴) میں قبول کیا۔ عیسوی خاں ہندی کے مشہور مصنف ہیں جو گوالیر کے نزدیک ریاست نرور کے راجہ چھتر سنگھ کے متوسل تھے۔ ان کی ایک اور تصنیف ۱۷۵۴ء کی ملتی ہے۔ مہر افروز بھی اسی عہد کی ہوگی۔

مؤلف اس کے آگے نثر کا تیسرا دور غالب کے خطوط سے شروع کرتے ہیں جو قصۂ مہر افروز کے ایک صدی بعد انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی میں اُردو کی ترقی کے اداروں میں سب سے پہلے دلّی کالج کو لیتے ہیں، اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کو، گویا تاریخ کو آگے سے پیچھے کی طرف کو لکھ رہے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج، دلّی کالج اور غالب کے خطوط کے بجائے اس کے برعکس، اور اس جھمیلے میں رجب علی بیگ سرور اور فسانۂ عجائب کو بھول ہی جاتے ہیں۔

حالی کی نثر پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں "ان کی بعض نظمیں مثلاً بیوہ کی فریاد کوئی بہت اعلیٰ درجے کی نظمیں نہیں ہیں (ص ۱۰۵۸) شاعر حالی پر وہ پہلے ہی لکھ چکے ہیں، نثر کے حصے میں ان کی نظموں کو کیوں گھسیٹ لائے۔ اس کے زمانے کو دیکھتے ہوئے بیوہ کی فریاد اعلیٰ درجے کی نظم ہے۔ مؤلف "آب حیات" کی اشاعت کا سال ۱۸۸۱ء لکھتے ہیں (ص ۱۰۶۸)۔ اسلم فرخی نے اپنی کتاب میں مکتوباتِ آزاد کی مدد سے طے کیا کہ اس کی اشاعت ۱۸۸۰ء کے آخر میں ہوئی (محمد حسین آزاد، جلد ۲، ص ۱۴)۔ شبلی اور عطیہ کے سلسلے میں بعض نقاد حضرات پر پھر طنز کیا ہے (ص ۱۰۷۶)۔ روئے سخن وحید قریشی کی جانب ہے۔ شبلی نے سیرۃ النبی کے سلسلے میں جو دو شعروں کا قطعہ لکھا ہے اسے مؤلف نے ص ۱۰۸۰ پر نقل کیا ہے۔ مجھے یہ قطعہ بہت پسند ہے۔ ع: "خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا" یہ مصرع مدح سے ماورا ہے۔ اسے شاعری کہتے ہیں جس میں جذبہ بھی ہے، ایمان کی حرارت بھی۔

مؤلف اپنے ہم وطن میر محفوظ علی بدایونی کے بہت مداح ہیں۔ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

"علامہ اقبال جس شخص کے مرید ہونے کی تمنا رکھتے ہوں اس کے
علمی اور فکری مرتبہ کا اندازہ صرف ایک ایسی بات سے لگا سکتے
ہیں۔" (ص ۱۰۸۸)
"کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اقبال اپنا کلام بہ نظرِ اصلاح میر صاحب
کی خدمت میں بھیجتے اور بعض اہم تفصیلات اور تشریحات
میر صاحب نے اقبال کو فراہم کیں۔" (ص ۱۰۸۹)

واقعی حیرت کی بات ہے۔ مؤلف تائید میں اپنے ماخذ کا بھی اظہار کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ محفوظ علی ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے یعنی اقبال سے محض تین چار سال بڑے تھے۔ اُردو نثر میں بڑے آداب اور انکسار کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی کوئی نظم محفوظ علی کو بھیجتے ہوئے اخلاقاً لکھ دیا ہوگا کہ بہ نظرِ اصلاح بھیج رہا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میر صاحب واقعی اقبال کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ وہ نثر نگار تھے، میرے علم کی حد تک شاعر نہ تھے۔ مؤلف رشید احمد صدیقی کے لیے لکھتے ہیں "وہ ایک عظیم نقاد بھی ہیں۔" (ص ۱۰۹۸)۔ مجھے اس سے اختلاف ہے عظیم ہونا تو در کنار، وہ قابلِ ذکر نقاد بھی نہ تھے، ہاں عظیم انشائیہ نگار اور مزاح نگار ضرور تھے۔

مؤلف یہ دلچسپ خبر دیتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں پنڈت کیفی کا لاہور کا مکان لُٹا تو کتب خانے کا ایک حصہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں پہنچ گیا۔ اسی میں مصحفی کی "مجمع الفوائد" کا نسخہ تھا (ص ۱۱۰۷) کیفی کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ وہ مولوی عبدالحق کے بہت دوست اور بڑے اُردو پرست تھے۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور نے انھیں ان کا گنج باد آورد کیوں نہ لوٹا دیا۔ کتاب کے آخر میں آ کر مؤلف ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں کھل جاتے ہیں، پھوٹ کر بہہ نکلتے ہیں۔ بیت الغزل یہ ہے:

"جو لوگ ان کو نقاد تسلیم کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ان کو دوسروں
کی ٹوپی اچھالنے میں مزہ آتا ہے۔ یہی ان کی تنقید کی خصوصیت
ہے۔" (ص ۱۱۱۱)

ایک تاریخِ ادب میں یہ صحافیانہ لہجہ مناسب نہیں۔ اُردو تنقید کے باب میں مطلع کرتے ہیں کہ وجہی کی قطب مشتری میں تنقیدی نقوش کا پتا اُنھوں نے نگار جنوری فروری ۱۹۴۴ء میں دیا تھا۔ جسے بعد کے نقادوں نے اپنا مال سمجھ کر بغیر حوالوں کے نقل کیا ہے (ص ۱۱۱۳)۔ مجھے بھی یہ معلوم نہ تھا۔ وہ "آبِ حیات" کا دفاع کرتے ہیں لیکن ایک جگہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

Scanned by CamScanner

"البتہ یہ درست ہے کہ تنقید میں اُنھوں نے جابجا ڈنڈی ماری ہے۔
مثلاً ذوق کے کلام کو بہادر شاہ کے حصے میں ڈال دیا۔" (ص۱۱۱۶)

اپنے نظریات کی وجہ سے وہ حالی کے مقدمے کو ناپسند کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ہاں حالی اور ان کے بعض ہم خیال حضرات کی اس "پیرویِ
مغربی" نے اُردو تنقید کو ایک ایسا رخ دیا جس میں ہمارا سارا
شعروادب ایک دفترِ بے معنی ہو کر رہ گیا۔" (ص۱۱۱۸)

اُردو تنقید کی تاریخ میں مقدمۂ شعروشاعری کو سنگِ میل سمجھا جاتا ہے لیکن مؤلف اپنی رجعت پسندی کی وجہ سے اس سے آزردہ ہیں۔ تنقید کے اس جائزے میں معلوم نہیں کیوں وہ میر کے فارسی دیوان کو لے آئے جو ان کی رائے میں بہت پھُس پھُسا ہے (ایضاً) چونکہ اسے اُنھوں نے دریافت کیا تھا اس لیے اس تاریخ میں نہ معلوم کتنی بار اس کا موقع بے موقع ذکرِ خیر کر دیتے ہیں۔ تنقید کے باب کے آخر میں کلیم الدین احمد کی تضحیک کرتے ہیں۔

خدا خدا کر کے وہ اُردو ناول کے باب تک پہنچتے ہیں۔ ابتدا میں چند داستانوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں فسانۂ عجائب کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ بعد میں داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا کو بھی چھوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اگر صنف ہی کو لینا تھا تو داستان کو ناول سے الگ باب میں لیتے کیونکہ داستان اور ناول میں کوئی تعلق نہیں۔

ناول نویسوں میں نذیر احمد پر معترضانہ تنقیدات کو نقل کرنے میں تامل نہیں کیا لیکن ان سب کا جواب دیا ہے۔ اس طرح اپنے نقطۂ نظر سے نذیر احمد پر خوب کھل کر لکھا ہے۔ سرشار کے فسانۂ آزاد اور ڈان کوئک زاٹ کا ذکر کر کے کہتے ہیں:

"سرشار نے انگریزی ناول کا ترجمہ کیا ہے لیکن فسانۂ آزاد کی فضا
خالص سرشار کی فضا اور ان کی تخلیق ہے۔ اسے ترجمہ یا ماخوذ کہنا
زیادتی ہوگی..." (ص۱۱۴۱)

پھر خود ہی اسے ترجمہ کر کے یہ زیادتی کیوں کر رہے ہیں۔ شرر کے ناولوں کے تاریخی مآخذ اور مسیحی راہبوں کے جن رقعوں پر اعتراض کیے جاتے ہیں مؤلف ان کا یہ جواب دیتے ہیں کہ شرر کا نقطہ نظر وہ ہے جو ایک مسلمان کا تھا (ص۱۱۴۵)۔ ادبی تنقید میں اپنے مذہب کی طرف داری کافی توجیہ نہیں سمجھی جائے گی۔ غالب جو انگریزوں کی قصیدہ خوانی کرتے تھے اس کی طرف روئے سخن کر کے کہتے ہیں:

"آلِ تیمور کے آخری نشان بہادر شاہ ظفر کی رنگون سے تحریریں اور
ان کی بیگم کی گزارہ الاؤنس بڑھانے کی درخواستیں آج بھی سامانِ

Scanned by CamScanner

عبرت ہیں۔" (ص ۱۱۵۶)

میں ان تحریروں سے واقف نہیں۔ وہ واقعی سامانِ عبرت ہوں گی۔ پریم چند کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"بعض حوالوں میں پرتاپ چندر کے نام سے بھی پریم چند کے ایک ناول کا ذکر ملتا ہے جو بقولِ بعض پریم چند کا پہلا ناول تھا۔" (ص ۱۱۵۷)

"بعض حوالوں، بقولِ بعض" یہ پردہ داری کیوں؟ صاف کیوں نہیں لکھتے کہ کس نے کہا ہے۔ پریم چند کا کوئی ناول "پرتاپ چندر" نہیں۔ وہ ایسی انوکھی بات لکھتے ہیں تو اس کا ماخذ کیوں نہیں بتاتے۔ پریم چند سے انھیں دو خاص شکایتیں ہیں۔

۱۔ خاص طور پر ہندو معاشرہ ان کے پیشِ نظر ہے۔

۲۔ وہ گاندھی جی کو ایک بڑا فلسفی، مفکر، لیڈر اور سب کچھ مانتے تھے (ص ۱۱۵۸)

مہاتما گاندھی ان کے بڑے معتوبین میں ہیں۔ موقع بے موقع ان کی تنقیص کر کے انھیں بڑا سکون ملتا ہے۔ پریم چند کے یہاں ہندو کرداروں کے ہونے سے بھی وہ ناخوش ہیں۔ ناولوں اور افسانوں دونوں کے سلسلے میں دسیوں بار اس کا ذکر کرتے ہیں جس سے صاف مترشح ہے کہ وہ اُردو ادب میں ہندو معاشرے کے مرقعوں اور ہندو کرداروں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر محمد حسن نے میری توجہ دلائی کہ پریم چند سے پہلے اردو فکشن میں ہندو کردار (اہم کردار) نہیں ہوتے۔ یہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ غور کیا تو داستان، حکایت، ناول کسی میں ہندو معاشرے کی عکاسی نہیں تھی۔ ہندو داستاں نگاروں اور سرشار نے بھی ہندو معاشرے کو پیش نہیں کیا۔ ہندوستان میں اردو ادب پر ہندو مسلمان دونوں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ ابواللیث صدیقی اگر اردو ادب کو محض اسلامی ادب بنانا چاہیں تو ہندوستان کے اہلِ اردو اسے قبول نہیں کر سکتے۔ مؤلف آخر میں پریم چند کے بارے میں یہ ماننے پر مجبور ہو گئے:

"بلاشبہ وہ ایک عظیم ناول نگار تھے" (ص ۱۱۶۴)

لیکن اس کے ساتھ کئی اعتراضات بھی جڑ دیے۔ قاری سرفراز حسین کا ذکر ص ۱۱۴۸ پر بھی ہے اور ۱۱۲۶ پر بھی۔ کرشن چندر کے لیے لکھتے ہیں:

۱۔ تقسیم ہند کے بعد کرشن چندر نے ہر معقول پڑھنے والے کو جس طرح مایوس کیا ہے وہ کرشن چندر ہی کی نہیں اردو ادب کی بھی بد قسمتی ہے۔ (ص ۱۱۷۱)

۲۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر کرشن چندر اس اعلیٰ مقام پر بیٹھے نظر نہیں آتے

Scanned by CamScanner

جہاں بعض حضرات ان کو دکھانا چاہتے ہیں (ص ۱۱۷۳)

۳۔ انھوں نے ایک مسلمان عورت سے شادی کی۔ مسلمان عورت کے لیے تو اہلِ کتاب سے بھی شادی جائز نہیں چہ جائیکہ کہ ایک ہندو سے جس کی ہندو بیوی موجود تھی۔ لیکن کرشن چندر کو مرنے کے بعد دفن نہیں کیا گیا جو مسلمانوں کی رسم ہے بلکہ ہندوؤں کی طرح ان کا کریا کرم ہوا۔ (ص ۱۱۷۳)

لیکن کیا سلمیٰ صدیقی سے کرشن چندر کی واقعی شادی ہوئی تھی؟ مجھے اس میں شبہ ہے۔ میرے ایک شاگرد محمد بیگ احساس نے میری نگرانی میں کرشن چندر پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیق کی۔ بمبئی گئے۔ سلمیٰ صدیقی کہتی رہیں لیکن کبھی نکاح نامہ نہیں دکھایا۔ دوسری طرف انھوں نے کرشن چندر کی وصیت دیکھی جس میں کچھ اثاثہ اپنی سابق بیوی کے لیے چھوڑا تھا لیکن کتابوں کی رائلٹی سلمیٰ کے نام کی تھی جنھیں محض اپنی دوست کہا ہے، بیوی نہیں۔

مولف عصمت چغتائی کی عریانی اور بےباکی کی وجہ سے ان سے بھی خفا ہیں (ص ۱۱۵۴) یہی رائے عزیز احمد کے بارے میں ہے۔ افسانہ نگاری کے باب میں پریم چند پر ایک نیا وار کیا ہے:

> "ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان کے اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے سب ہندو ہوں۔" (ص ۱۱۸۴)

یہ انکشاف انھیں پریم چند کی کس تحریر سے ہوا۔ ع:

فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمتِ اوست

ترقی پسندی کے لیے لکھتے ہیں:

> "ترقی پسندی میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں اور جیسا کہ ہم ترقی پسند شاعر کی بحث میں کسی قدر تفصیل سے لکھ چکے ہیں، مذہب، خدا اور مذہبی قیود کا استہزا ترقی پسندی کی ایک علامت تھی۔
> (ص ۱۱۸۶)

> "اشتراکی عقائد پر ایمان کو بھی آپ ایک مذہب کہہ سکتے ہیں، ایک لادینی مذہب۔" (ص ۱۱۹۱)

لکھتے ہیں:

> "آصف الدولہ نے میر تقی میر کو رہنے کو جو کمرہ عنایت فرمایا تھا اس میں ایک کھڑکی تھی جس کے بارے میں آصف الدولہ نے پوچھا..." (ص ۱۱۹۴)

Library
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Scanned by CamScanner

اس لطیفے کا ماخذ "آبِ حیات" ہے۔ اس میں آصف الدولہ کا نام نہیں "لکھنؤ کے نواب" لکھا ہے۔ کھڑکی کھولنے کے بارے میں استفسار نواب نے نہیں کسی دوست نے کیا تھا۔ ("آبِ حیات" ص ۲۲۰)

بنگال میں اُردو اسٹیج ڈرامے کے سلسلے میں ایک عجیب دلچسپ بات کہتے ہیں:

"لطف یہ ہے کہ پہلے نوعمر لڑکے عورتوں کے کردار ادا کرتے تھے اب عورتوں نے عورتوں مردوں دونوں کے کردار ادا کرنے شروع کردیے۔" (ص ۱۱۹۸)

ڈرامے پر تفصیل سے لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے لیکن قدیم عہد تک محدود رہتے ہیں۔ نئے ڈراموں بلکہ خصوصاً یک بابی ڈراموں کو نہیں چھوا۔ مضامین و مقالات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

اُردو زبان کا کسی زبان سے کوئی تنازعہ یا جھگڑا نہیں۔ مختلف زبانوں اور بولیوں کا اپنا اپنا دائرہ اور حلقۂ عمل ہے اور ان کو بھی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسری زبان کو لیکن اس مقابلہ میں تصادم اور لسانی نفرت کی زبان کی تاریخ میں کوئی گنجائش نہیں۔" (ص ۱۲۱۴)

کاش اس تاریخِ زبان و ادبِ اُردو میں سنسکرت اور ہندی کے لیے بھی یہی جذبہ دکھایا ہوتا۔ "مضامین و مقالات" کے عنوان کے تحت وہ ادبی رسالوں کی تفصیل دیتے ہیں، مضمون نگاری کی نہیں۔ صحیح عنوان دے دیتے تو کوئی ہرج نہ تھا۔ رسالہ جامعہ کے لیے ہمیشہ ماضی بعید کا صیغہ استعمال کیا ہے (ص ۲۰-۱۲۱۹) انھیں معلوم نہیں کہ یہ رسالہ اب بھی نکلتا ہے۔ اُردو اخبارات کے سلسلے میں آخر میں لکھتے ہیں:

"ہم عصر صحافت کے مضمون پر لکھنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔" (ص ۱۲۳۸)

بالکل آخر میں تذکروں کے بارے میں دو تین صفحے لکھ دیے ہیں گویا انگلی میں لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہا ہے۔ یاد آیا ہوگا کہ یہ موضوع تو چھوٹ گیا تھا۔ آخر میں پھر اُردو کے "نثری مضامین اور مقالات" کا عنوان آجاتا ہے۔ پہلے تو اس عنوان کے تحت رسالوں پر لکھ گئے تھے، اب مضامین و مقالات پر نہایت تشنہ اور سرسری دو تین صفحے لکھے ہیں جن کے آخر میں اس صحافی سطح پر آجاتے ہیں:

"مصنف بعض سنجیدہ لکھنے والوں کے سر پر ایسے سوار ہوتے ہیں کہ

Scanned by CamScanner

ان سے یہ مضمون لکھوا کر ہی اس کی خطا بخشتے ہیں۔" (ص ۱۲۵۱)

اس ضخیم تاریخ کا مفصل جائزہ ختم ہوا۔ میں اس میں دیے ہوئے سنین پر سے خاموشی سے گزر آیا ہوں۔ اب ان کے بارے میں کچھ معروضات۔ میں تمام سنین کو تو جانچ نہیں سکتا تھا، اہم سنین کو پرکھا۔ ان میں سے کچھ صحیح، کچھ ظاہراً غلط معلوم ہوئے۔ میں ذیل میں ایسے سنین کا گوشوارہ دیتا ہوں جو بادی النظر میں درست نہیں، ان کی بہ نسبت دوسرے ماخذ میں دیے سنین زیادہ معتبر معلوم ہوتے ہیں:

ڈاکٹر ابواللیث کی دی ہوئی تاریخ	دوسرے ماخذ میں دی ہوئی زیادہ معتبر تاریخ
ص ۷۳ میر کا نکات الشعرا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء	صحیح ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء
ص ۱۲۵ دریائے لطافت ۱۸۱۰ء۔ ص ۹۹۴ پر ۱۸۰۲ء	مقدمے میں دی ہوئی تاریخ ۱۸۰۷ء
ص ۱۳۵ خواجہ فرید شکر گنج پ ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء	عبدالحق: ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء (اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۱۳)
ص ۱۳۶ خواجہ فرید شکر گنج ف ۶۷۰ھ/۱۲۷۱ء	جالبی: ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء۔ (جلد ۱، ص ۶۱۵)
ص ۱۵۲ ص ۹۶۹ میراں جی شمس العشاق ف ۹۰۲ھ	گیان چند: ۲۵ شوال ۹۹۴ء (نوائے ادب اکتوبر ۸۶ء، ص ۳۰)
ص ۱۵۳ برہان الدین جانم ف ۹۹۰	حسینی شاہد ۱۰۰۷ھ (امین الدین اعلیٰ)
ص ۱۷۱ بہاالدین باجن ف ۹۱۶ھ/۱۵۰۶ء	صحیح ۹۱۲ھ
ص ۱۸۲ خاور نامہ ۱۶۴۹ء/۱۰۵۹ھ	جالبی: ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء (جلد ۱، ص ۲۶۵)
ص ۱۸۳ مولوی عبدالحق کی کتاب ملا نصرتی ۱۹۴۱ء میں شائع	طبعِ دوم کے مطابق ۱۹۴۴ء
ص ۱۹۵ آبرو ف ۱۱۱۶ھ/۱۷۵۰ء	جالبی: ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۷۳۳ء (جلد ۲، ص ۲۱۲)
ص ۲۷۶ سودا پ ۱۱۲۵ھ	جالبی: ۱۱۱۸ھ۔ (جلد ۲، ص ۶۵۳) مالک رام: ۱۱۲۶ھ (تحقیقی مضامین)
ص ۳۰۸ اثر پ ۵۷-۱۱۵۶ء	
ص ۳۸۷ امیر مینائی پ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء	ابو محمد سحر: ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ/۲۱ فروری ۱۸۲۹ء (مطالعۂ امیر ص ۶۷)

Scanned by CamScanner

ص ۳۹۲ شوق قدوائی پ ۱۸۸۲ء جو خود مؤلف کو درست نہیں لگتی	خمخانۂ جاوید ۱۸۵۲ء
ص ۴۱۹ ذوق پ ۱۷۹۵ء/۱۲۵۴ھ	عابد پشاوری: ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء - تنویر علوی: ۱۷۸۸ء
ص ۴۸۳ نظیر اکبر آبادی پ ۱۷۴۰ء	عبدالغفور شہباز: ۱۷۳۵ء (زندگانی بے نظیر)
ص ۶۷۰ نظم طباطبائی پ ۱۲۶۹ھ یا ۱۲۷۱ھ	اشرف رفیع ۱۶ صفر ۱۲۷۰ھ/نومبر ۱۸۵۳ء
ص ۶۷۲ صفی پ ۱۲۷۸ھ/۱۸۹۴ء	مالک رام: یکم رجب ۱۲۷۸ھ/۳ جنوری ۱۸۶۲ء (تذکرۂ ماہ و سال)
ص ۶۷۳ ثاقب لکھنوی پ ۱۲ جنوری ۱۸۹۹ء	مالک رام: ۲ جنوری ۱۸۶۹ء/ ۱۹ رمضان ۱۲۸۵ھ (تذکرۂ ماہ و سال)
ص ۶۸۷ محمد علی جوہر ف ۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء	مالک رام: اتوار، ساڑھے نو بجے شب ۴ جنوری ۱۹۳۱ء (تذکرۂ ماہ و سال)
ص ۶۹۵ حسرت موہانی پ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء	پاسپورٹ کے مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء (ہماری زبان یکم فروری ۹۳ء)
ص ۷۰۵ فانی پ ۱۳ اگست ۱۸۷۹ء	مالک رام: ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء حوالہ کتاب "فانی"
ص ۷۱۰ جگر پ ۱۸۶۰ء	صحیح ۱۸۹۰ء
ص ۷۱۴ شاد عظیم آبادی پ ۱۸۳۶ء	شاد کی کہانی: ۷ جنوری ۱۸۴۶ء
ص ۷۲۶ اقبال پ ۹ نومبر ۱۸۷۸ء	مالک رام: ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء (تحقیقی مضامین)
ص ۷۳۹ جوش پ ۱۸۹۶ء	کاظم علی خاں: ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء (جوش شناسی)
ص ۷۵۱ حفیظ جالندھری ف ۱۹۸۳ء	مالک رام: ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء حوالہ افکار حفیظ نمبر
ص ۸۳۶ سائل دہلوی پ ۱۸۶۷ء	مالک رام: ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء - (تذکرۂ ماہ و سال)

Scanned by CamScanner

ص۸۴۸ مختار صدیقی پ یکم مارچ ۱۹۱۹ء	مالک رام: یکم مارچ ۱۹۱۷ء - (تذکرۂ ماہ وسال)
ص۸۵۲ ناصر کاظمی ف ۱۹۷۲ء	مالک رام: ۴ مارچ ۱۹۷۴ء - (تذکرۂ ماہ وسال)
ص۸۶۶ ابنِ انشا پ ۱۹۲۶ء	معین الرحمان ۱۵ جون ۱۹۲۷ء - (اُردو تحقیق یونی ورسٹیوں میں)
ص۸۷۰ غلام ربانی تاباں پ ۱۹۲۵ء	مالک رام: ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء (تذکرۂ ماہ وسال)
ص۸۷۱ وجد پ ۱۹۱۴ء	مالک رام: ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء (تذکرۂ ماہ وسال)
ص۹۶۹ برہان الدین جانم ف ۹۹۰ھ	حسینی شاہد: ۱۰۰۷ھ (امین الدین اعلیٰ ص۱۵-۱۱۴)
ص۹۷۳ محمد قلی قطب شاہ ف ۱۰۶۰ھ	صحیح ۱۰۲۰ھ
ص۹۹۴ دریائے لطافت تصنیف ۱۸۰۲ء	صحیح ۱۸۰۷ء
ص۹۹۴ دریائے لطافت مرشد آباد ایڈیشن ۱۸۴۷ء	عابد پیشاوری ۱۲۶۶ھ/۵۰-۱۸۴۹ء
ص۱۰۰۶ غالب کا خط ذکا کے نام ۱۷۶۷ء	سہو کتابت۔ صحیح ۱۸۶۷ء
ص۱۰۴۰ مظہر علی ولا کی مادھونل کام کندلا ۱۸۰۴ء	ڈاکٹر عبیدہ: ۱۸۰۱ء (فورٹ ولیم کی خدمات ص۲۶۶)
ص۱۰۴۱ ولا کا ترجمۂ تاریخِ شیر شاہی ۱۸۲۰ء	عبیدہ ۱۸۰۵ء/ ۱۲۲۰ھ (فورٹ ولیم کی خدمات ص۲۶۶)
ص۱۰۲۸ آبِ حیات اشاعت ۱۸۸۱ء	اسلم فرخی ۱۸۸۰ء (محمد حسین آزاد، جلد ۲، ص۱۴)
ص۱۰۸۱ نذیر احمد پ ۱۸۳۶ء	اشفاق اعظمی ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء
ص۱۰۸۹ مولوی عبدالحق پ ۱۸۷۱ء	مالک رام: ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء (تذکرہ)
ص۱۱۳۱ نوطرزِ مرصع تصنیف ۱۷۸۱ء	گیان چند: ۱۷۷۵ء (نثری داستانیں)
ص۱۱۸۹ انگارے کی اشاعت ۱۹۳۱ء	ڈاکٹر عقیل رضوی: نومبر ۱۹۳۲ء (اعجاز حسین کی تاریخ ص ۳۹۳ ۳)

Scanned by CamScanner

آخر میں مختصراً اس تاریخ کے بارے میں اپنی مجموعی رائے پیش کردوں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا مزاج محققانہ نہیں۔ وہ قدما کے بیانات اور روایات کو پرکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ وہ اب بھی "آبِ حیات" کے زمانے میں رہتے ہیں۔ حد سے حد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے تحقیقی تشخص کا ان کے ریسرچ اسکالری کے زمانے (۱۹۴۱ء کے لگ بھگ) سے آگے ارتقا نہیں ہوا۔ جو شخص قلی قطب شاہ کو عبداللہ قطب شاہ کا بیٹا قرار دے، جو مصحفی کو سلیمان شکوہ کا استاد سمجھتا ہو، جو آج بھی مثنوی "لذتِ عشق" کو نواب مرزا شوق سے منسوب کرے، جو رابندر ناتھ ٹیگور کو ۱۸۳۹ء کی ایک تحریک کا قائد قرار دے میں اسے محقق نہیں کہہ سکتا۔ ان کی اس تاریخِ ادب میں کوئی بھی عالمانہ تحقیقی بحث نہیں ہے۔ وہ اختلاف آرا کی صورت میں فیصلہ نہیں کرتے، قاری کی رہبری نہیں کرتے، ضعفِ انتساب کو نہیں پرکھتے۔

کتاب کا خاکہ ناقص ہے۔ ابواب بندی میں تکرار اور بے ترتیبی ہے۔ تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں کرتے۔ نظیر اکبر آبادی پر داغ کے بعد اور واجد علی شاہ پر چکبست اور مضطر خیر آبادی کے بعد لکھتے ہیں۔ نثر میں پہلے غالب کے خطوط، پھر دلی کالج اور اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کو لیتے ہیں۔ آخرالذکر میں حیدر بخش حیدری کا پتا نہیں۔ مثنوی "سحرالبیان" اور رجب علی بیگ سرور کی تصانیف کو بھی نظر انداز کیا ہے۔

ان میں تنقیدی صلاحیتیں ہیں لیکن ان کی غلط مذہبیت ادبی نقطۂ نظر پر حاوی ہو گئی ہے۔ وہ اُردو کی ادبی روایات اور غزل کے مضامین کو بھی رَد کرتے ہیں۔ اس پر مزید ہے ان کی فرقہ پرستی۔ میں نے اُردو کے کسی بڑے ادیب کی تحریر میں یہ عنصر نہیں دیکھا۔ راسخ العقیدہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ میرے بزرگوں، رفیقوں اور شاگردوں میں ایسے پکّے مسلمانوں کا قافلہ ہے جو راسخ العقیدگی کے باوجود ذرا بھی متعصب نہیں۔ وہ میرے اور میں ان کا دل دادہ ہوں۔(۵) میں نے اپنے معاصر اہلِ اُردو میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو شریف ترین انسان پایا۔ کتب خانے میں انھیں بار بار نماز پڑھتے دیکھا لیکن وہ کتنے غیر متعصب اور وسیع النظر تھے کہ میرا، ان کے آگے سربسجود ہونے کو جی چاہتا ہے۔ اپنے مذہب سے عقیدت کے معنی دوسرے مذہب سے نفرت کے نہیں۔ ع:

ہر قوم راست راہے، راہے و قبلہ گاہے

ابواللیث مہاتما گاندھی سے خار کھاتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ اس شخص نے صرف پاکستان کی خاطر اپنی شہادت دی۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں ہندوستان اور پاکستان کے بیچ تقریباً جنگ کی حالت تھی۔ اثاثے کے بٹوارے کے تحت ہندوستان کو پاکستان کے حصے کے

Scanned by CamScanner

۵۵ کروڑ روپے ادا کرنے تھے۔ پاکستان کو روپے کی سخت ضرورت تھی لیکن کشمیر کی صورتِ حال کے باعث ہندوستان یہ روپیے دبا کر بیٹھ گیا تھا۔ مہاتما گاندھی نے اس کے خلاف مرن برت کیا۔ دو ہی دن بعد حکومت ہند یہ روپیہ ادا کرنے کو تیار ہو گئی اور مہاتما جی کا برت ختم کرادیا۔ اس پر ناراض ہو کر پہلے ایک پنجابی ہندو پناہ گزین نے ان پر ناکام حملہ کیا، چند روز بعد ناتھو رام گوڈسے نے انھیں ہلاک کردیا۔ ان کی شہادت کی قدر کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو پورے پاکستان میں چھٹی کا اعلان کردیا۔ میں نے ۳۰ جنوری کی شام کو ریڈیو پر قائداعظم کی تقریر سنی تھی۔

کتاب لکھنے کا مقصد قارئین کے علم میں اضافہ کرنا ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر ابواللیث تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و ہند کا حوالہ دیتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تاریخ لکھ کر تاریخِ مسلماناں کی پانچ جلدوں پر کون سا اضافہ کیا۔ ان کی تاریخ میں بہ مشکل ایسی پان سات باتیں ہوں گی جو دوسری تواریخِ ادب میں نہیں۔ اب اُردو ادب اتنا بڑا ہوگیا ہے کہ اس کی ایک جلد کی تاریخ بالکل سرسری ہوتی ہے، اس کا لکھنا نہ لکھنا برابر ہے۔ چھوٹی جماعتوں کی درسی ضروریات کے لیے پہلے سے کئی یک جلدی تاریخیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ابوالیث کی تاریخ میں سے لسانیات اور سیاسی سماجی پس منظر نکال دیا جائے۔ ادبی ابواب میں سے تکرار کو خارج کرکے ان کی ترتیبِ نو کی جائے تو ان کا مخصوص زاویۂ نظر باقی رہنے کے باوجود کتاب قابلِ مطالعہ ہوجائے گی۔

Scanned by CamScanner

پچیسواں باب

ڈاکٹر انور سدید: اردو ادب کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر انور سدید (ولادت ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء) ایک طرف سول انجینیرنگ کی ڈگری رکھتے ہیں، دوسری طرف اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی ہیں۔ ان کی سب سے اہم کتاب، ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو ادب کی تحریکیں، ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک" ہے۔ یہ ۱۹۸۵ء میں انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان کراچی سے شائع ہوا۔ ان کی کتاب "اردو ادب کی مختصر تاریخ" مقتدرہَ قومی زبان اسلام آباد سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ جب میں اپنی زیرِ نظر کتاب کا مسودہ ناشر کے سپرد کر چکا تھا اس کے کافی بعد میں مقتدرہَ قومی زبان کی عنایت سے مجھے ڈاکٹر سدید کی تاریخ ملی۔ اس کا مختصر جائزہ مسودے میں شامل کر رہا ہوں۔

اس کتاب میں ۷۲۲ صفحات ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سوا سات سو صفحات کی کتاب کو مختصر کہا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ اعجاز صاحب کی "مختصر تاریخ ادب اردو" واقعی مختصر تھی۔ سلیم اختر کی مختصر ترین تاریخ کو بھی مختصر کہا جا سکتا ہے لیکن انور سدید کے کارنامے کو نہیں۔ اعجاز صاحب کی تاریخ اصلاً ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت مختصر تاریخ لکھنا ممکن تھا لیکن اب اردو ادب اتنا بڑھ گیا ہے کہ سات سو صفحوں کی کتاب میں محض اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں، نام ہی گنوائے جا سکتے ہیں، تاریخ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ انور سدید کی کتاب کے اندر جہاں بھی سیر کیجیے یہی احساس ہوتا ہے کہ بیان بہت مختصر اور تشنہ ہے۔

مؤرخِ ادب کے سامنے بڑا مسئلہ رہتا ہے کہ تاریخ کے ابواب دور کے اعتبار سے ترتیب دیے جائیں، علاقے کے اعتبار سے کہ صنف کے اعتبار سے؟ جس ملحوظ کو پیشِ نظر رکھیے، دوسرے تقاضے مسخ ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے اردو جیسے طویل و عریض ادب کو محض ۱۳ بابوں میں محصور کیا ہے۔ یہ ابواب زیادہ تر زمانی دور کے مطابق ہیں۔ ہر دور میں نظم و نثر اور ان کی جملہ اصناف کی تاریخ کا بیان کیا گیا ہے۔ آخر کے ابواب میں اصناف و موضوعات اس طرح ٹھونس ٹھونس کے بھرے گئے ہیں جیسے دیاسلائی کی ڈبیا میں تیلیاں۔ فہرست میں تیرھویں باب "آزادی کے بعد ادب کا جدید دور" میں اصناف اور ان کے ذیلی

Scanned by CamScanner

عنوانات کی تعداد تقریباً ۳۸ ہے۔ سچ یہ ہے کہ اب اردو ادب کی تاریخ ایک جلد میں لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ اس میں موضوع سے انصاف ہو ہی نہیں سکتا۔

اگر ایک جلد میں لکھنے کی قید ہے تو ادب اور ادیبوں میں انتخاب سے کام لینا چاہیے، محض قابل ذکر تخلیقات اور تخلیق کاروں کے نام لیے جائیں لیکن ڈاکٹر سدید کی کوشش رہی ہے کہ کوئی صنف، کوئی موضوع، کوئی نام چھوٹنے نہ پائے۔ ہمارے عہد کا کوئی معمولی سے معمولی ادیب کیوں نہ ہو، وہ اپنا نام اس تاریخ میں تلاش کرے، کہیں نہ کہیں ٹنکا ہوا ضرور پائے گا۔ اس درگاہ سے کوئی ناامید نہیں جا سکتا۔ بدقسمت ہے وہ ادیب جس کا نام اس تاریخِ زریں میں رقم نہ کیا گیا ہو۔

عرضِ ناشر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ایم اے اردو کی نصابی ضرورتوں کا احاطہ کرتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کتاب میں از ابتدا تا انتہا تاریخِ اردو ادب کی معلومات سمائی ہوئی ہیں لیکن یہ معلومات اتنی ابتدائی اور سرسری ہیں کہ ایم اے کے طالبِ علم کے لیے کافی نہیں۔ جہاں تک قدیم ادب کا تعلق ہے، انور سدید اس کی تازہ تحقیقات سے واقف نہیں۔ انھیں قدیم اردو ادب کا محقق یا مورخ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں، بعد کے ادب کے بارے میں ان کی معلومات یقیناً شافی ہیں۔ میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ انور سدید نے گاگر میں ساگر یا کوزے میں دریا کو سمونے کا فن بڑی چابک دستی سے سرانجام دیا ہے۔ کون سا موضوع اور کون سا ادیب ہے جو اس زنبیلِ عمروعیار میں موجود نہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی تاریخ ہے جس کی جامعیت کا کوئی دوسری تاریخ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ نہایت عریض ہے لیکن ذرا بھی عمیق نہیں۔ پھر بھی اس سے ہر قاری کی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوگا۔ میں اس کا سرسری جائزہ لوں گا، اطناب سے بچنے کے لیے سنین سے بالکل صرفِ نظر کروں گا۔

مصنف نے مقدمے کو "روبرو" کے عنوان سے لکھا ہے۔ "اردو ادب کی تحریکیں" لکھنے کے بعد انھیں یہ کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ انھوں نے اس میں ابتدائے اردو سے زمانۂ حال (۳۱ دسمبر ۱۹۸۶ء) تک کے ادب کو پیش کرنے کی کاوش کی ہے (ص ۳۸)۔ ان کے نزدیک لاہور میں مسعود سعد سلمان اردو کا پہلا مینارۂ نور ہے۔ اب اردو پنجاب، دہلی اور دکن میں گھوم کر اولمپک مشعل کی طرح واپس اپنے وطن میں آگئی ہے (ص ۳۹)۔ مقدمے پر لاہور ۱۶ مئی ۱۹۸۹ء کی تاریخ درج ہے۔

پہلا باب "اردو زبان کی ابتدا: پس منظر اور قدیم روایت" ہے۔ اس میں بہت سے ذیلی عنوانات ہیں جن میں سیاسی و معاشرتی پس منظر بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

کپل کا "شانکھو شاستر"، پتنجلی کا "یوگ شاستر" اور ویاس کا

Scanned by CamScanner

"اتر مہالسا" چند اہم شاستر ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد "رلمائین" (کذا) اور
"مہابھارت" جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ (ص ۲۵)

کپل منی شانکیہ فلسفے کے اہم ستون ہیں۔ "سانکھ شاستر" ان کی کتاب نہیں۔
"اتر مہالسا" کا صحیح نام "اتر میمانسا" ہے۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ سدید کی مولّفہ پہلی تین
کتابوں کو شاستر کہا جا سکتا ہے۔ یہ "رلماین" اور "مہابھارت" پر مقدم نہیں، کئی صدی مؤخر
ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں نظریات کا جزو اچھا ہے جس میں کئی غیر معروف
نظریات کو بھی متعارف کیا ہے۔ اردو کو پنجاب میں پنجابی سے پیدا کرنے والے مختلف
نظریوں کے مدّاح ہیں۔ ممکن ہے اس میں مؤلف کے جذبۂ حبِ وطن کا دخل ہو۔ لکھتے ہیں:

۱۹۴۷ء میں جب نئی سیاسی حد بندیاں عمل میں آئیں تو یہ زبان
اپنے حقیقی وطن پنجاب و سندھ میں واپس آ گئی۔ (ص ۴۸)

کیا ۱۹۴۷ء سے پہلے اردو پاکستانی پنجاب میں نہ تھی؟ کیا پاکستانی پنجاب کی لسانی تاریخ
میں ۱۹۴۷ء نقطۂ تغیر ہے؟ کیا تقسیم کے بعد ہندوستان سے اردو سدھار گئی؟ اس قسم کے
بیانات حُبِ وطن اور علاقائی مفاخرت کی پیداوار ہیں، انھیں لسانیات سے کوئی تعلق نہیں۔
یہی کیفیت رسم الخط کے بیان میں ہے۔ وہ بار بار لپی کو تشدید کے ساتھ لپّی لکھتے ہیں، مثلاً
ص ۵۳ پر۔ دراصل اس کتاب میں کئی جگہ کتابت میں حشوی تشدید دکھائی دیتی ہے، مثلاً: لپّی
(ص ۵۳)، ببّر علی انیس (ص ۱۹۴)، ولی دکّنی (ص ۲۲۰)، دکّن (ص ۲۸۶)۔ معلوم نہیں یہ
مصنف کا املا ہے یا کاتب کا اضافہ؟ ہندوستان کی ایک قدیم لپی کا نام "کھروشتی" لکھتے ہیں
(ص ۵۳)۔ صحیح "کھروشٹی" ہے۔ دیوناگری رسم الخط کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ
مشاہدہ نقل کرتے ہیں:

دیوناگری لپی کو ایک نظر دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی
لمبی شاخ سے درجنوں بندر لٹکے ہوں ... دیوناگری کی یہ صورت بھی
ہندوستانی جنگل ہی کی ایک تصویر معلوم ہوتی ہے۔

(ص ۵۳)

اس قسم کی پھبتیاں اپنی بیٹھک کی خلوت میں جائز ہیں، لیکن ایک علمی کتاب میں یہ
غیر علمی لہجہ زیب نہیں دیتا۔ مؤلف اردو رسم الخط میں یہ تقدس تلاش کر لیتے ہیں:

اردو رسم الخط صوری اعتبار سے ربطِ ملت کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس
میں ایک حرف اپنی تجریدی صورت میں دوسرے حروف میں مل
جاتا اور پورے جملے کے چھوٹے بڑے الفاظ "ایک ہی صف میں

Scanned by CamScanner

کھڑے ہوگئے محمود و ایاز" کی صورت پیش کرتے ہیں۔

(ص ۵۴)

یہ تجزیہ بھی جذباتی ہے، لسانیاتی نہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ہے: "اردو زبان و ادب کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیا اور بھگتوں کا حصہ"۔ "بھگتوں" کے بجائے "سنتوں" موزوں تر رہتا۔ اس باب میں خواجہ فرید شکر گنج، امیر خسرو، خواجہ بندہ نواز اور شاہ میراں جی شمس العشاق سے متعدد ایسی تخلیقات منسوب کی ہیں جنھیں جدید تحقیق غلط ثابت کر چکی ہے۔ حیرت ہے کہ وہ ۱۹۸۹ء میں "معراج العاشقین" کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف قرار دیتے ہیں (ص ۷۲)۔ اُن سے اس صاف زبان کے شعر منسوب کرتے ہیں"

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اُسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا اُسے

وہ یہ غزل بھی خواجہ کی تخلیقات میں درج کرتے ہیں:

تول تو سی ہے لشکری کر نفس گھوڑاسار تول

اگر وہ "علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو"، ص ۲۶۹ یا جمیل جالبی کی تاریخ جلد اوّل، ص ۲۲۸ دیکھ لیتے تو انھیں پتا چل جاتا کہ یہ غزل خواجہ بندہ نواز کی نہیں خواجہ شہباز حسینی کی ہے۔ ڈاکٹر سدید ص ۷۵ پر شاہ علی جیو کی نسبت "گام دھانی" لکھتے ہیں، صحیح "گام دھنی" ہے۔

تیسرا باب "شمالی ہندوستان میں اردو ادب کا ابتدائی فروغ" ہے۔ اس سلسلے میں وہ دھڑلے سے لکھتے ہیں:

> مسعود سعد سلمان کو اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک ان سے پہلے زمانے کے کسی شاعر کا دیوان دریافت نہیں ہوتا۔ (ص ۸۵)

کیا مسعود سعد سلمان کا اردو دیوان دریافت ہو گیا؟ مؤلف کے دعوے کی بنیاد عوفی اور امیر خسرو کے یہ بیان ہیں کہ سلمان نے ہندوی یا ہندی میں بھی دیوان تیار کیا ہے۔ سدید صاحب نے اسے اردو سمجھ لیا۔ انھیں معلوم نہیں کہ زمانۂ قدیم میں ہندوستان کی کسی بھی زبان کو ہندی یا ہندوی کہہ دیا جاتا تھا حتیٰ کہ یہ نام سنسکرت، تیلگو اور مراٹھی تک کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مسعود سلمان کے تعلق سے ہندوی یا ہندی سے مراد قدیم پنجابی ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی زبان میں ان کا ایک مصرع تک موجود نہیں اور مصنف انھیں اردو کا شاعر

Scanned by CamScanner

قرار دینے پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ تحقیق میں حزم واحتیاط کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔

اس باب میں ص ۸۷ پر وہ مثنوی "دردنامہ" کے مصنف کا نام محبوب عالم عرف شیخ جیون لکھتے ہیں۔ "پنجاب میں اردو" کی تصنیف کے بعد محمود شیرانی نے واضح کیا کہ یہ دو شخصیتیں ہیں۔ شاعر کا نام محبوب عالم ہے اور شیخ جیون اس کا دوست ہے(۱)۔ اسی باب میں آگے چل کر شاہ مراد خان پوری (م ۱۷۰۲ء) دلشاد پسروری اور شاکر اٹکی (م ۱۷۷۲ء) کا ذکر معلومات افروز ہے۔ گو ان سے پہلے جمیل جالبی بھی اپنی تاریخ میں ان کو متعارف کر چکے ہیں۔

شمالی ہند میں اردو نثر کے سلسلے میں وہ بڑے لڑکھڑاتے انداز میں محمد حسین آزاد اور شمس اللہ قادری کے حوالے سے فضلی کی "دہ مجلس" کا ذکر کرتے ہیں (ص ۹۲)۔ انھیں معلوم نہیں کہ اس کتاب کو مالک رام اور مختارالدین احمد شائع کر چکے ہیں اور اس کا صحیح نام "کربل کتھا" ہے۔ اس میں ۱۲ مجلسیں ہیں، دس نہیں۔ اس لیے اس کا نام "دہ مجلس" غلط ہے۔

چوتھا باب "جنوبی ہند میں اردو ادب کا ابتدائی فروغ" ہے۔ اس میں نظامی کی ایک نئی مثنوی "خوف نامہ" کی اطلاع دیتے ہیں اور نمونتاً دو شعر درج کرتے ہیں۔ ان کی زبان بہت صاف ہے۔ یہ "کدم راؤ پدم راؤ" کے شاعر کی تصنیف نہیں ہوسکتے۔ میں نے "خوف نامہ" کا ذکر اور کہیں نہیں پڑھا۔ مؤلف کو اپنے ماخذ کی تفصیل دینی چاہیے تھی تاکہ انتساب کو پرکھا جاسکتا۔ انھوں نے اشرف بیابانی سے ایک نظم "واحد باری" منسوب کی ہے۔ یہ نظم نظام سکندر جاہ کے عہد کے کسی اشرف کی ہے(۲)۔ میں نے اس نظم کا مخطوطہ دیکھا ہے جس میں شاعر نے اطلاع دی ہے کہ وہ بریلی یوپی کا رہنے والا ہے، جہاں سے حیدر آباد گیا۔

مؤلف نے اس باب کے جزو "ب" میں جلی عنوان میں لکھا ہے، "بےجاپور میں اردو ادب کی نشوونما" (ص ۹۹)۔ آگے بھی ہر جگہ یائے مجہول سے "بےجاپور" لکھا ہے حالانکہ شہر کا صحیح نام یائے معروف سے "بیجاپور" (بی جاپور) ہے اور یہی بولا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سدید نے ص ۱۱۲ پر شیخ احمد دکنی مصنف "لیلیٰ مجنوں" و "یوسف زلیخا" کا ذکر کیا ہے۔ یہ شیخ احمد دکنی نہیں، گجراتی تھے جو گجرات سے دکن چلے آئے۔ جمیل جالبی اور سیدہ جعفر دونوں نے انھیں گجراتی قرار دیا ہے(۳)۔ مؤلف غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" کے بیان کے بعد علی گڑھ تاریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غواصی کی ایک اور مثنوی "چندا اور لورک" بھی دریافت ہو چکی ہے (ص ۱۱۵، فٹ نوٹ)۔ غواصی نے کوئی مثنوی "چندا اور لورک" نہیں لکھی۔ مؤلف کو غلط فہمی ہوئی۔ چندا اور لورک مثنوی "مینا ستونتی" ہی کے اہم کردار ہیں۔ علی گڑھ تاریخ میں

Scanned by CamScanner

غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" کا ذکر نہیں۔ غواصی کے بیان کے آخر میں "چندا اور لورک" نام دے کر اس کی دریافت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علی گڑھ تاریخ کے چند سال بعد ۱۹۶۵ء میں غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" شائع ہو گئی۔ تفصیل دیکھیے، ڈاکٹر پرکاش مونس کی کتاب "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر" میں ص ۲۳۱ اور اس کے آس پاس۔

دقت یہ ہے کہ مؤلف پرانے ادب کی تحقیق میں نئی نئی دریافتوں اور تصحیحات سے واقف نہیں۔ اگلے زمانے میں مولوی عبدالحق، محمود شیرانی اور ڈاکٹر زور وغیرہ نے جو کچھ لکھ دیا اسے حرفِ آخر مان کر درج کر دیتے ہیں۔ بعد کے محققین نے ان بزرگوں کی تحریروں میں جو تصحیحات کی ہیں ان سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے۔ مؤلف ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے مذکور "رسالۂ جنونیہ" اور "رسالۂ شاہ راجو" کا ذکر کرتے ہیں اور آخرالذکر کی یوں قدر افزائی کرتے ہیں:

> ان شواہد کی بنا پر "رسالۂ شاہ راجو" کو اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ اور شاہ راجو کو پہلا نثر نگار قرار دینا مناسب ہے۔ (ص ۱۳۰)

ڈاکٹر حسینی شاہد نے شاہ امین الدین علی اعلیٰ پر اپنی کتاب میں واضح کیا کہ "رسالۂ جنونیہ" کئی صدی بعد کا ہے۔ "رسالۂ سید راجو" کے بارے میں انھوں نے اپنے ایک مضمون میں صراحت کی کہ یہ بہت بعد کے شاہ محمد کادری نور دریا کی تصنیف ہو سکتا ہے(۴)۔ حیرت ہے کہ مؤلف نے خواجہ بندہ نواز سے "معراج العاشقین" اور دوسرے نثری رسالے منسوب کیے ہیں (ص ۱۲۳)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ مؤلف کے ماخذ میں رہی ہے۔ اگر وہ اسے توجہ سے پڑھتے تو قدیم ادب کے بارے میں متعدد لغزشوں سے محفوظ رہتے۔ افسوس کہ اطناب سے بچنے کے لیے میں ان کے اس قبیل کے جملہ تسامحات کی نشاں دہی نہیں کر سکتا۔

پانچواں باب "شمالی ہند میں اردو ادب کی صبحِ صادق" اچھا ہے۔ اس کا جزو "س" "شمالی ہندوستان میں اردو نثر کا ابتدائی دور" بطورِ خاص قابلِ قدر ہے۔ اس میں "کربل کتھا" کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "کربل کتھا" پہلی دفعہ ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۸۵۰ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد نے اس کا ایک نسخہ ٹوبنگن (جرمنی) سے تلاش کیا اور پنڈت مالک رام کے اشتراک سے ۱۹۶۵ء میں دوبارہ شائع کیا۔
> (فٹ نوٹ، ص ۱۶۷)

مجھے اس بیان پر تین اعتراضات ہیں۔ اگر انھوں نے مطبوعہ "کربل کتھا" دیکھی ہوتی تو اس کے مقدمے میں مرتبین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ دتاسی کی یہ اطلاع درست نہیں

Scanned by CamScanner

معلوم ہوتی کہ "کربل کتھا" دہلی میں ۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ مرتبین اس کتاب کو پہلی بار شائع کر رہے ہیں (مقدمہ، ص ۴۵)۔ دوسری بات یہ ہے کہ مؤلف بار بار مالک رام کے نام سے پہلے پنڈت کا اعزازی سابقہ لگاتے ہیں، مثلاً مندرجۂ بالا کے علاوہ ص ۲۵۷ پر۔ پنڈت سے مراد برہمن ہوتے ہیں۔ مالک رام اروڑہ تھے۔ انھیں کسی نے پنڈت نہیں لکھا۔ پنڈت مالک رام ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے سید اسد اللہ غالب یا علامہ سید اقبال۔ آخری بات یہ کہ مؤلف کے ذہن میں متن اور حاشیے کے اندراجات کی تفریق کا کوئی معیار نہیں۔ وہ ایک بیان کا کچھ حصہ متن میں دیتے ہیں اور کچھ حاشیے میں ٹانک دیتے ہیں، حالانکہ یہ اہم اطلاعات متن ہی میں لکھی جانی چاہیے تھیں۔ فٹ نوٹ کا استعمال حوالے کے لیے یا ایسے اندراج کے لیے ہونا چاہیے جو متن میں دیا جائے تو تسلسل کو مجروح کرے۔

قواعد و لغت سے متعلق جزو "ح" بھی قابلِ قدر ہے، بالخصوص کسی کی ۱۵۹۹ء کی "ہندوستانی فارسی لغت" کی طرف اشارہ۔ اس صفحے پر کئی خالی جگہوں میں انگریزی نام چھپنے سے رہ گئے ہیں۔

چھٹا باب "شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ تک" کے لکھنوی ادب کے بارے میں ہے جس میں کئی اصناف نظم و نثر کا تعارف کیا ہے۔ اس میں ناسخ کی مثنوی کا نام "سراج نامہ" لکھا ہے (ص ۱۹۷)۔ صحیح "سراجِ نظم" ہے ع:

نام رکھا سراجِ نظم اس کا

اس کے آگے دیا شنکر نسیم کی مثنوی کا ذکر ہے جس پر محض اعتراضات کیے ہیں، معاصر لکھنو میں اس کی مقبولیت کے اسباب جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اردو میں واسوخت کے ابتدائی نقوش کے سلسلے میں سودا کا نام لیتے ہیں (ص ۲۰۳)۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ شاہ مبارک آبرو کے دیوان میں واسوخت موجود ہے (دیوان، مرتبہ محمد حسن، علی گڑھ تاریخ ندارد، ص ۲۴۴)

ابواب کی صحیح ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے رجب علی بیگ سرور اور "فسانہ عجائب" کا بیان پہلے ہے، یعنی ص ۲۰۸ پر اور میرامن اور "باغ و بہار" کا اس کے بعد ص ۲۲۸ پر مولوی عبدالحق کی تقلید میں لکھتے ہیں کہ میرامن نے دیباچے میں اپنے ماخذ "نوطرزِ مرصع" کا ذکر نہیں کیا (ص ۲۲۷)۔ لیکن انھیں محمود شیرانی کی اس تصحیح کا علم نہیں کہ "باغ و بہار" کی طبعِ اول کے سرورق پر برملا اعلان تھا کہ:

ماخذ اس کا "نوطرزِ مرصع" کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا۔(۵)

آگے لکھتے ہیں میرامن سے پہلے محمد عوض زریں نے بھی اس کا ترجمہ کیا (ص ۲۲۸)۔ اس

Scanned by CamScanner

بیان میں دو خرابیاں ہیں- اوّل یہ کہ زرّیں کا نام محمد عوض نہیں، محمد غوث تھا، دوسرے یہ کہ اس نے میر امن سے پہلے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ دونوں نے ۱۲۱۷ھ میں ترجمہ کر کے تاریخ "باغ و بہار" نکالی-

نویں باب "غالب کا عہد" میں نودریافت مخطوطۂ دیوانِ غالب کے لیے لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں یہ دیوان "نسخۂ امروہہ" کے نام سے شائع ہوا ہے (حاشیہ، ص۲۵۵)- یہ درست نہیں- ہندوستان میں اسے اکبر علی خاں عرشی زادہ نے مرتب کر کے "دیوانِ غالب بخطِ غالب، نسخۂ عرشی زادہ" کے نام سے چھپوایا- "نسخۂ امروہہ" ہندوپاک کے کسی ایڈیشن کا نام نہیں- اسی باب کا ایک عنوان ہے، "عہدِ غالب کی نثر"- اس میں محمد بخش مہجور کا بھی مختصر ذکر ہوا ہے (ص۲۶۲)- ان کی کتابیں سرور پر مقدم تھیں لیکن ان کا ذکر سرور کے بہت بعد میں کیا ہے- خواجہ امان کے لیے لکھتے ہیں:

> خواجہ امان (متوفی ۱۸۷۹ء) کی "بوستانِ خیال" میر تقی خیال گجراتی کی فارسی داستان کی دس میں سے پانچ جلدوں کا ترجمہ ہے-
>
> (متن، ص۲۶۲)
>
> خواجہ امان نے "بوستانِ خیال" کا ترجمہ دو جلدوں میں کیا تھا-
>
> (حاشیہ، ص۲۶۲)

مجھے جھنجھلاہٹ ہوتی ہے کہ پہلے اور دوسرے بیان میں ایسا کیا فرق ہے کہ دوسرے بیان کو حاشیہ میں جگہ دی گئی- مؤلف کے ذہن میں متن اور حاشیے کے فرق کا کوئی تصور نہیں- جو جی چاہا متن میں لکھ دیا، اسی سے مماثل بیان کو حاشیہ نشین کر دیا- "بوستانِ خیال" فارسی اور اردو کی جلدوں کی تعداد میں بھی التباس کیا ہے- ان کے مآخذ میں میری کتاب "اردو کی نثری داستانیں" طبعِ اوّل کراچی ۱۹۵۴ء رہی ہے- معلوم نہیں کیوں، اس سے بدرجہا بہتر دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء نہیں دیکھا- اگر طبعِ اوّل کو توجہ سے دیکھتے تو جلدوں کی تعداد کی بات صاف ہو جاتی- اگر اضافہ شدہ طبعِ دوم کو دیکھتے تو سب کچھ آئینہ ہو جاتا- "بوستانِ خیال" فارسی کے مخطوطات میں جلدوں کی تعداد کاتبوں کی مرضی کے مطابق ہیں؛ کہیں ۱۵، کہیں ۱۶- ان کا اردو ترجمہ آٹھ جلدوں میں ہے جن میں سے سات جلدیں امان کا کارنامہ ہیں(۶)-

مؤلف نے "اگر و گل" کے مترجم کا نام عاصی لکھنوی لکھا ہے (ص۲۶۴)- صحیح سعادت خاں ناصر ہے- "گل صنوبر" کے مترجم کا نام ہیم چند کھتری لکھا ہے اور فٹ نوٹ میں سہیل بخاری کا قول درج کیا ہے کہ نیم چند غلط ہے (ص۲۶۴)- درست یہی ہے کہ اس کا نام نیم چند تھا- ہیم چند کوئی نام نہیں ہوتا- "گل صنوبر" کی طبعِ اوّل اور معتبر نسخوں میں

نیم چند ہی درج ہے(۷)۔ ص۲۶۶ پر نواب کریم خاں کی ۱۸۴۰ء کی ڈائری کا تعارف معلومات افروز ہے۔ میں اس سے واقف نہ تھا۔

تنقیدی جائزوں میں ڈاکٹر انور سدید نے اپنے اور دوسروں کے بعض بہت دلکش، بلیغ اور جامع جملے درج کیے ہیں جنھیں میں اس مضمون کے آخری حصے کی تزئین کروں گا۔ ص۸۳-۲۸۲ پر انھوں نے حالی کی غزل کا جو تجزیہ کیا ہے مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ مؤلف کا دبستانِ سرسید کا جائزہ بھی سلیم الطبعی اور توازن کا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں مخالفین کا تعارف خاص طور سے توجہ طلب، بلکہ دادطلب ہے۔ انھوں نے رشیدۃ النسا بیگم کو اردو کی پہلی ناول نگار خاتون قرار دیا ہے۔ اس سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ جیسے جیسے ہم جدید دور میں داخل ہوتے جاتے ہیں، ڈاکٹر سدید مفید اور دلچسپ معلومات کے ڈبے کھولتے جاتے ہیں۔ غدر کے بعد کے دور پر وہ قدرت کے ساتھ لکھتے ہیں، مثلاً ان کا مختصر جزو "سفرنامہ" ملاحظہ ہو (ص۱۲-۳۰۸)۔

اب میں ایک بڑی جست لگاتا ہوں۔ مؤلف نے ص۳۵۳ پر جگر کا نام سکندر علی لکھا ہے، صحیح علی سکندر ہے۔ میں اس باب میں سنین کا جائزہ نہیں لے رہا ہوں لیکن ایک اندراج میں سامنے کی غلطی نظر آئی۔ ص۳۵۶ پر فراق کو متوفی ۱۹۸۱ء لکھا ہے۔ وہ دراصل ۱۹۸۴ء میں رخصت ہوئے۔ مؤلف نے ص۳۵۸ پر چکبست کے لیے جو لکھا ہے، "بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔" مجھے اس سے اتفاق کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل کہاں ہے؟

ص۳۷۱ سے ۳۷۳ تک اردو کے پہلے افسانہ نگار کی بحث دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> ڈاکٹر معین الرحمان نے یلدرم کے ایک قدیم افسانے "نشے کی ترنگ" کی نشاں دہی کی ہے جو "اردوئے معلیٰ" میں اکتوبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ (ص۳۷۳)

لیکن ص۴۰۴ پر انھوں نے درست لکھا ہے کہ "اردوے معلیٰ" ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ دراصل پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء کا ہے۔ مؤلف خود "نشے کی ترنگ" کو خارج کر دیتے ہیں، کیونکہ اس کی مستند شہادت دستیاب نہیں، اس لیے یلدرم کے افسانے "غربت و وطن" ("اردوے معلیٰ"، اکتوبر ۱۹۰۶ء) کو اردو کا پہلا طبع زاد افسانہ قرار دیتے ہیں (ص۳۷۳)، لیکن مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب "اردو افسانے کی تاریخ" میں راشد الخیری کے افسانے "نصیر اور خدیجہ" (۱۹۰۳ء) کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا ہے (رسالہ "تجدید"، کلکتہ، پہلا شمارہ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء، ص۱۶۳)

Scanned by CamScanner

ص ۳۸۷ پر نصیر الدین ہاشمی کی ایک کتاب کا نام "دکنی ہندی اور اردو" لکھا ہے۔ دکنی اور اردو کی رعایت سے "ہندی" بہت برجستہ معلوم ہوتا ہے لیکن کتاب کا صحیح نام "دکنی ہندو اور اردو" ہے۔ ہاشمی کے لیے لکھتے ہیں:

شاہدانِ بازاری سے ان کی دلچسپی ایک علاحدہ مضمون ہے۔

میں نے حیدر آباد کے طویل قیام میں ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ اگر اس میں کچھ حقیقت بھی ہو تو اردو ادب کی تاریخ میں اس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا تھا۔ تحقیق کی روایت کے اس جزو میں انھوں نے مسعود حسن رضوی ادیب اور قاضی عبدالودود پر ایک ایک پیرا گراف لکھا ہے۔ ضروری تھا کہ یہیں امتیاز علی عرشی اور مالک رام کا بیان بھی کر دیا جاتا لیکن ان دو عظما کو ص ۶۵۴ پر جگہ ملی ہے۔ مالک رام کو ایک جملہ اور مولانا عرشی کو محض نام کا اندراج۔ مؤلف نے ہندوپاک کے محققوں پر جو جابجا لکھا ہے ان میں سے بعض کے بارے میں مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ تحقیق میں ان کا کوئی قابلِ ذکر کام ہے کہ نہیں؟

ص ۷۴۱ پر حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخِ اردو" کا سنہ ۱۹۳۸ء لکھا ہے حالانکہ اس کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ آگے لکھتے ہیں:

مولوی عبدالسلام ندوی کی تاریخ "شعر الہند" پر دبستانِ ندوہ کا تحقیقی مزاج غالب ہے۔ (ص ۴۱۸)

اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ "شعر الہند" خالص تنقیدی کتاب ہے، جس میں تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے۔

تیرھویں باب کی ابتدا میں پیر مسعود سعد سلمان کو اردو کا پہلا شاعر کہہ کر ان کے لاہوری ہونے پر فخر کیا ہے۔ یہ بزرگ کمال کے اردو شاعر ہیں جن کا ایک اردو مصرع کسی نے نہیں دیکھا۔ اس باب میں آزادی کے بعد کے اردو ادب کی متعدد اصناف و موضوعات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں ماہیا، کافی، سی حرفی، نظمانہ، دینی شاعری، فکاہیہ کالم، یادنگاری، خطوط، ٹیلی ورژن ڈراما، منظوم ڈراما وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے اردو ادب کی تحریکوں پر تحقیق کی ہے۔ اپنے مطبوعہ مقالے کے پہلے باب میں انھوں نے رجحان اور تحریک کا فرق دکھایا ہے (۸)۔ لیکن دبستان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں انھوں نے باربار دبستان کا لفظ استعمال کیا ہے، مثلاً دبستانِ لاہور (ص ۳۱۶)، لاہور کا دبستانِ تحقیق، کراچی کا دبستانِ تحقیق، دبستانِ حسن عسکری، ایک منفرد تنقیدی دبستان (ڈاکٹر وزیر آغا کا)۔

معلوم نہیں ان کا دبستان کا کیا تصوّر ہے۔ علی جواد زیدی نے تو دہلی اور لکھنؤ کے

Scanned by CamScanner

دبستانوں پر بھی سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ انور سدید لاہور اور کراچی کے الگ الگ دبستانِ تحقیق قائم کرتے ہیں۔ مجھے ان دونوں شہروں کی تحقیق کے ما بہ الامتیاز کا عرفان نہیں۔ شاید مؤلف دبستان کے لیے ایک مقام پر کچھ افراد کے اجتماع کو کافی سمجھتے ہیں۔ ان میں کسی ادبی رجحان، ادبی روایت، پسند و ناپسند کا اشتراک ضروری نہیں سمجھتے۔ حسن عسکری اور وزیر آغا کے تنقیدی دبستان ہو سکتے ہیں لیکن لاہور کے جملہ شاعروں اور نثر نگاروں کو یا وہاں کے محققین کو ایک علاحدہ دبستان کہا جا سکتا ہے، مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے۔ ضمناً یہ کہتا چلوں کہ لاہور کے دبستانِ تحقیق کے تحت محمد اکرام چغتائی کے احوال میں لکھا ہے کہ "تاریخِ مشغلہ" مصنفہ واجد علی شاہ ان کی دقتِ تحقیق کا ایک اور کارنامہ ہے (ص ۶۴۸)۔ جناب مسعود حسن رضوی نے اپنی کتاب "سلطانِ عالم واجد علی شاہ" میں اس کتاب کا سرسری ساذکر کیا ہے لیکن وہ ان کی نظر سے نہیں گزری (لکھنؤ، ۱۹۷۷، ص ۲۲۲)

جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا ڈاکٹر انور سدید نے بعض ادیبوں کی خصوصیات کو انشاپردازانہ جملوں میں خوب اسیر کیا ہے۔ ایسے چند شاعرانہ جملوں کا لطف لیجیے اور ان کی بلاغت کی داد دیجیے۔ ان میں سے چند جملے دوسروں کی تحریر سے ڈاکٹر بحث کیے گئے ہیں۔

۱۔ حالی کی خاندانی مفلوک الحالی نے انکسار اور نذیر احمد کی گداگری نے انحصار کے زاویے پیدا کیے تھے لیکن شبلی کے راجپوتی خون نے حریت پسندی کا راستہ قبول کیا (ص ۲۸۶)۔

۲۔ دبستانِ سرسید میں ذات کی جستجو دھیمی اور روح کی صدا مدھم ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ (ص ۲۹۰)۔

۳ (شرر کے) ناولوں کے ہیرو جذبات زدہ اور عشق پیشہ ہیں اور ان کی فتح میں غیر مسلم عورتوں کو مغلوب کرنا حدِ کمال کا درجہ رکھتا ہے (ص ۲۹۹)۔

۴۔ یہ ناول ("امراؤ جان ادا") ایک ایسا بالاخانہ ہے جس میں گزشتہ لکھنؤ اپنے تہذیبی سیاق اور سباق کے ساتھ موجود ہے (ص ۳۰۰)۔

۵۔ "شاہدِ رعنا" میں قصہ تو موجود ہے لیکن روح غائب ہے (ص ۳۰۱)۔

۶۔ شرر نے اپنے مضامین میں زندگی کو کھویا ہوا بانکپن تصور کیا ہے، انھوں نے اس جنتِ گم گشتہ کو تلاش کرنے کی سعی کی لیکن اس جہدِ تحریر میں حقیقت سے ناتا کمزور ہو گیا (ص ۳۰۴)۔

۷۔ ریاض خیر آبادی نے درست کہا تھا کہ میر ناصر علی قلم کے بجائے دل سے لکھتے ہیں (ایضاً)۔

Scanned by CamScanner

۸ (منشی محمد دین) فوق کی کمزوری ان کا غیر تخلیقی اسلوب ہے۔ انھوں نے حقائق کی مناسب کھدائی بھی نہیں کی (ص۳۰۵)۔

۹۔ سرسید کا سفرنامہ "مسافرانِ لندن" کسی ایسے سیاح کا سفرنامہ نہیں جو پاسبانِ عقل سے نجات حاصل کر کے لذتِ نایاب کی تلاش میں سرگرداں ہو (ص۳۰۹)۔

۱۰۔ ظفر علی خاں شدید ردِ عمل کے شاعر تھے (ص۳۵۹)۔

۱۱۔ مجید امجد (متوفی ۱۹۷۴ء) سکوت سخن جُو کا شاعر تھا (ص۴۵۴)۔

۱۲۔ کرشن چندر کا شبنمی اسلوب ان کی خوبی بھی ہے، کمزوری بھی (ص۴۷۵)۔

۱۳۔ خواجہ احمد عباس کو ترقی پسند تحریک کا ایسا رپورٹر شمار کیا گیا جس پر افسانہ نگار کا گمان ہوتا ہے (ص۴۷۷)۔

ایسے دلآویز قولِ فیصل کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ دل کو فرحت اور ذہن کو روشنی بخشتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ۳۰ صفحوں کی جامع کتابیات ہے، اشاریہ نہیں جو تاریخِ ادب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ دقت یہ ہے کہ اس تاریخ میں نام اتنی فراوانی سے آئے ہیں کہ جامع اشاریہ ۱۰۰ صفحوں سے کیا کم میں آتا۔ کون ناشر یہ کمر شکن بار اٹھا سکتا ہے۔ آخر میں مختصراً میں یہی کہوں گا کہ قدیم ادب ڈاکٹر انور سدید کا متقل ہے۔ وہ اس کی نو بہ نو تحقیق کے ساتھ قدم بہ قدم نہیں چل پائے لیکن اس سے قطعِ نظر انھوں نے جس غیر معمولی طور پر وسیع موضوع کو جس سلیقے سے ایک متوسط حجم کی کتاب میں سما دیا ہے اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اتنے زیادہ مواد کو ترتیب دینے میں انھیں کتنی مشقتِ شاقہ کرنی پڑی ہوگی۔ بیسویں صدی کے ادب کے لیے یہ تاریخ خصوصیت سے قابلِ قدر ہے جس سے ہر قاری کے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوگا۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱) شیرانی: "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" در "اورینٹل کالج میگزین"، بابت نومبر، ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۲ء۔ بازطباعت: "مقالاتِ شیرانی" جلد دوم، ص ۳۷۷
(۲) نصیر الدین ہاشمی: کتب خانۂ نواب سالارجنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست"، طبع اول، ص ۵۶-۳۵۵
(۳) جالبی: "تاریخِ ادبِ اردو"، جلد اوّل، ص ۴۳۲۔ سیدہ جعفر: مثنوی "یوسف زلیخا" کا مقدمہ، حیدر آباد، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱
(۴) مضمون "کلمۃ الحقائق اردو نثر کا پہلا مستند نقش" در "نوائے ادب"، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱۱
(۵) محمود شیرانی: مضمون "چاردرویش" در "کارواں" لاہور، سال نامہ، ۱۹۳۳ء
(۶) "نثری داستانیں"، کراچی، ۱۹۵۴ء، ص ۲۰۰-۱۹۷۔ طبعِ دوم ۱۹۶۹ء، ص ۱۹۵۹ء، ص ۲۰۹
(۷) "نثری داستانیں"، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۵۷۶، نیز "گل صنوبر" مرتبۂ رفیق مارہروی، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء، دیباچہ، ص ۱۲
(۸) "اردو ادب کی تحریکیں"، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۶-۴۴

Scanned by CamScanner

چھبیسواں باب

علی جواد زیدی: اردو ادب کی تاریخ (انگریزی)

ادھر کے چند برسوں میں انگریزی میں اردو ادب کی کئی تاریخیں لکھی گئیں۔ ان میں تازہ ترین سیّد علی جواد زیدی کی "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" ہے جسے ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ اس میں مصنف کے پیش لفظ پر بمبئی ۱۹۹۱ء کی تاریخ درج ہے جس سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ کتاب میں ۱۹۹۰ء تک کا مواد ہونا چاہیے۔ اس میں ۱۶ تمہیدی صفحات کے بعد متن، مختصر کتابیات اور اشاریے کے کل ۴۵۹ صفحات ہیں۔ اس ضخامت کی انگریزی کتاب کی قیمت محض ۱۴۰ روپے ! ع:

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

علی جواد زیدی نے گجرال کمیٹی رپورٹ کا مسودہ تحریر کیا تھا۔ اس کے دوسرے باب میں جو تاریخی پس منظر دیا تھا وہی ان کی موجودہ تاریخ کا پیش رَو معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُس باب کے کئی ذیلی اجزا موجودہ تاریخ کے باب بن گئے ہیں۔ دیباچے میں وہ یہ مفید اطلاع فراہم کرتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے ہندوستان میں ۱۶۷۳ زبانیں اور بولیاں ہیں۔ ان کے اندازے میں دنیا میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۰ کروڑ ہے جن میں چھ کروڑ سے زیادہ ہندوستان میں ہیں۔ یہ خیال کہ اردو محض شہری زبان ہے، صحیح نہیں، کیونکہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اردو بولنے والوں کی تقریباً ۵۳ فی صد آبادی دیہاتی علاقوں میں رہتی ہے۔

زیدی لکھتے ہیں کہ "انگریزی یا اردو میں لکھی ہوئی اب تک کی اردو ادب کی تاریخوں میں اردو زبان کے آغاز اور پھیلاؤ کا تحقیقی جائزہ نہیں لیا گیا۔" میری رائے میں آغاز کے بارے میں تو کئی تاریخوں نے لکھا ہے، پھیلاؤ کی طرف اتنی توجہ نہیں کی۔ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں پاکستان کے صوبوں میں اردو کے آغاز اور پھیلاؤ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ زیدی لکھتے ہیں کہ:

Scanned by CamScanner

پاکستان میں بھی تاریخ کا ایک پروجیکٹ ہے جس کے نگراں
جمیل جالبی ہیں۔ (ص ۷)

یہ پوری طرح صحیح نہیں۔ جالبی کو کہیں سے کوئی پروجیکٹ نہیں ملا۔ وہ اپنی خوشی سے، تنِ تنہا اپنے وسائل سے ایک تاریخِ ادب لکھ رہے ہیں جس کی ابھی تک تین جلدیں آ چکی ہیں۔

زیدی واضح کرتے ہیں کہ قاری کو اس تاریخ میں شمالی ہند میں دلی اور لکھنؤ اسکول کی تقسیم نہیں دکھائی دے گی کیونکہ وہ اپنی کتاب "دو ادبی اسکول" میں واضح کر چکے ہیں کہ دبستانوں کی یہ دوئی غیر حقیقی ہے۔ وہ اپنی اس مشکل کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک جلد کے اندر پورے اردو ادب کی تاریخ سمانے میں کافی دقت ہوئی جس کے ازالے کے لیے وہ علاحدہ سے ایک اور ضخیم تر جلد لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کی اس ہدایت کا بھی ذکر کیا ہے کہ تقسیم کے بعد ہندوستان ہی کے اردو ادب کا جائزہ لیا جائے، پاکستان کے ادب کا نہیں، جس کی وجہ سے وہ سرحد پار کی صورتِ حال کی طرف مختصر اشارے ہی کر سکے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اتنے طویل و بسیط اردو ادب کو متوسط ضخامت کی ایک جلد میں سمیٹنا زیدی صاحب ہی کا کام ہے۔ مفصل نگاری کے مقابلے میں مختصر نگاری کہیں زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

پیش لفظ کے بعد فہرست مشمولات ہے۔ اس میں ۳۲ ابواب ہیں جو زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض ابواب چند صفحوں ہی کے ہیں، مثلاً باب۸ سات صفحے، باب۹ نو صفحے، باب۱۱ چھے صفحے، باب ۱۳ چھے صفحے، باب۱۵ پانچ صفحے، باب۲۸ آٹھ صفحے، باب۳۱ آٹھ صفحے، باب۳۲ چھے صفحے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مواد کو قدرے بڑے قطعوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے ادبی تاریخ کے خاکے میں ابواب کو حتی الامکان زمانی ترتیب سے بیان کرنا چاہیے لیکن اس کی راہ میں دو رکاوٹیں ہیں: علاقے اور نظم و نثر پر نظر رکھنا۔ ان سب کے ساتھ عدل کرتے ہوئے زمانی ترتیب کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ زیدی صاحب نے ایسا ہی کیا ہے لیکن کہیں کہیں ان کی ترتیب کے بارے میں بعض مشاہدات کی گنجائش ہے۔

پانچویں باب کا عنوان ہے، "ایک زریں منزل (phase) اٹھارویں صدی۔" اس میں سب سے پہلا ذیلی عنوان "قلی قطب شاہ" دیکھ کر حیرت ہوئی۔ متن میں دیکھا تو یہ عنوان ہے ہی نہیں۔ قلی قطب شاہ کا نام ضمناً ایک جملے میں آ گیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں کر اسے فہرستِ ابواب میں نمایاں جگہ دے دی گئی ہے۔ چھٹے باب کے عنوان کا ترجمہ ہوگا، "پھیلاؤ اور تنوع"۔ اس میں پہلا ذیلی عنوان ہے، "اودھ میں نیا مرکز" اور دوسرا عنوان ہے، مرزا مظہر

Scanned by CamScanner

جانِ جاناں۔" چونکہ مرزا مظہر کبھی اودھ نہیں گئے اور ان کے زمانے تک اودھ اردو کا قابلِ ذکر مرکز نہ تھا، اس لیے ان دونوں ذیلی عنوانات کی ترتیب بدل دی جاتی تو بہتر ہوتا۔ نثر سے متعلق دو مسلسل ابواب ہیں لیکن رجب علی بیگ سرور باب ۱۳ میں ہیں اور فورٹ ولیم کالج باب ۱۴ میں جو زمانی ترتیب کے برعکس ہے۔ باب ۲۱ "ادبی تنقید کا دور" میں نیاز، عبدالحق، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر زور اور کلیم الدین احمد کا ذکر ہے اور حالی و آزاد کا اگلے باب ۲۲ "شاعری کی نئی لہر" میں۔ حالی و آزاد کے تعارف سے پہلے مسعود حسن رضوی کی "ہماری شاعری" اور کلیم الدین احمد کی حالی پر تنقید کا حق کیوں کر ادا ہو سکتا ہے۔ حالی و آزاد کو نثر نگار کی حیثیت سے باب ۱۸ میں اور شاعر کی حیثیت سے باب ۲۲ میں لیا ہے۔ اصل میں ان کی شاعری کا بیان نثر کے باب کے فوراً بعد آنا چاہیے تھا۔

باب ۲۶ کا عنوان ہے، "ترقی پسندی کا اُبال۔" اس باب میں آخری دو نام گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمان فاروقی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے لیکن ان کے، یہاں لکھے جانے کا بھید اس سے پہلے کے ذیلی عنوان "تنقید کے نئے رجحانات" کو دیکھ کر کھلتا ہے۔ اگلا باب نمبر ۲۷ ہے، "ترقی پسند شاعری اور اربابِ ذوق۔" چاہیے یہ تھا کہ دونوں ابواب ۲۶ اور ۲۷ میں پہلا ترقی پسندی کی نذر کر دیا جاتا، دوسرا حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت کو، تاکہ ان کے ذیلی عنوانات ایک ہی مکتبِ فکر سے متعلق رہتے۔ باب ۲۸ کا عنوان ہے، "نئی نسل کے شاعر۔" ذیلی عنوان میں صرف دو نام دیے ہیں، خلیل الرحمان اعظمی اور نازش پرتاب گڑھی۔ حالانکہ اس باب میں نازش سے زیادہ نمایاں کئی شعرا کا بیان ہے، مثلاً عمیق حنفی، بلراج کومل اور شاذ تمکنت وغیرہ۔

بہرحال خاکہ نگاری مصنف کی ذاتی پسند و ناپسند پر مبنی ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا شخص اسی خاکے کو کسی دوسری ترتیب و گروہ بندی سے تشکیل دے سکتا ہے۔ علی جواد زیدی کے خاکے سے مجھے کوئی بڑا بنیادی اختلاف نہیں۔ اب میں ایک ایک باب کو لے کر اس کا جائزہ لیتا ہوں۔ جن بیانات سے میں متفق ہوں، یا جنھیں سراہتا ہوں، اطناب سے بچنے کے لیے انھیں قلم زد کروں گا۔ جہاں مجھے حقائق سے اختلاف ہے ان کی نشاں دہی کی طرف زیادہ توجہ کروں گا۔

یہ دیکھ کر راحت ہوتی ہے کہ کتاب کے آغاز میں سیاسی اور سماجی پس منظر کا بیان نہیں۔ اس عنوان کے تحت اکثر ادبیات سے غیر متعلق تاریخ دہرا دی جاتی ہے خواہ اس کا ادبی تخلیق سے کوئی راست تعلق ہو کہ نہ ہو۔ زیدی نے یہ چھوڑ کر مختصراً لسانی پس منظر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے، "ابتدائی تاریخ۔" اس کے شروع کے چند صفحات

Scanned by CamScanner

میں ہندوستان کے قدیم لسانی نقشے کا بیان کیا ہے جس کی بعض جزئیات سے مجھے اختلاف ہے، مثلاً:

> موئن جودڑو اور ہڑپا کی تہذیب والوں کی زبانیں آریوں کے آنے کے بعد شمالی ہند اور مدھیہ دیش سے جنوب کی طرف چلی گئیں۔
>
> (ص ۱)

یہ صحیح نہیں، وادیِ سندھ کی زبان تو ابھی تک ایک معما بنی ہوئی ہے۔ یہ زبان پورے شمالی ہند اور مدھیہ دیش میں رائج نہ تھی۔ زیدی نے جو کچھ اس زبان کے لیے کہا ہے وہ دراصل دراوڑی زبانوں کے لیے کہنا چاہیے تھا۔ "رگ وید" کی تاریخ ۱۵۰۰ ق م اور ۸۰۰ ق م کے بیچ فرض کرنا بھی درست نہیں۔ ونٹر نٹز کے مطابق "رگ وید" کا آغاز ۲۵۰۰ ق م کے قریب ہوتا ہے(۱)۔ زیدی اردو کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کا آغاز پالی میں، پاکستان کے سہیل بخاری نے دراوڑی زبانوں میں اور مولانا سلیمان ندوی نے سندھی میں تلاش کیا ہے۔ لسانی اعتبار سے ان میں کوئی بھی نظریہ معتبر نہیں۔ (حاشیہ، ص ۳)

زیدی نے ان علما کے نظریات کو توجہ سے نہیں پڑھا۔ ان لوگوں نے ایسا نہیں کہا، اس سے ملتی جلتی کوئی بات کہی ہے۔ شوکت سبزواری نے اردو کو پالی کی اولاد نہیں، بلکہ ہم جدّی کہا۔ "اردو زبان کا ارتقا" میں کہتے ہیں:

> اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔

("اردو زبان کا ارتقا"، دہلی، ص ۱۰۵)

پھر اپنی دوسری کتاب "داستانِ زبانِ اردو" کے پیش لفظ میں اس سے انکار کیا کہ وہ پالی کو اردو کی اصل قرار دیتے ہیں:

> اردو نے جس زبان سے ارتقا پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت، پالی، شورسینی، پراکرت، مغربی اپ بھرنش بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف العہد ادبی روپ ہیں، کھڑی یا ہندوستانی (اردو) اس کی فطری ترقی یافتہ صورت ہے۔
>
> (ص ۵)

جہاں تک سہیل بخاری کا تعلق ہے، آں مرحوم اصطلاحوں کے بارے میں مجذوبیت

Scanned by CamScanner

کے مرتبے پر فائز تھے۔ لکھتے ہیں:

اس برِصغیر کی تمام زبانیں دراوڑی یعنی ہندوستانی ہیں۔(۲)

انھوں نے "دراوڑی" عام طور سے ہندوستانی زبانوں کو کہا ہے۔ وہ شمالی ہند کی زبانوں کو مہاراشٹری اور دراوڑ خاندان کی زبانوں کو پیجاپوری کہتے ہیں۔ ہم جنھیں دراوڑی زبانیں کہتے ہیں، اردو کو ان سے ماخوذ نہیں کیا۔ جہاں تک سلیمان ندوی کا تعلق ہے انھوں نے صرف یہ کہا:

مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں۔ اس لیے قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولا اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔

("نقوشِ سلیمانی"، طبعِ اوّل، ص۳۱)

یعنی انھوں نے اردو کو سندھی سے ماخوذ نہیں کیا، بلکہ اردو کو بیرونی مسلمانوں اور ہندوستانیوں کی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہی قرار دیا، جس کا مقام سندھ تھا۔ وہ صاف یہ نہیں کہتے کہ اردو سندھ میں شروع ہوئی، بلکہ یہ کہ اس کا "ہیولا" وہاں تیار "ہوا ہوگا۔"

عام مفروضہ ہے کہ وسطی ہند آریائی اپ بھرنشیں ۱۰۰۰ء کے قریب ختم ہوگئیں اور اس کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کا آغاز ہو گیا لیکن دوسری طرف ۱۳۰۰ء تک اپ بھرنش دھارا دکھائی دیتا ہے۔ زیدی نے اس مسئلے کے تعلق سے ڈاکٹر سدھیشور ورما کے اس فیصلے کی طرف توجہ دلائی کہ دسویں سے تیرھویں صدی تک اپ بھرنشیں اور جدید زبانیں دونوں ساتھ ساتھ موجود رہیں (ص ۴)۔

زیدی کا یہ مشاہدہ درست ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اپ بھرنشوں کے بعد جدید ہند آریائی زبانیں صحیح صحیح کس سنہ میں ظاہر ہوئیں۔ دراصل یہ ایک لمبا اور مسلسل عمل تھا۔ راہل سنکرتاین کے مطابق عبدالرحمان (ادی مان؟) کی "سندیش رسک" ۱۰۰۹ء سے پہلے مکمل ہو گئی تھی (ص۶)۔ یہ جدید زبان کی کتاب ہوگی۔ میں اس کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔

زیدی کہتے ہیں کہ دلی کے قریب بولی جانے والی زبان کو "بھاشا" یا "بھاکھا" بھی کہتے ہیں اور اسے برج بھاشا سے ملتبس نہیں کرنا چاہیے (ص۸)۔ میرا خیال ہے کہ تنہا بھاشا سے مراد برج بھاشا ہی ہے۔ قدیم اردو مورخین بھاشا کہہ کر ہندی زبان مراد لیتے تھے۔ اگلے صفحے پر اردو کے آغاز کے سلسلے میں وہ احتشام حسین کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اردو، پنجابی یا کھڑی بولی کی اولاد نہیں، بلکہ اس بڑے دھارے سے نکلی ہے جس سے یہ دونوں زبانیں نکلیں (ص۹)۔

Scanned by CamScanner

یہاں زیدی صاحب کو احتشام حسین کی رائے سمجھنے میں سخت غلط فہمی ہوئی۔ اصل میں احتشام صاحب نے جیولز بلاک، ڈاکٹر زور اور چٹرجی کا یہ نظریہ پیش کیا ہے، جس کے فوراً بعد احتشام صاحب نے اس سے اختلاف کیا اور اردو کو نواحِ دہلی کی ان بولیوں سے ماخوذ کیا جو پنجابی سے مختلف ہیں۔ یعنی بعد کی کتاب "اردو کی کہانی" میں صاف صاف کہتے ہیں کہ دلّی کے پاس والی کھڑی بولی میں عربی فارسی ترکی الفاظ کے شمول سے اردو بنی ("اردو کی کہانی"، ترقیِ اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۹)۔

اردو کے مختلف ناموں کے سلسلے میں وہ مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان کی یہ نشان دہی دلچسپ ہے کہ قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرے "طبقات الشعرا" میں صرف محاورہ اردو کو مستند مانا ہے۔ اصطلاح "ریختہ" کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ اصلاً موسیقی کے ان بولوں کو کہتے تھے جو جزواً ہندی میں اور جزواً فارسی میں ہوں، لیکن اس کے بعد کبیر کی غزل جیسی تخلیقات کو بھی ریختہ کہا گیا (ص ۱۱-۱۰) یہاں کبیر کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی۔ کبیر سے جن غزلوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہ نہایت مشکوک ہیں۔ زیدی صاحب کو جاننا چاہیے کہ اردو میں "ریختہ" دو معانی میں استعمال کیا گیا ہے:

۱۔ اردو زبان کا ابتدائی روپ جس میں اردو اور فارسی مخلوط ہوتی تھی۔ بعد میں محض اردو کو ریختہ کہا گیا۔

۲۔ محض ہندی نما نظم۔

تفصیل ملاحظہ ہو میرے مجموعے "کھوج" میں شامل مضمون "اردو کے دو لسانی ریختے" میں۔ زیدی میر اثر کی مثنوی "خواب وخیال" کی تاریخ ۴۱-۱۷۴۰ء درج کرتے ہیں لیکن اس مثنوی میں میر درد کے چار فارسی رسالوں کے نام آتے ہیں جن میں سے "دردِ دل" اور "شمعِ محفل" کا آغاز ۱۱۹۵ھ/ ۸۱-۱۷۸۰ء میں اور تکمیل ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء میں ہوئی (جالبی: تاریخ، جلد دوم، حصہ دوم، ص ۷۳۴)۔ مثنوی کی تصنیف کے وقت میر درد (متوفی ۱۱۹۹ھ) زندہ تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی کی تصنیف ۸۵-۱۷۸۰ء کے درمیان ہوئی۔

زیدی ایک معرکے کا انکشاف کرتے ہیں کہ عہدِ مغل میں ایران کے مقابلے میں ہندوستان میں تخلیق کیا جانے والا فارسی ادب زیادہ اہم تھا اور فارسی زبان و ادب کا اصل مرکز ہندوستان تھا (ص ۱۲)۔ اسی طرح ان کا یہ انکشاف بھی ولولہ انگیز ہے کہ بعض نئے چیکوسلواک شاعر بھی غزل لکھ رہے ہیں (ص ۱۴)، لیکن میں ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ غزل دوہے سے مماثل ہے (ایضاً)۔ دوہا ایک مخصوص وزن میں محض ایک شعر ہوتا ہے جب کہ غزل کئی اشعار کا مجموعہ، یعنی نظم کی ایک قسم ہے۔ وہ ذیل کی فراموش شدہ اصناف کا نام

Scanned by CamScanner

لیتے ہیں، "کرکھا"، "عشق پیچہ"، "اندر سبھا" (رس)، "دوہا سبد" (شبد)، "کبت" (ص ۱۷)۔
میں نے اپنی کتاب "ادبی اصناف" (گجرات اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء) میں کبت اور سبد کا ذکر ص ۸۶-۸۷ پر کیا ہے۔ "اندر سبھا" کوئی صنف نہیں، "سنگیت" ناٹک کی ابتدائی شکل ہے۔ "کرکھا" اور "عشق پیچہ" میرے لیے نئے نام ہیں۔ "کرکھا" کے بارے میں وہ دوسرے باب میں ص ۲۱ پر صراحت کرتے ہیں کہ یہ رجزیہ نظمیں ہوتی تھیں جن میں سے انھیں صرف دو دستیاب ہو سکیں۔ "عشق پیچہ" کوئی صنف ہو، مجھے اس میں شبہہ ہے۔

دوسرا باب "قدیم ترین تحریریں (گیارھویں سے سولھویں صدی)" ہے۔ اس کے پہلے صفحے ہی پر لکھتے ہیں کہ خواجہ مسعود سعد سلمان نے اردو ہندوی غزلوں کا دیوان ۱۰۶۶ء کے قریب مرتب کیا (ص ۱۹)۔ انھیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ یہ دیوان اردو غزلوں کا تھا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس میں پنجابی کی نظمیں ہوں۔ اس زمانے میں شمالی ہند کی کسی بھی زبان کو ہندی یا ہندوی کہہ دیا جاتا تھا۔ وہ سنہ کا ماخذ بھی درج کر دیتے تو اردو کے قارئین کو سہولت ہوتی۔ اس باب میں انھوں نے عام اردو تاریخوں میں مذکورہ قدیم شعرا کے نمونوں کو پیش کیا ہے، لیکن ان کی صحت انتساب کے بارے میں ضروری تحقیق نہیں کی، مثلاً بابا فرید شکر گنج سے منسوب نظم، جس کی زبان اس کے زمانے کے مقابلے میں زیادہ صاف ہے۔ انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ بہتوں کی رائے میں (ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ وغیرہ) گرنتھ صاحب میں شامل شیخ فرید کا کلام بابا شکر گنج کا نہیں، بلکہ بہت بعد کے حضرت دیوان ابراہیم ملقب بہ شیخ فرید ثانی کا ہے (جالبی: تاریخ، جلد اول، ص ۲۱۶-۲۱۷)۔ زیدی نے ص ۲۰ کے حاشیے پر بابا فرید کا ایک شعر نقل کیا ہے، لیکن یہ تو نام دیو کا ہے (مسعود حسین خاں: علی گڑھ تاریخ، ص ۲۰)۔ یہ شعر رام چندر شکل نے "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" میں درج کیا ہے۔ زیدی نے شاہ برکت اللہ پیمی بلگرامی کی "پریم پرکاش" کے مشمولات کی تفصیل عمدگی سے دی ہے (ص ۲۰)۔

امیر خسرو کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ پٹیالہ (کذا، صحیح پٹیالی) میں نہیں، دہلی میں پیدا ہوئے تھے (ص ۲۲)۔ ماخذ درج نہیں کیا، لیکن یہ ممتاز حسین کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے، جسے دوسرے ماہرین خسرو کے برخلاف مستند نہیں مانا جا سکتا۔ "خالق باری" کے خسرو سے انتساب کے ایک وکیل کا نام وہ صفدر علی لکھتے ہیں (ص ۲۴)۔ یہ سہو طباعت معلوم ہوتا ہے صفدر آہ کے لیے۔ انھوں نے خسرو کی ایسی پہیلیاں بے جھجک نقل کی ہیں جن کی زبان بیسویں صدی کی ہے۔ انھوں نے دوسروں کی تقلید میں خسرو کا ایک شعر درج کر کے لکھ دیا ہے کہ یہ فارسی اور ہندی دونوں میں پڑھا جا سکتا ہے، لیکن میں تو اسے نہ پوری طرح فارسی

Scanned by CamScanner

میں، نہ ہندی میں پڑھ پاتا ہوں۔ زیدی اسے "کہ مکرنی" کہتے ہیں، لیکن خسرو کی مکرنی بالکل مختلف انداز کی ہوتی ہے۔ بعد میں اسے "کہ مکرنی" بھی کہا گیا۔

خسرو سے منسوب ریختے پر بھی سوالیہ نشان ہے اور ص ۲۷ کی غزل تو اور بھی بعید از قیاس ہے۔ حسن سجزی دہلوی سے منسوب ریختے میں انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اس میں دکنی عناصر کثرت سے ہیں۔ مختلف ریختوں کے سلسلے میں ملاحظہ ہو میرا مضمون "اردو کے دو لسانی ریختے" جو "تحفۃ السرور" اور میرے مجموعے "کھوج" میں شامل ہے۔ زیدی نے ص ۲۹ پر موید بیگ کا لقب "کورکی" لکھا ہے جب کہ امیر حسن عابدی نے ڈاکٹر نذیر احمد کے حوالے سے محض "کور" لکھا ہے (۳)۔ ص ۳۳-۳۲ پر انھوں نے قطبن کی "مرگاوتی" کا ذکر کیا ہے اور اقتباس دیا ہے۔ یہ مسلم کہ یہ زبان قدیم اردو سے مماثل ہے لیکن "مرگاوتی" ہے ہندی کی نظم۔ یہی سوال منجھن کے سلسلے میں اٹھتا ہے۔ کیا زیدی صاحب اردو اور ہندی کو ایک زبان ماننے کو تیار ہیں۔

اس تاریخ کے فلیپ پر لکھا ہے کہ یہ بنیادی طور سے غیر اردو قارئین کے لیے ہے۔ اس طرح ہم اس میں تحقیقی بحثوں کی توقع نہیں کر سکتے لیکن چونکہ مصنف نے سنین درج کرنے پر خصوصی توجہ کی ہے اس سے ان پر ذمے داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ صحیح سنہ ہی لکھیں لیکن بارہا یہ تقاضا پورا نہیں ہوا۔ وہ ہر جگہ عیسوی سنہ ہی لکھتے ہیں۔ غیر اردو قارئین کے لیے اسی میں سہولت ہوگی۔ قدیم اردو ادب کی تاریخ میں ہجری سنین ہی ملتے ہیں۔ جب تک ان کے ماہ و یوم درج نہ ہوں ہم ایک ہجری سنہ کے متوازی محض ایک عیسوی سنہ نہیں لکھ سکتے، دو لکھنے چاہییں۔ محض ایک عیسوی سنہ لکھنے سے بعض اوقات ایک سال کا فرق ہو سکتا ہے۔ میں سنین کا جائزہ اس تبصرے کے آخر میں لوں گا۔

تیسرے باب کا عنوان ہے، "دکھنی اردو (چودھویں سے اٹھارویں صدی تک)۔" اس میں سرکاری زبان کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بہت محتاط اور درست ہے۔ وہ ڈاکٹر صادق کا یہ قول تسلیم نہیں کرتے کہ علاء الدین حسن بہمن شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کی حکومتوں کی دفتری زبان دکھنی تھی، وہ اسمتھ کے اس قول کو ترجیح دیتے ہیں کہ حساب کتاب میں مراٹھی کا استعمال ہوتا تھا۔ "تاریخِ فرشتہ" میں مذکور عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں میں اوپری سطح پر فارسی میں اور نچلی سطح پر دکھنی اور مراٹھی میں کام ہوتا تھا (ص ۳۸)۔ دکھنی نثر کی ابتدا کے بارے میں ان کی اس رائے کو تسلیم کر سکتے ہیں کہ سید عبداللہ کی "نشاط العشق" (صحیح: "ترجمۂ نشاط العشق") کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب یہ کتاب ناپید ہے۔ ان کا یہ خیال کہ خواجہ بندہ نواز سے آٹھ رسالوں، بہ شمول "شکار نامہ" و "معراج العاشقین"

Scanned by CamScanner

کے انتساب کو بھی رد نہیں کر سکتے، محض جذباتی ہے، تاریخی نہیں۔ غالباً انھوں نے حفیظ قتیل کی کتاب "معراج العاشقین کا مصنف" نہیں دیکھی۔ خود مولوی عبدالحق تک نے یہ لکھا ہے:

> ان سے منسوب "معراج العاشقین" میں نے ہی مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کے دیباچے میں میں نے اپنا شبہہ ظاہر کیا تھا۔ بعد کی تحقیق سے مجھے قریب قریب یقین ہو گیا کہ یہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے رسالے "شکارنامہ"، "معراج نامہ" وغیرہ جو اُن سے منسوب کیے جاتے ہیں، درحقیقت ان کی تصنیف نہیں۔

("اردو"، جنوری ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۷)

میں اس موضوع پر علی گڑھ تاریخ کے سلسلے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

حیرت ہے کہ وہ "نورس" کو موسیقی کی کتاب سمجھتے ہیں۔ میرے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس واضح کر چکے ہیں کہ یہ ابراہیم کے گیتوں کی کتاب ہے۔ ہر گیت سے پہلے اس راگ راگنی کی صراحت کر دی ہے جس میں یہ گایا جانا چاہیے، نیز راگ کو روایتاً جس دیوی دیوتا سے منسوب کیا جاتا ہے اس کی قلمی تصویر پیش کر دی ہے اور بس۔ مرکزی چیز گیت ہے، راگ سے متعلق صراحت محض پیش لفظ کی طرح ہے۔

لکھتے ہیں کہ "خاور نامے" میں ۴۸۰۰۰ لائنیں ہیں (ص ۴۰)۔ معلوم ہوتا ہے زیدی نے یہ تعداد کسی انگریزی تاریخ سے لی ہے جہاں مصرع کو سطر سمجھ لیا جاتا ہے۔ سب کی غلط فہمی کا آخری ماخذ شبلی کی "تاریخ ادب اردو" ہے۔ "خاور نامہ" دکنی میں روایتاً ۲۴ ہزار اشعار کہے جاتے ہیں لیکن جمیل جالبی کی صراحت کے مطابق دراصل ۲۲۰۶۱ شعر ہی ہیں (جلد اوّل، ص ۲۶۶)۔ ملک خوشنود کی مثنوی کا نام "ہشت بہشت" لکھا ہے (ص ۴۰)۔ عبدالقیوم اور جالبی کی تاریخوں میں صراحت ہے کہ اس کا صحیح نام "جنت سنگار" ہے۔ حیرت پر حیرت ہے کہ زیدی ۱۹۹۱ء میں نصرتی کو برہمن لکھتے ہیں (ص ۴۲)۔ یہ غلط فہمی گارساں دتاسی کو ہوئی تھی۔ زیدی کا دوسرا سہو یہ ہے کہ ان کے مطابق بیجاپور کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے نصرتی کو ملک الشعرا بنا دیا (ص ۴۳-۴۲)۔ "گلشنِ عشق" کے ایک مخطوطے میں دیے ہوئے قطعۂ تاریخ کے مطابق نصرتی کا انتقال ۱۰۸۵ھ (۷۵-۱۶۷۴ء) میں ہوا۔ اورنگ زیب نے بیجاپور کو ۱۶۸۶ء میں فتح کیا۔

ص ۷۴ پر شاہ علی جیو کا لقب "کام دھنی" لکھا ہے۔ صحیح "گام دھنی" ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین باجن نے اپنی زبان کو ہندی اور دہلوی دونوں کہا ہے۔

Scanned by CamScanner

روشن گنبد برسے نور
حاجت مند کی حاجت پور

(ص ۴۷)

ظاہر ہے کہ ثبوت کا شعر غیر متعلق ہے۔ یہ ان کی "بِکری" کا شعر ہے جسے جمیل جالبی نے اپنی تاریخ کی جلد اوّل میں ص ۱۰۹ پر دیا ہے۔ اس بکری میں زبان کے تعلق سے کچھ نہیں کہا گیا۔ اگلے ص ۴۸ پر شاہ اشرف بیابانی کی "واحد باری" کا ذکر ہے۔ اس غلط فہمی کا ماخذ جالبی کی تاریخ ہے (ص ۳۳)۔ میں اس سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ "واحد باری" دراصل دورِ آصفی کے ایک شاعر کی تصنیف ہے جو بریلی یوپی کا رہنے والا تھا۔ دیکھیے سالار جنگ لائبریری کے مخطوطات کی فہرست، ص ۳۵۵۔

اسماعیل امروہوی کی دو مثنویوں "وفات نامۂ بی بی فاطمہ" (۱۱۰۵ھ) اور "معجزۂ انار" (۱۱۳۰ھ) کے لیے لکھتے ہیں کہ افضل کی "بکٹ کہانی" کے بعد یہ شمالی ہند کی قدیم ترین مثنویاں ہیں (ص ۴۹)، لیکن یہ صحیح نہیں۔ عبداللہ انصاری عرف مُلا عبدی کی فقہِ ہندی ۱۰۷۴ھ کی ہے۔ شیخ محبوب عالم کی مثنویاں "محشر نامہ"، "مسائلِ ہندی" اور "دردنامہ" بھی اسی کے آس پاس کی ہیں۔ شیخ فیض اللہ کی "قصۂ جمجمہ" ۹ شوال ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء کی ہے۔

ص ۵۳ پر دیوانِ ولی کی تدوین کے بارے میں ایک معاصر شہادت "نادم" کی درج کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ "نادم" خرابی ہے "حاتم" کی۔ ص ۵۶ پر شاہ میراں جی سے منسوب ایک نثری رسالے کا نام "گل برگ" لکھا ہے، یہ "گل باس" ہونا چاہیے۔ شاہ برہان الدین جانم سے جو نثری کتابیں منسوب کی ہیں اُن میں پہلا نام "سکھ سہیلا" ہے۔ یہ نثر کی نہیں، نظم کی کتاب ہے۔ اس کے آگے دو کتابوں کے نام "ہشت بہشت" اور "ذکرِ جلی" دیے ہیں (ص ۵۶) جانم نے ان ناموں کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ نصیر الدین ہاشمی (۴) اور ڈاکٹر نذیر احمد (۵) نے جانم کے ایک نثری رسالے "ہشت مسائل" کا ذکر کیا ہے، اسی کو زیدی صاحب نے "ہشت بہشت" بنا دیا۔ اسی طرح "ارشاد نامہ" نثر کا پہلا جزو "ذکرِ جلی" ہے، اسے الگ کتاب نہیں کہہ سکتے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ کی تصانیف میں ایک کتاب کا نام "رسالۂ وجودیہ" لکھا ہے (ص ۵۶)۔ شاہ امین کے محقق ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس رسالے کو محض منسوبات میں شامل کیا ہے۔ ان کے مطابق انجمنِ ترقیِ اردو ہند کے فہرست نگار نے محض انداز سے اس کا نام "رسالۂ وجودیہ یا وحدت الوجود" لکھا ہے ("سیّد شاہ امین الدین علی اعلیٰ" ص ۵۱-۴۵۰) زیدی نے میراں یعقوب کی ایک کتاب کا نام "شمس الاتقیا" لکھا ہے (ص ۵۶)۔ صحیح "شمائل الاتقیا"

Scanned by CamScanner

ہے۔ زیدی نے شاہ جانم کے خلفا کی فہرست دی ہے جو اس مختصر کتاب میں چنداں ضروری نہ تھی۔ اس میں کئی نام غلط شامل ہو گئے ہیں، مثلاً میراں جی خدا نما اور میراں حسینی۔ یہ جانم کے نہیں، ان کے فرزند شاہ امین کے خلیفہ تھے (حسینی شاہد، ص ۱۲۷) ایک خلیفہ کا نام "محمد قادر نورضیا" درج کیا ہے۔ حسینی شاہد نے تحقیق کر کے زیادہ سے زیادہ خلفا کے نام معلوم کیے، لیکن ان میں "محمد قادر نورضیا" شامل نہیں (حسینی شاہد، ص ۹-۱۰۸)۔ زیدی کا شاہ معظم کو بھی جانم کا خلیفہ کہنا درست نہیں۔ وہ قادر لنگا کے مرید تھے (حسینی شاہد: "شاہ معظم"، حیدر آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۸)۔

دکنی داستانوں کے سلسلے میں زیدی لکھتے ہیں کہ اٹھارویں صدی میں "انوار سُہیلی" کا ترجمہ ہوا (ص ۵۶)۔ میں ایسے کسی ترجمے سے واقف نہیں۔ انیسویں صدی میں ضرور ہوا۔ اسی صفحے پر وہ میسور کی نثری کتاب "بہادر نامہ" (۱۷۹۸ء) کا ذکر کرتے ہیں جس کا موضوع ٹیپو سلطان اور انگریزوں کی لڑائی کا ذکر ہے۔ اسی طرح کی ایک اور کتاب میں سلطان حیدر علی اور انگریزوں کے محاربات کا بیان ہے (ص ۵۶)۔ مجھے ڈاکٹر حبیب النسا بیگم کی کتاب "ریاست میسور میں اردو" (بنگلور، ۱۹۶۲ء) یا "دکن میں اردو" میں ان تاریخوں کا ذکر نہ مل سکا۔ کاش زیدی صاحب نے ماخذ کا حوالہ دے دیا ہوتا۔ بہرحال اس دور کی یہ نثری تاریخیں بیش بہا ہیں۔

چوتھا باب "شمالی پس منظر (سولھویں تا سترھویں صدی)" ہے۔ اس باب کے شروع میں عہد وُسطا میں شمال کے لسانی نقشے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تلسی داس، جائسی، کبیر، سُورداس اور میراں بائی نے اودھی، برج بھاشا، پوربی یا راجستھانی کو وسیلۂ اظہار بنایا جو کبھی کبھی اس کھڑی بولی سے مماثل ہو جاتی تھی جس نے عرصے تک دہلی اور اس کے قریب و جوار پر راج کیا۔ یہ ہندوی اور دہلوی بھی کہلاتی ہے۔ علاقائی اور بولیوں کے اختلافات کے باوجود اس نے ملک کی مشترک زبان کا کام دیا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اسے پورے شمالی ہند کی مشترک بولی اور اردو کہتے ہیں (ص ۵۸)۔

یہ بات اگر کھڑی بولی کے لیے کہی گئی ہو تو کوئی اعتراض نہیں، لیکن ڈاکٹر چٹرجی نے اردو کو پورے ملک کی مشترک بولی نہیں کہا۔ مجھے زیدی صاحب کے الفاظ پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اودھی، برج اور راجستھانی کھڑی بولی کی علاقائی بولیاں ہیں اور یہ سب مل کر شمالی ہند کی مشترک زبان ہو گئی ہیں۔ میرے نزدیک ان سب بولیوں یا زبانوں کو مخلوط کرنے والی کوئی زبان نہیں تھی، گو ہندی والے ان سب کو ہندی کا جزو مانتے ہیں۔ بہرحال یہ سب بولیاں مل کر اردو نہیں کہلا سکتیں۔ زیدی نے ص ۵۸، ۶۰

Scanned by CamScanner

اور ۶۴ پر اودھی کے علاوہ ایک زبان کا نام پوربی بھی لکھا ہے۔ مشرقی ہندی کی تین بولیاں ہیں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی۔ عام طور سے اودھی ہی کو پوربی کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے زیدی پوربی کہہ کر بھوج پوری مراد لے رہے ہوں جو مشرقی ہندی کی نہیں، بہاری کی بولی ہے۔ انھوں نے ص ۶۳ پر برج کے بہت سے شعرا، مثلاً خان خاناں، سورداس، گھنانند، کیشوداس، ہری داس، نام دیو وغیرہ کو ہند ایرانی روایت کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ ان میں خان خاناں کو اس روایت سے وابستہ کر سکتے ہیں لیکن سُورداس اور کیشوداس وغیرہ کے یہاں ایرانی ثقافت کے عناصر کہاں ہیں۔

آگے لکھتے ہیں کہ دارالسلطنت کے دوبارہ دلّی کو منتقل ہونے سے دکھنی، برج، اودھی، پوربی، راجستھانی اور ہریانوی اثرات دلّی میں اکٹھا ہو گئے (ص ۶۴)۔ یہ بات برج، راجستھانی اور ہریانوی کے لیے تو درست ہو سکتی ہے لیکن دارالسلطنت کے دلّی آنے سے ایسے دکنی، اودھی اور پوربی اثرات کیوں کر نمودار ہوں گے جو آگرے کے دارالسلطنت رہتے ہوئے سرایت نہ کر سکے تھے۔

ص ۶۵ پر برہمن سے منسوب مشہور غزل کے تین شعر درج کیے ہیں۔ واضح ہو کہ رشید حسن خاں کی راے میں یہ برہمن کی نہیں ("اردو تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ص ۲۶۷) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی بھی اسے اتنی قدیم ماننے میں متامل ہیں۔ (علی گڑھ تاریخ، ص ۴۹۴) ص ۶۶ پر اشرف کی "واحد باری" کا پھر ذکر ہے۔ میں ص ۴۸ کے اندراج کے سلسلے میں واضح کر چکا ہوں کہ یہ عہدِ آصفیہ کے ایک دوسرے اشرف متوطن بریلی کی تخلیق ہے۔ ص ۶۷ پر "بکٹ کہانی" کے لیے مصنف کا نام محمد افضل م ۱۶۲۵ء لکھتے ہیں۔ میں اس موضوع پر علی گڑھ تاریخ پر تبصرے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ اکرم قطبی رہتکی کی قدیم ترین شہادت کے مطابق افضل کا نام گوپال اور وطن نارنول تھا۔ "ریاض الشعرا" میں مندرج محمد افضل متوفّٰی ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ء) دوسرا شخص ہے جو "بکٹ کہانی" کا مصنف نہیں۔

پانچویں باب کا عنوان ہے: "ایک زرّیں منزل (اٹھارویں صدی)۔" اس باب کی ابتدا میں مختصراً اس عہد کا تاریخی پس منظر دیا ہے جو ضروری تھا، اس کے بعد اساتذہ کا ذکر ہے۔ ان میں عبدالوہاب یکرُو بھی شامل ہے جو نسبتاً غیر معروف ہے۔ آبرو کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ ایک فوجی ملازمت سے ریٹائر ہو کر استادی کے مرتبے پر فائز ہوئے (ص ۷۱)۔ فوجی ملازمت کی بات مجھے کسی تذکرے میں نہ ملی۔ گردیزی نے صرف یہ کہا ہے کہ "نارنول میں جائزات نمایاں موصول کیے۔" اگر اس سے مراد سرکاری ملازمت بھی ہو تو بھی فوجی ملازمت کی کوئی سند نہیں ملتی۔ زیدی یہ مفید اطلاع دیتے ہیں کہ حال میں سید فضل علی افضل جاگیردارِ

Scanned by CamScanner

بہادر گڑھ (۱۷۳۰ء-۱۷۶۴ء) کی کلیات سامنے آنے سے ایک اور قدیم شاعر منظرِ عام پر آیا ہے (ص ۴۷)۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

زیدی نے اس دور میں شعرا کے ہندایرانی روایت کی طرف جھکاو اور بعض الفاظ کے متروک کرنے کی طرف عمدگی سے اشارہ کیا ہے۔ تنقیدی اعتبار سے یہ پورا باب اطمینان بخش ہے۔ اس کا دوسرا جزو مثنوی اور مرثیے کے بارے میں ہے۔ اس میں عزلت کا بیان معلومات افروز ہے، کیونکہ یہ عام طور سے تواریخ ادب میں نہیں ملتا؛ ہاں، جالبی نے اپنی تاریخ کی جلد دوم حصہ اوّل میں زیدی سے بھی زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ مثنوی "لعل و گوہر" کے مصنّف کا نام زیدی نے عارف علی خاں عاجز لکھا ہے۔ اس مشہور شاعر کا صحیح نام عارف الدین خاں عاجز ہے۔ دیکھیے، "چمنستانِ شعرا۔"

چھٹے باب کے انگریزی عنوان کا ترجمہ "پھیلاو اور تنوع" کیا جائے گا۔ اس باب میں پہلے اودھ میں اردو کے نئے مرکز کا ذکر ہے، پھر اساتذہ مظہر جانِ جاناں، سودا، درد، میر وغیرہ کا۔ مناسب ہوتا کہ مظہر جانِ جاناں کا ذکر اس سے پہلے باب میں آبرو و حاتم وغیرہ کے ساتھ کر دیا جاتا۔ زیدی نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ ناشر نے انھیں اغلاطِ طباعت کی تصحیح کا موقع نہیں دیا جس سے بہت سی اغلاط راہ پا گئیں۔ اب ص ۸۷ پر یہ الفاظ اور اوقاف دیکھیے۔

Works of literature like, Khwaja, Mir Dard

دونوں کاما ہٹا دینے چاہییں کیونکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ اور میر درد دو اشخاص ہیں۔ "لٹریچر" کی جگہ litterateues ہونا چاہیے۔ ص ۱۰۸ پر میر کی ایک مثنوی کا نام "گنج نامہ" چھپا ہے، صحیح "جنگ نامہ" ہے ص ۱۰۹ پر سالار جنگ کے بیٹے کا نام نوازیہ علی خاں چھپا ہے، صحیح نوازش علی خاں ہے۔ ان چند مثالوں کو میں نے نمونتاً پیش کیا۔ آگے ان سے صَرفِ نظر کروں گا۔

زیدی لکھتے ہیں کہ شاہ عالم ثانی سودا سے مشورہ سخن کرتا تھا (ص ۸۸)۔ "آبِ حیات" کی اس غلط بیانی کا پردہ محمود شیرانی نے چاک کیا۔ انھوں نے بتایا کہ شاہ عالم ۱۱۸۵ھ میں دہلی پہنچتا ہے جب کہ سودا ۱۱۷۰ھ میں دہلی چھوڑ چکے تھے، یعنی سودا کی شاہ عالم سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی ("مقالاتِ شیرانی"، جلد سوم، ۱۹۶۹ء، ص ۹۶)۔ اس سے قطعِ نظر زیدی نے سودا، درد، میر، میر حسن اور سوز کی شاعری پر خوب لکھا ہے لیکن مثنویوں کو یہاں حذف کر دیا ہے اور بعد میں اسی باب میں علاحدہ عنوان کے تحت لیا ہے۔ اس دوئی کی ضرورت نہ تھی۔ اب قاری میر یا میر حسن کے عنوان کے تحت مثنویوں کا ذکر نہ پائے تو حیران ہوگا۔

اس کے آگے "مثنوی" عنوان دے کر مختلف شعرا کی مثنویوں کا ذکر کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ص۱۱۶ پر میر کی ایک مثنوی کا نام "حکایت عشق" یا "حکایاتِ عشق" (Hikayat-e-ishq) لکھتے ہیں۔ میرے علم میں میر کی کسی مثنوی کا یہ نام نہیں۔ اگلے صفحے پر لکھا ہے:

حسرت کی "طوطی نامہ" کو بعضوں نے میر مہدی حیات عظیم
آبادی سے منسوب کیا ہے۔ (ص۱۱۷)

آخرالذکر کا نام میر مہدی حیات نہیں، میر محمد حیات ہے، خطاب بہجت قلی خاں، تخلص حسرت۔ زیدی کو ان کا تخلص بھی لکھنا چاہیے تھا تاکہ بنائے التباس معلوم ہو جاتی۔ زیدی نے دو ٹوک رائے ظاہر نہیں کی کہ "طوطی نامہ" حسرت عظیم آبادی کی نہیں۔ غلط فہمی کا ذمے دار کریم الدین کا تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس کی تردید کی کہ یہ مثنوی حسرت عظیم آبادی کی ہے (۶)۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اس مثنوی کو کلیات جعفر علی حسرت کے ایک نسخے سے لے کر شائع کر دیا۔

مثنوی کے بیان کے آخر میں زیدی نے دو دکنی مثنوی نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک شہیدی حیدر آبادی ہیں جن کی مثنوی "روضۃ الاطہر" ہے (ص۱۱۹)۔ کوئی بہت غیر معروف مثنوی ہوگی کیونکہ مجھے دکنیات کی کسی کتاب میں اس کا نام نہ مل سکا۔ اسی کے ساتھ زیدی نے باقر آگاہ کی مثنوی "ہشت بہشت" کا بھی نام لیا ہے۔ "ہشت بہشت" دراصل ایک مثنوی نہیں، آٹھ منظوم رسالوں کا مجموعہ ہے (جالبی: تاریخ، جلد ۲، حصہ ۲، ص ۱۰۱۲)۔

مثنوی کے بعد کے موضوع کا عنوان ہے: "نثر۔" نثر کا بیان کسی الگ باب میں ہوتا تو بہتر تھا، شعرا کا ضمیمہ بنا کر نہ لکھنا چاہیے تھا۔ یوں تین صفحوں کے اس مختصر بیان میں زیدی نے بہت مواد پیش کر دیا ہے بالخصوص مذہبی کتب نثر کے بارے میں۔ لیکن یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ کیا یہ کتابیں ادبی اعتبار سے اتنی اہم ہیں کہ غیر اردو قارئین کے لیے اس مختصر حجم کی تاریخ میں ان کے نام غیر نامی لیے جائیں۔ وہ جعفر زٹلی کے "وقائعِ دربارِ معلّیٰ" کا بھی ذکر کرتے ہیں (ص۱۱۹) کراچی کے عبدالقیوم نے انکشاف کیا ہے کہ وقائع میں کچھ چیزیں الحاقی ہیں کیونکہ ان میں جعفر سے بعد کے بادشاہوں عالم گیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کے عہد کے واقعات کا ذکر ہے۔

مذہبی کتابوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ معین الدین حسین علی نے فارسی کتاب "جامِ جہاں نُما" کا ترجمہ کیا۔ ان کی تحریر سے یہ بھی شبہہ ہو سکتا ہے کہ اردو ترجمے کا نام بھی "جامِ جہاں نُما" ہے۔ دراصل اردو کتاب کا نام "فتوح العین" ہے اور وہی لکھنا چاہیے تھا (جالبی: جلد ۲، حصہ ۲، ص۱۰۳۱)۔ آگے چل کر بڑے اطمینان سے شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کا

Scanned by CamScanner

سنہ ۱۷۸۶ء لکھ دیتے ہیں حالانکہ اس کا سنہ کسی کو معلوم نہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کا سنہ ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ اس کے بعد کا ہے۔ ("قدیم اردو"، کراچی، ص ۱۳۲)۔ جمیل جالبی کی رائے اس پر مقدم ہے اور اندازاً ۱۷۸۵ء یا اور بھی پہلے کا ہونا چاہیے (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۱۰۵۳)۔ زیدی نے پھلواری شریف کے شاہ عماد کی ایک کتاب "سیدھا راستہ" (۱۷۷۰ء) کا ذکر کیا ہے (ص ۱۲۱)۔ افسوس کہ انھیں یہ علم نہیں کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے جسے تمنا عمادی مجیبی پھلواروی نے بانیِ خانقاہ کے عقائد کے سلسلے میں وضع کیا تھا۔ پھر یہ کہ انھوں نے اس کی تاریخ ۱۷۷۰ء نہیں، ربیع الاول ۱۰۸۱ھ دکھائی تھی جو جولائی ۱۶۷۰ء کے مطابق ہے (۸)۔

جیسا کہ پیچھے لکھا گیا اس سلسلے میں کئی کم معروف مذہبی نثری کتابوں کا معلومات افروز ذکر کرتے ہیں۔ ان میں ایک مہر نگ اورنگ آبادی کی "تفسیرِ چراغِ ابری" ہے (ص ۱۲۱)۔ اس کا صحیح نام "چراغِ ابدی" ہے جو تاریخی بھی ہے ("فہرست اردو مخطوطات"، آصفیہ لائبریری، جلد دوم، ص ۳۱)۔ حاشیے میں رؤف احمد رافت کی تفسیر کا نام "تفسیرِ رونی" لکھا ہے لیکن صحیح اور پورا نام "تفسیرِ مجددی المعروف بہ رؤفی" ہے (۹)۔

ص ۱۱۹ پر عنوان "نثر" ہے اور ص ۱۲۴ پر "داستان"۔ یہاں نثری داستانوں کا ذکر ہے جو نثر کے تحت آتی ہیں۔ ص ۱۲۵ پر "تنقید اور مرقع نثر" کا عنوان ہے۔ صحیح یہ ہوتا کہ ص ۱۱۹ کا بڑا عنوان "نثر" ہوتا، اس کے تحت جزوِ اول کو "علمی اور مذہبی نثر"، جزو دوم کو "داستان" اور سوم کو "تنقید اور مرقع نثر" کہا جاتا۔ اس میں مہرچند کھتری کی داستان کا نام "نو آئینِ ہندی یا قصۂ محمود و گیتی افروز" لکھا ہے (ص ۱۲۳)۔ اس کے دوسرے جزو کا نام صحیح نام "قصۂ ملک محمد و گیتی افروز" ہے۔ میرے لیے لکھتے ہیں کہ میں نے شاہ عالم کی داستان "عجائب القصص" میں "خاطر مبارک ہماری" جیسے فقروں کو دیکھ کر اس کے شاہ عالم کی تصنیف ہونے پر شک کا اظہار کیا ہے (ص ۱۲۵)۔ انھوں نے میرے بیان کو توجہ سے نہیں پڑھا۔ میں نے شاہ عالم سے انتساب پر شبہ ظاہر نہیں کیا تھا، بلکہ تعظیمی فقروں ہی کے لیے لکھا ہے کہ یہ منشیوں کے اضافے ہیں ("اردو کی نثری داستانیں"، لکھنؤ ۱۹۸۷ء، ص ۲۲۱)۔

لکھتے ہیں محمد حسین کلیم کا "ترجمۂ فصوص الحکم" ناپید ہو گیا ہے (ص ۱۲۵)۔ اس کا ذکر "نثر" کے تحت آیا ہے۔ اکثر حضرات اسے نثری ترجمہ سمجھتے ہیں۔ قائم، میر حسن اور مصحفی ("تذکرۂ ہندی") نے واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ ترجمہ منظوم تھا۔ قائم نے لکھا ہے کہ

Scanned by CamScanner

کلیم فصوص کا ریختہ نظم میں ترجمہ کرتا تھا، لیکن بعض بیماریوں کی وجہ سے باز رہا۔ زیدی اس باب کے آخری جزو "تنقید اور مرصع نثر" میں ایک کتاب کا نام "آئینِ ہندی" لکھتے ہیں (ص ۱۲۵)۔ پورا نام "نو آئینِ ہندی" ہے۔

مجموعی طور پر اس پورے باب کو تشفی بخش کہہ سکتے ہیں۔

ساتویں باب کا عنوان ہے "تین عظما کے بعد۔" یہ تین بڑے ہیں: سودا، میر درد اور میر۔ پہلے اپنے دل پسند موضوع کو لیتے ہیں کہ اردو شاعری کے دو علاحدہ دبستان نہیں تھے (ص ۱۲۹)۔ یہ مسلم کہ دو آب بند خانے نہیں تھے، دونوں جگہ کے شعرا کے رنگ میں آپسی اختلافات تھے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ کے بہت سے شعرا میں (دہلی کے مہاجر شعرا کے بشمول) بعض ایسی مشترک خصوصیات تھیں جو دلی کے ادبی ماحول میں نہیں ملتیں، مثلاً نسوانیت کی طرف رجحان۔ اختلاف نقطۂ نظر سے قطعِ نظر زیدی نے اس باب کے تمہیدی آٹھ صفحوں میں تنقیدی ژرف بینی کا ثبوت دیا ہے۔ تمہید کے بعد دہلی سے لکھنؤ ہجرت کرنے والے مشاہیر انشا، مصحفی، رنگین اور جرأت کا بیان ہے۔ اس میں انشا کے احوال میں لکھتے ہیں کہ انشا نے دہلی پہنچنے پر بادشاہ کو اندھا پایا (ص ۱۳۵)۔ یہ طوطا مینا آزاد کا بنایا ہوا ہے۔ عابد پیشاوری نے اس کی اصلیت معلوم کی۔ شاہ عالم ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو اندھے کیے گئے۔ انشا اس سے پہلے دلی سے لکھنؤ جا چکے تھے اور ۱۷۸۸ء میں لکھنؤ کے الماس علی خاں کے متوسل تھے ("انشاء اللہ خان انشا"، ص ۱۲۷)۔ دوسرے تذکرہ نگاروں کی تقلید میں زیدی لکھتے ہیں کہ انشا، منجملہ دوسری زبانوں کے، پشتو اور کشمیری بھی جانتے تھے (ص ۱۳۵)۔ عابد پیشاوری، جو انشا کے زبردست وکیل ہیں، کہتے ہیں کہ انشا بعض زبانوں میں دو ایک فقرے سے زیادہ نہیں جانتے تھے، کشمیری اور پشتو تقریباً نہیں جانتے تھے ("انشاء اللہ خان انشا" ص ۹۹ تا ۱۰۷)۔

رنگین کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ ایک ماہر جنگ شہزادہ تھا (ص ۱۳۹)۔ معلوم نہیں زیدی صاحب رنگین کو شہزادہ کیوں کو سمجھ بیٹھے۔ رنگین کے سوانح نگار ڈاکٹر حسن آرزو کے مطابق رنگین کے والد طہماس خاں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو ایک "گم نام، نادار، مسکین طفل" پایا۔ انھوں نے ہندوستان آ کر سرہند میں نوکری کی اور بعد میں منصب ہفت ہزاری تک پہنچے۔ اس طرح رنگین شہزادہ نہیں، امیرزادہ تھا (حسن آرزو: "سعادت یار خاں رنگین"، ۱۹۸۴ء، ص ۵۴)۔ انشا کے مقابلے میں رنگین اور جرأت کی تنقید سرسری ہے۔

ان شعرا کے سنین کے بارے میں دو لفظ۔ جرأت کا سنہ وفات ۱۸۱۹ء لکھتے ہیں (ص ۱۳۰)، لیکن مصحفی کا مصرعِ تاریخ ہے:

Scanned by CamScanner

از قلندر بخش شصت و دو فگن

۱۲۸۶-۶۲، یعنی ۱۲۲۴ھ

اور ناسخ کا مشہور مصرع ہے:

ہائے ہندستان کا شاعر موا

۱۲۲۵ھ

ان دونوں ہجری سالوں کا احاطہ کرنے والے عیسوی سنہ ۱۰-۱۸۰۹ء ہیں۔ مصحفی کی ولادت و وفات کی تاریخیں درج ہی نہیں۔ رنگین کا سنہ ولادت ۱۷۵۵ء دیا ہے (ص ۱۳۹)۔ رنگین نے خود ۱۷۱اھ لکھا ہے۔ صحیح تاریخ ۱۷ ذی قعدہ ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء ہے (حسن آرزو: ص ۶۱-۶۰)

آٹھواں باب "نظیر اکبر آبادی" ہے۔ رام بابو سکسینہ نے نظیر اور شاہ نصیر کو ایک پورا باب دے کر نظیر کی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔ زیدی نے محض نظیر کو پورا باب دیا ہے۔ یہ امتیاز پانے والا واحد دوسرا شاعر اقبال ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی شاعر، میر ہو کہ غالب کہ انیس، پورے باب پر قابض نہ ہوسکا۔ ص ۱۴۲ پر نظیر کا سنہ ولادت قطعیت سے ۱۷۴۰ء لکھا ہے۔ گو یہ قطعیت سے تو معلوم نہیں، لیکن آسی، پروفیسر شہباز، فرحت اللہ بیگ، مخمور اکبر آبادی اور ڈاکٹر محمد حسن سب نے ۱۷۳۵ء پر اتفاق کیا ہے (ڈاکٹر محمد علی اثر: "نظیر شناسی"، ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۶)۔ نخلی احمد فاطمی نے بھی اپنی کتاب میں بحث کر کے یہی سنہ طے کیا ہے ("نظیر اکبر آبادی"، ۱۹۸۳ء، ص ۴۶)۔ اس سے قطعِ نظر نظیر پر تنقید مفصل اور قابلِ قدر ہے۔

نواں باب "عہدِ ناسخ و آتش" ہے۔ اس باب میں ناسخ، آتش، دیاشنکر نسیم اور شاہ نصیر پر لکھا ہے۔ ان میں نصیر پر مختصراً، بقیہ تینوں پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے جو اطمینان بخش ہے۔ دسواں باب "نیا مرثیہ" ہے۔ اس میں بطورِ خاص میر انیس کا ذکر نو صفحوں پر ہے جس کے بعد دبیر کو محض پون صفحہ دیا ہے۔ یہ عدمِ توازن ہے۔ آخر کی چند سطروں میں دوسرے مرثیہ نگاروں کے نام لکھ دیے ہیں۔ انیس کے مرثیوں کے طویل اقتباسات کا انگریزی منظوم ترجمہ دیا ہے جس کی وجہ سے یہ بیان انگریزی قارئین کے لیے دلاویز ہو جاتا ہے۔

گیارھواں باب "مثنوی کا دور" ہے۔ اسی مصنف نے ایک کتاب "مثنوی نگاری" لکھی ہے جس کی وجہ سے انھیں صنفِ مثنوی سے خاص شغف ہے۔ ابھی تک شمالی ہند کی

Scanned by CamScanner

مثنویوں کا ضمناً ذکر کیا تھا، اس باب میں انھیں یک جا لیتے ہیں۔ باب کے پہلے ہی صفحے پر شاہ افضل الہ آبادی کے "بارہ ماسے" کا ذکر کرتے ہیں (ص ۱۷۰)۔ شاہ افضل ناسخ کے شاگرد تھے۔ مجھے ان کے "بارہ ماسے" کا علم نہ تھا۔ واجد علی شاہ اختر کی دو مثنویوں "دریاے تعشق" اور "حُزنِ اختر" کو خود نوشت سوانحی مثنویاں قرار دیتے ہیں (ص ۱۷۰)۔ یہ بات "حزنِ اختر" کی حد تک صحیح ہے، لیکن "دریاے تعشق" ایک داستانی مثنوی ہے جسے واجد علی شاہ کی زندگی سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ اختر کی دوسری سوانحی مثنوی کا نام "عشق نامہ" ہے۔ زیدی نے جب "دریاے تعشق" کا ذکر کیا ہے تو دوسری مشہور داستانی مثنویوں "افسانۂ عشق" اور "بحرالفت" کا نام کیوں نہیں لیا۔

ص ۱۷۱ کے حاشیے میں میر کی مثنویوں کے نام درج کرتے ہیں۔ جب انھیں لکھا ہی ہے تو انھیں فٹ نوٹ میں کیوں جگہ دی، متن میں کیوں نہیں، فہرست میں ایک مثنوی کا نام "جذبِ عشق" لکھا ہے۔ میر کی کوئی مثنوی اس نام کی نہیں۔ اس کے بجاے "جوشِ عشق" چاہیے تھا۔ ایک اور مثنوی کا نام "مثنویِ عشقیۂ افغاں پسر" لکھا ہے۔ اس کا نام محض "مثنوی عشقیہ" ہے جسے کبھی کبھی "مثنویِ عشقِ افغاں پسر" بھی کہ دیتے ہیں۔ ص ۱۷۱ پر راسخ عظیم آبادی کی ایک مثنوی کا نام "جذبۂ الفت" لکھا ہے۔ اس کا صحیح نام "جذبِ عشق" ہے۔ اسی صفحے پر سامی کی مثنوی کا نام "سروِ آزاد" لکھا ہے۔ یہ نام غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرے کا ہے۔ سامی کی مثنوی کا نام "سرو و شمشاد" ہے جیسا کہ لچھمی زاین شفیق نے اپنے تذکرے "چمنستان شعرا" میں لکھا ہے (ص ۴۱۲)۔

احمد گجراتی کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کی تاریخ ص ۱۷۱ پر ۸۸-۱۵۸۰ء لکھی ہے جب کہ ص ۴۲ پر ۳۹-۱۹۳۹ء-۱۶۳۴ تھی۔ ۱۹۳۹ء سہوِ طباعت ہے ۱۶۳۹ء کے لیے۔ صورت یہ ہے کہ احمد نے پہلے مثنوی "یوسف زلیخا" لکھی بعد میں "لیلیٰ مجنوں"۔ "یوسف زلیخا" کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرتب کر کے ۱۹۸۳ء میں حیدر آباد سے شائع کیا۔ انھوں نے اس کا زمانہ ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء اور ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء کے درمیان طے کیا ہے (مقدمۂ مثنوی "یوسف زلیخا"، حیدر آباد، ۱۹۸۳ء، ص ۶۱)۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کی حدود ۸۸-۱۵۸۰ء رکھی تھیں (جلد اوّل، ص ۴۲۳)۔ "لیلیٰ مجنوں" اس کے بعد کی مثنوی ہے۔ زیدی نے "یوسف زلیخا" کے سنہ کو "لیلیٰ مجنوں" کا سنہ سمجھ لیا۔ مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کے محض ۴۹ منتشر اوراق ملے ہیں اس لیے اس کا سنہ تصنیف درج کرنا بہت مخدوش ہے۔

زیدی اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ احمد کے بعد مرزا بوس اور تجلی نے بھی لیلیٰ مجنوں کی مثنویاں لکھیں۔ لیکن دوسروں نے بھی تو لکھی ہیں، مثلاً احمد کے بیٹے محمد بن احمد عاجز نے

Scanned by CamScanner

۱۰۳۶ھ۔ اسے ڈاکٹر غلام عمر خاں ۱۹۶۷ء میں شائع کر چکے ہیں۔ اردو میں "لیلیٰ مجنوں" کے مختلف تراجم کی فہرست میری کتاب "اردو کی نثری داستانیں" لکھنؤ ایڈیشن، ص ۵۰-۱۴۹ پر ملاحظہ ہو۔

اس باب میں بکثرت مثنویوں کے نام لکھے ہیں جن میں اہم، غیر اہم سبھی شامل ہیں۔ چونکہ چند منتخب نام ہی لکھے جا سکتے تھے اس لیے مناسب یہ ہوتا کہ ان ناموں کو حذف کر دیا جاتا جو ادبی اعتبار سے کم مایہ ہیں۔ نام شماری سے قطعِ نظر مثنویوں کے بارے میں نہ کوئی قابلِ ذکر تنقید ہے، نہ ان کا ارتقا دکھایا ہے، نہ نمونے ہیں۔ حیرت ہے کہ مثنوی کے باب میں امانت کے منظوم ڈرامے "اندر سبھا" کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس میں مثنوی کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن بھی شامل ہیں۔ اس کا مناسب مقام ڈراموں کے ذیل میں ہوتا۔

بارھواں باب "شفق اور مرزا غالب" ہے۔ اس باب میں صرف غالب کا تذکرہ نہیں، بلکہ ان کے عہد کا ہے، یعنی ذوق، مومن، ظفر اور غالب کا۔ آخر میں ایک صفحے میں چند مثنویوں کے نام بھی گنا دیے ہیں۔ اس دور کے مرکزی دھارے کے لیے غالب کے علاوہ شاہ نصیر، ذوق، احسان ظہیر اور مومن کے ذکر کو ناگزیر قرار دیتے ہیں (ص ۱۷۹)، ذوق اور مومن کے ساتھ احسان جیسے غیر اہم شاعر کا نام لینا عجیب ہے۔ ظہیر اس نسل سے بعد کا شاعر ہے، یعنی خاص طور سے غدر کے بعد کا۔ اس کی اہمیت اس کی نثری کتابوں "قصہ ممتاز" اور "داستانِ غدر" کی وجہ سے ہے، شاعری کی وجہ سے نہیں۔ واضح ہو کہ "داستانِ غدر" ۱۹۱۰ء میں مکمل ہوئی۔ ذوق کے استاد شاہ نصیر اور ان کے شاگرد ظہیر کو ایک ہی زمرے میں نہیں رکھنا چاہیے۔

مومن کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے "مثنویِ جہادیہ" لکھ کر مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی ترغیب دی جس سے مخالفِ انگریز جذبات ابھرے (ص ۱۸۴)۔ یہ سب لکھ کر مثال میں اشعار دیتے ہیں:

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو

اور غزلوں کے دوسرے اشعار۔ اس کے معنی ہیں کہ ان اشعار سے پہلے کوئی نثری مشاہدہ چھوٹ گیا ہے۔ ظفر پر بہت مختصر لکھا ہے۔ نمونے کے طور پر ان کی مینہ غزل کے دو اشعار کا انگریزی منظوم ترجمہ دیا ہے، لیکن زیدی کو یہ مشہور بات معلوم نہیں کہ یہ غزل:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

ظفر کی نہیں، مضطر خیر آبادی کی ہے۔ اس تاریخ میں یہ سہو کئی بار دیکھنے میں آیا ہے

Scanned by CamScanner

کہ نثری تعارف میں ایک بات کہتے ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر جو اشعار دیتے ہیں وہ بالکل غیر متعلق ہوتے ہیں۔ باجن کی جکری (ص ۷۴) اور مومن کی "مثنوی جہادیہ" (ص ۱۸۲) کا ذکر کیا گیا۔ تیسری مثال غالب کے سلسلے میں ہے۔ لکھتے ہیں کہ وہ زوال پذیر قدیم نظام اور ابھرتے ہوئے نئے نظام سے وفاداریوں کے بیچ کشا کش میں مبتلا ہیں، وہ بنیادی طور پر مشرقی ہیں، لیکن آنے والے بڑے تغیر کو دیکھ سکتے ہیں اور اس تجزیے کے ثبوت میں شعر دیتے ہیں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(ص ۸٦-۱۸۵)

شعر بلند ہے لیکن ان کے تبصرے اور دعوے سے غیر متعلق ہے۔ ص ۱۸٦ پر لکھتے ہیں کہ غالب نے فارسی زبان و ادب کا درس ایرانی اتالیق عبدالصمد سے لیا لیکن انھوں نے اس طرف اشارہ نہیں کیا کہ خود غالب کے الفاظ میں عبدالصمد کا وجود خارجی نہیں، بلکہ خود انھیں کی ایجاد ہے۔ اگلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ غالب کو مغلیہ دَور کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا گیا اور انھوں نے اس کی پہلی جلد "مہرِ نیم روز" کے نام سے لکھی (ص ۱۸۷)۔ اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غالب مؤرخ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کارپردازانِ دفترِ شاہی پورا مواد اردو میں لکھ کر بھیج دیتے تھے جسے غالب اپنی مخصوص فارسی میں انشا کر دیتے تھے۔ ("یادگارِ غالب"، دہلی، ۱۹۸٦ء، ص ۵۹)۔ زیدی نے غالب پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور اردو اور انگریزی میں ان کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں۔

باب کے آخر میں ایک صفحہ "مثنوی" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ زیدی "مثنوی" پر فریفتہ ہیں، پھر پھر کر اس پر آ جاتے ہیں۔ اس ایک صفحے میں ایک بھی مثنوی ایسی نہیں جو ادبی اعتبار سے قابلِ ذکر ہو۔ اس یک جلدی تاریخ میں ان کا ذکر محذوف رہتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ پچھلے باب "مثنوی کا دور" میں واجد علی شاہ تک کی مثنویوں کا ذکر تھا۔ زیرِ نظر باب کی چند مثنویوں کو بھی اُسی باب میں جگہ دی جا سکتی تھی۔ اس ضمن میں قدرت اللہ قاسم کی مثنوی "زبدۃ الاخیار یا کراماتِ پیران پیر" کا ذکر کرتے ہیں (ص ۱۹۷)۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو مثنویاں ہیں۔ تذکرے "مجموعہ نغز" میں محمود شیرانی نے اپنے مقدمے میں، نیز خود قاسم نے اپنے احوال میں ان کا ذکر کیا ہے (جلد دوم، ص ۹۳) دونوں نے پہلی مثنوی کو محض "معراج نامہ" کے نام سے لکھا ہے۔ میں نے اسے رضا لائبریری، رام پور میں دیکھا ہے۔ اس کا صحیح نام "زبدۃ اخبار" ("اخیار" نہیں،) ہے اور موضوع احوالِ معراج ہے۔ اس کی تاریخ ہے:

Scanned by CamScanner

گنت از روے ممند، "گلِ معراج شگفت"

۱۲۰۴ھ = ۱۱۶۴ + ۴۰

"کراماتِ پیران پیر" ۱۲۱۷ھ میں لکھی گئی۔

تیرھویں باب کا عنوان ہے: "نثر کا ظہور۔" اس کی ابتدا میں بائبل کے ترجموں کے بارے میں قیمتی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ مرزا فطرت نے ہنٹر کے ساتھ مل کر ۱۸۰۵ء میں بائبل کا ترجمہ کیا۔ آگے لکھتے ہیں کہ فطرت نے خود نئے عہد نامے کا پورا ترجمہ کیا، آخر میں حیدر بخش حیدری نے بائبل کا ترجمہ کیا تاکہ بامحاورہ زبان کے مطابق ہو سکے (ص۱۹۹)۔ عتیق صدیقی نے اس موضوع پر اپنی کتاب "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں دو جگہ لکھا ہے، ص۵۵-۵۴ پر مختصراً اور ص۸۴-۱۸۳ پر تفصیل سے (طبعِ اول)۔ معلوم ہوتا ہے کہ کول بروک نے مرزا محمد فطرت لکھنوی سے فارسی اور اردو دونوں میں بائبل کے ترجمے کرائے۔ اس کے بعد کول بروک کی سفارش پر گل کرسٹ نے مرزا فطرت کو اردو ترجمہ کرنے کے لیے ملازم رکھا (عتیق: ص۱۸۴)۔ عبیدہ بیگم نے اطلاع دی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے منشیوں نے نئے "عہد نامے" کا ترجمہ کیا، اس پر ولیم ہنٹر نے نظرِ ثانی کر کے ۱۸۰۵ء میں شائع کیا ("فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، ص۶۳۵)۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ خاص طور سے مرزا فطرت کا کیا ہوا ہوگا۔ حیدری کے ترجمۂ بائبل کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ میرا خیال ہے کہ ۱۸۰۵ء کے ترجمے ہی میں مرزا فطرت کے ساتھ حیدری بھی شریک رہے ہوں گے۔

ص۲۰۱-۲۰۰ پر کئی معروف یا غیر معروف مذہبی کتابوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں صرف ایک بات عرض کرنی ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی دور میں خواہ کسی موضوع کی نظم و نثر کی کتابیں ہوں، ہم انھیں تاریخِ ادب میں شامل کرتے ہیں، ان کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ اس دور میں جو کچھ مل جائے بسا غنیمت ہے۔ بعد کے زمانے میں بدرجہا بہتر زبان و اسلوب میں لکھی ہوئی، غیر ادبی موضوعات کی کتابوں کو ادبی تاریخ میں جگہ نہیں دی جاتی۔ دکنی دور میں صوفیہ کے جو نظم و نثر کے رسالے ہیں، تاریخِ ادب میں ان کو فخر سے شامل کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں مذہب، تاریخ اور دوسرے سماجی علوم کی کتابیں پختہ اسلوب میں لکھی جاتی ہیں، لیکن تاریخِ ادب میں ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ زیدی نے جو انیسویں صدی کے غیر ادبی مصنفین کی مذہبی کتابوں کے نام گنائے ہیں وہ اس یک جلدی تاریخ میں ضروری نہ تھے۔

مذہبی کتابوں میں مظہر علی ولا کی "دہ مجلس" کا ذکر کرتے ہیں جس میں عاشور کے دس

دنوں کے مطابق دس مجلسوں کا بیان ہے (ص ۲۰۰)۔ زیدی صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔ "دہ مجلس" کا ترجمہ محمد بخش نے کیا تھا، ولا نے اس پر نظرِ ثانی کی، دیباچہ لکھا اور مادۂ تاریخ کا شعر کہا جس سے ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء برآمد ہوتا ہے۔ اس میں دس نہیں، ۱۲ مجلسیں ہیں (ڈاکٹر عبیدہ بیگم: ص ۴۴۲۔ ۴۴۰)۔ مولوی سید علی محدث لکھنوی کی سات جلدوں کی "مجالسِ حیدری" (۱۸۷۵ء) کا مجھے زیدی کی تاریخ سے علم ہوا۔ یہ اس نوع کی سب سے ضخیم کتاب ہونی چاہیے۔

حیرت ہے کہ زیدی رجب علی بیگ سرور کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ آگرے کے رہنے والے تھے (ص ۲۰۱)۔ ثبوت؟ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی نے "بیگماتِ اودھ کے خطوط" کے دیباچے میں اور محمود اکبر آبادی نے اپنے مرتبہ "فسانۂ عجائب" (۱۹۲۸ء) کے دیباچے میں سرور کا وطن آگرہ قرار دیا ہے۔ دونوں حضرات نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ مفتی صاحب نہایت غیر معتبر راوی ہیں۔ حنیف نقوی نے "انتخابِ کلامِ سرور" کے دیباچے میں خیال ظاہر کیا ہے کہ سرور کا وطنِ اصلی کان پور تھا (لکھنؤ، ۱۹۸۸ء، ص ۸)، لیکن جب خود سرور "فسانۂ عجائب" کے دیباچے میں لکھنؤ کو اپنا وطن کہتے ہیں تو اس کو کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔ بہرحال زیدی نے اپنے دعوے کی کوئی دلیل نہیں دی۔

ص ۲۰۴۔ ۲۰۳ پر زیدی نے انیسویں صدی کی دوسری نثری کتابوں کے نام درج کیے ہیں۔ ان میں زیادہ تر غیر مذہبی کتابیں ہیں اور قارئینِ ادب کے لیے زیادہ تر غیر معروف بھی نہیں۔ اس سے دو صفحے پہلے کی مذہبی کتابوں کو اور انھیں یک جا درج کیا جا سکتا تھا۔ اس سے بھی کہیں بہتر ہوتا کہ انھیں موضوع کی گروہ بندی کے ساتھ دیا جاتا، مثلاً قصے، مذہبی کتب، تاریخی کتب، دوسری علمی کتب وغیرہ۔

"سیر المتاخرین" کے دو ترجموں میں ایک کا نام "اقبال نامہ" لکھا ہے، مترجم بخش علی بخش۔ دراصل یہ ترجمہ "سیر المتاخرین" کے صرف ایک حصے کا ہے۔ یہ فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۰۹ء میں تیار ہوا تھا۔ اسی صفحے ۲۰۳ پر اشک کے بیان میں متعدد غلطیاں در آئی ہیں۔ ان کا نام محمد خلیل خاں لکھا ہے۔ پورا نام محمد خلیل علی خاں ہے جو انھوں نے اپنی کتاب "انتخابِ سلطانیہ" میں لکھا ہے۔ زیدی نے اس کتاب کا نام "تاریخِ انتخابِ سلطانی" درج کیا ہے جو صحیح نہیں۔ اشک کی داستان کے لیے لکھتے ہیں:

تین جلدوں میں امیر حمزہ کے داستانی کارنامے ۴۹۔۱۸۴۸ء۔

(ص ۲۰۳)

Scanned by CamScanner

یہ سنہ حیرت کی بات ہے۔ اشک کی داستانِ امیر حمزہ ۱۸۰۱ء میں شائع ہوئی، خود زیدی نے ص ۲۰۶ پر اس کا سنہ ۱۸۰۱ء لکھا ہے۔ یہ تین جلدوں میں نہیں۔ اس کے چار حصے ہیں جو ایک ہی جلد میں ہیں۔ زیدی نے ان کی ایک اور کتاب کا نام "واقعات اکبری" لکھا ہے۔ کلکتے کے مخطوطے پر ضرور یہی نام درج ہے لیکن اشک نے اس کی تمہید میں لکھا ہے:

> نام اس کا "کتابِ واقعاتِ اکبر" رکھا کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی ہے۔ (عبیدہ بیگم: ص ۵۱۹)

زیدی نے اشک کی تیسری کتاب کا نام "رسالہ کائنات" لکھا ہے۔ اس کا صحیح نام "رسالہ کائنات جو" ہے۔ نام عجیب ہے، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں جب مصنف نے یہی پسند کیا۔ وہ اس عجیب لاحقے کے یہ معنی لکھتے ہیں:

> "جو" نام ہے بیچ کا زمین و آسمان کے، یعنی یہ جو زمین سے آسمان تک وسعت ہے، اس کو "جو" کہتے ہیں اور کائنات جو اشارہ چیز ہے مثل ابر، باراں ...الخ۔ (عبیدہ بیگم: ص ۵۰۸)

زیدی بار بار نصیرالدین حیدر کے "شاہی ٹرانسلیشن بیورو" کا ذکر کرتے ہیں (ص ۵-۲۰۴، نیز ص ۲۱۲)۔ میرا خیال ہے کہ ایسا باقاعدہ ادارہ نہیں تھا، بلکہ نصیرالدین حیدر نے کچھ علمی و ادبی کتابوں کے ترجمے کرائے تھے۔ زیدی لکھتے ہیں کہ اس بیورو کے لکھنے والوں میں کمال الدین حیدر اور خلیل خاں اشک ممتاز تھے (ص ۲۰۴)۔ اشک کا نام لینا سخت غلط فہمی ہے۔ نادم سیتاپوری کے مطابق اشک کی وفات ۱۸۲۱ء میں ہوئی (۱۰)۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ کلکتے کے بعد اشک کے لکھنؤ آ کر رہنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اس بیان میں زیدی نے بعض نادر کتابوں کا ذکر کیا ہے جو معلومات افروز ہے، مثلاً اعظم علی خاں اعظم کا نثری "ترجمۂ سکندر نامہ" (ص ۲۰۴)۔ اسی کے آگے وہ بخش علی بخش کے "ترجمۂ الف لیلیٰ" (۱۸۴۵ء) کا نام لیتے ہیں۔ میرے لیے یہ انکشاف کا درجہ رکھتا ہے۔ میں نے "الف لیلیٰ" پر کافی تحقیق کی ہے، لیکن میں اس ترجمے سے ناواقف ہوں۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے "اقبال نامہ" کو ان کا واحد کارنامہ کہا ہے (۱۱)۔ مجھے ان کے ۱۸۴۵ء کے "ترجمۂ الف لیلیٰ" کے بارے میں ہزار شبہات ہیں۔ زیدی نے خواجہ امان کے "ترجمۂ بوستانِ خیال" کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ چھ جلدیں ہی مکمل کر سکے جن میں آخری "ضیاء الانظار" تھی (ص ۲۰۵)۔ دراصل امان نے سات جلدیں لکھی تھیں اور ساتویں کو ان کے فرزند خواجہ راقم نے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا۔ اس کا نام "ضیاء الانوار" تھا، "ضیاء الانظار" نہیں۔ چھٹی جلد کا نام "مصباح النہار" تھا۔ حاشیے میں زیدی نے سوال کیا ہے کہ امان نے

Scanned by CamScanner

چھ جلدوں کا ترجمہ کیا یا محض دو کا؟ یہ شبہ بے بنیاد ہے کیونکہ اِن کی ساتوں جلدیں رضالائبریری رام پور میں موجود ہیں اور میری نظر سے گزری ہیں۔

نول کشور پریس کے "داستانِ امیر حمزہ" کے داستان نگاروں میں تصدق حسین، احمد حسین قمر، محمد حسین جاہ اور احمد حسین جاہ کا نام لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جاہ برادروں کا کام سب سے زیادہ تخیل آمیز ہے (ص ۲۰۶)۔ یہ غلط فہمی پریشان کُن ہے۔ محمد حسین جاہ کے کسی بھائی احمد حسین جاہ کا نام سننے میں نہیں آیا۔ محمد حسین جاہ کا تخلص جاہ تھا، کوئی عائلی لقب نہیں۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ بھائی کا تخلص بھی جاہ ہو۔ بہرحال میری نظر سے "داستانِ امیر حمزہ" کے سلسلے کی جملہ ۴۶ جلدیں گزر چکی ہیں۔ ان میں کسی کا مؤلف احمد حسین جاہ نہیں۔

باب ۱۴ کا عنوان ہے: "نئی نثر اور نئے کالج۔" پچھلے باب میں انیسویں صدی کے آخر تک کی کتابوں، مثلاً "داستانِ امیر حمزہ" اور "بوستانِ خیال" کے لکھنوی ترجموں "رتن ناتھ سرشار اور محمد علی طبیب کے ناولوں وغیرہ کا ذکر کر کے رجعت قہقہری کرتے ہیں اور انیسویں صدی کی ابتدا کے فورٹ ولیم کالج کو لیتے ہیں۔ یہ تاریخیت کے خلاف ہے۔ اتنے اہم ادارے کو محض آدھا صفحہ دیا ہے۔ جس میں وہاں کے اہم مصنفوں کے نام بھی نہیں۔ اس میں لکھتے ہیں کہ ولا اور جوان نے سنسکرت یا برج بھاشا سے براہِ راست ترجمہ کیا (ص ۲۱۰)۔ فورٹ ولیم میں سنسکرت سے اردو میں کسی ایک کتاب کا بھی ترجمہ نہیں ہوا، برج یا اودھی سے ہوا ہے۔ ولا کی کتاب کا نام "مادھو کام کندلا" لکھا ہے۔ صحیح "مادھونل کام کندلا" ہے۔ یہ برج سے نہیں، عالم کی اودھی نظم سے ترجمہ کی گئی۔ جوان کی دو کتابوں کے نام "شکنتلا" اور "بارہ مانا" (کذا) لکھے ہیں۔ آخرالذکر تخریب ہے "بارہ ماسا" کی۔ یہ طبع زاد ہے، ہندی یا سنسکرت سے ترجمہ نہیں۔

"فسانۂ عجائب" کے لیے لکھتے ہیں کہ آج اس کتاب کی اہمیت اس کے مرصّع اسلوب سے زیادہ اس کے سماجی ثقافتی موضوع کی وجہ سے ہے (فٹ نوٹ، ص ۲۱۰)۔ مجھے اس فیصلے سے اختلاف ہے۔ اردو ادب میں "فسانۂ عجائب" کی اہمیت کی وجہ زیادہ تر اس لیے ہے کہ اس نے اردو نثر کو ایک اسلوب دیا، اس کے دیباچے کے سماجی بیانات کی اہمیت ثانوی ہے۔ اس مختصر باب میں دلّی کالج کا بیان سب سے زیادہ ہے، یعنی تقریباً دو صفحوں پر۔ اس کے آگے "لکھنؤ ٹرانسلیشن بیورو" اور دوسری انجمنوں کے بارے میں لکھا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، لکھنؤ میں کوئی باقاعدہ ترجمے کا بیورو نہیں تھا، متفرق طور پر کچھ کتابوں کے ترجمے کرائے گئے۔ میں نے ڈاکٹر نیر مسعود سے دریافت کیا۔ وہ بھی اس بیورو کے قیام

Scanned by CamScanner

کے منکر ہیں۔ ص۲۱۱ کے فٹ نوٹ میں چار کتابوں کے ترجموں کی تفصیل دی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بد قسمت ترجموں کو حاشیہ نشیں کیوں کیا گیا۔ پُرمغز معلومات متن ہی میں دی جانی چاہییں، حواشی میں نہیں۔

ص ۲۱۳ پر حیدر آباد کے نواب شمس الامرا کے ترجمہ بیورو کے قیام کا سال ۱۸۳۴ء لکھا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> آپ نے ہی سب سے پہلے مغربی زبانوں سے سائنس کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ ۱۲۴۲ھ میں اس کا آغاز ہوا ہے۔
>
> ("دکن میں اردو"، ص۵۲۱)

۱۲۴۲ھ مطابق ہے ۲۷-۱۸۲۶ء کے۔ زیدی نے دوسری سوسائٹی کا نام دلی کالج کی ایجوکیشن سوسائٹی (۱۸۴۲ء) لکھا ہے (ص ۲۱۳)۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے اپنی کتاب "انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے" میں لکھا ہے کہ دلی کالج کے پرنسپل مسٹر بوترو نے گارساں دتاسی کو ۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء کو ایک خط لکھا جس میں مطلع کیا کہ تقریباً چھ مہینے سے وہ ۲۰ مترجموں سے عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کی کتابوں کے ترجمے کرا رہے ہیں۔ بعد میں ۱۸۴۳ء میں ایک باقاعدہ انجمن قائم کی جس کا نام "انجمن اشاعت علوم بذریعۂ السنۂ ملکی" تھا۔ عرفِ عام میں اسے "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی" یا "ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" کہتے تھے (ص۲۰۶-۲۰۵)۔ اس طرح اس کا کام ۱۸۴۱ء میں شروع ہوا، سوسائٹی باضابطہ طور پر ۱۸۴۳ء میں وجود میں آئی۔ زیدی نے سرسید کی "سائنٹیفک سوسائٹی" کی تاریخ ۱۸۶۳ء لکھی ہے۔ اس کی صحیح تاریخ ۹ جنوری ۱۸۶۴ء ہے (۱۲)۔

میرا خیال ہے یہ مختصر باب بآسانی اس سے پہلے باب میں سمویا جا سکتا تھا۔

پندرھویں باب کا عنوان "صحافت" ہے۔ باب مختصر ہے، لیکن مفید ہے۔ اس میں ہندوستانی پریس، کلکتہ کے قیام کا سنہ ۲-۱۸۰۱ء لکھی ہے (ص۲۱۵)۔ ۱۸۰۲ء کافی اور صحیح تھا۔ دیکھیے عبیدہ بیگم کی کتاب ص۹۶۔ زیدی لکھتے ہیں کہ "کلکتہ گزٹ" میں ۸۷-۱۷۸۶ء میں ایک کالم فارسی اردو کا شروع کیا گیا (ص۲۱۵)۔ عتیق صدیقی نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اس اخبار میں کوئی باقاعدہ فارسی کالم ہوتا تھا، اردو کا تو سوال ہی نہیں۔ عتیق نے اس اخبار کی ۱۷۸۶ء، ۱۷۸۷ء اور ۱۷۸۸ء کی فائلیں دیکھیں، کسی میں فارسی کالم نہ تھا؛ ہاں، بعض اوقات فارسی کی غزلیں اور ایک بار کچھ حکایات ضرور چھاپی گئی تھیں (۱۳)۔ زیدی نے "دہلی اردو اخبار" کی تاریخ ۱۸۳۵ء لکھی ہے (ص۲۱۶)۔ عتیق صدیقی نے جنوری ۱۸۳۷ء لکھی ہے گو بعض محققین نے ۱۸۳۶ء قرار دی ہے ("ہندوستانی اخبار نویسی"،

Scanned by CamScanner

ص۶۷-۲۶۶)۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بھی ۱۸۳۶ء تسلیم کی ہے (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد۸، ص۳۲۸)۔

لکھتے ہیں، اردو میں شعرا کا پہلا گلدستہ مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۸ء میں شائع کیا۔ ساحل احمد اپنی کتاب "اردو میں گلدستوں کی روایت" میں تسلیم کرتے ہیں کہ کریم الدین کا "گلِ رعنا" اردو کا پہلا گلدستہ تھا جو ۱۸۴۵ء میں جاری ہوا (الہ آباد، ۱۹۸۸ء، ص۱۹)۔

ایک بار پھر کہوں گا کہ اس مختصر سے باب میں بہت کافی مفید مواد سمایا ہوا ہے۔ سولھواں باب اور بغاوت (غدر) کے بعد کا منظر ہے۔ اس میں داغ، منیر، امیر اور جلال وغیرہ کا بیان ہے۔ شاعروں کا احوال مختصر ہے اور کتاب کی محدود صفحات کو دیکھتے ہوئے یہ ناگزیر تھا۔ سترھواں باب "آزادی کا ادب" ہے جس میں راجا رام زاین موزوں سے لے کر علی جواد زیدی تک کا ذکر ہے۔ اٹھارواں باب "ایک عہد کا سویرا" ہے جس میں سرسید، آزاد، حالی، شبلی وغیرہ پر لکھا ہے۔ جگہ کی تحدید کی وجہ سے سرسید پر دو سوا دو صفحے ہی لکھے ہیں، لیکن اس کوزے میں دریا کو باحسن الوجوہ سمودیا ہے۔ وہ جو ص۲۳۵ پر لکھتے ہیں کہ سید کی "تفسیرِ قرآن" کی چھ جلدیں ہیں اس میں ذرا سی ترمیم کر کے کہنا چاہیے کہ سات جلدیں ہیں (۱۴)۔

اس کے بعد عنوان ہے: "مقصدی تنقید۔" اس میں تذکروں سے لے کر حالی کے مقدمے اور شبلی کے موازنے تک کا تیزی سے ذکر کر دیا ہے۔ اس کے بعد تشریف لاتے ہیں حضرت محمد حسین آزاد۔ اس میں آزاد کے دعوئ کے مطابق لکھا ہے کہ وہ شاعری میں ذوق کے شاگرد تھے (ص۲۴۸)۔ آزاد نے یہ دعوئ ذوق کے انتقال کے بعد ہی کیا۔ "آبِ حیات" پر تبصرے کے ضمن میں، مَیں اس کی تردید کر چکا ہوں (۱۵)۔

لکھتے ہیں کہ آزاد ۱۸۶۵ء میں کابل اور ایران گئے اور اس کے بعد ۱۸۸۳ء میں ایک خفیہ مشن پر بھیجے گئے (ص۲۳۸)۔ دراصل ۱۸۶۵ء کا پہلا سفر خفیہ مشن پر تھا۔ ملاحظہ ہو آزاد کے محقق ڈاکٹر صادق کا مضمون (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان، جلد۹، ص۳۱۲)۔ زیدی آگے لکھتے ہیں کہ آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی اور عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے (ص۲۳۸)۔ ڈاکٹر صادق کے مطابق وہ پروفیسر نہیں، اسسٹنٹ پروفیسر تھے اور وہ بھی صرف عربی کے، فارسی کے نہیں (تاریخِ مسلمانان، جلد۹، ص۳۱۵)۔ سوانح کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۹۰ء کے بعد آزاد ذہنی توازن کھو بیٹھے (ص۲۳۹)۔ ان کے جنون کی ابتدا ۱۸۸۹ء ہی میں ہو گئی تھی (۱۶)۔

ص۲۳۹ پر لکھتے ہیں کہ آزاد نے "اتالیقِ پنجاب" کی ادارت کی۔ دراصل ماسٹر پیارے لال آشوب "اتالیقِ پنجاب" کے ایڈیٹر تھے اور آزاد اسسٹنٹ ایڈیٹر (حامد حسن

Scanned by CamScanner

قادری: "داستانِ تاریخ اردو"، ص۳۸۵)۔ زیدی نے آزاد کی تصانیف میں "قصصِ ہند" کو بھی شامل کیا ہے(ص۲۳۹)۔ قصص کے تین حصے ہیں۔ پہلا اور تیسرا حصہ پیارے لال آشوب نے لکھا (ادبیاتِ مسلمانان، جلد۸، ص۹۴)۔ آزاد نے صرف دوسرا حصہ لکھا (صادق: تاریخِ ادبیات مسلمانان، جلد۹، ص۳۱۵)۔

زیدی نے "آبِ حیات" کا بہت دفاع کرنا چاہا ہے۔ لکھتے ہیں کہ صرف دو معاملوں میں آزاد کا فیصلہ جانب دارانہ ہے (ص۲۳۹)، لیکن انھیں علم نہیں کہ آزاد نے اس کتاب میں باربا شعوری طور پر غلط بیانی سے کام لیا ہے، واقعات اختراع کیے ہیں، شعرا کی غلط تصویریں پیش کی ہیں اور جنبہ داری سے کھل کر کام لیا ہے۔ دیوانِ ذوق کے لیے زیدی لکھتے ہیں کہ آزاد نے اسے معدوم ہونے سے بچا لیا۔ ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ آزاد نے ذوق کے کلام میں اصلاح کی، لیکن ابھی یہ بات ثابت ہوتی ہے(ص۲۴۰)۔

زیدی کو معلوم نہیں کہ آزاد کے دیوانِ ذوق کے ایڈیشن سے بہت پہلے دیوانِ ذوق کا حافظ ویران کا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسروں کے متعدد ایڈیشن نکلے۔ آزاد کا وضعی ایڈیشن ۱۸۹۰ء میں آیا۔ زیدی آزاد پر صرف اصلاح کا الزام مانتے ہیں، حالانکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ انھوں نے کثرت سے غزلیں اور قصیدے کہہ کر کلامِ ذوق میں شامل کر دیے۔ میری سفارش ہے کہ آزاد جیسے کمزور کیس کی مدافعت سے پہلے زیدی صاحب یہ مآخذ دیکھ لیں:

۱۔ محمود شیرانی: مضمون "شمس العلما محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق" رسالہ "ہندوستانی"، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۴۴ء تا اپریل ۱۹۴۷ء ۔ باز طباعت "مقالاتِ شیرانی"، جلد سوم۔

۲۔ ڈاکٹر صادق: "مولانا محمد حسین آزاد، احوال و آثار" لاہور، نومبر ۱۹۷۶ء۔

۳۔ ڈاکٹر اسلم فرخی: "محمد حسین آزاد، حیات اور تصانیف" کراچی، ۱۹۶۵ء، جلد دوم، ص ۵۰-۵۳۳

۴۔ ڈاکٹر عابد پیشاوری: "ذوق اور محمد حسین آزاد"، دہلی، ۱۹۸۷ء، کتاب کا دوسرا حصہ۔

انھیں دیکھ کر زیدی صاحب بھی ماننے پر مجبور ہوں گے کہ آزاد کو ادبی جعل سازی میں ذرا بھی دریغ نہ تھا۔

آزاد کے بعد حالی کی سوانح بھی بہت سیر حاصل طریقے سے لکھی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ حالی لاہور سے آکر دہلی کالج میں پروفیسر ہو گئے (ص۲۴۱)۔ زیدی صاحب منصب کی

Scanned by CamScanner

صحت پر توجہ نہیں کرتے۔ حالی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ وہ اینگلو عربک اسکول دلی میں مدرّس ہو کر چلے آئے (۱۷)۔ کبھی دلی کالج میں نہ تھے۔ شبلی کی سوانح نسبتاً مختصر ہے، لیکن تصانیف کے بارے میں مفصل لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۲ء میں شبلی کو علی گڑھ کالج کی عربی فارسی کی لیکچرشپ پیش کی گئی (ص ۲۴۳)۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ شبلی کو یہ پیش نہیں کی گئی، بلکہ انھوں نے درخواست دے کر سر سید کے ایک استاد نیز دوسرے مقتدر لوگوں سے سفارش کرائی اور تقرر حاصل کیا (ظفر احمد صدیقی: "شبلی"، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۵-۱۴)۔ حیرت ہے کہ اگلے صفحہ ۲۴۴ پر "شعر العجم" کی چار جلدیں لکھی ہیں جب کہ دراصل پانچ جلدیں ہیں۔ شبلی کی خدمت حیدر آباد کے لیے بھی زیدی لکھتے ہیں کہ وہاں دعوت دے کر بلائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی خود گئے۔ کئی مہینے کی امیدواری کے بعد خدا خدا کر کے تقرر ملا (ایضاً، ص ۲۱)۔ زیدی نے حالی اور شبلی پر بہت سیر حاصل طریقے سے لکھا ہے نیز اُن پر تنقید بھی سلامت روی سے کی ہے۔

علی گڑھ کے دوسرے عظما کی فہرست میں نواب محسن الملک سید مہدی حسن خاں کا نام لیتے ہیں (ص ۲۴۶)۔ سہواً کاما لگانے سے معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ دو اشخاص ہوں حالانکہ ایک ہی شخص کا ذکر ہے۔ ان کا صحیح نام سید مہدی علی تھا (۱۸)۔ وحید الدین سلیم کی کتاب کا نام "اصطلاحاتِ علمیہ" لکھتے ہیں (ص ۲۴۷)۔ صحیح "وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ" ہے۔ واضح ہو کہ اسی تاریخ میں ص ۲۶۹ پر اس کتاب کا نام "وضعِ اصطلاحات" دیا ہے۔

انیسواں باب "ناول اور ڈراما" ہے۔ اس میں خاص طور سے انیسویں صدی کے ناول اور ڈرامے پر توجہ کی گئی ہے۔ یہ دونوں اصناف اتنی وسیع ہیں کہ چند صفحات میں نہیں سما سکتیں، پھر بھی زیدی نے جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ غنیمت ہے۔ ناول نگاروں میں نذیر احمد، سرشار، شرر، سجاد حسین اور رسوا کو قدرے تفصیل سے اور راشد الخیری وغیرہ کو مختصراً لیا ہے۔ اس میں شرر کے اہم ناولوں میں ایک نام "آئینۂ حرم" لکھا ہے (ص ۲۵۲)۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اپنے مقالے "عبد الحلیم شرر بحیثیت ناول نگار" (لکھنؤ، ۱۹۸۶ء) میں ص ۱۷۱-۱۶۹ پر شرر کے ناولوں کی مکمل فہرست دی ہے، اس میں "آئینۂ حرم" یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام نہیں۔ زیدی نے شرر کے مشہور ناولوں میں "ایامِ عرب" کو شامل نہیں کیا، کرنا چاہیے تھا۔ کم اہم ناول نگاروں میں ایک نام عباس حسین شوق لکھا ہے (ص ۲۵۵)۔ یہ عباس حسین ہوش ہونا چاہیے۔

ناول کے بعد ڈراما نگاروں کا ذکر ہے جس میں آغا حشر کے علاوہ بقیہ کا محض نام لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں ایک نام غلام حسین الیاس (Alias) لکھا ہے۔ اس کے بعد کاما ہے

Scanned by CamScanner

اور پھر حسینی میاں ظریف کا نام ہے (ص ۲۵۶)۔ کاما نے ستم کر دیا۔ میں سمجھا کہ یہ دو نام ہیں جن میں پہلا نام "غلام حسین الیاس" ہے۔ میں بہت چکرایا کہ اس ڈراما نگار کا کبھی نام ہی نہیں سنا۔ کتابوں میں دیکھا تو اندازہ ہوا کہ alias بمعنی "عُرف" ہے اور غلام حسین نام ہے حسینی میاں ظریف کا۔

بیسواں باب قلم کار صحافی ہے۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ظفر علی خاں اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بغیر کسی علاحدہ عنوان کے ایک صفحے میں انشائیہ نگاروں کو سمو دیا ہے۔ اس باب میں ص ۲۵۹ پر مولانا ابوالکلام آزاد کا سنہ ولادت ۱۸۸۹ء دیا ہے۔ ان کی کتاب "تذکرہ" کے مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ (اگست استمبر ۱۸۸۸ء) ہے۔ یہی مالک رام نے "تذکرۂ ماہ و سال" اور عبدالقوی دسنوی نے "تلاشِ آزاد" (دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳) میں لکھا ہے۔ اس سے قطع نظر مولانا آزاد کا بیان خوب ہے۔ مولانا محمد علی کا حال چند سطور میں ہے۔ ظفر علی خاں کا سنہ پیدائش ۱۸۷۰ء درج کیا ہے۔ مالک رام نے "نقوش" لاہور نمبر کے حوالے سے ۱۸۷۳ء لکھا ہے، نیز بتایا ہے کہ ظفر علی ان کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۰ھ حاصل ہوتا ہے۔ یہ برابر ہے ۷۴-۱۸۷۳ء کے۔ خواجہ حسن نظامی کا سنہ وفات ۱۹۵۷ء لکھا ہے (ص ۲۶۳)۔ ان کے مقالہ نگار امام مرتضیٰ نقوی، نیز مالک رام نے ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء لکھا ہے اور یہی صحیح ہے (نقوی: "خواجہ حسن نظامی، حیات اور ادبی خدمات"، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص ۵۳)

صحافیوں کے باب کے آخری حصے میں انشائیوں کا ذکر ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ نہ باب کے شروع میں، نہ باب کے متن میں یہ عنوان موجود ہے۔ انشائیہ نگاروں میں زیادہ تر بیسویں صدی کے نصفِ اول تک کے قلم کاروں کا بیان ہے جو بہت مختصر ہے۔

باب ۲۱ کا عنوان "ادبی تنقید کا دور" ہے۔ اس میں غدر کے بعد تنقید کے ابتدائی آثار کا تعارف دیتے ہوئے عبدالرحمان بجنوری، نیاز، عبدالحق، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر زور، کلیم الدین احمد اور وقار عظیم کا ذکر کرتے ہیں۔ دقت یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں عبدالحق، مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر زور کی تصویر محقق کی ہے، نقاد کی نہیں۔ مسعود حسن رضوی نے ایک نظریاتی تنقید کی کتاب "ہماری شاعری" اور ڈاکٹر زور نے "روحِ تنقید" اور "اردو کے اسالیبِ بیان" لکھیں، پھر بھی ان دونوں علما کا عملی تنقید میں کوئی مقام نہیں۔

مسعود حسن رضوی کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ ۱۹۵۳ء تک صدرِ شعبہ رہے اور ۱۹۵۴ء میں بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہوئے (ص ۲۷۰)۔ زیدی کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ ۱۹۵۳ء کے بعد صدرِ شعبہ نہیں رہے۔ ان کی آپ بیتی کے مطابق وہ ۱۵ جون ۱۹۵۴ء کو ۲۲ سال صدارتِ

Scanned by CamScanner

شعبہ کر کے ریٹائر ہوئے (رسالہ "تحریر"، مسعود حسن رضوی نمبر، اپریل جون ۱۹۷۴ء، ص ۱۳)۔ ڈاکٹر زور کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں ریڈر مقرر ہوئے، اس کے بعد کالجوں کے پرنسپل (ص ۲۷۱)۔ وہ ان کے اہم ترین عہدے کو لکھنا بھول گئے کہ وہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے جس کے بعد وہ ایک ڈگری کالج کے پرنسپل ہو کر چلے گئے۔ شومیِ قسمت سے کالج کی ڈگری جماعتیں ختم ہو گئیں اور ڈاکٹر زور محض چادر گھاٹ انٹر کالج کے پرنسپل رہ گئے۔

زیدی کے مطابق ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ذخیرۂ کتب کی فہرست چھ جلدوں میں تیار کی (ص ۲۷۱)۔ صحیح یہ ہے کہ ڈاکٹر زور نے "تذکرۂ مخطوطاتِ اردو" کی پانچ جلدیں تالیف کیں۔ بہت بعد میں اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی اثر نے ۱۹۸۳ء میں چھٹی جلد شائع کی۔ زیدی نے ڈاکٹر زور کی کتابوں میں ایک کا نام "ادبی شہ پارے" لکھا ہے، صحیح "اردو شہ پارے" ہے۔ ایک اور کتاب کا نام "تاریخِ ادبیاتِ حیدر آباد" درج کیا ہے، صحیح "داستانِ ادبِ حیدر آباد" ہے (ص ۲۷۱)۔ زیدی نے ان کی اہم کتابوں میں آخرالذکر غیر اہم کتاب کو بھی شامل کر لیا ہے، لیکن "ہندوستانی لسانیات"، "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" اور "حیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ" جیسی اہم کتابوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بائیسویں باب کا عنوان ہے: "شاعری میں نئی لہر"۔ اس میں آزاد، حالی، اکبر الہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، درگا سہائے سرور اور چکبست کا بیان ہے۔ ان میں آزاد، حالی، اکبر اور چکبست پر نسبتاً تفصیل سے لکھا ہے۔ پہلے ہی صفحے پر یہ مفید معلومات بہم پہنچاتے ہیں کہ حکیم مولا بخش قلق نے ۱۵ انگریزی نظموں کا ترجمہ کر کے ۱۸۶۴ء میں شائع کیا (فٹ نوٹ، ص ۲۷۵)۔ شاید زیدی صاحب کو یہ معلوم نہ ہو کہ محکمۂ تعلیم یوپی نے اس ترجمے کو اصلاح کے لیے مرزا غالب کے پاس بھیجا اور انھوں نے غالباً قلق کے علم کے بغیر، ان پر اصلاح دی۔ تفصیل ملاحظہ ہو مالک رام کی کتاب "تلامذۂ غالب"، طبعِ دوم، ص ۶۴-۵۶۲ میں۔ زیدی ص ۲۷۹ پر پھر لکھتے ہیں کہ حالی دلی کالج میں آ گئے۔ پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ وہ اینگلو عربک اسکول میں مدرس تھے۔ ص ۲۸۰ پر حالی کی ایک کتاب کا نام "مجموعۂ حالی" لکھا ہے۔ صحیح "مجموعۂ نظمِ حالی" ہے۔

اگلا باب ۲۳، "اقبال اور نیا سویرا" ہے۔ ۱۸ صفحوں کا یہ باب پورے کا پورا اقبال کی نذر ہے۔ کتاب میں صفحوں کی تحدید کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ جائزہ اعلیٰ معیار کا ہے اور توازن کا دامن کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

باب ۲۴ کا عنوان "شباب اور قوت کی شاعری" ہے۔ اس میں جوش، فراق، حفیظ

Scanned by CamScanner

سیماب، ساغر، اختر شیرانی، روش، آنند نراین ملا اور احسان دانش وغیرہ پر لکھا ہے۔ ان سب پر شباب اور قوت کے شاعر ہونے کا لیبل برجستہ نہیں معلوم ہوتا، مثلاً سیماب اور ملا پر۔ ان شعرا میں جوش، فراق اور حفیظ پر نسبتاً تفصیل سے لکھا ہے۔ ص۳۲۱ پر فراق کے ایک مجموعے کا نام "گل برگ" چھپا ہے، "گلبانگ" ہونا چاہیے۔ باب۲۵ "غزل کا احیا" ہے۔ اس میں شاد عظیم آبادی، صفی، عزیز، ثاقب، حسرت موہانی، یگانہ، آرزو، جگر، اثر، جمیل مظہری، وجد اور جگن ناتھ آزاد پر لکھا ہے جس کے بعد ایک پیراگراف "گیت" کے عنوان سے ہے۔ اس میں گیت نگاروں کے محض نام ہیں۔ شاد عظیم آبادی پر لکھتے ہوئے ان کے حالات تقریباً دیے ہی نہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام "سرگزشت" لکھتے ہیں (ص۳۳۳)۔ صحیح نام "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی" ہے۔ زیدی نے شاد کے چند بہت اچھے شعر نمونتاً درج کیے ہیں۔ شاد ہی پر کیا منحصر ہے، اس باب کے دوسرے شعرا کے نمونے بھی دل خوش کن ہیں۔

آرزو کے مجموعے کا نام "رسیلی بانسری" لکھتے ہیں (ص۳۴۲)۔ صحیح "سُریلی بانسری" ہے۔ جگر کے مجموعے کا نام "شعلۂ گل" لکھا ہے (ص۳۴۳)۔ یہ نام ان کے دو مجموعوں "شعلۂ طور" اور "آتشِ گل" کا ملغوبہ ہے۔ "شعلۂ گل" احمد ندیم قاسمی کے مجموعے کا نام ہے۔ جگن ناتھ آزاد کو غزل کے شاعروں میں رکھا ہے (ص۳۴۶-۳۴۷)۔ میرے خیال میں ان کا نشانِ امتیاز نظم ہے۔ ان کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اقبال پر ایک پوری کتاب "اقبال اور اس کا عہد" بھی لکھی ہے (ص۳۴۷)۔ حالانکہ اس کے علاوہ وہ اقبال پر ذیل کی کتابیں بھی لکھ چکے ہیں:

"اقبال اور مغربی مفکرین"، "اقبال اور کشمیر"، "اقبال کی کہانی"، اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری۔ "فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو۔

("لمحے لمحے"، بدایوں، جگن ناتھ آزاد نمبر، جولائی ۱۹۸۶، تا فروری ۱۹۸۸، ص ۱۴-۱۳)

ان کے علاوہ ایک اور اہم کتاب "محمد اقبال، ایک ادبی سوانحِ حیات" بھی ہے۔ اس باب کے آخر میں گیت پر چند سطریں لکھنا، نہ لکھنے کے برابر ہے۔

باب ۲۶ "ترقی پسندی کا اُبال" ہے۔ اس میں اول مجنوں گورکھپوری، آلِ احمد سرور، احتشام حسین اور ممتاز حسین کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بطور خاص ترقی پسندی کی نظریاتی بنیاد کو لیا ہے، لیکن اس کے بعد مختلف ترقی پسند ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ سرور صاحب کے ایک مجموعے "ذوقِ جنوں" کا نام لیا ہے (۳۵۴)، لیکن سرور صاحب کا یہ واحد مجموعہ نہیں۔ اس سے پہلے ان کا مجموعہ "سلسبیل" آچکا تھا اور اب تو تیسرا مجموعہ "خواب

Scanned by CamScanner

اور خلش" بھی آگیا ہے۔ اسی باب میں "تنقید کے نئے رجحانات" کا عنوان دے کر جدید نقادوں گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمان فاروقی کو لیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ان کا ذکر ترقی پسندی کے باب میں نہیں آنا چاہیے تھا۔

باب ۲۷ "ترقی پسند شاعری اور اربابِ ذوق" ہے۔ یہاں بھی دو تحریکوں کو ملا دیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ دونوں کو علاحدہ علاحدہ بابوں میں لیا جاتا۔ اس میں فیض کے لیے لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری کے چار مجموعے ہیں: "نقشِ فریادی"، "دستِ صبا"، "زنداں نامہ" اور "دستِ تہِ سنگ" (ص ۳۶۲)، لیکن ان کے علاوہ تین اور مجموعے "سرِ وادیِ سینا"، "شامِ شہرِ یاراں" اور "مرے دل مرے مسافر" بھی ہیں۔ فیض کے بعد مجاز، مخدوم، سردار جعفری، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، ساحر، جذبی، مجروح، کیفی، شمیم کرہانی، سلام مچھلی شہری، اختر الایمان وغیرہ کا بیان ہے۔

ص ۳۶۸ پر سردار جعفری کے ایک مجموعے کا نام "ایک ہاتھ اور" لکھا ہے۔ "ایک خواب اور" درست ہے۔ جاں نثار اختر کے لیے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے آخری سال فلم سازی کی نذر کر دیے (ص ۳۷۰)۔ یہ صحیح نہیں کہ جاں نثار فلم ساز تھے۔ وہ فلموں کے لیے گیت لکھتے تھے، فلم بنانے کے لیے جتنا روپیہ درکار ہے اتنا اختر کے پاس کہاں تھا۔ جذبی کے لیے لکھتے ہیں کہ وہ بالکل حال میں علی گڑھ یونی ورسٹی سے ریٹائر ہوئے ہیں (ص ۳۷۱)۔ زیدی کی یہ کتاب ۱۹۹۱ء میں مکمل ہوئی ہے۔ جذبی ۲۱ اگست ۱۹۷۴ء کو ریٹائر ہوئے ("آج کل"، اگست ۱۹۹۴ء، جذبی نمبر، ص ۳)۔ اسے "بالکل حال" نہیں کہا جا سکتا۔ شعرا کے ضمن میں اپنے بارے میں یوں صفحہ صیغۂ غائب میں لکھا ہے۔

ترقی پسند شعرا کے بعد "حلقۂ اربابِ ذوق" کا عنوان ہے۔ اس میں تصدق حسین خالد کو آزاد نظم کا پہلا شاعر کہا ہے۔ ان کے بعد میرا جی، ن م راشد اور چند چھوٹے شعرا پر لکھا ہے۔ آخر میں کچھ ایسے شعرا کے نام لیے ہیں جو ناوابستہ ہیں۔ اس باب میں شعرا کے مشہور نظم پاروں کے نمونے پیش کرنے کی وجہ سے بیان کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

۲۸واں باب "نئی نسل کے شعرا" ہے۔ اس میں خلیل الرحمان اعظمی، وحید اختر، عمیق حنفی، بلراج کومل، شاذ تمکنت اور زاہدہ زیدی وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرے کئی مشہور شعرا کے محض نام لکھنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ اس باب میں ص ۳۸۶ پر نازش کا نام بڑی نمایاں سرخی سے لکھا ہے جب کہ انھیں کے بعد کے عمیق حنفی، بلراج کومل، شاذ تمکنت وغیرہ کو خفی عنوان بھی نہیں ملا حالانکہ یہ نازش سے بہتر شعرا ہیں۔ زیدی صاحب سے فون پر میری بات ہوئی تو انھوں نے ازخود شکایت کی کہ نازش کو بڑا جلی عنوان دیا گیا ہے۔ انھوں نے

Scanned by CamScanner

بتایا کہ طباعت اور عنوان سازی وغیرہ سے انھیں پوری طرح بے خبر رکھا گیا۔ یہ کسی اور کی نگرانی میں ہوئی۔ ص ۳۸۹ پر قابلِ ذکر غزل گویوں میں مشفق خواجہ کو بھی شامل کیا ہے۔ میں اُن کی اِس حیثیت سے واقف نہ تھا۔

باب ۲۹ "جدید فکشن" ہے۔ اس میں عنوان تو نہیں دیا لیکن اوّل مختصر کہانیوں کو لیا ہے۔ میں اس جزو میں مشاہیرِ فکشن کے بیان میں ان کے ناولوں کے نام نہ پا کر کھٹک رہا تھا۔ اس جزو میں پریم چند اور نیاز وغیرہ سے لے کر ہمارے ہم عصر افسانہ نگاروں تک کا ذکر ہے۔ ص ۴۰۵ پر افسانوی مجموعہ "ایک معمولی سی لڑکی" بلونت سنگھ اور ان کے فوراً بعد اختر اورینوی دونوں سے منسوب کیا ہے۔ یہ ناول بلونت سنگھ کا ہے (۱۹)۔ ص ۴۰۸ پر خدیجہ مستور کا صرف سنہ ولادت دیا ہے، سنہ وفات نہیں۔ اس سے قاری یہ سمجھے گا کہ خدیجہ اس وقت تک زندہ ہیں۔ مالک رام نے خدیجہ کی وفات کی تاریخ ۲۶ جولائی ۱۹۸۲ء لکھی ہے۔

ص ۴۱۱ کی تہ میں عنوان ہے: "جدید ناول،" اور اس کے بعد پریم چند سے لے کر نئے ناول نگاروں تک کے نام اور کاموں کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ مسلسل یہ احساس ستاتا ہے کہ مصنف صفحات کی تحدید کی وجہ سے اتنے سارے تخلیق کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ افسانہ و ناول کے اتنے بڑے ادب کو ایک مختصر باب میں کیسے سمیٹا جا سکتا ہے۔ کاش وہ اقبال اور بعض قدیم مشاہیر کے صفحے کچھ کم کر کے جدید ادیبوں کا بہرہ بڑھا دیتے۔

ص ۴۰۹ پر یہ جو لکھا ہے کہ جیلانی بانو کو "ایوانِ غزل" پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا، صحیح نہیں۔ یہ مغالطہ ڈاکٹر اعجاز حسین کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" میں ڈاکٹر عقیل کے بیان کا آفریدہ ہے۔ جیلانی بانو کو کبھی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ نہیں ملا گو "ایوانِ غزل" اس کی مستحق تھی۔ ص ۴۱۷ پر ایک ناول نگار کا نام صرف "مجازی" لکھا ہے۔ یہ ناکافی ہے۔ "نسیم مجازی" لکھنا چاہیے تھا۔

باب ۳۰ کا عنوان "مزاح و طنز" ہے۔ اس میں قبلِ "اودھ پنچ" سے شروع کر کے "اودھ پنچ" پر آتے ہیں، اس کے بعد عنوان دیتے ہیں، "نثری مزاح۔" اس میں انشا و مہجور سے لے کر منشی سجاد حسین، رشید احمد صدیقی، پطرس، امتیاز علی تاج، کنہیا لال کپور، فرقت وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں، نمونہ کہیں نہیں۔ بار بار محسوس ہوتا ہے کہ مصنف صفحات کی تنگیٔ داماں کی وجہ سے قلم کاری میں کفایت سے کام لینے پر مجبور ہو رہا ہے۔ ص ۴۲۲ پر پیروڈی اور تضمین کے سلسلے میں مجید لاہوری کے بعد ایک نام "عاشق محمد" کا لیا ہے۔ میں اس مصنف سے قطعاً واقف نہیں۔

باب ۳۱ کا عنوان "تحقیق اور ادبی متفرقات" ہے۔ لکھتے ہیں اردو میں تحقیق کا عہد

Scanned by CamScanner

سر سید کی "آثار الصنادید" اور پھر "آئینِ اکبری" و "تزکِ جہاں گیری" کی تدوین سے شروع ہوتا ہے (ص ۴۳۰) سر سید نے ضیاء الدین برنی کی "تاریخِ فیروز شاہی" بھی مرتب کی تھی، لیکن ان میں سے کسی کتاب کا تعلق اردو یا فارسی ادبیات سے نہیں۔ یہ کارنامے ادبی تدوین کے لیے ایک نمونہ ہو سکتے تھے لیکن اردو میں سوانحی اور تاریخی تحقیق کا کام پہلے شروع ہوا، تدوین کا بعد میں۔ مجھے اس میں شبہہ ہے کہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے سامنے والے اردو ادب کی تدوین کے کام تقریباً ۷۰ سال پہلے کی سر سید کی تاریخی تدوینوں سے متاثر ہوئے۔

دکنی محققوں میں عبدالستار دلوی کے نام کا آخری جزو Dabri چھپا ہے (ص ۴۳۰)۔ قاضی عبدالودود کا سب سے اہم کام "جہانِ غالب" کو قرار دیتے ہیں (۴۳۱) جو محض چند مضامین تک محدود رہا۔ لگتا ہے کہ زیدی صاحب کو قاضی صاحب کے اہم کاموں سے واقفیت نہیں۔ اس باب میں بعض اہم محققین کے نام بالکل چھوٹے ہوئے ہیں مثلاً رشید حسن خاں، حنیف نقوی، خلیق انجم، تنویر علوی، عابد پیشاوری۔ چند اصناف کی تحقیق اور چند متون کی تدوین کے نام بھی لیے ہیں، لیکن وہ اتنے کم ہیں کہ اس موضوع پر انگلی میں لہو لگانے کے برابر بھی نہیں۔ اس کے آگے چند اصنافِ ادب کے اہم کاموں کا نام لیا ہے۔ یہ سب اتنا سرسری اور تشنہ ہے کہ اس باب کا وجود عدم سے قدرے ہی زیادہ کہلا سکتا ہے۔

۳۲ واں اور آخری باب "ستر کے عشرے کے بعد" ہے جو ایک طرح کا خاتمہ اور مجموعی جائزہ ہے، محض پانچ صفحوں کا۔ اس میں ن م راشد کے بعد آزاد نظم کو برتنے والے ترقی پسند شعرا میں تین نام لیے ہیں: مخدوم، سردار جعفری اور جواد زیدی، نیز یوسف ظفر اور ممور جالندھری وغیرہ (ص ۴۳۹)۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جواد زیدی کو بحیثیت شاعر مخدوم اور سردار جعفری کے برابر رکھا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ یہاں کچھ نئے اہم شعرا کے نام بھی آ سکتے تھے۔

میں نے اس تبصرے میں کہیں کہیں زیدی کے مذکورہ سنین پر شبہہ کیا ہے لیکن عام طور سے سنین کا جائزہ نہیں لیا۔ اب اس اہم فریضے کو لیتا ہوں۔ ذیل میں کتاب کے ایسے سنین درج کر رہا ہوں جو زیدی صاحب نے کچھ اور لکھے ہیں، دوسرے محققین نے کچھ اور۔ یہ لازم تو نہیں کہ دوسروں کے سنین ہر جگہ درست ہوں، لیکن میرا خیال ہے بیش تر صورتوں میں دوسروں کے سنین کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ قاری کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہاں "پ" مخفف ہے "پیدائش" کا اور "ف" "فوت" کا۔

زیدی	دوسرے مؤرخین
ص۱۹ شیخ حمید الدین ناگوری: پ ۱۱۰۳ء ف ۱۲۷۵ء	عبدالحق و جمیل جالبی: پ ۱۱۹۳ھ - ف ۱۲۷۴ء (اردو کی ابتدائی نشوونما...، ص ۱۳، نیز جالبی کی تاریخ، جلد اوّل، ص ۳۷)
ص۲۰ شیخ سراج الدین (اخیِ سراج عثمان) ف ۱۳۵۵ء	عبدالحق ۷۵۸ھ/۱۳۵۶ء (نشوونما، ص۱۷) ۷۵۸ھ کے صرف ابتدائی سات دن ۱۳۵۶ء میں پڑتے ہیں، بقیہ پورا سال ۱۳۵۷ء کے مطابق ہے، اس لیے عیسوی سال ۱۳۵۷ء صحیح تر ہے۔
ص۲۰ اشرف جہاں گیر سمنانی: ف ۱۳۵۵ء	حامد حسن قادری: ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء ("داستانِ تاریخِ اردو"، ص۱۷)
ص۲۰ سیّد محمد جون پوری: ف ۱۵۰۴ء	سیّد نصرت مہدی: ۱۹ ذی قعدہ ۹۱۰ھ/۲۳ اپریل ۱۵۰۵ء ("اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ"، ص۱۹)
ص۲۰ بہاء الدین باجن: ف ۱۵۰۶ء	شمس اللہ قادری: ۱۴ ذی قعدہ ۹۱۲ھ (۱۵۰۷ء) ("اردوئے قدیم"، ص۴۶)
ص۲۰ عبدالقدوس گنگوہی: ف ۱۵۳۸ء	مالک رام: ۲۳ جمادی الثانی ۹۴۴ھ/۲۷ نومبر ۱۵۳۷ء ("تذکرۂ ماہ و سال"، ص۲۶۶)
ص۲۰ و ص۳۱ کبیر ۱۳۹۹ء تا ۱۵۱۵ء	انصاراللہ نظر: ۱۳۹۸ء تا ۱۵۱۸ء ("شعرِ کبیر"، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص۵۸) پربھاکر ماچوے: کبیر پنتھیوں کے مطابق پ ۱۳۹۸ء - ف ۱۸-۱۵۱۷ء ("کبیر"، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص۱۰، ص۱۸)
ص۲۰ گرونانک: ف ۱۵۳۹ء	مالک رام: ۱۰ اکتوبر ۱۵۳۸ء (تذکرہ...، ص۳۸۴)

Scanned by CamScanner

ص ۳۰ میاں مصطفےٰ گجراتی: ف ۱۵۲۳ء	محمود شیرانی: ۹۸۴ھ/۷۷-۱۵۷۶ء، بحوالۂ مثنوی "فیضِ عام" ("مقالاتِ شیرانی"، دوم، ص ۱۸۳)
ص ۳۵ و ص ۳۸ خواجہ گیسو دراز: ف ۱۴۲۱ء	سروری: ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ/ یکم نومبر ۱۴۲۲ء (علی گڑھ تاریخ، ص ۱۵۶)
ص ۳۶ سید احمد کبیر حیات قلندر: ف ۱۲۹۱ء	حمید شطاری: صحیح نام سید احمد کبیر جہاں قلندر ف ۶۵۹ھ/۶۱-۱۳۶۰ء ("قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر"، حیدر آباد، ۱۹۸۲ء، ص ۳۸)
ص ۳۸ ابراہیم عادل شاہ ثانی: ف ۱۶۷۰ء	شمس اللہ قادری و نصیر الدین ہاشمی: ۱۰۳۷ھ
ص ۴۰ ابراہیم عادل شاہ ثانی: ف ۱۶۲۶ء	(۲۸، ۱۶۲۷ء)- قادری: "اُردوئے قدیم" میں ص ۴۷، ہاشمی: "دکن میں اردو"، ص ۱۷۱
ص ۴۲ احمد گجراتی کی "لیلیٰ مجنوں" ۱۹۳۶ء- ۱۶۳۴ء- ظاہرا ۱۹۳۶ء سہوِ طباعت ہے ۱۶۳۶ء کے لیے ص ۱۷۱ پر اسی کا سنہ ۸۴-۱۷۸۳ء دیا ہے	سیدہ جعفر: مثنوی "یوسف زلیخا" کا سنہ ۸۵-۱۵۸۰ء ہے۔ اس کے بعد کی "لیلیٰ مجنوں" کے محض چند منتشر اشعار ملتے ہیں اس لیے اس کا سنہ نہیں لکھا جا سکتا ("یوسف زلیخا" از احمد کا مقدمہ ص ۶۱، حیدر آباد، ۱۹۸۳ء)
ص ۴۲ نصرتی: ف ۱۶۸۴ء کے قریب	نصیر الدین ہاشمی: ۱۰۸۵ھ/۷۵-۱۶۷۴ء (فہرست سالار جنگ، ص ۶۰۱، بحوالہ مخطوطۂ "گلشنِ عشق")
ص ۴۳ محمد قلی قطب شاہ: ف ۱۶۱۱ء	ڈاکٹر زور: ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء ("معانیِ سخن"، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹)
ص ۴۳ وجہی: ف ۱۶۵۹ء	جاوید وششٹ: ۱۶۵۶ء اور ۱۶۷۱ء کے بیچ۔ قطعی تاریخ معلوم نہیں ("وجہی"، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸)
ص ۴۵ غواصی کی "سیف الملوک و بدیع	خود مثنوی میں مذکور سنہ ۱۰۳۵ھ

Scanned by CamScanner

"الجمال" ۱۶۲۳ء	(۲۶-۱۶۲۵ء)
ص۴۵ غواصی: "طوطی نامہ" ۱۶۳۱ء	جمیل جالبی: ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء (جلد ۱، ص ۴۸۱)
ص۴۹ محمود بحری: "من لگن" ۱۷۰۵ء	شمس اللہ قادری: خود مثنوی میں تاریخ ۱۱۱۲ھ (۰۱-۱۷۰۰ء)۔ "اردوے قدیم" ص۹۸-۹۷
ص۵۴ سراج: پ ۱۵- ۱۷۱۴ء	سروری اور مالک رام: ۱۳ صفر ۱۱۲۴ھ/ مارچ ۱۷۱۲ء (سروری: مقدمہ "بوستانِ خیال"، حیدر آباد، ۱۹۶۹ء، ص۷)
ص۵۵ میراں جی شمس العشاق: ف ۱۴۹۶ء	جانم کے لکھے مرثیے کے مطابق شوّال ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء (دیکھیے، "اردوے قدیم" پر تبصرہ)
ص۵۵ شاہ امین الدین علی اعلیٰ: پ ۱۵۸۲ء ف ۷۵- ۱۶۷۴ء	حسینی شاہد: پ ۲۳ رمضان ۱۰۰۷ھ/ ۱۵۹۹ء ۔ف ۲۳ جمادی الاول ۱۰۸۵ھ/ ۱۶۷۴ء (شاہ امین...، ص۱۱۹، ۱۵۰)
ص۵۶ جانم: "ارشاد نامۂ نثر" ۱۵۸۲ء	جانم کی نظم "ارشاد نامہ" ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) کی تصنیف ہے۔ "ارشاد نامۂ نثر" اس کے بعد کی ہے۔
ص۸۲ جعفر علی حسرت: ف ۱۷۹۵ء	جمیل جالبی: ۱۲۰۶ھ/ ۹۲-۱۷۹۱ء (جلد ۲، حصہ ۲، ص۸۱-۸۸۰)
ص۸۷ مظہر جانِ جاناں: پ ۱۷۰۰ء	جالبی: ۱۱ رمضان ۱۱۱۰ھ/ ۱۳ مارچ ۱۶۹۹ء (جلد ۲، حصہ ۱، ص۳۶۱)
ص۱۰۹ میر حسن: پ ۳۸-۱۷۳۶ء	وحید قریشی: ۱۱۵۴ھ/ ۴۲-۱۷۴۱ء کے لگ بھگ "میر حسن اور ان کا زمانہ"، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۲۰۴)
ص۱۱۳ میر سوز ۱۷۹۷ء میں آصف الدولہ کے استاد ہوئے	جالبی: سوز آصف الدولہ کے حکمراں ہونے کے بعد جلد ہی ان کے استاد مقرر ہوئے اور آصف کی وفات ۱۷۹۷ء تک

Scanned by CamScanner

	استاد رہے (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۷۹۵)
ص ۱۱۵ محمد روشن جوشش: ف ۳۶-۱۷۳۵ء	جالبی بحوالۂ قاضی عبدالودود: بعد ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۱ء (جلد ۲، حصہ ۲، ص ۹۶۱)
ص ۱۱۵ شاہ رکن الدین عشق: ف ۱۷۹۹ء، لیکن ص ۱۱۹ پر ۱۷۸۹ء	جالبی: ۷ جمادی الاوّل ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء (۲/۲، ص ۹۳۴)
ص ۱۱۶ دردمند: ف ۱۷۷۶ء	جالبی: ۱۱۷۹ھ/ ۶۶-۱۷۶۵ء (۱/۲ ص ۹۴، ۳۹۳)
ص ۱۱۶ ٹیک چند بہار: ف ۴۲-۱۷۴۱ء	جالبی: ۶۷-۱۷۶۶ء (۱/۲، ص ۱۶۸)
ص ۱۱۶ محمد علی ندوی: ف ۹۶-۱۷۹۵ء	جالبی: ۱۲-۱۲۰۸ھ/ ۹۸-۱۷۹۳ء کے بیچ (۲/۲، ص ۹۴۰)
ص ۱۱۷ "خدائی نعمت عرف تفسیرِ مرادیہ" کا سنہ ۱۷۷۰ء	حمید شطاری: تکمیل ۲۴ محرم ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء (قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، ص ۹۹)
ص ۱۲۱ شاہ رؤف احمد رافت: پ ۱۷۷۶ء	شطاری: ۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء (ایضاً ص ۲۳۱)
ص ۱۲۲ "قصۂ احوالِ روہیلہ" ۱۷۳۰ء	جالبی: ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۵ھ یعنی ۱۷۷۴ء اور ۱۷۸۱ء کے بیچ ۲/۲، ص ۱۰۷۵
ص ۱۲۳ "نوآئینِ ہندی" ص ۱۷۸۸ء	ڈاکٹر سلیمان حسین: ۱۲۱۸ھ/ ۰۴-۱۸۰۳ء (مقدمہ "نوآئینِ ہندی"، لکھنؤ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴)
ص ۱۲۴ "رانی کیتکی کی کہانی" ۱۸۰۴ء	عابد پیشاوری: ۱۷۸۸ء کے آس پاس (انشاءاللہ خاں انشا، لکھنؤ ۱۹۸۵ء، ص ۴۴۵)
ص ۱۵۰ ناسخ: پ ۱۷۷۱ء	مالک رام: ۸ محرم ۱۱۸۶ھ/ ۱۰ اپریل ۱۷۷۲ء
ص ۱۵۸، نیز ص ۱۷۹ شاہ نصیر: ف ۱۸۴۰ء	مالک رام: ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء - تاریخ "چراغ گل"
ص ۱۷۱ مصحفی کی "بحرالمحبت" ۱۸۱۰ء	گیان چند: اس کا مخطوطہ ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء کا ملتا ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کی تصنیف

Scanned by CamScanner

ب۔ (اردو مثنوی...، جلد ا، ص ۳۴۸)

ص ۱۷۱ راسخ عظیم آبادی ۱۷۴۸ء تا ۱۸۲۸ء

جالبی: ۵۷-۱۷۵۶ء تا ۱۸۲۳ء (۲/۲، ص ۹۴۵)

ص ۱۷۱ رنگین کی مثنوی "دل پذیر" ۱۷۹۹ء

ڈاکٹر سلیمان حسین: ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء کی ابتدا میں پوری ہوئی (مقدمہ مثنوی "دل پذیر"، لکھنؤ، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰-۹)

ص ۱۷۱ ہوس: مثنوی "لیلیٰ مجنوں" ۸۴-۱۷۸۳ء

ابتدا میں سعادت علی خاں (جلوس: ۱۷۹۸ء) کی مدح ہے، نیز تذکرہ "طبقاتِ سخن" میں ذکر ہے، اس لیے ۱۷۹۸ء اور ۱۸۰۷ء کے بیچ لکھی گئی (اردو مثنوی...، جلد ۲، ص ۳۵)

ص ۱۷۱ تجلی کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" ۱۷۹۶ء

گیان چند: ۱۱۹۷ھ اور ۱۲۰۷ھ یعنی ۹۳-۱۷۸۳ء کے درمیان (اردو مثنوی...، جلد اول، ص ۳۹۳)

ص ۱۷۱ ابوالحسن حسن کی "گلزارِ ابراہیم" ۱۸۳۵ء

گیان چند ۱۲۵۱ھ/ ۳۶-۱۸۳۵ء (اردو مثنوی...، جلد ۲، ص ۹۲)

ص ۱۷۱ مثنوی "طلعت الشمس" ۱۸۱۲ء

گیان چند: قبلِ ۱۲۹۹ھ/ ۸۲-۱۸۸۱ء۔ شاعر کا زمانۂ حیات ۱۲۳۲ھ تا ۱۳۱۲ھ، یعنی ۱۸۱۶ء تا ۱۸۹۵ء (اردو مثنوی...، جلد ۲، ص ۲۸۸)

ص ۱۷۱ گوبند پرشاد فضا: مثنوی "شیریں خسرو" ۱۸۴۵ء

عطاء اللہ پالوی: صحیح نام "گلزار فضا"۔ "ابتدا میں واجد علی شاہ کی مدح ہے۔ ("اردو کے ہندو مثنوی نگار"، پٹنہ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۵) واجد علی شاہ کا سنہ جلوس ۱۸۴۷ء ہے، اس لیے مثنوی اس سے پیش تر کی نہیں۔

ص ۱۷۱ شوق کی "زہرِ عشق" ۱۸۶۲ء

راس مسعود: ۱۲۷۷ھ/ ۶۱-۱۸۶۰ء ("انتخابِ زرّیں"، ص ۹۷)

Scanned by CamScanner

ص۱۷۱ قلق کی "طلسمِ الفت" ۱۸۸۲ء	گیان چند: عہدِ واجد علی شاہ ۵۶-۱۸۴۷ء کی (اردو مثنوی...، جلد ۲، ص۱۰۱-۹۹)
ص۱۷۵ امانت: ف ۱۸۵۸ء	ابواللیث صدیقی و مالک رام: ۲۸ جمادی الاوّل ۱۲۷۵ھ / جنوری ۱۸۵۹ء ("لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، "تذکرۂ ماہ و سال")
ص۱۸۷ غالب کا قیامِ کلکتہ ۱۸۳۰ء تک	کالی داس گپتا رضا: کلکتے سے دلی واپسی ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو ("دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے"، بمبئی، ۱۹۸۸ء، مقدمہ، ص۸۷)
ص۱۹۷ نگار کی "یوسف زلیخا" ۲۵-۱۸۲۴ء	گیان چند: تصنیف ۱۲۱۲ھ - طبع ۱۲۴۰ھ/۲۵-۱۸۲۴ء (اردو مثنوی...، جلد اوّل، ص۳۹۷)
ص۱۹۷ عشرت کی "شمع و پروانہ" ۹۸-۱۷۹۷ء، سہواً نام "شام و پروانہ" چھپ گیا ہے	گیان چند: ۱۲۱۱ھ/۹۷-۱۷۹۶ء (ایضاً، ص۳۹۵)
ص۱۹۹ مرزا محمد فطرت کی قواعد ۱۸۰۱ء میں	عتیق صدیقی اور ابوسلمان شاہ جہاں پوری: ہیڈلے کی قواعد کے ۱۸۰۲ء کے ایڈیشن کی تصحیح از فطرت۔ ("گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص۵۴۔ ابوسلمان: "کتابیاتِ قواعدِ اردو"، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص۶۴)
ص۲۰۰ حیدر بخش حیدری کی "گل مغفرت" ۱۸۰۲ء	عبیدہ بیگم: خود مترجم کے دیباچے کے مطابق مرقوم ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء)۔ یہی سنہ طباعت ہے۔ ("فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، ص۳۴۷)
ص۲۰۱ "فسانۂ عجائب" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۰ء	دراصل پہلا ایڈیشن ۱۲۵۹ھ/۴۴-۱۸۴۳ء کا ہے۔
ص۲۰۳ گویا کی "بوستانِ حکمت" (کذا۔ صحیح: "بُستانِ حکمت") کا سنہ تصنیف ۱۸۳۷ء	جعفر ملیح آبادی: خود مصنف نے خاتمے میں ۱۴ ذی قعدہ ۱۲۵۱ھ (مارچ ۱۸۳۶ء)

Scanned by CamScanner

	تاریخ دی ہے ("گویا، صاحبِ سیف و قلم"، لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ص ۱۳۲)
ص ۲۰۳ غلام امام شہید: ف ۱۸۷۸ء	مالک رام: ۱۸۷۹ء
ص ۲۰۳ غلام غوث بے خبر: ف ۱۹۰۵ء	مالک رام: ۱۸ شوال ۱۳۲۲ھ/ دسمبر ۱۹۰۴ء، تاریخ "خواجہ بہشت"
ص ۲۲۰ میر مہدی مجروح: ف ۱۹۰۲ء	مالک رام: ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء
ص ۲۲۲ منیر شکوہ آبادی: ف ۱۸۸۱ء	مالک رام: ۴ رمضان ۱۲۹۷ھ/ ۱۰ اگست ۱۸۸۰ء
ص ۲۲۲ امیر مینائی: پ ۱۸۲۸ء	ابو محمد سحر: ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ/ ۲۲ فروری ۱۸۲۹ء ("مطالعۂ امیر"، لکھنؤ ۱۹۶۵ء، ص ۶۷)
ص ۲۲۳ امیر کا دیوان "مرآۃ الغیب" ۱۸۷۳ء	ابو محمد سحر: ترتیب ۱۲۸۳ھ طباعت ۱۲۹۰ھ/ ۷۴-۱۸۷۳ء ("مطالعۂ امیر"، ص ۱۲۱)
ص ۲۲۳ امیر کا دیوان "صنم خانۂ عشق" ۱۸۹۵ء	ابو محمد سحر: ترتیب ۱۳۰۶ھ/ ۸۹-۱۸۸۸ء۔ طباعت ۱۳۱۸ھ/ ۰۱-۱۹۰۰ء ("مطالعۂ امیر"، ص ۱۳۲)
ص ۲۲۴ و ص ۲۵۳ مرزا رسوا: پ ۱۸۵۹ء	مالک رام ۱۸۵۸ء۔ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری: فروری ۱۸۷۸ء ("رسوا کی ناول نگاری"، ص ۲۸ بحوالہ "تاریخِ ادبِ اردو" از ملک حسن اختر)
ص ۲۳۴ سر سید ۱۸۶۶ء میں آخری طور پر علی گڑھ آ گئے	صحیح ۱۸۷۶ء۔ حامد حسن قادری ("داستانِ تاریخِ اردو"، ص ۲۵۸، نیز تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان...، جلد ۹، ص ۷۲)
ص ۲۳۸ محمد حسین آزاد: پ ۱۸۳۳ء	ڈاکٹر صادق: ۱۰ جون ۱۸۳۰ء (تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان...، جلد ۹، ص ۳۰۸)
ص ۲۳۸ آزاد کا دوسرا سفرِ ایران ۱۸۸۳ء	صادق: ستمبر ۱۸۸۵ء تا جولائی ۱۸۸۶ء (ایضاً)
ص ۲۳۸ آزاد کا جنون ۱۸۹۰ء کے بعد	گیان چند: ۱۸۸۹ء میں ("قومی زبان"، مئی ۱۹۹۱ء، ص ۲۹-۲۸)

Scanned by CamScanner

ص ۲۴۲ حالی کی "حیاتِ سعدی" ۱۸۸۴ء	رشید حسن خاں: ۱۸۸۶ء ("حیاتِ سعدی"، دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۷) تاریخِ ادبیات مسلمانان...، جلد ۹، ص ۱۲۱، فٹ نوٹ میں مفصل بحث۔
ص ۲۴۵ شبلی کی "سیرت النعمان" ۱۸۹۲ء	ظفر احمد صدیقی: پہلا حصہ ۱۸۸۹ء، دوسرا ۱۸۹۰ء، طباعت: ۱۸۹۱ء ("شبلی"، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۵۱)
ص ۲۴۵ حیدر آباد میں ۱۹۰۰ء میں بلائے گئے	ظفر احمد صدیقی: ۲۲ مئی ۱۹۰۱ء کو تقرر ہوا (ایضاً، ص ۲۱)
ص ۲۴۵ "الغزالی" ۱۹۰۲ء	ظفر احمد صدیقی: ۱۹۰۱ء (ایضاً، ص ۵۳)
ص ۲۴۵ "علم الکلام" ۱۹۰۳ء	ظفر احمد صدیقی: ۱۹۰۲ء (ایضاً، ص ۵۹)
ص ۲۴۵ "موازنۂ انیس و دبیر" ۱۹۰۷ء	ظفر احمد صدیقی: تصنیف ۱۹۰۴ء۔ اشاعت ۱۹۰۶ء (ایضاً، ص ۲۳)
ص ۲۴۹ نذیر احمد: پ ۱۸۳۳ء	ڈاکٹر اشفاق اعظمی: ۳۱-۱۸۳۰ء ("نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے"، لکھنؤ ۱۹۷۴ء، ص ۱۲-۱۱)
ص ۲۵۰ سرشار: پ ۱۸۴۴ء؛ ف ۱۹۰۲ء	پریم پال اشک اور لطیف حسین ادیب: پ غالباً ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء (اشک: "سرشار ایک مطالعہ"، دلی، ۱۹۶۴ء، ص ۴۳-۴۷ ادیب: "سرشار کی ناول نگاری"، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۳۸) ف بقولِ چکبست ۲۱ جنوری ۱۹۰۳ء ادیب بھی یہی۔ (اشک: ص ۸۷۔ ادیب: ص ۴۲)
ص ۲۵۲ شرر: پ ۱۸۶۳ء	خود شرر: ۱۷ جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ/ ۱۰ جنوری ۱۸۶۰ء (علی احمد فاطمی: "عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار"، لکھنؤ ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۳)
ص ۲۵۵ راشد الخیری: پ ۱۸۷۰ء	مالک رام: جنوری ۱۸۶۸ء بحوالہ "عصمت"، راشد الخیری نمبر
ص ۲۵۷ آغا حشر: پ ۱۸۸۰ء	ملک حسن اختر: ۸ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ/ یکم

	اپریل ۱۸۷۹ء ("تاریخِ ادبِ اردو"، ص۸۸۸)۔ "نقوش" لاہور نمبر ص۷۹۲ میں بھی ۱۸۷۹ء
ص۲۶۷ نیاز: ف ۱۹۶۸ء	ڈاکٹر اسیر عارفی: ۲۷ مئی ۱۹۶۶ء ("نیاز فتح پوری"، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص۸۹)
ص۲۶۸ عبدالحق: ف ۱۹۶۳ء	مالک رام: ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء
ص۲۶۹ وحیدالدین سلیم: ف ۱۹۱۶ء	مالک رام: ف ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء
ص۲۷۳ وقار عظیم ۱۹۰۸ء تا ۱۹۸۱ء	مالک رام: تاریخی نام ہے جس سے سنہِ ولادت ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) برآمد ہوتا ہے۔ بنارس کی سنجیدہ خاتون نے اپنے مقالے میں دسمبر ۱۹۱۰ء لکھا ہے۔ مالک رام: تاریخِ وفات ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء
ص۲۹۲ اقبال نے ایم اے ۱۸۸۹ء میں پاس کیا۔	جگن ناتھ آزاد کے "مرقعِ اقبال" ص۳۵ میں ایم اے کی سند ۱۸۹۹ء کا عکس۔ ۱۸۸۹ء میں تو مڈل بھی پاس نہیں کیا تھا۔
ص۲۹۲ اقبال کی "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء	رفیع الدین ہاشمی: ۱۹۰۴ء ("تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ"، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص۲۹۱)
ص۲۹۲ اقبال نے لندن میں گول میز کانفرنس میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں شرکت کی۔	عبداللطیف اعظمی: ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں ("اقبال، دانائے راز"، دہلی، ۱۹۷۸ء، ص۲۳۷)
ص۳۰۰ "رموزِ بے خودی" ۱۹۱۷ء	رفیع الدین ہاشمی: تکمیل نومبر ۱۹۱۷ء۔ اشاعت اپریل ۱۹۱۸ء (تصانیفِ اقبال...، ص۹۸-۹۷)
ص۳۱۱ جوش کی ہجرتِ پاکستان ۱۹۵۴ء	کاظم علی خاں: ۱۹۵۵ء ("جوش شناسی"، لکھنؤ ۱۹۸۶ء، ص۲۵۶ بحوالہ "نگار"، کراچی، جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء)
ص۳۲۵ حفیظ جالندھری: ف ۱۹۸۳ء	مالک رام: ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء

Scanned by CamScanner

ص۳۲۵ سیماب ۱۸۸۰ء تا ۱۹۵۲ء	مالک رام: پ ۵ جون ۱۸۸۲ء۔ ف ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء
ص۳۲۸ ساغر نظامی ۱۹۰۵ء تا ۱۹۸۳ء	ضیا فتح آبادی و مالک رام: پ ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء ف ۲۷ فروری ۱۹۸۳ء (ضیا: "ذکرِ سیماب"، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص۱۶، ص۸۸)
ص۳۲۹ اختر شیرانی: ف ۱۹۴۲ء	یونس حسنی و مالک رام: ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء (حسنی: "اختر شیرانی اور جدید اردو ادب"، کراچی، ص۶۱)
ص۳۳۰ احسان دانش: ف ۱۹۸۳ء	مالک رام: ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء
ص۳۳۵ صفی: پ ۱۸۶۳ء	مالک رام: ۳ جنوری ۱۸۶۲ء
ص۳۳۵ عزیز لکھنوی: پ ۱۸۸۰ء	ڈاکٹر مسعود حسن ردولوی: ۱۴ فروری ۱۸۸۲ء۔ مقالہ ص۲۶ (حوالہ کاظم علی خاں: "مقالات و نشریات"، لکھنؤ ۱۹۹۳ء، ص۳۱)
ص۳۳۵ ثاقب لکھنوی: پ ۱۸۶۰ء	مالک رام: ۳ جنوری ۱۸۶۹ء / ۱۹ رمضان ۱۲۸۵ھ
ص۳۳۷ حسرت موہانی: پ ۱۸۷۵ء۔ ف ۱۹۶۱ء	ولادت مطابقِ پاسپورٹ ۱۴ اکتوبر ۱۸۷۸ء ("ہماری زبان")، یکم فروری ۱۹۹۳ء۔ احمر لاری: ف ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء ("حسرت موہانی"، گورکھپور، ۱۹۷۳ء، ص۱۳۷)
ص۳۳۸ آرزو: پ ۱۸۷۲ء	مالک رام: پ ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ / ۱۶ فروری ۱۸۷۳ء
ص۳۳۸ پر ف ۱۹۵۱ء، ص۳۴۲ پر ۱۹۵۲ء	مالک رام: ف ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء
ص۳۳۸ و ۳۴۳ جگر: ف ۱۹۶۱ء	مالک رام و صاسن علی مراد آبادی: ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء (صاسن علی: پیشِ لفظ "جگر مراد آبادی" دہلی، ۱۹۸۳ء)
ص۳۴۳ اثر لکھنوی: ف ۱۹۶۶ء	محمود خاور و مالک رام: ۶ جون ۱۹۶۷ء (خاور: "اثر لکھنوی، حیات اور کارنامے"،

Scanned by CamScanner

	حیدر آباد، ۱۹۷۷ء، ص ۳۳)
ص ۳۴۷ وجد: پ ۱۹۱۴ء	مالک رام: ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء
ص ۳۵۴ آلِ احمد سرور: پ ۱۹۱۲ء	خلیق انجم: ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء ("پروفیسر آلِ احمد سرور، شخصیت اور ادبی خدمات"، دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۸۷)
ص ۳۶۲ فیض: پ ۱۹۱۲ء۔ ف ۱۹۸۵ء	مالک رام: پ ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء۔ ف ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء (وفات کے لیے "ہماری زبان" یکم دسمبر ۱۹۸۴ء)
ص ۳۶۸ سردار جعفری: پ ۱۹۱۲ء	مالک رام: ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء۔ سردار جعفری کی بہنوں کے مطابق ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء
ص ۳۷۰ جاں نثار اختر: ف ۱۹۷۹ء	مالک رام و "ہماری زبان"، ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء ("ہماری زبان"، بابت یکم ستمبر ۱۹۷۶ء)
ص ۳۷۱ احمد ندیم قاسمی: پ ۱۹۱۵ء	مالک رام: ۳۰ نومبر ۱۹۱۶ء (تذکرہ...، ص ۳۸۶)
ص ۳۷۱ ساحر لدھیانوی: پ ۱۹۲۲ء	ناز صدیقی و مالک رام: ۸ مارچ ۱۹۲۱ء (ناز: "ساحر، شخص اور شاعر"، حیدر آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۱۳)
ص ۳۷۱ مجروح سلطان پوری: پ ۱۹۱۹ء	بقولِ خود ۱۷ جنوری ۱۹۲۰ء
ص ۳۷۲ کیفی اعظمی: پ ۱۹۱۸ء	صابر دت: جنوری ۱۹۲۰ء ("تصویرِ بتاں")
شمیم کرہانی: پ ۱۹۱۴ء	مالک رام: ۲ رجب ۱۳۳۱ھ/ ۸ جون ۱۹۱۳ء
ص ۳۷۳ سلام مچھلی شہری: پ ۱۹۲۰ء	مالک رام: یکم جولائی ۱۹۲۱ء
ص ۳۷۳ غلام ربانی تاباں: پ ۱۹۱۵ء	مالک رام: ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء
ص ۳۷۸ میراجی: ف ۱۹۵۰ء	مالک رام: ۳ نومبر ۱۹۴۹ء (بحوالہ "نقوش"، لاہور نمبر، ص ۹۴۹)
ص ۳۷۹ ن م راشد: ف ۱۹۷۶ء	مالک رام و مغنی تبسم: ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء (مغنی: "ن م راشد، شخصیت اور فن"، دہلی،

Scanned by CamScanner

	۱۹۸۱ء، ص ۱۳)
ص ۳۸۴ خلیل الرحمان اعظمی: ف ۱۹۷۴ء	ڈاکٹر اسلام عشرت و مالک رام: یکم جون ۱۹۷۸ء (عشرت: "خلیل الرحمن اعظمی، ترقی پسندی سے جدیدیت تک"، پٹنہ، ۱۹۸۸ء، ص ۴۳)
ص ۳۸۴ خلیل اعظمی کا مجموعہ "نیا عہد نامہ" ۱۹۶۳ء	گیان چند: دسمبر ۱۹۶۵ء ("ذکر و فکر"، ص ۳۹۴)۔ عقیل: ص ۳۶۴
ص ۳۹۰ سجاد حیدر یلدرم ۱۸۸۸ء تا ۱۹۳۲ء	سجیدہ خاتون: پ ۱۸۸۰ء۔ مالک رام: ف اپریل ۱۹۴۳ء
ص ۳۹۷ علی عباس حسینی: ف ۱۹۷۱ء	مالک رام: ۲۷ ستمبر ۱۹۶۹ء
ص ۳۹۹ رشید جہاں: ف ۱۹۵۴ء	ڈاکٹر شاہدہ بانو: ۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء ("ڈاکٹر رشید جہاں، حیات اور کارنامے"، لکھنؤ ۱۹۹۰ء، ص ۹۷)
ص ۳۹۹ کرشن چندر: پ ۱۹۱۴ء	ڈاکٹر بیگ احساس، کرشن چندر کے مقالہ نگار کے مطابق ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء
ص ۴۰۱ راجندر سنگھ بیدی: پ ۱۹۱۰ء	ڈاکٹر عقیل و مالک رام: یکم ستمبر ۱۹۱۵ء
ص ۴۰۳ اپندر ناتھ اشک: پ ۱۹۰۸ء	خود اشک کے مطابق: ۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء
ص ۴۰۵ اختر اورینوی: ف ۱۹۷۵ء	مالک رام: ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء
ص ۴۰۶ عزیز احمد: پ ۱۸۹۴ء۔ ف ۱۹۸۱ء	مالک رام: پ ۱۹۱۴ء۔ ف ۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء (ص ۲۸۵)
ص ۴۰۹ جیلانی بانو: پ ۱۹۳۳ء یہی "دکن میں اردو" میں	مالک رام: ۱۴ جولائی ۱۹۳۶ء
ص ۴۱۰ ڈاکٹر قاضی عبدالستار: پ ۱۹۳۲ء	۹ فروری ۱۹۳۳ء ("علی گڑھ میگزین" ۱۹۹۰-۹۱ء، ص ۱۵۴)
ص ۴۱۲ قاری سرفراز حسین: ف ۱۸۵۶ء	مالک رام: ۲ جون ۱۹۳۱ء (تذکرہ...، ص ۲۷۱)
ص ۴۲۲ دلاور فگار: پ ۱۹۲۸ء	مالک رام: ۸ جولائی ۱۹۲۹ء
ص ۴۲۵ رشید احمد صدیقی: پ ۱۸۹۶ء	مالک رام: ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء

Scanned by CamScanner

ص ۴۲۶ وجاہت علی سندیلوی: پ ۱۹۱۶ء [سعادت علی صدیقی: یکم مارچ ۱۹۱۷ء ("ہماری زبان"، ۸ مارچ ۱۹۹۴ء)

ص ۴۳۷ احمد جمال پاشا: ف ۱۹۸۸ء [مالک رام: ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء (بحوالہ منصف، حیدر آباد، ۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء)

سنین کی بحث کے بعد متنِ کتاب کا جائزہ ختم ہو جاتا ہے۔ متن کے بعد آخر میں منتخب کتابیات ہے اور پھر اشاریہ۔ اشاریہ جامع نہیں۔ اس میں کتاب میں مذکورہ متعدد اشخاص اور کتابوں کے نام غائب ہیں، مثلاً میرا نام اور کتابیں۔ خود زیدی صاحب نے فون پر مجھ سے اشاریے کے تشنہ ہونے کا شکوہ کیا۔ کتاب کو دیکھ کر یہ مجموعی تاثر اُبھرتا ہے کہ صفحات کی تحدید کی وجہ سے مصنف پریشان ہے۔ وہ قدیم دور اور وسطی دور پر تو تفصیل سے لکھتا ہے، جدید دور میں آ کر محض نام شماری کو اپنا لیتا ہے۔ اسے محض ۳۵۰ صفحات لکھنے کو کہا گیا تھا، اس نے قدرے پھیل کر ۴۴۱ صفحے لکھ ڈالے۔ اختصار کے باوجود ضرورت تھی کہ اسے مزید سَو صفحے دیے جاتے۔ ساڑھے پانسو صفحوں میں اردو ادب کی سرسری تاریخ پیش کی جا سکتی تھی۔

جدید دور کی نثر کے بیان میں بطورِ خاص ناکافی اور تشنہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر انھیں چاہیے تھا کہ ۴۰۰ صفحوں کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کر کے ہر باب کے صفحوں کا تعین کر لیتے اور کسی بھی مصنف کو، خواہ وہ غالب ہوں کہ اقبال، پانچ صفحے سے زیادہ نہ دیتے۔ ادبی اعتبار سے غیر اہم مذہبی اور تاریخی کتابوں کے نام گنانے کی ضرورت نہ تھی۔

یہ تاریخ سنین کے بارے میں تشفی بخش نہیں۔ مانا کہ یہ تحقیقی تاریخ نہیں، لیکن جب وہ کتاب میں سنین دیتے ہی ہیں تو اُن پر ان کی صحت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اہلِ قلم کی تاریخوں میں اتنی وسیع اغلاط دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تحقیقی حزم و احتیاط سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ اس سے قطعِ نظر تنگیِ داماں کے باوصف مصنف نے جتنا مواد پیش کر دیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ ایک دوسرا پہلو جو یقیناً قابلِ ستائش ہے یہ ہے کہ تنقیدی قدر بندی میں انھوں نے کہیں عدمِ توازن کا ثبوت نہیں دیا، ہر جگہ سلیم الطبعی سے کام لیا ہے۔ وہ اردو میں ایک مفصل ادبی تاریخ لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں عُمر اور صحت کے زوال کے ہوتے وہ اسے تیار کر سکیں گے کہ نہیں؟ وہ سامنے آ جائے تو موجودہ کام کی ساری خامیوں کا تدارک ہو سکے گا۔

Scanned by CamScanner

حواشی

(۱) Winternitz: A History of Indian Literature, (Calcutta, 1927).

(۲) "قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی جائزہ" "اردونامہ"، کراچی، شمارہ۱۸، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء، ص۷۵

(۳) امیر حسن عابدی: "عہدِ ہمایوں و اکبر کی دو اردو غزلیں" رسالہ "تحریر"، ۱۹۶۸ء، شمارہ۲، ص۲۰۶

(۴) "دکن میں اردو"، ترقیِ اردو بیورو ایڈیشن، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص۲۵۶

(۵) "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو"، ص۲۴۳

(۶) ڈاکٹر اسما سعیدی: "دیوانِ حسرت عظیم آبادی"، دہلی، ۱۹۷۸ء، مقدمہ ص۱۹-۱۱۸

(۷) "تاریخِ ادبِ اردو" جلد اوّل، مرتبہ عبدالقیوم، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص۶۵۸

(۸) مالک رام: "مخطوطات، تلاش، قرأت، ترتیب" "آج کل"، اردو تحقیق نمبر، اگست ۱۹۶۷ء، ص۱۳- بازطباعت: "تحقیقی مضامین"، دہلی، ص۵۰-۲۴۹

(۹) ڈاکٹر سید حمید شطاری: "قرآنِ مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ۱۹۱۴ء تک"، حیدر آباد، ۱۹۸۲ء، ص۲۳۱

(۱۰) ڈاکٹر سمیع اللہ: "انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے"، ۱۹۸۸ء، ص۱۶۰

(۱۱) ایضاً

(۱۲) "علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے"، گورنمنٹ نیشنل کالج، کراچی، ۴۳-۱۹۷۳ء، ص۱۶۹- نیز سمیع اللہ: ص۳۰۹

(۱۳) "ہندوستانی اخبار نویسی: کمپنی کے عہد میں"، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص۷۵

(۱۴) ڈاکٹر نورالحسن نقوی: "سرسید اور ہندوستانی مسلمان"، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص۲۰-۲۱۹

(۱۵) اسلم فرخی: "محمد حسین آزاد"، کراچی، ۱۹۶۵ء، جلد دوم، ص۹۸-۹۴، نیز عابد پیشاوری: "ذوق اور محمد حسین آزاد"، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص۲۲-۱۲۰

Scanned by CamScanner

(۱۶) گیان چند: "آزاد کا دورِ جنوں" "قومی زبان"، کراچی، بابت مئی ۱۹۹۱ء، ص۲۹-۲۸

(۱۷) حامد حسن قادری: "داستانِ تاریخِ اردو"، ص۵۳۵، نیز: صالحہ عابد حسین: "یادگارِ حالی"، علی گڑھ، طبعِ سوم، ص۳۹

(۱۸) حامد حسن قادری: ص۳۵۱، نیز تاریخ ادبیات مسلمانان...، جلد۹، ص۲۰۹

(۱۹) محمد قمرالہدیٰ: "بلونت سنگھ ایک نظر میں" "آج کل"، جنوری ۱۹۹۵ء، بلونت سنگھ نمبر، ص۳- یہ شمارہ دسمبر ۱۹۹۴ء کے وسط میں آیا-

Scanned by CamScanner

ستائیسواں باب

سیّدہ جعفر، گیان چند جین: تاریخِ ادبِ اُردو، ۱۷۰۰ء تک

کوئی ۱۹۸۳ء کی بات ہو گی کہ حکومتِ ہند کے ترقّیِ اُردو بیورو، دہلی نے چار جلدوں میں اُردو ادب کی تاریخ لکھوانے کا منصوبہ بنایا۔ میں مرکزی حیدر آباد یونی ورسٹی میں پروفیسر تھا۔ پہلی جلد میرے ذمے کی گئی۔ میں ان دنوں اقبال کے کلام کو تاریخی ترتیب سے مرتب کر رہا تھا۔ میں نے بیورو کو لکھا کہ حیدر آباد میں رہنے کے یہ معنی نہیں کہ میں دکنیات کا ماہر ہوں، یہ کام میرے بجائے ڈاکٹر سیّدہ جعفر کے سپرد کر دیا جائے۔ بیورو نے مجھے لکھا کہ آپ سیّدہ جعفر کو اپنا اسسٹنٹ بنا کر یہ کام کر دیجیے۔ اس وقت سیّدہ جعفر ریڈر تھیں، پھر بھی میں نے ان کے مرتبے کی محقق کو اپنا نائب بنانا پسند نہیں کیا۔ بیورو کو لکھا کہ اگر سیّدہ جعفر کو میرے ساتھ شریک مصنف مقرر کر دیا جائے تو میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ بیورو نے منظوری دے دی۔ میں نے تاریخ کے ابواب کا خاکہ بنایا جس میں آدھا کام سیّدہ جعفر کے ذمے کیا، آدھا خود لیا۔ میں نے اوائلِ ۱۹۸۵ء میں اپنے حصے کا کام پورا کر کے بیورو کو بھیج دیا، سیّدہ جعفر نے مزید دو سال لگائے اور ۱۹۸۸ء میں اپنے اوراق میرے سپرد کیے میں نے بیورو سے اپنے لکھے ابواب واپس منگائے۔ نئی معلومات کی روشنی میں ان میں کہیں کہیں ترمیم کی، دونوں مصنفوں کے ابواب کو سمویا، مقدمہ لکھا جس پر ۱۴ اگست ۱۹۸۸ء کی تاریخ پڑی ہے اور پورا مسودہ بیورو کی شاخِ حیدر آباد میں دے دیا۔

بعد کی جلدیں جن علما کے ذمے کی گئی تھیں ان میں سے کسی نے کام نہیں کیا۔ بیورو نے مجھے لکھا کہ بقیہ جلدیں بھی میں لکھ دوں۔ میں تیار نہ ہوا۔ میں نے رائے دی کہ ہماری تصنیف کو تاریخ کی جلد اوّل کہنے کے بجائے آزاد اور مکمل کتاب کے طور پر شائع کر دیا جائے۔ بیورو نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس بیورو کا نام پہلے ترقّی اُردو بورڈ تھا، بعد میں ترقّیِ اُردو بیورو ہو گیا۔ اب تیسرا نام قومی کونسل برائے فروغِ اُردو ہے۔ اس کونسل نے یہ تاریخ ستمبر ۱۹۹۸ء میں پانچ جلدوں میں شائع کی یعنی آخری مسودہ داخل کرنے کے ۱۰ سال بعد۔

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر تنویر علوی نے اس کی ویٹنگ (Vetting) کی اور اس کے بعد ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بڑی محنت سے پروف ریڈنگ کی۔ سیدہ جعفر نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو مجھے خط کے ذریعے مطلع کیا کہ میرا (گیان چند کا) لکھا آخری باب "دکنی میں ہندی اُردو فارسی روایات کی آویزش و آمیزش" غائب ہے۔ ڈاکٹر سیدہ نے خود دفتر میں تلاش کیا، نہ ملا۔ آخر کتاب اس کے بغیر چھاپ دی گئی۔ ناشر کی اس لاپروائی پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ میں یکم جنوری ۱۹۹۸ء تک لکھنؤ میں تھا، اگر ناشر مجھ سے اس باب کی نقل مانگ لیتا تو میں فوراً فراہم کردیتا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی کتاب چھپنے کے بعد مجھے اطلاع دی، پہلے سے نہ کہا۔ اب میں نے اس باب کو ناشر کے پاس بھیجنے کا انتظام کردیا ہے تاکہ ضمیمے کے طور پر چھاپ دیا جائے۔

۱۷۰۰ء تک کی تاریخ ادب زیادہ سے زیادہ ایک ہزار صفحوں کی ہونی چاہیے۔ مطبوعہ تاریخ کُل ۲۳۳۶ صفحوں کو محیط ہے جن میں ۲۲۴۷ صفحے متن کے ہیں۔ میں نے متن کے ۶۰۳ صفحے لکھے ہیں، ڈاکٹر سیدہ جعفر ۱۶۴۴۔ یہ دیکھ کر میں نے مقدمے میں مزاحاً لکھ دیا۔

"ڈاکٹر سیدہ جعفر کے پیرے کی تفصیل و ضخامت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ تاریخ زیادہ تر اُن کی تصنیف ہے جس میں چند صفحات میں نے بھی لکھ دیے ہیں۔" (ص۱۱)

خود کو سینیر سمجھ کر میں نے مصنفین میں پہلے اپنا نام اور بعد میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کا نام لکھا تھا۔ کسی نے ترمیم کرکے سرورق پر پہلے سیدہ جعفر کا اور بعد میں میرا نام لکھا ہے۔ یہ میرے مندرجہ بالا مشاہدے کے مطابق ہے۔ یہاں میرا نام "پروفیسر گیان چند جین" لکھا ہے۔ میں کبھی اپنے نام سے پہلے پروفیسر نہیں لکھتا، اُردو کی حد تک جزو "جین" لکھنے سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ میں نے اپنی کتاب اُردو کی ادبی تاریخیں کئی سال پہلے اشاعت کے لیے دی تھی۔ اب میری اور سیدہ جعفر کی تاریخ بھی آگئی ہے۔ اپنی تاریخ پر تبصرہ کیونکر لکھوں۔ سیدہ جعفر کے ابواب پر اپنے مختصر مشاہدات پیش کروں گا، اپنی تحریر کا مختصر تعارف دوں گا، تبصرہ کوئی اور کرے گا۔

اس تاریخ کو تقریباً برابر ضخامت کی پانچ جلدوں میں تقسیم کیا ہے جس میں موضوع یا باب کا خیال نہیں رکھا۔ ساتویں باب کا نصف حصہ جلد دوم میں اور بقیہ نصف جلد سوم میں ہے۔ آٹھواں باب بھی جلد سوم اور چہارم میں بٹا ہوا ہے۔ ایک باب کو دو جلدوں میں نہیں توڑنا چاہیے تھا، بھلے ہی ایک جلد کی ضخامت کچھ بڑھ جاتی۔ ۲۳۳۶ صفحوں کے مواد کو پانچ جلدوں کے بجائے بخوبی چار جلدوں میں دیا جاسکتا تھا، جن کی ایک جلد ۶۰۰ صفحوں سے کم رہتی۔

Scanned by CamScanner

جلد کی ابتدا میں کونسل کے ڈائریکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب کا دو صفحوں کا دیباچہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ہر جلد کی ابتدا میں دیا گیا ہے حالانکہ پانچوں جلدیں مل کر ایک کتاب ہیں۔ دیباچہ یا مقدمہ کتاب کی ابتدا میں ہوتا ہے، بیچ بیچ میں نہیں۔ میں نے اصولاً اپنی کسی کتاب پر کسی سے مقدمہ نہیں لکھایا۔ ہندوستان اور پاکستان میں رواج ہے کہ سرکاری ادارے کوئی کتاب شائع کرتے ہیں تو اکثر ان کے اعلیٰ کارکن ایک رسمی مقدمہ لکھ دیتے ہیں۔ اپنی کتاب پر حمید اللہ بھٹ صاحب کے دیباچے کے تعلق سے مجھے دو مشاہدات پیش کرنے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ انبالے سے الہ آباد تک کے علاقے میں سب سے اہم پراکرت پالی کا فروغ ہوا۔ میرے رائے میں علاقے کا یہ قطعی تعین قدرے مخدوش ہے۔ پالی کہاں کی زبان تھی، اس کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ مغربی مستشرقین اسے مگدھ (بہار) کی زبان قرار دیتے ہیں جب کہ ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر بابورام سکسینہ اسے مدھیہ دیش کی کہتے ہیں۔ حمید اللہ بھٹ نے دوسری بات یہ کہی ہے کہ ۲۰۰۷ء تک کی تاریخ ادب اُردو پر تین اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُنھوں نے ان میں حامد حسن قادری کی داستانِ تاریخِ اُردو کو بھی شامل کیا ہے حالانکہ یہ دکن کی تاریخ نہیں، بعد کی نثر میں ادب کی تاریخ ہے۔ میں نے اپنے مقدمے میں ص ۱۰-۹ پر اپنے موضوع کی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے ان میں سے صرف چوتھی کتاب جمیل جالبی کی تاریخ کا نام لیا ہے۔ اُنھوں نے میرے اور سیّدہ جعفر کے لیے جو کلماتِ خیر کہے ہیں، میں ان کے لیے ممنون ہوں۔ فہرست کتاب میں صرف متعلقہ جلد کے مشمولات کی فہرست ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلی جلد میں اگر پانچوں جلدوں کی مکمل فہرستِ ابواب بھی دے دی جاتی تو کتاب کا پورا خاکہ ایک نظر میں سامنے آجاتا۔

میں نے مقدمے میں کراچی کے ڈاکٹر عبدالقیوم کی مرتبہ تاریخ جلد اوّل کے لیے لکھا ہے کہ یہ میری نظر سے نہیں گزری۔ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بعد میں، میں نے اسے حاصل کرکے اس کا تفصیلی جائزہ لیا اور زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا۔ مقدمے میں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض لفظوں کے ہجے بالکل ویسے نہیں جیسے میں نے لکھے تھے مثلاً میری تحریر کے رابرٹ کو روبرٹ اور علیحدہ کو علاحدہ لکھا ہے۔ شاید ویٹنگ کرنے والے صاحب نے کیا ہوگا۔

مقدمے میں ایک جملہ یوں ہے:

"خاکہ ۱۲ بابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں چھ چھ باب دونوں نے لیے۔" (ص ۱۱)

Scanned by CamScanner

اصل میں خاکہ ۱۳ بابوں کا تھا۔ اسے ۱۲ باب کا کر کے گم شدہ باب کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن دو صفحوں کے بعد لکھا ہے:

"... اصناف کے فنی پہلو اور ارتقا کو واضح کیا ہے اور آخر میں ہندی اور فارسی روایات کی آویزش و آمیزش پر نظر ڈالی ہے۔" (ص ۱۳)

"اصناف کا ارتقا" مطبوعہ آخری باب نمبر ۱۲ کا موضوع ہے جب کہ ہندی اور فارسی روایات کی آویزش گم شدہ باب نمبر ۱۳ کا موضوع تھا۔ دفتر میں اس باب کو ضائع کرنے کے بعد وَیٹنگ یا پروف ریڈنگ کرنے والے نے مقدمے میں ۱۳ بابوں کے بجائے ۱۲ باب کر دیا۔

پہلا باب "اُردو زبان کا آغاز و ارتقا" مسیر الکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۷۰۰ء تک کی تاریخ ادب ہی کو نہیں، پورے اُردو ادب کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ ۱۰۲ صفحوں پر پھیلا ہوا یہ باب بڑا جامع ہے۔ اس میں کہیں کہیں سہوِ کتابت در آئی ہے مثلاً ایک عنوان ہے "پراکرت دَور: مولودِ مسیح سے ۱۵۰۰ تک" (ص ۱۸)۔ ۱۵۰۰ء کے بجائے ۵۰۰ء چاہیے۔ ص ۴۴ پر مضموم کو مفہوم اور ص ۱۱۵ پر جلی عنوان میں مغنیات کو مصنیات لکھا ہے۔ دوسرا باب "دکن میں اُردو کا تاریخی و تہذیبی پس منظر" ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔ پس منظر دینے کا رواج ترقی پسند تنقید کے زیرِ اثر ہوا۔ اس کی معراج ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر، حیات اور شاعری" تھی جہاں کئی سو صفحوں میں آخری مغلوں کی تاریخ انڈیل دی گئی تھی۔ بعد میں یہ محسوس ہوا کہ یہ پس منظر بہت مختصر ہونا چاہیے جس میں صرف انھیں تاریخی اور سماجی عوامل کا بیان ہونا چاہیے جو براہِ راست متن کے مطالب پر اثر انداز ہوئے ہوں۔ متعدد عنوانات میں پس منظر کی ضرورت ہی نہیں۔ میں نے اُردو مثنوی پر اپنے مقالے میں پس منظر مختصر لکھا تھا۔ ایک ممتحن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے مقالے کو مسترد کرتے ہوئے اعتراض کیا کہ تاریخی پس منظر مختصر ہے۔ نتیجۃً نقشِ ثانی میں، میں نے اسے مفصّل لکھ دیا۔ مطبوعہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن نے اعتراض کیا کہ آج کل تحقیقی مقالوں میں تاریخی پس منظر اس طرح لازمی کر لیا گیا ہے جیسے غزل میں مطلع کے بعد حسنِ مطلع۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس باب کے لیے کتنے صفحات لیے ہیں؟ ۲۵۳۔ اس کے بعد کتاب میں ہر علاقے کے بیان سے پہلے بھی مختصراً اس کا سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر دیا ہے۔ یہ مانتا ہوں کہ سیدہ جعفر نے پس منظری باب بڑی محنت سے، بہت ماخذ دیکھ کر لکھا ہے۔ یہ معلوماتی بھی ہے، دلچسپ بھی۔ کیا خوب ہوتا کہ وہ ۲۵۳ صفحوں کی ایک علاحدہ کتاب شائع کر دیتیں اور موجودہ تاریخ میں صرف ۲۰ یا ۲۵ صفحوں کے پس منظر پر قناعت کر لیتیں۔

Scanned by CamScanner

۲۵۳ صفحوں کی ایک اور کتاب کا مصنف ہونا بُرا نہیں۔ اس باب کو لکھنے کے لیے ڈاکٹر سینڈہ جنز نے کیسے کیسے نادر مآخذ سے مدد لی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی اچھی مورخ ہیں۔ اس تحریر کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ کاش یہ ایک آزاد کتاب ہوتی۔

اُنھوں نے فیروز شاہ بہمنی کی ایک رباعی دریافت کر کے لکھی ہے جو تاحال اس کے دکنی کلام کا واحد نمونہ ہے (ص ۱۴۰)۔ سینڈہ نے تاریخ فرشتہ اور خافی خاں کی سند پر لکھا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ نے شاہی دفاتر میں سے فارسی کو ہٹا کر ہندوی کو رائج کر دیا۔ لکھتی ہیں کہ مراٹھی، تیلگو یا کنڑی کے لیے کبھی ہندوی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، یہاں ہندوی سے مراد دکھنی ہی ہے۔ (ص ۲۰۱)

میں اس غلط فہمی کی تصحیح بارہا کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے فرشتہ اور دوسروں کے بیانات کی روشنی میں طے کیا کہ فرشتہ نے ہندی یا ہندوی کا لفظ کسی بھی ہندوستانی زبان مثلاً سنسکرت تک کے لیے استعمال کیا ہے۔ ابراہیم کے دفاتر میں فارسی کے علاوہ مراٹھی اور بعض اوقات تیلگو کا بھی استعمال کیا گیا، اُردو کا کبھی نہیں۔ (۱)

صفحہ ۳۱۵ پر کوہ نور ہیرے کی تفصیل بہت دلچسپ ہے۔ میں عموماً سینڈہ جنز کے قابلِ تحسین بیانات کی نشان دہی نہ کر سکوں گا کیونکہ یہ تو ہر باب میں بہ کثرت بھرے پڑے ہیں۔ اگلا باب "شمالی ہند میں اُردو شاعری، ۱۶۰۰ء تک" میرا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس میں امیر خسرو کی مبینہ اُردو شاعری کا بہت تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ شمالی ہند کے اُردو فارسی شعرا کے ریختوں اور کھڑی بولی نما شاعری کا ذکر کر کے اُس دوسرے دھارے کے نمونوں کو بھی لیا ہے جو دیوناگری رسم الخط میں ہیں۔ ہندی کے شاعروں کو شامل کر کے شمالی ہند میں کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت تشکیل پا جاتی ہے۔

تاریخ کی مختلف جلدوں میں میری تحریر میں اغلاط کتابت کافی پائے جاتے ہیں مثلاً اس باب میں کبیر بجائے کبیر (ص ۳۷۲)، مدھیہ پردیش بجائے مدھیہ دیش (ص ۳۷۴) "۱۲۱۰ھ جو مطابق ہے ۵۶-۱۷۹۵ء کے"۔ اس فقرے میں ۵۶ کی جگہ ۹۶ چاہیے (ص ۴۰۵)، خسرو کا انتقال ۷۵ھ میں ہوا، بجائے ۷۲۵ھ کے (ص ۴۱۲)۔ ایک غلطی میری بھی ہے جس کا میں علی الاعلان اعتراف کرتا ہوں، جس پر میں جتنا بھی شرمسار ہوں کم ہے۔ ص ۳۹۹ کی پہلی سطر نیز ص ۴۰۷ کی پانچویں سطر میں "وطیرہ" لکھا ہے جس کے صحیح ہجے "وتیرہ" ہیں۔ مجھے غلطی سے وطیرہ معلوم تھا۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان میں ایک قابل نوجوان کالج لیکچرر رفیق احمد نقش نے میری ادبی تاریخوں کی کتاب کی پروف ریڈنگ کرتے وقت نشان دہی کی کہ صحیح املا "وتیرہ" ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے تاحال میں نے کسی دوسرے لفظ

Scanned by CamScanner

کے نیچے غلط نہیں لکھے۔ اُردو ادب کی زیرِ تبصرہ تاریخ میں، میں نے ہی "وطیرہ" لکھا ہوگا جسے ذیل میں کسی نے درست نہیں کیا۔

دوسری جلد کا چوتھا باب "دکن میں اُردو شاعری ۱۶۰۰ء تک" سیّدہ جعفر کا لکھا ہوا ہے۔ اُنھوں نے میثنہ رسالہ شاہ راجو کو لے کر اسے بجا طور پر رَد کیا ہے (ص ۳۲-۳۱)، لیکن یہ نثری تحریر ہے جو اس باب کے ذیل میں نہیں آتی۔ اس کی بحث کو میرے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھا، چنانچہ میں نے چھٹے باب میں اس کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے (ص ۸۱- ۲۷۹)۔ اسی طرح اُنھوں نے شاعری کے اس باب میں خواجہ بندہ نواز کے نثری رسالوں کا ذکر چھیڑا ہے (ص ۴۹)۔ میں نے اسی جلد میں چھٹے باب میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب جملہ رسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ یہاں اُنھوں نے خواجہ کی شاعری پر خوب لکھا ہے مثلاً خواجہ کے سُہیلا در مقامِ رام کلی کو برٹش میوزیم کے مخطوطے سے درست کر کے دیا ہے (ص ۵۸-۵۷) اُنھوں نے اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری حیدر آباد سے لے کر (جہاں اب آصفیہ کے مخطوطات منتقل کر دیے گئے ہیں) خواجہ بندہ نواز کی ایک رباعی درج کی ہے (ص ۶۰)۔ اس کا پہلا مصرع "مشہود بہ حیرت ہو مگر ہیچ ہے واللہ" رباعی کے وزن سے نکل کر ایک اور وزن میں پہنچ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس مصرع میں "مگر ہیچ" کی جگہ "کہ ہیچ" رہا ہو جس سے وزن اور معنی دونوں درست ہو جاتے ہیں۔

وہ ایک بار پھر نثر کی طرف ڈھلک کر رسالہ اکبر حسینی پر لکھتی ہیں (ص ۶۶-۶۵) میں نے اسی جلد میں ص ۲۲۳-۳۲۲ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ فیروز شاہ بہمنی کی ستائش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "فیروز شاہ صوم و صلوٰۃ اور مذہبی اصولوں پر سختی سے عمل پیرا تھا۔" (ص ۷۲)

لیکن اگلے ہی صفحے پر ایک انگریزی تاریخ کے حوالے سے لکھتی ہیں "فیروز شاہ کے حرم میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی آٹھ سو بیگمات موجود تھیں" (ص ۷۳)۔ ۸۰۰ بیگمات رکھنے والے کو کم از کم میں مذہبی آدمی قرار نہیں دے سکتا۔ وہ ہر بیگم کے ساتھ دو سال سے بھی زیادہ میں شب گزاری کرتا ہوگا۔ یہ اُن پر ظلم ہے۔ سیّدہ جعفر فیروز شاہ کے تخلص کے سلسلے میں لکھتی ہیں:

> "اکثر دکنی شعرا کا تخلص یائے مجہول پر ختم ہوتا ہے جیسے وجہی، نصرتی، غواصی، ابنِ نشاطی اور ہاشمی وغیرہ۔" (ص ۷۹)

بڑے عالم بھی غائب ذہنی میں کیا کیا سہو کر جاتے ہیں۔ سیّدہ یائے معروف کو مجہول

لکھ گئیں۔ اُنھوں نے کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف نظامی کی شخصیت اور زمانے پر بہت اچھی بحث کی ہے (ص ۸۸۔ ۸۵) اس سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے فیصلوں کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ہندی کی بعض نادر کتابوں سے استفادہ کیا ہے، کم از کم وہ اُردو والوں کے لیے ندرت رکھتی ہیں مثلاً مہاپنڈت راہول سانکرتیاین کی "دکنی ہندی کی کاویہ دھارا" (۱۹۵۹ء) اور وی پی محمد کنج میتر کی "ہندی کا سروت نیا چنتن" (۱۹۸۶ء) میں ان کتابوں کے وجود سے بھی واقف نہ تھا۔ وہ کنج میتر کی کتاب سے یہ بیش بہا اطلاع فراہم کرتی ہیں۔

"کدم راؤ میں استعمال ہونے والے بارہ ہزار الفاظ میں سے دس ہزار الفاظ سنسکرت اصل کے ہیں اور عربی و فارسی لغات کی تعداد لگ بھگ دو سو ہے۔" (ص ۹۳)

اُنھوں نے ص ۹۸۔ ۹۷ پر عبداللہ حسینی کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ شاعر نہیں تھے، انھیں محض نثر نگار کہا جاتا ہے، اس لیے سیدہ جعفر کو اس باب میں ان پر لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے ص ۳۲۴ پر ان کے بارے میں لکھا ہے۔ سیدہ جعفر اور میں دونوں نے لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے کے فہرست نگار اسٹیوارٹ کے مطابق عبداللہ حسینی نے "نشاط العشق" کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ اس کا ذکر میں اپنے باب کے سلسلے میں کروں گا۔

میراں جی شمس العشاق کی ایک مثنوی کے نام کے سلسلے میں یہ شعر درج کرتی ہیں:

اس نام ہے تحقیق
سن شہادۃ التحقیق

(ص ۱۰۴)

سچ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے "قدیم اُردو" کے اپنے مضمون میں اور سروری صاحب نے علی گڑھ تاریخِ ادب میں مصرعِ ثانی میں نام "شہادۃ التحقیق" ہی لکھا ہے اس لیے اسی کو تسلیم کرنا چاہیے خواہ حقیق کہنا صحیح نہ ہو۔ سیدہ ایک بار پھر بہمنی سلطنت میں اُردو کے دفتری زبان بننے کا ذکر کرتی ہیں (ص ۱۲۷)۔ اس کی تردید میں پیچھے مصطفٰے کمال کے حوالے سے کر چکا ہوں۔ سیدہ جعفر نے ہندی کے ڈاکٹر سری رام شرما کے حوالے سے فیروز مصنف پرت نامہ کی ایک نایاب شعری تخلیق یوسف نامہ کی خبر دی ہے (ص ۱۳۷)۔ ظاہرا یہ اب معدوم ہے۔ اُردو میں اس کا ذکر اور کہیں نہیں ملتا۔ وہ شاہ برہان الدین جانم کے سنہ ولادت و وفات کے سلسلے میں متعدد لوگوں کے بیانات نقل کرتی ہیں (ص ۱۶۵۔ ۱۶۸)

Scanned by CamScanner

لیکن معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر حسینی شاہد کا نام نہیں لیتیں جنھوں نے شاہ امین پر اپنی کتاب میں اس موضوع پر لکھا ہے اور کم ازکم سنہ وفات شافی طریقے پر متعین کیا ہے، دیکھیے اسی جلد میں میری تحریر ص ۳۵۶-۵۷)

وہ شاہ جانم کی متعدد مختصر مثنویوں کی نشان دہی کرتی ہیں مثلاً "کفر نامہ"، "مسافرت حال سیاں و بیان خلاصہ" (کذا) نعت خانم یا توحید حقیقت، عبرت ادم، ہنج گنج (ص ۸۳-۱۸۱)- ہنج گنج کی صحت انتساب کے بارے میں انھیں شک ہے۔ دراصل دکنی نثر و نظم میں اصل و الحاق کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ میں نے مولوی عبدالحق کی مشہور ۱۰۶۸ھ کی ضخیم بیاض کا عکس دیکھا ہے۔ اس میں معلوم نہیں کتنی مختصر نظمیں شمس العشاق کے نام سے دی ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ میں انجمن ترقی اُردو ہند میں جانم کی نظموں کی تفصیل دی ہے۔ دکنی مخطوطوں میں بالخصوص صوفیوں کی نظم و نثر میں مصنف کے طور پر جو نام دیا ہو اس پر آنکھ موند کر بھروسا نہیں کرلینا چاہیے۔ اس کی زبان کو آنک کر ہی کچھ فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر کامل وثوق نہ ہو تو قطعی دعوے سے بچنا چاہیے۔

اُنھوں نے جانم کے نثری رسالوں کا بیان چار صفحوں میں کیا ہے (ص ۹۵-۱۹۲) وہ بھول جاتی ہیں کہ خاکے کے اعتبار سے یہ میری جائداد ہے۔ میں نے اسی جلد میں ص ۳۵۶ تا ۳۷۴ پر بالاستیعاب لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ اُنھوں نے شاہ امین الدین علی اعلیٰ کی شاعری پر کسی جلد میں نہیں لکھا۔

پانچواں باب "گجرات میں اُردو شاعری ۱۶۰۰ء تک" میں نے لکھا ہے۔ اس میں وہاں کے مشہور چار صوفی شعرا سے پہلے شیخ احمد کھٹو پر لکھا ہے جس کے لیے ہندی سے بھی کچھ مواد ملا۔ چھٹا باب اُردو نثر ۱۶۰۰ء تک بھی میرا لکھا ہوا ہے۔ اس کے شروع میں صوفیوں کے ملفوظات تفصیل سے دیے ہیں۔ اس میں ص ۲۴۴-۴۵ پر مادرِ موموناں اور بابا شکر گنج کے ایک مکالمے کا ذکر کیا ہے۔ لوّل الدٰ کرے کہا "خوجو بربان الدین بالا ہے" یہاں بالا کے معنی بالک ہیں۔ شیخ نے جواب دیا۔ "پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔" صاحب سیر الاولیا نے اس جملے میں بالا کی یہ تاویل کی ہے کہ چودھویں رات کو اولِ شب میں چاند چھوٹا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے اتفاق نہ کرتے ہوئے ایک بے تکی بات کہہ دی کہ شاید خواجہ سہواً پونوں کا چاند بول گئے ہیں، ان کا عندیہ دوج کا چاند کہنے کا ہوگا (ص ۲۴۵)۔ اب میں اپنی تاویل میں ترمیم کرکے کہتا ہوں کہ خواجہ نے بالا کا لفظ "بلند" کے معنی میں استعمال کیا ہے، اسی طرح لفظ بالا میں ایہام سے کام لیا ہے۔

ص ۲۷۶ پر سہوِ قرأت سے نظام شدہ کو بہت جلی عنوان کے طور پر لکھا ہے حالانکہ یہ

Scanned by CamScanner

دکھانا تھا کہ رسالہ جنونیہ میں شدہ کو اس طرح لکھا ہے کہ اسے ۵۰۰ پڑھا جاسکتا ہے۔ میں نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب ایک ایک نثری رسالے کو لے کر ان کے انتساب کو شافی طریقے پر رد کیا ہے۔ (ص ۲۸۱ تا ۳۲۱) سید عبداللہ حسینی کے ترجمہ "نشاط العشق" کے سلسلے میں، میں نے شمس اللہ قادری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسٹیوارٹ کے مطابق عبداللہ حسینی نے "نشاط العشق" کا دکنی میں ترجمہ کیا اور شرح بھی لکھی اور یہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود ہیں (ص ۳۲۴)۔ اس وقت اسٹیوارٹ کی فہرست میرے سامنے نہیں تھی۔ بعد میں عثمانیہ یونی ورسٹی لائبریری میں فہرست دیکھی تو پایا کہ اسٹیوارٹ نے ایک کتاب "نشاط العشق"، "شرحِ غوثیہ" کی موجودگی کی خبر دی ہے لیکن اس کے مصنف یا مترجم کا نام نہیں دیا۔ معلوم نہیں بعد والوں نے اس کے ساتھ عبداللہ حسینی کا نام کیوں چپکا دیا۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کی سوانح پر میں نے تفصیل سے بحث کی ہے اور جانم کے مرثیے کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت میراں جی کا وصال ۲۵ شوال ۹۹۴ھ کو ہوا (ص ۴۹-۳۲۶) ان سے کسی نثری تصنیف کے انتساب کی تردید کی ہے۔

ساتواں باب "بیجاپور اور بیدر میں اُردو شاعری سترھویں صدی میں" ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔ اس کا کچھ حصہ جلد دوم میں ہے، کچھ جلد سوم میں۔ قریشی بیدری کے زمانے کی بحث عالمانہ ہے (ص ۲۵-۴۲۴) اسی طرح مقیم اور مقیمی کی بحث بھی بہت خوب ہے (ص ۳۶-۴۳۴) ڈاکٹر غلام عمر خاں نے عاجز کی لیلیٰ مجنوں کی تدوین کی تھی۔ سیدہ جعفر نے اس پر سخت تنقید کی ہے کہ وہ عاجز کے حالاتِ زندگی کے متعدد حقائق سے ناواقف ہیں۔ آگے لکھتی ہیں:

> "مقدمہ لیلیٰ مجنوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق میں عدم توجہی، محدود مطالعے اور داخلی شہادتوں سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے کس طرح حقائق مسخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔" (ص ۴۷۰)

اس باب کا بقیہ حصہ جلد سوم میں ہے۔ سہوِ کتابت کی مثال دیکھیے۔ ص ۱۷ پر دوسرے پیراگراف میں ناری نامہ کو "فارسی نامہ" لکھا ہے۔ اس جلد میں پہلی جلدوں کے برخلاف ہر شاعر اور نثر نگار کو نئے صفحے سے شروع کیا ہے جو باب کے درمیان میں مناسب نہیں۔ ڈاکٹر سیدہ نے ص ۸۹-۸۸ پر نصرتی کی مثنوی گلشنِ عشق سے قدرتی اور سماجی اشیا کی تفصیلات کی فہرستیں اچھی تیار کی ہیں۔ شمس اللہ قادری نے نصرتی کی ایک مثنوی "گلدستۂ عشق" کا بھی ذکر کیا ہے جو ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں موجود تھی۔ سیدہ لکھتی ہیں کہ چارلس اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی فہرست میں نصرتی کے دو شعری

Scanned by CamScanner

کارناموں کا ذکر کیا ہے جو "گلشنِ عشق" اور "گلدستۂ عشق" ہیں(ص ۱۲۶) یہ نادر فہرست عثمانیہ یونی ورسٹی لائبریری میں موجود ہے جہاں میں نے اسے دیکھا۔ اگر سیدہ جعفر دیکھ لیتیں تو کئی غلط فہمیوں سے محفوظ رہتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فہرست کے مطابق وہاں نصرتی کی دو مثنویاں علی نامہ اور گلشنِ عشق تھیں۔ گلشنِ عشق کے ساتھ عشقیہ نظموں کی ایک کتاب "گلدستۂ عشق" مجلد تھی۔ اسٹیوارٹ نے یہ نہیں لکھا کہ یہ بھی نصرتی کی تصنیف تھی۔ دوسروں نے اسے نصرتی کی غزلیات کا مجموعہ کہہ دیا۔ اب اس کتاب کا کہیں پتا نہیں۔

سیدہ جعفر معظم بیجاپوری کے سلسلے میں دکنی نظم کی کئی نئی ہستیوں کی خبر دیتی ہیں۔ ان میں ایک صنف "بھاڑا" میرے لیے نئی ہے(ص ۱۴۷)۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُنھوں نے کہیں اس کے معنی منعہ لکھے ہیں۔ ہاشمی بیجاپوری کے لیے ان کا یہ مشاہدہ صحیح ہے کہ اس کے کلام میں ملبوسات اور رنگوں کی مناسبت سے یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ مادر زاد اندھا نہیں تھا بلکہ بعد میں چیچک سے اس کی بصارت زائل ہوئی۔(ص ۱۷۸) ایک شعر کا مصرع دو نسخوں سے یوں لکھا ہے:

کہا احسن القصص جس کوں خدا (ص ۱۸۹)

کہا احسن القصہ جس کوں خدا (ص ۱۹۰)

پہلا مصرع غیر موزوں ہے، دوسرا موزوں، اس وزن میں احسن القصص نہیں آسکتا حالانکہ ترکیب یہی صحیح ہے۔ وہ ہاشمی کے اس مرثیے کو:

سن ہاشمی یو مرثیہ پُرسوز گاتے تے عجب
انگشتِ حیرت مکھ منے لیوے اپس کے انوری

انوری کے مشہور مرثیے ع:

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری

کی زمین میں قرار دیتی ہیں(ص ۹۳-۱۹۲)

فرہنگ آصفیہ کے مطابق شعر کی زمین کا تعین ردیف، قافیہ اور وزن تینوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ ہاشمی کے مرثیے اور انوری کے قصیدے کا وزن مختلف ہے اس لیے دونوں کی زمین کو یکساں نہیں کہا جاسکتا۔

آٹھواں باب "گولکنڈے میں اُردو شاعری سترھویں صدی میں" بھی ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تصنیف ہے۔ یہ باب تیسری اور چوتھی دونوں جلدوں میں ہے۔ اس میں احمد فریف مصنفِ یوسف زلیخا کے سلسلے میں محمود شیرانی کا قول نقل کرتی ہیں:

Scanned by CamScanner

"وہ اپنے مذہب سے بھی جو شیعہ تھا بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے۔"

سیدہ جعفر خود شیعہ ہیں لیکن مذہبی جنبہ داری پر ادبی صداقت کو ترجیح دیتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ احمد شریف شیعہ نہیں تھا۔ (ص ۲۵۱)

سخاوت مرزا نے غواصی کا نام شیخ حسین بہاء الدین تحریر کیا تھا۔ ایک مضمون نگار جمال شریف نے اس کی تردید کی۔ سیدہ جعفر نے عثمانیہ یونی ورسٹی میں غواصی کا کتابت کیا ہوا ایک عربی مخطوطہ دریافت کیا جس کے ترقیمے میں اس نے اپنا نام "شیخ حسین بہاءالدین الملقب بغواصی" لکھا ہے۔ اس سے شاعر کا نام بھی طے ہوجاتا ہے اور یہ کہ اس نے اپنے لقب کو تخلص بنالیا۔ (ص ۸۷-۳۸۶)

غواصی نے مثنوی طوطی نامہ کی کہانیوں میں عورتوں کے مکروفریب کو شدت سے بیان کیا ہے۔ سیدہ جعفر نے انھیں تلاش کر کے کہا کہ یہ اس عہد کے مردوں کی فکرو نظر کے ترجمان ہیں (ص ۴۱۰)۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا کہنا تھا کہ محمد قلی سے منسوب مشہور غزل۔ ع "پیا باج پیالہ پیا جائے نا" دراصل غواصی کی ہے کیونکہ یہ دیوانِ غواصی میں شامل ہے، کلیاتِ قلی قطب شاہ میں نہیں۔ سیدہ جعفر نے خبر دی کہ آصفیہ لائبریری میں کلیاتِ قلی کا ایک قدیم، نادر اور مکمل نسخہ تھا جسے نظام میر عثمان علی خاں نے اپنے ذاتی کتب خانے کے لیے منگوالیا۔ اب اس نسخے کا پتا نہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں اس نسخے سے لے کر یہ پوری غزل درج کی تھی، اس لیے یہ محمد قلی ہی کی ہے۔ (ص ۱۴-۴۱۳)

وہ تحفۃ النصائح کے شاعر قطب کا تخلص زاری لکھتی ہیں بجائے رازی کے (ص ۴۵۳) یہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تقلید ہے جنھوں نے اسے زاری لکھنے پر اصرار کیا ہے (تاریخ جلد اول ص ۴۸۶)۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں۔ آصفیہ لائبریری میں تحفۃ النصائح کے سات نسخے ہیں۔ بیشتر میں اس کا تخلص رازی ہی لکھا ہے۔ دو ایک میں تحریف سے "راضی" درج ہے جس سے طے ہوجاتا ہے کہ رازی ہی صحیح ہے۔ یائے معروف والے تخلصوں کو اکثر کسی مکمل لفظ میں تحتانی کے اضافے سے تشکیل دیا جاتا ہے۔ زاری پر یائے معروف کا اضافہ قرینِ قیاس نہیں۔ زاری خود ایک مکمل لفظ ہے۔

اب آئیے جلد چہارم پر سیدہ جعفر نے احمد جنیدی کی مثنوی ماہ پیکر مرتب کی ہے۔ ایک قدیم مضمون نگار نے مثنوی میں خلفائے راشدین کی مدح دیکھ کر طے کیا کہ احمد سنی تھا۔ ہر شخص آنکھ موند کر یہی فیصلہ کرے گا۔ سیدہ جعفر نے اس شعر کی طرف توجہ دلائی:

الٰہی بحرمتِ شمس العارفین
کہ ہادیِ موحّد ہے دنیا و دین

Scanned by CamScanner

ان کے بقول شمس العارفین "حضرت سیّد محمد جونپوری مہدی موعود کا لقب تھا۔ جنیدی کے شجرۂ نسب میں کئی ائمہ کے نام آتے ہیں جس سے سیّدہ جعفر نے نتیجہ نکالا کہ احمد جنیدی مہدوی تھا (ص ۱۷-۱۶) اس شجرے میں مہدوی بزرگ سیّد خوند میر کا بھی نام آتا ہے۔ سیّدہ جعفر مثنوی "ماہ پیکر" سے سازوسامان کی جو فہرست دیتی ہیں اس میں پلنگ کے ساتھ صوفے بھی لکھتی ہیں (ص ۴۹)۔ کیا اس زمانے میں صوفے بھی ہوتے تھے؟

مختلف جلدوں میں سیّدہ جعفر خود کو بار بار راقمہ الحروف کہتی ہیں مثلاً ص ۱۲۱ پر۔ میں نے اپنی کتاب "تحقیق کا فن" میں زور دیا ہے کہ تحقیق کا لہجہ غیر شخصی نہیں، شخصی ہونا چاہیے۔ راقم الحروف کتنا مصنوعی معلوم ہوتا ہے (ہندوستانی ایڈیشن ص ۴۰۷)۔ اس کے آگے اُردو کے بڑے بڑے محققین کے یہاں سے ضمیر متکلم کے استعمال کی مثالیں دی ہیں۔ سیّدہ نے ابوالحسن تاناشاہ کو ۱۳ صفحے دیے ہیں۔ اس کا محض ایک آدھ شعر اور ایک آدھ مشکوک غزل ملتی ہے۔ اس پر ۱۳ صفحے اسراف ہیں۔

نواں باب "گجرات میں اُردو شاعری سترھویں صدی میں" بھی سیّدہ جعفر کی تحریر ہے۔ ص ۲۰۹ پر ایک عنوان ہے "شاہ ہاشم اور سیّد شاہ ہاشم حسینی" اس عنوان کے تحت ہاشمی بیجاپوری کے پیر سیّد ہاشم حسینی ہے جس کے تحت ان کا مفصّل ذکر ہے، ص ۲۰۹ کے عنوان میں ان کا نام غیر ضروری تھا۔ انھیں عام طور سے سیّد ہاشم علوی کہا جاتا ہے۔ سیّدہ جعفر نے ان کے بیان کے آخری صفحات پر حسینی اور علوی کی بحث کی ہے جو ابتدائے مضمون میں آنی چاہیے تھی۔ ص ۲۲۳ پر عنوان ہے "سید محمود اور سیّد محمد علی عاجز"۔ اس شاعر کے نام اور اس کی مثنوی قصۂ فیروزشاہ یا قصۂ ملکۂ مصر کے ناموں میں اتنا الجھاؤ ہے کہ سیّدہ جعفر کی مفصّل تحریر پڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ وہ خود اس مسئلے کو کافی الجھا ہوا مانتی ہیں (ص ۲۲۹)۔

دسواں باب "اُردو نثر سترھویں صدی میں" سیّدہ جعفر کا لکھا ہوا ہے لیکن اس میں ملّا وجہی، سب رس اور داستانِ امیر حمزہ کے دو دکنی نسخوں پر میں نے لکھا ہے۔ سیّدہ جعفر نے شاہ امین الدین علی اعلیٰ پر ۱۹ صفحے لکھے ہیں۔ یہیں مختصراً ان کی شعری کاوشوں کا بھی ذکر کردیا ہے حالانکہ بطور شاعر ان پر بیشتر لکھنا چاہیے تھا۔ اس باب کے آخری تین نثر نگاروں، شاہ برہان الدین رازِ الٰہی، شاہ نور محمد قادری اور محمد شریف پر محض آدھا یا چوتھائی صفحہ ہی لکھا ہے۔ نوردریا اور نوبطون کے مصنف شاہ نور محمد قادری اہم مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف کئی صفحوں کا مطالبہ کرتی ہیں۔ حیرت ہے کہ سیّدہ جعفر کی "دریادلی" ان کے باب میں کیوں شبنم بن کر رہ گئی۔

Scanned by CamScanner

گیارھواں باب "شمالی ہند میں اُردو شاعری سترھویں صدی میں" میرا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس میں بکٹ کہانی کے افضل کی شخصیت کے بارے میں مختلف بیانوں کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بکٹ کہانی کا مصنف افضل، "تذکرہ ریاض الشعرا" کے افضل سے مختلف شخص ہے نیز صاحب بکٹ کہانی کوئی ہندو مسمی گوپال ہے جس کا تخلص افضل تھا۔ اس باب میں ص ۳۴ سے ۳۸ تک چار شاعروں کے تخلص کو جلی عنوان کے طور پر سطر کے شروع میں عام کتابت کی خفی تحریر میں درج کیا ہے جس سے وہ عنوان معلوم ہی نہیں ہوتا۔ فقہ ہندی کے شاعر عبداللہ انصاری جیسے اہم شاعر کو بھی یہی خفی قلم نصیب ہوا ہے حالانکہ اس کا بیان سوا چھ صفحوں پر ہے۔ اس کے مقابلے میں اگلے شاعر شیخ محبوب عالم کو سطر کے بیچ میں جلی عنوان سے درج کیا ہے (ص ۴۵)۔ ص ۵۲ پر شیخ فیض اللہ مصنف قصۂ جمجمہ کے بارے میں، میں نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ صمد صاحب کے ذخیرے کا اس نظم کا واحد مخطوطہ میرے گھر سے کسی محقق شاگرد نے اڑا لیا۔ اب مجھے پس نوشت کے طور پر یہ کہنا ہے کہ میرے شور مچانے پر سعادت مند شاگرد نے یہ نسخہ اس کے مالک صمد خاں کی الماری میں خاموشی سے رکھ دیا۔

بارھواں باب "قدیم اُردو کی اہم ادبی اصناف و موضوعات" زیادہ تر میرا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس میں دکنی اصناف کی فنی خصوصیات اور ادبی ارتقا کو بیان کیا ہے۔ پانچ اہم اصناف: مثنوی، غزل، مرثیہ اور رباعی پر ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ میں نے بہت زیادہ اصناف پر لکھا ہے لیکن صفحات سیدہ جعفر نے زیادہ لیے ہیں یعنی ۲۱۲۔ ص ۱۰۴ پر میں نے ایک نثری صنف کا نام ملفوظہ لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صوفیوں کے قول کو ملفوظ کہتے ہیں یا ملفوظہ؟ انجمن ترقیِ اُردو پاکستان میں ایک نوجوان ذہین لیکچرر نے پروف ریڈنگ کرتے وقت مجھ سے اصرار کیا کہ اسے ملفوظ کہتے ہیں۔ عربی اور صوفیا کے عالم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی مجھے لاہور میں ملے۔ میں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے یہی کہا کہ "ملفوظات" کا واحد ملفوظ ہے۔ میں نے اس اصطلاح کا نام ملفوظہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند میں ڈاکٹر الف۔د۔ نسیم کی تحریر کے عنوان سے لیا تھا (چھٹی جلد ص ۱۱۷) میری رائے ہے کہ نثر کی ایک صنف یا موضوع کے طور پر اسے ملفوظ کے بجائے ملفوظہ ہی کہا جائے۔ اس طرح اس کی مشابہت قصیدہ، مرثیہ، رزمیہ (ایپک) نامہ والی شعری اصناف (معراج نامہ، نور نامہ، وغیرہ) اور رسالہ، مقالہ، افسانہ، انشائیہ، خاکہ جیسی شعری اصناف یا انواع سے ہو جائے گی۔

امید کرتا ہوں کہ میرا گمشدہ تیرھواں باب، جو ایک طرح سے مجموعی خاتمہ بھی ہے،

Scanned by CamScanner

ضمیمے کے طور پر چھاپ دیا جائے گا۔ جلد کے آخر میں کتابیات بہت تفصیل سے ہے یعنی ۳۵ صفحوں پر۔ اس کی کئی فصلوں پر قوسین میں سیدہ جعفر کا نام لکھا ہے۔ میں نے اپنی کتابیات علاحدہ سے بنا کر بھیجی تھی۔ سیدہ جعفر کی کتابیات الگ تھی۔ معلوم نہیں موجودہ کتابیات دونوں کو مدغم کر کے بنائی گئی ہے یا اس میں صرف سیدہ جعفر کی کتابیں ہیں؟

اتنی تحقیقی کتاب میں اشاریہ نہیں۔ اشاریہ بنانا ناشر کی ذمے داری ہوتا ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ کتاب ایک سے زیادہ مصنفوں کی تحریر ہو۔ میں نے ترقیِ اُردو بیورو کو کئی بار لکھا، انھیں یہ بھی پیش کش کی کہ اگر میری تحریر کی کاپیاں یا مطبوعہ پروف مجھے بھیج دیے جائیں تو میں اپنے حصے کا اشاریہ بنا دوں گا لیکن بیورو کے سابق انتظامیہ کے تحت تو خطوں کا جواب بھی نہ دیا جاتا تھا، اشاریہ تو کیا بنتا۔ کوئی تجارتی نجی ناشر اس کھکیڑ میں پڑنے کو تیار نہ ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن ایک بڑا علمی ادارہ اس سے پہلو تہی کرے تو یہ ایک بڑی کمی ہے۔ میری کتاب "اردو کی نثری داستانیں" طبع دوم پر انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان نے جیسا مفصل اشاریہ تیار کر کے لگایا ہے وہ قابلِ تعریف و تقلید ہے۔

اس تاریخ کی جلدوں میں سیدہ جعفر نے جو کچھ لکھا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ انھیں پس منظر بہت مختصر لکھنا چاہیے تھا۔ مصنفوں اور ان کی کتابوں پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کہیں غیر متعلق نہیں۔ اسے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن انھوں نے بعض شعرا پر جو بہت پھیلا کر لکھا ہے مثلاً نصرتی ۶۹ صفحے، قلی قطب شاہ ۵۸ صفحے، غواصی ۳۸ صفحے، ہاشمی ۳۲ صفحے یہ ایک تاریخ کے لیے بڑا بار ہے۔ لکھنے کو تو ایک شاعر یا ادیب پر کئی سو صفحوں کی کتاب لکھی جاتی ہے لیکن پورے ادب کی تاریخ لکھتے وقت ہاتھ روک کر ضبط کے ساتھ لکھنا ہوتا ہے۔ اس سے قطعِ نظر میں یہ اعتراف کروں گا کہ انھوں نے غیر معمولی محنت کی ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں اپنی کج مج نگارش کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ اس کا فیصلہ دوسرے کریں گے۔ اس کے باوصف میں یہ کہنے کی جرات کروں گا کہ نقشِ آخر ہونے کی وجہ سے اب تک کی دکنی ادب کی تاریخوں میں یہ بہترین ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیش رووں کی بیش بہا تحقیقات سے پورا استفادہ کیا ہے۔

حاشیہ

(۱) ڈاکٹر مصطفےٰ کمال: حیدر آباد میں اُردو کی ترقی تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے (حیدر آباد ۱۹۹۰ء) ص ۳۶-۳۰

Scanned by CamScanner

اٹھائیسواں باب

چند کم اہم ادبی تاریخیں

گزشتہ اوراق میں اردو کی تمام اہم، بلکہ نسبتاً کم اہم تاریخوں کا جائزہ لیا گیا ہے، لیکن تاریخوں کی ایک قسم اور ہے جو زیادہ تر نصابی ضرورت کے تحت طالب علموں کے لیے لکھی گئی۔ یہ مسلم کہ گزشتہ ابواب کی ڈاکٹر انصاراللہ کی "تاریخِ اقلیمِ ادب" اور ڈاکٹر اعجاز حسین و محمد عقیل رضوی کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" بھی صریحاً طلبہ کے مطالعے کے لیے لکھی گئیں، لیکن انصاراللہ نے اپنی کتاب میں تحقیقی بحثیں بھی کی ہیں اور ڈاکٹر عقیل نے اعجاز صاحب کی تاریخ میں اضافے کر کے اسے اتنا جامع بنا دیا ہے کہ اب انھیں محض طلبہ کی ضرورت تک محدود نہیں سمجھا جا سکتا۔ محمود اکبر آبادی نے "صحیفۂ تاریخِ اردو" کے دیباچے میں کہا تھا:

> عہدِ حاضر کی بہت تصنیفیں اور تالیفیں، خصوصیت سے وہ جو نصابِ تعلیم میں داخل کرنے یا دوسرے لفظوں میں روپیہ کمانے کے مقصد سے مرتب کی جاتی ہے، عموماً قینچی اور لئی کا متحدہ کارنامہ ہوتی ہے۔ (کذا، صحیح: ہیں) قطع برید، ردوبدل، پیوند کاری، ملمع سازی، ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔

کسی کتاب کا طلبہ کے لیے لکھا جانا کوئی عیب نہیں، کیونکہ فی زمانہ ادبی تحقیق کا زیادہ تر کام درس گاہوں میں ہو رہا ہے اور تحقیقی کتاب کے قارئین زیادہ تر اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ، ریسرچ اسکالر اور اساتذہ ہی ہوتے ہیں، لیکن نصابی تاریخ کو اس پہلو سے بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا اس کا مصنف تحقیق و تاریخِ ادب میں کوئی مقام رکھتا ہے؟ اگر نہیں، تو اس کے کام کو قینچی اور لئی کی دین ہی سمجھنا ہوگا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس باب میں ذکر کیے جانے والی تاریخیں بالکل ناکارہ ہیں، لیکن ان میں ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا، تنقیدی تفہیم میں، رالف رسل کی تاریخ کے استثنا کے ساتھ، کوئی معتد بہ اضافہ نہیں کیا گیا۔ ان کے مرتبوں نے چند پیش رَو تاریخوں کو سامنے رکھ کر ان کا خلاصہ کر لیا۔ چونکہ کسی قسم کی تحقیق، تقابلی مطالعے، اصل ماخذ کی ورق گردانی وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھا گیا اس لیے ان میں سنین کی

Scanned by CamScanner

اور واقعات کی غلط بیانیاں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ ان تاریخوں کا مفصل جائزہ لینا اپنے اور قارئین کے وقت کا بہترین استعمال نہیں، اس لیے ان کے مختصر ترین تعارف پر اکتفا کی جائے گی۔ ایسی تاریخیں یہ ہیں:

آغا محمد باقر	"تاریخِ نظم و نثر اردو"	امرتسر ۱۹۳۳ء
محمد جمیل احمد بریلوی	"اردو شاعری کی مختصر تاریخ"	لکھنؤ ۱۹۴۴ء
صغیر احمد جان	"تنویر ادب"	الہ آباد، طبعِ اول کی تاریخ نامعلوم
نسیم قریشی	"اردو ادب کی تاریخ"	دہلی، ۱۹۵۵ء
محمد چراغ علی حقیر	"اردو کی ادبی تاریخ کا خلاصہ بطرزِ سوال و جواب"	حیدر آباد، نومبر ۱۹۵۶ء
علامہ درد نکودری	"تاریخِ ادب اردو"	دہلی، تاریخ ندارد
شرافت حسین مرزا	"جائزہ تاریخِ اردو"	علی گڑھ ۱۹۶۰ء
ڈاکٹر نذیر احمد و ڈاکٹر عباداللہ	"تاریخِ ادب اردو"	علی گڑھ غالباً ۱۹۶۰ء
شجاعت علی سندیلوی	"تعارف تاریخِ اردو"	لکھنؤ ۱۹۶۲ء
عظیم الحق جنیدی	"اردو ادب کی تاریخ"	علی گڑھ، ۱۹۷۱ء
ڈاکٹر سلیم اختر	"اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"	لاہور، طبعِ اول ۱۹۷۱ء کے لگ بھگ
امیر حسن نورانی و عظیم الحق جنیدی	"جدید تاریخ ادب اردو"	۱۹۷۳ء
ابوالعاصم رضوی	"اردو ادب کی تاریخ" حصۂ اول (نظم)	دہلی، ۱۹۷۵ء
میتھوز، شیکل و شاہ رخ حسین	اردو لٹریچر (انگریزی)	
رالف رسل	"اردو ادب کا تعاقب، ایک منتخب تاریخ" (انگریزی)	دہلی وغیرہ، ۱۹۹۲ء
ڈاکٹر نورالحسن نقوی:	"تاریخِ ادب اردو"	

ان میں رسل کی تاریخ نصابی نہیں ہے، لیکن یہ چونکہ باقاعدہ تاریخ نہیں، بلکہ ان کے چند مضامین کا مجموعہ ہے، اس لیے اس کا اس باب میں ذکر کرنا مناسب سمجھا گیا۔ ہو سکتا ہے روایتی نصابی تاریخیں کچھ اور بھی ہوں لیکن مجھے ان کا علم نہیں۔ اب سلسلہ وار مندرجۂ بالا تاریخوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

Scanned by CamScanner

آغا محمد باقر: تاریخِ نظم و نثرِ اردو

یہ تاریخ آغا محمد باقر ایم اے، ایم او ایل، بی ٹی کی تالیف ہے۔ آغا باقر مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے یا پرپوتے ہیں۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب نے ان سے فرمائش کی کہ چونکہ رام بابو سکسینہ کی تاریخ پنجاب یونی ورسٹی کے مشرقی امتحانوں کے نصاب میں شامل ہے اس لیے اس کی تلخیص کر دی جائے۔ باقر نے یہ بات مان لی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ "آبِ حیات" پر جس بےدردی سے اعتراض کیے جا رہے ہیں، اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ان کا جواب بھی دے دیں۔ انھوں نے ایسا کر کے کتاب مکمل کی اور مقدمے پر ۹ فروری ۱۹۳۳ء کی تاریخ ڈالی۔ میرے سامنے کتاب کی طبعِ دوم لاہور ۱۹۳۸ء، نیز تقسیم کے بعد کا ایک ہندوستانی بازاری ایڈیشن ہے۔ مؤلف نے کتاب کو اپنے استاد حافظ محمود شیرانی کے نام معنون کیا ہے۔

باقر نے رام بابو سکسینہ کے اردو ترجمے کی تلخیص ہی نہیں کی، فُٹ نوٹ میں دو مزید کام کیے۔

۱۔ "آبِ حیات" کے جن بیانات پر اعتراض کیے گئے ان کا جواب لکھا۔ چونکہ آغا باقر آزاد کی اولاد میں ہیں، اس لیے ان کی مدافعت میں علمی غیرجانب داری نہیں، ذاتی رشتے کی جنبہ داری ہے۔

۲۔ مصنف رام بابو سکسینہ یا مترجم مرزا عسکری کے جن بیانات سے باقر متفق نہیں، ان کی تردید بھی حاشیے میں کی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسے بیانات ہیں جن میں "آبِ حیات" سے اختلاف کیا گیا تھا۔

چونکہ باقر کی تاریخ کے متن میں سکسینہ کے اردو ترجمے کا خلاصہ ہی ہے اس لیے میں اس سے صَرفِ نظر کر کے آغا باقر کے مشاہدات ہی کا جائزہ لوں گا۔ پہلے مقدمہ لیجیے۔

مرزا محمد عسکری نے "آبِ حیات" کے بارے میں رائے دی تھی کہ "مولانا کی رنگین عبارت کی وجہ سے کتاب کی مورخانہ حیثیت میں فرق آ گیا جس کی وجہ سے "آبِ حیات" پر اعتراض کیے جا رہے ہیں"۔ اسے نقل کر کے باقر لکھتے ہیں کہ تذکرہ میر قاسم کی اشاعت کے بعد ایسے فاسد خیالات حرفِ غلط کی طرح محو ہو جائیں گے۔ مزید لکھتے ہیں کہ "آبِ حیات" کے بعد عام طور پر جس قدر تذکرے (تواریخِ ادب) لکھے گئے ان کا مدعا اصل میں "آبِ حیات" کی مخالفت تھا۔ "آبِ حیات" پر کیے جانے والے اعتراضات کا یہ خلاصہ کرتے ہیں:

۱۔ نظم و نثرِ اردو کی ابتدا بجائے دکن کے پنجاب میں ہوئی۔ (سکسینہ صاحب مولانا آزاد کے ہم خیال ہیں۔)

Scanned by CamScanner

۲۔ میر پر غیر معمولی طور پر بد دماغی کا الزام لگایا اور ان کے "تذکرۃ الشعرا" پر بہت سخت تنقید کی۔

۳۔ انشا کی آخری تین حالتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے جزوی طور پر اختلاف ہے۔

۴۔ اپنے استاد ذوق کو مرزا غالب پر ترجیح دی ہے۔

۵۔ عبارت کو رنگین اور دلچسپ بنانے کے لیے واقعات میں بہت کچھ رنگ آمیزی کی گئی ہے۔

آغا باقر نے ان اعتراضات کا محض ذکر کیا، کوئی جواب نہیں دیا۔ "آبِ حیات" کے بعد کی لکھی چند تاریخوں کی نوعیت بیان کرتے ہیں کہ "گلِ رعنا" میں مولانا آزاد کی نام نہاد غلط بیانیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کی حیثیت معاندانہ ہو گئی ہے۔ "شعر الہند" کی ژولیدہ بیانی نے اس کو حدودِ معینہ سے باہر نکال دیا ہے۔ باقر، سکسینہ کی تاریخ اور اس کے اردو ترجمے کی تعریف کرتے ہیں۔ مرزا عسکری کو ترجمہ کرتے وقت جن دقتوں کا سامنا ہوا اور انھوں نے جو اضافے کیے، انھیں گناتے ہیں۔ اس کے بعد ایک عنوان دیتے ہیں: "اصل اور ترجمے پر اعتراضات۔" اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

۱۔ سنین کہیں ہجری میں ہیں، کہیں عیسوی اور ایک آدھ جگہ سمبت بھی ملتا ہے۔

۲۔ بعض جگہ سکسینہ صاحب کے بیانات میں اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی اور سرشار کے حالات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے (۱)۔

۳۔ سکسینہ صاحب نے خود زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا۔ اکثر دوسروں کے بیانات اپنی طرف سے نقل کر دیے ہیں اور جہاں خود دست اندازی کی ہے وہاں اکثر ٹھوکر کھائی ہے۔

۴۔ الفاظ بدل بدل کر واقعات کا اعادہ بہت کثرت سے کیا ہے۔ یہ عیب ترجمے میں زیادہ ہے۔

۵۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کا اصل گہوارہ دکن ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے ۷۹۵ھ تک کی دکنی تصانیف کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے "پنجاب میں اردو" نہیں دیکھی جس میں پروفیسر شیرانی نے ۶۰۰ھ تک کی تصانیفِ اردو دریافت کی ہیں اور ثابت کیا ہے کہ اردو کا اصل مرکز پنجاب ہے، دکن نہیں۔

۶۔ بعض بیانات کے بے جا اعادے اور آزاد ترجمے سے کتاب بے حد ضخیم ہو گئی ہے۔

Scanned by CamScanner

انھیں الفاظ پر مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔ مندرجۂ بالا اعتراض نمبر ۵ میں لکھتے ہیں کہ شیرانی نے پنجاب میں ۶۰۰ھ تک کی اردو تصانیف دریافت کی ہیں۔ میں نے "پنجاب میں اردو" نکال کر دیکھی۔ اس میں قدیم ترین مصنف شیخ فرید گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ ہیں۔ ان کی تصنیف سے جو اردو ابیات پیش کی جاتی ہیں وہ سب الحاقی ہیں، صرف دو ایک نثری ملفوظات تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ انھیں باقاعدہ تصنیف کہنا مناسب نہیں۔ پنجاب کی دکن پر سبقت ثابت نہیں ہوتی۔

اب کچھ وہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جہاں مؤلف آغا باقر نے حاشیے یا متن میں سکسینہ کے بیان پر تنقید کی ہے۔ حسبِ ضرورت میں اپنا تبصرہ بھی پیش کروں گا۔

ص۹: "اسی طرح برج بھاشا کو، مولانا آزاد کے خیال کے مطابق، اردو کا ماخذ قرار دینا بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔"

حاشیہ: "مولانا آزاد کا نظریہ قدیم زمانے کی تحقیق پر مبنی ہے اور سکسینہ بابو کی قیاس آرائی ہے۔" (ص۹)

سکسینہ کا اعتراض صحیح ہے کہ اردو برج سے پیدا نہیں ہوئی۔ اسے قیاس آرائی کہہ کر مؤلف نے اپنی ہٹ دھرمی دکھائی ہے۔

ص۲۵: سکسینہ نے کلکتے کے عیسائی پادریوں کے سلسلے میں لکھا:

> ہمارا خیال ہے کہ دیسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اسی زمانے سے ہوئی۔

باقر نے اپنی تلخیص میں دیسی زبان کی جگہ "اردو اخبار نویسی" لکھ کر حاشیہ لگا دیا کہ "اردو کا سب سے پہلا اخبار مولوی محمد باقر مرحوم نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے جاری کیا تھا۔" موضوعِ بحث "اردو اخبار" نہیں دیسی زبانوں کے اخبار ہیں۔

ص۴۰: "آزاد نے لکھا تھا کہ اردو کے سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ولی ہیں، لیکن قطب شاہیوں کے دیوانوں نے اس کی تردید کر دی ہے۔" (سکسینہ)

باقر حاشیہ لگاتے ہیں:

> "قطب شاہیوں کے دیوان ولی کے کلام کی برابری نہیں کرتے۔ اس لیے مولانا آزاد کا بیان صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ جواب بالکل مہمل ہے۔

ص۶۰ تا ۶۳: میر کے سلسلے میں سکسینہ کے بیانات پر تبصرہ متن ہی میں کیا ہے۔ سکسینہ نے آزاد کے بعض بیانات پر اعتراض کیا تھا: میر کی نازک دماغی کا مبالغہ، "نکات الشعرا"

Scanned by CamScanner

سے متعلق غلط بیانات، میر کا دوسروں کے مرتبے کا اعتراف نہ کرنا، سوز کا تخلص بدلنا۔ باقر، ان سب پر بہت خفا ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "آبِ حیات"، تذکرۂ شورش اور تذکرۂ میر قاسم سے ماخوذ ہے۔ ان تذکروں کی اشاعت کے بعد "آبِ حیات" کی روایتیں ضعیف نہیں رہتیں۔

اس صفائی میں سب سے کام کی چیز یہ افشا کی ہے کہ "آبِ حیات" نے تذکرۂ قاسم کے علاوہ تذکرۂ شورش سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔

ص ۱۰۵: "سکسینہ لکھتے ہیں، سودا نے سب سے پہلے مرثیے کو مسدس کیا، حقیقت یہ ہے کہ میر انیس کے بزرگوں نے مرثیے کے لیے مسدس کو منتخب کیا۔" (آغا باقر)

سکسینہ نے دراصل لکھا تھا: "سودا کے وقت تک عموماً مرثیے چومصرع ہوا کرتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا۔" (اردو ترجمہ، ص ۶۸-۲۶۷) باقر نے اپنی تلخیص میں سکسینہ کا اہم لفظ "غالبا" حذف کر دیا۔ مسدس کی سبقت کی بات سودا اور سکندر کے درمیان ہے، میر انیس کے بزرگ اس ہوڑ میں نہیں آتے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی رائے ہے کہ "مسدس میں مرثیہ لکھنے کی اولیت کا شرف سکندر کو حاصل ہے۔" ("اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا"، ص ۲۳۸)

ص ۱۳۴: سکسینہ صاحب لکھتے ہیں۔ "آخر عمر میں مرزا کی زندگی آلام و امراض کے لیے وقف ہو گئی تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کرتے ہوں، لیکن کیا فرماتے ہیں سکسینہ صاحب مرزا کی ایامِ شباب کی شراب نوشی کے متعلق!" (آغا باقر)۔

یہاں بظاہر آغا باقر کا اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن سکسینہ کی تاریخ میں اس جزو کو دیکھا جائے تو انھوں نے غالب کے آخر عمر ہی میں شراب نوشی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ وہ اپنے عیوب کو نہیں چھپاتے، چنانچہ انھوں نے اشعار اور خطوط میں اپنی شراب نوشی پر ندامت کا اظہار کیا ہے۔

ص ۷-۳-۲۳۶: "اُن (آزاد) کے والد کا نام مولانا محمد باقر تھا۔ سکسینہ صاحب نے باقر علی اور باقر حسین غلط لکھا ہے۔" (آغا باقر)۔ اعتراض درست ہے۔ سکسینہ نے ان کے والد کا نام باقر علی لکھا ہے۔ مجھے آزاد کے حالات میں "باقر حسین" کہیں نظر نہ آیا۔ ممکن ہے کہیں اور لکھا ہو۔ بہرحال سکسینہ نے نام غلط لکھا ہے۔ آزاد کے حالات میں آغا باقر نے ایک مفید اضافہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا سنہ ولادت ("ظہور اقبال":
۱۲۴۵ھ) سے نکلتا ہے۔ ۱۲۴۵ھ برابر ہے ۳۰-۱۸۲۹ء کے۔

ص ۲۳۷: سکسینہ صاحب نے لکھا ہے کہ "ہنگامۂ غدر فرو ہونے کے بعد مولانا آزاد کسی فوجی اسکول میں ملازم ہو گئے تھے۔ یہ بیان غلط ہے۔" (آغا باقر) تصحیح درست ہے۔

ص ۲۴۰: سکسینہ صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا۔ غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دی ہیں اور بعض جگہ کتاب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے واقعات میں کمی و بیشی اور تبدیلی تک کو جائز رکھا..."

سکسینہ نے حصۂ نثر ص ۴۹ پر ایسے چند واقعات گنائے بھی ہیں۔ آغا باقر نے طویل اقتباس دے کر لکھا کہ تذکرۂ قاسم کے چھپ جانے سے "آب حیات" کی تاریخی خوبیاں نمایاں ہو گئیں۔ تذکرۂ شورش سے بھی بہت سے واقعات نقل کیے گئے ہیں، لیکن ابھی تک یہ تذکرہ کہیں سے برآمد نہیں ہوا۔ لکھتے ہیں:

> انشا کی آخری حالت کی مجالسِ رنگیں اور تذکرۂ میر قاسم سے تصدیق نہیں ہو سکی، لیکن امید ہے کہ مستقبلِ قریب میں تذکرۂ شورش مل جائے گا اور یہ بیان بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا۔

تذکرہ شورش کے اب دو نسخے چھپ چکے ہیں۔ اس تذکرے میں انشا کے بارے میں محض ڈیڑھ سطریں، یعنی دو جملے ہیں۔ آزاد کی افسانہ طرازیوں کا قاسم اور شورش کے تذکروں سے کوئی دفاع نہیں ہوتا۔

ص ۲۴۶: سکسینہ نے لکھا ہے کہ مولوی مملوک علی کے اصرار سے نذیر احمد دلّی کالج میں داخل ہوئے۔ اس پر باقر نے بہت بجا حاشیہ لکھا ہے کہ "حیات النذیر" کے مطابق کالج میں امتحان ہو رہا تھا۔ وہ اتفاق سے اُدھر جا نکلے اور مولوی مملوک علی نے ان کا امتحان لیا اور نذیر احمد کالج میں داخل ہو گئے۔

ص ۲۴۷: سکسینہ نے "شعرالعجم" کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس کی یکتائی پر پروفیسر براؤن جیسے مستشرق کی شہادت موجود ہے۔" "یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اس کی اکثر غلطیاں نکالی گئیں اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جا رہی ہیں مگر پھر بھی ہمارے نزدیک کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحر علمی میں اس سے کوئی فرق نہیں آ سکتا۔" اس پر باقر تبصرہ کرتے ہیں: "استادِ گرامی پروفیسر شیرانی کی معرکہ آرا تنقیدوں نے مولانا شبلی کی تاریخ دانی کی خوب قلعی کھولی ہے... مستشرقین کے نزدیک تاریخی حیثیت سے "شعرالعجم"۔

Scanned by CamScanner

بالکل بے وقعت ہے۔

شاذ محمد باقر نے سکسینہ کی تاریخ سے ہٹ کر اپنی طرف سے بھی بعض چھوٹی موٹی معلومات کا اضافہ کیا ہے، مثلاً ص ۲۶۷ پر سر شیخ عبدالقادر کے بارے میں یہ اطلاع کہ وہ چند سال انگلستان میں انڈیا کونسل کے ممبر رہے اور ص ۲۶۹ پر لالہ سری رام کے بارے میں یہ خبر کہ انتقال کے بعد ان کی کتابیں بنارس یونی ورسٹی کو دے دی گئیں۔ واضح ہو کہ سری رام کا انتقال رام بابو سکسینہ کی تاریخ اور اس کے ترجمے کے بہت بعد میں ہوا۔

آغا محمد باقر نے مرزا محمد عسکری کے ضخیم اردو ترجمے کی تلخیص خوب کی ہے لیکن انھوں نے جابجا حاشیے اور متن میں مصنف اصلی یا مترجم پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اکثر صورتوں میں قائل نہیں کرتے، خصوصاً "آبِ حیات" سے متعلق ان کا ہر تبصرہ صریحاً جنبہ داری معلوم ہوتا ہے۔

مخمور اکبر آبادی نے اپنی "صحیفۂ تاریخ اردو" کے مقدّمے میں آغا باقر کی تاریخ پر سخت تنقید کی ہے۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ کتاب کے سرورق یا دیباچے میں کھل کر اعتراف نہیں کیا گیا کہ یہ کتاب سکسینہ کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ کتاب سکسینہ کا خلاصہ کہہ کر پیش کی گئی ہے، لیکن دراصل ترجمہ معلوم ہوتی ہے (مقدمہ، ص ۲-۷ ۲۶)۔ دونوں اعتراضات غلط ہیں۔ باقر نے مقدّمے میں سب سے پہلے یہی لکھا ہے کہ شیخ مبارک علی نے ان سے کہا کہ رام بابو سکسینہ کی تاریخ مشرقی امتحانوں کے نصاب میں شامل ہے، اس کی تلخیص کر دو، چنانچہ انھوں نے یہ فرمائش مان لی۔ کتاب تلخیص ہے، یہ بات سکسینہ کی کتاب یا اس کے اردو ترجمے اور باقر کی کتاب کے حجم کے فرق ہی سے واضح ہو جاتی ہے۔

ان دو اعتراضات کے بعد مخمور نے آغا باقر کی نثر کی خامیاں دکھا کر ان کی اصلاح کی ہے۔ یہ پہلو چنداں اہم نہیں، حالانکہ آزاد کے خلف سے غیر معیاری زبان کی توقع نہ تھی۔

محمد جمیل احمد ایم اے بریلوی: "اردو شاعری کی مختصر تاریخ"

یہ نول کشور پریس لکھنؤ سے پہلی بار ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ مصنف اپنے "التماس" میں واضح کرتے ہیں کہ اس کے مخاطب فضلائے ادب نہیں، عوام اور خصوصاً اسکول و کالج کے طلبہ ہیں (ص ۲)۔

یہ خالص تنقیدی تاریخ ہے جس میں تحقیق کا کوئی مواد نہیں۔

Scanned by CamScanner

ابتدا میں "لسانیاتی بیان" میں محمور اکبر آبادی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> محمور اکبر آبادی نے اپنی کتاب میں مہاتما بدھ کے یہ فقرے نقل کیے ہیں۔ دھرم کرو، دھرم کا سکھ پھونکو، دھرم کی ڈُند بجاؤ۔
>
> (ص ۸)

ظاہر ہے کہ گوتم بدھ نے یہ فقرے ہندوستانی زبان میں نہیں کہے ہوں گے، بلکہ اپنے عہد اور علاقے کی پالی یا کسی مماثل بھاشا میں کہے ہوں گے۔ جمیل احمد قدیم دور کی زبانوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ پانچ پراکرتیں ممتاز تھیں:

> مہاراشٹری، سور سینی، ماگری، پیساچی، ابھ لسار (ص ۸)

ان پراکرتوں میں پہلی چار کے صحیح نام یہ ہیں: مہاراشٹری، شور سینی، ماگدھی، پیشاچی۔ "ابھ لسار" کسی لفظ کی غلط قرأت ہے، لیکن اس سے پہلے مذکورہ چار پراکرتوں کے ساتھ پانچویں کا نام "اردھ ماگدھی" سمجھا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ سب انھوں نے محمور کی کتاب سے لیا ہے۔ محمور کی تاریخ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ کیا محمور نے یہی باتیں ۱۹۴۱ء سے قبل کسی مضمون میں درج کی تھیں جنھیں بعد میں اپنی تاریخ میں لے لیا۔ جمیل احمد نے اسی مضمون سے استفادہ کیا ہوگا۔

ہندو مسلم اتحاد کی خاطر اردو اور ہندی کی قدرِ مشترک کو ہندوستانی نام دے کر رائج کرنے کی جو تجویز کی جاتی تھی اس کے لیے وکیلِ اردو تیج بہادر سپرو نے بڑے زوردار الفاظ میں کہا:

> میں ہندوستانی کو ایک دھوکے کی ٹٹی سمجھتا ہوں جس کے ذریعے یقیناً خودغرض لوگ اپنے خود ساختہ پیمانے سے زبان و ادب کو مٹانا چاہتے ہیں... میں چاہتا ہوں کہ اردو روز بروز ترقی کرے اور آپ میں یہ اخلاقی جرأت ہو کہ لفظ "اردو" کو استعمال کرنے میں نہ شرمائیں اور خواہ مخواہ اس کی بجائے لفظ "ہندوستانی" استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ یہ زبان ہمارے آبا و اجداد کا ایک ناقابلِ تقسیم اور مقدس ترکہ ہے جس کی نہ روح بدلی جا سکتی ہے نہ نام۔ (۲)
>
> (ص ۸)

اس کے آگے اس تاریخ میں اردو شاعروں پر چھوٹی جماعتوں کے طلبہ کے ذہن کی تنقید ہے جس کا جائزہ لینا غیر ضروری ہے۔

Scanned by CamScanner

صغیر احمد جان: "تنویرِ ادب"

اس کے اندرونی سرورق پر اس کا نام "تنویرِ ادب یعنی تاریخِ زبان و ادبِ اردو" لکھا ہے۔ ناشر نیشنل پریس الہ آباد ہے اور ملنے کا پتا رام نراین لال بک سیلر الہ آباد۔ میں نے اس کتاب کے دو ایڈیشن دیکھے، ایک ۱۹۵۹ء کا، دوسرا ۱۹۸۰ء کا دسواں ایڈیشن۔ دونوں میں ۳۱۸ صفحے ہیں۔ مصنف کی "عرضِ حال" کے آخر میں کوئی تاریخ نہیں پڑھی، کہیں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ اس کا پہلا ایڈیشن کس سنہ میں شائع ہوا۔ اس کے مطالب کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آزادی سے پہلے کی کتاب ہے۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنے دورِ طالب علمی میں اس کا ذکر سنا تھا۔

اس کتاب کے ہر باب کے بعد ایک مختصر تبصرہ ہے۔ ذیل میں اس کے ابواب کی فہرست درج کی جاتی ہے تاکہ قارئین کو اس کتاب کے مشمولات کے بارے میں کچھ اندازہ ہو سکے۔

Scanned by CamScanner

ضمیمہ متعلقِ باب ۱۱: عہدِ حاضر کے نظم نگار شعرا۔
نثر کے ادوار اور ان کے عنوانات کو اور بہتر بنایا جاسکتا تھا۔ اس سے قطع نظر، نصابی مختصر تاریخوں کو دیکھتے ہوئے یہ تاریخ اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ترتیب میں ذاتی تحقیق کا تو سوال ہی نہیں۔ صرف دو چار قدیم تر تاریخوں کو سامنے رکھ کر تیار کرلی گئی ہے۔

نسیم قریشی: "اردو ادب کی تاریخ"

اس تاریخ کا پہلا ایڈیشن آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کی اشاعت کی ذمےداری فرینڈس بک ڈپو، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ نے سنبھال لی۔ آٹھواں ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں اور نواں ۱۹۷۶ء میں آیا۔ آج کل گیارھواں ایڈیشن بازار میں ہے، لیکن میرے سامنے نواں ایڈیشن ہے۔ اس میں چھوٹے سائز کے ۲۷۲ صفحے ہیں۔ اس کے بڑے حصے یہ ہیں:

اردو دکن میں
اردو ادب کا ارتقا شمالی ہند میں
اردو نثر ۱۸۵۷ء تک
اردو ادب ۱۸۵۷ء کے بعد
جدید اردو ادب کے معمار

دیباچے میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب طالبِ علموں کی ضرورت کو نگاہ میں رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بی اے کے طلبہ کے لیے بھی کافی نہیں، انٹرمیڈیٹ اور جامعہ اردو علی گڑھ ہی کے امتحانوں کے لیے کار آمد ہوسکتی ہے۔

محمد چراغ علی حقیر ایم اے:
"اردو کی ادبی تاریخ کا خلاصہ بطرزِ سوال و جواب"

اس کے عنوان کے نیچے وضاحت ہے:
بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے لیے
ناشر ادارہ مطبوعات درسی کتب، قاضی پورہ، حیدر آباد ہے۔ ظاہر ہے یہ مؤلف کے مکان کا پتا ہے اور یہ مؤلف کا ذاتی ادارہ ہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے کالجوں میں بی ایس سی

Scanned by CamScanner

اور بی کام میں بھی اردو بحیثیت ثانوی زبان کے لی جاسکتی ہے۔ اس کا معیار باقاعدہ اختیاری مضمون سے ہلکا ہوتا ہے۔ حقیر کی تاریخ یا تاریخ کے نوٹ دونوں قسم کی جماعتوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ چونکہ یہ طلبہ اور اساتذہ میں بہت مقبول ہوا، اس لیے چند ترمیمات کے ساتھ دوسرا ایڈیشن مئی ۱۹۵۹ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے چند سطری دیباچے پر قاضی پورہ، حیدر آباد، ۱۷ اپریل ۱۹۵۹ء کی تاریخ پڑی ہے۔

میں اس کے ابواب کے عنوانات دیکھ کر چونکا۔ پہلے عنوان ہی سے ایسا لگا کہ یہ سروری صاحب کی "اردو کی ادبی تاریخ" میں دیکھا تھا۔ کتاب نکال کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ حقیر صاحب نے جملہ ابواب کے عنوان سروری صاحب کی تاریخ سے لیے ہیں، یعنی حقیر کی کتاب سروری کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ حیرت یہ ہے کہ حقیر نے کہیں خفیف سا اشارہ بھی نہیں کیا کہ ان کا ماخذ سروری کی تصنیف ہے۔ پوری کتاب کی ابتدا، انتہا، سرورق، کہیں بھی سروری صاحب کا نام نہیں لیا۔ حقیر کی تاریخ کے ابواب کے عنوان یہ ہیں:

۱۔ قدیم ہندوستان! عظیم ہندوستان!
۲۔ نئی لہر
۳۔ تہذیبی لین دین
۴۔ نئی تہذیب، نئی زبان
۵۔ فاتح، مفتوح
۶۔ شمال کی رَو دکن کی طرف
۷۔ پہلے آثار
۸۔ نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات
۹۔ نشوونما
۱۰۔ شمال و جنوب کا سنگم
۱۱۔ زوال آمادہ اجزا
۱۲۔ اہلِ نظر کی تازہ بستیاں
۱۳۔ مغربی دھارا
۱۴۔ ہندوستاں ہمارا
۱۵۔ شکست اور تعمیرِ نو۔

یہی عنوانات سروری صاحب کی تاریخ کے ابواب کے ہیں۔ اس طرح حقیر صاحب کی کتاب کی کوئی آزاد حیثیت نہیں، یہ سروری صاحب کی تاریخ کا ایک لاحقہ بھر ہے۔

Scanned by CamScanner

علّامہ درد نکودری: "تاریخِ ادب اردو"

کالی داس گپتا رضا نے جوش ملسیانی کی کتاب "اقبال کی خامیاں" مرتب کی ہے (بمبئی، ۱۹۹۴ء)۔ اس کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ نوہریارام درد نکودری جوش ملسیانی کے شاگرد اور نریش کمارشاد کے والد تھے۔ ان کی تاریخ مشورہ بک ڈپو، گاندھی نگر، دہلی نے شائع کی۔ کتاب پر سنہ اشاعت نہیں دیا۔ اس کی صفحات ۲۱۶ صفحے ہے۔ ابتدا میں فہرستِ ابواب نہیں۔ ہوتی بھی کیسے جب یہ کتاب ابواب میں تقسیم ہی نہیں کی گئی۔ ضمنی سرخیاں ترتیب دی جائیں تو مشمولات کی یہ صورت بنتی ہے۔

تاریخِ زبانِ اردو، امیر خسرو

اردو غزل: میر تقی میر، میرزا غالب دہلوی

اردو نظم: اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض

اردو قصیدہ: محمد رفیع سودا، ذوق دہلوی

مثنوی: میر حسن، دیاشنکر نسیم

مرثیہ: میر انیس، مرزا دبیر

رباعی، قطعہ

طنزیہ اور مزاحیہ شاعری: انشاءاللہ خاں انشا، اکبر الہ آبادی

اردو گیت

مہاجرین شعرائے دہلی، اردو شاعری اور شاہی دربارِ دکن، دہلی کے درباری شاعر، دربارِ لکھنؤ۔

دربارِ رام پور، اودھ کے حکمرانوں کی شاعری، واجد علی شاہ

اردو شاعرات، یوروپین شعرائے اردو

اردو شاعری کا نمایاں ترین پہلو، معشوقہ کے لیے صیغۂ تذکیر کا استعمال

جدید شاعری، قدیم اور جدید اردو شاعری کا بنیادی فرق، ترقی پسند شاعری، ۱۹۴۷-۴۸ء کی اردو نظمیں، دو اہم ہنگامی موضوعات، امن اور اردو شاعری

اردو نثر:

چند ابتدائی اردو نثر نگار، میر امن دہلوی، فورٹ ولیم کالج کلکتہ

اردو نثر کا دوسرا دور: سر سید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، شبلی، شاعری اور نثر نگاری کا فرق، دلّی کالج

اردو ناول: نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر، منشی پریم چند

Scanned by CamScanner

جدید اردو افسانہ: کرشن چندر
اردو ڈراما: آغا حشر کاشمیری
اردو طنز و مزاح: غالب کے بعد، رشید احمد صدیقی
اردو تنقید، اردو صحافت، ادبی اردو رسائل، اردو پاکٹ بکس
اردو میں سوانح نگاری، اردو کی خواتین افسانہ نگار، چند جدید ترین اصنافِ نثر
فلم اور اردو ادیب، انجمنِ ترقیِ اردو، اردو کی ترقی پسند تحریک

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تاریخ، اصناف اور موضوعات کے اعتبار سے لکھی ہے اور ان میں بھی محض ایک دو نمائندہ ادیبوں کو لیا ہے جس سے بڑے بڑے کھانچے رہ جاتے ہیں، مثلاً نثر میں رجب علی بیگ سرور کا ذکر نہیں، ناول میں مرزا رسوا، افسانے میں بیدی، منٹو، عصمت، ڈرامے میں امتیاز علی تاج غیر حاضر ہیں۔ تاریخ کے خاکے میں بد نظمی نمایاں ہے۔ یہ کسی بھی اعتبار سے بنایا گیا ہو، نہیں ہے تو تاریخیت اور زمانی ارتقا۔ یہ ہیں ہمارے آپ کے مجہول الاسم خود ساختہ علامہ۔

شرافت حسین مرزا ایم اے: "جائزۂ تاریخِ اردو"

یہ تاریخ بارِ اوّل سرسید بک ڈپو علی گڑھ نے ۱۹۶۰ء میں شائع کی۔ بعد میں شرافت مرزا نے دلی یونی ورسٹی سے مولانا ابوالکلام آزاد پر پی ایچ ڈی کی۔ مناسب ملازمت حاصل کرنے کی بہت جدوجہد کی لیکن ناکام رہے۔ آخر کار اپنے وطن بجنور کے ایک اسکول میں ملازمت کی اور وہیں سے ریٹائر ہو گئے۔ آج کل بجنور کے قریب کرت پور میں رہتے ہیں۔ ان کا مقالہ شائع نہیں ہوا۔ ان کا دوسرا کام سرسید کی "تاریخِ سرکشیِ بجنور" کی ترتیب و اشاعت ہے۔ اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ان کی تاریخ ادب پر مولانا ضیا احمد بدایونی نے "مختصر تعارف" لکھا ہے۔ کتاب اور مصنف کی تحسین کے بعد انھوں نے لکھ دیا ہے کہ "ہم نے کتاب کو بالاستیعاب تو نہیں، مگر اکثر مقامات سے پڑھا اور ہمیں یقین ہے کہ مؤلف نے واقعات کے بیان میں صحت و احتیاط سے کام لیا ہے۔"

اس تاریخ میں ۲۳۰ صفحات ہیں۔ شروع میں مفصل فہرستِ ابواب مع ذیلی عنوانات کے ہے۔ میں اس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

باب ۱:- اردو زبان، ایک تبصرہ (اس باب میں اردو سے پہلے کا لسانی نقشہ دیا ہے: سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش وغیرہ۔)

۲- اردو کا دکنی دور
۳- شمالی ہند میں نثر کا تاریخی ارتقا
دورِ اول، ابتدائی کارنامے
دورِ دوم فورٹ ولیم کالج تحریک
دورِ سوم مقفیٰ و مسجع نثر نگاری
۴- شمالی ہند کی اردو شاعری، شاعری کے تین دور
دورِ اول دورِ ایہام گوئی
دورِ دوم عہدِ زریں (میر و سودا وغیرہ)
دورِ سوم (عہدِ درباداری)
۵- نظیر اکبر آبادی
۶- شاعری کے دو اسکول، دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دلی شاعری کا چوتھا دور (اس میں آتش و ناسخ، دو ادبی شاہکار، یعنی "گلزارِ نسیم" اور "زہرِ عشق"، انیس و دبیر کا زمانہ، اور اس کے بعد دبستانِ دلی میں ذوق، غالب، مومن وغیرہ کا ذکر ہے۔)
۷- دربارِ رام پور، حیدر آباد، شعرائے متاخرین
اردو شاعری کا پانچواں دور (یہ امیر و داغ سے لے کر مہاراجا سرکشن پرشاد، سائل اور نوح ناروی تک آجاتا ہے۔)
۸- علی گڑھ تحریک، جدید اردو ادب
جدید شاعری، جدید اردو نثر
۹- اردو نظم (اس کے تحت اکبر، اقبال، جوش، حفیظ، ساغر نظامی، احسان دانش وغیرہ کا ذکر ہے۔)
۱۰- ترقی پسند تحریک
۱۱- جدید اردو غزل
۱۲- تین اصنافِ ادب
ناول، مختصر افسانہ، ڈراما
۱۳- علم و ادب
مقالات و صحافت، تحقیق و تنقید
۱۴- طنز و مزاح
۱۵- اردو مکتوب نگاری

Scanned by CamScanner

۱۶- ادارے

میرا خیال ہے کہ یہ خاکہ بہت معقول ہے۔ اس میں زمانے، علاقے، نظم و نثر، اصناف، موضوعات سبھی کا خیال کیا گیا ہے۔ ۲۳۰ صفحوں میں اتنے سارے موضوعات و ملفوظات کو سمو دینا واقعی قابلِ داد ہے۔ تعارف نگار جناب ضیا احمد بدایونی کا یہ قول کتنا درست ہے:

دریا کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ مدّت سے سنتے آئے ہیں۔ کوئی اس کا مصداق دیکھنا چاہے تو "جائزہ تاریخِ اردو" دیکھ لے۔ لائق مرتّب شرافت حسین مرزا صاحب ایم اے نے یہ کتاب جامعہ اردو کے طلبہ کی غرض سے تیار کی ہے اور نہایت اختصار (مگر پوری جامعیت کے ساتھ) تمام ضروری مباحث کو سمیٹ لیا ہے۔

میں نے اس کتاب کو حیدر آباد کے آخری سفر میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ اب لکھنؤ میں بہت تلاش کی، نہ ملی۔ مجبوراً حیدر آباد سے اس کے ابتدائی اجزا کا فوٹو عکس منگایا اور اس کی بنا پر یہ تعارف پیش کیا۔ (۳)

ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عباداللہ: "تاریخِ ادب اردو"

مولفین کے دونوں نام فرضی ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ انھوں نے کوئی تاریخِ ادب نہیں لکھی۔ وہ اور مختار الدین احمد کسی ڈاکٹر عباداللہ سے واقف نہیں۔ اس تاریخ کا ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ہے۔ اس میں سنہِ اشاعت درج نہیں، لیکن ص۱۴۵ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کا سنہ ۱۹۵۸ء دیا ہے۔ موجودہ مالک و ناشر نے مجھے اپنے ۹ دسمبر ۱۹۹۴ء کے خط میں لکھا کہ یہ کتاب ان کے کام سنبھالنے سے پہلے ان کے والد کے زمانے میں اندازاً ۱۹۶۰ء میں چھپی ہوگی۔ اس کے شروع میں چار صفحوں میں فہرست ہے۔ اس کے بعد پانچ صفحوں کا دیباچہ اور متن، دونوں میں کُل ۳۰۹ صفحات۔ آخر میں تین صفحوں کا انڈکس ہے۔

یہ عجیب لچر قسم کی تاریخ ہے جس کا اندازہ ابواب کی فہرست سے ہوگا۔

پہلا باب اردو کا مقام، دوسرا باب محض دو صفحوں کا، جس میں بتاتے ہیں کہ اردو شاعری کے چھ دور ہیں اور اردو نثر کے پانچ دور، تیسرا باب "دورِ جدید" جس میں ترقی پسند ادب سے متعلق سوال جواب ہیں۔ چوتھا باب "تنقید و تبصرہ" ہے، جس میں ان دونوں کا فرق دکھایا ہے۔ اس کے آگے "خمریات اور اردو شاعری" کے عنوان کے تحت کچھ لکھا

Scanned by CamScanner

ہے۔ پانچواں باب "نگارشات" ہے، جس میں جدید اصنافِ نثر کا بیان ہے۔ باب۶ مثنوی، باب۷ قصیدہ، غزل، مرثیہ۔

آٹھواں باب فورٹ ولیم کالج ہے جس کے آخر میں رجب علی بیگ سرور کی تفصیل ہے۔ مرتبین کو اس سے غرض نہیں کہ سرور فورٹ ولیم کالج میں نہ تھے۔ نواں باب "اردو کے عناصرِ خمسہ" ہے۔ دسواں باب "ناول اور افسانہ لکھنے والے، سرشار سے کرشن چندر تک"، گیارھواں باب مقالات وصحافت پر ہے۔ بارھواں باب "تحقیق و تنقید" ہے جس میں سات نام ہیں: وحیدالدین سلیم، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، مولوی عبدالحق وغیرہ۔ تیرھواں باب اردو کے مزاح نگاروں پر ہے۔

مرتبین رجعتِ قہقری کر کے جدید سے قدیم کی طرف جاتے ہیں۔ ہمارے معاصرین تک پہنچ کر، چودھواں باب "اردو کا آغاز" ہے جس میں ص ۱۷۰ پر شاہ میراں جی شمس العشاق کو بہمنی دور میں دکھایا ہے حالانکہ وہ اس سے بعد میں عادل شاہی دور میں تھے۔ ان سے "شرحِ مرغوب القلوب" اور "جل ترنگ" دو مثنویاں منسوب کی ہیں جن میں سے ایک میں پانچ ہزار سے زیادہ بند ہیں (ص۱۷۱)۔ مثنوی میں بند، مرتبین کی اپج ہے لیکن یہ مثنوی ہیں ہی کہاں؟ میراں جی سے جو نثری رسالے منسوب کیے جاتے ہیں مندرجۂ بالا دونوں انھیں میں سے ہیں۔ دراصل "جل ترنگ" تو موجود ہی نہیں، "شرحِ مرغوب القلوب" میراں جی خدانُما کی نثر ہے۔

ص۱۷۲ پر نصرتی کی ایک مثنوی کا نام "گلدستۂ عشق" لکھا ہے۔ نصرتی کی کوئی مثنوی یا کتاب اس نام سے دستیاب نہیں۔ بعض مؤرخین نے نصرتی کی غزلیات وغیرہ کے مجموعے کا نام "گلدستۂ عشق" لکھا ہے لیکن یہ موجود نہیں۔ شاہ میراں جی کے پوتے کا نام آمین لکھا ہے، جن کے مُریدوں نے آپ کا کلام "جواہرالاسرار" کے نام سے جمع کیا۔ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ شاہ میراں جی کے پوتے کا نام "آمین" نہیں، شاہ امین الدین علی اعلیٰ تھا اور "جواہرالاسرار" ایسا سینہ مجموعہ ہے جو کہیں دستیاب نہیں۔ اسی باب کا ایک جزو ہے: "اردو ادب کی ترقی کے تدریجی اور ادواری نمونے۔"

چودھویں باب کی تفصیل طویل ہو گئی۔ اس کے بعد باب۱۵ "غدر ۱۸۵۷ء کے قبل کی نثر" ہے۔ باب۱۶ "ادب کی رفتار ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد"، سترھویں باب سے "تذکرۃ الشعرا" ہے جو سودا و میر سے شروع ہوتا ہے اور تین ابواب ۱۷ تا۱۹ لیتا ہے۔ بیسواں باب مرثیہ گو شعرا اور نظم گو شعرا کے متعلق ہے جن میں ترقی پسند شعرا بھی شامل ہیں۔

Scanned by CamScanner

غرض یہ ہے کہ اردو کی تمام نصابی تاریخوں میں یہ سب سے نچلی سطح پر ہے، جیسے انٹرمیڈیٹ کے کسی کم ذہین طالب علم نے لکھ دی ہو۔ اس کی ابواب بندی، یعنی خاکے میں ایک مالیخولیائی کیفیت ہے۔ معلوم نہیں، یہ کس جعل ساز کا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی: "تعارف تاریخ اردو"

اس تاریخ کا ناشر فروغ اردو لکھنؤ ہے۔ مصنف نے تعارف میں صراحت کی ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ نظرِ ثانی کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں آیا۔ اس کی متعدد طباعتیں ہوئیں۔ اس کے بعد قدرے اضافوں کے ساتھ ایک ایڈیشن ۱۹۷۶ء کے اوائل میں شائع ہوا اور یہی میرے سامنے ہے۔ اس میں چھوٹے سائز کے ۳۶۰ صفحے ہیں۔ اس تاریخ کے تین حصے ہیں:

حصۂ اول۔ آغاز اردو
حصۂ دوم۔ اردو نظم
حصۂ سوم۔ اردو نثر

مصنف نے ادیبوں کی ولادت و وفات کی تاریخیں درج کرنے پر خصوصی توجہ کی ہے لیکن ان کی صحت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، مثلاً ص۱۹۶ پر اختر شیرانی کا سنہ وفات ۱۹۴۵ء درج کیا ہے، صحیح ۱۹۴۸ء ہے۔ ص۲۹۶ پر محمد حسین آزاد اور ص۲۹۷ پر نذیر احمد دونوں کی ولادت ۱۸۳۶ء میں دکھائی ہے۔ دونوں سنین غلط ہیں۔ ڈاکٹر صادق کے بقول آزاد ۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئے اور اشفاق اعظمی کے اندازے کے مطابق نذیر احمد ۳۱-۱۸۳۰ء میں۔ مصنف نے ص۳۰۵ پر اپنے ہی شعبے کے سید مسعود حسن رضوی کی تاریخِ ولادت ۲۹ جولائی ۱۸۹۴ء لکھی ہے، صحیح ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء ہے جو خود مسعود صاحب نے اپنی آپ بیتی میں لکھی ہے۔ ("تحریر"، دہلی، مسعود حسن رضوی نمبر، اپریل۔جون ۱۹۷۴ء، ص۸)

غرضیکہ یہ تاریخ بھی عام نصابی تاریخوں کی طرح تحقیق و تنقید میں کوئی امتیاز نہیں رکھتی۔

عظیم الحق جُنیدی ایم اے: "اردو ادب کی تاریخ"

یہ کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کی۔ ناشر نے میرے استفسار کے

جواب میں مجھے بتایا کہ مصنف مسلم یونی ورسٹی ہائی اسکول اور اس کے بعد یونی ورسٹی سٹی ہائی اسکول کے پرنسپل تھے، جہاں سے ۱۹۷۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا (مکتوب، مرقومہ: ۹ دسمبر ۱۹۹۴ء)۔ چونکہ ۱۹۷۳ء میں ریٹائر ہوئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں۔ دوسرا ۱۹۷۶ء میں اور تیسرا ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ان کی زندگی کا آخری ایڈیشن ہے۔ اس کے مختصر "عرضِ مرتب" میں صاف گوئی سے اعتراف کرتے ہیں:

> اس کتاب کے متعلق نہ مجھے تصنیف کا دعویٰ ہے اور نہ اردو ادب کی چھوٹی بڑی کتابوں میں کسی اضافے کا... یہ کتاب اردو زبان و ادب کی مستند کتابوں کو سامنے رکھ کر اردو کے طالبِ علموں کی رہ نمائی کے لیے مرتب کی گئی ہے۔

میری نظر سے اس تاریخ کے دو ایڈیشن گزرے ہیں، ایک ۱۹۷۸ء کا، دوسرا ۱۹۹۰ء کا۔ آخرالذکر میں مجنوں گورکھ پوری کی وفات ۱۹۸۸ء کا ذکر ہے۔ اس ایڈیشن میں "عرضِ ناشر" میں اطلاع دی ہے کہ جنیدی صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر انصاراللہ کو زحمت دی جنھوں نے کچھ واقعات کی تصحیح کی اور جابجا، تاریخوں کا اضافہ بھی کیا۔ اس کے بعد شاعروں کے حالات اور تنقید کو زیادہ مفصل بنایا گیا۔ ۱۹۹۰ء کے ایڈیشن میں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونی ورسٹی سے نظرِ ثانی کرائی۔ اس سے پہلے نورالحسن نقوی اور ڈاکٹر اطہر پرویز (ف ۱۰ مارچ ۱۹۸۴ء) سے بھی تصحیح و ترمیم و اضافہ کرایا۔

موجودہ ایڈیشن میں ۲۸۸ صفحات ہیں۔ اس میں ہر جگہ عیسوی سنین ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے اردو کے اکثر سنین ہجری میں ملتے ہیں۔ اگر ماہ و سال معلوم نہ ہو تو ان کے مقابل محض ایک عیسوی سنہ دینے میں بسااوقات ایک سال کی کمی بیشی ہو سکتی ہے اور یہ موجودہ تاریخ میں بھی ہے۔

اس کی فہرستِ ابواب سے اس کے حصار کا اندازہ ہوگا۔ پہلے باب میں "لسانی خاکہ اور ارتقا"، نیز "سیاسی و سماجی پس منظر" ہے۔ دوسرا باب "اصنافِ شاعری" ہے۔ تیسرا باب "شاعری کے اسکول" اور چوتھا "دکن میں اردو شاعری" ہے۔ پانچویں سے پندرھویں باب تک شعرا کا بیان ہے۔ باب ۱۶ "گیت" اور باب ۱۷ "پیروڈی" ہے۔

اس کے آگے حصۂ نثر ہے جس کا پہلا باب "رفتارِ نثرِ اردو" ہے۔ دوسرے باب سے نثر نگاروں کا بیان ہے۔ باب ۵ "ناول"، باب ۶ "افسانہ"، باب ۷ "ڈراما"، باب ۸ "مقالہ نگاری اور صحافت"، باب ۹ "تنقید"، باب ۱۰ "طنز و مزاح" اور باب ۱۱ "رپورتاژ" ہے۔

Scanned by CamScanner

میں نے ۱۹۷۸ء کے ایڈیشن کی قدرے ورق گردانی کی تو یہ تسامحات دکھائی دیے۔
ص ۶۸ پر مظہر جانِ جاناں کا زمانہ ۱۱۱۱ء تا ۱۱۹۵ء دیا ہے۔ عیسوی لکھنا سہوِ کتابت ہے، ہجری ہونا چاہیے۔ ص ۱۰۹ پر اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء ہے حالانکہ ۱۸۷۳ء یا ۱۸۷۷ء کہا جاتا ہے۔ صحیح ۱۸۷۳ء ہے۔ لکھا ہے کہ وہ ۱۹۱۵ء میں انگلستان گئے۔ یہ سہوِ کتابت ہے۔ وہ ۱۹۰۵ء میں ولایت گئے۔ ص ۱۲۳ پر جوش ملیح آبادی کا انتقال ۱۹۷۳ء میں لکھا ہے، گو یہ اس ایڈیشن کے بعد ۱۹۸۲ء میں فوت ہوئے۔ ص ۱۰۷ پر برج نرائن کا تخلص چکبست اور ص ۱۳۰ پر آنند نرائن کا تخلص ملا لکھا ہے گو یہ دونوں کشمیری پنڈتوں کے عائلی نام ہیں، تخلص نہیں۔

ص ۱۶۰ پر "سب رس" کی تاریخ ۸۴۵ھ لکھی ہے جو سہوِ کتابت ہے۔ مؤلف نے مسودے میں صحیح تاریخ ۱۰۴۵ھ لکھی ہوگی۔ ۱۰ میں صفر ہزار کے عدد ایک سے مل گیا ہوگا جسے کاتب نے ۸۴۵ھ پڑھ لیا۔ ص ۱۶۵ پر لکھتے ہیں کہ حیدری نے ۱۸۱۰ء میں "طوطا مینا" لکھی۔ اس سلسلے میں ضیا بخشی (کذا، صحیح: نخشبی) اور ملا سید محمد قادری کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ "طوطا کہانی" کا ذکر ہے۔ اس کی تاریخ ۱۸۰۱ء ہے جسے ۱۸۱۰ء بنا دیا گیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ ۱۸۰۵ء میں "مثنویِ حیدری" لکھی گئی۔ تاریخ اور نام دونوں غلط ہیں۔ صحیح تاریخ ۱۸۰۹ء ہے اور مثنوی کا نام "ہفت پیکر" ہے۔ ص ۱۶۷ پر نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق" کی تاریخ ۱۸۱۲ء لکھی ہے۔ حیرت ہے کہ یہ ۱۹۹۰ء کے ایڈیشن میں بھی قائم ہے۔ صحیح ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۳ء ہے۔

میں نے تاریخ کا مفصل باقاعدہ جائزہ نہیں لیا۔ ورق گردانی میں بادی النظر میں جو تسامحات دکھائی دے گئے، ان کا ذکر کر دیا ہے۔ یقینی ہے کہ ایسے تسامحات اور بہت ہوں گے۔ ان کے باوجود میں یہ مانتا ہوں کہ نصابی تاریخوں میں یہ کتاب بُری نہیں۔ سنین کا التزام ہے لیکن احتیاط سے کام نہیں لیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر: "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ اس کے پہلے ایڈیشن کا مسودہ ۱۹۷۰ء میں تقریباً مکمل تھا۔ انھوں نے طبعِ اول کی تاریخ نہیں لکھی۔ ۱۹۷۱ء یا ۱۹۷۲ء رہی ہوگی۔ اس کے بعد وہ ہر ایڈیشن میں کچھ حذف و اضافہ کرتے رہے ہیں۔ ساتواں ایڈیشن فروری ۱۹۸۱ء میں آیا اور فی الوقت یہی میرے سامنے ہے۔ ۱۹۸۳ء میں نواں ایڈیشن آ چکا تھا۔ معلوم نہیں اب تک کتنے ایڈیشن نکل چکے ہوں گے۔ ۱۹۸۱ء کے ایڈیشن میں ۳۶۸ صفحات ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں

Scanned by CamScanner

آتا کہ اسے "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ احتشام حسین کی کتاب "اردو کی کہانی" بھی ایک تاریخِ ادب ہے۔ یہ اصلاً ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ پے بہ پے آٹھ ایڈیشن نکلے۔ بعد میں ترقیِ اردو بیورو نئی دہلی نے اس کا نیا ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ اس میں ۱۰۴ صفحات ہیں۔ میں نے اس باب میں جن تاریخوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے زیادہ تر میں سلیم اختر کی کتاب سے کم صفحے ہیں۔

یہ تاریخ محققانہ نوعیت کی نہیں، نصابی ہے۔ اندازِ گفتار میں ہر جگہ علمی سنجیدگی نہیں، صحافیانہ اور بولی ٹھولی کا انداز اختیار کرنے کا لپکا ہے، مثلاً یہ عنوانات ملاحظہ ہوں:

تبسم کی کرنیں۔ فلسفہ اور تنقید کی نکمیاں۔ ٹھہرے پانی میں پتھر۔ ادبی کھاد۔ ناز و انداز کا اسلحہ خانہ، ریختی۔ پھول جمع کرنے والے۔ انشائیے کا سیاپا۔

تحقیقی کتاب میں ہم گفتگو کا یہ انداز سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر اس کتاب میں ذاتی نوک جھونک بھی ہے، مثلاً یہ عنوان:

> تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، المعروف بہ حکایاتِ عجیب و غریب اور لطائفِ دل پذیر۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے لکھتے ہیں:

> "اردو شاعری کا مزاج" ایک نزاعی کتاب ہے جس کا رشید ملک نے "معاصر" میں مطبوعہ مقالہ "طلائی تثلیث" میں جدید ترین علوم کی روشنی میں پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے بنیادی تھیسس کو لغو اور بے معنی ثابت کیا۔ انھوں نے سرقے کی مثالیں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کی علمیت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔
>
> (ص ۹۱-۲۹۰)

"ڈاکٹریٹ اور تحقیق" کے عنوان کے تحت یہ حیرت انگیز اصول تراشتے ہیں:

> اصولاً ڈاکٹریٹ کا تحقیق کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے اور نہ ہی ڈاکٹر محقق ہوتا ہے۔ (ص ۲۸۶)

اگر ڈاکٹریٹ تحقیق سے غیر متعلق ہوتی ہے تو یہ کیا ہے؟

لیکن اس تاریخ میں کہیں کہیں کام کی تحقیقی معلومات بھی مل جاتی ہیں، مثلاً ص ۷-۱۳۶ پر مستشرقین کے بارے میں یا ص ۱۶۱ پر "یورپ میں باغ و بہار" یا "چکوال میں اردو" کے تحت شاہ مراد (تاریخِ وفات ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء) کا ایسا ریختہ جس کے تین اردو اشعار میں محض ایک شعر میں نصف مصرع فارسی کا ہے۔ انشائیے کے بارے میں اطلاع دیتے

Scanned by CamScanner

آتا کہ اسے "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ احتشام حسین کی کتاب "اردو کی کہانی" بھی ایک تاریخِ ادب ہے۔ یہ اصلاً ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ پے بہ پے آٹھ ایڈیشن نکلے۔ بعد میں ترقیِ اردو بیورو نئی دہلی نے اس کا نیا ایڈیشن ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ اس میں ۱۰۴ صفحات ہیں۔ میں نے اس باب میں جن تاریخوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے زیادہ تر میں سلیم اختر کی کتاب سے کم صفحے ہیں۔

یہ تاریخ محققانہ نوعیت کی نہیں، نصابی ہے۔ انداز گفتار میں ہر جگہ علمی سنجیدگی نہیں، صحافیانہ اور بولی ٹھولی کا انداز اختیار کرنے کا لپکا ہے، مثلاً یہ عنوانات ملاحظہ ہوں:

تبسم کی کرنیں۔ فلسفہ اور تنقید کی تکھیاں۔ ٹھہرے پانی میں پتھر۔ ادبی کھاد۔ ناز و انداز کا اسلحہ خانہ، ریختی۔ پھول جمع کرنے والے۔ انشائیے کا سیاپا۔

تحقیقی کتاب میں ہم گفتگو کا یہ انداز سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر اس کتاب میں ذاتی نوک جھونک بھی ہے، مثلاً یہ عنوان:

> تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، المعروف بہ حکایاتِ عجیب و غریب اور لطائفِ دل پذیر۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے لکھتے ہیں:

> "اردو شاعری کا مزاج" ایک نزاعی کتاب ہے جس کا رشید ملک نے "معاصر" میں مطبوعہ مقالہ "طلائی تثلیث" میں جدید ترین علوم کی روشنی میں پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے بنیادی تھیسس کو لغو اور بے معنی ثابت کیا۔ انھوں نے سرقے کی مثالیں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کی علمیت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔
>
> (ص ۹۱-۲۹۰)

"ڈاکٹریٹ اور تحقیق" کے عنوان کے تحت یہ حیرت انگیز اصول تراشتے ہیں:

> اصولاً ڈاکٹریٹ کا تحقیق کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے اور نہ ہی ڈاکٹر محقق ہوتا ہے۔
>
> (ص ۲۸۶)

اگر ڈاکٹریٹ تحقیق سے غیر متعلق ہوتی ہے تو یہ کیا ہے؟

لیکن اس تاریخ میں کہیں کہیں کام کی تحقیقی معلومات بھی مل جاتی ہیں، مثلاً ص ۷-۱۳۶ پر مستشرقین کے بارے میں یا ص ۱۶۱ پر "یورپ میں باغ و بہار" یا "چکوال میں اردو" کے تحت شاہ مراد (تاریخِ وفات ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء) کا ایسا ریختہ جس کے تین اردو اشعار میں محض ایک شعر میں نصف مصرع فارسی کا ہے۔ انشائیے کے بارے میں اطلاع دیتے

Scanned by CamScanner

ہیں کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے اختر اورینوی نے ۱۹۴۴ء میں استعمال کی۔ سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کا مجموعہ "ترنگ" ۱۹۴۴ء میں پٹنہ سے شائع ہوا جس کے دیباچے میں اختر اورینوی نے اس اصطلاح کا استعمال کیا (ص ۳۱۹)۔ یہ بات میں نے کہیں اور بھی پڑھی ہے۔

"اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ" کے عنوان کے تحت مطلع کرتے ہیں کہ وہ ماہ لقا چندا نہیں، لطف النسا امتیاز ہے جس کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں یعنی چندا کے دیوان سے ایک سال قبل مرتب ہوا تھا (ص ۸۴)۔ ان سے پہلے نصیر الدین ہاشمی یہ انکشاف کر چکے ہیں۔ انھوں نے "دکن میں اردو" ص ۴۴۱ پر امتیاز کے دیوان اور ص ۴۷۹ پر چندا کے دیوان کی ترتیب کی تاریخیں لکھی ہیں۔ پہلی خاتون ناول نگار کے سلسلے میں وقار عظیم کے ایک مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ رشیدۃ النسا بیگم والدہ محمد سلیمان بیرسٹر و ہمشیرہ شمس العلماء سید امداد امام صاحب ہیں۔ ان کا ناول "اصلاح النسا" ۱۸۸۱ء میں پٹنہ سے شائع ہوا (ص ۳۱۳)۔

کتاب میں تحقیقی اغلاط کافی ہیں۔ ان کی نشان دہی ضروری نہیں۔ آخری چند ابواب میں ۶۵ جدید اردو ادیبوں کے بارے میں مفید تنقیدی مشاہدات ہیں، لیکن یہ پاکستانی ادیبوں تک محدود ہیں، کسی ہندوستانی ادیب کا نام نہیں لیا۔ یہ تفریق حیران کن ہے۔

امیر حسن نورانی و عظیم الحق جنیدی: "جدید تاریخِ ادب اردو"

یہ تاریخ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ میں نے کہیں اس کا حوالہ پڑھا ہے، لیکن کتاب کہیں سے نہ مل سکی، نہ کوئی اس کے بارے میں بتا سکا۔ لکھنؤ میں دانش محل کے مالک نے وعدہ کیا تھا کہ امیر حسن نورانی سے دریافت کر کے بتائیں گے لیکن انھیں دنوں نورانی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ معلوم نہیں یہ جنیدی صاحب کی دوسری تاریخ پر کس حد تک منحصر ہے۔

سید ابوالعاصم رضوی ایم اے: "اردو ادب کی تاریخ" حصۂ اوّل: نظم

اس کے نام سے پیشتر لکھا ہے، "اردو میں پہلی بار"، بعد میں اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ۱۵۰۰ ق م سے بیسویں صدی تک تمام لسانی، فکری اور ادبی تحریکوں کا جائزہ اور ان ادوار کے تقریباً ۲۰۰ نمائندہ شاعروں کی شعری تخلیقات پر تنقید و تبصرہ مع نمونہ کلام۔

Scanned by CamScanner

مصنف دہلی یونی ورسٹی کا ریسرچ اسکالر ہے اور ایک کتاب "اردو محاورے اور کہاوتیں" کا مصنف ہے۔ کتاب کو مجلسِ ترقیِ اردو، بارہ دری شیر افگن، دہلی نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ اس کا انتساب خاندانِ شریفی کے چشم و چراغ مسرور احمد خاں ابنِ حکیم محمود احمد خاں بن حکیم محمد احمد خاں کے نام ہے۔

پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ فی الوقت اردو ادب کی تاریخ پر تین قابلِ ذکر کتابیں ہیں:

۱۔ رام بابو سکسینہ کی۔

۲۔ مخمور اکبر آبادی کی "صحیفۂ تاریخِ اردو" جس میں گھن گرج، خود نمائی، ادعاے شخصی اور دلکشی اسلوب زیادہ ہے اور ادبی مواد کم۔

۳۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" جو مختصر تاریخِ ادبِ اردو کم اور مختصر تذکرۂ شعراے اردو زیادہ ہے۔ دوسری میں نمونۂ کلام بالکل نہیں، سوم میں کافی کم ہے۔

اس "پیش لفظ" پر تاریخ اگست ۱۹۷۵ء درج ہے۔ ظاہرا یہ مصنف پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" سے واقف نہیں جس کی پانچوں جلدیں ۱۹۷۲ء تک شائع ہو چکی تھیں۔ اپنی کتاب کی قدر افزائی کے لیے دوسری کتابوں کو ناقص قرار دینا یا انھیں سرے سے نظر انداز کرنا ضروری سمجھ لیا گیا۔

اس کتاب میں ۱۷ باب ہیں۔ پہلا باب ۱۵۰۰ ق م تا ۱۰۰۰ء۔ میرے لیے یہ نئی اطلاع ہے کہ اردو ادب کی تاریخ اس عہدِ عتیق سے شروع کی جا سکتی ہے۔ بہرحال اس باب میں ۱۰۰۰ء کے بہت بعد کے چندر بھان برہمن اور افضل مصنفِ "بکٹ کہانی" تک کا ذکر آ گیا ہے۔ دوسرا باب "دکن میں اردو" ہے۔ اس میں عین الدین گنج العلم کے رسالوں کا ایک سطری ذکر ہے (ص۲۵)۔ نظامی کے معاصر دکنی شعرا میں امیر حسن (سجزی)، سید اکبر حسینی اور نظیری کو بھی لے لیا (ص۲۶)۔ ۲۷ پر اشرف بیابانی کی ایک تصنیف "قصۂ آخرالزماں" کا ذکر کیا ہے گو یہ کہیں نہیں ملتی۔ ابراہیم عادل شاہ کی "نورس" کو علمِ موسیقی کی کتاب کہا ہے (ص۲۹)، یہ ابراہیم کے گیتوں کا مجموعہ ہے، جن کی ابتدا میں اُس راگ کا نام درج کر دیا ہے جس میں یہ گایا جانا چاہیے۔ ص۳۳ پر نصرتی کی ایک کتاب "کلیاتِ نصرتی" کا بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ اس نام کی کوئی کتاب نہیں۔

تیسرا باب "ولی اور اس کا دور" ہے۔ اس میں ولی، بحری اور سراج وغیرہ کا ذکر ہے۔

چوتھا باب "شمالی ہند کا ابتدائی دور" ہے۔ اس میں پہلے سیاسی سماجی پس منظر دیا ہے پھر مظہر و حاتم تک کا ذکر ہے۔ پانچواں باب "دبستانِ دہلی (میر و سودا کا عہد)" ہے۔ چھٹا باب

Scanned by CamScanner

"قدما کا دور" ہے جس میں میراثر، فراق اور قمرالدین منت کا ذکر ہے۔ پانچ صفحوں کا یہ باب غیر ضروری ہے۔ یہ شعرا اس سے پہلے یا بعد کے دور میں سمائے جا سکتے تھے۔ ساتواں باب "دبستانِ لکھنؤ" ہے۔ اس میں تہذیبی پس منظر اچھا ہے۔ اس میں جرأت، انشا، مصحفی اور رنگین کا بیان ہے۔ آٹھواں باب "مثنوی" ہے جس میں صرف میر حسن پر لکھا ہے۔ نواں باب نظیر اکبر آبادی ہے۔ دسواں باب "دہلی کے شعرائے متوسطین" ہے جن میں شاہ نصیر، مومن، غالب، ذوق، ظفر اور ممنون شامل ہیں۔

گیارھواں باب "لکھنؤ کے شعرائے متوسطین" آتش و ناسخ کے بارے میں ہے۔ بارھواں باب "مرثیہ" ہے جس میں انیس و دبیر کا ذکر ہے۔ تیرھواں باب "لکھنؤ کے شعرائے متوسطین" ہے جو ناسخ اور آتش کے شاگردوں کے بارے میں ہے۔ پندرھواں باب "دورِ جدید" آزاد، حالی، شبلی، اسماعیل پانی پتی، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، چکبست اور شاد عظیم آبادی وغیرہ کا بیان کرتا ہے، سولھواں باب "دورِ حاضر" بہت بڑا باب ہے جو تذکرۂ شعرا ہے۔ سترھواں باب "اردو ادب کے چند رجحانات اور تحریکیں" نہایت مختصر، یعنی محض چھے صفحوں کا ہے۔

کتاب میں متعدد غیر مشہور شعرا شامل ہیں۔ شعرا کا بیان خاصا مختصر ہے۔ شعرا کے سنینِ ولادت و وفات اکثر دیے ہیں، گو تحقیقی اعتبار سے کتاب کمزور ہے۔ سرسری تنقیدی تاریخ ہے جو بسا غنیمت ہے۔ میرے علم کی حد تک اس کا "حصۂ دوم: نثر" نہیں آیا۔

میتھیوز، شیکل اور شاہ رخ حسین: اُردو لٹریچر (انگریزی)

انگریزی کی اس کتاب کے تین مولفین ہیں ۱۹۸۵ء میں ڈیوڈ جون میتھیوز اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقین اسٹیڈیز، لندن یونی ورسٹی میں اُردو اور نیپالی کے لیکچرر تھے۔ سی شیکل (C. Shacle) اسی اسکول میں جنوبی ایشیا کی زبانوں کے ریڈر تھے اور خاتون شاہ رخ حسین اُردو کی ریسرچ اسکالر۔ ان کا موضوع تحقیق "بیسویں صدی کی اُردو شاعری" تھا۔ ہندوستانی یونی ورسٹیوں میں تو کوئی اس موضوع کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے شایاں نہ سمجھتا۔ کتاب کا ناشر اُردو مرکز لندن ہے۔ حیرت ہے کہ مغرب میں چھپی اس کتاب پر کہیں سنہ اشاعت نہیں دیا۔ اُردو مرکز کے افتخار عارف کے پیش لفظ نیز مولفین کے دیباچے پر لندن ۱۹۸۵ء تاریخ درج ہے، ماہ و یوم نہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ اسی سال شائع ہو گئی ہو گی۔ یہ اُردو مرکز کی دوسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۸۲ء میں رالف رسل کا مرتبہ مجموعۂ مضامین "برطانیہ میں اُردو" شائع ہوا تھا۔

Scanned by CamScanner

مؤلفین لکھتے ہیں کہ یہ مختصر کتاب اُن قارئین کے لیے ہے جو پہلے سے اُردو ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور غالباً بعد میں بھی اس کا گہرا مطالعہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس لیے اُنھوں نے سنین کم سے کم دیے ہیں۔ ابتدائی ابواب میں مندرجہ سنین کے لیے یہ معرکے کی صراحت کی ہے کہ انھیں قطعی نہیں، بلکہ تقریبی سمجھا جائے۔ دیباچے کے اس اعتراف سے طے ہوجاتا ہے کہ یہ تاریخ تحقیقی نہیں بلکہ اُردو ادب کا ایک تعارف بھر ہے۔ ظاہرا ایسے کتابچے کو میری اس کتاب میں جگہ نہیں ملنی چاہیے تھی جس میں عالمانہ تحقیقی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خود مجھے اس کتاب کے مشمول پر ہزار تامل تھا لیکن محض جامعیت کی خاطر اس کے مشمولات کا مختصر ترین تعارف پیش کررہا ہوں۔ کتاب کے مؤلفین نے دیباچے میں یہ بھی واضح کردیا ہے کہ اُردو شعری نمونوں کو انگریزی منظوم ترجمے میں پیش کیا ہے۔ چھوٹے سائز کی اس کتاب میں محض دس ابواب ہیں جو ۱۳۲ صفحات کو محیط ہیں۔ ان کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ زبان اپنے سیاق میں، ۲۔ ادب اور اس کے موضوعات، ۳۔ سلاطین اور شعرا، ۴۔ شہنشاہیت اور اس کا زوال، ۵۔ خروج اور نفاست (refinement)، ۶۔ لکھنؤ اور نثر کا فروغ، ۷۔ غالب اور لال قلعہ، ۸۔ ردِ عمل اور اصلاح، ۹۔ اقبال اور اس کا عہد، ۱۰۔ آزادی اور اس کے بعد۔

پہلے باب کی ابتدا میں لکھتے ہیں کہ اُردو ہمیشہ برِصغیر کے مسلمانوں سے براہِ راست وابستہ رہی ہے (ص۱)۔ سیاسی اور لسانی پس منظر کے بعد اُردو کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "نئی مشترکہ زبان قدیم پنجابی کی کسی شکل اور فارسی کی آمیزش سے بنی ہوگی۔ اُردو میں اب بھی کچھ پنجابی روپ موجود ہیں۔ دلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد قدیم ہندی، فارسی کی غالب حصے دار بنی ہوگی (ص۶)۔ دوسرا باب "ادب اور اس کے موضوعات" ہے جس میں اصناف کا تعارف ہے۔ غزل کو سب سے زیادہ صفحات دیے ہیں، قطعے او رباعی کو چند سطور۔ اس کے بعد مثنوی، مرثیے اور نظم کا قدرے زیادہ بیان ہے۔ تیسرے باب "سلاطین اور شعرا" میں زیادہ تر ممتاز دکنی شعرا کا ذکر ہے جن میں محمد قلی قطب شاہ اور ولی کو زیادہ صفحات دیے ہیں۔ ان کے بعد خان آرزو، حاتم، مظہر اور سراج اورنگ آبادی کا مختصر بیان ہے۔

Scanned by CamScanner

سراج کو ولی کے فوراً بعد دینا بہتر ہوتا۔ چوتھے باب "شہنشاہیت اور اس کا زوال" میں سودا، میر اور میر درد پر لکھا ہے۔"

پانچویں باب "عروج اور لطافت" میں لکھتے ہیں کہ

"اودھ دلّی کے قبضے سے ۱۷۵۴ء میں آزاد ہوا"۔ (ص ۵۸) دراصل سعادت خاں برہان الملک نے ۱۱۳۳ھ/۲۱۔۱۷۲۰ء میں اودھ کی صوبے داری حاصل کرلی تھی۔ علاحدہ شاہی کا اعلان غازی الدین حیدر نے ۱۸۱۹ء میں کیا۔ اس باب میں مصحفی، انشا، ناسخ، آتش، نواب مرزا شوق اور مثنوی زہرِ عشق، نسیم کی مثنوی، واجد علی شاہ اور میر حسن کا ذکر ہے۔ نسیم اور واجد علی شاہ کے بارے میں تین تین سطریں ہیں جن کے بعد میر حسن پر تقریباً تین صفحے ہیں۔ نسیم کا ذکر پہلے اور میر حسن کا ان کے بعد تاریخی ترتیب کے خلاف ہے۔ میر حسن تو اس باب کے سب سے سینیر شاعر ہیں۔ ان کو اس باب کے شعرا میں سب سے پہلے جگہ ملنی چاہیے تھی۔

چھٹا باب "لکھنؤ اور نثر کا فروغ" ہے۔ ابتدائی کئی صفحے مرثیے کے بارے میں ہیں جن کے بعد کلکتے کے فورٹ ولیم کالج کا ذکر ہے۔ اس میں صرف ایک شخص گل کرسٹ اور ایک کتاب "باغ و بہار" کا نام ہے۔ کسی اُردو مصنّف کا نام نہیں۔ یہاں تک کہ صفحات باب کے عنوان کے تحت نہیں آئے۔ ان کے بعد میں مرزا رجب علی بیگ سرور اور "فسانۂ عجائب"۔ ان کے تعلق سے داستان کے بارے میں چند جملے لکھ کر کہتے ہیں کہ انیسویں صدی میں سب سے مقبول قصّے "پنچ تنتر" کی روایتیں (کلیلہ ودمنہ) اور داستانِ امیر حمزہ تھے۔ پھر نول کشور پریس، سرشار اور فسانۂ آزاد، شرر، رسوا و امراؤ جان ادا اور نظیر اکبر آبادی کا ذکر ہے۔ "فسانۂ عجائب" کو ایک پیرا اور امراؤجان ادا کو سوا صفحہ دیا ہے۔ حیرت ہے کہ اس باب کے آخری دو صفحے نظیر اکبر آبادی پر ہیں جو نہ لکھنؤ سے متعلق تھے، نہ نثر سے۔ ان کا ذکر کسی اور باب میں آنا چاہیے تھا۔

ساتواں باب "غالب اور لال قلعہ" ہے۔ اس کی ابتدا میں لکھتے ہیں کہ فرحت اللہ بیگ نے ایک خیالی مشاعرے کا ذکر کیا ہے جس کی خود بادشاہ نے صدارت کی (ص ۸۳)۔ ظاہر ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ اس بزمِ شعر کے میرِ مشاعرہ مرزا فخرو تھے، بادشاہ نہیں۔ اس باب میں ظفر، ذوق، مومن، غالب اور شیفتہ کا ذکر ہے جن میں سب سے زیادہ صفحات غالب کو دیے ہیں۔ آٹھویں باب کا عنوان "ردِ عمل اور اصلاح" ہے۔ جس میں قدیم و جدید دو نول روایتوں

Scanned by CamScanner

کے شاعروں کو ملا جلا کر لیا ہے۔ ان میں داغ، محمد حسین آزاد، سرسید، حالی (مسدس، غزل اور مقدمہ شعر و شاعری)، نذیر احمد اور اکبر الٰہ آبادی پر لکھا ہے۔ شبلی کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔

نواں باب "اقبال اور اس کا عہد" ہے۔ اس میں اقبال پر بہت تفصیل سے لکھا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ایران اور اسلامی دنیا پر اقبال کی فارسی شاعری کا کوئی اثر نہیں ہوا (ص ۱۱۱)۔ باب کے آخر میں ڈھائی صفحے پریم چند پر ہیں، کسی دوسرے ادیب کو نہیں لیا۔ آخری باب کا عنوان "آزادی اور اس کے بعد" ہے۔ اس کی ابتدا میں ترقی پسند تحریک کا ذکر ہے جس کے بعد منشی جگر، اصغر، جوش، میراجی، ن۔ م۔ راشد اور فیض پر لکھا ہے۔ انھیں پر کتاب ختم ہوجاتی ہے۔ آخر میں دو صفحوں سے کم کا اشاریہ ہے۔

کتاب میں زیادہ تر شاعری پر توجہ کی ہے لیکن امیر مینائی، حسرت موہانی اور فراق کا نام نہیں آیا۔ نثر میں ناول و افسانہ پر تقریباً لکھا ہی نہیں۔ پریم چند کا ذکر ہے لیکن گئودان کا نہیں۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر سے بھی صرف نظر کیا ہے۔ صنف ڈراما کے بارے میں ایک لفظ نہیں، اس لیے "انار کلی" کا نام بھی نہیں آیا۔ یہ کتابچہ تحقیقی تو ہے نہیں، تنقیدی جائزے کے اعتبار سے بھی اس میں گہرائی نہیں۔ اس کا بنیادی مقصد انگریزی بولنے والوں کو اُردو ادب کی مبادیات سے واقف کرانا ہے اور اس مقصد میں کتاب ناکام نہیں۔ میری زیر نظر کتاب میں اُردو کی جتنی ادبی تاریخوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں یہ کتاب سب سے زیادہ تشنگی ہے، اس لیے میں نے اس کے مشمولات بیان کردیے ہیں، تنقید تقریباً نہیں کی۔

رالف رسل: "اردو ادب کا تعاقب"

اس انگریزی تاریخ کے سرورق پر اس کا نام یوں لکھا ہے۔

The Pursuit of Urdu Literature - A Select History

یعنی "اردو ادب کا تعاقب۔ ایک منتخب تاریخ" فلیپ کا پہلا جملہ ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کی ایک منتخب ذاتی تاریخ ہے، لیکن اندر جا کر یہ لکھا ہے کہ یہ جلد عُمر بھر کی ریسرچ اور غور و فکر کا ثمرہ ہے۔ یہ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس دہلی اور دوسرے مقامات سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے پیش لفظ پر کوئی تاریخ درج نہیں، لیکن اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب کو "منتخب ذاتی تاریخِ اردو ادب" کہہ سکتے ہیں۔ "منتخب تاریخ"، "ذاتی تاریخ" یہ نئی اصطلاحات ہیں جن کا مقصد ایک غیر جامع، تشنہ، ناکافی کام کا جواز فراہم کرنا ہے۔ یہ کوئی باقاعدہ تاریخ

Scanned by CamScanner

ادب نہیں، بلکہ متفرق تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو نہ جاننے والے انگریزی بولنے والوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔

"پیش لفظ" میں بتاتے ہیں کہ اس کتاب کی داغ بیل ان مضامین سے پڑی جو پچھلے ۲۰ سال سے زیادہ کی مدت میں لکھے گئے۔ ہر باب اپنے آپ میں مکمل اور خود مکتفی ہے۔ کتاب جامع نہیں، اس میں ہر اہم مصنف اور اہم موضوع کا ذکر نہیں، نہ مختلف موضوعات کو یکساں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ابواب (مضامین) کو تاریخی اعتبار سے مرتب کر دیا ہے۔ آدھے سے زیادہ ابواب خاص اس کتاب کے لیے لکھے گئے، بقیہ مضامین پر بھی، اس مجموعے میں شامل کرتے وقت، نظرِ ثانی کر دی گئی ہے۔ رالف رسل نے چودھری محمد نعیم کے مرتبہ مجموعے "Annal of Urdu Studies, 1987" میں ایک مضمون لکھا۔

How not to write the History of Urdu Literature

"اردو ادب کی تاریخ کیسے نہیں لکھنی چاہیے۔" یہ مضمون اپنی اُردو شکل میں اخبار "جنگ"، ۲۶-۲۵ جولائی ۱۹۸۹ء میں بھی شائع ہوا۔ اس میں انگریزی میں لکھی بعض تواریخِ ادب پر تبصرہ کیا ہے، لیکن رسل نے خود جو نمونہ پیش کیا ہے اسے تو تاریخِ ادب کہا بھی نہیں جا سکتا۔ اس میں میر سے پہلے کے اردو ادب کا ذکر ہے ہی نہیں۔ اس کی فہرستِ مضامین سے اس کے مشمولات اور محذوفات کا اندازہ ہو جائے گا۔

کتاب کے شروع میں Marion Moltino کا مضمون ہے "اردو شاعری سے تعارف" اس کے بعد متنِ کتاب کے تین حصے ہیں اور ان حصوں کے تحت ۱۴ باب ہیں:

پہلا حصہ کلاسیکی شاعری (اٹھارویں سے وسط انیسویں صدی)

۱۔ اردو ادب کی پہلی شگفت
۲۔ اردو غزل کی تفہیم
۳۔ میر، شاعر اور شخص
۴۔ غزلیاتِ غالب

دوسرا حصہ۔ برطانوی حکومت کے ردِ عمل کا ادب (۱۸۵۷ء تا ۱۹۲۲ء)

۵۔ راج اور مسلم ردِ عمل
۶۔ جدید ناول کا ارتقا
۷۔ نذیر احمد اور علی گڑھ تحریک
۸۔ شاعری کے بدلتے نظریے، آزاد اور حالی
۹۔ اکبر الہ آبادی کی طنزیہ نظمیں

Scanned by CamScanner

۱۰۔ اقبال اور اس کا پیغام

تیسرا حصہ۔ ادب اور جمہور (۱۹۲۰ء کا عشرہ اور مابعد)

۱۱۔ حصولِ آزادی اور مابعد

۱۲۔ پریم چند اور مختصر افسانہ

۱۳۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک

۱۴۔ فیض احمد فیض، شاعری، سیاست اور پاکستان

آخر میں پانچ اختتامی ملحقات ہیں:

مزید مطالعے کی تجاویز۔ مصنف (رالف رسل) کی کتابوں اور مضامین کا اشاریہ۔

تلفظ اور کتابت پر نوٹ، نوٹ اور حوالے، اشاریہ

متن کتاب ص ۲۱ سے ص ۲۴۷ تک، یعنی ۲۲۷ صفحوں کو محیط ہے۔ اس کا نواں باب "اکبر الہ آبادی" ان کا اور خورشید الاسلام کا مشترکہ مضمون ہے جو ص ۱۲۹ سے ۱۷۵ تک، یعنی ۴۷ صفحوں پر ہے۔ پوری کتاب میں صرف سات ادیبوں کو پورے باب دیے گئے ہیں، یعنی میر، غالب، نذیر احمد، اکبر، اقبال، پریم چند اور فیض کو۔ آزاد اور حالی ایک مختصر باب میں ایک دوسرے کے دوش بدوش بیٹھے ہیں۔

دکنی ادب، میر سے پہلے کے ادیب، سودا، درد، میر حسن، دیاشنکر نسیم، ذوق، مومن، امیر، داغ، چکبست، نیاز اور جوش بالکل چھوٹ گئے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج، ادبِ لطیف، انشائیہ، حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ خود انھوں نے شروع ہی میں لکھ دیا ہے کہ کتاب میں تمام اہم ادیب اور تمام اہم موضوع نہیں لیے گئے، لیکن جس کتاب میں اتنے سارے اہم ادیب اور اہم موضوعات غیر حاضر ہوں اسے تاریخِ ادب نہیں کہہ سکتے، یہ ایک ذاتی مقالوں کا مجموعہ ہے اور بس۔

پہلے باب کا یہ مشاہدہ دلچسپ ہے:

> ہمارے لیے ہندوستانی تاریخ کا مُسلم زاویۂ نظر اہم ہے کیونکہ اردو ادب ہمیشہ مسلم ادب رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں اسلام کا درس دیا جاتا ہے، بلکہ اس میں بیش تر برِ عظیم کی مُسلم جماعت کے تجربات بیان کیے جاتے ہیں۔
>
> (ص ۲۱)

دوسرا باب "غزل کی تفہیم" شخصی تاثر ہونے کی وجہ سے دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں کہ انگریزی بولنے والے مغربی قارئین کے لیے غزل کو سمجھنا اور اس کی قدرشناسی بہت مشکل

Scanned by CamScanner

ہے۔ وہ غزل کے عشق، غزل کے عاشق اور محبوب کے کردار، رقیب اور شیخ وغیرہ کو نہیں سمجھ پاتے۔ غزل کی ریزہ خیالی انھیں بوکھلاتی ہے۔ غزل کی رسی پر بیش قیمت جواہر، خزف اور کانچ ایک ساتھ ٹانک دیے جاتے ہیں۔ غزل کے محبوب کی جنس مغربی قارئین کی فہم سے بالاتر ہے۔ غزل ناجائز عشق کا بیان کرتی ہے۔

میر اور غالب کو علاحدہ ابواب میں لیا ہے لیکن ان کی تنقید کا حق ادا نہیں کر پائے۔ چھٹے باب "جدید ناول کا ارتقا" میں داستانوں پر بھی کافی لکھ دیا ہے جو مناسب نہیں۔ "فسانۂ آزاد" کے لیے لکھتے ہیں کہ داستانوں سے اس کے انسلاک کے باوجود اس میں جدید ناول کے اہم عناصر پائے جاتے ہیں (ص ۹۲)۔ نذیراحمد کی "توبۃ النصوح" کے لیے لکھتے ہیں کہ نذیراحمد کے علی الرغم انگریزی بولنے والے قاری کی ہم دردی کلیم اور نعیمہ سے ہوگی (ص ۹۷)۔ نذیراحمد کے بیان کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> اگر نذیراحمد نے کہانیوں کو ترقی دینے کے بجاے ناول لکھنے کا انتخاب کیا ہوتا تو وہ کیا کچھ نہ کر گزرتے۔ (ص ۹۹)

شرر کی "فلورا فلورنڈا" کا قصہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس میں مسیحیت کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے آزردہ ہیں۔ شرر کے ناولوں کو داستان کے رنگ کا اور ان کے معاشقوں کو غزل کے انداز کا قرار دیتے ہیں۔ رسوا کی "امراؤ جان ادا" کو اردو کا پہلا واقعی ناول قرار دیتے ہیں اور اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

ناول کے باب میں نذیراحمد پر کافی لکھنے کے بعد دوبارہ ساتویں باب "نذیراحمد اور علی گڑھ تحریک" میں ان پر اور زیادہ تفصیل سے لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ابواب آزاد مضامین ہیں جو مختلف اوقات میں لکھے گئے، تبھی تو چھٹے باب میں ص ۹۲ پر نذیراحمد کا سنِ ولادت ۱۸۳۶ء اور ساتویں باب میں ص ۱۱۲ پر ۱۸۳۰ء لکھتے ہیں۔ صحیح ۳۱-۱۸۳۰ء ہی ہے۔ نذیراحمد پر افتخار احمد صدیقی کی کتاب "مولوی نذیراحمد، احوال و آثار" (مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء) سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی کی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اس کتاب کی بدولت رالف رسل نے اس باب کو اور محض اس کو تحقیقی انداز میں لکھا ہے۔ نذیراحمد کے بارے میں کئی انکشاف کیے ہیں:

۱۔ ۱۸۶۴ء سے کچھ پہلے کے برسوں میں ماسٹر رام چندر کے زیرِاثر نذیراحمد نے مسیحیت کے اصولوں کو پسند کیا۔ وہ عیسائی ہونا چاہتے تھے لیکن اپنے مسلمان ساتھیوں کے دباؤ کی وجہ سے ایسا نہیں کیا (ص ۱۱۳)۔

۲۔ ایک انگریز افسر نے زمانۂ غدر کے اپنے تجربات قلم بند کیے۔ نذیراحمد نے اپنے

Scanned by CamScanner

ایک ہندو افسر کی ترغیب پر اس کتاب کا ترجمہ "مصائب غدر" کے نام سے کیا۔ بعد کے زمانے میں وہ اس ترجمے پر نادم تھے اور کبھی اس کے ذکر کے روادار نہ تھے کہ انھوں نے یہ تالیف کی (ص ۱۱۴)۔

۳۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہونے کے بعد نذیر احمد کو گانے اور ناچنے کا شوق ہو گیا تھا (ص ۱۱۴)۔ افتخار احمد نے اس بیان کا ماخذ نہیں دیا۔

۴۔ نذیر احمد نے کہا ہے کہ انھوں نے "مرأۃ العروس" اپنے بچوں کے لیے لکھی تھی۔ ڈائریکٹر تعلیم کیمپسن نے اسے اتفاق سے دیکھ لیا اور اس پر انعام دیا۔ افتخار احمد کے مطابق یہ نذیر احمد کا تراشا ہوا افسانہ ہے۔

میں نے نذیر احمد کا گہرا مطالعہ نہیں کیا، اس لیے مندرجۂ بالا انکشافات پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ آٹھویں باب میں آزاد کی "آبِ حیات" کا ذکر بہت سرسری، بلکہ سطحی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس میں محض سادہ تاریخ نگاری، نیز شاعروں کی زبان کی تبدیلی پر توجہ کی ہے لیکن مختلف ادوار کی خصوصیات کو وضاحت سے بیان نہیں کیا۔

فہرست مضامین میں دسویں باب کا عنوان "اقبال اور اس کی شادی" (Marriage) دیکھ کر حیرت ہوئی۔ متن کتاب میں ص ۱۷۶ پر اس کے عنوان میں لفظ "Message" (پیغام) ہے۔ حیرت ہے کہ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کی انگریزی کتاب میں طباعت کی اتنی مضحکہ خیز غلطی در آئی ہے۔ اقبال پر مفصل لکھا ہے لیکن آخر میں ایک عنوان "اقبال کی فکر کی تحدیدیں" میں ان سے اختلاف بھی کیا ہے (ص ۱۸۵)۔

باب ۱۱، "حصولِ آزادی اور اس کے بعد"، میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۲۰ء کے بعد اردو ادب صرف مسلم فرقے کا نہیں رہا، بلکہ اس میں ہر ملت کے لوگ: ہندو، مسلم، سکھ حصہ لینے لگے۔ ان میں پریم چند اور کرشن چندر ہندو اور بیدی سکھ تھے (ص ۱۹۱)۔ پریم چند کے باب میں زیادہ تر کہانیوں کے خلاصے پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی عینیت (آدرش واد) کی طرف توجہ دلائی ہے۔ باب ۱۳ "ترقی پسند مصنفین کی تحریک" غنیمت ہے گو اس میں واقعہ نگاری ہے یا افسانوں کے پلاٹ۔ ترقی پسندی کے نظریات کا جائزہ نہیں لیا۔ فیض احمد فیض کا باب مفصل ہے۔ ان کی سوانح تفصیل اور دلکشی کے ساتھ دی ہے۔

یہ کتاب تحقیقی تو ہے ہی نہیں، مجھے تنقید میں بھی کوئی بلندی نہیں دکھائی دیتی، ہاں مصنف کی غیر جانب داری ضرور قابلِ قدر ہے۔ آخر میں مزید مطالعے کے لیے جن کتابوں کے نام پیش کرتے ہیں، ان میں انگریزی میں لکھی ادبی تاریخوں کے ایک نقص کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ان میں بار بار انگریزی اور اردو ادب کا غیر متعلق تقابل کیا جاتا ہے جس میں

Scanned by CamScanner

اردو ادب کو فروتر دکھایا جاتا ہے۔ بیلی کی تاریخِ ادب کے لیے لکھتے ہیں کہ اس میں غیر اہم مصنفوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ تفصیلات دی ہیں اور اہم مصنفوں کے بارے میں بہت کم کہا گیا ہے۔ یہ اتنے خشک اور بے سوچے سمجھے اسلوب میں لکھی ہے کہ اسے پڑھنا مشکل ہے (ص ۴۹-۲۴۸)۔

اس ضمیمے سے انگریزی میں اردو کے بارے میں لکھی ہوئی بعض نئی کتابوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ اس کے آگے مصنف (رسل) کی اردو سے متعلق تحریروں کی کتابیات ہے جو سال بہ سال دی گئی ہے، لیکن زیرِ نظر کتاب کی کتابیات (فہرستِ مآخذ) نہیں، نہ باب کے آخر میں، نہ کتاب کے آخر میں۔ اشاریے میں متعدد ایسے اندراجات ہیں جن کا اردو میں رواج نہیں، مثلاً ادیبوں، کتابوں، اصناف، مقامات وغیرہ کے ساتھ ساتھ ایسے موضوعات کے اندراج بھی ہیں۔

Consultation, cow, crow, fox, husbands, kissings, landlords, leaders, owl, wine, Zindagi.

یہ غیر ضروری ہیں۔ اردو میں انھیں درج کرنے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی مجھ سے ملے تو انھوں نے مجھے اس نئی تاریخِ ادب کی اطلاع دی، میں نے اس سے پہلے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ انھوں نے الہ آباد سے مجھے یہ کتاب بھیجی۔ یہ محسوس ہوا کہ یہ تاریخ ادبِ اردو نہیں، اسے میری کتاب میں جگہ نہیں ملنی چاہیے لیکن چونکہ مصنف نے اسے "ایک ذاتی تاریخِ ادب" کہا ہے اس لیے اس کا ذکر کرنا ضروری ہو گیا۔ اس کتاب میں سنین زیادہ نہیں، جو ہیں وہ ٹھیک ہیں۔ بعض جگہ مجھے ایک سال کا فرق دکھائی دیا، لیکن چونکہ یہ کتاب محض تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس لیے سنین کا جائزہ بدمذاقی معلوم ہوا۔

میری جس کتاب میں "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو"، "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" اور جمیل جالبی کی تاریخِ ادب کا جائزہ لیا گیا ہو اس میں اس باب کی غیر تحقیقی، غیر اہم یا خالص نصابی تاریخوں کو شامل کرنا عدمِ توازن یا بدمذاقی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے جامعیت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کتب کا اچٹتا سا تعارف پیش کر دیا ہے گو قدرے بددلی کے ساتھ۔ تحقیق میں تو ان کتب کا مقام ہے ہی نہیں، تنقید کے اعتبار سے بھی یہ کوئی بلاغت نظر فراہم نہیں کرتیں۔ رسل کے استثنا کے ساتھ ان کی تالیف کا مقصد مشرقی جماعتوں، مثلاً

Scanned by CamScanner

ادیب فاضل یا انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طلبہ کو ایک مختصر کتاب میں پورے اردو ادب کا تعارف پیش کر دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر کے متعدد ایڈیشن نکلے، بعض صورتوں میں دس یا اس سے بھی زیادہ۔ یہ کتب اختصار کے لحاظ سے گاگر میں ساگر کا نمونہ ہیں۔ ابتدائی تعارف کے لیے یہ بری نہیں، لیکن صحیح تر معلومات کے لیے بڑی تاریخوں کو دیکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر نورالحسن نقوی: تاریخِ ادب اُردو

۴۷۲ صفحات کی یہ تاریخ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے ۱۹۹۷ء میں شائع کی۔ بک ہاؤس کے مالک اسد یار خاں نے ابتدائیے میں لکھا ہے کہ اسی ادارے سے عظیم الحق جنیدی کی تاریخ سال بہ سال ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہے۔ وہ بی۔اے ادیب اور ادیب ماہر کے طلبہ کے لیے مفید تھی۔ محسوس ہوا کہ ادیب کامل اور ایم۔اے کے طلبہ کے لیے زیادہ معلومات کی ضرورت ہے (ص۱۶)۔ سچ یہ ہے کہ یہ خالص نصابی کتاب اتنی مختصر اور سرسری ہے کہ ایم۔اے تو درکنار بی۔اے کے ڈھب کی بھی نہیں، جامعہ اُردو کے مختلف نصابوں کے لیے ضرور سودمند ہے۔ اس پر تحقیق و تنقید کی ضرورت نہیں۔ مختصر تعارف پیش کرتا ہوں۔

کتاب کے دو حصے ہیں نظم اور نثر۔ پہلے حصہ نظم:

پہلا باب اصنافِ شاعری ہے جس میں حمد، مناجات، نعت اور منقبت بھی شامل کی ہے۔ دوسرا باب اُردو شاعری کے دبستان ہے جس میں پانچ دبستان لیے ہیں: دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، رام پور اور جدید اسکول۔ تیسرا باب "دکن میں اُردو شاعری" ہے۔ چوتھے باب کا عنوان "اُردو شاعری شمالی ہند میں" ہے لیکن اس میں صرف دہلی کے قدیم شعرا مظہر اور فائز تک کا ذکر ہے۔ بعد کے ابواب کے عنوان یہ ہیں۔ ۵۔ "بہار میں اُردو"، ۶۔ "عہدِ میر و سودا"، ۷۔ "لکھنؤ میں اُردو شاعری کا پہلا دور"، ۸۔ "نظیر اکبر آبادی"، ۹۔ "اُردو شاعری کا عہدِ زرّیں"، ۱۰۔ "لکھنؤ میں زبان کی اصلاح"، ۱۱۔ "مرثیہ گوئی"، ۱۲۔ "رام پور کا ادبی مرکز"، ۱۳۔ "اُردو شاعری میں نئے رجحانات"، ۱۴۔ "جدید غزل" (اس میں صفی، جلیل، حسرت موہانی وغیرہ کا ذکر ہے، آزادی کے بعد کے جدیدیوں کا نہیں)۔ ۱۵۔ "شعرائے عہدِ جدید"، ۱۶۔ "ترقی پسند تحریک"، ۱۷۔ "نئی شاعری"، ۱۸۔ "گیت نگاری"، ۱۹۔ "طنز و مزاح"

اس کے آگے حصہ نثر ہے۔ اس کے ابواب کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ "اُردو نثر کا آغاز"، ۲۔ "فورٹ ولیم کالج"، ۳۔ "اُردو نثر ترقی کی راہ پر"،

Scanned by CamScanner

۴۔ "اُردو نثر کا عہدِ زرّیں"، ۵۔ "ناول"، ۶۔ "مختصر افسانہ"، ۷۔ "ڈراما"، ۸۔ "خاکا"،
۹۔ "انشائیہ"، ۱۰۔ "مقالہ، صحافت، رپورتاژ"، ۱۱۔ "طنز و مزاح"، ۱۲۔ "تحقیق"، ۱۳۔ "تنقید"۔

ص ۴۳۸-۴۳۹ پر ۲۱ محققوں کے نام گنوائے ہیں جن میں ۱۳ زندہ ہیں، تین مجھ سے بڑے، دس عمر میں چھوٹے۔ فہرست میں میرا نام نہیں۔ اس سے اپنی اوقات پہچاننے میں مدد ملی۔ ویسے اس فہرست میں مرحومین میں ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، شیخ اکرام، غلام رسول مہر، حسینی شاہد اور ہم عصروں میں جمیل جالبی، کالی داس گپتا رضا، نثار احمد فاروقی، عابد پیشاوری، اکبر حیدری، سیدہ جعفر، قدرت نقوی وغیرہ بھی غیر حاضر ہیں۔
بابِ تحقیق کی آخری دو سطروں میں یہ جملہ ملتا ہے۔

"مثنوی پر گیان چند اور گوپی چند نارنگ کا کام قابلِ توجہ ہے۔" (ص ۴۴۷)

اب تو ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں، کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

مختصر نصابی تاریخوں کے لکھنے والوں میں نورالحسن نقوی سب سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ امید ہے ان کی تاریخ میں واقعات کی کوئی غلطی نہ ہوئی ہوگی۔

حواشی:

(۱) غالباً اس سے مؤلف کی یہ مراد ہے کہ مترجم نے مصنف سے مختلف بیان دیا ہے۔ واضح ہو کہ اس تاریخ کے قدیم ایڈیشن میں ہر جگہ "سکینا" آخری الف سے لکھا ہے۔

(۲) سپرو: "اردو زبان" سال نامہ رسالہ "نیرنگِ خیال"، جنوری ۱۹۳۹ء، ص ۲۰-۱۹

(۳) میں نے تین تاریخیں حیدر آباد کے سفر میں دیکھی تھیں۔ یہ ہیں: چراغ علی حقیر کی "اردو کی ادبی تاریخ کا خلاصہ"، علامہ درد نکودری کی "تاریخِ ادبِ اردو" اور شرافت حسین مرزا کی "جائزہ تاریخِ اردو۔" یہ تینوں لکھنؤ میں کہیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ حیدر آباد سے میرے شاگرد ڈاکٹر محمد انورالدین، صدر شعبہ اردو، مرکزی یونی ورسٹی، حیدر آباد نے ان تینوں کی فہرستِ عنوانات کا عکس فراہم کیا جس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں۔

Scanned by CamScanner

انتیسواں باب

اردو کی ادبی تاریخ کا ارتقا

گزشتہ صفحات میں اردو کی جملہ قابلِ ذکر ادبی تاریخوں کا تحقیقی اور کسی حد تک تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ اردو میں ادبی تاریخ نگاری کا ارتقا کن خطوط پر ہوا اور آئندہ تاریخ لکھی جائے تو وہ کس انداز کی ہو۔ اب تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں کمال کا تنوع ملتا ہے، طرح طرح کے زمرے دکھائی دیتے ہیں، مثلاً میری زیرِ نظر کتاب اردو میں لکھی ہوئی ادبی تاریخوں کے جائزے پر مشتمل ہے، لیکن اس میں حسبِ ذیل انگریزی میں لکھی ہوئی تاریخوں کو بھی شامل کر لیا ہے۔

۱۔ رام بابو سکسینہ: "تاریخِ ادبِ اردو"

۲۔ گراہم بیلی: "تاریخ ادب اردو"

۳۔ اینی میری شمیل: "کلاسیکی اردو ادب"

۴۔ ڈاکٹر محمد صادق: "اردو ادب کی تاریخ"

۵۔ میتھوز، شیکل اور شاہ رخ حسین: "اردو لٹریچر"

۶۔ رالف رسل: "اردو ادب کا تعاقب"

۷۔ علی جواد زیدی: "اردو ادب کی تاریخ"

رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے اضافہ شدہ اردو ترجمے نے انگریزی اصل کو پس پشت ڈال کر گردِ گمنامی میں چھپا دیا ہے، اس لیے ایک طرح سے انگریزی کی چھ تاریخیں ہی سمجھیے۔

۱۔ کچھ تاریخیں محض نظم تک محدود ہیں، یعنی: آزاد: "آبِ حیات"، عبدالحی: "گلِ رعنا"، عبدالسلام ندوی: "شعرالہند"، محمد یحییٰ تنہا: "مرآۃ الشعرا۔"

۲۔ درسی تاریخوں میں:

محمد جمیل احمد بریلوی: "اردو شاعری کی مختصر تاریخ" اور ابوالعاصم رضوی کی "اردو ادب کی تاریخ حصۂ اول (نظم)"، محمود اکبر آبادی کی "صحیفۂ تاریخِ اردو" کا صرف حصۂ نظم شائع ہو سکا، حصۂ نثر سامنے نہیں آیا۔

Scanned by CamScanner

۳۔ کچھ تاریخیں محض نثر نگاروں تک محدود ہیں، یعنی: محمد یحییٰ تنہا: "سیر المصنفین"، محمد احسن مارہروی: "تاریخِ نثرِ اردو عرف نمونۂ منثورات"، حامد حسن قادری: "داستانِ تاریخِ اردو۔"

بقیہ سب تاریخیں نظم و نثر دونوں کی ہیں۔

۴۔ بیش تر تاریخیں مکمل ہیں، لیکن سات نامکمل رہ گئی ہیں، یہ ہیں۔

۱۔ ممورا کبر آبادی کی "صحیفۂ تاریخِ اردو" کی تصنیف تو مکمل ہو گئی لیکن شائع محض دو تہائی ہو سکی۔ بقیہ حصّہ طباعت سے محروم رہ گیا۔

۲۔ عبدالقیوم کی مرتّبہ "تاریخ ادب اردو" حصّۂ اوّل۔

۳۔ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی کی "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" حصّۂ اوّل۔

۴۔ لینی میری شِمِل کی "کلاسیکی اردو ادب۔" یہ ایک منصوبے کا جزو ہے، جسے شِمِل اور نارنگ لکھنے والے تھے۔ شِمِل نے لکھ دیا۔ دوسرا حصّہ "اقبال اور ان کے بعد" نارنگ کو لکھنا تھا، لیکن وہ بوجوہ نہ لکھ سکے۔

۵۔ ابوالعاصم رضوی: "اردو ادب کی تاریخ" حصّۂ اوّل (نظم)۔

۶۔ ڈاکٹر محمد انصاراللہ: "تاریخِ اقلیمِ ادب"، دو حصّے۔

۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخِ ادب اردو"، دو جلدیں۔

ان میں صرف جمیل جالبی کی تاریخ کا سلسلہ تسوید جاری ہے، وہ مکمل ہوگی۔ بقیہ کسی تاریخ کے بارے میں امکان نہیں کہ اس کی بقیہ جلدیں لکھی جائیں گی۔

بیشتر تاریخیں فردِواحد کی لکھی ہوئی ہیں، لیکن ذیل کی تاریخیں اجتماعی تحقیق کا نتیجہ ہیں، یعنی کئی مضمون نگاروں کے مقالوں کا مجموعہ ہیں۔

"تاریخِ ادبِ اردو" مرتّبہ عبدالقیوم، "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو"، "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند"، ۵ جلدیں۔

رشید حسن خاں کے الفاظ میں انھیں "پنچایتی کام سمجھا جائے گا۔ ان میں صرف آخری منصوبہ مکمل ہو سکا، اس سے پہلے کی دونوں تاریخیں پہلی جلد کے بعد ہی ڈھیر ہو گئیں۔ ترقیِ اردو بیورو، دہلی نے بھی چار جلدوں میں اردو ادب کی تاریخ لکھانے کا منصوبہ بنایا۔ پہلی جلد میں نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی شرکت میں لکھ کر بیورو کو دے دی۔ بقیہ جلدیں ایک ایک مصنف کے سپرد کی گئی تھیں۔ ابھی تک کسی نے نہیں لکھ کر دی۔

دو تاریخیں ایسی ہیں کہ ان کے مؤلفِ ثانی نے ایسے معتد بہ اضافے کیے ہیں کہ اب نقشِ اوّل ناقص اور محض نقشِ ثانی معتبر ہے۔ پہلی تاریخ رام بابو سکسینہ کی ہے جس کے

Scanned by CamScanner

اردو مترجم مرزا محمد عسکری کی تالیف نے انگریزی اصل کو غیر ضروری کر دیا ہے۔ دوسری کتاب اعجاز حسین کی "مختصر تاریخ ادب اردو" ہے جس میں ڈاکٹر عقیل رضوی نے اس کثرت سے ترمیم اور اضافے کیے کہ اب ترمیم شدہ ایڈیشن نے اصل نسخے کی جگہ لے لی ہے۔

۵۔ کچھ تاریخیں بنیادی حیثیت سے محض تنقیدی ہیں، یعنی عبدالسلام ندوی: "شعر الہند"، عبدالقادر سروری: "اردو کی ادبی تاریخ"، سید احتشام حسین: "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ"، رالف رسل: "اردو ادب کا تعاقب۔" درسی تاریخوں میں جمیل احمد بریلوی کی "اردو شاعری کی مختصر تاریخ" بھی بڑی حد تک تنقیدی ہے۔

کچھ تاریخیں بنیادی حیثیت سے نام شماری اور تحقیق پر زور دیتی ہیں، یعنی: بیلی: "تاریخ ادب اردو"، ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد کی "تاریخ ادب اردو" اور اینی میری شمل کی "کلاسیکی اردو ادب۔"

بقیہ تاریخوں میں تحقیقی اور تنقیدی پہلوؤں کا مناسب امتزاج ہے۔

۶۔ بعض تاریخیں شارع عام سے ہٹ کر کسی انوکھے انداز کی ہیں، مثلاً: احسن مارہروی کی "تاریخ نثر اردو عرف نمونۂ منثورات" کا مرکزی حصہ نثری نمونوں پر مشتمل ہے جس کے سرنامے کے طور پر کتاب، مصنف کے نام، سنہ وغیرہ کو ایک چارٹ کے خانوں میں محصور کر کے درج کیا ہے۔ آغا محمد باقر کی "تاریخ نظم و نثر اردو" رام بابو سکسینہ کے اردو ترجمے کی تلخیص ہے، جس پر مؤلف نے اپنے تبصروں کا نمک مرچ چھڑک کر پیش کیا ہے۔ احتشام حسین کی "اردو کی کہانی" بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ شمل کی تاریخ پوری کتاب نہیں، ایک کتاب کا جزو ہے۔ رالف رسل کی "اردو ادب کا تعاقب، ایک منتخب تاریخ" باضابطہ مسلسل تاریخ ادب نہیں، بلکہ ادب کے مختلف اجزا پر لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے جس کی وجہ سے ادب کے بڑے بڑے قطعے اور بعض اہم ادیب بزم سے باہر رہ گئے ہیں۔

درسی تاریخوں میں محمد چراغ علی حقیر کی "اردو کی ادبی تاریخ کا خلاصہ بطرز سوال و جواب" سروری صاحب کی کتاب "اردو کی ادبی تاریخ" کے مختلف ابواب پر کلاس روم کے انداز میں سوال و جواب کرتی ہے۔

۷۔ مواد تحقیق کی اہمیت کے اعتبار سے صرف حسب ذیل تاریخیں درخور التفات ہیں:

Scanned by CamScanner

شمس اللہ قادری: "اردوے قدیم"، حامد حسن قادری: "داستانِ تاریخ اردو"، عبدالقیوم: "تاریخِ ادبِ اردو" حصۂ اول، "علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو"، "تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند"، محمد انصاراللہ: "تاریخ اقلیمِ ادب"، جمیل جالبی: "تاریخ ادبِ اردو۔"

ادبی تاریخوں کی اس نوعیاتی گروہ بندی کے بعد اہم تاریخوں پر ایک چھلتی نظر ڈالی جاتی ہے۔

تذکروں سے گزر کر ادبی تاریخ کی داغ بیل ڈالنے کا فخر محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" کو حاصل ہے۔ اردو کے قدیم اور متوسط دور میں شاعری ہی ادب کی صدر مسند پر جلوہ افروز تھی، نثر کو نواحی صفوں میں جگہ دی جاتی تھی۔ تذکرے محض شاعروں تک محدود رہے، شاید آزاد نے انھیں کی تقلید میں "آبِ حیات" کو محض شاعروں کی تاریخ بنایا۔ ایک نحیف سا امکان یہ ہے کہ لاہور میں کسی نے اُن سے انگریزی ادب کی پہلی تاریخ ٹامس وارٹن کی "انگریزی شاعری کی تاریخ" (۱۷۷۴ء) کا ذکر کیا ہو۔ وارٹن نے پہلی بار شاعروں کا تذکرہ تاریخی ترتیب سے کیا۔ یہ جاننے کا کوئی وسیلہ نہیں کہ کن محرکات نے آزاد کو الفبائی تذکرے کے بجاے تاریخی ترتیب سے لکھنے کی ترغیب دی، لیکن انھوں نے اپنا تجربہ شاعروں تک محدود رکھا، نثر نگاروں پر ان کا دھیان نہیں گیا۔

"آبِ حیات" تاریخِ ادب ہے لیکن کلاسیکی انداز کی۔ اس میں حالات کے بیان کرنے پر زور دیا ہے، نقدِ شعر جو کچھ ہے قدیم انداز کی معرکہ آرائی، اعتراض و سند تک محدود ہے۔ اس زمانے میں ہم اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آزاد نے شعرا کے جو مفصل حالات لکھے، ان کے جوجیتے جاگتے چہچہاتے مرقع پیش کیے وہ ان کا بڑا کارنامہ قرار دیا جانا چاہیے تھا، لیکن افسوس! انھوں نے زبانی چٹخارے کے لیے صحت کی قربانی دینے میں کوئی مضائقہ نہ کیا۔ انھوں نے تاریخ کو توڑا مروڑا، واقعات کو مجروح کیا، لطیفے اور معرکے اختراع کیے، جُنبہ داری سے بھرپور کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "آبِ حیات" انشائیوں یا افسانوں کی کتاب کے طور پر دلکش و دلفریب ہے، لیکن تاریخِ ادب کی حیثیت سے سراسر غیر معتبر۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) کے ۴۰ سال بعد تک کوئی دوسری ادبی تاریخ نہیں لکھی گئی۔ چرنجی لال کی "اردو زبان کی تاریخ" (دہلی، ستمبر ۱۸۸۴ء) اردو کی تاریخی لسانیات کی کتاب ہے، تاریخِ ادب نہیں۔ جوگل واعظ لال ایم اے کی "اردو زبان کی تاریخ" (دہلی، ۱۹۲۰ء) نظر سے گزری۔ چھوٹے سائز کی پتلی کتاب ہے۔ یہ بھی اردو زبان کی تاریخ ہے لیکن اس کے دو مختصر باب نمبر ۱۰ "نئی اردو... نظم کا زمانہ" اور نمبر ۱۱

"نئی اردو... نثر کی ابتدا اور ترقی" سرسری حد تک اردو ادب کی تاریخ ہیں۔ امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" (۱۸۹۷ء) ادبی تاریخ نہیں، بلکہ ایک تنقیدی کتاب ہے۔ ہوتے ہوتے ہم آجاتے ہیں بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں۔ ادبی تاریخ و تدوین کے لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی عشرہ ہے۔ ۳۰-۱۹۲۱ء کے بیچ ان شعبوں میں جتنا کام ہوا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، بعد میں بھی شاید کسی ایک دہے میں اتنا نہ ہوا ہو۔ ان دس برسوں میں ذیل کی تاریخیں منظرِ عام پر آئیں:

> "گلِ رعنا"، "شعرالہند"، "سیرالمصنفین"، شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم"، رام بابو سکسینہ کی کتاب کے انگریزی اور اردو روپ، احسن مارہروی کی "تاریخِ نثرِ اردو۔"

ان کے علاوہ محدود تاریخوں میں "دکن میں اردو"، "پنجاب میں اردو"، "ارباب نثر اردو" اور "اردو شہ پارے" جیسی تاریخ ساز کتابیں لکھی گئیں۔ تدوین میں کتنے تذکرے اور کتنے قدیم نثری و شعری متون چھاپے گئے۔ اس زریں دہے کا افتتاح حکیم عبدالحی نے اپنی "گلِ رعنا" (۱۹۲۱ء) سے کیا۔ اس کی تصنیف ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ عبدالحی نے اپنے پسندیدہ اشعار کی ایک بیاض تیار کی تھی۔ بعد میں سوچا کہ اشعار کو ترتیب دے کر ان کے خالقوں کے حالات بھی لکھ لیے جائیں۔ اس کی ارتقایافتہ شکل "گلِ رعنا" ہے۔ بیاضِ اشعار سے اگنے والی تاریخ محض شاعروں تک کیوں نہ محدود رہتی، حالانکہ اس وقت تک سرسید اور ان کے رفقا کی بدولت اردو نثر اردو شعر پر چشمک زن تھی، محفلِ ادب میں اس کے دوش بدوش بیٹھ کر گھمنی گھرا رہی تھی۔ سرسید اور ان کے رفقا نیز مرزا رسوا، شرر اور پریم چند کے نثری جواہر ریزوں کے باوجود حکیم صاحب نے بھی محض شاعری کا جائزہ کافی سمجھا۔ انھوں نے "آبِ حیات" کے بیانات کی تصحیح پر خاص توجہ کی لیکن ان کی کتاب "آبِ حیات" کے آس پاس بھی نہیں پہنچتی۔

"شعرالہند" کو ادبی تاریخ کہتے ہوئے قدرے ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ یہ بھی دراصل اردو شعر کی تنقیدی تاریخ ہے۔ عبدالسلام نے یہ کتاب اپنے استاد مولانا شبلی کی تقلید میں لکھی ہے۔ شبلی نے فارسی شاعری کی تاریخ "شعرالعجم" کے نام سے لکھی، عبدالسلام نے اردو شاعری کی تاریخ "شعرالہند" کے نام سے تصنیف کی۔ ایران کی واحد زبان فارسی ہے، لیکن ہندوستان کی واحد زبان اردو نہیں، اس لیے شعرِ اردو کی تاریخ کو "شعرالہند" کہنا جزو کو کل قرار دینے کے مترادف ہے۔ اس کتاب کے تنقیدی پہلو کا سب سے بڑا اکتساب اردو میں دلی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کا تصور پیش کرنا ہے۔ اس پر مہرِ توثیق ثبت کی مسلم یونی ورسٹی

Scanned by CamScanner

علی گڑھ کے دو تحقیقی مقالوں: "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" اور "دہلی کا دبستانِ شاعری" نے۔ "شعر الہند" کی دوسری تنقیدی دین ہر دور میں اردو شعرا کے حریف جوڑے اُبھارنا ہے۔ "آبِ حیات" میں اس کی طرف اشارہ تھا، "شعر الہند" میں ان میں گہرا رنگ بھر دیا گیا، لیکن انھوں نے ان حریفوں کی جو قدر بندی کی، اسے عام طور سے متوازن ہی کہا جائے گا۔

شبلی نے "شعر العجم" کی تین جلدوں میں شعرا کے حالات لکھے، بعد کی دو جلدوں میں شاعری کی نظریاتی تنقید کی۔ آخری دو جلدوں کی تحریک حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" سے ہوئی ہوگی۔ عبد السلام نے بھی "شعر الہند" کی دوسری جلد مختلف اصنافِ شعر کی نظریاتی تنقید پر وقف کی، لیکن یہ جلد اہلِ نظر کی نظروں میں نہ سما سکی۔ "شعر الہند" کی پہلی جلد ہی پر توجہ کی جاتی ہے۔ میں "شعر الہند" کو ادبی تاریخ کے طور پر وقیع نہیں سمجھتا، لیکن عملی تنقید کے لحاظ سے اسے قابلِ لحاظ پاتا ہوں۔ اس خصوص میں یہ "آبِ حیات" ہی سے نہیں، "گلِ رعنا" سے بھی کافی آگے ہے۔

"آبِ حیات" کو دیکھ کر پہلا ردِ عمل یا تحریک محمد یحییٰ تنہا کو ہوئی تھی۔ انھوں نے ۱۹۱۴ء میں سوچا کہ کیوں نہ "آبِ حیات" کی طرز پر نثر نگاروں کی تاریخ لکھ دی جائے۔ یہ ارادہ ۱۹۲۴ء میں "سیر المصنفین" جلد اول کی شکل میں بار آور ہوا۔ تنہا محقق یا مورخ نہ تھے۔ وہ تھوڑی محنت اور تھوڑے سے مطالعے کے بعد ایک کتاب تالیف کر دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے قدیم ماخذ نہیں دیکھے، مخطوطات تک پہنچنے کی جہد نہیں کی۔ جو کچھ مطبوعہ مواد میسر آیا، اسی پر اکتفا کر کے نثر نگاروں کے حالات گھسیٹ دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے بارے میں محض دو چار سطریں لکھنی کافی سمجھیں۔ سب کے حالات نہایت تشنہ رہے۔ ہاں، چوتھائی صدی کے بعد "اربابِ نثر اردو" اور دوسری تاریخوں کو دیکھنے کے بعد جب انھوں نے "سیر المصنفین" کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا وہ غنیمت تھا، لیکن غنیمت سے آگے نہیں۔

"سیر المصنفین" کی دوسری جلد عہدِ سرسید کے نثر نگاروں کے بارے میں ہے۔ یہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنفوں کے حالات شرح و بسط سے ہیں، لیکن ان کی تحریروں کے نمونے حالات سے کہیں زیادہ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ معلومات کے لیے یہ جلد اچھی خاصی ہے، لیکن یہاں بھی تنہا نے تلاش و تحقیق سے کام نہیں لیا۔ ایک مصنف کے لیے محض ایک یا دو مطبوعہ کتابوں سے صفحے کے صفحے ماخوذ کر لیے ہیں۔ ادبی تاریخ رقم کرنے کا یہ نرالا انداز ہے کہ محض آٹھ دس کتابوں کی مدد سے سیکڑوں صفحے لکھ ڈالے جائیں۔ اگر اس

Scanned by CamScanner

جلد میں مندرجہ ہر مصنف کے نمونۂ تحریر کو محض ایک یا دو صفحات تک محدود کر دیا جائے تو اس کا حجم گھٹ کر ایک تہائی رہ جائے گا۔ مصنفین کی تنقیدی قدر پیمائی اس دور کے لحاظ سے مناسب ہے۔

شمس اللہ قادری کی "اردوے قدیم" کے شمول پر مجھے ہمیشہ اعتذار پیش کرنا پڑتا ہے کہ یہ عمومی تاریخ نہیں، بلکہ چند صفحات کے استثنا کے ساتھ دکنی ادب کی تاریخ ہے۔ ان سے پہلے نصیر الدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" کا پہلا ایڈیشن سامنے آچکا تھا۔ قادری نے، براے نام ہی سہی، شمالی ہند کی ابتدائی اردو نظم و نثر کا بیان کیا ہے، جس کی وجہ سے مجھے اس کتاب کو اردو کی عام ادبی تاریخ لکھنے کا جواز میسّر آ جاتا ہے۔ یہ اردو کی پہلی تحقیقی ادبی تاریخ ہے۔ قادری نے متعدد اصل مخطوطات کو دیکھنے کے بعد یہ کتاب لکھی۔ بعد کی معلومات کے لحاظ سے اس میں کچھ تسامحات ہیں، لیکن ۱۹۲۵ء کو دیکھتے ہوئے اس کے تحقیقی معیار کی داد دینی ہوتی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کمزور راوی ہیں جب کہ قادری کا پایۂ استناد کہیں مضبوط ہے۔

"آبِ حیات" کے بعد اردو کی ادبی تاریخ کا دوسرا پائدار سنگِ میل رام بابو سکسینہ کی انگریزی میں لکھی "تاریخِ ادبِ اردو" ہے جس کا تکملہ اس کے اضافہ شدہ اردو ترجمے سے ہوا۔ سکسینہ اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ ان کا ارادہ کالج کے طلبہ کے لیے اس تاریخ کو ایک ٹیکسٹ بک کے طور پر لکھنے کا تھا لیکن پہلا مسودہ مکمل کرنے کے بعد مزید مواد ملتا گیا اور وہ اسے چار سال کے بعد شائع کر سکے۔ اب یہ کتاب محض طلبہ کے لیے نہیں، ادبی تحقیق کے شائقین کے ڈھب کی بھی ہو گئی۔ سونے پر سہاگا ہوا مرزا محمد عسکری کا کیا ہوا ترجمہ، جنھوں نے اصل کتاب میں کثرت سے اضافے کیے۔

سکسینہ کی تاریخ جدید انداز کی، پورے اردو ادب کی، مثالی تاریخ ہے جو اپنے زمانے میں تو روشنی کا مینار تھی ہی، اب بھی کسی مصنف، کسی علاقے، کسی دور اور کسی صنف کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کرنی ہوں تو اس سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے دکن کے ادب، نیز بیسویں صدی کے نثری ادب کے بارے میں بہت اچھی طرح لکھا ہے۔ مستشرقین کے کارناموں، نیز اردو کے ابتدائی ڈراما نگاروں کے بارے میں یہ تاریخ آج بھی مفید معلومات کا گنجینہ ہے۔

احسن مارہروی کی کتاب "تاریخِ نثرِ اردو" سے زیادہ "نمونۂ منثورات" ہے۔ مؤرخ اور محقق کے لیے یہ نمونے تقریباً بے کار ہیں۔ چارٹ میں اور ہر جزو کے آخر میں جو تبصرہ و کیفیت دیتے ہیں، وہی کار آمد ہے۔ انھوں نے متعدد ایسے قلم کاروں کو جگہ دی ہے جن کا

Scanned by CamScanner

ادب میں کوئی مقام نہیں۔ اگر نمونوں اور غیرادبی مصنفوں کو خارج کر دیا جائے تو اس کتاب میں سے تقریباً سو صفحوں کا ایک کتابچہ مرتب ہو سکے گا جس میں کام کی معلومات ملیں گی۔ انھوں نے غیرادبی موضوعات، مثلاً مذہبی، عدالتی، صحافتی تحریروں کو بھی اپنی بزم میں جگہ دی ہے۔ بہرحال اس کتاب کو ایک منضبط تاریخِ ادب نہ سمجھ کر، اس میں بکھری ہوئی کار آمد معلومات کے مخزن کے طور پر پڑھنا چاہیے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" شائع کی تھی۔ اس میں بھی نمونے پیش کرنے پر زور تھا۔

گراہم بیلی کی انگریزی "تاریخِ ادبِ اردو" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کا متن محض ۱۰۴ صفحوں کا ہے لیکن اس کی کثرتِ سواد کو دیکھا جائے تو یہ دو تین سو صفحوں کی تاریخ سے کم نہیں۔ اس میں حشویات بالکل نہیں۔ اس کثرت سے مصنفین کو ٹھونسا گیا ہے، اور ان میں غیراہم اہلِ قلم بھی ہیں، کہ کتاب میں تذکرے کا انداز آ جاتا ہے، لیکن اس کے تحقیقی اور تنقیدی فیصلوں کی اہمیت ماننی ہوگی۔ انھوں نے دکن اور شمال، دلی و لکھنؤ قدیم و جدید سب کو لیا ہے۔ اردو ادب کے بارے میں ایک مغربی کے فیصلے معروضی ہوتے ہیں، اس لیے بیلی کی تنقید کی بھی اہمیت ہے۔ مولوی عبدالحق اس تاریخ سے بہت خفا ہیں، لیکن میں اسے ناقص نہیں سمجھتا۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد سے جو "تاریخِ ادبِ اردو" ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی اسے بیلی کی تاریخ کا ترجمہ ہی سمجھیے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں اس میں برائے نام اضافہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں بیلی کی تاریخ انگریزی میں تو قابلِ قدر تھی، لیکن ۱۹۸۲ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کی تاریخ (طبعِ ہشتم) اردو کی ادبی تاریخوں میں کسی مقام کی مستحق نہیں۔

حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخِ اردو" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں اور دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں آیا۔ یہ انیسویں صدی کے اختتام تک ہی کے مصنفوں کا احصاء کرتی ہے لیکن تاحال یہ اردو نثر نگاروں کی بہترین تاریخ ہے، "سیر المصنفین" سے تو کوسوں آگے ہے۔ اس میں دکنی مصنفوں کے حالات تو معتبر نہیں، لیکن مستشرقین اور عہدِ سرسید کے اردو کے عناصرِ خمسہ کا بیان آج بھی قابلِ قدر ہے۔ نمونے اس میں بھی زیادہ ہیں لیکن ان سے قطعِ نظر مختلف نثر نگاروں کے حالات اور ان کی تصانیف کے بارے میں اس تاریخ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے بعد یہ اردو (نثر) کی دوسری قابلِ قدر تاریخ ہے۔

محمود اکبر آبادی نے "صحیفۂ تاریخِ اردو" ۱۹۴۳ء تک مکمل کر لی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں طباعت شروع ہوئی لیکن ۱۹۴۶ء تک کتاب کا دو تہائی حصہ ہی چھپ سکا۔ انھوں نے اسی کو

Scanned by CamScanner

شائع کرادیا۔ غیر مطبوعہ جزو میں اردو نثر کی تاریخ اور شعرا کے تذکروں کی تفصیل تھی۔ تقسیم کے بعد محمور پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ انھوں نے پوری تاریخ شائع کرائی کہ نہیں؟ انھوں نے اپنی تاریخ کے طویل مقدمے میں "گلِ رعنا"، آغا باقر کی "تاریخ نظم و نثرِ اردو" اور اعجاز حسین کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" پر سخت تنقید کی ہے، خصوصاً ان کی زبان و بیان پر۔ ان کی اپنی تاریخ تحقیقی اعتبار سے تہی مایہ ہے۔ ان کے خاص ماخذ رام بابو سکسینہ کی تاریخ، نصیر حسین خیال کی "مغل اور اردو"، اور آزاد کی "آبِ حیات" ہیں۔ آخرالذکر دونوں کو انھوں نے پرکھے بغیر تسلیم کر لیا ہے۔ جس مؤرخ کے پیر طریقت نواب خیال ہوں اس سے تحقیقی صحت کی کیا امید؟ لیکن تنقید کے اعتبار سے محمور کی تاریخ قابلِ ذکر و قابلِ توجہ ہے۔ نظریاتی تنقید میں وہ چنداں کام یاب نہیں۔ انھوں نے بجانت بجانت کی ۲۳ تحریکیں متعین کی ہیں، لیکن وہ دراصل تحریک نہیں، مثلاً بلاغت کی تحریک، تصنع کی تحریک، نورجائیت کی تحریک وغیرہ۔ عملی تنقید میں ان کا نقطۂ نظر جدید ہے جس کی وجہ سے وہ روایتی غزل گوئی کو برداشت نہیں کر سکتے، تازہ خیالات کے جُویا رہتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے مصحفی، ناسخ، ذوق، امیر اور جلال کی جم کر تنقیص کی ہے۔ بہرحال محمور کا صیغہ تنقید کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔

محمد یحییٰ تنہا نے "آبِ حیات" کو دیکھ کر خیال کیا کہ نثر نگاروں کی تاریخ لکھ دی جائے۔ ۱۹۲۸ء میں "سیر المصنفین" مکمل ہونے پر سوچا کہ نثر نگاروں کی طرح شاعروں کی تاریخ بھی لکھ دی جائے تو وہ اردو کی جامع تاریخ کے مصنف ہو جائیں گے۔ انھوں نے طے کیا کہ شاعروں کی ایسی تاریخ لکھی جائے جس میں تنقید کا حق ادا ہو سکے۔ اس مقصد سے انھوں نے "مرآۃ الشعرا" لکھی جو ۱۹۴۵ء تک تیار ہو گئی تھی لیکن اس کی پہلی جلد ۱۹۴۹ء میں اور دوسری جلد ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ "سیر المصنفین" کی طرح، تنہا نے اس میں بھی ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا۔ شعرا کا نمونہ کلام غیر معمولی طور پر طویل دیا لیکن انھوں نے جس تہوّر کے ساتھ مشہور شاعروں کے کلام کو رد کیا ہے اسے دیکھ کر ان کے تنقیدی فیصلوں کے بارے میں ہمدردی سے سوچنا پڑتا ہے۔ وہ کسی نام سے مرعوب نہیں ہوتے، کسی کی روایتی شاعری کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک سادہ منش انسان کی طرح اپنا تاثر بےدھڑک بیان کر دیتے ہیں، تنقید میں مصلحت کوشی کے خوگر نہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ان کے تنقیدی بیانات کو یک جا کر کے ایک مختصر کتاب تیار کر دی جائے تو وہ یقیناً توجہ خیز ہو گی۔ اس کے باوجود میں یہ بھی کہوں گا کہ یہ تاریخ اپنے عہدِ اشاعت سے کم از کم ایک ربع صدی پیچھے ہے۔ اس وقت تک تحقیق و تنقید دونوں کافی

Scanned by CamScanner

ترقی کر چکی تھیں۔

عبدالقادر سروری محقق تھے۔ معلوم نہیں انھیں کیا سوجھی کہ تنقید، اور وہ بھی معاشی اور سماجی تنقید کے پالے میں کود پڑے۔ ان کی "اردو کی ادبی تاریخ" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ ادبی تاریخ لکھنے والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ "ادبی تاریخ کو سیاسی، سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرے۔" نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تاریخ میں سیاسی اور سماجی واقعات بھرے پڑے ہیں لیکن تاریخِ ادب کا پتا نہیں، سنین نہیں، نمونے نہیں، کتابیات نہیں، اشاریہ نہیں، صرف سیاسی اور سماجی حالات کا بے مقصد بیان ہے۔ مثل مشہور ہے: کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھولا۔ سروری صاحب نے سماجی نقاد بننے کی کوشش کی، لیکن اس میں ناکام رہ کر چاروں خانے چت جا گرے۔

عبدالقیوم پہلے شخص ہیں جنھوں نے کئی حضرات سے مضامین لکھوا کر "تاریخ ادبِ اردو" تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کا ارادہ پورے اردو ادب کو چار جلدوں میں سمیٹنے کا تھا لیکن پہلی جلد ہی تیار کر کے ۱۹۶۱ء میں کراچی سے شائع کر سکے۔ اس میں اُن سمیت پانچ مضمون نگار ہیں۔ اس کے تین چار پس منظری ابواب کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کتاب کی جان دکنی ادب سے متعلق سخاوت مرزا کے لکھے تین باب ہیں۔ ان میں اور دوسروں کے لکھے ابواب میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ کتاب میں کسی باب کے شروع یا آخر میں مجموعی جائزہ نہیں، کہیں ماخذ کا اظہار نہیں کیا، کوئی فہرستِ کتابیات نہیں۔ ان کوتاہیوں کے سبب یہ کتاب متفرق مضامین کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ سخاوت مرزا نے اس کتاب کی ساکھ رکھ لی ہے۔

عبدالقیوم کی تاریخ کے اگلے سال ۱۹۶۲ء میں دوسری اجتماعی تاریخ علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ کیا سُوء اتفاق ہے کہ یہ دونوں تاریخیں پہلی جلد، یعنی دکنی ادب کے بیان پر ڈھیر ہو گئیں۔ علی گڑھ تاریخ پر رشید حسن خاں کا شدید معترضانہ تبصرہ شائع ہوا جس کے بعد تاریخ کی یہ جلد بھی بازار سے اٹھالی گئی اور بعد کی جلدیں مرتب ہی نہ ہو سکیں۔ افسوس! اس جلد کے تمام لکھنے والے مشاہیرِ ادب ہیں جس کی وجہ سے اس میں بہت بیش بہا معلومات جمع ہو گئی ہیں۔ کاش، اس تاریخ کی بقیہ جلدیں بھی تیار ہو جاتیں تو اردو ادب کا فائدہ ہی فائدہ ہوتا، خسارہ نہیں۔

سید احتشام حسین کی "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" اپنی نوعیت کی تاریخوں میں بہترین ہے۔ یہ احتشام صاحب کی ہندی کتاب "اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس" کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم ہیں چودھری سبطِ محمد نقوی۔ اردو روپ اپنی نوع کی تاریخوں میں بہترین

Scanned by CamScanner

ہے۔ اسے تحقیق کے نقطۂ نظر سے نہیں، تنقید کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی سلامت روی کی داد دینی ہوگی۔

"تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" پنجابی تاریخوں میں سب سے ضخیم، سب سے جامع اور مکمل ہے۔ اس کی پانچوں جلدیں ۷۲-۱۹۷۱ء میں شائع ہو گئیں۔ اس تاریخ کا سب سے زریں پہلو ہے اس کا مکمل ہو جانا۔ اردو ادب کی یہ سب سے بڑی اور مکمل تاریخ ہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں زیادہ تر پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے متعلق معلوم ہوتے ہیں جن میں سے بیشتر ہندوستان میں معروف نہیں۔ اگر لکھنے والوں کا انتخاب وسیع تر پیمانے پر ہوتا تو بہتر نتائج سامنے آتے۔ منصوبے کی مجلسِ ادارت نے اپنے فرائض کی طرف توجہ نہیں کی جس کی وجہ سے یہ تاریخ منتشر مضامین کا مجموعہ ہو گئی، اس میں کتاب کی وحدت نہیں آنے پائی۔ مختلف مضامین کا معیار مختلف ہے، بعض بہت اچھے ہیں، بعض خاصے سرسری۔ مضمون نگاروں نے عام طور پر تحقیقی حزم و احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اس ضخیم پروجیکٹ کی تکمیل میں جو مالی و ذہنی وسائل کام آئے ہوں گے اگر انھیں سلیقے سے استعمال کیا جاتا تو کہیں بہتر تاریخ تیار ہو سکتی تھی۔ بہرحال، اب بھی جو کچھ ہے وہ بسا غنیمت ہے۔ اردو کے پاس ایک مفصل اور مکمل تاریخِ ادب تو ہوئی۔

ڈاکٹر این میری شِمل کی "کلاسیکی اردو ادب" ایک مکمل کتاب نہیں۔ جرمنی میں ہندوستانی ادب کی تاریخ تیار کرانے کا ایک منصوبہ بنایا گیا۔ اس کی آٹھویں جلد میں دو فصلیں اردو ادب کو دی گئیں۔ تیسری فصل کا عنوان "کلاسیکل اردو لٹریچر" ہے جسے شِمل نے لکھا ہے۔ نویں فصل "جدید اردو ادب"، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، کو لکھنی تھی لیکن انھوں نے نہیں لکھی۔ شِمل کی ضخیم فصل ایک کتاب کے برابر ہے۔ یہ گنجان خفی ٹائپ کے ۱۳۷ صفحوں پر چھپ کر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ شِمل نے دکنیات کی تقریباً سب تدوینوں کو دیکھا ہے اور ان کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر یہ کتاب مغربی قارئین کے لیے ہے، لیکن شِمل نے اسے تحقیقی انداز سے لکھا ہے۔ ناموں کی ریل پیل میں شاید یہ بیلی سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ جتنے زیادہ ادیبوں اور ان کی کتابوں کے نام اور سنین اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں اتنے اردو کی کسی ضخیم تاریخ ہی میں ہو سکتے ہیں۔ شِمل نے سنین درج کرنے پر خصوصی توجہ کی ہے، گو ان میں اغلاط بھی کافی ہیں۔ اتنے زیادہ مصنفوں کا اتنے کم صفحات میں ذکر کرنے کی وجہ سے اس میں تنقیدی پہلو پر مناسب توجہ نہیں کی جا سکی۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی "تاریخِ ادبِ اردو" ۱۹۷۹ء میں لاہور سے شائع کی۔ اس میں پیش لفظ کے بعد ۱۲۱۲ صفحے ہیں جو ایک جلد میں سمائے ہوئے ہیں۔ اردو میں یہ ایک جلد

کی سب سے ضخیم تاریخ ہے لیکن یہ کوئی تحقیقی کارنامہ نہیں۔ مصنف نے چند تواریخِ ادب اور دوسری کتابوں کو سامنے رکھ کر ایک تاریخ تیار کر دی، لیکن اس میں ذاتی تحقیق سے کام نہیں لیا، قدیم کتب کو بذاتِ خود نہیں دیکھا، ضعیف روایات کو بے تأمل درج کر دیا۔ لیکن تنقید کے معاملے میں یہ نیازمند نہیں۔ ایک جلد کی ادبی تاریخوں میں یہ سب سے زیادہ جامع ہے جو قدیم ادب سے لے کر اپنے عہد تک کا احاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ نے طالب علموں کے لیے اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن محقق ہونے کی وجہ سے لکھ گئے ایک تحقیقی تاریخ۔ ان کی "تاریخِ اقلیمِ ادب" کا پہلا حصہ ۱۹۷۹ء میں اور دوسرا ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں دہلی کے بادشاہ احمد شاہ کے عہد کے خاتمے تک کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد بددل ہو کر آگے لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ان کی تاریخ میں کئی دلچسپ تحقیقی بحثیں ہیں، لیکن اس کا سب سے نمایاں پہلو ان کی پورب پرستی ہے۔ ان کے نزدیک اردو مشرقی یوپی میں پیدا ہوئی، اس کا ماخذ پوربی زبان ہے۔ وہ پوربی، یعنی اودھی، بلکہ بھوج پوری تک کے ہندی شعرا کو اردو میں شامل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن اس سے اردو زبان و ادب کی انفرادیت ہی ختم ہو جائے گی۔ ہمارے اس محقق کو ہر طرف "پورب" اور "پوربی" ہی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کا اُلس انھیں مبارک ہو لیکن اردو والے ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

رام بابو سکسینہ کے بعد انگریزی میں اردو ادب کی دوسری اہم مکمل تاریخ ڈاکٹر محمد صادق نے لکھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں اور دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ان کی تاریخ عام باذوق قاری کے واسطے اردو ادب کا تنقیدی جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب تحقیقی انداز سے نہیں لکھی گئی۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ادیبوں اور ان کے کاموں کی فہرست اور تاریخیں درج کرنا ادبی تاریخوں کا کام نہیں، یہ کتابیات کے ذیل میں آتا ہے۔ میں ان کے اِس اصول سے متفق نہیں۔

ان کی کتاب تحقیقی نہیں۔ انھوں نے سنین درج کرنے کا التزام نہیں کیا۔ جہاں سنین ہیں، ان کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں۔ انھوں نے دکنی دور اور جدید دور کے ادب کو بہت سرسری انداز میں لکھا ہے، نثری ادب کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی لیکن ان کی ان کوتاہیوں کے باوجود میں ان کی تاریخ کی نظریاتی بنیاد کی داد دیتا ہوں۔ ان کے پاس آزادیِ نظر اور جرأت اظہار ہے۔ پاکستان میں رہ کر وہ عہدِ وُسطیٰ کے مسلم معاشرے کی تقلید کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ بڑے بڑے اردو شعرا اور تحریکوں کی کمزوریوں کی نشان دہی

Scanned by CamScanner

کرنے میں تکلف نہیں کرتے۔ ان کے اس صالح اور روشن نقطۂ نظر کی وجہ سے ان کی تاریخ کی اہمیت رہے گی۔

استاذی ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اپنی "مختصر تاریخ ادبِ اردو" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔ طالبِ علموں کے لیے یہ پہلی مختصر ادبی تاریخ تھی اس لیے اس کا معیار وہی تھا جو ۱۹۳۴ء میں ہو سکتا تھا۔ بعد کے ایڈیشنوں میں انھوں نے اس میں ترمیم اور اضافے کیے، اس کے باوجود اردو کی ادبی تاریخوں میں اس کا کوئی نمایاں مقام نہ بن سکا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی نے اس میں ترمیم اور معتدبہ اضافوں کے بعد ۱۹۸۴ء میں نیا ایڈیشن شائع کیا۔ اب یہ تاریخ مختصر نہیں رہی۔ اس میں عہد قدیم سے لے کر جدید دور تک کے ادیبوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ یہ تاریخ تحقیقی نہیں، تنقیدی ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے واضح نہیں کیا کہ انھوں نے کہاں کہاں ترمیم کی ہے، کون کون سے اضافے کیے ہیں۔ میں نے ان کی نشان دہی کی ہے۔ عقیل صاحب کی نظر ثانی کے بعد یہ کتاب قابلِ قدر ہو گئی ہے۔ طالبِ علموں کو اس سے زیادہ مختصر تاریخوں پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے۔

اب ہم آتے ہیں اردو ادب کی تاریخ نگاری کے نقطۂ عروج پر۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخِ ادبِ اردو" کی جلد اول ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اور دو حصوں پر مشتمل جلد دوم ۱۹۸۴ء میں۔ یہ اٹھارویں صدی کے آخر تک کا احاطہ کرتی ہیں۔ کاش بقیہ جلدیں بھی جلد آجائیں تو اردو ادب کو ایک مکمل، مفصل اور قابلِ اعتماد تاریخ مل جائے۔ یہ تحقیق اور تنقید دونوں کے اعتبار سے خوب سے خوب تر ہے۔ مصنف نے ادبی تاریخ کے نظریے پر شعوری طور سے توجہ کی ہے۔ اپنی تاریخ کو ادبی روایات کے نقطۂ نظر سے ترتیب دیا ہے اس کے باوجود تحقیق و تاریخ کو نظرانداز نہیں کیا۔

میرا خیال ہے کہ پورے اردو ادب کے جتنے زیادہ مخطوطوں کو جمیل جالبی نے خود سے دیکھا ہے اتنا کسی اور نے نہ دیکھا ہوگا۔ انھوں نے اپنی تاریخ کے ہر تخلیق کار کے سلسلے میں اصل مآخذ کو پڑھا۔ سنین کے معاملے میں جس قدر اس تاریخ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے، اتنا اردو کی کسی دوسری تاریخ پر نہیں۔ ان کی کتاب کی ایک معمولی سی کمی یہ ہے کہ انھوں نے مصنفین کے سوانحی حالات کم دیے ہیں یا بعض صورتوں میں بالکل نہیں دیے۔ ان پر قدرے مزید توجہ کی جاتی تو اچھا ہوتا، لیکن تاریخِ ولادت و وفات پر جو لمبی بحثیں کی ہیں اور پھر کسی اطمینان بخش فیصلے پر پہنچے ہیں اس سے سوانحی تحقیق کا اہم ترین حصہ سامنے آجاتا ہے۔ میں اس تاریخ کو بہت پسند کرتا ہوں۔

بیتھوز، شیکل اور شاہ رخ حسین کی "اردو لٹریچر" غیر اردو دانوں کے لیے لکھی گئی

Scanned by CamScanner

ہے، یہ ایک نہایت سطحی اور سرسری کتابچہ ہے جسے تنقیدی تاریخ بھی نہیں کہہ سکتے۔

رالف رسل کی کتاب "اردو ادب کا تعاقب" باقاعدہ تاریخ نہیں، اس سے تاریخ نگاری کے ارتقا میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ انھوں نے انگریزی میں لکھی اردو ادب کی بعض تاریخوں پر تنقید کرنے کو ایک مضمون لکھا کہ "اردو ادب کی تاریخ کس طرح نہیں لکھی جانی چاہیے۔" اس تنبیہ کی ضرورت سب سے زیادہ کسی کو ہے تو خود مضمون نگار رالف رسل کو۔

سکسینہ اور صادق کی تاریخوں کے بعد انگریزی میں لکھی تیسری قابلِ قدر تاریخ علی جواد زیدی کی ہے جو ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ سکسینہ اور ڈاکٹر صادق کے مقابلے میں زیدی خالص اردو زبان و ادب کے آدمی ہیں۔ انھیں یہ تاریخ لکھنے پر مرکزی ساہتیہ اکادمی نے مامور کیا تھا۔ اس نے ایک تحدید کی تھی کہ کتاب ۳۵۰ صفحوں میں سما جائے۔ دوسری پابندی یہ تھی کہ صرف ہندوستان کے ادب کے بارے میں لکھی جائے، سرحد پار کے ادیبوں کو شامل نہ کیا جائے۔ زیدی نے دونوں قیود کو امکان بھر ڈھیلا کیا۔ ان کی تاریخ میں مواد بہت زیادہ ہے۔ متعدد غیر اہم اور مجہول الاحوال ادیبوں کے نام درج کرتے ہیں جو ایک جلد کی تاریخ میں ضروری نہ تھے۔ موجودہ دور میں آ کر وہ صفحوں کی تنگ دامانی کی وجہ سے چھٹپٹاتے دکھائی دیتے ہیں اور کسی طرح جملہ اہم ادیبوں کو سمانے کی کوشش کرتے ہیں گو اس کی وجہ سے بہتوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا۔

انھوں نے سنین بھی کثرت سے دیے ہیں لیکن ان کی مناسب چھان بین نہیں کی۔ ہم عصروں میں آ کر سنین کی غلطیاں خاص طور سے کھلتی ہیں۔ تاریخوں کا معاملہ ہے ہی اتنا عیار کہ بڑے بڑے فریب کھا جاتے ہیں۔ تاریخیں حذف کیجیے تو اعتراض، درج کیجیے تو اعتراض۔ ان کی تنقیدی قدر بندی ہر جگہ متوازن ہے۔ خلاصے کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ۴۵۹ صفحوں کی تنگ قبا میں زیدی کی تاریخ یقیناً لائقِ التفات ہے۔

درسی تاریخوں میں چار یقیناً اچھی خاصی ہیں:

۱۔ صغیر احمد جان کی "تنویرِ ادب"

۲۔ فرافت حسین مرزا کی "جائزۂ تاریخِ اردو"

۳۔ عظیم الحق جنیدی کی "اردو ادب کی تاریخ"

۴۔ اعجاز حسین اور عقیل رضوی کی "مختصر تاریخِ ادبِ اردو" ترمیم شدہ ایڈیشن۔

مخمور اکبر آبادی کی "صحیفۂ تاریخِ اردو" درسی تاریخ نہیں ہے، لیکن ہے انھیں سے ملتی جلتی۔ دوسری طرف اعجاز حسین کی تاریخ کے ترمیم شدہ ایڈیشن پر گو درسیات کا ٹھپہ لگا ہوا ہے لیکن وہ اس زمرے سے نکل کر غیر نصابی تاریخوں کی بزمِ عمائد میں داخل ہوتی دکھائی

Scanned by CamScanner

دیتی ہے۔ یہ سروری صاحب اور رالف رسل کی تاریخ سے بدرجہا بہتر ہے۔

اب تک کی تاریخوں میں صرف سکسینہ اور مرزا عسکری کی "تاریخ ادب اردو"، حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخِ اردو"، "علی گڑھ تاریخِ ادب اردو"، "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند" اور جمیل جالبی کی نامکمل "تاریخ ادب اردو" قابلِ قدر ہیں۔ انگریزی میں ڈاکٹر صادق اور علی جواد زیدی کی تاریخیں اچھی ہیں، لیکن جیسا کہ انگریزی میں کہا گیا ہے، ہر نسل کو اپنی ادبی تاریخ لکھنی چاہیے۔ اردو میں ہر بیس سال بعد نئی معلومات اور نئے نقطۂ نظر کے ساتھ پورے اردو ادب کی نئے سرے سے تاریخ لکھی جانی چاہیے۔ وہ کیسی ہو اور کس طرح تیار کی جائے؟

ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی تاریخ کے پہلے ایڈیشن ۱۹۳۴ء کے "عرضِ حال" میں لکھا:

> تجربے سے معلوم ہوا کہ تاریخ لکھنا شاید ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ (۱۹۸۴ء ایڈیشن، ص ۱۰)

وہ ایک مختصر درسی کتاب کے لکھنے ہی میں اتنے ٹوٹ گئے حالانکہ ان سے پہلے رام بابو سکسینہ اور ان کے بعد کئی دوسروں نے ضخیم اور جامع تاریخیں تنِ تنہا لکھیں۔ لیکن پیش تر کی چند اہم تاریخوں کو سامنے رکھ کر قینچی اور لئی کی مدد سے ایک نئی اور مکمل تاریخ تشکیل دینا ایک بات ہے، اصل مآخذ کو دیکھ کر جامع تحقیقی تاریخ تیار کرنا دوسری بات۔ ایک کوہ کن جمیل جالبی اس ہفت خواں میں لگا ہوا ہے، لیکن ۲۰ سال میں آدھا اردو ادب ہی طے کر سکا ہے۔

ادبی تاریخ کی کیا نوعیت، کیا رنگ ڈھنگ، کیا ابعاد و حدود ہونی چاہییں، ان پر پہلے باب میں غور کیا جا چکا ہے۔ طریقِ کار سے متعلق چند اہم سوالات یہ ہیں:

۱۔ ادبی تاریخ کی تسوید میں تاریخی، سیاسی اور سماجی پس منظر کو کتنی اہمیت دی جائے۔ اگر ادب کا مطالعہ معاشرتی پس منظر میں کرنا ہے تو آخرالذکر کا بیان ابتدا میں کرنا کافی ہے یا ہر ادیب اور تخلیق کو سیاسی اور سماجی آئینے میں دیکھا جائے۔ افکار پر لکھتے ہوئے غیر ادبی سماجی افکار کی کتنی شرح کی جائے، مثلاً علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے بیان میں ادبی افکار اور غیر ادبی افکار میں کیا تناسب ہو؟

۲۔ سوانح اور تنقید میں کسے زیادہ اہمیت دی جائے؟ کیا ادبی تاریخ ادیبوں کی سوانح کا مجموعہ ہو یا ادیبوں پر تنقیدی مقالات کا؟ اگر دونوں ہونے چاہییں تو تنقید کا بہرہ کس قدر ہو۔

۳۔ انفرادی ادیبوں کے علاوہ اصنافِ ادب اور تحریکات کے ارتقا پر بھی علاحدہ سے ابواب لکھے جائیں کہ نہیں؟

۴۔ ادب سے متعلق غیر ادبی لواحقات یا نواحی ادبی موضوعات کو علاحدہ سے بیان کیا

Scanned by CamScanner

جائے کہ نہیں؟ غیر ادبی لواحقات یہ ہو سکتے ہیں:

اردو اخبارات، اردو کے اہم ناشرین، اردو کی مشہور درس گاہیں، اردو میں تاریخی ادب، اردو میں مذہبی ادب وغیرہ۔

نواحی ادبی موضوعات اِس قسم کے ہوں گے:

اردو قواعد، اردو لغات، اردو کا لسانیاتی ادب، لوک گیت، لوک کہانیاں، اردو رسالے، اردو کے تصنیفی ادارے۔

ان سوالات کے بارے میں میری رائے کچھ اس طرح ہے:

۱۔ کتاب کی ابتدا میں علاحدہ سے تاریخی اور سماجی پس منظر دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ متعدد تاریخوں میں آچکا ہے اور قارئین اسے جان چکے ہیں۔ تاریخی اور سماجی عوامل کو تخلیق اور تخلیق کار کے ضمن میں دینا زیادہ سُودمند ہوگا۔ تاریخ کے ہر بڑے جزو سے پہلے یا ادیب کے بیان میں ضروری پس منظر دیا جا سکتا ہے، مثلاً دکنی ادب کے بیان سے پہلے مختصراً دکنی حکومتوں کی تاریخ دینی ہوگی، فورٹ ولیم کالج کے بیان میں اس دور کے معاشرے کی تعلیمی ضرورتوں پر لکھنا ہوگا، وہابی تحریک کے مصنفوں پر لکھتے وقت سیاسی اور دینی پس منظر کو دینا ہوگا۔ علی گڑھ تحریک سے پہلے تفصیل سے سیاسی، تہذیبی اور علمی پس منظر کو شرح کرنا ہوگا۔ ادبِ لطیف کی تحریک اور اس کے ادیبوں سے پہلے مغرب کی جمالیاتی تحریک کا ذکر کرنا ہوگا۔ ترقی پسند ادب اور ادیبوں پر لکھتے وقت مارکسی نظریہ بیان کرنا ہوگا۔ ایسے ہی تقاضے حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت پر لکھنے کے ہیں۔

انفرادی ادیبوں میں ابراہیم عادل شاہ ثانی، علی عادل شاہ ثانی، قلی قطب شاہ، ولی، جعفر زٹلی، میر، رجب علی بیگ سرور، غالب، سرسید، نذیر احمد، سرشار، چکبست، پریم چند، اقبال، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، جوش وغیرہ پر لکھتے ہوئے حسبِ ضرورت تاریخی، سماجی اور علمی پس منظر کو ان کے حالات سے قبل یا حالات میں سمو کر لکھنا ہوگا۔ جنس زدہ ادیبوں کے رشحاتِ قلم کے تجزیے کے ساتھ نفسیاتی نظریے کو بیان کرنا ہوگا۔ صرف یہ خیال رہے کہ انھیں سیاسی، سماجی عوامل کا ذکر کیا جائے جن کا ادیب یا ادبی تخلیق سے نزدیک کا تعلق ہو۔ بہر حال ادبی تاریخ کو سیاسی تاریخ یا سماجی تاریخ نہ بنا دیا جائے۔ پس منظر پیش منظر پر حاوی نہ ہو۔

۲۔ اردو ادب کی تاریخ کو قابو میں رکھنے کے لیے سوانحی حالات کو زیادہ جگہ دینی چاہیے تنقید کو نسبتاً کم۔ تنقید تو مختلف کتابوں اور مضامین میں تفصیل سے ملتی ہے لیکن مستند سوانحی حالات کم ملتے ہیں۔ ادبی مؤرخ کو انھیں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ مغربی نظریات

Scanned by CamScanner

مغربیوں کے لیے چھوڑیے، اردو کی ادبی تاریخ میں سنین کی صحت کی خصوصی اہمیت ہے۔ کسی قاری کو کسی مصنف کی سوانح یا تصانیف کی تاریخیں جاننی ہوں گی تو وہ ادبی تاریخ کو حوالے کی کتاب کے طور پر دیکھے گا۔ ادبی تاریخ ادبی تنقید سے مختلف ہے۔ "شعرالہند"، سروری کی ادبی تاریخ، احتشام صاحب کی تنقیدی تاریخ اور رالف رسل کی "اردو ادب کا تعاقب" ادبی تاریخ کے بنیادی فریضے، تاریخیت کو پورا نہیں کرتیں۔

مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ بیلی، ادارۂ ادبیات اردو اور شمل کی تاریخیں ادب کی تفہیم کے میدان میں سست رَو ہیں۔ تاریخ کو ناموں کی کھتونی بنانا بھی اسی طرح غیر سودمند ہے جیسے تاریخ کو تنقیدی مضامین کا مجموعہ بنانا۔

ادبی تاریخ میں نظم و نثر کے نمونے ضرور ہونے چاہییں، لیکن کافی مختصر۔ ایک دو صفحے کافی ہیں۔ بعض صورتوں میں ایک پیراگراف یا دو تین اشعار سے کام چل سکتا ہے۔ غیر اہم مصنفین کے نمونے نہ بھی دیے جائیں تو مضائقہ نہیں۔ "سیرالمصنفین"، "داستانِ تاریخِ اردو" اور "مراۃالشعرا" کی سی دریادلی اور اسراف ناپسندیدہ ہیں۔

۳۔ اہم اصناف ادب اور اہم تحریکات کے ارتقا پر علاحدہ ابواب لکھے جائیں۔

۴۔ ادب سے متعلق غیر ادبی یا نیم ادبی موضوعات پر بہت ضخیم اور جامع تاریخ ہی میں لکھنا چاہیے، ایک دو جلدوں کی تاریخ میں نہیں۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جامع اور بھرپور تاریخ وہی ہوگی جو مندرجہ بالا لوازمات پر بھی لکھے۔ ہندی ادب کی ۱۶ جلدوں کی تاریخ کو نظر میں رکھیے۔ اس سے لگتا ہے کہ مکمل تاریخ ایک فرد نہیں لکھ سکتا، یہ کام اجتماعی طور پر ہی ہو سکتا ہے۔ دقتیں دونوں میں ہیں۔ ایک فرد کے لیے قدیم و جدید ادب، تحقیق و تنقید اور لسانیات سب پر قادر ہونا مشکل ہے۔ اگر جملہ موضوعات پر ماہر کی طرح لکھنا ہے تو کئی افراد کی مدد لینی ہوگی۔ اجتماعی تحقیق میں پہلی منزل یہ ہے کہ ادبی تاریخ کے لیے ایک مناسب مدیر اور مناسب مجلسِ ادارت تلاش کی جائے۔ اب تک کی "پنچایتی" تاریخوں کو دیکھا جائے تو کسی میں بھی ادارے کی کارفرمائی نظر نہیں آتی اور شاید کسی کو بھی مناسب مدیر نہیں مل سکا۔

دوسری قباحت یہ ہے کہ ماہر مضمون نگاروں کے سپرد مضمون اور موضوع تو کر دیے جائیں لیکن اردو میں لگن سے جم کر کام کرنے والے کم ہیں۔ یہاں نوابی صحبتوں، مشاعروں، مجلس آرائی اور بیٹھک بازی کی روایات کی وجہ سے سنجیدہ کام کو تکمیل تک پہنچانا مشکل ہوتا ہے۔ عمائد اور زعما روابط عامہ، خوداشتہاریت، جلسے جلوسوں، کمیٹیوں اور انجمنوں میں اتنا وقت گنواتے ہیں کہ ان کے سپرد جس موضوع کو کر دیا جائے، اسے وقت پر پورا کر ہی نہیں

Scanned by CamScanner

سکتے۔ مرکزی ساہتیہ اکادمی، ترقیِ اردو بیورو یا دوسری انجمنوں کی رپورٹیں دیکھیے تو یہی فریاد سننے کو ملے گی کہ جس بڑے نے کو جو تصنیفی کام سپرد کیا گیا تھا، اس نے تقاضاے بسیار کے باوجود کر کے ہی نہیں دیا۔

اگر سب کے مضامین دستیاب بھی ہو جائیں تو ان کی سطح، ان کا طول، ان کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنے موضوع پر بہت اطناب سے لکھتا ہے، دوسرا اپنے موضوع کو ہلکے پھلکے انداز میں ٹال دیتا ہے۔ ایک مضمون میں کسی ادیب یا کتاب کی جو تاریخیں دی ہوتی ہیں، دوسرے مضمون میں اس سے مختلف ہوتی ہیں۔ ادارے کا کام ہے کہ ان میں یکسانیت لائے۔ لیکن یہ مطالبہ کرنا آسان ہے، سرانجام دینا مشکل ہے۔ کس مدیر کی ہمت ہے کہ نک چڑھے زعیم ادب کی تحریر پر قلم اٹھائے۔ مضمون نگار کے علم کے بغیر اس کی تحریر میں ترمیم و تصحیح کرنی بھی نہیں چاہیے۔ اگر دو مضمون نگاروں نے ایک واقعے کی تاریخیں مختلف یا دوسری تفصیلات متضاد لکھی ہیں تو مدیر کو چاہیے کہ یا تو فٹ نوٹ میں اپنے علم کے مطابق تصحیح کرے یا مضمون نگاروں کو لکھ کر پوچھا جائے۔ یہ کام کتنا دیر طلب ہے۔ اس لیے ہوتا یہ ہے کہ اجتماعی تاریخوں میں کتاب کی وحدت نہیں بن پاتی، وہ مضامین کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے بہتر صورت یہی ہے کہ منصوبے کی کئی جلدیں کر کے ایک ایک جلد ایک ایک مصنف سے لکھائی جائے تاکہ ہر جلد میں تو وحدت ہو، کتابی شان ہو۔

اردو ادب کی تاریخِ بزرگ اتنا بڑا کام ہے کہ ایک فرد اس ہفت خواں کو تنہا سرانجام نہیں دے سکتا، چند مخلص اہلِ جنوں ہی کر سکتے ہیں۔ ان کا صحیح انتخاب ہونا چاہیے۔ ہمارا ترقیِ اردو بیورو چار جلدوں میں اردو ادب کی تاریخ تیار کرا رہا ہے۔ برسوں سے وہ ایک کے بعد دوسرے ادیب کو ایک ایک جلد کی ذمےداری سونپتا ہے، لیکن کوئی اس بیل کو منڈھے ہی نہیں چڑھاتا، میں نے اور سیدہ جعفر نے اپنے حصے کی جلد کئی سال پہلے ان کے حوالے کر دی تھی۔

بہترین صورت تو یہ ہوتی کہ اردو کا کوئی مقتدر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہوتا اور وہ اپنے یہاں چار پانچ کُل وقتی ماہرین کو ادارے میں بٹھا کر تاریخ لکھواتا۔ ہندوستان میں ایسا کوئی انسٹی ٹیوٹ نہیں۔ پاکستان کے مقتدرہَ قومی زبان کی اولیات غالباً دفتری اور نظم و نسق کی زبان کی ہیں۔ ان حالات میں ساری امیدیں اس فرہاد جمیل جالبی کی تاریخ پر لگی ہیں کہ وہ کسی طرح بقیہ جلدیں بھی اسی معیار کے ساتھ مکمل کر دیں۔ اس کے بعد اکیسویں صدی میں کسی تازہ تاریخ کے بارے میں سوچا جائے گا۔

Scanned by CamScanner

کتابیات

اس میں چند بہت غیراہم کتابوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ فہرست مسلمہ قاعدے کے برخلاف موضوعی گروہ بندی کے تحت بنائی جا رہی ہے۔

(۱) تذکرے

موٹے طور پر تاریخِ تصنیف کے اعتبار سے:

میر: "نکات الشعرا"، مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی، بدایوں، ۱۹۲۲
میر: "نکات الشعرا"، مرتبہ محمود الٰہی، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء
خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی: "گلشنِ گفتار"، حیدر آباد، ۱۹۲۹ء
فتح علی حسینی گردیزی: "تذکرۂ ریختہ گویاں" ("گلشنِ راز")، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء
قائم: "مخزنِ نکات"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء
لچھمی نراین شفیق: "چمنستانِ شعرا"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء
نثار احمد فاروقی: "تین تذکرے"، مکتبۂ برہان اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۸ء
میر حسن: "تذکرۂ شعرائے ہندی"، مرتبہ اکبر حیدری، اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ، اپریل ۱۹۷۹ء
کلیم الدین احمد: "دو تذکرے" (شورش و عشقی)، پٹنہ، ۱۹۵۹ء
غلام حسین شورش: "رموز الشعرا"، مرتبہ محمود الٰہی، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء
اسد اللہ ابوالحسن: "تذکرۂ مسرت افزا"، "معاصر"، حصہ ۵، پٹنہ، ۵۵-۱۹۵۴ء
مردان علی خاں مبتلا: "گلشنِ سخن"، مرتبہ مسعود حسن رضوی، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء

Scanned by CamScanner

علی ابراہیم خلیل و مرزا علی لطف: "گلزارِ ابراہیم" مع "گلشنِ ہند"، مرتبہ ڈاکٹر زور، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، طبع: علی گڑھ، ۱۹۳۴ء
قدرت اللہ قاسم: "مجموعہ نغز"، مرتبہ محمود شیرانی، کلیہ پنجاب، لاہور، ۱۹۳۳ء
رام بابو سکسینہ: "نگار خانہ یا مرقعِ شعرا"، دھومی مل دھوم داس، دہلی، ۱۹۵۸ء
مصحفی: "تذکرۃ الشعرا المعروف بہ تذکرۂ ہندی"، مرتبہ اکبر حیدری، اردو پبلشرز، نظیر آباد لکھنؤ، جنوری ۱۹۸۰ء
مصحفی: "ریاض الفصحا"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء (طبع اورنگ آباد ۱۹۳۴ء کا عکس)
غلام محی الدین مبتلا و عشق میرٹھی: "طبقاتِ سخن"، مرتبہ نسیم اقتدار علی، لکھنؤ، ۱۹۹۱ء
مفتی آزردہ: "تذکرہ آزردہ"، مرتبہ مختار الدین احمد، انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۴ء
ابنِ امین طوفان: "تذکرۂ ابنِ طوفان"، مرتبہ قاضی عبدالودود، "نگار"، کراچی، فروری ۱۹۸۶ء (طبع پٹنہ ۱۹۵۴ء کی چھاپ)
مصطفےٰ خاں شیفتہ: "گلشنِ بے خار"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء (طبع نول کشور ۱۹۷۴ء کا عکس)
نصر اللہ خاں خویشگی: "گلشنِ ہمیشہ بہار"، مرتبہ اسلم فرخی، انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء
امام بخش صہبائی: "انتخابِ دواوین"، مرتبہ تنویر علوی، شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۷ء
فیلن اور کریم الدین: "طبقاتِ شعرائے ہند"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء (طبع ۱۸۴۸ء کا عکس)
اسپرنگر، مترجم طفیل احمد: "یادگارِ شعرا"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
قطب الدین باطن: "گلستانِ بے خزاں"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء (طبع ۱۲۹۱ھ کا عکس)
نورالدین فائق: "مخزن الشعرا"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء (غالباً طبع ۱۹۳۳ء کا عکس)
سید محسن علی موسوی: "سراپا سخن"، تلخیص از ڈاکٹر سلیمان حسین، نایاب بک ڈپو، لکھنؤ سنہ ندارد، مقدمہ مارچ ۱۹۶۷ء
مرزا قادر بخش صابر: "گلستانِ سخن"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء (طبع ۱۲۷۱ھ کا عکس)
عبدالغفور نساخ: "سخنِ شعرا"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء (طبع ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء کا عکس)
کلب حسین خاں نادر: "تذکرۂ نادر" مرتبہ مسعود حسن رضوی، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۵۷ء
امیر مینائی: "انتخابِ یادگار"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء (طبع ۱۲۷۱ھ کا عکس)
دیبی پرشاد بشاش: "آثار الشعرائے ہنود"، مطبع رضوی، دہلی، ستمبر ۱۹۸۵ء

Scanned by CamScanner

حسرت موہانی: "تذکرۂ شعرا"، مرتبۂ احمر لاری، دبستانِ نظام پور، گورکھ پور، ۱۹۷۲ء
لالہ سری رام: "تذکرۂ ہزار داستاں المعروف بہ خمخانۂ جاوید دلی، جلد اوّل ۱۹۰۸ء۔
(دوم ۱۹۱۱ء۔ سوم ۱۹۱۷ء۔ چہارم ۱۹۲۶ء
دتاتریہ کیفی: "تذکرۂ ہزار داستاں المعروف بہ خمخانۂ جاوید"، جلد پنجم، دلی، ۱۹۴۰ء
خورشید احمد خاں یوسفی: "خمخانۂ جاوید"، جلد ششم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء
محمد عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری: "محبوب الزمن، تذکرۂ شعرائے دکن"، ۲ جلدیں، حیدر آباد،
۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء
خواجہ عبدالرؤف عشرت: "آبِ بقا"، مؤلفہ مرزا جعفر علی نشتر، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۸ء
راس مسعود: "انتخابِ زریں"، بدایوں، سنہ ندارد، مقدمہ ۱۹۲۱ء
حافظ احمد علی خاں شوق: "تذکرہ کاملانِ رام پور"، ہمدرد پریس، دہلی، مارچ ۱۹۲۹ء
ڈاکٹر سید سلیمان حسین: "لکھنؤ کے چند نامور شعرا" جلد اوّل، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۷۳ء
ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب: "چند شعرائے بریلی"، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
عطاءاللہ پالوی: "اردو کے ہندو مثنوی نگار"، پٹنہ، ۱۹۸۲ء
مالک رام: "تذکرۂ معاصرین: ۴"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، جون ۱۹۸۲ء
"دستاویز"، مرتبۂ یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء
مالک رام: "تلامذۂ غالب"، طبع دوم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، مئی ۱۹۸۴ء
مالک رام: "تذکرۂ ماہ و سال"، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۱ء

(۲) ادبی تاریخیں

تاریخِ تصنیف کے اعتبار سے:

(الف) عمومی تاریخیں:

محمد حسین آزاد: "آبِ حیات"، شیخ مبارک علی، لاہور، بارِ دوازدہم
حکیم عبدالحی: "گلِ رعنا"، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، طبعِ چہارم، ۱۳۷۰ھ (۱۹۵۱ء)، نیز نیا
ایڈیشن مع پیش لفظ سید ابوالحسن علی ندوی، سنہ ندارد
محمد یحییٰ تنہا: "سیر المصنفین"، دارالاشاعت، غازی آباد، (جلد اوّل: ۱۹۲۴ء، جلد دوم:
۱۹۲۸ء، ترمیم و اضافہ شدہ جلد اوّل: شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۳۹ء)

Scanned by CamScanner

عبدالسلام ندوی: "شعر الہند"، دارالمصنفین، اعظم گڑھ جلد اول: طبعِ ششم، ۱۹۸۶ء، جلد دوم: طبعِ چہارم، ۱۹۵۴ء

شمس اللہ قادری: "اردوئے قدیم"، تیج کمار بھار گو بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۶۷ء

رام بابو سکسینہ، (مرزا محمد عسکری، مترجم) "تاریخِ ادبِ اردو"، راجا رام کمار بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۲ء

احسن مارہروی: "تاریخِ نثرِ اردو بنام تاریخی نمونۂ منثورات"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جون ۱۹۸۶ء (طبع ۱۹۳۰ء کا عکس)

سید محمد عصیم (مترجم): "اردو ادب کی تاریخ" (بیلی کی تاریخ کا ترجمہ)، دہلی، ۱۹۹۳ء

آغا محمد باقر: "تاریخِ نظم و نثرِ اردو" (رام بابو سکسینہ کی تلخیص)، مبارک علی، لاہور، طبعِ دوم ۱۹۳۸ء، نیز ایک ہندوستانی بازاری ایڈیشن، سنہ ندارد۔

"تاریخ ادبِ اردو"، مرتبۂ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، آٹھویں بار ۱۹۸۲ء

حامد حسن قادری: "داستانِ تاریخِ اردو" ناشر لکشمی نراین اگروال، آگرہ، ۱۹۵۷ء

محمود اکبر آبادی: "صحیفۂ تاریخِ اردو"، گیا پرشاد اینڈ سنس، آگرہ، ۱۹۴۶ء

محمد جمیل احمد بریلوی: "اردو شاعری کی مختصر تاریخ"، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۱ء

صفیر احمد جان: "تنویرِ ادب"، نیشنل پریس، الہ آباد، ایڈیشن ۱۹۵۹ء، نیز ۱۹۸۰ء

محمد یحییٰ تنہا: "مرآۃ الشعرا"، شیخ مبارک علی، لاہور، جلد اول: ۱۹۴۹ء، جلد دوم: ۱۹۵۰ء (فوٹو عکس)

نسیم قریشی: "اردو ادب کی تاریخ"، فرینڈس بک ہاوس، علی گڑھ نواں ایڈیشن

سید احتشام حسین: "اردو کی کہانی"، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۰ء

عبدالقادر سروری: "اردو کی ادبی تاریخ"، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء

محمد چراغ علی حقیر: "اردو کی ادبی تاریخ کا خلاصہ بطرزِ سوال و جواب"، ادارۂ شروعاتِ درسی کتب، قاضی پورہ، حیدر آباد، طبع دوم، ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر نذیر احمد و ڈاکٹر عباداللہ: "تاریخِ ادبِ اردو"، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، سنہ ندارد، قیاساً ۱۹۶۰ء

شرافت حسین مرزا: "جائزۂ تاریخِ اردو"، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، بار اول، ۱۹۶۰ء

عبدالقیوم (مرتب): "تاریخِ ادبِ اردو" (حصۂ اول ۱۲۰۰ء تا ۱۷۰۷ء)، پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۱ء

"علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو"، شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۲ء

Scanned by CamScanner

شجاعت علی سندیلوی: "تعارفِ تاریخِ اردو"، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
علامہ درد نکودری: "تاریخِ ادبِ اردو"، مشورہ بک ڈپو، گاندھی نگر، دلی ۶، سنہ ندارد
سیّد احتشام حسین: "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ"، ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء
عظیم الحق جنیدی: "اردو ادب کی تاریخ"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، طبع ۱۹۷۸ء، نیز ۱۹۹۰ء
"تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند"، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، جلد ۶ تا ۸: ۱۹۷۱ء، جلد ۹: ۱۰ فروری ۱۹۷۲ء، اشاریہ جلد اول: ۱۹۷۵ء
ڈاکٹر سلیم اختر: "اردو کی مختصر ترین تاریخ"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بارِ ہفتم، فروری ۱۹۸۱ء
ابوالعاصم رضوی: "اردو ادب کی تاریخ" (حصۂ اوّل: نظم)، مجلسِ ترقیِ اردو، بارہ دری شیر افگن، دہلی، ۱۹۷۵ء
ڈاکٹر ملک حسن اختر: "تاریخِ ادبِ اردو" یونی ورسٹی بک ایجنسی، انار کلی لاہور، ۱۹۷۹ء
ڈاکٹر محمد انصاراللہ: "تاریخِ اقلیمِ ادب"، علی گڑھ، پہلا حصہ ۱۹۷۹ء، دوسرا حصہ ۱۹۸۰ء
ڈاکٹر اعجاز حسین و ڈاکٹر محمد عقیل رضوی: "مختصر تاریخِ ادبِ اردو"، جاوید پبلشرس، منٹو روڈ الہ آباد، ۱۹۸۴ء
ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخِ ادبِ اردو"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، جلد اوّل: جنوری ۱۹۷۷ء، جلد دوم (دو حصے): ۱۹۸۴ء
ڈاکٹر انور سدید: "اردو ادب کی مختصر تاریخ"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
ڈاکٹر ابو سعید نورالدین: "تاریخِ ادبیاتِ اردو"، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۷ء
ڈاکٹر نورالحسن نقوی: "تاریخِ ادبِ اردو"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۷ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: "تاریخِ زبان و ادبِ اردو"، رہبر پبلشرز، اردو بازار، کراچی ۱۹۹۸ء
ڈاکٹر سیدہ جعفر، گیان چند: "تاریخِ ادبِ اردو، ۱۷۰۰ء تک" ۔ ۵ جلدیں، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۸ء

(ب) محدود تاریخیں

۱۔ علاقہ:

نصیرالدین ہاشمی: "دکن میں اردو"، ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

Scanned by CamScanner

محمود شیرانی: "پنجاب میں اردو"، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ستمبر ۱۹۸۱ء
ڈاکٹر زور: "دکنی ادب کی تاریخ"، ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، اپریل ۱۹۸۲ء
ڈاکٹر زور: "داستانِ ادب حیدر آباد" ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، ۱۹۸۲ء
ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی: "سخن ورانِ گجرات"، ترقیِ اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۱ء
حبیب النسا بیگم: "ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما"، بنگلور ۱۹۶۲ء
سلیم حامد رضوی: "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ"، ادارۂ ادب و تنقید، بھوپال، جنوری ۱۹۶۵ء
شانتی رنجن بھٹاچاریہ: "بنگال میں اردو زبان و ادب"، نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۷۶ء

۲- دور

رفیعہ سلطانہ: "اردو نثر کا آغاز و ارتقا، انیسویں صدی کے اوائل تک"، مجلسِ تحقیقاتِ اردو، حیدر آباد، سنہ ندارد، غالباً ۱۹۶۱ء

۳- گروہ

مولوی عبدالحق: "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ، سنہ ندارد
نصیر حسین خیال: "مغل اور اردو"، مرتبۂ جمیل مظہری، کلکتہ، سنہ ندارد، تعارف: مئی ۱۹۳۳ء
رفیعہ سلطانہ: "اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ"، مجلسِ تحقیقاتِ اردو، حیدر آباد، سنہ ندارد
گنپت سہائے سری واستو: "اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ"، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۶۹ء
سید نصرت مہدی: "اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ ۱۸۰۰ء تک"، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء

۴- دبستان

ابواللیث صدیقی: "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری"، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، طبعِ اول، ۱۹۴۴ء، نیز کراچی ایڈیشن ۱۹۸۷ء

Scanned by CamScanner

نورالحسن ہاشمی: "دلّی کا دبستانِ شاعری"، فروغِ اردو، لکھنؤ طبعِ دوم، ۱۹۶۵ء
ڈاکٹر شاہ عبدالسلام: "دبستانِ آتش"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۷۷ء
جعفر رضا: "دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی"، الہ آباد، طبعِ دوم، ستمبر ۱۹۹۳ء

۵- ادارے

سید محمد: "اربابِ نثرِ اردو"
ابوسلمان شاہجہاں پوری (مرتب): "برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے"، گورنمنٹ نیشنل کالج کے مجلّہ "علم و آگہی" کا خصوصی شمارہ، کراچی، ۷۳-۷۴-۱۹ء
خورشید نعمانی ردولوی: "دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات"، بمبئی، اکتوبر ۱۹۷۷ء
عبیدہ بیگم: "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات"، نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۸۳ء
سمیع اللہ: "انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے"، لکھنؤ اکتوبر ۱۹۸۸ء
ڈاکٹر سید معین الرحمان: "یونی ورسٹیوں میں اردو تحقیق"، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء
ڈاکٹر سید معین الرحمان: "شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور، کوائف اور کارکردگی"، یونیورسل بکس، لاہور، دسمبر ۱۹۸۹ء

۶- تحریک و رجحان

ڈاکٹر عبدالودود: "اردو نثر میں ادبِ لطیف"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ستمبر ۱۹۶۷ء
ڈاکٹر منظر اعظمی: "اردو میں تمثیل نگاری"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۷۷ء
ڈاکٹر پرکاش مونس: "اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر"، الہ آباد، ۱۹۷۸ء
ڈاکٹر انور سدید: "اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک)" انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۵ء

۷- اصناف

فرمان فتح پوری: "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، نومبر ۱۹۷۲ء
حنیف نقوی: "شعرائے اردو کے تذکرے"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۷۶ء

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر انصار اللہ: "شعراے اردو کے اولین تذکرے"، علی گڑھ ۱۹۷۸ء
گیان چند: "اردو کی نثری داستانیں"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۷ء
سہیل بخاری: "اردو داستان، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء
یوسف سرمست: "بیسویں صدی میں اردو ناول"، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۹ء
ڈاکٹر عبدالعلیم نامی: "ببلو گرافیا اردو ڈراما"، جلد دوم، اورینٹل کالج، بمبئی، مئی ۱۹۶۷ء
عتیق صدیقی: "ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۷ء
ڈاکٹر سید حمید شطاری: "قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک"، حیدر آباد، ستمبر ۱۹۸۲ء
مسیح الزماں: "اردو مرثیے کا ارتقا ابتدا سے انیس تک"، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۶۸ء
ڈاکٹر محمد چراغ علی: "اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور اور گولکنڈہ میں، ابتداء سے ۱۷۰۰ء تک"، حیدر اینڈ سنز، حیدر آباد، اگست ۱۹۷۳ء
ڈاکٹر اکبر حیدری: "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا"، ناشر و سنہ ندارد
عبدالقادر سروری: "اردو مثنوی کا ارتقا"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۶۸ء
گیان چند: "اردو مثنوی شمالی ہند میں"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۷ء
فہمیدہ بیگم: "کتابیات اردو: مثنوی"، بنگلور، سنہ ندارد (مجھے پیش کش: ۱۹۸۲ء)
ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی: "گجری مثنویاں"، گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر، گجرات، اکتوبر ۱۹۹۰ء
ڈاکٹر محمد علی اثر: "دکنی غزل کی نشو و نما"، الیاس ٹریڈرس، حیدر آباد، جولائی ۱۹۸۶ء
خلیل احمد صدیقی: "ریختی کا تنقیدی مطالعہ"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ اگست ۱۹۷۴ء
ساحل احمد: "اردو میں گلدستوں کی روایت"، لٹریری بک سینٹر، الہ آباد، ۱۹۸۸ء

(۳) ایک مصنف پر کتابیں، عہد کے اعتبار سے

ظ انصاری و ابوالفیض سحر: "خسرو شناسی"، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۷۵ء
پربھاکر ماچوے: "کبیر ساہتیہ"، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
حفیظ قتیل: "معراج العاشقین کا مصنف"، حیدر آباد، ۱۹۶۸ء
حسینی شاہد: "سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے"، انجمنِ ترقیِ اردو آندھرا پردیش، حیدر آباد، اگست ۱۹۷۳ء

حسینی شاہد: "بیجاپور کا ایک صوفی شاعر، شاہ معظم"، انجمنِ ترقیِ اردو آندھرا پردیش، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۸ء

حفیظ قتیل: "میراں جی خدا نما" حیدر آباد، اردو اکادمی، ۱۹۶۱ء

سیّد حسینی پیر علوی: "تذکرۃ الوجیہ"، گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر، اکتوبر ۱۹۹۰ء

جاوید وشسٹ: "ملاوجہی"، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر محمد علی اثر: "غواصی، شخصیت اور فن"، حیدر آباد، اگست ۱۹۷۷ء

عبدالحق: "نصرتی"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، سلسلہ نمبر ۱۱۲، سنہ ندارد

طیب انصاری: "نصرتی کی شاعری، تنقید اور انتخاب"، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۸۴ء

علیم صبا نویدی: "مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر"، ٹمل ناڈ اردو پبلی کیشنز، مدراس ۱۹۹۴ء

فضا، صدرالدین: "حضرت شاہ آیت اللہ جوہری، ان کی حیات اور شاعری"، پٹنہ، دسمبر ۱۹۶۴ء

خلیق انجم: "مرزا محمد رفیع سودا"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ جنوری ۱۹۶۶ء

وحید قریشی: "میر حسن اور ان کا زمانہ"، لاہور، ۸ مئی ۱۹۵۹ء

فضلِ حق: "میر حسن، حیات اور ادبی خدمات"، ادارۂ تصنیف، دہلی، ستمبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر محمد امین: "قائم اور ان کا کلام"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء

عابد پیشاوری: "انشا کے حریف و حلیف"، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۷۹ء

عابد پیشاوری: "انشاء اللہ خاں انشا"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء

ڈاکٹر حسن آرزو: "سعادت یار خاں رنگین، حیات اور نگارشات"، مکتبہ رشیدیہ، سَونا تھ بھنجن، ۱۹۸۴ء

مشرف احمد: "شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان"، ادارۂ ادبیاتِ پاکستان، کراچی، ۱۹۷۷ء

علی احمد فاطمی: "نظیر اکبر آبادی"، الہ آباد، ۱۹۸۳ء

اکبر علی بیگ و محمد علی اثر: "نظیر شناسی"، ادارۂ شعر و حکمت، حیدر آباد، ۱۹۸۷ء

نیّر مسعود: "رجب علی بیگ سرور"، شعبۂ اردو الہ آباد یونی ورسٹی، ۱۹۶۷ء

حنیف نقوی: "رجب علی بیگ سرور، چند تحقیقی مباحث"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۱ء

جعفر ملیح آبادی: "گویا صاحبِ سیف و قلم"، لکھنؤ، ۹۷۸ء

لئیق صلاح: "میر شمس الدین فیض، حیات اور ادبی کارنامے" شگوفہ پبلی کیشنز، حیدر آباد، جنوری ۱۹۸۰ء

حالی: "یادگارِ غالب"، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء (طبعِ اول ۱۸۹۷ء کا عکس)

Scanned by CamScanner

شیخ محمد اکرام: "غالب نامہ یا آثار غالب" احسان بک ڈپو، لکھنؤ سنہ ندارد
مختار الدین احمد (مرتب): "احوالِ غالب"، انجمنِ ترقی اردو ہند، نئی دہلی، طبع دوم، ۱۹۸۶ء
مختار الدین احمد (مرتب): "نقد غالب"، انجمنِ ترقی اردو ہند، علی گڑھ، جون ۱۹۵۶ء
مالک رام (مرتب): "عیار غالب"، علمی مجلس، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء
مالک رام (مرتب): "تلامذۂ غالب"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، طبع دوم، مئی ۱۹۸۴ء
مالک رام: "گفتارِ غالب"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، اگست ۱۹۸۵ء
مالک رام: "فسانۂ غالب"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، جنوری ۱۹۷۷ء
کالی داس گپتا رضا: "آبِ حیات میں ترجمۂ غالب"، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۸۷ء
کالی داس گپتا رضا: "غالب درونِ خانہ ساکار پبلیکشنز، بمبئی ۱۹۸۹ء
کالی داس گپتا رضا: "غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں ساکار پبلیکشنز، بمبئی، دسمبر ۱۹۹۰ء
ڈاکٹر معین الرحمان: "غالب کا علمی سرمایہ"، یونیورسل بکس، ۱۹۸۹ء
ڈاکٹر حنیف نقوی: "غالب، احوال و آثار"، نصرت بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۹۰ء
ثریا حسین: "گارسیں دتاسی، اردو خدمات، علمی کارنامے"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۴ء
مسعود حسن رضوی: "سلطانِ عالم واجد علی شاہ (ایک تاریخی مرقع)"، آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ ۱۹۷۷ء
مسعود حسن رضوی: "اسلافِ میر انیس"، کتاب نگر، لکھنؤ ۱۹۷۰ء
مسعود حسن رضوی: "انیسیات"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ نومبر ۱۹۷۶ء
کاظم علی خاں: "تلاشِ دبیر"، لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۹ء
ڈاکٹر محمد زماں آزردہ: "مرزا سلامت علی دبیر، حیات اور کارنامے"، مرزا پبلی کیشنز، سری نگر، دسمبر ۱۹۸۱ء
ڈاکٹر اصغر عباس: "سرسید کی صحافت"، انجمنِ ترقی اردو ہند، دہلی، دسمبر ۱۹۷۵ء
عتیق صدیقی: "سرسید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء
ڈاکٹر نورالحسن نقوی: "سرسید اور ہندوستانی مسلمان"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۹ء
ڈاکٹر اسلم فرخی: "محمد حسین آزاد"، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۵ء
قاضی عبدالودود: "آزاد بحیثیت محقق"، پٹنہ، ۱۹۸۴ء
عابد پیشاوری: "ذوق اور محمد حسین آزاد ادارہ فکر جدید، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء
ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی: "نسیم دہلوی حیات و شاعری"، لکھنؤ ۱۹۷۷ء

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر فضل امام: "امیر اللہ تسلیم، حیات و شاعری"، الہ آباد، ۱۹۷۴ء
اشفاق احمد اعظمی: "ڈاکٹر نذیر احمد، شخصیت اور کارنامے"، مکتبۂ شاہراہ، دہلی، ۱۹۷۴ء
ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "ڈپٹی نذیر احمد (کتابیات)"، مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء
صالحہ عابد حسین: "یادگارِ حالی"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ، بارِ سوم، سنہ ندارد
ظفر احمد صدیقی: "شبلی"، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
ڈاکٹر رفعت جمال: "ذکاء اللہ، حیات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے"، بنارس، ۱۹۹۰ء
محمد علی زیدی: "مطالعۂ داغ"، کتاب نگر، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء
ابو محمد سحر: "مطالعۂ امیر"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۵ء
مختار شمیم: "ظہیر دہلوی، حیات و فن"، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء
افصح ظفر: "اکبر الہ آبادی، ایک سماجی و سیاسی مطالعہ"، اقدار کتاب گھر، کلکتہ، ۱۹۷۷ء
سیفی پریمی: "حیات اسماعیل"، مکتبۂ جامعہ، دہلی، اکتوبر ۱۹۷۶ء
ظفر اوگانوی: "صفیر بلگرامی، حیات و کارنامے"، اقدار کتاب گھر، کلکتہ، جون ۱۹۷۶ء
محمد مسلم عظیم آبادی: "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۱ء
اشرف رفیع: "نظم طباطبائی"، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۳ء
ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر: "اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین"، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۷۸ء
لطیف حسین ادیب: "سرشار کی ناول نگاری"، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۱ء
پریم پال اشک: "سرشار، ایک مطالعہ"، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی، ۱۹۶۴ء
پریم پال اشک: "سرشار جشن نراین در کی نظر میں"، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی، ۱۹۶۶ء
علی احمد فاطمی: "شرر بحیثیت ناول نگار"، نصرت پبلشرس، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء
ابوالحسن علی ندوی: "حیاتِ عبدالحی"، ندوۃ المصنفین، دہلی، رمضان ۱۳۹۰ھ/ نومبر ۱۹۷۰ء
ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ: "عزیز مرزا، شخصیت، حیات اور کارنامے"، ادارۂ شعر و حکمت، ۱۹۸۷ء
ذکی کاکوروی: "جلیل مانک پوری، حیات اور کارنامے"، مرکزِ ادبِ اردو، شاہ گنج الہ آباد، ۱۹۷۸ء
علی احمد جلیلی: "فصاحت جنگ جلیل مانک پوری"، حیدر آباد، ۱۹۹۳ء
مرزا خلیل احمد بیگ: "پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی"، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء
فیروز احمد: "مہدی افادی"، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء

Scanned by CamScanner

ظفر الاسلام ظفر: "نوح ناروی، حیات اور شاعری"، مکتبۂ جامعہ، دہلی، نومبر ۱۹۷۶ء
احمر لاری: "حسرت موہانی، حیات اور کارنامے"، ادبستان، نظام پور گورکھپور، ۱۹۷۳ء
نظر برنی (مرتب): "مولانا محمد علی، شخصیت اور خدمات"، ادبی سنگم، جامعہ نگر نئی دہلی، جولائی ۱۹۷۶ء
امام مرتضیٰ نقوی: "خواجہ حسن نظامی، حیات اور ادبی خدمات"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۷۸ء
رفیع الدین ہاشمی: "تصانیفِ اقبال، تحقیقی و توضیحی مطالعہ"، اقبال اکادمی، لاہور، پاکستان، ۹ نومبر ۱۹۸۲ء
عبداللطیف اعظمی: "اقبال دانائے راز"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء
جگن ناتھ آزاد: "محمد اقبال، ایک ادبی سوانحِ حیات"، دہلی، ۱۹۸۳ء
جگن ناتھ آزاد: "مرقعِ اقبال"، پبلی کیشنز ڈویژن حکومت ہند، نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۷۷ء
ڈاکٹر اے بی اشرف: "آغا حشر کاشمیری (کتابیات)"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
زرینہ ثانی: "سیماب کی نظمیہ شاعری"، بمبئی، فروری ۱۹۷۸ء
ضیا فتح آبادی: "ذکرِ سیماب، بزمِ سیماب"، دہلی، جنوری ۱۹۸۴ء
اسیر عارفی: "نیاز فتح پوری"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، نئی دہلی، اپریل ۱۹۷۷ء
سلام سندیلوی: "تصوف اور اصغر گونڈوی"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۷۸ء
محمود خاور: "اثر لکھنوی، حیات اور کارنامے"، شالیمار پبلی کیشنز، حیدر آباد دسمبر ۱۹۷۷ء
عبدالقوی دسنوی: "تلاشِ آزاد"، شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال، ۱۹۹۰ء
عبداللطیف اعظمی: "معترضینِ ابوالکلام آزاد"، علمی ادارہ، ذاکر نگر دہلی، مارچ ۱۹۹۰ء
صناسن علی مراد آبادی: "جگر مراد آبادی"، دہلی، ۱۹۸۴ء
جگن ناتھ آزاد: "تلوک چند محروم"، ادارۂ فروغِ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۹ء
ڈاکٹر معین الرحمان: "آپ بیتی رشید احمد صدیقی (حیات، افکار اور فتوحات)"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء
اصغر عباس: "رشید احمد صدیقی، آثار و اقدار"، شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء
عبدالماجد دریابادی: "آپ بیتی"، مکتبۂ فردوس، مکارم نگر برولیا لکھنؤ، ۱۹۷۸ء
ڈاکٹر اے بی اشرف: "حکیم احمد شجاع (کتابیات)"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء
ڈاکٹر علی حیدر: "ڈاکٹر اعجاز حسین، حیات اور کارنامے"، الہ آباد، ۸۳-۱۹۸۴ء

Scanned by CamScanner

کاظم علی خاں (مرتب): "جوش شناسی"، شیعہ کالج، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء
مظفر حنفی: "ایک تھا شاعر، شاد عارفی، فن اور شخصیت"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ دسمبر ۱۹۶۷ء
قمر سلطانہ: "علامہ جمیل مظہری، زبانوں کا سنگم"، دریا گنج نئی دہلی، مارچ ۱۹۸۶ء
یونس حسنی: "اختر شیرانی اور جدید اردو ادب"، انجمنِ ترقیِ اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء
ڈاکٹر شاہدہ بانو: "ڈاکٹر رشید جہاں، حیات اور کارنامے"، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء
ڈاکٹر خلیق انجم: "محی الدین قادری زور"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۹ء
مالک رام: "نذر حمید"، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء
مغنی تبسم و شہریار: "ن م راشد، شخصیت اور فن"، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، نومبر ۱۹۸۱ء
ڈاکٹر نصرت چودھری: "فیض کی شاعری (ایک مطالعہ)"، شان پبلشنگ ہاؤس، سری نگر، جون ۱۹۸۶ء
خلیق انجم: "پروفیسر آلِ احمد سرور، شخصیت اور ادبی خدمات"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۲ء
برج پریمی: "سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے"، مرزا پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر علی ثنا بخاری: "سعادت حسن منٹو (کتابیات)"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
کالی داس گپتا رضا: "علی سردار جعفری، اپنی بہنوں کی نظر میں"، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۹۰ء
ڈاکٹر شفیق اعظمی: "کرشن چندر کی افسانہ نگاری"، گورکھ پور ۱۹۹۰ء
ڈاکٹر کشور سلطانہ: "جاں نثار اختر، حیات و فن"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۷ء
ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ: "نذرِ مسعود"، تعلیمی مرکز، علی گڑھ ۱۹۸۹ء
ناز صدیقی: "ساحر، شخص اور شاعر"، پنجابی پستک بھنڈار، دریبہ کلاں دہلی، فروری ۱۹۷۸ء
مالک رام: "نذرِ مختار"، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء
ڈاکٹر اسلام عشرت: "خلیل الرحمن اعظمی، ترقی پسندی سے جدیدیت تک"، دانش پبلی کیشنز، پٹنہ، مارچ ۱۹۸۸ء
نسیم فاطمہ: "ڈاکٹر جمیل جالبی (سوانحی کتابیات)"، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء
خلیق انجم: "نثار احمد فاروقی (شخصیت اور ادبی خدمات)"، مکتبۂ جامعہ، دہلی، دسمبر ۱۹۹۳ء

(۴) مضامین کے مجموعے

گارساں دتاسی: "خطباتِ گارساں دتاسی"، انجمنِ ترقیِ اردو، دہلی، ۱۹۴۳ء
عبدالحق: "تنقیداتِ عبدالحق"، (مرتبۂ تراب علی باز) بارِ اول، حیدر آباد، ۱۹۳۴ء

Scanned by CamScanner

عبدالحق: "قدیم اردو"، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۱ء
محمود شیرانی: "مقالاتِ حافظ محمود شیرانی"، (مرتب: مظہر محمود شیرانی) مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، جلد دوم: ۱۹۶۶ء
سید سلیمان ندوی: "نقوشِ سلیمانی"، اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء
قاضی عبدالودود: "عیارستان"، پٹنہ، ۱۹۵۷ء
نثار احمد فاروقی: "دید و دریافت"، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی، ۱۹۶۴ء
نثار احمد فاروقی: "دراسات"، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی، دسمبر ۱۹۷۸ء
نورالسعید اختر: "نقوشِ دکن"، بمبئی، ۱۹۷۷ء
رشید حسن خاں: "ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ"، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۸ء
کالی داس گپتا رضا: "سہو سراغ"، (مرتب: صابر دت) ادارۂ فن اور شخصیت، بمبئی، جنوری ۱۹۸۰ء
مالک رام: "تحقیقی مضامین"، مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۴ء (دراصل: ۸۸-۱۹۸۷ء)
گیان چند: "ذکر و فکر"، الہ آباد ۱۹۷۸ء
مشفق خواجہ: "تحقیق نامہ"، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء

(۵) تدوین

ان میں عموماً مرتب کے مقدمے سے استفادہ کیا ہے۔

انصاراللہ: "شعرِ کبیر"، یعنی "کبیر پداولی" کا اردو ترجمہ، علی گڑھ ۱۹۷۹ء
جمیل جالبی: "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" از نظامی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۹ء
ثمینہ شوکت: "شکار نامۂ حضرت گیسو دراز اور مماثل مثالیے و جنونیہ"، مجلسِ تحقیقاتِ اردو، حیدر آباد، ۱۹۶۳ء
ڈاکٹر محمد ہاشم: "مغزِ مرغوب و چہار شہادت" از میراں جی، حیدر آباد ۱۹۶۶ء
مسعود حسن خاں: "ابراہیم نامہ" از عبدل، قدیم اردو، حیدر آباد (جلد سوم: ۱۹۶۹ء)
ڈاکٹر زور: "معانیِ سخن"، ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء
سیدہ جعفر: "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ"، ترقیِ اردو بیورو، ۱۹۸۵ء
مبارزالدین رفعت: "کلیاتِ شاہی" از علی عادل شاہ ثانی شاہی، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۲ء
اکبرالدین صدیقی: "پھول بن" از ابنِ نشاطی، ترقیِ اردو بورڈ، دہلی، ۱۹۷۸ء

Scanned by CamScanner

سیدہ جعفر: "سکھ انجن" از شاہ ابوالحسن قادری لطف الدولہ، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد، ۱۹۶۸ء
غلام عُمر خاں: "لیلیٰ مجنوں" از عاجز، قدیم اردو عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدر آباد، ۱۹۶۷ء
سیدہ جعفر: "یوسف زلیخا" از احمد، حیدر آباد، ۱۹۸۳ء
نورالحسن ہاشمی: "کلیاتِ ولی"، لکھنؤ ۱۹۸۲ء
عبدالقادر سروری: "سراجِ سخن"، حیدر آباد ۱۹۳۶ء
عبدالقادر سروری: "بوستانِ خیال" از سراج، مجلسِ تحقیقاتِ اردو، حیدر آباد، ۱۹۷۳ء
ریحانہ خاتون: "مُثمر" از خان آرزو، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۱ء
فضل الحق: "دیوانِ شاکر ناجی"، ادارہ صبحِ ادب، دہلی، ۱۹۶۸ء
عبدالحق: انتخاب حاتم، دیوانِ قدیم، ناشر مسعود احمد، جون پور ۱۹۶۹ء
عبدالباری آسی: "کلیات سودا"، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء
محمد حسن: "انتخابِ میر"، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۰ء
اسما سعیدی: "دیوانِ حسرت عظیم آبادی"، ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء
نورالحسن ہاشمی: "نوطرزِ مرصع"، ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ۱۹۵۸ء
سلیمان حسین: "نو آئینِ ہندی" از مہر چند کھتری مہر، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۸ء
ثمینہ شوکت: "مثنوی لطف"، مجلسِ تحقیقاتِ اردو، حیدر آباد، ۱۹۶۳ء
رشید حسن خاں: "باغ و بہار"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۲ء
سلیمان حسین: "گلشنِ نوبہار" از مہجور، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
محمد انصار اللہ: "قاعدہ ہندی ریختہ عرف رسالہ گل کرسٹ" از بہادر علی حسینی، علی گڑھ ۱۹۷۳ء
اطہر پرویز: "فسانہ عجائب"، سنگم پبلشرز، الہ آباد، جون ۱۹۶۹ء
مختار الدین احمد: "دیوانِ حضور"، علی گڑھ ۱۹۷۷ء
محمد حسین آزاد: "دیوانِ ذوق"، دہلی، ۱۹۳۳ء/۱۳۵۱ھ
مولانا عرشی: "دیوانِ غالب، نسخہ عرشی"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ، طبعِ اول، ۱۹۵۸ء
کالی داس گپتا رضا: "دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے"، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۸۸ء
جمیل جالبی: "ایلیٹ کے مضامین"، چوتھا ایڈیشن، دہلی، ۱۹۷۸ء
کالی داس گپتا رضا: "کلیاتِ چکبست"، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۸۱ء

Scanned by CamScanner

علیہ نشاط: "چکبست کا ایک ڈراما؛ کملا"، رام نراین لال بینی مادھو الہ آباد، ۱۹۷۱ء
کالی داس گپتا رضا: "منشورات جوش ملسیانی"، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۷۷ء
عبداللطیف اعظمی: "مشاہیر کے خطوط"، مکتبۂ جامعہ، دہلی، دسمبر ۱۹۷۵ء
ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی: "انتخابِ جوش"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء
کاظم علی خاں: "انتخابِ غزلیاتِ جعفر علی خاں اثر"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۸ء

(۶) متفرق

حالی: "مقدمۂ شعر و شاعری"، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء
بابو چرنجی لال: "اردو زبان کی تاریخ"، دہلی، ستمبر ۱۹۸۴ء
جوسل واعظ لال ایم اے: "اردو زبان کی تاریخ"، دہلی، ۱۹۲۰ء
شمس الرحمان فاروقی: "شعرِ شور انگیز"، جلد اوّل، ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
نصیر الدین ہاشمی: "کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست"، سالار جنگ اسٹیٹ کمیٹی، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء
نصیر الدین ہاشمی: "کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات"، سلسلۂ اشاعتِ خواتینِ دکن انسٹی ٹیوٹ، جلد اوّل و دوم، حیدر آباد، ۱۹۶۱ء
ڈاکٹر زور: "تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیاتِ اردو"، جلد سوم، سب رس کتاب گھر، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء
حامد اللہ ندوی: "کتب خانۂ جامع مسجد کے اردو مخطوطات"، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء
ابوالنصر محمد خالدی: "تقویم ہجری و عیسوی"، انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۳۹ء
مسعود حسن رضوی: "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ"، کتاب نگر لکھنؤ طبعِ دوم، ۱۹۶۴ء
نجم الغنی: "بحر الفصاحت"، راجا رام کمار بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۷ء
نجم الغنی: "درسِ بلاغت"، ترقیِ اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء
رشید حسن خاں: "اردو املا"، نیشنل اکادمی، دریا گنج دہلی، مئی ۱۹۷۴ء
حکم چند نیر: "اردو کے مسائل"، بنارس، اگست ۱۹۷۷ء
ابو سلمان شاہ جہاں پوری: "کتابیاتِ قواعدِ اردو"، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
عبدالستار دلوی: "ادبی اور لسانی تحقیق، اصول اور طریقِ کار"، شعبۂ اردو بمبئی یونی ورسٹی، دسمبر ۱۹۸۴ء

Scanned by CamScanner

گیان چند: "تحقیق کا فن"، یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء
یولس اگاسکر: "مراٹھی ادب کا مطالعہ"، نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ، بمبئی، نومبر ۱۹۷۶ء
سیماب: "کلیمِ عجم"، ادارہ قصر الادب، آگرہ، جولائی ۱۹۳۷ء
نور الحسن ہاشمی: "اندرونم"، لکھنؤ ۱۹۸۴ء
اپندر ناتھ اشک: "انجو باجی"، مقدمہ از گیان چند، نیا ادارہ، الہ آباد، ۱۹۸۴ء
ڈاکٹر مصطفیٰ کمال: "حیدر آباد میں اردو کی ترقی، تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے"، حیدر آباد ۱۹۹۰ء

(۷) قلمی کتابیں

شاہ کمال: "مجمع الانتخاب" (۲ نسخے)، سالار جنگ لائبریری، حیدر آباد
خواجہ عنایت اللہ خان فتوت: "تذکرہ ریاض حسنیٰ"، اسٹیٹ آرکائوز، حیدر آباد
ڈاکٹر نور الدین سعید: "خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل"، (بنگلور یونی ورسٹی کا مقالہ)
سنجیدہ خاتون: "مشاہیرِ ادبِ اردو، شعرا کو چھوڑ کر ۱۹۰۰ء تا ۱۹۵۰ء"، (بنارس یونی ورسٹی کا مقالہ)
کفیل احمد: "مشاہیرِ ادبِ اردو، ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء"، (بنارس یونی ورسٹی کا مقالہ)

(۸) رسالوں کے مضامین، تاریخی ترتیب سے

نذر علی درد کاکوروی: "امیر خسرو، ایک اردو شاعر کی حیثیت سے" "نگار"، دسمبر ۱۹۲۵ء
محمود شیرانی: "اردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیفات" "اورینٹل کالج میگزین"، لاہور، نومبر ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۲ء
محمود شیرانی: "تنقید بر آبِ حیات" "اورینٹل کالج میگزین"، لاہور، اگست ۱۹۴۱ء، نومبر ۱۹۴۱ء و فروری ۱۹۴۲ء
عبد الحق: "مرآۃ الشعرا" از تنہا پر تبصرہ "اردو" اکتوبر ۱۹۴۹ء
عبد الحق: ""سیر المصنفین" از تنہا پر تبصرہ "اردو" جنوری ۱۹۵۰ء
ڈاکٹر ریاض الحسن: "اردو کے تذکرے" "اردو" جنوری ۱۹۵۰ء
ڈاکٹر سید عبد اللہ: مقدمہ "نوادر الالفاظ" "اردو" جنوری ۱۹۵۱ء

Scanned by CamScanner

سید حسن عسکری: "حضرت عبدالقدوس گنگوہی اوران کا ہندی کلام" "معاصر"، پٹنہ دسمبر ۱۹۵۷ء
ڈاکٹر جعفر حسن: "اردو کے سلسلے میں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر جعفر حسن کی خط و کتابت"
"ہماری زبان"، ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ء "نقوش"، لاہور نمبر، فروری ۱۹۶۲ء
سخاوت مرزا: "شاہ صدرالدین میسوری دکھنی قدس سرہ" "نوائے ادب"، اپریل ۱۹۶۳ء
سہیل بخاری: "قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی جائزہ" "اردو نامہ"، کراچی شمارہ ۱۸،
اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء
علی جواد زیدی: "اردو ادب کی تاریخ ؟؟؟" "جامعہ"، دہلی، جون ۱۹۶۶ء
محمد اکرام چغتائی: "ولی گجراتی کا نام اور اس کے اختلافات" "اردو نامہ"، شمارہ ۲۵،
ستمبر ۱۹۶۶ء
محمد اکرام چغتائی: "اردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق" "اردو نامہ"، شمارہ ۲۶، دسمبر
۱۹۶۶ء
امیر حسن عابدی: "عہدِ ہمایوں و اکبر کی دو اردو غزلیں" رسالہ "تحریر"، دہلی، شمارہ ۲،
۱۹۶۸ء
حسینی شاہد: "گلشن الحقائق، اردو نثر کا پہلا مستند نقش" "نوائے ادب"، جولائی ۱۹۷۰ء
عبدالغفار شکیل: ""بکٹ کہانی کا مصنف اور اس کا وطن" "فکر و نظر"، علی گڑھ ۱۹۷۱ء
نورالحسن ہاشمی: "دو قدیم ریختے" "تحریر"، دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۳ء
اکبر رحمانی جلگانوی: "احتشام حسین، حیات اور شخصیت" "فروغِ اردو"، لکھنؤ
احتشام حسین نمبر، فروری ۱۹۷۴ء
مسعود حسن رضوی: "مختصر آپ بیتی" "تحریر"، دہلی، اپریل جون ۱۹۷۴ء
"ہماری زبان"، ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء، "ہماری زبان"، یکم ستمبر ۱۹۷۶ء
اکبر حیدری: "اقبال سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ" "ہماری زبان"، ۱۵ مارچ ۱۹۸۰ء
اکبر حیدری: "اقبال کے والد شیخ نتھو کا سفر، شیخ نور محمد ان پڑھ فلسفی تک، ماہرینِ اقبالیات
کے لیے لمحہ فکریہ"، "ہماری زبان"، ۱۵ اگست، ۲۲ اگست، یکم ستمبر ۱۹۸۰ء
خورشید احمد خاں: "نوشہ گنج بخش سے منسوب اردو کلام کی حقیقت" "اورینٹل کالج میگزین،
شمارہ خاص بابت جشنِ جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۲ء
معین الرحمان: "حیاتِ آزاد پر ایک اہم نادر معاصر ماخذ" "راوی" مجلہ گورنمنٹ کالج لاہور،
محمد حسین آزاد نمبر، ۱۹۸۳ء

Scanned by CamScanner

گیان چند: "میراں جی شمس العشاق اور ان کی نثری تصانیف" "نوائے ادب"، اکتوبر ۱۹۸۶ء
محمد اسعد اللہ وانی: "توقیت (جگن ناتھ آزاد)" "لمحے لمحے" بدایوں، جگن ناتھ آزاد نمبر، جلد ۷، شمارہ ۹، جولائی ۱۹۸۶ء تا فروری ۱۹۸۸ء
گیان چند: "آزاد کا دورِ جنوں" "قومی زبان"، مئی ۱۹۹۱ء
م قدیر ملک: "علامہ اقبال اور رشید احمد صدیقی" "نقوش"، شمارہ ۱۳۹، سنہ ندارد
"علی گڑھ میگزین"، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ بابت ۹۱-۱۹۹۰ء
حنیف احمد صدیقی: "مولانا حسرت موہانی کا سنہ پیدائش اور آزادیِ کامل" "ہماری زبان"، دہلی، یکم فروری ۱۹۹۳ء
سعادت علی صدیقی: "وجاہت علی سندیلوی" "ہماری زبان"، ۸ مارچ ۱۹۹۴ء
م حبیب خاں: "کچھ قاضی عبد الغفار کے بارے میں" "قومی زبان"، کراچی، مارچ ۱۹۹۴ء
ادارہ: "حالات" "آج کل"، جذبی نمبر، دہلی، اگست ۱۹۹۴ء
"کتاب نما"، دہلی، نومبر ۱۹۹۴ء
"ایوانِ اردو" دہلی، نومبر ۱۹۹۴ء
محمد قمر الہدیٰ: "بلونت سنگھ ایک نظر میں" "آج کل"، جنوری ۱۹۹۵ء، بلونت سنگھ نمبر، (دسمبر ۱۹۹۴ء کے بیچ شائع)
یوسف سرمست: "تنقید - تحقیق = گم راہی" "ایوانِ اردو"، دہلی، ستمبر ۱۹۹۵ء

ہندی کتابیں

احتشام حسین: "اردو ساہتیہ کا اتہاس"، انجمنِ ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء
احتشام حسین: "اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس"، لوک بھارتی پبلی کیشن، الہ آباد، طبعِ اوّل، ۱۹۶۹ء

Scanned by CamScanner

انگریزی کتابیں (تاریخی ترتیب سے)

1-Charles stewart: A descriptive Catalogue of Oriental Library of the late Tipoo Sultan of Mysore (Cambridge University Press, London 1809)

2- Sprengar: A Catalogue of Arabic, Persian and Hindustany Manuscripts of the libraries of the King of Oudh. Vol. Containing Persian and Hindustany poetry (Calcutta 1854)

3- Winternitz: A History of Indian Literature (Calcutta 1927)

4- Ram Babu Saksena: A History of Urdu Literature (Allahabad 1927)

5- T.Grahame Bailey: A History of Urdu Literature (Association Press, YMCA, Calcutta, London Oxford University Press,1932)

6- Govt. of India, Ministry of Education and Social Welfare: Report of the Committee for Promotion of Urdu, 1975

7- Annemarie Schimmel: Classical Urdu Literature from the begining to Iqbal, 1975 Otto Harrassowitz, Wies Baden (Part of a History of Indian Literature, Vol.III. Modern Indo-Aryan Literatures, Part I, Fase.III)

8- James Thorpe (ed.): The Aims and Methods of Scholarship in Modern Languages and Literature (American study Research Centre, Hydrabad, 2nd edition, reprint 1979)

9- Muhammad Sadiq: A History of Urdu literature, 2nd edition, Oxford University Press (Delhi 1984)

10- Matthews, Shacle, Shah Rukh Husain: Urdu Literature (Urdu Markaz, London 1985)

11- Ralph Russal: The Pursuit of Urdu Literature, Oxford University Press (Bombay, Calcutta, Madras 1992)

12- Ali Jawad Zaidy: A History of Urdu literature, Sahitya Akademi (New Delhi, 1993)

Scanned by CamScanner

مصنف کے کوائف

نام: گیان چند

تاریخ ولادت: ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء

اصل وطن: سیوہارہ، ضلع بجنور، یوپی، ہندوستان

تعلیم:
ایم۔اے (اردو) الہ آباد یونی ورسٹی ۱۹۴۵ء
ڈی۔فل (اردو) الہ آباد یونی ورسٹی ۱۹۴۸ء
ایم۔اے (سوشیالوجی) آگرہ یونی ورسٹی ۱۹۵۴ء
ڈی۔لٹ (اردو) آگرہ یونی ورسٹی ۱۹۶۰ء

سابقہ تعلیمی مصروفیات:
لیکچرر: شعبہ اردو گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال، جولائی ۱۹۵۰ء
پروفیسر: شعبہ اردو۔ جموں یونی ورسٹی، جموں۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء تا اکتوبر ۱۹۷۶ء
پروفیسر: شعبہ اردو۔ الہ آباد یونی ورسٹی، الہ آباد۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء تا مارچ ۱۹۷۹ء
پروفیسر: اردو مرکزی یونی ورسٹی حیدر آباد (دکن) مارچ ۱۹۷۹ء تا اپریل ۱۹۸۹ء

موجودہ مصروفیت: امریکہ میں مستقل قیام اور اپنے ذاتی علمی و ادبی منصوبوں کی تکمیل میں مصروف

خاص تصانیف:
۱۔ اردو کی نثری داستانیں (ڈی فل کا مقالہ)
۲۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈی لٹ کا مقالہ)
۳۔ اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک: (باشتراک ڈاکٹر سیدہ جعفر)
۴۔ تحریریں
۵۔ تفسیر غالب
۶۔ تجزیے
۷۔ حقائق
۸۔ کھوج
۹۔ تحقیق کا فن
۱۰۔ لسانی مطالعے
۱۱۔ رموز غالب
۱۲۔ ذکر و فکر
۱۳۔ پرکھ اور پہچان
۱۴۔ شخصیات و مشاہدات

Scanned by CamScanner